زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شخصیات نمبر ۲

۵۹ ، ۶۰

اکتوبر ۱۹۵۶ء

مرتب

محمد طفیل

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

قیمت موجودہ پرچہ
۸ روپے

ادارۂ فروغِ اردو — لاہور
(ایبک روڈ - انارکلی)

مکاتیب نمبر

نقوش نے کئی اہم موضوعات پر نمبر چھاپے ہیں۔ جو اپنی اپنی حیثیت میں ضرور باقی رہیں گے۔ جن میں غزل نمبر، شخصیات نمبر اور افسانہ نمبر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اِدھر ایک سال سے ہم "مکاتیب نمبر" مرتب کر رہے ہیں۔ ہزاروں اہم اور تاریخی خطوط (غیر مطبوعہ) جمع کئے جا چکے ہیں۔ جن میں سرسید، حالی، اکبر، اقبال، مولانا محمد علی، ڈپٹی نذیر احمد، حکیم اجمل خاں، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، سلیمان ندوی اور ابو الکلام آزاد ایسے تمام زندہ اور مرحوم مشاہیر کے بیسیوں ہی ادبی اور سیاسی خطوط ضروری حواشی کے ساتھ مرتب کئے جا چکے ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ خطوط کی شکل میں جتنا سرمایہ اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے وہ سب کا سب ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ تمام علمی و ادبی اور سیاسی دستاویزیں یک جا ہو کر آنے والے حضرات کے بھی کام آئیں۔

اگر یہ سرمایہ اکٹھا نہ کیا گیا تو اِس بات کا ڈر ہے کہ آئندہ تلف ہی نہ ہو جائے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہمارا کتنا ہی قیمتی اور نایاب سرمایہ ضائع ہو چکا ہے۔ ویسے بھی علم و ادب کے انفرادی سرمائے سے اجتماعی سرمایہ، اردو ادب کے تمام طالب علموں کے لئے مفید بھی ہو گا۔ اور اس طرح محفوظ بھی ہو جائے گا۔

مجھے خدا کے فضل اور آپ کے تعاون سے پوری امید ہے کہ ہم پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی نادر خطوط جمع کر لیں گے۔

میرے تمام احباب نے اس اہم خدمت کے سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون فرمایا ہے۔ احباب کے تعاون ہی سے ہم نے ہزاروں نادر خطوط جمع کر لئے ہیں۔ جس پر ادارہ نقوش کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ متدعی ہوں کہ آپ کے پاس بھی جتنے زندہ اور مرحوم مشاہیر کے خطوط ہوں، وہ سب (بذریعہ رجسٹری) مرحمت فرما دیں۔ میں اس نمبر کی تکمیل کے بعد وہ تمام خطوط بصد شکریہ واپس کر دوں گا۔ اگر اصل خطوط دینے میں تامل ہو تو ان کی نقل ہی عنایت فرما دیں۔

تمام اہم خطوط کو فوٹو آفسٹ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد طفیل

ترتیب

(۱)

* شخصیات نمبر حصہ اوّل صفحہ ۷۰۰ پر تمام ہوا تھا۔ اس حصہ دوم کو صفحہ نمبر ۷۰۱ سے شروع کیا ہے۔

(۲)

(۳)

طلوع

۱۹۵۴ء میں شخصیات نمبر کی پہلی جلد پیش کی گئی تھی اور اب ۱۹۵۶ء میں دوسری جلد، اس وقفے میں جتنے بھی دن رات گذرے، میں اُن میں اِس نمبر کی ترتیب و تدوین سے غافل نہیں رہا۔

جس طرح پہلی جلد کے بعد، دوسری جلد کا اعلان کر کے میں نے آج سرخروئی حاصل کی ہے اسی طرح اب تیسری جلد کا بھی عزم ہے تاکہ میری جد و جہد کے باوجود، جو نمایاں شخصیتیں رہ گئی ہیں۔ وہ سب آجائیں۔

اِس ضخیم نمبر میں ایک دو مطبوعہ مضمون بھی شامل ہیں۔ لکھنے والوں سے زیادہ انتظار نہ ہوا۔ اِدھر پرچہ جلد مکمل نہ ہو سکا۔ دونوں کی مجبوریوں سے آپ درگذر فرمائیں۔

اِس پرچے میں چند ایک مضمون، اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو حتمی طور پر مکمل نہیں کیے جا سکتے۔ مگر میں نے ان کی شمولیت بعض وجوہ سے ضروری سمجھی —— ترتیب وہی ہے جو پہلے حصّے کی تھی۔

نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا —— اس کے بعد مکاتیب نمبر!

محمد طفیل



داغ دہلوی



امیر مینائی



نواب وقار الملک





اکبر الہ آبادی



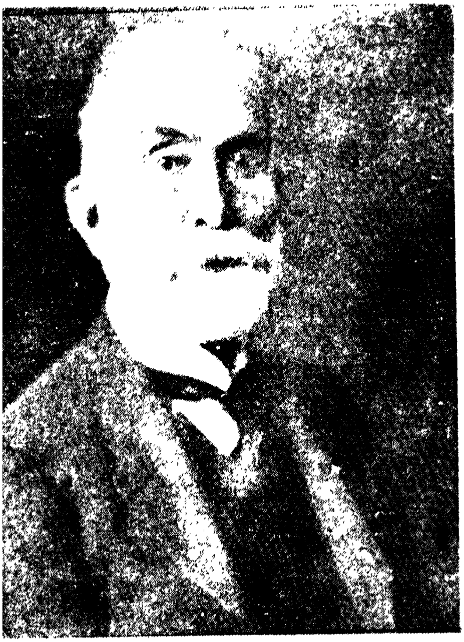
شاد عظیم آبادی







سید امداد امام اثر



عماد الملک حسین بلگرامی







سائل دہلوی



سلطان حیدر جوش







مولانامحمد علی جوہر



امتیاز علی تاج



مالک رام



عرشی رامپوری



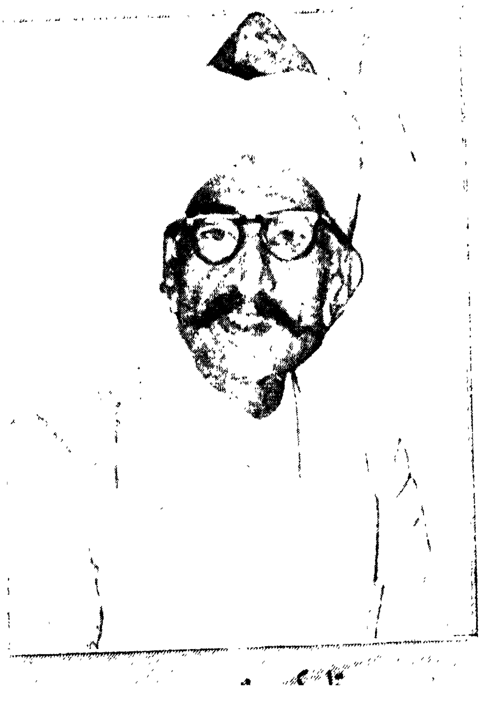
سیماب اکبر آبادی



مسعود حسن رضوی



جوش ملسیا





صوفی تبسم



علی عباس حسینی



اختر شیرانی



اختر انصاری



حفیظ ہوشیارپوری



شاد عارفی





(۱)

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

(فیضی)

داغ دہلوی

جوش ملسیانی

غدر سے سات آٹھ سال پہلے جس نوجوان شاعر کی گرمیِ کلام کا چرچا دلّی میں گھر گھر ہونے لگا اور جس کے بعض غیر فانی اشعار کی مقامی شعرا اور اساتذہ اور خود بادشاہ ظفر نے وجدانی کیفیت میں آ کر داد دی وہ داغ دہلوی تھے۔ جو آگے چل کر خان بہادر بلبلِ ہندوستان ناظم یار جنگ، میر اللہ بہ نصیب الملک، استادِ حضور بندگانِ عالی آصف جاہ نظامِ دکن کے القاب سے ملقب ہوئے۔ اور جنھوں نے اپنی گراں مایہ شاعری، حسنِ اخلاق اور وسیع المشرب ہونے کی وجہ سے اتنی قدر و عزت پائی کہ اردو نظم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نواب شمس الدین والی ریاست فیروز پور جھرکہ کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں یتیم ہو گئے۔ تو ان کی والدہ ان کو لے کر قلعہ معلّے دہلی میں پناہ گیر ہوئیں۔ ان دنوں کی پریشانیاں اور یہ مصائب ایسے تھے۔ کہ اگر آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی تو تعجب نہ تھا۔ لیکن آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم میں اعلیٰ درجے کی کوشش فرمائی۔ یہاں دن رات یہ شہزادوں کی صحبت میں رہے اور بیگمات کی گود میں پرورش پا کر سنِ بلوغ کو پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان نہایت معتبر، نہایت مستند اور ٹکسالی تسلیم کی گئی۔ انہیں خود بھی اس امتیازی خصوصیت پر ناز تھا۔ دیکھئے یہ شعر انہوں نے کس دعوے سے کہا ہے ؎

غیروں کا اختراع و تصرّف غلط ہے داغ ۔۔۔ اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

اسی زمانے میں ان کا کہا ہوا یہ شعر ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ۔۔۔ اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مرزا غالب کو کسی نے سنایا تو وجد میں آ گئے۔ شطرنج کی بازی چھوڑ کر دیر تک کیفیت کے عالم میں رہے اور پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا۔ بہ حیثیت شاعر جب انہیں بادشاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ قلعہ معلّے کے شاہی مشاعرے میں خاص خاص شعرا ہی شامل ہوتے تھے۔ عام لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مصرع طرح یہ تھا۔ ع

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے

اس زمین میں مرزا غالب کی غزل بھی ہے۔ اساتذہ پڑھ چکے تو داغ کو حضور میں پیش کیا گیا۔ تعارف ہو چکا۔ تو انہوں نے بھی طرحی زمین میں اپنی غزل سنانی شروع کی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سن کر تمام اہلِ دربار جھوم اٹھے۔ شاہ ظفر نے بھی داد دی اور فرمایا۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔

انہیں دنوں میں ان کا یہ شعر بھی تمام اربابِ ذوق کی زبان پر تھا ؎

رہ گئی چپ سمجھ کے داغِ حزیں کیوں ایسی مجھ کو کچھ حال تو کم بخت سنا تو اپنا

اسی طرح یہ مطلع بھی جس میں دلِ بے تاب کی چار تشبیہیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں بہت مقبول ہوا ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

اگرچہ وہ بہت زندہ دل، بہت شگفتہ طبع، بہت بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے آدمی تھے مگر ان کے ایوانِ شخصیت کے سب سے بڑے ستون ان کی زندگی بخش شاعری، ان کی ڈھلی ہوئی اور بے تکلف ٹکسالی زبان اور اس ٹکسالی زبان میں ان کا تغزل یا معاملہ بندی یہی تین چیزیں ہیں جو ان کی عظمت و شہرت کے لئے پرِ پرواز ثابت ہوئیں۔ انہی کی بدولت وہ صاحب طرز کہلائے اور انہی کے ذریعہ انتی قدر و عزت پائی۔ اگرچہ ان قدر و عزت کے اسباب میں اور باتیں بھی شامل ہیں مثلاً قلعہ معلےٰ میں رہنے کی وجہ سے درباری آداب سے آگاہی۔ ان کے اخلاقِ حمیدہ جو انہوں نے دلی کی پرانی تہذیب اور شرفا سے سیکھے۔ ان کا وسیع المشرب ہونا۔ مگر یہ دوسرے درجے کی باتیں ہیں۔ بنیادی باتیں وہی ہیں جن کا ابھی ابھی ذکر ہوا۔

دلی ان کو عمر بھر نہیں بھولی۔ اس کی یاد میں ہمیشہ بے چین رہے۔ غدر کے مصائب اور دلی کی تباہی سے بیزار ہو کر بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اس عالم میں جو غزل کہی اس کا ایک ایک شعر ان کے مجروح احساسات کا ترجمان ہے۔ یہ مطلع اسی غزل کا ہے ؎

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی

اس مطلع کا پہلا مصرع دلی کی تباہی کا مکمل بیان اور اسی ضمن میں اپنی بربادی کی مکمل شرح ہے۔ اسی پُر آشوب زمانے میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام بھی تلف ہو گیا۔ دلی سے نکلے تو اول ضلع بریلی میں وہاں کے ایک رئیس کے ہاں دو سال قیام پذیر رہے۔ انہوں نے حضرت داغ کی اتنی خاطر و مدارات کی کہ ان کے آلام و افکار بہت حد تک دور ہو گئے۔ آخر انہی کی وساطت سے رام پور پہنچے اور نواب یوسف علیخاں کی ادب نوازی و غربا پروری سے مستفیض ہو کر فکرِ معاش سے فارغ ہو گئے۔

رام پور ان دنوں دلی اور لکھنؤ کا خلاصہ بنا ہوا تھا۔ دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اسیر، امیر مینائی، جلال لکھنوی، محمد تقی تسلیم لکھنوی، منیر شکوہ آبادی یہ سب مشاہیر رام پور میں جمع تھے۔ داغ نے یہاں آ کر اس شگفتہ گلزار کو اور بھی پُر بہار بنا دیا اور وہیں خوب چمکے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی رام پور کی ادبی شان بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت داغ کی شاعرانہ توقیر و منزلت بھی دو چند ہو گئی۔

غزل تو ان کا خاص میدان تھا ہی۔ باقی اصنافِ سخن پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ قصائد میں بھی زبان کا وہی رنگ ہے۔ جو ان کی غزل

میں ہے ۔ دِلّی کی تباہی پر جو شہر آشوب لکھا ۔ اسے پڑھ کر تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

نہایت دردناک پیرائے میں واقعہ نگاری کا یہ کمال انیس و دبیر کے ہاں کے سوا اور کہیں نہیں ہے ۔ قوتِ بیانیہ کا جو اظہار اس مسدس میں پایا جاتا ہے اسے دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر وہ غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوتے تو اس میدان میں بھی مردِ میدان مانے جاتے ۔

مرزا غالب نے آموں پر ایک نظم کہی ہے ۔ انہوں نے بھی کہی ہے ۔ اس میں بھی زبان کی حلاوت اور حسنِ بیان ان کی قوتِ بیانیہ کا شاہکار ہے ۔ ان کے دوست میر نثار علی شہرت جب ایک مدت کے بعد ان سے ملے تو انہوں نے کہا کہ میں اگر آپ کے پائے کا شاعر ہوتا تو غزل کو چھوڑ کر اپنی شاعری کا رخ نظم ہی کی طرف پھیر دیتا ۔ اس کے جواب میں حضرت داغ نے جو کچھ فرمایا وہ سننے کے قابل ہے ۔

کہنے لگے ۔ تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کروں ۔ جو کام اپنے ذمے لے رکھا ہے وہی پورا نہیں ہوتا ۔ انہوں نے پوچھا ۔ وہ کام کیا ہے ۔ فرمانے لگے کہ جس طرح کان سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعہ معلےٰ اور دہلی میں سے اُردو زبان نکلی ہے جس کے محاورے لعل و یاقوت کو پرے بٹھاتے ہیں ۔ کوشش یہ ہے کہ دِلّی کی شستہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جائے ۔ اور ہر شہر میں ایسی ہی اُردو زبان بولی جائے ۔ جیسی دہلی میں بولی جاتی ہے ۔ گو مجھے اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی ہے ۔ مگر ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی ۔ دو آدمی خاص اس امر کے لئے متعین کر رکھے ہیں کہ ہر روز کی ڈاک میں ہندوستان کے شہروں سے جو غزلیں اصلاح کے لئے آئیں وہ بعد اصلاح روانہ کر دی جایا کریں ۔ اگر تمام ہندوستان کی زبان دہلی کے مطابق ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے ۔ شہرت صاحب گو اپنے خیالات کے پکے تھے ۔ لیکن داغ صاحب کی یہ صائب رائے انہیں بہت پسند آئی اور مان لیا کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں ۔

اصلاح کا ذکر چلا ہے تو اس کی کچھ تفصیل بھی سن لیجئے ۔ شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کم نہ تھی ۔ ان کے نام اور پتے رجسٹر میں درج ہوتے رہتے تھے ۔ ذات پات کی تمیز انہوں نے کبھی گوارا نہیں کی ۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے ہندو شعرا شامل تھے ۔ وہ صاحبِ دیوان بھی ہوئے اور استاد بھی کہلائے ۔ مثلاً پروفیسر نرائن پرشاد مہر گوالیاری جن کو نواب سائل نے جانشینیِ داغ کی سند بھی عطا کی تھی ۔ اس اعزاز میں انہوں نے حضرت داغ کے دو تین اور شاگرد بھی شامل کر لئے تھے اور اس طرح بے خود دہلوی کی رنجش مول لی تھی ۔ منشی حُب لال رعد گوالیاری ۔ زار دہلوی اور راقم الحروف بھی اسی برادری میں شامل ہیں ۔

شاگردوں کی اتنی کثیر تعداد ان کی شاعرانہ شخصیت کا روشن ثبوت ہے ۔ ان میں بہت سے اصحاب فارغ الاصلاح تھے ۔ بہت سے ایسے تھے جو خود ہی اپنے آپ کو فارغ الاصلاح سمجھ رہے تھے ۔ پھر بھی ہر روز پندرہ بیس اصلاح طلب خطوط ڈاک میں پہنچتے تھے ۔ بڑی بات یہ تھی کہ اصلاح کا کام ہمیشہ خود ہی کرتے تھے اور اپنے اُن فارغ الاصلاح پختہ گو شاعروں پر جو شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لئے آتے اور ہفتوں ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے ۔ یہ کام ہرگز نہ چھوڑتے تھے ۔ وہ عزیز غزل کے اشعار پڑھتے جاتے اور یہ اصلاح لکھواتے جاتے تھے ۔ جو شعر ناقص ہوتا اسے قلم زد کرنے کے لئے کہہ دیتے اور جو اچھا ہوتا اسے سن کر کہہ دیتے کہ آگے پڑھو ۔ دو ڈیڑھ گھنٹے میں اس کام سے فارغ ہو جاتے تھے ۔ ایک دو لفظوں ہی کی تبدیلی سے شعر میں روح پھونک دیتے تھے ۔ مثلاً میرا ایک شعر یہ تھا ؎

حور پر آیا مرا دل نہ پری پر آیا
پر بتوں پر نہیں معلوم کہ کیوں کر آیا

مصرع ثانی میں پہلا لفظ بدل کر "ان" رکھ دیا (ان بتوں پر) اس تبدیلی سے ایک تو متروک لفظ خارج ہو گیا ۔ دوسرے اس لفظ کی تکرار بھی اس مصرع میں بارِ گوش تھی وہ بھی نہ رہی ۔ تیسرے یہ کہ اس تبدیلی سے کاتی رنگ پیدا ہو کر مصرع کی شان ہی کچھ اور ہو گئی ۔

اس کام میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب رام پور چھوڑ حیدر آباد پہنچے تو نواب میر محبوب علی خاں آصف تخلص کی غزل بھی سربمہر لفافہ

میں یہ غرض اصلاح آنے لگی۔ اس میں قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد نہیں کرتے تھے۔ ترمیم کے الفاظ کو اوپر لکھ دیتے تھے۔ آدابِ شاہی کا تقاضا بھی یہی تھا یہ کام ہمیشہ تنہائی میں بیٹھ کر کرتے تھے اور پھر اصلاح شدہ کاغذ سربہ مُہر کر کے چوب دار کے حوالے کر دیتے تھے۔ کسی اور شاگرد کو یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ اصل شعر کیا ہے اور اصلاح کیا ہے۔ بعض دفعہ دن میں چار پانچ بار چوب دار سربہ مُہر لفافہ لاتا اور اسی طرح سربہ مہر واپس لے جاتا۔ ان کے بعد یہ خدمت حضرت جلیل کو سپرد ہوئی۔ تو وہ قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد کرنے لگے۔ اس پر آصف صاحب نے جب یہ کہا کہ جلیل اصلاح دینا نہیں جانتے۔ تو وہ بھی حقیقت حال سے آگاہ ہو کر متنبہ ہو گئے۔

نظام حیدر آباد کبھی کبھی رات کو خود بھی ان سے ملنے کے لئے آجاتے تھے۔ دربار میں بھی ان کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اور یہ اعزاز خصوصی تھا۔ جو بہت کم اشخاص کو نصیب ہوتا تھا۔

پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ رام پور میں ایک مشاعرے کا اہتمام انہی کے سپرد تھا۔ درباری مصروفیتوں کی وجہ سے طرحی غزل کہنے کا موقع نہ ملا مشاعرہ منعقد ہوا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا۔ کہ پڑھنے والوں کے اچھے اشعار کی داد بھی دے رہے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر و مدارات اور مشاعرہ کے حسنِ انتظام کی بھی نگرانی فرما رہے ہیں اور طرحی غزل بھی کہہ رہے ہیں۔

پڑھنے کا انداز اگرچہ تحت لفظ تھا۔ مگر بہت دل کش تھا۔ اس زمانے میں دیکھنے والوں نے ریاضؔ خیرآبادی کے سوا کسی شاعر کو اس نوک جھونک سے پڑھتے نہیں دیکھا۔

ہر صاحب کمال کے حاسد ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے کلام پر بھی ان کی زندگی میں اعتراض ہوتے رہے۔ وسط ہند کے ایک شخص نے اپنا نام پردے میں رکھ کر اودھ اخبار میں بہت سے اعتراض شائع کئے، مگر ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ خاموش رہیں۔ فرماتے تھے کہ کوئی اس طرح خوش ہوتا ہے تو ہونے دو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اعتراضات کا دندان شکن جواب ان کے قابل شاگرد نسیمؔ بھرت پوری نے اپنے جذبات سے اثر پذیر ہو کر کتابی صورت میں شائع کیا اور معترض کی خوب خبر لی۔ اس کتاب کا نام تازیانہ تھا۔ اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے بلاشبہ اسم با مسمےٰ تھی۔ صرف ایک مثال سن لیجئے۔ داغ صاحب کا مطلع یہ تھا ؎

دیکھ لے گا یہ مزا حشر میں جو جائے گا آپ جو حکم کریں گے وہی ہو جائے گا

معترض کا قول یہ تھا کہ حکم کریں گے کی جگہ یہاں حکم دیں گے کہنا چاہئے نسیمؔ صاحب نے سعدیؔ کا یہ قطعہ بطور سند پیش کر دیا ؎

خواجہ با بندۂ پری رخسار چوں بیاید بہ بازی و خندہ
چہ عجب گر چو خواجہ حکم (کند) وے کشد بارِ ناز چوں بندہ

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ داغ صاحب نے صبر و قرار کے لئے فعل واحد استعمال کیا تھا۔ معترض نے کہا کہ جمع کا فعل آنا چاہئے نسیم صاحب نے جواب میں دو مثالیں پیش کر دیں۔

۱۔ آپ کو دسط ہند کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔
۲۔ ذہاں کا آب و دانہ قسمت میں تھا۔

اس کے بعد یہ بھی لکھا کہ اصول و قواعد یا ان کی کسی بات پر اعتراض ہو تو سنا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے بیگمات کی گود میں پرورش پائی اور شہزادوں کی صحبت میں رہ کر جوان ہوا۔ وسط ہند کے رہنے والوں کو اس کی زبان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

کلام کا بیشتر حصہ سہل ممتنع ہے۔ زبان کی بے تکلفی اور بیان کی صفائی کے لئے یہ ایک مطلع بطور مثال کافی ہے ؎

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

کوئی خاص بات نہیں بتائی اور سب کچھ بتا دیا ہے۔

چھوٹے چھوٹے لفظوں سے بہت بڑا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

نہیں انصاف سے لے حضرتِ ناصح کہہ دو　　　لُطف اِن باتوں میں آتا ہے کہ اُن باتوں میں

یہاں اِن اور اُن کا استعمال کتنا نادر ہے۔ اسی قسم کی اور بیسیوں خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ جن پر نقد و تبصرہ اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

اچھے شعر کی داد دینے میں بہت فراخ دل تھے۔ بہت سے اساتذہ کو دیکھا ہے کہ مشاعرے میں مہر بلب ہو کر بیٹھے رہتے ہیں اور کسی کو داد نہیں دیتے۔ اگر کوئی شاعر کسی کو مخاطب کر کے شعر پڑھتا ہے۔ تو تھوڑا سا سر ہلا دیتے ہیں اور بس۔ مگر حضرت داغ اچھے شعر کو سُن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔ اور مکرر پڑھواتے تھے۔ اگرچہ نو مشق شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی اسی عادت کا ایک حصہ تھی۔ مگر پھر بھی شاگردوں کو یہ تاکید تھی کہ صرف اصلاح شدہ غزل ہی مشاعرے میں پڑھا کریں اور ایسی ہی چیز رسالوں میں بھیجا کریں۔

طبیعت بہت انصاف پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ریاض خیرآبادی اپنے استاد حضرت امیر مینائی کی بیمار پُرسی کے لئے حیدرآباد آئے اور کئی ہفتے وہاں ٹھہرے۔ کبھی کبھی حضرت داغ کی خدمت میں بھی نیازمندانہ سلام کے لئے حاضر ہونے کا معمول رہا۔ ایک دن حاضر ہوئے تو حضرت داغ کے پاس چند احباب بھی بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد داغ صاحب نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ ریاض صاحب نے اظہارِ معذرت کیا اور کہا۔ آپ کے سامنے کیا پڑھوں۔ داغ صاحب نے احباب سے کہا کہ یہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنا مخاطب صحیح نہیں سمجھتے۔ ریاض صاحب نے یہ چبھتی ہوئی طنز سُن کر کہا کہ آپ تو مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں اپنے استاد کے سامنے بھی نہیں پڑھتا۔ آپ کا بھی ویسا ہی احترام کرتا ہوں۔ مگر یہ عذر قبول نہ ہُوا۔ مزید اصرار پر ریاض صاحب نے مختصر سی زمین میں ایک غزل سُنا دی۔ اس کے دو تین شعر یہ ہیں ؎

چین مر کر تہِ زمیں بھی نہیں　　　اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں
آہ کے ہوتے اشک کے چلتے　　　آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں
چپ ہیں دے سُن کے مری عرضِ وصال　　　مُنہ سے ہاں بھی نہیں نہیں بھی نہیں
کون گرمائے تجھ کو اے دلِ سرد　　　برق آب آتشیں بھی نہیں

داغ صاحب نے بہت داد دی۔ بہت خوش وقت ہوئے۔ چند یوم کے بعد ریاض صاحب پھر ملاقات کے لئے آئے تو فرمایا کہ وہ زمین مجھے پسند آئی تھی۔ میں نے بھی غزل کہی ہے۔ مگر تمہاری غزل کے سامنے پست معلوم ہوتی ہے۔ فرمائش اور اصرار پر غزل سنانے لگے۔ ریاض صاحب لکھتے ہیں کہ غزل بلند پایہ تھی۔ مگر پھر بھی یہ فرمایا کہ مجھے پسند نہیں۔ یہ کہہ کر کاغذ میرے سامنے پھاڑ ڈالا۔

اس واقعہ کا آخری حصّہ غلط ہو یا درست۔ پھر بھی ان کی انصاف پسندی اور فراخ دلی کا یہ پورا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اپنے ہم عصروں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مثال میں یہ شعر کافی ہے ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ　　　ملتے امیر احمد و سیّد بھلا سے

اسی سلسلے میں حضرت امیر مینائی کا یہ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہم عصروں کا برتاؤ بھی ان کے ساتھ بہت مخلصانہ تھا ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مطلع ہے

مجھ میں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

آن سے نکلا۔ شان سے نکلا۔ اس زمین میں حضرت داغ کی ایک غزل ہے۔ حضرت امیر نے اس غزل کی تعریف بھی زوردار الفاظ میں کی تھی۔ احباب کو اس کا مطلع بھی سُنایا تھا اور فرمایا تھا کہ اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ مطلع یہ ہے ؎

خارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

حیدر آباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ خود تو شامل نہیں ہو سکے۔ ان کے کئی شاگرد شامل مشاعرہ تھے۔ ان کے خواجہ تاش سید ظہیر کو ایک ضروری کام تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے پڑھوا دیا جائے۔ مگر بار بار کہنے پر بھی مہتمم مشاعرہ نے احتراماً انہیں نہ پڑھوایا۔ اور کہا کہ آپ کے بعد کوئی اور شاعر پڑھنا گوارا نہ کرے گا۔ مشاعرہ خراب ہو گا۔ انہوں نے مزید اصرار کیا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ تو غصے میں دونوں غزلیں چاک کر ڈالیں اور چل دیئے مشاعرے میں سناٹا چھا گیا۔ مہتمم مشاعرہ نے باقی شعرا کی منت خوشامد کی اور ان کو پڑھوا دیا۔ داغ صاحب کو اس کا علم ہوا تو اگلے دن ان سب شاگردوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جب ظہیر صاحب نے غزل نہیں پڑھی اور اٹھ کر چلے گئے تو پھر تم نے یہ بے ادبی کیوں گوارا کی۔ تم بھی اٹھ کر چلے آتے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں اور مشاہیر کا کتنا احترام کرتے تھے۔

رام پور میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ عالم تھا۔ کہ ہر مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ حضرت امیر مینائی خود کہا کرتے تھے کہ غزل پر محنت کرنے سے کیا ہوگا۔ مشاعرہ تو داغ ہی کے ہاتھ رہے گا۔ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور نے بارہا ایسا کیا۔ کہ خفیہ طور پر چند آدمی یہ معلوم کرنے کے لئے مقرر کر دیئے۔ کہ مشاعرہ ختم ہونے پر جب حاضرین رخصت ہوں۔ تو ان کی گفتگو مشاعرہ کے متعلق سنیں اور دیکھیں کہ وہ راستہ چلتے چلتے کس شاعر کی تعریف کرتے اور کس کے اشعار کو دہراتے ہیں۔ ان کی رپورٹ بھی ہمیشہ حضرت داغ ہی کے حق میں ہوتی تھی۔ اور لوگ انہی کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے پائے جاتے تھے۔ حیدر آباد میں بھی ان کے کلام کی مقبولیت کا یہی عالم تھا۔ اخیر عمر میں تو وہ پھیکا شعر بھی کسی مشاعرے یا اور کسی صحبت میں پڑھ دیتے تھے تو اس پر بھی خاصی واہ واہ ہو جاتی تھی۔

حیدر آباد میں ان کی ابتدائی تنخواہ ۴۵۰ تھی۔ پھر ایک ہزار ہوئی۔ پھر ڈیڑھ ہزار۔ مگر ہر ایک ترقی روزِ اوّل ہی سے شمار کی گئی۔ ایک دفعہ انہیں پندرہ ہزار روپے اسی ترقی کے حساب میں ملے تھے۔ آئے دن کے انعامات و اکرامات اس کے علاوہ تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی سرپرستی میں بھی بہت کچھ خرچ کرتے تھے۔ ایک دفعہ نظام حیدر آباد نے یہ سُنا کہ داغ سات ہزار کے مقروض ہیں۔ انہوں نے یہ قرضہ ادا کرنے کے لئے کل رقم بھیج دی۔ ان کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم کا بھی وظیفہ مقرر تھا۔ یہ لڑکی دراصل ان کی سالی کی بیٹی تھی۔ جو بعد میں نواب سائل دہلوی سے بیاہی گئی اور ابھی تک بقیدِ حیات ہے۔

شاگردوں کی کثیر تعداد میں جیسے بے خود دہلوی۔ بے خود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نواب سائل۔ رسا رام پوری۔ نسیم بھرت پوری۔ احسن مارہروی۔ طیش مارہروی۔ مہر گوالیاری۔ نواب عزیز یار جنگ۔ حضرت اقبال۔ فدا گلاؤٹھی۔ ناطق گلاؤٹھی۔ احسن سنبھلی۔ مبارک عظیم آبادی۔ متین مچھلی شہری۔ وجاہت جھنجھانوی۔ زار دہلوی۔ رعد گوالیاری۔ ثاقب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نظام دکن شامل ہوں۔ تو اس سے بڑھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت اور کیا ہو گا۔ کلام اس قدر مقبول ہوا۔ کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ان کے صدہا اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں۔ چار دیوان شائع ہوئے۔ گلزارِ داغ آفتابِ داغ اور مہتابِ داغ تو ان کی زندگی ہی میں منظرِ عام پر آ گئے تھے۔ اور تمام دنیائے ادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ مثنوی فریادِ داغ ان کے علاوہ ہے۔ چوتھا دیوان یادگارِ داغ ان کے بعد حضرت احسن مارہروی نے نذرِ اشاعت کیا۔ اس کے علاوہ فصیح اللغات بھی ان کی زیرِ نگرانی مرتب ہو رہی تھی۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۲۲ھ یا فروری ۱۹۰۵ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مزار حیدر آباد ہی میں ہے۔

ان کی وفات پر جو ماتمی مضامین شائع ہوئے ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدمہ تمام دنیائے ادب میں شدّت سے محسوس کیا گیا۔ بہت سے رسالوں اور اخباروں نے زوردار مضامین لکھے ۔ تمام مشہور شعرائے وقت نے ماتمی نظمیں اور قطعات تاریخ دردناک پیرائے میں کہے ان میں حضرت اقبال ۔ حضرت مضطر خیرآبادی اور حضرت ریاض خیرآبادی کی ماتمی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر اور بہت بلند پایہ ہیں ۔ نواب میرزا داغ (۱۳۲۲ھ) کے الفاظ بیشتر اصحاب کے قطعات تاریخ میں بطور توارد پائے جاتے ہیں ۔ راقم الحروف نے دس بارہ شعر کا ایک قطعہ تاریخ کہا تھا ۔ اس کا آخری مصرع جس میں مادّہ تاریخ ہے یہ تھا ۔ ع

بُلبلِ ہندوستاں آج اپنے گلشن میں نہیں

۲۲ ۱۳ھ

اکبر الہ آبادی

عبدالماجد دریابادی

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی:

اکبر کا یہ الہامی شعر دوسروں کے حق میں جس حد تک بھی صحیح ہو، خود ان کے حق میں تو بہرحال صحیح نہیں۔ ان کے درج گزٹ حالات و معاملات تو گفتنی یقیناً ہیں باقی جو گزٹ یا ہر یا مسل باہر ہیں وہ بھی پبلک سے سب کے سب مثالی، معیاری، ملکوتی نہ ہوں جب بھی ناگفتنی کہنے کے لائق تو کسی طرح بھی نہیں۔

یہ تو فرما گئے ہیں ؎

اکبر کی برائی اچھائی پوچھو اس کے محلہ دانوں سے
ہاں شعر وہ اچھا کہتے ہیں، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

لیکن محلہ والوں کی شہادت انشاءاللہ ان کی صفائی ہی میں گزرے گی۔ استغاثہ کو مدد ان سے ذرا نہ ملے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ خوب سوچ سمجھ لیجئے کہ جن حضرت اکبر کو ہم آپ جاننے پہچاننے نکلے ہیں وہ اپنی پبلک زندگی میں ایک شاعر تھے اور خالص شاعر۔ اوّل بھی شاعر اور آخر بھی شاعر۔ جو سید اکبر حسین وکیل تھے اور پھر منصف ہوئے، سب جج ہوئے، عدالت خفیفہ کے جج ہوئے ڈسٹرکٹ اور سشن جج ہوئے اور ہائی کورٹ کی ججی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ ان سے ہم کو آپ کو کوئی سروکار نہیں۔ ان سے اگر کچھ واسطہ ہے بھی تو بالواسطہ، اور بہت گھوم پھیر کر —— کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی سرکاری زندگی کا بھی رخ روشن ہی رہا، صاف اور بے داغ رہا۔ کام جو کچھ کیا دیانت سے کیا، محنت سے کیا، تا ہمیت سے کیا، فہم سلیم کے ساتھ کیا۔ فرض کو فرض سمجھ کر کیا۔

شاعر کی ذاتی زندگی کو شاعر کی شخصیت کو جب جانچا جائے گا تو اسے اسی کے پیمانہ سے ناپا جائے گا۔ یہ نہ ہو گا کہ جائزہ تو لے رہے ہوں ہم شاعر کا اور عینک لگا لیں پبلک لیڈر والی، عالم دین والی، مرشد وقت والی۔

حضرت اکبر کے کلام سے واقفیت بلکہ گرویدگی اپنے بچپن ہی سے تھی۔ اس وقت سے کہ جب شعر سمجھنے کی معمولی سی تمیز بھی نہ تھی۔ لڑکپن بھر سیتاپور اپنا وطن ثانوی رہا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ ہوا کہ اکبر صاحب یا صاحبزادہ سید عشرت حسین ڈپٹی کلکٹر ہو کر سیتاپور آئے۔ ہماری ہی کوٹھی کے ایک حصہ میں آکر اترے اور ہم لوگوں سے خوب خلاملا ہو گیا۔ میں اس وقت لکھنؤ کالج میں پڑھنے آچکا تھا۔ پھر بھی سیتاپور آمد و رفت کثرت سے رہا کرتی اور عشرت صاحب اپنی "صاحبیت" اور سن میں مجھ سے بہت بڑے ہونے کے باوجود مجھ پر بہت مہربان ہو گئے۔ بالکل بے تکلف، اور اس طرح حضرت اکبر سے ذاتی واقفیت کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی۔ براہِ راست تعارف پہلی بار اپریل سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ میں بی۔ اے کا امتحان دینے الٰہ آباد گیا اور وہیں عشرت منزل حضرت اکبر کی خدمت میں حاضری دی ——— پہلی ملاقات کا منظر آج تک لوحِ حافظہ پر منقوش ہے۔ حضرت اکبر آرام کرسی پر تشریف فرما تھے (عموماً یہی طریقۂ نشست تھا) سامنے حقہ لگا ہوا تھا۔ میں ادب سے جا کر ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس محبت و شفقت سے ملے کہ جیسے اپنے ہی خاندان کا کوئی شفیق بزرگ ملتا ہے۔ میرے عقائد اس وقت اسلام سے بالکل ہٹے ہوئے تھے اور یہ قدرۃً اکبر جیسے دیندار شخص کے لئے یقیناً کشیدگی کا باعث ہو سکتا تھا اور پھر سن میں ہی اتنا فرق کہ وہ ۶۶ سال کے بزرگ سال خوردہ اور میں عمر کے بیسویں سال میں۔ اس پر بھی کوئی چیز اکبر کے حسنِ اخلاق و شفقتِ بزرگانہ میں حائل نہ ہو سکی اور پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے ہر طرح بے تکلف ہو گئے۔

اس وقت سے لے کر وقتِ رحلت ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء تک کہ کوئی ۱۰ سال کی مدت ہوتی ہے، اس بے کمال کو اچھا خاصہ قرب اس باکمال سے نصیب رہا۔ سال میں دو چار بار شرفِ نیاز عموماً حاصل ہو جاتا۔ زیادہ تر لکھنؤ ہی میں اور دو بار الٰہ آباد میں اور ایک بار پرتاب گڈھ میں بھی حاصل ہوا اور خط و کتابت تو کثرت سے رہتی۔ یہاں جو کچھ عرض ہو گا عمر کے اس دور سے متعلق عموماً مشاہدہ یا براہِ راست تجربہ ہی پر مبنی ہو گا۔ ہاں اس کے قبل کی بابت جو کچھ عرض ہو گا وہ دوسروں ہی کی روایات و بیانات سے ماخوذ ہو گا۔

جسمانی حیثیت سے حضرت اکبر بہت ہی لاغر اور کچھ منحنی سے تھے۔ سفید کی ہوئی آنکھوں پر عینک لگی ہوتی۔ داڑھی کچھ چھدری سی جس کے اکثر بال سفید۔ چہرہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو انہیں عوام سے ممتاز کرتی۔ آنکھوں میں ذرا چمک البتہ تھی۔ لباس بھی معمولی قسم کا پہنتے۔ سواری میں فٹن گاڑی رہتی۔ اور اسی کو لے دے کے ایک علامت امارت کی سمجھ لیجئے کہ یہی عشرت منزل انہی کی بنوائی ہوئی تھی۔ ایک لق و دق اور خوش قطع حویلی کسی زمانہ میں دعوتوں کے قہقہوں اور چہچہوں سے معمور، خوب آباد و پُر رونق تھی۔ لیکن اب خزاں رسیدہ اور ویران سی پڑی رہتی تھی۔ نہ دعوتیں نہ جلسے نہ مشاعرے، نہ ملنے جلنے والوں کا ہجوم۔ بس کبھی کبھی دو چار آدمی آجاتے۔ کھانا بھی اوسط درجہ کا کھاتے، نہ بہت امیرانہ اور نہ بالکل غریبانہ۔ کھانے کی مقدار بہت کم ہوتی اور زیادہ روغنی اور ثقیل غذاؤں سے بڑی احتیاط رکھتے۔ چائے وغیرہ کے بھی شوقین نہ تھے ——— جوانی کی تصویروں میں البتہ دیکھا کہ خاصے وجیہہ تھے اور چہرہ بھرا ہوا رکھتے تھے اور اس دور میں کھانا اور لباس بھی ذرا پُرتکلف رہتا۔

عام طور پر افسردہ اور غمگین ہی رہا کرتے۔ ایک بڑے ہوشیار اور چہیتے لڑکے ہاشم نامے کا سنہ ۱۹۱۳ء میں، عین اس وقت جب وہ سبزہ آغاز ہو چلا تھا، انتقال ہوا اور اس کی ماں، حضرت اکبر کی محبوب بیوی، اس سے قبل ہی رحلت کر چکی تھیں۔ یہ چھوٹی بیگم تھیں۔ بڑی بیگم سے کبھی بنی ہی نہیں۔ شروع ہی سے ان سے علیحدگی رہی۔ اسباب اور اندرونی حالات کا اللہ ہی کو علم ہے بہرحال یہ تذکرے ہی حضرت اکبر کے لئے کوفت کا باعث تھے۔ یہ خانگی صدمے اور پھر اس عمر میں دل بجھا دینے کے لئے خود ہی کیا کم تھے کہ بڑے صاحبزادہ (اور اب تو یہی ایک باقی رہ گئے تھے) کے عادات و اطوار اور پھر مذہبی عقائد نے حضرت اکبر کو اور بھی فکر و تشویش میں ڈال رکھا تھا۔ بہو اور پورا سمدھیانہ شیعہ گھرانے کا تھا اور اکبر اپنی ذات سے سخت قسم کے سنی۔ برابر اس طرف سے فکر و اندوہ میں رہا کرتے۔

آخر میں صحت بھی بہت گر گئی تھی اور روز بیمار رہنے لگے تھے۔ طبیعت بڑی حساس واقع ہوئی تھی۔ گرمی، سردی، شور و غل ہر چیز کا اثر بہت زیادہ لیتے۔

درمعمولی ادویے ضرر غذاؤں سے بھی شدید نقصان کا وہم قائم کر لیتے۔ طبیب کو علاج میں خاصی دقت ہوتی۔ یہ اس کے تجویز کئے ہوئے نسخہ میں برابر نفی نکالا کرتے اور دیکھئے فلاں دوا مجھے موافق نہیں آئے گی۔

ان ذاتی حالات کے علاوہ ملکی و ملی انتشار بھی حضرت اکبر کی جمعیت خاطر کو پراگندہ کئے ہوئے تھا۔ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان اپنے قدیم عقائد کو خیرباد کہہ کر تجدد، روشن خیالی، نیچریت اور فرنگیت کے سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے سے ذکی الحس شخص کو اس سے قلق ہونا بالکل قدرتی تھا۔ پھر سیاسی حیثیت سے بھی نہ انہیں یہ گوارا تھا کہ مسلمان بدستور انگریزوں کی سیادت و بالادستی قبول کئے پڑے رہیں اور نہ وہ حکومت سے مقابلہ کے لئے گاندھی جی کے اصول اور کانگرس کے طریق کار سے متفق تھے اور مسلم لیگ بھی جیسی کہ وہ اس وقت تھی کچھ ان کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ یہ سارا سماں دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتے اور گھٹ گھٹ کر رہتے۔ کھل کر کچھ کہنے کی یا اعلانیہ میدانِ عمل میں آجانے کی نہ ہمت اپنے میں پاتے اور نہ اسے کچھ زیادہ مفید یا مناسب ہی سمجھتے۔ کوئی دوسرا ان کے خیالات وجذبات کی ترجمانی میں کچھ لکھ لکھا دیتا تو اس سے بہت خوش ہوتے، خوب اس کی پیٹھ ٹھونکتے اور خود بس اشارے کنایے اپنی شاعری میں کرتے رہ جاتے اور کلام کے چہرے پر مزاح، ظرافت کا نقاب اسی غرض ومقصد سے ڈالے رہتے۔ کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برفبار
شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

ظرافت وشوخی کچھ تو اصلی وطبعی رنگ بھی تھا اور کچھ اس لئے بھی اختیار کیا کہ اس کی آڑ میں دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع مل جائے گا۔ وہی مرشد سعدیؒ کی ہدایت پر عمل کہ "سرِ دلبراں" بیان کرنا ہو تو پیرایہ "حدیثِ دیگراں" کا اختیار کرو۔

غرض ان کی مستقل افسردگی اور مستقل شکیبی، متعدد اور گوناگوں ذاتی وملی حالات کے مجموعہ کا نتیجہ تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مزاج میں جھلاہٹ اور طبیعت میں چڑچڑاپن ضرور پیدا ہو جاتا۔ اکبر کے ہاں یہ کچھ نہ ہوا۔ البتہ ایک مستقل اداسی سی رہنے لگی اور غم غلط کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو بنا لیا۔ مجلسوں اور صحبتوں میں گفتگو بہت زیادہ نہ کرتے کہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہ ملے اور نہ ایسے خاموش رہتے کہ بس دوسرے ہی بولتے رہیں اور یہ چپکے سنتے ہی رہ جائیں۔ گفتگو میں خود بہت کم ہنستے۔ دوسروں کو البتہ ہنساتے رہتے۔ نظم تو گویا ان کے گھر کی کنیز تھی اور تاثیر جیسے ہاتھ باندھے سامنے حاضر رہتے۔ شعر برجستہ اور فی البدیہہ کہہ ڈالتے۔ گفتگو عام تذکروں و وقتی چرچوں کے علاوہ جب اپنی مرضی کے مطابق کرتے تو یا تو اپنا کلام سناتے اور یا پھر توحید ومعرفت کا ذکر چھیڑ دیتے۔ آخر زمانہ میں ان کا سب سے دل پسند موضوع یہی تھا۔ لکچر نما طولانی گفتگو سے گھبراتے بات مختصر کہتے اور بات کا بیشتر حصہ یا عارفانہ حکیمانہ ہوتا اور یا پھر شعر وادب کے کسی نکتہ پر مشتمل۔ مخاطب کی دلجوئی کا بڑا لحاظ رکھتے اور بحث ومباحثہ مذہبی کیا معنی، سیاسی، علمی، شعری حتی الامکان کسی قسم کا نہ پیدا ہونے دیتے بلکہ جب دیکھتے کہ مناظرانہ رنگ آیا ہی چاہتا ہے تو کوئی لطیفہ یا چٹکلہ درمیان میں لا کر بات وہیں ختم کر دیتے۔

مذہبی عقائد میں بڑے پختہ تھے۔ معاصر علما میں سب سے زیادہ قائل ومعتقد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تھے۔ عام عقیدت بھی دیوبند سے زیادہ تھی۔ عملاً بھی مذہب کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نماز اوّل وقت پڑھنے کا خاص اہتمام رکھتے اور وقت آنے کے منتظر ومشتاق رہا کرتے۔ بار بار گھڑی دیکھتے جیسے کوئی عازمِ سفر اسٹیشن جانے کے لئے گھڑی دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے ملازموں وغیرہ کو ساتھ لے کر حتی الامکان چھوٹی سی جماعت کا بھی التزام رکھتے بلکہ نئے ملازم سے اسے رکھتے ہوئے کہہ بھی دیتے کہ بھئی نماز میرے ساتھ پڑھنا ہوگی۔ میں نے اپنے الحاد سے نکلنے کے بعد جب پہلی بار نماز ان کے ساتھ پڑھی ہے تو بے انتہا خوش ہوئے معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی دولت خود انہی کو مل گئی ہے۔ نماز کے بعد پھر تلاوت قرآن مجید کے شائق نہیں، عاشق تھے۔ دو دو وقت پابندی کے ساتھ قرآن پڑھتے۔ ایک بعد نماز فجر، دوسرے بعد نماز ظہر۔ عربی کی باضابطہ استعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ مجھے جو کچھ عربی آتی

تلاوت قرآن کی دولت سے آئی اور اب میں آیات قرآنی کا مفہوم بلا تکلف سمجھ لینے لگا ہوں۔

مذہبیت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار دہلی بستی نظام الدین اولیا میں جا کر خواجہ حسن نظامی کے مہمان ہوئے۔ درگاہ کے دروازہ ہی پر غالب کی تربت تھی۔ خواجہ صاحب نے بتا دیا۔ ان کے ساتھ فاتحہ پڑھنے چلے۔ مگر کچھ ہی دور چل کر رک گئے اور بولے کہ "میں نہیں جاؤں گا۔ یہ تو وہی ہے جو جنت کے لئے یہ شعر کہہ گیا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایسے شخص کی قبر پر میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔ اللہ میاں اس کے ساتھ جو بھی چاہیں معاملہ کریں۔"

تصوف کے بڑے معتقد تھے۔ لیکن ان کا تصوف بھی خالص اسلامی طرز کا تھا۔ پیرزادوں اور درگاہ کے مجاوروں والا نہ تھا۔ چادر، گاگر، عرس، سماع سب سے بچتے اور ملفوظات و کرامات کے بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ بس توحید ہی کا رنگ غالب تھا اور اسی کا اعتقاد برابر مستحضر رہتا۔ اپنے دوران قیام میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء پر روزانہ حاضری دیتے لیکن کسی بدعتی نذر و نیاز وغیرہ میں شرکت نہ کرتے۔ بس تربت کے پاس بیٹھ کر کلام مجید تو پڑھ لیتے بزرگوں کے قصص و حکایات بھی بیان نہ کرتے۔ بلکہ میں ان کے آخری زمانہ میں جب نیا نیا حلقہ تصوف میں داخل ہوا اور صوفیاء کی حکایات زیادہ بیان کرنے لگا تو اکبر صاحب انہیں حیرت ہی سے سنتے اور کبھی ایسے اینڈے بینڈے سوال کر دیتے کہ بیان کرنے والا جھینپ کر رہ جاتا۔ ایک روز میں فرید الدین عطار کی مثنوی "منطق الطیر" کا کوئی مقام جھوم جھوم کر سنا رہا تھا، پوچھ بیٹھے "ان صاحب کا مذہب کیا تھا؟" بس بجائے داد و تحسین کے یہ سوال سن کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اس سے بھی بڑھ کر سنئے۔ میں نے مثنوی مولانا روم کا مطالعہ نیا نیا کیا تھا اور اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ مثنوی ہی کا ذکر و فکر ہر وقت کا مشغلہ تھا اور اسی نشہ سے چوبیسوں گھنٹے مست رہتا تھا۔ یہی تذکرے حضرت اکبر کے سامنے شروع کئے۔ ایک بار سنا، کچھ ہلکی سی داد دی۔ دوبارہ سنا، چپ ہو گئے۔ تیسری بار جب پھر یہی تذکرہ میں نے چھیڑا تو بول اٹھے "کیوں صاحب اللہ میاں بڑے ہیں یا آپ کے مولینا روم صاحب؟" میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر جواب دیا کہ "ظاہر ہے خدا سب سے بڑا ہے" بولے کہ "آپ کی زبان سے ہر بار مولانا روم ہی کی بڑائی سنی، اللہ میاں کی بڑائی ایک بار بھی نہ سنی اس لئے پوچھنا پڑا" پھر بولے کہ "اس طرح سوچئے کہ اللہ میاں اپنی قدرت و حکمت سے آپ کو مولوی روم تک لائے یا مولانا روم نے آپ کو خدا تک پہنچا دیا؟" ـــــ غیرت توحید اس درجہ غالب تھی کہ اس کے آگے ہر عقیدت، ہر محبت، دب کر رہ گئی تھی۔

حد اور انتہا یہ ہے کہ نعتیہ مضامین کا سننا بہت دیر تک گوارا نہ کرتے اور جھٹ اس میں پیوند توحید کا ملا دیتے۔ ایک روز فضائل و مناقب رسول ؐ کا تذکرہ جاری تھا۔ دو چار منٹ تک تو دلچسپی لی اس کے بعد بول اٹھے "جی ہاں! ہمارے اللہ میاں کی کاریگری کا کیا کہنا۔ دیکھئے ایسا جامع کمالات رسول پیدا کر دیا" ـــــ توحید کے بعد دوسرے نمبر پر محبوب موضوع تذکرۂ آخرت تھا۔ یہی ذکر خود بھی کرنا چاہتے اور دوسروں سے بھی سننا چاہتے۔ گو ظاہر ہے کہ ان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہی انہیں کتنے اور کہاں ملتے۔

اس سے خیال یہ نہ گزرے کہ اکبر کوئی خشک قسم کے انسان تھے۔ جی نہیں، گفتگو بڑی دلچسپ کرتے اور علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی ہر عنوان پر گفتگو فرما لیتے۔ انگریزی کی استعداد اچھی خاصی تھی اور علاوہ انگریزی اخبارات کے اونچی انگریزی کتابیں بھی پڑھتے رہتے۔ بیشک بڑے کتب بینوں میں ان کا شمار نہ تھا۔ یعنی یہ نہ تھا کہ ہر وقت کتاب کے کیڑے بنے رہتے لیکن یہ بھی نہ تھا کہ اس مذاق سے کورے ہوں۔ مطالعہ میں اکثر فلسفہ کی کتابیں رکھتے خصوصاً روحانی فلسفہ کی اور اس بارے میں مدد انہیں اپنے صاحبزادہ سے مل جاتی۔ عشرت صاحب آخر کیمبرج کے گریجویٹ تھے اور وہ اپنے اساتذۂ کیمبرج

کی نئی نئی فلسفیانہ کتابوں سے اپنے والدِ ماجد کو برابر باخبر رکھتے۔ پروفیسر میکٹا گرٹ (Mactaggart) وغیرہ کی کتابیں میں نے پہلے پہل انھی کے ہاں دیکھیں۔ مذہب اور تصوف کی تائید میں خوب خوب نکتے ان لوگوں کے ہاں سے پیدا کر لیا کرتے۔ شاید ۱۹۱۸ء تھا جب میں نے برکلے (Berkeley) کے مکالمات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ برکلے کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "موجودیت" تحلیل ہو کر "معلومیت" پر پڑتی ہے اور اس کے سوا 'وجود' کا وجود بے معنی ہے۔ اکبر اس فلسفہ کو سن کر بڑے خوش ہوتے اور فرمایا کہ "یہی تو ہمارے صوفیہ شروع سے کہتے آ رہے ہیں کہ سارے موجودات کا وجود بس علمِ باری ہی میں ہے" — ایسے ایسے نکتے دن رات پیدا کرتے رہتے، پڑھتے کم تھے، سوچتے زیادہ تھے اور کتابی معلومات سے کہیں زیادہ تکیہ اپنے ذہن و دماغ پر رکھتے۔

گاندھی جی سے کچھ زیادہ حسنِ ظن نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کی تحریکِ ترکِ موالات کے کچھ زیادہ قائل تھے۔ میرے دل و دماغ پر اس وقت گاندھی جی کی عقیدت و عظمت پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور علی برادران تو ان کی صرف سیاسی رہنمائی اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے لیکن میں انہیں روحانی پیشوا کے درجہ پر رکھنے لگا تھا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں (عین تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے شباب کے وقت) حضرت اکبر سے ملا اور لگا گاندھی جی کی روحانیت اور روحانی عظمت کے قصے بیان کرنے۔ کچھ دیر بعد حضرت اکبر فرماتے کیا ہیں کہ "کیوں صاحب! ان کی انجمن میں شریک ہونے کے لئے پہلی شرط تو توحیدِ الٰہی کی ضرور ہو گی" — اس کا جواب بن ہی کیا پڑتا۔

گفتگو میں نازک موقعوں پر لطیفہ گوئی سے خوب کام نکال لیتے۔ ۱۵ء، ۱۶ء میں یو۔پی کے چیف سیکرٹری مسٹر رچرڈ برن تھے۔ بڑے صاحب اثر و اقتدار، فارسی کے ماہر اور اردو سے بھی واقف تھے۔ اکبر صاحب ملنے گئے تو ان سے بولا کہ "اب مسلمانوں نے بھی آزادی کے لئے بڑا ایجی ٹیشن شروع کر دیا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں" اکبر کو سچا جواب خلافِ مصلحت نظر آیا جھٹ سے بولے کہ "میں تو اور کچھ نہیں جانتا یہ جانتا ہوں کہ "آدم زاد" میں جب تک 'دم' نہ ہے 'آزاد' کہاں ہو سکتا ہے۔ 'آزاد' تو جبھی ہو گا جب 'دم' نکل جائے گا" انگریز حاکم کہاں تو غصہ میں تھا کہاں اس ادبی لطیفہ پہ ہنس پڑا۔

دوسروں کو چاہے وہ ان کے خورد ہی کیوں نہ ہوتے روکتے ٹوکتے نہیں عموماً لطیف و شستہ پیرایہ اختیار کرتے۔ لکھنؤ میں ایک بار ایک جواں عمر سرکاری عہدہ دار ملنے آئے اور یہ حریتِ نسواں کے بڑے علمبردار تھے، اکبر صاحب کا مسلک دوسرا۔ آزادئ نسواں کے مطالبہ کی تردید میں فرمایا کہ لوگ سید احمد خاں کو بڑا آزاد خیالی کا معلم بتاتے ہیں لیکن عورتوں کی آزادی سے تو وہ بھی پناہ مانگتے تھے" وہ صاحب بیچ ہی بول اٹھے کہ "سر سید کی رائے اس معاملہ میں تو بہت قابلِ ترمیم تھی" اکبر صاحب بس رکے اور اپنے سلسلۂ بیان کو اسی طرح جاری رکھتے ہوئے بولے "آپ نے سچ کہا سر سید کی رائے اس معاملہ میں کیا بہت سے معاملات میں قابلِ ترمیم تھی اور رائے و خیال کیا معنی وہ خود ہی قابلِ ترمیم تھے۔ دیکھئے زمانہ نے انہیں ترمیم کر دیا۔ وہ رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ آپ کو پیدا کر دیا"

عقائد میں اتنے پختہ و متشدد ہونے کے باوجود مذہبی بحث و مباحثہ کیا معنی مذہبی تبلیغ بھی براہِ راست اور کھلم کھلا نہ کرتے۔ بس اشاروں کنایوں میں کر جاتے۔ میرا دور الحاد تھا، ایک روز فرمایا کہ "کیوں صاحب آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی نا؟ اور عربی تو ایک اعلیٰ زبان ہے کیوں نہ اس سے مناسبت قائم رکھئے۔ جہاں اتنی انگریزی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں وہاں چند منٹ کے لئے قرآن مجید کو بھی کھول کر بیٹھ جایا کیجئے۔ ادب کی بہترین کتاب تو اسے یورپ والے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بس اس کے ادب کا خیال کر کے دو چار صفحے اس کے روز پڑھ لیا کیجئے۔ جن آیتوں میں شبہ پیدا ہوتا ہو انہیں جانے دیجئے اور سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں۔ کسی نہ کسی آیت کا مضمون تو آپ کے دل کو بھی کھینچے گا۔ بس ایسی آیت جب آ جائے تو اس کی دو چار بار تکرار کر لیا کیجئے۔ اور آپ کے لئے کوئی قید وضو وغیرہ کی بھی نہیں" — یہ ایک نمونہ ہے ان کے حکیمانہ اندازِ تبلیغ کا۔ خدا معلوم

کتنوں کی عاقبت اسی طریقہ پر سُدھار گئے۔

شیعہ عقائد سے بالطبع بیزار تھے لیکن اس کے باوجود شیعوں میں ان کے ملنے والے اور مخلصین کثرت سے تھے۔ عزیز لکھنوی کو دل سے عزیز رکھتے تھے پھر راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ سے بھی شیر و شکر تھے اور لکھنؤ جب آجاتے تو محشر، اثر وغیرہ شیعہ شعراء سے خوب خلا ملا رہتا ——— اور یہی حال ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ ہندو احباب ان کے الہ آباد و لکھنؤ میں بہ کثرت تھے۔

اقبال کے ملی جوش سے پوری طرح متفق نہ تھے۔ ان کا ترانۂ حجازی نیا نیا نکلا تھا اس کا ذکر چلا۔ بولے "اقبال جوان آدمی ہیں "سارا جہاں ہمارا" کہہ گئے۔ میں اس سن میں یہ ترنگ کہاں سے لا سکتا ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ سارا جہان کیسا کچھ بھی ہمارا نہیں، جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا"

اور پھر اس پر اور مصرع لگا کر اس کو قطعہ بنا دیا ؎

کالج میں ہو چکا جب امتحاں ہمارا — سیکھا زباں سے کہنا ہندوستاں ہمارا
رفعت کو کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے — ہندوستان کیسا، سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم — جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا

اکبر پر ایک الزام یہ چلا ہوا ہے کہ ان کی جزرسی حدِ بخل تک پہنچی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں کا سابقہ ان سے چوبیسوں گھنٹہ کا رہتا تھا انہیں کچھ اس کی اصلیت دریافت ہوئی ہو لیکن اپنے تجربے کی حد تک تو کہہ سکتا ہوں کہ الزام غلط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکبر مسرف نہ تھے اور بڑے فیاض اور عالی حوصلہ بھی وہ مشکل ہی سے کہے جا سکتے ہیں لیکن ان کے بخل کی کوئی شہادت میرے علم میں نہیں۔ خرچ کے موقع پر برابر خرچ ہی کرتے رہتے۔ دوست احباب کی دعوتیں کرتے رہتے اور مجھے تو الہ آباد یا پرتاب گڈھ جب طلب فرماتے تو کرایہ کے نام سے کوئی رقم ضرور بھیج دیتے۔

ذہانت و شوخی بلا کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ مضمون، نہ الفاظ، نہ قافیہ کوئی چیز انہیں سوچنا ہی نہیں پڑتی تھی۔ سب کی سب برا جمائے ہوئے حاضر ہیں۔ رنگِ کلام شوخ ہونے کے ساتھ ساتھ عارفانہ شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں شوخی رفتہ رفتہ گھٹتی گئی اور معرفت اسی نسبت سے بڑھتی گئی۔ آخر عمر کے رنگ کا نمونہ یہ ہے ؎

ذہن شائق رہا ٹھکانے کا — رنگ بدلا کیا زمانے کا
شوخیٔ عقل رہ گئی شک میں — کٹ گئی عمر مفت بکبک میں
کر دیا دل کو این و آں نے تباہ — مدوائے لا الہ الا اللہ

یہ نمونہ قطعہ کا تھا۔ غزل کے شعر بھی آخر عمر میں عموماً اس رنگ کے ہو گئے تھے ؎

نہیں تو کھو کر ہو گئی ہے کمپ میں شامل — مگر ہاں آسماں کی کچھ پرانی شان باقی ہے
بہت آراستہ ہم کو کیا تعلیم مغرب نے — بس اتنی ہی کسر سمجھو جو کچھ ایمان باقی ہے
سوا اس کے جو کچھ تھا ہو گیا سرکار میں داخل — خدا کا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے
ہوئے نیکی سے بیگانہ ترقی اس کو کہتے ہیں — فرشتے ہو گئے رخصت فقط شیطان باقی ہے

طبیعت میں ابھی تیزی سے سیری نہیں پاتا
یہ سچ ہے کٹ گئے ہیں پاؤں لیکن ران باقی ہے

———

وقار الملک

مولانا غلام رسول مہر

سرسید مرحوم کے رفیقانِ خاص محض اپنے ہی عہد میں بے مثال نہ تھے بلکہ ان جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں بہت ہی کم ملیں گی۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، اعظم یار جنگ، ان میں سے کون سی شخصیت ہے جو علم و فضل، مکارمِ اخلاق، وسعتِ نظر اور جذبۂ خدمتِ ملک و ملت میں انتہائی اونچے مقام پر فائز نہیں؟ لیکن ان میں سے وقار الملک محاسن کی فراوانی اور فضائل کی جامعیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ میں نے شخصیتوں کے اس نظامِ شمسی پر جب کبھی غور کیا ان میں سے دو کو بالکل یگانہ اور نادر پایا: ایک مولانا حالی اور دوسرے نواب وقار الملک۔ مولانا حالی بہت ہی پاکیزہ صفات انسان تھے۔ سراپا سوز و گداز، سراپا محبت و شفقت اور سراپا ایثار و انکسار، تاہم ان کا حلقۂ عمل صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک محدود تھا۔ وقار الملک کا دائرۂ کار بہت زیادہ وسیع تھا۔ انہوں نے ہر مقام پر حسنِ عمل کے جو نقوش چھوڑے، ان کی آب و تاب اب تک ہر صاحبِ بصیرت کا دامنِ نگاہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور جب تک فضائل کے اسلامی معیار اس دنیا میں قائم ہیں، یہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

ان کے انتقال پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے "معارف" میں لکھا تھا:

> نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان کا ذکر کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ احساسات بے شائبۂ ریب بالکل بجا اور درست تھے۔

میں نے نواب وقار الملک کو دسمبر ۱۹۰۶ء میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ جب میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ ہوشیار پور

میں اسلامیہ ہائی سکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کی غرض سے جالندھر سے آئے تھے۔ اُس زمانے میں جالندھر اور ہوشیارپور کے درمیان ریلوے لائن نہ تھی اور انہیں جالندھر میں ٹھہر کر گھوڑے گاڑی کے ذریعے سے ہوشیار پور جانا تھا۔ ہزاروں اکابر کے علاوہ طلبہ بھی استقبال کے لئے سٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے سب سے مصافحہ کیا۔ میرے ناچیز ہاتھوں کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ وہ منظر سینتالیس سال گزر جانے کے باوجود اب تک اس طرح آنکھوں کے سامنے تازہ ہے گویا کل پیش آیا تھا۔

قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ جسم دہرا اور گٹھا ہوا۔ اس وجہ سے وہ قدرے پست قامت نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا، سر منڈا ہوا، چہرہ گول، مونچھیں ترشی ہوئیں، ڈاڑھی متوسط اور بالکل سفید۔ اُس وقت اُن کی عمر ساٹھ کے قریب تھی۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو سر پر سرخ ترکی ٹوپی تھی، سبز سی گرم شیروانی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جو بھی ان سے مصافحہ کرتا، بڑے تپاک، حسنِ اخلاق اور محبت و شفقت سے ملتے، لیکن چہرے پر متانت کا غلبہ تھا اور تبسم کی کوئی جھلک نمایاں نہ تھی۔

اُس زمانے کے استقبال ویسے شاندار نہ ہوتے تھے، جن کی رسم ہمارے ملک میں ترکِ موالات کے دور سے پڑی اور تکلفات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن جالندھر میں وقار الملک کا استقبال بہت غیر معمولی جوش و سرگرمی سے کیا گیا۔ دُور تک اور دیر تک اُن پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔

واضح رہے کہ اُس وقت مجھے وقار الملک کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مقام بلند کے متعلق کچھ علم نہ تھا لہٰذا تقریب استقبال میں شامل ہونے کی خوش نصیبی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کے جن واقعات کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھتا رہا ہوں، اُن میں ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

وقار الملک ۱۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۲۴ - مارچ ۱۸۴۱ء) کو پیدا ہوئے۔ مشتاق حسین نام رکھا گیا۔ والد کا نام فضل حسین تھا، ذات کمبوہ، وطن سنبھل۔ والدہ امروہہ کی تھیں۔ مشتاق حسین صرف چھ مہینے کے تھے، جب ان کے والد نے وفات پائی۔ والدہ یتیم بچے کو لے کر امروہہ چلی گئیں اور یہی مقام مشتاق حسین کا وطن بن گیا۔ جو آگے چل کر وقار الدولہ وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ بننے والے تھے۔

چھ سال کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ کچھ عربی اور فارسی پڑھی۔ ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ پر مدرس بن گئے۔ پھر انکم ٹیکس کی محرری اور اہل باقی نویسی کی۔ بعد ازاں منصفی میں سررشتہ دار بن گئے۔ تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کر لیا، لیکن ایک واقعے کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا، ملازمت سے استعفا دے دیا اور سرسید کی سفارش پر ریاست حیدرآباد میں چار سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے بھی ایک مرتبہ بعض مقامی کشمکشوں کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ دوبارہ بلائے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں صوبہ ورنگل کے صوبہ دار، پھر معتمد عدالت و کوتوالی بنے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت میں پوری ریاست کا کاروبار عملاً انہی سے متعلق تھا ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں پنشن لے کر وطن واپس آ گئے اور قوم کے تعلیمی و سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ انہی کی کوشش سے مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ نواب محسن الملک کی وفات پر علی گڑھ کالج کے سکرٹری بن گئے۔ انہی کے عہد نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز بروئے کار آئی۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں ضعف اور علالت کے باعث استعفا دے دیا، لیکن قوم کے سیاسی مقاصد سے دلچسپی آخری دم تک جاری رہی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب میں پونے دس بجے وفات پائی اور امروہہ ہی میں دفن ہوئے۔

یہ حالاتِ زندگی کا سرسری مرقع ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان کے حالات تفصیلاً لکھوں، بلکہ اُن اولوالعزمانہ اخلاق کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں جو وقار الملک کی عظمت کا سرمایہ تھے اور جن کی بنا پر حق شناسوں کے نزدیک ان کا ماتم قوم کا ماتم قرار پایا۔

وقار الملک نے ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ کی مدرّسی سے مستقل زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اُس وقت کسی کو اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس وجود میں خدا نے کیسی نادر صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ سرسیّد علی گڈھ میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے، جب وقار الملک کو سر رشتہ دار عدالت کی حیثیت میں ان کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ سرسیّد علی گڈھ سے تبدیل ہو کر بنارس گئے تو وقار الملک کی سروس بُک میں انہوں نے جو رائے لکھی، وہ اس عظیم الشان انسان کے گوناگوں اوصاف کا پہلا اعتراف تھا۔ فرماتے ہیں:

> منشی مشتاق حسین سر رشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی، نہایت کارگزار، نہایت فہیم اور نہایت زود نویس و خوش خط افسر ہے اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا یقین ہے، جیسا کہ اپنی موت پر . . . . . جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے، اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔

واضح رہے کہ سرسیّد حد درجہ متوازن رائے کے آدمی تھے اور ان کی طبیعت میں احتیاط بہت تھی، تاہم وہ وقار الملک کے یگانہ اوصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کوئی بھی وصف "نہایت" کی صفت کے بغیر بیان نہ کیا، حالانکہ اُس وقت تک وقار الملک معمولی سر رشتہ دار تھے، اور سر رشتہ داری کے محدود دائرے میں ان کی تمام قابلیتیں ٹھیک ٹھیک بروئے کار نہ آ سکتی تھیں۔

علی گڈھ کے جج بریملے صاحب بھی وقار الملک کی لیاقت و محنت کے بہت معترف تھے۔ وہ تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ مسٹر مارٹن جج مقرر ہو کر آئے۔ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ مسٹر بریملے کی ہر رائے سے اختلاف کریں گے یہاں تک کہ ہر اس شخص کو بُرا سمجھیں گے جو مسٹر بریملے کی نظروں میں اچھا تھا۔ چونکہ بریملے کی نظروں میں وقار الملک معزز تھے لہٰذا مارٹن صاحب نے موصوف کی سروس بُک میں بے وجہ خراب ریمارک درج کر دیئے۔ وقار الملک کو اپنی راستی کا یقین تھا، لہٰذا مارٹن صاحب سے کہا کہ یا تو ریمارک واپس لے لیجئے یا اس کے وجوہ بتائیے۔ مارٹن صاحب نے کوئی توجہ نہ کی تو وقار الملک نے باقاعدہ درخواست پیش کر دی، جس میں لکھا:

۱۔ عدالت کے تمام وکلاء، پورے عملہ اور حاضرین سے میرا حال دریافت کیا جائے۔

۲۔ میں نے اب تک جو کام کیا ہے، اس کا جائزہ لیا جائے۔

۳۔ میری تحریر کردہ کیفیتوں سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے، انہیں بلا کر میرے چال چلن کی صفائی کی تصدیق کر لی جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ میرے لئے خطرناک ہے، لیکن تحقیقات کی غرض سے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

مارٹن صاحب اس پر رضامند نہ ہوئے تو وقار الملک نے کلکٹر کے سامنے درخواست پیش کر دی اور اس میں لکھا، تحقیقات سے جج کا اعراض خود ظاہر کرتا ہے کہ ریمارک صحیح نہیں، تاہم آپ بھی میرے پیش کردہ ذریعوں کے مطابق پوری چھان بین کرا لیں۔ ہر طرح اطمینان ہو جائے تو یہ ریمارک میری سروس بک سے قلمزد کر دیا جائے۔

مشہور مثل ہے: "آں را کہ حساب پاک است، از محاسبہ چہ باک"۔ وقار الملک اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ان کا عہدہ جج کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا، تاہم سچی بات میں جج کا مقابلہ کرتے وقت ایک لمحے کے لئے بھی تامل نہ ہوا اور یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب انگریزوں کے سامنے کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کا حوصلہ نہ تھا۔

۱۸۷۵ء میں وہ مسٹر کالون کلکٹر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا، مقررہ معمول کے مطابق دفتر سے اُٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کالون صاحب کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے منع کیا تو انہوں نے کہا کہ نماز مذہباً مجھ پر فرض ہے۔ میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی وجہ سے کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ کالون کام سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نماز کا مخالف

تھا۔ مجبور ہو کر وقار الملک نے درخواست دے دی کہ یا تو ادائے نماز کے لئے تھوڑی سی غیر حاضری معاف کر دی جائے۔ یا غیر حاضری کے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا چھ مہینے کی رخصت دی جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی صورت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھ لیا جائے یعنی پندرہ سال کی ملازمت سے دست برداری پر وہ بے تکلف تیار ہو گئے، لیکن نماز میں تاخیر گوارا نہ کی۔

سرسید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وقار الملک کو لکھا:

> نماز جو خدا کا فرض ہے، اُس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے، جو کبھی بخشا نہ جائے گا تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق پڑاق استعفا دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا، نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ آتی۔ فاقہ مرجاتے، نہایت اچھا ہوتا۔

چھ مہینے کی رخصت ہی کے زمانے میں سرسید نے سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد کو لکھا اور وقار الملک کے لئے حیدر آباد میں چار سو روپے ماہانہ کی ملازمت کا انتظام ہو گیا۔ لطف یہ کہ جس انگریز افسر نے نماز پر جھگڑا کر کے رخصت اور استعفے تک نوبت پہنچائی تھی، اس نے آپ کی کارگزاری کے متعلق نہایت اچھی رائے دی اور اُس میں اقرار کر لیا کہ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے، مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنی رائے بدلنے پر راضی نہ ہوئے، میں اس صورت کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ انہیں دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔

حیدر آباد میں وہ بہت جلد ترقی کر کے محکمۂ عدالت و کوتوالی کے معتمد بن گئے اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہو گئی۔ عدالت و کوتوالی کے صدر المہام یعنی وزیر متعلقہ نواب بشیر الدولہ تھے، جنہیں بعد میں آسمان جاہ کا خطاب ملا اور وہ مدار المہام بن گئے تھے۔ وقار الملک نے بہت جلد ان کا خاص اعتماد حاصل کر لیا۔ اُس زمانے میں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کم سن تھے اور انتظامِ ریاست کے لئے کونسل آف ریجنسی بنی ہوئی تھی، جس کے صدر امیر کبیر نواب شمس الامراء تھے۔ وہ نظام کے قریبی رشتہ دار ہوتے تھے۔ بشیر الدولہ ان کے بھتیجے تھے شمس الامراء کو ایک طرف سر سالار جنگ وزیر اعظم سے کاوش تھی، دوسری طرف بھتیجے سے مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری تھی اور وہ ہر اُس شخص کے مخالف تھے جو بشیر الدولہ اور سالار جنگ کے نزدیک معتمد علیہ تھا۔ اس وجہ سے وقار الملک ان کے عتاب کا ہدف بن گئے۔ ایک موقع پر وقار الملک رخصت لے کر وطن جاتے ہوئے گوالیار اترے اور وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کو بشیر الدولہ کا ایک ذاتی پیغام پہنچا دیا۔ اس بنا پر شمس الامراء کو ناراضگی کے اظہار کا بہانہ مل گیا اور سالار جنگ کو ریاست کے عمومی مصالح کی بناء پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ وقار الملک کو ملازمت سے برخاست کر دیں۔

وقار الملک کے لئے یہ واقعہ سراسر تعجب انگیز تھا، لیکن کچھ مدت بعد ایک دوست کے ذریعے سے سالار جنگ کی مجبوریوں کا علم ہوا تو بے تکلف لکھ دیا کہ میں اپنے فائدے کے لئے شمس الامراء اور سالار جنگ کے درمیان کسی کشمکش کا روادار نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی برطرفی بہ دل و جان منظور ہے۔

نواب بشیر الدولہ کو جب یہ علم ہوا کہ وقار الملک صرف ان کے ایک ذاتی کام کی وجہ سے عتاب میں آئے اور ملازمت گنوائی تو فوراً پیغام

بھیجا کہ میں اتنی ہی تنخواہ پر اپنی جاگیر میں ملازم رکھتا ہوں۔ وقار الملک نے لکھ دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں۔ اگر سالار جنگ کے سوا کوئی اور مجھے موقوف کرتا تو میں نئی پیشکش قبول کر سکتا تھا۔ جب انہی کی وجہ سے مجھے نوکری ملی اور انہی نے موقوف کیا تو میری محبت اس امر کی مقتضی نہیں کہ میں حیدر آباد میں دوسری جگہ تعلق قبول کر لوں۔

وقار الملک ملازمت پر آمادہ نہ ہوئے تو نواب بشیر الدولہ نے لکھ بھیجا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہیں، میں پانسو روپیہ ماہانہ وہاں بھیجا جائے گا۔ وقار الملک نے یہ پیشکش بھی قبول نہ کی اور لکھ دیا کہ میں نے نواب ممدوح کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام نہیں دی۔ جس کے معاوضے میں ان کا اس قدر نقصان جائز سمجھوں۔ آخر بشیر الدولہ نے وقار الملک کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب پر چار ہزار روپے کی رقم نیوتے کے طور پر بھیج دی۔ وقار الملک نے ایک عزیز دوست کی وساطت سے ضروری سمجھا کہ سالار جنگ سے استصواب کئے بغیر یہ رقم قبول نہ کریں۔ وہاں سے جواب آیا کہ روپیہ واپس کر دو۔ چنانچہ وقار الملک نے بے تامل واپس کر دیا۔ اس عزیمت عمل پر سر سالار جنگ نے لکھا کہ مولوی مشتاق حسین نے جو کچھ کیا وہ کسی دوسرے سے نہ ہو سکتا تھا۔ امید ہے کہ ایک دن وہ اپنے اس عمل نیک کا صلہ حاصل کریں گے۔

ان واقعات کے بعد سالار جنگ نے خود لکھا کہ میں چار سو روپے ماہ بہ ماہ آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ حالات بدل جائیں گے تو آپ کو نعم البدل حاصل ہوگا اور اس امداد کو "بہ صیغۂ راز" رکھیں۔

وقار الملک کو سالار جنگ کا یہ خط ملا تو چار سو روپے کی پیشکش کے سلسلے میں دو باتیں عرض کیں: اول یہ کہ روپے کی مقدار کم کر دی جائے، اس لئے کہ میں کفایت سے گزارہ کر سکتا ہوں۔ دوسرے اسے قرض سمجھا جائے۔ زمانہ میری مساعدت کرے گا تو یہ قرض ادا کر دوں گا۔

سالار جنگ نے چند ہی روز میں سررشتۂ مال کا دستور العمل وقار الملک کے پاس اصلاح و نظر ثانی کے لئے بھیج دیا۔ اس طرح ذاتی امداد سرکاری کارگزاری کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت وقار الملک نے چار سو روپے ماہانہ کی رقم بہ اطمینانِ خاطر قبول کی۔

وقار الملک اخلاقی جرأت میں ضرب المثل تھے۔ جس زمانے میں سالار جنگ اعظم دولتِ آصفیہ کے مختارِ کل تھے۔ نواب بشیر الدولہ عدالت اور کوتوالی دونوں کے صدر المہام یا وزیر تھے اور وقار الملک ان کے ماتحت معتمدی (سکرٹری شپ) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالار جنگ نے ایک معاملے کے متعلق وقار الملک کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی اور فرمایا کہ اسی رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیر الدولہ کے روبرو پیش کر دیں۔ وقار الملک اگرچہ سالار جنگ کے آوردہ تھے۔ اپنی ملازمت اور ترقی کو انہی کا احسان سمجھتے تھے، لیکن صاف کہہ دیا کہ میری رائے یہ نہیں۔ سالار جنگ کو یہ امر طبعاً ناگوار گزرا۔ وقار الملک گھر واپس آئے تو فوراً ملازمت سے استعفاء پیش کر دیا اور حیدر آباد سے روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سالار جنگ نے انہیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ واقعی اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کا مجھ کو کوئی حق نہ تھا۔

سالار جنگ وفات پا چکے تھے اور بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی مدار المہامی کا زمانہ تھا۔ وقار الملک وقتاً فوقتاً ان سے صاف صاف کہتے رہتے تھے کہ میں کسی خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کروں گا، لیکن مجھے ریاست میں ملازمت نواب سالار جنگ کی وجہ سے ملی اور میری عقیدت کا پہلا مرجع انہی کا خاندان ہے۔

سر آسمان جاہ بہت نیک دل، نیک مزاج اور شریف انسان تھے۔ بعض اوقات لوگ تملق و خوشامد سے کام لے کر ان سے ایسے احکام جاری کرا لیتے، جو انتظامی نقطۂ نگاہ سے مناسب نہ تھے۔ وقار الملک نے ایک عرضداشت ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں صاف صاف لکھ دیا:

> جن کو حضور دشمن سمجھتے ہیں، اُن کو بھی خدمتوں پر رکھا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی کریم النفسی تو ہے یا یہ کہ ان کی خوشامدوں کا خیال کیا جاتا ہے یا طبیعت کی کمزوری ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اول قوت و انتظام ضعیف ہوتا ہے، دوم انٹریگ (سازباز) بڑھتی ہے، سوم دوسرے عہدہ داروں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ

غلط طرزِ حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہے۔

وقار الملک سرسید کے بہت معتقد تھے۔ اور اُن کی بڑی عزّت کرتے تھے، تاہم بیسیوں معاملات میں انہوں نے سرسید کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا۔ یہاں تک کہ ایک معاملے میں سرسید نے ان کے اختلاف پر ناراض ہو کر لکھ دیا:

مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں۔ جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا، کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی۔

کالج کے انتظامات سنبھال لینے کے بعد وقار الملک نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا، جس کا اندازہ غالباً عام لوگوں کو نہیں۔ سرسید کے زمانے میں حالات مختلف تھے اور وہ کالج کی ترقی کے پیشِ نظر انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف کی دلجوئی میں بہت مبالغہ فرماتے تھے۔ محسن الملک کے زمانے میں انگریزی سٹاف مختارِ مطلق بن گیا اور انتظامی معاملات میں سکرٹری یا ٹرسٹی بڑی حد تک بے دست و پا رہ گئے۔ وقار الملک نے چارج لیتے ہی ٹرسٹیوں کی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس پر پرنسپل اور انگریزی سٹاف نے ایکا کرکے استعفوں کی دھمکی دے دی۔ یو۔پی کے گورنر نے انگریزی سٹاف کی تائید کی اور خاصی نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ وقار الملک نے ٹرسٹیوں کو ہم رائے بنا کر فیصلہ کرایا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی مختاری تسلیم نہ کرے گا اور ملازم کی حیثیت میں نہ رہے گا۔ وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دانش مندی، تدبّر لیکن پوری استقامت سے اس معاملے میں کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ گورنر نے اپنی رائے بدل لی اور سٹاف وقار الملک کی رائے کے مطابق کام جاری رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی یہ پہلی زبردست اور کامیاب کوشش تھی۔

وقار الملک کی سکرٹری شپ کے زمانے میں کالج کی مذہبی فضا بہت خوشگوار ہو گئی۔ انہوں نے ایک موقع پر طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نماز کی خوبی یا اس کا وجوب یا اس سے اخلاق کی اصلاح کا بیان مقصود نہیں، لیکن:

یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی نگہبانی کہاں تک میری اپنی ذمّہ داریوں میں سے مہتم بالشّان ہے۔ آپ یہاں کس غرض سے آتے ہیں؛ ظاہر ہے کہ تعلیم، اخلاق کی اصلاح اور آداب حاصل کرنے کے لئے ہیں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ امورِ دینی کی طرف مائل کروں۔ ۔ ۔ ۔ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیّر پذیر ہے۔ پُرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں۔ قومی عمارت کے پُرانے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں اور اب یہ بار آپ کو اپنے کندھوں پر اُٹھانا پڑے گا۔ یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اُس آئندہ وقت کے لئے تیار ہوں۔ کوشش کیجئے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے لئے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوں۔ وہ روش اختیار کیجئے اور ایسے پاک و صاف مذہبی طریقے پر چلئے کہ مسلمان آپ پر بھروسا کریں۔ حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہو سکتے اگر آپ اسلامی شعار کے پابند نہیں۔

وقار الملک سے پیشتر نماز میں غیر حاضری پر جرمانے کا قاعدہ جاری تھا۔ موصوف نے نماز کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ منسوخ کر دیا اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اس طرح نماز کا استہزا ہوتا ہے، مگر یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ غیر حاضریٔ مسجد کے لئے اب کوئی سزا نہیں۔ سزا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو صاحب حاضرِ مسجد نہ ہوں گے اور نماز کی پابندی نہ کریں گے، ان کو کالج سے علٰحدہ ہو جانا پڑے گا۔ میں یہ کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دے۔

وقار الملک اپنے ماتحت ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے۔ اُس پر قرضہ ہوتا تو اُس کا بندوبست کرتے۔ اُس کے لڑکوں کے لئے وسائلِ معاش کا خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرا دیتے۔ بیواؤں کے لئے وظائف مقرر کراتے۔

جب وہ ورنگل کے صوبہ دار تھے، ایک موقع پر دورہ کرتے ہوئے ایک گاؤں سے گزرے، جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے گاؤں کے قریب پہنچتے ہی سواری روک لی اور اپنے تمام ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جن کا جی چاہے آگے چلا جائے۔ خود ڈاکٹر کو لے کر صبح سات بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ تمام مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ اُن کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرایا۔ ساڑھے تین بجے فارغ ہو کر جائے قیام پر پہنچے۔

ایک دورے میں ایک اہلکار جو ساتھ تھا اُسی مقام پر بے پتا ہو گیا۔ وقار الملک نے منزل پر پہنچ کر پولیس اور سواروں کو چاروں طرف روانہ کر دیا۔ شام کے چار بجے تک اس کا پتا نہ مل سکا۔ وقار الملک نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا۔

جب وہ حیدر آباد میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے تو عوام اور اکابر سے ملاقات کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر کر رکھی تھیں۔ جہاں عوام سے ملاقات کرتے تھے، وہ جگہ کوٹھی کے صحن میں پھاٹک کے قریب تھی۔ ایک شامیانہ نصب کرا لیا تھا اور نشست گاہیں خاصی پُر تکلف تھیں۔ جہاں اکابر سے ملاقات کرتے تھے، وہاں لکڑی کی معمولی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عوام سے ملاقات کی جگہ پہنچ جاتے اور سب سے آزادانہ ملتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے۔ اس اثناء میں کوئی بڑا عہدہ دار آ جاتا تو فرماتے کہ ملاقات کی جگہ چل بیٹھیے۔ عوام سے فارغ ہو کر بڑے لوگوں سے ملتے۔

وقار الملک کو اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر رہنے کا موقع ملا اور وہ خاصی بڑی تنخواہ پاتے تھے لیکن ان کی آمدنی کا بڑا حصّہ عزیزوں اور غریبوں کی امداد یا قومی کاموں میں صرف ہوتا۔ خود عموماً تنگ دست رہتے اور سادگی میں گزارہ کرتے۔

وہ وقتاً فوقتاً اعلیٰ حضرت نظام کی پیشی میں جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر اعلیٰ حضرت نے ان کا چشمہ دیکھا تو فرمایا: مولوی صاحب! چشمے کا فریم تو بہت خراب ہے۔ وقار الملک نے عرض کیا:

> پیرو مرشد! اگر اتفاق سے یہ چشمہ کہیں رہ جائے تو لوگ اسے لا کر دے دیں گے کیونکہ اس کی قیمت صرف چھ آنے ہے اور یہ مشتاق حسین کی آنکھیں ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے نہایت قیمتی اور اعلیٰ درجے کا فریم بنوا کر وقار الملک کو مرحمت فرمایا۔ اسے انہوں نے کبھی استعمال نہ کیا اور ایک عزیز یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا۔

مستند بیان ہے کہ محسن الملک نے حیدر آباد میں اپنے لئے کوٹھی بنوائی تو اُس کا فرنیچر ولایت سے تیار ہو کر آیا، جس پر ستر ہزار روپے خرچ ہوئے۔ وقار الملک کو اپنا مکان بنوانے کی بھی استطاعت نہ ہوئی۔ سر آسمان جاہ کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے انہیں ایک کوٹھی عنایت فرما دی۔

جب وہ سر آسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے تو اُن کی پتلون میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

اُن کی طبیعت میں انکسار بہت تھا۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک واقعہ پیش کروں گا۔ حیدر آباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا ان کے ہاں سے مقرر تھا۔ ایک مرتبہ شدّت سے بارش ہوئی۔ ملازم رات کا کھانا نابینا کو پہنچا نہ سکا۔ وقار الملک کو بڑی دیر میں معلوم ہوا تو خود اُٹھے اور پیدل کھانا نابینا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھوکا بیٹھا تھا۔ بہت بڑبڑایا اور خفا ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لے کر آیا ہے۔ جا ہم نہیں کھاتے۔ وقار الملک نے بڑی خوشامد اور منت سماجت سے اسے راضی کیا اور کھانا کھلا کر واپس آئے۔ تاہم اس پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود کھانا لے کر آئے تھے۔

دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر بے اختیار اشک بار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علالت کے باعث پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں سُنا کہ ان کی صوبہ داری میں بارش نہ ہونے کے باعث عوام کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور غریبوں کے مویشی مر رہے ہیں۔ فوراً پہاڑ سے واپس آئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد

ایک چھپّر کے نیچے بیٹھے ہوئے اطرافِ علاقہ کی رپورٹیں دیکھ رہے تھے، جو دردناک اطلاعوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کاغذات اٹھلتے، پڑھتے اور روتے جاتے۔ دو گھنٹے میں خدا کی رحمت سے ابر آیا۔ اس تدر پانی برسا کہ چھپّر ٹپک پڑا اور وقار الملک بھیگ گئے۔ پھر اُٹھے۔

یہ وقار الملک کے فضائل و مکارم کی صرف چند جھلکیاں ہیں، جو سرسری طور پر پیش کردی گئی ہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر غور فرمائیے کہ وہ کس درجہ نادر و یگانہ شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے انتظامی کارناموں پر بحث کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ دولتِ آصفیہ پچاس سال تک جس نظام حکومت پر چلتی رہی، اس کی تربیت اور اجزا میں سب سے بڑا حصہ وقار الملک ہی کا تھا۔ انہوں نے حکومت کو خودسری کی بلندیوں سے اُتار کر حقوقِ جمہور کی نگہبانی و پاس داری کی راہ پر لگایا اور اپنے حُسنِ عمل سے وہ نمونہ پیش کیا۔ جس کی مثالیں کسی بھی ملک میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرسیّد کے رفیقوں میں ایسے جامع اوصاف کا آدمی دوسرا کوئی نہ تھا۔

نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبد الحق

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انہوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مرد و زن باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزوں اور فرانسیسیوں کا کوئی قابلِ ذکر نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ اکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

ان سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنتِ دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہ گئے۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ یہ کبھی آپس میں لڑ مرتے، کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر حملے کر بیٹھتے۔ کبھی مل کر غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی غداری کرکے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس کمک کے معاوضے میں مصارف کے نام سے گراں قدر رقمیں لیں اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتھیا لیا۔ کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اس کے حریفوں سے مل کر اس کے علاقے پر چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لئے رکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پر ایک ایک ٹکڑا ساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کرکے مقبوضہ علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و اطوار، ان کی زبان، غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں نامانوس اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"یکے از جانورانِ دریائی کہ گاہ گاہ بساحل نمودار می شود"

اس میں "گاہ گاہ بساحل نمودار می شود" کا کلمہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کرتے تھے کہ کاریگر اچھے ہیں، بندوق،

توپ، گھڑی وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحبِ علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا وفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انہوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انہوں نے ابتدا میں جس مکروفریب، جعلسازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے چہیتے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اعتقادات، تہذیب، روایات اور علم و فضل پر غرّہ تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انہوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا پلٹ دی اور با وجود زوالِ سلطنت کے انہوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور نجس سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور دیکھ چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسلمانوں میں دو چار ہی خاندان ایسے تھے جنہوں نے اس کشمکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے بڑھے اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رُخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اٹھے جن کے نام اپنے تبحرِ علم و فضل کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ (۱۲۴۳ — ۱۲۵۲ھ) سرکارِ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے گئے گورنر جنرل لارڈ منٹو کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین حسین (دادا سید حسین) اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کردہ مدرسہ عالیہ میں علومِ مشرقیہ کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ بنٹنک کے اے ڈی کانگ اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بطور سفیر یا پولیٹکل ایجنٹ امیرانِ سندھ و افسر اعلیٰ جہاز رانی دریائے سندھ متعین ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا مگر امیرانِ سندھ اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم لیتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے جب کبھی کوئی عربی شعر یاد آتا یا آیت قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے۔ جب لوگ تعویذ مانگنے آتے تو وہ اس ٹوکری میں سے نکال نکال کر دے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بدنفس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ یہ شخص دراصل انگریز ہے مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی تھے گورے چٹے لوگوں کو یقین آگیا اور شورش برپا ہو گئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست بہار چوبیس پرگنہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دوبار لیجسلیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے۔ حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران میں انہیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگالہ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت بھی ننھیال بدھ کی جنم بھومی ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی۔ سید صاحب ۱۸۷۵ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرائی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی زبان

سے ہوئی تھی کہ حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ فارسی عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور پٹنے اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۶۱ء میں میٹرکیولیشن کی سند حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں درجہ اول میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اثر سے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک کر دیں۔ لیکن نوجوان سید نے جو کالج کے کمروں سے تازہ تازہ نکلا تھا اپنے علمی ذوق کی بناء پر اس سر رشتے کو پسند نہ کیا جو تمام سرکاری سر رشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزرنے پر بھی اب تک ناقدر دانی کا شکار ہے۔ اس نے ڈپٹی کلکٹری پر معلمی کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی اور اس طرح انہیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں ان کو لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و اشغال اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علماء و اکابر کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا۔ ان تمام باتوں کا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پر اثر ہونا ضروری تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں انہیں لکھنؤ ٹائمز کی اڈیٹری کے ذائض بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقداران اودھ کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے نہر سردہ نکالنی چاہی۔ اس سے تعلقداران اودھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے تعلقدار اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اخبار پانیر نے (جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا) اس تجویز کی تائید میں پر زور آرٹیکل لکھے۔ لکھنؤ ٹائمز کے نوجوان اڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ ایسی نکتہ چینی اور وہ بھی تعلقداران اودھ کے اخبار میں، حکومت کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین معرضِ عتاب میں آ گئے اور انہیں اڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر لارڈ نارتھ بروک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہمانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار رؤسائے عظام کی کی جاتی تھی۔ کل گورنران صوبجات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا مہمان سمجھیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریزیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس ہم رکاب تھے۔ لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل ایل بیرو چیف کمشنر کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل بیرو نے تعلقداران اودھ و دیگر امرائے شہر سے ملاقات کرائی منجملہ ان کے پروفیسر سید حسین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور ان کی علمی و ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔ نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مردم شناس اور قدر دان تھے اور ان اصلاحات کے پیشِ نظر جو وہ حیدر آباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب حیدر آباد واپس پہنچوں تو تم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدر آباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابلہ میں کم تر اور ناقابلِ اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انہیں رنج ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انہیں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے اصرار کر کے بلا بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس و پیش کرتے رہے اور آخر ۱۸۷۳ء میں حیدر آباد آئے اور آئے بھی تو تین مہینے کی رخصت لے کر۔ حیدر آباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔

ابتدا میں نواب صاحب نے انہیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ (مددگار پیشی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدر آباد میں انگریزی معتمد (سیکرٹری) ایک انگریز مسٹر اولی فینٹ تھا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی جو دیسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدر آباد کنٹنجنٹ کے مصارف کی رقم کئی سال سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے زرخیز علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام، ان کے امراء اور اہلِ حیدر آباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا تھا جو دولتِ آصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہرا رہا اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی مگر زبردست مارے اور رونے نہ دے کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔

سرسالار جنگ نے اس مہم کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ آرزو تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ بہت بگڑتی تھی۔ نواب سالار جنگ نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بچانے میں جو بے نظیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریز ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے ورنہ کبھی کے ختم کر دیئے جاتے۔ برابر اور اسی قسم کے دیگر اہم معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری مسٹر اولی فینٹ انگریزی حکومت کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ نزلہ بر عضوِ ضعیف ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک معتمد و جائنٹ سیکرٹری تھے گویا شریک جرم تھے۔ حیدرآباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرض عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیئے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے سن کر فرمایا کہ سید حسین کے نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دے دوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدر دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

۱۸۷۶ء میں نواب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور معتمد صیغۂ متفرقات مقرر فرمایا جس میں سر رشتۂ تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب حضور نظام میر محبوب علی خان مسند نشین ہوئے اور سر لائق علی (عماد السلطنت) مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملاتِ حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے معتمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میر مجلس خود بہ نفس نفیس اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان) تھے۔ اس سال جشن نوروز میں ان کو علی یار خان مرتمن جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں بہ تقریب جشن نوروز عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں سالگرہ مبارک کے موقع پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء/۱۳۰۶ھ) میں مولوی صاحب اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے دستِ مبارک سے (اپنی زبان میں) ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

”نواب عماد الملک بہادر۔ آپ کے واسطے خدمت خانگی پرائیویٹ سیکرٹری کی مقرر کیا ہوں
جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اردو اور بات
کو مخفی رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہوگی وہ آپ کے پاس لکھ کر بھجوا دوں گا
یا خود آؤں گا۔ مگر آپ کل دس بجے صبح میں آکر نذر دینا۔“

(دستخط یا محبوب)

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ روز دوشنبہ شب سہ شنبہ

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن) ممالک محروسہ سرکار عالی کے عہدے پر متمکن ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ بہ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کئے گئے لیکن انہوں نے نظامت تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں بالطبع تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سفارشوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و نااہلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامت تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت و اقتدار بھی واجبی ہی واجبی ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ عہدہ دوسرے فوائد سے بھی محروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم و فضل اور اعلیٰ سیرت کے ایسا تھا کہ ان کا اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امراء و وزراء ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۳۴ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ

تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور سررشتۂ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس فرضِ منصبی کے ان کے اثر اور صحبت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کے بڑے قدردان تھے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف اس کتب خانہ کے لئے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس برِ عظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہوگیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ نواب عماد الملک کتاب کے بڑے قدردان تھے اور اس قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آگئی تو لئے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے وہ آپ پر بہت جھنجھلاتے اور اسے اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے چار پانچ عربی کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مطلوبہ مدار المہام سرکار عالی (نواب وقار الامرا) کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار! مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو جتنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اس کی سن گن پہنچ گئی۔ انہوں نے مدار المہام سے کہا کہ کتابیں واپس فرمادی جائیں، میں انہیں خود خرید لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چارگنی قیمت وصول کروں گا۔ مدار المہام نواب وقار الامرا نے جو بہت بامروت، فیاض اور سیر چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتہ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری افضل العلما نواب حمید اللہ خان (فرزند مولوی سمیع اللہ خان) تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نول کشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپے روپے لکھی ہے تو انہیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عماد الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے دیکھنا ہو یہاں آکر دیکھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلما صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح نسخہ مل جائے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سے نادر کتابیں طبع و شائع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلادِ یورپ میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے ماہانہ اس کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۴۹ھ (۱۹۲۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال بعد پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدرآباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی۔ لیکن اس نے جو قابلِ قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"مجھے ایک مدت تک بالالتزام ان کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے

طالب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ان کی واقفیت عامہ، ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے انہیں ادب عربی میں یکتائے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے سادے اور خالص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے۔"

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جامعۂ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:

"دوسرا امر جس کی طرف کارپردازان جامعہ علمیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔ عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حق تحکم حاصل ہے۔"

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی:

"میں نے اورنگ آباد میں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہوئی۔ بنا پر کالج کے بعد آپ نے ان طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے جنہوں نے عربی زبان لی تھی اور ہر سال بغیر یاددہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چک آ جاتا تھا۔"

مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا:

"جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی، وہاں پرانی علمی کتابوں کی تباہی دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد دے کر ان کتابوں کے خریدنے اور محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خط لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی تباہی پر میں رو رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ تھی مرحوم کی کریم النفسی اور علم کی شیفتگی۔"

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تقاضے کے آمادہ ہو جاتے تھے۔ وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحاق خان آنریری سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

"نہایت وثوق کے ساتھ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا ہے جس کی تصانیف اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو۔ ... اگر آپ کی کوشش سے

اس مشہورِ زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم و نثر جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا اور جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا —

بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے خود ایک ہزار روپے اس وقت دیتا ہوں اور بوقتِ ضرورت ایک ہزار اور دوں گا۔"

اس کے بعد نواب اسحاق خان بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار دئیے۔ سرکارِ عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خان صاحب (فضیلت جنگ) سے پانسو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اسی طرح وہ اہلِ علم کی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود الحسن ٹونکی مرحوم ایک عالم متبحر تھے۔ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی۔ بہت روشن خیال اور نہایت زندہ دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفینِ اسلام پر ایک کتاب کیا انسائیکلوپیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک جلد مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علما نے اسے بہت پسند فرمایا تھا۔ دوسری جلد کی نوبت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگِ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے نواب عماد الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فوراً اعلیٰ حضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدر آباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا اور ایک معقول تنخواہ ان کے لئے مقرر ہو گئی اور ایک مختصر سا عملہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے چند حصے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی مجلدات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبار میں پڑی سڑ رہی ہیں جن کا اب کوئی قدر دان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرینکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انہیں یقین نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فردِ واحد کا کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری نے دکن کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے دولتِ آصفیہ سے چھ ہزار روپے منظور کرا لئے۔

مولوی عبداللہ خان نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ آصفیہ ہی میں رہتے تھے نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سرو آزاد اور مآثر الکلام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت فرمائے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کرا دیا۔

ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے اور انہوں نے اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے منصب (یعنی دوامی وظیفہ) مقرر کر دیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے اگر کسی تعلیم کے شوقین نادار طالب علم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلی سے ایک نوجوان عبدالرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسنِ تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ بھیجا کہ تمہیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ وہ بھی ایسے خوددار اور

تشریف النفس تھے کہ جواب میں لکھا۔ یہاں حسبِ دل خواہ انتظام ہوگیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ کی ٹیم کھیلوں کے دورے پر جارہی ہے۔ میں نے کہا ہاں فلاں فلاں مقام پر جائیں گے۔ یہ سُننے کے بعد کئی سو روپے ان کے سفر خرچ کے لئے بھیج دیے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ درجے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے فرنچ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلاتکلف گفتگو کرتے تھے۔ جب امیر امان اللہ خان ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر ہی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے متعلق شرر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعراء کے سادہ اور پُرجوش کلام کے بہت مداح تھے اور مولّدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قائل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں لکھنؤ کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انہیں لفظی صنائع سے جس پر لکھنوی شاعری کا دارومدار تھا اور عامیانہ خیالات سے بہت چڑ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو، فارسی، عربی) میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالی نے اردو کو متین نثر عطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار جنہیں وہ ان کا شہ کار سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سناتے تھے لیکن کہتے تھے میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائع بدائع سے دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا "نہیں!" لیکن آخر لکھنؤ میں رہتا ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد مقالے اور مضامین اور نظمیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہوگئی ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انہوں نے "اصطلاحاتِ علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چوراسی پچاسی برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے قدیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آراء پر جو تنقید فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشاپردازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہلِ زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب الرائے اور نامور مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد سے مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکرِ رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دوربین اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ انہی نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سر سید احمد خان کے پیرو تھے۔ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت پُرزور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعثِ خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ اکثر اسی خیال کے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکومتوں کی بدنظمی، ابتری، ناانصافی، رشوت خواری، ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں نے ریلیں جاری کیں، تار گھر، ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا انسداد کیا، تعلیم پھیلائی اور مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ سفر کی آسانیاں پیدا ہوگئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہوگیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو گیا جسٹس رانا ڈے تک نے اپنے ایک خطبے میں انگریزوں کی آمد کو مشیتِ ایزدی اور ملک کے حق میں باعثِ خیر فرمایا تھا۔ ابتدا میں گوکھلے اور گاندھی

بھی یہی کہتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگرس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگرس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انہیں حکومت میں ذمہ داری کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعہ اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور عملی تحریکوں میں پڑنے سے ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے نہ ہٹے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنہوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے تھے ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریز حکومت سے اصل نقصانات کیا پہنچے اور بعض اسے آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں جنٹلمین کی ضرورت ہے۔ یہ وہی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ایرے غیرے کامیاب ہو کر آ جاتے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دیے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انہیں بلگرام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصباتی شرفا کی خو بو ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے یہ شخص شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شرافت کی پرکھ بھی عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی تھے جو کہہ گئے ہیں ؎

کچھ اور آدمی بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آدمی بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور" دونوں اشراف ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک نہ صرف وقت کے تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی سمجھتا تھا اور دوسرا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا۔ جہاں تھا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تصنع نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا فرنیچر اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا لیکن زمانۂ ملازمت میں اور خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امراء و وزراء ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی خورد کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و شوکت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور رعب داب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وہ بہت صاف باطن بامروت اور منکسر المزاج تھے۔ خاص کر اہلِ علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف علمی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص آ جاتا تو ملنے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل جنگ ان سے ملنے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل جنگ نشست کے کمرے میں آئے تو مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کیا نیچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے (جھٹکا دکن میں ایک ادنیٰ قسم کی سواری ہے)؟" یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "تم اہلِ علم کی توہین کرتے ہو۔ تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔" غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ پانی پانی ہو گئے۔ عقیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورٹی کو (پلیٹ فارم) میں سیڑھیوں کے عین سامنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سواریوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملہ میں نواب عماد الملک بہت

[illegible] تھے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے۔ [illegible] پہلے کبھی پندرہ سال اور کبھی بیس [illegible] کپڑوں میں ہو۔ وہ خود بھی [illegible] اور [illegible] پہنچنے کے ان سے ملنے [illegible] میں ادب [illegible] مرحوم کی [illegible] تھی اور ادبی علمی گفتگو میں ان کا انداز تخاطب بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم [illegible] اس وقت وہ [illegible] کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

اردو زبان و ادب سے انہیں [illegible] لگاؤ تھا چنانچہ حیدرآباد آنے کے بعد [illegible] سال ۱۸۸۸ء میں ایک ماہانہ رسالہ [illegible] جاری کیا۔ یہ رسالہ [illegible] سال تک [illegible] جاری رہا [illegible] اس میں متعدد مضامین شائع ہوئے ان میں سے [illegible] موضوع پر تھے [illegible] تعلیم یافتہ [illegible] میں [illegible] یہ بات [illegible] ہے کہ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور انگریزی ہی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ نواب عمادالملک [illegible] لکھتے تھے۔ ایسے لوگوں سے جن کی زبان اردو ہے یا جو اردو زبان جانتے تھے انگریزی میں بات نہیں کرتے [illegible] جب کبھی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جو اردو نہیں جانتا تھا [illegible] انگریز تو اس سے اس کی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ [illegible] ایک صاحب جو [illegible] برٹش انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے اور بعد میں بنگال میں وزیر ہو گئے تھے نواب صاحب سے ملنے آئے اور آتے ہی انگریزی میں گفتگو شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا میری زبان انگریزی نہیں اور نہ غالباً آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آتا ہے تو میں اس سے مجبوراً انگریزی میں بات چیت کر لیتا ہوں ورنہ میں انگریزی زبان میں بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت کرنی پڑی۔

وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ نہ صرف حصول علم میں مانع ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طریق تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت [illegible] حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن ۱۹۱ [illegible] میں کیا ہے۔ جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> "ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت ادق زبان ہے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی مضامین مثلاً حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کو اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ بیشتر تعداد طلبہ کو [illegible] گیارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس عرصۂ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے [illegible] انگریزی بقدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں سادے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں ...... جغرافیہ جانتے ہیں اقطار دنیا کے نام جانتے ہیں [illegible] ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، ندیوں، پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کو نشان دے سکتے ہیں۔ یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ سے [illegible] واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ [illegible] انگریزی سلطنت سے پہلے [illegible] اورنگزیب [illegible] ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے [illegible] پڑھ لکھ نہیں سکتے [illegible] مذہبی زبان [illegible] حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ [illegible] زیادہ تعجب [illegible] بجز اس کے [illegible] مغربی دنیا کے تمدن [illegible] ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں [illegible] اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ آپس کی گفتگو، تقریبات [illegible] انگریزی زبان میں کرنا [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ [illegible] انگریزی وضع کو پسند کرتے ہیں [illegible] اپنی زبان میں [illegible] انگریزی

لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز نہیں آتی، سورے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے کلمہ توحید تک معلوم نہ تھا کہ کیا شے ہے اور کس کا نام ہے۔"

کالجوں میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغربیہ سے ہمیشہ ناآشنا رہیں گے...... اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامعہ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطۂ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسبِ امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولتِ علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلسِ انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر ہمیں انجمن کی صدارت کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ ادبی علمی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انہوں نے فوراً کاغذ قلم لے کر فارسی زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب سید راس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا ان کو کھٹکھٹائیے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ سید صاحب سفر سے واپس آئے تو کہا۔ آغا خان سے ملا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملئے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ پونے آ کر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہز ہائی نس آغا خان تپاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی دستی میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہو گی۔ ایک روزنامچہ محشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدر آباد سے وطن (شمالی ہند) جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلہ میں ایک خط نواب صاحب رامپور (نواب حامد علی خان) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فرماں روائے ریاست رامپور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالہ کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انہوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انہیں یہاں لائیے۔ مجھے بے حد مسرت ہو گی۔ میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آ کر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب سے صدمہ پہنچا ہے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیئے دار کرسی میں باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انہیں بمبئی تک لے آئیے پھر میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے۔ بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے "آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے" کہتے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں روزانہ ہزاروں روپے

صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمۂ تعلیم یا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدر آباد آنا پڑتا تھا۔ قیام حیدر آباد کے ان ایام میں نواب صاحب سے ملتا رہتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے کیا امپیریل بنک آپ کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابلِ اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا ڈاک خانہ آپ سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط دے دیتے تھے کہ یہ ڈاک میں ڈلوا دیجئے گا۔ میں نے مکان پر آکر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک سے مجھے اطلاع دی کہ نواب عماد الملک نے دو ہزار کا چیک انجمن کے نام پر بھیجا تھا جو انجمن کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انجمن کے حساب میں درج ہو گی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر آئے گا اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ جو منع فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خان کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ وہ نوجوان ہیں اور نظم و نسق ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلا وجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفا مروت میں آکر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انہوں نے حیدر آباد آنے کے بعد جو مخزن الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا؛ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے برسبیلِ تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلیٰ ارکانِ ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان مصاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، رحمدلی، قدردانی، سیاست و تدبر کاردانی اور عالی دماغی کے بے حد مداح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دیئے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیتے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے سرکاری کارروائیاں کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے" یہ سننا تھا کہ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اعلیٰ حضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ امرا کے حضور میں خفیف سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولتِ آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے پیشرو بادشاہوں کے درباروں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہلِ دربار مولوی صاحب کی یہ صاف بیانی سن کر دنگ

رہ گئے اور ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب عماد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" نواب صاحب نے عرض کیا کہ "حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی۔" اعلیٰ حضرت جب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور ہر دل عزیز فرمانروا کے فرزند اور جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان کا حال سنئے کہ اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی دعوت تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ مہاراجہ پٹیالہ یا مہارانی ناگپور یا کوئی اور رئیس ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاز میں اپنے محل میں ایک بڑا ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں [illegible] بہت حریت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ "یہ صحیح نہیں ہے، اسلام نے اس معاملہ میں [illegible] کڑی شرطیں رکھی ہیں [illegible]۔" اعلیٰ حضرت کو اختلاف کی تاب کہاں۔ سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا "آپ یہاں سے چلے جائیے۔" نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز صبح اعلیٰ حضرت کے معتمد پیشی غیاث الدین (اظہر جنگ)، نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدرآباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف سیکرٹری کی ممبری کی جو تنخواہ اب تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ "وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں اس کا ایک حصہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔" اور اسی روز حیدرآباد کو الوداع کہہ کر یوپی تشریف لے گئے۔ یہ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ متلون، مغلوب الغضب، متکبر، بے اصول، گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان۔ جو شخص نہیں [illegible] ان کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعامی نہ ہوکر ایک زمانہ گزر گیا ہے لہٰذا کل صبح دس بجے شریک [illegible] مسرت [illegible] ایک خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں "ایسی باوقعت خدمت سے [illegible] دست بردار ہونا تمام مسلمانانِ ہند کے لئے ایک بدقسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر، صاحب رائے، تجربہ کار، واقف اسرار [illegible] دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا محالات سے معلوم ہوتا ہے۔" یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے [illegible] وہی شخص ان کو [illegible] اسناد لکھی ہیں، دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدرآباد سے [illegible] کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب [illegible] صاحب ریذیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک [illegible] معمولی شخص نہیں [illegible] مسلمانانِ ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومتِ ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو ناروا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ فوراً ان کی واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے۔ [illegible] نہیں جانا چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے۔ جس روز حیدرآباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، مائی ڈیئر ڈیئر مائی ڈیئر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی [illegible] کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک مرتبہ [illegible] امداد انجمن پیش گاہ اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ

امداد منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا ”اسے قبول نہ کیجئے، انکار کر دیجئے۔ ریاست کے خزانہ پر سب کا قبضہ ہے“ (اس وقت صدر المہام فنانس سر اکبر حیدری کلانسی تھے) میں نے اسے خلاف مصلحت خیال کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدر آباد اس برِ عظیم کی سب سے بڑی اور باعظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات تمام تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے عروج کو پہنچ گئی۔ شخصی سلطنتیں سازشوں کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھولی پھلی۔ سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم نگراں اٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کشمکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کو ابھارا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لیے کذب و افترا، بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ سازشوں کا یہ جال ایسا پیچ در پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی پھنس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بند جس سے نگاہ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

انھوں نے اپنے ذاتی رسوخ اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور یار فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار اعلیٰ حضرت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی سیکرٹری نواب ۔ امین جنگ ۔ سے ناخوش ہوگئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں امین جنگ کی جگہ آپ کے فرزند محمد ہاشم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ حضور امین جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرمائیں (پیشی کی خدمت عرصہ بعد میں صدر المہامی پیشی ہوگئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ دار اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند تہنیت جنگ کو کوتوال شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوتوال شہر کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار تو کیا کوئی امیر یا وزیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ تہنیت جنگ اس کام کے اہل نہیں کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے لیکن نواب عماد الملک اپنی جگہ قائم رہے۔ وہ آخر تک حیدر آباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔

برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا اسی طرح اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے یونیورسٹیز کمیشن، ہندوستانی یونیورسٹیوں کے حالات کی تحقیق اور اصلاح کے لئے بہ صدارت سر ٹامس ریلے مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب بھی مقرر کئے گئے تھے اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۰۳ء میں بہ عہد لارڈ کرزن امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں لارڈ مارلے نے انھیں بار دیگر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۸۹۹ء میں جب کہ اجلاس کلکتہ میں ہوا اور دوسری بار جب ۱۹۰۰ء کا کانفرنس کا اجلاس رامپور میں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں مدراس یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور رنج بھی کہ ان کی امت کا ذکر نہیں۔ کہ انھوں نے انگریزی معاشرت کی گرویدگی کا اظہار کیا اور نہ پینے۔ ہے ان کے حالات بہت کم لکھے گئے۔ تہنیت جنگ، سید محمد عماد الملک، نواب عماد الملک کے دستخط ان کا

میں نے یہی رنگ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی اُبلے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے؟ اب تو نوکر، وہ کھانے بھول گئے نام تک یاد نہیں، نہ ان کے پکانے والے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدردان۔ اب جو کھانے ہم کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغلئی۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں لیکن ان میں کتنے ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور آب و نمک کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ نواب عماد الملک بہت نفیس اور لذیذ کھانے کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے۔ جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ وقار آباد لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑا۔ رات کے کھانے پر وہ بار بار ٹوکتے تھے کہ کیسے جوان ہو تم سے تو میں بڑھا ہی اچھا ہوں تم سے دُگنا کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر کچھ میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن یہ مرغن کھانا جس میں گھی پانی کی طرح تھا مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بے چینی رہی۔ صبح ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کی ٹھانی۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا اور ٹھہرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا میرے سامنے آتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ نواب صاحب میرے کم کھانے پر ہنستے اور طعن کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک نہ سنی اور حیدرآباد جا کر ہی دم لیا۔

نواب صاحب کھانا تو بہت اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور مزے کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ بعض چیزیں وہ بھی پکا لیتے تھے۔ ارہر کی دال جس میں مرچ کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ قدردان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میٹھے چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر تیز تھی۔ تیز شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صحیح فرمایا۔ اس وقت پرانی شکر نہ ملی تھی نئی استعمال کرنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت باورچی تھے۔ نواب صاحب کے ملازموں میں وہ پہلا شخص تھا جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے رابطہ تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ ان سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان تھے اور ان کے لئے بڑی بڑی تکلیف گوارا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

پرانے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اسی کے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سرسید احمد خان کی تھی۔ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک مددگار عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جو ان تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حساب کی تنقیح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس ذکر سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے معتمد علیہ ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا در حقیقت اپنی سیرت، کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت قابلِ قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہلِ تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرے اور تقیے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ یہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب رامپور مرحوم حامد علی خان بھی جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عماد الملک بہادر کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں مجھے ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ تقیے کا تھا۔ حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے۔ ... نیز یہی دین آبائی کہ وہ نہایت

بے تعصب شخص تھے۔ کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے مطلق کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "مولوی شبلی نعمانی مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عماد الملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت تھی جو آپ نے ادا کی۔" سررشتہ تعلیم بہت وسیع محکمہ ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا تقرر ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انہوں نے کبھی مذہبی پاسداری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت فراخ دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں کی جو اشاعتِ تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انہیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گفتگو میں اکثر محاسنِ اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام اہلِ حدیث رہ گئے ہیں، کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانہ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش داعی اور واعظ اشاعتِ اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آ کر مہمان رہتے اور ان کے والد ان کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں مسلمان کر لئے تھے۔ یہ نومسلم بڑے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ مثلاً کھیت میں کوئی ہل چلا رہا ہے تو اذان سنتے ہی ہل جہاں تھا وہیں رہ جاتا۔ کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پر ہے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی شخص قبر پر پھول چڑھائے یا اسی قسم کی کوئی اور بدعت کرے۔ اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیادار پیروں نے آنا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے توہمات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسمٰعیل کے زمانے کے تقوے اور سچے اسلامی جوش کے بہت قائل تھے۔ لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر آخر عمر تک تازہ رہا۔

میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کے قلب پر ... ہو گئی تھی۔ ان چیزوں کو وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خاں صاحب فضیلت جنگ، صدر الصدور سے قرآن مجید کی فصاحت کے دقیق نکات بیان کر رہے تھے۔ دوران گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظِ قرآن پاک کی موسیقیت اور ترنم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیۃ الکرسی کے الفاظ میں ایسی حسن ترتیب ہے کہ وہ بہاتر پر ڈالے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقا نے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت ثنا خواں تھے۔ غالباً انہی کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ رہنما مذہب کے میدان میں آئے گا۔ کچھ مدت بعد جب گاندھی جی میدانِ سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے نواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے قبضہ میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ انہوں نے یک لخت اپنی طرز زندگی اس طرح بدل دی جیسے سانپ اپنی کینچلی بدل دیتا ہے۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں رہتے۔ گھٹنوں سے اوپر ایک چھوٹی سی دھوتی باندھ لیتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا بڑا سا رومال یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہو گئی اور وہ دفعتہً موہن داس کرم چند گاندھی سے "مہاتما گاندھی" ہو گئے۔ ہندو خلقت ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہام ربانی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ عوام کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی بجائے ہندی، ہندوستانی اور اردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو تو ہندو مسلمانوں کو خلافت کے مسئلے پر ایسا لگایا کہ ان کے سرگروہ اور علماء گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست

میں ایسا ہوا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خطوں کا جواب باالتزام دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی فونٹین پن استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعفِ بصارت کا بھی عارضہ تھا انھوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریریں کسی دوسرے سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔

میانہ قد، کھلا گندمی رنگ، خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے۔ آخر زمانے میں ترک کر دیا تھا۔ سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حقہ پیتے تھے، پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ سگریٹ سگار بہت ناپسند کرتے تھے۔ کہتے تھے جہاز کے سفر میں ایک بار سگریٹ سگار پینے کی کوشش کی۔ اس کی بو سے بہت تکلیف ہوئی اور حلق میں بھی خراش معلوم ہوئی۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی یعنی حیدرآبادی لباس پہنتے تھے۔ جب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کر دی۔ پتلون پہنن نگی یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قوی بہت اچھے تھے۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آ گئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۳ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں:-

۱۔ سوانح سر سالار جنگ۔ یہ نواب سر سالار جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ ۱۹۰۰ء میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔ سر سالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست دانی، معاملہ فہمی، مردم شناسی اور قدر دانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سر سالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا تھا۔

۲۔ DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ڈبلیو ولنٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسائل عماد الملک۔ اس میں نواب صاحب کے وہ مضامین، خطبات، مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں تحریر کیے۔

۴۔ انگریزی مضامین، مقالات و خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ۔ یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابلِ قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لیے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر و احادیث اور لغات اور سلف کے ادب کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑا احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور تولتے تھے۔ اس کے ساتھ لفظی پابندی کا بھی خیال رکھتے۔ ان کے پیشِ نظر پکتھال کا انگریزی ترجمہ تھا۔ مسودہ پاس تھا۔ ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور بطور پروف کے چھپوا بھی لیا تھا۔ نظرِ ثانی کے وقت مولوی عبداللہ صاحب سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ افسوس نہ پیرانہ سالی، ضعفِ بصارت اور ناگہانی صدمے سے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبارات سے بے مثل تھی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر مشغلے اور شعبے میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آ جاتی ہے جو رواداری، اعتدال اور اطمینانِ قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور کٹھن گھاٹیوں کے یہ خرچ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسنِ ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی طرزِ معاشرت اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوقِ علم اور ذوقِ تہذیب سے عاری ہوتے گو دنیاوی حیثیت سے

ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہوتا، ملنے سے ابا کرتے اور ایسے اصحاب سے ان کا برتاؤ خشک اور اُچٹتا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اہلِ علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ ان سے گھل مل کے باتیں کرتے۔ ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی، خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم یا طالب علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے علم و ادب کی اشاعت، اہلِ علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا اور اس سے انہیں سچی خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول، باوضع اور پابند اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم مل ہو گئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روش زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات، اپنے بزرگوں کی خودداری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصّے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں ان کا منتخب کلام سناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے دیکھ کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالی نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مظہر جان جاناںؒ نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطۂ جواہر" تھا۔ اس کا دلّی کی شاعری پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پرانے صاحبِ ذوق اور پڑھے لکھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی مجرّب نسخہ ہاتھ لگا وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوئی لیکن جیسی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے سررشتہ کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری کے لئے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام نکالنا پڑتا ہے اور کبھی لڑ جھگڑ کر اور اپنے رسوخ سے کام لے کر منظوریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور غیور اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی ربط اور دوڑ دھوپ یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توقع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے انوکھے حالات اور ماحول کی آسائش، ان کی تعمیرات سے بیزاری اور نئی طرز معاشرت نے تن آسانی پیدا کر دی تھی اور کام کا وہ ولولہ جو ابتدا میں تھا بعد میں نہ رہا۔ لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض، فاضلانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے مثل کردار کی وجہ سے وہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

محمد حسین خاں زبیری

یہ تذکرہ ہے لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (علیگ) کے ٹی - سی آئی ای - ایم اے (کنٹب) پی ایچ ڈی (گوٹنجن) ڈی ایس سی (الٰہ آباد) سر آئزک نیوٹن اسکالر (کیمبرج) پروفیسر پرنسپل ایم اے او کالج پرووائس چانسلر، وائس چانسلر، ریکٹر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ممبر لیجسلیٹو اسمبلی - ممبر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ممبر وائسرائے ڈیفنس کونسل کا

برصغیر ہند و پاکستان میں جب مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں تو عرب، عراق، ایران وغیرہ ممالک سے اکثر قبائل بھی بغرض ملازمت و تجارت یہاں آنے لگے ان میں سے اکثر اسی ملک میں آباد ہو گئے ان ہی قبائل میں ایک عربی النسل قبیلہ بھی تھا جس کی نسبت حضرت زبیرؓ سے کی جاتی ہے اس قبیلہ کے افراد سندھ، ملتان، پنجاب، دہلی اور دہلی کے متصلہ علاقوں میں آباد ہوئے اور کنبوہ کے لقب سے مشہور ہوئے - ان کی جو بستیاں دہلی میرٹھ، مراد آباد، امروہہ، سنبھل، بریلی اور مارہرہ وغیرہ میں قائم ہوئیں ان میں زمینداریاں بھی تھیں اور شاہی ملازمت و اعزاز کا سلسلہ بھی جاری تھا - ان میں بڑے بڑے علما، صوفیا، مصنفین، شعرا اور اطبا و مدبرین پیدا ہوئے جن کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں - مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب "خزانہ عامرہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خدمات شرعیہ دار الخلافہ دہلی مثل قضا و افتا اکثر بہ قوم کنبو تعلق داشت و دارد"۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا - وہ ۱۸۷۷ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے اسی سال ایم اے او کالج علیگڈھ کا سنگ بنیاد رکھا گیا - اور اس مادر علمی کا وہ فرزند رشید جو اس کی خدمات کے لحاظ سے اپنے معاصرین اور رفقا میں فرد فرید ہے ساتھ ہی ساتھ اس عالم وجود میں منصۂ شہود پر آیا - ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ معین الدین احمد محکمہ مال میں ملازم تھے اور انہوں نے تحصیلداری تک ترقی کی

وہ جو مثل ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ڈاکٹر صاحب مشکل سے چار برس کے ہوں گے کہ ان میں یہ عادت تھی کہ گھر میں بچوں کے کھلونے جو ٹوٹ جاتے تھے ان کے ٹکڑے جمع کر کے ان کو پھر جوڑنے کی کوشش کرتے اور اکثر کامیاب ہو جاتے تھے - جب عمر تعلیم کے قابل ہوئی تو میرٹھ کے قومی مدرسہ میں ان کا داخلہ کرا دیا گیا یہ مدرسہ مکتبی طرز کا تھا جسے اسی قبیلہ کے ایک بزرگ حافظ محمد روح اللہ خاں نے جاری کیا تھا اور

اس کے لئے جائداد وقف کردی تھی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا اسی مدرسہ میں مولوی بشیر الدین احمد بانی اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ و ایڈیٹر اخبار "البشیر" بھی مدرس تھے اور وہ ڈاکٹر صاحب کے چچا تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں داخل ہوئے ڈاکٹر صاحب کو ابتدا ہی سے ریاضی میں بہت شغف اور دلچسپی تھی گرمیوں کی راتوں میں جب صحن میں لیٹتے تو انگلیوں اور ہتھیلی کے ذریعہ حساب کے سوال حل کرتے رہتے تھے۔ اور بسا اوقات رات کا بیشتر حصہ مطالعہ میں گزار دیتے تھے۔ چونکہ اوائل عمر ہی سے ضبط و نظم اور ترتیب اشیاء کا ملکہ فطری تھا اس لئے ان کے والد نے تیرہ سال کی عمر میں ہی تمام انتظام خانہ داری ان کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ نہایت اہتمام سے اشیائے خانہ داری منگاتے اور تالا کنجی میں رکھتے تھے۔ الماری کے کواڑ پر الجبرا کے فارمولے لکھ دیئے تھے جب الماری کھولنے جاتے ایک نہ ایک فارمولا یاد کر لیتے تھے۔

جب وہ مڈل کلاس میں آگئے جس کا امتحان بھی ان دنوں یونیورسٹی سے متعلق تھا تو ان کے ایک ہندو ہم جماعت نے فخریہ کہا کہ ضیاء الدین میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ خاموش رہے اور اپنے کام میں مصروف لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو ریاضی کے پرچے میں اقلیدس کے چار سوال تھے جن میں سے کوئی دو سوال کرنے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چاروں سوال نہایت عمدہ طور پر حل کئے اور لکھ دیا کوئی سے دو دیکھ لئے جائیں۔ اس طرح وہ اپنے حریف سے بازی لے گئے اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے اور ریاضی و تاریخ میں امتیاز حاصل کیا۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں وہ ایم اے او کالج سے ملحقہ اسکول میں داخل ہوئے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جو پہلے سے وہاں پڑھتے تھے ہاسٹل میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کے نمایاں ہم جماعت سیٹھ یعقوب حسن مرحوم اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب تھے جب انٹرینس کے امتحان کا وقت قریب آیا تو اساتذہ میں خیال آرائیاں شروع ہوئیں کہ دیکھئے امتحان میں اوّل کون آتا ہے ہیڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ یعقوب حسن اوّل آئے گا اور سیکنڈ ماسٹر عبدالحق کے متعلق قیاس آرائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ انہوں نے بھی یہ چہ میگوئیاں سن لیں اور اپنی محنت و کوشش میں اضافہ کر دیا۔ اور امتحان میں سب ساتھیوں پر بازی لے گئے اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے ان کو کالج سے لینگ میڈل اور سررشتہ تعلیم سے سرکاری وظیفہ ملا۔ چونکہ اس وقت تک کالج میں سائنس کی تعلیم کا انتظام نہ تھا اور ڈاکٹر صاحب سائنس کورس لینا چاہتے تھے اس لئے مجبوراً علی گڑھ چھوڑ کر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں داخل ہو گئے یہاں بھی انٹر میڈیٹ اوّل درجہ میں نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ پھر علیگڈھ واپس آگئے اور سنہ ۱۸۹۵ء میں اعلیٰ ریاضی کورس لے کر بی اے درجہ اوّل میں پاس کیا اور ان کو اس کے صلہ میں اسٹریچی میڈل دیا گیا۔

قومی بہبود کا جوش ان کے سینہ میں فطرت نے ودیعت کیا تھا چنانچہ اس کا مظاہرہ مختلف صورتوں میں طالب علمی ہی کے زمانے سے ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ میر ولایت حسین صاحب جو ان کے استاد تھے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ :۔

"ڈاکٹر صاحب نے بی اے کی تعلیم کے زمانے میں ہی نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا وہ کھیلوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور علیگڈھ کی دوسری تحریکوں مثلاً ڈیوٹی سوسائٹی یا قیام مدارس کی تحریک میں حصہ لیتے تھے چنانچہ ان کی کوشش سے مارہرہ میں مارسین اسلامیہ اسکول قائم ہوا۔"

یہ قصبہ ایک قدیم مردم خیز بستی ہے جو کبھی مشرقی علوم کا گہوارہ تھا لیکن لوگوں کو جدید تعلیم سے نفرت تھی۔ یہاں کنبوہ اور سادات بلگرام کی آبادی نمایاں تھی۔ چونکہ علی گڈھ کے قریب واقع ہے ڈاکٹر صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک قرارداد کے بموجب یہاں کا تعلیمی سروے کیا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اپنے اعزا کو آمادہ کر کے یہاں ایک جدید مدرسہ قائم کرا دیا۔

بی اے کا امتحان دینے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب کا تقرر کالجیٹ اسکول میں بمشاہرہ سو نہ روپیہ ماہوار اسسٹنٹ ماسٹری پر تقرر ہو گیا نتیجہ نکلنے کے بعد ان کو اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی کی جگہ مل گئی جہاں پہلے چالیس روپیہ اور بعد کو ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ہو گئی۔ سر سید نے

بجٹ رپورٹ میں ان کے متعلق تحریر کیا کہ :۔

" اگر وہ میتھمیٹکس میں ترقی پاتا گیا اور اپنے تئیں ایک اچھا پروفیسر ثابت کر گیا اور ہمارے کالج میں رہے گا تو جہاں تک ممکن ہے ہم اس کی ترقی کا خیال رکھیں گے "

اس زمانے میں بی اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ معراج ترقی خیال کیا جاتا تھا۔ کالج کی طرف سے پرنسپل نے ڈاکٹر صاحب کا نام اس عہدہ کے لئے گورنمنٹ میں بھیج دیا اور زوردار سفارش لکھی پرنسپل اور ان کے اہل خاندان تو چاہتے تھے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر بنیں لیکن وہ خود اسے ناپسند کرتے تھے اور کالج ہی میں رہ کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے غرض بڑی ردوکد کے بعد سب کو ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے سے متفق ہونا پڑا اور انہوں نے ڈپٹی کلکٹری سے اپنا نام واپس لے لیا۔ جب وہ کالج میں مستقل پروفیسر ہو گئے تو سر سیّد نے ایک معاہدہ کا مسودہ تیار کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ کم از کم پانچ سال کالج کی ملازمت ترک نہیں کر سکیں گے جب یہ مسودہ ڈاکٹر صاحب کو دیا گیا کہ اس پر دستخط کر دیں تو انہوں نے سر سیّد کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا مقصد تو اپنی پوری زندگی علیگڈھ میں صرف کرنے کا ہے۔ معاہدہ کی پابندی کو میں عار سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں کسی معاہدہ کی بنا پر قومی خدمت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اپنے خود اپنے دل کے تقاضے سے یہ اہم کام انجام دینا چاہیئے۔ سر سیّد پر اس جواب کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے فوراً اسی وقت معاہدہ کا مسوّدہ چاک کر دیا اور کہا کہ جاؤ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب کالج کی چاروں جماعتوں کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۷ کی بجٹ رپورٹ میں سر سیّد نے ان کے متعلق لکھا کہ :۔

" جو ٹرسٹی کہ روزمرہ کالج کے حالات دیکھتے ہیں وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ ضیاء الدّین احمد کے کالج میں ہونے سے طالبعلمان کالج کو کس قدر علمی شوق بڑھتا جاتا ہے اور اس کا اس کالج میں رہنا طالب علموں کی ترقی تعلیم کے لئے کس قدر مفید ہے بالفعل یہ امر پیش آیا ہے کہ پرنسپل صاحب نے حسب قاعدہ دو طالب علموں کا نام ڈپٹی کلکٹری کے گورنمنٹ میں بھیجدیا ہے جس میں ایک ضیاء الدّین احمد ہے اگرچہ اس کے دوستوں نے بہت ترغیب دی مگر خود ضیاء الدّین احمد نے علمی شوق سے ڈپٹی کلکٹری کے مشغلہ سے علمی ترقی اور ہمارے کالج میں رہنے کو پسند کیا اور پرنسپل کو اطلاع کی کہ گورنمنٹ میں رپورٹ کر کے اس کا نام ڈپٹی کلکٹری سے خارج کرا دیا جائے پس ایسی حالت میں ضیاء الدّین احمد ٹرسٹیوں کی توجہ کا بہ لحاظ قومی ترقی و تعلیم کس قدر مستحق ہے اور جب موقع ملے گا ٹرسٹی ضرور اس کی ترقی پر توجہ فرمائیں گے "

اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں منطق کا مضمون لازمی تھا مگر پروفیسر آرنلڈ جو اس مضمون کو پڑھایا کرتے تھے مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے تھے ان کے اور مضامین تو مختلف پروفیسروں میں تقسیم کر دیئے گئے لیکن اس مضمون کو کوئی پڑھانے پر آمادہ نہ ہوا۔ بجٹ میں جدید تقرر کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک سخت قسم کا تردد تھا اس موقع پر ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے اگرچہ انہوں نے خود یہ مضمون نہ پڑھا تھا لیکن اس بار گراں کو اپنے ذمہ لے لیا۔ مطالعہ کے بعد پہلے نوٹ تیار کرتے اور پھر لکچر دیتے تھے اور بقول میر ولایت حسین " ایسی پڑھائی کہ امتحان یونیورسٹی میں اعلیٰ نمبروں سے طلبا پاس ہوئے " اور اس سال یونیورسٹی ممتحن کی رپورٹ یہ تھی کہ منطق کی تعلیم علی گڈھ میں بہترین ہوتی ہے۔

مسلمان طلبا عموماً ریاضی سے خائف رہتے تھے اور اسی لئے انجینئری وغیرہ کی تعلیم سے انہیں واسطہ نہ تھا ڈاکٹر صاحب نے علاوہ اپنے فرائض منصبی کے یہ انتظام کیا کہ طلباء کی باقاعدہ تربیت و تعلیم کی جانے لگی اور وہ رڑکی انجینئرنگ کالج و نیز محکمہ جنگلات کے مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے اس کام کے لئے مساحت پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی۔ علاوہ ازیں امتحان کے قریب گھر پر پڑھایا کرتے تھے اور ہفتہ میں دو مرتبہ عموماً ان کے گھر رات کو ایک جلسہ ہوا کرتا تھا اور باتوں باتوں میں وہ مشکل سے مشکل مسائل ریاضی اپنے طلباء کے ذہن نشین کر دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے غیر معمولی کاموں کا انہوں نے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔

سرسید کی وفات کے بعد سرسید میموریل فنڈ کی بنا ڈالی گئی اور محمڈن یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں جس ایثار اور انہماک سے کام کیا اسے جاننے کے لئے محسن الملک کی تقریر کا اقتباس کافی ہے ۔ نواب صاحب نے کہا کہ :۔

سرسید کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہو لیکن تیرہ سال تک کسی قسم کی کامیابی نہ ہوئی آخر یہ قرار پایا کہ خاص آدمی کلکتہ بھیجا جائے پروفیسر ضیاء الدین احمد مسلمانوں پر جان دینے والا ایک شخص ہے جس کو ڈپٹی کلکٹری ملتی تھی لیکن اس نے محض قومی بھلائی کے خیال سے اس نوکری کو منظور نہیں کیا اور کالج میں سو روپیہ کی نوکری کر لی اور اس قلیل تنخواہ پر پڑا ہوا ہے اگر وہ ڈپٹی کلکٹر ہوتا تو اس وقت پانچ سو کی تنخواہ ہو جاتی ۔ غرضیکہ ضیاء الدین آمادہ ہوئے کہ میں کلکتہ جاتا ہوں چنانچہ وہ تین ہفتہ تک برابر کلکتہ پڑے رہے کل خرچ اپنا کیا اور ایک حبہ کسی سے خرچ کے واسطے کالج یا کانفرنس سے نہیں لیا ۔ اس ہمدرد قوم نے وہاں جاکر میموریل فنڈ کے لئے کوشش شروع کر دی لیکن وہاں یہ دشواری پیش آئی کہ کلکتہ میں سربرآوردہ مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں ہیں ایک گروہ کی کوشش جو قومی بھلائی کے لئے کی جاتی ہے دوسرا گروہ اس کے توڑنے کی فکر کرتا ہے کہ ہمارے فریق مخالف کی نیکنامی نہ ہو جائے ۔ بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست ۔ مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی وہاں بھی موجود ہے لیکن پروفیسر ضیاء الدین احمد کے تین ہفتہ قیام کا نتیجہ ہوا کہ سرسید میموریل فنڈ کے چندہ کے لئے کمیٹی کی بنا پڑی اور وہاں کے سربرآوردہ اصحاب نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو مدعو کرنے کی رائے دی غرض ۱۹۰۱ء میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا ۔ لفٹنٹ گورنر تک نے اس جلسے میں شرکت کی اور مادی و اخلاقی لحاظ سے یہ اجلاس نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا ۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تحریک سے کالج میں انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی) قائم ہوئی تھی جس کا کام غریب طلبا کی امداد کے لئے روپیہ جمع کرنا تھا ۔ طلبا اپنے تعطیل کے زمانے میں انفرادی طور پر جمع کرتے تھے اور انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلاتے تھے اس انفرادی دریوزہ گری سے مالی حالت تو کچھ ترقی ہو جاتی تھی مگر اصل مقصد میں کامیابی نہ ہوتی تھی یعنی مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا ذہن نشین کر دینا اور مسلمانوں کے خیالات کالج کی طرف سے درست کرنا ۔ جس سال ڈاکٹر صاحب انجمن کے نائب امین مقرر ہوئے تو انہوں نے بجائے انفرادی کوشش کے طلبا کو مختلف مقامات پر وفود کی صورت میں روانہ کیا ۔ تاکہ وہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں جلسے کریں اور کالج کے متعلق تقاریر کے ذریعے لوگوں پر ضرورت اور اہمیت کا اظہار کریں ۔ اس سلسلے میں وہ اچھے لڑکوں کی تقریر کرنے کی صلاحیت کو تربیت کرکے ابھارتے تھے اور اچھے مقررین کے لئے انعام بھی مقرر کرتے تھے ۔ ان وفود کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہاں آٹھ سال میں ۱۸۹۷ء تک انجمن کو قریب پانچ ہزار روپیہ کے ملا تھا وہاں پانچ سال میں یعنی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک قریباً اکیس ہزار وصول ہوا ۔ وہ انجمن سے بیس سال تک متعلق رہے ۔ اس عہد میں انجمن کو تین لاکھ تریپن ہزار کی آمدنی ہوئی ۔ انہوں نے اپنی آخری رپورٹ میں لکھا تھا کہ :۔

"ڈیوٹی کا فرض ہے کہ وہ اس قدر سرمایہ جمع کرے جس سے مستقل طور پر کم از کم ایک ہزار طالب علم بلا کسی قسم کا خرچ کئے ہوئے تعلیم پا سکیں ورنہ خوف ہے کہ مسلمان پورے طور پر اس مجوزہ محمڈن یونیورسٹی سے فائدہ اٹھانے سے معذور رہیں گے "۔

وہ نادار اور ہونہار طلبا کی امداد کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے بار بار پرنسپل اور کارکنان کالج پر زور دیا کہ نادار طلبا کو تعلیم اور اقامت کے اخراجات میں رعایت ملنی چاہیئے چنانچہ ان کی مساعی بار آور ہوئیں اور رعایتی شرح جاری ہو گئی بی اے کا کل خرچ دس روپیہ ماہوار اور ایف اے کا نو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا گیا ۔ تنخواہ کی کمی کے باعث اساتذہ مشکل سے ملتے تھے ۔

لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے یہ طے پایا کہ جو اساتذہ ہاسٹل میں رہنا پسند کریں ان سے صرف چھ روپیہ ماہانہ لیا جائے۔

(۲)

ڈاکٹر صاحب نے باوجود کثیر مشاغل و فرائضِ منصبی کے ۱۸۹۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اور ۱۸۹۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ۱۹۰۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈی ایس سی اوّل درجہ میں پاس کیا۔ مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ:۔

"امتحانات یونیورسٹی کا ایک نتیجہ علیگڈھ میں نہایت اطمینان کا باعث ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ پروفیسر ضیاء الدین احمد نے ڈی ایس سی کا امتحان اوّل ڈویژن میں پاس کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کالج اور مسلمانوں کی قوم کے متعلق اس قدر کثیر فرائض اپنے ذمہ لئے ہیں کہ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنے پرائیوٹ مطالعہ کے لئے کب وقت نکالا ہوگا لیکن انہوں نے ایسے طریقہ میں یہ وقت نکال لیا کہ وہ یونیورسٹی الٰہ آباد کی تعریف و توصیف کے مستحق ہوئے ہم یقیناً اس بات کی امید کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کیمبرج میں تحصیل علوم کے لئے عنقریب انگلستان کے واسطے روانہ ہو سکیں گے اور اگرچہ علیگڈھ کی سوسائٹی کو ان کے چلے جانے سے نقصان پہنچے گا تاہم ہم میں ہر شخص اس بات کے خیال سے خوش ہوگا کہ ان کو موقع ملے گا کہ انگلستان جا کر اپنی اعلیٰ قابلیتوں کو اوّل درجہ کے مہندسین کی نگرانی میں اصلی علمی تحقیقاتوں میں صرف کریں اور جب کہ کیمبرج میں تین برس تعلیم پا کر کالج کو واپس آویں گے تو ہمارے ٹیچنگ اسٹاف کو بڑا استحکام حاصل ہوگا۔"

حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈاکٹر صاحب کو وظیفہ دیا ان ہی دنوں سر آغا خاں نے تین ہزار روپیہ سالانہ کالج کے لئے منظور کئے لیکن اس رقم میں سے نصف ڈاکٹر صاحب کے لئے مخصوص کر دی تاکہ وہ یورپ میں زیادہ عرصہ رہ کر مزید قابلیت حاصل کر سکیں۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر صاحب نے ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ریاضی آنرز میں ڈگری حاصل کی تمام پاس شدہ امیدواروں میں ان کا نمبر اوّل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ ملا وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ کیمبرج میں انہوں نے سیّد علی بلگرامی کی سرپرستی میں ایک مسلم سوسائٹی قائم کی جہاں ہفتہ میں دو بار کسی مشہور مسلمان کی زندگی اور کارناموں پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔

ٹرنٹی کالج میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جتنی بڑی داڑھی ڈاکٹر صاحب کی تھی اتنی ہی ان کے ٹیوٹر کی تھی۔ ایک دن ٹیوٹر نے کہا کہ یہ بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا ٹیوٹر ہوں یا تم میرے ٹیوٹر ہو۔ شرعی جواز معلوم کر کے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ٹیوٹر کی خاطر داڑھی منڈوا دی لیکن وہاں سے فارغ ہونے کے بعد پھر رکھ لی جو آخر وقت تک رہی۔ دوسری عجیب بات اس دور کی یہ ہے کہ وہ حسبِ عادت عموماً امتحان سے قبل رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے اور جب سونے کا ارادہ کرتے تب بھی ریاضی کے مسائل دماغ میں گھومتے رہتے اور نیند نہ آتی۔ جب دو ہفتہ اسی طرح گزر گئے تو انہوں نے اپنے ٹیوٹر کے مشورہ سے ایک ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا اس نے خوب معائنہ کرنے کے بعد رائے دی کہ فوراً ہندوستان واپس چلے جاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر واپس چلے آئے اور اپنی قوتِ ارادی سے علاج شروع کیا اور یہ مشق بہم پہنچائی کہ جیسے ہی کتاب بند کرتے تمام مسائل دماغ سے خارج ہو جاتے اور خالی الذہن ہو کر سو جاتے اور جب کتاب کھولتے تو تمام مسائل پھر دماغ میں آ جاتے۔ جب کئی ہفتہ اس کی مشق کر لی تو پھر اسی ڈاکٹر سے جا کر ملاقات کی اس نے پھر معائنہ کیا اور کہا اب حالت درست ہے ہندوستان جانے کی ضرورت نہیں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب نے خود علاج کیا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ قوتِ ارادی کا کرشمہ آخر وقت تک رہا۔ جب چاہتے اور جتنے وقت کے لئے چاہتے سو جایا کرتے تھے اور بروقت بیدار ہو جاتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے گوٹنجن یونیورسٹی

جرمنی سے ہیئت میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی بعد ازاں پیرس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں کچھ عرصہ مخصوص علوم کے ماہرین کے لکچروں کو سُنا اور درس لیا ۔ ان کی کامیابیوں کی اطلاعیں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں اور اب ان کی واپسی کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ان کے کیمبرج کے ٹیوٹر ہندوستان میں محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر مقرر ہوگئے تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ترغیب دی کہ وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا عہدہ قبول کرلیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکار کردیا ۔ اس کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات یو ۔ پی نے انسپکٹر مدارس کا عہدہ جس کا مشاہدہ ساڑھے سات سو سے شروع ہوتا تھا پیش کیا لیکن انہوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کردیا اور نواب محسن الملک کو خط میں لکھا کہ :۔

"موجودہ اور آئندہ ہر قسم کی ملازمت کے لئے میری طرف سے آپ جو جواب دیں گے وہی میرا جواب ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج مسٹر ڈی لافوس ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا باضابطہ خط میرے پاس پہنچا ہے جس میں انہوں نے بہ دلائل میرے انسپکٹری قبول کرنے پر زور دیا ہے ۔ میں نے بھی بہ دلائل اس سے انکار کردیا "۔

سنہ ۱۹۰۶ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب یورپ سے واپس ہوئے راستے میں مصر میں قیام کیا ۔ یہاں جامعہ ازہر میں علمائے ہیئت سے درس لیا اور وہاں کے اخباروں میں ہندوستان یورپ اور مصر کی تعلیم پر کئی بصیرت افروز مضامین شائع کئے ۔ ایک مضمون میں لکھا کہ :۔
مجھ کو جو اکثر اسلامی ممالک کے اہل نظم سے اور دیگر اکابرین سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے ان سے جو گفتگو ہوئی اس سے میں اس یقینی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت مسلمانان ہند دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اگر دنیا کے مسلمان کسی وقت ترقی کریں گے تو مسلمانان ہند ہی اس ترقی کا باعث ہوں گے اور علیگڈھ اس ترقی کا مرکز ہوگا ۔

(۳)

اواخر سنہ ۱۹۰۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے وطن کی طرف مراجعت کی اور ۱۱ دسمبر کو براہ راست علی گڈھ پہنچے ۔ نواب محسن الملک پرنسپل اور اساتذہ وطلبا نے پرجوش استقبال کیا اور جس گاڑی میں وہ سوار ہوئے اس کے گھوڑے کھول دئے گئے اور طلبا نے گاڑی کو کھینچ کر نواب محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچایا ۔ اب انہوں نے پروفیسر ریاضی کی حیثیت سے بڑے جوش وخروش وسرگرمی سے کام شروع کردیا ۔ کچھ عرصہ بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری انہیں پیش کی گئی جس کا مشاہرہ علیگڈھ کی نسبت تقریباً دوگنا تھا مگر انہوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا
ڈاکٹر صاحب نے مصر میں متعدد پبلک لکچر تعلیم پر دئے تھے ۔ تقاریر کے دوران میں انہوں نے مصریوں کو مشورہ دیا تھا کہ ان کی پسماندگی کا سبب برطانوی پالیسی ہے اور اس پالیسی پر انہوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی مصریوں کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اسی پر ملک کی ترقی کا دارومدار ہے ۔ ان کے یہ خیالات برٹش ہائی کمشنر مقیم مصر کو ناگوار گزرے اور انہوں نے دوران ملاقات میں ان کی تقاریر پر اعتراض کیا ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوں ۔ یہ سب معاملات وائسرائے ہند کو واضح کردئے گئے اور برطانیہ سے ہدایات جاری ہوئیں کہ ضیاء الدین کی خاص طور پر نگرانی کی جائے ۔ اس کے خیالات باغیانہ ہیں ۔
چنانچہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہاں کے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں اپنے خیالات میں ترمیم کرنی پڑی تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو سیاسی ترقی کا موقع ملا تھا ۔ شملہ ڈپوٹیشن کے نتائج کا انتظار تھا ۔ لہٰذا مسلمان حکومت سے کسی طرح بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بھی نواب محسن الملک کے مشورہ سے مصلحت وقت کا تقاضا دیکھتے ہوئے اپنی زبان بند رکھی ۔ لیکن باوجود اس کے تین سال تک خفیہ پولس ان کی نگرانی کرتی رہی ۔ ان کے مکان سے تمام وہ تعلیمی لٹریچر جو وہ یورپ اور مصر سے لائے ۔ چوری کرا لیا گیا ۔ خفیہ پولیس کے اس افسر نے جو ان کا نگران تھا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس چوری کا اقرار کیا۔

ڈاکٹر صاحب ان پروفیسروں میں نہ تھے کہ جن کی سرگرمیاں صرف کلاس روم تک محدود رہتی ہیں انہوں نے اپنے یورپ کے تجربہ اور علم کی بنا پر ایجوکیشنل کانفرنس میں ابتدائی تعلیم کی اصلاحات سے متعلق ایک اسکیم پیش کی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ میوزیم قائم کیا جائے اور اس کے ذریعہ بچوں کو تعلیم دی جائے علاوہ ازیں ایسے بڑی عمر کے لوگ جن کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے اور جو تعلیم کے شائق ہوں ان کے لئے تعطیلات میں لیکچروں کا پروگرام مرتب کیا جائے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان ہی میں ہو اور عربی مدارس میں فارسی بھی اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ تاریخ اسلام بھی ایک الگ مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ انہوں نے خود علیگڑھ میں میوزیم اور کنڈر گارٹن اسکول قائم کیا۔ انہوں نے ایک اسکیم ایسی بھی تیار کی جس میں مذہبی تعلیم بچوں کو کنڈر گارٹن کے اصول پر دی جاسکتی تھی۔ کالج کے طلبا میں تعلیمی نقطہ نگاہ سے مل جل کر سیر و سیاحت کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح ایسے اکسکرشن ہر سال ہونے لگے۔ انہوں نے یہ بھی تحریک کی کہ علی گڑھ میں ایک اولڈ بوائے کالونی قائم کی جائے تاکہ وہ لوگ مادر علمی کی خدمت کرسکیں چنانچہ اکثر نے علی گڑھ میں مکانات بنا کر سکونت اختیار کر لی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور پھر جنگ بلقان چھڑ گئی ترکوں کی امداد کے لئے ایک کمیٹی کالج میں قائم ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ لڑکوں نے عمدہ کھانا اور عمدہ پہننا ترک کر دیا اس سے جو بچت ہوئی وہ ترکی فنڈ میں دے دی گئی ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو بیش بہا امداد ملی اور چھ طلبا نے اپنی خدمات پیش کیں۔ غرض ترکی امدادی فنڈ میں طلبا نے تقریباً دس ہزار روپیہ جمع کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ طلبائے علی گڑھ میں ترکوں سے ہمدردی اور سیاسی بیداری کا جذبہ زور پر تھا۔ حکومت ہند اس طرف سے خائف تھی لیکن نظم و ضبط قائم رہا۔ طلبا نے امپیریل ریلیف فنڈ کے لئے چندہ بھی جمع کیا اور ایمبولینس کور میں بھی خدمات انجام دیں۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں حکومت ہند نے کلکتہ یونیورسٹی کی تحقیقات کے لئے سڈلر کمیشن مقرر کیا اس کا ایک ممبر ڈاکٹر صاحب کو بھی مقرر کیا گیا پانچ دس سال تک ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے الگ رہے اور کمیشن کے کام میں منہمک رہے۔ میٹرک میں مسلمان طلبا کی ناکامی کے پست ترین اعداد و شمار سے انہیں شبہ ہوا اور انہوں نے تحقیقات شروع کی۔ بنگال بھر کے مختلف مرکز امتحان کی کاپیاں منگوا کر خود جانچا تو انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان طلبا ہندو متعصب ممتحنوں کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں قصداً فیل کیا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں طلبا امتحانوں کی کاپیوں پر نام لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر نام کے بجائے رول نمبر لکھے جانے لگے۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں کالج کے اندرونی خلفشار کے باعث انگریز پرنسپل اور اس کے ساتھ انگریز اساتذہ نے ملازمت سے استعفا دے دیئے جو منظور کر لئے گئے۔ اور جنوری سنہ ۱۹۱۹ء سے ڈاکٹر صاحب کا تقرر پرنسپل کے عہدہ پر ہوا۔

(۴)

کچھ عرصہ سے کالج کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بجٹ کی حالت متزلزل تھی۔ انگریز اساتذہ کے چلے جانے سے حکام ضلع اور محکمہ تعلیم ناراض تھا۔ ادھر کالج کے ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز میں معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب نے پرنسپل کا جائزہ لیا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں کالج تعطیلات کے لئے بند ہوا تو تعداد طلبا صرف ۱۸۰ رہ گئی تھی۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ۱۲ سو سے زاید طلبا تھے جن میں تقریباً ایک ہزار بورڈر تھے۔

حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا تقرر مشروط ہوا تھا کہ جب تک انگریز پرنسپل ملے کام کریں۔ لیکن انہوں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حکومت کے حکام کی خوشنودی ضروری تھی تاکہ الحاق منسوخ کرنے کی دھمکیاں اور گرانٹ بند کرنے کا خوف دور ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر صوبہ کو دعوت دی اور انہوں نے کالج کا معائنہ کر کے نہایت عمدہ خیالات کا اظہار کیا اور ایک ہزار اپنی جیب خاص سے عنایت فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی مالی مشکلات آمدنی جو کہ بند تھی سرکاری حکومت کی گرانٹ کا روپیہ رکا ہوا تھا وہ اضافہ کے ساتھ وصول ہوا۔ کالج میں بیالوجی کا شعبہ

قائم کیا گیا۔ چنانچہ اس سال کی رپورٹ میں کالج کے آنریری سیکرٹری نے لکھا کہ:۔

"جب میں سیکرٹری ہوا تو کالج میں خطرہ کا زمانہ تھا تمام یورپین اسٹاف فروری و مارچ میں جا چکا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ گزشتہ چند برسوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالج تنزل کر رہا ہے پبلک میں یہ احساس تھا کہ گورنمنٹ اب اس کو نظر التفات سے نہیں دیکھتی جیسے کہ زمانہ سابق میں دیکھتی تھی چنانچہ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعداد طلبا میں کمی ہوتی گئی جب یکم مئی سنہ ۱۹۱۹ء کو کالج بند ہوا تو تعداد طلبا (۱۸۱) تھی کیونکہ اور طلبا امتحان دے کر جا چکے تھے کالج دوبارہ یکم اگست کو کھلا اور (۲۰۰) نئے داخلے ہوئے فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں (۷۶۷) تک تعداد پہنچی جس میں (۶۲۰) بورڈر تھے۔ یہ اضافہ بڑی حد تک ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ساتھ ہی انجمن الفرض نے زیادہ مقدار میں قرضہ دیا۔ رعایتی شرح بھی جاری کی گئی اور (۱۵۱) طلبا اس شرح پر داخل ہوئے۔"

ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں قراردادیں منظور کیں۔

کالج کی حالت کو پوری طرح سنبھالنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ترک موالات کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور کالج پر حملہ ہوا۔ یہ ایک سخت مصیبت کا وقت تھا ڈاکٹر صاحب چومکھی لڑائی لڑ رہے تھے حملہ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ وہ رات دن کام کرتے تھے کبھی جلسے ہو رہے ہیں کبھی حکام سے مل رہے ہیں کبھی طلبا کے سرپرستوں کو خطوط لکھے جا رہے ہیں اپنے کارکنوں کو مختلف کاموں میں لگائے رہتے تھے۔ انہوں نے اوّل تو مولانا شوکت علی سے اگست ہی میں وعدہ لے لیا کہ علیگڈھ کو محفوظ رکھا جائے گا پھر جب اکتوبر میں حملہ آور پہنچے تو گاندھی جی کو یاد دلایا کہ آپ نے تو مارچ ہی میں وعدہ کر لیا تھا کہ طلباء کو ہدایت کریں گے کہ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں انہوں نے جواب دیا ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور ترکی شرائط صلح نے میری رائے پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مولانا محمد علی سے انہوں نے کہا قومی یونیورسٹی کی اسکیم کو میں اس شرط پر جاری کرنے کو تیار ہوں کہ اوّل تو اسے ہندوستان کے ماہرین تعلیم منظور کریں اور آپ علیگڈھ ہی کو چھوڑ دیں انہوں نے کہا ہم تو حکومت سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی رات دن کی مساعی اور دوڑ دھوپ کی بدولت ۶۶۰ بورڈروں میں سے ۳۰۴ باقاعدہ پرنسپل سے اجازت لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے۔ قومی یونیورسٹی کے لئے صرف ۱۰۰ طلبا رہ گئے۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے نہ تو اسٹرائک کی نوبت آنے دی اور نہ کوئی تصادم آپس میں ہوا۔ انہوں نے زیادہ تر بار اولڈ بوائز پر ڈال دیا۔ تحریک کے مخالف علما سے تقریریں کرائیں۔ اشتعال آمیز باتوں سے قطعی پرہیز کیا۔ غرض اسی طرح ۲۶ اکتوبر کو کالج بند کر دیا گیا۔ جب دسمبر میں کالج کھلا تو وہ ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی ہو گیا تھا۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی دلیری، ہمت اور حسن تدبیر نے میدان مار لیا۔ یونیورسٹی کا دستور اساسی ڈاکٹر صاحب ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔

(۵)

یکم دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء کو ایک ناقص ایکٹ کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی کا وجود عمل میں آیا۔ وائس چانسلر مہاراجہ صاحب محمود آباد نامزد کئے گئے۔ اور حکومت نے کورٹ کی تشکیل تک مکمل اختیارات مہاراجہ صاحب سونپ دئے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے سخت مخالف تھے انہوں نے ان کی پرنسپلی کے تقرر پر بھی مخالفت کی تھی۔ اور اب پرو وائس چانسلر کے عہدہ کے لئے وہ کسی انگریز کے متلاشی تھے اس وقت نہ کوئی انگریز اس بار کو اٹھانے کے لئے تیار تھا اور نہ کوئی مسلمان بھروسے کا مل سکا جو تمام حالات پر قابو پا سکے۔ مجبوراً ڈاکٹر صاحب ہی پرو وائس چانسلر بنا دیئے گئے۔ لیکن ہر معاملہ اور ہر کام میں مہاراجہ صاحب روڑے اٹکاتے تھے۔ اختیارات سب ان کے ہاتھ میں تھے اور وہ علیگڈھ سے اکثر غیر حاضر رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذمہ داریاں بے شمار لیکن اختیار کچھ بھی نہیں مگر ڈاکٹر صاحب جو علیگڈھ کی خدمت میں دھن کے پکے تھے ڈٹے رہے اور اوّل ممبر دلائے۔ چنانچہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے کام میں اپنے تعلیمی تجربہ اور اپنے اسٹاف کی مدد سے راجہ صاحب کو

زک دیتے رہے"۔

مہاراجہ صاحب محمود آباد چونکہ یو پی گورنمنٹ میں ہوم ممبر بھی تھے۔ انہیں مجبوراً وائس چانسلری سے استعفا دینا پڑا کچھ دن نواب مزمل اللہ خان نے کام کیا لیکن دسمبر ۱۹۲۳ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اس انتخاب سے پہلے مہاراجہ صاحب نے صاحبزادہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے بھی تعلیمی انتظام میں جس کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر تھی مداخلت شروع کر دی اور ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر ڈاکٹر صاحب نے سولہ ماہ تک صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد استعفا دے دیا۔ ادھر یونیورسٹی کا جشن جوبلی ہونے والا تھا اور صاحبزادہ صاحب یہ ضرور جانتے تھے کہ بغیر ڈاکٹر صاحب کے کام چلنا ناممکن ہے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا اور آخر میں یہ تحریر کیا کہ :

"ہمارے ادارہ کی کامیابی ہر حالت میں اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کو ان ریگولیشنوں کے ماتحت چلایا جائے جو تیار ہو رہے ہیں ...... اور اس معاملہ میں آپ کا اور صرف آپ کا تجربہ اور اثر نہایت ضروری ہو گا .... جوبلی کی کامیابی کا اثر قوم کی سیاسی تنظیم پر بہت گہرا پڑے گا .... آپ کا علیگڈھ کو ایسے موقع پر چھوڑنا ہماری امیدوں کے مخالف اور قومی مفاد کے خلاف ہو گا۔ .... میں آپ کا چھٹی تک پر جانا پسند نہیں کرتا لہذا آپ کا اشارہ جو استعفا کے متعلق ہے اس کو میں کبھی بھی خوش آمدید نہیں کہہ سکتا ——"

الغرض بڑی رد و قدح کے بعد ڈاکٹر صاحب نے استعفا واپس لے لیا اور جوبلی کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ۲۵ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء تک یہ تقریب جاری رہی۔ مسلم لیگ اور دیگر مختلف مسلم اداروں کے اجلاس بھی ہوئے۔ ہر مکتبۂ خیال کے مختلف زعما ایک جگہ جمع ہو گئے اور سات ہزار مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا حیرت انگیز امر تھا۔ ان ہی دنوں ہندو مسلم مناقشات کو ختم کرنے کا واحد حل ایک پمفلٹ کے ذریعہ تقسیم ملک کو بتایا گیا تھا یہ پمفلٹ اگرچہ "گاندھی جی کے نام کھلا خط" کے نام سے پہلے شائع ہو چکا تھا لیکن اسے اس موقع پر دوبارہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا جس میں ملک کی مکمل تقسیم کی ایک اسکیم درج تھی۔ جوبلی کا یہ اہتمام و شان ڈاکٹر صاحب کی قوت تنظیم اور طلبا و اساتذہ کے اتحاد و ایثار اور جذبہ و جوش کا مظاہرہ تھا۔

مسلمانوں کا یہ اجتماع دشمن معاندین کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اب یونیورسٹی کے خلاف معیار قابلیت اور نامناسب نتائج کے متعلق پروپیگنڈا شروع ہوا اس میں سررشتۂ تعلیم کا انگریز ڈائرکٹر میکنزی اور یو پی کا مشہور ہندو اخبار لیڈر شریک تھے۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ صاحب کی بعض تقاریر کو جو انہوں نے یونیورسٹی کی اندرونی بدنظمی کے متعلق مہاراجہ صاحب محمود آباد کو بدگمان کر دینے کی بنا پر کی تھیں بنیاد ٹھیرایا گیا۔ غرض صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے نظریات میں اختلافات بڑھتے ہی گئے ان اختلافات کو ایک طرف تو ہوا دینے والے چند خود غرض علیگڈھ ہی میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ اختلافات تو یوں ختم ہوئے کہ صاحبزادہ صاحب میدان سے ہٹ گئے اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کی میعاد ختم ہونے پر سرولیم میرس گورنر یو پی کے ایما سے نواب سر مزمل اللہ خان کا انتخاب ہو گیا۔

لیکن جشن جوبلی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہونا قائد اعظم اور دیگر زعما کا وہاں آنا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا سوراج کی قرارداد کی تائید کرنا یہ سب امور ایسے تھے کہ صوبہ کے متعصب گورنر کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلم طلبا میں سیاسی بیداری پیدا ہو وہ چاہتا تھا کہ تعداد طلبا محدود ہو اور اساتذہ میں انگریزوں کی اکثریت ہو چنانچہ اس نے ۱۹۲۶ء میں اپنی تقریر کے دوران جب کہ سپاس نامہ کا جواب دے رہا تھا صاف طور پر کہا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ آپ سرسید کے نصب العین کی طرف لوٹ جائیں

اور وائسرائے نے بھی ایک تقریر میں کہا کہ :۔

"جو مراحل درپیش ہوں گے ان کے حل کرنے کے لئے آپ سرسید کے قائم کردہ اصولوں کو رہبر بنائیں گے" ۔۔۔

یونیورسٹی کی تاسیس کے دور میں یو پی گورنمنٹ کے وزیر تعلیم مسٹر چنتامنی تھے جو ایک متعصب ہندو تھے ان کا رویہ ہمیشہ غیر ہمدردانہ رہا ان کا آوردہ سررشتۂ تعلیم کا ڈائرکٹر میکنزی تھا اسے نہ صرف یونیورسٹی سے بلکہ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب سے پرخاش تھی کیونکہ صوبہ کی کونسل میں ڈاکٹر صاحب ہی ایک ماہر تعلیم تھے جو میکنزی کی تعلیمی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کیا کرتے تھے ۔ اس نے مخالفت شروع کی اور چنتامنی کا اخبار لیڈر یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف مضامین شائع کرتا تھا ۔ ادھر صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی سے الگ ہوتے ہی ایک پمفلٹ یونیورسٹی کے انتظامات کے خلاف شائع کر دیا۔

ان حالات میں وائسرائے نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جو یونیورسٹی کی چانسلر تھیں اور ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کا پرزور مشورہ دیا ۔ چنانچہ رحمت اللہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ۔ غرض رحمت اللہ کمیشن نے کام شروع کر دیا ۔ باہمی اختلافات کیا بلکہ مخالفت کا بڑھ کہ بعض حضرات نے شہادت کے دوران میں بدترین رذائل کا اظہار کیا ۔ اور وہ وہ الزام ڈاکٹر صاحب کے خلاف تراشے گئے کہ جن کے خیال سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے ۔ لیکن کمیشن کا کام خفیہ ہدایات کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو ہٹانا مقصود تھا ۔ ساری رپورٹ میں کہیں تعلیمی مسئلہ پر ایسی بحث نہیں ہے جس سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہو ۔ جو رطب و یابس ملا رپورٹ میں درج کر دیا گیا ۔ کمزوریاں کونسی یونیورسٹی میں نہیں ہیں اور ذمہ داری کسی کی ہو وہ سب ڈاکٹر صاحب کے ہی سر تھوپی گئی اور بمصداق طویلہ کی الا بلا بندر کے سر ۔ سب کی پاداش میں ایک مخلص کارکن کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا کیونکہ اس وقت کی حکومت کا منشا ہی یہ تھا ۔ لیکن کمیشن کو ڈاکٹر صاحب کی قابلیت و خدمات کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا چنانچہ کمیشن رپورٹ کے آخر میں لکھا کہ :۔

"ہم ڈاکٹر ضیاء الدین کی پختہ علمی قابلیت ان کی کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی کی طویل خدمات اور علیگڑھ سے ان کے عمیق جذبہ محبت کے معترف ہیں لیکن ہم کو یہ بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ حالیہ مشکلات میں ان کے قریبی . . . . تعلقات کے پیش نظر ان کی خدمات کا یونیورسٹی میں جاری رہنا سلامت روی اور ترقی کی اس نئی روح کے منافی ہوگا جو یونیورسٹی کی آئندہ کامیابی کے لئے ضروری ہے ۔ غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین کے لئے بہترین راہ یہی ہوگی کہ وہ ریٹائر ہونے سے پہلے رخصت لے لیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے رپورٹ دیکھنے کے بعد ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو وائس چانسلر کے سامنے اپنا استعفا پیش کر دیا ۔ چونکہ اس خط سے جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا ان کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے لہذا اسے بے کم و کاست ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ وہ خط یہ تھا :۔

۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء

بخدمت جناب وائس چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مائی ڈیر نواب صاحب ۔

۱۸۹۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوا مگر تھیوڈور بک نے اس کے مقابلہ میں مجھ کو اسسٹنٹ پروفیسری کی حیثیت سے اسٹاف میں شریک ہونے کا مشورہ دیا ۔ میرے تقرر کے وقت سرسید علیہ الرحمتہ سے جو ملاقات ہوئی اس میں مجھ سے پانچ سال کی ملازمت کا اقرار نامہ لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر میں نے اس وقت عرض کیا کہ میرا ارادہ تو کالج میں تمام عمر خدمت کرنے کا ہے اس پر جو اقرار نامہ کا مسودہ مضمون سے میرے لئے خود لکھا تھا اسے پھاڑ ڈالا ۔ ۱۹۰۱ء میں میں نے ڈی ایس سی کی ڈگری

ڈویژن میں حاصل کی جس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھ کو انگلستان جانے کے لئے اسکالرشپ عطا فرمایا ۱۹۰۳ء میں میں نے ٹرنٹی کالج کیمبرج سے ریسرچ کی ڈگری اور ۱۹۰۴ء میں سر اسحاق نیوٹن اسٹوڈنٹ شپ اور ۱۹۰۶ء میں میں نے گوٹنجن یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی میں یورپ میں ہی تھا کہ مجھ کو انسپکٹر مدارس کا عہدہ دیا جا رہا تھا۔ مگر میں نے اس سے انکار کر دیا وہاں سے واپسی پر میں علیگڈھ میں ۱۹۰۷ء میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا ۱۹۱۰ء میں مسٹر سڈول کی ماتحتی میں میں سینئر ٹیوٹر بنایا گیا ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کا پہلا مسودہ تیار کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا سکرٹری مقرر ہوا۔ ۱۵-۱۹۱۴ء میں مسٹر سڈول کی عدم موجودگی میں ایم اے او کالج علیگڈھ کا قائم مقام پرنسپل مقرر ہوا جنگ طرابلس جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے واقعہ کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا تھا جس کا اثر کالج کے طلبا پر بھی پڑا ان میں نہایت بے چینی ظاہر تھی اور ہماری درسگاہ میں ڈسپلن کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ اپنی قائم مقامی کے زمانے میں باوجود مخالف اثرات کے مجھے طلبا کے دلوں میں کالج کی عظمت قائم رکھنے میں کامیابی ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا ممبر مقرر ہوا میری عدم موجودگی میں آنریری سیکرٹری بورڈ آف ٹرسٹیز اور یورپین اسٹاف میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں آخر کار یورپین اسٹاف نے استعفا دیدیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب کمیشن سے فارغ ہو کر آیا تو کالج میں لڑکوں کی تعداد (۱۰۸۰) رہ گئی تھی کالج کی شہرت کم ہو رہی تھی اولڈ بوائز نے یہ خیال کر کے کہ کالج کی قدیمی روایات کا خاتمہ ہو چکا ہے علیگڈھ میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں ہز ہائی نس کورٹ ہٹلر کی تشریف آوری کے موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے قریب پانچ سو اولڈ بوائز کو مدعو کیا اور ہز اکسلنسی کی خاص توجہ کو دیکھ کر ان میں بھی کالج کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ دوسرے سال تحریک ترک موالات کا حملہ ہوا اور ایمانداری سے میرا یہ یقین تھا کہ اگر ایم اے او کالج نہ رہا تو مسلمانوں کی قوم کو سخت نقصان ہوگا اس انتشار کی حالت میں کالج کو بند کر دیا گیا اور اس تعلیم گاہ کو بچانے کے لئے مسلم یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کیا گیا تارکان موالات نے اپنی نیشنل یونیورسٹی ہماری یونیورسٹی کے متصل قائم کر دی تھی میری راہ میں سخت دشواریاں حائل تھیں لیکن میں نے متواتر محنت اور جانفشانی سے والدین اور اولڈ بوائز کی ایک بڑی تعداد کو مدعو کر کے ان کی مدد سے یونیورسٹی کے اقتدار کو قائم کر دیا میں نے اسٹرائک کی صورت کو بدل کر لڑکوں پر ان کی درسگاہ کی ذمہ داری کا پورا بار ڈال دیا۔ جوبلی کے موقع پر جب کہ قریب سات ہزار مہمان ہندوستان کے ہر حصّہ سے ایم اے کالج کی پچاسویں سالگرہ کے منانے کو جمع ہوئے تھے یہ اقتدار اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے بانی کالج کے کام کو جاری رکھنے کے لئے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔

یونیورسٹی کے قیام کے پہلے کئی سال تک نہ کوئی قوانین تھے اور نہ کوئی ضوابط تھے میں نے اپنی سالانہ رپورٹ میں جو فروری ۱۹۲۴ء میں پڑھی گئی تھی مندرجہ ذیل فقرہ لکھا تھا:۔

"جون ۱۹۲۳ء تک مسلم یونیورسٹی کے آرڈی ننس وصول نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے اول اٹھارہ ماہ تک حکومت ہند نے وائس چانسلر کو پورا اختیار دے دیا تھا کہ کسی قسم کے آرڈی ننس یا ریگولیشن بنا لیں حتیٰ کہ قوانین کی جس دفعہ کو چاہیں نظرانداز کر دیں یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ شخص واحد کو اور وہ بھی ایسے شخص کو جو موقع پر موجود نہ ہو اس قدر عرصہ کے لئے اس طرح سے مطلق العنانی کے ساتھ اختیارات دے دئے جائیں بڑا معجزہ ہے۔ کہ یونیورسٹی کا اس دوران میں خاتمہ نہ ہو گیا"۔

بد قسمتی سے مجھ کو اپنے زمانہ میں تین مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا (۱) آنریری سیکرٹری محمڈن کالج اور وائس چانسلر نے مجھ کو کافی امداد نہیں دی اور اکثر موقعوں پر انہوں نے کھلم کھلا اسٹاف میں میرے خلاف پارٹیاں قائم کیں (۲) میرے دفتر میں کبھی لائق آدمی نہیں ملے (۳) بعض ممبران اسٹاف نے میرے ساتھ مل کر کبھی کام نہیں کیا اور اکاڈمک کونسل میں میرے خلاف ایک مضبوط پارٹی بنالئے

رکھی۔ آپ نے اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد نہایت نیک نیتی کے ساتھ اسٹاف میں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آپ کو معلوم ہے کہ کس طرح آپ کی کوششیں رائگاں گئیں۔

موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے مطابق پرو وائس چانسلر پر درس گاہ کے ہر شعبہ کے متعلق پوری ذمہ داری ہے میں ان کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نالائق اور لاپروا ممبر اسٹاف کی تنخواہ کے معمولی اضافہ کو بھی رد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ تمام باتوں کا دارومدار وائس چانسلر کی مرضی پر ہے خواہ وہ پرو وائس چانسلر کی تجاویز کو اگزکٹو کونسل میں پیش کرے یا نہ کرے۔ سابق وائس چانسلر راجہ صاحب محمود آباد نے صاف احکام تحریری دئے تھے کہ پرو وائس چانسلر کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی تجاویز اگزکٹو کونسل میں بلا واسطہ بھیج سکے اور اس پر اس وقت سے عمل ہو رہا ہے۔ پرو وائس چانسلر کی حیثیت "ڈکٹیٹر" کے بالکل برعکس ہے خدا کرے کہ میرے جانشین مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی کے چلانے میں سب سے زیادہ جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ پرو وائس چانسلر پر تمام ذمہ داریاں ہیں مگر اسے کوئی اختیار نہیں ہے اور وائس چانسلر کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ مگر اس پر ذمہ داری کچھ بھی نہیں ہے۔

ایم اے او کالج کے پرنسپل صحیح طور پر یا غلطی سے اپنے سابق طلبا کو ملازمتیں دلانا اپنا فرض خیال کرتے تھے تاکہ وہ مطمئن رہیں۔ نواب وقار الملک مرحوم کے مستعفی ہونے کے بعد سے میں نے اس فرض کو انجام دیا اور ایمانداری سے میں اس کو کالج کی روایات میں خیال کرتا تھا کہ جن کو سر سید علیہ الرحمتہ۔ نواب محسن الملک۔ مسٹر تھیوڈور بک اور سر تھیوڈور ماریسن نے قائم کیا تھا ان تمام صاحبان سے میرا گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے فخر حاصل ہے

میری رائے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہمیشہ یہی رہی کہ گورنمنٹ سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد ہے میں نے ہمیشہ نیک نیتی سے اس روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اگرچہ اس میں مجھ کو اکثر کامیابی نہیں ہوئی میرا اندازہ ممکن ہے کہ اکثر موقعوں پر غلط ہوا ہو اور ممکن ہے کہ اکثر میری رائے صحیح نہ ہوئی ہو لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی خیال رہا ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ میری سپردگی میں ہے اس کو بہترین مصرف میں لاؤں۔

۱۹۲۵ء سے میں پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۲۷ اپریل ۲۵ء کو تیس سال ملازمت کرنے کے بعد میں نے سابق وائس چانسلر صاحب سے استدعا کی تھی کہ وہ اکتوبر ۲۵ء سے مجھ کو پرو وائس چانسلری کے فرائض سے سبکدوش کر دیں۔ لیکن انہوں نے ایک خط مورخہ یکم مئی ۲۵ء میں مجھ کو یونیورسٹی کے مفاد کے خیال سے استعفا دینے سے منع فرمایا۔ ایک سال بعد ۱۹۲۶ء میں انہوں نے میرے دوبارہ تقرر کی مندرجہ ذیل الفاظ میں سفارش کی:۔

"یونیورسٹی کو ایسے پرو وائس چانسلر کی ضرورت ہے جو قوم کی خاص ضرورتوں اور ملک کے مروجہ تعلیمی نظام سے واقف ہو اور پرو وائس چانسلر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے طلبا کے والدین سے ذاتی تعلقات ہوں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی خاص لیاقت اور قابلیت میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے آپ سے مئی ۱۹۲۷ء میں عرض کیا تھا کہ مجھ کو میرے موجودہ فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے آپ نے مجھ سے زبانی فرمایا تھا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے پیش ہونے تک میں توقف کروں۔

اس قدر عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ دوران قیام علیگڈھ میں مجھ کو مختلف محکموں کی ملازمت ملتی رہی ہے لیکن میں نے اپنی تقرری کے وقت جو وعدہ کیا تھا اس کا لحاظ کر کے میں نے ان کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب مجھ کو پورے طور پر یقین ہو گیا ہے کہ میں یونیورسٹی کی بہتر خدمت اس سے اپنے باضابطہ تعلقات ختم کرنے سے زیادہ کر سکتا ہوں لہذا بغیر کسی پس و پیش کے اپنے استعفے کو پیش کر کے اپنا فرض

ادا کرتا ہوں اور آپ سے مستدعی ہوں کہ جلد سے جلد جس طرح بھی ہو آپ اور اگزکٹو کونسل مناسب سمجھے اسے منظور کر لیا جائے ——

آپ کا صادق

ضیاء الدین احمد

استعفا بعد اعتراف خدمات منظور کر لیا گیا اور اگزکٹو کونسل نے طے کیا کہ "اس استحقاق رخصت کی بجائے جو کہ ان کو حاصل ہے چھ ماہ کی تنخواہ دی جائے جو نو ہزار روپیہ ہوتی ہے" ـــ لیکن ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ ایک خط وائس چانسلر کو مطلع کیا کہ مجھے اس رقم کے لینے سے انکار ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:-

"میں نے آپ کو اپنے استعفے کے دوران میں لکھا ہے کہ اس ادارہ کی خدمت میں میرا مقصد کام سے محبت اور فرض کی آواز کو پورا کرنا رہا ہے اور میں نے اپنی تیس سال کی ملازمت میں کبھی فرلو حاصل نہیں کی اور نہ کبھی کالج کے زمانہ تعطیلات کو کسی کام میں لایا اور ہمیشہ ان بڑی تعطیلوں میں یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر اپنے خرچ سے دورہ کرتا رہا اور میرا ضمیر مطمئن رہا کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ یہی میرا انعام ہے۔ میں آپ کا اور اگزکٹو کونسل کا اس مہربانی کے لئے مشکور ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی فرلو یا اس زمانے کے حق رخصت کی تنخواہ قبول نہیں کر سکتا اور نہ میں اس چیز کو منظور کر سکتا ہوں جس کو میں اپنے زمانۂ ملازمت میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔"

بہرحال کمیشن کے قائم کرنے سے جو مقصد تھا یعنی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ ڈالی جائے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو الگ کر دیا جائے وہ حاصل ہو گیا۔ جس شان کے ساتھ ان کا استقبال یورپ سے واپسی پر کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام کے ساتھ انہیں رخصت کیا گیا۔ علیگڈھ سے رخصت ہونے کے بعد ایسے رہے کہ جیسے علیگڈھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں دوست احباب سے خط وکتابت جاری رہتی تھی لیکن علیگڈھ کے نظم ونسق کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ہوتا تھا۔ خدا نے انہیں غیر معمولی ضبط کا مادہ عطا کیا تھا یہ کام ہر ایک انسان کا نہیں ہے کہ اس طرح یکسو اور بے تعلق ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب مئی ۱۹۲۸ء میں یورپ چلے گئے اس سفر کا مقصد تعلیم پر اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کرنا تھا دوران قیام انگلستان میں دو لطیفے ہوئے جو قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے لندن ٹائمز کے تعلیمی ایڈیٹر نے ملاقات کی۔ دوران ملاقات میں اس نے حیران ہو کر کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ۱۹۲۶ء میں تو مسلسل یہ صدا اٹھتی رہی ہندوستان میں علیگڈھ سے بہتر کوئی یونیورسٹی نہیں لیکن چھ ماہ بعد ہی یہ کہا جانے لگا کہ اس سے بدتر کوئی ادارہ نہیں۔ مدارج ترقی سے اترنے کے لئے کم سے کم پانچ سال کا عرصہ درکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ۱۹۲۵ء کی جوبلی اس کا سبب ہے۔ جب تک یونیورسٹی ترک موالات کا مقابلہ کرتی رہی حکومت تعریفیں کرتی رہی اور جب جوبلی پر تمام مسلم زعما ایک جگہ جمع ہو گئے تو حکومت کو خوف ہوا کہ اب پھر علیگڈھ مرکزی حیثیت حاصل کرنے والا ہے اس لئے قوت توڑنے کے لئے سب کچھ کیا گیا یونیورسٹی ویسی ہے جیسی تھی۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ایک روز سر ولیم میرس سابق گورنر یو پی نے جو کہ اب انڈیا کونسل کے ممبر تھے ڈاکٹر صاحب کو لنچ پر مدعو کیا دوران گفتگو میں انہوں نے ایک سوال کیا کہ علیگڈھ میں اب کچھ Troubles تو نہیں ہیں ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا آپ خود Troubles تھے آپ کے آنے کے بعد کچھ بھی نہیں۔

۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہوئے اور اسمبلی میں پہنچ کر انہوں نے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات کیں۔

(۶)

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد سر راس مسعود کا انتخاب ہوا اور عبوری دور کے لئے سر شاہ سلیمان کو کام سپرد کیا گیا علیگڈھ میں ایک

جماعت یونیورسٹی کے کاموں میں روڑے اٹکانے والی موجود تھی اس جماعت نے سر شاہ سلیمان اور سر راس مسعود جیسے نیک نفس لوگوں کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اکثر مشاہیر قوم کو خیال پیدا ہوا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ڈاکٹر صاحب کا وجود ناگزیر ہے۔ ادھر یو پی کے گورنر نے ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلری کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بعد ازاں وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ڈاکٹر صاحب سے بوقت ملاقات اصرار کیا کہ وہ وائس چانسلری کے امیدوار بن جائیں۔ چنانچہ وہ مجبوراً راضی ہو گئے لیکن انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ نواب صاحب بھوپال چانسلری سے ضرور الگ ہو جائیں گے اور انہیں میرا انتخاب قبول نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ انتخاب سے ایک روز قبل نواب صاحب بھوپال نے استعفا دے دیا۔ اور ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اب یہ بڑا سخت سوال درپیش تھا۔ کہ چانسلر کون ہو نواب صاحب بھوپال کو خیال تھا کہ کوئی مناسب آدمی ان کے درجہ کا مشکل ہی سے ملے گا لیکن ڈاکٹر صاحب اور لارڈ ولنگڈن کے ذاتی اثر سے نظام دکن نے چانسلر بننا منظور کر لیا اور اگست میں باقاعدہ ان کا انتخاب ہو گیا۔ نواب محمد اسماعیل خاں کو شکست ہوئی۔ تین سال کے بعد ۱۹۳۸ء میں دوبارہ انتخاب ہونے لگا تو پھر اسماعیل خاں مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ چند اراکین کورٹ کو یہ معاملہ سپرد کر دیا گیا ان کے مشورہ سے دونوں دست بردار ہو گئے اور سر شاہ محمد سلیمان کا انتخاب ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور پھر یہ مسئلہ پیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ سر سکندر حیات خاں اور سر اکبر حیدری نے بڑے انتظام و زور شور سے ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی اور سر شیخ عبدالقادر کو پیش کیا۔ غرض اس مرتبہ بھی ڈاکٹر صاحب ہی کامیاب ہوئے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہ ہو سکے لیکن مخالفین اس میں بھی ناکامیاب ہوئے۔ الیکشن کے زور شور میں جب ووٹ کے لئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے درخواست کی گئی تو انہوں نے سر شیخ عبدالقادر مرحوم سے فرمایا کہ آپ نام واپس لے لیں تو اچھا ہی ہے کیونکہ الیکشن میں ضیاءالدین سے نہ شیطان جیت سکتا ہے اور نہ جبرائیل۔

اپریل ۱۹۴۱ء میں نظام کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اب ڈاکٹر صاحب جون میں تعزیت کے لئے حیدر آباد گئے وہاں کے اخباروں میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف سر اکبر حیدری کے زیر اثر بہت زہر اُگلا جا چکا تھا۔ لیکن نظام نے نہایت اخلاق و مہربانی سے خیر مقدم کیا اور کئی مرتبہ شرف ملاقات بخشا اور بذریعہ فرمان علیگڈھ یونیورسٹی میں ایک مسجد "مسجد زہرا" کے نام سے تعمیر کئے جانے کا اعلان کیا۔

تیسری بار اپریل ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر صاحب کا انتخاب بلا مقابلہ عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ان کی قوم تعلیم میں بہت پیچھے ہے اور اس وجہ سے ملک میں مسلمانوں کا وقار ختم ہو چکا ہے ملک کے نظم و نسق میں بھی انہیں جیسا چاہئے حصہ نہیں ملتا لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم کو عام کیا جائے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور خصوصاً ٹکنیکل تعلیم کا مسلمانوں میں بالکل فقدان ہے لہٰذا اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ ہندو تمام سرکاری شعبوں پر حاوی ہیں اور وہ بوجہ تعصب مسلمانوں کو ملازمتوں میں گھسنے نہیں دیتے اگر مسلمان سوچتے رہے کہ پیسہ کافی ہو تو کام شروع کیا جائے تو یہ ناممکن ہے جس طرح بن سکے ہر قسم کی تعلیم جاری کر دینی چاہئے جب ایک کام جاری ہو جائے گی تو لامحالہ قوم اور حکومت دونوں اس طرف توجہ دیں گے اور امداد حاصل ہو گی اور ہمارے اداروں سے تربیت یافتہ افراد جیسے بھی نکلیں گے کام سنبھال لیں گے انہی خام کاروں میں پختہ کار بھی نکل آئیں گے اسی نظریہ کے تحت انہوں نے اپنی وائس چانسلری کے دور میں متعدد شعبے اضافہ کرنے شروع کر دئے چنانچہ انجینئرنگ کالج زراعتی کالج ٹکنیکل کالج میڈیکل کالج ٹیچرز ٹریننگ کالج وغیرہ کی اسکیمیں تیار کرتے رہتے تھے اور حسب موقع ان اداروں کا اجرا بھی کیا گیا اگرچہ وہ چھوٹے پیمانے ہی پر ہوا۔ وہ مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں دوسروں کی محتاجی سے الگ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کے حالات سے فائدہ اُٹھا کر عسکری تربیت کے لئے بھی ادارہ کھول دیا۔ طبیہ کالج اور انجینئرنگ کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں انجینئرنگ کالج کے ان ہی انجینئروں نے پاکستان

میں آکر اس محکمہ کو سنبھالا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہندوستان اور یورپ کے ممالک کے طرز تعلیم کے متعلق نہایت ہی وسیع معلومات تھیں اس ضمن میں شاید ہی اس ملک میں ان کے مقابلہ کا کوئی شخص نکلے۔ ان کا نظریہ تھا کہ تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ اپنے کاروبار میں آزادی ملنی چاہئیے اور حکومت کو کم سے کم دخل انداز ہونا چاہیئے۔ اور جس قدر سہولتیں عوام کو پہنچ سکتی ہیں وہ پہنچائی جائیں تعلیم کسی خاص طبقہ کا اجارہ بن کر نہ رہ جائے۔

امتحانات کے مروّجہ طریقہ کو بہت بُرا سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ ظالمانہ ہے اور ان کے نزدیک ایک خاص وقت میں پرچہ حل کرا کر اور نمبر دے کر طالب علم کی کئی سال کی محنت پر آخری فیصلہ کر دینا غیر منصفانہ ہے کیونکہ ایک ہی پرچہ کو اگر مختلف ممتحن دیکھیں تو نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ بہتر تھا کہ اساتذہ کو طلباء کی روز بروز ترقی اور اہلیت و صلاحیت کا علم ہونا چاہیئے۔ موجودہ طریقہ امتحان ان کے نزدیک حافظہ کا امتحان تھا وہ طالب علم کی علمی اور دماغی ارتقا کا پیمانہ نہیں تھا۔ طالب علم کو پاس ہونے کے لئے نمبر حاصل کرنے تک وہ نرم رہتے تھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے سخت ہوتے جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اصول و قوانین انسان کے لئے بنائے گئے ہیں اور انسان ہی نے بنائے ہیں اگر اصول و قوانین کی پابندی سے انسان کو نقصان کا اندیشہ ہو تو قوانین کو نظر انداز کر دینا چاہیئے انسان کو گرانا نہ چاہیئے انسان کے وضع کردہ قوانین خدائی قوانین نہیں ہیں۔ انہوں نے طریقہ امتحان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور اس کے بعد سے ممتحن بننا چھوڑ دیا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ ایسے طلباء مسلمانوں میں پیدا ہوں کہ وہ خواہ کیسی ہی مصیبت میں گھر جائیں کبھی بددل نہ ہوں اور ہمّت نہ ہاریں اور اپنے لئے راستہ بنا لیں اسی لئے وہ ہمیں درس و تدریس سے زیادہ تربیت پر زور دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ طلباء میں ضبط و نظم بغیر کسی تعزیری کارروائی کے قائم کیا جائے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ہونہار طلبا کے ساتھ ہر قسم کی مراعات کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو نہایت شفقت سے کام کرنا سکھاتے تھے۔ ان کا دروازہ ہمہ وقت طلبا کے لئے کھلا رہتا تھا اور ملاقات میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ایم اے کے طلبا کو ہفتہ میں ایک بار ضرور گھر پر مدعو کرتے تھے اور اس وقت نہ صرف ان کے مضمون کے متعلق بات چیت ہوتی بلکہ قومی مسائل پر بھی گفتگو ہوا کرتی تھی انہیں اپنے شاگردوں کے متعلق جزئیات تک سے واقفیت رہتی تھی اور اگر برسوں بعد بھی کوئی مل جاتا تو اپنی غیر معمولی قوت یادداشت کی بنا پر اس کے پرانے واقعات دہرا دیتے اُس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلبا کو ان کے ساتھ فرزندانہ عقیدت ہو جاتی تھی۔ اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ چودھری خلیق الزمان صاحب سے منسوب ہے۔ چودھری صاحب موصوف نے فرمایا کہ جنگ بلقان کے زمانے میں طلبا مسجد میں جلسے کرتے اور حکومت برطانیہ کے خلاف تقاریر ہوتیں۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان تمام باتوں کو مسٹر ٹول پرنسپل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی چھان بین کے لئے چودھری صاحب ہی کے کمرہ پر مختلف ٹیموں کے کپتان اور یونین کے وائس پریزیڈنٹ جمع ہوئے اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر اپنی اپنی رائے دینے لگے کہ کون شخص مسٹر ٹول کو خبریں پہنچاتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ رائڈنگ اسکول کے کپتان صاحب خبریں پہنچاتے ہیں۔ بعد ازاں یہ طے ہوا کہ چودھری صاحب رات ہی رات میں ایک اشتہار کا مسودہ تیار کرکے اور اسے اسکول کے بچوں سے اُلٹے ہاتھ سے لکھوا کر اس چغل خور کی قلعی کھولنے کے لئے مختلف مقامات پر چسپاں کرائیں چنانچہ چودھری صاحب نے ایسا ہی کیا صبح کو کپتان مذکور نے ان اشتہاروں کو نوچنا شروع کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی پہنچی اور چونکہ چودھری صاحب ہاؤس مانیٹر بھی تھے ان کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ یہ اشتہار بازی کس کا کام ہے چودھری صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء میں ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اصرار سے انہیں دعوت پر بلایا ادھر ادھر کی باتوں میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کو وہ اشتہار والا واقعہ یاد ہے فرمانے لگے ہاں خوب یاد ہے وہ کارگزاری تمہاری ہی تھی۔ لیکن میرے پاس کچھ ثبوت نہ تھا اس لئے میں کچھ نہ کر سکا۔ اس قسم کی باتیں درحقیقت ان کی کامیابی کا راز تھیں۔

انہیں اپنے طلبا پر زبردست بھروسہ اور اعتماد تھا۔ جب لارڈ لوتھین ہندوستان آئے تو تمام ملک کے طلباء نے جہاں بھی وہ گئے ان کے خلاف مظاہرے کئے۔ سر آغا خاں کی خواہش تھی کہ وہ علیگڑھ آئیں ڈاکٹر صاحب نے فوراً لارڈ لوتھین کو مدعو کر دیا۔ سب لوگ پریشان تھے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے طلبا کچھ ناشائستہ حرکت نہ کر بیٹھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا ہمارے طلبا مسلمان ہیں اور انہیں اسلامی مہمان نوازی کا پاس ہے چنانچہ لارڈ موصوف آئے اور نہایت ضبط و نظم کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہوا۔ کھانے کے بعد لارڈ نے طلبا کی تعریف کی ڈاکٹر صاحب نے جوابی تقریر میں فرمایا کہ :-

”میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ طلبا کا زیادہ حصّہ آپ کی آمد کا مخالف تھا لیکن جب کارکنان کالج نے دعوت دے دی تو طلبا نے اپنی مخالفت پر آپ کے خیر مقدم کو ترجیح دی۔“

طلبا سے بعض اوقات ایسی حرکات سرزد ہو جاتی تھیں جن کی بنا پر وہ قانون کی زد میں آ سکتے تھے ڈاکٹر صاحب اس موقع پر وہی کرتے تھے جو ایک باپ کر سکتا ہے وہ کہا کرتے تھے کوئی باپ اپنی اولاد کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا میں کیسے کر دوں۔ ان کا عقیدہ تھا جرم کی اصلاح اس قسم کی تعزیری سزا سے نہیں ہوگی طلبا جوانی کی ترنگ میں اگر کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو بعد میں ضرور پچھتاتے ہیں اگر پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور سزا کرا دی جائے تو بہت ممکن ہے وہ عادی مجرم بن جائیں۔ چنانچہ وہ طلبا کو اس طرح بچا لیتے تھے ایسی متعدد مثالیں ان کی زندگی میں پیش آئیں اور وہ طلبا جنہیں انہوں نے اس طرح بچایا بعد میں سوسائٹی کے نہایت مفید افراد ثابت ہوئے۔ رسٹی کیشن کے نام سے انہیں چڑ تھی وہ قوم کے نوجوانوں کی آئندہ زندگی برباد کرنے کے سخت مخالف تھے۔ کسی طالب علم کا داخلہ اس وجہ سے نہیں روکا جاتا تھا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے ایسے طلبا کی وہ ضرور مالی امداد کرتے تھے۔ وہ اپنے طلبا کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ فارغ التحصیل طلبا کو ملازمت دلانا ان کا روزمرہ تھا۔ کسی کی سفارش کرنے سے انکار کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے کوئی دن ایسا جاتا ہوگا کہ کسی کی سفارش نہ کرتے ہوں انہوں نے بے شمار لوگوں کو برسر روزگار لگایا۔

وہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی پارٹی سے متعلق رہے پہلے انڈی پنڈنٹ پارٹی میں اور پھر مسلم لیگ پارٹی میں۔ انہوں نے ریلوے۔ مالیات۔ ٹیکس اور مزدوروں کے مسائل پر ماہرانہ اور قابلانہ بحثیں کیں۔ ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلی تقریر ریلوے پر تھی اور ایسی پُر مغز تھی کہ ریلوے کے فائننشیل کمشنر کو شبہ ہوا کہ شاید کسی ریلوے کے افسر نے لکھی ہے ڈاکٹر صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے دوران تقریر میں اس انگریز افسر کو مخاطب کر کے کہا کہ ”آپ کا خیال غلط ہے کہ یہ تقریر کسی نے مجھے لکھ کر دے دی ہے اور میں نے تیار کر لی ہے میں نے آپ سے زیادہ مشکل امتحان پاس کئے ہیں مجھے ضرورت نہیں کہ کوئی میرے لئے تقریر لکھے میں دوسروں کو تقریر لکھ کر دینے کی قابلیت رکھتا ہوں“۔ معاشی مسائل پر بڑی وقیع تقاریر کرتے تھے۔ حکومت کے مسلمان ملازمین کے معاملات میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے بحث کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم جداگانہ ہو اور ان کے مفاد محفوظ رہیں۔

ان کی علمیت اور ہمہ دانی کا یہ عالم تھا کہ ریاضی تو ان کا مضمون ہی تھا لیکن فلکیات۔ معاشیات۔ جغرافیہ۔ تعلیمات غرض جس موضوع پر ضرورت ہو اس کا سرسری مطالعہ کر کے اور اصول و نظریات کو سمجھ کر ایسی بحث کرتے تھے کہ ماہرین ان کے سامنے سپٹ پٹا جاتے تھے۔ بظاہر وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ لیکن دماغ کی مشین ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ بڑے بڑے تجربہ کار کسی گتھی کو سلجھانے میں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور ڈاکٹر صاحب نے آن واحد میں سلجھا دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ریاضی کو مسلمانوں نے ہوّا سمجھ رکھا ہے مجھے اس طلسم کو توڑنا ہے۔ لکچر کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک دریا بہ رہا ہے۔ بعض متبحر عالموں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی قابلیت سے اپنے علم کا توازن پیدا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب میں باوجود تبحر علمی یہ قابلیت تھی کہ طلبا کی مشکلات کا اندازہ

خوب کر لیتے تھے اور اکثر اپنی بلند علمی سطح سے نیچے اُتر آتے تھے۔ تاکہ مسئلہ طلبا کے ذہن نشین ہو جائے ان کے لکچروں میں جہاں تک ممکن ہو لطائف و ظرائف ہوتے تھے تاکہ مضمون کی خشکی اسے غیر دلچسپ نہ بنا دے۔ باوجود عالی دماغی اور تبحر علمی کے ان میں طالب علمانہ جذبہ موجود تھا کوئی بات جو انہیں معلوم نہ ہو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے دریافت کرنے میں انہیں تامّل نہ ہوتا تھا اور نہ اس علمیت کا ان میں غرور تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک یا اسکول ٹیچر کے ہاں دعوت میں اسی خوشی سے شریک ہوتے تھے جیسے وائسرائے کے محل میں۔ انہیں اپنی عظمت و اہمیت کا قطعی احساس نہ تھا۔ بعض اوقات معلوم ہوتا تھا کہ انہیں پوزیشن کا پاس نہیں مخاطب چھوٹا ہو یا بڑا اسلام میں پیشقدمی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ عرصہ تک یورپ میں رہے لیکن اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے وہ پورے و مکمل ہندوستانی مسلمان تھے۔ چنانچہ کپڑوں کے معاملے میں کوئی اہتمام نہ تھا۔ کام کی ضروریات کی وجہ سے سوٹ پہنتے تھے لیکن اس سوٹ کی بے بضاعتی سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ عید بقر عید پر اور اعزا کی تقاریب میں وہ شیروانی پہنتے تھے اور پاجامہ۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر صاحب انتہا درجہ کے منکسر المزاج تھے۔ اپنے ماتحتوں کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ اور طرح طرح امداد کرتے۔ مالی امداد گاہ بگاہ دیتے اور کبھی قرضہ کی صورت میں کر دیا کرتے تھے لیکن اس کی ادائیگی میں کبھی سختی نہ کی جاتی تھی۔

مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اکثر دعوتیں ہوا کرتی تھیں بڑی بڑی اور شاندار اور چھوٹی و معمولی لیکن ان کا اہتمام ایسا تھا کہ کم سے کم خرچ ہوتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر غم غلط ہو جاتا تھا۔ گاہ گاہ اپنے کنبہ کے افراد کو اور خصوصاً بچوں کو جمع کر لیتے تھے اس روز ان کی کوٹھی میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ بچوں کے ساتھ ہنسنے بولنے میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔ چائے ان کے ہاں بڑی بدمزہ اور خراب ہوتی تھی لیکن قہوہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا پیتے تھے کہ اکثر احباب اس کی فرمائش کرتے تھے۔ اور قائد اعظم تو خاص طور پر قہوہ پر مدعو کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی میں اپنے اعزا کو مدعو کیا تھا اسی اندازے سے انتظام تھا۔ بعض طلبا نے سازش کی اور قریب سو طلبا بن بلائے مہمان جا پہنچے ڈاکٹر صاحب قطعی نہ گھبرائے بلکہ خوش ہوئے اور انہیں الگ بٹھایا تاکہ دوسرے دور کا انتظار کریں اتنی دیر میں فوراً انتظام مکمل ہو گیا انہیں طالب علمی کے زمانے سے علیگڈھ کے ڈائننگ ہال کا نسخہ یاد تھا یعنی ایسے غیر متوقع حالات میں سالن میں شوربے کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔

ان میں ایک خصوصیت تھی کہ ابھی ایک مسئلہ درپیش ہے اس پر غور و فکر ہو رہا ہے کہ یکایک کوئی دوسری قسم کا مسئلہ آ کھڑا ہوا تو وہ فوراً اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تھے نہ ان کا دماغ تھکتا تھا نہ ذہن میں اُلجھن پیدا ہوتی تھی جب کوئی بڑی سے بڑی اسکیم درپیش ہوتی تو ان کے سامنے اس کے تمام پہلو ہوتے اور معمولی سے معمولی جزئیات پر نظر رہتی ذہن ایسی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب کوئی ان کے ساتھ کام کرنے بیٹھتا تو مشکل ہی سے ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ یادداشت بڑے غضب کی تھی اور پھر یہی نہیں جس وقت جس چیز کو چاہتے یاد آ جاتی اور جب چاہتے اُسے بھلا دیتے تھے۔

مخالفین کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے درپے رہی لیکن وہ کبھی کسی سے انتقام لینا تو کجا اور اپنے مخالفین پر احسان کرتے تھے۔

جب ان کا انتخاب وائس چانسلری کے لئے ہوا تو نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے چانسلری کے عہدہ سے استعفا دے دیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عسکری تربیت کا مرکز یونیورسٹی میں جاری کرتے وقت ان سے امداد کی استدعا کی اور تعلّقات خوشگوار ہو گئے نواب صاحب علی گڈھ آئے مشورہ بھی دیا اور امداد بھی۔ مرکزی اسمبلی میں ملک کے غذائی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے بھوپال کے غذائی نظم و نسق کی عمدگی کی مثال دی اور اس کی بہت تعریف کی۔ وہ کبھی کسی مخالف کی عزّت کے درپے نہیں ہوتے تھے رحمت اللہ کمیشن کے صدر سر رحمت اللہ مرکزی اسمبلی میں اسپیکرشپ کے اُمیدوار تھے اور ڈاکٹر صاحب سے مدد کے طالب تھے ڈاکٹر صاحب نے کھلے دل سے ان کی امداد کی یہ وہی کمیشن تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کو علی گڈھ سے الگ کر دئے جانے کی سفارش کی تھی۔ بعض اوقات جب

طلبا کسی معاملہ میں مخالفت یا ہڑتال کرنے پر تُل جاتے تو ان کے سامنے جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی مگر وہ اس وقت بھی بے دھڑک طلبا کے مجمع میں گھس جاتے اور ایسی تقریر کرتے کہ سرکش سے سرکش بھی گردن جھکا دیتا اور وہ جو چاہتے ان سے منظور کرا لیتے تھے ۔ ان کے مخالفین ان پر پارٹی بازی کا الزام لگاتے تھے ۔ پارٹیاں سب ہی نے بنائیں اور کوئی جمہوری ادارہ بغیر پارٹی نہیں چل سکتا ۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ ان کی پارٹی جیتی اوروں کی ہاری ۔

ان کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ تھا کہ دوسروں سے کام لینے کی ان میں صلاحیت تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ خود لگاتار و مسلسل کام کرنے کی دھن تھی ۔ ذہانت کے علاوہ ان میں جسمانی توانائی اور چستی اس غضب کی تھی کہ لگاتار گھنٹوں کام کر سکتے تھے جتنی زیادہ مشکلات ہوتیں اتنا ہی تیزی سے انکا ذہن کام کرتا تھا اور کام کرنے کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی ۔ وہ دنوں سفر میں رہتے لیکن سفر سے واپس آتے ہی پہلے دفتر کا رخ کرتے اور کام میں مصروف ہو جاتے تھے ان کے ساتھ کام کرنے والے اکثر عاجز آ جاتے تھے ۔ ایک دفعہ ان کے ایک شاگرد رشید نے ان سے کہا کہ آپ کی تقلید کرنا معمولی انسان کا کام نہیں ہے آپ نے غالباً جنّ مسخر کر رکھے ہیں ہنس کر فرمانے لگے جو قویٰ خدا نے عطا کئے ہیں ۔ ان سے کام لینا چاہئے بس یہی جنّات ہیں ان کو تابع کرنے کے لئے خلوص و محبت کی ضرورت ہے ۔ ان کے سفر کا ہی حساب لگایا جائے تو غالباً عمر کا ایک تہائی سفر میں گزرا ۔ یہ سب کچھ علیگڈھ کے لئے تھا اسی کے لئے وہ یہ تکالیف برداشت کرتے تھے ۔ سرسیّد علیہ الرحمتہ کے بعد اگر کوئی ہستی تھی تو ڈاکٹر صاحب کی تھی کہ ادھر آپ علیگڈھ کا نام لیں اور فوراً ڈاکٹر صاحب کا نام ذہن میں نہ آئے یا ڈاکٹر صاحب کا نام لے کر تو علیگڈھ آپ کے ذہن پر مسلط نہ ہو ۔ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کچھ لازم و ملزوم سے تھے ۔ ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ حاوی جو چیز تھی وہ علیگڈھ اور اس کی خدمت بعض مخالفین کا اعتراض تھا کہ اسمبلی کی ممبری سے علیگڈھ کے کام میں خلل پڑے گا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی وہ علیگڈھ ہی کی خدمت کے لئے گئے تھے یونیورسٹی کے بے شمار کام بنتے تھے ۔ وہ جس قدر سفر یونیورسٹی کے لئے کرتے تھے ایک پیسہ بھی سفر خرچ کا یونیورسٹی سے نہ لیتے تھے ۔ اور جو کچھ یونیورسٹی کو ان کے دور میں حاصل ہوا وہ سب ان کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھا ۔ میڈیکل کالج فنڈ کے لئے دو سال میں پچاس لاکھ روپیہ جمع کر دینا ان ہی کے بس کا کام تھا ۔ سرسیّد کے بعد اگر کسی کو چندہ جمع کرنے کا گُر آتا تھا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے ۔ ہر جگہ ہر موقع پر ان کے دل میں یونیورسٹی کی لگن قوم کی تڑپ اور اپنے طلبا کے لئے بے چینی رہتی تھی ۔

قائداعظم نے جب لیگ کے پرچم کے نیچے قوم کو مجتمع کر لیا اور مرکزی اسمبلی میں بھی مسلم لیگ پارٹی کی بنا ڈالی اس وقت ان کی دور رس نگاہ ڈاکٹر صاحب ہی پر پڑی انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ذمہ پارٹی کی تنظیم کا کام کیا اور اس کا سکرٹری انہی کو بنایا اسی زمانے میں یونیورسٹی کے لئے وائس چانسلر کا انتخاب ہونے والا تھا اور کورٹ کے ممبران کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کو چاہتی تھی لیکن انہوں نے قائداعظم کی خواہش کا احترام کیا اور اس قومی خدمت کو اس پر ترجیح دی اور سر شاہ سلیمان کو بلا مقابلہ منتخب کرا دیا ۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ خود دھن کے پکّے تھے ۔ اور جس کام کو لے کر کھڑے ہوتے تو اسے بلا خوف مخالفت پورا کر کے چھوڑتے تھے اسی وجہ سے انہیں قائداعظم کی یہ ادا پسند تھی کہ جب وہ کسی اصول یا پالیسی کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتے تھے تو پھر کوئی چیز انہیں اپنی رائے سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ہی ان کا عزم مضبوط ہوتا تھا ۔ چنانچہ وہ قائداعظم کی سیاست پختگی رائے بلند کردار دیانت اور علو ہمتی کے بڑے مداح تھے ۔ ڈاکٹر صاحب کا عقیدہ تھا کہ اسلامی جمہوریت یہ ہے کہ پہلے سوچ سمجھ کر اپنا قائد چن لو اور پھر بے چون وچرا اس کا ساتھ دو ۔ اختلاف ہو تو نجی طور پر بحث کر لو ۔ لیکن عوام میں لیڈر کی ہمیشہ حمایت کرو ۔ اسی جذبہ کے تحت وہ مسلم لیگ میں شریک ہوئے تھے ۔ اور آخر وقت تک قائداعظم کے حامی و مددگار رہے ۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق علیگڈھ سے کم وبیش ساٹھ برس رہا وہ علیگڈھ میں بحیثیت طالب علم آئے ۔ مانیٹر ہوئے ٹیچر ہوئے ۔ پروفیسر ہوئے ۔ اسسٹنٹ ٹیوٹر ہوئے ۔ ٹیوٹر ہوئے ۔ پرنسپل ہوئے ۔ پرووائس چانسلر ہوئے ۔ چانسلر ہوئے اور آخر میں ریکٹر ہوئے انہوں نے سرسید علیہ الرحمتہ سے تازیست علیگڈھ کی خدمت کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا ۔ علیگڈھ سے والہانہ محبت طلبا کی خیر سگالی اور مادر علمی سے وفاداری ایسی خدمات ہیں جن کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے ۔

علیگڈھ کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد ستر سال کی عمر میں وہ قوم کا جواں ہمت شیدائی ۱۹۴۷ء میں یورپ اور امریکہ تعلیمی ترقیوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کی غرض سے وطن سے روانہ ہوا ۔ امریکہ اور دیگر ممالک یورپ کا دورہ کیا ۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں واپسی کا ارادہ تھا کہ سر آغا خاں سے ملاقات کرنے کے لئے پیرس گئے وہاں سے لندن آتے ہوئے راستے میں فالج کا حملہ ہوا ۔ نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے ۔ وہاں ایک روز مسلمان نوجوانوں کو چائے پر مدعو کیا اور باوجود تکلیف کے ان سے کہا کہ آپ لوگ یہاں سے ہندوستان ہی واپس جائیں اور وہیں رہیں اگرچہ وہاں ملازمت نہیں ملے گی لیکن یہ خوشی کی بات ہے اسی وجہ سے آپ لوگ زراعت صنعت وحرفت اور صحافت کی طرف متوجہ ہوں گے ۔ وفات سے ایک روز قبل اپنے معالج ڈاکٹر غیاث الدین صاحب کو پاس بلا کر کہا ۔ کہ آپ اب ہندوستان جا کر کام کریں ۔ اب آپ جیسے حضرات کی وہاں ضرورت ہے اب مسلمانوں کی تعلیم وہاں ایک اہم مسئلہ ہوگا ۔

۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء کو گیارہ بج کر ۴۰ منٹ پر اس جہان فانی سے رحلت کی انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ دوسری و تیسری فروری ۱۹۴۸ء کی درمیانی شب میں تابوت براہ بحری جہاز علیگڈھ پہنچا ۔ اور ۴ فروری کو سرسید علیہ الرحمتہ کے پہلو میں مغربی جانب دفن کیا گیا ۔

ملک بھر میں کہرام مچ گیا اخبار و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے ہم صرف دو رسائل کا مختصر اقتباس دیتے ہیں معارف نے لکھا کہ :-

مرحوم اس دور کی پیداوار تھے جب مسلمانوں پر مغربی تمدن مسلط تھا ۔ اور اس کا سب سے بڑا مرکز علیگڈھ تھا ۔ لیکن انہوں نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا ۔ اب تو ضعیفی کی عمر تھی وہ ہر زمانے میں نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع میں بھی مسلمان رہے ۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور بے تکلف تھی ان کی سادگی میں ایک صاحب کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی ۔ شخصی طور پر بھی ان سے لوگوں کو بڑے فوائد حاصل ہوئے ان کی ذات سے سینکڑوں غریب طالب علموں نے تعلیم حاصل کی اور انہوں نے بہتوں کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا ۔ ملازمتیں اور بڑے بڑے عہدے دلوائے ۔

صدق لکھنؤ کے مدیر نے لکھا کہ :-

موتیں اچھے اچھے مخلص مسلمانوں کی بھی کہنا چاہیئے کہ روز ہی ہوتی رہتی ہیں اور بعض یقیناً بہت ہی دردناک وقلق انگیز بھی ہوتی ہیں لیکن کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فرد واحد کی نہیں پوری جماعت کی پورے ادارہ کی موت کہی جا سکتی ہے علیگڈھ کے مرحوم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وفات اسی قسم میں آتی ہے . . . . بڑے ذی مروت اور بڑے ہی فیض رساں تھے دروازہ ہر علی گڈھی کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا ہر اولڈ بوائے کے میزبان دوست اور دست گیر تھے ۔ آمدنی کا بڑا حصہ طلبا ہی کے لئے وقف تھا ۔ خدا معلوم کتنوں کو عہدے دلوائے کتنے بیروزگاروں کو روزگار سے لگایا کتنے بھوکوں کو کھلایا کتنوں کی سفارشیں کیں کتنوں کی خالی جیبیں اپنے پاس سے بھر بھر دیں . . . .

بعض اہل صحافت نے جو مستقل پروپاگنڈا مرحوم کی مخالفت میں مہینوں بلکہ برسوں جاری رکھا اور جس نے ان کے ہر ہنر کو عیب ہی بنا کر رکھا وہ خود ہی ان کے حق میں کفارہ کا کام دے سکتا ہے ۔ عجب نہیں اسی سے وہ بالکل

ڈھل گئے ہوں۔

اصنافِ سخن میں مدحت طرازی۔ مرثیہ، سلام اور قصیدہ سب ہی کچھ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے جنازہ کے استقبال کے سلسلے میں شائع ہوئی جنازہ کی استقبالیہ نظم ایک جدّت ہے ہم اسی نظم پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

استقبالیہ نظم از پروفیسر محمدؐ حاذق صاحب ایم اے شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی

علیگڈھ تونے کی ہے اہل ملّت کی پذیرائی
ہوئی ہے تجھ میں ارکانِ حکومت کی پذیرائی

ترے ایوان میں آمد ہوئی اکثر امیروں کی
بڑے ارماں سے کیں تو نے مداراتیں امیروں کی

رئیسانِ وطن کا تونے استقبال دیکھا ہے
شہانِ ذی حشم کا موکب اجلال دیکھا ہے

مگر یہ شان استقبال کی سب سے نرالی ہے
کہ آج اک تیرے شیدائی کی میّت آنے والی ہے

سلامی کو صفیں استادہ ہیں اعیانِ ملّت کی
کہ ہوگی پیشوائی زبدۂ ارکانِ ملّت کی

بیاں کیا ہو حقیقت قوم کے اندوہ بے حد کی
کہ لاش آتی ہے یورپ سے ضیاء الدّین احمدؒ کی

وہ جس نے اپنی ہستی کو مٹایا قوم کی خاطر
پڑا جو بار وہ سر پر اُٹھایا قوم کی خاطر

شکایت جس کے لب سے شکر بن کر برملا نکلی
وہ جس کے منہ سے اکثر گالیاں کھا کر دُعا نکلی

بڑھاپے میں ملی تھی جس کو ہمّت نوجوانوں کی
وہ جس کی خاک ساری میں تھی رفعت آسمانوں کی

وہ جس کی عمر گزری میڈیکل کالج کی خواہش میں
دیا نقد حیات آخر اسی سودے کی کاہش میں

وہ جس نے خاک چھانی پائے مردی سے زمانے میں
فراہم کر دئے لاکھوں ہی کالج کے خزانے میں

وہ اپنا ڈاکٹر جو ماہرِ امراضِ ملّت تھا
جو سچ مچ چارہ سازِ قوم تھا نبّاضِ ملّت تھا

دیارِ غیر میں جس کے لئے پیکِ اجل آیا
زمانہ میں شہیدِ علم کا جس نے لقب پایا

جسے سب سے فزوں تھا قوم کا غم بعد سیّد کے
جو تھا طلاب کا ہمدرد و ہمدم بعد سیّد کے

سُن اے خاکِ لحد سُن یہ امانت سونپی جاتی ہے
تجھے سارے مسلمانوں کی دولت سونپی جاتی ہے

قیامت تک اسے آغوش میں رکھ امن و راحت سے
کہ یہ خاکی جسد محروم آسائش تھا مدّت سے

دُعا ہے یہ کہ پلّہ نیکیوں کا اس بھاری ہو
دمِ حشر اس کے سر پر سایۂ افضالِ باری ہو

رہا از بس کہ ملّت کی ہوا خواہی سے کام اس کو
ملے جنّت میں قرب حضرت خیر الانامؐ اس کو

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم

غلام پنجتن

انیسویں صدی کا ربع حصہ گزرا تھا کہ ان کے دادا کشمیر سے سلسلۂ ملازمت پنجاب میں آئے۔ اور اس کے بعد میرٹھ میں مقیم ہو گئے۔ یہ بزرگ اُن معدودے چند مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم کو بدعت نہیں سمجھا اور اپنے فرزند خدا بخش کو انگریزی پڑھائی لکھائی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی جوان عمری میں کمپنی بہادر کے ملازم ہو کر سرحدی ضلعوں ڈیرہ غازی خاں، بنوں وغیرہ میں محکمہ بندوبست میں خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مولوی خدا بخش صاحب ضلع سہارنپور کی کلکٹری میں ہیڈ کلرکی پر آ گئے۔ چونکہ انہوں نے انگریزی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔ مولوی خدا بخش صاحب ۳۵ برس کی عمر میں سہارنپور ہی میں ۱۹۰۶ء میں انتقال کر گئے۔ اُن کی والدہ اپنی بیوہ بہو اور چار کم سن پوتوں کو لے کر پھر میرٹھ آ گئیں۔ ان چار یتیموں میں مولوی چراغ علی سب میں بڑے اور بارہ سال کے تھے جو آگے چل کر نواب اعظم یار جنگ بن کر آسمان ادب ہی پر نہیں چمکے بلکہ ریاست حیدر آباد کی تنظیم جدید میں جو سر سالار جنگ اول نے شروع کی تھی نمایاں مقام حاصل کیا اور آج تک ایک محلہ "چراغ علی لین" کے نام سے ان کا مسکن ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔

اس لاوارث گھرانے کو میرٹھ میں دوبارہ آئے ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ہنگامہ شروع ہو گیا جس کو "غدر" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے حالانکہ وہ ایک سوچی سمجھی حکومت کو بدیسی قوت کے ہاتھوں سے چھین لینے کی مہم تھی جو مقررہ وقت سے پہلے شروع ہونے اور ڈسپلن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ناکام رہی۔ ان سورماؤں میں نہ تو مذہبی جوش تھا اور نہ نسلی تفریق جو قتل و غارت گری تو کیا ان لوگوں کو سبق دینا تک گوارا کرتی جو سرکار انگریزی کا اقتدار بڑھانے میں اپنی فلاح سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ شہر میرٹھ ہی پر جہاں اس انقلاب کا زور رہا کسی نے اس گھر کی طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ خون خرابا تو اس وقت عام ہوا جب لاہور سے سکھوں کی اور دکن سے نظام کی کمک شمالی ہند پہونچی اور کمپنی بہادر کا سکہ بٹھانے کی غرض سے ہندوستانیوں کو بزدل بنانا اور مسلمانوں کا تختہ اُلٹنے اور انہیں ذلیل کرنا شروع ہوا۔ عوام تو کیا خواص میں جو خوف بٹھایا گیا اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سر سید ایسے جری شخص کی ہمت نہ ہوئی کہ اس شورش کے متعلق جو معرکۃ الآرا تصنیف کی اس کا نام "رسالہ اسباب بغاوت" نہ رکھتا۔

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے کئی سال ایسے گزرے کہ میرٹھ اور اس کے قرب و جوار میں کسی کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایسے میں

جیسی ایک یتیم کی تعلیم ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں طریقہ تعلیم بھی دوسرا تھا نہ تعلیمی کمیشن بیٹھتے تھے نہ محکمہ تعلیمات تھا۔ نہ درجے داری نصاب سال کے سال شائع ہوتا تھا۔ نہ پبلک اسکولس تھے نہ شاندار عمارتوں والے کالج۔ جب مہدی علی، مشتاق حسین، چراغ علی، الطاف حسین حالی، ذکاء اللہ، شبلی، نذیر احمد ایسے ادیبوں اور رہنماؤں کو دیکھتے ہیں تو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ آخر ایسے ادیب اور صاحب فکر، اہلِ بصیرت ہماری یونیورسٹیوں کی مکمل تعلیم کیوں نہ پیدا کر سکی۔ چٹائی پر دو زانو بیٹھ کر اُدھوری تعلیم حاصل کر کے افکارِ دنیا میں جتنی کچھ بصیرت فنون ہمارے بزرگ حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح چراغ علی کو اُردو، فارسی اور انگریزی کی معمولی تعلیم حاصل کرتے ہی تلاشِ روزگار میں نکلنا پڑا۔ گورکھپور کی کمشنری میں ایک ضلع بستی نیا قائم ہوا تھا۔ چراغ علی وہاں جا کر بیس روپیہ ماہوار کے نوکر ہو گئے۔ دفتر کے بعد جو وقت ملتا اس میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں ایک انگریز افسر جس کے ساتھ ان کے والدِ مرحوم پنجاب میں کام کر چکے تھے اودھ کا جوڈیشنل کمشنر ہو کر آیا۔ چراغ علی اس سے ملنے گئے اس نے ان کا تقرر انشی روپیہ ماہوار کی جائداد نائب منصرمی پر جو اتفاق سے اس وقت خالی تھی فوراً کر دیا۔ اس طرح بستی سے لکھنؤ پہونچے۔ اس زمانے تک انہوں نے اتنی علمی استعداد حاصل کر لی تھی کہ ان کے مضامین لکھنؤ کے رسالوں میں چھپنے لگے۔ لکھنؤ میں آ کر انہیں اہلِ علم و فضل کی صحبت کا موقع ملا۔ جس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی کا جواب لکھ کر اسی زمانۂ قیام لکھنؤ میں انہوں نے شائع کیا جو نہ صرف علماء اسلام کو پسند آیا بلکہ سرسید احمد خاں نے جنہوں نے مذہب کے بچاؤ میں ایک نئی روش اختیار کی تھی بڑی داد دی۔ عام مسلمانوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چراغ علی اب مولوی چراغ علی کہلائے جانے لگے۔ سرسید نے اُن کی ذہانت اور علمی شخصیت کی اتنی قدر کی کہ انہیں تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح مولوی صاحب، اسلام پر جو اعتراضات ہو رہے تھے اُن کے جواب دینے اور عیسائیوں کو اسلام اور اس کے پیغمبر کی خوبیوں سے واقف کرانے میں لگ گئے اور اسلامی فرقوں کی آپس کی کج بحثی سے ہمیشہ دُور رہے۔ چنانچہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ مردم شماری کے نقشوں میں اپنی بیگم صاحبہ کو تو انہوں نے شیعہ لکھا ہے لیکن اپنے اور اپنے بچوں کے نام سے آگے نقطہ لگا دیا۔

لکھنؤ سے ان کا تبادلہ سیتاپور ہو گیا۔ وہاں انہیں سرسید احمد خاں کے لکھنؤ آنے کی خبر ملی اور وہ سرسید سے ملنے لکھنؤ آئے دونوں کا غائبانہ تعارف تو خطوط اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعہ سے ہو چکا تھا۔ رو برو کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ انھیں بیادہ ہوتے ہی وہ مہدی علی اور مشتاق حسین کی طرح سرسید کی طرف کھنچے ہوئے چلے گئے۔ سرسید کو جس جوہر کی تلاش تھی وہ انہیں مل گیا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو سینے سے لگایا سر پر بٹھایا اور خوب چمکایا۔ دوسرے مہینے ہی مولوی صاحب رخصت لے کر علی گڈھ پہونچے اور سرسید نے انہیں انگریزی اور عربی کی مستند کتابوں کے مطالعے اور اُن کے تراجم میں لگا دیا جن کی اس وقت مذہبی نکتہ نظر سے ضرورت تھی۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تبلیغی کاموں کے لئے سرمایہ ہونے کے علاوہ حکومت کی پوری تائید حاصل تھی۔ عیسائی مذہب میں داخل ہونے سے روحانی برکت حاصل ہو یا نہ ہو اخلاقی حالت سُدھرے یا نہ سدھرے مگر دنیاوی بہتری کا دروازہ ضرور کھل جاتا تھا۔ برہمو سماجی اور اس کے بعد سوامی دیانند سرسوتی کا آریہ سماجی مشن اسی روک تھام کے لئے انتھک کوشش میں لگا ہوا تھا۔ پڑھے لکھے مسلمان نئے فلسفے کے شیدا بن کر اور اپنے پرانے دقیانوسی عقائد سے جو رفتہ رفتہ مذہب میں داخل ہو کر جزو مذہب بن چکے تھے، شبہ میں پڑے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے محققانہ مضامین میں وہ فلسفیانہ بحثیں اُٹھائیں اور وہ مسئلے نئی رنگ میں حل کئے کہ سید کو اُن کی ذات سے بڑی بڑی توقعات پیدا ہو گئیں۔ سب جانتے ہیں کہ سرسید بعض معاملات میں بڑے متعدی تھے لیکن وہ ان لیڈروں میں نہ تھے جو شیخ سعدی کے

کس نہ آموخت علمِ تیر از من ۔۔۔۔۔ کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے سدِّ راہ ہوتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ اُن کے ساتھ والے اونچے اُٹھتے چلے جائیں اور اُن کو

اپنی قابلیت اور اہلیت کے اظہار کے برابر موقعے ملتے رہیں۔ چند ہی دنوں میں چراغ علی صاحب کی جامع قابلیت اور وسعت نظری کا سر سید پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ انہوں نے مہدی علی (محسن الملک) کے ذریعہ سر سالار جنگ کو اطلاع دی کہ جیسے شخص کی آپ کو تلاش تھی مجھے مل گیا۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ بڑی نزاکت کا زمانہ تھا۔ سر سالار جنگ کی ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے کی خدمات بھلائی جا رہی تھیں اور وہ سلطنت برطانیہ کی بدلی ہوئی پالیسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آقا کے دیرینہ وقار کو قائم رکھنے اور ریاست کے نظم و نسق کو جدید دور کے مطابق بہتر بنانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جنرل سر رچرڈ میڈ فوجی خدمات کے علاوہ مختلف ممالک کا ڈپلومیٹک سفر بھی کامیابی سے ختم کر چکے تھے دونوں حیثیت سے اُن کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا میں تھا ان کو حیدرآباد کا ریذیڈنٹ بنا کر بھیجا گیا وہ سر سالار جنگ کو نیچا دکھانے کے جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے اس رسہ کشی کے زمانے میں سر سالار جنگ نے مولوی صاحب کو فوراً حیدرآباد طلب کر لیا۔ اور سر رشتہ مال میں محسن الملک کے مددگار کی حیثیت سے اُن کا تقرر چار سو ماہانہ پر کر دیا اور چند ماہ کے بعد ہی اُن کو سات سو ماہوار اسی عہدے کی تنخواہ ملنے لگی۔

سر سید کے مشن اور ان کے حواریں کے ساتھ جو عقیدت میری گھٹی میں پڑی ہے اس کو وقار عالی کردار مصنف اور اعلیٰ عہدے دار کے معاملے میں ایک اضافہ اور ہوا تھا کہ مولوی صاحب مرحوم کے فرزند محبوب علی جو ناظم لاسکی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے علیگڈھ کالجیٹ اسکول میں ۱۹۰۱ء میں میرے ہم جماعت تھے۔ ہم دونوں کی عمریں اتنی نہ تھیں کہ اس سے زیادہ کچھ یاد رکھ سکیں کہ مرحوم بھاری بھر کم جسم، بڑے سر، بڑی آنکھوں والے تھے۔ اتنا خیال بھی ہے کہ بچوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچے اُن سے ڈرتے نہ تھے اور وہ بچوں کی ناسمجھی کی باتوں میں دل بہلاتے تھے البتہ محسن الملک سے ان کے متعلق بہت سنتا رہا۔ محسن الملک کی یہ عادت تھی کہ کالج اور قوم کے کاموں سے جب وہ فارغ ہوتے تو اندر نہانے کے کمرے میں بیٹھ کر دادی صاحبہ مرحومہ سے جو عربی فارسی میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں اپنے حیدرآباد کے پرانے ساتھیوں اور ہم عصروں کی اکثر باتیں کیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں مولوی چراغ علی صاحب نواب اعظم یار جنگ بہادر کی بہت سی خصوصیات معلوم ہوئیں۔ محسن الملک اعظم یار جنگ سے تقریباً سات سال بڑے تھے۔ اور بارہ سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے آج پچاس پچپن برس کے بعد ہم ایسے خزاں رسیدہ کو سب سے زیادہ جو تکلیف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں آپس کے اختلافات کے باوجود محبت و اخلاص تھا۔ جو آج مفقود ہے وہ بھلائیاں یاد رکھتے تھے اور ہم برائیاں۔ مثلاً علی گڈھ کے معاملات میں بعض امور میں نواب محسن الملک اور وقار الملک کا خصوصاً کالج میں انگریز اسٹاف کے معاملے میں اختلاف تھا لیکن جب میکڈانل نے جو اس وقت اس صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے ۱۹۰۰ء میں محسن الملک کے خلاف ہو گئے۔ تو نواب وقار الملک ہی سب سے زیادہ محسن الملک کیساتھ اُردو کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح ان کی وفات کے بعد ۱۹۰۷ء سے ہمیں یہ محسوس ہوتا رہا کہ وقار الملک سے زیادہ ہمارے اس غم میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

محسن الملک جب معتمد مالگزاری تھے اور مولوی چراغ علی صاحب مرحوم اُن کے مددگار تھے جب وہ معتمد پولیٹیکل و فنانس ہوئے مولوی صاحب مرحوم کا تقرر ان کی جگہ معتمدی مال پر ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ ان دونوں کی حیدرآباد میں یکجائی ہونے کے پہلے ہی سے محسن الملک مولوی صاحب مرحوم کی عربی و فارسی کی قابلیت اور طرز تحریر کے مداح ہی نہیں تھے بلکہ ان کو انگریزی زبان پر کافی عبور رکھنے والا اور اظہار خیال پر قادر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانے کے مسلمانوں میں ان کا نمبر نواب عماد الملک اور سر امیر علی سے کم نہ تھا۔ وہ مولوی صاحب کو ان دونوں ادیبوں سے زیادہ محنتی اور کھوجی خیال کرتے تھے۔ ان کی رائے میں مولوی صاحب تفریحی مشاغل اور ظاہری شان و شوکت کے اظہار سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہیں نہ توصیف و تعریف کی پرواہ تھی نہ وہ مخالفت کی پرواہ کرتے تھے۔ نواب محسن الملک یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے مددگاروں اور دوسرے عہدے داروں میں مولوی صاحب مرحوم ہی ایسے تھے جنہوں نے ان کے عروج کے زمانے میں کبھی ان کی ہاں میں

ہاں نہیں ملائی اور نہ کبھی انہیں یہ توقع ہوئی کہ سرکاری یا غیر سرکاری معاملات میں وہ ذاتی تعلقات یا ماتحتی کی وجہ سے اپنی رائے بدل دیں گے۔

سرکاری معاملات میں جب تک وہ مقدمے کے پورے حالات و واقعات سے واقف نہ ہو جائیں کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ معاملے کی تہ کو اس درجہ کو پہونچ کر اسے تحریر کرتے تھے کہ کبھی بدلنے کی نوبت نہ آتی۔ ان کی اس حق پسندی اور بے لوثی کی اس درجہ شہرت ہو گئی تھی کہ ان تک بڑے سے بڑے افسر و بارسوخ آدمی کی سفارش پہونچانے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ امیر، امراء، جاگیردار والیان سمستان انہوں نے کبھی ان لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھانے کی یا ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور چونکہ ان سے مطلب برابری کی کسی کو توقع نہ تھی اس لئے مطلبی لوگ ان سے نالاں رہتے تھے۔ وہ لوکل پالیٹکس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ باوجود اس کے انہیں نواب سر آسمان جاہ کے زمانہ وزارت میں معتمد مالگزاری چھوڑ کر مساوی یافت پر گلبرگہ صوبہ داری پر جانا پڑا اور نواب وقار الملک گلبرگہ سے ان کی جگہ آئے کیونکہ سر آسمان جاہ کے لئے نواب وقار الملک کو حیدرآباد میں اس خدمت پر رکھنا ضروری تھا وہ اس وزارت میں مدار المہام وقت کے ناک کا بال سمجھے جاتے تھے۔ جب محسن الملک کو اپنے عہدے پولٹیکل و فنانس کی معتمدی سے ہٹنا پڑا تو اس جگہ پر نواب اعظم یار جنگ کو بلانا ہی پڑا۔

قبل اس کے کہ ان کی انتظامی قابلیت اور معاملات سرکاری میں انہماک کا ذکر کیا جائے یہ بیان کر دینا مناسب ہو گا کہ جس علمی شغف اور تصنیف و تالیف کی دھن میں انہیں حیدرآباد میں ۱۳۰۰ھ میں آنے سے پہلے تھی اس میں یہاں آکر اور اضافہ ہی ہوا۔ وہ اپنے کتب خانے پر جتنی ان کی ماہوار آمدنی بڑھتی گئی زیادہ خرچ کرنے لگے۔ ان کے ڈھب کے ایک مولوی صاحب عبداللہ خاں ٹونکی مل گئے، جو ان کے لئے نایاب کتابیں مہیا کرتے اور علمی مباحث میں حصہ لیا کرتے۔ ان مولوی صاحب کو انہوں نے نادر اور قلمی کتابیں تلاش کرکے لانے کے لئے مصر تک بھیجا۔ وہ عادتاً رات گئے تک آرام کرسی پر لیٹ کر کتاب پڑھا کرتے تھے اور اکثر اسی کرسی پر ان کی آنکھ لگ جاتی جب چونکتے تو پھر پڑھنے لگتے یا میز پر جا کر لکھنا شروع کر دیتے۔ وہ مشکل سے تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ انگریزی ادب پر پوری قدرت حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے لیٹن اور گریک بھی سیکھ لی تھی وہ انگریزی زبان میں ایسی شستہ عبارت لکھنے لگے تھے کہ مسٹر جسٹس محمود جو کسی کو بہت کم مانتے تھے کہتے تھے کہ مولوی صاحب کا دماغ ایسے ایسے مقامات پر پہونچ جاتا تھا جہاں عام محققین نہیں پہونچتے۔

فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ مولوی صاحب ریاست حیدرآباد کی ایک بڑی خدمت جاگیرات پر ایک مفصل کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ہزاروں مسلیں دیکھ ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کون سی جاگیر کس کو کن شرائط کے ساتھ ملی اور پھر اس میں نسلاً بعد نسل کیا تبدیلی ہوئی۔ جاگیر کا رقبہ کیا ہے۔ جاگیردار کو کیا خدمت ریاست کی انجام دینا ہے۔ محاصل کیا ہے، کاشتکار اور دیگر باشندگان جاگیر کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا ہیں دہارہ کیا ہے وصولی کا طریقہ کیا ہے مکاحقہ سرکاری دفاتر میں مواد نہ ملنے کی وجہ سے انہیں جاگیرداروں سے رجوع کرنا پڑا۔ بعضوں نے تو ان کے خطوط کا جواب تک نہیں دیا اور دل میں طرح طرح کے گمان کرنا شروع کئے۔ مجبوراً نواب صاحب مرحوم کو یہ کام ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔ اگر ان کے ہاتھوں جاگیرداری کی تاریخ مکمل ہو جاتی تو صیغہ انعام و عطیات کو نئی نئی الجھنوں اور جاگیرداروں کو آئے دن کے مقدمات کی پیروی سے نجات مل جاتی۔ اور جاگیرداروں کے ورثاء کو جو صعوبتیں اٹھانا پڑیں اس سے چھٹکارا نصیب ہو جاتا۔

ان کو سرکاری خط و کتابت میں "اشد ضروری" سے سخت نفرت تھی اور نہ کبھی وہ ایسے الفاظ سے متاثر ہو کر ایسی لفافوں کو فوراً کھول کر پڑھتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی خفگی کا باعث یہ بھی تھا کہ وہ اپنے مفروضہ کام کو کبھی ڈال کر نہ رکھتے تھے۔ وہ دفتر میں زیادہ بیٹھنے کے عادی نہ تھے۔

سر سالار جنگ کا انتقال یکایک ایک ہی دن کی بیماری میں ۳۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۳ ہجری کو ہو گیا۔ اور مستقل انتظام ہونے تک مہاراجہ نریندر پیشکار کے سپرد وزارت کا کام کر دیا گیا اس وقت سے لارڈ رپن کے آنے اور مرحوم نظام کے تخت نشین ہونے تک مختلف امراء وزارت کا خواب دیکھتے

رہتے ایک گروہ لائق علی خاں کا حق جتاتا تھا دوسرا آسمان جاہ اور وقارالامراء کو اس منصب پر فائز دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر طرف سے بدعنوانیاں پیدا ہونا شروع ہوئے۔ سرخورشید جاہ کا تو ایک دو جگہ نام بھی آ کر رہ گیا۔ مسٹر پامر اور رنگ جی مہاراجہ کے لئے کوشش کرنے کو نکلے۔ میجر گاؤ، محسن الملک اور عمادالملک نے وراثتاً لائق علی خاں کو اپنے باپ کا قائم مقام وزارت پر بھی حکومت ہند سے منوانے کی ترکیبیں کرنا شروع کیں۔ پوری ریاست بھر میں صرف مولوی چراغ علی اور نواب اکرام اللہ خاں دو شخصوں کا نام لیا جاتا ہے کہ ان کو ان جھگڑوں قصوں سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ رہا۔ نواب اکرام اللہ خاں تو سرسالار جنگ کے مرتے ہی استعفا دے کر چلے گئے۔ اور چراغ علی خاں نے سالار جنگ کی زندگی ہی میں جو کتاب حیدر آباد دکن انڈر سرسالار جنگ لکھنا شروع کی تھی اپنے گھر بیٹھے خاموشی سے بغیر اس خیال کے کون وزارت کا مستحق قرار پا کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں مشغول رہے۔ سرسالار جنگ کو معلوم تھا کہ یہ کتاب لکھی جارہی ہے اور اس کے کچھ جز چھپ بھی چکے تھے۔ لیکن اس کی اشاعت اور تکمیل ان کے مرنے کے بعد عمل میں آئی اور انہی کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس کتاب کی چار جلدوں میں تمام انتظامات اور محکمے اور صیغوں میں جو اصلاحات ہوئیں ان کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک اور مستند کتاب گذشتہ دور کی اور سرسالار جنگ کے زمانے تک ختم کی جو تاریخی اور انتظامی معاملات پر ہے جو اس وقت بہت پسند کی گئی تھی اور انگریزی اخبارات نے تعریفانہ ریویو کئے تھے۔ مسٹر کارڈری ریذیڈنٹ نے مولوی صاحب موصوف کو ایک پرائیویٹ خط میں اس کی اشاعت پر مبارکباد دی تھی اور ان کی محنت اور لیاقت کی تعریف کی تھی ۱۸۸۴ء کی اڈمنسٹریشن Administration رپورٹ جس کی آج تک تعریف کی جاتی ہے بڑی تقطیع کے کچھ سو سے زیادہ صفحات پر شروع سے آخر تک انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور سرکار انگریزی میں ریذیڈنسی سے مسٹر کارڈری کے تعریفی نوٹ کے ساتھ بھیجی گئی تھی۔ ان کی ملازمت کے سلسلہ کا ایک اور بڑا کارنامہ حیدر آباد کا پہلا باقاعدہ تفصیلی بجٹ ہے جس کی جامعیت کے ساتھ ساتھ اس کی اختصار اور صفائی بھی قابل تعریف قرار دی گئی۔ اس بجٹ کی خصوصیتوں کا آگے چل کر خود مسٹر کرالی کو اعتراف کرنا پڑا۔ مسٹر کرالی نواب وقارالامراء کی وزارت کے زمانہ میں حیدر آباد پر کنٹرولر جنرل کی حیثیت سے مسلط کئے گئے تھے تاکہ وہ ناگوار حالات کی جو سکہ و چاندی کی فروخت اور بے جا مصارف سے پیدا ہوگئے۔ اور جن کی وجہ سے آگے چل کر دو کروڑ قرضہ لینے کا سوال پیدا ہوا روک تھام ہو سکے۔ انہوں نے رپورٹ تیار کی اس میں شاہی اخراجات کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا اور اس پر بڑی کڑی تنقید کی اور نظم و نسق کے سررشتوں میں تخفیف مصارف کی بھی تحریک کی۔ مولوی صاحب اس وقت فنانشل سیکرٹری تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی کہ ایک انگریز کو کنٹرولر جنرل بنا کر یہاں لانے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں اس کی روک تھام تو ان کی طاقت سے باہر تھی انہوں نے فنانس پر جو مستند کتابیں مل سکتی تھیں منگا کر دو ماہ میں ان سب کو پڑھ ڈالا جب مسٹر کرالی آئے اور اسے سرکاری ملاقاتیں ہوئیں تو انہیں پتہ چلا کہ یہ موٹا مہاتما اور بڑی بڑی آنکھوں والا دیسی آدمی عرصہ جدید کے مالیہ کے اصولوں اور گورکھ دھندوں سے ان سے زیادہ واقف ہے۔

مسٹر پلاؤڈن اس وقت ریذیڈنٹ تھے۔ انہوں نے سرآسمان جاہ سے وزارت کی کرسی خالی کرائی تھی محسن الملک اور وقارالملک کو کئے بعد دیگرے ریاست سے باہر کرایا تھا۔ فتح نواز جنگ بھی علیحدہ کئے جا چکے تھے۔ نواب وقارالامراء بہادر کو وزارت پر لا کر ان کی بے جا تائید کر رہے تھے۔ ایک طرف تو انہیں بڑھتے ہوئے شاہی مصارف کا رونا تھا۔ اور دوسری طرف حضور نظام کو مجبور کر کے فلک نما خرید دیا تاکہ اس طرح وقارالامراء کا قرضہ ادا ہو سکے اور یہ الزام اٹھ جائے کہ وزیر اس قدر قرض دار ہے۔ اگر مولوی چراغ علی کا دم نہ ہوتا تو ریلوے شیئرز جو لندن میں محفوظ تھے بک ہی جاتے اور نظام اسٹیٹ ریلوے ہاتھ سے نکل جاتی۔ انہوں نے جمع و خرچ کا ایسا صاف اور واضح Ballence sheet تیار کیا کہ پلاؤڈن کو اس سے اتفاق کر کے تعریف کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجنا ہی پڑا۔ انہیں ایک عرصے سے ذیابیطس کی شکایت تھی لیکن وہ آرام لینا جانتے ہی نہ تھے ان پر اس مرض کا آخری دورہ جب شروع ہوا تو اس زمانے میں بھی وہ اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ آرام لینا تو ان کو آتا

ہی نہ تھا ان کی گردن کے اوپری حصے پر ایک گلٹی نکلی، حیدرآباد کے مشہور سرجن ڈاکٹر لاری نے کئی مرتبہ نشگاف دیا اور زہریلا مادہ نکالا لیکن وہ مرجراحی عمل کے بعد اور کمزور ہوتے گئے ان کے عزیز ان کو لے کر بمبئی گئے اور بہتر سے بہتر ڈاکٹروں کو دکھایا مگر جب انسان کا وقت آجاتا ہے کسی کی دعا کارگر نہیں ہوتی اور جہاں کی مٹی نصیبوں میں ہوتی ہے قسمت وہیں لے جاتی ہے ان کو بمبئی گئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر وہیں دفن ہوئے۔

جن خوبیوں اور خصائل کے وہ تھے ایسے انسان کم پیدا ہوتے ہیں وہ نہایت منکسرالمزاج تھے نام و نمود کی ان کو خواہش نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ نواب اعظم یار جنگ بہادر خطاب ملنے کے بعد انہوں نے کبھی نوابی کی شان جو اس وقت تو آج سے بھی زیادہ جتائی جاتی تھی کبھی نہیں دکھائی۔ انہوں نے ہمیشہ مولوی چراغ علی کے نام سے منسوب ہونا ہی پسند کیا وہ اپنے ابتدائی زمانہ ملازمت میں جس طرح سے لوگوں سے ملتے تھے اسی طرح معتمدی کے زمانے میں بھی ملتے رہے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا کی نہایت خندہ پیشانی سے مدد کرتے رہے اور اس طرح سے مالی مدد کی کہ مدد حاصل کرنے والوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس نہ ہونے دیا کہ وہ مالی امداد کو قرض کا بدل سمجھتے تھے۔ نوکروں پر آقائی نہیں جتاتے تھے نہ کبھی سخت لفظ ان کے منہ سے نکلتا تھا اور نہ نوکر کے قصور پر چاہے کتنا ہی وہ نقصان کرے سختی کا اظہار کرتے تھے۔ ذیابطس کی شکایت کی وجہ سے اور پھر اس پر جاگنے کی عادت کی بناء پر رات کو کئی دفعہ پانی پینا پڑتا مگر وہ نوکر کو آواز نہیں دیتے خود ہی اٹھ کر پی لیتے۔ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی خاموش طبعی کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھتے۔ وہ چونکہ اپنے وقت کی بہت قدر کرتے تھے اس لئے جو لوگ اُن سے ملنے آتے ان کو صرف مطلب کی بات ہی کہنے دیتے۔ جب سر سید کو ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو اُن کو جس قدر رنج ہوا وہ اس مضمون سے ظاہر ہے۔ جو تہذیب اخلاق کی اس سال کی جلد میں موجود ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"افسوس۔ ہزار افسوس۔ صد ہزار افسوس کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتے کی بیماری میں انتقال کیا۔ . . . ."

"افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جبکہ ہم بعض کاغذات ان کے نام روانہ کر رہے تھے۔ اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے اسی وقت انہوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔ . . . . حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے انہیں بلایا تھا اس زمانہ سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے۔ پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام اور علمی مشغلے کے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حیدرآباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

"انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ اُن کی عمر کچھ بھی زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

وہ سوال جس کا ذکر اقتباس بالا میں ہے دو ماہ پیشتر تہذیب الاخلاق میں شائع ہو چکا تھا اور یہ اعلان بھی ہو چکا تھا کہ اس کا جواب مولوی صاحب مرحوم لکھ رہے ہیں جو انگریزی میں کتاب کی شکل میں "العلوم الجدیدۃ والاسلام" کے نام سے شائع ہو گا سوال یہ تھا کہ اکثر لوگوں کی رائے میں یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یوروپین علوم و فنون کے ان مسائل اور ان کے دلائل کو بیان کرنا چاہئے جو اس برگشتگی کا باعث ہیں اور ان کتب دینیہ اور ان مقامات کا نشان ضروری ہے جن کو تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے اور اگر یہ رائے صحیح نہیں ہے تو اس کی عدم صحت کا بیان جہاں تک ممکن ہو مفصل اور دلیل سے بیان کیا جاسکے۔

مذہبی تصانیف میں ان کی پہلی کتاب "تعلیقات" کے نام سے ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اس میں انہوں نے پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کا جواب دیتے ہوئے یہ لکھا کہ اس کے ماخذ غلط ہیں حضرت عیسیٰ اور انجیل پر تفصیلی بحث کی تھی اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں متعدد کتابیں "ریفارمز انڈر مسلم رول" "محمدوی پرافٹ" وغیرہ لکھیں۔ تحقیق الجہاد میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ جہاد کی حقیقت بتلاتے ہوئے انہوں نے اسباب کو دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں جو لڑائیاں لڑی گئیں اس میں کفار کو قتل کرنا اور تلوار کے زور سے ان کو مسلمان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ وہ سب حالتِ مجبوری میں اپنے بچاؤ کے لئے لڑی گئیں۔ ایک اور کتاب میں انہوں نے اسلام کی دنیوی برکتیں دکھلائی ہیں۔ ایام الناس جو اُردو میں لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اس میں اس اعتراض کو مٹایا ہے کہ قرآن میں کوئی بھی من گھڑت قصہ نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں انہیں بڑی محنت برداشت کرنا پڑی ہوگی اور کافی دقتیں اُن کتابوں کے مہیا کرنے میں اُٹھانا پڑی ہوں گی جس پر انہوں نے استدلال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قدیم یونانی اور عبرانی مؤرخوں کے حوالے سے ان قوموں کا وجود ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد رسالے لکھے ہیں اور کئی کتابیں ناتمام حالت میں چھوڑ گئے۔ ان رسالوں میں "غلامی" "تعداد ازدواج" بہت مشہور ہیں۔ سر ولیم میور نے جو قرآن پر اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں انہوں نے "ردِ شہادت قرآنی برکتب ربانی" لکھی تھی۔

مولوی امیر حسن صاحب مرحوم جو محسن الملک کے چھوٹے بھائی تھے جنہوں نے اپنی نامور بھائی کی کتاب "آیات بینات" کا جواب "آیات محکمات" کی تکمیل میں عمر کا بہت حصہ صرف کیا، فرماتے ہیں کہ مذہب پر کتاب لکھنے والوں میں جو روش مولوی صاحب مرحوم کی تھی اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے اعتراضات و جوابات سے یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ وہ سُنی ہیں یا شیعہ، مقلد ہیں یا غیر مقلد۔ وہ جہاں تک ہو سکتا قرآن ہی سے استدلال کرتے تھے۔ عام رائے یہ ہے کہ مولوی چراغ علی اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر تھے۔ ان کی تقریباً سب کتابیں اسلام کی حمایت میں ہیں جس میں نہ لفاظی اور نہ عبارت آرائی ہے اور نہ خواہ مخواہ فصاحت و بلاغت دکھائی گئی ہے وہ واقعات کی تنقید و تنقیح صحیح نتائج کے استخراج اور معلومات علمی سے لبریز ہیں ظاہر ہے کہ ایسی تحریریں جوش اور گرمی نہ ہوگی اور روکھی پھیکی ہوں گی جن سے نہ جذبات بھڑک سکتے اور نہ دل پھڑک سکتے اُن میں محض منطقی سرد مہری ہوگی۔ انہوں نے دنیا کو اپنی تصنیفات سے دکھلا دیا کہ مذہب اسلام ہی ایک مذہب ہے جس میں ترکِ دنیا و ترکِ لذات کے بغیر روحانی ترقی کے مدارج طے کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ وہ ان عالموں میں سے تھے جن کو صحیح معنوں عالم باعمل کہا جاتا ہے۔ جو وہ کہتے تھے اس پر خود عمل بھی کرتے تھے۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا، وہ ایک شفیق باپ اور مخلص دوست تھے۔ ادائے حقوق میں وہ کامل تھے اور اپنی بات کے پکے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بیکار صرف نہیں کیا۔ وہ ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جس کی پیروی کر کے دین اور دُنیا دونوں سنبھل سکتے ہیں۔

۷ امرداد ۱۳۰۴ھ فصلی کے جریدہ اعلامیہ میں ان کی وفات پر مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا۔

"نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر ناظم مال و فنانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ھ فصلی بروز شنبہ مقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگذار واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی مکرر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقہ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے

در حقیقت بہت نقصان پہونچا۔"

ان کا سوگ مسلمانوں نے ہر جگہ منایا اور انگریزی اور اُردو اخبارات میں تعزیتی مضامین چھپے اور ان کی قومی مذہبی اور ملکی خدمات کو سراہا گیا۔ متعدد قطعے، تاریخیں اور نظمیں لکھی گئیں۔ "وائے اعظم یار جنگ" سے اُن کے وفات کی تاریخ ۱۳۱۲ھ ہجری نکلتی ہے۔ مولانا حالی نے جو قطعہ لکھا تھا اس کے چند شعر جن سے مولوی چراغ علی مرحوم کی اس عظمت کا جو سرسید کے حواریں کے دل میں تھی پتہ چلتا ہے، یہ ہیں:۔

مستفیدان ہُنہ کردہ ز این معنی ہنوز ——— مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشیدہ رفت

از سحابِ فیضِ کلکش ناشدہ سیرابِ خلق ——— ساعتے برقِ یمانی از اُفق تابیدہ رفت

کردنے آزارِ خلق اعمالِ سلطانی ادا ——— نے ز کس رنجیدہ نے کس را ابرنجانیدہ رفت

یادران قوم را تازلیست یاور بود و یار ——— ہر چہ بتوانست در تائیدشان کوشیدہ رفت

مسٹر سید محمود نے ان کی انتقال کی خبر سنتے ہی کہا:۔

حیف چراغ علی از دُنیا نہاں شد

اس سے ان کی وفات کی تاریخ سنہ عیسوی بھی نکلتی ہے۔ سید محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے جو اُن کے ساتھ حیدرآباد میں کام کر چکے تھے تاریخ کہی:۔

"گوہر شب چراغ بود نہ ماند"

مختصر یہ کہ مولوی چراغ علی نواب اعظم یار جنگ بہادر اُن ہستیوں میں سے تھے جو پیوند خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان بزرگوں کی یاد آتے ہی مسلمانوں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ گو اُردو اُن کی مذہبی زبان نہیں ہے اور نہ اکیلے انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر اس کے مٹتے ہی سرسید، محسن الملک، وقار الملک، اعظم یار جنگ، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکا اللہ ایسے بزرگوں کو حقیقی موت آ جائے گی، اور اگلی نسل میں کوئی اُن کا نام بھی نہ سن سکے گا۔

خدا وہ وقت نہ لائے!

نظام رامپوری

شاد عارفی

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اگر آپ حیران نہ ہوں اور آپ میری پندرہ سالہ تحقیق و تلاش پر بھروسہ کریں تو میں آپ کو یہ اطلاع فراہم کر سکتا ہوں کہ اوپر دیئے ہوئے حضرت نظام کے مطلع میں پہلا مصرع حضرت نظام رامپوری کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں صاحب المتخلص بہ نواب کے فکر کا نتیجہ ہے جسے مرحوم نے مکلمرائے کے کسی شعر سے متاثر ہو کر نظم کیا اور باہر آ کر شعرائے دربار سے اس پر گرہ کی فرمائش کی۔ اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور مارا مگر مصرع کا واقعاتی رخ کسی کی گرہ برداشت نہ کر سکا۔ چونکہ یہ مصرع حضرت نظام صاحب کے مذہب کا تھا چنانچہ انہوں نے کہا، دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ ——— مصرع دست و گریبان ہو گیا تھا۔ اس سے نواب صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرع یہ کہہ کر نظام رامپوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرع بھی تم ہی لے لو اور حضرت نظام نے بھی کمی نہیں کی کیونکہ وہ کوئی جاگیر نہیں تھی جسے اوڑھا بچھایا جا سکتا ——— اور پھر اس مطلع پر پوری غزل کہی جو حضرت نظام صاحب کے دیوان کا حاصل ہے اور یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ہر دیوان میں ایک غزل اور ہر غزل میں ایک شعر بے پناہ ہوتا ہے۔ حالانکہ نظام رامپوری کی ایک اور غزل بھی حاصل دیوان ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت نظام کے دیوان میں دو غزلیں وہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ جو کسی اور شاعر کے دو ایک پورے دیوان میں ہوتی۔ اس غزل کا ایک مصرع یہاں سنا دوں تفصیل بعد میں آئے گی۔ فرماتے ہیں ———

ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا

تو حال ... آپ میری اس اطلاع پر حیران ہوئے ہوں گے لیکن مجھے اپنی اس تحقیق پر کتنی پشیمانی ہوئی تھی بیان نہیں کر سکتا لیکن اس طرح حضرت نظام کے عقیدت مندوں کو ٹھیس لگی تھی لہٰذا اُن حضرت کو جن کے ذریعہ یہ پتہ چلا تھا۔ جو ذرا ابن الوقت اور فدوی قسم کے آدمی تھے اُن سے اس لئے بدگمان ہو کر کہ یہ مبالغہ تو نہیں فرما رہے ہیں میں نے بے ساختہ کہا تھا ——— ارے بھئی ...... اس مطلع کا پہلا مصرع معہ ردیف و قافیہ زوائد کے نذر ہو گیا ہے۔" یعنی سوئے الکلام' والی بات ہے۔ وہ کس طرح؟ انہوں نے پوچھا ——— تم بھی سمجھ لو۔ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے ———

مضمون ادا ہو چکا —— "اُٹھا کے ہاتھ" —— چھلانگ لگا کر دُور جا کھڑا ہوا۔ بالکل یوں جیسے کوئی کہے - میں نے ناک سے پھول سونگھا —

یا پھر - ملی حزیں کا یہ مطلع دیکھو جس پر حضرت غالب نے بجا اعتراض کیا تھا۔

ز ترک تازی آں نازنیں سوار ہنوز | کہ سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

پہلے مصرع میں "ہنوز" قطعاً کاواک اور زائد ہے - جبھی تو کہا ہے کہ مطلع پر شاعر کی پول کھلتی ہے - بہ ہر حال - جب میں آتش کی طرح جوان تھا اور میری شاعری اختر شیرانی کی معشوقہ کی طرح جوان العمر - تو مجھے حضرت نظام کا یہ مطلع سنایا گیا - میں اس وقت زوائد وغیرہ سے واقف نہ تھا۔ اس لئے پورے مطلع پر پھڑک گیا کیونکہ میری شاعری کی بنیاد بھی اس وقت "واقعات" اور "معاملوں" پر قائم تھی - مثلاً

—— چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں اُنگلیاں اُسکی جانتا ہوں —— وغیرہ

اس لئے حضرۃ نظام رامپوری کا دیوان دیکھنے کی فکر پڑی - بڑی تلاش کے بعد ایک مولوی قسم کے (پوپلے منہ) شخص کے پاس دیوان ہونے کی خبر ملی - پہونچا —— مگر وہ "مت کئے" سے تھے اس لئے پہلے تو صاف انکار کر گئے پھر میری التجاؤں پر کچھ پسیجے اور کہنے لگے کہ تم میرے سامنے دیکھ سکتے ہو گھر نہیں لے جا سکتے نہ اس کی نقل کر سکتے ہو - ایک شعر بھی نہیں - جی نہیں - اور انہوں نے دیوان بغل میں داب کر گھر چلنے کی ٹھانی - میں نے پھر عاجزی سے کام لیا تو ٹھہر گئے —— یہ قلمی دیوان تھا - لکھائی بہت بُری - کاغذ بھی بادامی اور گلا سڑا —— چھ دن متواتر ایک ایک گھنٹہ مطالعہ کر کے بہت سے شعر یاد کر لئے اور روز ایک نوٹ بک پر گھر آ کر نقل کرتا رہا - جب اس طرف سے مطمئن ہوا تو اُن اشعار کا بغور مطالعہ کیا - تو صاف ظاہر ہوا کہ حضرت نظام اپنے ماحول سے تنگ آ کر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ شخصی حکومت کے خوف سے نہ کہہ سکے - اس لئے جگہ جگہ بات چبا گئے ہیں - مثلاً

— ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو —

یا پھر

—— جیسے ہم بن بلائے بیٹھے ہیں ——

اب حال نظام کچھ نہ پوچھو | غم ہوگا تمہیں اگر کہوں گا

کچھ آپ کو خبر بھی ہے سید نظام کی | بیچارہ تنگ آ کے وطن سے نکل گیا - وغیرہم

حالانکہ یہ بیچارے کبھی ترک وطن نہیں کیا نہ کر سکتے تھے - مگر اس طرح وہ اپنی التجاؤں کو حسن طلب سے آگے لے گئے تھے اور جیسا کہ مجھے تحقیق ہوا اُن کی زندگی سخت مالی مشکلات کا شکار رہی - انتقادیات کا پہلا مضمون میاں نظام شاہ رامپوری پر ہے جس میں نیاز فتحپوری نے کسی تجسس سے کام نہیں لیا - ورنہ یہ کبھی نہ لکھتے کہ (جب میاں نظام شاہ کی شاعری کی خبر شہر میں عام ہوئی تو نواب نے انہیں بلایا اور منصب مقرر کر کے شعرائے دربار کا سلسلہ سے وابستہ کر دیا) - حیرت ہے کہ نیاز فتحپوری نے کس بنیاد پر منصب مقرر کرنے کا دعوے کیا ہے جبکہ کوئی تحریری سند یا اسٹیٹ گزٹ وغیرہ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا - اس عبارت کے فوراً بعد انتقادیات میں ایک کھٹکتا ہوا جملہ اور بھی ہے کہتے ہیں (کہا جاتا ہے کہ میاں نظام شاہ نے اس کے بعد خود نواب سے فن شعر حاصل کیا) اس جملہ معترضہ کے صاف یہی معنی ہیں - جس میں اقتدار پسندی لکھنے والے کو دوسری جانب بہکائے جاتی ہے - سمجھ میں نہیں آیا کہ جس کا منصب ہو جو نواب کا شاگرد ہو اس کی زندگی اس قدر ناگفتہ رہی کہ باید و شاید - مکان گر پڑا تو بنا نہ سکے - مفلسی کی بنا پر بیوی ایک بچہ (لڑکا) لے کر اپنے گھر جا بیٹھی اور پھر زندگی بھر واپس نہ آئی - یہاں نیاز فتحپوری کو ایک اور ٹھوکر

گی ہے۔ کیونکہ وُہ اپنے انتقادیات میں لکھتے ہیں کہ سید نظام شاہ نے (ساری عمر تجرّد میں بسر کی اور قلیل معاش پر نہایت صبر و توکّل سے زندگی گزار دی) تعجب ہے کہ اپنے انتقادیات میں نیاز فتحپوری منصب داری کا ذکر بھی کرتے ہیں اور تجرّد کا بھی دعوے کرتے ہیں۔ لیکن قلیل معاش پر زندگی گزارنے کے متعلّق اقرار کرتے ہیں۔ نوّاب کلب علیخاں صاحب نوّاب کا شاگرد اور قلیل معاش۔ منصب ولد اور فاقے — ایسے متضاد بیانات ہیں جن سے شبہ گزرتا ہے کہ واقعہ یہ نہیں ہے جو احتیاطاً یا مصلحتاً درج انتقادیات کیا گیا ہے۔ حقیقت جو میری تحقیق میں آئی جس کے راوی حتی الامکان معتبر تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط۔ اُن کا منصب و نصب کچھ نہیں تھا۔ جوانی میں اپنے والد سیّد احمد شاہ صاحب کی جگہ سواروں میں نوکر ہوئے تھے۔ مگر اپنے لاابالی پن اور صوفیانہ روش اور شاعرانہ مزاج کے بنا پر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ تنگ دستی کی وجہ سے بیوی عموماً پریشان رہتی تھی اور ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اس لئے فاقے کرتے کرتے تنگ آ کر گھر بیٹھ رہی اور سیّد نظام شاہ صوفی منش حضرات کی صحبت میں گزارتے رہے۔ بیوی کی جدائی اور اُس کی یاد نے وہ تمام باتیں یا معاملے شعر میں ڈھالنے شروع کئے جو اُن پر گزرے تھے گویا یہ اشعار جن پر ادابندی اور معاملہ سنجی کی مہریں ہیں۔ سب اُن کے گھر والی سے متعلق ہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ انتہائی پاک باز قسم کے صوفی تھے۔ میں اس قسم کے دعوے کیوں کر رہا ہوں آپ گھبرائیں نہیں میں اُن کا معتبر راویوں کے ذریعہ ثبوت دوں گا۔ میں نے جس قدر وقت سیّد نظام شاہ کی زندگی پر لکھنے پر صرف کیا ہے اور جہاں جہاں قدرت نے خلاف توقع وہ اسباب فراہم کر دیئے۔ جو سیّد نظام شاہ پر لکھتے وقت کسی کو نصیب نہ ہوں اُن کے لئے میں مشیّت اور اُن کرم فرماؤں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میری بڑی رہنمائی کی ورنہ میں تھک کر بیٹھ رہتا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سیّد نظام شاہ حضرت بیمار شاگرد حضرت مومن کے شاگرد تھے۔ بعد میں صوفی علی احمد شاہ صاحب سے اصلاح لینے لگے ——— مگر ایک سوال ہے جو برابر مجھے ستا رہا ہے وہ یہ کہ مولوی صوفی علی احمد شاہ صاحب ان اشعار پر کیا اصلاح دیتے ہوں گے جن کا تعلق معاملہ بندی اور خلوت سرائے سے ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ سیّد نظام شاہ صاحب کی اپنی شدت ادا کا نتیجہ تھا۔ نیاز فتحپوری نے جن کو سب سے الگ بات کہنے میں اپنی شان نکلتی معلوم ہوتی ہے سیّد نظام شاہ کو جرأت سے متاثر یا ان کے رنگ میں کہنے والا بتایا ہے حالانکہ اُن کا رنگ یا تو میر سوز سے ملتا جلتا ہے یا پھر نوّاب آصف الدولہ سے۔ اب میں ان تینوں شعراء کا کلام گڈمڈ کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں آپ خود اندازہ کریں گے کہ یہ ایک ہی شخص کا کلام ہے یا تین الگ الگ رجحانات طبع کا نتیجہ۔

جس کا تو آشنا ہُوا ہو گا — اُس نے کیا کیا ستم سہا ہو گا

تیرا ملنا تو اک قیامت ہے — غیر کا حال کیا ہُوا ہو گا

دردِ دل اپنا میں اُس شوخ سے کہتا لیکن — جو چھپانے میں مزا ہے نہیں اظہار کے بیچ

مُکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے — ہر اک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے

غیر سے کہتے ہیں وہ میرے سُنانے کے لئے — ڈھونڈھ لیں گے ہم بھی کوئی دل لگانے کے لئے

رات دن یہ سوچ رہتا ہے میرے دل کے تئیں — اے خدا وہ یاں سے جا کر کس کا ہم خانہ ہُوا

اُس بات میں پھر گیا دل گمراہ کیا کروں — دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کروں

بے وہاں جائے بھلا ہم سے رہا جائے کہاں — دل سے اور اس بزم میں جانے کا مزہ جائے کہاں

نہ جی چاہے تھا جس کے پاس سے اک دم سرکنے کو — سو اس کے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر ٹپکنے کو

ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ میر سوز۔ نظام شاہ اور نواب آصف الدولہ جو میر سوز کے شاگرد بھی تھے قریب قریب ایک ہی رنگ میں کہتے تھے۔ اوپر دئیے ہوئے تین تین شعروں میں ہر پہلا شعر میر سوز کا ہے دوسرا شعر نظام رامپوری کا اور آخری شعر نواب آصف الدولہ کا ہے۔

عبدالشکور صاحب پرنسپل گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور نے "نظام رامپوری" کے نام سے جو مجموعہ شائع کر دیا ہے اُس میں موصوف نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ نظام رامپوری کا ناظم رامپوری یعنی نواب یوسف علی خاں کا شاگرد ہونا محل نظر ہے۔ اور یہ کہ انہیں شاعر دربار ہونے سے کوئی مالی منفعت نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ انہوں نے نواب یوسف علی خاں صاحب ناظم اور نواب علی خاں صاحب نواب کی تعریفوں میں قصیدے تک کہے (قصیدے میں اُن کا رنگ بہت پھیکا ہے اور اُن پر شکوہ الفاظ سے خالی ہے جو قصیدے کی جان ہوتے ہیں) ان قصائد کا نتیجہ بھی صفر رہا ہوگا ورنہ وہ تنگیٔ معاش میں مبتلا نہ رہتے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ مصرع

ـــــ شب کو فرمائش سرکار نے سونے نہ دیا ـــــ

سید نظام شاہ ۱۲۴۹ھ میں نواب احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ صحیح النسب سید تھے۔ ان کا سلسلہ بارھویں پشت میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ نیلا تہبند باندھے رہتے تھے اور کبھی کبھی سیاہ بھی۔ خلیق۔ ملنسار اور متقی قسم کے صوفی تھے۔ تین صاحبزادگان وقت کا سودا سلف خریدنے پر دقتی ملازم تھے۔ ان سے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ اس پر قناعت کر لیتے تھے ـــــ یہ قناعت کا لفظ مجبوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ورنہ وہ کوئی باقاعدہ متشرع اور مذہبی آدمی نہ تھے۔ صوفی ضرور تھے لیکن صوفی اور فاقہ لازم و ملزوم نہیں رہے ہیں اور یہ کہ اگر وہ اتنے ہی نفس کُش تھے تو نواب یوسف علی خاں ناظم کے قصیدے کیوں لکھتے۔ نواب کلب علی خاں صاحب نواب کی مدح اور فرمائش سرکار کے سلسلے میں اپنی راتیں کیوں کالی کرتے۔ ظاہر ہے کہ اُن کو کبھی وہ فراغت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ دربار سے متمنی تھے۔

سید قیصر شاہ میاں جو نظام شاہ کے ساتویں لڑکے تھے۔ (ان سے پہلے چھ لڑکوں کا انتقال ان کے سامنے ہی ہو گیا تھا) اور اپنی والدہ کے ساتھ تھانہ پیلا تالاب پر رہتے تھے۔ جب میں اُن سے ملا ہوں تو وہ بہت ضعیف اور عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنے والد کی شاعری بابت قریب قریب کچھ نہیں جانتے تھے۔ خود پڑھے لکھے نہ تھے۔ اس لئے اپنے والد کی بے پروائی کے سخت شاکی تھے انہیں یہ قطعی معلوم نہیں تھا ان کے والد کو ناقدریٔ زمانہ نے اس بری طرح پیسا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ـــــ ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو ـــــ

ہاں ایک مثنوی کے بابت کہتے تھے جو اُن کی والدہ کے پاس تھی جسے کوئی صاحب دیکھنے کو مانگ کر لے گئے اور پھر واپس نہ لائے ـــــ ماسٹر امتیاز صاحب کھنڈارا ـــــ جو ڈرائینگ ماسٹر ہیں اور ایک اچھے آرٹسٹ بھی ایک روز میرے پاس میرا فوٹو لینے آئے، وہ اس پر قلمی عمل کرنا چاہتے تھے۔ باتوں باتوں میں نظام صاحب کا ذکر آگیا تو موصوف نے اپنے والد کے حوالہ سے سید نظام شاہ صاحب کے بارے میں عجیب روایت بیان کی انہوں نے کہا کہ میرے والد جن کا اس عہد کی پسندیدہ ہستیوں میں شمار ہوتا تھا اپنا چشم دید حال بیان کرتے تھے کہ پہلے ہم لوگ بھی گھیر سنجی میں رہا کرتے تھے وہیں سید نظام شاہ صاحب کا آبائی مکان بھی تھا جس کو انہوں نے بیوی سے ناچاقی کے بعد قریب قریب ترک کر دیا تھا صرف رات کو سونے کے لئے یہاں چلے آتے تھے اور دن بھر علی نور صاحب کی خدمت میں رہا کرتے تھے علی نور صاحب اُس عہد کے ایک اچھے بزرگ تھے۔ اُن کا ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے۔ افغانستان سے ایک مولوی علی نور صاحب سے بیعت کے لئے آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ جب یہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ خربوزہ کھا رہے تھے۔ افغانی مولوی نے دیکھتے ہی کہا۔ لاحول ولا قوۃ میں کیا سمجھ کر

آیا تھا اور یہاں تو کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں ۔ علی نور صاحب اس پر مسکرائے اور کہا ۔ مولینا ۔ اللہ میاں تو روزہ نہیں رکھتا ۔ انغانی بھی بلا کے تیز آدمی تھے ۔ کہنے لگے ۔ اللہ میاں روزہ تو نہیں رکھتا مگر وہ خربوزہ بھی نہیں کھاتا ہے —— آپ اس جواب پر بڑے خوش ہوئے اور فوراً مرید کر لیا اور کہتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دولت فقر سے مالامال کر دیا —— جب سیّد نظام شاہ کا انتقال ہوا تو صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس وقت علی نور صاحب کی قدموں میں تھے یا کسی اور مکان میں مگر یہ طے ہے کہ اُن کا انتقال مسکونہ مکان میں نہیں ہوا اور انتقال کے بعد علی نور صاحب کے احاطے میں کہیں دفن ہوئے ۔ نیاز فتحپوری نے یہ جو کہا ہے کہ انتقال کے بعد سیّد نظام شاہ اپنے پیر علی احمد شاہ صاحب کے قدموں میں دفن کئے گئے قطعاً موضوعی حیثیت رکھتا ہے ۔ ہاں تو کھنڈارا کے والد کا بیان ہے کہ جب میاں نظام کا انتقال ہوا تو امیر احمد صاحب مینائی نے آ کر نظام صاحب کے مسکونہ مکان میں حکومت کی طرف سے ایک اور قفل ڈال دیا سوئم کے بعد امیر مینائی نے ہی یہ مکان کھولا ۔ غزلیات کے مسودے اور کچھ اشعار جو دیواروں پر کوئلہ سے لکھے ہوئے تھے نوٹ کئے اور ان کو مٹا کر چلے گئے ۔ پلنگ پیڑھی ان کی بیوی کو بھجوا دی موصوف نے یہاں ایک عجیب و غریب بات کہی ۔ مجھے چونکہ کسی حقیقت کو چھپانا مدنظر نہیں ہے اس لئے وہ سب کچھ بے کم و کاست بیان کرتا ہوں حالانکہ امیر صاحب مینائی میرے دادا اُستاد ہیں کیونکہ میں فصاحت جنگ حضرت جلیل کا شاگرد رہا ہوں ۔ ماسٹر کھنڈارا صاحب کے والد کا یہ خیال تھا کہ وہ اشعار جو امیر مینائی کے کلام میں نہیں کھپتے یہ وہی اشعار ہیں جو وہ نظام شاہ کے مکان سے اپنے ہمراہ لے گئے تھے ۔ میں نے جیسا سُنا تھا آپ سے بیان کر دیا اب یہ آپ پر ہے کہ اُسے قبول یا رد کر دیں —— پھر بھی امیر مینائی سے اس قسم کی بدگمانی کی نسبت درست نہیں ۔ ابھی میں نظام شاہ صاحب سے متعلق کچھ لکھنے پر سوچ ہی رہا تھا کہ مزے سے از غیب بیروں آمد و کارے بکند ۔ کے طور پر ایک شخص میری غزل کا مطلع سُن کر پوری غزل حاصل کرنے کو آ گئے ۔ یہ امیر مینائی خاندان کے قدیم خدمتگزاروں ہیں ۔ اُن سے بھی سیّد نظام شاہ صاحب کا تذکرہ چھڑا تو وہ کھُل پڑے ۔ کہنے لگے کہ آپ حافظ پھُندو عرف پنڈت سے ملئے جو کٹ کوئیا محلہ میں رہتے ہیں اور پھر انہوں نے پنڈت کے متعلق سب کچھ بطور خود بھی بتایا ۔ پنڈت اِن کے خاص دوستوں میں سے تھے ۔ یہ حافظ پھُندو اور پنڈت یہ کیا معاملہ ہے میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ پیغمبر پور میں ایک بزرگ رہتے تھے ۔ حافظ پھُندو نے ان کی کرامت کا امتحان لینے کے لئے پنڈت کا روپ دھارا اور حاضر ہوئے ۔ وہ بزرگ حقّہ پی رہے تھے ۔ حقّہ آگے بڑھا کر کہا ۔ پنڈت جی پیو —— انہوں نے پنڈت ہونے کا عذر کیا تو فرمایا یہ تو ٹھیک ہے مگر ہمارے ہاں پنڈت اور شیخ سب برابر ہیں ۔ بہت عذر ہوا بس اب پی لو —— راز کھُل گیا مگر یہ پنڈت کے نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ اُن کا نام بھُول گئے ۔ تو ان پنڈت کو سیّد نظام شاہ صاحب سے والہانہ محبت تھی ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے اور ہر شعر اور ہر غزل کے متعلقات انہیں یوں حفظ تھے جیسے وہ اُس کے حافظ ہوں ۔ ان پنڈت نے ہی لوگوں پر یہ راز فاش کیا تھا کہ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ ۔ یہ مصرع نواب کلب علی خان کا مصرع تھا جس پر نظام رام پوری نے پہلے تو مصرع پہونچایا اور پھر پوری غزل کہی جو حاصل دیوان ہے ۔ پنڈت نے یہ بھی بتایا کہ آخر عمر میں ایک مہترانی جو گھر میں کمانے آتی تھی سیّد نظام شاہ صاحب اس سے محبت کرنے لگے تھے (مگر بے لوث اور پاک) پنڈت کا کہنا ہے کہ وہ مہترانی بھی بڑی مزاج شناس تھی ۔ جب نظام صاحب خاموش ہوتے یا کوئی شعر کہتے ہوتے تو وہ کوئی نہ کوئی چٹکی لے لیتی تھی اور نظام صاحب پھڑک جاتے تھے —— ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گئی اور کئی دن تک نہ آئی تو آپ آبدیدہ بھی ہوئے اور اُس کی مزاج پُرسی کو اس کے گھر بھی تشریف لے گئے —— پنڈت کہا کرتے تھے کہ اُن کے کسی شعر میں محبوب کو ہاتھ لگانے کا ذکر نہیں ملتا ۔ یہی نظام صاحب کا کردار تھا —— اور یہ بات قرین قیاس یوں بھی ہے کہ نظام صاحب کے ہاں چوما چاٹی کا کوئی شعر نہیں ملتا ۔ وہی رُکی تھمی کیفیت ۔ وہی احتیاط اور رکھ رکھاؤ جو ایک پاکباز شاعر کے ہاں ہوتا ہے نظام صاحب کا رنگ ہے ۔ سیّد نظام شاہ صاحب کے تین دیوان کتب خانہ سرکاری میں موجود ہیں ایک مطبوعہ اور دو قلمی ۔ قلمی اور مطبوعہ میں زمین آسمان کا فرق ہے کئی کارآمد اور اچھے اشعار مطبوعہ دیوان میں نہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً وہ دیوان کی اشاعت

کے بعد دستیاب ہوئے ہوں گے۔ مطلب یہ کہ نظام شاہ صاحب کا دیوان تو دراصل ایک ہی ہے مگر قلمی نسخوں میں بقیہ اشعار بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ شعرائے دربار رامپور جس میں میرے دادا استاد امیر مینائی بھی شامل ہیں نے حتی المقدور نظام کو اُبھرنے سے روکا جس کے نتیجہ میں وہ درباری مشاعروں میں شریک تو ضرور ہوتے تھے مگر وہ منفعت حاصل نہ کر سکے جو ان کے حسب حال ہوتی۔ انتقال کے بعد یہ بھی نہ ہو سکا کہ اُن کی کلیات شائع کر دی جاتی چنانچہ امیر مینائی نے ترتیب دے کر ایک دیوان سرکاری کتب خانے میں داخل کر دیا اور بس۔ وہ تو یہ کہیے کہ قدرت رامپوری کو اس کا خیال آیا اور اُس نے بڑی جانفشانی کے بعد ان کی کلیات اور وہ اشعار جو زبان زد تھے جمع کر کے شائع کرا دئے۔ چند اشعار اور پیش کرتا ہوں ہو سکتا ہے کہ ان کا کچھ زیادہ تعلق ان کی زندگی سے نہ ہو مگر اچھے اشعار سننے میں حرج ہی کیا ہے۔

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا — ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا
خوش ہوں اس وعدہ فراموشی سے — اُس نے ہنس کر تو کہا بھول گیا

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
کروٹ بدلنے میں جو دوپٹہ سرک گیا — گھبرا کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں — کیا منہ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ
بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا — ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ
وہ زانوؤں میں سینہ چھپانا سمٹ کے ہائے — اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام — منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

سوتوں میں جان ڈال کے انگڑائیاں نہ لو — یاں آنکھ آپ کی ہے مقرر لگی ہوئی

کہتے ہیں سب یہ میری باتیں ہیں — تجھ کو شاعر بنا دیا میں نے

اُس دست نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا — کس ناز سے کہنے لگے اُف چھوڑ۔ گیا ہاتھ

مرا کچھ حال دل کہنا اور اُس کا — وہ کہنا چپکے سے مُنہ پھیر کر کچھ
یہاں کہتا ہوں کچھ میں ہائے قسمت — وہاں کہہ دیتے ہیں پیغامبر کچھ
نظام ایسے ابھی شاداں نہ تھے تم — خوشی کی دی کسی نے کیا خبر کچھ

کس نے کوسا تھا خدایا مجھ کو — کہ تجھے عشق بتاں ہو جیسے

پھر نہ کہنا کہ مجھے تم نے کہیں دیکھا ہے
سوچ لو جی میں کئی بار وہیں دیکھا ہے

گر کوئی پوچھے مجھے۔ آپ اسے جانتے ہیں
ہو کے انجان وہ کہتے ہیں کہیں دیکھا ہے

بعد رنجش وہ مل کے پوچھتے ہیں
ہم نہ ملتے تو آپ کیا کرتے

مری جانب سے تم کو دشمنوں نے خط یہ لکھے ہیں
بھلا ایسا میں لکھ سکتا ہوں یہ تحریر میری ہے

قاصد تری باتوں کا تو ہے اور ہی مطلب
ان باتوں کا خط میں کہیں مذکور نہیں ہے

ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بُری۔ لگے
اُس بیوفا سے گو مری رنجش ہزار ہے

مجھ میں اُن میں جو کچھ کدورت ہے،
جائے گی یہ ابھی نہیں جاتی

چھپ چھپ کے دیکھنے کا مزہ دیکھتے نظامؔ
یہ خیر گزری اُس کی اِدھر کو نظر نہ تھی

شاد عظیم آبادی

سید حسن امام

خان بہادر سید علی محمد شاد (۱۲۶۲ — ۱۳۴۵ھ)

"خون لگا کر شہید" قسم کے بہاری کہے جانے والے مشاہیر میں شاد نہیں تھے بلکہ کئی پشتیں خاک بہار میں پیوند کر دینے کے بعد یہ گل سرسبد اُگا تھا۔ میر و درد کی اپنی اپنی خصوصیتوں کا دل پکڑ لینے والا مجموعہ تیار کرنے کی فطری صلاحیت انہی کو ودیعت ہوئی تھی۔ بہاری فقیر کی جھولی میں لعل و گوہر، ہزار بے قدری سے سہی مگر "شب چراغ" آنکھوں سے اوجھل کب رہ سکتا تھا؟ شاد پر زمانے کی نظریں پڑتی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کا احترام اپنی اپنی جگہوں پر رکھنے کے بعد بھی شاد خود اپنی بہاری بولی پر نازاں تھے۔ بدقسمتی سے ان کو "نادان دوست" تو ملے مگر دانا دشمن تک نہ ملا۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے اکثر "بول" بزبان غیر ترجمہ ہو گئے۔

شاد کی شخصیت بہت ہی اُلجھی ہوئی سی ہے۔ کیا باعتبار ذاتی توقعات اور اس کے ماحصل کے، یا ماحول اور اس کی اقتضا کی نسبت سے۔ ان باتوں کے شواہد اور اثرات ان کے کردار اور کلام میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے فرمودات پر جہاں تک خیال آرائی کی گئی ہے اس میں ان کی ذات کو معرض بحث میں لانے سے عموماً پرہیز کیا گیا ہے۔ اگر ناگزیر طرح پر ان کو زیر بحث لایا بھی گیا ہے تو اس میں معترضین نے علیل قسم کی غیر واجب احتیاطیں برتی ہیں اور معترضین بری طرح اپنا بھانڈا پھوڑ بیٹھے ہیں۔ ع مُردم ز غلط فہمی مُردُم، مُردم۔ کہنے کا مستحق شاد سے بہتر کیا ہوگا۔ ماہنامہ ندیم گیا کا شاد نمبر بمعونت جناب حمید عظیم آبادی، میری ادارت میں شائع ہوا تھا۔ متکلم اسلام، شاد کو ثابت کرنے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا زور قلم ہاتھ آگیا تھا مگر شاد کی شخصیت کی تابانی یا تاریکی کو اُجاگر کرنے کے لئے کوئی روشن ضمیر ہمت نہ کر سکا تھا۔ ایک کھلی وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاد کی ذات خود اپنے فرمودات کے حجابات سے باہر آنے کی کبھی عادی ہی نہیں ہو سکی چونکہ نگاہ مدہیں اکثر تاک میں رہتی تھی۔ لہذا ع

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا۔ قول کسی کا بھی ہو مگر "زبانِ حال" شاد کی اس کی ہمنوا رہی۔ آج جب شاد شعرائے بہار کی حدوں سے پار اُتر کر صرف اُردو کے منفرد و سرآمد اساتذۂ سخن میں شمار ہونے لگے تو اُن کی شخصیت سے دلچسپی بڑھ رہی ہے۔

شاد کے تالیف کردہ تذکرۃ الاسلاف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دادا ؤں میں بخط مستقیم کوئی ہستی غیر معمولی وجاہت

کی ہندوستان میں نہیں تھی۔ مصاہرت کے ذریعہ ننھیالوں میں متعدد اسماء ملتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ مورثین اور وارث کے مذہبی رجحانات ایک سے نہیں ہیں۔ جن نسبتوں سے شاد اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں وہ سیادت سے گرگرا تر اک سے ملتی ہیں، یعنی علی وردی خاں صوبہ دار بہار، اڑیسہ و بنگال کے ذریعہ۔ ظاہر ہے کہ شاد کا سا حساس طبع اس کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر "کڑوے پر نیم" یہ ہوا کہ متاع خاندانی کا صرف تبرک ہی تبرک شاد تک پہنچا۔ ان کے قریبی رشتہ داروں میں، صرف فارغ البال ہی نہیں بلکہ کثیر الاملاک اعزا بھی تھے، جن سے ہم چشمی برقرار رکھنی شاد کے ایسے نازک طبع کے لئے "بن کھانڈے سنگرام" سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سادات بارہہ کی قرابتداریوں سے بھی شاد بہت دنوں مطمئن نہیں رہ سکتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی سے رائے عامہ بادشاہ گر بھائیوں کو مطعون کرنے لگی تھی۔ شاد کے ہوش سنبھالتے ہی غیر جانبدار قدما اور ان کے آگے کی نئی پود اس بارے میں بلند آوازہ ہو چکی ہوگی۔ پھر انگریزی تسلط میں جو کارہائے نمایاں ان کے بڑوں نے کر دکھائے تھے مگر اس کے اجر "دہ در دنیا" میں سے پھوٹی کوڑی بھی شاد کی قسمت نہ ہوئی۔ ان سب باتوں کو زیر نظر رکھتے تو ان کے بیدرد نکتہ چیں یوں مشق ستم نہ فرماتے ع

زانکہ مجنوں را خرابیہائے خود، دیرانہ بود۔

اس پس منظر پر صرف سرسری نظر ڈالنے والے کا تاثر جب بعید از فہم ہے نہ خلاف توقع۔ تو پھر کون سی حیرت کی بات ہے کہ آنکھیں کھولنے کے بعد سے ان کو موند لینے کی رخصت پانے تک اسی پس منظر میں گزر بسر کرنے والا بھی اثر لئے بغیر نہ رہ سکا؟ آخر شاد بھی انسان ہی تو تھے۔ مگر اتنا بھی کسی نے غور نہ کیا اور نتیجے میں "الیپنچ" ہی خم ٹھوک کر میدان میں نہیں کودا، بلکہ لکھنو والے مرزا مچھو بیگ کی آخری منطق بھی اسی ذیل میں ہے۔ اگر شاد اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے صرف "شاگرد فریاد" ہوتے تو فغاں و نالہ کرتے یونہی رہ جاتے اور کسی کو ان کی یاد بھی نہیں رہتی۔ مگر وہ تھے تلمیذ فطرت سب طرح کے جھونکے سہار گئے۔ خزاں کے دور سے گزر گئے مگر جب بھی بہار ساز گار ہوئی تو کف گلفروش و دامن باغباں میں تر و تازہ نظر آئے۔

آبا و اجداد میں مذہبی دو رنگی کوئی خاص بات نہیں ہوتی بشرطیکہ شاد بھی معمولی قسم کے آدمی ہوتے۔ لیکن ان کی صلاحیتیں ضامن تھیں کہ اس عامتہ الورود صورت حال سے بھی استفادہ کئے بغیر نہ رہیں گی۔ چنانچہ منظر عام پر اب تک آئے ہوئے ان کے کلام میں "نوحہ" قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کے مراثی بھی اپنے انداز میں منفرد اس لئے ہیں کہ وہ بین و بکا کے چنداں قائل نہیں ہیں۔ اس صنف سخن میں جو فلسفیانہ طرز انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ایسا ہے کہ مراثی گو اساتذہ میں وہ سب سے ممیز ہیں۔ ان کے مراثی کا مقبول عام نہ ہونا ان کی خوبیوں کی دلیل ہے۔ جہاں مراثی بذیل رسمیات مذہبی مروج ہیں وہاں کے مطالبات شاد پورے نہیں کرتے۔ اور جہاں ان کی مقبولیت مصدق ہے وہاں مراثی کا رواج نہیں۔ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ محنت برباد گئی۔ شاد اس سے بےخبر نہ تھے۔ مگر جو اصلاح ان کے پیش نظر تھی اس کو "دور کی کوڑی لانا" کہہ سکتے ہیں۔ آج زمانہ اعتنا نہ کرے مگر وہ دن دور نہیں جب ان کی اتباع بغیر چارہ نہ ہوگا۔ نثری خطبات شہادت تو اس ڈھرے پر آچکے ہیں۔ منظومات میں شعرا حضرری "رفت سے کے بند" "سخت جانی کا ثبوت دے رہے ہیں لیکن فلسفیانہ استدلال آہستہ آہستہ قدم جما رہا ہے اور یہ سب شاد ہی کے مراثی کی آواز بازگشت ہے۔

شاد کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں جن کے سطحی مطالعہ سے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتدالی کے ساتھ خودستائی کی جا رہی ہے، لیکن بین السطور غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس بظاہر خودستائی کی تان جا کر ٹوٹتی ہے خود اپنے ہی مرثیہ پر۔ مکاتیب کے بارے میں ان کو کسی قسم کا خطرہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے "دیوار ہم گوش دارد" کے ڈر سے جو بات وہ منہ سے نکالتے بھی نہیں تھے۔ وہ ان کا قلم "برزبان" کئے رکھتا تھا۔ بعض بعض خطوط کے کچھ مفاہیم ایسے نکلتے ہیں جن کو شاد کا مقصود واقعی باور کر لینا، خود اپنے ذوق سلیم کی توہین ہونی چاہیئے۔ شاد کے ایسا متین و متواضع شخص کن مجبوریوں میں گھر گیا ہوگا جب اس کا قلم ایسا بے قابو ہو گیا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی مگر اس دردسری میں پڑتا کون؟

شاؔد کی اس کمزوری سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ محبّت کے ایسے بھوکے تھے کہ ہاتھ بڑھتے ہی پہونچا پکڑ لینے والے کی پذیرائی میں بھی اکثر یہی فرمایا کرتے تھے ؎

دوست آں دانم کہ گیرد دستِ دوست　　در پریشاں حالی و درماندگی

دھوکے پر دھوکا کھاتے رہنے کے بعد بھی "دوبارہ کی ہوس ہے" شاؔد پکارتے ہی چلے گئے۔ اس کا سبب ان کی عقل کی کمی نہیں بلکہ حسن ظن کی فراوانی!

رئیسوں کی اولاد ہونے کا بہت بڑا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ حاشیہ برداروں کی باتوں میں آگئے اور اپنے ہی اچھے برے میں تمیز کرنا بھول گئے۔ جہاں انہوں نے اشرفیاں لٹانے میں دریغ نہیں کیا وہیں کوڑیوں پر چھاپ لگانے میں عار بھی نہیں کی۔

شاؔد کی اخلاقی خوبیوں پر حرف گیری کے سدباب کے لئے اس تضیۂ نامرضیہ کو یکسو کر لینے پر کوئی آمادہ نہیں ہے کہ حضرت صفیؔر بلگرامی کو شاؔد نے استاد زمن، استادفن یا استاد من لکھا تھا۔ بہرحال یہ فتنہ اس وقت اٹھایا گیا جب شاؔد دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ چھیڑ یقینی شاؔد والے ہی نے کی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاسکتا تھا مگر اس سے احتیاط کے باوجود قصّہ کو طول دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ "از ماست کہ برماست"!

جہاں تک مجھے معلوم ہے شاؔد کی خانہ آبادی اور خانہ ویرانی ع "نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد حرمانے" ہی قسم کی تھی۔ صرف ایک صاحبزادے سیّد حسین مرحوم کا مجھے علم ہے۔ باپ بیٹے کو یکجا دیکھ کر شاؔد کی حرماں نصیبی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ عجیب عجیب قسم کے درد و اندوہ شاؔد کو قسمت ہوئے تھے۔ انہی کا ظرف تھا کہ صرف ہنس بول کر بسر کر لینے پر قادر نہ تھے بلکہ لب گور پہنچتے پہنچتے بھی حیات فریاد کی تسوید ختم کرکے مانے! اس کتاب کی تاریخی حیثیت جو بھی سہی مگر اخلاق و معاشرہ کے سمجھنے میں اس کا بکار آمد ہونا ناقابل انکار ہے۔

"دلّی، لکھنؤ کے بعد پٹنہ" ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے۔ مرشدآباد کو اس گنتی میں کبھی لیا ہی نہیں گیا تا بدیگراں چہ رسد۔ آج پٹنہ چاہے جو کچھ بھی ہو جائے مگر شاؔد کی جوانی کے دنوں پٹنہ ایسا باغ بہار تھا کہ پورب دروازہ سے لے کر پچھم دروازہ تک گلستان سعدی کا باب پنجم صفحۂ قرطاس سے سطح ارضی پر منتقل ہوکر جاندار ہوتا چلا گیا تھا۔ اگر "زرمستی" یا نعوذ باللہ "خرمستی" شاؔد کو کہیں سے چھو بھی گئی ہوتی تو یارانِ طریقت ایک کی دس لگائے بغیر کب مانتے؟۔ ایسی ایسی گلکاریاں کرتے کہ باغ شدّاد کے افسانے کی حقیقت نہیں رہتی۔ مگر یوں بھی باز آنے والے تھوڑے ہی تھے؟ کھوج ڈھونڈ کر ایک "گل بداماں بہار" کو شاخ پر چڑھا ہی دیا۔ خاردامن بن کر پیچھے پڑے۔ اس بارے میں شاؔد کے ماننے والوں کا سکوت ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" کی غلط فہمی کو ہوا دینے لگا۔ حالانکہ واقعہ میں واقعہ صرف اسی قدر تھا کہ ذات برادری سے نکالی ہوئی، گلچینوں کے پنجۂ ستم سے خوفزدہ، پناہ ڈھونڈتی آگئی تھی۔ شاؔد نے بُت کا فر کو کلمہ پڑھا دیا تو کیا غلط کیا؟ مگر ع جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے! کے باوجود وہ موردِ الزام قرار پائیں تو کہنا ہی پڑے گا کہ ع

بلبلِ زمزمہ برگلستاں، اگر گلے در دامنم باشد!

خلاصہ یہ کہ ۱۲۶۵ھ ہجری مطابق ۱۸۴۶ء کا پیدا ۱۳۴۵ھ ہجری مطابق ۱۹۲۶ء کو دنیا سے اُٹھ گیا اسّی برس ناشاد رہا مگر سب نے اسی کو شاؔد پکارا ؎ برعکس تخلّص ہے مگر شاؔد کریں کیا　　مجبور ہیں مشہور اسی نام سے ہم ہیں

اُن کی غزلوں کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کو جا سے اصرار ہے کہ ہم شاؔد کو کبھی مرنے ہی نہ دیں گے۔ اس میں شک کی گنجائش یوں نہیں کہ اپنے مرنے کا یقین جو ٹھہرا!!

———————

نصیر حسین خیالؔ

شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تفسیر می کنند
خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

نقوش لاہور کے مدیرِ محترم کی فرمائش ہے کہ میں نواب سید نصیر حسین خیالؔ عظیم آبادی کی شخصیت پر نقوش کے شخصیات نمبر کے لئے ایک مضمون لکھوں۔ ان کا یہ خط موصول ہوا تو میں نے محض اس وجہ سے تعمیلِ ارشاد سے پہلو تہی کرنا چاہی کہ میں نواب صاحب کی شخصیت سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتا۔ لیکن دوسرے ہی دن مدیرِ محترم کا تار ملا کہ مضمون جلد بھیجئے تو کسی نہ کسی طرح تعمیلِ ارشاد کے لئے تیار ہونا پڑا۔

نواب صاحب صوبۂ بہار کے ایک ممتاز و مقتدر خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ہندو پاک میں کون ایسا ہے جو ان سے واقف نہیں۔ لیکن اگرچہ مجھ کو شاعری میں شادؔ مرحوم سے تلمذ حاصل ہے اور کم از کم تین سال تک ان کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے جس کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا، یہ امر واقعہ ہے اور بدقسمتی بھی کہ میں نے کبھی نواب صاحب کو دیکھا اور نہ ان کی گفتگو سنی، کیونکہ اس زمانے میں وہ کلکتہ میں قیام کرتے تھے اور میرے سامنے کبھی پٹنہ نہیں آئے۔

شخصیت نگاری ایک مستقل اور مشکل فن ہے اور اس کی تعمیر میں متعدد عناصر کارفرما ہیں۔ کسی کی شخصیت پر کوئی قلم نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ اس نے اس شخص کو قریب سے نہ دیکھا ہو اور نہ اس کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوا ہو اور اس کی شکل و صورت، خط و خال، رفتار و گفتار، عادات و اطوار، اخلاق و افعال اور سیرت و کردار سے کما حقہٗ واقف نہ ہو اور ان سب صفات کا تجزیۂ نفسی نہ کر سکتا ہو۔ لہٰذا میرا یہ مقالہ گویا ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جس کو دیکھا بھی نہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ لکھنا بھی ضرور ہے کیونکہ مدیرِ محترم کو میں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میری اس تحریر سے نواب صاحب کی شخصیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔ یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ سچ یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ چند لکیریں ہیں۔

نواب خیالؔ صوبہ بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشاہیر میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ہنوز جاذبِ توجہ ہے۔ متعدد اربابِ قلم نے مختلف اوقات میں نواب صاحب سے متعلق خامہ فرسائیاں کی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے پہلے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے مئی ۱۹۱۷ء

کے العصر میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا، جنوری ۱۹۳۶ء کے ندیم میں سید رضا قاسم صاحب مختار حسین آباد (بلامو)، کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا مئی ۱۹۵۵ء کے نگار میں بھی ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ عرصہ ہوا معارف میں بھی کسی صاحب کا ایک مفید مقالہ شائع ہوا تھا جس میں نواب صاحب کے سفر مغرب سے متعلق دلچسپ بحث کی گئی تھی۔ اول الذکر تینوں مضامین میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے تیسرے مضمون میں نواب صاحب کی ادبی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور پہلے دونوں مضامین میں ان کے حالاتِ زندگی اور خاندانی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی دونوں مضامین کی مدد سے یہ مقالہ ترتیب دے رہا ہوں اور اس میں کچھ مفید مباحث بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

نواب صاحب کا خاندان نہ صرف جاہ و ثروت بلکہ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا۔ محفوظ الحق مرحوم کا بیان ہے کہ آپ کے مورثِ اعلیٰ عرب سے ایران کو منتقل ہوئے جہاں اس خاندان کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ سید حسین فیروزی شاہ طہران ہو گئے اور ان کے پوتے کبیر المشائخ گورنر ہرات مقرر ہوئے کچھ عرصہ کے بعد اس خاندان نے ہندوستان کا رُخ کیا اور اس کے اکثر ارکان صوبہ داری و وزارت کے درجہ تک پہنچے۔ عہدِ مغلیہ میں بھی اس خاندان نے اپنی قدیم عظمت و شان کو برقرار رکھا، چنانچہ قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں ہندوستان کی تاریخ میں "سید برادران" اور "بادشاہ گر" کے القاب سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے کچھ ایسا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ درحقیقت یہی حکمران تھے اور اس دور کے شاہانِ مغلیہ محض گنجفہ کے بادشاہ تھے۔ صوبۂ بہار سید حسین علی خاں کی جاگیر میں تھا اور وہ عرصہ تک عظیم آباد میں مقیم بھی رہے۔ نواب علی وردی خاں صوبہ دار بنگال و بہار بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ اس خاندان کی چند اور شخصیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے اکثر کا ترجمہ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم مؤلفہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی میں موجود ہے۔ مثلاً نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں ضمیر بخشی الملک اسد جنگ بہادر صوبہ دار عظیم آباد تھے۔ ان کے صاحبزادے نواب غلام حسین خاں سیر المتاخرین کے مصنف تھے جو فارسی زبان میں تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

اس خاندان کی دوسری شاخ نے پانی پت میں برگ و بار پیدا کیے جس کے گل سرسبز خواجہ حالی مرحوم تھے اور وہ شاد مرحوم کے ماموں ہوتے تھے۔

خواجہ محمد قاسم کے صاحبزادے صمصام الدولہ خان دوران امیر الامرا خواجہ محمد عاصم کا ذکر بھی اہم ہے۔ امیر الامرا نے میر محمد تقی میر کے لیے ایک روپیہ یومیہ مقرر کر دیا تھا جو انہیں تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ ۶ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ نادر شاہی حملہ میں بمقام کرنال امیر الامرا کو زخم کاری لگا اور وہ تیسرے دن انتقال کر گئے۔ ان کے صاحبزادے نواب اشرف خاں کے دو صاحبزادے تھے۔ احتشام الدولہ رستم علی خاں نواب بہادر رستم اور مرزا محمد حسن خاں مرزا۔ یہ دونوں بھائی انقلابِ زمانہ سے مجبور ہو کر ترکِ وطن کر کے نواب سعادت علی خان بہادر کے ہمراہ صوبۂ بہار و بنگال کو روانہ ہوئے اور بنارس میں رہنے لگے۔ یہ دونوں سید فضائل علی خاں بے قید ولد سید محمد علی خاں کے بھانجے تھے۔ یہ حضرات اسی خاندان کے افراد تھے۔

نواب خیال کی دادی فاطمہ بیگم کے والد نواب سید محمد عیسیٰ خاں عیسیٰ اور آپ کی نانی عارفہ بیگم کے والد نواب سید مہدی علی خاں مہدی اور بھائی نواب سید جلال الدین حسین خاں نامی بھی شاعر تھے۔ آخر الذکر شاد مرحوم کے حقیقی ماموں تھے۔ نواب خیال کے دادا نواب سید محمد محسن خاں محسن اور نانا نواب سید محمد عباس خاں محسن نواب سید تفضل علی خاں تفضل کے صاحبزادے تھے۔ محسن کے صاحبزادے نواب سید نوروز حسین خاں اور نواب سید جعفر علی خاں تھے۔ نوروز حسین خاں کے صاحبزادے نواب سید نصیر حسین خاں خیال اور جعفر علی خاں کے صاحبزادے نواب سید صادق حسین خاں نہال تھے۔ شاد مرحوم نواب خیال کے حقیقی ماموں تھے۔

غرضیکہ یہ امر مسلم ہے کہ نواب خیال ایک جلیل القدر خاندان کے فرد تھے جس نے علم و ادب کی عظیم الشان خدمتیں کیں اور جاہ و اقتدار بھی حاصل کئے۔ آپ کی ولادت بقول پروفیسر محفوظ الحق ۱۸۷۸ء میں اور بقول رضا قاسم صاحب ۱۲ مارچ ۱۸۸۰ء کو عظیم آباد (پٹنہ) کے محلہ حاجی گنج میں ہوئی۔ آپ کی عمر صرف تین سال[۱] کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تربیت فاطمہ بیگم نے اپنے ذمہ لی۔ چند برسوں کے بعد انہوں نے

---

[۱] والدہ ماجد حضرت شاد مرحوم
[۲] مضمون سید رضا قاسم صاحب

انتقال کیا تو آپ کی پرورش و پرداخت آپ کے چچا جعفر حسین خاں اور ماموں شاد مرحوم کے زیر سایہ ہونے لگی۔ میرا خیال ہے کہ اس جوہر قابل کی تابانی شاد مرحوم کے فیضِ صحبت کی رہینِ منت ہے۔ آپ نے عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی کافی بصیرت پیدا کی اور سفر یورپ کے دوران میں فرانسیسی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کی۔ غرضیکہ نواب صاحب اچھے خاصے ذی علم آدمی تھے۔

نوجوانی میں نواب خیال شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے اور حضرت شاد مرحوم سے اصلاح لیتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد شاعری کو خیرباد کہہ کر نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے اور اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی عمر تقریباً اٹھارہ ہی سال کی تھی کہ ۱۸۹۷ء میں آپ نے ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کیا جس کا نام ادیب تھا۔ یہ رسالہ عظیم آباد پٹنہ سے نکلتا تھا۔ ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء میں آپ کی شادی نواب واجد علی شاہ کے وزیر نواب انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی تو آپ نے پٹنہ کے قیام کو خیرباد کہہ کر مستقلاً کلکتہ میں اقامت اختیار فرمائی اور ماہانہ رسالہ "ادیب" مرحوم ہو گیا۔ ملک کے متعدد رسالوں میں آپ کے اردو مضامین شائع ہوا کرتے تھے اور فارسی اخبار "حبل المتین" میں فارسی مضامین۔ علمی و ادبی مشاغل کے علاوہ آپ کو سیاسی و تعلیمی تحریکوں سے بھی دلچسپی تھی۔ آپ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ٹرسٹی اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔

آپ[1] کا سب سے بڑا کارنامہ وہ خطبۂ صدارت ہے جس کا کچھ حصہ آپ نے دسمبر ۱۹۱۶ء کی آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ یہ خطبۂ صدارت سینکڑوں صفحات کو محیط ہے۔ افسوس ہے کہ پورا خطبہ کتابی شکل میں اب تک شائع نہ ہو سکا اور اب اس کی اشاعت کی امید بھی نہیں ہے۔ یہ عظیم الشان اور یادگار زمانہ کانفرنس ۲۹ دسمبر کی صبح کو ہنسنے قیصر باغ کی خوشنما بارہ دری میں منعقد ہوئی تھی۔ ایک بلند و وسیع پلاٹ فارم جس پر کوچیں اور گدے دار کرسیاں رکھی گئی تھیں متعدد و ممتاز شرکائے جلسہ کے لئے بنایا گیا تھا اور اس کی پشت پر ایک اور پلاٹ فارم مستورات کے لئے تیار ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد ہزاروں تھی اور ہر صوبہ کے معزز اصحاب نے شرکت کی تھی جن میں سے چند افراد کے نام یہ ہیں:۔

راجہ صاحب محمود آباد، نواب ذوالقدر جنگ بہادر (صدر مجلس استقبالیہ)، مسٹر محمد علی جناح، مسٹر مظہر الحق، مسٹر مارگولیتھ، میاں فضل حسین، مسٹر فضل الحق، مولانا آزاد سبحانی، مولانا شرر، صفی لکھنوی، مولانا سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مرزا رسوا، مسز سروجنی نائیڈو، پروفیسر پی گھوشال، سید سجاد حیدر یلدرم، سید جالب ایڈیٹر ہمدم، ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر، پنڈت شن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ دوسرے روز کی نشست ۲ بجے شام سے تھی۔ نواب صاحب کے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو مولوی نظام الدین حسن کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی لیکن دس ہی منٹ کے بعد نواب صاحب تشریف لے آئے تو بقیہ کارروائیاں آپ ہی کی صدارت میں ہوتی رہیں۔

نواب صاحب کے خطبۂ صدارت کا کچھ حصہ جس کا نام "داستانِ اردو" ہے العصر کے تین نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا آخری باب "مغل اور اردو" کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ یہ پرمغز خطبہ گراں قدر معلومات اور ادبی محاسن کا گنجینہ ہے۔ نواب صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہو گئی ہے جس کا نام "داستانِ عجم" ہے۔ یہ کتاب شاہنامہ پر گویا تبصرہ ہے اور اس میں شاہنامہ کے مصطلحات مثلاً درفش کاویانی، گرز گاؤسر، ماران ضحاک، پرمایہ، چاہ بیژن، سیمرغ، سیاوش وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ گو یہ چیز نئی نہیں کیونکہ سخندانِ پارس میں آزاد نے بھی مصطلحات کی تشریح کی ہے پھر بھی یہ کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

۱۹۱۷ء میں آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت بھی آپ ہی نے فرمائی اور اپنے خطبہ میں اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ پھر ۱۹۱۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن میں آپ سے بھی شہادت لی گئی تو اس موقع پر بھی اردو زبان کی اہمیت پر زبردست بیان دیا۔

نواب صاحب سیر و سیاحت کے بھی دلدادہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں نظام حیدر آباد کی طرف سے آپ کو یورپ بھیجا گیا۔ آپ نے

---

[1] رسالہ العصر ۱۹۱۷ء   [2] مضمون سید رضا قاسم صاحب۔

وہاں کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور انجمن یونین میں اردو زبان کے متعلق تقریر کی اور ایک مضمون بھی لکھا جو اردو رسالہ نوائے کیمبرج میں شائع ہوا۔ پروفیسر براؤن سے بھی آپ نے ملاقات کی اور دونوں میں فارسی میں گفتگو ہوتی۔ دوران گفتگو میں ایران کا ذکر آگیا تو آپ نے پروفیسر براؤن کو دوبارہ سفرِ ایران کی ترغیب دی۔ پروفیسر براؤن نے جواب دیا کہ "حالا پیر شدم طاقتے نہ دارم"۔ انگلستان کی سیر سے فارغ ہوکر آپ نے فرانس، بلجیم، جرمنی، اٹلی وغیرہ کی بھی سیر کی اور وہاں کے مشہور مقامات اور تعلیم گاہوں کو ملاحظہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے جہاں زاغلول پاشا سے ملاقاتیں ہیں پھر انگورہ (ترکی) پہنچے جہاں اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا سے نیاز حاصل ہوا۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے نہ صرف مضامین لکھے اور اسکیمیں بنائیں بلکہ عملی حصہ بھی لیا۔ اسی غرض سے ۱۹۳۴ء کے اپریل میں دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی میں دو روز گیا میں جناب انجم ایڈیٹر ندیم کے ہاں قیام کیا۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں آپ علی گڑھ تشریف لے گئے اور ۹ دسمبر کو نواب احمد سعید خاں سے ملنے کو چھتاری روانہ ہوئے۔ ۱۱ دسمبر کو وہیں آپ کے قلب میں درد اٹھا اور یہ درد ایسا مہلک ثابت ہوا کہ علاج کی بھی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ چند ہی منٹ کے بعد روح پرواز کرگئی۔ آپ کی لاش کو نواب صاحب نے پٹنہ روانہ کردیا جو ۱۲ دسمبر کو حضرت شاد کے پہلو میں سپرد خاک کی گئی۔

سنا ہے[1] کہ نواب صاحب ابتدا میں غزلیں کہتے تھے اور شاد عظیم آبادی سے انہیں تلمذ بھی حاصل تھا لیکن اگرچہ شاعری تو ترک ہو چکی تھی شاعرانہ ذوق مفلوج نہ ہوا تھا چنانچہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں بادشاہ نواب عشرتی کے دولت کدے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کچھ طرحیں دی گئی تھیں اور بیرون صوبہ کے حضرات نے بھی شرکت کی تھی تو نواب صاحب بھی اس مشاعرے میں شریک تھے لیکن غزل نہیں پڑھی تھی۔

نواب صاحب نے صرف ایک اولاد چھوڑی، آپ کے صاحبزادے سید امیر نواب صاحب ہیں جو آج کل غالباً حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

نواب صاحب نہایت ہی وجیہہ و شکیل آدمی تھے، گندمی رنگ اور قد او سط تھا، مونچھیں بڑی بڑی اوپر کو اٹھی ہوئی لیکن داڑھی استرے کی رہین منت تھی۔ طرز معاشرت مغربی اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ کبھی شیروانی استعمال کرتے تھے اور کبھی مغربی لباس لیکن ٹوپی ایک خاص قسم کی پہنتے تھے جس کے سامنے دو نو تام لگے ہوتے تھے۔ لباس کا خاص خیال اور شوق تھا اور جو لباس بھی پہنتے تھے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ نہایت ہی خلیق اور ملنسار تھے اور لوگوں کو ایک ملاقات میں گرویدہ کرلیتے تھے۔ انداز گفتگو نہایت دلکش تھا اور گفتگو میں بھی صحت زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مذہبی خیالات میں آزادی تھی بلکہ یہ کہنا نازیبا نہ ہوگا کہ ان کی زندگی پر مذہبی اثرات بالکل نہ تھے لیکن معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ ہر فن پر گفتگو کرسکتے تھے خواہ وہ ادبی ہو یا علمی، مذہبی ہو یا سیاسی۔

داستان اردو ادبی حیثیت سے ضرور قابل قدر ہے لیکن تاریخی نقطۂ خیال سے مصنف کے اکثر نظریے محل نظر ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ نواب صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ کی (بابر کی) اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظل اللہ کے منہ سے نکلا ہوگا تو نہ معلوم مغل کا کیا رنگ اور باربریوں کا کیا حال ہوا ہوگا، کتنی واہ واہ ہوتی ہوگی"۔ بابر کا شعر یہ ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغو سدر پانی و روتی

پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ہماری نظر جہاں تک ہے بابر سے قبل کسی نے اردو میں نظم کی ہمت و جرأت نہیں کی اس لئے جب تک اس کی تردید نہ ہو فردوس مکانی ہی اس کے موجد اور اس صنعت کے باوا آدم مانے جائیں گے"۔ بابر ۱۵۲۶ء مطابق ۹۳۲ھ میں ہندوستان آیا تھا۔ مذکورہ بالا شعر

---

[1] روایت مولوی سید قدرت حسین عظیم آبادی۔

یقیناً اس کے بعد کہا ہوگا۔ لیکن مزید تحقیق کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوئی ہے کہ شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۶ء) جو عرفانیہ مسائل پر لکھنے اس سے بہت قبل اردو میں تین نظمیں لکھ چکے تھے، ایک کا نام "خوش نامہ" اور دوسری نظم کا نام "خوش نغز" ہے اور تیسری کا "شہادت الحقیقت" ہے۔

۲۔ نواب صاحب کا خیال ہے کہ فضلی کی "دہ مجلس" (۱۱۴۵ھ) اردوئے معلّٰی کی پہلی مثال ہے۔ یہ آزاد کے خیال کی بازگشت ہے لیکن جدید تحقیق یہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۷۲۱ھ، ۸۲۵ھ) نے اردو میں دو رسالے لکھے تھے، "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ"۔ معراج العاشقین شائع ہو چکی ہے۔ اس کا وجود ثابت کرتا ہے کہ "دہ مجلس" سے کم از کم سوا تین سو سال پیشتر اردو میں تصنیف موجود تھی۔

۳۔ نواب صاحب عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام کی دو غزلیں پیش کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ "عمدۃ الملک کی یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ مجتہد زبان و فن ہے اور کسی کا مقلد کیا، سب اسی کے شاگرد و زلّہ خوار ہیں۔" اور انجام کے اس شعر کے متعلق ؎

نعش میری دیکھ کر مقتل میں یوں کہنے لگے

کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

فرماتے ہیں کہ "ذرا زبان کو دیکھنا یہ دو سو برس کی اردو ہے۔ میاں ولی کیا کسی ولی نے بھی یہ زبان کی کرامت نہیں دکھائی۔"

انجام کا انتقال ۱۱۵۹ھ میں ہوا ہے۔ ولی گجراتی (یا دکنی) نے انجام سے چالیس سال قبل ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ اس وقت انجام اگر پیدا ہو چکے ہوں گے تو بہت کمسن ہوں گے۔ اب ذرا ولی کی زبان کی کرامت ملاحظہ ہو ؎

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا	میرا سخن راست اسے راس نہ آیا
پھر میری خبر لینے وہ صیّاد نہ آیا	شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
زندگی جامِ عیش ہے لیکن	فائدہ کیا اگر مدام نہیں
جسے عشق کا تیر کاری لگے	اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
اے ولی! رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق	کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

انجام کی دونوں غزلیں میرے سامنے ہیں، ان میں زبان کی صفائی و روانی ہے مگر خیالات ہلکے پھلکے ہیں۔ ولی کے بعض اشعار میں اعلیٰ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے مثلاً ؎

دشمنِ دیں کا دین دشمن ہے	راہزن کا چراغ رہزن ہے
صدق ہے آب و رنگ گلشنِ دیں	پاکبازی ہے شمعِ راہِ یقیں

۴۔ عمدۃ الملک انجام کو بیدل کا شاگرد لکھا ہے۔ اگر یہ شاگردی فارسی شاعری میں تھی تو ممکن ہے ورنہ انجام کا بیدل سے اردو شاعری میں اصلاح لینا محلِ نظر ہے۔ صرف دو اشعار بیدل کی طرف منسوب ہیں اس لئے وہ اردو کے شاعر ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔ پھر دوسری جگہ نواب صاحب کا یہ ارشاد کہ انجام کسی کے مقلد نہیں شاگردی کی بنیاد کو منہدم کر دیتا ہے۔

۵۔ نواب صاحب انشا پردازی کے شوق میں کہیں کہیں صنعت ایہام سے بھی کام لیتے تھے۔ ایک جگہ ولی کی زبان کے لئے یہ جملہ فرماتے ہیں "ولی تاپتی ندی کے کنارے ٹاپتے رہتے" یہ روش آزاد کی تھی، نواب صاحب بھی انہی کے مقلد تھے لیکن مورخانہ تحریروں میں ایسے جملوں کا استعمال نقد بہت و متانت کے منافی ہے۔

۶۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "یہ وہی بھاکا تھی جس میں اس (مہاتما بدھ) نے ایک عالم وجد و سرور میں کاشی اور گیا جی کے جنگلوں کے درمیان اپنے ساتھیوں اور چیلوں کو پکارا اور کہا کہ دھرم کرو دھرم کرو دھرم کرو دھرم کا سنکھ بجاؤ دھرم کی ڈنڈ مچاؤ۔" اگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جملہ مہاتما بدھ نے اپنی

زبان مبارک سے ادا کیا ہوگا تو وہ پالی زبان کا کوئی فقرہ ہوگا نہ کہ ایسی بھاشا میں جس کو اردو سے مشابہت ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ مذکورۂ بالا فقرہ پالی زبان کا کیونکر ہو سکتا ہے۔

۷۔ اردو کے ابتدائی دور میں دو نوری گذرے ہیں، پہلا نوری عہدِ اکبری میں گزرا ہے جو فیضی کا معاصر تھا، دوسرا نوری ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں گزرا ہے اور تانا شاہ کے وزیر کے لڑکے کا معلم تھا۔ اسی نوری کا نام شجاع الدین تھا لیکن نواب صاحب نے اس نوری کو عہدِ اکبری سے وابستہ کر دیا ہے۔

۸۔ نواب صاحب نے بعض اچھے اچھے اشعار کو ملکۂ نورجہاں بیگم اور شہزادی زیب النساء سے منسوب کر دیا ہے۔ مثلاً اس شعر کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ نورجہاں بیگم کا نتیجۂ فکر ہے ؎

دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس دلِ بیباک میں ہم

اس پر نیاز فتح پوری نے صحیح تنقید کی تھی کہ اگر یہ شعر نورجہاں کا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ داغ سے اصلاح لیتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید و تحقیق کی موجودہ روش خیال صاحب کی تحریروں میں مفقود نظر آتی ہے اور شاید وہ اس کی اہمیت کے بھی قائل نہ تھے۔

۹۔ نواب صاحب شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے لیکن مولوی سید قدرت حسین عظیم آبادی فرزند میر عنایت حسین امداد جو شاگردِ شاد تھے) سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آخری ایام میں دونوں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور کچھ کشیدگی پائی جاتی تھی۔ نواب صاحب نے شاد کی زبان کے متعلق صحیح رائے دی ہے کہ ان کی زبان نہ دہلوی تھی نہ لکھنوی بلکہ ایک خاص قسم کی زبان تھی۔ شاد کی شاعری کے متعلق حمید عظیم آبادی کا خیال ہے کہ اس پر حافظ کی شاعری کا پرتو تھا۔ لیکن نواب صاحب نے ایک مکتوب میں حمید عظیم آبادی کو لکھا کہ اس کا ثابت کرنا آپ لوگوں کا کام ہے اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ حمید صاحب کے خیال کو انہوں نے اہمیت نہ دی۔ تلامذہ شاد مُصر ہیں کہ وہ ہر صنفِ سخن کے مالک تھے۔ بیشک انہوں نے مراثی، رباعیات اور قصائد بھی لکھے تھے۔ لیکن نواب صاحب کا خیال تھا کہ وہ غزل[1] کے سوا کسی اور صنفِ سخن کے مالک ہی نہ تھے۔ اس خیال سے میں بھی متفق ہوں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ نواب صاحب نے شاد کی زبان اور شاعری کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی وہ کشیدہ تعلقات کی بنا پر تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ آپ نے شاد کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے وہ سوئے ظن پر نہیں بلکہ حسنِ ظن پر مبنی تھے اور یہ آزادیٔ رائے، بیباکیٔ تنقید اور حریتِ خیال کی مثال ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے منجھلے بھائی شاہ منظور الرحمٰن اختر کاکوی (شاگردِ رشید شاد عظیم آبادی) سے سُنا ہے۔ شاد کی غزلوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ نواب خیال بھی اس مجلس میں شریک تھے اور بعض اشعار کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے یوں نہیں یوں سنا ہے۔ ایک روز سید صاحب (شاد کے صاحبزادے) نواب صاحب سے بگڑ گئے کہ آپ ابا جان کی غزلوں کو ترمیم و اصلاح سے خراب کر رہے ہیں۔ نواب صاحب بھلا کب چوکنے والے تھے، آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ تم کیا ہو تمہارے ابا جان کے سامنے بھی میں ٹوک دیا کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اظہارِ خیال میں کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

---

[1] مکتوب خیال مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۳۳ء بنام حمید عظیم آبادی مطبوعہ ندیم جولائی ۱۹۳۸ء

نواب صاحب کی شانِ ریاست، رکھ رکھاؤ اور مغربی طرزِ بود و باش سے متعلق بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ ۱۹۳۴ء میں نواب صاحب گیا میں جناب انجم کے مہمان ہوئے تو آپ کے لئے کموڈ کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ نواب صاحب کو انقباض پیدا ہوا اور آپ نے انجم صاحب سے دوستانہ اس کی شکایت کی۔

نواب صاحب کی شخصیت یقیناً ممتاز و بلند تھی۔ آپ نے ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ کو اردو زبان سے عشق تھا۔ آپ کی انشاپردازی ایک خاص قسم کی تھی اگرچہ آپ آزاد کے مقلد تھے لیکن پھر بھی آپ کی انفرادیت نمایاں تھی۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے نواب صاحب کا کارنامہ مشعلِ راہ اور آپ کا نام نامی روشن رہے گا۔ ؎

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

امداد امام اثرؔ

سید حسن امام

نواب شمس العلما سید امداد امام اثر عظیم آبادی۔

سنہ [illegible] ء کو بیسویں صدی میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور انیسویں صدی میں بھی اس کو گننا برائے نام ہی ہو گا۔ اسی عجیب و غریب سال میں [illegible] اس زمانہ کے مولوی امداد امام سے سابقہ پڑا تھا وہ بھی بذریعہ علاج۔ اس وقت سچ پوچھئے تو میرا ان کا کوئی رشتہ [illegible] نہیں تھا۔ میری [illegible] ان کی شریک زندگی ضرور تھیں مگر یہ بھی کوئی رشتے میں رشتہ ہوا۔ جو بھی ہو دو باتیں ان کو عام شخصیتوں سے ممتاز کرنے والی اس وقت بھی صاف محسوس ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ پیشہ ور حکیم یا ڈاکٹر تو کسی وقت نہیں تھے۔ دوسری بات یہ کہ [illegible] کے علاج جاری [illegible] مشکل ہی سے ملتے تھے۔ اس آخری صورت حال سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کچھ سیلانی سی طبیعت واقع ہوئی تھی [illegible] وقت ایسا بھی گزر چکا ہے کہ جناب اثر نے اپنا مطب [illegible] بڑھا رکھی تھی [illegible] صورت ویرانہ رہی مگر نواب صاحب کا [illegible] ظاہر ہو گیا [illegible] البتہ کہ گزشتہ [illegible] کی وجہ سے [illegible] شان متانت و بردباری پر حرف لائے بغیر [illegible] قہقہہ بار سماعت نہ ہو پاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی کی صحبت میں نواب صاحب کو دیکھا ہو اور [illegible] جس پر خود بھی ہنسے ہوں اور سننے والوں کو بھی ہنستے ہنستے [illegible] کر دیا ہو۔ ہنستے وقت ان کی آنکھوں میں ایسی چمک اور چہرہ پر وہ کیفیت کھیل جاتی تھی جو [illegible] بچوں کا حصہ ہوا کرتی ہے جبکہ ان کی شرارتیں کامیاب ہو جاتی ہیں! آپ کے اخلاق کی وسعت بسا اوقات خوش گواری کی حد سے باہر ہو جاتی تھی۔ اس کا [illegible] سمجھئے کہ نواب صاحب کے آگے عموماً سب ہی ان سے کچھ بے تکلف ہوا کرتے تھے۔ اگر کچھ افراد صحبت میں ان سے بڑے [illegible] نواب صاحب کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ اب ذرا فرض کیجئے کہ نواب صاحب میرے یہاں محفل جمائے بیٹھے چہل پہل ہو رہی ہے [illegible] کوئی [illegible] ضرورت سے آتا نظر آیا۔ نواب صاحب اس کی پذیرائی کے لئے گفتگو بند کر کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اس سکوت کا سبب ابھی دریافت نہیں کیا جا سکا ہے کہ نواب صاحب [illegible] استادہ۔ ساری مجلس گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ [illegible] خالی الذہن بڑھتا چلا آیا۔ نواب صاحب نے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ تو حیران پریشان

ہوکر رہ گیا - اب سب لوگوں کی سمجھ میں بات آئی - ایسے موقعوں پر یہی کرنا پڑتا تھا کہ سب دم بخود رہ جاتے کہ نواب صاحب کو خفیف ہونا پڑے - ہنسنا ہنسانا ان کا ذوق تھا مگر ذرا سے میں متاثر ہو کر آنسوؤں سے منہ دھو لینا بھی ان کے لئے دشوار نہ تھا -

نازک مزاجی ان کی مشہور تھی مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بدمزاجی کا انہوں نے مظاہرہ کیا ہو "قہرِ درویش برجانِ درویش" کو قول سے فعل میں لاتے ہوئے انہی کو دیکھا - شکار کا بے حد شوق ظاہر فرماتے تھے - مہاراج ٹکاری اور پیر شفاعت حسین مرحوم اکثر اس صحبت میں گرفتار ہوا کرتے تھے کہ نواب صاحب کو شکار کھلائیں "صحبت" کا لفظ میں نے دانستہ لکھا ہے - نازک مزاجی کا بڑا مظاہرہ شکار کے موقعوں پر ہوا کرتا تھا - پارٹی کا ہر فرد سہما ہوا رہتا تھا کہ دیکھئے کس غریب پر نزلہ گرتا ہے - یہ ڈر اس بات کا نہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب مار پیٹ کریں گے یا بے نقط سنا کر کسی کی عزت اتار لیں گے - جی نہیں - ایسی کسی حرکت کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا - اگر شیر وغیرہ درندوں میں سے کسی وحشی کے لئے مچان پر ٹولیاں بیٹھی ہیں تو نواب صاحب خود کو گولی چلا ہیں سکے نہیں اور کسی نے شکار کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سبقت کر دی تو بس قیامت آ گئی - نواب صاحب اس سے تو کیا خفا ہوں گے خود اپنے آپ سے خفا ہوئے بیٹھے ہیں - سارا لطف جاتا رہا - اسی طرح اگر پرند کا شکار ہے تو سمجھ لیجئے کہ شامت آ گئی اس شخص کی جس پر خاص توجہ صرف فرما دی نواب صاحب نے - اب اس غریب کو سوا اس کے چارہ نہیں کہ شکار کے نکات سیکھتا چلا جائے - نواب صاحب کے ساتھ ساتھ پرند کے اتنا قریب کہ وہ سطح زمین یا شاخِ شجر سے اڑ کر فضا میں پرافشانی کرنے لگے - بس پھر کیا تھا بندوق زمین پر دے ماری اور نواب صاحب سراپا تصویرِ خستہ و مظلوم صورت بنائے وہیں ڈھیر ہو گئے - ہمراہی پر سارا الزام دھرنا لازم آیا کہ اسی کے اناڑی پن سے شکار اڑ گیا - ہمراہی اگر راز آشنا ہوا تو وہ خود اپنی ناکردہ غلطیوں کا اعتراف کر لیتا تھا - نواب صاحب سے آئندہ پوری معلومات حاصل کرنے کا عزم اس نے ظاہر کیا نہیں کہ ممدوح الشان خود اس کی طرف سے معذرت خواہی فرمانے لگے - رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت! شکار پارٹی میں کبھی کوئی ایسی شخصیت اگر آ جاتی جو نواب صاحب کی افتادِ طبع سے واقف نہ ہوتی اور مرکزِ توجہ خاص بھی قرار پا جاتی تو اس خیال سے کہ زد میں وہ نہ آ جائے، کیا یہ جاتا کہ مصاحبین میں سے کسی کو پہلے سے تیار کر لیا جاتا تھا کہ اشارہ پاتے ہی سے بے موقع بندوق داغ دے یا کوئی سی حرکت ایسی کر دے کہ شکار نہ ہو سکنے کا الزام اس کے سر عائد ہو سکے اور نیا مہمان مامون و محفوظ رہے -

موقع کم پر سرا کو بتاتے ہیں کہ حضرت اثر عظیم آبادی کا مرزبوم تھا ممکن ہے کبھی آبا و اجداد یہاں رہتے ہوں کے مگر سوائے گیا کے ان کو کہیں کا بھی ہم نے تو نہیں دیکھا - سنہ ۱۹۰۶ء کا ذکر ہے - شہر گیا کی کچہری روڈ پر زمینداران موہ نواده کی عمارات سے متعلق کونے پر جانب شمال ایک دو منزلہ مکان میں قیام فرما تھے - چند بزرگوں کے ساتھ حاضری کا موقع ملا - اطلاع کرائی گئی - بڑوں کی باہمی کھسر پھسر سے پتہ چلا کہ بغیر کسی قسم کی سوئے مزاجی کے، زوجۂ محترمہ سے بے نیاز ہو کر کسی بیگم کو ممتوعہ کر رکھا ہے - پردہ ہو جائے گا تو ہماری باریابی ہو گی چنانچہ ایسا ہی ہوا - خیال ایسا آتا ہے کہ گلابی جاڑوں کی رات تھی کیونکہ کمرے کے اندر ہم سب بیٹھے تھے - کمرہ ہوادار نہ تھا - گفتگو چلتے چلتے اس سوال پر آ گئی تھی کہ نیرِ نظر کے بسمل ہوئے بغیر کامیاب تغزل ممکن ہے کہ نہیں؟ بالمقطع رائے یہی تھی کہ "ناممکن" نواب صاحب کے اشعارِ غزل کے "تاثرات" کے اعترافات مع مبالغہ نذر کیے گئے تو آپ نے انکشاف فرمایا کہ ہنگامۂ عنفوانِ شباب جب آپ کے حضرت قبلہ گاہی کی تعیناتی دربھنگہ تھی تو وہاں کسی تقریب میں محفل گرم ہوئی تھی جس موقع پر ایک شمعِ محفل اپنی اگن دے کر چل دی اور جناب اثر آج تک یہی کہنے پر مجبور رہیں کہ ع

سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت!

دربھنگہ کا ذکر آتا ہی اب تو ایسے معمولی بسری ہاتی اور ہو جائے - اسی شہر میں حضرت اثر اور حکیم یعقوب بیگ وارثی مرحوم و مغفور کی ملاقات ہوئی - مراسم بڑھے اور اس حد کو پہنچے کہ طرفین سے علیک سلیک کی جگہ مغلظات سے تفریحِ القلوب مرغوب ہو گئی - نواب صاحب نے "معجونِ طرفہ" منظوم فرما کر چھپوا دی - یہ ایک نظم مسلسل تھی جس کے قوافی طرح دار در دلدار وغیرہ تھے اور ردیف حکیم الغنی - ناظم کی قدرتِ تخلیقِ سخن کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ

حکیم صاحب کی مذمت کا کوئی پہلو لیے بغیر ان کا مضحکہ ترین حلیہ اس طرح نقشِ قرطاس ہو گیا تھا کہ اس نظمِ لطیف کو مطالعہ کرنے والے کے لئے اس کی محتاجی نہیں رہتی تھی کہ حکیم صاحب کا سامنا ہو اور کوئی اس کو بتائے کہ "معجونِ طرفہ" سے مراد کیا تھی۔ پھر کمال یہ کہ نیچے بھی اس کو تکلف نہ ہوتا تھا کہ حکیم صاحب سے لوٹ کر ملے اور اس بات کے اعتراف میں ذرا سا بھی مضائقہ سمجھے کہ "معجونِ طرفہ" پڑھ کر اس نے پہچانا ہے۔ ادھر حکیم صاحب کا یہ حال کہ "معجونِ طرفہ" کا نام سمع مبارک تک پہنچا نہیں کہ خود بدولت طرفہ تماشہ بن گئے۔ "تفریح القلوب" والا نسخہ کام میں لے آئے۔ بیچ بچاؤ نہ کی جائے تو تھانہ پولیس تک نوبت پہنچے بغیر نہ رہے۔ حکیم صاحب مہینوں میرے غریب خانہ پر تشریف رکھا کرتے۔ جب تک اپنا مکان نواب صاحب نے تعمیر نہ فرما لیا تھا۔ ہمارے قریب ہی اکثر و بیشتر کرایہ دار بن کر کسی نہ کسی مکان میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ "معجونِ طرفہ" قطعی نایاب ہے۔ سڑی گلی کوئی کاپی کہیں پڑی پڑائی مل بھی جائے تو حکیم صاحب کہاں کہ "نگریدو بخندیدہ"

۱۹۰۹ء میں ہم خود کرایہ کے مکان میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ محلہ مرآر پور میں منشی ولی اللہ مختار مرحوم کے صاحبزادے مسٹر نور اللہ وحشت مرحوم بیرسٹر ایٹ لا کا مکان میرے کرایہ میں تھا اور قریب ہی ڈاکٹر ملک فصیح احمد مرحوم کے مکان میں نواب صاحب معہ بیگم مقیم تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی پسندیدہ ترین چیز آدم زاد کی دنیا ہے۔ دنیا کا بہترین حصہ ایشیا ہے۔ ایشیا کا انتخاب ہفت رقبہ برصغیر ہند ہے۔ ہندوستان کا اعلیٰ ترین صوبہ بہار، بہار کا اول نمبر علاقہ شہر گیا۔ گیا کا صحت افزا و فرحت بخش حصہ وہ خطہ جہاں ڈاکٹر فصیح کا مکان واقع ہے۔ جب پھلگو ندی کے پار قصبہ آبگلہ و مانپور کے وسیع اسٹے پر محلہ بنیاد گنج میں کوٹھی خرید کر کے اس کی درستگی نئے سرے سے کرا لینے کے بعد نواب صاحب یہاں اٹھ آئے تو پھر گیا تک تو یہی سلسلہ رہا مگر ڈاکٹر فصیح کے مکان کی ساری خوبیاں بھی اپنے ساتھ منتقل فرما لی تھیں۔ درمیان میں دوسرے مکانات کرایہ پر رہے تھے مگر ان کی اتنا وسعت اتنی نہیں ہوتی تھی۔ بہرکیف ذکر تھا ۱۹۰۹ء کا۔ میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ علیل تھے اور علاج نواب صاحب سے رجوع تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ کبھی صبح کبھی شام ایک وقت روزانہ کرم فرماتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے مریض کو بہت خوش نہ پا کر نواب صاحب نے ایک شہزادہ کے جہازی سفر کی روئیداد سنانی شروع کی۔ اس میں ایسے ایسے مضحکہ پہلو نکالے اور ان کو بیان کرنے وقت وہ پیرایہ کئے کہ ہنستے ہنستے سب کا برا حال ہو گیا مگر مریض پر اچھا اثر ہوا۔ اس دن پتہ چلا کہ تمثیلی ادب پر قولاً فعلاً کتنی کامیابی کے ساتھ حاوی ہو سکتے تھے اگر اس کی طرف التفات فرماتے۔

نواب صاحب آٹھ ٹانگوں والے مکڑے سے ڈرتے تھے۔ کہیں نظر آجاتا تو فوراً بندوق طلب فرمایا کرتے تھے۔ بندوق تو کیا پیش کی جاتی کوئی شخص بڑھ کر مار دیا کرتا تھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ مکڑے سے میں ڈرتا نہیں ہوں۔ اس کی حماقت ناقابل برداشت ہوا کرتی ہے۔ یہ آٹھ آٹھ ٹانگوں کو سکوڑتے ہوئے چلنے کی ضرورت ہی کیا؟

۱۳-۱۹۱۲ء میں پٹنہ جانا ہوا۔ نواب صاحب اتفاق سے وہیں مقیم تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ملے بغیر چلا آتا۔ قیام گاہ پر جس وقت پہنچا تو پیش نمازہ کول سائبان میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے کہ خوب وقت پر آئے۔ دیکھو پتھریوں کے علاج پر رسالہ لکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں کے یہاں کیسی کیسی ہانکی ہیں۔ تمہارے کام کی چیز ہے۔ اوسان جاتے رہے کہ کہاں پھنسے۔ مگر اب کر کر وہی خوش آمدی باتیں "آپ لائے ہی ہیں گی غالب" بی بی جی میں کہتے بیٹھ گئے "آئی بلا کو ٹال تو" ہم نہ کہتے مگر دل کو کیا کر سکتے تھے جو یہی رٹ لگائے تھا۔ اب اللہ کی کرنی کہ سن اما صاحب کا صاحبزادہ بچپن سے لندن پاشی، تعطیلوں میں آیا ہوا، کھیلتا کودتا آ پہنچا، نواب صاحب کی کرسی کا پشتیبان پکڑ کر کھڑا ہو سکنے لگا۔ اردو وہ غریب جانتے نہیں۔ اس کی سمجھ میں کیا خاک آ جاتا۔ تہذیب شائستگی اس کی بندروں والی، وہ کیا جانے مشرقی ادب آداب۔ اس کی طبیعت جو الجھی تو جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے یہی الفاظ تھے جو بے لگام اس کے منہ سے نکلے:

WHET NONSENSE YOU ARE TALKING. GRANDPA, LIKE AN OLD FOOL.

"کیا اول فول بک رہے ہو دادا میاں؟ بڈھے بے وقوف کی طرح"

نواب صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بڑے ضبط سے کام لیا، مسودہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میرا بچپنا تو چھوٹا مگر اس کی خوشی کیا۔ آج بھی یہ حال ہے کہ نواب صاحب کی اس وقت کی بے بسی یاد آتی ہے تو خود بار بار آتا ہے۔

اس سے پہلے یا اس کے کچھ دنوں کے بعد کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب اپنے پھر لے برادر نسبتی آنریبل جسٹس سید شرف الدین کی کوٹھی جو شاہ دو ماس بانکی پور پٹنہ میں بیٹھے اپنی تازہ غزل سنا رہے ہیں۔ پڑھے لکھوں کے ساتھ شہر کے تقریباً ہر قابل ملک التجار جنت خان بھی موجود ہیں۔ قصہ آگے بڑھانے سے پہلے عرض کر دیا جائے کہ پٹنہ سٹی کے دو خطوں کی ایک الگ خصوصیت تھی۔ رانی پور کی خطہ کی نام کے علاقے میں جو کہ سیاہ بستے تھے وہ "ڑ" کا تلفظ نہیں کر پاتے تھے گھوڑے کو "گھورا" "را" کے ساتھ بولتے تھے۔ برخلاف چوک وغیرہ دیگر علاقہ والے جہاں "ر" ہوتی وہاں بھی "ڑ" ہی سے تلفظ کرنے کے عادی تھے "سرکار" کو "سڑکاڑ" کہنے ہی کو شاندار تصور کرتے تھے۔ اس تصریح کے بعد اصل قصہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نواب صاحب نے شعر سنایا جس میں "زلف پُر پیچ" سے متعلق خیال آفرینی ہوئی تھی۔ ادھر شعر تمام ہوا اُدھر جنت خان بے تاب ہی تو اٹھے:

"واہ سڑکاڑ واہ۔ ایک تو جو زلف، اس پڑ سے پڑ پیچ" اس وقت بھی یہی ہوا کہ نواب صاحب کو جیسے سکتہ لگ گیا۔

انہی دنوں کے بعد ہی سننے میں آیا کہ شمس العلماء نے نکاح ثانی بجائے منعقد کر لیا ہے۔

۱۹۱۸ء میں نواب صاحب، میرا استقبال بنارس آنجہانی کے مکان میں جلوہ افروز تھے، فرماتے تھے۔ موسم انتہائی گرم تھا، لوئیں چل رہی تھیں، فضا جلد رہی تپ رہی تھی۔ ہم لوگ زمین [illegible] میں پناہ گیر تھے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت نوکر نے اطلاع کی کہ نواب صاحب پیدل تشریف لائے ہوئے ہیں اور مجھ کو طلب فرما رہے ہیں۔ گھبرا کر نہ خانہ سے برآمد ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ پیادہ سوار رشا گرد بیٹھے مؤدب دست بستہ کھڑے ہوتے مجلس رہے ہیں اس لیے کہ حسب الحکم پھاٹک چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ پیادوں نے نشست کی تخت پر نواب صاحب نزول اجلال فرماتے تھے۔ زندگی میں غالباً یہ پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ اس تخت کی یہ عزت افزائی ہوئی۔ امثال امر میں مجھے بھی پہلو پہ عزت و بانی تھی۔ یقین کیجئے کا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ نواب صاحب نے بڑی [illegible] معصومیت کے ساتھ باور کرایا کہ وہ قطعی بے یار و بے مددگار صرف رانند آد کے سہارے اس شہر میں بیٹھے ہیں۔ اور میں بھی ممدوح الشان کی مدد [illegible] کا تو بعد ان کی بے کسی کا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میرے کانوں سے وہ الفاظ لاؤ جو میری دلی اور دماغی کیفیت کا صحیح اعادہ کر سکیں [illegible] اس وقت اس کو کوئی [illegible] میں خود بیان کرنے [illegible] الله [illegible] بلند پایہ [illegible] عالم [illegible] علماء و فضلا [illegible] [illegible] کا اس "کرده کندن" سے [illegible] [illegible] کسی کی مدت سال و شش ماہ پوری ہو رہی تھی [illegible] ترک خدمت کرنے [illegible] ارادہ ہوئے [illegible] ایک عزیز زمیندار سے [illegible] فرمائی گئی ہو کہ [illegible] عالت متفرقہ سے صورت [illegible] منتقل ہو [illegible] کا سامان رکھوں۔

اس زمانہ میں آنریبل مسٹر سید شرف الدین گورنمنٹ بہار کے ہوم ممبر کی حیثیت سے رانچی میں مقیم تھے کہ رانچی میں [illegible] گیا لاتے گئے بیمار ماموں کو دیکھنے سر علی امام گیا آئے اور ابھی انہوں نے ماموں کی جگہ نہیں لی تھی [illegible] سب کچھ کر لیا تھا [illegible] کہ نواب صاحب سے [illegible] کا خیال بھی نہیں کر سکتے پھر دیر بھی تھا نہ وہاں سے بروقت رخصت نہ ملی تو کیا ہوگا۔ نواب صاحب کی شفقت جو مجھ پر تھی اس کے لحاظ سے میرا انتخاب ہوا کہ سر علی کے ساتھ جاؤں اور ان کی ٹرین چھوٹنے سے پہلے ان کے اسٹیشن پہنچ جانے کی راہ نکالوں [illegible] پرشاد مختار [illegible] نواب صاحب مع متعلقین مقیم تھے جس وقت ہم لوگ پہنچے رسیلے بچھاتے نواب صاحب وظیفہ میں مشغول تھے سلام عرض کرتے ہوئے

سر علی تو زنان خانہ تشریف لے گئے، میں نے تنگیٔ وقت کی اطلاع کر دی۔ اس وقت تک نواب صاحب کے یہاں ایک صاحبزادی اور بڑا صاحبزادہ مسمّی حسین امام پیدا ہو چکے تھے۔ اسی بچے کو گود میں لئے سر علی بس منٹوں ہی میں باہر آئے اور کہنا ہی شروع کیا تھا کہ یہ بڑا پیارا ہے۔ ماں کو دے دیا جائے گا کہ شروع میں طریقے سے پرورش و تعلیم کی خدمت وہ انجام دیں۔ سر علی کا رنگ دبتا ہوا تھا۔ یہ بچہ صورت میں سر علی کی پوری پوری شباہت لئے ہوئے اور کھلتی ہوئی رنگت کا تھا۔ ابھی بات تمام بھی نہ ہو پائی تھی کہ نواب صاحب تسبیح رکھتے ہوئے مصلّے سے اٹھے اور قریب قریب چھینتے ہوئے صاحبزادے کو لے لیا اور سر علی کو ٹرین پکڑنے کی ضرورت یاد دلا کر چلتا کر دیا۔ مجھے روک لیا۔ بڑے کمرے میں سے جا کر دیوار میں بنی ہوئی الماری کھول لی۔ اس کے کئی درجے کتابوں سے بھرے تھے۔ استفسار فرمایا کہ تجھے معلوم ہے کہ یہ کتابیں کس علم کی ہیں؟ اظہارِ لاعلمی پر ارشاد ہوا کہ نجوم و فلکیات ان کا موضوع ہے۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ سر علی امام بڑے قیافہ شناس ہیں۔ پہلی ہی نظر میں انہوں نے تاڑ لیا کہ بچہ کیسا نصیبہ ور ہے۔ اسی لئے اس کو حاصل کرنے کے لئے خوشامدیں کر رہے تھے۔ ایسا کہیں ہو سکتا کہ میں بچہ کو ان کے حوالے کر دوں کہ اپنے جیسا کرسچن بنا کر رکھ دیں۔ مجھے یاد ہے ہمیشہ کہا کرتے تھے، بالو میرا ایک عشق شادی کرنے کا تھا، مگر کرتا کیا؟ کہ آپ پر سرا کے امام باڑے اور شیرہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام مع بال بچوں کے کرسچن ہو گئے۔ اس نے مجھے شادی کرنے پر [illegible] بڑی نیت کا پھل خدا نے یہ دیا کہ اس بچے کا زائچہ وہی ہے جو سکندر ذوالقرنین کا تھا۔ اس وقت بھی اس مثال شیر خوار کی روزانہ آمدنی علی امام، حسن امام کی مجموعی ماہانہ آمدنی سے زیادہ ہے —— افسوس اس عزیز کو [illegible] کر یہ صاحبزادہ داغ دے گیا۔ انا للہ … الخ۔ گھر کے اندر اس کی تربیت [illegible] نظر رہ کر نواب صاحب کا جینا حرام کئے دیتی تھی۔

اُدھر کی سنئے کہ آنریبل مسٹر شرف الدین کا علاج یونانی ہو رہا تھا۔ آگرہ سے حکیم محمد حیات خان اسی لئے بلائے گئے تھے۔ بند کمرے میں انگیٹھیاں سلگی ہوئی رکھی رہتی تھیں۔ مریض کو متلی بار بار ہو رہی تھی۔ فالج زدہ کا لباس تبدیل کرانا مصیبت۔ حکیم صاحب کے بنائے کچھ بن نہیں رہی تھی —— نواب صاحب کا دل موم کا تھا۔ برادرِ عزیز کی حیثیت میں اور بھی پگھلا جا رہا تھا۔ صبر کا پیمانہ چھلک [illegible] منہ پر گھونسہ مار کر اٹھے اور یہ کہتے ہوئے سیدھے ہو لئے کہ [illegible] کے اندر [illegible] نہیں۔ نواب صاحب کیا کہہ کر اٹھے تھے اس کی تو چند مخصوص صاحبوں کو خبر تھی مگر ان کا تمتمایا ہوا چہرہ سبھوں نے دیکھ لیا تھا۔ اپنی اپنی بولی سب بولنے لگے۔ بیچارے حکیم صاحب کو یہ سنا سنا کر سہما رہے تھے کہ نواب صاحب غصہ میں حضرت گئے ہیں، بس کوئی دم میں بھری بندوق لئے آئیں گے اور کسی نہ کسی کو نشانہ بنائے بغیر نہیں رہیں گے —— حکیم صاحب کو اپنی جان سب سے زیادہ خطرہ میں معلوم ہوئی۔ وہ تو بوریا بستر سنبھال کھڑکی کی راہ آنریبل جسٹس پرشاد کے گھر جا رہے —— نواب صاحب نے واپس آتے ہی انگیٹھیاں ہٹوا دیں۔ ذرا رہ کر کمرے کے کل در کھلوا دئے۔ بیمار داروں کی جان میں جان آئی۔ کچھ وقفہ کے بعد مریض کو پلنگ اٹھوا کر باہر سائبان میں لے آئے۔ مریض صاحب اپنے اخی معظم کی جند مانی طبیعت سے واقف تھے لہٰذا ان باتوں سے خوش ہو سکنے کے بجائے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جب ان سے سوال ہوا کہ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے تو انہوں نے تکلّف کی خاطر فرمایا "کھیرا" یہ جانتے ہوئے کہ علاج میں اس کا استعمال حرام ہے۔ مگر نواب صاحب نے [illegible] برا نہ مانا بلکہ بازار سے منگوا کر کھیرے کی قاشوں پر نمک مرچ چھڑک کر کھانے کو دیا۔ واقعی چوبیس گھنٹہ کے اندر متلی کا نام بھی نہ رہا۔ اب باقاعدہ علاج شروع ہوا اور یوماً فیوماً فائدہ مترتب ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے پاؤں چل کر مولوی شرف الدین پٹنہ سدھارے۔ یہ معرکے کا علاج، نواب صاحب کی حذاقت کا ایک کھلا ثبوت تھا۔

اسی سال سر علی کا تقرر بجائے مولوی شرف الدین ہو گیا تھا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے سے بر [illegible] درخواست دینے والوں میں میرے ایک مخدوم عزیز بھی تھے۔ افواہ یہ تھی کہ سر علی اپنے کسی خاص عزیز کو اس کے لئے مخصوص فرما چکے ہیں لہٰذا کسی کی دال نہیں گلے گی۔ میرے قابلِ احترام عزیز میرے پاس تشریف لائے کہ آنریبل سر خواجہ محمد نور اور آنریبل جسٹس پرشاد سے اسناد حاصل کر دوں۔ نواب صاحب سے اس سلسلہ میں کچھ عرض معروض کی راہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ خود میرا اپنا دل نہیں چاہتا تھا مگر "الغرض مجنون" کی وادی سے گزرے بغیر بعض وقت رہا بھی نہیں جاتا۔

جرأتِ رندانہ کام دے جائے تو تعجب کیا۔ نواب صاحب کی شفقت بزرگانہ پر بھروسا کر ہی بیٹھے۔ وہی بیتل پرشاد مختار والا مکان۔ نواب صاحب مصلّے بچھائے اسی انداز سے وظیفے میں مشغول۔ نواب صاحب رام پور کا مکتوب کھلا پڑا تھا اور ممدوح الشان کا فرستادہ آموں کا ٹوکرا ابھی بند تھا۔ اوراد و وظائف سے فراغ کے بعد باتیں شروع ہوئیں جن کا شعر وسخن سے سلسلہ ملا لینا دشوار نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ بڑا محتاط استاد ہونے کے باوجود غالب ایک شعر میں ذرا بہک گئے۔ تعجب کے ساتھ دریافت فرمایا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ نظم ونسقِ حاکمِ مطلق تبارک وتعالیٰ پر الزام تراشی ہے۔ فرشتوں کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ سن کر شاباش دی اور کہا کہ اتنی احتیاط کون کرتا ہے میں نے عرض کیا کہ خود حضور کا شعر اس سقم سے پاک ہے۔ بڑے تعجب اور شوق سے پوچھا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ؎

کیا جانے لکھا کرتے تھے کیا کاتبِ اعمال
دنیا میں تو یا رب کبھی نشہ نہ ہوا تھا

سنتے ہی جذباتی آدمی تو تھے ہی، رو پڑے۔ بہت دعائیں دیں۔ حد یہ کر دی کہ کہنے لگے کہ تمام عمر جو کچھ لکھا پڑھا وہ سب جھک مارنے کے برابر ہے۔ جب خود نہ سمجھ پائے کہ جو کچھ لکھا ہے اس کا صحیح مطلب کیا ہے۔ یہ قسم فرمانے لگے کہ اس شعر کی یہ خوبی آج تک نہ سمجھ میں آئی تھی نہ آئندہ آنے والی تھی۔ اب شدت فرما کر مجھ سے وعدہ لینے لگے کہ بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک پورا دیوان آخر مطالعہ کر کے حضرتِ والا کو ایک ایک شعر کا مطلب سمجھاؤں۔ ع اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی" کا مطلب عملی طور سے اسی دن سمجھ میں آیا۔ مجھ پر تو عذاب نازل ہوا مگر میرے عزیز محترم کا کام بن گیا۔ بڑی زوردار سند لکھ دی۔ کمشنر اور چیف سیکرٹری کے نام زبردست سفارشی خطوط تحریر فرما دئے۔ اسی پر بس نہیں کیا، پٹنہ کا قصد ظاہر فرما کر عزیز گرامی قدر کو سر علی سے ملا دینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ نواب صاحب جب پٹنہ پہنچے تو پلیٹ فارم پر میرے عزیز مکرم موجود تھے۔ فٹن کرایہ کی سے کر سوار ہوئے اور روانہ منزل مقصود ہوئے۔ عین راہ دریافت فرمایا کہ کلام اثر سے کچھ یاد ہے؟ حسنِ اتفاق کہ یہ اشعار ان کو یاد تھے ؎

الجھی الجھی رہنے دو کیوں سر پہ آفت لاتے ہو	دل کی الجھن بڑھتی ہے جب زلفوں کو سلجھاتے ہو
چھپ چھپ کر تم رات کو صاحب غیروں کے گھر جاتے ہو	کیسی ہے یہ بات کہو تو کیسے منہ دکھلاتے ہو
کیسا آنا، کیسا جانا میرے گھر کیوں آؤ گے	غیروں کے گھر جانے سے تم فرصت کب کو پاتے ہو

اس سے بھی خوش ہوئے۔ سر علی کے گھر پہنچ کر آپ باہر ہی انتظار فرمانے لگے۔ چپراسی اردلی "سرکار سرکار" کہتے دوڑ پڑے اندر ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلنے پر اصرار کرنے لگے مگر آپ نے ایک نہ سنی۔ صرف اطلاع کر دینے کو کہا۔ خبر ہوتے ہی خود سر علی دوڑے آئے تو آپ نے فرمایا کہ آج آپ کے یاں تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ حکومت کے نمائندہ سے ایک شہری ملنے آیا ہے۔ یہ صاحبزادے میرے ساتھ ہیں اور انہی کی سفارش مجھے کرنی ہے۔ لائق وسعادتمند فرزند ارجمند نے سفارش کو حکم کے درجے پر رکھ کر وہی کیا جس پر یہ کہنا لازم آتا ہے کہ الولد سرٌ لابیہ —
نواب صاحب زندہ نہ سر علی امام مگر عملِ خیر دونوں کے ہمیشہ بہار رہیں گے ؎

نیکی کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اب جو واقعات لکھے جاتے ہیں ان کے سنین وترتیب قبل وبعد کا صحیح تعین نہیں کر سکتا۔ رستاخیز ۱۹۴۷ء میں اوروں کی متاعِ حیات ومال ومنال پر زوال آیا۔ میرا ایک ہی سرمایہ تھا یعنی حافظہ افسوس کہ وہی ضائع گیا۔ پرانی باتوں کے نقوش سطحِ دماغ پر گہرے بیٹھے تھے وہ ہنوز قابلِ شناخت

ہیں۔ بعد کی یادداشتیں خوب واضح نہیں رہی ہیں لہٰذا ان کی تصدیق کی ضرورت ہو سکتی ہے جس کا کوئی ذریعہ یہاں کراچی میں میسر نہیں۔

اب نواب صاحب شہر چھوڑ کر ندی پار والی اپنی کوٹھی میں آباد۔ دوسرا صاحبزادہ کاظم امام پیدا ہو چکا مگر سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن اول وقت عصر ہو گا کہ بلکرم اسپتال سے میرے بے تکلف دوست ڈاکٹر پرتاپ ل کپنا سب اسسٹنٹ سرجن تیز قدم چلنے کی وجہ سے کچھ ہانپتے تشریف لائے اور جناب سول سرجن کی طلبی دہ بھی فوری سنا کر مصر ہوئے کہ جس حال میں ہوں یونہی ان کے ہمراہ چلا چلوں۔ انہوں نے صرف یہ بتایا کہ آبکلہ سے کوئی بچہ لایا گیا ہے جس کا اپریشن کرنا فوراً لازمی ہے۔ بچہ کو کسی سے منسوب بتایا جاتا ہے جس کے نام میں امام ہے۔ چونکہ تم اسپتال سے قریب رہتے ہو اور تمہارے نام میں بھی امام ہے لہٰذا سول سرجن صاحب تمہاری اجازت سے مطمئن ہو کر آپریشن کرنا چاہتے ہیں۔ واضح باد کہ آبکلہ میں میرے عصبات بستے ہیں۔ ہمارا مدفن بھی اسی قصبے میں ہے لہٰذا میرا خیال نواب صاحب کی طرف نہ جا سکا۔ اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ بچہ نواب صاحب کا نومولود صاحبزادہ کاظم امام ہے جس کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہے۔ ایک غریب درزی نواب صاحب کے یہاں مقیم کپڑے سینے پر مامور تھا اسی نے عقل سے کام لیا۔ بچہ کو لے کر افتاں و خیزاں اسپتال لے آیا۔ اور کسی کا معاملہ ہوتا تو میں ذمہ داری لینے نہ لینے کے متعلق سوچ بچار کرنے لگتا مگر نواب صاحب کی نازک مزاجی اوروں کے آگے بدنام سہی میرے نزدیک ان کی ذات گرامی اعتماد کو سزاوار رکھتی لہٰذا میں نے بے تکلف آپریشن کی اجازت دے دی۔

آپریشن کامیاب ہوا۔ یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں بچہ لا کر لٹا دیا گیا۔ نو دس مہینے کی جان، اپنے بھائی جان حسن امام صاحب کی ننھی سی تصویر اور وہی تیور وہی آن بان ——— بڑی متانت سے خاموش پڑا سو رہا تھا۔ خواب آور دواؤں کا اثر، گلے سے تیز سیٹی کی سی آواز جاری تھی۔ چونکہ نرخرے میں سوراخ کر کے اس قسم کا بٹن آر پار سوراخ والا بٹھا دیا گیا تھا جیسا ربڑ کے چوں چاں کرنے والی چڑیوں بطخوں میں آویزاں ہوا کرتا ہے۔ قریب مغرب نواب صاحب تشریف لائے۔ ہیرا ہاتھ پکڑ کر خوب روئے۔ کئی دن بچہ اسپتال میں رہا۔ ربڑ کی نلکی بٹن کے سوراخ سے لگا دی جاتی تھی اور دودھ وغیرہ سیال قسم کی غذا پیٹ میں اتار دی جاتی تھی۔ کلکتہ سے یورپین نرس مس اسٹرلنگ بچہ کی خدمت کے لئے مقرر ہو کر آئی تھی۔ نواب صاحب کے ساتھ کئی کئی گھنٹے اسپتال میں بسر ہوتے تھے۔ کبھی بچے کو روتے نہ سنا مسکرا لینے کے سوا کھل کر ہنستے بھی نہ دیکھا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ آپ چاہے اس کو میری خوش فہمی پر محمول فرمائیے مگر مجھے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اپنی غیر معمولی و غیر متوقع فراست سے بچہ ہماری باتیں سمجھتا تھا ایسا بچہ پھر آج تک دیکھنے میں نہ آیا۔ افسوس کہ گھر جا کر چند مہینے ہی زندہ رہا۔ اس کی موت نے نواب صاحب کو زندہ درگور کر دیا۔ انا للّٰہ۔۔۔۔۔ الخ۔

اب وہ زمانہ ہے کہ سر علی امام کو مؤید الملک اور حیدرآباد کو مملکت آصفیہ کا صدر اعظم لکھا جاتا ہے۔ نواب صاحب بھی حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ ابھی واپسی کی خبر بھی نہیں تھی کہ ایک دن یاد نہیں کس ضرورت سے گیا کے ریلوے اسٹیشن سے باہر آتے ہی، ایک کرایہ کی گاڑی میں نواب صاحب بیٹھے نظر آئے۔ گاڑی کی چھت پر اسباب لدا ہوا تھا۔ سمجھ تو گیا کہ حیدرآباد سے مراجعت فرما ہوئے ہیں۔ اسی لئے بڑے ذوق و شوق سے ان کی طرف لپکا۔ اب تصور فرمائیے کہ ممدوح الشان گاڑی کے اندر اور میں عام شاہراہ پر گاڑی سے لگا کھڑا ہوں۔ نہ صلاح کیسی، علم ہوا کہ بالوہا ہوا اٹھا بیٹھے۔ خود بھی دست بہ دعا ہو کر گڑگڑا کر فرماتے جاتے ہیں کہ یا اللہ ہم سب بڑے گنہگار ہیں اور ہر سزا کے لائق مگر واسطہ اپنی کریمی کا، اپنے نبی کریم صلعم اور ان کی آل اطہار علیہم السلام کا، میرے اعزا و اقارب، دوست احباب پر اور چاہے جو بھی مصیبت نازل ہو مگر حیدرآباد کسی کو جانا نہ ہو۔ کہئے بابو آمین ——— !

ایک دن کا واقعہ سنئے، غریب خانہ حسنین منزل کے دروازہ پر ایک کرایہ کی گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے برآمد ہوئے نواب صاحب کی محل ثانیہ کے برادر معظم میاں ٹھنگو مرحوم، بایں ہیئت کذائی کہ نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتے۔ "یا الٰہی خیر کیجیو" کہنے کے سوا اور کیا کرتا۔ خبر لائے کہ نواب صاحب سخت علیل ہیں اور علی الفور بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ گاڑی پر لد کر آنے کی مہلت تھی مگر ٹوپی جوتی کی طرف دھیان دینے کی رخصت نہ تھی کیوں؟ غریب بلبلا اٹھا کہ نواب صاحب کی عجلت پسندی نے یونہی چل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ پیادہ پا تمام راہ طے کی۔ پل پار کر کے گاڑی

پکڑی۔ خیر ساتھ ہو لیا۔ پیش خانہ در سیڑھیوں کا لانبا سا سائبان جس کے آگے سنگریزوں کی سڑک سی تھی اسی پر پلنگ بچھا تھا اور کرسیاں پڑی تھیں۔ میں جب اس جگہ پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی دونوں بازوؤں کو سہارا دیے ہوئے نواب صاحب کو ہوشیاری کے ساتھ سنبھالے زنان خانہ سے اس پلنگ پر لا رہے تھے۔ صورت سے نواب صاحب واقعی بے حد علیل نظر آئے۔ نقاہت بھی ایسی طاری تھی کہ جیسے چھ مہینوں کے فاقہ زدہ مریض کی ہونی چاہیے۔ نواب صاحب کی خو بو سے اتنی واقفیت نہ تھی یا دیکھی ہی میں صاف دھوکا کھا ہی گیا۔ پلنگ پر دراز ہوتے ہی مخاطب فرمایا کہ بالو! بڑے وقت پر تم آگئے بس چند گھنٹوں کا میں مہمان ہوں۔ جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تم کو وصیت کرنے کے لیے بلایا ہے۔ اگر میری وصیت پوری کرنے کی حامی تم نے بھر لی تو میری جان آسانی سے نکلے گی اور روح آسودہ و مطمئن رہے گی۔ تم جانتے ہو کہ میرا اس شادی بیاہ کا نہ تھا مگر عزیزوں میں کیا کرتا؟ کر ا پر سرا کے امام باڑے اور نیورہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام کرسٹان ہو گئے۔ کلمہ توحید پڑھنے والا میری نسل میں نہ رہا۔ مجبوری شادی کر کے دوبارہ نسل ہماری چلی۔ اب آخری وقت ہے۔ ادھر میں مرا، ادھر علی امام، حسن امام بال بچوں پر قبضہ جمائیں گے اور اپنے سے بہکا کر عیسائی بنائے بغیر باز نہ آئیں گے۔ لہٰذا بالو میری وصیت یہ ہے کہ میرے بعد میرے بال بچوں کے والی و کفیل آپ ہوں۔ علی امام، حسن امام سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سنی ہیں۔ آپ کی تربیت میں میرے بچے شیعہ نہ رہ سکیں گے۔ یہ مجھے گوارا ہے۔ موحد و مسلمان تو رہیں گے۔ کرسٹان تو نہ ہو جائیں گے لہٰذا آپ زبان دیجئے کہ میری وصیت پر آپ عمل کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت مجھے ہومیو پیتھی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی مگر بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ میں نے نواب صاحب کا بکس دواؤں والا طلب کیا۔ جو شیشی ہاتھ آئی اسی میں سے کاغذ پر چند گولیاں نکال کر نواب صاحب کو دیں کہ پہلے ان کو نوش فرمائیے۔ اس کے بعد جو وصیت کیا معنی حکم دیجئے گا اس کی تعمیل اپنی سعادت سمجھوں گا۔ بلا حیل و حجت دوا کھا کر استفسار فرمایا کہ تجھ کو بھی اس طریقہ علاج میں درک حاصل ہے؟ بفیض صحبت کو میں نے حیلہ بنایا۔ دوا کھاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ خوب کھنکھار کھنکھار کر تھوکا۔ لیٹے سے بیٹھے ہو گئے۔ فرمانے لگے بالو! ہم سمجھ گئے۔ آپ نے لائیکوپوڈیم دیا ہے۔ لوگوں کی طرف مخاطب ہو کے کہہ دیکھی بالو کی حذاقت۔ میرے مہینوں سے بلغم ذرہ ذرہ جمع ہو کر دم پھیلا رہا تھا۔ اگر ذرا سی دیر اور اس کا تدارک نہ ہوتا تو میرا کام تمام تھا۔ اب نواب صاحب پوری طرح توانا و تندرست، خوش و خرم، چاق و چوبند تھے۔ پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ہاتھوں سے پکڑ لیے چلے زنان خانہ کی طرف۔ ڈیوڑھی کے پردے کے پاس پہنچ کر بتایا ان لوگوں کو کہ ابھی وہ کس حال میں برآمد ہوئے تھے۔ لہٰذا تھوڑا سا اضمحلال اپنے پر طاری کر کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ مخدرات علیہ بھی میرے سامنے نہ آتی تھیں۔ ان کے پاس پہنچ کر کمال تحمل آواز میں فرمایا ہے کہ دیکھو بالو نے میری جان بچائی ہے۔ بالو کے قدم دھو دھو کر پیو۔ ... رنگ دیدم، بو کشیدم ... کے واسطے سنئے مجھ پر خود ... دیکھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ ... زیادہ سن و سال والے عزیزوں سے سامنا ہوا کرتا ہے۔ مجھے ... نواب صاحب آواز کی نقاہت کا بیکار مظاہرہ بھی فرما رہے تھے۔ ... صاحب زندہ و سلامت ہیں۔

مذہب کے متعلق ... شیعہ ہونے پر ... بلکہ صحیح الخیال ہونے سے متعلق اصرار فرماتے تھے کہ وہ بھی شیعہ ... نقوی کے انداز میں ... عجیب باتیں ... سے منسوب کرتے تھے۔ بار ہا ایسا ہوا کہ ... کوئی بات اماموں سے منسوب کی تو میں نے کس لحاظ کے احتیاج ... ان واہی تباہی باتوں سے ان کو واسطہ کیوں نہیں ہے ... سادگی کے ساتھ اس پر کہنے کہ ... آپ کیا ... پلٹ کر نہیں کہا کرتا تھا کہ جب ہم سنی نہیں ہیں تو آپ کہاں کے شیعہ ہیں۔ کبھی ان باتوں سے نہ تو کبیدہ خاطر ہوا کرتے، نہ بحث مباحثہ کو راہ دیتے، نہ ابرو پر بل ڈالتے، نہ چہرے پر بل لاتے۔ یہاں تک کہ مسکراتے بھی نہیں۔ کرتے تو بس یہی کہ باتوں کا رخ پلٹ دیتے۔

"معجون طرفہ" کے سلسلہ میں نادر الکلامی کا بیان ہو چکا ہے۔ اس زمانہ کے بنگالیوں کی اردو میں ایک غزل موزوں فرمائی تھی جو ان کے اعزاء احباب کو یاد ہو گئی تھی۔ اس میں کمال یہ ہے کہ موزونیت کے ساتھ مصارع پڑھے ہی نہیں جا سکتے جب تک بنگالیوں کا مخصوص تلفظ اپنایا نہ جائے چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

غصے میں جو کھل جاتا ہے اصغور کا دھوتی	اس واسطے نیلوں وہ دو چار سٹے ہیں
کاگوری اس دیس میں پوڑتا ہے اے باپ	دن رات کلی لوگ یہاں پنکھا کٹے ہیں
کولکا جو پیتا ہے کھڑا چولنا کے نیچے	اظہار میاں مولوی ہیں اور بٹے ہیں

واضح ہو کہ تذکیر و تانیث کی طرف سے بے خیالی دانستہ ہے۔ بعض الفاظ کی ضروری تشریح یہ ہے :۔

(۱) اصغور : اصغر (۲) کاگوری : کیا گرمی (۳) پوڑتا : پڑتا (۴) پنکھا : پنکھا (۵) کولکا : حقہ پینے کا ناریل (۶) چولنا : چھپروں کی اولتیاں (۷) بٹے : بی۔ اے

ختم سخن یہ عرض کر دوں کہ اتنی زیادہ تفصیل سے ہر بات کو لکھنے کی ضرورت کا قائل جو نہ ہوا اور اس سے انقباض خاطر حاصل کرے اس کے آگے بھی معذرت پیش کرنے کو میں ابھی تیار نہیں ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بڑی ضروری ضروری تفصیلیں اور بحثیں تو ہیں نے ہنوز بروئے کار لائی ہی نہیں ہیں۔ تحریر ہذا کا تتمہ دوسری قسط میں نذر ہو گا۔ اس کے ملاحظہ کے بعد جزا و سزا جو تجویز ہو گی اس کا قبول کرنا میرا فرض ہو گا۔ فی الحال تمام بخیر و بالسلامت۔

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

مالک رام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ یا حبیب گنج میں رہا کرتے تھے، میں دہلی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا علمی پایہ مجھ جیسے ہیچ مدان سے اتنا بلند تھا، اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یوں کہ ۱۹۴۳ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا، اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور وہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھیے، ممکن ہے اُن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے۔ یہ تھی تقریبِ تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اُسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی نکلی، تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحب ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے یا نواب صاحب

کے کاتب نے روائتی اصلاحیں دی ہیں۔ ان میں سے کتنی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی اٹکل سے انہیں درست کر لیا۔ پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار ان سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئیں ہوں۔ اس پر میں نے دل میں طے کیا کہ جب دہلی جانا ہوا، تو ایک دن کے لئے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ اور اصلی نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے درستی کر لوں گا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ جائیے۔ یہ تو میری خواہش تھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دہلی آیا۔ یہاں ایک دن اب یاد نہیں رہا میں کون سی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خاں کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے پھر اُن کی خدمت میں لکھا کہ کیا آپ کے ہاں حبیب گنج میں مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں! دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے۔ لیکن اسے بھیجنے کے لئے آپ کو بھیجیں گا نہیں۔ اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہئے دیکھ جائیے۔ میں خود کتنے دن سے وہاں جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن مکروہات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی حیص بیص میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے بوریا بستر باندھا اور بغیر اطلاع دئے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے سٹیشن پر اترا ہوں تو بوندا باندی بھی پڑ رہی تھی۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو پھر۔ لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے کہا اگر نہ ہوئے تو کونسی قیامت آ جائے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہرحال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میرس روڈ پر ان کی کوٹھی حبیب منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرا کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آ گیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالوحید خاں صاحب کا تعارف کرا دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں، نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے، خان بہادر حاجی مولوی محمد عبیدالرحمٰن خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خاں شیروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیرہ تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خاں صاحب مئو قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب زینب بیگم صاحبہ سے ہوا۔ مولانا عبدالغنی خاں مرحوم مشہور کتاب ارمغان آصفی کے مصنف ہیں جس میں فارسی مصادر کے مسلوں کی اسناد کلام اساتذہ سے جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب آٹھ حصوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سواد عرب اور ایک تذکرہ شعرائے فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبدالغنی خاں نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انہوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ یہی مولانا عبدالغنی خاں صاحب جناب عبدالوحید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی ہمشیرہ تھیں۔ نفیس دلھن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو تین سال ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آ گئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے ہم عصر مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ۱ باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ۲ حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار ۳ ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبدالغنی خاں صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۷۶ء میں اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے "بلیغ سخن رفت"۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خاں آگرہ کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عزت النساء بیگم صاحبہ کا نام صرف

ایک فارسی خط میں دیا ہے، جو انہوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خاں ایرانی کے بڑے صاحبزادے ولی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی ننھیال سے بھی دیرینہ تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تو خیر ان خداداد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے، ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالغنی خاں سے منسوب تھیں اور یہ جناب ابو سعید خاں صاحب انہی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں کی پوتی کے بیٹے ہوئے۔ غالب کے جس خط کا میں ذکر کر رہا ہوں، انہی نے نواب صاحب مغفور کو دیا تھا، جو اُن کے خاندانی کاغذات میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ بحرِ طویل بن کر چلا گیا۔ بہرحال جناب نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے انہیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دروازہ بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا۔ [illegible]

بہت لانبا قد، لوئی چھ فٹ کے قریب، کسرتی جسم، سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک، خضاب لگی ہوئی چھدری داڑھی، خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور اُن کے پان کے شوقین ہونے کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما کوٹ اور نیچے سفید لٹھے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور اس کے اوپر مفلر کی شکل میں سپید شال لپیٹے ہوئے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور اُٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا: آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو۔ یہ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑ توڑ انہوں نے تین چار سوال کر دیے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت دھیمی تھی اور ایک ایک لفظ انہوں نے الگ الگ کہا۔ کمرے میں پہنچے تو چھوٹتے ہی فرمایا: میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا: قبلہ جوانی کی کہی! ایک ہی کہی، ساری عمر جس بیماری میں بسر ہوئی ہے وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ یہ "غمِ عشق" تو خیر نہیں، غمِ روزگار نے ہمیشہ پریشان رکھا، اس لیے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ کہنے لگے، میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی شیدا صاحب کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہی ختم نہیں ہوا تھا کہ آپ نے مثنوی کے [illegible] دیوان سے متعلق پوچھ بھیجا۔ پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا: میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا۔ ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت اُن کے ساتھ گزارتا ہوں، اور واپسی بالعموم عشاء کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوعِ سخن بدل گیا۔ فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ آپ کے آرام میں مخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دل جمعی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام بھی ہو رہے تھے تو انہوں نے قطعی کسی طرح اُسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطف سے فرمایا: ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجیے۔ کل صبح انشاء اللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا: یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کون سا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ سنجیدگی سے ہونے لگی تھی اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کا ایک روشن دان بھی کچھ خراب تھا۔

نہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکھٹاتا تھا۔ رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ خیر صبح کو اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور دھوپ بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور اُن کے مصاحب مُلّا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور ملا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہی تھی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں و خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا۔ مہتمم صاحب آ گئے۔ ملازموں نے دریچوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ اللہ اب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں نے اس سے توارد کیا ہے بلکہ یقین جانو کہ اس شخص نے زمانۂ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے جب کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ تب یوں لگتا ہے جیسے غلطی سے میرے حصے کی چیز یہاں آ گئی ہے اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں ذخیرے ہیں میرے اور دکھ کی تعبیر سے

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

نواب صاحب کا عجیب انداز تھا۔ وہ ایک کتاب منگواتے۔ مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملا طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ انہوں نے جب یہ دیوان خریدا تھا تو کچھ عرصہ بعد اس کتابت کی خوبی دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی تحریریں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ یہ دیکھئے یہ ترجمہ روشنائی کی تحریر طالب کی ہے۔ یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ یہ دراصل مثنوی مولانا روم کا اس سے قدیم ترین نسخہ جرمنی کے مشہور کتب خانہ میں ہے۔ یہ کچھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا نسخہ ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے کتب خانہ میں رہا ہے۔ یہ دیکھئے ان کی مہر ہے۔ محی الدین محمد اورنگ زیب بادشاہ۔

یہ شیخ سعدی کی بوستاں ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن پہلے ایک نادر نسخہ آئی تھی۔ ملا سعد الدین تفتازانی کی مطول۔ مہتمم سے کہہ کے اُسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ وہ عبارت بہت قدیم اور مغشوش تھی اور باقی آدھی تازہ الحاقی معلوم ہوا کہ یہ خط خود نواب صاحب نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پاس ہی میز پر محدب شیشہ پڑا تھا۔ اٹھایا اور میرے ہاتھوں میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھئے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ میں رک رک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نور الدین جہانگیر" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اور اسی لئے انہوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ بابر بادشاہ کے بیٹے کامران کا دیوان کچھ دن پہلے شائع ہوا تھا اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے عکس دئے گئے ہیں جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں ثبت ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ سطروں کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا: جہانگیر کا طرز تحریر بالکل وہی ہے جو کامران کے دیوان میں ہے۔ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا تو آپ نے کامران کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں اُسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنتِ نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے، مجھے دکھاتے اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا

میتقصہ یا صاحب علم وفن ہوں۔ وہ ہر حرف سے بے پروا ہو کر یوں کتاب پہ کتاب نکلوا رہے تھے گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کہیں کتابوں کا قدردان ملا ہو، اور میں ذہنی بےرنگی اور اُن کی ذرہ نوازی پہ عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شعر ہے ؎

یاراں ز مہربانی دانند، ہرچہ دانند

ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ مائیم

اصل بات یہ ہے کہ وہ بنفسہ بہ سبب کہ ہوتے ہوئے بھی اساسی اور بنیادی طور پہ علمی آدمی تھے۔ ان کی روح اور فطرت کی تسکین اگر ہوتی تھی تو کتابوں سے یا صاحب علم اصحاب کی صحبت سے۔ جہاں کہیں انہیں یہ دونوں چیزیں میسر آجاتیں ان کا بیرونی پردہ جو بہرحال عارضی چیز تھی، اُٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا تو وہ بے نقاب ہو گئے۔ صحیح یا غلط ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدردان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے جذبات میں عمر کا شریک اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہ چیز ہم دونوں میں گویا قدر مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا اندوختہ نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبہ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ آپ کا بچہ جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہمجولیوں کو نہ دکھا لے اُسے چین نہیں آتا۔ اس کی تہہ میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھیلنے سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی نمائش کی خواہش۔

نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتب خانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس لئے بہت کم اہل ذوق صاحب ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ دعوتیں دے دے کر انہیں بلاتے۔ اپنا مہمان رکھتے اور جب واقعی کوئی قدردان مل جاتا تو پھولے نہ سماتے۔

عربی کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیرُ مقامٍ فی الدُّنیٰ سرجُ سابحٍ

وخیرُ جلیسٍ فی الزمانِ کتابُ

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔

یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا طغرا ہے۔ دریچہ کی ایک تکونی مہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پہ یہ مہر لگائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آ کے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پہ مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک بڑا اور دلکش قلمی نسخہ تھا۔ جس میں صاف ستھرے مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ کرشن پرشاد مرحوم کو آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں اُن کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے تو واجبی ہی سی تھیں۔ البتہ نازک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کر آیا ہوں وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۸۶۰ء لکھی ہے، جو بداہتہً غلط ہے۔ دیر تک اس پہ بحث ہوئی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔ بہرحال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا، محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ "ذکر غالب" کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعہ کیلئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گزارش کی کہ "سبع چمن" کا مطبوعہ نسخہ دلوایئے تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

"سبع چمن" کی پہلی ۱۸۶۳ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگایا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے حبیب گنج والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری دہلی کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا۔ اس کے باوجود میرے

شائع کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں جن کا مجھے افسوس ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملازم مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دسترخوان لکڑی کا ایک نیچا سا تخت تھا۔ اس پر سفید چادر تھی۔ تخت کے چاروں طرف گدے تھے ہم لوگ ان پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب دسترخوان کے ایک سرے پر تھے۔ ان کے سامنے ان کے خلف اکبر خان بہادر محمد عبیدالرحمٰن خاں صاحب تھے۔ اور ان کے بھائی [illegible]۔ میں نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ چار یا پانچ کھانے پر تھے۔

کھانے میں قورمہ، پلاؤ تھا۔ مرغ کا سالن تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لاکے رکھی۔ یا نہیں رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی پر تھوڑا سا نکال کے مجھے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی۔ جناب خان بہادر [illegible] مجھے پیش کی کہ نوش فرمائیے۔ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب [illegible] کے لئے [illegible] لے گئے میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان دیکھتا رہا۔

چار بجے کے قریب [illegible] نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے جا رہے تھے۔ مسجد بڑے پھاٹک کے باہر جو [illegible] تھی۔ اُن کی واپسی پر [illegible] بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لئے اُٹھے لیکن نماز کے بعد سیدھے وہیں واپس آ گئے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام [illegible] سے اپنی جنگلش کے حالات سناتے رہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد مرحوم کی وضعداری کا ایک قصّہ قابلِ ذکر ہے۔ فرمایا مجھے پان کی عادت ہے لیکن تمباکو نہیں کھاتا۔ جب بھی مہاراجہ بہادر کے ہاں گیا تو وہ خاصدان میں پان رکھ کر لائے میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ [illegible] بار [illegible] عذر کیا کہ [illegible] تمباکو نہیں کھاتا۔ میں حیدرآباد میں بارہ برس رہا اور مہاراجہ بہادر سے اکثر ملاقات ہوتی [illegible] لاتے جو میں لے لیتا۔ پھر تمباکو لاتے میں شکریہ کے ساتھ عذر کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا انھوں نے مجھے تمباکو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر آپ نے میری [illegible] مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

راہ دوستی ہا ہر کہ بے منت، قدم ساید
بہ کہ نیکی [illegible] بارد [illegible] زمین بیند

کتبہ حبیب الرحمٰن

بفرمائش [illegible] صاحب بوقت ورود دراپیشاں در حبیب گنج ۷ شوال المکرم ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۳۵ء

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے اپنے "[illegible]" اور "ذکرِ غالب" شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے اُن کی خدمت میں بھیجے۔ حوصلہ افزائی فرمانے ہوئے بہت تعریف کی۔

۲

اتفاق سے ۱۹۴۰ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں واپس وطن آیا۔ اس تمام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ میں جب لندن سے آتے [illegible] دیکھا کہ جب واپس آؤں تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ ماہ فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ گیا۔ میں نے جانے سے ایک دن پہلے [illegible] آنے کی اطلاع دی [illegible] صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا تو نواب کے بھتیجے جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں [illegible] کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہرحال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب قبلہ

حبیب گنج پہنچا۔ یہاں فوراً دادوں جانے والی لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ اب راستے کا حال کیا بیان کروں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کچے ... سڑک کی مرمت کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سڑک کہنا ہی غلط تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور ان سے ذرا ہٹ کر ایک خاص چوڑائی میں روش بنی تھی جس پر بہت باریک مٹی کی بھاری تہ جمادی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد و غبار کا ایک طوفان ... آنکلتی تو پھر خود ہی تصور کر لیجیے کہ مسافروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ ... پر لیسنہ ... آگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ ... اتنا خراب تھا کہ ہچکولوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی ... کے بعد میں ... باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی اور سامان تانگے پر آیا۔

میں قریباً تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب حجرہ میں ... فرش پر بیٹھے ... میں مولانا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہوئے تو میں نے جھک کر سلام عرض کیا۔ چونکہ نواب ... مولانا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہیے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب لے جا کے ... آداب عرض کرتا ہوں ... غور سے دیکھا۔ میں نے ابھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لخت پہچان کے ... گرم جوشی سے ... لذت اندوز ہو رہا ہوں ... میرا تار انھیں موصول نہیں ... جناب عبدالوحید خاں صاحب تھے آگے دستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے ... ایک گھنٹہ بعد ایک شخص تار لے کے آیا۔ اس میں ... تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا۔ وہ پانی کا لوٹا ... اور تولیا وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا ... میرے پاس ... چائے آئی سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لیے مسجد میں چلے گئے ... مغرب ... آپ کی کچھلے سات برس کی ... کہاں کہاں رہتے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا ... کھانے کے بعد ... بڑے کمرے میں آ گئے۔ نواب صاحب ... اگرچہ میں نے اس کچھ سات برس میں شرق اوسط ... اسلامی ممالک کی سیر کی تھی لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا ... آپ کتنے دن مصر میں رہتے ہیں یقیناً عربی ... بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ وہ ان کی سمجھنے اور انھیں اپنی سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام لوگوں یہاں کی بولی کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان ... کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو ... کہ ان عربیوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سنا ہوگا۔ خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں ... محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک مصری دوست ہیں ... ذوالنون ... مصری قنصل تھے۔ مراکش ... ایک دن کچھ مراکشی ... ان کے دفتر میں آئے ... کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے ... ان کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھ میں نہ آیا ... ترجمان بلانا پڑا ... کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا۔ اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ عربی میں ایسے رس بس گئے ہیں کہ لوگ انھیں بے تکلف بولتے ہیں اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نہ انھیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے لفظ ... پائے گئے ہیں ... میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال ... کا ہے۔ اگر اس ... سے کچھ محفوظ رہی ہے تو حجاز کی زبان۔ اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام ہی تک محدود نہیں ... بات چیت ... گے تو اسی

[illegible] انھیں [illegible] کے [illegible] زبان [illegible] بولیں گے یہی عام [illegible]۔

اسی [illegible] کہ مجھے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن بے اختیار میری زبان پر وار جو کلمات آجائیں گے [illegible] کے گئے تو عربی کا [illegible] پروانہ کیجئے۔ چنانچہ ہم پہلے پندرہ بیس منٹ تک عربی میں گفتگو کرتے رہے [illegible] زبان نحوی اور [illegible] لیکن پھر بھی مشق نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں وار جو لفظ آ گئے۔ موضوع سخن اسلامی [illegible] سے متعلق پوچھتے رہے۔ جب میں نے بتایا کہ عوام بہت غریب ہیں اور دولت کی تقسیم بہت [illegible] ہے۔ سب کا [illegible] سرمایہ [illegible] خاندانوں میں جمع ہو کے رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں مغربی سیاسی [illegible] اسلامی بلکہ خلاف اسلام تمدن و معاشرت پر [illegible] نے تو بہت افسوس کرتے رہے۔

اس [illegible] اردو و زبان و ادب کا سلسلہ چلا۔ مولانا [illegible] آزاد نے جو خطوط قید خانے میں ان کے نام لکھے تھے اُن کا مجموعہ غبار خاطر کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے تھوڑے دن پہلے ایک اور مختصر کتاب اُن کے ایک عزیز نے مرتب کر کے "کاروانِ خیال" کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد [illegible] خطوط تھے [illegible] غبار خاطر [illegible] بہت خوبصورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا اس کے آخر میں ایک خط بھی زیادہ ہے جس میں اسلامی [illegible] کاروانِ خیال [illegible] ایڈیشن [illegible] نسخہ میز پر پڑا تھا۔ دونوں کتابوں کو اٹھایا اور اُن پر دستخط کر کے مجھے عنایت فرمائیں [illegible] کی تعریف [illegible] مجھے خیال آیا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں۔ چنانچہ میں نے اُن کے خاندان [illegible] سے متعلق [illegible] سوال کئے [illegible] دیتے رہے۔ [illegible] ایک عزیز نے پچھلے دنوں [illegible] کے رسالے معارف میں میرے متعلق [illegible] کچھ غلطیاں [illegible] ہیں۔ بہر حال اس پر ایک [illegible] کے آپ کو صحیح دوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ [illegible] نے مجھے بھیجا تھا اس میں بعض [illegible] بعض [illegible]

[illegible] غالب [illegible] ایک نسخہ ہے [illegible] مجھے [illegible] زندگی میں چھپ ہے۔ اس کے [illegible] کی [illegible] ۱۹۵۰ [illegible] ذکر غالب [illegible] ایڈیشن میں [illegible] اپنی غلطی پر [illegible] دیوان غالب [illegible] ایڈیشن [illegible] جو نسخہ ہے [illegible] اپنے [illegible] نسخہ [illegible] حل ہو جائے [illegible] یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم [illegible] بعض شعر چھپنے سے رہ گئے بعض دوبارہ چھپ گئے [illegible] کی غلطیوں کا [illegible] کی اجازت [illegible] دی تھی۔

[illegible] کے بیٹھے بھی [illegible] آپ سے متعلق ایک شعر [illegible] ہے ؎

[illegible]

[illegible]

[illegible] شکریہ ادا کیا [illegible]

[illegible] رحمت [illegible] تصویر [illegible] جو [illegible] ان میں سے بھی [illegible] تصویر [illegible] آپ [illegible] تصویر [illegible] رخصت کی کیا ضرورت ہے [illegible] کل [illegible] آج چلا جاؤں گا۔ [illegible] یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے

علی گڑھ کسی کام سے الہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے روانہ ہوتے ہوتے دیر ہوگئی۔ جاڑوں کے دن، جو بہت جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم علی گڑھ پہنچے، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں پھر کسی وقت اتروا لیجئے گا۔ دن ٹلتا گیا۔ افسوس ہے ورنہ آج آپ اس میں نہیں ہوں گے۔

راستے میں گرد و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دن بادل کو دیکھ کے فردوسی کے شعر کی تضمین واقعی سمجھ میں آئی ہے

ز سم ستوران دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ بڑے خود حافظے پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے سب موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لیکن یوں اچانک ایک شعر سن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیات شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جا بجا اضافے کیے جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں یا دوں کو منتخب کیا تھا۔ ادھر بعض لوگ شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمون لکھ رہے تھے ... کہ زمانہ اور ادب پر ... ایک کتاب بھی اس موضوع پر شائع ہوئی تھی ... شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے میرا ذہن "شعر العجم" کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے فردوسی پر ... شاہنامے پر ... تبصرہ لکھا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آ گیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی۔ جن اصحاب نے "حیات شبلی" پڑھی ہے انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس ... کا لفظ نہیں لکھا۔ حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کر دیا جاتا ... اگر اس میں کچھ اصلیت ہے ... اعتراف کر لینا ... مولانا شبلی کی علمی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی ... مولانا ... صاف نہیں ہوگا اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور ... اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں جو اس ... لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہر حال انہیں کے خوشہ چین ہوں گے۔

ان ہی ... کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کیا آپ نے "حیات شبلی" میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی ... میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کر کے رہ گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں "محتسب خداست بزرگاں گرفتن خطاست" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے۔ جواب ... نہیں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے۔ فرمایا ہاں ... دیکھا ہے۔ کہا آپ نے ... خطوط شبلی بھی ... مولوی ... شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے۔ فرمایا ہاں ہاں وہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے اتنی تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی پردہ داری تھی۔ کہنے لگے مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا اچھا یوں سہی لیکن آپ حضرات کی یہ خاموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے "فائدہ؟" فائدہ یہ کہ اس سے ... فائدہ ... ہو جائے گا کل کے مؤرخ کے لئے روشنی مہیا ہو جائے گی، اور اس کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں ... جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک ...

حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے "لا تکتموا الشہادۃ" کسی سلسلے میں اگر تمہیں کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اسے مت چھپاؤ، اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعث آبادیٔ ما

ذکر تو بود زمزمۂ شادیٔ ما

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورود ایشاں در مقام حبیب گنج

فی البدایہ

اے مالک ملک وفا نے یار ما

دل رام قدرشد فدائے صد جاں

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ

حبیب گنج، ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء

یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر بہت بے قاعدگی پیدا ہو گئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بار خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب سے ان کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن اُن کا خط ملا کہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن صبح کے سات بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۴)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۴ برس تھی۔ یعنی کتاب مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ ٹل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی بلکہ کوس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ جو کمالات کسب علم و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شاد کام اور فیض یاب نہ ہوا ہو۔ یہ بھی قابل قدر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دور کی وہ پیداوار تھے وہ دور ہی ختم ہو گیا۔ اب اُن کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس دور کی یادگار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل۔ اس کے بعد گھُپ اندھیرا۔

زمانے نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص، دوستی اور وفا، اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پہلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری کہہ سکتے ہیں۔ وضعداری ایک دن کا نہیں، ایک عمر کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں اسی طرح آپ اس سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اسلوب آپ نے بنا لیا ہے اب کوئی طاقت آپ کو اس سے ادھر اُدھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہو گی اور خالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا چلی اُدھر پھر گئے۔ اسے ہم وفاداری بشرط استواری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میر کا ایک شعر یاد آ گیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا

پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

علّامہ عمادی

ابوالخیر مودودی

منقطع سر اور کشادہ ابھری پیشانی کے عمادی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی و عقلی کے حافظ، وسیع النظر مؤرخ، عربی فارسی اردو کے انشا پرداز و ادیب، رنگین بیان و گرم لہجہ شاعر، کتاب میں دیدہ ور باقی امور میں جنتی۔ ان کا حافظہ طرفہ تماشا تھا: بیسیوں مرتبہ کے چلے ہوئے رستے پر ان کو چھوڑ دیجئے، رستہ بھول جائیں گے اور بغیر رہنمائی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ ۱۸ء کے ہائی انفلوئنزا میں رفیقۂ حیات نے ان کو زندگی کے رستے میں چھوڑا اور وہ یہ رستہ بھی بھول گئے۔ لیکن کتاب، کوئی بھی ہو ——— فسانۂ آزاد، کوچک باختر، نائیکا بھید یا کوک شاستر ——— ایک دفعہ نظر سے گزر جانی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں۔ بلکہ بعض خاص خاص جملے اور فقرے لفظ بلفظ یاد رہتے۔ مہینہ بھر ایک ہی چیز کھلا دیجئے، وہ شوق سے کھا لیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھتے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیل ذائقے کے لئے ——— اور ذہنی مہمیز کے لئے ——— تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمے بھی پڑھتے تھے۔

عمادی صاحب کے نام سے، میں سب سے پہلے، امرتسر کے اخبار "وکیل" کے ذریعے واقف ہوا ——— اور ابوالکلام صاحب کے نام سے بھی اول اول "وکیل" ہی کے ذریعے آنکھیں روشن ہوئی تھیں ——— یہ میرے بدوِ شعور کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں "وکیل" بڑا نامی گرامی اخبار تھا، اور اس وقت کی صحافت میں اصابتِ رائے، متانتِ تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عمادی صاحب اس کے اڈیٹر اور ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ شعور بڑھتا گیا اور عمادی صاحب سے واقفیت بڑھتی گئی: "الندوہ" کے پرانے پرچوں[1] میں اعجاز القرآن اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب اڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا۔ یہاں بھی وہ سب اڈیٹری میں ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ پھر "وکیل" کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوشِ قلم سے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ماہنامہ[2] نکلنے لگا۔ جس میں نقلی علوم کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں

---

[1] سنہ ۱۹۰۶ء — سنہ ۱۹۰۸ء

[2] یہ رسالہ بھی وکیل لمیٹڈ کے زیرِ اہتمام نکلتا تھا۔

کے عقلی و انکشافی علوم پر بلند پایہ محققانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے اتنا لکھا کہ اب معلوم ہوتا تھا بند ٹوٹ گیا ہے۔[1] شعور نے چند منزلیں اور طے کیں، تو ان کے ایک عربی ماہنامے "البیان" پر آگاہی ہوئی[2]۔ یہ ماہنامہ عمادی صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۹۰۲ء میں نکلا۔ جسے وہ ۱۹۰۸ء تک کامیابی سے چلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ سنی کہ وہ مکتبی علماء میں پہلے شخص تھے جنہوں نے بیرونِ ہند کی صحافت سے ناطہ جوڑا، اور مصر و بیروت کے رسالوں اخباروں میں مضامین لکھے۔ "البیان" اسی تعارف کے سہارے نکلا تھا۔ پھر جب "الہلال" نکلا تو کچھ دنوں بعد "وکیل" کی لوح سے ان کا نام رخصت ہوگیا، اور معلوم ہوا کہ ابوالکلام صاحب نے عمادی صاحب کو "الہلال" کی سلکِ ادارت میں بندھ لیا ہے۔ "الہلال" سے ظفر علی خاں صاحب نے ان کو "زمیندار" میں کھینچا، اور پھر دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے نیم رسالے "ستارۂ صبح" میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت بھاری بھر کم تھی، لیکن عمادی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے نمود واقعہ دفعتہً اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دارالترجمے سے متعلق ہو کے حیدرآباد جا رہا تھا۔ طبّی مشورے کی غرض سے حکیم اجمل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، حکیم صاحب نے فرمایا: وہاں ایک بڑے فاضل شخص عمادی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل ۱۸۹۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے، ایک دن سفیر صاحب نے مجھ سے کہا: حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کر دے۔ مجھے تین سال جستجو کرتے ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سوچتا رہا، مولوی عمادی صاحب نے بڑے بھائی صاحب سے "قانون" پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دست گاہ رکھتے ہیں، خط لکھ کے ان کو بلایا اور انہوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔"

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عمادی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک دن میں بھی منسلک ہوا جو ان کی پائنتی میں بیٹھنے کے قابل تھا۔

لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوقِ ملاقات نہ تھا۔ خیال تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے متعدد ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی تھوتھنی پر لادے رہتے ہوں گے، آنکھوں میں نخوت تھرکتی ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوں گے گویا لوگوں کے سروں پر چل رہے ہیں، اور باتیں آنکھیں بند کر کے اس طرح کرتے ہوں گے جیسے بہت دور کسی سیّارے میں بیٹھے اپنے بندے پر وحی نازل فرما رہے ہیں۔ ـــــــ مگر جب ان کو دیکھا، تو پہلی نظر میں ذہن پر ان کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ یہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی ودیعت الٰہی نہیں سمجھتا: محض انسان، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان! اور اس سے زیادہ کچھ ہونے یا منوانے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ اور میں بھول گیا کہ وہ کوئی بڑے جغادری فضیلت پناہ ہیں؟ اور میں سطوتِ دریا سے دہلا سہما ساحل سے بہت دور کھڑا ایک نادان لڑکا ہوں چہرے پر شرافت کی ملاحت، خدوخال میں علم کا رچاؤ، آنکھوں میں گہرے پانی کا دقار۔

---

[1] وکیل بک ڈپو سے عمادی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات ہیں "محکمات"، "علم الحدیث"، "فلسفۂ القرآن"، "فلسفۂ ابن عربی"، "صناعتہ العرب"، "تاریخ عرب قدیم" اور تراجم میں مفتی محمد عبدہٗ کی مشہور کتاب "الاسلام والنصرانیہ" (جو رینان کے جواب میں لکھی)، شیخ عبدالعزیز شادیش کی "الاسلام دین الفطرۃ" اور امام راغب کی "تفصیل النشاتین و تحصیل السعادتین" شائع ہوئیں۔

[2] "البیان" تین حصّوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصّے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالات حاضرہ پر عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصّے میں عرب اہل قلم کے مضامین با ترجمہ درج کئے جاتے تھے اور تیسرے حصّے میں بلادِ اسلام کے حالات اور خبریں اردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر و شام و بیروت اور شمالی افریقہ تونس و الجزائر و مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

اسلاف عالی گوہر تھے۔ علم صدیوں سے متوارث تھا، جاہ و منصب بھی رچا بسا۔ نیک نہاد اولاد نے جو ہر دار بزرگوں کی حقیقی میراث بڑے جتن سے محفوظ رکھی اور ایک نسل نے دوسری نسل کو پہنچا دی۔ نسباً یہ لوگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے ساتھ ان کے اوضاع و اطوار میں نمایاں رہی۔

شیخ عماد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں علم کے قافلوں کی آخری منزل پورب دیس تھا۔ شیخ عماد بھی یہیں پہنچے اور جون پور میں خود وہ اور ان کے گھرانے کے لوگ افادۂ علوم میں مشغول ہو گئے۔ ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس گھرانے کے درس علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا۔ اس نے بارہ گاؤں سیر حاصل جاگیر دیئے، ان لوگوں نے انہی دیہات کو اپنی درس گاہ بنا لیا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخشیاں ایک مستقل فکر کی حامل تھیں۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداروں کے لئے آزاد و با اختیار سرمایہ مہیا کرنا تھا۔ ہر درس گاہ قرب و جوار کے طلبہ کی اقامتی درس گاہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طلبہ تن کے کپڑوں سے گھر سے چلتے اور جس درسگاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی وہی درس گاہ کفیل ہوتی۔ یہ دیہاتی درس گاہیں صحت مند تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں۔

عمادی خاندان نے پورب کی بستیوں میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تلقین کی شمعیں روشن رکھیں۔ آخر زمانے میں سوگھر پور میں شیخ عبد القادر عمادی کی درسگاہ مرجع عام تھی، جس میں بیک وقت دو دو سو طلبہ مقیم رہتے تھے۔ بادشاہی وقتوں کی جاگیر اودھ کی نوابی کے ابتدائی دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چشمۂ نور جاگیریں نہ تھیں خود ان کی ذات تھی۔ بزرگوں کا زرخرید "امرتور" ایک گاؤں تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدارات کرتے اور دونوں وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھاتے۔ یہ عمادی صاحب کے پردادا تھے۔

اس تعلیمی اور تہذیبی خدمت گزاری میں عورتیں بھی اپنے دائرۂ عمل میں مردوں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشروں کا سیکڑوں برس پرانا دستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف جلا پاتے تھے، تہذیب و شائستگی برومند ہوتی تھی اور معاشرے کا شیرازہ بندھا رہتا تھا۔

عمادی صاحب نے علمی شیفتگی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ خاندان میں اب تک بول چال کی زبان عربی تھی۔ صرف و نحو دادی سے پڑھی۔ اور گیارہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود "الف لیلہ" پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد سے حل کر لیتے۔ اسی کتاب نے عربی انشاء کا شوق پیدا کیا۔ علوم و آداب اپنے والد اور ماما سے پڑھے، دونوں بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی ڈھیروں الم غلم کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہترین ادب عالیہ بھی پڑھا دیا۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جاحظ و ابن قتیبہ کی ادبی صناعتوں اور کلام عرب کے مجموعوں سے خود استفادہ کر لے۔ یہ زندگی سے ہنستے بولتے، کھرے اور سادہ، لطیف اور منطقی: کانٹے کی تول تلے ادب کی تعلیم تھی متنبی اور حریری اس کے آگے پانی تھے۔ نقلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام نصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر اکتفا کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ درس نظامی پر اضافہ تھا۔ اس کے بعد خیرآبادی درسیات سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خاں؎ رام پوری کے درس میں داخل کر دیا۔

؎ مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولوی فضل حق خیرآبادی کے یگانۂ روزگار شاگردوں میں تھے۔ چند سال رام پور میں درس دیا، پھر ۱۸۷۴ء میں جون پور آئے اور مدرسۂ امام بخش کو رونق بخشی۔ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی ان کی کریم النفسی کا ایک واقعہ بڑے مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے کہتے تھے کہ ایک مرتبہ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ مدرسہ عالیہ کے امتحان کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے سخت گرمیوں کا موسم تھا امتحان سے فراغت پائی تو بارہ بج چکے تھے (باقی صفحہ پر)

ہزاروں رحمتیں ہوں ان بزرگوں پر جنہوں نے فقہ میں سلامت روی کا قانون ذہن نشین کیا، اور بنیادی تعلیم میں آزاد تفکر کا سبق پڑھایا۔ اگر خدانخواستہ عمادی صاحب قدوری شریف اور مولانا کنز الدقائق کی آل اولاد کے چکر میں پڑ جاتے، تو اور جو کچھ بھی ہوتے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلب عمادی صاحب نہ ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں لٹکتے "صورت معنی" اور "معنی صورت" کے کانٹوں میں الجھتے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ ترینے کی امتحی میں سمٹی سمٹائی، ڈاڑھی کو یک مشت دو انگشت بنانا پڑتا۔ ٹخنے ڈھکا پائجامہ نہ پہن سکتے، اور لبیں اتنی گہری ترشواتے کہ مونچھوں کے وجود کا اطلاق ہی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد تفکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بت شکن تھے انہوں نے شہ نشین کے طاقچوں سے بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہے اور بڑے مزے سے ان کا مُثلہ کیا ہے۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی طاقچے میں نہیں بٹھایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے 'دلی' جا کے طب کی مشہور کتاب "القانون" پڑھی۔ پھر 'رام پور' میں عرب محمد طیب[۵] سے فنونِ ادب کا فیض حاصل کیا، اور طیب صاحب نے مکتب سے مکتب نوازی کی مسند پر بٹھا دیا۔

اس زمانے کی مکتبی دنیا میں مولوی عبدالعلی آسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدالحئی فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ اور 'رام پور' کے مدرسۂ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسی چھوڑ کر 'لکھنؤ' میں "اصح المطابع" کے نام سے مطبع قائم کیا، جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصحیح و تہذیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ آسی صاحب کو اپنے اس کام کے لئے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی، جو ادب اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے ہوں اور غلط نسخوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے کسی کام سے 'رام پور' آئے، طبیب صاحب نے ان کے مطلب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، اور عمادی صاحب مکتب سے مطبع کی زینت بن گئے۔ یہاں قلمی اور مطبوعہ نسخے تھے اور عمادی صاحب، اوّل سے آخر تک لفظ بلفظ ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ آسی صاحب کو کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ جیسے بچّوں کو بچوں کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انہوں نے اپنے ذمے رکھا۔ کام کا دائرہ وسیع کر لیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور درسیات کی تقریباً تمام کتابیں شائع

(بقیہ حاشیہ صـــ) استاد العلماء کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلتے تو سر پر چادر ڈال لیتے' چادر ڈال کے مدرسہ سے پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کرنے زنان خانے میں جا چکے تھے، اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لائے اور اس شان سے مہمان عزیز کی پذیرائی کی جو انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے بھتیجے کو بھیج کر کنویں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئے۔ سپاس گزاری یہ تھی کہ "مولوی لطف اللہ صاحب نے دھوپ میں کرم فرمایا" اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

[۵] عرب محمد طیب نوادرِ عالم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا بہتا دریا، وطن مکہ تھا، نہ جانے ہندوستان کس طرح آنکلے، مولوی فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۸۶۱ء) سے معقولات میں کمال حاصل کیا، نقلی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، کلام جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گھنٹوں قصیدے پر قصیدہ مسلسل سنے جایئے، پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی عکاسی کر دیتے اور لہجے سے شعر کی خوبیاں نمایاں کر دیتے، نکاتِ سخن بیان کرتے اور دادِ سخن دیتے۔ مماثل یا متماثل شعر سنانے کی لہر آ جائے تو گھنٹوں ہم رنگ و ہم معنی شعر سنے جایئے۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے، کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے۔ نواب کلب علی خاں کی مجلس کے بلبل ہزار داستان تھے، جدّو ہزل میں طاق، نواب ان کی بہت ناز برداریاں کرتے۔ مذہب میں پانی تھے، جس رنگ کے گلاس میں چاہو ڈال دو، مگر رہتے تھے اسلام کے دائرے کے اندر۔ مدتوں مدرسۂ عالیہ کے صدر و مہتمم رہے اور طلبہ کے وظیفے بڑی فراخ حوصلگی سے ہضم کئے۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مردِ آزاد و بے باک پر۔

کیں "اصح المطابع" کا نام درسی حلقوں میں صحتِ طباعت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، غلطیوں کی تصحیح نے کھٹک اور پرکھ کی استعداد پیدا کردی، اور بغور پڑھنے کی وجہ سے مباحث ذہن نشین ہو گئے، اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیلاً اس کے مباحث سامنے آ گئے۔

تصحیح کا بار جب ہلکا ہوا تو آسی صاحب نے پہلے "الریاض" نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبدالوالی صاحب کے اہتمام سے "البیان" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی ادارت میں نکلے تھے۔ جب ناخن نرم تھے اس وقت سے عربی انشاد کا شوق پرورش پا رہا تھا، تصحیح کے کام سے جب فرصت پاتے عربی جرائد کو مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ آسی صاحب نے مناسب سمجھا کہ یہ ابرِ کرم جو باہر برستا ہے گھر ہی میں کیوں نہ برسے۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب سے آخر میں دارالترجمے اور حیدرآباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں ... ... مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دارالترجمے کو یہ "بڑا شرف" تقریباً بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ سبھی کچھ رہے: مترجم[۱]، ناظرِ مذہبی، علمی مبصر، واضع اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے، اور ان کو ارکانِ مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ بایں ہمہ علمی رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی مدد اور رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رکین تھے۔ دائرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں یورپی شرق شناسوں کے اشتراک سے ایڈٹ کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگرانِ اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے[۲]۔ کتاب خانہ آصفیہ کی مجلس مخطوطات میں وہ قلمی

---

[۱] مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے حسب ذیل کتابیں نکلیں :-

(۱) مؤرخ مسعودی کی "تنبیہ و اشراف" اور "مروج الذہب" (۲) مؤرخ طبری کی تاریخ الرسل والملوک کی آخری دو جلدیں۔

(۳) طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن حزم کی الملل والنحل ——— یہ آخرالذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

[۲] پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل :-

(۱) رسالۃ الضوء
(۲) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالقطوع
(۳) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالدائرۃ
(۴) رسالۃ المکان
(۵) رسالۃ مشکلات بنی موسیٰ
(۶) رسالۃ المساحت
(۷) رسالۃ ضوء القمر۔

محدث ابن جوزی کی مشہور تاریخی اور سیرتی خاکوں کا نوشتہ المنتظم فی التاریخ وغیرہ۔

نسخوں کے مستند مبصر تھے۔ کتاب کسی موضوع و مضمون کی ہو، اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادّی قیمت کیا ہو؟ اس میں وہ کورے تھے اور اس سے سروکار ہی نہ رکھتے۔ جس نے زندگی بھر بازار جا کے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں تیر تکے ہی لگاتا۔ یاب در گیری اور محکم گیری اِن کی شخصیت کی ایک بنیادی اینٹ تھی۔

حیدرآباد سے عمادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب[1] تھے ——— یہاں حیدرآباد سے میری مراد حیدرآباد کی روح ہے، روح کا مظہر، جس سے حیدرآباد، حیدرآباد تھا ——— اور اپنے رفیقِ دیرینہ کی کچھ اس شان سے تقریب کی کہ پیش گاہ سے تار کے ذریعے طلبی ہوئی، درباری لباس برطرف کر دیا، پہنچتے ہی باریاب کیا اور مشرقی شعبے کو ان کی رکنیت کا شرف بخشا۔ پہلی ملاقات میں ہنر ذات کا نقش اتنا گہرا پڑا کہ عمادی صاحب خاص امتیازوں کے مورد بن گئے، ایسے امتیاز جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بارگاہ میں جو نادر قلمی کتابیں صلہ و انعام کی غرض سے پیش کی جاتیں، اور بڑے بڑے مصنف اپنی جو کتابیں نوازش و سرپرستی کی غرض سے پیش کرتے ان کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے ایک ہی معتمد جوہری تھا، عمادی صاحب! یہ نجی معاملت تھی، براہ راست "ہمارے قاموس" اور "ہمارے جاحظ" مخاطب کئے جاتے۔ اپنے خاندانی کتاب خانے اور آصف جاہی ریکارڈ آفس کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس نادر تاریخی مواد سے (جسے دیکھنے کا اتفاق عمادی صاحب کے سوا کسی کو نہیں ہوا) خود اپنے لئے ہند و دکن کی سیاسی تاریخ لکھوائی اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اطمینان اور اپنی تلاوت میں استفادے کے لئے قرآن کے نامی گرامی ترجموں کی نسبت توثیق چاہی کہ دیکھ کر بتاؤ ان میں کونسا ترجمہ مستند ہے اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو حاشیے پر اصلاح کر دو۔ کس قدر جذامی بنا ڈالنے والا تھا انسانیت کو یہ امتیاز اور منفرد امتیاز! لیکن عمادی صاحب کا جوہر ذات اس قدر اعلیٰ اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے امتیازات میسفک میں بارش کی ایک بوند تھے!

عمادی صاحب نے بطور "تحدیث نعمت" بھی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو اُردو کی ایک کہاوت ہے: نیکی کر کنوئیں میں ڈال، بالکل اسی طرح انہوں نے یہ سارے کام کئے اور ان کے ذکر اذکار خاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔ اِس سے زیادہ نادرہ کاری اور کیا ہوگی، کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر رہے جو اُن سے قریب تر تھے۔

یہ اُن کے کھرے علم کا گمبھیر انا تھا۔ انا احساسِ ذات ہے، یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و نظر سے متوازن ہوتا ہے اسی قدر گمبھیر ہوتا ہے، اور جس قدر گمبھیر ہوتا ہے اسی قدر ہوش مند شخصیت تشکیل پاتی ہے ——— لیکن ایگو جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے، وہ مستقیم اور متوازن احساسِ ذات نہیں! انا کی بدمستی ہے ——— عمادی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و نظر سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص کمال اور

---

[1] ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابع اپنے زمانۂ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جاننے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس (میر محبوب علی خاں)، کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی عہد کو مملکت کا کام سکھانے جاتے تھے، ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے، کاغذات پیش کرنے ہمیشہ یہی ان کے ساتھ جاتے۔ عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق فائق، اسبابی اور کام میں زعد و برق تھے، ولی عہد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی فوقیت گراں گزری، ان لوگوں نے یہ سازش گھڑی کہ عزیز مرزا ولی عہد کو برسرِ اقتدار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس پاداش میں عزیز مرزا صاحب اور ان کے ردیف ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ بات یاد رکھی، اور جب ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کے لئے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدرآباد بلایا اور اپنے خاص زبان سے مغربی شعبے کا رکن مقرر فرما دیا۔

خاص بصیرت ہے، اس احساس اور قلندر مشرب[5] بزرگوں کے فیض تربیت نے ان کی ہوش مند اور جمیل شخصیت کو جنم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو آج ڈھونڈے بھی کہیں نظر نہیں آسکتیں، نہ خانقاہوں میں نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے ادعائی مرکز میں! شائبے کا تو ذکر ہی کیا، نخوت اور تجبر کی پرچھائیں بھی ان میں نہ تھی۔ اپنے ہر ملنے والے کی بھید بزرگ داشت کرتے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات اور کسی طریقے سے ایک جاہل ہم نشین کو اس بات کا خفیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور دست گیری کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کر دیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی تنخواہ میں دست گیری کی ایک مستقل مد تھی۔ معمولی نہیں چھ سو میں سوا سو روپے کی مستقل مد! خود ان کا اپنا حصہ کھانے کپڑے اور اوپری مصارف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کا بیس فی صد! دست گیری اس شان سے کرتے کہ اونچا ہاتھ نیچا رہتا اور نیچا ہاتھ اونچا۔ جیسے مرید با اخلاص اپنے پیر و مرشد کو اور سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر دفتر کے چپراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آتا، تو اگرچہ وہاں کا عام دستور یہ تھا کہ چپراسیوں کا سلام دیکھ لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عمادی صاحب ان سب سے معانقہ کرتے، بزرگ داشت سے ان کو بٹھاتے، خود ہر ایک کو عطر پان پیش کرتے اور عید کا انعام ٹھیک اسی طرح پیش کرتے جس طرح وہاں اعلیٰ حضرت کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ عید اور عید گردی میرے لغت و رسم سے خارج رہی ہے، لیکن عمادی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔ ان کی بلندیاں دیکھ کر میری پستیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ اور سچ پوچھئے تو اپنی پستی کا یہ احساس انہی کی بلند انسانیت کا ادنیٰ فیض تھا۔ شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریقے پر جسارت سے کچھ کہا، فرمانے لگے: "جب عمادی اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عید کی نذر پیش کرتا ہے، تو یہ لوگ بدرجۂ اولیٰ اس کے سزاوار ہیں۔ عمادی کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے مخدوم ہیں، اور وہ سب کا ادنیٰ ترین خادم ہے"۔ ان کے لہجے میں بھرپور انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں پیوست ہوئی جا رہی ہے۔

نوکروں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ تھا۔ نوکر صرف دو تھے، لیکن ان کا سارا گھرانہ ان کے دسترخوان میں برابر کا حصہ دار تھا، بلکہ ان کے مہمان بھی۔ جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذتِ کام و دہن سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت محبوب تھی۔ دکھ بیماری میں ان کی دیکھ بھال علاج معالجہ کرتے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت الفت تھی۔ وطن جب جاتے عزیزوں دوستوں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ خاندان کے متعدد بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق پڑھوایا۔ ایک بھتیجے کو ادب کا اور ان کے صاحبزادے کو سائنس کا شوق تھا، دونوں کو بلا امتیاز ایک ساتھ علی گڑھ میں پڑھوایا۔

حیدر آباد کی جاہ نما معاشرت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنا کانٹے پر اوس ہوتی ہے۔ نمونے کی طالب علمانہ سادگی، جو ہمیشہ سے ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سر مو فرق نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست کہتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو روش دیکھی تھی

---

[5] قلندری طریق کا تحفہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان لائے، پردیسی سال تھے، صاحب فضل اور اپنے کام میں صاحب کمال تھے، "بروش بیک نگاہے" ان کا طریق کار تھا، خواجہ قطب الدین بختیار اوشی ملے، متمتع کیا اور متمتع ہوئے۔ وہ خود تو وجدان کی اس تازہ نظر سے ان علاقوں کو بہرہ مند کرنے واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے، لیکن یہاں بھی ان سے ایک مستقل طریق تفکر شائع ہوا، "قطب بینا دل" ان کے سر حلقہ تھے اور طائفۂ چشتیہ میں بھی اس طرز تفکر کا پیوند لگا۔ جزیرہ کار میں تمام اصحاب طریق متمتع ہوئے۔ عمادی صاحب کے بزرگ شیخ قطب بینا دل کے حلقے سے متعلق تھے مشرب قلندری کا خلاصہ دو لفظوں میں طیبت، نفس ہے، مطلب نظر کی پاکی و بے باکی، خوش دلی و خوش اندیشی۔ شیخ محدث نے "اخبار الاخیار" میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

وہی آج اس مرکزِ جاہ و نمائش میں دیکھ رہا ہوں نہ مزاج میں کوئی فرق ہے، نہ لباس اور بود و باش میں" —— اور اسی سلسلے میں عمادی صاحب کی تحصیل علم کے واقعات سنائے۔

انفرادیت کہیئے یا وضع داری، جو کچھ بھی تھی ان کی ٹوپی میں تھی: پھندنے سے آزاد اُونچی باڑ کی نرم ترکی ٹوپی۔ ڈھیلی ڈھالی گھٹنوں سے بالشت بھر سے کچھ زیادہ نیچی شیروانی۔ ڈیڑھ فٹے پائنچے، ٹخنوں سے اُونچے نہیں، اتنے نیچے کہ ایڑیوں سے ملے رہتے۔ یہ چیز خاص الخاص قسم کے لوگوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔ عبا اور عمامے سے کبھی گراں جسم نہ ہوئے۔ جو لباس معمولاً پہنتے تھے۔ کوئی مجلس ہو اسی لباس میں جاتے۔ جلوہ فرمائی کا جدا لباس کیش و آئین نہ تھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے وضع دار تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا، جو وضع پڑ گئی زندگی بھر کا دستور بن گئی۔ توہین چاہے کسی کی ہو کسی قسم کی ہو، اس سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و استہزا، اپنی ذات کے متعلق ذکر اذکار ان کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی جتنی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی کوئی استعداد پاتے، اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے مقام سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے اور حوصلہ بڑھاتے۔ ردّ و کد، بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور تفنن کوئی انوکھی علمی بات چھیڑ کے ذہنی ورزش کا لطف لیتے اور لطف اندوز کرتے۔ شواذ اور نوادر مسائل، اور لطائف و ظرائف، ان کے کشکول میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کے ہزاروں شعر: جِدّ و ہزل ہر قسم کے ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے، سناتے اور نکتہ سنجی کرتے۔ مطالعے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ ادبی تاریخی اور فقہی لطیفوں کی پھُل جھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کرکے اس طرح ہنستے کہ سارا جسم ہل جاتا۔ شاید مقامی محاوروں کی طرح ہنسنے کا محاورہ بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی بالکل یہی وضع مرحوم مولوی ابوبکر شیث کی بھی تھی، دونوں "جون پوری" تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سانچا جون پور کی قدیم شائستگی نے ڈھالا ہو۔

تردید کے انداز میں تردید نکرنا اور غلطی کی اصلاح "غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہ بھی مستقل عادت تھی کہ جو لوگ بننے کے شوقین ہوتے بڑی نکتہ آفرینی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علّامہ بننے کا سودا ہوا، خوب مدارات کی، وہ "حضرت العلامہ" بن گئے اور اس سند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ لکھ دیا ہے، علامہ پن کو اپنا قانونی حق سمجھ لیا اور عمادی صاحب نے طرح داری سے لکھ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو مُعَلّمَہ کہتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ، میرے دوست بلا شبہ علامہ ہیں اور ایسے علّامہ کم ہوتے ہیں۔ تفریح کے لئے شئے لطیف ضروری ہے اور یہ شئے لطیف کا کرشمہ تھا۔ تھوڑے عالم لوگ بھنّائے، عمادی صاحب نے کہا: میرا یا آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا؟ وہ غریب علّامہ بننے کی کوشش میں کچھ بن ہی جائے گا، بگڑے گا تو نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے۔

ہمیں تو شیخ و برہمن سبھی کی سُن لینی　　　　یہ کیوں؟ کہ آس نہ توڑیں پکارنے والے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی مدارات میں بھی دریغ نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یہ اپنی جگہ مطمئن وہ اپنی جگہ خوش۔

اور یہی مدارات تھی کہ قانون کے مترجم مسعود علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب شاگرد کو اس کے گھر میں جا کے پڑھانے لگے۔ محوی صاحب علیگڈھ کے پرانے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی میں نمایاں استعداد کا علامہ شبلی نے ان کو وثیقہ دیا تھا، سشن جج رہ چکے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ سشن جج کے غرّے کی وجہ سے خود پڑھنے نہیں آتے، اور عمادی صاحب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خوب برسے، خوب برسے، جتنے یہ برسے اتنے ہی وہ نہال ہوئے، جھڑی تھمی تو بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ان کے آنے سے مجھے کچھ تزک نہیں لگ جائے گا۔ یہ بات تو قابل قدر ہے کہ انہیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے آپ پڑھیے عمادی آپ کی جناب

میں بھی حاضر ہوں گا۔" انہی محوی صاحب کے ہاں ضیافت میں ظفر علی صاحب نے بیان کیا تھا (یہ ۳۴ء یا ۳۵ء کی بات ہے) کہ مجھ سے ڈاکٹر اقبال نے ذکر کیا کہ میں ابن عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو مجھے ابن عربی کی فصوص اور فتوحات کے مباحث اور فلسفہ سمجھا دے۔ میں نے اپنے علامہ کو تجویز کیا اور یہ حضرت خود جا کے پڑھانے لگے۔" محوی صاحب نے نوید سنائی: کہ رسم پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا قصہ پوچھا، بہت سادگی سے اتنا کہا: جو بزرگ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے تھے وہ بوڑھے ہو چکے تھے، مولوی شبلی سیّد صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و مطالعے میں مشغول تھے۔" اور قصہ گویا تمام کر دیا۔

مولوی سیّد سلیمان صاحب کو بہت ملال تھا کہ" ان کے مضامین ابوالکلام کے نام سے شائع ہو گئے۔" ایک دن دارالمصنّفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں عمادی صاحب کے پاس دفتر تشریف لائے، یہ قصہ لوازم گفتگو سے تھا، فرمایا: یاد ہوگا مولانا آپ کو، وہ میرا 'کان پور' کی مسجد والا مضمون اور ابوالکلام صاحب کا برہمی کا خط! اسی مضمون سے شہرت لی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا —— اور مولانا! آپ نے دیکھا، آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مملوکاتِ ارثی میں شامل کر لئے جو آپ وہاں چھوڑ آئے تھے . . . . ." اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی۔ عمادی صاحب نے کہا: چھوڑیئے جناب مولانا (یہ عمادی صاحب کا خاص اندازِ تخاطب تھا) ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ ہی کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطف صحبت حاصل نہ ہوا۔" سیّد سلیمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دل گرفتگی سے عمادی صاحب کی صورت تکنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دل چسپ مطالعہ تھا۔

ان کا ذہنی وجدان کلیتہً عقلی تھا، اور وجدان الفاظ کا زندانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد راسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات رسوخ کی پوری آزادی دینے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، راسخ اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو 'انگریزوں' کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی صحبت سے یکساں فرحت و انبساط حاصل کرتے۔ ایک غالی شیعہ دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام نے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: آپ جس کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبلچی اور سارنگیئے پیدا کرنے نہیں چاہتا خیبر شکن حیدر کرار پیدا کرنا چاہتا ہے۔" کفر ان کے نزدیک لغت اور اصطلاح دونوں لحاظ سے، عقل سے بغاوت ہے اور استدلال ایمان کی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مولوی معنوی نے استدلال کو پائے چوبیں کہا ہے، وہ پائے آہنیں کہتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انہوں نے یوں بدلا ہے:

پائے استدلالیاں روئیں بود — پائے روئیں باہمہ تمکیں بود
بسکہ استدلال کار دین ماست — فخر رازی راز دار دین ماست

اور یہ استدلالی طریق، دینی امور اور علمی امور میں، ان کا اصول کار تھا۔

وہ اپنی تسکین خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے، تو دن رات اسی دھن میں لگے رہتے اور تحقیق کے پھل سے، خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، شاد و شاد ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہوتا تھا، وہ اپنی خواہش اور نقطۂ نظر کو محور نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف زمین کا کام لیتے تھے اور عمارت گری کے لئے تذکرہ و تراجم رقعات و محاضرات (کشکولی کتابوں) اور دوسرے مآخذ سے واقعات کو رونما کرنے والے ریشوں کا کھوج لگاتے۔ اس کے لئے وہ قصّوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں انہوں نے شاہی فرمانوں، جاگیری وثیقوں اور

پرانے وقف ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ امتحانات اور دوسری علمی سرکاری مدوں سے دو ڈھائی ہزار سالانہ کی جو آمدنی ہوتی وہ قلمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کردی تھی۔

بدنام دانتی سسمان کو بہت ہمدردی تھی۔ کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے تاریخ اور انسانے لکھ کر ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے فن سے معاشرے کی اکثریت ہر زمانے میں بڑے ذوق شوق سے مستفید ہوئی۔ وہ مورخ کی بجائے ایک بامقصد نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا دلاویز و رنگ مہیا کرتی ہے۔ یہ ان کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دو نظریوں: عربوں کی بدویت کے نظریئے اور علوم و آداب میں عربوں کی تہی دستی کے نظریئے سے سخت اختلاف تھا۔ کہتے تھے کہ مستشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی محققانہ رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریے بے اصل ہیں۔ "تاریخ عرب قدیم" اور "صناعۃ العرب" ابن خلدون کے نظریۂ بدویت کی تردیدی تحریریں ہیں لیکن ان کو اپنی معتاد روش کے مطابق تردید کے عنوان سے پیش نہیں کیا۔

مقالہ ہو یا ترجمہ، برداشتہ قلم لکھتے اور کسی پیراگراف یا صفحے میں شاذ و نادر کوئی لفظ قلم زد ہوتا۔ مدت سے خود لکھنا چھوڑ دیا تھا ترجمہ لکھواتے تھے۔ ترجمہ لکھوانے کا ڈھنگ اکثر و بیشتر یہ ہوتا: ٹہلتے رہتے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور فقرے روانی سے بول دیتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ لفظی ہوتا۔ مسجع عبارتوں کے لفظی ترجمے کی یہ شان تھی:

والقمر الباهر والكواكب الزاهر والغمام	قسم ہے ماہِ تاباں کی، نجم درخشاں کی، ابرِ باراں کی، مرغانِ فضائے
الماطر وما يلحق من طائر وما اهتدى بعلمٍ	آسمان کی۔ قسم ہے اُس پہاڑی ٹیلے کی جس سے رہرو کو راہ ملے
مسافر من منجد وغائر لقد سبق هاشم امية	فراز پسند ہوں یا نشیب گیر سب کو پناہ ملے کہ خوبیوں میں ہاشم
الى المآثر اول منه وآخر ابو همهمة بذلك خابر	اُمیہ سے بڑھ کے ہے آگے پیچھے ہر حال میں بڑھ چڑھ کے ہے
نقضى لهاشم بغلبة۔	ابو ہمہمہ ان کا خبررساں ہے اور یہی اس کا بیان ہے۔ اس بیان

کے ساتھ ہاشم کے غالب آنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے، ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا چاہتے تھے کہ آصفیہ کتاب خانے میں اچھے داموں نکل جائے۔ ان سے کہا: فہرست بنائیے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھئے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا، یہ کام اپنے ذمے لے لیا، اور بار احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبک دوش کردیا کہ "مجھے پڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی"۔ وہ ہر ہفتے دس پانچ کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی کھکھیڑ کون کسی کے لئے اٹھاتا ہے۔ چند نمونوں سے تعارف کی فنی خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہوگا:

کیمیائے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین کیوں کی، نبات و معدن و جماد میں قدرِ مشترک کیا ہے، نقصِ خلقت کی کتنی گنجائش ہے۔ سالمات کتنے ہیں اور ناقصات کس قدر ہیں جوہر و عرض کی کیا نسبت ہے، جن اجسام کو بظاہر مُصْمَت اور ٹھوس محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر تخلخل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تنزیل و تحلیل و ترکیب سے وہی جنس سافل مرتبہ عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل سب کو لے کو ہیرے میں تبدیل کرلیا جائے؟

کیمیائے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیاء کے علم حق اور عمل صدق پر مبنی ہے۔

اسلام سے پیشتر کلدانی و مصری و یونانی قومیں جن موہومات میں مبتلا تھیں، مسلمان بھی ابتداءً اسی طرح میں گرفتار ہوئے، خلافت سے محرومی کے بعد خالد بن یزید اور اس کے رفیق کار جابر بن حیان انہی تجربوں میں پڑے رہے جو طغرائی کی تحقیق میں فن سے تعلق نہیں رکھتے، ایک شخص زیبق کی تصعید

میں سرگرم ہے، تلوین میں انہماک رکھتا ہے، بایں ہمہ کوشش بے نتیجہ رہتی ہے، اس لئے کہ نباتات و معادن و جمادات کے حقیقی علم سے عملاً آشنا نہیں۔

مسلمانوں نے یہ کمزوری محسوس کی، مہوسی کے زینے پر چڑھ کے کیمیا کے بام حکمت پر چڑھ گئے۔

یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے۔

طغرائی نے اپنے تمام پیش روؤں سے الگ ہو کے ابوبکر رازی کو اپنا مدار علیہ مانا ہے کہ اس علمی خلافت کے — فی زمہ — وہی بانی بالفصل تھے۔"

رسالہ حیّ: فلاسفۂ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا الشیخ بوعلی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ عہد سلاجقہ کی یادگار ہے۔ اسی عہد کی زبان ہے اور وہی انداز بیان ہے، کائنات کس طرح وجود میں آئی، نیستی سے ہستی کیسے ہوئی، معدوم سے موجود کی کیا سبیل نکلی، کوئی شے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی علت و سبب موجود ہو یہ علت اس شے پر مقدم ہوتی ہے، وجود عدم سے نکلا تو کیوں کر نکلا، علتِ وجود کو وجود سے پہلے موجود ہونا چاہئے حال آں کہ وجود سے پہلے آپ عدم کے قائل ہیں۔ یہ مباحث نمونۂ کتاب ہیں۔ ان میں غور کرنے والے پر طبیعیین و دہریین کے مذہب کا فساد خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے پہلے ایک واجب الوجود بھی ہے، تعالیٰ شانہٗ کہ وہی اس کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبّب بھی"۔

رسالۂ طیر: یہ بھی شیخ کی عربی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سلجوقیوں کے عہد میں ہوا تھا۔ اس میں انسان کی تخلیق سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہوتے ہوئے ان میں گوناگوں اختلاف کیوں ہے؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی تحلیل کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے، یہ استعداد بالقوہ ہے، عبارت ہے اگر اس کو فعل میں لایا جائے تو کون سے مدارج ارتقا ہیں جن پر انسان فائز نہیں ہو سکتا"۔

تحفۃ الحبیب: اصفہان کے خوش بیان سخنور و سخن سنج میرزا فخری کی یہ کتاب زبان آوری کی دنیا میں پرواز خیال کا ایک عجیب مرقع ہے۔ مثلاً سعدی نے، کہ ملاحتِ کلام میں شور انگیزی پیدا کی پہلا ... کے حصے میں آئی، ایک غزل لکھی، خسرو بھی اسی زمین کو شاداب کرتے ہیں اور معاملہ بندی میں جسے ان دنوں وقوعہ گوئی کہتے تھے، ایک نئی شان دکھاتے ہیں، حسن اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں، سلمان ساوجی، خواجو کرمانی، عماد فقیہ کی شکر خائی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے یہی زمین سخن شکرستان بن جاتی ہے۔ پھر حافظ آتے ہیں اور خداداد قبول خاطر سے اسی زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں۔ پھر جامی، اہلی، کاتبی و نزاری و جامی اپنے اپنے طور میں داد سخن دیتے ہیں۔

یک ایک زمین میں مشاہیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حیرت خیز نگارخانۂ معنی اہل نظر کے ذہنی تشفی کا انبار در انبار سامان رکھتا ہے۔ جس سے ادب فارسی میں عہد بعہد حسن تخیل و لطف ذوق و عروج فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے ناآشنا ہے"۔

اسی سلسلے میں دو مضمونوں کے اقتباس ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام میں، "بغداد" کا تمدن سیلاب تاتار کی نذر ہو چکا ہے، ہلاکو کا جانشین "اباقا" سریر آرائے سلطنت ہے۔ تبریز جو زبیدہ خاتون کی یادگار تھا، آج اس میر تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے، روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کے سب اُن کے زیر نگیں آ چکے ہیں۔ مصر و شام کی ایک ہی بچی کچی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نے پناہ لی ہے، مگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں، اسی ضرورت سے خود اباقا تبریز میں لشکر زن ہے اور صاحب دیوان اور وزیر اعظم خواجہ شمس الدین محمد یہ تاکید ہو رہی ہے کہ مغولستان سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر لی جائیں، پوری قوت کے ساتھ جوم

"قسطاط" کے مناروں پر حملہ ہو سکے"۔

(۲) ہجرت نبوی کا چھیاسٹواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشتِ کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، جوشِ انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے، یزید و آل یزید پر عام بیزاری مزید ہے، توابین کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر تو بہ تلا اب بھی برپا ہے۔ اسی حالت میں قبیلۂ ثقیف کا ایک جواں مرد اٹھتا ہے اور سب کو بٹھا دیتا ہے۔ اس کی کنیت ابو اسحاق ہے، پہلے خارجی رہ چکا ہے، اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ طرف داران اہل بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے، بایں ہمہ شیعہ اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسنِ مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے یہ کانٹا کیا گل کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے"۔

اردو میں شعر کم کہتے تھے، عہد شباب کی ایک غزل ہے:

چشم پُرفن کا ہے گردش میں نظام اے ساقی
گردشِ ساغر و میناکو سلام اے ساقی

سطوتِ جام کی جاتی رہی عالم گیری
اب کہاں ولولۂ شربِ مدام اے ساقی

شیشہ ہے منتظرِ جلوۂ خورشیدِ ازل
مجھ کو درکار نہیں ماہ تمام اے ساقی

کعبۂ دل میں بتوں کو ہے خدائی کا غرور
لب تک آتا ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی

پرتوِ صبح بنا گوش سے ہو گی کافور
گیسوئے بند جگر خوار کی شام اے ساقی

تیغِ ابرو سے مے آشام کہیں ڈرتے ہیں
دمِ شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

مئے گل رنگ شہادت کا چلے بزم میں دَور
آ چلی ساعتِ افطارِ صیام اے ساقی

فارسی میں یوں دادِ سخن دیتے ہیں:

جبین زُہد ز اُفتادگی نشد روشن
ہزار سجدہ کنند نور بر جبیں نرسد

حریفانِ تو ز ہمت کوتاہ بین نیست
ہرگز در کریم بگا نزد بستہ اند

اہل بینش ہمہ از آتشِ دوزخ بہ اماں
ہر کہ در خلد در آید بہ بر ندش بجحیم

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این ست کہ بیمار تر بیمار ترست

فریبِ رنگ و نمود سے گہر شناس مخور
حباب دار نموداری گہر بخشند

عجب مدار اگر مرغ خانہ پر ورا
نہ ادہ ہمتِ پرواز بال و پر بخشند

جہاں کش کہ جہانے دگر پدید آید
گلیم فقر دیا بند و تاجِ زر بخشند

عالم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات انسان ہونا ہے مولوی صاحب جتنے بڑے عالم اور علامہ تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان تھے۔ بلند نگاہ اور کریم النفس، قلندر صفت اور قلندر سیرت۔ ان کی زندگی شرافتِ علم اور شرافتِ نفس کے امتزاج کی مظہر تھی۔

پنڈت برج نرائن چکبست

نجم الدین شکیب

چکبست کی وفات کو پورے تیس سال گزر چکے ہیں لیکن علمی اور ادبی حلقوں میں وہ ابھی تک اس طرح یاد کئے جاتے ہیں جیسے ان کی موت کا حادثہ کل ہی کی بات ہو۔ وہ صرف یہی نہیں کہ جوان مرے بلکہ اس وقت اس دنیا سے گذر گئے جب ان کی قابلیت کی شہرت اپنے بھرپور شباب کو پہنچ رہی تھی۔ اگر موت کا بے درد ہاتھ اس جوہر گراں مایہ کو قوم کے ہاتھ سے چھین نہ لے جاتا تو ابھی ملک اور قوم کے نوجوانوں کو ان سے کسب فیض کا موقع حاصل ہوتا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس سال ہم ان کی پچھترویں سالگرہ مناتے۔ اس عمر کے پختہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن پھر بھی چند سال اور ان سے استفادے کی آس باقی ہوتی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو جب شہرت اور شباب کے پھول ان پر نچھاور ہو رہے تھے، وہ اچانک بیمار ہو کر پانچ چھ گھنٹے میں اس دنیا سے آگے بڑھ گئے۔

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شباب
اب تک آیا بھی نہیں دور میں پیمانہ ہے! (چکبست)

چکبست کا آبائی وطن اودھ کی قدیم راجدھانی فیض آباد ہے لیکن وہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے کیننگ کالج سے بی۔ اے پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں وکالت پاس کر کے قانون کے پیشے میں آ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا۔

وہ مشہور کشمیری برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ فارسی ادب سے لگاؤ ان کو ورثے میں ملا تھا۔ قدرت نے طبیعت موزوں عطا کی تھی۔ گھر کا ماحول بھی شعر و ادب کی تخم ریزی اور آبیاری کے لئے موزوں تھا اس لئے نو برس کی عمر ہی سے مشق سخن کرنے لگے۔ ناسخ اور آتش غزل کی زبان کو آسماں بنا چکے تھے اس لئے شروع شروع میں چکبست نے بھی وقت کی اسی لے میں اپنے دل کی بات کہی۔ لیکن زمانہ بدل رہا تھا۔ اب دنیا کے غم اتنے بڑھ گئے تھے کہ "حدیث دلبراں در حدیث دیگراں" میں کوئی کشش نہیں محسوس ہوتی۔ ان کے خلوص نے جو ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ان کی فکر کے عمل کو زیادہ وسیع سے وسیع تر کر دیا اور ان کے نغموں میں وہ غم بھی ڈھلنے لگے جو ابھی تک اردو شعر و ادب کے لئے تقریباً نئے تھے۔ کوئی شبہ نہیں

اقبال کے نغمے ایک "جہانِ تازہ" کی تخلیق کر رہے تھے لیکن وہ گلستان جس میں چکبست کی حب الوطنی نے زبان کھولی، ابھی تک خاموش تھا اور چکبست نے خالص ہندوستانی قومیت کے رجز خواں کی حیثیت سے تاریخِ ادب میں اپنے لئے جو جگہ بنائی وہ ابھی تک کسی اردو شاعر کے نصیب میں نہ آئی تھی۔ نواب جعفر علی خاں اثر کا دعویٰ غلط نہیں کہ :

"صرف چکبست ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات و منظومات کی بلا امتیاز
تفریقِ مذہب ترجمانی کی ہے"

چکبست کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انہوں نے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مل، مارلے اور برک ان کے پسندیدہ فلسفی اور انشا پرداز تھے۔ راناڈے، گوکھلے اور تلک نے بھی ان کے خیالات اور جذبات پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ بڑے زبردست قوم پرست تھے لیکن ان کی قوم پرستی کا دائرہ تنگ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب کے قدردان تھے لیکن تمدن کے بہتے ہوئے دھارے کو روکنا نہیں چاہتے تھے بلکہ تہذیب کی قدیم اور جدید قدروں کے امتزاج سے ایک ترقی پسند سماج کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ بقول پنڈت کشن پرشاد کول مرحوم، چکبست کا عقیدہ تھا کہ :

"پرانی تہذیب سے جو کچھ بچ پڑ سکتا ہے پوری طرح سمیٹ لینا چاہئے لیکن نئی روشنی اور نئے تمدن
کے سامنے بھی آنکھیں بند نہیں کرنا چاہئیں۔ ہماری زندگی میں مشرق اور مغرب دونوں کی روشنی کا عکس ہونا چاہئے۔"

یہ صرف ان کا عقیدہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اس مقصد کے لئے جدوجہد بھی کی۔ انہوں نے اپنے خداداد ملکۂ سخن سے بھی کام لیا اور تعلیمی اداروں میں شامل ہو کر بھی ابھرتی ہوئی نسل کو سنبھالنے اور راہِ مستقیم پر لے چلنے کی کوشش کی۔ طلبہ سے ان کو بڑی امیدیں تھیں۔ وہ کیننگ کالج (جس نے اب لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی ہے) کے قدیم طالب علم تھے۔ اس لئے وہاں کے حالات کا ان کے اوپر بہت اثر پڑتا تھا۔ وہ طلبہ کے سچے رہنما اور مربی تھے۔ جب موقع پاتے، کالج جاتے، طلبہ سے ملتے، باتیں کرتے، ان کا نقطۂ نظر سمجھتے اور اپنا سمجھاتے۔

ملکی اور قومی معاملات میں ان کی تمنائیں خالص ہندوستانی تھیں۔ وہ مذہباً ہندو تھے لیکن ان کا کردار خالص ہندوستانی تھا۔ مذہب کی صداقت پر پوری طرح ایمان رکھنے کے باوجود وہ انسان تھے۔ ہر ہندوستانی ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ ہندو، مسلمان، چھوٹے بڑے، امیر غریب وہ سب ہی کے خیر خواہ تھے اور سب کے دکھ درد میں ایک سچے دردمند انسان کی طرح شریک ہوتے تھے۔ ان کا یہ شعر صرف شاعرانہ الاپ نہیں ہے بلکہ ان کے مردانہ کردار کا سچا رجز ہے جو خدمت کے میدان میں اترتے وقت ان کی زبان پر آیا تھا۔

درد دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (چکبست)

ان کے سیاسی عقائد انتہا پسندانہ نہیں تھے۔ ہم ان کو اعتدال پسند کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی عظمت و برتری کا خواب دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ :

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے (چکبست)

لیکن بیرونی تسلّط کے خلاف ان کا رویّہ جارحانہ نہ تھا۔ انہوں نے پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) میں انگریزی حکومت سے پوری طرح تعاون کیا۔ ان کی انتہائی تمنا بس یہی تھی کہ :

"ہم ہوں گے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا"

وہ "ہوم رول" کے مطالبہ سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ زمانے کے حالات نے آگے چل کر جو پلٹے کھائے، اگر وہ زندہ رہتے تو دیر یا سویر ان سے ضرور متاثر ہوتے۔ لیکن موت نے اتنا وقت نہ دیا کہ ان کا خلوص ان کی بے چینیوں سے مل کر کسی واضح بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا۔ لیکن پھر بھی ان کی تحریروں نے قومی جذبات کے ابھارنے میں جو حصہ لیا وہ بہت کم ادیبوں کے حصے میں آیا۔

چکبست بڑے خوش وضع، ملنسار اور وفادار دوست تھے۔ ان کا شباب آریائی وجاہت کی تصویر تھا۔ لکھنؤ کی تراش خراش اور نوک پلک نے ان کی جامہ زیبی میں اور بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ بہت سنجیدہ اور پُرفکر آدمی تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن خشک مزاج نہیں تھے۔ طبیعت میں وزن بہت تھا۔ کھلکھلا کر بہت کم ہنستے لیکن خندۂ زیرِ لب سے کبھی ان کا چہرہ عاری نہیں ہوا۔ دوستوں اور بے تکلفوں کی صحبت میں ان کی سنجیدگی کبھی بار نہیں ہوئی بلکہ ان کی بذلہ سنجیوں نے روتوں کو ہنسایا اور مردہ دلوں کو زندگی کی آس بندھائی۔ پرانے زمانے کی تہذیب اور شائستگی سے ان کے فطری حسنِ اخلاق نے جلا پائی تھی۔ ان سب پر مستزاد ان کا دل تھا جس کا گوشہ گوشہ انسانیت سے معمور تھا۔ وہ سراپا اخلاق تھے۔ لکھنوی تہذیب اور معاشرت کے آب و رنگ نے اس میں اور بھی دل آویزی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس وقت کے معاشرے کے تکلفات سے خالی نہ تھے لیکن ان تکلفات میں نقالی اور ذہنی غلامی کا شائبہ نہ تھا بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق نے صرف دل و نگاہ کی تسکین کے لئے یہ رنگین نقاب ڈال رکھا تھا۔ وہ قدیم شرافت کا پتلا تھے اور زمانے کے غموں نے ان کے دل میں جو گداختگی پیدا کر دی تھی وہ اس روایتی شرافت میں روح بن کر ان کو سراپا انسان بنائے ہوئے تھی۔

چکبست ترقی پسند ادیب اور رفارمر تھے لیکن بے راہ روی سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے ترقی اور اصلاح کے میدان میں بھی میانہ روی ہی کو اپنا اصول بنایا۔ وہ تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے لیکن ان کی حمایت غیر مشروط نہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر عمل کو اخلاق کی کسوٹی پر کستے تھے۔ تعلیمِ نسواں بھی ان کے نزدیک ہندوستانی اخلاق کی روایات سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستانی خاتون کا جذبۂ وفا، شرم، غیرت اور خاندان پروری بڑی نعمتیں ہیں جن کو وہ زیورِ نسوانیت کے لئے ضروری جانتے تھے۔ وہ عورت کو محض "چراغِ خانہ" بنا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس کے "شمعِ انجمن" بننے کے بھی حامی نہ تھے۔ ان کے نزدیک "امومت" اور اس کے فرائض کی بجا آوری عورت کا بڑا انسانی اور قومی فریضہ ہے جو تعلیمِ نسواں کی وجہ سے خاتون کو سکھانا تھا۔ اپنی اولاد کی طرف سے مردوں کی بے اعتنائی دیکھ کر انھوں نے دخترانِ ہند کو متوجہ کیا تھا کہ:

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

مرحوم اودھ پنچ کا صفحہ چکبست کا خاص صفحہ تھا اور وہ تمام ادیب جو اس حلقے میں شامل تھے ان کے خاص دوست تھے لیکن اودھ پنچ کے لہجے میں جو چیٹ پٹا پن تھا اسے چکبست نے اپنی تحریروں میں اختیار نہیں کیا۔ ان کی فطرت جارحانہ نہیں تھی اس لئے وہ شدید اختلاف کے باوجود کسی کا دل ہنسی مذاق میں بھی دکھا نہیں سکتے تھے۔

چکبست نے گلزارِ نسیم کو ایڈٹ کر کے ایک دیباچہ لکھا۔ عبدالحلیم شرر نے اس دیباچہ پر چوٹیں کیں۔ چکبست نے اس کا جواب لکھا اور جواب الجواب بھی نکلے۔ زوردار استدلال کے باوجود کہیں تلخی نہیں آنے دی۔ ان کے اوپر بعض حلقوں سے کچھ غیر اصولی اور ناروا سب حملے ہوئے لیکن انھوں نے صبر اور ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی تحریروں میں شروع سے آخر تک سچا تنقیدی وقار قائم رہا۔ جب گرماگرمی بہت بڑھی تو انھوں نے بڑی شرافت سے لکھا:

"جناب شرر اطمینان رکھیں کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میرے قلم سے ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلے گا جس سے کسی بندۂ خدا کی توہین مقصود ہو۔"

یہ "بندۂ خدا"، چکبست کا محبوب تھا۔ وہ اس کی خدمت کو خدا کی پرستش کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ ہندو تھے لیکن اس سے پہلے انسان تھے۔

اس لئے وہ سب کے تھے، کسی کے لئے غیر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات جو کسی کی دل آزاری کا موجب ہو ان کے نزدیک روا نہ تھی۔ وہ مذہب کو بھی انسانیت اور انسان نوازی کی کسوٹی پر کستے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہبی تصوّر اور رجحان کو کس مزے میں سمجھایا ہے ؎

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے

کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے (چکبست)

چکبست نے بہت کمایا لیکن کبھی ایک پیسہ جمع نہیں کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے صرف ایک لڑکی تھی۔ پنڈت مہاراج نرائن کے کئی لڑکے تھے۔ یہ سب چچیرے بھائی بہن ساتھ ساتھ رہتے اور سگے بھائیوں اور بہنوں کی طرح پرورش پاتے تھے۔ چکبست کو اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن سے بڑی محبت تھی۔ اچھی خاصی آمدنی رکھنے کے باوجود کبھی ان کے دل میں خیال بھی نہ آیا کہ اپنی بیوی اور تنہا بچی کو لے کر الگ رہیں اور عیش سے زندگی بسر کریں۔ ایسے وفادار، محبت پرست اور کنبہ پرور بھائی کی موت پنڈت مہاراج نرائن کے لئے بڑا حادثہ تھی۔ چکبست کے انتقال کے وقت ان کی بچی چھوٹی تھی۔ اس کی شادی کے فرائض پنڈت مہاراج نرائن نے انجام دئے۔ چکبست کا غم ابھی تک ان کے خاندان میں تازہ ہے۔ ان کے بھتیجے ابھی تک اپنے مرحوم چچا کو ویسے ہی یاد کرتے ہیں جیسے اپنے باپ پنڈت مہاراج نرائن کو یاد کرتے ہوں گے۔ ان دونوں بھائیوں نے برادر نوازی اور کنبہ پروری کی جو مثال قائم کی اس نے اس خاندان کو بڑھنے، پھلنے، پھولنے اور ترقی کرنے کا ہنر سکھا دیا۔ آج چکبست برادران موجود نہیں ہیں لیکن ان کا فیضان ان کے خاندان میں جاری ہے اور کشمیری برہمنوں کی اس شاخ کی ترقی کا نشان ہے۔

چکبست نے وکالت بھی کی اور روپیہ بھی خوب پیدا کیا۔ لیکن اس پیشے میں جتنے گہرے ہوتے گئے ان کی شعر و ادب کی تشنگی اور بڑھتی گئی۔ اتنے بڑے خاندان کی پرورش اور اتنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے روپے کی ضرورت تھی اس لئے ترکِ دنیا میں کوئی مصلحت نہ تھی۔ لیکن دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان کی آخری منزل نہ بن سکی۔ ان کو پیشے کی مصروفیت میں برابر اس کا خیال رہا کہ وہ اپنی اصل منزل سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انتقال سے ایک یا دو روز پہلے بارہ بنکی کی عدالت جج میں شیخ ممتاز حسین جونپوری سے جو اس وقت بارہ بنکی کی عدالت جج میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے کہا تھا کہ آپ مجھے غالب کا ایک فارسی شعر لکھ دیجئے تاکہ میں ہر وقت اسے اپنی میز پر رکھوں اور پیشے کی مصروفیت کو اپنے ذوقِ علم و ادب پر غالب نہ آنے دوں۔ چکبست نے غالب کے اصل شعر میں تھوڑی سی ترمیم کرکے شیخ صاحب کے حوالے کیا۔ انہوں نے یہ شعر اس طرح لکھا تھا ؎

دل اسبابِ سخن گم کردہ پابندِ غم ناں شد[1]

زراعت گاہِ دہقاں ہی شود چوں باغ ویراں شد

شیخ ممتاز حسین جونپوری اعلیٰ درجے کے خوشنویس ہیں۔ وہ اپنے عزیز دوست کی یہ فرمائش پوری نہ کر پائے تھے کہ چکبست کے انتقال کی خبر آئی۔ انہوں نے چکبست کے لکھے ہوئے شعر کو یادگارِ حبیب کے طور پر محفوظ رکھا تھا لیکن وہ کہیں تلف ہوگیا۔ اگر ہوتا تو ادبِ اردو کے طالب علم کے لئے تبرک کے طور پر کام آتا۔

عدالت کی قانونی مصروفیت میں بھی چکبست کا ذوقِ سخن دلچسپی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا تھا۔ وہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو بعض سخن فہم اور سخن سنج اہلکاروں کے پاس جا بیٹھتے۔ مصرعے پر مصرعے دئے جاتے۔ گرہیں لگائی جاتیں۔ کچھ کام کی باتیں ہوتیں۔ کچھ لطیفے ہوتے اور فضا میں ان کی بدولت ایک ہلکی سی شعریت پیدا ہو جاتی۔ اس زمانے میں عدالت خفیفہ میں ایک اہلمد تھے۔ ان کا نام پیارے لال تھا۔ وہ چکبست کے شاعرانہ کمال کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے

---

[1] غالب کا اصل شعر غالباً یوں ہے ؎

دل اسبابِ طرب گم کردہ پابندِ غم ناں شد   زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

چکبست کو ایک مصرعہ بھجوایا اور فرمائش کی کہ اس پر گرہ لگا دیں۔ مصرعہ یہ تھا ؎

"رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں"

چکبست نے مسکرا کر گرہ کا مصرعہ لگا کر شعر لکھ دیا ؎

خفیف عدالت میں اُلّو کے پٹھے
رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

پیارے لال غریب پر جو کچھ بھی اثر ہوا ہو لیکن پورا دفتر اس برجستہ گرہ سے بہت محظوظ ہوا۔ ان کی یہی خوش مزاجی تھی جس نے ان کو عدالتوں کی روکھی پھیکی فضا میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور جب ان کی ناگہانی وفات کی خبر آئی تو وہ بھی رو دیے جن کی آنکھیں برسوں سے مسلیں دیکھنے کے سوا رونا اور ہنسنا سب کچھ بھول چکی تھیں۔

شعر و ادب کا قافلہ اب بہت آگے بڑھ چکا ہے لیکن راہ میں اس نے جو مرغزار دیکھے ہیں وہ اسے ہمیشہ یاد آئیں گے۔ آگے کی راہ کتنی ہی پُرخطر اور ویران کیوں نہ ہو کھوئی ہوئی محبتوں کی یہ غیر فانی یادگاریں ہماری رہنمائی کریں گی۔ آج چکبست ہم میں نہیں ہیں لیکن جو تصورات انھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑے ہیں وہ ہماری ادبی اور قومی زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم

جمیل زبیری

شہروں کی ہماہمی سے دور یوپی کے ایک چھوٹے سے ضلع ایٹہ میں ایک چھوٹا سا قصبہ مارہرہ ہے جسے بہت سے لوگ مارہرہ شریف کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ عجیب مردم خیز علاقہ ہے۔ مولانا احسن مرحوم جن کا اصل نام سید شاہ علی احسن تھا اسی چھوٹے سے قصبہ کے رہنے والے تھے۔ میں نے انھیں پہلی بار اس وقت دیکھا جب میری عمر مشکل سے آٹھ یا دس سال ہوگی۔ مجھے خوب یاد ہے رمضان کا مہینہ تھا۔ میں اپنے نانا (صدیق حسن صدیقی جو خود بھی شاعر ہیں اور مولانا احسن کے شاگرد ہیں) کے ہمراہ مولانا کے گھر پہونچا۔ پرانے وضع کے ایک بڑے پھاٹک سے ہم لوگ مولانا کی بیرونی حویلی میں داخل ہوئے ہمارے سیدھے ہاتھ پر ایک دالان تھا جس میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر ایک لمبی چوڑی سی چوکی بچھی تھی جس پر نہایت صاف دھلی ہوئی ایک چادر پڑی تھی۔ چوکی کے اطراف چھوٹے مونڈھے اور کرسیاں رکھی تھیں جن پر چند اشخاص مؤدبانہ بیٹھے تھے۔ چوکی کے سرے پر بڑے پھاٹک کی طرف پیٹھ کئے ایک نہایت وجیہہ انسان ایک مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ میرے نانا نے داخل ہوتے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہی مولانا احسن تھے۔ میں نے قریب پہونچ کر انھیں سلام کیا اور دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں ان کی شخصیت سے کچھ ایسا مرعوب اور اس وقت سے ماحول سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ گو اس واقعہ کو آج تقریباً ۱۶ یا ۱۷ سال گذر چکے ہیں مگر ان کے جسم کا وہ نفیس کرتہ، وہ ہلکے سبز رنگ کا تہبند اور ان کے سیدھے ہاتھ پر سلگتا ہوا حقہ اور مولانا کا ہکلا ہکلا کر جلدی جلدی بولنا مجھے اس طرح یاد ہے جیسے آج کی بات۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ نانا کو قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے قریب بلا کر پیٹھ ٹھونکی اور علیم اللہ (مولانا کا دیرینہ ملازم تھا) کو آواز دی "علیم اللہ، علیم اللہ ہمارے بیٹے کے لئے ایک مونڈھا ہمارے قریب رکھ دو"۔ اور مجھے بالکل اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسی اثنا میں کچھ اور لوگ بھی آگئے معلوم ہوتا تھا کوئی بڑی پر تکلف دعوت ہے۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ چوکی پر طرح طرح کی چیزیں جن میں پکوان، مٹھائیاں، پھل، کھجوریں اور دہی بڑے غرض کہ ہر ایک چیز شامل تھی موجود تھیں اور لوگ مؤذن کی صدا کے منتظر تھے۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور مزاج پرسی کرنے کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ میں خاموش بیٹھا کبھی ان کی طرف کبھی دہی بڑوں کی طرف اور کبھی دیگر افراد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دفعہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور ذرا سا جھک کر پوچھا "کیوں بیٹے۔ تمہارا روزہ ہے؟" میں خاموش رہا۔ گو موجودہ اشخاص میں سے کچھ کی طرح میں بھی گھر سے منہ بالکل صاف کر کے اور چہرہ پر روزے کے آثار پیدا کر کے چلا تھا۔ مگر میری کم عمری سچائی کو نہ چھپا سکی۔ وہ خود ہی ہنس کر کہنے لگے "ایک ڈاڑھ کا ہوگا"۔ پھر اور لوگوں سے محو گفتگو ہو گئے۔ روزہ کشائی کے بعد جماعت

کھڑی ہوئی۔ نماز خود انھوں نے ہی پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ علیم اللہ انکے لئے لگا ہوا پان لایا۔ وہ کھا کر حقہ قریب کر لیا اور پھر گفتگو شروع ہو گئی مجھے ان کی گفتگو سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اول تو وہ بہت جلدی جلدی بولتے تھے دوسرے ان کی گفتگو میری چھوٹی سی سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور جب نانا نے میری آنکھوں میں نیند کے آثار دیکھے تو مولانا سے رخصت لے کر چلے آئے۔ چلتے وقت مرحوم نے فرمایا۔" صدیق کل ضرور آنا "

اور یہ سلسلہ پورے مہینے جاری رہا۔ میں نانا کے ہمراہ دو تین مرتبہ اور گیا اور اس محفل کو ہمیشہ اسی طرح پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور تقریباً ہر سال پورے ماہِ رمضان کی چھٹی لیکر مارہرہ آجاتے تھے۔ جہاں ان کی تفریحِ طبع اور عبادت کا بہت کچھ سامان موجود تھا۔ گھر کے نزدیک ہی ایک بڑی مسجد تھی جس میں وہ تراویح پڑھتے تھے اور چونکہ خود بھی حافظ تھے اس لئے کبھی کبھی خود بھی کلام مجید سناتے تھے ستائیسویں روزے کو بڑی دھوم سے شبینہ کرتے تھے جس میں جلیبیاں بانٹی جاتی تھیں۔ شبینے کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے میں نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا۔ جس محلے میں ہمارا مکان تھا اس کی مسجد کے ایک امام تھے جنکا نام حافظ عبد الحمید تھا مگر لوگ انھیں گلاؤ ٹھی والے حافظ جی کہا کرتے تھے۔ وہ بڑے پُر مذاق اور زندہ دل انسان تھے۔ ایک رات اپنی مسجد میں تراویح ختم کر کے میرے والد سے کہا " چلو، لبستی (بستی اس محلے کا نام ہے جہاں مولانا رہتے تھے) میں شبینہ ہے وہاں چلتے ہیں "۔ بستی کی مسجد میں مولانا احسن جنھیں مارہرہ کے لوگ شاہ میاں کے نام سے یاد کرتے تھے تراویح میں موجود تھے اور اگلی صف میں سرے پر کھڑے تھے۔ حافظ جی جماعت کے دوران میں ہی ان کے قریب پہنچے اور کان کے برابر منہ لیجا کر کہنے لگے۔" اس کے بعد میں سناؤنگا "۔ مولانا کو نماز میں غصہ آگیا اور نیت توڑ کر کہنے لگے " لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ۔ نماز خراب کر دی " اور پھر نیت باندھ لی۔ حافظ جی سر پر پاؤں رکھکر بھاگے اور اپنے گھر پہنچ کر دم لیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ احسن صاحب کا آدمی حافظ جی کو بلانے آیا ہے۔ انھوں نے کہلوایا تھا۔" آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ آکر قرآن ختم کرا دیجئے " اور حافظ صاحب کو جانا پڑا۔ یہ انکا اخلاق تھا جو مرحوم کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی یہ چیز انھیں اپنے آباو اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ مولانا مرحوم کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا سید شاہ برکت اللہ جو مولانا کے جد امجد تھے۔ سترھویں صدی کے آخیر یا اٹھارہویں صدی کے شروع میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے تھے۔ بلگرام خود وہ جگہ ہے جہاں کا ہر فرد بقول غالب جو ہر قابل کہے جانے کا مستحق ہے۔ مولانا کے بزرگوں میں حضرت صاحب عالم اور حضرت شاہ عالم بڑے عالم بزرگ گذرے ہیں۔ مارہرہ کی مشہور درگاہیں ہیں جن کی وجہ سے مارہرہ، مارہرہ شریف کہلاتا ہے۔ انہی تمام بزرگوں کے مزار ہیں۔

مولانا مرحوم سادات مارہرہ میں سے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور جدید خیالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گو وہ خود انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر قدیم اور جدید کی کشمکش میں انھوں نے ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی اور ذاتی صلاحیت اور ذوق کی بدولت دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ تلاش کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے لئے یہ خاصہ دشوار کام تھا کیونکہ بچپن سے ان کی تعلیم بالکل پرانی وضع پر ہوئی تھی۔ مولانا نے خود اپنی ایک نظم میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس زمانے کے علمی رواج کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی گڑھ کالج قائم ہونے کے بعد جگہ جگہ انگریزی اسکول کھلنا شروع ہوئے اور اسی کے زیر اثر مارہرہ میں بھی مولانا کے گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول کھلا۔ حصولِ علم کا شوق تو تھا ہی۔ اس اسکول میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک ترکی ٹوپی اور ایک انگریزی پرائمر بھی خرید لی۔ شدہ شدہ جب ان کے والد بزرگوار کو اطلاع پہونچی کہ صاحب زادے نے انگریزی اسکول میں جانا شروع کر دیا ہے تو بہت ناراض ہوئے۔ اور نہ صرف انھیں مارا پیٹا ہی بلکہ کتاب اور ٹوپی چھین لی اور ہدایت کی کہ آئندہ ایسی جرأت نہ ہو۔ اس واقعہ کے چالیس سال بعد ۱۹۲۹ء میں مولانا نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا۔

" سرسید کا فیض جاری "

سن نواسی عیسوی گذرے ہیں جسے چالیس سال ✣ ✣ ✣ اس زمانے کے رواج علم کا لکھتا ہوں حال

میرا مسکن تھا جو پونے دو صدی سے خانقاہ ‏ زیب سجادہ تھے اس میں عارفانِ دیں پناہ
اس احاطے ہی میں اک اسکول انگریزی کھلا ‏ درس لینے کے لئے جس کی طرف عالم ڈھلا
میں کہ جس کی نوجوانی کا ہوا تھا عنفوان ‏ اس نئی تعلیم کی خواہش میں در در بے تکان
تھا نہ کوئی بعد مائل آمد و شد کے لئے ‏ بیٹھ جاتا تھا کتابیں لے کے شد بد کے لئے
آتے جاتے دیکھنے والوں کی پڑتی تھی نظر ‏ رفتہ رفتہ والد ماجد کو بھی پہنچی خبر
میرے اس شوقِ تعلم پہ بہت برہم ہوئے ‏ اور بالتصریح ارشادات یہ پیہم ہوئے
"تجھکو انگریزی نہ پڑھنے دینگے ہم او روسیاہ ‏ مار ڈالیں گے جواب اٹھی ادھر تیری نگاہ
ہے غضب جس گھر میں وردِ مغنی[۱] و تشنج رہے ‏ اس میں انگریزی کی یہ گٹ پٹ رہے ہم جنج رہے
سیکھتا ہے ان کا فن جو بولتے ہیں ڈیم[۲] فول ‏ تجھکو نامعقول پڑھنا چاہیے قال اقول"
مجھکو ان احکام کی تعمیل کرتے ہی بنی
زندہ رد کر عالم فانی میں مرتے ہی بنی

اسی نظم کے آخری مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں انگریزی تعلیم حاصل نہ کرسکنے کا برابر احساس رہا اور نئے اور پرانے رجحانات کے درمیان ایک میانہ راہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس قسم کے اشعار سے کیا جاسکتا ہے ؎

یہ شوق اضطراب تماشا دیکھنا ‏ اُنسے جواب خط کا منگایا ہے تار پر

اس میانہ روی کا ذکر انھوں نے ایک مرتبہ اپنے رسالے "فصیح الملک" میں اس طرح کیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ ہر معاملے میں افراط و تفریط بری ہوتی ہے، آجکل انگریزی و پرانی دونوں شاعریاں[۳] اس طرح کی جاتی ہیں جن میں کوئی خاص اور تازہ لطف نہیں پایا جاتا۔ الا ماشاء اللہ ہم نئی شاعری کے مخالف نہیں ہیں . . . . . فصیح الملک میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ایشیائی پرانی طرز کے سوا نئے خیالوں کی ایسی نظمیں شائع ہوں جو پرانے اور نئے دونوں اہل مذاق کی دلچسپی کے لیے موزوں ہوسکیں اور اس کے واسطے یہ معیار ہے کہ خیال نیا اور نیچرل ہو مگر طرز بیان، ترکیبیں اور قیود وہی ہوں جن کی ایشیائی طبیعتیں عادی ہیں"

ادب میں میانہ روی قائم رکھنے کی برابر کوشش کی۔ انھیں اپنے خاندانی وقار اور پرانی روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے رکھ رکھاؤ میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی محبت اور تواضع سے ملتے تھے اور بہت جلد ہی بے تکلف ہو جاتے تھے مگر کسی قسم کی بیہودگی یا بدمذاقی روا نہیں رکھتے تھے۔ پرانے اخلاق کا مکمل نمونہ تھے اگر کوئی دوسرا ان کے معیار سے گری ہوئی بات کر بیٹھتا تو ان کے چہرے سے ناگواری کا احساس ٹپکنے لگتا تھا اور بسا اوقات صاف دلی سے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

---

۱ ورد وتاج وعیش کے قسم کی دعائیں ہیں۔
۲ مولانا کو اس نظم میں انگریزی کا یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا۔
۳ مولانا کے قلم سے اس لفظ کا نکل جانا سخت حیرت کی بات ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے۔

"مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ[1] میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اوّل میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بانوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے۔

؎ کہاں لیجاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ جیسے بانسوں کی طرح سیدھے سادے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی ؎

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن!
بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے ایک شعر پر جو صفِ اوّل کو مدِنظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دی ؎

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت
یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا۔"

مولانا کی کلاس میں اکثر طلباء شوخیاں کر بیٹھتے تھے اور مولانا برہم ہو جاتے تھے اور کلاس سے چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ رشید صاحب صدیقی سے جو شعبۂ اردو کے صدر تھے کہنے لگے[2] "رشید صاحب۔ طلباء پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گذاری اور تفننِ طبع کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں۔" مولانا کے پڑھانے کا طریقہ پرانا تھا وہ بالکل معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے اس قسم کے آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے استادوں کے ساتھ اپنی طالب علمی کے زمانے میں رکھے تھے۔

مولانا احسن مرحوم جس طرح خوش پوشاک تھے اسی طرح خوش خوراک بھی تھے اور اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا۔ اسی طرح انھیں چائے سے بھی عشق تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانا تھا اور اسی شوق نے انھیں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آموں سے بھی اسی طرح رغبت تھی۔ گو آم کھانے سے ان کے سارے جسم پر پھنسیاں نکل آتی تھیں مگر فصل بھر دونوں وقت کھانے کے بعد آموں کا ہونا لازمی تھا۔

ایک مرتبہ میں پوری بیں مشاعرہ تھا۔ مارہرہ سے پوری ایک لاری بھر کر لوگ مشاعرے کی شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ مولانا بھی ہم سفر تھے راستے میں شکارپور پر لاری ٹھہری۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا مولانا نے کسی سے کہا "جاؤ کھانا لے آؤ" جو شخص کھانا لینے گیا وہ صرف اپنے اور مولانا کے واسطے کھانا لیکر واپس آگیا۔ مولانا نے پھر دوسرے آدمی کو بھیجا۔ وہ صرف اپنے واسطے کھانا لے کر واپس آگیا۔ مولانا کو غصہ آگیا۔ گھبرا کر لاحول پڑھی اور کہنے لگے "شکارپور

---

[1] اس مشاعرے میں سائل دہلوی بھی موجود تھے۔

[2] یہ واقعہ بھی رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے جس کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔

آکر سب شکار پوری ہو گئے میں خود جاتا ہوں" اور روانہ ہو گئے تھوڑی دیر میں پورے اٹھارہ آدمیوں کے لئے کھانا لدوا کر لے آئے اور یہ بھول گئے کہ تین اشخاص کا کھانا پہلے بھی آ چکا ہے۔ سب دل ہی دل میں مسکرا کر چپ ہو گئے مگر کسی کی ہمت نہ پڑی جو مولانا کا جملہ خود انہی پر دہرا سکتا۔

مولانا کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں داغ کے شاگرد ہوئے اور اپنی غزلیں بغرض اصلاح انھیں بھیجتے رہے۔ ۱۸۹۶ء میں اپنی غزلیات کا پہلا مجموعہ "ریاض سخن" کے نام سے شائع کیا اور اس کو نواب صاحب ٹونک کی خدمت میں پیش کر کے داد تحسین حاصل کی۔ نواب صاحب نے بعد میں اس کا نام بدل کر "ریاض سخن" کی بجائے "ریاض خلیل" رکھ دیا۔

اس بات کو دنیا جانتی ہے کہ احسن مرحوم نے جو وقت اپنے استاد کے ساتھ حیدر آباد دکن میں گذارا وہ ان کی زندگی کا کسقدر اہم دور ہے۔ ان کی شاعری پر داغ کا کسقدر اثر ہے اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

کسی کو بھیج کر خط ہائے کیسا یہ عتاب آیا
کہ ہر اک پوچھتا ہے "نامہ بر آیا، جواب آیا"
تجھکو اے پیماں شکن پاس وفا کچھ بھی نہیں
بار ہا تو نے کہا سب کچھ، کیا کچھ بھی نہیں
کوئی دیکھے یہ تماشائے تکلف کب تک
ہو چکا پردہ بس اب آؤ ادھر دیکھ لیا
لائے ہو جنازہ تو مجھے دفن بھی کر دو
اٹھے ہیں جہاں چار قدم ایک قدم اور
ڈوبی ہوئی نبضیں ہیں تو اکھڑی ہوئی سانسیں
کر لیجئے بیمار سے باتیں کوئی دم اور

اس اثر کو مولانا نے خود ہی ایک شعر میں باندھا ہے ؎

طرز چھپتی ہی نہیں داغ کے شاگردوں کی
احسن اوروں سے الگ ان کی زباں ہوتی ہے

داغ کا اثر نہ صرف ان کے شاگردوں تک محدود رہا بلکہ مولانا احسن کے شاگردوں تک نظر آتا ہے۔ اپنے استاد کی طرح مولانا کے بھی شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا اور سب میں تقریباً وہی رنگ پایا جاتا ہے۔

؎ گھر گھر مرا چرچا ہے در در مری رسوائی — کہتا ہے کوئی وحشی کوئی مجھے سودائی (صدیق)
؎ آتا نہیں یقین کہ جا ہو گئے تم ہمیں — اچھا ذرا دکھاؤ تو جا ہت نباہ کے (اختر)
؎ سوچ کیا ہے قتل میں ٹوٹی ہو شمشیر بھی — تم اگر بھولے ہو مجھ سے پوچھ لو تقصیر بھی (منظر)
؎ اٹھتا نہ مجھ سے تجربہ الزام زندگی — اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہو سکا! (ابر)

احسن کو داغ کی صحبت میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی سوانح حیات کو ترتیب دینے کا کام انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ استاد کے نام اور کلام کو چمکانے میں صرف کر دیا۔ داغ کی شاعری سے جس طرح وہ واقف تھے کسی اور شخص کا ہونا ناممکن ہے۔ داغ پر گو شاعر تھے۔ ان کا پورا کلام چار ضخیم دیوانوں میں مرتب ہوا ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کلام سے ایک اچھا انتخاب کیا جائے اور یہ کام بھی مولانا

احسن نے ہی کیا۔ داغ کی زندگی میں احسن ہر چیز میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے انکی زیادہ تر اصلاحات حضرت احسن کے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اکثر خطوط کا جواب بھی آپ ہی دیا کرتے تھے۔ داغ کو خود بھی اس چیز کا اعتراف تھا اور انھوں نے احسن مرحوم کو اپنے ایک شعر میں اس طرح یاد کیا ہے۔

سیداحسن جو میرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جنکو اللہ نے دی فکر رسا، طبع رسا

مولانا زود گو شاعر تھے اور شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں آمد کم اور آورد زیادہ تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر عالم میں شعر کہہ سکتے تھے "وہ فکر کرتے تھے مگر ان کی فکر پریشان حال شاعروں کی طرح نہ تھی۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے، علمی و ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے مگر فکر شعر سے کبھی خالی نہیں رہتے تھے۔" جس زمانے میں وہ "شاہکار عثمانی" مثنوی تیار کر رہے تھے ان کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کی شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلباء اور دوستوں سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ اس مثنوی کے لکھنے میں مشکل سے تین یا چار دن صرف ہوئے ہونگے۔

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ دراصل اس پابندئ اوقات میں ان کے پرانے ملازم علیم اللہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علیم اللہ خود گھڑی کی سوئی ہے۔ علیم اللہ سے مولانا کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور آخیر میں انھوں نے اس کی بہن سے نکاح بھی کر لیا تھا جس سے ان کے ایک صاحب زادے[2] بھی تولد ہوئے جو حیات ہیں مگر چونکہ انھوں نے اپنے خاندانی وقار کو قائم نہیں رکھا اس لئے احسن مرحوم ان سے ہمیشہ ناراض رہتے تھے۔

۱۹۳۲ء[1] میں رسالہ "ریاست" نے مختلف مشہور شاعروں سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے روزآنہ مشاغل کے بارے میں کچھ تحریر کریں۔ اس درخواست پر بہت سے شاعروں نے اپنے مشاغل کو نظم کر کے بھیجدیا تھا۔ مولانا احسن نے بھی اسی درخواست پر حسب ذیل غزل لکھی تھی ؎

کیوں پوچھتے ہو کوئی احسن کے مشاغل — کیا حسن عمل دفتر عصیاں میں ملے گا
اوقات نہیں پابند روابط حالات ہیں بے ربط — ہر وقت وہ فکر و غم دوراں میں ملے گا
اس پر بھی اگر آتش کسی کو تو دوستو سنئے — آوارہ دنیا کے بیاباں میں ملے گا
یا صبح کو ہوگی [illegible] — یا خلوت کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا
جب تک نہ بجے دو پہر [illegible] — ڈھونڈو گے تو وہ اطفال دبستاں میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک — سویا ہوا بیٹھا ہوا ایواں میں ملے گا
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک — مشغول ملاقات عزیزاں میں ملے گا
ہوگی پس مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر — پڑھتا ہوا کچھ بزم شبستاں میں ملے گا

---

۱ دکن کے ایک اخبار میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ نواب حیدرآباد دکن کے چھوٹے بیٹے کی [illegible] و فات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے [illegible] نواب حیدرآباد کے [illegible] تھے۔ مولانا نے انہی مضامین کو مثنوی کے پیرائے میں نظم کیا ہے۔

۲ ان کا نام [illegible] ہے۔

ہوگا انھیں اوقات میں جو وقت میسّر — سرگرم عمل شعر کے میداں میں ملے گا
جب تا بہ کمر زلفِ شب آئیگی تو اس کو — پہلوئے سکوں ۔ خواب پریشاں میں ملے گا

الغصہ جو ہے آج یہاں محو تکلّم !
لب بستہ وہ کل شہر خموشاں میں ملے گا

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسی ردیف قافیئے میں حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی غزل کہی تھی جو مقبول عام ہے ۔

مولانا کو مشاعروں کا بڑا شوق تھا ۔ بڑے تکلف سے ان کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء مہمانوں کی خاطر مدارات اس طرح کرتے تھے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب ہو رہی ہے ۔ مشاعروں میں اپنی غزلیں نہایت فصاحت سے زور دے دے کر پڑھتے تھے ۔ ایک دفعہ مارہرہ کے چھوٹے سے اسکول[1] میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی ۔ مولانا مرحوم اس کی صدارت فرما رہے تھے ۔ حاضرین میں زیادہ مجمع اسکول کے طلباء کا تھا ۔ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا اور مشاعرے میں موجود تھا ۔ شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے کے شوق میں میں نے بھی اپنے نانا سے غزل لکھوا کر پڑھی تھی ۔ جب لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے تو حضرت احسن نے اپنی غزل سنائی جو بالکل اسکول کے لڑکوں کے لئے لکھی گئی تھی ۔ لڑکے چیخ چیخ کر انھیں داد دے رہے تھے ۔ مولانا جوش میں آکر مسند سے آدھے کھڑے ہو ہو جاتے تھے ۔ اس غزل کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے ؎

حکّام بلائیں تو اندھیرے ہی سے اٹھ جائیں
اللہ بلائے تو سویرا نہیں ہوتا !

لڑکوں کی شوخی بہت بڑھ گئی اور وہ ناراض ہو کر مسند سے کھڑے ہو گئے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا ۔ وہ کہا کرتے تھے " اس طرح کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد میں عہد کر لیتا ہوں کہ اب آئندہ کبھی مشاعرے میں شرکت نہیں کرونگا مگر میرا یہ عہد بالکل اس حاملہ عورت کا سا ہوتا ہے جو دردِ زہ کی تکلیف میں مبتلا ہو کر ہمیشہ عہد کرتی ہے کہ آئندہ پھر بچہ نہیں جنے گی مگر تکلیف رفع ہونے کے بعد اپنے عہد کو بالکل بھول جاتی ہے "۔

احسن مرحوم کا ادبی مذاق ستھرا تھا اور وہ فن شعر گوئی سے گہری واقفیت رکھتے تھے ۔ جس پر کثرت مطالعہ سے برابر جلا ہوتی رہتی تھی ۔ کتابوں سے انھیں عشق تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی کتابیں دوسروں کو عاریتاً دیتے میں بھی تکلف کرتے تھے ۔ کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں انھیں روحانی لذت حاصل ہوتی تھی ۔ قدیم اور جدید مصنفین اور مولفین کی بیشتر تصانیف مولانا کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں ۔ مولانا کو اگر پتہ چلتا کہ شعر و ادب اور تاریخ زبان پر کہیں کوئی کتاب نئی لکھی گئی ہے تو انھیں اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک اس کا مطالعہ نہ کر لیں ۔ ان کی وفات کے بعد انکے صاحبزادگان نے وصیت کے مطابق ان کی تمام کتابیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے کو دے دیں ۔

مولانا نہ صرف شاعر ہی تھے بلکہ نثر میں بھی انکی خدمات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں ۔ اسکول اور کالج کے بیسیوں انتخاب مولانا کے قلم کے ہی رہین منت ہیں نثر میں انکا سب سے بڑا کارنامہ کلیات ولی کا دیباچہ (جس کی ضخامت ۹۰ صفحات ہے) تاریخ نثر اردو موسوم بہ منثورات اور منتخب داغ انکا مقدمہ ہے ۔

جناب مبشر علی صاحب صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں کلیات کے بارے میں لکھا ہے کہ " یہ تحقیق کا راستہ اتنا دشوار گذار ہے کہ یہاں چلا کا سے پہاڑ کی راہ دشوار کہا جاتا ہے اور مولانا ستر برس کلیات مرتب کرنے میں کہیں جگہ لغزشیں ۔ نہ ہوں یہ نہیں مگر انکے کارنامے پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا "

---

[1] مارہرہ اسکول کا نام مارسٹن اسکول ہے [illegible]

علاوہ ازیں احسن مرحوم نے ایک اور دلچسپ سلسلہ "داغ و احسن" کے نام سے شروع کیا تھا مگر اس کام کی ابتدا بہت دیر سے ہوئی اور اسی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اسی طرح مولانا نے ایک لغت کی ترتیب بھی شروع کی تھی جسکا نام "فصیح اللغات" رکھا تھا افسوس کہ وہ بھی نا مکمل رہ گئی مولانا نے اپنے مذہبی خیالات کو پہلی دفعہ کتابی صورت میں اپنی وفات سے تقریباً دو سال قبل شائع کیا تھا۔ اس کا نام "کارنامۂ عمر" ہے اور اس سے ۱۳۵۷ء کے اعتقادات بھی مستخرج ہوتے ہیں۔ مولانا نے تھوڑے عرصے لاہور میں لالہ سری رام۔ ایم اے کے ساتھ خمخانۂ جاوید کے ادارے میں بھی کام کیا اور خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد کی ترتیب و تدوین میں بھی شامل تھے۔

احسن مرحوم صاحب طرز نہ تھے مگر ان کی تحریر سلجھی ہوئی، رواں اور شگفتہ ہوتی تھی وہ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ استعمال کر کے پڑھنے والوں پر خواہ مخواہ اپنی قابلیت کا رعب ڈالنا نہ چاہتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

"نیچرل شاعری کے حامی جو ہماری پرانی شاعری کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کند چھری سے ذبح کر رہے ہیں ان کو چند داؤں بہت رواں ہیں۔ اور جہاں کہیں اس قسم کی بحث چھڑتی ہے تو وہ یا تو گل و بلبل کی داستان پارینہ کے بار بار دہرانے کے شاکی ہوتے ہیں یا کمر و دہن کی فرضی تشبیہوں پر منہ آتے ہیں۔"

"مولانا عبد الحق کی طرح احسن مرحوم نے بھی اپنی نگارشات میں ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کئے ہیں۔" ان کی خوبیوں میں ان کا املا بھی شامل ہے جس پر انھوں نے ہمیشہ خاص توجہ دی۔

مرحوم کی مالی حالت کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں تھی اور بسا اوقات انھیں مجبوراً اپنی تصانیف کو فروخت کرنا پڑا۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں بریلی تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ان کی پیٹھ پر پھنسیاں نمودار ہوئیں انہی پھنسیوں نے آگے چل کر کاربنکل کی صورت اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ علی گڑھ سے مارہرہ منتقل ہو چکے تھے۔ بغرض علاج اپنے بیٹے کے پاس علی گڑھ گئے۔ جب وہاں کچھ افاقہ نہ ہوا تو اپنے دوسرے بیٹے کے پاس جو پٹنہ میں ڈاکٹر تھے بغرض علاج پہونچے مگر ان کی ساری پیٹھ پر ایک پھوڑا بن چکی تھی جسکا اچھا ہونا ناممکن تھا۔ وفات سے ایک روز قبل بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ آخیر میں گردوں نے اپنا فعل بند کر دیا تھا۔ مرنے سے ذرا دیر پہلے آنکھیں کھولیں اور اسی بدحواسی کے عالم میں پوچھا "کس پر مضمون لکھا جا رہا ہے؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی نعش مارہرہ لائی گئی اور انھیں ان کے بزرگوں کی برابر خانقاہ "درگاہ" میں دفنا دیا گیا۔

کر دیا خاموش لیکن آج اس کو موت نے
آہ جو احسن جہاں میں یادگار داغ تھا

۱

دیا نرائن نگم

ثاقب کان پوری

جس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا سر سید کے بغیر اور اُردو کے تحفظ کا کوئی تذکرہ عبدالحق کو علحدہ کرکے نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اُردو کی ادبی صحافت کا تصور منشی دیا نرائن کے بغیر ممکن ہی نہیں، عہد حاضر میں حسرت موہانی مرحوم اور منشی دیا نرائن نگم نے کان پور کی تجارتی فضا کو بہت کچھ ادبی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دیا نرائن نگم کی شخصیت تو کتنے ہی ادیبوں کے لئے کعبۂ مقصود تھی وہ یہاں طواف کرنے آئے یا پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے، درگا سہائے سرور، پیارے لال شاکر، منشی پریم چند، نوبت رائے نظر، احسن سنبھلی، ان سب سے کان پور کو دیا نرائن نگم کی وجہ سے قربت رہی۔

منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۲۲ء میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب میرے عزیز و محترم دوست جگر مرادآبادی کی شاعری اور خوش نوائی کا ادبی حلقوں میں نیا نیا چرچا ہوا تھا، ان کی رندی و سرمستی نے ادبی حلقوں کو تو چھوڑیئے، خانقاہوں، مدرسوں، ندوۃ العلماء اور سید سلیمان ندوی کے دل و دماغ میں بھی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جگر صاحب منشی دیا نرائن نگم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے جناب کرشن سہائے صاحب وحشی کان پوری، استاذی مولانا احسن سنبھلی مرحوم، مولانا محمد حسین محوی اور ان کے وسیلے سے مجھے بھی بلایا کہ آکر اس نئے شاعر سے مل لو، جگر صاحب سے بھی ملنے کا مجھے اشتیاق تھا اور منشی صاحب کو بھی دیکھنے کی تمنا تھی کیوں کہ وہ زمانہ میری ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیا ادیب بڑے، ممتاز اور مشہور ادیبوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کتنا بیتاب رہتا ہے۔ میں وحشی صاحب کے گھر پہنچا، بڑی خندہ پیشانی سے ملے، جگر صاحب سے تعارف ہوا اور پھر جگر صاحب نے ایک غزل پڑھنی شروع کی، "دل میرا" اور "حاصل میرا" ایک تو ان کے کلام کی گرمی اور دوسرے ان کے پڑھنے کا انداز، وحشی صاحب کرسی سے اتر کر فرش پر لوٹنے لگے، یہ بڑے صاحب دل بزرگ ہیں اور محفل شعر کو بس ایک لمحے میں بزم قوالی میں بدل دیتے ہیں، پھر یہ سب کچھ بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے، وہ مردانِ غوغا، کشتگانِ عشق اور قبیلۂ نظیری میں سے ایک ہیں، جگر صاحب غزل پڑھ رہے ہیں، وحشی صاحب آنکھیں بدلے ہوئے فرش پر لوٹ رہے ہیں اور نعرے بلند کر رہے ہیں عجیب منظر تھا وہ بھی، منشی صاحب پریشان ہو گئے، میری طرف دیکھا، میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں وہ حال میں ہیں اور یہ کوئی مرض نہیں۔"

وہ یوں مسکرائے جیسے مطمئن ہو گئے ہوں"۔ جب جگر صاحب کی غزل ختم ہوئی تو وحشی صاحب پھر اسی دنیا میں لوٹ آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

یوں منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات ہوئی، لیکن اس ملاقات میں اُن سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ جگر صاحب کا ترنم اور وحشی صاحب کا حال ہمارے درمیان حائل ہو گیا لیکن میں نے اُن کے متعلق رائے ضرور قائم کی اور مجھے زندگی بھر اس رائے پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اُردو زبان تو برِّصغیر کی بہترین روایات کا سنگم ہے ہی لیکن کچھ افراد بھی ایسے ملتے ہیں جو ہماری مشترکہ روایات کے امین ہوتے ہیں۔ دیا نرائن نگم بھی اُن میں سے ایک تھے، وہ قیامت کے وضع دار تھے۔ جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور پھر میں نے ہمیشہ انہیں اسی لباس میں دیکھا۔ لباس کی یہ وضع داری ممکن ہے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن میرے خیال میں تو یہ کردار کی پختگی کی علامت ہے، داخلی شخصیت کا ایک اہم خارجی عکس۔ چشمے کے پیچھے دیا نرائن نگم کی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ یہ مسکراہٹ اور ہونٹوں کا تبسم ہی اُن کی گفتگو تھا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے ڈبے سے پان نکال کر مجھے دیا اور بعد میں جب بھی ہم ملے اس رسم میں کبھی فرق نہ آیا۔ بے تکلفی میں بے تکلف ان کی وضع تھی۔

[illegible] ملاقات کا ذکر [illegible] اس ملاقات کے بعد میں کئی بار [illegible] سے ملنے گیا۔ ۱۹۲۴ء میں میرے اُستاد حضرت احسن [illegible] "زمانہ" میں ملازم ہو گئے اور پھر تو تقریباً ہر دن "زمانہ" کے دفتر میں میرا آنا جانا ہو گیا۔ نگم صاحب سے بھی روزانہ کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ "زمانہ" کا معیار وہ ہمیشہ بلند تر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ انہیں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہ تھی۔ یہ بھی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اسی لئے وہ اُردو کے کسی ممتاز صاحبِ قلم کو ہمیشہ ادارۂ "زمانہ" سے متعلق رکھتے۔ کم لوگوں کو شاید یہ بات معلوم ہو کہ درگا سہائے سرور جہاں آبادی [illegible] اور نوبت رائے نظر وغیرہ "زمانہ" کی ترتیب میں نگم جی کے معاون رہے [illegible] کے بعد احسن لکھنوی اور یعقوب کلام [illegible] "زمانہ" کی ترتیب دیتے رہے۔

[illegible] نگم جی کے مکان [illegible] کو چلتے تھے [illegible] کام بڑی پابندی سے کرتے تھے اور اس زمانے میں بھی وہ میز کرسی پر بیٹھ کر [illegible] کام کیا کرتے تھے [illegible] دیکھتے تھے اور نگم صاحب ادیبوں کو خود ہی خط لکھتے اور خطوں کے جواب دیتے۔ مضمون لکھنے سے [illegible] لکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خلوص کسی ادیب یا پیغمبری [illegible] ہماری اور [illegible] نظر آتی ہیں۔ اسی لئے اُردو کے تمام [illegible] صاحب [illegible] کر رہے ہیں۔ [illegible] زیادہ عرصے تک [illegible] نہ سکتے تھے۔ [illegible] اور بزرگوں کو میں نے بلایا، نگم صاحب کو نہ بلا سکا۔ [illegible]

عزیزی ثاقب صاحب

آپ [illegible] میں آپ کا ممنون ہوں۔ [illegible] میں اب لکھوں تو کیا لکھوں، ڈاکٹر [illegible] اور آپ نے مجھے بھی نہ بلایا [illegible] جتنے آپ کو نظیری کا ایک شعر سنا دوں۔

[illegible]

[illegible] ضرورت ہے۔

آپ خانقاہ میں رہتے ہیں اور خانقاہوں کے دروازے کبھی فقیروں پر بند نہیں ہوتے۔ شاید اب رسم و رہ خانقاہی بدل گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے اطلاع دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔

دعاگو

دیا نرائن

اِن چند سطروں میں تعلقات، خلوص، طنز اور شکایت کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ نگم صاحب خطوں میں اُردو اور فارسی کے اشعار برجستہ لکھتے تھے اور بڑے مناسب موقعوں پر۔ مگر عام طور پر شعر ناموزوں پڑھتے تھے۔ تلفظ کا بھی کچھ ایسا ہی حساب تھا۔ وہ کئی الفاظ بہت غلط بولتے تھے جیسے شناس شناش کو شناش شناش کہتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کرشن سہائے وحشی کے مکان پر پریم چند، آنجہانی، اصغر گونڈوی مرحوم، منشی عبدالصمد بزمی اور احسن مرحوم وغیرہ سب موجود تھے۔ نگم صاحب درگا سہائے سرور کا ذکر کرنے لگے۔ وہ اپنی شعر خوانی میں انہوں نے جہناجبہنا [illegible] سے اور ذکر [illegible] بدل دیا [illegible]۔ لیکن نگم صاحب سے کون کہتا۔

دیا نرائن نگم کو زمانہ سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ یہ رسالہ اُن کی زندگی کا مقصد بھی تھا اور حاصل بھی [illegible] عام طور پر انہیں زمانہ کا بانی سمجھا جاتا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ گورمنٹ ہائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب نے [illegible] ۱۹۰۳ء میں زمانہ کا اجرا کیا تھا۔ جب وہ کانپور سے کلکتے جانے لگے تو یہ رسالہ نگم صاحب کے حوالے کر گئے اور انہوں نے زمانہ کو زندہ تر بنا دیا۔ دیا نرائن نگم آنجہانی کے والد کچہری میں پیشکار تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن نگم صاحب نے [illegible] بیٹے کو اچھا سمجھا وہ ادبی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔

زمانہ کے علاوہ انہوں نے ہفت روزہ آزاد بھی نکالا جو تقسیم ہند کے بعد تک جاری رہا۔ آزاد ۱۹۱۳ء میں جاری ہوا۔ اس کے [illegible] کی تحریک مسجد مچھلی بازار کی شہادت سے ہوئی۔ دیا نرائن مسلمانوں کو اُن کا حق دلانا چاہتے تھے۔ انہوں نے [illegible] شہنشاہیت کی سنگینوں سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ سچے نیشنلسٹ تھے۔ گاندھی جی کے بڑے معتقد، کانگرس کی تحریک کے حامی [illegible] ہندوستانی [illegible] زمانہ کا [illegible] ہندو مسلم اتحاد [illegible] کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء کی بات ہے میں نگم صاحب سے ملنے اُن کے دفتر گیا۔ احسن صاحب اس زمانے میں زمانہ کو مرتب کر رہے تھے۔ اس وقت [illegible] احسن صاحب اور نگم صاحب میں بحث ہو رہی تھی [illegible] زمانہ کا [illegible] نمبر نکالا جا رہا تھا اور احسن صاحب اس تجویز کے خلاف تھے۔ ان کی یہ رائے تھی کہ زمانہ کو خالص ادبی پرچہ رہنا چاہئے۔ نگم صاحب کہنے لگے: مولانا زمانہ کے اندر کیا چکبست اور اقبال کی شاعری کو آپ کیا نہیں کہیں گے۔ ان کے یہاں کیا نہیں ہے۔ فلسفہ، مذہب، مسائل، مسلمانوں کا اتحاد، ہندوستان کی آزادی [illegible] ادب زندگی سے الگ کس طرح ہو سکتا ہے۔ پریم چند کے افسانے تو آپ بڑھ پڑھتے ہیں [illegible] میں زمانہ میں سیاست، آرٹ، موسیقی، رقص، مذہب، تاریخ اور سب ہی موضوعات پر [illegible] آپ دیکھ لیجئے گا آئندہ ادبی پرچے ایسے ہی ہوں گے اور پھر لوگ نہیں کہیں گے۔ اس بات کی ابتدا زمانہ سے ہو [illegible] نمبر ضرور نکلے گا۔ دیکھئے میں فیصلہ تو [illegible] پر چھوڑ دیں۔ نگم صاحب تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے اور یہ کہ فیصلہ خود ہی کر دیا کہ [illegible] نمبر ضرور نکلے گا۔ وہ فیصلہ ثاقب صاحب پر [illegible] شور [illegible] تھا۔ نگم صاحب کے فیصلے پر میری بات کا کیا اثر ہوگا۔ اور احسن صاحب میرے استاد ہیں۔ کچھ [illegible] نے کہا کہ احسن صاحب نے آپ کی مخالفت کی۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ آپ آزاد بھی نکالتے ہیں اور زمانہ بھی [illegible] کے لئے آزاد کے صفحات موزوں ہیں اور اگر زمانہ قومی نمبر نکالے تو ادبی شان کا معیار [illegible] علمی انداز کے مضامین لکھے

جائیں، قومی تمدن اور زبان کے مسائل پر غور کیا جائے، وطنی نظمیں شامل ہوں ۔۔۔ آپ نے احسن صاحب کی پوری بات تو سُنی ہوتی، وہ یہی کہنے جا رہے تھے، میں اُن کا شاگرد ہوں اس لئے بہت کچھ تمہید سے سمجھ جاتا ہوں۔ یوں میری جان چھوٹی۔ احسن صاحب خوش ہو گئے، کہنے لگے، جی ہاں یہی میرا مطلب تھا ورنہ زندگی سے تو بہروپیوں کو بھی نجات نہیں ملتی، مگر جان کہاں چھوٹی وہ تو محض میرا گمان تھا، نگم صاحب بولے "ٹھیک ہے ٹھیک ہے تو چلئے ابھی کام شروع کر دیں، میں ہندوستانی زبان پر مضمون لکھنا شروع کرتا ہوں اور آپ دونوں نظمیں لکھیں ابھی اسی وقت" دوسرے لمحے ہم دونوں سادے کاغذ لئے بیٹھے تھے۔ نگم صاحب بیچ بیچ میں بول اُٹھتے، "بھئی آپ دونوں مولوی ہیں ذرا مذہبیت نہ ہو، قومیت کا مذہبیت سے کوئی تعلق نہیں۔ سمجھے احسن صاحب" احسن صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے وہ یہی کہتے "واہ صاحب تعلق کیسے نہیں، مسلمان جغرافیائی حدود کا قائل نہیں ہوتا" آخر جب نگم صاحب مولانا احسن کو قائل نہ کر سکے تو کہنے لگے "یار میرے دوستوں کی پاس داری بھی کوئی چیز ہے، میری ہی خاطر کچھ اشعار لکھ دو" پھر نگم صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ "دیکھئے آپ اپنی نظم میں حالیہ سیاسی بیداری کا ذکر ضرور کیجئے گا اور ہاں مرکزی خیال کیا ہوگا آپ کی نظم کا" میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا کہ نگم صاحب مجھے آپ یوں کوئی ہدایات نہ دیجئے، مجھے وطنی نظم لکھنی ہے سو لکھ دوں گا۔ میں نے کاغذ پر یوں ہی لکیریں کھینچنی شروع کر دیں، نگم صاحب خاموش ہو گئے اور میں نے بھی دیر تک اُن کی طرف نہ دیکھا، کچھ دیر کے بعد میں نے اپنے کاندھے پر دباؤ سا محسوس کیا، نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ نگم صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں اور پان اُن کے ہاتھ میں ہے ۔۔۔

لو پان کھا لو ——— میں شرمندہ ہوں، یہ بھی تو بھول گیا تھا کہ تم صرف میرے دوست اور عزیز ہی نہیں شاعر بھی ہو، شاعر بڑا حساس ہوتا ہے، ایک رسالے کے ایڈیٹر کو تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے۔"

کتنی نرمی کے ساتھ وہ کیا کچھ کہہ گئے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا، دوست، شاعر، ایڈیٹر، حساس یہ سب باتیں مجھ پر ہنسنے لگیں، وہ مسکرا رہے تھے اور میں انہیں بس دیکھ رہا تھا اور چپ تھا۔

پان کیوں نہیں کھاتے ——— ارے پان نہ کھاؤ مسکرا ہی دو ——— اور میں مسکرانے کی جگہ ہنس پڑا۔

"تم نے کتنے شعر کہے"

میں نے پوری نظم لکھ لی ہے۔

سچ۔

"سچ" "اور آپ کا مضمون ہو گیا"

——— ہاں سُرخی لکھ لی ہے ——— "اپنی نظم سناؤ"

"اس میں حالیہ سیاسی بیداری"

"پھر وہی باتیں"

میں کہہ رہا تھا کہ اس میں حالیہ سیاسی بیداری کا بھی ذکر ہے ——— یہ دیکھئے

محو کر دے اپنی پیشانی سے داغِ عبدیت
پھر دکھا دے اہلِ دُنیا کو طریقِ حریت

پھر بلندی پر ہو تیرا پرچمِ حسنِ عمل
تیری آواز صداقت بھی سہا آوازہ ہو

"بہت اچھے" بہت اچھے ——— چلو تم نے نظم لکھ دی ——— اگر اب بھی ناراض ہو تو کوئی پروا نہیں۔

"آپ مسرور ہیں نگم صاحب کتاب اور مولی تراں کرتے ہیں" ——— اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں نے یہ واقعہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے لئے میں اپنے پڑھنے والوں سے شرمندہ نہیں ہوں ——— کیونکہ اس واقعہ سے نگم صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آجاتے ہیں ——— پہلی بات۔ کہ وہ اپنے زمانے سے کس قدر آگے سوچ رہے تھے، یا اتنا تو آپ کم سے کم مانیں ہی گے کہ ادب اور زندگی کے تعلق کا انہیں کتنا واضح احساس تھا۔ یہ واقعہ ترقی پسند تحریک کی ابتداء سے بہت پہلے کا ہے ——— دوسری بات یہ کہ اُن کا نظریۂ صحافت کس قدر صحت مند اور انقلاب آفریں تھا، تیسری بات یہ کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کس قدر فعال اور سرگرم تھے، ذرا سی تاخیر کے روادار نہ ہوتے تھے اور ان سب باتوں سے بڑی بات ان کی دوستی اور دوست نوازی ——— [illegible] بات اگر [illegible] مضمون پر انہیں ناز [illegible] اپنا حق سمجھ جاتے یا لیتے ——— اور ان کے انداز کے قائل تھا، ایک ایسا [illegible] رشتہ ——— ہم سب [illegible] لئے کہ کسی بات سے انکار ہی نہ پڑتا تھا ——— یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ نگم صاحب کا طنز کتنا شیریں اور چٹیلا ہوتا تھا ——— نرم انداز کی [illegible] کا طنز دیتے تھے۔ یہ [illegible] اُن کی گفتگو اور خطوط ہی میں ملتی ہے [illegible] مضامین میں [illegible] اس کا پتہ نہیں۔

اس واقعہ کے تین چار دن کے بعد جب میں گیا تو کہنے لگے کہ لو بھئی قومی نمبر کے لئے میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ لیا ہے [illegible] ایک زبانوں کے متعلق اور دوسرا قومی زبان کے بارے میں [illegible] ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، قومی زبان سے [illegible] مضمون [illegible] کا [illegible] کیوں دلچسپی نہیں، ہندوستان کی [illegible] آبادی [illegible] مجھے [illegible] دلچسپی [illegible] سے نفرت ہے [illegible] آپ رہتے ہیں [illegible] شاعر [illegible] اور صاحب کے [illegible] نہیں [illegible] شمار کرتے ہیں اور [illegible] نفرت [illegible] کا ذکر کیا [illegible] اختر شماری تو برائے شعر گوئی خوب است، ویسے تو میں ختم شماری [illegible] انہوں نے [illegible] اپنا مضمون [illegible] کے قومی [illegible] پر جس انداز سے [illegible] اس کی بنا پر آج بھی یہ مضمون ہمارے فکر و عمل کا مستحق ہے [illegible] انتظام تعلیم اور قومی زبان کی حیثیت ان سب چیزوں پر [illegible] اچھے مشورے دیئے [illegible] لیکن مجھے ان سے بنیادی اختلافات تھے۔ انہوں نے اُردو کی جگہ ہندوستانی لکھا اور اردو ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا، ہندی رسم الخط کی [illegible] اور اُردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیا۔ ہمارے درمیان ذرا تیز قسم کی گفتگو ہوگئی میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ پھر آپ [illegible] کی خدمت کا دعویٰ [illegible] اُردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیتے ہیں تو گویا [illegible] زبان اور ہندوستانی مسلمانوں [illegible] اس [illegible] بہت [illegible] گئے [illegible] پھر ایک دن وہ خود ہی آئے اور ہم دونوں یوں باتیں کرنے لگے گویا کوئی بات [illegible] ہی نہ ہوئی [illegible] اُٹھتے بیٹھتے [illegible] دل [illegible] دوست [illegible] صحیح سمجھتا ہوں۔

نگم صاحب [illegible] اور مجھ سے ناراض ہو گئے تھے [illegible] کے متعلق [illegible] محترم اثر لکھنوی کا [illegible] مضمون [illegible] شائع ہوا تھا جب میں نے جامعہ ملیہ کے لئے [illegible] کو [illegible] مضمون [illegible] حقیقتوں کو زمانے [illegible] کئے بغیر دیباچے کے طور پر شائع کر دیا تھا، انہیں یہ گراں گزرا کہ زمانہ کا حوالہ کیوں نہ دیا اور انہوں نے اس کا اظہار اپنے تبصرے میں بھی کر دیا۔ اُن کی یہ شکایت کچھ ایسی بیجا بھی نہ تھی، جب کہ زمانہ سے انہیں اتنی محبت [illegible] لیکن ایسی باتوں نے ہمارے تعلقات

کو کبھی متاثر نہ کیا۔

یہ ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے کہ میں دوستوں سے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا، نہ خود بتاتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے ـــــ منشی صاحب آنجہانی سے بھی اس قسم کی گفتگو بہت کم ہوئی، اس لئے میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ شوہر کی حیثیت سے کیسے تھے؟ لیکن یہ یقین ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوش گوار ہوگی۔ وہ وسیع القلب تھے اور انسانوں سے بے پایاں محبت کرتے تھے اُن کے پانچ بیٹے ہیں ـــــ بڑے بیٹے سری رائن نگم وکیل ہیں اور والد کے انتقال کے بعد غالباً ۱۹۵۰ء تک زمانہ نکالتے رہے۔ نگم صاحب آنجہانی کو اپنے بیٹوں سے بڑا پیار تھا اور وہ اس باب میں خوش نصیب بھی تھے۔ آج ان کے سب بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک بیٹا آئی سی ایس ہے، دوسرا بیٹا [illegible] ہیں اور تیسرا انڈین پولیس سروس میں ہے۔ یہ چند بکھری ہوئی یادیں ہیں۔ ان میں کوئی منطقی ربط نہیں، اور پھر محبت منطق کی زد سے آزاد ہے۔ آخر میں یقیناً آپ مجھے اس قسم کی رسمی باتیں لکھنے پر مجبور کریں گے کہ منشی دیانرائن نگم بڑے آدمی تھے اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نگم صاحب کے متعلق یہ سب کہنا مجھے بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

سائل دہلوی

مالک رام

نواب سراج الدین احمد خاں سائل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو شنبہ کے دن اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ چونکہ سال ولادت ۱۸۶۸ء تھا، اس طرح عمرِ عزیز ۷۷ برس ہوئی۔ اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ مرحوم مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ بہت دن سے خیال کر رہا تھا، کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن ہائے مکروہات۔ ؎

تجھ کو بھی ہم دکھائیں، کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا، لیکن اسے میری نالائقی سمجھیے یا بدقسمتی، کہ کسی جگہ قدم نہ جم سکے۔ ان ایام میں یہاں دلی میں میرے ایک مہربان تھے، جنہیں اس بات کی بہت فکر تھی کہ کسی جگہ میرے لئے مستقل ٹھکانہ ہو جائے۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں مجھے لکھا، کہ اگر تم یہاں آ جاؤ، تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمہارا انتظام ہو جائے۔ چنانچہ اس بلاوے پر میں یہاں آ گیا۔ یہ دلی میں میری پہلی آمد تھی۔ میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث، مجھے اس عروس البلاد سے جو دلچسپی ہو سکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

ان زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن عزیز دوست جگت سنگھ رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، یوں سمجھیے، کہ دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرس تھے۔ میں انہی کے ہاں اترا۔ دو تین دن کے بعد وہ ایک صبح مجھ سے کہنے لگے۔ تمہیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، کسی دن فرصت ملے تو لال کنویں میں ایک بڑھے نواب صاحب رہتے ہیں۔ سراج الدین خاں نام ہے۔ ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا، کون نواب سراج الدین احمد خاں، وہی تو نہیں جو سائل تخلص کرتے ہیں۔ کہا، ہاں وہی۔ [illegible] اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے ناشتہ کے بعد لال کنویں کی راہ لی۔ ؎

بوقتِ صبح چو مردم بکار و بار روند — بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

جگت سنگھ صاحب کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا، کہ ان کا لوہارو خاندان سے تعلق ہے۔ اس لئے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں

کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں وہ پتا پوچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا جہاں اس خاندان کے مکانات ہیں۔ یہاں میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں [illegible]۔ اس وقت نواب ضیاء الدین احمد خاں عرف نمیر مرزا رخشاں فرزند نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمائیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے جناب نمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا۔ اس نے کہا جناب وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں ہے۔ [illegible] شاید آپ سے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ "جی ہاں" میں سمجھ گیا وہی جو شاعر ہیں اور جن کے [illegible] ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔ آئیے میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کر لال کنویں میں آ گئے۔ لال دروازہ کچھ دور نہ تھا [illegible]۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے وہ سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی کرسی [illegible] کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ "یہ ہے حضور، یہ ہے نواب صاحب کا مکان"۔ اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور [illegible] انتظار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

ملازم کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی [illegible] ملازم کے رہنے کی [illegible] اور یہ جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا تھا [illegible] صحن میں [illegible] گلی تھی جس پر [illegible] تمام مکان [illegible] سے دیکھا کہ مجھے معاً [illegible] یاد آ گیا۔

[illegible] بیٹھک [illegible] جس میں [illegible] کے لیے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ملازم نے [illegible] دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کو میری آمد کی اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے [illegible] دیکھا [illegible] اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج [illegible] اور [illegible] کے قریب [illegible] کرسیاں اور ایک چھوٹی سی [illegible] رکھی تھی [illegible] ایک [illegible] پڑا ہوا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چیز مجھے پسند ہو گی اور کون سی ناپسند۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہیں گے جو میرے خلاف طبع ہو۔ اس دفعہ بھی یہی ہوا۔ میں نے نہیں پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ صرف اتنا کہہ دیا "بہت اچھا"۔ انہوں نے کسی دوست سے گاڑی مانگ رکھی تھی۔ ملازم کو حکم ہوا گاڑی لے آؤ۔ ہم نیچے اترے اور نئی دہلی کے راستے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر پہنچ گئے۔

نواب سائل مرحوم کے خاندان کو بزرگان دین سے جو عقیدت رہی ہے وہ [illegible] ان کے اپنے اجداد میں بھی اولیا اللہ ہو گزرے ہیں۔ قریبی زمانے میں بھی ان کے پردادا نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف جنہیں شاعری میں [illegible] تصوف اور ادب دہلی کے حلقوں میں اس سے کم مشہور نہیں۔ وہ حضرت مولانا فخر الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خود نواب احمد بخش خاں [illegible] اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعہ انہوں نے بھی مولانا فخر الدینؒ کی بیعت کر لی تھی۔ یہ اسی ارادت اور خوش عقیدگی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت خواجہ ضیاء الدین [illegible] کے نام کی رعایت سے غلام ضیاء الدین رکھا۔ جو آسمان علم و ادب پر ضیاء الدین احمد نیر رخشاں بن کے چمکا۔ سائل صاحب بھی حضرت مولانا شاہ [illegible] صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ یہ بزرگوار شاعر بھی تھے۔ مذاق تخلص تھا اور اس فن میں ذوق کے شاگرد تھے۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

میرا سلطان جی میں یہ پہلا پہلا اتفاق [illegible] سب سے پہلے ہم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ یہاں فاتحہ پڑھ کے ہم باہر صحن میں بچھی ہوئی لکڑی کی چوکیوں پر آ کے بیٹھ گئے۔ چند مجاور بھی ہمارے پاس آن بیٹھے۔ وہ نواب صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بھی ایک ایک سے اس کے گھر بار کا حال پوچھتے رہے۔ ایک مجاور اندر مزار پر سے سبز رنگ کے دو چھینٹے لے آیا۔ ایک ایک ہماری ٹوپیوں کے گرد لپیٹ دیا گیا۔ سائل صاحب نے ان سے کچھ سلوک کیا۔ پھر مجھ سے [illegible] دہلی کے مزاروں پر اکثر آتے رہنا چاہیئے۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے اور دل میں [illegible] اہل اللہ پیدا ہوتی ہے۔ افسوس [illegible] مقامات پر اب مجاور ایسے ہیں جنہوں نے [illegible] دوکانداری بنا رکھی ہے۔ لیکن [illegible] ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دل [illegible] انوار سے منور ہیں [illegible]

پہلے تو بہت جی میں آئی کہ ان سے پوچھوں کہ [illegible] مناسب نہ تھا۔ ہمارے ارد گرد بہت لوگ جمع ہو گئے تھے [illegible] جانے اور خاموشی ہی بہتر [illegible] مجھے یقین ہے کہ وہ اسے پوری نہیں تو نیم رضا تو ضرور ہی سمجھے ہوں گے۔

مبادا اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو جائے اس لئے میں ایک اور واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں جس سے ان کے مذہب اور صحابہ مذہب سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

میں ان دنوں [illegible] باغ میں رہتا تھا۔ ان دنوں جامعہ ملیہ کے [illegible] جامع مسجد کے زیر سایہ "خرابات" کا تلازمہ پیدا کرنے کو یہیں سے یہاں کے اکابر کے گھروں میں [illegible] رکھا تھا۔ اور ان اصحاب کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ایک شام میں مکتبہ جامعہ کے مہتمم برادرم حامد علی خاں صاحب سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو رہا ہے۔ [illegible] کے علاوہ باہر کے ایک بہت بڑے عالم اور مصنف بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں ذاتی طور پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ان کی دو ایک جغرافیہ کی [illegible] پڑھ رکھا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تقریباً [illegible] تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ مشار الیہ بزرگوار ایک تقریب کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ [illegible]

میر سرور [illegible] اور بہت [illegible] ہونے کے علاوہ ایک مشہور علمی ادبی مجلے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ کچھ عرصہ پہلے دلی کے ایک [illegible] نوجوان نے ان کی ایک مایہ ناز کتاب پر مخالفانہ تبصرہ لکھ کر ایک [illegible] رسالے کی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس میں ان کی غلطیاں دکھائی گئی [illegible] لیکن اگر

معاملہ یہیں تک رہتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ پھر تحقیق و تصنیف کا میدان تو بہت وسیع ہے خصوصاً جو ان تعلق استنباط اور استخراج سے ہو وہاں تو اختلاف کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر ہمارے ممدوح معاملے کو اسی نظر سے دیکھتے تو کوئی قباحت نہیں تھی لیکن خدا معلوم انہیں کیسے شبہ ہوا کہ اس رسالے کی تصنیف میں ان کے ایک مخالف عالم دین کا ہاتھ ہے جو یہیں دہلی میں رہتے تھے۔ بقول امام شمس الدین ذہبی، دو صاحب سلسلہ شخصیتوں کے لئے ہم عصری بہت بڑا ابتلا ہے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی صحیح قدر و قیمت شناخت نہیں کر سکتے بلکہ بسا اوقات رشک و حسد کے باعث ان میں چشمک بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے چوٹی کے عالموں اور مصنفوں میں سے تھے لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے اشد مخالف۔ چنانچہ جب یہ رسالہ موصوف کے پاس تبصرے کی غرض سے پہنچا تو انہوں نے اپنے مجلے میں اس پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق ہے۔ درحقیقت یہ کتاب کس نے لکھی ہے اور کیوں چھپوائی ہے۔ یہ بھی تشریح ہونا تھا کہ رسالے کے مصنف کا نام جعلی ہے۔

جونہی یہ پرچہ دلی میں پہنچا جس میں یہ تنقید چھپی تھی اس نوجوان مصنف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، عدالت میں ہتک عزت اور ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا کہ فلاں مجلہ کے ایڈیٹر نے میری تصنیفی قابلیت پر حملہ کر کے میری ہتک کی ہے۔ نیز یہ شبہ کر کے کہ میں نے یہ کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہے میری شہرت اور عزت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں معاملہ کس قدر سنگین تھا۔ قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جائے گا اور موصوف کو سزا ہو جائے گی اور ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا اس لئے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگلے دن اسی مقدمے کی پیشی تھی اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر مل چکا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے ان کی تعریف کی اور ان کے والد مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی ان سے اسی طرح مؤدبانہ ملے تھے جیسے ایک خورد اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی روداد سنی تو معاً میرے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی جا کے ان سے ملنا چاہیے تاکہ اگلی صبح عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جا سکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار وہاں دو ایک دوستوں سے کیا تو انہوں نے بھی میری اس تجویز پر صاد کیا اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ غرض کہ میں باہر نکلا اور بائیسکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے ہاں پہنچا ہوں تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جونہی انہیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی فوراً نیچے اتر آئے اور چھوٹتے ہی پوچھا "کیوں خیر تو ہے؟" میں نے کہا "نہیں تو۔ کوئی ایسی بات نہیں۔" کہنے لگے۔ "اب میں یہ تو ماننے سے رہا۔ اس سردی کے وقت اتنی رات گئے قرول باغ سے تمہارا آنا بے سبب تو ہو نہیں سکتا۔" القصہ میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے سارا قصہ بیان کیا تو انہوں نے جو کچھ جواب میں کہا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔ "بیٹا! تم بہت بھولے ہو، تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انہیں اپنے علم کا غرور ہے، انہیں اپنی نمازوں کا غرور ہے، اپنے روزوں کا غرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدے کریں اور ان کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی بھی ہر بات ماننے کو تیار نہیں اور کہہ دیتا ہے، 'ابا جان! یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔' بھلا یہ خلیل آعوذی ملا کیسے توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لے گی۔ تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے باوا میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لئے اچھی خاصی پونجی چھوڑ کر مرے ہیں۔ اس کی عربی اور مذہبی علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوئی ہے اور وہ بودا نہیں۔ مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا لیکن اگر انہوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے، تو اسے بجا طور پر رنج ہونا ہی چاہیے اور اگر انہوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے تو انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہیے۔

جو آگ کھائے گا، انگارے ہگے گا، اگر کوئی اور مجھے اس معاملے میں دخل دینے کو کہتا، تو میں کبھی نہیں مانتا۔ لیکن تمہاری خاطر سے میں اپنی سی کوشش کر دوں گا، آگے جو خدا چاہے۔ کل علی الصباح دفتر جانے سے پہلے آجانا۔ میں تمہارے ساتھ خود اس کے پاس چلوں گا۔

میں نے یہ لمبی داستان صرف اس لئے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے عقائد دینی سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بہت بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے جد بزرگوار کے بعد انہوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہیں عربی علوم یا مذہب سے کچھ ایسی بڑی وابستگی تھی کہ انہیں ان مولویوں کا مدِ مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ سنی خوش عقیدہ تھے اور سب علماء اور اصحاب فضل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدر شناس اور پرستار تھے، وہیں بناوٹ اور طمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت سے مشرف ہو کر باہر نکلے اور پھرتے پھراتے جناب خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی الفت تھی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری کتاب [illegible] جناب خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حسن نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ [illegible] تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور سائل صاحب سے کچھ [illegible] بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف نے [illegible] کے قتل [illegible] کا بہت اشتہار دے رکھا تھا۔ [illegible] ان چیزوں کا ذکر آیا تو حسن نظامی صاحب اپنی دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمارے پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلئے آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے [illegible] کے پاس اس احاطہ میں پہنچ گئے، جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشاندہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی کی ہے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی بخش خاں کی قبر ہے۔ معروف کی بائیں طرف ان کے [illegible] خاں (رام پوری) [illegible] اور ان سے بائیں جانب ان ہی کے صاحبزادے جان بہادر نظام الدین خاں ہیں۔

دلی کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ایک داستان اور ایک تاریخ دفن ہے۔ ہم یہ ہیں اٹھتے بیٹھتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور مشاہیر کی آرام گاہوں سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے تو ڈیڑھ ایک بجے کے لگ بھگ قطب میں [illegible] پر آکے دم لیا۔ یہاں کے انتظام [illegible] میں کچھ [illegible] شمالی برآمدے میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چولھا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے، تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا، کہو میاں بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے؟ حضور وہ اب آنے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ حکم ہو تو چائے تیار کروں۔ نہیں میاں۔ ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت [illegible] [illegible] [illegible] آگئے تو دوسرا دور ہو جائے گا [illegible] تیار کئے دیتا ہوں۔ [illegible] آگ پر رکھا ہی تھا، اس نے پیالے [illegible] چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب [illegible] تو نہیں [illegible] لیکن یہ [illegible] کی [illegible] کردی سے خاصی [illegible] نہیں کر پاتے تھے۔ [illegible] ایک گاڑی [illegible] اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ [illegible] لانبا قد [illegible] بڑی ڈاڑھی، [illegible] زیادہ [illegible] بند گلے کا [illegible] اور ٹخنے گرم پاجامہ۔ سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی۔ [illegible] اور آداب عرض کر کے، نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا، بھائی، میں تم سے اس [illegible] کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند کلمے [illegible] سے فرمایا۔ آپ خان بہادر

حکیم امجد علی خاں صاحب ہیں، میرے بچپن کے لنگوٹیے، بھائی نہیں مگر بھائی سے عزیز تر۔

جن اصحاب نے ذوقؔ کا تذکرہ پڑھا ہے ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویراںؔ کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویراںؔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں، عاشق تھے۔ کیا مجال جو ان کی موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصف مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف کمی رہ جاتی ہے تو اس کی کسر کہیں اور سے پوری کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویراںؔ نابینا تھے مگر بلا کے ذہین اور حافظے کا کیا کہنا، قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوکِ زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انہوں نے تڑ سے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔

ذوقؔ ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے۔ بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوقؔ کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کھچا تھا اسے مولانا آزاد لے کر نکل بھاگے۔ ذوقؔ کے شاگردوں کو قدرتی طور پر فکر ہوئی کہ اگر کلام جلد شائع نہ ہوا تو کل کو کوئی استاد کا نام لینے والا بھی نہیں ملے گا۔ ظہیرؔ اور انورؔ دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویراںؔ کے پاس پہنچے کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ ان ہی کو یاد تھا۔ چنانچہ یہ بولتے گئے اور ظہیرؔ اور انورؔ لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۸۶۰ء میں دیوانِ ذوقؔ کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزاد نے بہت کچھ کتربیونت کر کے، بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے ایک اور دیوان شائع کیا جو اب متداول ہے۔

حافظ ویراںؔ استاد کی زندگی بھر قلعۂ معلی میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد محلہ کشن گنج دہلی میں رہنے لگے۔ ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ "خاک بستۂ خواجہ" تاریخ وفات ہے جو انہوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرونی احاطے کے صدر دروازے سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؂

فاتحہ مرقدِ ویراںؔ پہ بھی پڑھتے جانا　　　ان سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گزرنے والے

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم امجد علی خاں صاحب اسی صاحبزادی کی یادگار تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب موصوف ویراںؔ کے نواسے ہیں تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔

میرے دلی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے "خاقانیٔ ہند" کے نام سے ذوقؔ کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے اور الم غلم باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا کہ ذوقؔ مذہباً شیعہ تھے۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی۔ اس پر میں نے اس کی تغلیط میں ایک مختصر تحریر نگار میں شائع کی تھی۔ میں نے استدلال خود ذوقؔ کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ ایسا قابلِ اطمینان ذریعۂ تحقیق نہیں۔ اب یہ سن کر کہ حکیم صاحب ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں جو ذوقؔ کا دن رات کا مصاحب تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سے کبھی اپنے نانا جان سے ذوقؔ کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی۔ فرمایا پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا، اس لئے مجھے ایسی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اگر ہوتی تو بھی میرا سر پھرا تھا کہ اب ان سے کوئی بحث ذوقؔ سے متعلق کرتا۔ اگر انہیں کہیں ہلکا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ میرے سوال سے استاد کی تنقیص یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے تو دو دہری کھوپڑی نہ ادھیڑ ڈالتے۔ لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوقؔ شیعہ نہیں تھے، بلکہ اہلِ سنت والجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکتوبر سے لے کر مارچ تک، جاڑوں کے چھ مہینے، ہر اتوار [illegible] یہاں [illegible] آ جاتے ہیں۔ پھر گرمی ہو، پانی برسے، آندھی ہو یا طوفان آئے، ان کے اس معمول میں فرق نہیں آ سکتا۔ اگر آپ کسی اتوار کو حکیم صاحب کو یہاں موجود نہ پائیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ دلی میں نہیں یا اتنے بیمار ہیں کہ بستر پر سے ملنے کی تاب نہیں۔ دلی میں ہوتے ہوئے اور صحت کی حالت میں ناممکن ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو نامور شاعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو حضرت بیخود مرحوم تھے، دوسرے

ظہیر دہلوی کے نواسے سید اشتیاق حسین شوق۔ خضر مرزا، میرزا زین العابدین خان عارف کے بھتیجے اور جناب سائل صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے بلکہ رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ ایک نواب احمد بخش خان کے پڑپوتے تھے اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کے نواسے کے بیٹے گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جدِ اعلیٰ ایک تھا۔ خضر مرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ نوکری سے پنشن پانے کے بعد اب یہیں مہرولی میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے اور سارا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود جسم نہایت چاق و چوبند، طبیعت حد درجہ حاضر اور حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انہوں نے بیسیوں ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل آئے۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ باوجود پیرانہ سالی اور زہد و تقویٰ کے انہیں غیر ثقہ بلکہ عریاں لطیفے تک سنانے میں باک نہیں تھا ---- ان میں سے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جو نسبتاً کم عریاں ہے:

ایک مولوی صاحب تھے۔ نماز کا وقت آیا تو مسجد میں تشریف لے گئے۔ پہلے سوال کی ... لوٹا ہاتھ میں لے کر ... میں گئے اور واپس آ کر وضو کرنے لگے [illegible] نہیں ... [illegible] ہوا خارج ہو گئی اور وہ بھی آواز سے ... [illegible] قریب ... بیٹھے وضو کر رہے تھے ... آواز بلند [illegible]

[illegible] حیران ... [illegible] بعض بدل ڈالے گئے ہیں

معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں ... اور ... [illegible] یاد ہے

[illegible] قدرت ہے [illegible]

اس کے ساتھ انہوں نے ... شعر پڑھا تھا

[illegible] جیسا ... رات کالی [illegible]

سید اشتیاق حسین [illegible] مختلف شاعروں کے ... [illegible] خوش قسمتی سے ... [illegible]

[illegible]

اس کے بعد [illegible]

ان کے ... [illegible] عام تھی۔ اس [illegible] نواضع کی جاتی ... [illegible] شعر و شاعری ہوتی۔

حکیم صاحب موصوف نے ۲۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو نواسیر کے مرض سے وفات پائی اور اپنے نانا و برادرِ مرحوم کی طرح درگاہ خواجہ باقی باللہؒ میں دفن ہوئے
سائل صاحب نے اپنے ایک دیرینہ دوست کی تاریخ وفات لکھی جو لوحِ قبر پر کندہ ہے :

بود مرد از نسلِ افغاں چارہ ساز بیکساں — حاجیٔ بیت الحرام و زائرِ دار النبی

کرد رحلت زیں جہان و داد رنج بیکراں — از فراقِ جاودانی و از وداعِ دائمی

سالِ تاریخ وفاتش سائلِ دہلی نوشت

"قدوۂ عالی شان صاحب حاجیٔ امجد علی"

۱۳۵۷ھ

ان کے بعد مطب صاحب کے [illegible] ختم ہو گئے۔

وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

حق ہے [illegible] امر اللہ کا۔

سائل صاحب کی بیٹی [illegible] نواب [illegible] کی [illegible] ایک بیٹا ہوا
تھا جو عین جوانی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام ناظم مرزا تھا یہی لڑکا ان کی [illegible] [illegible] لاڈلی بیگم سے ہوا
جوان [illegible] بھائی میرزا ممتاز الدین احمد خان کی بیوہ تھیں [illegible] اپنی صلبی اولاد [illegible] ایک بیٹا [illegible] کو [illegible] انہوں نے ایک شعر
میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

آج [illegible] — آنکھوں کا [illegible]

ان کے بعد [illegible] نانی [illegible] کی نواسی تھیں [illegible] ملازم نے
محبوب [illegible] نواب سراج الدین احمد خان [illegible] کے گھر [illegible] دالان کے دروازے
کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" [illegible]۔

جناب [illegible] صاحب [illegible] سائل صاحب [illegible] اور وہ ۴۳
۹۴ برس [illegible] نواب صاحب [illegible] ۱۹۴۳ء
[illegible] سائل صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] سائل صاحب کی مجلس
[illegible]
[illegible] صاحب [illegible] رہا ہے۔

سائل صاحب اپنے استاد [illegible]
کی وہ بات [illegible] اپنے استاد [illegible] دہلوی [illegible]
سے میں سائل صاحب ہی کے ہاں ملا ہوں۔

استاد داغ کے خاندان کی [illegible]۔

ایک دن ان سے [illegible] گفتگو [illegible] نے [illegible] انہیں [illegible] خان کا بیٹا [illegible] آپ کی

[illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] لکھن [illegible] آدمی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] شمس الدین احمد خاں [illegible] شمس الدین احمد خاں [illegible] مخالفت [illegible] تھی۔

[illegible]

[illegible] شراب [illegible] ایک مرتبہ مولانا [illegible]

[illegible] شراب [illegible] انگور [illegible] حرام [illegible]

[illegible] متعلق پوچھا [illegible] تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دعوت دی جاتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے تھے تو کسی نو مشق نے پوچھا کہ دہلی میں آپ کا پتا کیا ہے جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے میاں صاحبزادے! خط پہ صرف "سائل دہلی" لکھ دینا، مجھے مل جائے گا۔ اسی طرح کا جواب ایک موقع پر غالب نے نواب علاء الدین احمد خان کو دیا تھا کہ بے شک صرف، میرا نام اور دہلی لکھ دیا کرو، خط مجھ تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروت کا مادہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جائے، انہیں ملنے اور ان کی فرمائش پورا کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک، وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے شکریہ، بس کیجئے یا کوئی اور ذکر نہ چھڑ جائے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدیوں سے واسطہ پڑ جاتا، جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ لیکن نواب صاحب بڑے اطمینان سے اسی طرح ان سے بھی پیش آتے۔ میں بہت جز بز ہوتا۔ ایک آدھ دفعہ میں نے شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے کوڑھ مغزوں کو ٹال نہیں دیتے۔ ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بیٹا، انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ تم نے سنا نہیں۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردو کے معتبر محاورات لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھئے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے، انہوں نے استاد کی رنگین آبادی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ سے مخصوص تھی اور انہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ امیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لئے کیا کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ امیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیرآبادی، حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بہ فرق مراتب اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی اساتذۂ فن ہیں۔ مضطر خیرآبادی کی غزل میں استاد کا رنگ چوکھا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا واحد مالک ہے۔ سائل نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ انہوں نے اپنے لئے نئی راہ نکالی۔ زبان تو دلی کی ہونا ہی چاہئے تھی، انہوں نے اس میں نازک خیالات اور معاملہ اور محاکات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پر لطف شعر نکالے ہیں کہ کچھ انہی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی نور علی نور ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نورالدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نورجہاں بیگم کی حیاتِ معاشقہ کا بیان ہے۔ لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔

زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے سارے دیوان تو کون چھپوائے گا اور کون پڑھے گا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور ہی چھپ جانا چاہئے، اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری کے

ہزار نقش دریں کارگاہ، کار است
مگیر خردہ نظیری کہ ہمہ نکو بستند

چودھری افضل حق (مرحوم)

شورش کاشمیری

ہم جن لوگوں کو بہت جلد بھول گئے ہیں، ان میں مرحوم افضل حق بھی ہیں۔ فی زمانہ یارانِ قلم کی جتھہ بندی نے بہت سی قابلِ قدر شخصیتوں کو طاقِ نسیاں کا گلدستہ بنا دیا ہے اور بہت سی ممیوں کو شہرت کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

پنجاب مرحوم کی قومی زندگی میں پہلی جنگِ عظیم سے لے کر دوسری جنگِ عظیم تک جن لوگوں نے عزت کا مقام پیدا کیا ان میں بعض شخصیتیں ادب و سیاست کے تذکرہ ہی کی مشہور تھیں، چودھری صاحب بھی انہی میں سے ایک تھے لیکن سیاسیات کے اختلافی گرد و غبار نے انہیں اوجھل کر دیا اور آج وہ محض اس لئے ایک فراموش شدہ عظمت ہیں کہ ان کے گرد و پیش اعترافِ محاسن کا کوئی حلقہ نہیں، وہ زندگی میں بھی مفلس کا چراغ تھے اور زندگی کے بعد بھی گمنام قبر ہیں جس پر کوئی کتبہ آویزاں نہیں ہے۔

——— چودھری صاحب کی زندگی ہمیشہ مختلف دھاروں کا سنگم رہی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے خلاف بہت بڑا احتجاج تھے، انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ جس زمانہ میں وہ پولیس کے سب انسپکٹر بھرتی ہوئے تب ہندوستانیوں میں سے بہت کم لوگ سب انسپکٹر ہوتے تھے، اس "اعزاز" کے مستحق چیدہ چیدہ خاندانوں کے چیدہ چیدہ لوگ ہی سمجھے جاتے تھے۔ مرحوم چودھری صاحب ہوشیارپور کے ممتاز راجپوتوں میں سے تھے، ان کے بڑے بھائی بھی پولیس میں تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ چودھری صاحب پولیس میں رہتے تو تعجب نہ تھا کہ اپنی ذہانت و فراست کے بل پر پولیس کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرتے اور عین ممکن تھا کہ پنجاب میں جن ہندوستانی پولیس افسروں کی آج تک دھوم ہے ان میں سے ایک ہوتے لیکن تحریکِ لاتعاون کے آغاز میں مستعفی ہو گئے ——— سید عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے تھے کہ وہ ہوشیارپور کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کر رہے تھے اور چودھری صاحب مرحوم اس جلسہ میں ان کی تقریر کے نوٹ لے رہے تھے، میں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ایک اقبال صورت نوجوان کے کسے ہوئے بدن پر تھانے دار کی وردی نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اثنائے تقریر میں کنایتہً کہا:

"اے کاش مجھے اس طرح کے نوجوان مل جائیں تو میں چند دنوں میں ہندوستان کی کایا پلٹ دوں لیکن

کیا کروں میرے نوجوان تو فرنگی بابا کی صف میں وردی پہنے کھڑے ہیں۔"

کچھ دنوں بعد لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیتہ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا تو چودھری صاحب نے اس اجلاس میں مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا ——— انگریزوں کے لئے کسی ذیلدار کا مستعفی ہونا انتظامی نقطۂ نگاہ سے انتہائی خطرناک تھا۔ مسٹر ہری کشن کول اس زمانے میں جالندھر ڈویژن کے کمشنر تھے، انہوں نے چودھری صاحب کو ڈرانے دھمکانے پھر منانے سمجھانے کی سرتوڑ کوشش کی، مگر چودھری صاحب قدم اٹھا چکے تھے اور پیچھے مڑنے کو مطلق تیار نہ تھے ——— انگریزوں نے دو سال کے لئے قید کر دیا۔ بیدردی کا زمانہ تھا۔ چودھری صاحب کوئی بڑے لیڈر یا معروف کارکن نہ تھے اعزہ واقربا سرکار پرست تھے، جیلر نے حکام بالا کے ایما پر سختیاں شروع رکھیں، قید تنہائی میں ڈالا، بیڑیاں لگائیں، چکی پسوائی، کھڑی ہتھکڑی لگوائی، ٹاٹ کے کپڑے پہنوائے، غرض گوناگوں اذیتیں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر چودھری صاحب نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ——— پنڈت بنکی رام شرما قید خانے میں آپ کے ساتھی تھے وہ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے روزنامہ "بندے ماترم" میں ان مظالم کے خلاف احتجاج کیا، جس سے لوگوں کو پہلی دفعہ ان کی شخصیت اور ہمت کا علم ہوا۔

——— "دنیا میں دوزخ" "قید خانے کے کوائف" ان کی پہلی تصنیف ہے جو آپ نے رہائی کے بعد قلمبند کی۔ ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی ہوشیار پور نے اس کو شائع کیا اور رہائی کے بعد آپ کو ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا

تحریک خلافت ختم ہو چکی تو مختلف رہنماؤں کی صلاحیتوں کا بھرم کھلنے لگا مگر چودھری صاحب رفتہ رفتہ ابھرتے ہی گئے حتیٰ کہ دو چار برس ہی میں صوبے کے مسلمان لیڈروں کی صف اول میں شمار ہونے لگے۔ چنانچہ ہندوستان میں اندرونی خلفشار تھا، کانفرنسیں منعقد کی گئیں ان میں پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے آپ کو بھی مدعو کیا جاتا رہا اور ہمیشہ آپ کے مشوروں کی قدر کی گئی ——— اس رفتار نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ چنانچہ پہلی بار جب پنجاب کونسل کے انتخابات ہوئے تو ہوشیار پور کے مسلم حلقے سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ——— پنجاب کونسل میں آپ کی قابلیت کے نقش اور اثر ہوئے، خود انگریز ممبروں نے ان کی جرأت و قابلیت کا اعتراف کیا اور اس کی شہادت کونسل کے اجلاسوں کی مطبوعہ کارروائیوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

میاں فضل حسین مرحوم آپ کے بے حد گرویدہ تھے، ہمیشہ آپ کی استدلالی تقریر کو غور سے سنتے ——— وہ تمام زندگی کوشاں رہے کہ چودھری صاحب اپنی موجودہ راہ سے ہٹ کر ان کے ہم قدم چلیں اور حکومت میں شریک ہوں لیکن چودھری صاحب ہمیشہ ان کے اس خیال کی مزاحمت کرتے اور اپنے طرز عمل کی سچائی پر اصرار کرتے تھے۔

چودھری صاحب مرحوم انتہائی عاجز طبیعت کے بزرگ تھے۔ ہمیشہ لیڈروں کی سی خو بو سے بے نیاز رہے، انکسار ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کیا ہیں، بس جو کچھ تھے انتہائی عاجزی کے ساتھ تھے ——— صرف ایک دفعہ انہوں نے جیل خانوں میں اصلاحات کے مسئلہ پر بعض باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جیل خانوں کے سدھارنے میں میں نے جو کوششیں کی ہیں مجھے ان پر جائز فخر ہے۔

جن دنوں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی جیلخانے میں اصلاحات کا مطالبہ کر رہے اور بھوک ہڑتال پر تھے چودھری صاحب غیر سرکاری وزیٹر ہونے کے علاوہ اصلاحاتی کمیٹی کے ممبر تھے آپ نے اس معرکہ میں جس مستعدی کا ثبوت بہم پہنچایا اس سے اپنے پرائے سب عش عش کر اٹھے گو آپ کو اس کمیٹی کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا، لیکن آپ نے "دنیا میں دوزخ" کے شعلوں کو ہلکا کرنے میں ایک قابل ستائش کارنامہ سرانجام دیا۔ واقفان حال کو معلوم ہے کہ اصلاحات کی سب سے پہلی قسط کے مجوز آپ ہی تھے۔

——— سنہ ۳۰ء میں کانگرس نے ڈانڈی مارچ کیا تو گاندھی جی کے بعد دوسری مجلس عاملہ کے ارکان میں سے ایک آپ بھی تھے ——— سردار

وٹھل بھائی پٹیل صدر بنتے اور مالویہ ایسے رہنما رکن، دہلی میں مجلسِ عاملہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کو گورکھپور جیل میں رکھا گیا جہاں آپ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف 'زندگی' سپردِ قلم کی ——— اس کتاب کے شائع ہوتے ہی آپ کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ چراغ حسن حسرت نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جو باتیں علامہ اقبال ؒ نے بیسیوں اداؤں کے ساتھ کہی ہیں وہ چودھری صاحب نے سیدھے سادے الفاظ میں لکھ دی ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے 'زندگی' کی تعریف میں نظم لکھی۔ تمام ملک کے جرائد و رسائل نے خراج ادا کیا ——— پنجاب یونیورسٹی نے پہلا انعام پانچ سو روپے دیا، سالہا سال یہ کتاب ادیب عالم کے نصاب میں رہی اور غالباً اب بھی شریکِ نصاب ہے۔

——— ۱۹۳۱ء کے بعد آپ نے پنجابی رفقاء کے ساتھ مل کر اپنی الگ راہ قائم کی چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جس مجلسِ احرار کی بنا ڈالی گئی تھی اس کو مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم کے طور پر زندہ کیا گیا، تحریکِ کشمیر کی ہمہ گیری نے انہیں دماغِ احرار کا درجہ دیا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری انہیں پیار سے احرار کے "مہاتما جی" کہتے تھے، تحریکِ کشمیر سے لے کر دوسری جنگِ عظیم کے مختلف ملی ہنگاموں میں ان کی شخصیت کے دونوں پہلو ابھرتے گئے ———

ادبی زندگی میں انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ میرا افسانہ، ۲ جلد (خود نوشت سوانح) جواہرات (افسانے)، شعور (ڈرامہ)، محبوبِ خدا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح)، دینِ خدا (اسلامیات)، خطوطِ افضل حق (بیٹی کے نام خط)، تاریخ احرار اور انگریزی میں پاکستان و چھوت چھات ———

افسوس ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے ان کی ادبی زندگی سے انصاف نہیں کیا، حالانکہ وہ اسلوب سے لے کر مقصدیت تک صاحبِ طرز تھے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں نے صرف ایک مجموعہ یا ایک افسانہ کی بنا پر ادبِ اردو میں جگہ حاصل کی ہے اور اس کی وجہ محض ادب میں دھڑے بندی ہے ورنہ ادب کی کوئی ترازو ایسی نہیں جس میں چودھری صاحب کے رشحاتِ قلم تل نہ سکتے ہوں اور ان کا پلڑا مقابلتاً جھکا ہوا ہو ——— اگر ادب کا مقصد تفسیرِ حیات، تنقیدِ حیات اور تعمیرِ حیات ہے تو "زندگی" اس معیار پر پوری اترتی ہے، جتنا اثر ذہنوں پر 'زندگی' نے ڈالا ہے اتنا شاید اس دور میں نثر کی کسی ایک کتاب نے نہیں ڈالا۔ لیکن کج روی کی حد ہے کہ ادب کے سیاسی ناقدوں کی نگاہیں اس طرف اٹھتی ہی نہیں اور اٹھتی ہیں تو پیچھے کو لوٹ جاتی ہیں۔

——— سیاسی زندگی میں چودھری صاحب "مسلمان سوشلسٹ" تھے۔ ایک زمانہ میں انہوں نے "اسلام میں امراء کا وجود نہیں" لکھ کر علماء کی صفوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا، حتیٰ کہ ان کے کئی احرار ساتھی بھی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کے مبادی کا شعور بھی ان حضرات کو نہ تھا۔

"تاریخ احرار" بظاہر احرار کی تاریخ ہے لیکن حقیقتاً مسلمانوں میں طبقاتی احساس کے نشو و نما کی تاریخ ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں احرار کے جھگڑے کے ہمہ گیر پہلو کا اپنا ذہن بکمال و تمام پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے غصے اور احتجاج کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں امراء کے طبقہ کی بدولت کھولتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن مجید میں سرمایہ داری کے خلاف جو احکامات ہیں ان کو یکجا کریں اور پھر ان تفسیروں، تعبیروں اور تاویلوں کے بخیئے ادھیڑیں جنہیں مختلف اوقات میں حکمرانوں کی منشا کے مطابق ڈھالا گیا لیکن اس کی راہ میں کئی دیواریں حائل تھیں مثلاً:

۱ - وہ اس مضمون کی صدیوں پرانی وسعتوں کو سمیٹنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

اولاً وسیع المطالعہ تھے ثانیاً انہیں عربی کا بنیادی علم نہ تھا، ثالثاً عصری تحریکوں کے علمی رجحانات سے کاملاً آگاہ نہ تھے، رابعاً ان کا تجربہ صرف عملی سیاسیات کے بارے میں تھا۔

۲ - جس وقت انہوں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا وہ نظر و بحث کی اس تکرار کے لئے موزوں وقت نہ تھا۔

۳ - جس ماحول میں وہ خوردہ رہے تھے وہاں "دانشور" تھوڑے اور "مجذوب" زیادہ تھے۔

ـــــــ تمام زندگی فقر و فاقہ میں بسر کی، لیکن وضعداری پر ایک ثانیہ کے لئے بھی آنچ نہ آنے دی ـــــــ جو کمایا جماعت کی نذر کیا ان کے اخلاص و دیانت کی مثالیں اس دور کی پوری تاریخ میں نایاب ہیں ـــــــ ہندوستان میں ایثار پیشہ لیڈروں کی کمی نہیں، گو مسلمانوں میں اس کا قحط ہی رہا، لیکن چودھری صاحب محدود ہونے کے باوجود بے پایاں تھے، انتہائی سیر چشم، اچھے گھرانے میں پرورش پا کر فقیری کی زندگی اختیار کی، وفد احرار کی بالائی منزل میں قدم رکھا تو پھر اترے نہیں اور اترے تو دوش پر ـــــــ آخری سفر کے لئے ـــــــ دنوں فاقے کئے لیکن دن بھر کے ساتھ بیٹھنے والوں کو خبر نہ ہونے دی۔ مسکراتا چہرہ، متحرک آنکھیں، نرم گفتار، کہیں سے پیسے مل گئے، بعض کتابوں کی رائلٹی مل گئی یا پنجاب کونسل میں حاضری کا چیک آ گیا تو اکثر و بیشتر احباب میں تقسیم ہو گیا۔

شاہ جی کو ضرورت ہے، مولانا حبیب الرحمٰن سوالی ہیں، ماسٹر جی کے پاس کرایہ نہیں، جانباز مانگتا ہے، سردار شفیع کو بل جوتنے کے لئے کچھ رقم درکار ہے، فلاں رضا کار کی شادی ہے، فلاں کارکن بیمار ہے اس کے پاس دوا کے لئے پیسے نہیں ـــــــ اور چودھری صاحب ہیں کہ اپنے آپ کو بیچ کر ان مطالبات کو پورا کر رہے ہیں۔

شہر میں عید ہے، گھر میں فاقہ، کوئی ساتھی سویاں لے کر آ گیا تو عید ہو گئی ورنہ سب اچھا!

دو دفعہ کونسل کے ممبر منتخب ہوئے، ایک دفعہ مسجد شہید گنج کی تحریک کے آغاز میں استعفیٰ دے دیا، تیسری دفعہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا لیکن رہ گئے ـــــــ اور رہ اس طرح گئے کہ صوبجاتی خود مختاری کے تحت پہلا انتخاب تھا، اب کے وزارتیں قائم ہو رہی تھیں، سردار سکندر حیات ہر قیمت پر شکست دلوانا چاہتے تھے، لاہور کے بہت سے لوگ، لیچے اور رہنما کئے ہوئے باہر کے حلقۂ انتخاب میں درآمد کئے گئے جنہوں نے بازو پھیلا پھیلا کر اعلان کیا کہ شہید گنج میں ان پر جو کچھ بیتی اس کا ذمہ دار چودھری ہے مسلمان جذباتی قوم، ہوا کا رخ پلٹا، چودھری صاحب ہار گئے۔ پھر اس کے بعد کبھی منتخب نہ ہو سکے، جب کھڑے ہوتے یونینسٹ پارٹی پوری طاقت سے مقابلہ کرتی، نتیجہ یہ نکلتا کہ شکست کھا جاتے۔ ایک دفعہ راقم نے عرض کیا:

"چودھری صاحب! الیکشن لڑنے سے فائدہ؟ ہمیشہ تو زک اٹھانی پڑتی ہے۔"

ہنسنے لگے، "شورش! میں اس لئے الیکشن نہیں لڑتا کہ مجھے جیتنا ہی ہے، میں اس لئے بھی الیکشن لڑتا ہوں کہ مسلمان امراء کو یہ احساس ہو کہ غریب ان کا مقابلہ کر سکتا ہے اور غرباء میں یہ ذہن پیدا ہو کہ امراء کا مقابلہ کرنے سے عزت نفس بڑھتی ہے۔"

ـــــــ چودھری صاحب کی مجموعی قید کوئی آٹھ یا نو برس رہی۔ جن سپرنٹنڈنٹوں اور جیلروں کے پاس انہیں مختلف جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ ان کی سیرت کے شاہد تھے تقریباً سب متفق الرائے تھے کہ وہ سیاسی قیدیوں میں غیرت مندی، خودداری اور بہادری کے اعتبار سے گوہر یکدانہ تھے، ہر سانحہ کو انہوں نے لبیک کہا، جو مصیبت آئی خندہ پیشانی سے جھیلی، کبھی کسی آفت پر اف نہ کی ـــــــ دمہ کا مرض جیل ہی میں لگا، آواز صاف تھی اس میں نام کو بھی خرخراہٹ نہ تھا لیکن جیل خانے میں ہمیشہ کے لئے گلا رندھ گیا۔ آخری بار ستمبر ۱۹۳۹ء میں قید ہوئے، ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں دمہ اٹھا، حکومت نے علالت کو جان لیوا ہوتا دیکھا تو رہا کر دیا۔ بہتیرا علاج کیا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر افق حریت کا یہ ستارہ ۲ر جنوری ۱۹۴۲ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ـــــــ انسانی سیرت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس میں رچ پچ گئے ہوں وہ بھی اس کے کردار کی گواہی دیں۔ چودھری صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے زندگی کے ہر موڑ میں مخالفوں سے خراج وصول کیا۔ ان کے سب سے بڑے دشمن کا نام حقہ تھا وہ تمباکو نوشی

کے سخت خلاف تھے، انھوں نے اپنی کتابوں میں بھی اس کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب میں اس کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ اس کا تلخ تجربہ انہیں تحریکِ کشمیر میں ہوا جبکہ احرار کے فراہم شدہ زرِ اعانہ میں سے نصف روپیہ قیدی رضاکاروں کو سگرٹ مہیا کرنے میں اٹھ گیا، کیونکہ بصورتِ دیگر ان کے معافی مانگ کر نکل آنے کا اندیشہ تھا اور اس صورت میں تحریک کی عزت بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ وہ حقہ نوشی کو کاہل سمجھتے، اور تمباکو کی مضرتوں کو ام الامراض سے تعبیر کرتے تھے۔

ان کے سامنے کوئی ساتھی حقہ نہیں پی سکتا تھا۔ عام رضاکاروں کو ہمیشہ اجتناب کی تلقین کرتے بلکہ ان سے عہد لیتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ احرار کے ممتاز راہنماؤں میں ایک آدھ راہنما کے سوا چوٹی کے سبھی لیڈر حقہ نوشی کے خلاف تھے ـــــ

افراد و جماعت کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ اتنا صاف تھا کہ بسا اوقات پڑھ کر حیرت ہوتی، بعض سیاسی تحریکوں کے متعلق انھوں نے عجیب و غریب تجزیے کئے ہیں۔ علامہ اقبال کو وہ اپنی صف میں سے سمجھتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کو علم کا شہنشاہ جن کے ماتھے پر داغدار الفاظ سے نسلی آسیائی ہے۔ جواہر لال نہرو کو سیاست کا لاڈلا جو چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔ گاندھی جی کو شاطر سیاستدان جو مہاتما اور مدبر کا ایک دلآویز آمیزہ تھے۔ کانگرس کو وہ ہندو سرمایہ داری کا قلعہ اور مسلم لیگ کو خاص امراء کی آخری جائے پناہ سمجھتے تھے۔ غرض خلاصۂ کلام یہ تھا کہ:

”امراء کبھی اس غریب کو ساتھ لے کر نہیں چلتے جو ان کی بات پر سوچتا ہو، ان سے اختلاف کرے، ان کے مقابلہ میں ذہین ہو اور ان سے علیحدہ بھی اپنی شخصیت ابھار سکے۔“

چودھری صاحب میں یہ چاروں خصوصیتیں بدرجۂ اتم تھیں، نتیجہ معلوم کہ وہ بساطِ سیاست پر ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح ختم ہو گئے، حتیٰ کہ زمانے کے ساتھ انہیں دوست بھی بھول گئے۔

سیماب اکبرآبادی

نثار اٹاوی ایم۔اے

۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ میں بذریعہ مراسلت علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو چکا تھا مگر شوقِ اشتیاقِ دید باقی تھا۔ ایک دن اس جذبۂ شوق کی شدت سے مجبور ہو کر آگرہ پہنچا، غالباً مئی یا جون کا مہینہ تھا، میری تربیت کچھ ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں استاد کا احترام فرضِ عین سمجھا جاتا ہے، استاد کی خدمت میں نذر پیش کرنا اور خصوصاً اس وقت جب استاد سے پہلی مرتبہ شرفِ نیاز حاصل ہو رہا ہو ضروری تھا۔ مگر اس زمانہ میں میری مالی حالت نہایت سقیم تھی، ایک مقامی اسکول میں معلمی کے عوض مجھے آٹھ روپیہ ماہانہ ملتے تھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سفر کے لئے کہاں سے مصارف کا انتظام کیا، استاد کی نذر کے علاوہ شرینی لے جانا بھی ضروری معلوم ہو رہا تھا چنانچہ شہر سے ایک ٹوکری خرید کر دو روپیہ کی مٹھائی خریدی مگر وہ تو ٹوکری کی تلی ہی میں سما گئی۔ بڑے شش و پنج میں تھا کہ اتنی بڑی ٹوکری میں یہ ذرا سی مٹھائی لے کر کیا جاؤں، آخرکار ایک تدبیر سمجھ میں آئی، ایک روپیہ کے پھل خرید لئے چند سنگتروں، چند کیلوں اور غالباً ایک یا دو چکوتروں نے ٹوکری کو پُر کر دیا۔ تانگہ میں ٹوکری رکھ کر قصر الادب کی طرف روانہ ہو گیا قصر الادب عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ میں ٹوکری لے کر اوپر پہنچا، صحن کے بعد ایک کمرہ تھا۔ اس سے ملحق ایک کوٹھری تھی جس پر پھولدار رنگین پردہ لٹک رہا تھا۔ بیرونی کمرہ میں ایک صاحب لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے، میں ان سے ناواقف تھا۔ میں نے دریافت کیا مولانا کہاں ہیں؟ انہوں نے کوٹھری کی جانب اشارہ کر دیا، میں نے پردہ اٹھایا، دیکھا فرش پر سفید چادر اور قالین بچھا ہے، قالین پر حضرت علامہ گاؤ تکیہ کے سہارے دراز کش ہیں۔ پیروں کی جانب ایک اور صاحب تشریف فرما ہیں (بعد کو معلوم ہوا کہ وہ جناب محمد صادق صاحب ضیا چنیوٹی تھے) میں نے سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا، علامہ مرحوم کھڑے ہو گئے اور معانقہ کیا۔ ضیا صاحب سے بھی ہاتھ ملایا۔ مولانا فرمانے لگے، نثار صاحب! آپ تو میرے تصور میں کوئی مُسن شخص تھے۔ میں نے عرض کیا۔ جیسا ہوں حاضر ہوں، مولانا نے میرے قیام کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا صرف آپ کے دیدار سے مشرف ہونے آیا ہوں، آپ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد پہلی ٹرین سے واپس ہو جاؤں گا۔ مولانا نے بہت اصرار کیا کہ دو ایک روز قصر الادب میں مہمان رہوں مگر یہ مجھے اس لئے گوارا نہ ہوا کہ جب مجھ میں اتنی استطاعت

نہیں ہے کہ استاد کو کچھ نذر بھی پیش کرسکوں تو یہ کیسے مناسب ہوسکتا ہے کہ اپنی مہمان داری کا بار ان کے سر ڈالوں، چنانچہ میں نے بادل ناخواستہ معذرت چاہی اور واپسی کی اجازت طلب کی انہی دنوں علامہ کا پہلا مجموعۂ نظم "کارِ امروز" شائع ہوا تھا چنانچہ اس کے مطالعہ کا شوق بھی بے چین کئے ہوئے تھا "کار امروز" کی قیمت اس وقت ساڑھے تین یا چار روپیہ تھی۔ میرے پاس کرایہ کے علاوہ اب صرف پانچ روپے باقی تھے میں نے مولانا سے کار امروز کا ایک نسخہ عطا کرنے کی گزارش کی۔ مولانا نے بلند آواز سے کہا۔ اعجاز میاں! نثار صاحب کو ایک نسخہ کار امروز کا دے دیجئے۔ وہی صاحب جو کمرہ میں بیٹھے تھے کتاب لے کر اندر آئے اور معلوم ہوا کہ وہ علامہ مرحوم کے صاحبزادے حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر ہیں۔ میں نے شیرینی کی ٹوکری میں صرف کا نوٹ رکھ کر مولانا کے سامنے پیش کیا اور گزارش کی کہ "کار امروز" میرے لئے بیش بہا شے ہے میں اس کی کوئی قیمت نہیں چکا سکتا۔ آپ خواہ اسے نذر سمجھئے یا کتاب کی قیمت۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ میں نے اجازت طلب کی اور اٹاوہ واپس آیا۔

یہ تھی میری علامہ مرحوم سے پہلی ملاقات ———

مولانا اس وقت باوجود عمر کی پچپن منزلیں طے کر چکنے کے کافی تنومند تھے، قد چھوٹا تھا مگر ان کی ترکی ٹوپی اسے درازی عطا کر دیتی تھی، سر کے بال سفید ہو چلے تھے اور انگریزی وضع پر ترشے رہتے تھے، مولانا کا چہرہ گول، آنکھیں بڑی اور چمکدار تھیں، ان کی آواز کافی رعب دار تھی۔ مونچھوں کے بال بہت ہلکے اُگتے تھے، داڑھی صفاچٹ رہتی تھی، آخر عمر میں کمر میں تھوڑا خم آگیا تھا، مگر چھڑی کے سہارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چل سکتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی پُر تکلف لباس میں نہیں دیکھا، 'کلیم عجم' میں ایامِ شباب کی تصویر دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی زمانے میں سوٹ بھی پہنتے ہوں گے مگر شاید جوانی کے ساتھ یہ شوق بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے انہیں ہمیشہ شیروانی اور چوڑے پائنچے کے پائجامے ہی میں ملبوس دیکھا۔ گھر پر قمیض اور تہبند یا پاجامہ کے عادی تھے اگر گرمی کی شدت ہوتی تھی تو صرف بنیائن اور تہ بند پر ہی اکتفا کرتے تھے مگر بغیر شیروانی اور ٹوپی کے مکان یا دفتر سے باہر جانا معیوب سمجھتے تھے، انہیں ترکی ٹوپی بہت عزیز تھی، کبھی کبھی جاڑے میں سمور کی ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے، یہ سیہی کے کانٹوں جیسی گھنے، بھورے بالوں والی ٹوپی ان کے پر رعب چہرہ کو اور بھی باوقار بنا دیتی تھی۔

اس ملاقات کے بعد مولانا سے میرے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے، مولانا متعدد مرتبہ اٹاوہ تشریف لائے۔ میں بارہا آگرہ گیا اور ہفتہ دو ہفتہ مولانا کے یہاں قیام پذیر رہا۔ متعدد مقامی اور بیرونی مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ غرضیکہ ان کی ہجرت پاکستان کے وقت تک مجھے اس کے بے شمار مواقع ملے کہ میں ان کے نظریات، عادات و اطوار اور کردار کے ہر پہلو کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرسکوں۔

علامہ سیماب مرحوم صبح تڑکے بیدار ہونے کے عادی تھے، انہیں اکثر مشاعروں کی شرکت کے باعث رات کے پچھلے پہر تک جاگنا پڑتا تھا مگر یہ جگار صبح خیزی کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت جلد نماز فجر سے فراغت حاصل کرکے سحر گشت کے لئے نکل جاتے تھے، طلوعِ آفتاب سے پہلے کا سہانا وقت اُن کی شگفتِ طبع کے لئے بہت موزوں ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "کارِ امروز" کی بیشتر نظمیں میں نے سحر گشت کے دوران میں کہی ہیں۔ واپسی پر مکان تشریف لاتے، غسل فرماتے، ناشتہ کرتے، اخبارات کا مطالعہ فرماتے اور ٹھیک دس بجے قصر الادب تشریف لاتے دوپہر تک ڈاک دیکھتے، ضروری خطوط پڑھتے ان کے جوابات لکھتے پھر دوپہر کے کھانے سے فراغت پاکر اپنے بیرونی شاگردوں کے کلام پر اصلاح فرماتے اسی دوران میں اگر موقع مل جاتا تو خود بھی شعر کہہ لیتے، شام کو مکان واپس آتے، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کبھی مکان پر اور کبھی دفتر میں آرام فرماتے اور فکر سخن میں مصروف ہو جاتے۔ اگر کسی مشاعرہ کی شرکت ضروری نہ ہوتی تو وہ رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے۔

مولانا بڑے ہی صاحب علم و فضل بزرگ تھے، ان کی انگریزی تعلیم معمولی ہی تھی مگر ان کی انگریزی تحریر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ صرف ایف۔ اے (سال اوّل) تک ہی پڑھے ہیں۔ عربی اور فارسی انہوں نے خوب پڑھی تھی۔ یہ تعلیم انہیں کچھ تو اپنے قابل قدر اساتذہ کے ذریعہ اور کچھ فطری ذوقِ مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ حضرت مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، مولانا سید احمد گنگوہی اور مولانا قمر الدین وغیرہ فاضل

بزرگوں سے انہوں نے عربی ادب، اصول اور منطق کی تکمیل کی تھی۔ ان کا فارسی کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا جس کا ثبوت ان کی وہ غزلیں ہیں جو انہوں نے فارسی میں کہی ہیں۔ یہ غزلیں اپنی شستگی، صفائی اور روانی کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔

اگرچہ علاّمہ کی تعلیم و تربیت قدامت پسند ماحول میں ہوئی مگر وہ بڑے روشن خیال اور دوراندیش انسان تھے۔ وہ زمانے کے تیور خوب پہچانتے تھے، اور اس کے ساتھ قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے، ان کی وقت شناس نگاہیں ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہیں۔ ادب کے معاملہ میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا۔ جب ان کے معاصرین کی اکثریت روایتی غزل کی پُرپیچ وادیوں میں بھٹک رہی تھی انہوں نے اپنے تصورات اور جذبات کو نئی قدروں کے سانچے میں ڈھالا اور جدید اُردو شاعری کی راہیں متعین کیں۔ "کلیم عجم" کے دیباچہ میں انہوں نے خود اپنی سرگزشت لکھی ہے اور اپنے نظریات شعری کی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ حالانکہ میرے رنگ قدیم میں بھی سوقیانہ، غیر متین اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء سے میرا رنگ تغزل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علم، شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا مؤید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنہیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کار آمد نہیں رہی۔ شعرائے متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ منتہی شعراء کے لئے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنفِ سخن اُردو شاعری کو کار آمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر توجہ اسی کی طرف ہونا چاہیئے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ "زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے" کائنات بغیر شاعر کے ایک ساز بے نغمہ ہے۔ شاعر دنیا کا ایک ایسا جزوِ ضروری ہے جس کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و القا کا وہ سلسلہ جو انبیاء و اولیاء کی ذاتِ مقدس تک مخصوص ہے۔ شاعر کے دماغ اور سرورش کے ساتھ بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔"

[کلیم عجم]

علاّمہ مرحوم کے نزدیک شاعر کا مرتبہ بہت بلند تھا انہیں بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ اکثر شعراء کو مشاعروں اور ادبی محلسوں میں انسانیت سوز حرکات کا مرتکب ہوتے دیکھتے تھے، وہ شاعر کا وقار بہت بلند دیکھنے کے متمنّی تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے خود اپنی زندگی کو اسی رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ ایسے شعراء سے ملنا جلنا بلکہ بات کرنا تک پسند نہ کرتے تھے جو اخلاقی مراتب سے گرے ہوئے ہوں، اور یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ انہیں غلطی سے متکبّر اور خود پسند سمجھتے تھے، مولانا فطرتاً نہایت منکسر المزاج تھے۔ میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے اپنے سے جونیر اور کمتر درجہ کے شعراء کی بے حد تواضع کرتے دیکھا ہے شکیل بدایونی جب کبھی تشریف لاتے مولانا نہایت محبّت سے بٹھاتے، گھنٹوں باتیں کرتے، ان کا کلام سنتے، اپنا سُناتے، چائے پلاتے اور بہ اصرار تمام میزبانی کے فرائض انجام دیتے۔

علامہ بڑے ہی خوددار انسان تھے، ان کی خودداری اُن کے پُر وقار چہرے سے ٹپکتی تھی۔ جب کبھی ان کے شاعرانہ وقار کو ٹھیس لگ جاتی تھی تو ان کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھتا تھا اور وہ بپھر جاتے تھے، ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی یہ ادا پسند نہ ہو۔ خودداری اور غرور کے درمیان بڑا ہی نازک فرق ہے اور ان دونوں کی حدود متعین کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وطن واپس آنے پر چند حیدر آبادی احباب کے توسّل سے تحریک ہوئی کہ مولانا مستقلاً حیدر آباد چلے آئیں۔ ولیعہد بہادر ان سے اصلاحِ کلام کے طالب ہیں غالباً تنخواہ کے متعلق بھی معاملہ طے پا گیا مگر جب مولانا کو یہ معلوم ہوا کہ انہیں حیدر آباد کے رسوم کے مطابق دربار میں پگڑی اور پھینٹا باندھ کر حاضر ہونا پڑیگا تو ان کی خوددار طبیعت نے بغاوت کردی اور انہوں نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ شکوہ آباد میں اسلامیہ اسکول کے قیام کے سلسلہ میں ایک جلسہ تھا پروگرام میں مشاعرہ بھی شامل تھا اسکول کا افتتاح کرنے کے لئے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو مدعو کیا گیا تھا اور مشاعرہ کی صدارت علامہ سیماب کے ذمہ تھی۔ اتفاقاً دونوں صدر ایک ہی ٹرین سے شام کے وقت تشریف لائے۔ منتظمین جلسہ میں چونکہ خاصی تعداد علیگڈھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تھی لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بڑے احترام سے کار پر بٹھا کر شہر لائے۔ مولانا کے لئے تانگہ کا انتظام کیا گیا۔ مولانا نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اسٹیشن سے اس وقت تک قدم باہر نہ نکالا جب تک دوسری کار نہ منگوالی۔ بادی النظر میں یہ بات نہایت معمولی ہوسکتی ہے۔ کچھ لوگ اسے تنگ نظری اور عصبیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ معاملہ صرف سیماب کی ذات تک ہی نہ تھا بلکہ دیگر اکابرین شعر و ادب کے لئے بھی تامّل کا مقام تھا۔ ہماری سوسائٹی میں ہمارے بزرگانِ ادب کا مرتبہ سیاسی لیڈروں سے بھی کمتر سمجھا جاتا ہے (خواہ اس کے وجوہات کچھ بھی ہوں) اور وہ ان کی اہمیّت کو محسوس نہیں کرتے اس لئے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ عوام کو اپنی اہمیّت کا احساس دلائیں اور ان کو اپنا ادب اور احترام کرنا سکھائیں۔

مولانا سیماب کو اپنی خودداری کی بڑی بڑی قیمتیں ادا کرنی پڑیں، تاریخ ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوگا۔ جس کے خلاف اس کی زندگی میں اس قدر کثرت سے لکھا گیا ہو جب مولانا سیماب پر پے در پے چاروں طرف سے حملے ہوتے تھے ان کے مخالفین اور معترضین ادبی تنازعات میں ذاتیات اور کردار تک آتر آتے تھے مگر وہ جواں ہمت قصر الادب کی چہار دیواری میں بیٹھا کبھی ہنستا تھا کبھی جز بز ہوتا تھا اور کبھی زمانے کی ناقدر شناسی کا شکوہ کرکے تاسّف کرتا تھا، انہوں نے شاید کبھی خود اپنی قلم سے ان حضرات کا جواب لکھنا مناسب نہ سمجھا، میں نے ایسے عزم اور ہمت کے انسان بہت کم دیکھے ہیں جو بیک وقت سینکڑوں طوفانوں سے ٹکر لیتے رہے ہوں اور ان سے صحیح و سلامت نکل کر ملک میں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کرسکے ہوں۔

ایک دن میں نے عرض کیا مولانا! ادبی دنیا میں آپ کے اس قدر مخالف موجود ہیں آپ زمانہ سازی سے کام کیوں نہیں لیتے، شعرا اور نقاد آپ کو متکبّر سمجھتے ہیں اور آپ کی خوددارانہ اسپرٹ کا غلط مطلب نکالتے ہیں آپ بھی دوسروں کی طرح ان کو فریب دیجئے۔ رفتہ رفتہ سب رام ہو جائیں گے۔ مولانا میرے اس سوال پر غور و فکر میں پڑ گئے۔ ان کے چہرہ سے کچھ بیکسی کے آثار جھلکنے لگے۔ بولے۔ نثار صاحب! زمانہ سازی تو میرے بس کی بات نہیں، بچپن سے صاف گوئی کی عادت رہی ہے وہ کیسے بدل جائے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں متکبّر نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وقار کے تحفّظ کا ضرور خیال رہتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اور ملک کے دوسرے شعرا بھی اس پر عمل کریں۔ جو کچھ جس کے جی میں آئے لکھے میں کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ لیکن یاد رکھئے کہ جب یہ دور گزر جائے گا۔ میں مرجاؤں گا۔ یہ نسل مرجائے گی تو سیماب کے کارناموں کی قدر ہوگی۔ میں نے اتنا کام کرلیا ہے کہ دنیا مجھے فراموش بھی کرنا چاہے تو نہیں کرسکتی میں نے اپنے ہاتھوں سے حیاتِ ابدی کا محل تعمیر کیا ہے۔ اس عمارت کو میری مخالفت کے وقتی طوفان ڈھا نہیں سکتے ؏

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اس فریب اور ریاکاری کے نسخہ کے علاوہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی تدبیر ہو تو بتایئے میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ مشاعروں میں دوسرے شعراء سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ لوگ اس کا مطلب اگر یہ سمجھتے ہیں تو کیا بیجا ہے کہ آپ شاید انہیں اپنا ہم مرتبہ نہیں سمجھتے مولانا فرمانے لگے۔ آپ کا خیال صحیح ہے مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ دوسرے شعراء میرے متعلق اسی طرح سوچتے ہوں گے بعض وقت میں نے اشارتاً ان کو اس کا شاکی بھی پایا ہے مگر وہ میرا دکھ کیا جانیں۔ میں مدتوں سے بواسیر کا مریض ہوں یہ مرض اب ناسور کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زخموں کے باعث اکثر لیٹا رہتا ہوں۔ بیٹھتا بھی ہوں تو تکیہ کا سہارا ضروری ہوتا ہے، روزانہ سجاد حسین (مولانا کے صاحبزادے) میرے زخم صاف کرتے ہیں اُن سے مواد اور خون رِستا ہے۔ میں اگر دوسرے شعراء کے ساتھ مشاعروں میں قیام کروں تو میری وجہ سے انہیں کس قدر تکلیف پہنچے گی، جہاں عام شعراء قیام کرتے ہیں لوگوں کی آمدورفت بکثرت رہتی ہے بربنائے "تکلف مجھے بار بار اُٹھنا بیٹھنا پڑے گا" یہ میرے بس سے باہر ہے، میرے زخموں کی صفائی وہاں ناممکن ہے میں نہیں چاہتا کہ صاف ستھری فضا میری ذات سے گندی ہو۔ اور لوگ مجھ سے اس بنا پر تنفر کا اظہار کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دیگر حاضرین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں مگر یہ ناممکن ہے۔ یہ باتیں بھی میں صرف آپ سے کہہ سکتا ہوں ہر ایک سے کہنے کی نہیں۔ اب آپ ہی بتایئے اس میں میری کیا خطا ہے۔ مجھ پر جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں اور میری جس قدر مخالفتیں کی جاتی ہیں وہ بربنائے حسد ہیں۔ وہ لوگ میری مقبولیت اور شہرت نہیں دیکھ سکتے۔ میں حاسدوں سے نہیں ڈرتا وہ ایک دن خود اپنی آگ میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔

مجھے خدا نے حسد سے بچا لیا سیماب — ہزار شکر کہ محسودِ روزگار ہوں میں

علامہ مرحوم کی قادرالکلامی اور مشاقی کے سب ہی معترف تھے۔ شعر کہنا ان کے لئے بچوں کا کھیل تھا۔ کیسا ہی موضوع دیں ان کو اشعار موزوں کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ وہ شعر کہنے کی مشین تھے۔ میں نے انہیں اکثر فکرِ سخن کرتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ مشاعرہ کا وقت ہو گیا ہے۔ شاگرد جمع ہیں مولانا شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کرتے جاتے ہیں۔ ان سے باتیں ہو رہی ہیں اور اپنی غزل بھی کہہ رہے ہیں اگر تنہا ہوتے تو بوقت فکر وہ عام طور پر پلنگ پر کروٹ سے لیٹ جاتے تھے، قلم اور کاغذ قریب رکھ لیتے تھے اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے تھے۔ میں نے اکثر شعراء کو دیکھا ہے کہ وہ شعر کہتے وقت گنگناتے ہیں، ہاتھ پیر چلاتے ہیں، منہ بناتے ہیں، سگرٹ پر سگرٹ پیتے ہیں اور تب کہیں جا کر سات یا نو شعر کی غزل کہہ پاتے ہیں۔ مولانا کے لئے یہ تمام لوازمات غیر ضروری تھے۔ ہاں کبھی کبھی لیٹے لیٹے داہنے پیر کے پنجے کو ہلاتے جاتے تھے، اور جس قدر اشعار چاہتے تھے، موزوں کر لیتے تھے۔ مشاعروں میں کلام پڑھتے وقت بھی وہ جملہ روایتی تکلفات سے اجتناب فرماتے تھے۔ عام شعراء کی طرح میں نے انہیں ہر شعر پر جھک جھک کے سلام کرتے، اور اظہارِ کسرِ نفسی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ شعر عجب انداز سے ادا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے طریقہ کو نہ تحت اللفظ کہا جا سکتا ہے اور نہ مترنم۔ وہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔ ان کے پڑھتے وقت شعر اور شاعر دونوں کے وقار کا احساس ہوتا تھا۔ عوام کو تو ان کے اشعار پر داد دینے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ خواص کی داد پر وہ کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔ جب ان کو کسی اچھے شعر پر مشاعرہ میں داد ملتی تھی تو ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت کی روشنی دوڑ جاتی تھی۔

ان کی قادرالکلامی کے بارے میں ابھی میں عرض کر چکا ہوں۔ اپنے بیرونی اور مقامی پچاسوں شاگردوں کی غزلوں اور نظموں پر اصلاح دینا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ چند گھنٹے دن کے اس کام کے لئے وقف تھے۔ اگر کسی دن ڈاک کم ہوتی تھی تو فاضل وقت میں اپنے لئے کوئی غزل یا نظم کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے ان کے ادبی اور سیاسی رجحانات بھی جُدا جُدا ہوتے تھے۔ مولانا کو بہتوں کے نظریات سے اختلاف ہونا فطری تھا مگر اصلاحِ کلام کے وقت وہ اپنے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر شاگرد کے مسلک کے مطابق اصلاح دیتے تھے اور کسی کو اپنا نظریۂ حیات بدلنے پر مجبور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کے ہزاروں شاگرد ملک کی مختلف تحریکات سے وابستہ ہیں۔ بعض روایتی غزل گو ہیں بعض ترقی پسند گروپ سے منسلک ہیں۔ کوئی کانگریسی ہے تو کوئی مسلم لیگ کا ہمنوا ہے اور کچھ لوگ کمیونسٹ

اور سوشلسٹ جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی قادر الکلامی کے متعلق ایک لطیفہ سنیئے۔ حضرت علامہ ایک مرتبہ ٹونک تشریف لے گئے۔ ٹونک کے شعراء کی ایک انجمن نے مشورہ کیا کہ مولانا کا امتحان لیا جائے چنانچہ انہوں نے صبح حاضر ہو کر مولانا سے عرض کیا کہ آج شب کو آپ کو ایک مشاعرہ کی صدارت فرمانا ہے جس کا مصرع یہ ہے۔ " آکہ مجھے تاب انتظار نہیں ہے "۔ اور یہ کہ آپ کو اپنے اسکول کے دستور کے مطابق خطبۂ صدارت بھی پڑھنا ہوگا۔

اس زمین میں غالب کی ایک مختصر غزل ہے جس کی بحر نہ صرف اردو میں غیر مروّجہ بلکہ نہایت مشکل ہے۔ مولانا کو بھی کسی نے آگاہ کر دیا کہ آپ کا امتحان مقصود ہے۔ علامہ مرحوم نے بخوشی یہ دعوتِ امتحان قبول کر لی اور رات کو مشاعرہ میں نہ صرف طویل طرحی غزل پڑھی بلکہ اسی زمین اور اسی ردیف قافیہ میں ساٹھ ستّر اشعار کا خطبۂ صدارت بھی خلافِ معمول نثر کے بجائے نظم میں پیش کیا۔ مولانا کی اس قادر الکلامی پر بڑے بڑے اساتذہ دنگ رہ گئے۔ اور دوسرے دن کئی حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مولانا جس زمانے میں " وحیٔ منظوم " کی تکمیل فرما رہے تھے مجھے آگرہ میں ان کے ہمراہ چند دن قیام کا اتفاق ہوا۔ قرآن پاک کا ترجمہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مولانا صبح غسل فرماتے اور نماز سے فارغ ہو کر کمرہ میں آ بیٹھتے تھے۔ لوبان اور اگربتیاں جلائی جاتی تھیں۔ کلام پاک کے متعدد نسخے میزوں پر ارد گرد کھول کر رکھ دیئے جاتے تھے اس کے بعد وہ ترجمہ شروع فرماتے تھے۔ ایک ایک آیت کی تلاوت کرتے تھے پھر مختلف تراجم کا مطالعہ کر کے اس آیت کا ترجمہ نظم کرتے تھے دوپہر کو تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد سہ پہر سے پھر وہی شغل شروع ہو جاتا تھا۔ برسوں کا کام تھا مگر مولانا کو چونکہ زبان اور بیان پر بے انتہا قدرت حاصل تھی لہٰذا انہوں نے صرف ساڑھے پانچ ماہ میں یہ عظیم الشان کام سرانجام دے لیا۔ وہ اپنے اس کارنامہ پر بے انتہا مسرور تھے اور فرماتے تھے کہ میری یہ خدمت نہ صرف میری نجات کا باعث ہوگی بلکہ میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کی ضامن ہوگی۔ افسوس کہ سرمایہ کی کمی کے باعث یہ ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی نے کراچی سے صرف نمونتاً " پارۂ عمّ " کا ترجمہ چھپوا دیا ہے۔ حکومت پاکستان کو اس جانب توجہ کرنی چاہئے ایسا نہ ہو کہ دست و برد زمانہ کے ہاتھوں یہ نایاب گوہر ضائع ہو جائے۔

مولانا مرحوم بڑے پکے مسلمان تھے۔ عقیدتاً وہ سنّی تھے، تصوّف سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ حاجی وارث علی شاہ صاحب سے انہیں بیعت حاصل تھی وہ اپنے پیر سے بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ حاجی صاحب قبلہ کی ایک تصویر ان کے سرہانے آویزاں رہتی تھی۔ اور اس پر پھولوں کا ہار یا کبھی کبھی ایک پردہ لٹکا رہتا تھا۔ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے اگرچہ اس ضمن میں زیادہ محتاط نہ تھے۔ بزرگانِ دین اور پیشوایانِ اسلام سے انہیں گہری محبت تھی۔ محرم کے ایام میں غزلیں کہنا ترک کر دیتے تھے اور اس مہینے میں صرف سلام یا شہدائے کربلا سے متعلق نظمیں یا مرثیے نظم کرتے تھے۔ ان کے سلاموں اور اس قسم کی نظموں کے دو مجموعے ' مرود غم ' اور ' نفیرِ غم ' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مذہبی شغف کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے بزرگوں سے بھی ان کو دلی لگاؤ تھا۔ تعصب تو انہیں چھو تک نہ گیا تھا ان کے مجموعوں میں جہاں پیغمبرِ اسلام اور دیگر رہنمایانِ اسلام پر نظمیں ہیں وہیں ان کے دوش بدوش سری کرشن، گوتم بدھ وغیرہ کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ سری کرشن جی سے تو انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ہندو مذہب کے اس پیغمبر محبت کے متعلق بہت سی نظمیں مختلف عنوانات سے کہی ہیں جو کرشن گیتا کے نام سے شائع ہو چکی ہیں کرشن جی کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اظہار ان ہی کی زبان سے سنیئے۔ " کرشن گیتا کے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔

" مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں صرف سری کرشن سے بڑی عقیدت و محبت ہے اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رہنمان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق و محبت

کے جتنے نغمے پھیلے ہوئے ہیں ان کا سرچشمہ میں سری کرشن کی مشہور تاریخی بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ برج کے حدود میں سری کرشن کی بانسری نے جو گیت گائے ہیں ان کا اثر بندرابن اور مہابن کی رنگین فضاؤں میں آج تک محسوس ہوتا ہے۔ میں جب کبھی دہلی جاتے ہوئے برج کی سرزمین سے ریل میں گزرتا ہوں تو مجھے خاموش صحرا کے ٹیلوں پر اور چرنے والے مویشیوں کے جھنڈ میں اب تک سری کرشن بانسری بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

مولانا کو قدرت کے مناظر سے بھی بڑی دلچسپی تھی انہوں نے مختلف منظریاتی نظمیں لکھی ہیں۔ گلشن، پہاڑ، شفق، ابر، صبح، شام، چاندنی یہ تمام مناظر اُن کے لئے دلکشی کا سامان فراہم کرتے تھے اور دعوت کیف و نظر دیتے تھے مگر انہیں بوجوہ ندیا اور ساحل دریا سے نفرت تھی۔ ایک مرتبہ جب میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ مناظر دریا سے نفرت کا سبب ایک complex ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں وسط ہند گئے ہوئے تھے۔ وہاں انہیں 'مان ندی' کشتی کے ذریعہ پار کرنی پڑی، دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ جب کشتی درمیان میں پہنچی تو اُلٹ گئی مگر خدا کے فضل سے تمام مسافر بچائے گئے۔ مولانا مرحوم کو اسی دن سے دریا اور اس کی جملہ رعنائیوں سے نفرت ہوگئی۔ پہاڑ پر جانے کے لئے اکثر ان کا جی چاہتا تھا۔ وحی منظوم کے ترجمہ کے زمانہ میں میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ آگرہ کی اس روح فرسا گرمی میں اس قدر محنت کر رہے ہیں اگر منصوری یا نینی تال تشریف لے جائیں تو بہتر ہو۔ فرمانے لگے جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے مگر کیا کروں۔ پہاڑوں پر مکان بہ آسانی نہیں ملتے۔ میں تنہا جانا نہیں چاہتا اگر بچوں کو یہاں چھوڑتا ہوں تو دل ان میں لگا رہے گا اور میں یکسوئی سے کام نہ کرسکوں گا۔ اتنے بڑے خاندان کو لیکر کیسے جاؤں۔ میری طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی۔

انہیں اپنے اہل و عیال کا بڑا خیال تھا۔ خاندان میں پچیس تیس افراد تھے۔ مولانا سب کی فکر رکھتے تھے۔ چھوٹے بچوں سے تو انہیں خصوصی محبت تھی۔ اپنے تین یا چار سال کے پوتے انتصار سے اکثر کھیلا کرتے تھے اور اس کی پیاری پیاری باتیں سنکر بیحد خوش ہوتے تھے۔ انہیں اپنی قیمت کا احساس اس لئے بھی تھا کہ وہ اس عظیم خاندان کے کفیل تھے وہ فسادات سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں آگرہ میں مولانا کے یہاں مقیم تھا شہر میں ہندو مسلم فساد ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا بہت پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہر دس منٹ بعد تازہ حالات معلوم کرنے کی فکر ہے گھبرائے ہوتے کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔ میں نے جرأت کرکے عرض کیا۔ مولانا مسلمان کے لئے موت برحق ہے آپ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔ کہنے لگے۔ مجھے اپنی جان کی اتنی فکر نہیں۔ بلکہ تمہاری اور بچوں کی فکر ہے۔

مولانا کو اپنے وطن آگرہ سے بے پناہ محبت تھی وہ اسے تمام دنیا میں سربلند و معزز دیکھنا چاہتے تھے ان کو اس کی ادبی منزلت کا بھی بخوبی احساس تھا۔ ارض تاج کے عنوان سے انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ ان کی وطن دوستی کی شاہد ہیں ان نظموں میں آگرہ کی ایک ایک عمارت کا تذکرہ اس خوبی اور صداقت سے کیا گیا ہے کہ جواب نہیں، تاج کا حسن تو ان کی شاعری میں جذب ہی ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی تاج پر مختلف انداز سے اتنی خوبصورت اور کیف آفریں نظمیں کہی ہیں جو شاید تاج کے فنا ہو جانے کے بعد بھی اس کا نام باقی رکھنے کے لئے باقی رہیں گی۔ وہ پاکستان میں تھے، مگر ان کی روح آگرہ کی گلیوں میں بھٹکی پھرتی تھی اس جدائی سے انہیں کتنی روحانی تکلیف تھی اس کا احساس صرف وہی کرسکتا ہے جو اُن کی طرح وطن دوست دل رکھتا ہو۔

علامہ مرحوم کی ذات مجسم عمل تھی میں نے انہیں کبھی بیکار نہیں دیکھا۔ احباب اور شاگردوں میں بیٹھ کر غپ شپ لڑانا اُن کا شیوہ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے تقریباً ۳۰۰ کتابیں تصنیف کیں۔ اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر اکثر کتابوں کا حق اشاعت دوسروں کے نام فروخت کردیا۔ آخر میں چند کتابیں اپنے ادارہ قصر الادب کی جانب سے شائع کرائیں۔ ضعیفی میں بھی وہ رات دن کام کرتے تھے۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ پاکستان میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو تھوڑا سا افاقہ ہوتے ہی پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئے، فالج کے اثر سے جب خود لکھنے کے قابل نہ رہے تو اپنے چھوٹے صاحبزادے مظہر صدیقی سے ضروری خطوط کے جوابات اور غزلیں وغیرہ لکھواتے رہے۔ وہ دوسروں کو بیکار بیٹھے دیکھ کر تعجب کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ لوگ بیکار رہ کر وقت کس طرح گزار لیتے ہیں۔ ایسے صاحب فکر و عمل شخص دنیا میں شاذونادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس کہ علم و عمل کا یہ چراغ دنیا کو پچاس سال تک روشنی دیکر ۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں گل ہوگیا۔

مرزا یگانہ چنگیزی

سید اعظم حسین اعظم

آج سے چند دنوں قبل مرزا یگانہ چنگیزی کے ذاتی حالات سے میں کچھ زیادہ واقف نہیں تھا کیونکہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ میں نے سب سے پہلے شاید ۱۹۲۷ء میں مرزا یگانہ کے چند اچھے شعر انہی کے لب میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی سے سنے تھے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس طرح مجھ پر واضح فرمایا تھا کہ مرزا یگانہ نہ صرف اچھے شعر کہتے ہیں بلکہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس وقت مرزا یگانہ کے جو اشعار سنائے تھے ان میں سے دو ایک مجھے یاد ہیں اور دل سے پسند ہیں۔ وہ شعر یہ ہیں —

آہستہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے   شوخی نگہ پھیر آنکھ سے محمل یار دیکھ کر

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا   نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

اس کے بعد گاہ گاہ مرزا صاحب کا کلام ادبی رسالوں میں نظر سے گزرا ——— کئی سال بعد حکیم سید محمد قاسم صاحب کے معدن الادب میں مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدرآباد دکن میں سب رجسٹرار تھے۔ وہاں سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے روزنامہ سرفراز کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کے پرچہ کے لئے کلام کی فرمائش کی اور انہوں نے کچھ شعر مجھے عنایت کئے۔

یہ مرزا یگانہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ سیاہ رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، کم رو، سن رسیدہ آدمی نظر آئے۔ شخصیت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا مگر ان کی شہرت سن چکا تھا اور دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ان سے مل کر ذوقِ تجسس کو یہ تسکین ہوئی کہ یہی مرزا یگانہ ہیں۔

اس کے بعد طویل مدت تک مرزا یگانہ سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ رسائل میں یا خود ان کے مجموعۂ رباعیات میں مرزا غالب دہلوی کے متعلق ان کے معاندانہ اشعار پڑھ کر ان سے ایک طرح کی بیزاری دل میں پرورش پاتی رہی۔ ان اشعار میں صرف اپنی تعلّی اور غالب کی ہجو ہوتی تھی کوئی ایسی قابلِ لحاظ تنقید نہیں ہوتی تھی جس سے ان کے سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ملتا۔

مرزا یگانہ حیدرآباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ آئے تو کبھی کبھار انہیں دیکھنے سننے کا اتفاق ہوا، پھر بھی کوئی مسلسل ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع نہیں ملا۔ تقریباً دو سال ہوئے کہ ان کے خلاف مسلمانانِ لکھنؤ میں ایک ہیجانِ عظیم ہوا اور ایک دن ان کی بری گت بنائی گئی۔ جو تحریریں ان سے

منسوب کی گئی تھیں وہ ضرور قابلِ اعتراض تھیں مگر مجھے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کا یہ رویہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک پرائیویٹ خط کو اپنے اخبار میں شائع کر کے اس طرح اچھال دیا کہ پبلک قابو سے باہر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اخبار "روشنی" میں جو کہ اس وقت میری ادارت میں نکل رہا تھا" اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ اس اشتعال انگیزی میں حصہ لینے والے اخبارات میرے نزدیک مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے آلۂ کار بن رہے تھے۔

اس دوران میں مجھے مرزا یگانہ کے حالات ان کے بعض اعزائے خاص سے معلوم ہوتے رہے۔ میں نے سنا کہ مسلم ہجوم کی تشدد دانہ یورش کا اثر مرزا یگانہ کے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہوا۔ جس مکان میں رہتے تھے اسے انہوں نے یک لخت چھوڑ دیا اور رسمِ تشہیر کے بعد سے پھر پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس میں ان کی نادر کتابیں اور مسودات سبھی کچھ تلف ہو گئے۔ پولیس نے عوام کے ہاتھوں سے جب انہیں رہائی دلائی تو وہ ایک دوسرے مکان میں پہنچ کسی عزیز کے ہاں جا کر پناہ گیر ہوئے اور ایک عرصے تک وہاں رہے۔ مگر انہیں اپنے گرد و پیش پر اعتماد نہیں رہ گیا تھا لہٰذا وہ اس محلے سے منتقل ہو کر ایک اور محلے میں کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔ اس مکان میں یکہ و تنہا رہتے تھے، کوئی اور ساتھ نہیں تھا۔ تنہائی کی بڑی تکلیف تھی کہ جاڑے آتے ہی بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ حالت نازک ہو گئی، ایک رشتہ دار کو خبر ہوئی تو وہ اپنے مکان واقع محلہ شاہ گنج میں انہیں اٹھا لائے۔

میں اسی ہفتے محلہ شاہ گنج میں مرزا یگانہ سے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے ساتھ ملا۔ ایک پختہ مکان کے صاف ستھرے کمرے میں ایک طرف ان کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اس کی پٹی کے پاس ایک بڑے ظرف میں بہت سی راکھ رکھی ہے جس میں یہ بوڑھا، نحیف و بیمار شاعر بار بار کھانس کر تھوکتا رہتا ہے پلنگ کے سامنے ایک میز ہے جس پر کچھ کتابیں اور کاغذات اور کچھ چائے کے ظروف وغیرہ رکھے ہیں۔ وہیں زمین پر مٹی کے تیل کا چولہا (اسٹوو) اور چند پتیلیاں وغیرہ ہیں۔ ایک معمولی سی کرسی رکھی ہے۔ کمرے کے بیچ میں کسی اور شخص کا بستر زمین پر بچھا ہوا ہے جس کے بعد کمرے کے دوسرے کنارے ایک اور پلنگ لگا ہوا ہے مگر مرزا صاحب اس وقت کمرے میں بالکل تنہا تھے۔ کمرے کا دروازہ بند رہا کرتا ہے، جسے کسی کی آمد کی اطلاع ہونے پر مرزا صاحب خود اٹھ کر کھولتے ہیں اور پھر فوراً بند کر دیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب بہت بیمار ہیں اور اپنی زندگی سے تقریباً مایوس ہیں۔ اس عالم میں انہیں اپنی تنہائی کا بہت زیادہ احساس ہے کیونکہ ان کی اولاد میں پاکستان میں ہے اور ان کی شریکِ زندگی بھی اس وقت ان کے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنے مالی اور خاص کر مستقبل کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے بعض ضروری باتیں کرتے رہے۔ پھر "نقوش" کے لئے مضمون اور تصویر بھیجنے کا تذکرہ ہوا۔ کافی دیر گفتگو کے بعد ہم واپس ہوئے۔ تیسرے دن میں تنہا یگانہ صاحب کے یہاں دوپہر کو گیا۔ ان سے ملاقات گھنٹوں نشست رہی اور موصوف نے میری فرمائش پر اپنے حالاتِ زندگی بیان کئے۔ کبھی لیٹ جاتے تھے اور کبھی کھانسی اور ضیقِ النفس کی تکلیف سے بیٹھ جاتے تھے۔ تھوڑا سکون ہونے پر پھر لیٹ جاتے تھے اور سگریٹ جلا کر پینے لگتے تھے۔ کمرے میں سوا ہم دو کے کوئی اور نہیں تھا میں نے کافی غور سے ان کی باتیں سنیں اور ان سے بعض دور رس سوالات کئے جن کے جوابات پا کر میں اس فن کار کی بعض خوبیوں اور بعض کمزوریوں سے براہِ راست مطلع ہوا۔

مرزا یگانہ کا پورا نام مرزا واجد حسین ہے۔ ان کے والد مرزا پیارے صاحب تھے۔ یہ سنہ ۱۸۸۴ء میں شہر عظیم آباد کے محلہ مغلپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ ولادت غالباً ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۱ھ تھی۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسے میں ہوئی۔ پھر محمد جان اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں داخل ہوئے سنہ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ شعر و ادب میں مذاقِ سخن کی اصلاح سب سے پہلے مولوی سید علی خان بیتابؔ عظیم آبادی نے اور ان کے بعد شاد عظیم آبادی نے کی۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں علاج کے سلسلے سے لکھنؤ آئے، پھر یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۵ء سے لکھنؤ ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔

اُردو زبان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں اور زبان دانی، محاورہ بندی، جدتِ بیان اور جوشِ ادا کے لئے خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ دنیائے ادب میں تقریباً پچاس سال تک بہ خیالِ خود اپنے ادبی فرائض انجام دینے کے باعث بدنام رہے۔ عام طور پر یہی آوازیں آتی رہیں کہ عمر لڑنے جھگڑنے میں گزاری بہ مصداق

کے بدنام اگر ہو گئے تو کیا نام نہ ہوگا" مگر مرزا صاحب کے نزدیک ان کی یہ زندگی مجاہدانہ ادبی زندگی تھی جسے لڑنے جھگڑنے سے موسوم کرنا حق کی طرف سے آنکھیں چرانا ہے۔ ابتدا میں انہوں نے معاصرینِ لکھنؤ کے خلاف اس لئے آواز بلند کی کہ ان کے نزدیک ان معاصرین کی روش صحیح نہ تھی اور وہ غالب کی غلط تقلید کر رہے تھے۔ مرزا یگانہ نے اس سلسلے میں شعرائے لکھنؤ پر پُرجوش تنقیدیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لکھنؤ اور سارا اودھ ایک طرف ہو گیا اور مرزا یگانہ ایک طرف۔ اچھا خاصا محاذ قائم ہو گیا جس کا زور و شور تقریباً بیس سال تک رہا۔ لکھنؤ کے شعراء نے مرزا یگانہ کا اس حد تک بائیکاٹ کیا کہ جن مشاعروں میں وہ جاتے تھے اس میں تمام دوسرے شعراء شرکت نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مرزا یگانہ کو مشاعروں میں مدعو کرنے سے احتراز کرنے لگے۔

مرزا یگانہ نے تقریباً ۱۹۱۵ء سے مرزا غالب کے کلام کی تنقید یا تنقیص کرنا شروع کی۔ اس سے ان کا مقصد "غالب پرستوں" کی روش کی اصلاح تھی مگر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سارے ہندوستان کے شاعر و ادیب بلکہ یوں کہئے کہ کل اہلِ ذوق مرزا یگانہ سے بیزار ہو گئے۔ مرزا یگانہ کی "غالب دشمنی" بھی بڑھتی ہی گئی تا آنکہ انہوں نے غالباً ۱۹۳۵ء میں "غالب شکن" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔

"غالب شکن" کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک بار کانپور میں آل انڈیا شاعر کانفرنس زیرِ صدارت سر راس مسعود مرحوم ہوئی جس میں مختلف ادیبوں نے مقالے پڑھے۔ ایک مقالہ نگار نے اس وقت کے شعراء پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرزا یگانہ کے مجموعۂ رباعیات "ترانہ" کا حوالہ دیا جس میں مرزا یگانہ نے غالب کی ہجو میں سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ مقالہ نگار نے ترانہ کا حوالہ دیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا کہ ایک ایسا بلند خیال شاعر ایسی پستی تک اُتر سکتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ آپ نے کانفرنس سے واپس آکر لکھنؤ سے مرزا یگانہ کو حیدرآباد خط لکھا، جس میں کانفرنس کے مقالہ نگار کے قول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "آپ کے کمال کے قدردان آپ کی شاعری کے بارے میں اس سے بہتر رائے سننے کے خواہشمند ہیں۔"

پروفیسر مسعود حسین صاحب رضوی کے اس مختصر خط کے جواب میں مرزا یگانہ نے ایک نہایت ہی طویل مکتوب انہیں روانہ کیا جس میں اپنے رویہ کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے غالب پر بُری طرح لے دے کی تھی۔ اپنے اس مکتوب کو مرزا یگانہ نے بعد میں کتابی شکل میں "غالب شکن" کے نام سے شائع کیا۔ "غالب شکن" کے پہلے ایڈیشن میں جو رباعیاں درج ہیں ان میں محض غالب کی ہجو کی گئی ہے، کوئی تنقید نہیں ہے مگر جب "غالب شکن" کا دوسرا ایڈیشن "غالب شکن و آتشکدہ" کے نام سے شائع کیا تو اس میں بعض ایسی رباعیاں بھی اضافہ کیں جن میں غالب کے کردار کی بعض مبیّنہ کمزوریاں ایک حد تک دکھائی گئی ہیں۔

غالب پر مرزا یگانہ کے پے در پے حملوں سے ایک عرصے تک ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مختلف لہریں اٹھتی رہیں آخر کو فضا میں سکون ہو گیا اور بقول ان کے رفتہ رفتہ یہ مسئلہ بھی داخل دفتر ہو گیا۔ مرزا یگانہ کا عقیدہ ہے کہ یہ ایک فرض تھا جو فطرت کی طرف سے ان پر عائد کیا گیا تھا اور جسے انہوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ مرزا یگانہ جس وقت اپنی اگلی معرکہ آرائیاں بیان کرنے لگتے ہیں تو اس پیرانہ سالی اور بیماری کے عالم میں بھی ان کے چہرے پر ایک تازگی و شگفتگی سی آجاتی ہے، ان کی آواز بلند ہو جاتی ہے، ان میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عجیب فاتحانہ شان سے مسکراتے ہیں۔ اس مسکراہٹ میں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ تو ضرور ہی فاتح رہے، اب یہ احمق دنیا اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اس میں تو بہرحال شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مرزا یگانہ اپنی دُھن کے پکے ہیں۔ وہ ملک کے مذاقِ حاضرہ یا ملک کی موجودہ ادبی جماعتوں کا مطالبہ پورا کرنا کیسا ان کو قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ ملک کو وہی چیز دے سکتے ہیں جو وہ خود دینا چاہتے ہیں۔ ساری زندگی ان کا یہی مسلک رہا، جس پر ان کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ صلح و آشتی کی توقع ایسے اکھڑ اور اپنے اوپر بہت زیادہ بھروسا رکھنے والے شخص سے بالکل بے محل تھی۔

مرزا یگانہ کی یہ خودداری و خود اعتمادی جو اکثر حضرات کے نزدیک خود بینی و خود پرستی کی حدوں تک پہنچی ہوئی ہے، صرف شعر و ادب کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیاوی ترقی کے معاملات میں حتیٰ کہ اپنے نجی امور میں بھی کارفرما رہی ہے جس سے انہوں نے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد دکن کی سرکار وسیع و زرخیز ریاست میں بھی، جہاں بڑے بڑے مواقع ترقی کے تھے اور ان کے لئے ذرائع بھی نکل سکتے تھے انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔

اور فقط سب رجسٹراری کے چھوٹے سے عہدہ پر رہ گئے۔ بجائے سعیٔ ترقی کے وہ اپنے حکامِ بالا سے متصادم ہوتے رہے کیونکہ ان کے نزدیک ان حکام کی روش ان کے بارے میں معاندانہ و غیر منصفانہ تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے افسر کی انتقامی کارروائیوں سے نہیں دبے بلکہ ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہمیشہ اپنے ضمیر کا جھنڈا اونچا رکھا۔

اواخر ۱۹۴۲ء میں جبکہ مرزا یگانہ کی ملازمت ۵۵ سال کی بناء پر ختم ہونے والی تھی پرنس معظم جاہ بہادر نے مرزا صاحب سے خود فرمایا کہ آپ وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی باتنخواہ رخصت لے کر میرے پاس کیوں نہیں آ جاتے۔ پرنس کی یہ تجویز سن کر مرزا صاحب دل میں بہت گھبرائے کہ یہ تو وہی بات کہہ رہے ہیں جو مجھ جیسے شخص سے کبھی ممکن نہیں یعنی دربارداری۔ مرزا صاحب نے پرنس کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ اُدھر ان کا انسپکٹر جنرل رجسٹریشن بھی اس امر کا خواہاں ہوا کہ مرزا صاحب وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی رخصت لے کر جگہ خالی کر دیں تو وہ اپنا مہرہ اس جگہ بٹھا دے۔ مرزا صاحب نے رخصت نہیں لی مگر انسپکٹر جنرل نے مرزا صاحب کا تبادلہ تعلقہ یادگیر سے ایسی جگہ کیا جہاں مرزا صاحب جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر وہ نہیں گئے اور رخصت لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے پرنس کی درباراداری بھی قبول نہیں کی حالانکہ کم سے کم دو سو روپے ماہانہ ضرور ہی ملتے۔

مرزا یگانہ جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں وہی زبان سے کہتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے، ریا سے کام نہیں لیتے۔ وہ مصلحت بین و مصلحت کوش بھی نہیں ہیں۔ وہ تہذیب سے گفتگو کو نفاق و ضمیر کشی سمجھتے ہیں۔ عمر بھر لڑتے رہے جس سے دنیا ان سے بیزار و نالاں ہو گئی مگر وہ اپنی اس جنگجویانہ روش پر نادم و پشیمان نہیں ہیں بلکہ آج بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

مرزا یگانہ نہ صرف اردو کے عظیم المرتبت شاعر غالبؔ دہلوی کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں بلکہ فارسی کے بے نظیر غزل گو نظیریؔ نیشاپوری سے بھی اپنے کو بہتر و افضل تصور کرتے ہیں۔ آپ علامہ اقبالؔ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے خلاف بھی مضامین لکھے ہیں۔

مرزا یگانہ کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

(۱) "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیزؔ" یہ رسالہ اسی نام سے چھپا۔ اس میں اردو کے نامور شاعر عزیزؔ لکھنوی پر شدید حملے اور ان کے کلام پر اعتراضات ہیں۔

(۲) "اندھی نگری"۔ ایک مضمون ہے جس میں ہم عصر شعراء پر لے دے کی گئی ہے۔

(۳) "چراغِ سخن"۔ یہ عروض پر رسالہ ہے جس میں معاصر شعراء کی عروض دانی پر اعتراضات کی بارش کی گئی ہے۔

(۴) "ترانہ"۔ مجموعۂ رباعیات

(۵) "غالب شکن" جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۶) "ادبِ خبیث"۔ یہ ایک مضمون ہے جو "ادبِ لطیف" کے جواب میں لکھا گیا ہے اس میں اردو کے ان مضامین کی جو رسائل و جرائد میں "ادبِ لطیف" کے نام سے لکھے جاتے تھے پُرزور مذمت کی گئی ہے۔

(۷) "آیاتِ وجدانی" مرزا یگانہ کی غزلیات کا مجموعہ ہے اور شعری حیثیت سے یہی ان کا سب سے اہم ترکہ کہا جا سکتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ مرزا یگانہ کی غزل میں بہت اچھے اچھے شعر ملتے ہیں۔ غالبؔ کی غزلوں پر بھی انہوں نے غزلیں کہی ہیں اور ان میں بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کی زمین میں یگانہؔ کی غزل کا ایک شعر سنئے ؎

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

یگانہ کی بعض رباعیاں بھی بہت عمدہ ہیں۔ ایک رباعی سُنئے ؎

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کرلوں   یا دیر کا آخری نظارہ کرلوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا   اک اور گنہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

اہلِ مذہب کی نظروں میں یگانہ مطعون و مغضوب ہیں مگر خود یگانہ اپنے کو مسلمان سمجھتے اور مسلمان کہتے ہیں۔ البتہ وہ ایک آزاد خیال مسلمان ہیں اور بعض مذہبی نظریات کے متعلق کچھ اپنے مخصوص خیالات رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انتہائی غور و خوض، تحقیق و تدقیق کے بعد انہی نتیجوں تک پہنچے ہیں۔ ان میں کوئی تصنع و ریاکاری نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ غلط نتیجے تک پہنچے ہوں مگر ان کا دماغ یہیں تک انہیں لے گیا ہے لہٰذا وہ اس کے لئے مجبور ہیں۔ خیر اس نازک و ناخوشگوار بحث کو چھوڑیئے اور مرزا یگانہ کی ایک رباعی سنئے جس میں ان کی مذہبیت اور غالب دوستی دونوں ہی ایک ساتھ ظاہر ہوتی ہیں جو کہ بہت سے لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہے اور خود مجھے بھی مرزا یگانہ کی زبان سے یہ رباعی سُن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ کہتے ہیں ؎

دونوں ولولے ہیں علیؑ کے طالب   جان ایک ہے گو جُدا جُدا ہیں قالب
مذہب میں، شاعری میں، تربیت میں   غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

یہ رباعی سُن کر میں نے مرزا یگانہ سے کہا کہ اس میں تو آپ غالب کے قدردان نظر آتے ہیں۔ میرے جواب میں وہ بولے "مجھ سے بڑھ کر اور کون غالب کو سمجھ سکتا ہے؟"

یہ ہیں مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی ثم خاتمہ شاعران ادب "ثم "امام الغزل" ثم "غالب کے چچا"۔ اب آپ انہیں جو چاہیں سمجھئے۔ یہ آپ کے فیصلہ پر چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ اتنی استدعا ضرور ہے کہ کسی رائے کے قائم کرتے وقت یگانہ پر کوئی اتہام نہ عائد کیجئے گا۔ ان کی اصلی تصویر پیش نظر رکھئے گا کہ یہی تو ان کی خواہش ہے اور ایک ستّر سال کے بوڑھے خادم شعر و ادب کی آخری خواہش کا احترام بہرحال ضروری ہے۔

———

رضا علی وحشت

اظہر قادری

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے گھر میں مولانا رضا علی وحشت کا ذکر سنتا اور ان کا کلام رسالوں میں پڑھتا آیا ہوں۔ غالباً ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا کہ مجھے پہلی بار مولانا وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں میں اسکول کا طالب علم تھا۔ مولانا وحشت کے انداز گفتگو اور زبان کی شیرینی اور ملائمت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ جہاں انکو دیکھ کر میرے اندر ایک روحانی مسرت پیدا ہوئی وہاں ان کے وقار اور شخصیت کا رعب بھی مجھ پر طاری ہو گیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں واقعی ایک بہت بڑی شخصیت کے سامنے کھڑا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے دو چار سوال بھی فرمائے لیکن میں بُت بنا کھڑا رہا اور مجھ سے ان کے کسی سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ وہ مسکرا دئے۔ انکی مسکراہٹ میں تلخی یا تمسخر نہیں تھا بلکہ محبت اور بزرگانہ شفقت تھی۔ اس کے بعد سے مجھے مولانا وحشت کی خدمت میں برابر حاضری دینے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔

میں مولانا وحشت کی شخصیت کے تین جیتے جاگتے پہلو سمجھتا ہوں۔ پروفیسر، انسان اور شاعر۔ پروفیسروں میں عام طور پر ایک مخصوص رکھ رکھاؤ اور ضرورت سے زیادہ متانت، عالمانہ شان اور اپنے کو ہر وقت سب سے بڑے رہنے کا انداز پایا جاتا ہے۔ مولانا وحشت میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مولانا وحشت علم کا ایک بحر ذخار ہیں۔ بڑے سے بڑا عالم بھی انکے سامنے اپنے کو طفل مکتب محسوس کرتا ہے۔ باوجود اس کے وہ زندگی بھر اپنے کو طالب علم سمجھتے رہے، اور ہمہ دانی کی شان کبھی بھی اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ لوگ جنہیں وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے وحشت کو صرف اردو فارسی کا عالم سمجھتے ہیں یہ سچ ہے کہ وحشت نے اردو فارسی زبان و ادب کا بڑا گہرا اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان دو زبانوں کے علاوہ وحشت نے انگریزی زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ ان کی انگریزی تحریروں سے ان کی زبان دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جس زمانے میں مولانا وحشت اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے حیدرآباد دکن سے [illegible] یار جنگ بہادر تشریف لائے تھے۔ ان کو انگریزی میں ایک سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ انگریزی ادب کے ایک پروفیسر طاہر جمیل مرحوم کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا۔ طاہر جمیل مرحوم ایک انگریز پروفیسر ہوم کے پاس گئے اور ان سے سپاسنامہ لکھنے کی درخواست کی۔ پروفیسر ہوم (Holme) نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور انہیں مشورہ دیا کہ یہ سپاسنامہ مولانا وحشت سے لکھوایا جائے تو بہتر ہے۔ طاہر جمیل مرحوم کو پہلے تو یقین نہیں آیا اور سوچا کہ مولانا وحشت کو انگریزی سے کیا واسطہ لیکن بالآخر جب مولانا وحشت نے سپاسنامہ انگریزی زبان میں لکھ کر طاہر جمیل مرحوم کے سپرد کیا تو جمیل مرحوم کو سخت تعجب ہوا

اور انہوں نے دست بستہ کہا کہ "آج مجھ پر یہ راز کھلا کہ اُردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی حضور کو دخل ہی نہیں بلکہ ید طولیٰ حاصل ہے۔ میری نظر میں حضور کی قدر اور زیادہ ہو گئی ہے"۔ آخیر عمر میں مولانا ہندی زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوئے اور دو ہفتوں میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ ہندی لکھنا پڑھنا آ گیا۔ یہ انکی ذہانت کی دلیل ہے۔ مولانا وحشت کی ان ہی فضیلتوں اور علمیت کی بنا پر انکے ایک عزیز شاگرد کیپٹن قمر صدیقی مرحوم کہا کرتے تھے کہ "وحشت گدڑی میں لعل ہیں"۔

انسان کی حیثیت سے مولانا وحشت کا جواب اس زمانے میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ اس باب میں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرافت اور عجز و انکسار سے ان کا خمیر اٹھا ہے۔ یہ انکی شرافت کی دلیل ہے کہ آج تک کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ شکایت تو درکنار جس کو ان سے ایک مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کے خلوص اور حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے آج تک انہیں کسی کو تم کہہ کر خطاب کرتے نہیں دیکھا۔ معمولی سے معمولی انسان کو بھی وہ لفظ آپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ کسی کی شکایت کرنا کسی کو برا بھلا کہنا ان کی طبیعت کے خلاف ہے ہمارے یہاں کوئی دور ایسا نہیں جسے ہم شعراء کی معاصرانہ چشمک سے خالی کہہ سکیں۔ باوجود اس قدر نمایاں ترقی کے دَورِ جدید بھی معاصرانہ چشمک سے خالی نہیں۔ ایک ادیب کا دوسرے ادیب کو اپنے سے کمتر سمجھنا ایک لازمی بات ہے۔ لیکن اس بارے میں وحشت کا کردار سب سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کے اندر ہم ذرہ برابر بھی احساس برتری نہیں پاتے۔ وہ ہر کسی کو اپنے سے بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے معاصرین کا ذکر نہایت احترام و عزت سے کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب وحشت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نہایت عدیم الفرصت انسان ہوں۔ میرے پاس رہ کر آپ کچھ نہ سیکھ سکیں گے۔ اور اسی لئے اب میں نے شاگرد بنانا ایک طرح سے ترک کر دیا ہے"۔ ان صاحب نے فوراً پوچھا کہ سیماب صاحب (اس وقت سیماب صاحب حیات تھے) کے متعلق آپکا کیا خیال ہے۔ مولانا نے کہا کہ "سیماب صاحب کے متعلق میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت بہتر ہیں"۔ مشاعروں میں ہر شاعر یہاں تک کہ مبتدیوں کا کلام بھی نہایت غور سے سنتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ شعر میں جو فنی اور معنوی محاسن ہوتے ہیں ان کی طرف ہلکے ہلکے اشارے بھی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔

مہمان نوازی مولانا وحشت کی طبیعت ثانیہ ہو گئی ہے۔ جو لوگ ان کے یہاں جاتے ہیں وہ ان کی خاطر مدارات کئے بغیر انہیں آنے نہیں دیتے خود ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے مہمان کو صوفے پر بٹھاتے ہیں۔ عمر کی وجہ سے اب مولانا وحشت بہت نحیف و نزار ہو گئے ہیں۔ کمزوری کی بنا پر اٹھنے بیٹھنے میں انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کے یہاں چلا جاتا ہے تو فوراً مردانے میں آتے ہیں اور نہایت تپاک سے ملتے ہیں۔ اور جب تک وہ بیٹھا رہتا ہے خود بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ایسا کرنے میں انہیں سخت جسمانی کوفت محسوس ہوتی ہے لیکن اپنے ملنے والے کے اندر اپنی تکلیف اور اکتاہٹ کا ذرا بھی احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یہاں میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ مولانا وحشت کی خدمت میں ہر روز حاضری دینے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ مردانے تک آنے میں انہیں بڑی دقّت ہوتی ہے ان کے یہاں جاتے ہوئے ہمت نہیں پڑتی۔

وضع داری مولانا وحشت کے کردار کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے جس طرح اپنی وضع داری نباہی ہے اور نباہ رہے ہیں یہ انہی کے دل گردے کا کام ہے۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا اس زمانے سے لے کر آج تک ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں پایا۔ لمبی شیروانی، چوڑے پائنچے کا پاجامہ، سر پر ٹوپی، عمدہ قسم کا موزہ اور جوتا۔ یہ ہے مولانا کا لباس۔ شیروانی کی جیب میں ایک گھڑی رہتی ہے جس کی نقرئی زنجیر شیروانی کے بٹن میں لگی ہوتی ہے۔ یہ گھڑی مولانا کی جیب میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اس لئے کہ انہیں وقت کی پابندی بہت زیادہ عزیز ہے۔ ان کی زندگی میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ وہ کہیں وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے ہوں۔ مشاعروں میں عام طور پر لوگ دیر سے

پہنچتے ہیں اور اب تو یہ چیز ہمارے یہاں روایت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ لیکن مولانا وحشت ہمیشہ مشاعروں میں وقت مقررہ سے قبل یا ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جس کا یہاں بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ محسن کالج میں ایک مشاعرہ وحشت صاحب ہی کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ محسن کالج کلکتہ سے کسی قدر دور ہے جہاں لوگ عام طور پر ٹرین سے جاتے ہیں۔ ٹرین شام کے سات بجے چھوٹنے والی تھی۔ جانے والے تمام شعراء اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ اور مولانا وحشت کا انتظار کر رہے تھے۔ سات بجنے والے تھے اور مولانا وحشت اس وقت تک اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہو رہے تھے اور ان پر ایک بے چینی سی طاری تھی۔ سبھی کہہ رہے تھے کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے ورنہ وقت کی پابندی کا خیال مولانا سے زیادہ کسکو ہو سکتا ہے۔ سات بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ تمام لوگ مایوس ہو چکے تھے کہ اتنے میں دور سے مولانا وحشت ٹرین کی طرف تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو تمام لوگ ان کو لے کر ایک ڈبے میں داخل ہو گئے اور پھر فوراً ٹرین چل پڑی۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب نے مولانا وحشت سے کہا کہ "حضور آج خلافِ معمول ٹرین ایک دو منٹ دیر سے روانہ ہوئی۔ یہ اچھا ہوا ورنہ شاید ہم لوگ اس سے نہ جا سکتے۔" مولانا وحشت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "میں نے ہمیشہ وقت کا خیال کیا ہے۔ کیا آج وقت میرا خیال نہ کرتا۔" اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشت صاحب نے وقت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔

مشاعروں میں وحشت صاحب شروع سے اخیر تک ایک ہی انداز میں بیٹھے رہتے ہیں۔ چاہے مشاعرہ دو گھنٹے کا ہو یا رات بھر۔ پہلو بدلنا یا بیچ میں اٹھنا مولانا کی وضع داری کے خلاف ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص رات بھر مسلسل ایک ہی پہلو کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ رات بھر مشاعرے میں ایک ہی انداز میں بغیر پہلو بدلے بیٹھا رہنا مولانا وحشت کے لئے جس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہوگا اس کا احساس مشکل نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ بات ان کی وضع داری کے تحت آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آداب مجلس کا انہیں کتنا پاس ہے۔ کم لوگ ہیں جن کی نظر مولانا کی اس وضعداری اور خصوصیت پر پڑتی ہے۔ یہاں مجھے وحشت صاحب کا ایک شعر یاد آگیا جو خود انہی پر صادق آتا ہے:۔

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

خطوط کا جواب لکھنا اور فوراً لکھنا مولانا کے لئے ایک فرض سے کسی طرح کم نہیں۔ آج بھی جبکہ کمزوری اور لاغری کی بنا پر ہاتھوں میں رعشہ پڑ گیا ہے لکھتے وقت انگلیاں کانپتی ہیں اور بینائی بھی کسی قدر کم ہو گئی ہے اگر کوئی انہیں خط لکھتا ہے تو وہ اس کا جواب فوراً لکھتے ہیں اس لئے کہ یہ بات انکی وضع داری کے خلاف ہے کہ ان کی ذات سے کسی کی دل شکنی ہو یا کسی کو تکلیف پہنچے۔ وہ خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ وحشت صاحب کے ایک ہم جماعت تھے جو زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور تعلیم ترک کر کے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ وہ ہوٹل ہرگز ایسا نہیں تھا جہاں کوئی شریف اور معقول قسم کا آدمی جا کر بیٹھتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ وحشت صاحب جب کبھی اس راہ سے گزرتے تو بلا ضرورت بھی اس ہوٹل میں جا کر چائے ضرور پی لیتے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ کہیں مولانا کے اس ہم جماعت کے دل میں یہ گمان نہ گزرے کہ وحشت صاحب بڑے اور مشہور آدمی ہو گئے ہیں اس لئے مجھ سے ملنے میں انھیں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور اسے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مولانا جب کلکتہ میں تھے تو ان کے پاس ہمیشہ ٹرام کا پاس ہوتا تھا اور ٹرام والے پاس صرف فرسٹ کلاس کا دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا پاس جیب میں رکھے سیکنڈ کلاس میں بیٹھ جاتے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحشت صاحب کے اندر جھوٹی شان و شوکت کی نمائش ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔

وحشت صاحب کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ برصغیر ہندو پاک کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں ان کے دو چار شاگرد موجود نہ ہوں۔ ہندو پاکستان سے باہر مثلاً رنگون وغیرہ میں بھی انکے کچھ شاگرد ہیں۔ مولانا کے شاگردوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور ان کے تفصیلی حالات جاننا

بہت دشوار ہے اس لئے کہ مولانا دیگر شعراء کے برخلاف اپنے شاگردوں سے متعلق بہت کم باتیں بتاتے ہیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم (سابق گورنر آسام) بھی مولانا کے شاگرد رہتے اور ایک زمانے سے مولانا سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن مولانا نے اس کو اس طرح چھپا کے رکھا جیسے یہ کوئی انکا بڑا راز تھا لیکن اپنے مفتوں سے وہ زیادہ دنوں تک اس "راز" کو چھپا نہ سکے۔

مولانا اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے دُکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے کچھ قبول کرنا وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے شاگردوں کی امداد کرتے ہیں۔ اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن جن شاگردوں کی وہ مدد کرتے ہیں وہ خود اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی کسی شاگرد کی ملازمت جاتی رہی اور وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تو مولانا نے مسلسل ہر مہینے اسکو مالی مدد پہنچائی اور اپنے جیب خرچ دیتے رہے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا وحشت اپنے شاگردوں کو شاگرد نہیں بلکہ اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ اولاد کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اگر مولانا کے شاگرد انکے پاؤں دھو دھو کر پیتے انکو خدا کی طرح پوجتے اور ان کے لئے ہمہ وقت اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مولانا وحشت کو روپیہ پیسہ کا کبھی کوئی لالچ نہیں ہوا۔ روپیہ کو انھوں نے ہمیشہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا اور بس۔ انہوں نے آج تک اپنے کسی شاگرد سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ ایک مرتبہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی کو ایک نئی بات سوجھی اور انھوں نے غزلیں کہیں اور ہر غزل پر مختلف شعراء سے اصلاح لی اور ہر ایک کو اس غلط فہمی میں رکھا کہ وہ اسی کے شاگرد ہیں۔ پھر ۱۹۲۶ء میں ان تمام شعراء کی اصلاحوں کو ترتیب دیکر کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اور اس کا نام "اصلاح سخن" رکھا۔ اصلاح لینے کے زمانے میں مختلف شعراء سے ان کی خط و کتابت ہوئی تھی۔ اصلاح سخن کے آخیر میں ان تمام خطوط کو بھی "ضمیمہ اصلاح سخن" کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ خطوط بڑے پرلطف ہیں اور اس وقت کے اساتذہ کی افتاد طبع کی بڑی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ کسی صاحب نے ان سے مٹھائیاں طلب کیں کسی نے سندیلہ کے لڈو کی فرمائش کی کسی نے اپنی کتابیں خریدنے اور فنڈ میں روپیہ جمع کرنے کو کہا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں "میرا یہ بھی معمول ہے کہ جو صاحب مجھ سے اصلاح لیتے ہیں ان سے بغرض فاتحہ بزرگان و اساتذہ سلف ان کی توفیق اور ہمت کے مطابق کچھ نقد لے کر مٹھائی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ لہٰذا حسب توفیق بھیجیے۔ باقی رہی استاد کی خدمت یہ آپ جانیں اور آپ کی ہمت۔" دوسرے صاحب لکھتے ہیں "ہمیشہ اصلاح کے لئے باضابطہ شاگردی لازمی ہے۔ شاگردی کی مٹھائی عنایت فرمائیے۔" ایک صاحب لکھتے ہیں "آپ نے ...... فنڈ میں اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وقت دو کتابیں پریس جا چکی ہیں ...... ایک سو روپیہ کا خرچ ان دونوں کتابوں میں ہے۔ مجھے کتابیں بہت جلد بھیجنا چاہئے۔ اگر آپ اعانت فرما سکتے ہوں تو جلد توجہ کیجئے ...... امید ہے کہ آپ ذرا ہمت کر کے یہاں تک عنایت کیجئے اور جو کچھ مناسب رقم ہو سکے عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔" ایک صاحب ٹکٹ کے دام تک وصول کرنا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں "جتنی غزلیں ایک دم آئیں اتنے ہی ٹکٹ بھی آنا چاہئیں۔" ایک صاحب لڈو کی فرمائش یوں کرتے ہیں "حسن طلب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ جناب آپ سے ہم وطنی کی بنا پر ایک شکایت ہے۔ آپ نے جوابی لفافہ کیوں بھیجا کیا سندیلہ میں اب لڈو نہیں بنتے جو یہ ...... کا اہتمام کیا ہے۔ شکایت سن کر یقین ہے پارسل نہ بھیج دیجئے گا۔ اس کو بصیغۂ امانت رکھنے میں تعطیل گرما میں آکر خود لے لوں گا۔" ایک قبلہ نے تو اس معاملہ میں انتہا ہی کر دی۔ انکے خطوط بڑے دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہاں انکے مختلف خطوط سے صرف چند سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں فرماتے ہیں "میرے دیوان ...... کی اشاعت کے متعلق میرے شاگردوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے مصارف سے چھپوائیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے ایک فنڈ کھولا ہے آپ بھی چندہ بھیجیں ...... یہ پہلا بار ہے جو ڈالا جاتا ہے ...... اب تک تمہارے چندہ کا انتظار ہے .... کی اشاعت میں تم بھی کچھ مدد دو۔" آئندہ تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تمہاری امداد کا انتظار ہے۔" اپنے آخری خط میں یہ بزرگ کسی قدر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "مجھے سخت حیرت ہے کہ اب تک آپ نے ...... کی اشاعت میں کسی قسم کی امداد نہ دی۔ محض معذرت تو کافی نہیں توجہ کرنی

چاہیئے۔ ان تمام لوگوں کی فرمائش اور روپیہ کے تقاضے کے پیشِ نظر مولانا وحشت کا ایک خط بنام شوقؔ سندیلوی پڑھیئے۔ وحشت صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"عزیز محترم۔ السلام علیکم۔ گرامی نامہ مع غزلوں کے موصول ہوا۔ نہایت شرمندہ ہوں کہ اس سے قبل رسید نہیں لکھ سکا۔ عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ خدا خدا کرکے آج کچھ وقت ملا ہے اکثر احباب کے خطوط عرصہ سے آکر پڑے تھے اس وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کا کلام ماشاءاللہ بہت خوب اور پُراثر ہے۔ مجھ جیسے کم سواد کی اصلاح کا محتاج نہیں۔ لیکن از راہِ امتثالِ امر میں نے کہیں کہیں ترمیم کر دی ہے۔ خطوں کو رجسٹری کر کے بھیجنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ ڈاک کا انتظام یہاں پوری طرح قابلِ اطمینان ہے۔ ٹکٹ ملفوف نہ بھیجیں۔ چونکہ میں اس کا روادار نہیں ہوں لہذا جو ٹکٹ آیا تھا اسے واپس کرتا ہوں۔ امید کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ خیر اندیش۔ وحشت"

آج ہمارے شعراء حضرات کے لئے مشاعروں میں جانا اور اس کے لئے معاوضہ قبول کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں اور میری دانست میں ایسا نہیں ہونا چاہئے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ مولانا وحشت کو یہ ہرگز گوارا نہیں کہ وہ باہر کسی مشاعرے میں شرکت کریں اور اس کے بدلے انہیں معاوضہ دیا جائے۔ انہوں نے اس طرح کے کتنے ہی مشاعروں میں شرکت کی لیکن معاوضہ کی شکل میں ایک پیسہ بھی قبول نہیں کیا۔ وہ تو اس پر بھی مشکل سے تیار ہوتے ہیں کہ آنے جانے کا خرچ مشاعرے کے منتظمین کے ذمہ ہو۔ مولانا وحشت کی یہی وہ شرافت، وضع داری اور روپیہ پیسہ کی طرف سے بے نیازی ہے جس نے لوگوں کو انکا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ یہ انکی وہ خصوصیات ہیں جن میں آج ملک انکے شریک و حمایت ہیں۔ مولانا کی سادگی اور شرافتِ نفسی کو دیکھ کر بےساختہ مولانا حالی مرحوم یاد آجاتے ہیں۔ لہذا مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اس معاملے میں مولانا وحشت دورِ جدید کے حالی ہیں۔

مولانا وحشت کے بارے میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کو اس کے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ جہاں انہوں نے زندگی کے بڑے خوشگوار دن گزارے ہیں وہاں انکو حالات نے بڑے کٹھن دور سے گزرنے پر بھی مجبور کیا ہے۔ لیکن آفرین ہے انکی ہمت اور مستقل مزاجی پر کہ دل پر ہزاروں قسم کے غم اٹھاتے رہنے کے باوجود پیشانی پر شکن نہ آنے دی۔ احباب میں جب بیٹھے تو چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہی اور ان کے دل کی صحیح حالت سے کوئی بھی واقف نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا اور شعر کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے اور اس طرح کم سے کم دل کی بھڑاس تو نکال لی۔ وہ شخص جس نے وحشت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے انکے حسب ذیل اشعار سے ان کی زندگی کے ایک پہلو کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتا ہے۔

طور دیکھے ہیں زمانے کے ہمارے دل نے — اب کہاں اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے
طور دیکھے ہیں زمانے کے مجھے کیا غم اگر — مٹ گیا دل سے مرے نام و نشانِ آرزو
شکل کچھ ایسی بدل دی یاس نے امید کی — آرزو پر بھی نہیں ہوتا گمانِ آرزو
کوئی کس طرح مصیبت سے بچے دنیا میں — تجھ سے اور بھی ہیں عشق کا سودا نہ سہی
جہاں میں چھوڑ جاتا میں المناک ایک افسانہ — اگر مجھ سے مری رودادِ غم تحریر ہو جاتی
مجھے ضد ہے اپنی فلاح سے نہیں فائدہ مرا مدعا — ہے ضرر ہی سے مجھے واسطہ مرا نفع جیسے ضرر ہے

یہ اور اس قسم کے اشعار وحشت صاحب کے یہاں بکھرے پڑے ہیں جن کو ترتیب دے کر ہم اگر چاہیں تو انکی زندگی کا خاکہ تیار کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں انکی پچھلی زندگی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اوپر میں لکھ چکا ہوں عمر کی وجہ سے مولانا اب نہایت نحیف و کمزور ہو گئے

ہیں - باہر آنا جانا ان کے لئے ایک امر دشوار ہے - باوجود اس کے جب لوگ بہت مصر ہوتے ہیں تو کسی خاص صحبت میں وہ ضرور شریک ہو جاتے ہیں ؏

غزل اپنی مجھے پڑھتے ہی بنے گی وحشتؔ
پاس احباب سہی ، دل کا تقاضا نہ سہی

اب وحشتؔ صاحب شعر و سخن سے ایک طرح سے دست بردار ہو چکے ہیں ؏

نہ دو وحشتؔ کو بزم شعر میں تکلیف شرکت کی
کبھی کچھ کہہ لیا کرتا تھا اب اُس میں رہا کیا ہے

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کسی سے اپنا حال کہنا یا اپنی تکلیف و مصیبت بیان کرنا وحشتؔ کی خود دار طبیعت کے خلاف ہے - وہ ہزاروں غم سہہ لیں گے لیکن باہر والے کو اس کی خبر تک نہیں ہونے دیں گے ؏

کیوں سکوت اپنا بتائے سبب خامشی
کیوں نطق حال کہے دل کی پریشانی کا

ان دنوں وحشتؔ صاحب بہت رنجیدہ رہتے ہیں - اس کا ایک سبب ترکِ وطن ہے - وطن کا جب ذکر آجاتا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں - یہ غم ان کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے ؏

باعث اندوہِ دل غربت کا ہر منظر مجھے
کاہشِ جاں کا سبب یادِ وطن میرے لئے

وطن کے چھوٹنے کے علاوہ اس وقت جو غم کھا رہا ہے وہ پچھلے زمانہ کی یاد ہے - پچھلے واقعات جب انہیں یاد آتے ہیں تو باوجود سعی بھی انکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں - پچھلے ساتھیوں کو یاد کر کے وہ کڑھتے رہتے ہیں - اس وقت ان کے دل کی جو حالت ہوتی ہوگی وہ اہل نظر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں - اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کا کلام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے - پوری پوری غزل ایک ہی رنگ میں ہوتی ہے وہ سنگ جس میں ان کی زندگی کا رنگ جھلکتا ہے ؏

جو زندگی میں ہمیں کچھ امید ہی نہ رہی	تو زندگی ہی ہماری رہی رہی نہ رہی
دل فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا	کہ دہر میں کوئی شے وجہِ دلکشی نہ رہی
مقام شکر ہے کہ اک وقت ایسا آپہنچا	کہ دل کے حال سے خود دل کو آگہی نہ رہی
غلط ہے دُوں جو گلستانِ دہر کو الزام	جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی

اور آخری شعر تو بالکل انکے حسب حال ہے : -

یہ کیا ضرور ہے روؤں میں عیش رفتہ کو
برا ہی کیا ہے جو لب پہ مرے ہنسی نہ رہے

وحشتؔ صاحب شاعری میں صداقت کے قائل ہیں - ایسے خیالات جن میں صداقت کا فقدان ہوتا ہے ان کے نزدیک وقعت نہیں رکھتے وہ خود اپنے شعروں میں بھی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے ہیں کہ صداقت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے پائے وہ حد سے زیادہ مبالغہ کو پسند نہیں کرتے - انکا کہنا ہے کہ مبالغہ جب اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معما بن جاتا ہے شعر میں صداقت اور بلند خیالی کے علاوہ وہ لطفِ زبان کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ نہ صرف موضوع کوئی چیز ہے اور نہ صرف زبان

بلکہ موضوع اور زبان دونوں مل کر اپنا ایک مجموعی اثر پڑھنے والے پر چھوڑ جاتے ہیں۔

پسند آ نہیں سکتا ہے طبعِ وحشتؔ کو
وہ شعر جن میں کہ پوشیدہ کچھ نکات نہیں

وحشت صاحب نے شعر کہنے کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں جو آج سے بہت پہلے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں وحشت صاحب نے مولانا حالی مرحوم کی غزل گوئی پر ایک وقیع مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ جب یہ مقالہ حالی مرحوم کی نظر سے گزرا تو انہوں نے مولانا وحشت کو لکھا "مولانا آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے میری غزل گوئی کی طرف توجہ دی ہے۔ ورنہ اب تک لوگ مجھے قوم کا مرثیہ گو ہی سمجھتے رہے ہیں۔" ان باتوں سے وحشت صاحب کی نظر کی گہرائی و گیرائی اور شعور کی پختگی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

سلطان حیدر جوش

وحید احمد

یادش بخیر۔ مرحوم سلطان حیدر صاحب باپ کی طرف سے شیخوپورہ (بدایوں) کے فریدی خاندان سے تھے اور ماں کی جانب سے ان کا سلسلہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب دہلوی سے ملتا تھا۔ معلوم نہیں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ شیخ فاروقی تھے یا سید تھے مگر سیادت فریدی کو تسلیم کرنے والے سلطان حیدر کے نام سے پہلے سید لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کے والد نے پہلے عیش میں پھر راہ خدا میں اپنی کثیر جائداد لٹا دی تھی۔ سخاوت میں وہ مشہور تھے۔ چہرہ پر نور برستا تھا اور بڑھاپے میں بچوں کی سی باتیں، پُر وقار ظرافت سے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کا بچپن اپنی والدہ صاحبہ کے زیر سایہ دہلی میں گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ پہنچے۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں بعہد نواب محسن الملک جب کالج میں اسٹرائک ہوا تو انہیں علی گڑھ کو خیرباد کہنا پڑا اور سلسلہ تعلیم ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ وقت بیکاری میں گزرا اور کچھ سعیٔ ملازمت میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲ء میں ملازمت تحصیلداری سے شروع کی اور نیک نامی کے ساتھ ۴۶ء میں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پائی۔ علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور وہیں ار مئی ۵۳ء کو ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو رہے۔

دہلی میں فٹ بال ٹیم کے اچھے کھلاڑیوں میں تھے۔ میچوں کے سلسلہ میں قلعہ کے انگریزی فوجیوں سے مراسم ہو گئے تھے۔ انگریزی تہذیب کے رسیا تھے علی گڑھ کالج کی فٹ بال ٹیم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ صاحبیت کے منازل طے کرنے کا یہاں خوب موقع ملا۔ اور "سلطان بل" کے خطاب سے نوازے گئے۔ لباس عمدہ اور دیدہ زیب پہنتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ سوٹ میں کوئی سلوٹ دراندازی کر سکے۔ جسمانی ورزش کا ہر زندگی میں شوق رہا۔ ورزش اور ملازمت نے پابند اوقات بنا دیا تھا۔ اسی واسطے عادات و اصولوں میں استقلال تھا۔ کم آمیز تھے لیکن جس سے ملتے خلوص سے ملتے۔ تصنع اور ظاہر داری کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ ماشاء اللہ جسیم و وجیہہ ہونے کے ساتھ زندہ دل تھے۔ ظرافت اُن کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ شرارت و شوخی فطرت میں داخل تھی۔ ان کی صحبت میں وقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا۔ آخر میں ثقل سماعت نے سُقم پیدا کر دیا تھا مگر اپنی ظرافت سے اُسے نباہ لے جاتے تھے۔

نام یاد نہیں، مگر ایک مسلمان عالم و فاضل مذہب عیسوی قبول کر کے پادری کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے اور دہلی میں منظر عام پر مناظرے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کو مناظرے سننے کا شوق تھا لہٰذا منطق سے ان کی دلچسپی بڑھی اور پھر منطق کی تحصیل بھی کی۔ اسی زمانہ میں ناولوں کا بھی چرچا شروع ہوا تھا لہٰذا طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک معمولی سا ناول شائع کر کے مصنف بن گئے تھے۔ "افسانہ دانی" کے عہد میں شاید شاعری سے شوق رہا ہو لیکن ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بجز اس کے کہ جوشؔ تخلص رکھتے تھے۔ بہرحال ان کا قلمی شوق دراصل رسالہ مخزن سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی دو تین مضمون اگر قابل اعتنا نہ ہوں تو نہ سہی لیکن پھر ان کے مضامین میں اہمیت و خصوصیت جھلک مارنے لگی تھی۔ انگریزی رسالوں۔ مس کوریلی کے ناولوں۔ آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کے ڈراموں اور دیگر یورپین تصانیف کے پڑھنے کے بعد انہیں فسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے مقبول و دلچسپ طرز کے مالک بن گئے۔ رسالۂ تمدن میں ان کے جملہ مضامین و افسانے ان کی پختگی کے مظہر ہیں۔ تمدن میں پروفیسر مشتاق زاہدی صاحب سے پردہ کے متعلق بحث چھڑ گئی تھی۔ اس قلمی نبرد آزمائی سے رسالۂ تمدن کی ہردلعزیزی اور اشاعت میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ سلطان حیدر اور پردہ کی موافقت میں میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور غالباً یہ میرا پہلا تبرّعلہ

جب مولانا شوکت علی صاحب نے علی گڈھ سے رسالہ "اولڈ بوائے" جاری کیا تو جوشؔ صاحب اپنے مضامین کے ذریعہ اس رسالہ کی روح و رواں تھے۔ پھر مولانا محمد علی صاحب نے دہلی سے کامریڈ کے ساتھ روزانہ ہمدرد بھی نکالا تو اس کے اسٹاف میں سیّد محفوظ علی صاحب۔ محمد فاروق صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب جیسے گراں قدر اہل قلم شامل تھے۔ ہمدرد میں اودھ پنچ کے مرحوم حاجی بغلول صاحب نے سیاسی آن بان کے ساتھ از سر نو جنم لیا تھا۔ اس موقع پر سلطان حیدر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین سے ہمدرد میں چار چاند لگا دیئے اور خوب خوب داد حاصل کی۔

کہنہ مشقی نے اب انہیں مستقل تصانیف کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے دو کتابیں لکھیں۔ "ابن مسلم" ایک ناول ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے آج بھی جدت کا نمونہ ہے۔ اس میں کردار نگاری کے وصف کو انتہا تک پہنچا دیا ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا دوسرا ایڈیشن میں نے اپنے نقیب پریس بدایوں سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا اور اب تیسرا ایڈیشن لاہور سے چھپا ہے۔ اس کی اشاعت ۵۳ء میں سلطان حیدر کے انتقال سے چند ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ ان کی دوسری کتاب بانیٔ شیخوپورہ محتشم خان نواب فرید کی سوانحعمری ہے جو دورِ جہانگیری، شاہجہانی اور عالمگیری سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں تاریخ کی خشکی کو ادب کی رنگینی کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔ ان تصانیف کے بعد ان کی تحقیق اور ان کے مطالعہ میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ ریفئیل۔ آنجلو اور دیگر ماسٹرز کی تصاویر اور آرٹ کی گہرائیوں میں رسائی حاصل کی اور اس مطالعہ کے نتائج الناظر لکھنؤ۔ کہکشاں لاہور۔ نقیب بدایوں۔ اور سرگزشت علی گڈھ وغیرہ میں نہایت آب و تاب سے جلوہ گر ہوئے۔ ان کے متعدد افسانے مثلاً "ہوائی" اور "نقش نقاش" ان کی بے مثال اور بیش بہا یادگار ہیں۔ رسالۂ الناظر لکھنؤ میں ان کی کسی ظریفانہ بات پر حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے قرآنی لغت میں "سلام" پیش کر کے اعتراض کیا تھا اور ان سے نوک جھونک شروع کی تھی جو ان کے جواب کے بعد ہی ختم ہو گئی۔ دورانِ ملازمت میں پہلی جنگ جرمن کے موقع پر ریکروٹنگ آفیسر بنا دیئے گئے تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے فوجی زندگی اور جنگ کے اصولوں کے متعلق کافی واقفیت و معلومات حاصل کی تھی۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں اکثر میدان جنگ کے نقشوں کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔ سلطان حیدر صاحب مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید کے اصول کے قائل تھے۔ اپنی تصانیف کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اشاعت کے متعلق بے نیاز رہے اور تجارتی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ ابن مسلم کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت اور افسانوں کی طباعت کی اجازت وہ اپنے چند احباب کو بلا معاوضہ عطا کر گئے ہیں۔

ولایت سے میری واپسی ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی۔ یہ حضرت اس وقت ہردوئی میں تحصیلدار تھے۔ اتفاق سے وہاں پر بہترین صحبت و

سوسائٹی مہیا ہو گئی تھی۔ سید ضامن علی صاحب۔ سید مسعود الحسن صاحب رضوی اور مولوی بدرالحسن صاحب اودلوی وہاں ڈپٹی کلکٹری پر فائز تھے۔ سب کے سب زندہ دل اور با مذاق تھے۔ ان سب کی روحِ رواں بدرالحسن صاحب تھے اور سلطان حیدر اس سوسائٹی کے پُر زور رُکن اعلیٰ تھے۔ بدرالحسن صاحب قبلہ کی تعریف محض اس قدر کافی ہے کہ متقی مسلمان ہیں اور علی گڑھ کالج کی بہوتی سوسائٹی کے مہتاب تھے۔ ہردوئی کے دیگر مذاق سلیم رکھنے والے احباب کے علاوہ سلطان احمد صاحب بیرسٹر اور جانِ ظرافت، چودھری محمد علی صاحب قبلہ اس سوسائٹی کے ممبر تھے اور چودھری صاحب کا شوق اُن کو کشاں کشاں ردولی سے یہاں لے آیا کرتا تھا۔ سوسائٹی کے صدر صاحب نے فرمان جاری کیا کہ ممبران آپس میں اپنے انداز و طرز میں گفتگو کیا کریں اگر روزمرہ کی عادت کے طور پر گفتگو کسی نے کی تو ایسا مجرم ممبری سے خارج کر دیا جائے گا۔ شاعر ممبران کو حکم ہوا کہ شاعری بھی عامیانہ روش کو ترک کر کے سوسائٹی کے رنگ میں کی جایا کرے اور اعلانِ عام ہوا کہ شاعر ممبران میں سے کوئی ایک صاف ستھری غزل لکھے۔ پھر اس غزل کو بہ یک وقت تمام اُستادانِ فن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیج دے۔ اس سوسائٹی کی میٹنگ کے وقت اگر کوئی غیر ممبر آ پھنستا تو باوجود اپنی قابلیت و ہمہ دانی کے ہکّا بکّا ہو کر رہ جاتا اور اس کے پلّے کوئی بات نہ پڑتی۔ امیر حسن مرحوم انسپکٹر زراعت نے شاعری کے اس خاص طرز میں کمال حاصل کیا۔ شوکتِ الفاظ سے مشاعروں میں داد حاصل کرتے اور داد دینے والا جب مفہومِ شعر سمجھنا چاہتا تو سر کھجلا کے رہ جاتا۔ ان کی "ٹکڑے کر دیئے" والی مُرصّع غزل کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔ اس شعر کا ایکٹنگ اور تصوّر کس قدر دل خوش کن نظارہ پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اُس نے پہلے مُس کہا۔ پھر تق کہا پھر بِل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

نشتر سندیلوی کو جب جملہ شاعرانِ باکمال کی اصلاحیں موصول ہو گئیں تو صنفِ شاعری و ادب میں اضافہ کرنے کی غرض سے کتابی صورت میں شائع کی گئیں۔ اور بڑے بڑے ماہرانِ فن کی شخصیتوں کو چمکا کر دکھا دیا گیا۔ غرض ہردوئی کی اس سوسائٹی میں سلطان حیدر کو پروان چڑھنے کا بہترین مرتع ملا۔ رسالۂ نقیب بدایوں کے اجراء کا تصور اسی سوسائٹی نے پیدا کیا تھا۔ بدایوں پہنچ کر جب سید محفوظ علی صاحب رح سے میں نے مشورہ کیا تو وہ دل و جان سے سرپرستی پر آمادہ ہو گئے۔ نقیب نے ادب و ظرافت میں کس قدر اضافہ کیا مجھے نہیں معلوم لیکن یہ واقعہ ہے کہ سید محفوظ علی صاحب کو ایک مرتبہ محمد علی صاحب نے گوشہ سے نکال کر دنیائے ادب کو ممنون کیا تھا اور دوسری مرتبہ محمد علی صاحب کی تقلید کا فخر مجھے حاصل ہوا۔

سلطان حیدر صاحب کے معمولات میں تھا کہ وہ ہر صبح کو ورزش و نماز سے فارغ ہو کر اور ناشتہ سے پہلے اپنے ملازمین سے ظرافت فرمایا کرتے تھے۔ اور اس طرح بلاناغہ طبعِ رسا کے سمندر کو دن بھر کی البیلی رفتار پر چلانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مستقل ڈرامہ تھا جو مستقل طور پر صبح کے وقت کھیلا جاتا تھا یعنی جا و بیجا وجہ تراش کر ملازم یا چھوکرے پر گالیوں کی بوچھار کی جاتی تھی کہ کرسی صاف نہیں کی۔ میز ٹیڑھی رکھ دی۔ چلم سے چنگاری کیوں اُڑتی ہے۔ ملازمین اس انعام کو دعائیں سمجھتے تھے اور کبھی مساوات ہو جانے پر جان بوجھ کر اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے کہ پارہ تیز ہو اور ہر اعتراض کا جواب ترکی بہ ترکی دیا کرتے تھے۔ حتّٰی کہ ناشتہ کا وقت آ جاتا۔ ناشتہ کھاتے وقت گھر والوں اور ساتھیوں کو سُنا سُنا کر اپنے آپ کو حق بجانب اور ملازم کو ملزم قرار دیا کرتے تھے اس کے بعد دن چین سے ہنستے کھیلتے گزرتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ روتوں کو ہنسا دیا کرتے تھے ہر مصیبت زدہ کو اس کی بہتری کیلئے صلاح مشورے دیا کرتے تھے اور پوری ہمدردی کرنے میں انہیں باک نہ تھا لیکن بربنائے وہم جب ذاتی پریشانی ہوتی تو اپنے انداز کو قائم رکھتے ہوئے زمین و آسمان کو زیر و زبر کر دینا بھی ان کی عادت میں داخل تھا اور بڑی مشکل سے ان کو تسکین حاصل ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اپنی موجودہ زندگی پہ نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا کہ تمدن میں پردہ کے متعلق ہم نے غلط بحث کی تھی۔ پردہ تو جہالت کی بات ہے۔ میں نے کہا۔ کہ آپ اپنی جہالت کا پردہ فاش کر رہے ہیں۔ میں تو پردہ ہی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ صحیح یاد نہیں۔ غالباً ۳۹ء میں دہلی پہنچکر اپنے کرہ

ڈاکٹر محمود اللہ جنگ کی معیّت میں مجھے مولوی عبدالسلام صاحب (جن کو بندۂ حسن آزاد بھی کہتے ہیں) کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کالی چوڑی کی مسجد کے سامنے مختصر سے بالاخانہ پر ان کا قیام تھا۔ فقہ و حدیث میں کامل ہونے کے ساتھ بڑے پایہ کے ولی بھی ہیں۔ اپنی کیفیت میں سرشار رہتے ہیں۔ علم کلام میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ خوب تقریر فرماتے ہیں۔ برابر بولتے رہتے ہیں۔ اور نئی تراش خراش کی علمی گالیاں ایجاد کرنے میں ان کی مثال نہیں۔ مجھ سے یہ سُن کر کہ میں شیخوپور کا رہنے والا ہوں برجستہ سلطان حیدر کے متعلق استفسار کیا اور فرمایا بڑے کٹر قسم کا دہریہ تھا، وجود مطلق سے انکار کرتا تھا۔ بڑی مشکل سے مثنوی کا ایک دفتر پڑھا کر میں نے اسے راہ پر لگایا تھا۔ جب میں نے بعد میں سلطان حیدر سے اس کا تذکرہ کیا تو اقبال کیا اور مولانا کی صفت و ثنا کرنے لگے۔

پنشن کے بعد مستقل قیام علی گڈھ میں تھا مگر شیخوپور بھی آکر رہا کرتے تھے۔ بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کے انتظامات میں خرابی واقع ہوئی اور اس کے متعلق اس کے صدر صاحب کلکٹر سے استدعا کر رہے تھے کہ انتظامیہ کمیٹی میں بہ حیثیت وزیٹر کے تشریف لا کر ٹرسٹیوں میں مینجری کے متعلق تصفیہ کر دیں تو اس وقت میں اور سلطان حیدر صاحب صاحب ضلع سے ملنے اتفاقیہ پہنچے۔ کلکٹر صاحب نے سلطان حیدر سے کہا آپ ٹرسٹی بھی ہیں پنشن بھی حاصل کر چکے ہیں لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ کالج کے سیکرٹری بن جائیں تاکہ یہ بدنظمی دور ہو جائے۔ یہاں کی صورتِ حال پر غور کئے بغیر یہ حضرت راضی ہو گئے۔ صاحب نے صدر صاحب سے کہا اب میرے آنے کی ضرورت نہیں۔ صدر صاحب سیکرٹری شپ کے نزاع کو انہیں منتخب کر کے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں۔ صدر صاحب نے بڑے تپاک سے وعدہ کیا۔ معاملہ طے ہو گیا اور سلطان حیدر صاحب انتظامات کے منصوبے گانٹھتے ہوئے گھر پہنچے۔ دوسرے دن صدر صاحب نے میٹنگ میں یہ کہہ کر کہ سلطان حیدر صاحب کی استدعا پر کلکٹر صاحب نے یہ حکم دیا ہے لہٰذا آپ غور کر لیں اور سلطان حیدر صاحب کو سیکرٹری بنا لیں۔ پروپیگنڈا پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ٹرسٹیوں نے ان میں دو ہزار عیب نکالے اور ان کو سیکرٹری منتخب نہیں کیا۔ جب واپس آئے تو روئداد مجھے سُنائی۔ افسوس کی انتہا تھی۔ اس لئے نہیں کہ منتخب نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے کہ بیجا نکتہ چینی کے بعد مضحکہ اڑایا گیا۔

اب اس عرصہ میں اُن کے کچھ احباب عالم بالا کو منتقل ہو گئے اور کچھ احباب پاکستان چلے گئے۔ ان بیرونی و خانگی انقلابات نے ان کی جان پہ بنا دی اور ان کی ظرافت شوخی نے بھی نیا وطیرہ اختیار کر لیا۔ بھائی عظمت اللہ خان کی وفات پر انہیں سخت صدمہ تھا۔ اس لئے کہ ان کے ذوق کی اصلاح کرنے میں ان کو بہت دخل تھا۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ بس ہندوستان میں ایک تم ہو اور لاہور پاکستان میں عطاء اللہ بیرسٹر ہیں جن سے میری ڈھارس بندھی رہتی ہے۔ عطاء اللہ صاحب ان کے خالہ زاد بھائی اور بچپن کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد جب بہ حیثیت پارلیمنٹری سیکرٹری کے مجھے علی گڈھ کے دورے پر جانا پڑا تو ان کو لکھ دیا تھا کہ میری مصروفیات مجھے ڈاک بنگلہ میں رہنے کے لئے مجبور کرتی ہیں ان سے فارغ ہو کر میرا وقت آپ کے یہاں گزرا کرے گا۔ دوسرے دن صبح کو جب اُن سے ملنے گیا تو میری صورت دیکھتے ہی برس پڑے میرے عہدہ کو سینکڑوں صلواتیں سُنا دیں۔ اور میرا اسباب ڈاک بنگلہ سے اپنے یہاں منگوا لیا پھر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کیں جن سے میں ان کو بچانا چاہتا تھا۔ دورانِ گفتگو میں مجھے یہ بتا دیا تھا کہ جواباً عطاء اللہ کو میں نے لکھ دیا۔ کہ فکر نہ کرو اس لئے کہ اقلیت ہر جگہ اور ہمیشہ مظلوم ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس نکتہ کی تائید کی۔ جب میں حاکم ضلع سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھ سے جائے قیام کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ سلطان حیدر میرے چچا زاد بھائی ہیں لہٰذا ان کے حکم کی مجھے تعمیل کرنا تھی۔ بڑی جرت کے ساتھ صیغۂ راز میں کلکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ تو پاکستانی جاسوس ہیں۔ میں نے ان کے خط پکڑے ہیں اور عنقریب اُن پر مقدمہ چلانے والا ہوں۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا کہ کس کو لکھے ہیں اور کیا لکھے ہیں۔ جواب ملا کہ عطاء اللہ کو لکھے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ اقلیت مظلوم ہوتی ہے۔ میں ہنس پڑا۔ میں نے اصل واقعہ سمجھا کر انہیں یقین دلا دیا کہ سلطان حیدر کو سیاست سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔ اور اب تو اپنے بعض مضامین میں کانگرس کو انہوں نے سراہا ہے

آپ کا مقدمہ ناکام ہوگا۔ تو تسلیم کرنے کے بعد اس شکایت کو باقی رکھا کہ باوجود پنشن یافتہ ہونے کے مجھ سے ملنے کبھی نہیں آئے۔ میں نے اُن کی اس کوتاہی کی توجیہہ کر کے وعدہ کر لیا کہ اب وہ ملنے آئیں گے۔ گھر جا کر پورا لطیفہ سُنا دیا اور عرض کیا کہ مل آئیے۔ اب تو ایسے بکھرے کہ آتے ہیں تو جاتے نہیں۔ کہنے لگے میں کبھی ملنے نہیں جاؤں گا۔ اب وہ مجھ پر مقدمہ چلائیں۔ میں اور بھابی صاحبہ ہنسنے لگے۔ مگر صاحبزادے اور صاحبزادی صاحبہ نے اُن کی بے طرح خبر لی کہ نہ دوست کو سمجھیں نہ دشمن کو سمجھیں برآمدہ میں بیٹھ کر ہر کس و ناکس سے چیخ چیخ کر اخباری مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی C - I - D یا دشمن رپورٹ کر دے تو موجودہ فضا میں کوئی سننے والا نہیں اور بُرا دن دیکھنا پڑے گا۔ ٹھنڈے ہو کر قائل ہوئے اور دوسرے دن کلکٹر صاحب کے یہاں جانے پر راضی ہو گئے اب یہ نہیں معلوم کہ کلکٹر صاحب کو انہوں نے رام کیا یا خود رام ہو گئے مگر بہ خیر گزشت۔

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سلطان حیدر بہ حیثیت انسان کے مرنجان مرنج تھے۔ بہ حیثیت ادیب اور ظرافت نگار کے بلند پایہ رکھتے تھے لیکن بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کی شوخی اور زندہ دلی نئے قسم کی تھی۔ جس کو عام مذاق کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کیا عجب ہے کہ بیشتر ڈپٹی کلکٹر صاحبان کا یہی مذاق ہو۔ اس کو ایک مثال دے کر سمجھاؤں گا کیونکہ ان عواصف کو سمجھنے کی قابلیت اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ کانگرس گورنمنٹ نے نیا نیا چارج لیا تھا۔ میں محض کونسل کا ممبر تھا اور سلطان حیدر کی لمبی چوڑی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ میرے ساتھ لکھنؤ اس لئے گئے کہ چھٹی کے بعد اُن کی تعیناتی علی گڈھ ہو جائے۔ میں نے قدوائی صاحب سے اس قسم کا وعدہ لے کر انہیں بتا دیا مگر یقین نہیں آیا تو انہیں ساتھ لے جا کر ان کے سامنے چیف سیکرٹری موڈی صاحب کو نوٹ لکھوا دیا۔ شام کو جب کونسل کے اجلاس سے کمرے پر پہنچا تو فرمایا مجھے متحقق ہوا کہ قدوائی صاحب کی موڈی صاحب نہیں مانیں گے۔ اس لئے پنتھ جی سے کہلوا دو۔ دوسرے دن میں نے پنتھ جی صاحب سے عرض کیا اور انہوں نے بھی وعدہ کر لیا۔ اور میں سمجھا کہ اب ان کو اطمینان ہو جائے گا۔ مگر بولے تو یہ بولے کہ چیف سیکرٹری بھلا ان منسٹروں کی کب ماننے والا ہے۔ گھبرا کر میں نے عرض کیا تو اب آپ موڈی صاحب سے خود مل لیجئے۔ اس پر انہوں نے سپر ڈال دی اور موڈی صاحب سے ملنے کو گئے۔ موڈی کے سامنے قدوائی صاحب کا نوٹ موجود تھا اس نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ علی گڈھ چاہتے ہیں؟ جواب دیا کہ علی گڈھ ہو یا کوئی سا بدایوں کے قریب کا ضلع ہو۔ اور ساتھ ہی ایٹہ کا نام بھی تجویز کر دیا۔ اس نے پھر دریافت کیا کہ ترجیح کس کو دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا ایٹہ کو۔ ملاقات ختم ہو گئی۔ واپسی پر کونسل کے اجلاس سے مجھے باہر بلا کر ملاقات کا حال مخففات و مرموزات میں سُنا دیا۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کہ جلدی میں اصل حقیقت کو میں نہیں سمجھ پایا۔ وقت رخصت میں نے تاکید کی کہ علی گڈھ کی تعیناتی کا خیال رکھنا۔ کچھ دن بعد خط آیا کہ ایٹہ کو بھیجا گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی اور قدوائی صاحب سے شکایت کرنے پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی فرمایا کہ کیوں حضرت یہ کیا بات ہے۔ مجھ سے علی گڈھ کے متعلق کہا اور چیف سیکرٹری سے ایٹہ کے متعلق طے کیا۔ عرض کیا یہ نہ دانستہ ہوا نہ قصداً۔ آپ نے تو اُلٹا میرا منہ بند کر دیا۔ میں تو خود اسی کی شکایت کرنے آیا تھا۔ فرمایا کہ دفتر سے تحقیق کر لو۔ نتیجہ تحقیق وہی نکلا جو قدوائی صاحب نے بتایا تھا۔ اب میں نے ان حضرت کو لکھا کہ ایں ہمہ آوردہ تست۔ شکایت کس بات کی ہے۔ جواب ملا کہ یہ حرکت میں نے مصلحتاً کی تھی کہ چیف سیکرٹری یہ نہ سمجھے کہ میں منسٹروں سے اس پر اثر ڈلواتا ہوں۔ مگر تمہاری کوشش پر مجھے اعتماد تھا جس میں مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہاری کوتاہی کی شکایت ہے اور کچھ نہیں۔ یہ توجیہہ سُن کر مجھے اپنی غلطی تسلیم کر لینے کے علاوہ اور صورت ہی کیا تھی۔ آخر میں بیوی کے انتقال کے بعد ان کی ظرافت نے اپنے اوپر خود مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ظرافت سے باز نہیں آتے تھے۔

خدا جانے کیا نقصہ ہے۔ میرا اپنا تجربہ یہی ہے کہ جب میرا کوئی عزیز دوست اس جہان سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو میرے اور اس کے درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غم کھانے میں پورا دل ناکام ہے۔ قصہ مختصر ان کے ایسے عمر کی تیسیں میں ان کے منشی نے ایک مغالطہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر چند میں نے معذرت کرتے ہوئے منشی کی غلط بیانی کا یقین دلایا۔ لیکن انہوں نے میری نہیں مانی تو میں نے عمر میں پہلی مرتبہ ایک سخت خط ان کو لکھ دیا جواب آیا کہ رسول کے واسطے عنداللہ معاف کر دو میں نے انکے ہی الفاظ دُہرا انہیں معاف کر دیا لیکن اسکے بعد خط و کتابت بند ہو گئی۔ اس عرصہ میں عطاء اللہ صاحب کا لاہور میں انتقال ہو چکا تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ اس سانحہ پر اُن کے اوپر کیا گزری۔ کچھ عرصہ کے بعد علیگڈھ سے دفعتہً خبر آئی کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے وہ بھی چل بسے۔

اختر شیرانی

نیر واسطی

[ادب کے سلسلے میں میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ شعر، تنقید اور تاریخ ہے۔ لیکن میری عادت کے خلاف طفیل صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اختر کی شخصیت کے موضوع پر لکھوں۔ لہٰذا ان کے ارشاد کی تعمیل میں کوشش کرتا ہوں کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکوں۔]

۱۹۲۴ء سے اختر کا نام میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں ان دنوں چوک چونا منڈی لاہور میں مطب کرتا تھا۔ حافظ محمد عالم مدیر "عالمگیر" جو مجھ سے اپنے رسالے کے لئے نظمیں لکھوا کر لے جاتے تھے اور اکثر اختر کے حالات بیان کیا کرتے تھے پھر اسی ضمن میں "انتخاب" اور "بہارستان" نے جنہیں اختر نے ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں جاری کیا مجھے ان سے اور زیادہ آشنا کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عاشق بٹالوی نے شاعری اور شعر میں ان کی محویت۔ بیخودی و وارفتگی اور والہانہ زندگی کے حالات کچھ ایسے لطیف اور پُرکیف انداز میں بیان کئے کہ میں اختر کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔

مارچ ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کو مغرب کے بعد ایک حسین اور تنومند نوجوان ننگے سر ہاتھ میں قراقلی ٹوپی لئے کالی اچکن پہنے مطب میں آیا اور کہنے لگا کہ میر نور احمد صاحب کے ہاں ایک مریض کو دیکھنے کے لئے چلئے۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ فرمایا اختر شیرانی ——— سنتے ہی لپٹ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو پا لیا ہے۔ اختر سے میری یہ پہلی ملاقات تھی ——— اس کے بعد تمام عمر جب تک وہ زندہ رہے یہ رشتۂ محبت روز بروز مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔

میں نے اختر کو زندگی کے ہر دور اور ہر حال میں دیکھا تھا کہ روزِ ملاقات سے یوم وفات تک جس کو ان کی شاعری کی عمر کا پورا دور سمجھنا چاہئے ان کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے تمام مراحل میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ میں نے ان کو خلوت میں دیکھا۔ جلوت میں دیکھا۔ دوستوں میں دیکھا۔ دشمنوں میں دیکھا۔ امیروں میں دیکھا۔ فقیروں میں دیکھا اور فلیمنگ روڈ کے تنگ و تاریک گوشے کے علاوہ گجرات کی رات کی جلوہ باریوں ایبٹ آباد کی شامِ وداع کی نالہ سامانیوں۔ مری کی صنوبرستانی فضا کی بہار فروشیوں اور خصوصاً باغِ لارنس کی دلکش چاندنی راتوں میں دیکھا۔ اختر ہر جگہ اور ہر حال میں ایک عجیب و غریب انسان نظر آیا۔

میانہ قد۔ سڈول جسم۔ روشن آنکھیں۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ کبھی کبھی اچکن ورنہ کھلے گلے کی قمیص اور سندھی طرز کا پاجامہ۔ چال میں لغزش اور نگاہوں میں مستی ——— ع کھویا کھویا سا اک جوانِ خمر کش ——— یہ تھے اختر شیرانی جو ابتدا میں آگ تھے اور انتہا میں خاک ———

اختر ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو اپنے وطن مالوف ٹونک میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت آپ کے والد محترم حافظ محمود شیرانی نے آپ کا نام داؤد خاں رکھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا تخلص اختر اختیار کر لیا۔ اور شیرانی الاصل ہونے کی وجہ سے شیرانی کہلائے۔

ان کے والد محترم حافظ محمود شیرانی فارسی علم ادب۔ تنقید اور تاریخ کے جیّد عالم تھے اور علم عروض میں تمام ہندوستان میں منفرد تھے۔ حافظ صاحب مرحوم جب ۱۹۱۴ء میں ولایت سے تعلیم سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے تو انہوں نے ٹونک میں اختر کی ابتدائی فارسی تعلیم کے لئے مولوی صابر علی صاحب شاکر کو مقرر کیا۔ جنہوں نے پہلے پہل اختر میں شعر کے ذوق کو بیدار کیا۔ ایک پہلوان قیوم خاں ملازم رکھا گیا جو اختر کو ورزش کراتا اور کشتی کا فن سکھلاتا تھا۔ اور ایک خوشنویس متعین کیا گیا جو اختر کو خوشنویسی کی مشق کراتا تھا۔ اختر کی حسین خطاطی اور جسمانی خوبصورتی و تنومندی درحقیقت اسی دور کی یادگار تھی۔

حافظ محمود شیرانی ۱۹۲۰ء میں جب ٹونک سے جلاوطنی کے سلسلے میں اہل و عیال کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور یہاں آکر اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے اختر کو اورینٹل کالج میں داخل کرایا۔ اور غالباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ اختر کی عمر ۱۶ سال کی تھی انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد خیال تھا کہ اس باقاعدہ تعلیم کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے کہ اختر شعر و سخن کی دلچسپیوں کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے۔

اختر نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی لیکن مطالعہ کی بدولت خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی اور کچھ عربی سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

اختر نے بہت کمسنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ۱۹۲۴ء سے ان کی نظمیں باقاعدہ رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ پہلی نظم "جوگن" تھی جس نے علمی اور ادبی حلقوں کو متوجہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد سرزمینِ گجرات۔ انجامِ ہستی۔ تیتری۔ "ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" اور اسی نوع کی بیشمار نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے دنیائے شعر و ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

ابتدائی دنوں میں فلیمنگ روڈ پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ اختر کے لئے مخصوص تھا۔ جس میں چند کرسیاں اور ایک چارپائی دیکھی جاتی تھی۔ دریچہ کی جانب ایک میز تھی جس پر چند کتابیں رکھی رہتی تھیں اور کبھی کبھی نپولین کی مراجعت روس کی تصویر نظر آتی تھی۔

درحقیقت یہ تھا اختر کا وہ مدرسۂ شعر و مکتبِ فکر جہاں ادبِ اردو کے ایک نئے دور کی تخلیق ہوئی اور شعر و ادب کے نئے اسالیب و اقدار وضع ہوئے۔

اختر کے دوستوں۔ شاگردوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم اسی کمرے میں رہتا تھا اور اختر نے جو ادبی رسائل و مجلّات جاری کئے ان کا دفتر بھی درحقیقت یہی کمرہ تھا۔ یہاں اختر ہمہ تن اپنے دوستوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہتے اور ان کا ملازم فضل بار بار بالاخانے کے زینے سے بیچ کی منزل میں جہاں یہ کمرہ تھا آتا اور آنے والوں کی خدمت میں سگریٹ۔ پان۔ شربت اور لیمونیڈ وغیرہ پیش کرتا۔

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اختر کی شاعری کے شباب کا دور تھا۔ اس دور کے ابتدائی ایام میں ان کی شاعری نے سب سے زیادہ جن لوگوں کو متاثر کیا وہ کالجوں کے طلباء۔ طالبات اور اس دور کے ہونہار نوجوان ادیب تھے۔ لاہور کے تقریباً ہر کالج کا ہر نوجوان جسے ادب سے ذرا بھی وابستگی تھی ان کے پاس پہنچتا تھا۔ اسی زمانے میں ن۔ م۔ راشد نے گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلس اردو میں اختر کی شاعری پر ایک شاندار مقالہ پیش کیا۔ جو اب ان کی کتاب اخترستان میں شامل ہے اور اس کے بعد سیّد اختر احمد اختر اورینوی نے گورنمنٹ کالج پٹنہ میں اُن کی شاعری پر ایک اور سیر حاصل مقالہ پڑھا۔

اس دور میں اختر کے گرد اس دور کے خوش ذوق نوجوان ادیبوں کا ایک شاندار حلقہ جمع ہو گیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی

میرزا ادیب - دلبر حسن مسحور - عمر فاروق - علی رضا - خضر تمیمی - مصطفےٰ حسین - سلیم رضا - عاشق بٹالوی - سردار کریم نواز - سید محمد جعفری - عظیم قریشی اور دیگر بیشمار نوجوان ادیب اختر کے پاس چاند کے گرد تاروں کی طرح جمع ہو گئے تھے - چراغ حسن حسرت بھی جنہیں اختر چراغ حسن کہا کرتے تھے کبھی کبھی شام کو اس محفل کو جگمگاتے تھے - جگر و جوش جب لاہور آتے اس کلبۂ اختر کی زینت بنتے -

پھر اختر کے ادبی رسالوں نے رومانی ادیبوں کے اس حلقے کو اور وسیع بنا دیا تھا - مولانا حسرت موہانی مولانا تاجور نجیب آبادی - بابائے اُردو مولانا عبدالحق - آغا حشر کاشمیری - چودھری خوشی محمد ناظر - عبدالرحمٰن چغتائی - چودھری فضل حق سب جج - شیخ عالم علی - ڈاکٹر تصدق حسین خالد - ڈاکٹر سید صدیق حسین نجمی - سید شبیر حسین بخاری - مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش - میر منظور محمود دلی - شیخ عبداللطیف تپش - سید ولایت حسین منی - ساحل ٹونکی - اسرار الحق مجاز اور ان کے علاوہ اس دور کے تقریباً تمام مشاہیر علم و ادب اس حلقے میں شامل تھے

اختر کی اس محفل ادب میں ملک کی ممتاز اہل قلم خواتین بھی شریک تھیں - ان میں محترمہ کنیز فاطمہ حیا کا نام سرفہرست ہے - ان کے علاوہ محترمہ ادا بدایونی - محترمہ عائشہ بیگم شمیم - محترمہ نسرین خانم - محترمہ آمنہ تمیم - محترمہ رضیہ خاتون رعنا - محترمہ شکیلہ اختر - آنسہ زہرہ بیگم اور دیگر بیشمار ادیب خواتین اختر کے رسائل میں مضامین نظم و نثر لکھتی تھیں -

اختر کی دوستی کے لئے علم و فضل کی کوئی قید نہ تھی - ایک پنواڑی سے لے کر لاہور میں بڑے سے بڑا ادیب اور صحافی ان کا دوست تھا - میں نے یہاں اختر کے دوستوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ بہت محدود ہے صرف پنجاب اور بالخصوص لاہور میں اختر کے ادیب دوستوں کی تعداد بلاشبہ اس سے ہزار گنا زیادہ تھی -

درحقیقت کشمیر سے لے کر راس کماری تک ملک کا کوئی ادبی گوشہ اور کوئی ادیب - شاعر اور صحافی ایسا نہ تھا جو اختر سے واقف اور اس کا قدردان نہ ہو - دوستوں کے خطوط کا ایک انبار تھا جو روزانہ اختر کے پاس جمع ہو جاتا تھا -

رومان میں اختر کے مخصوص طرز نگارش کے حاملین کا جو حلقہ بن گیا تھا - اختر اُسے دائرہ رومان کے نام سے یاد کرتے تھے - رومان میں ان کے خطوط پر تبصرے ہوا کرتے تھے - رومان کے سرنامہ پر تحریر تھا - ”اُردو کے نوجوان اہل قلم کا ماہنامہ“ -

انہیں مصوری سے گہرا لگاؤ تھا - موسیقی سے دلی وابستگی تھی - مشہور موسیقار مرحوم غلام حیدر اُن کے خاص دوست تھے - اکثر موسیقی کی محافل میں شامل ہوتے - ”آپ کے نغمے اُن کو بہت پسند تھے جس کا ذکر اُنہوں نے اپنے ایک سانیٹ میں بھی کیا ہے -

خطاطی اور فن خطابت سے اختر کو بڑی دلچسپی تھی - وہ خود بڑے اچھے خطاط تھے - حروف کے دائرے بڑے حسین بناتے تھے لیکن سطریں اکثر سیدھی نہیں رہتی تھیں - ہمیشہ اُن کی یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کا رسالہ بڑے اچھے خط میں چھپے اور اس مقصد کے لئے وہ بالعموم لاہور کے مشہور کاتب کلیمی کو پسند کرتے تھے -

کلاسیکی ادب میں اختر کی نظر بے حد وسیع تھی فارسی کے شعراء میں طالب آملی سے لے کر آج تک کے جدید ایرانی شعراء کے کلام پر انہیں عبور حاصل تھا - شاعری میں حافظ کے پرستار تھے - اور اس کے دیوان کو شاعری کا قرآن کہا کرتے تھے - اُردو شعراء میں میرؔ اور غالبؔ کے معتقد تھے - ذوقؔ کا نام جب آتا تو اُنہیں محمد رمضان کے صاحبزادے کہہ کر عجیب انداز میں یاد کرتے -

وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن مشترکہ ہند کے ہر مشاعرے میں طلب فرمائے جاتے تھے - جہاں جگرؔ و جوشؔ موجود ہوتے ، اخترؔ ضرور ہوتے - مشاعروں میں وہ اپنا کلام بغیر ترنم کے پڑھتے - سامعین چونکہ اخترؔ اور اس کے کلام کے عاشق ہوتے اس لئے آپ کے کلام سے مشاعرہ گونج اُٹھا کرتا تھا - اکثر ایسا بھی دیکھا گیا کہ عالمِ سُکر میں بھی پڑھ دیتے - ان مشاعروں سے جو رقم وصول ہوتی وہ بالعموم بوتلوں کے ہنڈیانی میں بہا دی جاتی تھی -

شعر کہتے وقت میں نے اختر کو کبھی گنگناتے نہیں دیکھا لیکن شعر پھولوں کی طرح بیساختہ ان کے منہ سے جھڑتے تھے عالم سُکر میں انہوں نے

بہت کم شعر کہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں شراب کی کیفیت کو شعر کی مصروفیت میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بالعموم خمار کی حالت کے بعد شعر کہتے تھے۔

پرائیویٹ صحبتوں میں اپنا کلام خود سنانے میں تامل کیا کرتے تھے اکثر دوستوں کو ارشاد فرماتے کہ وہ ان کا کلام پڑھیں۔ بعض دوست ترنم سے پڑھتے اور وہ اس کو سن کر جھومنے لگتے تھے۔ اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی داستان سے وابستہ ہے۔ آخری عمر میں اکثر ایسا دیکھا گیا کہ جب ان کے کسی دوست نے ان کا کوئی خاص شعر خوش الحانی سے پڑھا تو وہ بے چین ہو گئے ایک مرتبہ اصغر نے ان کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ترنم سے پڑھا کہ

؂ کس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں
میکدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جدھر جاتے ہیں

تو انہیں کلکتہ کا سفر اور اس کا ایک حسن رہگزر یاد آگیا اور دیر تک زار و قطار روتے رہے۔

اختر اس عہد کے اہل قلم میں ابوالکلام اور آغا حشر سے متاثر تھے۔ اور آغا حشر بھی اختر سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ ؂

کیوں زاہد نے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں

مولانا ابوالکلام نے ۱۹۲۶ء میں جب دوبارہ الہلال جاری کیا تو اس میں اختر کی نظمیں شائع ہوئیں۔ انگریزی ادب میں اختر پر آسکر وائلڈ کا اثر تھا اور گہرا اثر تھا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ان کی زندگی بعد میں اسی کے رویے میں ڈھلتی گئی۔

رسائل و مجلات کی ادارت میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ ابتدا میں ہمایوں میں انہوں نے ادارت کے فرائض انجام دئے۔ مدتوں تک ماہنامہ سہیلی کی ادارت فرمائی اور آخر میں مولانا تاجور نے جب 'شاہکار' نکالا تو اس کے ادارتی فرائض میں بھی آپ شریک تھے۔ اور مولانا تاجور کے 'شیرازہ' کی ترتیب و تزئین میں بھی ان کا حصہ تھا۔

اختر نے سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں انتخاب کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام و معیار کچھ مدت کے بعد بدل کر بہارستان کر دیا۔ بہارستان جب بند ہوا تو ۱۹۲۸ء میں خیالستان جاری کیا لیکن خیالستان بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا —— اور اب اس بے تعلقی کی وجہ سے وہ ارادہ کر چکے تھے کہ آئندہ کوئی رسالہ جاری نہیں کریں گے لیکن احباب کا اصرار غالب آیا اور انہوں نے ماہنامہ ۱۹۳۱ء میں رومان کے نام سے رسالہ جاری کر دیا۔ اس موقع پر کہا تھا کہ

؂ میں کہاں اور کہاں اخذ متاع عالم فانی کہاں
طائر سدرہ نہیں تنکے اٹھانے کے لئے
لیکن اہل دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں
چاہئے ہنگامہ جن کا دل بہلانے کے لئے

جیسا کہ اختر کہا کرتے تھے۔ یہ روایت قائم ہو گئی تھی کہ اختر کا کوئی رسالہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود شوق ... جب بھی وہ کوئی نیا رسالہ جاری کرتے فوراً خریداروں کا حلقہ مہیا ہو جاتا تھا۔

اختر کو ان رسالوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ بعد میں اختر کے مجموعہ ہائے کلام صبح بہار، اختر ستان، لالۂ طور، جہوے، آوارہ، مشہور و مشہور کے لئے ان کی نظموں اور غزلوں کا بہت سا سرمایہ مل گیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ نظم میں اختر کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں ایک ... دوسری پھولوں کے گیت۔ نثر میں دھڑکتے دل کے عنوان سے آپ کے مضامین نثر کا ایک مجموعہ چھپا۔ اور اس سے قبل ضحاک اور ... نامے میں" نثر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان چھوٹے رسالوں کے علاوہ آپ نے مجمع البحرین۔ مطلع السعدین اور جامع اللغات ... تدوین میں بھی حصہ لیا اور عوفی کی جوامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔

اختر کی ... عادات و خصائل بڑے عجیب و غریب تھے۔ نہ ان کی رات ان کی رات تھی نہ ان کا دن ان کا دن تھا۔ تمام لیل و نہار ... بیخودی ... اور پرستش حسن کے لئے وقف تھے۔ ہر چھوٹا بڑا ان کا دوست تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی سے ملتے اور بعض دوستوں

کے نئے نئے پیار کے نام تجویز کرتے اور انہیں ان سے مخاطب کرتے - ان کی دوستی کے لئے اخلاص تک ضروری نہ تھا - ہر دشمن دوست ان کا دوست تھا - مولینا کے لفظ سے ان کے یہاں اصطلاحاً حسین صورت مراد لی جایا کرتی تھی -

ابتدائی دور میں نشے کی حالت میں بہت زیادہ بولتے تھے - اور اس عالم میں اکثر پتے کی باتیں کہہ جاتے تھے - لیکن گاہے بے ربط بولتے تھے سلسلۂ کلام جلد جلد ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہوتا رہتا تھا - اور اس سے وہ دل و دماغ میں شگفتگی محسوس کرتے تھے - کھاتے بہت کم تھے لیکن پیتے بہت زیادہ تھے - گوشت اور بھنا ہوا گوشت اکثر پسند کرتے تھے لیکن بالعموم صورت یہ ہوتی کہ چند لقمے لے کر چھوڑ دیتے اور اس کے بعد خواہش یہ ہوتی کہ کچھ دیر تک دسترخوان سامنے کھلا رکھا رہے اور وہ اسے دیکھتے رہیں -

میں نے انہیں بہت کم پڑھتے دیکھا ہے لیکن حیرت ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑا پڑھا لکھا اور بہت مطالعہ کرنے والا انسان مصروفِ کلام ہے - فلیمنگ روڈ کے مشہور درمیانی منزل والے کمرے میں ان کی محفل ہوا کرتی تھی، اس کے بعد عرب ہوٹل کا درجہ تھا جہاں وہ دوستوں میں بیٹھے محفل کو باغ و بہار بنائے رکھتے تھے -

انہوں نے گھر اور گھر کے حالات سے کبھی تعلق نہیں رکھا - والد صاحب ناراض تھے اور اس لئے والد کے ڈر سے والدہ ان سے چھپ کر ملتیں اور سمجھاتیں لیکن معاملہ سمجھانے بجھانے سے حل نہیں ہوتا تھا - انہوں نے خود بیوی کی ضروریاتِ معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی - حافظ صاحب مرحوم ان کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھتے تھے - اور اختر کے بچوں خوشنود اور بہبود کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے - لیکن آخر میں اختر مرنے سے پہلے جب لاہور میں میرے یہاں مقیم تھے اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور کبھی کبھی یاد کرتے کرتے رو پڑتے - ایک دن بیوی کی وفا اور اپنی بے وفائیوں کو اس قدر یاد کیا کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی - مرنے سے پہلے اپنی بیگم کے متعلق ایک سانیٹ لکھا جس کا عنوان پیمانِ وفا تھا - اس میں ایک جگہ لکھا کہ ؎

برترے کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تجھ کو ‖ ہر ایک ذرہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تجھ کو

عام لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ عزیزانہ ہوتا تھا - نائی - پنواڑی اور تانگہ والے اکثر ان کے یار بنے رہتے تھے بعض وقت ایک تانگہ چار چار دن تک ان کی اردلی میں رہتا تھا - اور چار دن کے بعد کوچوان کو اکٹھے پیسے دیئے جاتے تھے - ایک دن دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر صبح کے وقت ایک دوست کو ملنے گئے - شام تک تانگہ باہر کھڑا رہا - شام کو رخصت کرتے وقت دوست نے پوچھا کہ بھلا یہ دن بھر تانگے کو کیوں کھڑا رکھا - فرمانے لگے نوجوان غریب اور شریف آدمی ہے میں نے سوچا اس کا بھلا ہو جائے -

محلہ کا پنواڑی ان کا دوست تھا جس کا بل مہینے مہینے بھر کے بعد ادا ہوا کرتا تھا - پان بے حد کھاتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جبکہ کچھ وقت کے لئے شراب ترک کر دی جاتی تھی - پان کے ساتھ چونہ علاوہ سے منگوایا جایا کرتا تھا - سگریٹ کا دور بھی بڑے زور سے جاری رہتا تھا - خصوصاً ان دنوں میں جبکہ شراب چھوڑی ہوتی تھی - عموماً سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے تھے اور اکثر اوقات دوست سگریٹ سلگا کر دیتے تھے تاکہ سگار نوشی کی - جس سے ان کی وہ انگلیاں زرد رنگی تھیں جن سے سگار و سگریٹ پکڑتے تھے - ایک دن سگریٹ کی تعریف میں ایک جدید ایرانی شاعر کا یہ شعر سنایا - ؎

سیگار بے تقلب و نازپری و شال ‖ این پردہ رنگ کشش دو دل کشید نیست

دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سگریٹ ہاتھوں میں لئے سو گئے یا نشے میں غافل ہو گئے، فلیمنگ روڈ والے کمرے کے بستر سے دھواں اٹھنے لگا - فضل ملازم چلایا - زاہدہ محترمہ آئیں اور انہوں نے اختر کو بستر سے جدا کیا - ابتدائی دور میں اکثر عبداللہ پسند کرتے تھے -

میں نے ان کو پان سگریٹ اور شراب کے سوائے کوئی چیز بازار سے خریدتے نہیں دیکھا - لباس اور ان کی ضرورت کی تمام چیزیں ان

کے لئے ان کی والدہ محترمہ خرید کر منگواتی تھیں۔

آخر عمر میں سر کے آگے کے بال کچھ سفید ہو گئے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ اس سفیدی کو چھپائیں اور اس مقصد کے لئے عموماً ہائیڈروجن پراکسائڈ منگوا کر لگایا کرتے تھے۔

وہ بے حد ملنسار اور خلیق تھے لیکن کبھی کبھی ذرا خشک نظر آتے تھے مگر جب کھلتے اور خصوصاً بوقت مے پرستی کھلتے تو طبیعت بے حد شگفتہ بن جاتی تھی۔ عالمِ کیف میں سب کچھ ہوتا تھا لیکن ہوش کی حالت میں مَیں نے انہیں بے حد متین دیکھا۔ چہرہ عموماً متبسّم رہتا تھا اور ہوش کے عالم میں کبھی قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔ جن لوگوں سے ملنا پسند نہ تھا ان سے ملاقات کے وقت بالعموم خاموش سے بیٹھے رہتے تھے۔

سینما سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ پہلے پہل جب متکلم فلمیں لاہور میں آئیں تو میں تین چار بار انہیں لے گیا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی جگہ حسین صورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں اِدھر اُدھر رونق افروز تھیں۔ البتہ ہندوستان کے مشہور رقاص شنکر کی فلم انہیں پسند آئی اور خصوصاً وہ منظر انہیں زیادہ پسند آیا جس میں پجارنیں مندر کے باہر دروازہ پر شمعیں ہاتھ میں لئے کمال عقیدت سے رقاصانہ وارفتگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں ——— بایں ہمہ لطف یہ ہے کہ فلموں والے آتے اور ان سے اپنی فلموں کے لئے منظوم و منثور مکالمے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ شہرۂ دہر ان کا لیلیٰ و مجنوں والا مکالمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اختر بہت کم بیمار ہوتے تھے اور ان کی بیماری بالعموم شراب کے بعد کی خماری کیفیت کا نتیجہ ہوتی تھی۔ جس نے آخر میں ان کے جگر اور عصبی نظام کو درہم و برہم کر دیا تھا ——— دو تین مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے والد مرحوم کے علاج کے سلسلے میں یاد فرمایا جنہیں گاہے گاہے ضیق النفس کی شکایت رہتی تھی۔

ایک مرتبہ اختر نے ایک پردہ نشین ضعیفہ مہمان کے علاج کے لئے مجھے گھر بلوایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ تنگ کمرہ اور مریضہ صاحبِ فراش لحاف اوڑھے پسینے میں شرابور پڑی تھیں ان کا یہ حال دیکھ کر میرے لئے مشکل ہو رہا تھا کہ مریضہ کو حال بیان کرنے کی زحمت دوں۔ معلوم ہوا کہ عجلت میں اختر نے انہیں پردے کے لئے معمولی چادر کی جگہ لحاف دے دیا تھا۔

اختر مال و زر کے معاملے میں قطعاً بے نیاز انسان تھے ان کے نزدیک سونے چاندی کی ٹکلیوں اور خزف ریزوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔

وہ طبعاً نہایت بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے۔ اور بادہ کشی کی عادت سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو وہ اتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں اُن میں جمع ہو گئی تھیں وہ نہایت کریم النفس۔ نیک مخضر۔ خلیق اور دوست نواز دوست تھے ——— عطا پاش اور خطا پوش ——— اور اس قدر غیور کہ انہوں نے اپنی زندگی میں حسن کی سرکار کے سوا کبھی کسی امیر و وزیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ

؎ کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا — فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

یہ سچ ہے کہ اکثر اوقات شراب کے لئے وہ عالم بیخودی میں ضرور مجبور ہو جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہوش کے عالم میں تو انہوں نے خدا کے سوا کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔

وہ ایک مردِ قلندر اور فقیرِ خاک نشین تھے اور ان کے دل میں مہربانی کے سوا کسی کے لئے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہ تھی۔

پھر سیر چشمی و مال و منال دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹونک ان کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب اُن کو ڈاک خانہ سے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں اور دوستوں کو بانٹتے آئے تا آنکہ جب وہ گھر پہنچے تو صرف

پانچ روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اسی ضمن میں ایک لطیفہ یہ بھی سنیئے کہ ایک مرتبہ اختر ایک سرکاری ادارے سے اپنے ڈیڑھ سو روپے لینے تشریف لے گئے لیکن وہاں دقت یہ پیش آئی کہ اُن کو کئی جگہ کلرکوں کے پاس جا کر کئی رجسٹروں میں دستخط کرنے پڑے۔ اب انہوں نے دو جگہ تو یہ تکلیف گوارا کر لی۔ لیکن جب یہ اُن کو تیسری جگہ ایک کلرک کے پاس جا کر دستخط کرانے کے لئے کہا گیا تو یہ کہہ کر خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے کہ بھائی ہم سے یہ بار بار دستخط نہیں ہوتے۔

اختر بے حد ہمدردِ بنی نوع انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا تلملا اُٹھتے اور اکثر رو پڑتے تھے۔ اور عورت ذات کی مصیبت تو وہ کبھی دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ انارکلی میں تانگے میں سوار تھے کہ ایک عورت بھیک مانگنے آ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہے اِسے فوراً دے دو۔ میں عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ لوگوں کے سوائے جب کسی کو آتے دیکھتے شراب کی بوتل کو اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش کرتے اور رقیق القلب اس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر چند مرجھائی ہوئی کلیاں پڑی نظر آئیں وہیں بیٹھ کر دیر تک اُنہیں دیکھتے اور روتے رہے کہ ؏

مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

پس حقیقت یہ ہے کہ اختر اپنے ادب اور آرٹ کی طرح اخلاق۔ انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے انسان تھے۔ —— ایک اتنے بڑے انسان جو کہیں صدیوں کے بعد اس خرابہ زار میں آتے ہیں۔ ؏

گردوں نیاورد چو تو اختر بصد قراں

اختر نے اپنے مخالف معاصرین میں سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا اُسے صبر سے سہہ لیا۔ میں نے انہیں دنیاوی امور میں کبھی کسی سے اُلجھتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم ناراض ہوتے اور اگر کسی سے ناراض ہوتے تو صرف سلام و کلام کم کر دیتے اور بس —— دشمنوں کے معاملے میں ان کا رویّہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلے میں اُنہیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔ لیکن ایک دن جب وہ ان کے سامنے سے گزرا تو اُسے لپٹ گئے اور اُلٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔

اختر اپنے دوستوں کے معاملے میں بے حد فیاض۔ سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے ایک مرتبہ جس سے تعلق ہو گیا اُسے ساری عمر نبھایا۔ دوستوں کے ساتھ تمام عمر وہ بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہے مثال کے طور پر اس ضمن میں میرے ساتھ ان کا سلوک یہ تھا کہ اختر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور اختر صاحب کہنے پر ناراض ہو جاتے تھے۔ کہتے تھے مجھے اختر کہا کیجئے ساتھ ہی اُنہیں اس قدر پاس خاطر تھا کہ جب وہ شغل خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سُن لیتے تو بوتل کو جسے وہ دخترِ گردن دراز کہا کرتے تھے اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش فرماتے تھے —— باایں ہمہ سلاست یہ تھا کہ مجھ سے بلا تکلف اپنا ہر دکھ درد بیان ہوتا تھا اور مجھے اپنے عشق و عاشقی کے دلچسپ فسانے سُنائے جاتے تھے۔

۱۹۳۴ء تک میں چوک چونہ منڈی میں تھا اس کے بعد میں اپنا مطب مستی دروازہ کے باہر اپنے مکان نیّر منزل میں لے آیا۔ یہاں بھی اختر حسب معمول باقاعدہ تشریف لاتے اور بالعموم شام کو سورج چھپے تشریف لاتے۔ ابتدائی ایّام میں ان کا معمول یہ تھا کہ شام کو تانگے میں ساتھ لیا اور لارنس یا منٹو پارک کی طرف چل دیئے۔ یہاں آدھی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ باتوں کے لئے کوئی موضوع مخصوص نہ تھا۔ بالعموم شعر و ادب موضوع گفتگو ہوتا۔ بسا اوقات دوسرے احباب کو بھی ساتھ لے لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا اختر کا معمول یہ تھا کہ بالعموم شام کو تشریف لاتے اور کوشش کرتے کہ اُسی رات گھر تشریف لے جائیں لیکن جب گھر سے ناراض ہوتے تو بالعموم یہاں اُن کا ہفتوں قیام رہتا تھا۔ اور اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بلا اطلاع کہیں شب گزاری نہ ہو۔ ایک دن مجھے اطلاع دیئے بغیر رات کو سلیم کے یہاں مزنگ چلے گئے اور اس خیال سے کہ مجھے زحمت انتظار نہ ہو یہ منظوم خط لکھ کر مجھے ایک دوست کے

ہاتھ ارسال فرمایا۔

برادرِ معظم و محترم دامت معالیکم

سلیم نے مجھے گھیر لیا ہے آج کی رات — کسی بہانے سے بہلا لیا ہے آج کی رات
بہانہ جو بھی ہے بے حد حسین ہے لیکن — نہ جانئے مجھے بہکا لیا ہے آج کی رات
ہے واقعہ فقط اتنا کہ اتفاقاً آج — نگاہِ حسن نے اپنا لیا ہے آج کی رات
کسی حسینہ کا ہے انتظار دو دنوں کو — کسی حسینہ نے بہکا لیا ہے آج کی رات
معاف کیجیے مری غیر حاضری پھر آج — کہ ایک حور نے بہلا لیا ہے آج کی رات

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اٹھا رکھی ہے ———— اختر

ایک دن رات کو ایک بجے کے قریب کہیں سے تانگے میں تشریف لائے اور جب تانگے سے اُترے تو کوچوان سے عالمِ مستی میں کچھ سخت کلامی ہو گئی۔ صبح خواب سے اُٹھے تو ہم سے پوچھنے لگے کہ رات میں نے ایک تانگے والے کو کچھ سب وشتم کیا تھا میری آواز ہمسایوں تک تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ یہ تھا اُن کی شرم مروت اور لحاظ کا عالم جو اُن کی ذاتی و نسبی شرافت کا نتیجہ تھا۔

دوستوں کی تقریباتِ مسرت میں وہ جس انداز میں شرکت فرماتے تھے اس سلسلے میں یہ مثال کافی ہے کہ میرے گھر کے بچوں کے ساتھ اُنہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اکثر جب گھر آتے تو بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے تھے۔ اور ان کی تقریبات میں گھر کے ممبروں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ میرے بچے سکندر صولت کی سالگرہ ہوتی تو جھومتے ہوئے آئے اور یہ نظم لکھ کر سب کو سنائی۔ ؎

سُنا رہی ہے نویدِ بہار سالگرہ — مسرتوں کی ہے پروردگار سالگرہ
زبسکہ سالگرہ ہے میاں سکندر کی — بجا ہے کہیئے سکندر وقار سالگرہ
سما رہی ہے نگاہوں میں بن کے عالمِ کیف — لبھا رہی دلوں میں بہار سالگرہ
دیارِ قدس سے آئی ہے حور کی صورت — مسرتیں لئے بہرِ نثار سالگرہ
خوشی کے پھول برسنے لگے فضاؤں سے — لٹا رہی ہے بہشت و بہار سالگرہ
خوشی سے پھولے سماتے نہیں ہیں خورد و کلاں — بڑھا رہی ہے ہر اک دل میں پیار سالگرہ
اسی فروغ سے تاحشر بار بار آئے — دعائیں کرتی ہے یہ بار بار سالگرہ
دعا ہے عمرِ سکندر کا رشتہ محکم — اسی بہار سے دیکھے ہزار سالگرہ

خوشی سے رقص کریں مل کے ساقی و اختر
بلا رہی ہے مئے خوشگوار سالگرہ

ایک مرتبہ میری اہلیہ گھر سے ناراض ہو کر کچھ مدت کے لئے بھوپال چلی گئیں۔ اختر ہمارے گھر کی ناراضگی کی اطلاعات سے بہت مغموم رہتے تھے —— لیکن کچھ دنوں کے بعد جب میں اپنی بچی رخسانہ اور اس کی والدہ کو بھوپال جا کر گھر لاہور لے آیا تو بہت خوش ہوئے اور اس وقت انہوں نے یہ اشعار کہے۔ ؎

دل کا سکوں لئے ہوئے رخسانہ آگئی — نیر کدہ میں رونق کاشانہ آگئی
بھوپال کی خبر ہے کہ بھاوج بھی آگئیں — بھائی کے گھر میں عشرتِ جانانہ آگئی

اپنے پرائے آج محبت سے خوش ہوئے — ہر ایک کو گماں ہے کہ سلطانہ آگئی
بھائی گئے تھے لینے فقیرانہ جس کو وہ — لاہور میں بہ شوکتِ شاہانہ آگئی
آنے کا اُن کے سب کو ہُوا اُس کے یہ خیال — وہ جانِ کعبہ روحِ صنم خانہ آگئی
نیّر کے دل کو آج نہ ہو کس طرح خوشی — وہ رشکِ صد پری و پریخانہ آگئی
مانا خلوص میں ہوئی جو کچھ ہوئی کمی — شمعِ خلوص کی وہی پروانہ آگئی

ہر چند تھی خفا مگر اظہارِ شوق پر
بھاوج ہماری اختر دیوانہ آگئی

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کا اپنے دوستوں اور اُن کے گھروں کی غم و شادی کے ساتھ کس طرح کا اور کس قدر ربط رہا کرتا تھا۔

اُن کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم اختر کو ہمیشہ اختر کی جگہ ' داؤد ' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اختر ان کے اکلوتے فرزند تھے اور ایسی صورت میں قدرتی طور پر حافظ صاحب مرحوم کو اختر کے ساتھ جو محبّت ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ وہ اوّل اوّل اختر سے بہت محبّت کرتے تھے۔ ان کی علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ وہ اختر کے ادبی رسائل میں اپنے مضامین اشاعت کے لئے دیتے۔ لغت اور شعر کے بارے میں ان کو اختر کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ چنانچہ ان دنوں میں بھی جبکہ اختر سے ناراضگی تھی میں نے دیکھا کہ نفضل ملازم بالاخانے سے کوئی چٹ لاتا جس میں کسی لغت یا تاریخی مسئلے میں اختر کی رائے معلوم کی جاتی تھی۔

ادھر اختر کی حالت یہ تھی کہ ان کے بال بچوّں کے کفیل صرف حافظ صاحب مرحوم تھے اور اختر دنیا و مافیہا سے بے نیاز لا اُبالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اختر سماج کے باغی تھے اور اُنہوں نے کبھی اپنی زندگی اور ماحول سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف شعر و نغمہ کی صدا تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کھولا۔ کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ انہوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کئے لیکن وہ کبھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکے۔ کیونکہ آمد و خرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہُوا۔ ایک مرتبہ " پھولوں کے گیت " مجموعۂ نظم سے جو آپ نے بچّوں کے لئے لکھا تھا غالباً دو سو روپے سے۔ یہ روپے لے کر وہ لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں امرت سر کے کچھ نوجوانوں کو پتہ چلا کہ اختر کے پاس روپے ہیں۔ انہوں نے ان کو سٹیشن پر گاڑی سے اُتار لیا اُنہوں نے یہ روپے قرض لئے اور دو چار دن میں عیش و عشرت میں اڑا دیئے۔ لیکن اب اختر کی سادگی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ بیٹھے شیراز ہوٹل میں روپے کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ روپے کی صورت میں کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں ان کے آخری مجموعہ ہائے کلام سے جو کچھ روپے وصول ہوئے بمشکل تمام ان کا عشرِ عشیر حصّہ ان کے بچّوں تک پہنچایا جا سکا۔ دستار اُن کے پاس نہ تھی ایک کوٹ کبھی کبھی رہن رکھتے ہوتا دیکھا جاتا تھا۔

ابتداء میں حافظ محمود شیرانی مرحوم نے کئی بار کوشش کی کہ اختر کو کسی کام میں لگائیں لیکن اختر ہمیشہ اس راہ سے دامن بچاتے رہے۔ حافظ صاحب مرحوم جب اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج میں تشریف لے گئے تو اختر سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج میں اپنے والد کی جگہ قبول کرلیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر ۱۹۳۵ء میں اختر کو دارالترجمہ حیدر آباد (دکن) میں ایک عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے وہاں جانے سے بھی انکار کردیا۔ درحقیقت وہ کسی قسم کی پابندی اپنے ذمّہ نہیں لینا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اختر کی دن رات کی خلوت گزینی یا گوشہ گیری۔ گھر اور گھر کی زندگی سے بیزاری۔ دنیا اور دنیا کی ہر قسم کی زندگی کی سود و بہبود سے بے نیازی۔ ہر وقت کی شعر نوازی اور ہمہ وقت عیش کوشی۔ رندی و مستی۔ اقارب اور اعزّہ سے لاتعلّقی۔ ایک خاص قسم کے آدابِ

وغبنون اور رسوا سر بازار لوگوں کی طرح کی زندگی اور ایک خاص طرز کے دوستوں سے سروکار —— یہ سب چیزیں کچھ ایسی تھیں جنہوں نے اختر کے والد محترم کے دل میں اُن کے خلاف سخت غم و غصہ اور رنج و نفرت کے احساسات پیدا کر دئے تھے۔

ساتھ ہی بعض مخصوص قسم کے احباب گاہے گاہے حافظ صاحب مرحوم کو مخصوص انداز میں ان حالات سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا اختر اپنے یگانۂ روزگار باپ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے اور قدرتی طور پر اُن کے والد محترم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کا فرزند بھی سوسائٹی اور ملک میں عزت اور علم و ادب میں امتیازی شہرت حاصل کرے —— لیکن اختر کی اس زندگی کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھی اختر اور ان کے والد محترم کے درمیان رفتہ رفتہ افتراق و شقاق کی ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی اور اسی لئے اختر کی گھر کی زندگی بے حد تلخ ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ ہو گئی تھی کہ گھر ان سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار —— بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر دوستوں کے یہاں اقامت گزیں ہو گئے اور اس مقصد کے لئے اکثر میرے غربت کدہ کو شرفِ انتخاب بخشا۔ —— لیکن پھر کسی نے گھر والوں سے صلح کرا دی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔

اکثر ان کا معمول یہ تھا کہ رات گئے گھر لوٹتے تھے اور اس اثنا میں بارہا ایسا ہوا کہ ان کے والد محترم نے غصہ میں آکر مکان کے اندر سے زینے کے دروازے کو قفل لگا دیا اختر آئے اور اس دروازے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی ممتا کے زیر اثر ان کی والدۂ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آکر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور اس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کھلتا

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر پر رہتے یا کہیں اور —— ان کی یہ عادت تھی کہ جہاں بھی رہتے خواہ دن بھر کہیں ہوں رات کو کسی نہ کسی وقت اپنے ٹھکانے پر ضرور پہنچتے تھے۔ یعنی مست و لایعقل رہنے کے باوجود اس قدر باخبر اور محتاط ضرور تھے کہ رات کو اپنا ٹھکانا نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ وہ میرے مکان پر قیام کے زمانے میں دن بھر غائب رہتے اور رات کو دو بجے تشریف لاتے تھے۔

ان تمام امور کے باوجود اختر اپنے والد محترم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی وہ اپنے والد محترم کا نام لیتے بڑے احترام سے لیتے اور اکثر ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر کرتے۔ عام لوگوں کو اس سلسلے میں اختر کی محبت کا اندازہ اُس وقت ہوا جب ٹونک میں اُن کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو اس رند خرابات نے راستے میں جنازہ کو روک کر پٹی پکڑ کر کچھ اس انداز میں صدائے نالہ و شیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اس منظر کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔

اختر کے ساتھ شراب کا تصور لازم و ملزوم کی صورت میں سامنے آتا ہے میں نے ذکر کیا ہے کہ اختر سے میری ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی ہے اس وقت اختر شراب کے خوگر ہو چکے تھے اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ لاہور پہنچنے کے بعد انہیں ان کے مخصوص قسم کے دوستوں نے شراب کے ذائقہ سے آشنا کرایا بعد میں جب علامہ تاجور مرحوم نے لاہور میں مرکز ادب حلقۂ ارباب علم و ادب کے نام سے قائم کیا اور یہاں ہند کے دیگر مشاہیر شعر و ادب کے ساتھ ساتھ حضرت جگر مراد آبادی بھی کچھ مدت کے لئے قیام پذیر ہوئے تو حضرت اختر نے اس سلسلے میں اس پیر مغاں کی بیعت کی۔ اختر کا بیان ہے کہ میں شعر میں علامہ تاجور کا شاگرد رہا اور شراب میں حضرت جگر کا ابتدائی دنوں میں انہوں نے اپنا کلام علامہ تاجور کو دکھایا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے مخصوص رنگ میں ڈھل گئے۔

شراب میں یہ جگر کی تقلید کا مسئلہ اس حد تک خبر متواتر کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ ایک مرتبہ جب اختر طبی مشورہ کے لئے حکیم فقیر محمد[۲]

چشتی مرحوم کے پاس گئے تو انہوں نے نبض دیکھ کر بر سبیلِ تفنن فرمایا کہ "جگر کے کباب کھاؤ"۔

رفتہ رفتہ اختر اس حد تک شراب میں بہہ گئے تھے کہ ان کے جسم میں پانی کی جگہ شراب رہنے لگی۔ شراب۔ ہر وقت اور ہر لمحہ شراب ——— آخر میں شراب کی بدولت اُن کا گوشت ہڈیوں سے جُدا ہو گیا۔ جگر جل کے کباب ہو گیا اور شراب نے ان کی زندگی کے بخیئے اُدھیڑ دیئے۔

اختر کی بادہ کشی عام شرابیوں کی طرح کی نہ تھی ان کی عادت یہ تھی کہ جب وہ آغاز کرتے تو بے تحاشا پیتے۔ اکثر سودیشی پیتے اور آخر میں صورت یہ تھی کہ پانی ملانا ترک سمجھتے تھے۔ جب دَور شروع ہوتا تو عموماً دو دو ہفتے جاری رہتا اور لطف یہ تھا کہ اس مدت میں غذا قطعاً ترک کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد خمار اور اس کے ساتھ قے اور ابکائیوں اور بے چینی اور گھبراہٹ کا زمانہ آتا۔ اب دو چار دن کے لئے ناغہ کرتے اور پھر دور لازم آ جاتا۔

جہاں تک پند و نصیحت کا تعلق ہے بہت سے دوستوں نے جو خود تو منکر تھے لیکن ان کے ساتھ "ہم رنگِ مستاں زیستن" کے عادی تھے انہیں شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بیکار ——— بارہا مجھ سے نہ پینے کا وعدہ کر کے جاتے لیکن اس کے باوجود میں دیکھتا کہ پیئے ہوتے اور جھومتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ پوچھتا کہ "حضرت یہ کیا ہوا" فرماتے کہ "اس دفعہ آخری بار حماقت ہو گئی"۔

کئی بار سخت کوشش کی کہ انہیں مجبور کر کے شراب سے باز رکھا جائے لیکن جب کبھی دو چار دن کا ناغہ ہوا اس اثناء میں کہیں نہ کہیں سے کوئی ہم مشرب ٹپک پڑا۔ جو ان کی توبہ کے ٹکڑوں کو چند روز بھی سلامت نہیں رہنے دیتا تھا۔

شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسن طلب کچھ ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پورا کئے رہا نہیں رہا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سرما کا مہینہ تھا اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطب کر رہا تھا۔ وہ مشہور ہلا نوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آ گئے۔

ایک صاحب نے فرمایا ع "دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں"۔

دوسرے صاحب بولے ع "اور شاعر کوئی آئے تو پلا دیتے ہیں"۔

اور آپ نے فرمایا ع "اہلِ دل ایسے مسیحا کو دعا دیتے ہیں"۔

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔ شراب کے لئے رقم طلب کر کے اکثر یہ فرمایا جاتا تھا کہ بس آخری موقع ہے اس کے بعد اس کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ لیکن یہ کافر ہمیشہ منہ سے لگی رہی۔

شراب پی کر شرابی دوستوں کو ساتھ تانگہ میں لے کر عموماً باہر نکلتے اور دوستوں کے یہاں پہنچتے۔ ملک میں سودیشی کا چرچا تھا۔ تھرّا پینے کی عادت کی جانب اشارہ کر کے فرماتے کہ میں سودیشی کی تحریک کا زبردست حامی ہوں۔ شرابیوں اور شرابخانہ کے کاروبار سے جو آپ کو لگاؤ تھا اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ انارکلی کے چوک کے دائیں طرف باہر ٹھیکے کی دکان پر ایک مسلمان بادہ فروش ترکی ٹوپی اوڑھے شراب بیچ رہا تھا۔ جب اس کا سر ہلتا اور ٹوپی کا پُھندنا جھولتا آپ قہقہے لگاتے اور جھومتے۔

اربابِ غرض مختلف کاموں کے سلسلے میں اختر کے پاس آتے تھے۔ کئی لوگ سفارشی خطوط لکھواتے۔ کئی انہیں اپنے کاموں میں سفارش کے لئے ساتھ لے جاتے۔ کئی ان سے اپنے اخبارات و رسائل کے لئے نظمیں لینے کے لئے آتے۔ اور کئی دوست اُن کے پاس آ کر اپنی فلموں کے لئے اُن سے مکالمات لکھواتے۔ اختر اس طرح کے اکثر کام بخندہ پیشانی مفت انجام دیتے تھے ——— اور گاہے ان کاموں کی قیمت دیسی شراب کی صرف ایک بوتل ہوا کرتی تھی۔ جو اُس زمانے میں دو ڈھائی روپے میں آتی تھی۔

اختر کی شاعری بڑی حد تک سلمٰی کے تصور کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اختر کی شاعری سلمٰی کے عشق کی رنگین داستان ہے

اس لئے ضروری ہوا کہ چند کلمات یہاں سلمیٰ کے متعلق بھی عرض کئے جائیں۔

جہاں تک لفظِ سلمیٰ کا تعلق ہے یہ لفظ فارسی اور عربی ادب میں محبوبہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حافظ کہتا ہے۔

؎ قاصدِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا ۔۔۔ چہ شود گر بسلامے دلِ ما شاد کند

؎ منزلِ سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام ۔۔۔ بہ صدائے ساربان بینی و آہنگ جرس

؎ ما بسلمیٰ و من بذی سلم ۔۔۔ این جیراننا و کیف الحال

؎ امن انکرتنی عن حبِ سلمیٰ ۔۔۔ غریق العشق فی بحر الودادی

اور جامی کہتا ہے کہ

؎ امن شوقاً الی دیارٍ لقیت فیہا جمال سلمیٰ ۔۔۔ کہ مے رساند از اں نواحی نوید لطفے بجانب ما

لیکن اختر کی شاعری میں سلمیٰ سے مراد ایک معیّن شخصیت تھی۔

سلمیٰ کا حقیقی وجود لوگوں کی نگاہوں سے اس لئے بھی مخفی رہا کہ اختر اس راز سے پردہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ واقف تھے ان کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ آخر عمر تک اس راز کو چھپاتے رہے اور جو لوگ پوچھتے انہیں بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کا یہ طریق کار صحیح بھی تھا۔ آخر ایک شریف خاتون کو رسوا کرنے کا فائدہ۔

قدرتاً سلمیٰ کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا نام منظرِ عام پر نہ آئے اور جب انہیں ایک دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر بہک کر کچھ خاص قسم کے اشارات کرنے لگا ہے تو انہیں ایک خط میں اختر کو خاص طور سے تنبیہہ کرنی پڑی جس کے جواب میں اختر نے ایک غزل میں کہا کہ

؎ شعر میں ذکر کسی کا دل ناکام نہ کر ۔۔۔ اُس نے لکھا ہے کہ تو یوں ہمیں بدنام نہ کر

غیرتِ حسن کو منظور نہیں رسوائی ۔۔۔ ضبط اے عشق اِس افسانے کو یوں عام نہ کر

اور اس کے بعد اس حد تک اخفا کی کوشش کی گئی کہ اختر نے اپنے اور سلمیٰ کے خطوط کا اس وقت جو مجموعہ مرتب کیا اس میں اپنے لئے بھی اختر کی جگہ "کوکب" کا لفظ اختیار فرمایا۔

یہ مجموعۂ مکاتیب ان دنوں بہت سے دوستوں کے یہاں چکّر لگاتا رہا چند روز میرے پاس بھی رہا لیکن اُس وقت مجھے اس کو نقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ آہ اُس وقت کسے خبر تھی کہ

؎ ہے آج جو سرگزشت اپنی ۔۔۔ کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک ایک نقل آغا غادم حسین جالوی ایڈ یٹر کے پاس موجود ہے۔

بہرکیف احباب کی اطلاع کے لئے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سلمیٰ جن کا اصل نام اور ہے ایک معین شخصیت کا نام ہے اور وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔

سلمیٰ سے اختر کے معاشقہ کی ابتداء ۱۹۲۶ء میں ہوئی جبکہ پہلے پہل سلمیٰ کا ایک مکتوب ان کے نام پہنچا اور اُسے پڑھ کر انہوں نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے کہ

؎ اے آئے انقلاب سپہر بریں کہاں ۔۔۔ اللہ ہیں کہاں وہ ثریّا جبیں کہاں

اس کے بعد جب درِ جاناں پر طلبی ہوئی تو اختر یوں نغمہ سنج ہوا کہ

؎ کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات ۔۔۔ کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات

کتنی فیّاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات   کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں   باغ میں پھول سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں   ایک میں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

آج کی رات کے عنوان سے یہ تمام نظم اسی نوع کے جذبات و احساسات سے معمور ہے۔ یہ نظم یوم ملاقات سے پہلے کی ہے لیکن اس کے بعد جب ملاقات ہو چکی تو اختر بہ سبیل تقاضائے باز دید یوں ترانہ طراز ہُوا کہ

؎ تمہیں ستاروں نے بھی بار بار دیکھا ہے   شریر چاند نے بے اختیار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے   نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو   بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
قریب شام تمہیں طائران گلشن نے   ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے
نسیم باغ نے زیب النساء سمجھ کے کبھی   تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے
غرض مظاہر فطرت نے ہر طرح تم کو   ہزار بار نہیں لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے   کہ اُس نے تم کو فقط ایکبار دیکھا ہے
دکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اور پھر اس کے بعد کی ایک ملاقات کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

؎ کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ   زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر   کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حنائی خوشبو   کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا   کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ
حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
میرے ہونٹوں سے ہوں کیوں برگ گلاب آلودہ

اختر سلمیٰ کی نسبت سے دیار سلمیٰ کا بھی جو مدت سے آذر کدۂ نیاز مندان شوق رہا ہے عاشق تھا اور اس سلسلے میں اس نے بربط عشق پر بڑے دلگداز نغمے چھیڑے ہیں۔ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

؎ اے سرزمینِ گجرات اے خلد زارِ اُلفت
پھولوں میں تیرے رقصاں روحِ بہارِ اُلفت
تیرا ہر ایک ذرّہ ہے رازدارِ اُلفت ــــ اور یادگارِ اُلفت ــــ اے سرزمینِ گجرات
عریاں ہے حسن تیرے سرسبز گلشنوں میں

آوارہ عشق تیرے شاداب دامنوں میں
فطرت برہنہ تیرے پُر نور امینوں میں —— رنگین مسکنوں میں —— اے سرزمین گجرات
پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے پاؤں پہ سر دھرنے کی آرزو ہے —— مرنے کی آرزو ہے —— اے سرزمین گجرات

ایک مرتبہ سلمیٰ جب بیمار ہوئیں تو اختر نے انہیں ایک منظوم خط میں لکھا کہ

تندرستی کا گلہ کیا ہے شکایت کیا ہے | میری بیمار بتا تو تری حالت کیا ہے
عشق بیماری ہے اور کتنی حسین بیماری | کیا خبر بے خبروں کو یہ لذت کیا ہے
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب! | آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے
رو دیئے جب بھی سنی درد بھری کوئی خبر | درد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے
ان کی صحت کی خبر آئے گی جلد آئے گی | دلِ ناداں تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے

سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں اُن پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے

تقریباً پانچ چھ سال تک یہ سلسلۂ معاشقہ جاری رہا لیکن آپ کو اس ضمن میں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ تمام دور جنسی آلودگی سے قطعاً مبرا رہا۔ مجھے اختر نے ذاتی طور پر ان حالات سے خود آگاہ کیا اور خود اختر کی تحریروں سے بھی یہ چیز واضح ہے۔ اختر اپنے اس مجموعۂ مکاتیب میں جو آج بھی دوستوں کے پاس ہے ایک مکتوب میں سلمیٰ کو اپنی ملاقات کا وقت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا آپ میری محبت کی معصومیت اور ملکوتی اور مقدس حیثیت کی داد نہ دیں گی" اور اس کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہیں کہ "آپ انسان نہیں دیوتا ہیں اور آپ کی اسی شان نے مجھے خرید لیا ہے" (یہ مکتوب روزنامہ آفاق لاہور کی اشاعت مؤرخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)

اختر اپنی ایک نظم میں بھی اس جانب اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

قسم اُس پاکبازی کی جو تھی باہم خیالوں میں | قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
قسم اُس چاک دامانی کی جو مجبورِ وحشت تھی | قسم اُس پاک دامانی کی جو معذورِ عفت تھی
محبت کی انہی معصوم راتوں کی قسم تم کو | حقیقت کی انہی موہوم راتوں کی قسم تم کو

فقط اتنا بتا دو کیا وہ راتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں آہ وہ راتیں وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

اختر و سلمیٰ کے مجموعۂ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے کہ اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا —— بالآخر غالباً ۱۹۳۲ء میں سلمیٰ ایک جگہ رشتۂ تزویج میں باندھ دی گئیں اور یہ سلسلۂ نام و پیام ہمیشہ کے لئے وعدۂ حشر پر ختم ہو گیا —— اختر نے اس موقع پر اپنی محبوبہ کو مطلع کر دیا کہ

دل و دماغ کو رو لوں گا آہ کر لوں گا | تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں ہی کاٹ دوں گا حشر سے دن | تمہارے ہجر میں راتیں تباہ کر لوں گا

اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم　　میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا

اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد واقعی اختر نے اپنی جوانی تباہ کر لی۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ اختر جب آسمان شعر و ادب پر چمکے اور سلمیٰ کی یاد میں اُن کے نغموں سے فضائے ارض میں گونجی تو اس سے سب سے زیادہ کالجوں کا ماحول متاثر ہوا جن میں طلباء کی طرح طالبات کا عنصر بھی شامل تھا۔ ان کے علاوہ ملک کی اُن ادب نواز خواتین نے اختر کے کلام کو خوش آمدید کہا۔ جن میں سے اکثر بڑے ممتاز اور اعلیٰ گھرانوں کی چشم و چراغ تھیں۔

بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خطوط لکھتی تھیں۔ بعض اپنے کلام میں اصلاح کے لئے خطوط لکھتیں۔ اور ممکن ہے ان میں سے بعض کو اختر سے کچھ دلی لگاؤ بھی رہا ہو لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حسن اور نسائیت کے نئے اُس کے احساسات اور بے پناہ طوفان جذبات کو دیکھ کر اس کی قدرداں اور اس کے ہنر کی دلدادہ تھیں۔ بعض کا معمول یہ تھا کہ اس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اُس کو خطوط لکھتیں اور تفریحاً چھیڑتی تھیں۔ جو خواتین اس سے اپنے کلام میں اصلاح لیتیں اکثر اس کے کمال فن کی ستائش کر دیتیں۔ اور یہ اختر کی سادگی تمنّا تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبّت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستارانِ اختر میں سے تقریباً سب کا تعلّق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔

وہ خواتین جن سے اختر کی مراسلت رہی ہے زہرہ۔ پروین۔ ثریّا۔ نسرین۔ ناہید۔ لالہ رخ۔ شمسہ اور لیلیٰ تھیں۔ لیکن اس ضمن میں لاہور کی عذرا۔ سندھ کی زلیخائے جواں۔ امرت سر کی نو بہار ناز اور لکھنؤ کی ممتاز ادیبہ سے بہت زیادہ سلسلۂ نامہ و پیام قائم رہا ہے۔ عذرا سے متعلق اختر نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے۔

؎ کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی　　مرے گھر پہ شامِ بہار آ گئی

شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سندھ کی زلیخائے جواں اکثر دہلی سے سندھ یا سندھ سے دہلی جاتے ہوئے لاہور سے گزرتیں ان کے خیر مقدم کے سلسلے میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ ادب اُردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

؎ راہ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے　　خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اور پھر ؎ سامانِ رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا　　لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا
مانا کہ نازِ سندھ ہے مضطر ترے لئے　　کچھ تو علاج پہلوئے بیتاب کر کے جا

جیسی نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں۔

ماہ لقا لکھنؤ کی شان میں لکھا۔

؎ کب تک رونقِ شامِ اودھ اے ماہ رواں　　شامِ لاہور کو بھی صبح بنا دے آ کر

اور امرت سر کی نو بہار ناز کی شان میں تحریر فرمایا۔

؎ ہر ذرّہ اس کے حسن سے دلکش ہے آج کل　　امرت سرایک وادیٔ ایمن ہے آج کل

عمر کے آخری حصّے میں اختر کو نثریں سے کچھ رابطہ رہا ہے اور اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دن مرنے سے کچھ مدت پہلے میرے

مکان کے سامنے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ ۔۔۔ فرمانے لگے، آج شیریں کی موٹر ادھر سے گزرے گی۔ شیریں کے متعلق آپ نے جو اشعار کہے وہ شہناز میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مری روحِ شیریں مری جانِ شیریں	تمنائے نذریں و ارمانِ شیریں
ترا رخ ہے برقِ سحابِ بہاریں	ترے لعل لب ہیں گلستانِ شیریں
دیکھ اے دل نظر آیا وہ دیارِ شیریں	ذرہ ذرہ سے جھلکتی ہے بہارِ شیریں
خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شان و عظمت	اختر اس خاک میں روشن ہے وقارِ شیریں

یہاں میں ضمناً یہ عرض کردوں کہ اختر صورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور سلمیٰ کی مہجوری کے بعد وہ خاص طور سے بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے جب بھی کوئی حسین صورت دیکھتے تو سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین صورت کا سامنا ہو جانا ان کے لئے مصیبت تھا۔ جس کا اظہار ان کے چہرے سے ہونے لگتا تھا۔ ایک دن میں مزنگ میں ان سے ملنے گیا۔ پتہ چلا کہ ایک حسین رہگزر کی جستجو میں سڑکوں پر ادھر ادھر پھیر رہے ہیں میں نے ان کا پیچھا کیا اور جب مل گئے تو پوچھا کہ آخر اس آوارہ گردی سے مقصد ہے ۔۔۔ فرمانے لگے زندگی کا اس سے بہتر مقصد اور کیا ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یوں ہی کوئی صورت دیکھ کر اپنا تانگہ کسی تانگہ کے پیچھے دوڑانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک بار لاہور سے گزرتے ہوئے سندھ کی شوخ کمسن نے گمدی پر پان کھا کے جب چھلکے پلیٹ فارم پر پھینکے تو وہ چھلکے سمیت کے سٹیشن سے گھر رومال میں باندھ لائے۔

خطوں کے معاملے میں یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی حسین خط آتا بار بار پڑھتے رہتے اور کئی کئی دن تک خاص خاص دوستوں کو دکھاتے اور سناتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان مہکتے ہوئے خطوط کی نسبت ارشاد فرمایا۔

مدت ہوئی ہے میری امیدوں کی طرح حرف مگر | آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

اختر کی زندگی کے تین دور ہیں پہلا دور سلمیٰ سے معاشقہ سے پہلے کا ہے اس زمانے میں اختر نے جوگن، تیتری اور نغمۂ سحر وغیرہ عنوانوں سے کئی نظمیں لکھیں۔ دوسرا دور سلمیٰ سے معاشقہ کے زمانے کا ہے۔ اس دور کو تقریباً تمام تر شعری دور سلمیٰ کے عشق کی حکایات، درد و درماں پر مشتمل ہے۔ اختر کی مشہور نظمیں آج کی رات، گجرات کی رات، اے سرزمین گجرات، اے عشق کہیں لے چل، اودیس سے آنے والے بتا، عورت، ملنی کی لڑکیوں میں، بعض رومانی عادات کی یاد، ایک تصویر دیکھ کر، سلمیٰ نو جوان کے مزار پر اور "مری سلمیٰ مجھے کچلی نو جوان لگیں بہار میں" اسی دور بہار سے تعلق رکھتی ہیں۔

تیسرا دور سلمیٰ سے جدائی کا زمانہ ہے۔ اس میں اختر نے ابتدا دنیا سے تنگ آکر زندگی کی رودادیں بیان کی ہیں۔ اور بہت کچھ کہا ہے۔ عذرا، ناہید، سندھ کی شوخ کمسن ہیں اور دوسرے حسین عنوانات اسی دور سے متعلق ہیں اور اختر کی نظم "میری داستانِ حیات" مکمل طور پر اس دور کی زندہ تصویر ہے۔ اس دور کا آخری حصہ تمام تر ماتمی ہے اور آخر میں تا پرستی سے خالی ہے۔ یہیں اختر نے "بہار بیتنے والی ہے" جیسی نظم سلمیٰ اور "رخصت اے دوست" جیسی ماتمی نظم کہی۔

اختر کی شعر گوئی کسی خاص دور سے وابستہ ہے اور ان کی زندگی کے حالات، سوانح سے ڈالی گئی اسی کے سانچے میں ان کی شاعری کو ڈھلتی گئی۔ موتی دور اور حالوں کی پرانی پرچھائیں ہے۔ اس دور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمنا اب ہوئی نہ گلستان آرزو | لٹا دی ہر بات پہ جھیل کر چلے گئے
بہت تڑپانے کی دل کو عادت داستان رہی | ستم ہیں دل تڑپا سا نہ جہاں ہر ہوں

؎ پلا دے جتنی چاہے اب تو مہماں ہیں کوئی دن کے — جرس کا شور گونجا کارواں طیار ہے ساقی

؎ قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے — بہار لے گئے یادِ بہار چھوڑ گئے
ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا — وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے
نگاہِ درد کی عرضِ حزیں قبول نہ کی — ہمیں وہ غمزدہ و دلفگار چھوڑ گئے
اُمید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل — اُمید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

اختر کو اپنی زندگی میں پانچ عظیم حوادث سے سابقہ پڑا۔ سلمیٰ کی جدائی۔ اپنے چھوٹے بچے کی موت۔ بشیون کی خودکشی۔ والد کی وفات۔ اور سب سے آخر میں ان کے عزیز داماد نظیر الدین کی ٹونک میں رود بناس میں غرقابی جس پر انہوں نے حسبِ ذیل قطعہ کہا۔

؎ ہے غرقِ ظلمتِ یاس آسماں آج — مہِ درخشاں ہے نظر سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے — اجل ڈوبا نظیر الدین جواں آج
۱۳۴۲

ان تمام حوادث پر گھر والوں کا عتاب۔ دوستوں کی سرد مہری اور لاہور کی جدائی مستزاد تھی۔ یہ تھے اختر کے مصائب۔ اور ان سب کا علاج آپ نے شراب تجویز کر رکھا تھا۔

تقسیم سے کچھ مدت پہلے اختر کے والد محترم حافظ محمود شیرانی اپنی مدت ملازمت ختم کر کے اہل و عیال کو ہمراہ لے کر ٹونک روانہ ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ لاہور کی یاد میں ہمیشہ بیقرار رہے۔ ہر خط جو ٹونک سے آتا اس میں لاہور کی جدائی کا مرثیہ ہوتا۔ وہ لاہور آنے کے لئے بےچین رہتے تھے اور اس اثنا میں جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی کی خاک میں دفن ہونا چاہتے تھے۔ لاہور آنے سے پہلے کئی بار ان کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اس زمانے میں انہوں نے نگار کے غزل گو شعرا نمبر میں لکھا کہ

"ریاست ٹونک میں پیدا ہوا۔ لاہور میں ہوش سنبھالا اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شائع کرنے کا موقع ملے گا۔"

مرنے سے چھ ماہ پیشتر ایک دن اچانک لاہور آ گئے اور فرمانے لگے کہ بس اب یہیں رہوں گا۔ یہیں رہوں گا۔ میں نے نیر منزل کے نیچے کا کمرہ ان کے لئے کھلوا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اسی میں باقاعدہ مقیم ہو گئے۔

اس بار بھی ان کے بسر اوقات کا عالم وہی تھا یعنی رات دن پینا۔ دن کو بالعموم غائب رہنا۔ آدھی رات کو آنا۔ خوب جاگنا اور دوستوں کو جگانا کہ عجب خانانی، اگر شب آمد۔

اس اثنا میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ عالمِ وحشت میں کئی کئی دن باہر رہتے اور سلمیٰ کے محلے کی گلیوں کی خاک چھان کر واپس آ جاتے۔ اس مرتبہ اختر مصائبِ حیات سے کچھ بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور اس قدر رقیق القلب ہو چکے تھے کہ اکثر بات بات پر رو دیتے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور اپنی بے اعتنائیوں کا گلہ کرتے۔

پھر اس اثنا میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اپنی تصویریں بہت زیادہ کھنچواتے اور سب میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے میں اس بار اپنی تصویریں بہت کھنچوا رہا ہوں۔

ان چیزوں کے علاوہ اس دور میں ایک خاص چیز یہ دیکھی گئی کہ آپ پر عشقِ رسول کا غلبہ معلوم ہوتا تھا چنانچہ اس زمانے میں آپ نے بہت سی نعتیں لکھیں جو آپ کے آخری مجموعۂ کلام شہرود میں درج ہیں۔

لیل و نہار اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن آپ پہ ردِ عمل کی کیفیت زیادہ طاری ہوگئی، جس کے نتیجہ میں غثیان و تہوع کی حالت بڑھ گئی۔ قبض شدید ہوگیا۔ جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پہ زردی چھاگئی۔ مجبوراً میں نے انہیں میو ہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو چند روز ٹھیک رہے۔ لیکن اچانک ایک دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی ——— اور بالآخر ۴۳ سال کی عمر ہی میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو آپ نے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گزار راہوں کا سفر ختم کر لیا ——— آہ

؎ میں میکدے کی راہ سے ہوکر گزر گیا ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

مرنے سے پہلے اختر کے ہونٹوں پر یہ مصرع تھا۔ ع ہوگئی بزمِ میکدہ خاموش ۔ شاعر نے یہ کہا اور بزمِ میکدہ سُونی ہوگئی

۱۱ ستمبر کی صبح کو آپ کا تابوت ہسپتال سے نیّر منزل لایا گیا اور یہاں سے وہ تدفین کے لئے گورستان لے جارہا تھا کہ اختر کی بھولنے والی کو اختر یاد آیا۔ راستہ میں ایک برقع پوش خاتون نے تابوت رکوا کر اس کا آخری دیدار کیا ——— اور اس کے بعد شہرستان علم وادب کی یہ عظیم دولت گورستان میانی میں ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دی گئی۔

ابوسعید بزمی

ادیبہ بزمی

طفیل صاحب آپ نے مجھ سے بزمی کی شخصیت کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ بزمی کا نام ہی میری زندگی کا سب سے اہم باب ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اس کتاب کو ہی بند کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی پہلی زندگی کے متعلق سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی ہے۔ آج پانچ سال گزر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو مجھے بھول ہی گئی ہیں۔ پھر بھی سوچتی ہوں کہ بہت سی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کی یاد ابھی تازہ ہے اور اگر اپنے جذبات سے قطع نظر انہیں کہہ دوں تو شاید مفید بھی ہوں۔ اس سلسلہ میں میری کوشش یہی ہے کہ بزمی کو بحیثیت انسان کے آپ کے سامنے پیش کر دوں لیکن میرے ذہن میں ان کی گھریلو زندگی کا کوئی پہلو اس طرح سے نہیں آتا کہ گھر سے باہر کی زندگی یا اس خاص قسم کی "ذہنی دنیا" سے اُن کو الگ کر دوں جو ان کے لئے سب کچھ تھی اور جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو بڑی ریاضت اور کوشش سے تیار کیا تھا۔

ان کی موت پر مجھے عربی کی یہ ضرب المثل یاد آتی ہے "ایک شخص تمام رات دعا مانگتا رہا کہ خدایا صبح کر دے اور جب صبح ہوئی تو اس کی بینائی زائل ہو گئی"۔

جب ارادے تکمیل کو نہ پہنچیں تو خواب پریشان بن کر رہ جاتے ہیں۔ بزمی کے بے شمار پریشان خوابوں کے دھندلے نقوش میرے ذہن میں باقی ہیں جنہیں اندھیروں سے کھینچ کر لانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی اس لئے میں نے ان کی چند تصویروں کا سہارا لیا ہے کہ شاید یہ ذہن کی رہنمائی کر سکیں۔

لیجئے یہ تصویر بزمی کی وہ واحد تصویر ہے جو نہ جانے کس اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ بندۂ خدا نے اس مختصر سی زندگی پر ایک ستم یہ بھی کیا کہ کبھی تصویر ہی نہ اتروائی۔ ایک دن ان کی میز کے کاغذوں کے انبار میں سے پاسپورٹ سائز کی تصویر کے یہ دو پرنٹ برآمد ہوئے۔ میں بہت حیران ہوئی۔ مگر وہ بولے "لیجئے کتنا پریشان کر ڈالا تھا تصویروں کے لئے اب کبھی مت کہئے گا کہ تصویر

نہیں کھنچواتے۔"

اور میں مزید حیران ہو کر رہ گئی کہ کس قدر بے تکلفی سے بھوپالی دوستوں کی زبردستی کا احسان مجھ پر رکھ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ تصویر تو بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس Bhopal State Peoples Conference کے ممبروں کے اصرار کا نتیجہ تھی ان لوگوں کی خواہش تھی کہ اس کانفرنس کے بانی اور وہاں کے عوام کے منظورِ نظر راہنما کی کم از کم تصویر ہی دفتر میں آویزاں ہو جائے۔ اور برسوں تک یہ اعتراض رہا کہ اب کون تصویریں اتروانا پھرے۔

پھر آخری سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر کہنے لگے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچواؤں کہ خدا جانے کیا ہو۔۔۔۔

مجھے عجیب سا وہم ہوا اور وہ تصویریں نہیں اتریں۔ اب جب میرا وہم حقیقت بن کر سامنے آگیا تو میرے ہاتھ میں صرف یہی تصویر رہ گئی۔ اس میں بزمی کی گہری آنکھیں اور دونوں ابروؤں کے درمیان دو چھوٹی چھوٹی لکیریں جو سوچتے وقت اور نمایاں ہو جایا کرتی تھیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جبڑے کی ساخت اور دہانے سے قوت ارادی کی مضبوطی ظاہر ہے۔ چوڑی پیشانی اور چہرے پر وہی شگفتگی ہے جو مزے دار لطیفے بیان کرتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے وقت پیدا ہو جایا کرتی تھی اور یہ لیجئے حسب دستور داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔

—— شیو بنانے اور بال کٹوانے کا کام ان کے لئے بے حد مشکل تھا۔ ہمیشہ دفتر سے اٹھتے ہوئے دس بجے رات کو اگر کسی بد قسمت کی دوکان اس وقت تک بھی کھلی رہ جاتی تو اس میں داخل ہو جاتے تھے اور وہ بھی دوستوں کی سرزنش سے تنگ آکر۔ سنا ہے کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے مولانا عبدالمجید سالک انہیں سردار جی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

نائی کی دوکان سے چھٹکارا پا کر وہ یوں گھر آتے جیسے ساری دنیا کے جھگڑے چکا کر آئے ہوں ایک دن بہت زوردار قہقہوں کے درمیان مجھے بتایا کہ "کل جو میں بال بنوانے گیا تو شخص مذکور کہنے لگا کہ بال پرانے فیشن کے بنا دوں یا اس فیشن کے رہنے دوں" یاد رہے کہ بڑے بڑے بال رکھنے کا فیشن ان دنوں نیا نیا شروع ہوا تھا جو نو عمر لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔

شیو کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے داڑھی نکلتے ہی معلوم کر لیا تھا وہ کہ شروع سے ہی داڑھی چھوڑ دی جائے۔ مگر دوستوں کی دستبرد سے وہ بیچاری نہ بچ سکی۔ اس وقت سے مجبوراً شیو کرنے کی روایت شروع ہوئی۔

یہی حال لباس کے معاملے میں بھی تھا۔ عجیب بے نیازی کا عالم تاعمر چھایا رہا۔ ان کی کھدّر پوشی میں کھدّر کی سرپرستی کے ساتھ، لباس کے مسئلہ کو بھی ایک ہی بار حل کر دیا تھا۔ ایک دم کئی تھان کھدّر کے اٹھا لائے اور کرتے، پاجامے، شروانیاں اور ٹوپی سب تیار ہو گئی۔ بعد میں درزی کو ہی اختیار مل گیا کہ بھئی تو اپنی مرضی سے کپڑے بنا دیا کر۔ وہ ظالم ان کی ڈھیل سے دن بدن لاپروا ہوتا گیا اور سینے پرونے کے فن کے تمام تجربات کی وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ کیا کہیئے۔ ایک دن جو گھٹنوں تک لمبی قمیص سی کر لایا تو میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور میں نے کھدر کے وہ سب کپڑے اٹھا کر پھینک دئے۔

"بس آج سے کھدر وغیرہ سب بند۔ آئندہ سے انسانوں کے لئے کپڑے بنیں گے"۔

"ارے بھئی سبب اُسے آتا ہے اس بیچارے نے سی دیئے ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو آپ ٹھیک کر دیجئے"۔ لیجئے جی چاہنے کا سوال آگیا تو گویا جی نہ چاہے تو مت ٹھیک کرو یہاں ایسا ہی پہننے میں کیسے انکار ہے۔

پھر میں نے بڑے شوق سے عام رواج کے کپڑے تیار کروائے تو انہیں بھی انہوں نے اسی بے نیازی سے پہن لیا جیسے پچھلے درزی کے سلے ہوئے ملیے کرتوں کو۔ البتہ جدید وضع کے لباس میں اتنی ترمیم کر دی کہ کوٹ کے بدلے شروانیاں سلوائیں۔

گنگا جمنا کے دوآبہ میں شروانی وضع داری اور شرافت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور جو لوگ یوپی کے قدیم خاندانوں کی خصوصیات

سے واقف ہیں وہ شاید اس بات کی تائید کریں کہ ان لوگوں کے لباس ہی میں نہیں بلکہ چال ڈھال، اُٹھنے بیٹھنے، روزمرہ کی زندگی کے طور طریقوں میں ایک رکھ رکھاؤ، ایک دھیما پن، ایک صبر و سکون کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ یہ صبر و سکون جسے اکثر بڑے ریاض سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں کی خصوصیات تھیں جو قومی زندگی میں اہم خدمات انجام دئے گئے اور بعد میں مولوی کے لقب سے یاد کئے گئے۔ بزمی کا خاندان بھی ایسے ہی مولویوں کا خاندان ہے جن کے ہاں اونچی آواز سے بولنا بُرا ہے، ریشمی کپڑے پہننا بُرا ہے۔ زمین پر زور سے قدم رکھنا بُرا ہے۔ غرض یوں جینا کہ ؏

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

بزمی کو اپنے اس ماحول سے بہت سی باتیں ورثہ میں ملیں اور کچھ انہوں نے اپنا لیں، ان کی طبیعت میں ایک دلآویز قسم کی یکسانیت تھی ایک ٹھہراؤ تھا۔ سُنا ہے کہ اس ٹھہراؤ اور پختگئ عمل کو بھوپال کے حکمراں کی چیرہ دستیاں اور ریاستی جیل کی ہولناک کوٹھڑیاں بھی متزلزل نہ کر سکی۔

شدید سے شدید جذباتی موقع پر بھی وہ ایسے ہی پرسکون رہتے اور انتہائی غصہ میں بھی آہستہ سے ایک آدھ جملہ سنائی دیتا۔ چہرہ کے آثار چڑھاؤ یا آنکھوں کی چمک کے سوا اور کسی طرح یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا کہ یہ شستہ اور مہذب جملے کس جذبے کے تحت کہے گئے ہیں بیشتر ان کے غصے کی حالت کچھ یوں ہوتی :۔

"کیا گڑبڑ ہے یہ؟ کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے؟" ——— وہ بغیر کاغذ پر سے نظریں اُٹھائے لکھتے لکھتے بولتے جاتے کیونکہ گھر میں بہر حال کسی نہ کسی وقت تو کوئی ہنگامہ ہوتا ہی ہے۔ اور مجھے اکثر کسی وجہ سے ان کے لکھنے میں مخل ہونا پڑتا۔

ان کا اعتراض سُن کر میں بھی جھلا جاتی۔ "جی ہاں ٹھیک ہے بے خبری میں ہر بات ہی ہنگامہ معلوم ہوتی ہے"۔

اس کا جواب عموماً یہ ہوتا کہ اپنا کاغذوں کا پشتارہ اُٹھایا اور کسی دوسرے کمرے میں گھس کے کھٹ سے دروازہ بند ———

ابھی ان کی بے نیازی پر میری طبیعت کا تکدّر باقی ہوتا کہ وہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ اپنا تازہ شاہکار سُنانے آموجود ہوتے۔ ایک مضمون نگار اپنے مضمون کی تکمیل پر جس طرح خوشی کا مجسمہ بن جاتا ہے اور مسرّت کی روشنی اس میں نظر آتی ہے اس کا ساتھ نہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی ناراضگی جلدی ختم کر دینی پڑتی۔

تاہم ایسی لڑائی کے موقع بھی ہمارے اس سات سالہ زندگی میں بہت کم آئے کیونکہ بزمی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی جن پر عام طور سے گھروں میں فساد برپا ہوتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے؟ کھانا کیا پکتا ہے؟ خرچ کس طرح ہوتا ہے؟ کون نیا ملازم رکھا جاتا ہے؟ انہیں کچھ غرض نہ تھی۔

انہیں تو یہ مسرّت ہی کافی تھی کہ گھر کی بدولت انہیں زندگی کا سکون و اطمینان تو میسّر ہے ——— کیا یہ خوشی ان کے لئے کافی نہیں تھی کہ وہ جس وقت چاہیں کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور انہیں مطالعہ کے لئے بھوپال کے قدیم کھنڈرات اور ویران سڑکوں پر تو پناہ نہیں لینی پڑتی کہ وہ والد کی سخت گیری کی زد میں نہ آسکیں۔ ان کو اپنے بچپن کے بے شمار دکھ یاد تھے اس وقت کے جب زبان کو اظہار پر قدرت نہ تھی مگر دل دکھی احساسات کا خزانہ بن گیا تھا۔ بچپن میں انہیں پرندوں سے بہت محبت تھی مگر وہاں گھر میں پرندے کہاں جہاں سوتیلی ماں کے نخروں کا راج ہو۔

ایک کتاب کہیں سے ہاتھ لگ گئی تھی جس میں پرندوں کی تصویریں تھیں تو ڈرے اور سہمے ہوئے ابو سعید نے جو اس وقت بزمی نہ بنا تھا گھر کے کونوں کھتروں میں، الماریوں کے پیچھے اور جہازی چھپر کھٹ کے نیچے اندھیروں میں چھپ چھپ کر ویسے ہی تصویریں بنانے کی مشق شروع کر دی اور ایک ایک تصویر نقل کر کے چھوڑی۔ لیکن پھر والد صاحب کو پتہ چل گیا چونکہ گھر میں شرع کی رو سے کوئی تصویر رکھنا جرم تھا

اس لئے اصل اور اس کی نقل دونوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ بزمی کو یہ سانحہ بڑی جزوی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھا۔ اس لئے یہ ان کے لئے بہت بڑا سکون کا باعث تھا کہ ان کے اپنے بنائے ہوئے گھر میں بچے اپنی مرضی سے کتابیں پڑھ سکیں گے۔ کھیل کھیل سکیں گے، آزادی سے ہنس سکیں گے اور یوں وہ اپنے سارے تشنہ ارمان پورے کر سکیں گے۔

اپنی عدیم الفرصت زندگی میں بھی وہ جب اپنے چار یا پانچ سالہ بیٹے کو سلیٹ پر کیل کانٹے بناتے دیکھتے تو اسے پاس بلا لیتے "آؤ مُنّے چڑیا بنائیں! کیا بنائیں؟ کبوتر بنائیں! کبوتر!"

پھر بڑے انہاک سے کبوتر بنایا جاتا اور دونوں باپ بیٹے بے انتہا خوش ہوتے۔ شاید اپنی کامیاب تصویر سے زیادہ اپنے بچپن کی تمنّا کو پُورا کرنے پر خوشی ہوتی تھی۔

پھر یہیں تک بس نہ تھا۔ ایک دن دس پندرہ شیرازی کبوتر اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

"ارے یہ کیا تماشہ ہے"۔

"ہوں تماشہ کہہ دیا بڑی مشکل سے خرید کر لایا ہوں۔"

"بلّی جو کھا جائے گی"۔

"نہیں کھائے گی ہم خود دانہ پانی ڈالا کریں گے۔ ہم تو بچوں کے لئے لائے ہیں۔"

آخر بڑے اہتمام سے کونڈی منگوائی گئی اور چنوں کا دانہ بچے سارا دن دانہ بکھیرتے رہتے اور کبوتروں میں گھسے رہتے اور صحن میں سے گزرتے ہوئے وہ اس خوبصورت منظر کو ایسی محبت سے دیکھتے جیسے کبوتروں کے سڈول اور پاکیزہ وجود میں ان کے آئیڈیل کا کوئی ہم راز چھپا ہوا ہو۔

بزمی کو مطالعہ کا بچپن سے شوق تھا۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد سے چودہ پندرہ سال تک کا عرصہ جو انہوں نے اپنے نانا کی حویلی میں گزارا تھا۔ مطالعہ کے یادگار دن تھے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق صاحب بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے۔ اور ایک وسیع کتب خانہ کے مالک تھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے بزمی کو فارسی اور عربی پڑھائی کیونکہ ان کے کھینچے ہوئے زائچہ کے مطابق یہ لڑکا بڑی علمی صلاحیتوں کا مالک بننے والا تھا۔ اس پُراسرار قدیم حویلی کے حجروں میں جہاں زندگی بہت احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ چلتی تھی دونوں نانا نواسے ان خزانوں کو کُریدا کرتے جن کے جواہر دن بدن مٹی کے مول ہو رہے تھے۔

پھر جب نانا کے انتقال کے بعد اس حویلی کا سکون بھی عنقا ہو گیا اور اس کی بنیادیں لُون لگ کر جھڑنے لگیں تو بزمی نے غلام گردش کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کو اپنا لیا کیونکہ نانا کے وارثوں کے لئے ان علمی خزانوں اور تاریک حجروں سے زیادہ اہم چیزیں موجود تھیں۔

انہوں نے ایک بار مجھے بتایا "میں حجرے کے دروازے میں لیٹ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک اور حجرہ تھا اور اس میں سے ہو کر ذرا سی روشنی میرے حجرے کے دروازے تک آیا کرتی تھی"۔

آخر وہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ کتابیں بِک رہیں تو بھوپال کے کھنڈرات نے اپنی آغوش کھول دی جن سے رفاقت کی مدت تقریباً دس سال رہی۔ یہیں سے بزمی نے بھوپال کے مقامی اخبارات کے لئے مضمون لکھنے شروع کئے جس کی اشاعت والد کی ناراضگی کا باعث بنی اور یہیں سے منشی فاضل کے امتحان کی تیاری ہوئی جس کے لئے اس بنا پر جھڑکیاں دی گئیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں بھلا یہ امتحان دینے۔

بے چارے والد چند ہی سال بعد اس لڑکے کو جسے وہ منشی فاضل کے امتحان کے ناقابل سمجھتے تھے۔ دو بھائیوں اور ایک ماں کا سہارا

بنا کر چھوڑ گئے ۔ سولہ برس کی عمر تھی کہ ملازمت کا چکر شروع ہو گیا ۔ میٹرک کی سند سے لے کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) تک کے سب مرحلے اسی طرح طے ہوئے ۔

اخبار مدینہ سے تعلق کے دوران 'چوبیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک، جب میرا انکا ساتھ ہوا وہ اگرچہ معاشی لحاظ سے آسودہ تھے مگر بنک بیلنس کچھ نہ تھا ۔ کیونکہ آمدنی سے یا تو موٹی موٹی کتابیں خریدی گئیں یا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کے چندے دے گئے تھے ۔ ان کے بنائے ہوئے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں ۔ غالب و اقبال کے کلام سے لے کر فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدوں تک ۔ انگریزی کے منتخب افسانوں سے لے کر معاشیات کی ٹھوس کتابوں تک، قرآن و بائیبل کے مقدس نسخوں سے لے کر کارل مارکس کی کیپٹل capital تک کے مجموعے ان کے پاس موجود تھے ۔

انہی کتابوں میں وہ آکسفورڈ ڈکشنری بھی تھی جسے وہ اپنی اوائل عمری کی نوکری میں دفتر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ تاکہ خالی اوقات میں پرانی پرانی فائلیں پڑھنے میں مدد دے سکے ۔ اور یہ مدد میرے خیال میں بڑی مہنگی تھی ۔ کیونکہ اس وقت ہر لفظ ان کے لئے ڈکشنری طلب ہوا کرتا تھا ۔ اور ان کے انتقال کے بعد جب امریکہ سے ان کا سامان آیا تو دوسری اشیاء تو ہمیشہ کی طرح سے غائب ہو چکی تھیں ۔ البتہ ان کی پسندیدہ کتابیں ضرور مل گئیں جن میں نہ تصویر بتاں تھیں اور نہ حسینوں کے خطوط تھے۔ اس لئے محفوظ رہ گئیں تھیں شاید!

ان کا کتابیں رکھنے کا طریقہ بھی کچھ نیا ہی تھا ۔ کچھ کھلی، کچھ ادھ کھلی، کچھ کے بیچ میں کاغذ ٹھنسے ہوئے اور بعض ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتی ہوئی ۔ ایک میدانِ حشر تھا جس کے لئے عام سائز کی میز کو مختصر سمجھ کر ایک بہت بڑی میز لی گئی تھی اس طرح سے انھیں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا تھا کہ ہر چیز ڈھونڈتے ہی مل جاتی تھی ۔ اور ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا ۔ ان کا قول تھا "جو لوگ کتابیں سجا سجا کر رکھتے ہیں وہ انہیں پڑھتے نہیں" لیکن بعد میں جب تمام کتابیں الماریوں میں پہنچ گئیں تو پتہ چلا کہ ان کی تمام تر ... سے کھو رہی ہیں ۔ اس لئے ان کی ضرورت کی کتابیں مجھے ہی ہمیشہ ڈھونڈ کر نکالنی پڑتی تھیں ۔

لیکن اخبار کے معاملے میں معاملہ برعکس تھا ۔ اگر کوئی ان سے پہلے اخبار دیکھ کر اس کے صفحات آگے پیچھے کر دیتا تو برہمی و بے چینی کا ... دیتا، یہ تمام اخبار باسی کر دیا ہے ۔ ساری تہ خراب ہو گئی ۔ پتہ چلتا کہ اس بات پر بہت ناراض ہیں ۔

خوشبودار لطیف قسم کی چائے پی کر جیسے دھیمے انداز میں باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا ۔ اس وقت سیاست سے لے کر ... کے آئندہ پروگراموں پر غور ہوتا ۔ ابوالکلام کی شخصیت ان کو بہت محبوب تھی اس لئے وہ اکثر ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے ۔ اس کے علاوہ غدر کے دوران انگریزی استبداد سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں اور ان تمام بہادروں کے کارنامے جو غدر کے بعد سے آزادی کے دور تک انگریز کے مظالم سے ٹکرا کر بچ جاتے یا پھنس گئے تھے انہیں اور بہت سے محب وطن لوگوں کی داستانیں ... ازبر تھیں ۔

انہیں غدر کی سو سالہ برسی منانے کی بڑی تمنا تھی ۔

"مجھے ۱۹۵۷ء کا بڑا انتظار ہے" ——— وہ بڑی دلسوزی سے کہتے ۔

"ہم غدر کی سو سالہ برسی بڑے دھوم سے منائیں گے "

اب جیسے جیسے ۱۹۵۷ء قریب آتا جاتا ہے مجھے ان کے یہ جملے بار بار یاد آتے ہیں ۔

کیونکہ انیس سو ستاون میں تو خود ان کی برسی ہے ۔ یا پھر گزشتہ کی برسیوں کو بھی سال بیت چکے ہوں گے ۔

"نہ کوئی انسان تھا جیتا جاگتا پورا 'بلیّات' "

"بلیّات" کا لفظ ان کی لغت میں بہت وسیع مفہوم رکھتا تھا ۔ غصّہ ہو تو "بلیّات" ۔ پسندیدگی ہو تو "بلیّات" کوئی قریب

دے جائے تو بلیّات۔ اگر احترام و عقیدت منظور ہو تو گویا بہت ہی "بلیّات"۔ ان بہت ہی "بلیّات" قسم کے لوگوں نے ان کے ذہن کا بہت بڑا حصہ گھیر رکھا تھا۔ جو لوگ کچھ بھی نہ ہوتے ان میں بھی عظمت کے پہلو ڈھونڈھ لیتے۔ اور اگر آ کر اطلاع دیتے کہ میں تو اسے یونہی سا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ تو "بلیّات" نکلا ہورا۔

ایک دن ایک لالہ جی کا قصہ سُنا رہے تھے جو کہیں اتفاق سے کانگریس کی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں دس پندرہ دن جیل میں کاٹ آئے تھے اور اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ کہ میں نے "انکا کربات کا رُخ بدل دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ بھوپال جیل کی جن کوٹھڑیوں میں بزمی نے ڈھائی سال رہ کر اپنی صحت برباد کی وہ کلکتہ کے بلیک ہول سے بدتر تھیں وہاں سانپ، بچھو اور حشرات الارض قیدیوں کی ہم نشینی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ریاستی جیلیوں میں کسی درجہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہی عام قیدیوں کی بارکیں جہاں نہ روشنی تھی نہ کھلی ہوا اور گرمیوں کی رات کو جب تپتی ہوئی پتھر کی کوٹھڑیوں میں ان قیدیوں کو بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو عوام کے لئے روٹی، کپڑا، اسکول اور اسپتال مانگتے تھے۔

میں نے کہا بزمی! "یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں بہت سے عظیم انسان ہیں، بہت سے بے نیاز ہیں مگر آپ بھی . . . . . .

"ہم نے کیا ہی کیا ہے۔" بزمی نے تاسف کے انداز میں جواب دیا۔

رشید جہاں

صدیقہ بیگم سیوہاروی

رشید آپا!

یہ بات ہو گئی اب سے کوئی تیرہ سال پہلے کی۔ میں علی گڑھ میں امیر نشاں میں رہتی تھی اور ابھی مجھے علی گڑھ آئے ہوئے مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ دیکھتی کیا ہوں کہ بوٹے سے قد کی ایک خاتون چلی آ رہی ہیں۔ مہمان نہ پہچان بڑی نازک سلام —— مردوں کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ گھر میں مردانے میں بھی داخل ہوں گے تو دستک ضرور دیں گے۔ لیکن یہ خاتون چلی آئیں بس یونہی —— برسات کی سڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں دوپٹہ پھینکے اطمینان سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس بھری دوپہر میں کوئی آ جائے گا اور پھر آنے والا بھی ایسا کہ قمیص کے اندر گلے میں سے ہاتھ ڈال کر کھجا جائے بار بار ہو۔ گھبر گھبر —— مجھے اپنے بدن میں کھجلی سی محسوس ہونے لگی۔ اگر کبھی کہیں سے یہاں کھجانے کے لئے۔ میں ویسے ہی جلسی ہوئی تھی یہ تماشہ ڈھنگ دیکھ کے آئے حواس بجا سے رہے۔ کہتی تو کیا کہتی اور دیکھا یہ کہ میرے سلام کا جواب دیئے بغیر کمرے میں گھسی چلی آ رہی ہیں۔ میں مہمان اپنے گھر میں مہمان بنی جا رہی تھی۔ جی میں سوچتی رہی کہ یہ اللہ ماری کون آ گئی۔ اس وقت اس کی اچھی بھلی صورت بھی تو مجھے زہر لگ رہی تھی۔ بھلا گرمی میں بھی کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور پھر ایسے چپچپاتے موسم میں۔

لیکن چند سیکنڈ کے اندر جیسے زمین میرے پاؤں کے نیچے سے کھسک گئی۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

"تم صدیقہ ہو؟ مجھے رشید جہاں کہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رشید جہاں !!!" میرے منہ سے بلا سوچے سمجھے نکل گیا۔

"کیوں کیا رشید جہاں کافی نہیں" —— انہوں نے بڑے پیار سے کہا جیسے کسی بچے کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے اپنے دوپٹے کا خیال آیا۔ نفسیات کی ماہر بھی تو تھیں سمجھ گئیں۔ "اونہہ! اپنے گھر میں سب ایسے ہی رہتے ہیں۔" لیکن مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ میں تڑپ کر اٹھی اور دوپٹہ ڈال لیا گئی۔ اب کہیں میرے ہوش و حواس ٹھکانے لگے۔

ذرا سی دیر میں بے تکلفی سے باتیں شروع ہو گئیں۔ ساری دنیا جہان کی باتیں۔ وہ سچ مچ کامیاب ڈاکٹر تھیں۔ کیسا ہی مریض ہو اُن کے سامنے آ کر ساری باتیں اُگل دے۔

اس روز دو تین گھنٹے میں مجھے محسوس ہوا جیسے میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں اور سچ پوچھئے تو اس ملاقات کے بعد کوئی اور ملاقات نہ بھی ہوتی تو یہ دو تین گھنٹے ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے کافی تھے۔

ہمارا ملازم باہر گیا ہوا تھا اور وہ چائے بنانے کے لئے مجھے اُٹھنے نہیں دے رہی تھیں آخر معاملہ اس پر طے ہوا کہ میں کمرے میں سماوار لے آؤں اور وہیں چائے بنے اور وہ چائے بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ مگر چائے کے برتن، ہائے اللہ وہ بھی تو دُھلے ہوئے نہ تھے ہیں اور اُلجھ گئی۔ آ گئیں چائے بنانے میں نے بھی سوچا جہاں من بھر وہاں سوا من۔ اس لئے وہ ماننے والی کہاں تھیں، ضدی جو ٹھہریں۔ جس بات پر اڑ جائیں، بس اڑیل ٹٹو کی طرح اڑی سی ہی تو رہیں (کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے۔ جب بھی ملی ہوں۔ میں نے انہیں کسی کے سامنے قائل ہوتے نہیں دیکھا)۔

اب اسی ملاقات میں لیجئے۔ ایک ناول نگار خاتون ہیں۔ بھلا سا نام ہے اُن کا۔ ہاں اے۔ آر۔ خاتون۔ اے۔ آر۔ خاتون کے ناول "شمع" کا ان دنوں علی گڑھ میں بڑا زور تھا۔ لڑکیاں برقعوں میں چھپائے پھرتی تھیں۔ جسے دیکھئے اسی پر ریجھا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے، سنا ہے کہ نسیم علی کے ناول "انور" اور "شمیم" بھی اسی طرح مقبول تھے اور مسلم علی گڑھ کی لڑکیاں ——— وہ بھلا کہیں ایک دو بار کسی چیز کو پڑھ کر اپنی تسلی کرتی ہیں۔ وہ تو بس پڑھتے ہی چلی جاتی ہیں۔ گویا حفظ کرنے کا ارادہ ہو۔ ہاں تو علی گڑھ میں ان دنوں "شمع" کا زور تھا اور میرے تو اس پندرہ بیس روز کے اندر ہی اندر سنتے سنتے کان پک گئے تھے۔ کیونکہ میں نے بھی اسے پڑھا تھا اور مجھے تو بڑی ناامیدی ہوئی تھی۔ جیسے کھودے پہاڑ اور اس میں سے نکلے "مری ہوئی چوہیا" اور اس روز کے بعد سے مجھے علی گڑھ کی لڑکیوں کے ناول پڑھنے کے ذوق اور ان کی پسند پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔

ان تو مجھے یہ ناول ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ اب کیا سنتی ہوں کہ ڈاکٹر رشید جہاں جو ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں ہیں، اس ناول کی شان میں "قصیدے" پڑھ رہی ہیں۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ رشید جہاں جنہوں نے [illegible] جانے انگریزی، فرانسیسی، روسی اور دوسری زبانوں کے کتنے اچھے اچھے ناول پڑھے تھے وہ اس ناول سے اتنا متاثر کیوں تھیں۔ میں تو بس [illegible] نکلی [illegible] میں نے بحث کرنی چاہی مگر اللہ کا نام لو، وہ بھلا کس کی بات مانتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ تو شاید ولی جاہ مصنفہ کو اس عظیم کارنامے پر مبارک باد بھی دے آئی تھیں۔ اب انہوں نے اس عظیم ناول کی عظمت پر لیکچر دینا شروع کر دیا اور یہ ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ میں نے اس ناول کو دوبارہ پڑھا۔ مگر پھر بھی مجھے اس میں اچھے ناول کی کوئی بات نظر نہ آئی۔ لیکن وہ جب بھی ملیں [illegible] اور خلوص میں کوئی [illegible] اے۔ آر۔ خاتون کے ناول کی قصیدہ خوانی میں۔

میں ابھی [illegible] نام [illegible] پڑھنے والوں کو نامانوس سا لگے گا۔ اس لئے کہ وہ تو مجاز کی [illegible] رشید آپا تھیں۔ لیکن ابھی تک میری سمجھ میں [illegible] شوکت تھانوی کی "شیش محل" اس وقت تک نہیں آئی تھی اور اگر نصیب کی تھی تو میں نے نہیں پڑھی تھی ورنہ یہ مسئلہ [illegible] حل ہو جاتا۔ کیونکہ [illegible] انہیں سب ہی رشید آپا کہتے تھے سوائے ان کے جو [illegible] ہوں لیکن [illegible] سے دوستی کے [illegible] ان کا نام لے کر کون پکارے گا۔ اگر [illegible] مل جاتے تو [illegible] پوچھ لیتی۔

ان تو [illegible] بعد میں رشید آپا کی [illegible] ہو گئی۔ رشید آپا باہر ٹہل رہی تھیں [illegible] (میں اس زمانے میں پردہ کرتی تھی) مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے میرا انتظار ہی تو کر رہی تھیں۔

"اچھا تو تم آگئیں"۔

میں نے کہا "آپ سے بدلہ جو لینا تھا"۔

رشید آپا مسکرا دیں۔ "اچھا تو آج جی بھر کر بدلہ لو۔ میں بھی تیار بیٹھی ہوں"۔ اور پھر رشید آپا نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ اس دوران میں مجھے جو بات کھٹکتی رہی وہ یہی کہ انہیں کیا کہوں یہ میری کمزوری ہے کہ شادی شدہ عورتوں کو بھابی ہی کہتی ہوں چاہے میں نے اُن کے "اُن" کی شکل بھی نہ دیکھی ہو لیکن شیخ عبداللہ کی کوٹھی کا ہر آنے والا انہیں رشید آپا کہہ رہا تھا۔ بس مرتی نہ تو کیا کرتی۔ میں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ حالانکہ میں اگر انہیں 'بھابی' کہتی تو شاید پہلی اور آخری 'بھابی' کہنے والی ہوتی۔

ہاں تو اس روز پھر حسب دستور رشید آپا نے لمبی چوڑی باتیں شروع کر دیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے ذرا سی دیر کے لئے بھی یہ نہ سمجھا کہ رشید آپا اتنی پڑھی لکھی ہیں۔ علی گڈھ کے گرلز کالج کے بانی کی لڑکی ہیں اور نوابزادہ محمود الظفر کی بہو ہیں۔ بس مجھے تو وہ اپنی جیسی نظر آئیں۔

رشید آپا ابھی نہ جانے کتنی دیر باتیں کرتیں وہ تو بھلے سے کسی نے دستک دے دی۔ رشید آپا نے انہیں اندر بلا لیا۔ میں ٹھٹھک گئی۔ کہنے لگیں کہ "ارے یہ طالب علم نہیں ہے۔ اس سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں بھی تن کر بیٹھ گئی۔ جیسے واقعی طالب علم ہی سے پردہ کرنے کی ضرورت ہو (میں آج بھی جب اس واقعے کو یاد کرتی ہوں تو مجھے اپنے اوپر ہنسی آتی ہے) لیکن بات سنجیدہ تھی۔ کوئی کامریڈ بیمار تھا اور رشید آپا کو اسے دیکھنے کے لئے جانا تھا۔ رشید آپا نے مجھ سے کہا "چلو پاس ہی ہے چلتے چلتے تمہیں سیر کرا لاتے ہیں۔ ابھی بات کی بات میں آئے جاتے ہیں"۔ میں اللہ ماری ساتھ ہو لی۔

ہم لوگ چلتے چلے جا رہے تھے اور راستہ تھا کہ کھنچتا چلا جا رہا تھا — عجیب و غریب آڑے ترچھے راستے اور گلی کوچے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی گلیاں کاہے کو دیکھی تھیں اور رشید آپا جیسے ان راستوں پر سدا سے چلتی آئی ہیں۔ رشید آپا کو شاید میری تھکن کا احساس ہو گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے کھلونے دے کر بہلا رہی ہیں۔ میں بھی اڑ گئی تھی کہ نہ بہلوں گی۔ پھر انہوں نے جاگیردارانہ نظام پر باتیں شروع کر دیں۔ ذرا سی بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ بھانپ گئیں۔ ایک دم سے موضوع بدل کر بولیں "تمہارا رسالہ کیسا چل رہا ہے"۔ (اس زمانے میں میں ایک زنانہ رسالہ نیا راگ کی ادارت کر رہی تھی۔)

میں نے کہا "بس یونہی"۔

اس وقت اگر میں چاہتی تو بڑے مزے میں رشید آپا سے ایک کہانی کا وعدہ لے لیتی لیکن میں جل رہی تھی۔

رشید آپا بولیں "لیجئے! ہم آ گئے۔ اب ہم ایک تنگ و تاریک راستے سے گزر رہے تھے۔ بڑے گندے گندے مکان نظر آ رہے تھے پھر رشید آپا نے اطمینان سے کہا "بس ان ہی میں سے کوئی مکان ہو گا۔ بھلا یہاں کوئی تندرست رہ سکتا ہے یہاں تو بیماریوں کے جراثیم پلتے ہیں، اور ہم ان بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیوں صدیقہ غلامی لعنت ہے یا نہیں؟

اور میں اس وقت ان کے تیور دیکھ کر بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "جی ہاں" اور میں نے ... تو کہا لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں اس کامریڈ نے تو نہیں سنا اور پھر اطمینان کا سانس لیا۔ سچ سچ اگر کوئی اس وقت سن لیتا تو ہنس پڑتا۔ میں کہتی ہوں کہ اگر اس وقت فراق گورکھپوری یا مجاز مرحوم بھی ہوتے تو ان کی زبان سے بھی یہی نکلتا کہ "جی ہاں"۔ ———

رشید آپا بڑبڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ اب ہم مکان در مکان گھستے چلے گئے آخر ایک اندھیری سی کوٹھری میں پہنچے جہاں ایک بیمار کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رشید آپا نے بڑھ کر اس کا ٹمپریچر لیا۔ اوہ ۱۰۳ ڈگری بخار ہے۔ کیوں جی! کب سے بخار آ رہا ہے؟

"اجی کئی روز سے"۔ اس کامریڈ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اور تم کو آج فکر ہوئی۔ دو چار روز اور ٹھہر جاتے۔ کس کا انتظار کر رہے تھے؟"

رشید آپا کو غصہ آ رہا تھا اور وہ خاموش تھا۔ پھر انہوں نے مریض کا باقاعدہ معائنہ کیا اور معائنہ کا یہ سلسلہ پندرہ منٹ جاری رہا۔ پھر رشید آپا نے ایک نسخہ لکھ کر اس کے حوالے کیا اور بولیں۔

"دیکھو! دودھ کے سوا اور کچھ مت دینا اور ہاں سنگترے کا عرق ضرور پلاؤ۔"

کامریڈ نے نسخہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر رشید آپا کو ذرا ایک طرف لے جا کر ڈرتے ڈرتے بولا: "آپ نے نسخہ تو لکھ دیا مگر دوا کہاں سے آئے گی، یہاں تو پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ پیسے ہوتے تو کسی ڈاکٹر کو ــــ" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

میں سہم گئی۔ رشید آپا کے تیور پہلے ہی سے کیا کم بگڑے ہوئے تھے اور رشید آپا کیا کوئی اور ڈاکٹر بھی ہوتا تو یہ سن کر اس کے نتھنے کا پارا نہ جانے کتنا اور چڑھ جاتا ــــ لیکن رشید آپا ــــ جیسے کسی نے آگ پر پانی چھڑک دیا ہو اور ان کے چہرے سے جیسے کسی نے سارا غصہ سوت لیا ہو۔ انہوں نے آہستہ سے کہا "اچھا میرے ساتھ چلو ــــ" اب ہم تینوں چل پڑے۔ بہت دور تک خاموش چلتی رہیں پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ "کیوں صدیقہ! یہ حالات اپنے آپ بدل جائیں گے یا ان کو بدلنا پڑے گا۔"

آپ بتائیے اس کا کیا جواب ہو گا۔ اور میں جانتی ہوں کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی ہوتے تو وہ بھی وہی جواب دیتے۔ جو رشید آپا کے دل میں تھا اور میری زبان پر۔"

ترقی پسندی کا یہ پہلا سبق تھا جو رشید آپا نے مجھے پڑھایا۔ میرس روڈ کی سڑک پر چلتے ہوئے۔

"موت اور اس مریض میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ شاید اتنا بھی نہیں جتنا کہ مجھ میں اور تم میں ہے"۔ رشید آپا نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہیں اور میں یہی سوچتی رہی کہ واقعی ان حالات کو بدلنا ہو گا یہ اپنے آپ نہیں بدلیں گے۔

میں ابھی وہیں تھی اور رشید آپا آگے بڑھ گئی تھیں۔ "بیچارہ اندھیرے میں پڑا کراہ رہا ہے۔ اندھیرے ہی ہے لیکن اس اندھیرے کو اندھیرا کہنا بھی تو جرم ہے۔"

میں اُن کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اُن کی کوٹھی آ گئی۔ رشید آپا اندر جا کر دس روپے کا ایک نوٹ لائیں اور اس آدمی کو دے کر بولیں۔ "لو فوراً دوا لا کر پلاؤ۔ سنگترے بھی لیتے آنا۔ کل مجھے حال بتا جانا یا میں خود آ کر دیکھ لوں گی تمہارے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اب رشید آپا سے میری خوب دوستی ہو گئی لیکن اگر دوستی نہ بھی ہوتی تو اس میں فرق ہی کیا پڑتا اس لئے کہ پہلے ہی روز وہ مجھ سے اس طرح ملیں کہ غیریت کے سارے پردے اٹھ گئے تھے۔ میں اپنے آپ پر کئی روز ناز کرتی رہی۔ رشید آپا مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرتی ہیں۔ مجھے اپنی بہن کی طرح سمجھتی ہیں۔ مجھے کتنی اچھی اچھی باتیں سناتی ہیں ــــ لیکن یہ ایک فریب تھا جو بہت دن نہ چل سکا۔ اور میں اس خود فریبی میں زیادہ مبتلا نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ وہ تو ہر ایک سے اسی بے تکلفی سے ملتی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی خصوصیت تھوڑا ہی تھی۔ وہ ہر ایک سے ہی تو اسی محبت اور خلوص سے ملتی تھیں۔

"واہ جی تم ابھی تک بی اے میں ہو۔ میں تو جب تم سے بھی چھوٹی تھی یہی اب سے کوئی پندرہ سولہ سال پہلے تب کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھی ــــ تم ابھی تک بی اے میں ہو۔"

اور لڑکی نے تپاک سے جواب دیا "جی ابھی تک کیوں اسی سال تو آئی ہوں بی اے میں۔"

اور رشید آپا ہنس پڑیں۔ "بڑی ذہین ہو میں اتنی ذہین نہ تھی"۔ وہ لڑکی خوش ہو گئی اور پھر رشید آپا نے اسے پاس بلا کر بٹھایا اور

ہماسے پلائی۔

لیکن رشید آپا کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ یوں تو اللہ میاں کو مانتی نہ تھیں لیکن دعائیں اور کوسنے بڑے مزے میں دیتی تھیں۔ بالکل بڑے بوڑھیوں کے سے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کوسنے میں ممتا کی تڑپ بھی شامل ہوتی۔ منہ پر آکر بات پرائی ہو جاتی ہے۔ اس لئے زبان سے لوٹا لیتی ہوں ورنہ اُن کے ایک آدھ کوسنے کا ذکر نوکِ قلم تک آ ہی گیا تھا۔ نہ جانے لوگ اس کی کیا کیا تاویلیں کریں —— بس یوں سمجھئے کہ وہ چڑھ کر کٹر کوسنے سے بھی نہ چوکتی تھیں مگر وہ جلی بھنی کب تھیں۔

میری اور رشید آپا کی ملاقات کا سلسلہ کافی دنوں تک رہا۔ پھر وہ لکھنؤ چلی گئیں اپنے سسرال۔ اور میں چند مہینوں کے بعد دلی چلی گئی۔ —— اس زمانے میں کبھی کبھی خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہا لیکن اکھڑا اکھڑا سا۔

اگر کہیں نثر میں استاد اور شاگرد کا سلسلہ چلتا ہوتا تو میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتی ہوں کہ میں اپنی تمام تر ترقی پسندی کے باوجود نذر چڑھاوے چڑھا، حق فرض ادا کر آتی۔ باقاعدہ شاگرد ہو چکی ہوتی لیکن شاگرد تو اس کے باوجود بھی تھی —— رسم رسوم ادا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بھی سکھایا وہ آج بھی میرے لئے مشعلِ راہ ہے۔

ستمبر ۴۸ء میں شادی کے بعد میں الٰہ آباد چلی آئی لیکن نہ جانے کیوں مجھے رشید آپا سے شرم آتی تھی کہ میں انہیں اپنی شادی کی اطلاع دیتی۔ دعوت تو خیر کیا دے سکتی کیونکہ شادی ہی ایسی کون سی شاندار ہوئی تھی بس دو بول پڑھے گئے تھے نہ ڈھول تاشے بجے نہ شہنائی۔ لیکن رشید آپا تو منہ لٹکائے تھیں، جیسے ابر برسنے کی تاک میں ہوں۔

عوامی تھیٹر کی کانفرنس الٰہ آباد میں تھی۔ اس میں جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آئے رشید آپا بھی لکھنؤ سے شرکت کرنے چلی آئیں۔ رات کو ایک ڈراما "حیا دوری کرتی" تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے گئی۔ اچانک رشید آپا سے ملاقات ہو گئی۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے ان کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ چہرے پر بس گھنگھریالے بال نظر آتے تھے —— زرد زرد ہو رہی تھیں، جیسے کسی نے خون چوس لیا ہو۔ لیکن آنکھوں میں وہی چمک اور وہی ذہانت۔ اور وہی تیزی تھی۔ اور آنکھوں کا کیا، زبان کا حال بھی وہی تھا۔ میں شرماتے لگی کچھ کہوں وہ تو مجھ پر پھٹ پڑیں۔ "شادی کر کے بیٹھ گئیں اور مجھے پوچھا تک نہیں کہاں ہے تیرا دولہا" انہوں نے سب کے سامنے کچھ اس طرح کہا کہ میں دلہنوں کی طرح شرما گئی۔ "چل ابھی دکھا —— نہیں پوچھا نہیں اور دولہا میکے چھوڑ گئیں" رشید آپا کھل کھلا پڑتی تھیں اور میں سمٹی جاتی تھی۔ مجھے اندر لے گئیں ڈراما شروع ہونے میں دیر تھی وہاں کچھ اور خواتین بھی آ گئیں۔

اردو کے مشہور شاعر مسعود اختر جمال صاحب کے گھر کی کچھ خواتین۔ رشید آپا نے پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔ اسی انداز میں جیسے اب سے چند سال پہلے علی گڑھ میں کیا کرتی تھیں۔ جیسے وہ اتنے گزرے ہوئے ماہ و سال کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ اُن کی طبیعت میں رتی بھر جو تبدیلی آئی ہو۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ڈراما شروع نہ ہو اور میں باتیں کرتی رہوں۔ لیکن ڈراما شروع ہو گیا۔ یہ ایک طنزیہ سیاسی ڈراما تھا جس میں طلباء ساتھی اور حبیب تنویر وغیرہ کام کر رہے تھے۔ دلچسپ اتنا کہ سارے دیکھنے والے محو۔ میں نے ایک مرتبہ جو مڑ کر دیکھا تو رشید آپا غائب۔ معلوم ہوا کہ پیچھے مزدوروں کے جھنڈ میں بیٹھی ہوئی دیکھ رہی ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد بائیں اسٹیج پر روشنی پڑی تو دیکھتی کیا ہوں کہ رشید آپا بالکل آگے والی نشست میں بیٹھی ہیں۔ رشید آپا پارہ ہو رہی تھیں لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا۔ مجھے اس روز معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی طرح رشید آپا کسی ایک طبقے کی فرد نہیں۔ اگر آپ نے انہیں دیکھا ہے تو جانتے ہوں گے کہ نچلے طبقے میں وہ مزدور تھیں اور اونچے طبقے کے آداب سے بخوبی واقف تھیں کیونکہ انہوں نے

ایسے ماحول میں پرورش ہی پائی تھی۔ اور درمیانی طبقہ اُن کے لئے اجنبی نہ تھا۔ وہ ڈاکٹر تھیں اور ان گھروں میں ان کا روز کا آنا جانا تھا۔ اور ہم جیسوں سے انہیں اللہ واسطے کی محبّت تھی۔

غرض ہر جگہ وہ ایک جیسی تھیں۔ کسی محفل میں اجنبی نہ تھیں۔ جہاں پہنچ جاتیں ایسا معلوم ہوتا کہ گویا بس اسی ماحول میں پلی بڑھی ہیں۔ بس وہ تو اس میں گھل مل جاتیں۔ کون ہے مائی کا لال جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دے —— ہاں تو بات چلی تھی اس ڈرامے کے بارے میں۔ یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا اور الٰہ آباد جیسے شہر میں بار بار اسٹیج ہوا۔ ہر ایک واہ واہ کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی عش عش کر کے اُٹھے تھے۔ لیکن رشید آپا نے منہ چلائے کہہ دیا۔ ”قطعی بکواس“۔

میں چونک پڑی ”رشید آپا! کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ اس ڈرامے کے بارے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں“۔ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ (دراصل بحث کرنے میں میں یوں بھی کمزور ہوں)

”اجی دو رائے کی کچھ مت کہو۔ دو رائے تو اشتراکیت پر بھی ہیں۔ انسانی مساوات اور برابری پر، سرمایہ داری کے خاتمے پر، مزدوروں کی بدحالی پر —۔“ رشید آپا نے تڑسے جواب دیا اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا منہ دہرا ہو گیا ہو۔ اور پھر رشید آپا نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ میں نے تو کچھ سُنا نہیں۔ رشید آپا اپنی بات پر اڑی رہیں۔ یہ ڈراما عام طور پر پسند کیا گیا۔ پھر مجھے رشید آپا کی رائے کا پس منظر معلوم ہوا۔

ڈرامے کے مکالموں کے طنز مزدوروں کے سمجھ میں نہیں آتے تھے، جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ڈرامے کا موضوع ہی طنز پر مبنی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈراما ہی سمجھنے سے قاصر رہے اور رشید آپا مزدوروں کے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ اور یہی نہیں بلکہ میں نے سُنا کہ بعد میں ان سے اور بلراج ساہنی سے اس پر خوب بحث بھی ہوئی۔ انہوں نے عوامی تھیٹر کے تمام حامیوں سے شدت سے اختلاف کیا۔ کچھ لوگوں نے ان کی تنقید پر بھی کی لیکن رشید آپا بلا وجہ کبھی کسی کو خوش نہ کرتی تھیں۔

اگلے دن میری بچی کی طبیعت خراب تھی۔ لیکن شام کو میں رشید آپا سے ملنے چلی آئی۔ اور جب رشید آپا کو معلوم ہوا تو مجھ پر برس پڑیں۔ میں نے اپنی ماں اور ساس کی بھی اتنی باتیں کا ہے کو سُنی تھیں۔ سچ مچ رشید آپا مردانہ وار زندگی گزارنے کے باوجود عورتوں کا سا مزاج رکھتی تھیں۔ وہ عورتوں کی طرح بگڑ رہی تھیں —— ”تم بیمار بچی کو چھوڑ کر نکل پڑیں۔“ واہ لڑکی واہ —— ننھی سی جان کا اتنا بھی خیال نہیں، بھلی ہو گئی میری محبت ——“ اور مجھے اُلٹے پاؤں لوٹنا پڑا۔ مرتی نہ تو کیا کرتی۔ ذرا سی دیر بعد دیکھتی کیا ہوں کہ رشید آپا میرے گھر پر موجود —— اس وقت وہ بیگ لئے ہوئے تھیں اور خوب سنجیدہ تھیں۔ سو فی صدی ڈاکٹر ——

بچی ایسی کوئی خاص بیمار بھی نہ تھی کہ جس کا علاج کرنا اتنا ضروری ہو۔ یونہی بس نزلے زکام کی شدت سے بخار ہو گیا تھا لیکن رشید آپا نے علاج شروع کر دیا اور جب تک بچی اچھی نہ ہو گئی وہ برابر آ کر خود آ کر دیکھتی رہیں اور انہوں نے میرا گھر سے نکلنا تقریباً ناممکن کر دیا۔

رشید آپا پر مجھے غصہ بھی بہت آیا ہے۔ وہ صاف گوئی کی ایسی قائل تھیں کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔

یہ بھی اسی زمانے کی بات ہے جب میں الٰہ آباد میں تھی۔ اس زمانے میں میں تو پردہ چھوڑ چکی تھی۔ لیکن گھر والوں کے سامنے بس یونہی سا کرتی تھی محض دکھاوے کا۔ حالانکہ انہیں بھی اس کا علم تھا لیکن محض بڑے بوڑھوں کے جذبات کا پاس جو رکھنا تھا۔ اب میں کسی اور سے کیا کہتی۔ اسی زمانے کی بات ہے۔ مہینے میں چار پانچ آدمی ایسے ملنے چلے آتے تھے جنہیں رشید آپا نے میرے پاس بھیج دیا ہوتا۔ ان لوگوں کو محض افسانہ نگار خواتین سے ملنے کا شوق ہوتا۔ اس کا اندازہ تو کچھ وہی لڑکیاں کر سکتی ہیں جنہیں ایسے ”انوکھی آفت“ کا مقابلہ کرنا پڑا ہے یہ بات لکھنے کی نہیں۔

بات یہ تھی جو لوگ رشید آپا سے بحیثیت افسانہ نگار ملنے جاتے انہیں وہ میرے پاس ”ریباؤنڈ“ کر دیتیں۔ اب میں نمٹوں ان سے۔ اور

گھر میں چہ می گوئیاں "اے لو، بیگما اخباروں میں تو لکھتی ہی تھیں اب مردوئے بھی ملنے آنے لگے"۔ لیکن رشید آپا سے کیا کہوں۔ کبھی کبھی جی میں آتا کہ ایک غصّہ سے بھرا ہوا خط لکھ دوں۔ لیکن پھر رہ جاتی ——— البتہ اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں نے بہت جلد اس دو رُخی کو چھوڑ دیا۔ غالباً رشید آپا نے سوچ سمجھ کر یہ کیا ہو۔ کیونکہ اب کوئی نہیں آتا۔ لیکن رشید آپا بھی تو زندہ نہیں ہیں۔"

رشید آپا کا گھرانہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ ایک بہن گرلز کالج کی پرنسپل تھیں تو ایک بہن فلم ایکٹرس بھائی بھادرج بھی فلم لائن میں تھے۔ اور رشید آپا ——— انہیں کون نہیں جانتا۔ رشید آپا اپنے گھر میں سب سے الگ تھیں۔ وہ چاہتیں تو عیش کی زندگی گزار سکتیں تھیں۔ لیکن انہوں نے ہر قسم کے عیش و آرام کو ٹھکرا کر ایک عام انسان کی زندگی کو ترجیح دی۔

اسی کوٹھی میں، میں نے اُن کی ایک بہن کو دیکھا جو اپنی جوتی کی ایڑی کے بل پر چل رہی تھیں۔ پاس پڑوس کی فضا سے بے نیاز ——— ہم چار پانچ لڑکیاں رشید آپا کے پاس بیٹھی تھیں کہ اُن کی بہن آئیں اور ہمارے سلام کا جواب دیئے بغیر گزر گئیں ——— رشید آپا شرمندہ تھیں گویا یہ بد اخلاقی اُن سے ہی ہوئی تھی۔ دوسروں کی کمزوری کو اس طرح اپنانا بھی تو بڑی بات ہے۔

میں نے شاید یہ کہیں نہیں لکھا کہ رشید آپا کمیونسٹ تھیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ ایسے لوگ اگر کمیونسٹ نہ بھی ہوں تو اُن کی بڑائی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

آج رشید آپا ہمارے درمیان نہیں۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور روس کی سرزمین میں آرام کر رہی ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ رشید آپا کی روح بے چین ہو گی خاک وطن کے لئے۔ وہ اپنی بیماری کا علاج کرنے گئی تھیں۔ روس کی مٹی نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ آج روس میں اُن کی ایک حسین سی قبر ہے۔ شاید ہم رشید آپا کے لئے اتنی حسین قبر نہ بنوا سکتے۔ اس لئے کہ ہمیں ابھی اُن کی عظمت کا صحیح معنوں میں احساس بھی نہیں۔ لیکن کون جانے ایک وقت ایسا بھی آئے جب ایک قبر ماسکو سے لکھنؤ لائی جائے۔ جس میں روس کی مٹی خاک ہند سے ملے۔ ہماری امانت ہمیں واپس مل جائے۔

رشید آپا ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں سے ایک تھیں۔ وہ ایک بڑی افسانہ نگار تھیں۔ کم لکھتی تھیں لیکن بہت اچھا لکھتی تھیں۔ وہ بہت اچھی معالج تھیں ——— وہ کمیونسٹ تھیں اور وقت آنے پر سر گردان سے اتار کر ہتھیلی پر رکھ لیتی تھیں لیکن ان کی بڑائی ان کے افسانوں میں نہیں ——— ان کے علاج معالجے میں نہیں، ان کے کمیونسٹ ہونے میں نہیں ——— ابھی کتنے افسانہ نگار اور پیدا ہوں گے جو شاید اُن سے زیادہ اچھے افسانے لکھیں گے۔ اُن سے اچھے اچھے ڈاکٹر بھی پیدا ہوں گے۔ اُن سے اچھے اچھے کمیونسٹ بھی پیدا ہوں گے جو قوم کے لئے اُن سے بڑی قربانیاں بھی دیں گے ——— لیکن ان میں کوئی رشید آپا نہ ہو گا۔ وہ سر تا پا خلوص کہاں ملے گا۔ وہ محبت کس میں ملے گی۔

وہ بے باک تھیں اور شاید اسی لئے کہ اُن کے دل و دماغ میں گانٹھیں نہ تھیں۔ وہ کبھی کسی چیز کو فرض کرکے آگے نہ بڑھتی تھیں۔ جو دیکھتی تھیں بس وہی کہتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں اُن کے ڈاکٹر ہونے کو دخل ہو، جو مفروضات پر علاج نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کے حقیقت پسند فنکار ہونے کو دخل ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ بے باک تھیں اور نڈر تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں جب انہیں پولیس نے خطرناک سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا تو ان کے مریضوں نے انہیں چھڑوایا۔ میں اس واقعہ کی سچائی کے بارے میں تصدیق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تاہم یہ بات رشید آپا کے لئے غیر ممکن نہیں۔

میں نے رشید آپا کی شخصیت کا یہ ہلکا سا جائزہ لیا ہے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شکایت ہو کہ میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی نہ کر سکی۔ اُن کی شخصیت کی کمزوریاں سامنے نہ لا سکی۔ لیکن میں نے انہیں کیمرے کی آنکھ سے نہیں اپنے دل و دماغ سے دیکھا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ چہرے کے داغ نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں لیکن اگر آپ انہیں جانتے ہیں تو ذرا مجھ سے نظریں ملا کر سچ سچ بتایئے ان میں خامیاں تھیں بھی کب ———

مجازؔ [1]

ابواللیث صدیقی

۱۹۳۲ء میں علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ ٹوٹا تو اسکولوں کی جماعتیں اسکول کے ساتھ اور کالج کی جماعتیں یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں۔ چنانچہ میں بھی یونیورسٹی پہنچا۔ ایک تو یونیورسٹی کی شہرت اور فضا کا مجھ پر پہلے ہی سے رعب تھا، پھر جیسا کہ [illegible] روایات [illegible] اکثر نو واردوں کو ڈرائے رکھتے تھے۔ یہاں سینئر اور جونیئر میں کچھ ایسا [illegible] مراتب تھا کہ بیچارے جونیئر عرصہ تک اپنے آپ کو محض [illegible] اور سینئروں کے رحم و کرم پر سمجھتے تھے۔ اتفاقی زندگی میں سینئروں کو [illegible] حاصل تھیں۔ ڈائننگ ہال میں بالائی اور مرغ [2] [illegible] کا مقصد [illegible] دن بریانی اور جمعہ کے دن [illegible] ٹکڑے [illegible] پہلے ان کی خدمت میں پیش ہوتے۔ [illegible] سینئر [illegible] جونیئروں کو بتا دیتے کہ میاں [illegible] صرف سینئر طالب علموں کے لئے ہوتی ہے۔ پھر یہ سینئر طالب علم واقعی [illegible] سینئر ہوتے، مثلاً ان میں سے ایک صاحب ممتاز ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں بارہ سال سے مقیم تھے اور بی۔ اے پاس نہ کر سکے تھے۔ ہر سال وہ ایک آدھ مضمون میں پاس ہو جاتے اور دو ایک میں فیل۔ اور حساب لگاتے تو ہر مضمون میں الگ الگ کئی مرتبہ پاس ہو چکے تھے۔ اب یہ مضامین کی [illegible] ترتیب تھی کہ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ ان کا [illegible] ایسے سینئر طالب علموں سے جونیئر تو درکنار بڑے بڑے جغادری عہدہ دار بھی ڈرتے تھے اور ان کا [illegible] احترام کرتے تھے۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی مجھے بھی اس فضا کو محسوس کرنا پڑا۔ خیریت یہ تھی کہ اس وقت کے چند نہایت ہی [illegible] سینئر [illegible] ہم وطن تھے اور ان کے کرم سے میں ان آزمائشوں سے کسی قدر محفوظ رہا جن سے بالعموم ہر جونیئر طالب علموں کو گزرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی [illegible] خصوصی [illegible] میری حالت اس وحشی ہرن کی سی تھی جو جال میں نیا نیا پھنسا ہو۔ ایک دقت یہ تھی کہ میں نہ جونیئر تھا نہ سینئر [illegible] جونیئر کے [illegible] سے تو میں [illegible] سمجھتا تھا کہ بعض اساتذہ اور سینئر طالب علم مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے اور مجھے ایسی [illegible] حاصل تھیں جو [illegible] کو نصیب نہ ہوتی تھیں [illegible] اس لئے میری وحشت کا سارا [illegible] سمجھ میں نہ آتا تھا۔

---

[1] یہ مضمون مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

[2] علی گڑھ کی خاص اصطلاح میں مرغ کا قورمہ اور پلاؤ وغیرہ۔ اصل اس اصطلاح کی یہ ہے کہ ڈاکٹر کی تجویز [illegible] ان کے لئے ڈائننگ ہال میں خاص کھانا [illegible] تھا [illegible] طلباء ڈاکٹر سے اپنے لئے مرغ کا شوربہ اور [illegible] بطور پرہیزی غذا تجویز کرا لیتے تھے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں علی گڑھ کی یونین (SIDDON'S UNION CLUB) کلب میں ایک مباحثہ ہوا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ یونین کے اس پلیٹ فارم سے عبدالرحمان صدیقی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین جیسے مقرر پیدا ہوئے تھے اور یہاں تقریر کرنے کے لئے بڑی جرأت، ہمت اور استقلال کی ضرورت تھی۔ بہرحال میں نے تقریر کر ڈالی اور خلافِ توقع بڑی داد پائی۔ تقریر کو کئی دن ہو چکے تھے۔ میں آفتاب ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۲ میں مقیم تھا، سہ پہر کے وقت ایک تیز طرار، خوش پوش اور خوش رُو طالب علم تشریف لائے۔ تعارف ہوا، فرمانے لگے "ڈاکٹر[1] صاحب! میرا نام انصار الحق ہاروانی ہے۔ کلاس میں ہم دونوں ساتھ ہیں لیکن اب تک تعارف نہ تھا۔ یونین میں آپ نے بڑی اچھی تقریر کی۔ یہ دیکھئے ہمارے یہاں سے طالب علموں کا ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار نکلتا ہے، اس میں آپ کی اس تقریر کی بڑی تعریف ہے۔"

یہ انصار سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد انصار کے بڑے بھائی اسرار اور پھر بہن صفیہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اسرار اس وقت اسرار الحق تھے، مجاز کی شہرت صرف ایک محدود حلقے میں تھی۔ صفیہ سکول میں پڑھتی تھیں، بعد میں جب انہوں نے اردو میں ایم۔ اے کیا تو میری شاگرد بھی رہیں۔ پھر وہ جاں نثار کی رفیقۂ حیات بنیں اور ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا۔ مجاز پر ہوش اور دیوانگی کے بہت سے عالم گزر گئے۔ جب تک علی گڑھ میں رہا اکثر ملاقات رہی، پاکستان بنا اور میں ادھر رہ گیا۔ اس کے بعد مجاز سے صرف ایک مرتبہ لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بھائی انصار اس وقت بھی قوم پرست تھے اب بڑے سیاسی لیڈر ہیں۔ جب وہ یہاں مقرر تھے اس وقت علی گڑھ میں عبدالرحمان انور، شیخ احمد عباس اور حافظ عثمان انصاری جیسے آتش بیان مقرر موجود تھے۔ ان کے سامنے انصار نوآموز تھے لیکن ان کے متبسم انداز اور شیریں گفتار نے انہیں یونین کے نمایاں مقررین میں شامل کرا دیا تھا۔ ان کے تیکھے نقش و نگار، پتلے ہونٹ اور روشن آنکھیں، ایک جوش اور حرکت اب تک میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ تینوں بہن بھائیوں کی صلاحیتوں، شہرت اور کارناموں پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ذہانت، شرافت اور لیاقت تینوں نے ورثہ میں پائی تھی۔

مجاز کی نشوونما علی گڑھ کے خاص ماحول میں ہوئی۔ یونیورسٹی سے ہٹ کر علی گڑھ بڑی بھونڈی، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ جگہ تھی۔ شہر میں تالوں کی تجارت ہوتی اور ریلوے اسٹیشن پر "علی گڑھ کی مشہور ساگونی" کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ساگونی جو شکر سے تیار ہوتی لیکن صورت اور مزہ دونوں میں "صابون" سے مشابہ ہوتی۔ لیکن اس غیر شاعرانہ ماحول میں یونیورسٹی کی دنیا الگ تھی۔ اس کے دارالاقاموں میں زندگی اپنے پورے جلال و جمال، آب و تاب اور رنگ و بو کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ ادھر میں کھلنڈرے، شاعر، ادیب، ملّا اور مولوی، رند اور زاہد، پڑھنے والے اور بے فکرے سب ہی جمع تھے۔ کسی کمرے میں طبلے ٹھنکتے اور ستار کے تار جھنجھناتے سنائی دیتے، کہیں شعر و شاعری کے چرچے ہوتے، کہیں تاش کی محفل جمی ہوتی، کہیں کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کا ذکر ہوتا۔ لیکن دو چیزیں سب میں مشترک تھیں "خوش باشی" اور "خوش مذاقی"۔ تیسرے درجے کے گھٹیا پن کا تو ذکر کیا کوئی دوسرے درجے کی بات بھی اس ماحول میں مستحسن خیال نہیں کی جاتی تھی۔ شاید علی گڑھ کی اقامتی زندگی کی شہرت اور کامیابی کا راز اسی معیار میں مضمر تھا اور اسی وجہ سے جو لوگ علی گڑھ میں رہتے اور بستے تھے وہ بھی اپنے بچوں کو ہوسٹل میں کچھ وقت گزارنے بھیج دیتے۔ چنانچہ مجاز نے بھی ایک عرصہ اردن سرکل میں گزارا، حالانکہ ان کا خاندان میرس روڈ پر رہتا تھا۔

علی گڑھ کے مجاز کے معاصرین میں حیات اللہ انصاری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری اور بعد میں جاں نثار، معین احسن جذبی اور اختر الایمان قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اختر الایمان بہت کم عرصہ رہے اور علی گڑھ کی روایات اپنا نہ کر سکیں۔ باقی سب ایک ہی حلقے اور بزم کے ایک ہی دور کے لوگ ہیں، یہی وجہ ہے کہ سب کے یہاں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ یہ سب کے سب شاعر، ادیب اور انشا پرداز ہیں اور سب کے سب آتش نوا ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کی دوسری

۱۔ میرا پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے سے ... پہلے کا واقعہ ہے۔ میں انٹرمیڈیٹ میں تھا کہ مخدومی پروفیسر محمد حبیب نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کیا اور پھر یار دوست سب کبھی مزاحاً، کبھی طنزاً اسی لقب سے یاد کرنے لگے۔

مصروفیتوں نے ان کی راہ الگ کر دی ۔ باقی ابھی تک ایک ہی راہ پر گامزن ہیں۔ سب نے آزادی کے گیت گائے ہیں اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ سب کے یہاں حُبِّ وطن ہے اور وطن کو سربلند کرنے کی آرزو سب کے یہاں موجود ہے، ان سب کی زندگی بے داغ ہے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ٹوپی نہیں اچھالی اور نہ خود اپنی پگڑی اچھلوائی۔ ان میں سے کوئی ابن الوقت نہیں، یہ سب ع" وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں" کے قائل ہیں۔

علی گڑھ میں مجاز کے خاندان کا قیام میرس روڈ، پر تھا جسے علی گڑھ کی سول لائن سمجھئے لیکن یہاں بھی سرکاری عہدہ داروں کی بجائے یونیورسٹی والوں کا پرچم لہراتا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوٹھیاں، گرلز کالج اور گرلز کالج ہوسٹل، یونیورسٹی کے طلباء کے قدیم جو ریٹائر ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہونا پسند کرتے تھے ان کے مکانات اور وہ اولڈ بوائز جو سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر علی گڑھ تبادلہ کرا لیا کرتے تھے یہاں رہتے تھے۔ اس پہلو سے ہٹ کر میرس روڈ بڑا "رومان پرور" علاقہ تھا، یہاں بہت سے صنم کدے اور ان صنم کدوں کا طواف کرنے والے ملتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطار گھنیری چھاؤں، نہر، آم کے درخت، اندھیرا ہوتے ہی جگنوؤں کی چمک دمک، پپیہوں اور کوئلوں کی کوک نے اسے واقعی ایک رومانی علاقہ بنا دیا تھا۔ آبادی کے باوجود یہاں موروں کی بھی کثرت تھی اور میرس روڈ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر یونیورسٹی کا زراعتی فارم تھا جہاں ہم نے اکثر مور اور تیتر کا شکار کیا ہے۔ گرلز کالج کی وجہ سے اس علاقے کی رونق اور بڑھ گئی تھی۔ لیکن "غنڈہ گردی" کا کوئی امکان نہ تھا کہ یہ بات علی گڑھ کی روایات کے منافی تھی، یوں طواف کرنے والے اکثر یہاں گھومتے نظر آتے تھے اور مجاز تو رہتے ہی یہاں تھے۔ "نذرِ علی گڑھ" والی نظم میں مجاز نے اسی فضا کے لئے لکھا ہے کہ یہاں کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے، پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے، یہاں برقِ حسن چمکتی ہے، اور نور کی بارش ہوتی ہے، یہاں کی ہر شام، شامِ مصر اور ہر شب، شبِ شیراز ہے۔ ان سڑکوں پر اکثر لوگوں نے مجاز کو گھومتے دیکھا ہے لیکن ان کا کوئی رومان بدنام نہ ہوا اور شاید قریب کے جاننے والے بھی مجاز کی محبوبہ کا نام مشکل سے بتا سکتے ہیں۔

میرس روڈ اور ہوسٹل کے علاوہ علی گڑھ کی زندگی میں بعض اور چیزیں طلباء پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک یونین تھی۔ یونین صرف مقرروں کی تربیت کے لئے ایک پلیٹ فارم ہی نہ تھی، بلکہ علی گڑھ کی اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا آئینہ تھی۔ یہاں طالب علموں کو اکابر قوم سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملتا تھا، یہاں وہ کھل کر اپنے افکار اور خیالات کا اظہار کر سکتے تھے، سیاسی مسائل پر بے خوف و خطر مباحثے کر سکتے تھے، سیاسی لیڈروں سے صاف صاف باتیں کر سکتے تھے۔ پھر یہاں مشاعرے اور ادبی جلسے ہوتے تھے۔ ایسے مشاعرے جو علی گڑھ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتے تھے، ان میں اساتذہ اور نوجوان شاعر اپنا کلام سناتے اور داد پاتے اور جو داد کا شور یہاں سے بلند ہوتا اس کی گونج ملک کے دور دراز گوشوں میں سنائی دیتی۔ یہی علی گڑھ سے حسرت، فانی اور جگر اور اصغر کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا۔ چنانچہ اسی یونین کے پلیٹ فارم سے مجاز کی چند نظمیں پہلی مرتبہ سنی گئیں ان میں نذرِ علی گڑھ اور ... "نمائش"، "نورا"، "رات اور ریل"، "انقلاب" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۲ء کے قریب مجاز کی شاعری شروع ہوئی اور تین چار سال میں ان نظموں کی شہرت یونین کی چہار دیواری سے نکل کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس وقت علی گڑھ کے نوجوان شاعروں میں مجاز سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا، مشاعروں میں بار بار ان سے پڑھنے کی فرمائش کی جاتی، اور اس فرمائش میں طلباء سے زیادہ ان طالبات کی آوازیں بلند ہوتیں جو یونین میں اوپر گیلری میں الگ بیٹھی یونین کی کارروائی دیکھتی تھیں۔

جنوری کے آخر اور فروری کے آغاز میں علی گڑھ میں نمائش ہوتی۔ یہ نمائش علی گڑھ کی معاشرتی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سال بھر لوگ اس کا انتظار کرتے۔ خرید و فروخت کے پروگرام مہینوں پہلے بنائے جاتے، طالب علم مختلف بہانوں سے گھر سے روپیہ منگا کر جمع کرتے۔ نمائش آتی تو جیسے زیادہ خوشی ہوتی ... سے بڑھ کر تو علی گڑھ کے شہر والے اور مضافات کے دیہاتی نمائش دیکھنے آتے۔ نمائش کے دکاندار ... جاتے، کچھ اپنی دکانیں کھولے، کچھ دکانوں پر پردے ڈالے چارپائیاں لئے رہتے۔ شام ہونے سے ذرا پہلے ... بیٹھ

چھٹ جاتی اور کالج کے طلباء اور طالبات، اساتذہ، ان کے اہل و عیال اور شرفا نمائش کا رخ کرتے۔ اس وقت سے رات کے نو بجے تک نمائش اپنے شباب پر ہوتی۔ سیر ہوتی، نظارہ بازیاں ہوتیں، خرید و فروخت بہت کم ہوتی چہل پہل زیادہ، مجاز اس نمائش میں جس طرح دلچسپی لیتے اس کی جھلک ان کی نظم 'نمائش' میں ملتی ہے۔ غرض یہ تھا مجاز کا رنگا رنگ ماحول جس میں ان کی اور ان کی شاعری کی تربیت ہوئی۔

پڑھنے لکھنے سے مجاز کو کبھی دلچسپی نہ رہی۔ معلوم نہیں بی۔ اے بھی انہوں نے کس مصیبت سے پاس کیا ہو لیکن جب انہوں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے۔ رشید صاحب اور مولانا احسن کے ساتھ ان کی عقیدت کچھ مریدی کی سی تھی لیکن قدیم ادب، لسانیات اور اس طرح کے موضوعات سے وہ بھاگتے تھے۔ مجھے وہ 'ادب لقدما' کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ شاعری میں رس اور رچاؤ پیدا کرنے کے لئے کلاسیکی ادب کے مطالعہ، تجزیہ اور تنقید کی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو مجاز نے بھی تسلیم کیا۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا پروگرام بھی بنا۔ میں نے تو کچھ پڑھ ڈالا، مجاز صرف پان کھانے، شعر کہنے اور شعر سنانے کی نذر ہو گئے۔ شراب انہوں نے شاید اس وقت تک شروع نہیں کی تھی یا کم از کم ہم لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن شاعرانہ لاابالی پن ان میں اس وقت بھی پوری طرح پیدا ہو چلا تھا۔ وہ ہر وقت اپنا یا کسی اور کا کوئی شعر گنگناتے رہتے، پھر پان کھانے لگتے، سگریٹ اور حقہ سے بھی کچھ شوق تھا۔ غرض نتیجہ یہ نکلا کہ مجاز بھاگ نکلے اور ایم۔ اے کی تکمیل نہ کر سکے اور نہ باقاعدہ مطالعے یا محنت کی طرف مائل ہوئے۔ اس لئے ان کی شاعری میں جو رس اور رنگ ہے وہ محض ان کی طباعی اور شاعرانہ فطرت کا مرہون منت ہے۔ اکتساب اور ریاض کا ان کے یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔

علی گڑھ میں اس وقت طالب علموں کی ایک جماعت کانگریس کے خیالات کی ترجمان تھی، ان میں سے بعض کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی سمجھا جاتا تھا۔ حیات اللہ انصاری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری سب اسی حلقہ سے وابستہ تھے۔ مجاز بھی ان کے ساتھ تھے، چنانچہ ان کے یہاں بھی رومانیت پر کبھی کبھی انقلاب کا سایہ پڑنے لگا۔ 'انقلاب' والی نظم اسی دور کی یادگار ہے۔ اس نظم کو مجاز نے جب پہلی مرتبہ یونین میں پڑھا تو آواز میں ایسا جوش اور انداز رجز خواں سا تھا جیسے وہ یونین سے باہر نکلتے ہی جام توڑ کر شمشیر اٹھا لیں گے لیکن یہاں بھی ان کا فطری لاابالی پن سامنے آیا۔ یوں ان کے اشعار میں اس طرح کے خیالات بار بار ملتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ اپنی شاعری کی رومانی فضا میں ہی بستے رہے اور آج تک آباد ہیں۔ انصار، بڑے عملی قسم کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے کانگریس کی عملی جدوجہد میں بڑا حصہ لیا اور اب تک وہ ایک سرگرم سیاسی کارکن ہیں۔

علی گڑھ کے مشاعروں میں اس وقت ترنم سے پڑھنے کا رواج عام ہو چلا تھا حالانکہ علی گڑھ کی بزم سخن کے میر مجلس مولانا احسن مارہروی مرحوم اس کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے ساغر نظامی کے ترنم پر ایک لطیف طنزیہ قطعہ مشاعرہ میں سنا دیا تھا لیکن جگر کے والہانہ انداز نے علی گڑھ میں ترنم کا شوق پیدا کیا، سردار جعفری تو بے تکلف نثر میں نظم سنانے لگے مگر مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر نے شروع سے ہی ترنم اختیار کیا۔ جاں نثار کی آواز ترنم کے لئے موزوں نہ تھی اس لئے یونین میں کبھی کبھی ان کے ترنم کے ساتھ اس کی نقل بھی شروع ہو جاتی۔ لیکن جذبی اور مجاز دونوں کا ترنم بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ جذبی کے یہاں ترنم میں ایک سوز تھا اور مجاز کے یہاں نغمگی۔ پھر جذبی پڑھتے تو مجسم سوز بن جاتے اور مجاز مجسم نغمہ، ان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا، وہ جھوم جھوم کر اپنا کلام سناتے اور بار بار والہانہ انداز میں اپنے بڑے بڑے بالوں کو جو پیشانی پر آ پڑتے ہاتھوں سے سنوارتے جاتے۔ ان کی آواز باریک تھی لیکن بڑے سے بڑے مجمع میں مائیکروفون کے بغیر وہ بلا تکلف اسے آخری گوشے تک پہنچا سکتے تھے۔ ابھی تک ان کے ترنم کے انداز میں فرق نہیں آیا لیکن صحت خراب ہونے کے بعد سے اس میں کچھ اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

مجاز کی صحت اس وقت بھی بہت اچھی نہ تھی ——— وہ دبلے پتلے اور نحیف سے آدمی تھے، اکثر بیمار رہتے رہتے اور اسپتالوں کی سیر کرتے لیکن

نرس نورا کی چارہ گری والی نظم شاید کسی اور اسپتال رغالباً لکھنؤ) کی یادگار ہے کیونکہ یونیورسٹی کے اسپتال میں حسین نورا کی بجائے ایک کھچڑی داڑھی والے مولانا تیمارداری کے فرائض انجام دیتے تھے اور یوں بھی یونیورسٹی کے ڈاکٹر صرف زمانۂ امن (PEACE TIME DOCTOR) کے معالج سمجھے جاتے تھے اور بالعموم پرہیزی کھانے کی سفارش کے لئے ان کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتے تھے، شاید اس کا اثر گلے اور صحت پر پڑنے لگا تھا، بعد میں رندی کا دور آیا۔ اس کا پورا حال مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جوش کے ساتھ رہ کر مجاز نے مے ومینا کا شغل اختیار کیا جس نے ان کی صحت کو اور تباہ کر دیا۔ اور لوگ اس تباہی کی ذمہ داری جوش پر عائد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ مجاز ایک مرتبہ جوش کے یہاں پہنچے اور آواز دی۔ جوش صاحب موجود نہ تھے۔ زنان خانے سے پوچھا گیا کہ ”آپ کون ہیں؟“ انہوں نے کہا ”مجاز“ ہوں۔ وہاں سے جواب ملا ”اچھا آپ ہی مجاز صاحب ہیں جنہوں نے جوش کو خراب کیا ہے؟“ یہ کون جانتا ہے کہ کس نے کس کو خراب کیا۔ لیکن مجاز کے لاابالی پن میں اس رندی کی شدت سے اور اضافہ ہوا اور رفتہ رفتہ ان کی شاعری کو اس سے نقصان پہنچا اور اس نے ایک کام کے آدمی کو واقعی 'نکما' کر دیا۔

مجاز کا ہمیشہ ہونٹوں پر ڈھلکتا تبسم ان کی شگفتہ مزاجی کا نشان ہے۔ دوستوں کی محفل میں وہ خوب قہقہے لگاتے اور ایسے فقرے چست کرتے کہ سامعین لوٹ لوٹ جاتے۔ اس سلسلہ میں سب سے مشہور لطیفہ روش صاحب کے متعلق ہے۔ کسی محفل میں روش صاحب موجود تھے ”شاعر اعظم“ کی بات چھڑی۔ مجاز پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے ”حضرت 'شاعر اعظم' تو بعد کی بات ہے۔ پہلے 'قدِ آدم' تو ہو جائیے“۔ جن لوگوں نے روش صاحب کو دیکھا ہے وہی اس لطیفے سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجاز کی طبیعت کا یہی انداز ان کے کلام کی شگفتگی اور تازگی کی بنیاد ہے۔

مجاز دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی 'دوست نوازی' میں بھی لاابالی پن ہے۔ ان کے کمرے میں ہوسٹل میں ہو یا گھر پر ہر وقت دوستوں کی محفل جمی رہتی یا پھر وہ خود اس کمرے سے بے نیاز دوستوں کے ساتھ رہتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی دن وہ اس کمرے کا رخ نہ کرتے۔ کمرے میں چیزیں بے ترتیبی سے منتشر پڑی رہتیں، کتابیں البتہ کہیں نظر نہ آتیں اور نہ کلاس میں مجاز بھی تشریف لانے کی زحمت کرتے۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری ہوتی۔ تاش کھیلے جاتے، قہقہے لگائے جاتے اور ساری فضا ان سے گونج جاتی۔ شاید ہی کبھی کسی نے مجاز کو تنہا دیکھا ہو اور کسی محفل میں شاید ہی کبھی وہ خاموش اور افسردہ نظر آئے ہوں۔ ان کے اس انداز میں جو رندانہ شان پائی جاتی ہے وہ ان کے اور ساتھیوں میں سے کم کے حصہ میں آئی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں غرقِ مئے ناب ہیں اور جہاں یہ غم ہے بھی وہاں ان کی مسکراہٹوں نے اس کی تلخی کم کر دی ہے، ایک غنائی شاعر کے لئے یہ بہت بڑی نعمت ہے، خصوصاً جس دور میں مجاز ہیں اس میں زندگی کی تلخیاں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک تبسم یا ایک مسکراہٹ بھی کسی کو نصیب ہو سکے تو غنیمت ہے۔

مجاز کی طبیعت کا لاابالی پن ان کی وضع قطع اور لباس سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک خاصے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور علی گڈھ میں یوں بھی عام طور پر طالب علم بہت خوش پوش رہتے تھے لیکن مجاز اس معاملے میں بھی بے نیاز تھے، ویسے ان کا لباس علی گڈھ کٹ پاجامہ اور شیروانی تھا لیکن دونوں سے لاابالی پن ظاہر ہوتا تھا۔ ٹوپی اس زمانہ میں سر کی بجائے زیادہ تر ہاتھ میں رہتی تھی۔ ترکی ٹوپی علی گڈھ سے رخصت ہو چکی تھی۔ البتہ آرکھدر کی شیروانی اور کھدر کی گاندھی ٹوپی پہنتے تھے لیکن مجاز بالعموم سیاہ رنگ کی سمور کی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ سوٹ انہوں نے کبھی نہ پہنا اور اس لاابالی پن کے باوجود کبھی بڑھے بالوں یا میلے کچیلے کپڑوں سے 'ہونق' کی صورت بنائی، لباس میں بے اعتنائی کے باوجود ایک نفاست اور ستھرا پن موجود تھا، اس زمانے میں علی گڈھ میں کابوری چپل کا رواج بھی عام تھا لیکن مجاز نے کبھی اسے پسند نہ کیا۔

غرض میں نے آج سے بیس بائیس سال پہلے مجاز کو جیسا دیکھا تھا آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ باہر والوں نے مجاز کو ان کی شاعری میں دیکھا ہے اور اسی سے ان کی صورت اور سیرت کا اندازہ لگایا ہے ——— فیض نے آہنگ کے دیباچہ میں مجاز کے مجموعے

کے اس پہلے شعر کو نقل کرتے ہوئے ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

لکھا ہے کہ مجاز کی شاعری انہی تینوں اجزا سے مرکب ہے لیکن مجاز بنیادی طور پر "غنائی" شاعر ہے اور بیچ کے ایک مختصر سے عرصہ کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ گیت گاتا رہا ہے جن میں شمشیر کم اور ساز و جام زیادہ ہے۔ یہاں میرا مقصد مجاز کی شاعری پر تنقید کرنا نہیں اس لئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ان کے اشعار میں بڑی تازگی، بانکپن، غزل کی ادا اور نغمگی ہے، بعض جدید رجحانات اور میلانات نے مجاز کو غزل سے دور لے جانا چاہا چنانچہ انقلاب کا نعرہ مجاز کی شاعری میں ایک طوفان بن کر اٹھا، لیکن اس طوفان کو انجام تک پہنچانے کے لئے جس عزم و استقلال اور جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجاز کے بس کی بات نہ تھی؛ اس لئے انقلاب والی نظم اس مجموعے میں ایک ہی نمونہ ہے جو اس ٹکنیک میں نئے تجربات کا ہے، یہاں بھی ان کے یہاں فیض، راشد، سردار جعفری وغیرہ کی سی بات پیدا نہ ہوئی۔ اب مجاز کی شاعری میں اضمحلال پیدا ہو چلا ہے۔ اس کے اسباب کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ کوئی عیب نہ ہوتا کہ وہ انقلاب کا مطرب بن جاتا اور جوش کی صحبت سے اسے کم سے کم اتنا فیض ضرور پہنچ سکتا تھا، اور ایسی صورت میں اس کے نغموں میں فیض کے بقول برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی اور تاثر آفرینی ہوتی، لیکن "نوجوان خاتون سے خطاب" اس انداز کی آخری نظم ہے جو ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی۔

مولوی محمد داؤد عباسی

محمود احمد عباسی

روہیل کھنڈ (یو۔پی) کے مشہور و مردم خیز قصبہ امروہہ[1] کے ایک علمی خاندان میں ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۹ فروری ۱۸۶۲ء کو داؤد مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ اس علمی خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا رکن الدین[2] عباسی اوائل عہد مغلیہ کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ ان کے اخلاف میں نسلاً بعد نسل علماء و فضلا ہوتے رہے۔ داؤد مرحوم کے والد مولوی علی محمد عباسی نے علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد درس و تدریس کے بجائے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اس پیشہ میں کامیاب و نیک نام رہے۔ انہوں نے اپنے سب بیٹوں[3] کو اس زمانہ میں انگریزی پڑھائی جب انگریزی کا پڑھنا حرام بتایا جاتا تھا چنانچہ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۷ء کو داؤد مرحوم ۱۵ سال کی عمر میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۴ ہی سال تک اکتساب علم کرتے رہے ۱۸۸۹ء میں ایف۔ اے، ۱۸۹۱ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات فارسی تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد دو سال تک

۱۔ روہیل کھنڈ کی بہت قدیم بستی ہے۔ ابن بطوطہ دوران سیاحت میں یہاں بھی آیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں امروہہ کے شیخ زادہ اور قاضی شہر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ ایک چھوٹا سا حسین شہر ہے"۔ اسی حسین شہر کی خاک سے جو ہر چہار طرف آموں کے سرسبز و شاداب باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ بڑے بڑے صاحب کمال اور خاص کر ریختہ اور اردو کے نامور شعرا اٹھے مثلاً میر سعادت علی سعادت جن کو میر تقی میر نے ریختہ میں اپنا استاد بتایا ہے۔ استاذ الاساتذہ شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی اور دکنی طرز کی قدیم اردو کا قدیم شاعر اسمٰعیل امروہوی۔

۲۔ یکے از اجلۂ علمائے عہد بابر و ہمایوں و اکبر شہنشاہان ہند و مورث خاندان عباسیہ متوطنہ امروہہ

"سر بر آرائے علم و فضل رکن الدین عباسی — بر زبانہائے معارف شد ز فیض او سحر پیدا" (تذکرۃ الکرام)

۳۔ یہ سب ۹ بھائی تھے۔ ان میں سے ایک نے جب اسکول میں داخل ہو کر انگریزی پرائمری میں dog اور cat وغیرہ لفظ پڑھے ان سے ایسی کراہت محسوس کی کہ گھر آ کر صاف کہہ دیا کہ میں ایسی کتاب نہیں پڑھوں گا۔ ان کو دینی مدارس میں بھیجا گیا۔ دیوبند اور امروہہ کے مدارس عربیہ میں تکمیل درس کے بعد دہلی میں فن طب حاصل کیا اور اس فن میں اب وہ یگانۂ روزگار ہیں اور یہ ہیں مولانا حکیم فرید احمد صاحب عباسی بابائے طب نزیل لاہور۔

علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں ٹیچر رہے پھر ۱۸۹۳ء سے سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ ابتداً نائب تحصیلدار رہے، بڑے فرض شناس اور متدین تھے۔ ضلع باندہ میں قحط کے امدادی کاموں کی نگرانی سپرد تھی اور ہزاروں روپیہ نقد تحویل میں رہتا اس کام کو ایسی خوبی اور دیانت سے انجام دیا کہ بہت نیک نام رہے۔ اپنے ایک دوست مولوی سید طفیل احمد (علیگ) مرحوم کو ۳/اکتوبر ۱۸۹۶ء کے مرقومہ خط میں لکھتے ہیں:

"محض خدا کے فضل سے ہرگز اپنی کسی کارگزاری سے نہیں، میں اس قحط کے کام سے بہت نیک نامی کے ساتھ فارغ ہوا۔ یہ کام بڑی ذمہ داری اور جوابدہی کا تھا، ہزاروں روپیہ بلا کسی شرط کے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا کہ مناسب طور سے خرچ کرو۔ اس میں لوگوں نے سینکڑوں روپیہ بلکہ ہزاروں غبن کیا اور کسی نے پوچھا بھی نہیں یہ واقعات تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ بوقت ملاقات عرض کروں گا۔ ہاں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس کام میں نیک نام رہا۔"

باندہ کے بعد چند اور اضلاع ایٹہ اور آگرہ وغیرہ میں تعینات رہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ نمونیہ کے شدید مرض میں مبتلا ہو گئے تھے تندرست ہونے کے بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا۔ ۱۸۹۹ء میں پھیپھڑے متاثر ہوئے، بیماری کی رخصت بھی نہ لی۔ برابر کار منصبی انجام دیتے رہے اپنے ان ہی دوست کو ۳/اگست ۱۸۹۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں بفضلہ اب بالکل تندرست ہوں، ضعف مطلق نہیں، صبح کو انڈا، دودھ، شہد کھانے کے ساتھ کاڈلیور آئل تیسرے پہر کو میاں فرید کی رائے سے شیرہ بادام، خشخاش، الائچی، کالی مرچیں اور مصری، رات کو کھانے کے ساتھ پھر کاڈلیور آئل۔ اتنی چیزیں استعمال میں ہیں۔ ان مقویات کے سامنے تو پاس بیٹھنے والوں کا بھی ضعف جاتا رہے۔"

مگر مرض برابر بڑھتا رہا، حسن کارگزاری میں ترقی بھی ملی تحصیلداری پر تقرر ہوا لیکن اس کے ایک سال کے اندر ہی یعنی ۳/جون ۱۹۰۰ء میں بعمر تقریباً ۳۹ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور فتح آباد ضلع آگرہ کے احاطہ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔

نہایت سلیم الطبع، نیک نہاد، ہر دل عزیز شخص تھے۔ متانت و سنجیدگی کے ساتھ طبیعت نہایت شگفتہ تھی۔ سخن سرائی کا ذوق موہبت الٰہی تھا نہ کبھی کسی سے تلمذ حاصل تھا اور نہ کبھی مشق سخن کی، شعر فی البدیہہ کہتے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جو کالج میں داؤد مرحوم سے کئی سال جونیئر تھے ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانۂ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک تلمیذ رشید تھے، مبدأ فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ[1] سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو نہیں لیکن سروں کو ضرور فکر مقراض سے فارغ البال کر رکھا تھا اس پر مرحوم کو ذیل کی اچھوتی پھبتی سوجھی جو اسی وقت کالج کے ہر لچے لفنگے کی زبان پر تھی ؎

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
تاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا"

---

[1] کاندھلہ ضلع مظفر نگر یو۔ پی میں پرانا قصبہ ہے۔

علی گڑھ کے تلامذہ میں خاص کر دورِ اوّلین کے طلباء میں داؤد مرحوم ہی کی شخصیت تنہا ایسی تھی کہ طویل زمانہ تک علی گڑھ میں رہے لیکن اپنی وضع قطع میں مطلق کوئی تبدیلی نہ کی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ان کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے :

"۱۸۹۰ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ...... بریلی کے اسکول سے علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لئے آیا...... اس "نیچر گڑھ" میں تقریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، جراب، انگریزی جوتا، یہی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کورٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھی کرتہ بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوئی ہوتی تھیں مگر مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے بڑھے ہوئے پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنہیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کر لیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اس کی پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ سے "ڈول ہاؤس" بن گیا ہے، ایک دراز قامت مگر خاصے دبلے پتلے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے جن کی ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی (جس کو اب "گاندھی کیپ"[1] کہا جاتا ہے) جن کا جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بردوش" نہ سہی لیکن "تابناگوش" ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے۔ وہ گردن میں ایک سپید خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سرسید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی۔ لیکن علی گڑھ جیسے "نیچر گڑھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جتنا کسی یوروپین لیڈی کا آج بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ اور گردن، بازوؤں اور بانہوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا آج نمایاں ہوگا اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انہیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں۔ لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ خان صاحب[2]،

---

[1] گاندھی کیپ اور امروہہ ساخت کی ٹوپی میں نمایاں فرق تھا۔ امروہہ ساخت کی ٹوپی ساٹن پر کلابتوں اور ریشم سے کڑھی ہوئی ہوتی تھی اور گاندھی ٹوپی کھدر کی۔

[2] یعنی خان بہادر الحاج مولوی محمد حبیب اللہ خان صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق کلکٹر یو۔ پی جنہوں نے اپنے مادر علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں۔

احمد حسین[1] مرحوم، قسیم[2] بیگ چغتائی جیسے طلباء شامل تھے اس کے سردار یہی پُرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلباء کا مجمع رہا کرتا تھا۔"

داؤد مرحوم کی کالج کے طلباء میں یہ ہر دلعزیزی مجلہ اور باتوں کے ان کی شاعری، شگفتہ مزاجی اور پھبتی و فقرے چست کرنے کی وجہ سے تھی۔ وہ لطیفہ تو کہہ جاتے مگر اس سنجیدگی و متانت کے ساتھ کہ کبھی خود قہقہہ مار کر نہ ہنستے مسکراہٹ لبوں پر آجاتی اور سامعین ان کے لطیفہ اور پھبتی سے پھڑک اٹھتے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کالج کے زمانہ کے دو ایک لطیفے لکھے ہیں۔ مولانا حالی مرحوم کی مشہور غزل ہے ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مقطع ہے ؎

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اس مقطع کی جو تضمین داؤد مرحوم نے کی تھی[3] مولانا محمد علی مرحوم اس کے متعلق کہتے ہیں :۔

"باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالی کی مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انھوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں صرف میرا تخلص مطلع سے نکال ڈالیں تو میں خوش اور میرا خدا خوش، مگر تضمین بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا۔ سنئے ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں | پہلے یہ دیکھ لے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سُن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں | ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر میں مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

اس کے بعد مولانا مرحوم ایک اور لطیفہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی، کالج میں ایک عرصہ تک ہر نسل میں

---

[1] احمد حسین بی۔ اے (علیگ) مرحوم ۱۸۸۱ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

[2] مرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ) آگرہ کے رہنے والے ۱۸۸۵ء میں فرسٹ ایر میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں بی۔ اے پاس کر کے اوّل علی گڑھ کے ایک کلکٹر کے جس کی آنکھیں خراب تھیں پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر کچہری میں مترجم ہو گئے اس کے بعد آگرہ کالج میں وارڈن رہے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ خان بہادری کے خطاب یافتہ تھے۔ آخر میں جودھ پور میں بھی رہے، بڑے لطیفہ گو تھے ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی افسانہ نویسی میں مشہور ہوئے۔

[3] تضمین کے اس واقعہ کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے بھی یادگار حالی مؤلفہ صالحہ عابد حسین کے مقدمے میں بیان کیا ہے لیکن تضمین کے مصرعے بھی غلط لکھے ہیں اور داؤد مرحوم کا حال بھی صحیح نہیں لکھا اور بھی متعدد اصحاب نے جنھوں نے یہ لطیفہ بیان کیا ہے ایسی ہی غلطیاں کی ہیں۔

ایک طالب علم کو "بوم" کا لقب عطا ہوتا تھا لیکن اس نسل کے "بوم[1]" کو مولانا شبلیؒ کی صحبت میں رہنے کا عشق تھا جب کالج کا گروپ فوٹو کھنچنے لگا تو "بوم" صاحب فوراً مولانا شبلیؒ کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے جس پر داؤد صاحب نے اسی وقت لکھ دیا ؎

آج کالج میں مچ رہی ہے یہ دھوم ۔۔۔ طلبا کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روحِ سعدیٔ مرحوم ۔۔۔ "کس نہ آید بزیرِ سایۂ بوم"
الّا مولانا شبلیؔ مخدوم"

مولانا شوکت علی مرحوم کو داؤد مرحوم کے بہت سے لطیفے کالج کے زمانہ کے یاد تھے۔ مولانا شبلیؒ نے ایک مسدس اردو میں لکھا تھا جس کا ایک بند یہ تھا ؎

بانیٔ مدرسۃ "سید" والا گوہر ۔۔۔ وہ مینجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلیؔ غمزدہ وہ شاعرِ اعجاز اثر ۔۔۔ اور یہ نو بادۂ اقبال کے سب برگ و ثمر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان

اسی طرح جب مولانا موصوف قسطنطنیہ کے سفر سے واپس آئے ایک ڈنر کے موقع پر فارسی نظم پڑھی جس کے چند شعر یہ تھے ؎

کالج امروز بہ آں فرو شاں است کہ بود ۔۔۔ بزم را گرمیٔ ہنگامہ ہماں است کہ بود
ہر یکے ز بک[2] و مارسین[3] و آرنلڈ[4] و ہیورسٹ[5] ۔۔۔ ہم چناں مدرسہ را روح و رواں است کہ بود
واں دگر دیدہ وراں کہ بہ اسکول در اند ۔۔۔ ہم چناں سعیٔ طلب از تہ جاں است کہ بود
شبلیؔ غمزدہ آں بادہ کش طرفِ بساط
ہم بہ آں طرز نوی زمزمہ خواں است کہ بود

"ہماں است کہ بود" ردیف و قافیہ تھا اور حسبِ معمول اپنے نام کے ساتھ "غمزدہ" باندھ گئے تھے اس لئے اس زمانہ میں وہ کالج کے طلبا میں

---

[1] مولانا شوکت علی مرحوم نے "علی گڑھ کالج کی ایک عجیب و غریب شخصیت" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی "بوم" والا لطیفہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مولانا شبلی نے جب یہ قطعہ سنا فوراً تاڑ گئے کہ یہ پھبتی داؤد مرحوم کے سوا اور کس کی سوجھ سکتی ہے چنانچہ انہوں نے خود بھی اس کی بہت داد دی۔" "بوم اول" کے بارے میں کہتے ہیں کہ "بدایوں یا میرٹھ کے رہنے والے گوری رنگت، بڑے بڑے دانت والے خوش وضع تھے مگر شستہ لطیف کی ذرا کمی تھی جس کسی ہم جماعت سے رنجش ہو جاتی اپنے کمرے میں پنسل سے دیواروں پر اس کی تصویر بناتے اور چھوٹے سے کھلونے کے طمنچہ سے تصویر پر نشانہ بازی کرتے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جو حاجت ضروری سے فارغ ہونے کے لئے جب پاخانہ میں بیٹھتے "اونہہ" "اونہہ" کی زحمت سے بچنے کے لئے مولانا حالی کے "شکوۂ ہند" کے اشعار بلند آواز سے پڑھتے۔ مولانا شبلی سے بڑی عقیدت تھی اور بلا کی طرح ان سے چپٹے رہتے تھے۔"

[2] مسٹر بک پرنسپل کالج [3] پہلے پروفیسر تھے مسٹر بک کے بعد پرنسپل ہوئے [4] مسٹر آرنلڈ عربی کے پروفیسر اور مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام کے مؤلف [5] مسٹر ہیورسٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

"شبلیٔ غمزدہ" سے معروف تھے۔ داؤد مرحوم کو پھبتی سوجھ گئی اسی وزن و قافیہ میں انہوں نے بھی چند شعر کہہ دیے۔ مولانا شوکت علی لکھتے ہیں کہ[۱] داؤد مرحوم نے "شبلیٔ غمزدہ" کی یہ نظم سنتے ہی کئی شعر کہہ دیئے جن کو ہم نے گا دیا جو سب میں مشہور ہو گئے ان کا ایک شعر یہ تھا ؎

شبلیٔ غمزدہ درصورت نسّاف کہ ہست
رنگ او تیرہ و تاریک ہماں است کہ بود

مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

"چودھری خوشی محمد خاں صاحب کالج کے "پوئٹ لاریٹ" اور اپنے قد کے لحاظ سے "لانگ فیلو" تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے ان کے مدّاح تھے مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لئے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق[۲] صاحب (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور اس زمانہ میں کالج میں "سینٹ پال" کے عرف سے معروف تھے) چودھری صاحب[۳] کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ٹامسن کی نظم "سیزنس" (مختلف موسم) پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھی ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورہ سے آرنلڈ صاحب نے انہیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا اس میں ایک موقعہ پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ ع ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو۔ ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ "انظر الی الابل کیف خلقت" اس لئے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو اس پر داؤد صاحب نے لگایا تھا۔

ناظر صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو
داؤد صاحب اس پر فرماتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدر آباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو سرسیدؒ کے ڈنڈے سے ڈرتے تھے۔ نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدا بہار کھانے کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی "حسب دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کئے، ان وعدوں سے

---

۱ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے "بلدرم" کے حالات میں (حاشیہ صفحہ ۱۳۴ شخصیات نمبر — نقوش — طبع ثانی ۱۹۵۶ء) یہ شعر بہ تغیر بعض الفاظ نقل کیا ہے یہ واقعہ مولانا شوکت علی مرحوم کے سامنے کا ہے اور وہ اس شعر کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے اس کے علاوہ "خر سید چوں بہ ...... رود ...... ہنوز خر باشد" کے متعدد شعر بھی سنایا کرتے تھے جو داؤد صاحب مرحوم کے کہے ہوئے تھے۔

۲ یعنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو ——— مولانا محمد علی مرحوم نے جس زمانہ میں (یعنی ۱۹۲۸ء میں) یہ تحریر لکھی تھی ڈاکٹر صاحب اورنگ آباد میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے اور وہیں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور پریس بھی قائم کیا پھر چند سال بعد ملازمت سے ریٹائر ہو کر دہلی آ گئے۔ فسادات دہلی میں کتب خانہ انجمن برباد ہو گیا اس کے بعد کراچی آ کر از سر نو انجمن کا کتب خانہ، مطبع وغیرہ قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب اعلیٰ پایہ درس گاہ ہے۔

۳ چودھری خوشی محمد خان بی۔ اے علیگ نے ۱۸۹۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کیا، انگریزی و فارسی میں آنرز کے ساتھ عرصہ تک ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی نظمیں بہت لکھی ہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں خاص طور سے پڑھی جاتی تھیں۔

خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ "جان" اور "نان" تھا اور مولوی شبلی کے شاگرد رشید اور محبوب خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے یونین میں پڑھا، ان کے بہت سے شاگرد آج بھی نقل اتار سکتے ہوں گے اسی بحر اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا ۔ وہ یہ تھا ؎

خوب تر صحرا نوردی می کند
اُشتر پنجاب در ہندوستان

اب قارئین کرام داؤد صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ؎

ناظرا! اب سیر سبزہ کر ڈالو
اپنے آگے کی گھانس چر ڈالو"

حامد علی[1] خان کے کمرے سے جو کالج میں "منشی ستائیس" کہلاتے تھے، ان کی ٹائم پیس گھڑی چوری ہو گئی تھی میز پر گھڑی کا خانہ خالی پڑا تھا داؤد صاحب مرحوم ادھر آ نکلے چوری کا واقعہ سنا اور فی البدیہہ چند مصرعے موزوں کر کے گھڑی کے خانہ میں لکھ دئے ۔ آخری مصرعہ یہ تھا ؎

چور گھڑی لے گیا کیوں نہ ہو خانہ خراب

علی گڑھ میں تعزیہ داری کے جلوس کے سلسلہ میں سخت بلوہ ہندو مسلمانوں میں ہو گیا تھا، اس فساد کی وجہ سے کالج بھی کچھ دن کے لئے بند کیا گیا تھا ۔ ہندوؤں کا لیڈر لالہ بدری پرشاد وکیل تھا اور وہ ہی مقدمہ کی پیروی میں پیش پیش تھا ۔ مقدمہ کی پیشی کے دن ایک پر جوش مسلمان امراؤ خاں نامی نے کچہری کے احاطہ میں لالہ بدری پرشاد کی ناک سے ناک کاٹ لی ۔ لالہ بڑے بزدل تھے غش کھا کر گر گئے اور پیشاب پاخانہ خطا ہو گیا ۔ داؤد مرحوم نے اس واقعہ پر نظم لکھ ڈالی جس کے دو شعر یہ تھے ؎

واہ رے امراؤ خاں زبان تیرے جائیے — ناک کاٹی ہے عدالت میں ٹرے بدلو کی
کیا زبوں حالت تھی لالہ بدری پرشاد کی — منہ سے گریہ کی صدا تھی اور مقعد سے باد کی

مولانا شوکت علی مرحوم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ :

" بہادر علی جن کا بیٹا اختر علی تحریک خلافت کے زمانہ میں میرا اسیکرٹری رہا تھا وہ غریب اسکول میں تعلیم دینے لگے ۔ نیک طبیعت شخص تھے، لانبی داڑھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے ہر شخص ان کا مذاق اڑاتا تھا ۔ انہوں نے بی ۔ اے میں ریاضی لی تھی ۔ چونکہ عام خیال یہ تھا کہ مسلمان ریاضی میں کمزور رہتا ہے اس لئے ہماری پارٹی کے مسٹر کمال الدین نے جو عبدالرحمٰن صدیقی کے بہنوئی سورت کے رہنے والے اور فٹ بال کے کپتان تھے، ان کا نام "بابو گھوش" بروزن "بابو گھوش" رکھ دیا تھا ۔ جب ریاضی کا مضمون انہوں نے چھوڑ دیا تو بابو "گھو کلے" بروزن "بابو گھو کلے" کی پھبتی ہوئی ۔ غرضکہ جب بہادر علی اسکول میں درس دینے لگے تو

---

[1] حامد علی خان ساکن فتح گڑھ ۱۸۸۹ء میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں بی ۔ اے کیا اولاً نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار ہوئے امروہہ میں تعینات تھے، شکار کھیلتے میں بندوق کا نشانہ اتفاقاً لگا اور جاں بحق ہوئے ۔ کسی موقع پر وہ کالج میں انیس بیس کے فرق کو یہ کہہ بیٹھے تھے کہ یا تو فرق چار کا ہوگا یا ستائیس کا ۔

داؤد صاحب مرحوم نے ایک خاص مناسبت کی بنا پر ایک قطعہ تصنیف کر دیا جس کو ہم نے گا دیا اور وہ سب میں مشہور ہو گیا اس کے صرف یہ دو شعر یاد رہ گئے ہیں ؎

کہاں چھوٹی کسوت کدھر استرا ہے　　تمہارا ہی پیشہ کہو کیسا بُرا ہے

بس اب دوس ونار سیں میں کیا دھرا ہے　　بہادر علی یہ زمانہ بُرا ہے"

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے ذوق شعر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"شعر نے جس شخص کے لئے اتنی کم عمر میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ "گرددفن او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ چودھری ممتاز حسین[1] صاحب کو آج کل کے کلکٹر سید زین الدین[2] صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کوآپریٹروں[3] پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۸۹۱ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ؎

نہ ہوا سرد تھی نہ سر پر چھاؤں
اس پہ طرہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

اس مثنوی کو ہمیں بھلا کون دکھاتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گو ذیابیطس کے باعث حافظہ اب بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمدللہ بچپن کے سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد صاحب عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے پایا۔"

مثنوی کا نام "شکوۂ یار" رکھا، پانچ سَو سے زیادہ شعر ہیں ۱۸۹۲ء میں طبع ہوئی - دیباچہ میں خود لکھتے ہیں:

---

[1] چودھری ممتاز حسین مرحوم ولد علی بخش ساکن پانی پت۔ ۱۰ جون ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے کالج چھوڑ دیا، اولاً نائب تحصیلدار ہوئے پھر تحصیلداری پر ترقی ہوئی کچھ عرصہ ریاست دوجانہ میں منیجر رہے — عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

[2] سید زین الدین مرحوم ایم۔ اے سید زین العابدین مرحوم کے فرزند تھے جو سر سیدؒ کے احباب خاص میں سے تھے اور علی گڑھ میں سب جج تھے۔ سید زین الدین مرحوم کا تقرر براہِ راست ڈپٹی کلکٹری پر ہوا، پھر کلکٹر ہوئے۔ ابتدا آپ بڑے فیشن ایبل تھے آخر میں مذہب کا رنگ غالب آیا۔ کچھ عرصہ ریاست رام پور میں ریونیو منسٹر رہے۔ جب کبھی ملنا ہوتا اکثر داؤد مرحوم کا ذکر کرتے اور ان کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ مجھے اجازت دی تھی کہ مثنوی اور ان کے نام کے قطعہ کو باظہار نام چھپوا دوں۔

[3] یعنی کانگرس کی تحریک عدم موالاۃ پر عامل "Non. Co operators"

”چونکہ مجھے کسی سے تلمذ کی عزت بھی حاصل نہیں لہٰذا ضرور ہے کہ جا بجا ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ بہرحال یہ ٹوٹی پھوٹی نظم جس پر نظم کا لفظ بھی مشکل سے عائد ہوتا ہے خاص اپنی رائے نیز ایک عزیز دوست کے اشارے سے اپنے سچے ہمدرد اور رفیق محمد فصیح[1] کے نام سے معنون کرتا ہوں۔ پہلے بھی مجھے اکثر دوستوں نے یہ صلاح دی کہ میں اس کو طبع کرا دوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ طبع ہونے کے بعد مطبوع ہو گی لہٰذا جرأت نہ کر سکا اور بجائے چھپوانے کے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان کے سخت اصرار اور متواتر تقاضوں نے اب مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ اس کو طبع کرا کے پبلک کے سامنے اپنی یاوہ گوئی اور ژولیدہ بیانی کے ثبوت دوں۔“

تمہید کے اشعار ملاحظہ ہوں:

قلمِ دو جہاں دکھا جوہر — خامۂ دُرفشاں دکھا جوہر
وقت آیا ہے خوش بیانی کا — امتحاں آج ہے روانی کا
گلِ مضمون رنگ دکھلائیں — آج کاغذ پہ پھول کھل جائیں
لب پہ تحسین بار بار آئے — گلشنِ نظم میں بہار آئے
ہر ورق رشکِ سنبلستاں ہو — مثنوی غیرتِ گلستاں ہو
بحرِ مضموں میں ہو تلاطم آج — جوش میں آئے قلزمِ موّاج
کس طرح میں سخن کے زمزمہ ساز — کھولتا ہوں درِ خزینۂ راز
عرصۂ نظم گھیرتا ہوں میں — آج موتی بکھیرتا ہوں میں
گوہرِ دُر کی کان ہے سینہ — جوہری کی دوکان ہے سینہ
تھے جو مضمون ازل سے سربستہ — ہیں مرے سامنے کمربستہ
توسنِ فکر ہو جو گرمِ عناں — پردۂ غیب کے ہوں راز عیاں
پھر کے اک پل میں چار سو آئے — جب اڑے آسماں کو چھو آئے

اسی طرز کے چند اور شعر ہیں پھر ”کیفیت ابتدائے الفت“ کے عنوان سے یوں شروع کیا ہے:

اب سنیں صاحبانِ سوز و گداز — قصۂ دردِ و غم کا ہے آغاز
اک مرے دوست اور کرم گستر — ذی خرد، ذی شعور، دانشور
نکتہ رس، نکتہ سنج، خوش اطوار — ساری باتوں میں الغرض ہشیار
مگر آگاہ ہے نہ الفت سے — نا بلد محض ہے محبت سے
دور دل سے یہ لطف تھے سارے — جانتے ہی نہ تھے یہ چٹخارے

---

[1] محمد فصیح گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ۶ مئی ۱۸۸۴ء میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں سکنڈ ایر سے تعلیم چھوڑ کر چلے گئے، پہلے سب انسپکٹر ہوئے پھر اسسٹنٹ انسپکٹر پھر تحصیلدار۔ داؤد مرحوم کے کمرے میں وہ اور ان کے بڑے بھائی محمد وجیہ جو ڈپٹی کلکٹر ہوئے، رہتے تھے محمد فصیح بڑے سر پھٹ تھے اور سید زین الدین سے ان کی دوستی تھی۔

ان مزوں سے زبان بے بہرہ | ان صداؤں سے کان بے بہرہ
جس کے دل میں نہ یہ حرارت ہو | اس سے بیزار جو طبیعت ہو
اس کے سودے سے ہو جو سر خالی | اس سے ہو کر کوئی بشر خالی
اس کو کچھ لطفِ زندگی ہی نہیں | بلکہ یوں کہئے آدمی ہی نہیں
اس کی تلخی میں بھی حلاوت ہے | اس کی تکلیف میں بھی راحت ہے
اس سے دل میں سرور آتا ہے | اس سے آنکھوں میں نور آتا ہے
اس کی بدنامی نام کا باعث | اس کی ناکامی کام کا باعث
یہ خزاں ہے بہار سے بہتر | بے قراری قرار سے بہتر
رنج ہے باعثِ خوشی اس میں | موت ہے عین زندگی اس میں
اس کے چھینٹوں سے ہوش آتا ہے | خود بخود دل میں جوش آتا ہے
اس کے غم میں بھی اک بحالی ہے | اس کی جو بات ہے نرالی ہے
اس نے پائی ہے کچھ عجب تاثیر | خاک اس کی نظر سے ہو اکسیر
قدر میں پھول سے سوا خس ہو | جس کو یہ مس کرے وہ پارس ہو
جس پہ یہ مہربان ہوتا ہے | وہ عزیزِ جہان ہوتا ہے
شہرۂ عام قیس نے پایا | کس قدر نام قیس نے پایا
تخمِ الفت کا بو گیا فرہاد | سرخرو اس سے ہو گیا فرہاد
اس کے غم سے نہ تھا جو دل خالی | رتبہ عشاق میں ملا عالی
دقتیں ہیں مگر ہزار اس میں | ہر کسی کو نہیں ہے بار اس میں
اس جنوں کے لئے ہے سر درکار | اس تحمل کو ہے جگر درکار
اس میں زور آزمانے مشکل ہیں | اس کے صدمے اٹھانے مشکل ہیں
جو کوئی یہ مصیبتیں جھیلے | پہلے وہ اپنی جان پر کھیلے
جان ہر ایک کھو نہیں سکتا | ایسے ویسوں سے ہو نہیں سکتا
اس میں لازم ہے مستقل رہنا | اس کے در پہ بجان و دل رہنا
چوٹ پر چوٹ کھائے اُف نہ کرے | لاکھ صدمے اٹھائے اُف نہ کرے

یہ مثنوی جب چھپ گئی اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ کالج کے ہر بے فکرے کی زبان پر اس کے اشعار رہتے۔ شدہ شدہ سید زین الدین مرحوم کے پدر بزرگوار سید زین العابدین صاحب کو خبر ہوگئی وہ ایسے برہم ہوئے کہ سرسید سے شکایت کی۔ انہوں نے مسٹر بک پرنسپل سے کہا مگر اودد صاحب مرحوم طلبہ اور اسٹاف دونوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے اور مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر خاص طور سے ان کے مداح تھے۔ سید محمود مرحوم کو بھی ان کے بعض لطیفے خاص کر مولوی شبلی کے متعلق پسند آئے تھے ان حالات میں کوئی اقدام ان کے خلاف نہیں کیا جا سکتا تھا بالآخر مسٹر بک نے

ان کی رائے معلوم کر کے سرکاری ملازمت کی سفارش کر دی اور اس طرح وہ سرکاری ملازمت میں منسلک ہو کر علی گڑھ سے باہر چلے گئے۔ سید زین الدین مرحوم بھی اپنی ملازمت پر چلے گئے تھے ایک خط میں یہ شکوہ بھی کیا تھا کہ دوستوں نے ہمیں بھلا دیا ہے داؤد مرحوم نے جس قطعہ منظوم میں اس کا جواب دیا تھا وہ یہاں درج کرتا ہوں ؎

تم نے لکھا تھا مجھے خط میں بڑی حسرت سے
اور حقیقت میں وہ تھی بات بھی حسرت والی

یعنی جو روز[1] کی آخر میں ہوئی تھی حالت
اور جس قسم کی تھی اس کی پریشاں حالی

کم زیادہ وہ ہی حال تمہارا ہے کہ تم
جس طرف دیکھتے ہو پاتے ہو میداں خالی

لاکھ کوشش کرو اب کوئی نہیں ملنے کا
محض بے سود، کرو کیسی ہی دیکھا بھالی

چودھری[2] کر گیا، سچ ہے، جو کچھ کرنا تھا
اس کی ہمت تھی قوی، حوصلے اس کے عالی

اب نہ وہ دم ہے کسی میں، نہ ہے وہ جوش و خروش
اور ادھر تم پہ بھی ہے چھائی ہوئی کنگالی

یعنی خود تم کو ہے افسوس کہ اب تم میں کچھ
نہ رہی بات وہ لوگوں کو لبھانے والی

اب نہیں وہ کہ جسے چاہا اسے پھونک دیا
گویا اک آگ تھی جب جی میں ہوا دہکا لی

مل گیا جب کوئی بیچارہ تو دل اینٹھ لیا
صبر و ہمت کی جو کچھ جمع تھی سب رکھوا لی

ہو گئے ظلم میں جب طاق ستم میں استاد
خوب ان باتوں میں جب مشق بہم پہنچا لی

تو یکایک صفِ عشاق سے نکلا آگے
اک اولوالعزم جری، بانی نئی کرنا لی

اس نے دو روز ہی میں کر دی قیامت برپا
ہو گئی دھوم زمانے میں وہ ہلچل ڈالی

اس کے تیور ہی کچھ ایسے تھے کہ دیکھے نہ سنے
پائی تھی اس نے طبیعت بھی عجب متوالی

اس کی الفت کے ہوئے لوگوں پہ سبب کیا کیا
مثنوی بھی کسی استاد[3] نے اک لکھ ڈالی

تم بھی مشہور یہاں ہو گئے اس کے باعث
اور اس نے بھی کما حقہ شہرت پا لی

اس زمانہ کے گذر جانے کا اب رنج فضول
ٹھہر سکتی نہیں جو شے ہو گزرنے والی

اب کوئی اور اسی قسم کی سوچو تدبیر
شغل کچھ چاہیئے اچھا نہیں رہنا خالی

ہم بتائیں تمہیں اب اس پہ عمل کرنے لگو
"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

داؤد مرحوم کے عزیزوں میں علی حسین عباسی ایک معمّر بزرگ، دمہ کے مریض تھے، کھانسی کھنکار، بلغم تھوک سے بردم واسطہ، اپنی قبر کے لئے انہوں نے پہلے ہی سے جگہ تجویز کر لی تھی اور خاندانی قبرستان سے ذرا دور ہٹ کر ایک چبوترہ بھی بنوا دیا تھا لیکن جب ۱۸۹۷ء میں مراد آباد و غازی آباد ریلوے لائن

---

[1] اس زمانہ میں "روز" و "فرڈی ننڈ" شائع ہوا "روز" ہیروائن کا نام تھا، زین الدین اور داؤد مرحوم انگریزی تحریر کی قابلیت بڑھانے کے لئے انگریزی خطوط لکھا کرتے تھے۔ ایک روز کی طرف سے اور دوسرا فرڈی نند کی جانب سے۔

[2] یعنی چودھری ممتاز حسین مرحوم ساکن پانی پت ضلع کرنال۔

[3] اس زمانہ میں داؤد مرحوم کالجیٹ اسکول میں ٹیچر تھے۔

بنی اور اس کی داغ بیل ڈالی گئی تو اس ریلوے لائن میں یہ چبوترہ آ کر مسمار ہو گیا، علی حسین مرحوم کو کچھ ایسا قلق ہوا کہ امروہہ سے اپنے اکلوتے فرزند ابن حسن عباسی کے پاس جو اس زمانہ میں تحصیلدار تھے اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے، ان کے جائے تعیناتی پر چلے گئے اور چند روز میں دنیا سے بھی رخصت ہو گئے۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخیں کہیں۔ داؤد مرحوم نے بھی تاریخ کہی اور اپنے دوست مولانا طفیل احمد (علیگ) مرحوم کو خط مرقومہ ۸ رمضان المبارک میں لکھا کہ جو تاریخیں ہوئی ہیں وہ ان مرحوم کے حسب حال نہ تھیں، مجھ کو حسب حال لکھنی چاہئے چنانچہ مادۂ تاریخ ایسا ہی نکالا ہے، سُنئے ؎

مر گئے ہیں بڑے میاں جب سے | دل میں اٹھتی ہے ان کے غم سے ہوک
تھے بڑے نیک بخت اور دیں دار | کرتے رہتے تھے سب سے نیک سلوک
جنتی ہونے میں نہیں ان کے | دوست دشمن کسی کے دل میں شکوک
سب نے لکھی ہیں ان کی تاریخیں | ہو گئی اک فقط مجھ ہی سے چوک
اس لئے آج میں نے بھی اپنی | شاعری کی گھڑی کو دی ہے کوک
جب سے یہ دُھن ہوئی ہے بھول گیا | کس کو کہتے ہیں پیاس، کیسی بھوک[1]

بولا ہاتف کہ ہو گئے بے کھٹک
آج کھانسی، کھنکار، بلغم، تھوک

۱۸۹۹ء

داؤد صاحب مرحوم کی بیاضوں میں، جو راقم الحروف کے پاس اب تک موجود ہے، میر انیس، مرزا دبیر، میر محسن کے متعدد مرثیے خاص کر وہ مرثیے جو حسن بیان، صنائع لفظی و بلاغت کے عمدہ نمونے ہیں نقل ہیں۔ وہ ہر سال بہ زمانہ طالب علمی ان مجالس کی شرکت کے لئے پنڈراول جایا کرتے تھے جہاں راجہ باقر علی خان[2] کے یہاں محرم کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں اور لکھنؤ کے نامی نامی مرثیہ گو آتے تھے۔ خان قلات نے اپنے ولی عہد، سردار یوسف خان کو جو ابھی نو عمر تھے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے ایما سے تعلیم و تربیت کے لئے علی گڑھ بھیج دیا تھا، ابھی چند ہی سال ہوئے تھے کہ اس نوجوان کو مسند نشینی کی تقریب کے لئے وطن واپس جانا پڑا جہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ مخالف پارٹی نے راستہ ہی میں بڑی بے دردی سے قتل کرا دیا۔ میسز بیک کے دل پر جو اس نوجوان سردار کی گارجین تھیں ایسا اثر پڑا کہ انہوں نے انگریزی میں اس کا مرثیہ لکھا۔ وہ خود بھی شاعرہ تھیں اور داؤد مرحوم کی خوش طبعی کی قدر دان، انہوں نے فرمائش کی کہ داؤد اردو میں مرثیہ لکھیں۔ داؤد مرحوم نے فرمائش کی تعمیل میں جو مرثیہ لکھا صاحب خمخانہ جاوید کی رائے میں "مرثیہ یوسف خان سے ان کی غیر معمولی لیاقت معاملہ بندی اور مضمون پسند فکر کا رنگ مترشح ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے" اب یہ مرثیہ سُنئے ؎

خشک اور ویران صحرا میں بلوچستان کے | اک کھلا تھا پھول نازک اور نہایت خوشنما
باغبانِ دہر نے دیکھا نہ ہو گا کوئی پھول | اس سے بہتر پُر فضا اور دلفریب اس کے سوا
گلشنِ عالم میں لاکھوں گل کھلے ہونگے مگر | کم ہوا ہو گا کوئی اس سے زیادہ دلربا
لیکن اس کے واسطے موزوں نہ تھی وہ سرزمیں | وہ گلِ تر ایسے ریگستان کے قابل نہ تھا

---

[1] برعایت روزہ ماہِ رمضان

[2] داؤد مرحوم کے رفیق اور ساتھی قطب الدین صاحب (اٹاوہ) کے جو بعد میں حیدر آباد کے مشہور افسر مال رہے، والد ماجد راجہ باقر علی خان آف پنڈراول کے مصاحب تھے اس لئے داؤد صاحب مرحوم کو مجالس کی شرکت کے لئے وہاں قیام کرنے کی سہولتیں تھیں۔

نامناسب تھی وہاں کی خاک اس کے واسطے / تھا مضر پانی وہاں کا اور مخالف تھی ہوا
کرکے اس پر غور آخر ایک ذی تدبیر نے / وہاں کے خار و خس سے اس گل کو علیحدہ کر لیا
سرزمینِ ہند میں اک باغ دیکھا پُربہار / مختلف اقسام کے پھولوں سے جو معمور تھا
بوئے جنسیت وہاں کے آب و گل میں دیکھ کر / اس گلِ تر خیز کو اس باغ میں لا کر رکھا
اس چمن میں کھل رہے تھے پھول صد ہا رنگ کے / جن کی بھینی خوشبو سے تھا سارا جہاں مہکا ہوا
مہرباں تھا باغباں اور بار آور تھی زمیں / موسم گل جوش پر تھا، راس تھی آب و ہوا
چونکہ واں سامان ایسے ہر طرح پر تھے بہم / رات دن ہوتی گئی اس گل کی شادابی سوا
حسن و خوبی میں ترقی دم بہ دم ہونے لگی / تازگی بڑھتی گئی، ہوتی گئی زائد جِلا
حیف چرخِ کینہ پرور نے ظلم پر باندھی کمر / کر دیا گلشن سے اس کو وقت سے پہلے جدا
رنگ و بو نے اسکی دکھلائے نہ تھے جوہر ابھی / ہونے پائی تھی نہ کامل طور سے نشو و نما
لے گئی قسمت اسے پھر کھینچ کر سوئے وطن / جو کسی پہلو سے اس کے واسطے موزوں نہ تھا
پھر وہی موجِ بلا انگیز تھی چاروں طرف / پھر اسی طوفانِ آفت خیز کا تھا سامنا
لیکن اس گل کو کہاں ان سختیوں کی تاب تھی / ایک ہی جھٹکے میں آخرکار وہ مرجھا گیا
جس چمن میں وہ گلِ رعنا رہا تھا چند روز / آج تک اس کی جدائی کا ہے وہاں ماتم بپا
گل گریباں چاک ہیں اسکے غمِ فرقت میں سب / ڈھونڈھتی پھرتی ہے ہر سو اس کی نکہت کو صبا
ہے یہ مجمل ہی بیاں کافی سمجھنے کے لئے / اس کے کہنے کی ضرورت کیا کہ وہ گل کون تھا
جس کی کل مسند نشینی کی سنی تھی خوش خبر / ہائے قسمت آج سنتے ہیں ہم اس کا مرثیا
لطف جینے کا اٹھایا تھا نہ یوسف نے ابھی / اس کا مرنا ہر طرح بے وقت و بے ہنگام تھا
جسقدر ارمان دل میں تھے وہ دل ہی میں رہ گئے / زیست کا افسوس ہے کچھ بھی نہ حظ حاصل ہوا
رحم آیا اے فلک تجھ کو نہ اس کے حال پر / تو نے کس موتی کو خاک و خون میں غلطاں کیا
کس کو دنیا سے اٹھایا اے خدا نا ترس موت / دل بھرا آتا ہے کہ کس سے جہاں خالی ہوا
کون سے تاریک بادل میں چھپا ہے چاند وہ / دفعتاً آنکھوں کے آگے کیوں اندھیرا چھا گیا
اے گلِ مشکیں نفس کیوں آگئی تجھ پر خزاں / اے خزاں! اس پھول کو پامال کیوں تو نے کیا
تیرے مرنے کا زمانہ تھا نہ یوسف خاں ابھی / کھائی ہوتی کچھ دن تو اور دنیا کی ہوا
باغِ عالم میں نہ دیکھی تھی ابھی تیری بہار / ہائے کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تو مرجھا گیا
داستاں تیری کلیجے کو کیے دیتی ہے پاش پاش / منہ کو آتا ہے کلیجہ واقعہ سن کر ترا
وہ تنِ نازک ترا زخموں سے ہو کر چور چور / بے کفن بے گور خاک و خون میں ہو گا پڑا
جان دی ہو گی نہیں معلوم کس تکلیف سے / کیا اذیت ہو گی جب سینے میں دم ہو گا رکا
تیرے قاتل نے نہ کی بچپن پہ بھی تیرے نظر / جس نے تیرا خون بہایا کون وہ بے درد تھا

چھوڑ کر کالج چلا تھا جبکہ تو سوئے وطن
ہے ہمارے سامنے اب تک سماں اس روز کا

وہ دمِ رخصت ترا رو رو کے ملنا یاد ہے
دل سے جانے کا نہیں اس دن کا وہ جانا ترا

کر رہی تھیں حسرت آلودہ نگاہیں تیری صاف
ہو رہا ہے تو ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا

اپنے واپس آنے کا آنا نہ تھا تجھ کو یقیں
سب تجھے سمجھاتے تھے اور تو مایوس تھا

کچھ دلاسوں کا نہ ہوتا تھا ترے دل پر اثر
بند ہوتا تھا نہ ہرگز آنسوؤں کا سلسلا

اب یہ ثابت ہو گیا تیرا ہی کہنا تھا درست
تھا غلط جو کوئی کہتا تھا کہ تو پھر آئے گا

غیر ممکن ہے کہ تجھ کو بھول جائیں جلد ہم
مدتوں ہوتا رہے گا ذکر کالج میں ترا

جس طرح کھیلوں میں تھا حاصل یدِ طولیٰ تجھے
ویسے ہی علمی ترقی کا بھی تجھ کو شوق تھا

سر برآوردہ رہا اسکول میں تو جس طرح
کرکٹ و فٹ بال میں ویسے ہی تو ممتاز تھا

اب نہ تو ہے اور نہ کالج میں ترا کوئی نشاں
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

داؤد مرحوم کا مجموعۂ کلام زیادہ تر اخلاقی نظموں، مثنوی، قطعات تضمین اور چند غزلیات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد پونے دو ہزار ہے۔ ان کی ایک نظم "سچی دوستی کا امتحان" کو ان کے رفیق خان بہادر مولوی الحاج محمد حبیب اللہ خان صاحب سابق کلکٹر یو۔ پی نے ۱۸۹۴ء میں طبع کرا دیا تھا اور اپنے دیباچہ مرقومہ ۱۴ فروری ۱۸۹۴ء میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ مولانا حالی مرحوم کی نظموں سے اردو شاعری میں طرزِ جدید کی بنیاد پڑی، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"پچھلے پانچ چھ سال سے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں نے اس طرزِ جدید میں طبع آزمائی کی اور چند عمدہ نظمیں پبلک کے سامنے پیش ہوئیں لیکن یہ نظم جس کا نام "سچی دوستی کا امتحان" ہے اور جو ابنذرِ ناظرین کی جاتی ہے ایسے اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دلکش نظم ہے کہ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی نظمیں تو درکنار ان کل نظموں میں جو اس طرزِ جدید میں مولانا حالی کی نظموں کو مستثنیٰ کر کے لکھی گئی ہیں بے مثل اور لاثانی ہے۔ اس نظم کے مصنف ہمارے دوست محمد داؤد صاحب بی۔ اے ہیں جنہوں نے عرصہ تک کالج میں تعلیم پائی ہے اور جو علاوہ کامل استعداد فارسی و عربی کے فنِ شاعری میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو قدرتی طور سے شعر سے خاص مناسبت اور لگاؤ ہے اور یہ رائے ہمارے مدتِ دراز کے ذاتی تجربہ اور واقفیت کے بعد قائم ہوئی ہے۔ ہم پبلک پر اس کا فیصلہ چھوڑتے ہیں وہ اس نظم پر اپنی قطعی رائے قائم کرے لیکن ہم اپنی سمجھ کے مطابق اس امر کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ بہ لحاظ خوبیٔ مضمون، سلاستِ بیان، بیساختگی، طرزِ ادا اور بندشِ الفاظ وغیرہ کے یہ نظم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ جس قصہ کو ہمارے دوست نے نظم کیا ہے وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت پُراثر ہے اور اس لحاظ سے اور نیز سادگی اور سلاستِ زبان کے لحاظ سے یہ نظم اس قابل ہے کہ سرکاری دیسی مدارس کے کورس میں شامل کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ قوم اس دلکش نظم کی پوری قدر کرے گی اور ہمارے دوست مصنف جو اپنے قدرتی انکسارِ طبیعت کی وجہ سے پبلک اسٹیج پر آنے میں تامل کیا کرتے ہیں وقتاً فوقتاً ایسی عمدہ نظموں سے قوم کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے اور اس ذریعہ سے اردو زبان کی روز افزوں ترقی میں مدد دے کر اس کو اپنا ممنونِ احسان کریں گے ——— ۱۴ فروری ۱۸۹۴ء"

اس نظم میں سو سے زیادہ شعر ہیں اور ہر شعر بندشِ الفاظ و بیساختگی طرز ادا میں دوسرے سے بڑھ کر، بخوفِ طوالت یہاں شروع کے پرچند ہی شعر نقل کرتا ہوں ؎

کہہ رہا تھا فخر سے اک شخص یوں بیٹھا ہوا
مجھ سا خوش قسمت بھی دنیا میں نہ ہوگا دوسرا

آج جیسے میرے سچے دوست اور ہمدرد ہیں
ویسے ہی احباب صادق ہر کسی کو دے خدا

ان میں ایک اک دوست ایسا ہے کہ آئے وقت پر
مال تو کیا جان تک کر دے مرے اوپر فدا

ایک قطرہ گر پسینے کا کہیں میرے گرے
سچ سمجھئے اس جگہ دیں گے وہ اپنا خوں بہا

بیوفائی کس کو کہتے ہیں نہیں ان کو خبر
نام سے نا آشنا کے کان ہیں نا آشنا

یار و ہمدرد و جانباز و رفیق و غمگسار
بامروت، بے تکلف، بے ریا و باصفا

ناز ہوا ان پہ مجھے جتنا زیادہ ہے درست
جس قدر ہو فخر مجھ کو ان کے اوپر ہے بجا

دوستوں کے سچے نے میں شاکی الٰہی کون لوگ
کیا شکایت ہوتی ہے دیکھا نہیں تجھے کیا گلا؟

کہتے ہیں دیتے ہیں دھوکہ [illegible] دوست بھی
غالباً یہ جھوٹ ہے ایسا تو کیا ہوگا بھلا

دوست [illegible] آنکھ میں ایسے دوست سے ممکن نہیں
یوں ہی اپنے دل سے لوگوں نے ہے شاید گھڑ لیا

جھوٹے اور سچے بنا لیتے ہیں قصے بیٹھ کر
بعض لوگوں کو انہی باتوں میں آتا ہے مزا!

جیسے خود ہیں ویسا ہی اوروں کو کرتے ہیں قیاس
وہ سمجھتے ہیں کہ ہے سارا زمانہ ایک سا

دوستوں ان کو دیکھ کر مشکل میں جب جانیں جو ہے دوست
[illegible] ہو جانے کا اندھیرا ایسا بھی کیا

اسی نظم میں ایسے بھی شعر ہیں کہ صنعت ایہام کا لاثانی نمونہ کہے جا سکتے ہیں مثلاً ؎

خود غرض احباب سے رکھتے نہیں ہم خود غرض
جو ہیں اپنے کام کے ان سے ہمارا کام کیا

تذکرہ خندہ گل کے [illegible] مولوی عبدالباری [illegible] اس تذکرہ میں ان کے کلام کا انتخاب [illegible] شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہایت قابل ذکی اور ذہین تھے [illegible] اور [illegible] شعر کہتے تھے طبیعت میں چونکہ ظرافت کا مادہ زیادہ تھا اس لئے کہیں کہیں وہ ایک ملکی ظرافت کا رنگ اختیار [illegible] اسی طرح لالہ [illegible] صاحب خمخانۂ جاوید ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مولانا حالی کے اکثر اشعار کی تضمین کی ہے [illegible] ذکی اور ذہین تھے [illegible] ان کی شوخی اور شگفتگی طبیعت داری اور ذکاوت ٹپکتی ہے اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے" مولانا محمد علی جوہر [illegible] نے فرمایا ہے کہ "خمخانۂ جاوید میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور [illegible] کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر [illegible] کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہل ممتنع کا ایک [illegible] اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بعض بچپن کے حافظے نے [illegible] شعر کا اندوختہ مجھے عطا کیا تھا جس کو میں [illegible] سے پڑھتا ہوں ؎

[illegible] اور [illegible] اب [illegible]
[illegible]

البتہ [illegible] صاحب [illegible] اس شعر [illegible] پر [illegible] تعجب ہوا کہ [illegible] اور [illegible] [illegible] جانا [illegible] تھا [illegible]

کی شان میں کہا گیا ہو۔" اب اس غزل کے جس کا ایک شعر مولانا نے اوپر نقل کیا ہے چند اور شعر سُن لیجئے ؎

اس عشق کے طفیل لڑائی رہی سدا تقدیر سے رقیب سے ناصح سے یار سے
انصاف کی ہے بات میں پھر کیا گلہ کروں جب ٹال دے وہ ہاتھ گلے میں پیار سے
رہزن ادھر ادا ہے اُدھر زلف پُرشکن یارب بچائیو مجھے اس لوٹ مار سے
قربان عشق کے کہ ہم آزاد ہو گئے قید حیا سے شرم سے ذلت سے عار سے
میری طرف سے آپ کے دل میں ہے کیوں غبار تقصیر ایسی کیا ہوئی اس خاکسار سے
سُن کر پیامبر سے مرا نامہ یوں کہا وہ ہی نا دُبلے پتلے ضعیف و نزار سے
معلوم ہے مجھے بڑے استاد ہیں جناب یوں دیکھنے میں بھولے سے ہیں پرہیزگار سے
خود مجھ کو تجربہ ہے بس اب کیا بیاں کروں خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

اب دو ایک تضمینیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مولانا حالی کا شعر ہے ؎

آؤ لیں جاکر ہمیں اس کو منا اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

داؤد مرحوم نے اس کو یوں تضمین کیا ؎

اس سے ہم ہیں اور وہ ہم سے خفا گو حقیقت میں اسی کی ہے خطا
خیر اب جانے بھی دیں کیا فائدہ آؤ لیں جاکر ہمیں اس کو منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

شعر حالی ؎

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

تضمین داؤد ؎

ہو رہا ہے رنگ عالم کا عجب دل کو پہنچا ہے عزیزوں سے سدا
کارواں [illegible] پر ملا آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں پر بھائی بہت

شعر حالی ؎

نا خوش کبھی ہوئے ہیں نہ غم ناگوار ہو ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

تضمین داؤد ؎

کیوں نشتر ملال سے سینہ فگار ہو کیوں رنج کے خیال سے چشم اشکبار ہو
صدمہ جو کچھ نیا ہو تو دل بے قرار ہو نا خوش کبھی ہوئے ہیں نہ تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

شعر حالی ؎

اک عمر [illegible] وہ حوصلہ رہا نہیں [illegible]

تضمین داؤد سے

طاقت تو رنج اٹھانے کی ہم میں رہی ہے کب ۔ تاب و توان و ضبط گئے دل کے ساتھ سب
غم جھیلنے کا آپ ہی کچھ پڑ گیا ہے ڈھب ۔ اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اسی بے تکلفی اور سلاست بیانی سے طویل نظمیں لکھ دیتے۔ فتح نواز جنگ کا ریاست حیدرآباد دکن میں آخری عہدہ ہوم سیکرٹری کا تھا۔ انگلستان کے زمانہ قیام میں انہوں نے گرٹروڈ نام کی ایک انگریز عورت سے شادی کر لی تھی۔ حیدرآباد کے قیام میں اس عورت کی بدچلنی کی شہرت ہوئی، سالار جنگ دوئم سے اس کا ناجائز تعلق بتایا گیا، اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ فتح نواز جنگ نے سکندرآباد میں ایک اخبار نویس منزا پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا، یہ مقدمہ بڑا ہنگامہ خیز ہوا۔ اس زمانہ میں داؤد مرحوم کے ایک رفیق اور دوست مولوی مسعود علی بی۔ اے (علیگ) فتح نواز جنگ کے پیش دست تھے۔ ایک پمفلٹ لکھا گیا، داؤد مرحوم نے اس کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ بڑی طویل نظم تھی ایک دو شعر اس کے لکھتا ہوں سے

محرم راز ایں پمفلٹ بہ نوشت ۔ گفت ایں "میم" "نیست" رنڈی "ہست"
چوں رسید ایں بہ گوش فتح نواز ۔ استغاثہ کناں ز جا بر جست

متعدد کتابوں پر منظوم تقریظیں فرمائشاً لکھی ہیں۔ اردو و انگریزی میں بھی مضامین لکھتے۔ اردو مضامین بعض اخبارات میں شائع ہوتے مگر اپنے نام کا کبھی اظہار نہ کرتے۔ پھبتی کہنے میں کبھی نہ چوکتے۔ "نیچری بھانڈ" اور "نیچری سانڈ" کی پھبتی جن پر کسی تھی وہ مدت العمر ان پر چسپاں رہی۔

مجذوب صاحب

محمد رضا انصاری

شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے فرق کی بدولت مجذوب صاحب کے شخصیت نگار پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ان کا سن پیدائش عمر اور سالِ وفات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کرے، جن میں سے ایک چیز بھی بدقسمتی سے میرے علم میں نہیں ہے، سن پیدائش اور عمر کے معاملے میں تو بعض بڑی بڑی شخصیتیں گمنامی کا شکار پائی جاتی ہیں لیکن کسی نمایاں شخصیت کا سالِ وفات نہ معلوم ہونا یقیناً جہالت ہے، اس جہالت کا مجذوب صاحب کے بارے میں مجھے اعتراف ہے

عجیب اتفاق ہے جولائی ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد کی ایک نجی صحبت میں جہاں کل ہند اردو کانگرس کے سلسلے میں حضرت جگر مراد آبادی کے ساتھ گیا ہوا تھا مجذوب صاحب کا ذکر آگیا جن کے بیشتر اشعار مجھے یاد ہیں۔ جگر صاحب نے لقمہ دیا۔ "آپ کوئی دو شعر ان کے سنائیے، دیکھئے آپ کے ذوق کا بھی امتحان ہے اس میں!"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لئے کیا تھا اس لئے کہ رسالہ نیا ادب (لکھنؤ) سے میری وابستگی اور ماہنامہ منزل (لکھنؤ) کی ادارت نے جگر صاحب کو جو "ترقی پسندوں کے ادبی ذوق" سے بدگمان سے رہتے تھے، میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہرحال وہ شعر جو بروقت یاد آگئے میں نے سنائے ؎

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوب مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جام نازک نازنیں ساقی

دیر تک مجذوب صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

خط لکھنا مجذوب صاحب نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا، حال معلوم ہو تو کیسے؟

واپسی پر کچھ دنوں کے بعد ایک دفعہ عمداً مجذوب صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے وطن اُوری ضلع جالون میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی جولائی ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے۔ اس وقت ذہن پر زور دے کر حساب لگایا تھا اور غالباً وہی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوب صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔ تاریخ انتقال مجھ کو یا دوسرے لوگوں کو نہ معلوم ہونے کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ آخر زمانے میں مجذوب صاحب ایسی جگہ قیام پذیر ہو گئے تھے جو خبروں کی رہ گزر سے دور پڑتی تھی لیکن اس کی وجہ بتانا مشکل ضرور ہے کہ مجذوب صاحب کا ایسا شاعر جو شعراء کی درجہ بندی میں حسرت، جگر اور اصغر وغیرہ کے طبقے کا غزل گو تھا، عام طور پر نقادوں اور تذکرہ نویسوں کی نگاہوں سے کیوں پوشیدہ رہا۔

صفِ شعراء میں جب کبھی مجذوب صاحب کو دیکھا اساتذہ کے پہلو بہ پہلو دیکھا اور جب محفل یکتائی، میں انہیں پایا تو آتش بجان معنیٰ پایا۔ جب وہ "نالہ کناں" ہوتے تو اچھے سے اچھے شاعر خاموش سامع بن کر رہ جاتے۔ اس فضا میں جو مجذوب صاحب کی ترنم آواز اور بے چین جذبات سے ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتی۔ بڑے بڑے سخن شناس وارفتہ ہو جاتے یا گم صم اور سب اس دعوے کے مؤید نظر آتے

یہ معانی، یہ حقائق، یہ روانی، یہ اثر

شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے؟

شاعر سب ہی "پیدائشی" ہوتے ہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ مجذوب صاحب "پیدائشی" شاعر تھے لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجذوب صاحب سرتاپا شاعر تھے۔

یہ دعویٰ مجذوب صاحب کے بہت سے جاننے والوں کو محض دعویٰ نظر آئے گا جس کا بظاہر واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک مجذوب صاحب ایک زمانے میں ڈپٹی کلکٹر رہے ہیں پھر اس سے مستعفی ہو کر محکمہ تعلیم (یو۔پی) میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوئے۔ آخر میں انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی، صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید خاص اور خلیفہ بھی۔ شیخ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات و کیفیات کے نگران اور مشیر بھی۔

تو وہ مذہبی بھی تھے صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری حلقوں میں "خان صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انہیں سرتاپا شاعر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں ـــــ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہمہ وقت طاری رہتا تھا۔ اگر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک عجیب قسم کی بے چینی ان کے ہر بُنِ مو سے ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا پوری طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دونوں "صاحبزادگان" فرنگی محل اپنے بلحاظ عمر نہ بلحاظ احترام، مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہنچے۔ ۱۹۴۲ء کے آس پاس کی بات ہے۔ اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف سکولز ہو چکے تھے اور خان صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف سکولز (یو۔پی) کہلاتے تھے۔ مکان یعنی سرکاری بنگلے میں وہ ملے نہیں معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا۔ آخر اس مسجد تک پہنچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھے ایک طرف گردن ڈھلکائے ہوئے اور اسے شانے پر ٹکائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بالکل قریب جا کر سنا تو وہ گنگنا رہے تھے۔

پروانہ ہے، بلبل کا ... انداز نہیں ہے

حال باز ہے مجذوب سخن ... نہیں ہے

کیا مسکنت اور کیسی عاجزی ہوتی ان کی آواز میں! یہی جی چاہتا کہ جس بے نیاز کو وہ اپنی سچائی کا یقین دلا رہے ہیں اس کے سامنے پہنچ کر ہم سب مجذوب صاحب کی صداقت کی فوراً گواہی دیں۔ مگر وہ تو "عالم الستر والشہادۃ" سے مصروف راز و نیاز تھے جس کے سامنے سوگند اور گواہ کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں ایک لفظ "حنین" ہے جس کے معنی کسی کے شوق میں بے قراری کے ہیں۔ مجذوب صاحب ہمہ تن اشتیاق اور سراپا شوق تھے۔ نماز میں ہوں، سرکاری کام میں ہوں، خالی بیٹھے ہوں یا انجمن میں ہوں، ایک ہی لگی رہتی تھی۔ مجذوب نہ تھے "اُستنِ حنانہ" تھے۔ انہوں نے خود کہا تھا ع

غمِ فرقت ... ہوں میں اُستنِ حنانہ ... سے

"اُستنِ حنانہ" مسجد نبوی میں ایک درخت کا تنا تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ فرماتے اور خطبہ دیتے وقت سہارا لیا کرتے تھے۔ پھر مسجد نبوی میں منبر بن گیا اور آپ اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی جدائی درخت کے اس تنے کو بہت شاق گزری اور لوگوں نے اس لکڑی سے "حنین" کی صدائے اشتیاق سنی۔ اسی لئے اس کو "اُستنِ حنانہ" یا "نالہ کناں ستون" کہا جاتا ہے۔

مجذوب صاحب بھی ستون کی طرح دراز قد۔ "اُستنِ حنانہ" کی تشبیہ ان کے ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب جب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہوا یعنی ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان ... ایک سڑک حائل تھی۔ یہ نہیں معلوم اور نہ میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب سے ہمارے پڑوسی تھے لیکن ... میں پہلے پہل ان کا، ان کی شاعری اور ان کی والہانہ زندگی کا ذکر اپنے ایک بزرگ کی زبانی سنا جو ایک دوسرے عزیز سے کر رہے تھے اور میں اپنے ... نحو میر یا صرف اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوا تھا۔

انہوں نے کہا "سڑک پر ایک ... ہجوم دیکھ کر میں اس کی طرف بڑھا تو دیکھتا کیا ہوں کہ مجذوب صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کر کے گا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ہنسے اور بولے "آیئے آیئے آپ حضرات اہل علم ہیں۔" میں قریب چلا گیا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کبھی اس غزل کے اور کبھی اس غزل کے اشعار ملا جلا کر بے ترتیب سناتے رہے۔"

عجیب و غریب "تعارف" تھا یہ! شوق پیدا ہوا۔ آدمی عجیب ہے! یہاں ہدایت دی گئی تھی کہ اکیلے سڑک پر نہ جاؤ، کسی سے ... بات نہ کرو، بے پروائی سے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو وغیرہ وغیرہ۔ بڑا زبردست نقشہ تھا ہماری معاشرت کا اور اس شاعر کے طور طریق ہیں۔ ایک ولولہ اٹھا ایسے آدمی سے ملنے کا، اس کی شاعری کے شوق میں نہیں، ۱۲/۱۳ برس کی عمر اور نحو میر کی استعداد رکھنے کے بعد شاعری کی سوجھ بوجھ ہو سکتی ہے! اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی گدگدی ضرور ہوئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو وہ آئیں گے اور ... نشست ہوگی تو ہم خوش ہو گئے۔

گرمی کا موسم تھا، مجذوب صاحب آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کو آ گئے، ہم سبق یاد کرنے اور ... دیکھنے کے بعد ہی اجازت ملی ... پھر کر مجذوب صاحب کو دیکھنے پہنچ گئے۔

دیکھا کیا، گورا چٹا، لمبی سفید داڑھی والا آدمی، سر پر ... والی چوگوشیہ ٹوپی، پاؤں ... کالا انگرکھا جس میں داہنے سینے پر ... گھڑی اور قلم وغیرہ رکھنے والی جیب جو لکھنؤ کے خوش پوشاکوں کے ذوق پر ہمیشہ بار رہی، آستینوں اور دامن پر ... لگی ہوئی، تخت پر بیٹھے دونوں ہاتھ اٹھائے داہنے بائیں جھوم جھوم کر ایسے انداز میں شعر پڑھ رہا ہے کہ شاعر کے ساتھ سامعین بھی جھومے رہتے ہیں یا کبھی کبھی چیخ پڑتے ہیں۔ ہوں گے سب ملا کر ۱۵، ۱۶ سننے والے جن میں زیادہ تعداد علمائے فرنگی محل کی تھی۔ چھوٹی پود سب سے پیچھے ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں پنسل کاغذ لے کر گیا تھا اشعار نوٹ کرنے، یہی سوچا کہ جس شعر کی زیادہ تعریف ہو اس کو لکھ لو۔ — مگر ایک شعر بھی ایسا نہیں سنا جس پر اہل علم سامعین نے جی کھول کر تعریف نہ ...

نہ کی ہو، کم از کم رسمی تعریف اور واقعی تعریف کا فرق میں اس وقت بھی سمجھ سکتا تھا۔
مجذوب صاحب پڑھ رہے تھے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آ جا! اب تو خلوت ہو گئی
دل میں داغوں کی یہ کثرت ہو گئی — رونما اک شانِ وحدت ہو گئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہو گئی — آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی!
سوگ میں یہ کس کی شرکت ہو گئی — بزمِ ماتم بزمِ عشرت ہو گئی
پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر — بات اتنی سی قیامت ہو گئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا — بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں — مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب — جب کہ غم کھانے کی عادت ہو گئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ — شکر کر مٹی سوارت ہو گئی

کر چکے رندی بس اے مجذوب تم
ایک چلہ میں یہ حالت ہو گئی

یہ تو ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب مجذوب صاحب خود سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے منکر کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی، ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے۔

ذرا اے ناصحِ فرزانہ اپنی کر تو دو باتیں
نہ ہوگا پھر بھی تو مجذوب کا دیوانہ دیکھیں گا

مجذوب صاحب کے پڑھنے کا بالکل نرالا انداز تھا، ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوز کے تذکرے میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

"انہوں نے (میر سوز نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دوچند ہو جاتا تھا، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں؟ آواز دردناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی مدد لیتے تھے مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے سے اوٹ وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے۔"

آگے چل کر میر سوز کے بارے میں آزاد نے جو بات لکھی ہے وہ وہ ہے جو مجذوب صاحب کے بارے میں میرے دل میں تھی مگر مجھے اس مفہوم کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے تھے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"تم خود خیال کرو کہ دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔"

مجذوبؔ صاحب کے اشعار ”حرکات و انداز“ کے کہاں تک طالب ہیں؟ ممکن ہے یہ بحث طلب مسئلہ ہو لیکن ان کے حرکات و انداز سے شعر کا اثر یقیناً دوچند ہو جاتا تھا، یہ تجربے کی بات ہے۔

ایک دفعہ حضرت جگر مراد آبادی نے مجذوبؔ صاحب کے ایک مجموعۂ کلام کے بارے میں بالکل یہی بات مجھ سے کہی۔ انہوں نے مجذوبؔ صاحب کو مولانا مجذوبؔ کہہ کر یاد کیا اور کہا ”دیکھئے ان کا یہ مجموعۂ کلام کیسا بے جان نظر آ رہا ہے، اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے اشعار میں مولانا کے حرکات اور ان کی بے چینی کو جب تک شامل نہ کیا جائے صحیح معنوں میں ان سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔“

اشعار سنانے میں مجذوبؔ صاحب کو میں نے بیہوش ہوتے یا غش کھاتے تو نہیں دیکھا جس طرح بقول مولانا آزاد میر سوز نے ایک خاص موقعہ پر عجیب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے | سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو | ارے رے رے ارے رے رے رے رے رے

یہ قطعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا ہے اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھا کر بیہوش ہو گئے۔

لیکن مجذوبؔ صاحب کے حرکات و سکنات تھے کچھ اسی طرح کے۔ غزل سنا رہے تھے ”کہیں ہوتی“ ”نہیں ہوتی“ جب یہ شعر پڑھا ؎

ہٹاتے ہم نشیں ہر چند لیکن چشمِ گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی یہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشمِ گریاں پر رکھ لی، پھر گویا ہم نشیں نے ہاتھ ہٹا دیا تو بائیں آستیں اس کی جگہ رکھ لی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا ؎

ہنس بھی دو ہنس بھی دو ہاں ہاں چلو بس رو چکے
اب ہنسے اب ہنسے دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

”دیکھو وہ ہنسی آئی ہے“ جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آ کے ہی۔

انہوں نے جب یہ سنایا ؎

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تختِ سلیماں تھا

تو اپنی نشست پر اس طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے واقعی تختِ سلیماں پر بیٹھے ہیں۔

یا جب یہ شعر پڑھا ؎

اٹھاؤں گا نہ زانو سے میں ہرگز اپنا سر ہمدم
ارے میں اپنی آنکھوں سے انہیں جاتا نہ دیکھوں گا

تو اس قدر جھک گئے کہ واقعی سر بہ زانو نظر آنے لگے۔

مجذوب صاحب کی یہ پہلی نشست تھی ہمارے یہاں۔ میں سامع سے زیادہ منشی، بن کر اس میں شریک ہوا تھا۔ وہ خود ہر شعر دو تین بار پڑھتے تھے اور بیشتر اشعار ان سے بار بار پڑھوائے جاتے۔ مجھے نقل کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی، ۸ بجے رات سے مجذوبؔ صاحب نے سنانا شروع

کیا تھا، نہ وہ سنانے سے تھکتے اور نہ سننے والے سننے سے۔ فجر کی نماز کے وقت بادلِ ناخواستہ محفل برخاست ہوتی اور سننے والے ایک تشنگی لے کر اٹھتے۔

محفل برخاست ہونے کا مطلب پڑھنے والے جو سمجھے وہ یقیناً صحیح نہیں ہے، مجذوبؔ کی محفل نرالی شان سے برخاست ہوتی تھی مثلاً فجر کی اذان ہوئی، سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ نماز کی تیاری کریں، مجذوبؔ صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے مگر گنگناتے اور شعر سناتے، جوتا پہن رہے ہیں اور شعر سنا رہے ہیں، گھر سے نکل رہے ہیں اور گھوم گھوم کر شعر سنا رہے ہیں، کچھ بڑے اور باقی لڑکے ان کی مشایعت کو تھوڑی دور گئے مجذوبؔ صاحب شعر سناتے چلے جا رہے ہیں اور اگر زوروں پر ہیں تو راستے میں کھڑے ہو جائیں گے اور سناتے رہیں گے، مشایعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہنچا دیں گے، جب تک گھر کا دروازہ کھلے مجذوبؔ صاحب سنائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے "استغفر اللہ" کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے پر چڑھ جائیں گے۔ اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی، ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ۔ یہ بھی ہوا ہے کہ مجذوبؔ صاحب کو سکون نہیں ہوا۔ بے چینی اور اضطراب کا عالم طاری ہے، دیکھا نمازِ فجر کے بعد پھر گنگناتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ان کی صدا پر یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آ رہے ہیں۔ بقول مجذوبؔ صاحب کے ؎

آ رہے ہیں ہر طرف سے طالبانِ دردِ دل !
یہ مری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل ؟

یہ تو آٹھ نو گھنٹے کی نشست تھی ایک دفعہ لگاتار ۴۸ گھنٹوں کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے چائے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی۔

۴۸ گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحید الدین صاحب کے یہاں ستر کھ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی اور سب لوگ لکھنؤ سے لدپھند کر وہاں پہنچے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا یہ حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ سونے کی فکر بس ایک "بڈھا" گا رہا ہے اور سب میاں لوگ جھوم رہے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک سا" تو خیر رہے رتھا ہی۔ اس کے ساتھ یہ سب میاں لوگ کا ہے (کیوں) سڑی ہو گئے ؟"

مجذوبؔ صاحب چاہے ایک گھنٹہ سنائیں یا ۴۸ گھنٹے سب کچھ زبانی سنایا کرتے تھے، ان کو سارا کلام حفظ تھا، نہ بیاض کا جھگڑا نہ نوٹ بک کی قید، یہ بات پہلے پہل میں نے مجذوبؔ صاحب ہی میں دیکھی اس کے بعد جگرؔ صاحب کو دیکھا کہ وہ جو کچھ سناتے ہیں زبانی سناتے ہیں خواہ کتنی پرانی غزل ہو۔

مجذوبؔ صاحب کبھی ایک دفعہ میں کوئی غزل پوری نہ سنا سکے، ایک غزل سناتے سناتے کوئی اور شعر کسی وجہ سے یاد آ گیا وہ سنایا اور اسی غزل پر چل نکلے۔ بیچ میں یاد آ گیا یا کسی نے یاد دلا دیا کہ فلاں غزل ہو رہی تھی، فوراً چونکے اور سابقہ غزل کی طرف پلٹ گئے۔ یہ سب ان سے اضطراراً ہوتا تھا۔

غزل ہو رہی تھی ؎

یہ نالہ کناں کون ؟ بآوازِ حزیں ہے
دیکھو کہیں مجذوبؔ غزل خواں تو نہیں ہے

اس اثناء میں چائے آ گئی چھوٹے چھوٹے چینی فنجانوں میں۔ مجذوبؔ صاحب بے قرار ہو گئے، غزل چھوڑ چھاڑ گنگنانے لگے اور یہ شعر انہوں نے

پڑھا وہ دوسری غزل کا مطلع تھا اور بے پناہ مطلع ؎

آ گئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے
غم مرا اور بڑھا عیش کے سامانوں سے

پھر اسی غزل پر چل دیئے ؎

اجنبیت نہیں دل کو ترے بیگانوں سے — کچھ وہ گھل مل گئے ایسے مرے ارمانوں سے
یا تو ہم کو بھی اجازت ہو نہیں بہرِ کرم — اس تصور کو بھی رکوا دیجئے دربانوں سے
شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی — آج تو لاد دیا آپ نے احسانوں سے

کس قدر ہوش ربا ہوتا ہے پُر درد کلام
پوچھیئے گفتۂ مجذوبؔ کے دیوانوں سے

ابھی گفتۂ مجذوبؔ کے دیوانے ہوش ربائی کی کارفرمائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوبؔ صاحب پہلی غزل کی طرف لوٹ گئے اور ایک نیا مطلع سنایا ؎

اک عمر سے الجھن میں مری جانِ حزیں ہے
یہ بھی ہے کوئی بات کہ "ہاں" ہے نہ "نہیں" ہے

اسی غزل میں انہوں نے کہا تھا ؎

اف! کشش حُسن میں کیسی مری آنکھیں
کھب جاتا ہے نظروں میں ذرا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوبؔ صاحب حُسن کے دیوانے تھے، انسانوں سے لے کر فن پاروں تک جہاں بھی انہیں حُسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوبؔ صاحب کی سحری کے لئے آم لائے گئے عشاء کے بعد سے تین بجے رات تک وہ مولانا قطب میاں صاحب (مرحوم) کے یہاں سناتے رہے تھے دوسرے دن مجذوبؔ صاحب کو روزہ رکھنا تھا گھر جا کر سحری کرتے! قطب میاں صاحب مرحوم نے اپنے یہاں انتظام کیا کہ تھوڑی دیر اور مجذوبؔ صاحب کا سنانا جاری رہے بمشکل۔ آدھی رات پر مجذوبؔ صاحب رضامند ہوئے تھوڑے سے آم بھی تھے، تر و تازہ، خوش رنگ اور رسڈول، بس مجذوبؔ صاحب بے چین ہو گئے اور جب آم پر چاقو چلا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

اسی وقت انہوں نے برملا حُسن پرستی کے "جرم" کا اقرار کیا۔ کہنے لگے "میری چار پانچ مہینے کی ایک پوتی ہے گوری گوری خوبصورت نرم نرم ہاتھ پاؤں، اس کو گود میں لے کر ایک دفعہ عجیب خواہش ہوئی یعنی اس کے پلپلے بدن کو منہ میں لے کر دانتوں سے خوب چباؤں۔"

انسانی بدن کو دانتوں سے چبانے کا تصور ہے بہت کریہہ، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وفورِ رغبت کے اظہار میں "لب و دنداں" کی سرگرمیوں کا کتنا دخل ہوا کرتا ہے۔

مجذوبؔ نے سب سے تو نفسیات، جنسیات، اشارات کنایات کسی کا بھی سہارا لئے بغیر یہ بات محسوس کی کہہ دی مگر اس طرح انہوں نے اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیا۔ ایسی شخصیت کے لئے ایک ہی جامع لفظ ہے یعنی "حُسن پرست" وہ بلا کے حُسن پرست تھے مگر غضب کے محتاط کہتے ہیں ؎

حُسن پسند پاک ہوں فاسق بیحیا نہیں — دید جمال کے سوا کچھ مرا مدعا نہیں

حُسن والوں سے وہ دور رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے مگر حُسن کی بے حجابیاں انہیں سچ مچ پریشان رکھتی تھیں۔ نہ معلوم کتنی بار انہوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے ؎

بُرے پھنسے ہیں یہ غارت گرِ دنیا و دیں مجھ کو — نہ رکھیں گے نہ رکھیں گے کہیں کا یہ حسیں مجھ کو
جہاں گردن اٹھی آیا نظر کوئی حسیں مجھ کو — بس اب ہر دم نگہ رکھنا ہے پیوندِ زمیں مجھ کو
یہ بُت کرنے کو ہیں اب اے خدا! مرتد و دیں مجھ کو — اٹھا لے آسماں مجھ کو، نگل جا لے زمیں مجھ کو

یا ؎

پڑے اُف نہ کمسن حسینوں سے پالا — وہ معصوم نظریں وہ منہ بھولا بھالا
دہائی ہے دردِ محبت! دہائی! — ارے مار ڈالا! ارے مار ڈالا

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

آتا ہے نظر حُسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم — کیا پھوڑ لیں اب آنکھیں ہی اے حُسنِ نظر ہم
اف پڑ ہی گئی اک بتِ کافر پہ نگہ آج — رکھتے تھے اسی ڈر سے تو نیچی ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھ لیا "یہ کون بتِ کافر" ہے۔ فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ؎

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش رُبا تھا — رکھتے نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ لیا ہے — اب حور بھی آ جائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما تھے۔ سنہ ۳۲ء یا ۳۳ء کی بات ہے۔ مولانا کی غیرتِ دینی معمولی بھول چوک، بھی بغیر گرفت کے نہیں رہ پاتی تھی۔ وہ جن مرحلوں سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جائے، ہم فرنگی محلیوں کا مسلک یہ کہ سماع، عرس اور زیارتِ قبور کے لئے شدِ رحال وغیرہ بھی ممنوع نہیں۔ غرض مولانا عنایت اللہ صاحب (فرنگی محلی)، اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے مضمرات پر نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے جب کہا "اب حور بھی آ جائے تو ڈالیں نہ نظر ہم" مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے کچھ کہا، مولانا عبدالماجد صاحب نے جواب میں فرمایا "بے شک، اس میں اللہ کی ایک بڑی نعمت کا استخفاف تو پایا ہی جاتا ہے۔" استخفاف کے لفظ نے جو میرے کانوں کے لئے نیا نیا تھا مولانا کا پورا جملہ ذہن نشین کر دیا۔

مجذوب صاحب خود راوی تھے کہ وہ اپنی موٹر پر جا رہے تھے حسبِ عادت متوسط رفتار سے خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے، پیچھے سے زور زور سے "پوں پوں" ہوا اور ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے داہنے سے نکل گئی، تیز رفتار موٹر کی چلانے والی ایک فیشن ایبل خاتون تھیں اور شاید انہوں نے دنیا نوسی صورت والے مجذوب کو ڈرائیور سمجھ کر، در پردہ سائڈ دینے پر چلتے چلتے آنکھیں بھی نکالیں، بس مجذوب صاحب اس ادا میں گم ہو گئے اور فرمایا ؎

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

وکٹوریہ اسٹریٹ جس پر مجذوب صاحب کا ۳۰-۳۲ء میں قیام تھا وہی سڑک ہے جو مزار حضرت مخدوم شاہ مینا کو علاقہ چوک سے ملاتی ہے، مزار شریف پر ہر مہینے دھوم دھام کی نوچندی اس وقت بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے، نوچندی کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں چوک

اور سڑک کی "مہ بالانشینان" کافی تعداد میں شریک ہوا کرتی ہیں۔ ہر جمعرات کو عام طور پر اور نوچندی جمعرات کو خاص کر ہر شام ہی یہ "شاہد اودھ" کی زیارت آب و تاب اور تمام جمال کے ساتھ اس سڑک سے مزار شریف کی سمت جاتی نظر آ جاتی ہے، مجذوب صاحب نے اسی غزل میں ایک شعر ایسے ہی ایک موقع کے لئے کہا تھا ؎

ہم بھی ہیں سرِ راہ کھڑے آج حسینو!
بن ٹھن کے نہ نکلو کہ لگا دیں گے نظر ہم

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی چلبلی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں، اسی غزل کا ایک مطلع ہے ؎

جانے تو تمہیں دیں گے نہ اب تا بہ سحر ہم — شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم
پیری میں حسینوں سے لڑائیں تو نظر کیا! — دزدیدہ مگر ڈال ہی لیتے ہیں نظر ہم

یہ شوخی ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی جس کی لگام مجذوب صاحب خود بھی کسے رہتے تھے اور جب منہ زوری زیادہ کرنے لگتی تھی تو خود اپنے مرشد (مولانا تھانویؒ) کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے مناسب ہدایتیں آ جاتی تھیں جن پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے، وہ زمانہ ان کے لئے سخت مصیبت اور کشاکشی کا ہوتا تھا۔ مرشد کی ایک ہدایت کا علم تو دوسروں کو بھی ہو جاتا تھا، یعنی ان کو "شعر خوانی" کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ دوسروں کے لئے بھی یہ ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا علم، یہاں دل پر چھریاں سی چل رہی ہیں"

ایک دفعہ یہی "توبہ" کا زمانہ چل رہا تھا، سب لوگ سنانے کا تقاضا کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے جلیل کا شعر پڑھ دیا ؎

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے۔ توبہ ٹوٹنے لگی مگر انہوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دئے۔ یہ صبح کی بات تھی شام کو جو آئے تو جھومتے اور رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ ؎

زاہدوں پر مے اچھالی جائے گی — جان ان مُردوں میں ڈالی جائے گی
شیخ پینے کا ارادہ تو کرے — حوضِ کوثر سے منگا لی جائے گی
اور تو نکلیں ہی گے غم سے کام — اس میں توبہ بھی چھپا لی جائے گی

۴۰-۵۰ اشعار اس غزل کے شام تک ہو گئے تھے اور اس انداز سے انہوں نے سنائے جیسے کہیں سے سچ مچ پڑا کر بھاگے ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذوب صاحب عام شاعروں کی طرح شعر گوئی میں "ریاض" کرنے کی زحمت میں کبھی نہیں پھنسے، ایک اُبال کی طرح ان کے جذبات اُبلتے اور موزوں قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی جذبات کا دھارا اتنا تیز ہوتا کہ ایک زمین میں ڈیڑھ سو دو سو شعر تک کہہ ڈالتے تھے اور بلا انتخاب سنانے چلے جاتے تھے۔ کم از کم تین غزلیں تو مجھے یاد ہیں جو ڈیڑھ سو دو سو اشعار کی ہیں، ایک میں ۵۳ مطلع ہیں اور دو غزلوں میں بھی بیس سے اوپر مطلع کہے ہیں۔

۵۳ مطلعوں والی غزل کا پہلا مطلع ؎

اب بھی مجذوب ہو کچھ سر میں ہوا آئی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے؟

اتنا کہنے والا اور اس قدر بدمستی کے ساتھ سنانے والا مجذوب عام محفلوں سے اور خصوصاً ان تقریبوں سے جو اس کے اعزاز میں کی جائیں دور بھاگا کرتا تھا، اپنا اعزاز وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے کہتے تھے ؎

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

سرکاری اعزاز کا جو "خان صاحب" کے خطاب کی شکل میں ملا تھا خود انہوں نے مذاق اڑایا ؎

ہوئے خواجہ صاحب سے ہم خان صاحب — بڑھی ناک عزت گھٹی شان صاحب

ایک خان بہادر دوست کو خطاب ملنے پر لکھ بھیجا ؎

کیا شان دکھلاتے ہو اے خان بہادر — تم خان بہادر رہو ہم ایمان بہادر
شاباش ہے شاباش تجھے اے خان بہادر — دنیا پہ کیا دین کو قربان بہادر

محفلوں سے گریز کی ایک وجہ تو ان کی بے قید و بند طبیعت تھی دوسری وجہ ایک واقعہ کے بعد ظاہر ہوئی یعنی دوسروں کے ہاں کا کھانا کھانا وہ اس احتیاط کے پیش نظر جو اکل حلال کے پابندوں کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے مجذوب صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجذوب صاحب اودھ کے ایک مسلمان تعلقدار کے یہاں زبردستی پہنچا دئے گئے جہاں انہوں نے مجبوراً کھانا بھی کھایا۔ رات بھر کی شعر خوانی کے بعد جب وہ واپس ہونے تو ایک صاحب سے انہوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں کوئی ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہے؟ انہیں اطمینان دلا دیا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے ہیں، جزئیات تک مجذوب صاحب نے پوچھ ڈالے اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو مجذوب صاحب نے سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کے غسل خانے میں استفراغ کیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہ سکا تب وہ کان ہو کر بستر پر پڑ گئے۔ اس تکان کا علاج دوسرے دن کو بھی ہوا اور بڑی دیر میں تکان کا راز کھل پایا

[illegible] انہوں نے کسی [illegible] پاس کرنے کے بعد [illegible] ان کو ڈپٹی کلکٹری کی [illegible] اس کے بعد [illegible] داخل کر دیا گیا [illegible] اس لئے کہ اس ملازمت [illegible] میں [illegible]

[illegible] سے آدھی بھی مگر وہ راستہ اور مطمئن تھے

آخر میں [illegible] ایک [illegible] کہتے اور ایک [illegible] کیا کرتے تھے ؎

[illegible] — اور اس دنیا [illegible] کار ہے
اس یہاں کی نعمتیں بھی [illegible] عطا — اے خدا تیری بڑی [illegible] کار ہے

---

(۲)

جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

(غالب)

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

اثر لکھنوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے۔ ڈی لٹ۔ ایل ایل بی چشم بد دور بلا کے ذہین ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں ہمیشہ اوّل آیا کئے۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انہیں اردو کا مسیحا اور اسی کے ساتھ اردو کا عاشق شیدا کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اُنہوں نے انگریزی میں تاریخ ادب اُردو لکھ کر اُردو کو صرف ہندوستان بھر سے نہیں بلکہ غیر ممالک سے روشناس کرایا۔ اُردو محض بولی ٹھولی سمجھی جاتی تھی اُس کو زبان، بھرپور زبان، انواع و اقسام کے جواہر سے مالا مال زبان تسلیم کرایا۔ مطالعہ کا شوق اس حد پر ہے کہ اُن کے گھر میں ہر طرف اُردو زبان کی کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ غسل خانہ میں بھی کتابوں کی ایک الماری ہوتی ہے شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

شوق کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم دونوں کا تقرر کانپور میں تھا (۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے) مجھے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ اُنہوں نے بھی چلنے کا وعدہ کیا مگر عین وقت پر کسی ضروری منصبی کام نے روک لیا۔ ایک یا دو بجے رات کو دیکھتا کیا ہوں کہ رام بابو صاحب مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مال گاڑی میں سفر کیا۔ جاڑے کا جاڑا، رات بھر کا جاگنا (اُس زمانے کے مشاعرے پو پھٹتے ختم ہوتے تھے اور واپسی کے وقت یہ اندازہ دشوار ہو جاتا تھا کہ ہم چل رہے ہیں یا زمین چل رہی ہے) یہ تمام زحمتیں گوارا کر کے مشاعرے میں بحیثیت سامع شریک ہونا —— کیا جسے اُردو سے عشق نہ ہو اتنی زحمت برداشت کرنا گوارا کر سکتا ہے؟

اُن کی اُردو دوستی کا مزید ثبوت وہ پیغام ہے جو انہوں نے حال ہی میں راجستھان اُردو کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر بھیجا تھا اُس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"اُردو کی راہ میں جو دشواریاں اور خطرے ہیں اُن سے اُردو کے بہی خواہوں کو بد دل نہ ہونا چاہئے بلکہ اُن سے مہمیز کا کام لینا چاہئے اور اپنے مساعی میں زیادہ مستعدی و انہماک دکھانا چاہئے۔

اُردو کو ہندی سے دشمنی یا رقابت نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اگر اُسے عالم گیر ہونا ہے

تو یہ صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ اُردو اُس کی مدد کرے اور شریک کار ہو۔

اُردو کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ محلوں کی پیداوار نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ عام لوگوں نے اسے پالا پوسا ہے اور دونوں قوموں نے مل کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ اُردو اسی ملک کی پیداوار ہے باہر سے اس کی کھیپ نہیں آئی۔

لیکن بدلتے ہوئے حالات میں اسے اپنی بقا کے لئے نئے نئے خیالات کو اپنے میں جذب کرنا اور اُن کا ساتھ دینا چاہئے۔ خود اپنی بے پایاں طاقت پر بھروسا کرنا چاہئے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستانی روایات ہیں۔ اسے عام لوگوں سے علٰحدگی اختیار نہ کرنا چاہئے بلکہ اُن سے قریب تر ہونا چاہئے۔ ایسی میٹھی، سُریلی، لچکیلی اور کس بل رکھنے والی زبان کو متروک یا تہس نہس نہ ہونا چاہئے۔

اُردو کا ادب سُریلا ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ اس کا خزانہ بھرا پڑا ہے جس میں موتی، یاقوت، ہیرا، زمرد اور نہ معلوم کتنے رنگوں کے جواہر ہیں۔ ان کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا۔"

ہندوستان ایک برصغیر ہے اور کافی وسیع ہے جس میں نصف درجن یا اس سے بھی زیادہ زبانوں کے لئے گنجائش ہے۔ ایک زبان کی ترقی کا یہ مقصد نہیں کہ دوسری زبانوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میل ملاپ میں رنگا رنگی ہونا چاہئے۔ اسی طرح حسن اور حسن میں چمکا جو پیدا ہوتی ہے"

اُنہوں نے ایک ضخیم کتاب میں یوروپین اور اینگلو انڈین شاعروں کا کلام مع حالات جمع کر دیا ہے جہاں جہاں رہے اعلے پیمانے پر مشاعرے کئے چنانچہ بلند شہر کے ایک مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا تھا۔

قدما کے قلمی نسخوں اور تصاویر کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا ہے۔ وہ ہمیشہ اُردو کے متعلق کچھ سوچا یا لکھا کرتے ہیں۔ شعر کے حسن و قبح پر تو اُن کی نظر ایسی پڑتی ہے کہ بایدو شاید۔ اُردو نہایت صحیح و فصیح بولتے ہیں مگر تحریر میں بجائے اُردو کے انگریزی استعمال کرتے ہیں وہ اس لئے کہ افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے۔

لگ بھگ پچاس سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اکثر ملتے رہے ہیں۔ کبھی وہ میرے یہاں آئے کبھی میں اُن کے پاس گیا۔ انسان کی حیثیت سے بھی اُن کا مثل نہیں۔ شرافت کا پتلا، اخلاق مجسم۔ اس قابلیت اور ہر طرح کے دنیوی عروج کے باوصف رام بابو کو غرور چھو بھی نہیں گیا ہر شخص کے ساتھ خلق سے پیش آنا اور ملنے والے کی بھلائی کی فکر میں لگا رہنا۔ میں نے اُنہیں آج تک کسی کی برائی کرتے نہیں سنا اگر کسی نے اُن کے ساتھ بُرائی بھی کی تو خاموش ہو رہے کبھی انتقام لینے کا خیال بھی نہ گزرا کبھی حرف شکایت زبان پر آیا۔ اُن پر کئی کٹھن وقت پڑے مگر ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور کیا مجال جو تیور بھی میلے ہوئے ہوں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو کہ اُن کا کیریکٹر بنانے میں اُردو کو کتنا دخل ہے۔

مجھے ناز ہے کہ رام بابو ایسا شخص مجھے دوست نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ میں بھی اُن سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں دل ہی دل میں اس محبت کے مزے لوٹا کرتے ہیں اور جب مل جاتے ہیں تو دونوں کی عید ہو جاتی ہے۔

اُن کی کتابیں جو ابھی زیر تصنیف یا پریس میں ہیں اُن کی اشاعت سے اُردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔ منتخب فہرست درج ذیل ہے:۔

(ا) اُردو ادب جدید (دو جلدیں) (ب) اشارت و روایت (ج) اُردو شعرا کا مرقع مع پیش لفظ (د) مثنویات میر و خط میر۔ (س) اُردو اور فارسی کے شاعروں کا کلام بزبان ہندی (ص) اُردو ادب پر وہ مضامین جو پی ای ان میں شائع ہوئے (ض) اُردو شعرا کی تقسیم انگریزی میں ملک

یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو اُن کی تاریخ ادب اُردو انگریزی جس کا ترجمہ اُردو اور دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے اُن کو زندگی جاوید بخشنے کیلئے کافی ہے۔

میں بیمار ہوں اور زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ جیسا کچھ اور جتنا کچھ لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا جس کا افسوس ہے۔

جگ جگ جیو رام بابو۔ تمہارا بول بالا رہے۔

جوش ملسیانی

پنڈت ہری چند اختر

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ کپور تھلے کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ لاہور اور دیگر مقامات سے کئی نامور شاعر آئے تھے۔ صدارت کے لئے شیخ سر عبدالقادر مرحوم سے درخواست کی گئی تھی۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا "جوش صاحب آ گئے" مشاعرے کے مہتمم مولوی ظفر حسین صاحب اشک نے بتایا کہ جوش صاحب نے کسی اور مصروفیت کے باعث معذوری کا اظہار کیا ہے۔ شیخ صاحب نے فرمایا "حیرت ہے کہ یہاں جوش ملسیانی کے بغیر بھی کوئی مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا استاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اس کو نہیں بلا سکے" اشک ایسا موقع شناس بھلا اس صورت حال سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔ فوراً تجویز پیش کر دی کہ اجازت ہو تو آپ کی طرف سے پیغام بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ایک خاص ایلچی موٹر کار میں روانہ ہو گیا۔

اس وقت جو شعراء شریک محفل تھے ان میں سے کئی ایک کو اپنے علم و کمال اور مقبولیت و شہرت کی بنا پر استادی کا درجہ حاصل تھا اور دو چار حضرات ایسے بھی تھے جن کی "حفظِ عزّت" کی فکر نازک مزاجی کی مناسب حدود سے تجاوز کر چکی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ سر عبدالقادر کی طرف سے جوش صاحب کی اتنی "شدید تعریف" اور خلوص بھرے اشتیاق پر کسی ایک پیشانی پر بھی بل نہیں آیا۔ اور پھر جب مشاعرہ کے اختتام کے قریب جناب جوش تشریف لائے تو ان سب کے چہروں سے حقیقی مسرّت کا اظہار ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش کو نہیں دیکھا تھا انہیں کچھ دیر کے لئے مزید حیرت ہوئی ہو گی۔ درمیانے قد کا ایک سیدھا سادہ ادھیڑ آدمی۔ معمولی کپڑے کی پگڑی قمیض اور دھوتی، دیسی جوتا، لباس کی وضع قطع خالص دیہاتی، شاعرانہ بناؤ نہ استادانہ تمکنت، کوئی نقیب نہ حاشیہ بردار سراپا خلوص و انکسار انداز میں دیہاتیوں کی سی اخلاص بھری سادگی اور بے تکلفی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا متانت آمیز تبسم صورت شکل اور لباس کو دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش عامی کہہ سکیں۔ ہر شخص یوں ملتا ہے جیسے خود اسے بھی اپنے مرتبے کا علم یا احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں ناواقف لوگوں کو اس اشتیاق اور تعریف و توصیف کا جواز کہاں نظر آ سکتا تھا۔ جس کا اظہار سر عبدالقادر

نے فرمایا تھا۔

لیکن انہیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مشاعرہ قریب الاختتام تھا۔ دو چار شاعر باقی رہ گئے تھے وہ پڑھ چکے تو جوش صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ مشاعرہ مسلّم الثبوت اساتذہ اور مشہور و مقبول شعرا کی تعداد کے علاوہ کلام کی بلندی اور عمدگی کے اعتبار سے بھی ایک معیاری اجتماع تھا۔ ایک ہی محفل میں اس پایہ کا اتنا کلام آج کل تو کجا ان دنوں بھی بہت کم سننے میں آتا تھا۔ پس اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب جوش صاحب شعر پڑھنے کے لئے اٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سامعین نہ صرف داد و توصیف کے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر چکے ہیں بلکہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگاتے لگاتے خود بھی شل ہو گئے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ آنے والے شاعر کی وضع قطع بھی کچھ توقع خیز نہ تھی لیکن آپ نے ایک رباعی ہی پڑھی تھی کہ سب دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور غزل شروع ہونے تک تو مشاعرے میں گویا ایک نئی روح ایک نیا جوش اور اس کے ساتھ ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اب وہ سیدھا سادہ مسکین صورت اور منکسر المزاج شاعر مملکتِ سخن کا پُرجلال و صاحب سطوت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ دیہاتی سادگی کا مغنی ساحجسمہ نیستان شعر میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ ایک قصباتی اسکول کا مدرّس پروازِ تخیّل اور کمالِ فن کے وہ کرشمے دکھا رہا تھا کہ بڑے بڑے استاد بے خودی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ پنجاب کا ایک دیہاتی کوثر میں دھلی کی ٹکسالی زبان میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا تھا۔ جس پر دہلی اور لکھنؤ والے بھی رشک کریں۔

جن لوگوں کو پہلے حیرت ہوئی تھی وہ اور بھی زیادہ حیرت زدہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ پہلے ان کی حیرت شک و شبہ پر مبنی تھی اور اب اس سے مرعوبیت اور احترام کا اظہار ہو رہا تھا لیکن خود شاعر اس صورت حال سے قطعاً متاثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عام سامعین کے علاوہ باکمال شاعروں اور عالی مرتبت استادوں نے بھی بڑی فراخ دلی سے خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ صاحب فن اہل نظر کی تعریف و توصیف سے فن کار کو قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب بھی مسرور و مطمئن تھے۔ لیکن اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں۔ کسی حرکت کسی انداز میں کامیابی کے نشے فتح مندی کے غرور یا مقابلے کی خواہش کا شائبہ تک نہیں۔ تحسین و آفرین کے غلغلوں میں غزل ختم کر کے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ جیسے ایک فرض تھا وہ ادا ہو گیا اور بس۔ اقلیم سخن کا جلالت مآب پھر وہی مسکین صورت سادہ مزاج دیہاتی تھا گرجنے والا شیر پھر خلوص و انکسار کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا قادر الکلام پھر ایک عامی کی طرح سیدھے سادے چھوٹے چھوٹے بے تکلف جملوں میں باتیں کر رہا تھا۔

یہ مغالطہ اور تعجّب تو خیر ناواقف ظاہر بینوں تک محدود تھا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جس ماحول میں جوش صاحب کی تربیت و پرورش ہوئی اور جن حالات میں ان کی زندگی گزری ان کا پورا علم ہونے پر جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات ان لوگوں کو بھی ایک معجزہ معلوم ہوں گے جو انہیں ایک مدت سے جانتے اور ان کے کلام اور مرتبے کو پہچانتے ہیں۔

پنڈت لبھو رام صاحب جوش یکم فروری ۱۸۸۲ء کو ضلع جالندھر (پنجاب) کے قصبہ ملسیان میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انہوں نے بیٹے کی تعلیم اور کنبے کی گزر اوقات کے لئے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے نہایت غریبی اور تنگدستی سے بسر ہونے لگی۔ ۱۴ برس کے بے یار و مددگار یتیم کے کمزور کندھوں پر جن مختلف اور کثیر التعداد ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا تھا ان کے تصور ہی سے جی چھوٹنے لگتا ہے۔

اس بے کسی اور اقتصادی مشکلات و مصائب کے علاوہ جوش صاحب کو ماحول بھی سخت غیر شاعرانہ نصیب ہوا۔ تیس سال عمر تک ملسیان میں رہے۔ جسے صرف پنڈت جی کے لحاظ سے قصبہ کہہ دیا گیا ہے۔ پھر ۱۹۱۲ء سے نکودر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ ملسیان سے ۸ میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے۔ نکودر کو اگرچہ بعد میں ہائی اسکول نصیب ہو گیا۔ جس میں پنڈت جی فارسی کے اوّل مدرّس تھے لیکن جوش صاحب

کے زمانہ طالب علمی میں آپ کے وطن اور آس پاس کے مقامات میں نہ تو تعلیم و تعلّم کا کچھ قابلِ ذکر چرچا تھا نہ کسی فردِ واحد کو علم و فن میں کوئی امتیازی شان حاصل تھی۔ اور نہ ان کے ہم صحبت اور ہم جماعت طلبہ میں کسی کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ یہ علاقہ کافی زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ اور مردم خیز بھی لیکن علم و ادب اور شعر و شاعری کے ساتھ جوشؔ صاحب سے پہلے اسے کوئی مناسبت نہیں رہی۔ نہ ہی پیداوار کی صورت میں یہاں کی زمین سونا اور لعل اُگلتی رہی ہوگی۔ زندگی کے شعبوں میں اس خاک سے بڑے بڑے آدمی اُٹھے ہوں گے لیکن اس کے کسی کھنڈر کسی خرابے سے کبھی کسی شاعر یا ادیب کی ہڈی تک برآمد نہیں ہوئی۔ جن لوگوں سے جوشؔ صاحب کو سابقہ پڑتا تھا۔ جن کی صحبت میں ان کا وقت گزرتا تھا جن کی بات چیت اور دلچسپیوں میں انہیں شامل ہونا پڑتا تھا ان کی سرگرمیوں میں شاعری اور زبان دانی اور ادب و انشاء کو ذرا بھی دخل نہ تھا اِسی طرح کسبِ علم و فن اور وسعتِ مطالعہ کے اسباب اور سہولتیں بھی عنقا تھیں۔ پس ایسے حوصلہ کش حالات ادب کش ماحول اور ادیب کش ذمہ داریوں کے باوجود ایک بے سہارا پریشان حال یتیم اگر ایک لائق فائق معلّم ایک ممتاز و مستند ادیب اور ایک باکمال صاحبِ فن شاعر بن جائے تو اسے معجزہ کے سوا کیا کہا جائے گا۔

اب جوشؔ صاحب کی شاعری کی جگہ ان کی ذات زیرِ بحث آگئی ہے تو چند اور باتیں بھی بیان کر دوں۔ ان کا طالب علمی کا زمانہ مالی اعتبار سے جتنا مصیبت ناک تھا تعلیمی ترقی کے لحاظ سے اتنا ہی خوش گوار رہا۔ حافظے کی قوّت بچپن ہی سے زبردست تھی اور قدرت نے ذہن ایسا اچھا عطا کیا تھا کہ درسی کتابوں سے پہلوانی کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ مشکل سے مشکل سبق دو چار بار نظر ڈالنے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ چناں چہ آپ محنت شاقہ سے کام نہ لیتے تھے اور اس طرح دوسری ذمہ داریوں پر توجّہ کے لئے وقت نکل آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود جماعت میں اوّل نمبر پر رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے امتحان کے دن تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد سائیکالوجی کے چالیس صفحے دیکھے اور دس بجتے بجتے سو گئے۔ صبح اُٹھ کر ایک ہم سبق سے کہا کہ ذرا فلاں حصّہ کتاب سے میرا امتحان لو۔ وہ سوال پوچھتا گیا اور یہ انہیں الفاظ میں درست اور معقول جواب دیتے گئے جو کتاب میں درج تھے۔ اس طرح آپ ادیب فاضل اور منشی فاضل بن گئے۔ اگرچہ اب ان جماعتوں کے پڑھانے والے جوشؔ صاحب سے برسوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت روز افزوں ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے پریشان حال نوجوان کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس سے آپ کے "روزگار" کی سبیل بن گئی اور آپ اُردو فارسی کے معلّم اور پھر اوّل مدرس ہو گئے۔

مزاج کی سادگی اور بے تکلّفی کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ سادگی زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں بلکہ ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ لباس کی یہ حالت ہے کہ معمولی کپڑے کی سفید پگڑی سفید دھوتی اور سفید قمیض کو کافی سمجھتے ہیں اور عام طور پر اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ سردیوں میں البتہ کمبل اوڑھ لیتے ہیں۔ گلوبند کالر نکٹائی اور پتلون کا تو ذکر ہی کیا کوٹ پاجامے کو بھی دفتر کی وردی کہا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار موسم کے اعزاز میں معمولی سیدھا سادہ کوٹ پاجامہ بھی پہن لیتے ہیں۔ جرابوں کے زیادہ سے زیادہ دو جوڑے جاڑے کے لئے کافی ہیں۔ وہ بھی سفر میں استعمال ہوتے ہیں۔ بوٹ آج تک نہیں پہنا۔ سر عبدالقادر نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "اتنی سادگی اس رنگینیٔ کلام سے کچھ بھی مطابقت نہیں رکھتی"۔ لیکن جوشؔ صاحب کی رائے یہ ہے کہ ۔

کیف آور تو ہے شراب فقط ساغرِ زرنگار کیا معنی

کھانے پینے میں بھی تکلّف کو قطعاً دخل نہیں۔ جو کچھ ملا خدا کا شکر کر کے کھا پی لیا۔ بعض لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شعر و سخن کی محفلوں میں کیف و مستی سے بھری ہوئی شراب کے خم کے خم لنڈھانے والے جوشؔ نے عمر بھر کبھی شراب نہیں پی بلکہ گوشت سے بھی ہمیشہ پرہیز کیا۔ اس کے باوجود احباب کی محفلوں میں نہایت بے تکلّفی سے شامل ہوتے اور بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

آتا ہے جذبِ دل کو وہ اندازِ مے کشی رندوں میں رند بھی رہیں دامن بھی تر نہ ہو

لیکن اس اندازِ مے کشی کو ہر شخص کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ حالات و طبائع کے مطابق نسخے میں تغیّر و تبدّل بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جناب شیخ کی مہمانی

حالت اور منزل مقصود کے پیش نظر مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنّت کی ہوائیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوشؔ صاحب کسی خانقاہ کے درویش یا مندر کے مہنت بن کے رہ گئے ہیں۔ اس پریشانیوں اور کلفتوں کی دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت "چہ خورد بامداد فرزندم" کے چکّر سے فرار اور کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش ہوتی ہے۔ چنانچہ جوشؔ صاحب نے بھی ایسی مصروفیتوں کے علاوہ ایک شغل بے شغلی منتخب کر رکھا ہے۔ شطرنج کھیلنے کا شوق خدا جانے انہیں کب اور کن حالات میں ہوا لیکن رفتہ رفتہ اس کا رانہ انہماک کی صورت اختیار کرکے علاج کی جگہ خود ایک مرض بن گیا۔ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایک صبح سے دوسری صبح تک کھیلتے رہے اور اٹھے بھی تو صرف اس مجبوری سے کہ دنیا اس انہماک کو دیکھ کر کیا کہے گی۔ آپ کا شمار پنجاب کے مشہور و معروف شاطروں میں ہوتا ہے۔ شطرنج کے متعلق ایک بیاض بھی مرتب کی ہے۔ جس میں بہت سے مشکل نقشے حل کئے ہیں۔ شاعری پر بھی اس شوق کا اثر ہونا لازم تھا۔ اکثر اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہات بڑی خوبی سے استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

سمجھتے خوب تھے ہم شاطر دوراں کی چالوں کو مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

شکست انجام تھیں وکوہ کن ہی کو نہیں دیکھا بساط عشق و الفت پر تو ہر شاطر کو ماتیں ہیں

ایک جگہ آنسو کی زبان سے فرماتے ہیں۔

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساط شطرنج جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادہ میں ہوں

شطرنج کا پیادہ آگے ہی بڑھتا ہے۔ اور مہروں کی طرح پیچھے نہیں ہٹتا۔ پہلے مصرع کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جاں باز غربت اور بساط شطرنج خود ہی مذاق سلیم سے داد و تحسین کا خراج حاصل کریں گے۔

عادات و خصائل کے اعتبار سے جوشؔ صاحب قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ ہیں۔ مزاج میں تکلّف نام کو نہیں خود بے حد مخلص اور اخلاص نواز ہیں۔ اور ایسے اشخاص سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر داری اور ریا کاری کی مزدوری اور کار آمد صفات سے قطعاً محروم ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے حد فراخ دل اور مرنجان مرنج ہونے کے باوجود ان صفات کے لوگوں کو سخت ناپسند فرماتے ہیں اور ان کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ طبیعت میں بغض و شر کے فقدان کے باعث دوستی کا نباہ تو عمر بھر کر سکتے ہیں لیکن دشمنی کی راہ پر تھوڑی دور بھی نہیں چل سکتے۔ کسی میں کوئی خوبی ہو تو اس کی تعریف دل کھول کر کریں گے مگر فضول خوشامد اور لابہ گری سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اصول پرستی اور خودداری کے بڑے بڑے دعویداروں کو ذرا سی بات کے لئے ذلّت کی انتہائی گہرائیوں میں گرتے اور اپنی خودداری بلکہ انسانیت کا خون کرتے دیکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے زور و شور سے اصول پرستی اور آزادی ضمیر کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اتنی ہی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ان دکھاوے کے اصولوں کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ مگر پنڈت جی کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کسی حالت میں بھی یہ ذلّت گوارا نہیں کی۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی ضروریات میں انتہائی تخفیف کر لی اور قناعت کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اسی لئے فرماتے ہیں ؎

وہ گدا ہوں تاج شاہی کی ہوس تو درکنار سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈوں ہما کو دیکھ کر

حقّہ آپ کا محبوب ساتھی ہے۔ سگرٹ سے نفرت ہے۔ بالعموم سفر میں بھی ایک سفری حقّہ ساتھ رہتا ہے۔ مجلس مشاعرہ یا اس قسم کی دوسری تقریبوں کے موقعے پر جبراً قہراً سگرٹ پیتے ہیں۔ اور وہ بھی "ریڈ لیمپ"۔ اچھے اور قیمتی سگرٹ اس لئے پسند نہیں کہ ان میں حقّے کا جزوی لطف بھی نہیں۔ ملک کی تحصیل میں تقسیم ملک سے پہلے تمباکو کی بہت کاشت ہوتی تھی اور یہاں کا تمباکو دور دور تک مشہور تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ فصل کے موقعے پر بیسیوں نمونے تمباکو کے لاتے اور جو سب سے اچھا نکلتا اس کا "اسٹاک" سال بھر کے لئے خرید لیتے۔

سادہ زندگی میں کفایت ایک عادت سی بن جاتی ہے ۔ آپ نہ خود بے جا خرچ کرتے ہیں نہ گھر میں کسی کو بے جا خرچ کرتے ہوئے برداشت کر سکتے ہیں ۔ سادہ کپڑے، ماکولات و مشروبات میں انتہا درجے کی سادگی ۔ تھرڈ کلاس سے اونچے درجے کا سفر میں نام نہ لینا اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صرف بے جا سے بچنا یہ آپ کی منفرد خصوصیات ہیں ۔ نکودر سے ملسیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے ۔ ریل اور موٹر کے ہوتے ہوئے بھی بالعموم پیدل آتے جاتے رہے ہیں ۔ اسٹیشن سے گھر تک ایک میل کا فاصلہ ہوگا ۔ لیکن سامان نہ ہو تو کبھی تانگے میں نہیں گئے ۔

ہم نشینوں میں صاحب علم کوئی نہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی صحبت کے فیضان سے ہم نشینوں میں قدرے سخن فہمی پیدا ہو گئی ہے ۔ آپ کے بہت پرانے ہم نشینوں میں سے آپ ہی کے ہم نام ایک حکیم صاحب ہیں جو نابینا ہیں ۔ نکودر آپ گھر پر نہ ہوں تو عام طور پر ان کے پاس ملیں گے ۔ طبی علمی اور دینی ہر قسم کی گفتگو حقے کے دور کے ساتھ وہاں ہوتی ہے ۔

انگریزی نہیں جانتے ۔ جوانی کے زمانے میں انگریزی پڑھنے کی کوشش کئی بار کی مگر ہر بار ایک آدھ کتاب پڑھ کر چھوڑ دی ۔ پہلی دفعہ تو جج (JUDGE) اور سولجر (SOLDiER) کے ہجوں سے جی بیزار ہو گیا ۔ جج میں ڈی اور سولجر میں ڈی خدا جانے کس مصلحت سے ہے ۔ دوسری مرتبہ پھر شوق ہوا مگر نائٹ (NiGHT) اور ہاف (HALF) اور نو (KNOW) وغیرہ وغیرہ کے تلفظ اور بے ربط ہجوں سے پریشان ہو کر رہ گئے ۔ پھر تیسری بار احباب کی ترغیب و تحریص سے ایک ابتدائی کتاب شروع کی تو نکودر میں جہاں آپ کا مستقل قیام ہے طاعون پھیل گیا ۔ چوتھی دفعہ کوشش کی تو شہر میں انفلوئنزا نے حشر ڈھا دیا ۔ یہ منحوس نتائج دیکھ کر کتاب پھینک دی اور پھر اس وہم میں مبتلا رہے کہ اگر پڑھنا شروع کیا تو خدا جانے کیا قیامت نازل ہو ۔

فصیح الملک مرزا داغ کے شاگرد ہیں ۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ جوش صاحب سے فیض اصلاح پانے والوں کی تعداد بھی بہت ہے ۔ حالانکہ آپ اکثر مبتدیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ " شاعری کا طوق آپ کے گلے میں تنگ ہے ۔" پنجاب اور یو پی کے بڑے بڑے کہنہ مشق آپ سے مشورہ سخن کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں ۔ آپ متروکات زبان کے پابند مگر حسن بیان کے دلدادہ ہیں ۔ بیخود، سائل، احسن مارہروی، نوح، یگانہ، حسرت موہانی، جگر، جوش، حفیظ سب سے آپ کے اچھے مراسم رہے ہیں ۔ عمر کا ایک طویل حصہ آپ نے گوشہ نشینی میں اس طرح گزارا کہ ایک مشاعرے میں اکابر آپ کا کلام سن کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے اور جب آپ نے انشاء کی مشہور زمین میں یہ شعر پڑھا

جناب شیخ کی میراث اس میں چل نہیں سکتی
ابھی تو گلشن جنت کے ہم حقدار بیٹھے ہیں

تو آغا شاعر قزلباش اسٹیج پر آ کر آپ سے بغل گیر ہو گئے ۔

یہ بات کہ بے شمار شاگردوں کو فیض پہنچانے کے باوجود آپ نے اپنے قابل فخر صاحبزادے حضرت عرش ملسیانی کو اصلاح کے فیض سے فیض یاب نہیں کیا ۔ تعجب خیز ضرور ہے لیکن جوش صاحب کی وضع داری اور مزاج کی نفاست کو دیکھتے ہوئے یہ بات عین قابل قبول ہے
آپ جوش صاحب کی شخصیت میں ایک شفیق باپ، ایک باوقار استاد، ایک معزز شہری، ایک نہایت شریف انسان، اور شہرت و ناموری کو تلاش نہ کرنے والا شاعر پائیں گے ۔ انہیں شاعر کی عظمت کا احساس ہے ۔ اس کے ساتھ خود اپنی عظمت کا احساس بھی ضرور ہے ۔

انکار کیجئے نہ کمالاتِ جوش سے
کم گو سہی مگر وہ سخن ور ضرور تھا

تلوک چند محروم

جگن ناتھ آزاد

مسلسل پینتیس برس تک سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت کرنے کے بعد والد جب کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے اپنے اس عرصۂ ملازمت کا جائزہ ان اشعار میں لیا ــــ

سی و پنج سال عمرم بہ ملازمت بسر شد ۔۔۔ سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم
شرفم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی ۔۔۔ بہ سگانِ ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

یہ ہیں ایک شاعر کی مسلسل پینتیس برس کی ملازمت کے تاثرات۔

پینتیس برس ــــ زندگی کا ایک حصّہ ــــ بہ سگانِ ادب نمودم بہ خراں سلام کردم ــــ اور اس کے باوجود مسلسل تخلیقِ فن کا سلسلہ جو آج تک جاری ہے۔ پینتیس برس کی اس مسلسل گھٹن کا اندازہ ان تنقیدی یا تعریفی مقالات سے نہیں ہو سکتا جو مختلف رسائل اور کتابوں میں والد اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ والد کی زندگی کے وہ گوشے جو ان کے تخلّص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں اور اس قطعے میں خوابیدہ ہیں ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔ میں اس مقالے میں بعض ایسے ہی گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد سے جب میں نے ذکر کیا کہ طفیل صاحب کا خط آیا ہے اور انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں مقالہ لکھنے کے لئے کہا ہے کچھ مشورہ دیجئے کیا لکھوں تو کہنے لگے کہ میری زندگی میں ایسے واقعات پیدا ہی نہیں ہوئے جنہیں رسالے کے لئے لکھا جائے اور جو واقعات ہیں وہ مل جل کر ہمارے سماج کی کوئی عمدہ تصویر پیش نہیں کرتے۔ پنجاب کی تلخیوں اور تعصّبات کا زمانہ۔ اسے دہرانا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ میانوالی اور راولپنڈی کے واقعات تو تمہیں یاد ہی ہوں گے۔ اگر مفتی احمد سعید اور بیرسٹر محمد جان میری امداد نہ کرتے تو متعصب لوگ میری زندگی ہی دشوار بنا دیتے۔ اب بھی انہوں نے کچھ کم پریشان نہیں کیا اس سے پہلے بھی جب تم بہت چھوٹے تھے مجھے مخالفوں نے مسلسل کئی برس تک پریشان کیا۔ یہ باتیں لکھنے کی تھوڑا ہی ہیں۔

انہوں نے مقالہ نہ لکھنے کی جو وجہ بیان کی وہی میرے لئے یہ چند سطور لکھنے کی وجہ جواز بن گئی۔ پریشان کرنے والے لوگوں یعنی بعض مسلمانوں نے

بربنائے تعصب پریشان کیا اور امداد کس نے کی؟ مسلمانوں ہی نے۔ اب ایک غیر مسلم شاعر کی زندگی کا یہ گوشہ پڑھنے والوں کے سامنے کیوں نہ آئے اس سے بڑی درجہ ایک شاعر کی داستانِ حیات لکھنے کی اور کیا ہو سکتی ہے اور پھر جتنی قدر دانی ہوئی وہ کن لوگوں نے کی؟ کیا ان میں سے بیشتر مسلمان نہیں تھے؟ تو گویا یہ تو تاریخ ادب کا ایک ایسا باب ہے جو آج سے بہت پہلے معرضِ تحریر میں آ جانا چاہیے تھا۔

۱۸۸۷ء والد کا سنِ پیدائش ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے عیسیٰ خیل کی تحصیل میں کاجراں والا نام کا ایک گاؤں تھا جو ان کی جنم بھومی ہے یہ گاؤں اسی زمانے میں دریا برد ہو گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی تھوڑی سی کاشتکاری اور معمولی دکانداری کو چھوڑ کر عیسیٰ خیل آ گیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ والد کی عمر اس وقت پانچ سات برس کی تھی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرا بچپن دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ موسم گرما میں عموماً سارا سارا دن اس دریا میں نہانے اور تیرنے میں گزر جاتا تھا۔ ساون بھادوں میں جب سارا گاؤں زیر آب ہو جاتا تھا تمام مکان کچے کوٹھے اور چھپر گر جاتے تھے۔ اہلِ قریہ کے لیے یہ بڑا حادثہ ہوتا تھا لیکن چونکہ اس کے عادی ہو چکے تھے کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لیتے تھے۔ ہم بچوں کے لیے تو پانی کا اس طرح موجیں مارتے ہوئے گھروں میں پہنچ جانا باعثِ مسرت ہوتا تھا۔ گرے ہوئے ملبے سے کواڑوں کے تختے لے کر ان کی کشتیاں بنا لینا اور ادھر اُدھر کھیتے رہنا ان ایام میں ہمارا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ اب جو غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو وہ سماں آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے :-

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط جو آج بھی ان کی گفتار اور اشعار میں موجود ہے، اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایک تازہ ترین نظم میں کہتے ہیں :-

بھولا نہیں عالم تری امواجِ رواں کا وہ ماضیٔ رقصاں مری عمرِ گزراں کا
تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا افسوس کہاں میں ہوں یہ قصہ ہے کہاں کا
گو تشنہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا
طفلی بھی جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا

تقدیسِ چمن سے مجھے انکار نہیں ہے گو پاک نہیں اس سے سرِ مکار نہیں ہے
کیا کیجیے وہ آر نہیں پار نہیں ہے آسودہ کسی طور دلِ زار نہیں ہے
وہ ہمہمہ وہ جوش و خروش اس میں کہاں ہے
افسردہ سی بے جان سی اک نہر رواں ہے

گو جور و جفا کی تجھے عادت بھی رہی ہے فطرت تری کچھ مائلِ وحشت بھی رہی ہے
مضمر ترے طوفان میں آفت بھی رہی ہے ساتھ اس کے نمایاں یہ حقیقت بھی رہی ہے
دیہات اُجاڑے تو بسائے بھی ہیں تو نے
نقشے جو بگاڑے تو بنائے بھی ہیں تو نے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہِ حسنِ خداداد جو قریہ ہر قیدِ تکلف سے تھا آزاد جو قریہ
بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون تو ہوگا وہی ہو گرچہ زمیں اور

کوئی چھ سات برس کی عمر میں انہیں ورنیکلر فائینل مڈل سکول عیسےٰ خیل میں باقاعدہ داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری سے ہائی اسکول تک ہر جماعت میں اول رہے۔ پانچویں اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی سکول نہ تھا اس لئے گھر سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر بنوں جا کر وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں میٹرکولیشن کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحان بعد میں بہ دورانِ ملازمت پاس کئے۔

میٹرکولیشن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہونے کے لئے بنوں سے لاہور آئے۔ رستے میں پہلی بار ملکۂ نورجہاں کا مقبرہ دیکھا۔ ان کی مشہور نظم "نورجہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ والد بتلاتے ہیں کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف بیلیں چڑھی ہوئی ہیں اور ویرانی کا عالم نہیں ہے لیکن اس زمانے میں جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا۔ اس مقبرے کی کیفیت واقعی یہی تھی کہ؂

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر — آرام کیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپّر — اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر
معمور ہے یوں گورِ غریبانہ کسی کی
آباد رہے محفلِ جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہ ایک فقیر طبع انسان تھے۔ آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے اور جب کوئی سادھو مل جاتا اس کے ساتھ ہو لیتے اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے تھے۔ چھوٹے دادا اردو اور فارسی سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اوائل عمر میں انہوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن اسے جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ایک سال کی بچی رہ گئی — وِدیا — میری بہن جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے مسرت چھین لی۔

اگلے برس دوسری شادی ہوئی۔ یہ میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ دو برس بعد ۱۹۱۸ء میں میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر کے واقعات میری یاد کے دھندلکے میں ابھی تک موجود ہیں گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ ہی کی نہیں بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں پہلوؤں کی حامل ہوں گی۔

آج سے چونتیس برس پہلے کا زمانہ میری نظر کے سامنے ہے۔ عیسےٰ خیل میں ایک چھوٹا سا مکان ہے، والد، والدہ، وِدیا اور میں ہم چار افراد اس میں رہتے ہیں، سردیوں کے دن ہیں، والد کوٹھے کی چھت پر دھوپ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے سامنے ہے، گنگنا رہے ہیں، والدہ مجھے اور وِدیا کو اوپر بھیجتی ہیں کہ جا کر کہو بازار سے ترکاری لے آئیں۔ ہم دونوں اوپر جاتے ہیں۔ دو ایک بار انہیں پکارتے ہیں لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم اس خوف سے کہ کہیں جھڑک ہی نہ دیں فوراً واپس آجاتے ہیں۔ اخبار یا کتاب کی جانب ان کی محویت کا آج بھی یہی عالم ہے۔ وہ محوِ مطالعہ ہوں تو انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے دو چار بار پکارنا بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے۔ ان کی محویت سے قطع نظر ان کا خوف اسی تصویر کا ایک اور پہلو ہے جو ایک زمانے تک قائم رہا اور جس کے بچے کھچے نقوش آج بھی باقی ہیں۔

میرے اور وِدیا کے دل میں ایک مدت تک والد کی محبت کے مقابلے میں شاید ان کا خوف زیادہ غالب رہا۔ یہ ان کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ آج بھی وہ اپنی رائے کے خلاف دنیا بھر کی رائے سن سکتے ہیں لیکن میری رائے ان کی رائے کے خلاف ہو یہ انہیں گوارا نہیں اور میں نے بھی حتی الامکان محتاط رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی یہ افتادِ مزاج شفقتِ پدری کے رستے میں حائل رہی بلکہ جہاں تک میرا اور وِدیا کا تعلق ہے ہمیں اس شفقت کا حصّہ وافر ملا ہے۔ ہاں میری چھوٹی بہنیں ساوتری اور کرشنا اس محبت سے پوری طرح شاد کام نہیں ہو سکیں کیونکہ انہوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب وِدیا کی خودکشی کے باعث والد کا دل بجھ چکا تھا۔ وِدیا نے جو بائیس برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی سسرال میں

ایک جھگڑے کی بنا پر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن والد کے چہرے پر میں نے وہ مسرت نہیں دیکھی جو اس حادثے سے قبل نظر آیا کرتی تھی۔ والد کی زندگی کا یہ حادثہ کئی انداز سے شعر میں ڈھل کر آیا لیکن انہوں نے اپنے اس ذاتی غم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا اس لئے یہ اشعار آج تک کہیں منظرِ عام پر نہیں آسکے ؎

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا — افسوس اسی شمشان میں کھائیں گے پئیں گے
تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر — ہم جینے پہ مجبور رہیں جل جل کے جئیں گے

بجھ نہیں سکتی جو دل میں آگ ہے بھڑکی ہوئی — عالمِ فانی میں اب راحت کہاں میرے لیے
سچ تو یہ ہے تیرے جل مرنے سے اے لختِ جگر — ہو گئے دوزخ زمین و آسماں میرے لیے

پہلے ہی عزا خانہ تھی وہ میری نظر میں — افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا
اے لختِ جگر! آہ کہ جل مرنے سے تیرے — میرے لئے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

تاب اک لمحے کی لاسکتی نہیں جانِ بشر — ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے انساں بیقرار
ہائے کن مجبوریوں میں تو نے اے لختِ جگر — کر دیا ملبوسِ تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دلِ بیتاب جلتا ہی رہے گا اس کی حدت سے — زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی وہ دنیا
جگر پھُنکتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں — تصور میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی وہ دنیا

زین فلک اے وائے کہ داغِ جگرم داد — فریاد بر آوردم و داغِ دگرم داد
این داغ جگر پارۂ خونِ جگرم سوخت — وین داغِ دگر آہ کہ سرتا بسرم سوخت

"آن داغِ جگر" اشارہ ہے میری چھوٹی بہن کی موت کی جانب۔ یہ بچی دو برس کی عمر میں دس بارہ دن بیمار رہ کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنایا گیا تھا۔ والد اور میں مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر والد ہر روز ایک نظم کہتے تھے۔ تین دن کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ یہ نظمیں بھی جہاں تک میرا خیال ہے کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ چند اشعار مجھے زبانی یاد ہیں، یہاں درج کر رہا ہوں ؎

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے نونہال — اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا
جنت طراز مقام ہے جنگل ہے ہولناک — ہاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا
خوابِ گراں میں تو ہے ابھی زیرِ خاک سرد — بیدار کائنات ہے ساری شکنتلا

خوش ہو کے پھر اچھل کر جگن میرے ساتھ ہے
آنکھوں سے اس کی اشک ہیں جاری شکنتلا
آنکھوں میں آگیا دلِ صد چاک کا لہو
پتھر بہ تجھ پہ دیکھ کے بھاری شکنتلا
ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر
کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آ گئے
اے کاش زیرِ خاک سے ہو آشکار تو
ہم دودھ لے کے آئے تھے گھر سے ترے لیے
دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیر خوار تو
گھر میں تو رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ
آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تو
افسوس عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات
جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بے قرار تو
روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج
وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو
بھولا غمِ جہاں تجھے جب گود میں لیا
آئی تھی بن کے راحتِ جانِ نزار تو
جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب
اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو
تیرے لیے دعا ہے دلِ غم نصیب کی
ہو بہرہ یابِ رحمتِ پروردگار تو

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب
کس نے شکنتلا! تجھے یوں کر دیا خموش
مطلب یہ تھا کہ تو مرے نالوں سے جاگ اٹھے
فطرت میں ورنہ ہے دلِ درد آشنا خموش
مجھ بد نصیب کے لیے تیری خموشیاں
ایمائے خامشی ہیں تو ہو جاؤں گا خموش
طاری ہے آہ! شہرِ خموشاں پہ کیا سکوت
خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش
سر منزلِ دیارِ عدم ہے یہی مقام
ڈیرے لگے ہوئے ہیں مگر بے صدا خموش
وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اترتے ہیں
سینے میں سانس روک کے جوں نقشِ پا خموش
دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں
پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش
نغمے خوشی کے ہیں نہ کہیں نالہ ہائے غم
یکسر ہیں ساکنانِ دیارِ فنا خموش
صدمہ نہ تا کہ ہو تری معصوم روح کو
ہوتا ہے ساز اب مری فریاد کا خموش

شکنتلا کے ذکر سے پہلے میں وِدّیا کی خودکشی کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہم راولپنڈی میں تھے جس روز دوپہر کو اس حادثے کی اطلاع تار کے ذریعے سے ملی اسی روز جب صبح کو ——— حادثے کی اطلاع سے پانچ سات گھنٹے قبل ——— والد بیدار ہوئے تو میں نے انہیں خلافِ معمول بہت افسردہ پایا۔ میں نے ان سے دو ایک بار پوچھا کہ طبیعت تو آپ کی اچھی ہے؟ رات کو نیند تو ٹھیک سے آئی؟ انہوں نے کہا۔

ہاں بالکل اچھا ہوں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یونہی طبیعت پریشان سی ہے۔ حسبِ معمول سیر کو چلے گئے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ افسردگی کا عالم بدستور طاری تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسکول یا کنٹونمنٹ بورڈ کا کوئی معاملہ پریشان کر رہا ہوگا دوبارہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کنٹونمنٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری ان کے لئے دردِ سر تھا۔ میرا گمان یہی رہا کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس دن اسکول جانے تک والد خلافِ معمول خاموش ہی رہے اپنی پریشانی کو چھپانا ان کے بس میں نہ تھا۔ دوپہر کو تار ملا جس میں یہ الفاظ درج تھے:——— (VIDYA DIED THE MORNING) وہی صبح کا وقت جب والد افسردہ خاطری کے عالم میں بیدار ہوئے ہیں ودیا اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر رہی تھی۔ تہہ بدیری کو اس حادثے کی اطلاع کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی رہی تھی۔

یہ میری بہنوں کی زندگی اور موت کا ذکر تھا جو بلا ارادہ نوکِ قلم پر آگیا ورنہ میں کہنا تو یہ رہا تھا کہ آج سے پچیس برس پہلے ہم لوگ کیسے رہتے سہتے تھے عیسیٰ خیل (مغربی) پنجاب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمارا وطن ہے اس لئے محبوب ہے ورنہ زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں اس شہر میں قطعاً مفقود ہیں زندگی کی اوّلین ضرورت پانی یہاں کیا ب بلکہ نایاب ہے۔ اب نہ جانے کیا کیفیت ہے۔ میں اپنے وقت کی بات بتا رہا ہوں۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا شہر کی عورتیں ہر صبح و شام اپنے سر پر دو دو گھڑے رکھ کر پانی بھرنے جایا کرتی تھیں اور گھر کی ضروریات کے مطابق دن میں کئی کئی بار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوا باہر کا سارا کام مردوں کے سپرد تھا اور گھر کے اندر کا سارا کام عورتوں کے سپرد۔ یہ پانی اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ پیا جائے لیکن سارا شہر یہی پانی پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی عمر میں اس شہر سے نکلے اور بنوں، لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں چودہ برس گذارنے کے بعد جب دوبارہ عیسیٰ خیل میں آئے تو شہر کے پانی سے بیزار ہو گئے انہیں ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ یہ پانی ہم لوگوں کو بیمار کر دے گا۔ چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں میں پھٹکڑی کی ڈلی پھیرا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو یہ خاص ہدایت تھی کہ پانی گلاس میں اس طرح سے انڈیلیں کہ تہ کے قریب کے پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ اس تمام احتیاط کے باوجود پانی نے اپنا اثر دکھایا اور والد بیمار پڑ گئے۔ پانی کی مٹی نے جمع ہو ہو کر گردے میں پتھری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شدتِ درد کے ناقابلِ بیان عالم میں انہیں چارپائی پر لٹا کر پھر اسی شہر بنوں میں لے جایا گیا جہاں وہ ایک مدت تک زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹر پنیل ایک مشہور انگریز ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اپریشن کر کے پتھری خارج کی اور والد انتہائی نقاہت کے عالم میں واپس گھر آئے۔ اب ہر لمحہ عیسیٰ خیل کو چھوڑنے کی تجویز پیشِ نظر تھی لیکن اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی احمد سعید میانوالی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے، گجرات ان کا وطن تھا۔ نیک خصلت اور تعصب سے بالا انسان تھے۔ ذوقِ سخن رکھتے تھے، والد کے مدّاح تھے اور قدردان۔ ان سے والد نے اپنی مشکل بیان کی کہ اس شہر سے مجھے نکالئے ورنہ پھر بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے ان کا تبادلہ کلور کوٹ کے مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

کلور کوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں کے اردگرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں یہاں بکثرت آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ بادل اٹھتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ نعمتِ غیر مترقبہ ——— صاف ستھرا پانی ——— جس کی تلاش میں والد نے اپنا شہر چھوڑا تھا یہاں بافراط موجود تھا۔ اب والد کو یقین ہو گیا کہ یہاں پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچروں میں شاید دس جماعتوں سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ ان کی ذہنیت وہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک ٹیچر صاحب نے ایک دن اپنے طلبہ سے کہا کہ کل سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے ایک ایک اکنّی لے کر آئیں۔ مجموعی رقم سے کلاس روم کے لئے ڈسٹر خریدا جائے گا۔ والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں ضابطے اور اخلاق کے پیشِ نظر یہ بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اس ٹیچر کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ حرکت تمہارے لئے اور سارے اسکول کے لئے بدنامی کا باعث ہے۔ جب سرکاری طور پر کلاس روم کے لئے ڈسٹر مہیا کئے جاتے ہیں

تو خلافِ قاعدہ طلباء سے پیسے جمع کرنے کے کیا معنی؟ وہ صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن انہوں نے دوسرے ٹیچروں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ کرتا ہے۔ کلور کوٹ میں آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان شہر سے دور مختلف دیہات میں آباد تھے۔ ان میں رئیس اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی تھے، خوشحال اور کھاتے پیتے بھی اور ایسے بھی جنہیں مفلس کہا جاتا ہے۔ ان دیہات میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے معمولی پرائمری اسکول بھی کوئی نہ تھا، انگریزی مڈل کا تو کیا سوال؟ لہٰذا مسلمان طلباء کے لئے کلور کوٹ میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جب ہم کلور کوٹ میں آئے تو اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے ان دیہاتی طلبہ کی سہولت کے لئے ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کر دیا جس میں بے شمار مسلمان طلبہ دیہات سے آکر داخل ہو گئے اور اسکول میں ان کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اس بات سے دیہات کے تمام مسلمان خواہ وہ لوگ نمبردار تھے یا ذیلدار، معمولی کاشتکار تھے یا دکاندار بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی لیکن اسکول کے ٹیچروں کی ذہنیت جو تھی وہی رہی۔ ایک ٹیچر نے بورڈنگ ہاؤس سے دو چار پائیاں چُرا لیں اور جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے والد کو متعصب ہندو کہنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ ٹیچر ایسے لوگ تھے جو کسی طرح سے معلمی کے مقدس کام کے موزوں نہیں تھے۔ یہ لوگ سرتا پا بے علم تھے اردو کا صحیح فقرہ بولنا ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوتا تھا لیکن یہ لوگ معلمی کے کام پر مامور تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز دو ایک طلبہ کو اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور وہ طلبہ وہاں دن بھر طرح طرح کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ کام یہ ہوتے تھے۔ گائے بھینس کے لئے کھلی اور چارے کا انتظام، چارپائی وغیرہ کی بُنائی، گھر کی صفائی اور بچوں کو اِدھر اُدھر لئے پھرنا وغیرہم۔ ایک اور صاحب نے طلبہ کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور اپنی اپنی باری کے مطابق ہر طالب علم ان کے لئے گھر سے لسّی لایا کرتا تھا۔ ٹیچر صاحب لسّی میں مکھن کی موجودگی پر بھی اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک ٹیچر صاحب جیب میں تاش ڈال کر اسکول آیا کرتے تھے اور جب موقع ملتا وہ تین ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ والد ان بدعنوانیوں کو گوارا نہ کر سکے۔ مشورہ، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے سے انہیں روکنا چاہا۔ انہوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مفتی احمد سعید ایک شریف اور غیر متعصب مسلمان تھے۔ ان پر ان شکایات کا مطلقاً کوئی اثر نہ ہوا اور سازشیوں کو ہر بار منہ کی کھانا پڑی لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مختلف مزاج کے افسر تھے۔ انہوں نے ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے خلاف انکوائری قائم کی گئی۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے والد نے اتنا کچھ کیا اور انکوائری اس الزام کی تحقیق کے لئے ہو رہی تھی کہ یہ متعصب ہیں اور مسلمان طلبہ اور ٹیچروں کو پریشان کرتے ہیں ؎

بہ جرمِ عشقِ توام می کشند و غوغا ئیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ئیست

انہوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط لکھا ؎

"فردا و دے کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی"

لیکن وہ اب دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر خود انکوائری کے لئے تشریف لائے۔ ڈاک بنگلے میں "عدالت" قائم ہوئی۔ شہر کے ہندوؤں کو تو گواہی کے لئے بلایا نہ گیا تھا دیہات کے مسلمان اور اسکول کے ٹیچر اور طلبہ موجود تھے۔ ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ٹیچروں نے دو چار معصوم طلبہ کو ورغلا لیا لیکن دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور ذمہ دار مسلمان طلبہ نے سازشی ٹیچروں کے خلاف گواہی دی اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو اس بات پر مجبور کیا کہ موجودہ ہیڈ ماسٹر کا کلور کوٹ سے بالکل تبادلہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام شاید جاری

نہ رہ سکے۔ والد کے لئے یہ ایک عظیم فتح تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس ماحول سے دل برداشتہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگرس کی تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ والد نے قومی اور ملکی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہیں اور یہ تمام نظمیں بغیر نام کے مختلف اخبارات میں چھپیں۔ اگر نام سے چھپتیں تو نوکری محفوظ نہیں تھی۔ وہ نظم کے ساتھ ایک خط ایڈیٹر کو لکھ دیا کرتے تھے کہ یہ نظم بغیر نام کے یا کسی فرضی نام سے چھاپ دی جائے۔ نہ جانے یہ بات کیوں ان کے ذہن میں نہ آئی کہ اخبارات کی ڈاک سنسر بھی ہو سکتی ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ ڈاک ہر روز سنسر ہو رہی تھی۔ والد کے خطوط کی نقل میانوالی کی خفیہ پولیس کو بھیج دی جایا کرتی تھی اور ان کے بارے میں میانوالی پولیس ایک فائل تیار کر رہی تھی لالہ لاجپت رائے کے انتقال پر انہوں نے ایک طویل نظم کہی یہ نظم لاہور کے ایک پبلشر نے کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ والد کا نام اس نظم پر موجود تھا۔ اس نظم نے پولیس کی فائل کو "مکمل" کر دیا اور یہ فائل ایک انکوائری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اب کے معاملہ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کا نام رادھا کرشن تھا۔ حکومت کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب بھی انہیں ملا ہوا تھا۔ اس انکوائری میں والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اپنے خطوط کی نقول اور بعض حالات میں اصل خطوط اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں موجود تھیں۔ حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی تھی۔ رادھا کرشن ضلع کے دورے پر کلور کوٹ آئے۔ والد کو انہوں نے اسی ڈاک بنگلے میں طلب کیا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ والد اپنے خلاف اتنا سنگین معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں۔ رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق سے سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جائیے یا تو کانگرس کی تحریک میں شامل ہو جائیے یا سرکاری نوکری میں رہئے۔ وہ تو یہ حکم دے کر چلے گئے۔ والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی لیکن اس سارے واقعے سے انہوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا لیکن انہوں نے اس واقعہ کا جب بھی ذکر کیا بڑے افسوس کے ساتھ کہ وہ بھی کیا نیکی جو تعصب کی بنا پر کی جائے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے قدردانی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تعصب کی بنا پر قدردانی کی تو کس کام کی۔ اب بھی جب آپ کبھی اس زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس واقعے کا ذکر افسوس اور اندوہ سے کرتے ہیں۔ عیسےٰ خیل کے مرحوم نواب سیف اللہ خان کا تذکرہ اس موقع پر وہ ضرور کرتے ہیں۔ سیف اللہ خان مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تھی تو بغلگیر ہو کر ملتے تھے اور بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خان سے نواب احمد یار خان دولتانہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا جہاں محروم صاحب رہتے ہیں؟ انہوں نے والد سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ تو ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جائدادوں کے مالک ہم ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ہیڈ ماسٹر سے زیادہ نہیں لیکن ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ کی ذات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔

کلور کوٹ سے آب و دانہ انہیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر کے راولپنڈی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ والد کلور کوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی، کوشش کر کے انہوں نے اپنا تبادلہ راولپنڈی کرا لیا۔ یہاں وہ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدمؔ کا قیام ان دنوں یہیں راولپنڈی میں تھا۔ عطاء اللہ کلیمؔ، عبدالعزیز فطرتؔ، ضبط، اظہر امرتسری یہ سب حضرات یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم ایک پر تکلف دعوت کی صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آگئی۔ ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوشگوار بن گئی لیکن اسکول کے حالات یہاں بھی دردِ سر بن گئے۔ کلور کوٹ میں تو ایک افسر تھا "ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز"، یہاں کنٹونمنٹ بورڈ کا ہر ممبر افسر تھا۔ ایک ممبر محمد رفیع کو تو ان سے پہلے دن ہی سے بغض للّہی پیدا ہو گیا۔ اس نے انہیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ایک اور ممبر محمد جان بیرسٹر ایٹ لا (حال جج مغربی پاکستان

ہائی کورٹ) نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ یہاں دو ایک ٹیچر محمد رفیع سے مل گئے جس سے والد کی پریشانیوں میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت اپنی صفائی میں لمبے لمبے بیانات لکھنے میں ضائع ہو جاتا تھا۔ چند برس بعد محمد رفیع کا انتقال ہو گیا اور صورت حال سکون پذیر ہو گئی۔ یہاں سے آپ ۱۹۴۳ء میں ریٹائر ہوئے اور آپ نے "سی و پنج سالِ عمرم ...." کہہ کر اطمینان کا سانس لیا۔

فوراً بعد آپ گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ مولانا تاجور کو اس تقرر کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے والد کو یہاں شروع میں پہنچنا چاہیئے تھا وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت قریباً ضائع ہی ہوا ہے۔ انہیں شروع ہی میں کالج میں اردو فارسی کا لکچرار مقرر ہونا چاہیئے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون میں بسر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہنگامۂ کشت و خون میں کیپٹن عبدالمجید (اللہ انہیں ہمیشہ اور ہر جگہ آبرو سے رکھے!) نامی ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر و عافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہ ہزار دقت امرتسر اور پھر جالندھر گئے۔ میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ "جالندھر تک آ گیا ہوں۔ دہلی پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک افراتفری اور کس مپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا۔" لیکن کون مسلمان اس وقت جالندھر میں اس قابل تھا کہ ان کی خدمت کر سکتا۔ بڑی مشکلوں سے دہلی پہنچے۔ یہاں لالہ دیش بندھو گپتا آنجہانی نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لکچرار مقرر ہوئے اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی تک اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن اتنا لکھنا مضمون کے احاطے سے باہر بھی نہیں ہو گا کہ والد ابھی اسکول کے تیسرے درجے ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انہیں پڑھ کر خود بخود ان کی تحریر میں مصرعے موزوں ہونے لگے۔ بعد میں درسی کتابوں کی نظمیں پڑھ کر رغبت بڑھنے لگی اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درس طلبا اور ماسٹر صاحبان کے لئے دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء (ساتویں جماعت) میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

فرطِ غم سے غنچے جیب ہائے گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اس شعر پر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے جو ایک دہلوی بزرگ تھے بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے ؎

الٰہی! تری کیسی مہربانی ہوئی — کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

اگرچہ اس دور کی شاعری کچی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث زبان کے نقائص سے خالی نہ تھی لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہو گیا اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی ہو گئیں جو "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور ایسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ "پپیہا کی زاری" اور "سندھ کو پیغام" "مطبوعہ مخزن" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور انہوں نے تعریفی جملوں سے ہر نظم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ فنِ عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے اسے

حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر اس سے ہمیشہ کے لئے دامن چھڑا لیا ؎

محروم! ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا　　　بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات

کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر　　　مفعول فاعلات، مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے بارے میں اب ان کی رائے یہ ہے کہ یہ میری سہل انگاری تھی ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔

عروض کے بارے میں ان کی ایک بار علامہ اقبال سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں علامہ کی رائے کا انہوں نے مجھ سے اکثر ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے ان سے کہا تھا کہ میں نے تو عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے، ویسے شاعری کے لئے عروض جاننے کی ضرورت نہیں ہاں استادی شاگردی کے سلسلے کے لئے عروض کا جاننا ضروری ہے۔

والد استادی شاگردی کے سلسلے سے بالکل بے نیاز رہے ہیں۔ شعر میں ان کا کوئی استاد ہے نہ انہوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے کسی نے مشورہ مانگا تو تجویز دے دیا۔ انہیں ہندوپاکستان کے گوشے گوشے سے اس مضمون کے خطوط اکثر ملتے رہتے ہیں کہ میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں آپ جواب میں یہی لکھتے ہیں کہ مطالعہ اور مشق جاری رکھئے، جوہر ہوگا تو چمک اٹھے گا۔ اصلاح لینے سے کچھ نہ ہوگا۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کو بعض کتابوں کے نام مطالعہ کے لئے تجویز کرتے رہتے ہیں جن میں "بانگِ درا" "جامِ سرور" "کلیاتِ داغ" اور "کلیاتِ امیر مینائی" کے نام ضرور شامل ہوتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اوّل الذکر دو کتابیں خیالات میں تنوع اور بلندی پیدا کرنے کے لئے اور آخر الذکر صفائی زبان کے لئے بہت مفید ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انہوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطورِ فن حاصل کیا اور نہ اس پر فنی نظر سے توجہ کی۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

شاعر ہوں شاعری میں استاد نہیں　　　گو نقدِ سخن ہے پاس نقاد نہیں

ہے شعر و سخن کا کب سے سودا مجھ کو　　　مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے۔ جب طبیعت مجبور کرتی ہے یا کوئی خارجی تحریک رونما ہوتی ہے تو آپ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بار آپ جو کچھ لکھ لیتے ہیں وہ اس کی قطعی صورت ہوتی ہے۔ میں نے انہیں کلام پر نظرِ ثانی نہیں دیکھا۔ گھر میں بچوں کا شور ہو یا غل غپاڑہ ہو آپ کی شعر گوئی کی رستے میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ہاں کوئی فرمائشی نظم کہنا ہو تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ "اہتمام" ضروری ہو جاتا ہے۔ اکثر آپ کاغذ پنسل لیکر گھر سے دور شہر کے باہر چلے جاتے ہیں اور وہیں سے فرمائشی نظم ختم کر کے لاتے ہیں۔ اب تو فرمائشی نظمیں کہنے کی انہیں ضرورت نہیں رہی لیکن جب کلور کوٹ اور راولپنڈی میں ہیڈ ماسٹر تھے تو ڈسٹرکٹ انسپکٹروں اور ڈپٹی کمشنروں کی فرمائشوں پر اکثر اس قسم کی نظمیں کہنا پڑتی تھیں بعض دفعہ تو آپ اس قسم کی نظمیں قلم برداشتہ "لکھ" دیتے تھے۔ اس کی نقل افسر موصوف کو بھیجی اور اصل کہیں پھینک دی۔ میں ان نظموں کی نقلیں کبھی کبھار محفوظ کر لیا کرتا تھا اس وقت ان نقلوں کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ مقالہ یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے اور کتابوں، بیاضوں یا کاغذات سے اشعار نقل کرنے سے اس کی نوعیت بدل جائے گی۔ کلور کوٹ ہی کے زمانے کی بات ہے۔ ایک دفعہ دریائے سندھ کے سیلاب نے ضلع میانوالی کے کچا وطاس (دریائی دیہات) کو برباد کر دیا۔ ملک زمان مہدی خان ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایس۔ ڈی۔ او کوئی رستم کیانی صاحب تھے۔ طوفان زدہ لوگوں کی امداد کا کام ان افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک فیروز خان نون وزیرِ تعلیم تھے۔ وہ امداد کے انتظام کا معائنہ کرنے اور تباہ شدہ لوگوں کی ڈھارس بندھانے آئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے والد کو نظم کہنے کی "فرمائش" کی۔ آپ نے فی البدیہہ نظم کہی۔ چند اشعار سنئے ؎

خستہ جاناں را اماں آید ہمی　　　مرہم زخمِ نہاں آید ہمی

مژدہ بادا اے دل! کہ دورانِ بہار　　　بعدِ ایامِ خزاں آید ہمی

در ہوائش پُرفشاں گشتیم باز — یادِ عہدِ آشیاں آید ہمی
از سرِ ما شورشِ طوفاں گذشت — پُرسکوں دورِ زماں آید ہمی
ساحلِ امیدِ ما نزدیک شد — و[illegible] از دورے نشاں آید ہمی
از پئے امدادِ طوفاں دیدگاں — کشتیٔ [illegible] امان آید ہمی
کارِ عیسیٰ چوں زماں مہدی کند — از جوادِ [illegible] زباں آید ہمی
مانمی ترسیم از دشتِ بلا — رستیم ما از کیساں آید ہمی

از ستمہائے فلک ما را چہ غم
چوں ملک فیروز خاں آید ہمی

ملک فیروز خان نون کے نام کا ایک سجع بھی لکھا تھا:

[illegible] فیروز [illegible] در جہاں کردند
از آں فیروز خاں [illegible] نامم کردند

[illegible] مہینوں کا [illegible] افسوس [illegible] کا اُستحکام ہوتا رہا۔

[illegible] کیا ہے [illegible] اس فن میں آپ کو واقعی ایک کمال حاصل ہے۔ [illegible] حفیظ جالندھر[illegible] [illegible] آپ [illegible] ایک زمانہ [illegible] آپ جب بھی لاہور [illegible] صاحب سے ضرور ملتے تھے [illegible] صاحب بھی جب کبھی [illegible] [illegible] ایک دفعہ [illegible] لاہور آئے [illegible] حفیظ صاحب [illegible] میں بالاخانہ [illegible] لے لیا تھا۔ آپ وہاں پہنچے [illegible] آپ نے [illegible] یہ شعر لکھے اور وہ [illegible]

[illegible] بالاخانہ [illegible] — [illegible] تو [illegible] ہوں
[illegible] — بازار [illegible] آباد ہو
[illegible] — اب [illegible] برباد ہو گیا

[illegible]

[illegible] — قیامت [illegible] کی [illegible]
[illegible] — [illegible] جہاں [illegible]

کیا [illegible] لکھ کر [illegible]

[illegible]

[illegible] نظم "مسدسِ حالی" [illegible] اس وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] — ہوا اور کی جانب سے [illegible]
[illegible] سے [illegible] — . . . .

ہے مطلوب ہم کو نہ گریہ نہ خندہ

سنا نظم ایسی ملے جس سے چندہ

مسدس بہت طویل تھا اور پھر بزبان حفیظ۔ حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ چندہ بھی خاصا جمع ہوا اور وعدے تو ہزاروں تک [illegible] گئے۔ جب چندہ بازی کی افراتفری ختم ہوئی تو والد نے صدرِ بزم قبلہ شیخ سر عبدالقادر سے جو ان کے قریب تشریف فرما تھے مخاطب ہو کر کہا ؎

حفیظ کہتے تھے احباب بس کو بندہ نواز

بنا ہے گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور یہ شعر حفیظ صاحب کو سنایا۔ حفیظ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے اور قبلہ شیخ صاحب نے اسی چندے کے موضوع پر اکبر الہ آبادی کے متعدد اشعار سنا دیئے۔

اجلاس تھوڑی دیر کے لئے برخاست ہوا۔ غالباً نماز کے لئے۔ حفیظ صاحب نے اعلان کر دیا کہ حضرات! جناب مخروم دوسری نشست میں بھی اپنا کلام سنائیں گے۔ والد کے پاس دوسری نشست کے لئے کوئی نظم نہ تھی۔ وقت بھی بہت کم تھا لیکن چونکہ اعلان ہو چکا تھا انہوں نے فی البدیہہ ایک نظم کہنا شروع کر دی اور جب چند لمحوں کے بعد ان سے کلام سنانے کے لئے [illegible] گیا تو یہ اشعار ان کی زبان پر تھے ؎

اے ملتِ اسلام [illegible]
[illegible] عامہ [illegible] گلزار
[illegible] مدرسہ [illegible] ہے گویا
اشجار [illegible] عالم [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہیں کہیں [illegible]
[illegible] اک [illegible]
[illegible] ترنم میں لئے [illegible]
بلبل نظر آتی ہے یہاں [illegible] کی
[illegible] ہو [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] باش [illegible]
[illegible] میں [illegible]
[illegible] کتنا [illegible]

[illegible]
[illegible] کی
[illegible] کی

علامہ اقبال کا ذکر تھا۔ انہوں نے اقبال کی موت کی خبر سنتے ہی [illegible] تھا۔ علامہ کے انتقال کی خبر [illegible] اسی وقت مرحوم کے اعزاز میں اسکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آئے۔ مجھے بتایا کہ اقبال اس دنیا میں نہیں رہے۔ پھر کہنے لگے ایک [illegible] میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی۔ آپ حقے کے ہر کش پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے [illegible] نہاں [illegible] لیا

احساس میں سما گیا [illegible] گیا

جب آپ یہ اشعار لکھوا چکے ؎

رنج مزار [illegible] کو چھوڑ کر

کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا

قدسی نژاد [illegible] سماوات پر گیا

[illegible] سے سلامت گزر گیا!

باغِ جہاں میں صورتِ گُل ہنس کے تو رہا ۔۔۔ باغِ جہاں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں ۔۔۔ خورشیدِ جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا
"ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق" ۔۔۔ روشن تر اس حقیقت روشن کو کر گیا

تو میں نے کہا کہ اس نظم میں آپ "مر گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے؟ کہنے لگے کیوں؟ میں خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ "مر گیا" کا قافیہ شعر کو بے جان کر دے گا۔ انہوں نے آخری شعر لکھ لیا اور وہ شعر یہ ہے ؎

محروم! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبالؔ مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں کس قدر غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبالؔ کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آ گئی کہ وہ ہال ہم لوگوں کو نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا اسے ملتوی کرنا اب ہمارے بس میں نہ تھا چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب رتنسیل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام مدعوئین کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والد بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے مقامِ جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن
ماتمِ اقبالؔ باید کرد در صحنِ چمن

وقارؔ انبالوی کے ساتھ بھی ان کے مراسم بے تکلفی کی حد تک دوستانہ ہیں۔ وقارؔ صاحب پہلے روزنامہ "پرتاب" میں کام کرتے تھے، وہاں سے "احسان" میں آ گئے۔ والد کی ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ؎

جس دن سے اُدھر سے تو اِدھر آیا ہے ۔۔۔ چشمِ بینا کو کم نظر آیا ہے
"احسان" پہ بھی احساں تھا ضروری لیکن ۔۔۔ "پرتاب" کو بے وقار کر آیا ہے

یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ وقارؔ صاحب نے یونہی باتوں میں ان سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ والد ایک آدھ منٹ تک خاموش رہے پھر بولے ؎

ہو لاکھ مٹے خودی سے ہٹلر سرمست ۔۔۔ ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی ۔۔۔ کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر شاعر ایڈیٹر ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقارؔ نے فوراً یہ رباعی نکھ لی اور اگلے دن اپنے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کر دی۔

اسی سفرِ لاہور کا ذکر ہے۔ وقارؔ اور والد اکٹھے جا رہے تھے۔ دیواروں پر جابجا سینما کے پوسٹر نظر آئے۔ ان پر وہی عام تصویریں تھیں، نیم عریاں۔ وقارؔ نے تصویروں کی جانب اشارہ کیا اور کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ والد نے جواب میں کہا ؎

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر ۔۔۔ آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں
خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا ۔۔۔ منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

سینما دیکھنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے زندگی بھر میں آپ نے دو چار تصویریں ہی دیکھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بھی

جہاں تک اخلاقیات کے عام اصولوں کا تعلق ہے آپ صرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہی نہیں رہے بلکہ بقول مولانا عبدالمجید سالک "ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلّم اخلاق رہے ہیں۔" ان کی روزمرّہ کی زندگی میں بھی مجھے ایک باقاعدگی اور ضابطہ نظر آیا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انہیں صبح کے ناشتے میں دودھ کے ایک گلاس کے سوا کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ ان کا یہ طریقہ آج تک جاری ہے۔ گھر پر تو اس معمول میں تبدیلی پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں، سفر میں ہوں تو بھی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس میں بے قاعدگی نہ ہو۔ چائے بالکل سے انہیں کوئی رغبت نہیں۔ لسّی کو تو جو ہم اہلِ پنجاب کی "قومی" غذا ہے بالکل استعمال نہیں کرتے۔ چائے کے لئے روزانہ کا ہونا شرط ہے۔ دودھ کے بعد پھلوں کا نمبر آتا ہے اور پھل کے بارے میں اس قدر "احتیاط" سے کام لیتے ہیں کہ پھل بالکل بے ذائقہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک پھلوں کا چھلکا بہت مضر چیز ہے۔ اس سے پرہیز لازمی ہے چنانچہ اس اصول کے تحت وہ انگور تک کا چھلکا اتار لیتے ہیں گھر کے باقی لوگوں کو انگور کھانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہیں۔ اکثر اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ جہاں تک انگور کا تعلق ہے اسے چھیلنا ترک کر دیں لیکن وہ اپنی وضع پر قائم ہیں۔

صحت کے پیشِ نظر وہ ٹماٹر بھی اکثر استعمال کرتے ہیں اور اس کا بھی چھلکا اتار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھلکا اتار لینے کے بعد ٹماٹر میں کیا باقی رہ جاتا ہو گا۔ شاید انہی باقاعدگیوں کا اثر ہے کہ صحت ان کی اس وقت تک اچھی ہے لیکن بعض عارضے ایک زمانے سے ان کے ساتھ ہیں۔ لڑکپن میں جب تیراکی کا شوق تھا تو دریائے سندھ میں ایک بار گہری چھلانگ لگائی۔ شوق تو پورا ہو گیا لیکن "ہرنیا" مستقل طور پر زندگی کا رفیق بن گیا۔ یہ اور اس کے ساتھ عرق النسا دونوں کبھی کبھی بڑی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ دوائیں آپ کی ہر لحظہ کی ساتھی ہیں۔ باہر کہیں سفر پر جاتے ہیں تو دس بارہ دوائیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نمک، مرچ اور چینی وغیرہ شیشیوں میں بند کر کے الگ ساتھ۔ کہتے ہیں مشاعرے میں کہیں جاتے ہیں تو تمام شعراء کے لئے ان کی دواؤں کی پیر ہیرٹ کا باعث ہوتی ہے۔ دوائیں ساتھ لے کر ان کی سفر کی عادت شعراء میں بہت شہرت پا چکی ہے۔ ایک دفعہ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ قتیل شفائی والد سے ملنے آئے۔ جہاں شعراء کا قیام تھا وہاں دو چار کمروں میں وہ گئے۔ والد موجود نہیں تھے ایک کمرے میں میز پر مختلف دواؤں کی دس پندرہ شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ ان کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہی کمرہ والد کا تھا۔

اتفاق کی بات ہے اسی مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سامعین کا ہجوم دیکھ کر بیہوش ہو گئے۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا ہم لوگ ان کو بڑی مشکل سے قیام گاہ تک لے آئے۔ والد کے پاس "امرت دھارا" موجود تھی۔ اس وقت وہ کام آئی اور شاعر صاحب اگلی صبح اچھے بھلے ہو کر رات کے مشاعرے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ایک نسل ان کا کلام پڑھتی چلی آ رہی ہے اس لئے ان کی عمر کے بارے میں اکثر غلط اندازے موجود ہیں۔ ایک بار جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد ان سے ملنے گئے، انہوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اب آپ بمشکل لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ حیرت انگیز طور پر غلط تھا۔ اس واقعہ کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں اور آج بھی جب کہ والد کی عمر تقریباً ستر برس کی ہے آپ عصائے پیری کا سہارا لئے بغیر باقاعدہ کالج جاتے ہیں اور اب اس چھڑی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے جو چند برس پہلے ان کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی۔

عبدالرزّاق ملیح آبادی

شاہد خاں

خاندان، پٹھان - وطن، ملیح آباد - تاریخ پیدائش معلوم نہیں - خود کو مولانا آزاد سے زیادہ پرانا کہتے ہیں! عمر کبھی چھیاسی برس کی کبھی ننانوے برس کی بتاتے ہیں - لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جوش ملیح آبادی سے، جو ان کی والدہ کے سگے چچیرے بھائی ہیں، کہیں چھوٹے ہیں۔

قد، چھوٹا ہے - بدن گٹھا ہوا ہے - لیکن ڈیل ڈول کچھ اس وضع کا ہے کہ بونا کوئی نہیں کہہ سکتا - رنگ صاف ہے - سر بڑا ہے - کلّا بھی چوڑا چکلا ہے - لوگ بد صورت نہیں کہتے۔

مزاج کس قسم کا ہے؟ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا - کچھ معمّہ سا ہے - شاید چوں چوں کا مربہ ہے - بالکل ٹھنڈے، جیسے برف کی سل بالکل گرم، جیسے آتش فشاں کی چٹان - بہت ہی ہنس مکھ، بہت ہی خشک - ہنسنے پر آئیں، تو خود بھی کھلکھلائیں اور روتوں کو بھی ہنسا دیں۔ منہ بنالیں، تو خود بھی تیوریاں چڑھالیں اور ہنستوں کو بھی روانسا بنا دیں۔

لیکن اکھڑ ضرور ہیں - ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ چوہے مارنے کے لئے سنکھیا لائے تھے اور وہ میز پر سامنے رکھی تھی - دوستوں سے بحث چل پڑی کہ قوتِ ارادی مضبوط ہو تو آدمی سب کچھ کر سکتا ہے - ایک دوست نے کہا "لغو بات ہے، کوئی صاحب فرمائیں کہ میری قوتِ ارادی بڑی سخت ہے اور سنکھیا کا یہ ڈلا کھالیں تو نتیجہ کیا ہوگا؟ اینٹھ کر رہ جائیں گے اور قوتِ ارادہ کھڑی فاتحہ پڑھتی ہوگی!" اس پر انہوں نے وہ پورا ڈلا چبا کر اوپر سے پانی پی لیا - اور کہنے لگے، ابھی ثبوت ملا جاتا ہے - مجھے کچھ بھی نہ ہوگا! یقیناً یہ پٹھانی جہالت تھی - مرنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی؟ مگر ایسے اجڈ لوگوں کا ساتھ شاید سحری قدرت بھی دے دیا کرتی ہے - حضرت کا سر تو پندرہ دن گھوما، مگر پہلے سے کہیں زیادہ تندرست ہو گئے - سر کے بال بھورے تھے اور چہرے کا رنگ پیلا - سنکھیا کے طفیل بال کالے بھونرا ہو گئے اور رنگ گہرا سرخ! خود کہا کرتے ہیں "سنکھیا کھانے کے بعد ایسی توانائی پائی ہے کہ پہلے تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا - بس جی چاہتا ہے اڑتے پھرو!

الھڑپن کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی لکھ دینا مناسب ہے کہ یا تو بیمار ہی نہیں ہوتے، اور ہوتے ہیں تو جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مصر میں ٹائیفائڈ کا شکار ہوئے۔ اور مصر میں ٹائیفائڈ ہندوستان میں پلیگ کی طرح اُن کے زمانے میں مہلک ہوا کرتا تھا۔

مصر سے واپسی پر بمبئی کے ایک مریض کی تیمارداری کر رہے تھے کہ اُس نے قے کی اور اِن کے منہ میں چلی گئی۔ اُسی وقت خود بھی مبتلا ہو گئے پھر جب کلکتہ میں مولانا آزاد کے ساتھ تھے، تو دوبارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے اور جب اچھے ہوئے، تو خود اپنے ہاتھوں کالا آزار کے جنگل میں گرفتار ہو گئے اور آٹھ مہینے بیماری سے گُتھم گُتھا کرتے رہے۔ ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے کینسر کے رگڑے میں آئے۔ خوشی خوشی بمبئی علاج کرانے گئے، اور ہنستے کھیلتے لوٹ آئے!

ایسی ایسی مہلک بیماریوں میں پھنسے، مگر کبھی پرہیز کیا نہ ڈاکٹر کی کسی ہدایت پر عمل۔ کبھی کبھی کہا کرتے ہیں "اپنی فکر کرنا حماقت ہے، خدا کو غرض ہوگی، تو ہمیں دُنیا میں رکھے گا، نہ غرض ہوگی تو اُٹھا لے گا۔ ہم کب اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے کہ زمین کو دانتوں سے دابے بیٹھے رہیں! پھر ہنس کر کہتے ہیں اللہ میاں اُس کو جلدی مارتے ہیں جو موت سے ڈرتا ہے۔ موت سے نہ ڈروگے، تو ملک الموت تم سے ڈرنے لگے گا!

ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ موٹا پہنتے ہیں۔ موٹا ہی کھانا چاہتے ہیں، اگرچہ کھانے نہیں پاتے۔ بھدّی چیزیں ہی استعمال کرنا پسند کرتے ہیں، مگر ساتھیوں کے لئے بھدّی چیزیں گوارا نہیں کرتے۔ نفیس سے نفیس، نازک سے نازک چیزیں اُن کے استعمال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

نہایت چُست، چالاک چوبند ہیں۔ چلتے ہیں تو بہت تیز چلتے ہیں، لیکن بڑے ہی سُست بھی ہیں۔ بیٹھتے ہیں تو ہفتوں بیٹھے ہیں۔ بیٹھ گئے، تو اُٹھنے کا نام ہی نہیں۔

صنّاع ہونے کا بھی چشم بددور دعویٰ ہے۔ بھوپال سے مولانا آزاد کی بہن، سانبھر کا چمڑا لائیں، تو حضرت نے بغیر فرمے کے ایک جوڑا جوتا بنانا شروع کر دیا۔ مولانا دیکھتے اور ہنستے۔ فرماتے "مولوی صاحب آپ بھی وقت کو قتل کرنا خوب جانتے ہیں"۔ اور یہ حضرت مسکرا کر جواب دیتے "بن جائے گا، تو آپ ہی داد دیں گے"۔ اور جوتا بن جانے کے بعد واقعی مولانا نے داد دی تھی۔

خیاطی کا بھی دعویٰ ہے۔ ایک دفعہ اپنی دو شیروانیاں خود ہی کاٹیں اور خود ہی سیں۔ اتفاق سے ایسی فٹ ہوئیں کہ ملیح آباد کا ہیڈ درزی جو تعلقہ داروں کی شیروانیاں سیا کرتا تھا، دیکھ کر کہنے لگا، ہم سے ایسی شیروانی نہیں سلے گی۔ یہ تو حیدرآباد کی سلی ہوئی ہے، اور جب اُسے سلائی دکھائی گئی تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔" واقعی شیروانی تو آپ ہی نے سی ہے، کیونکہ ہاتھ کی یہ سلائی درزیانہ نہیں ہے!"

بال کاٹنے میں بھی خود کو استاد سمجھتے ہیں۔ مردوں ہی کے نہیں، لیڈیوں کے بھی۔ مردوں، عورتوں کے بال تراشنے کے سبھی فیشنوں پر نگاہ رہتی ہے۔ جیل میں مولانا آزاد صاحب کو قیدی نائی کے سامنے بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ یہ صاحب بول اُٹھے۔ "میں آپ کی حجامت بنا دوں گا۔" بیٹھ، تو مولانا حجامت کے مواد رے پر ہنسے، پھر فرمایا "مولوی صاحب! آپ مجھے کیسا بھیڑ بنانا چاہتے ہیں؟ ـــــ کیا آپ نائی ہیں"؟ ـــــ بڑی منتوں، خوشامدوں کے بعد مولانا کی حجامت بنا دی گئی اور مولانا حیرت میں پڑ گئے!

کہا کرتے ہیں "بچپن میں، بڑا تیز اور ذہین تھا، لیکن نو دس برس کا ہوا تو اوّل درجے کا گھامڑ سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ ایسا تھا نہیں لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے خود بیوقوف بن گیا تھا"!

سنہ ۱۹۱۳ء میں مصر کا سفر اختیار کیا۔ خاندان میں اب تک پہلے آدمی ہیں، جس نے حج کے علاوہ ہندوستان سے باہر سفر کیا، سفر مصر کے وقت انگریزی سامراج کے کٹّر دشمن بن چکے تھے، اور اسی لئے سفر کیا تھا کہ لوٹ آئیں تو ملک میں انقلاب برپا کریں گے۔

مصر میں چار سال رہے۔ عربی پڑھی۔ مصر کیوں گئے؟ عربی کیوں پڑھی؟ خود بتایا کرتے ہیں، مسلمانوں کے اُٹھنے سے پہلے ہندوستان میں انقلاب ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور مسلمانوں کو وہی اُٹھا سکتا تھا، جو اسلام سے کما حقہٗ واقف ہو، اور دنیا دار ملاؤں کی، جو مسلمانوں سے جونکوں کی طرح چمٹے ہوتے ہیں، پوری طرح قلعی کھول سکے۔

مصر کی زندگی ہولناکیوں سے لبریز رہی۔ اُسی زمانے میں قسطنطنیہ بھی گئے۔ ترکی حکومت ''جہانِ اسلام'' کے نام سے تین زبانوں میں ایک اخبار نکالا کرتی تھی۔ ترکی، عربی، اُردو۔ یہ حضرت پہنچتے ہی اُردو حصے کے ایڈیٹر بن گئے۔ انور پاشا سے اور دوسرے مدبروں سے ملاقاتیں رہیں۔ قسطنطنیہ ہی میں تھے کہ پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ انہوں نے انور پاشا سے منتیں، ضدیں کیں، مگر موصوف نے ترکی فوج میں حصہ لینا منظور نہ کیا۔ فرمانے لگے ''کم عمر ہو۔ تعلیم حاصل کرو۔ حکومت تمہارے مصارف کی ذمہ دار رہے گی۔ پھر یہ مشکل بھی ہے کہ بین الاقوامی قوانین کی رُو سے ہم کسی غیر ملکی کو اپنی فوج میں نہیں لے سکتے۔ جنگ کی حالت میں یہ پابندی باقی نہیں رہتی، لیکن ابھی تک ہم جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔''

اِدھر سے مایوس ہو کر مصر واپس آئے اور پہنچتے ہی انگریزی مارشل لا کے چنگل میں پھنس گئے۔ لمبی داستان ہے اور اس داستان کا یہ موقعہ نہیں۔ قسطنطنیہ میں امیر شکیب ارسلان، عبدالعزیز شاویش، عبدالحمید زہراوی، سیّد صالح تونسی، ابو سعید الہندی العربی، مرزا عبدالقیوم دہلوی، عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری، لالہ ہردیال جیسے انقلابیوں سے ملاقاتیں رہیں۔

پہلی عالمگیر جنگ شباب پر تھی مگر یہ صاحب اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ تُرکوں سے لڑانے والی ہندوستانی فوجوں کو انگریز پہلے مصر میں اُتارتے تھے۔ قاہرہ کے مضافات میں ایک مقام ''زیتون'' ہے۔ یہیں چھاؤنی ہوتی تھی اور یہ حضرت بھیس بدل بدل کے فوجوں میں چلے جاتے اور انقلابی پروپیگنڈا پھیلاتے۔ اتفاق سے ایک روز ایسا ہوا کہ ایک فوج میں بیٹھے اپنا ''انقلاب'' چھانٹ رہے تھے کہ دفعتاً دو سپاہی فوج کی بھیڑ چیر کر نکل پڑے اور گلے مل کر زار زار رونے لگے۔ اب جو یہ حضرت دیکھتے ہیں، تو دونوں ملیح آباد کے، اور اپنے خاندان کے۔ ہاتھوں کے توتے (طوطے) اُڑ گئے۔ مگر اب کرتے تو کیا کرتے!

اِس طفلانہ انقلابی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین ہزار ہندوستانی فوجی، جن میں مسلمان، ہندو، سکھ سبھی تھے ''باغی'' ہو گئے اور مصر میں فوجی ہنگامہ برپا کرنے کی اسکیم بھی انہوں نے پیش کر دی، مگر اِس مہم کے لئے بڑے ساز و سامان کی ضرورت تھی اور ساز و سامان یہاں مفقود تھا۔ کچھ نہ ہو سکا، لیکن یہ سچے انقلابی مجاہد اپنی قسم کے دھنی نکلے۔ انگریز انہیں تُرکوں کے مقابلے پر نہر سویز لے گئے اور انہوں نے لڑنے سے اِنکار کر دیا۔ انگریزوں نے سب کو مشین گنوں سے اُڑا دیا۔ ملیح آبادی صاحب کہتے ہیں کہ آج تک اِس حادثے پر خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ یہ بیش بہا خون میری گردن پر ہے!

متضاد طبیعت تو ہے ہی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی پڑھنے ہی کے لئے داخل ہوئے تھے۔ مگر وہاں فٹ بال کھیلنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ یہاں تک کہ دن دن بھر اکیلے فٹ بال کھیلا کرتے، زبردستی امتحان پاس کرتے چلے گئے۔ لیکن درجۂ چہارم میں سب کتابیں صرف عربی میں تھیں۔ اور یہ حضرت عربی کی پہلی گردان کے بھی حافظ نہ تھے۔ مجبوراً مصر بھاگے، اور وہاں ذہن ایسا کھلا کہ نو ۹ مہینے کے اندر ہی درسگاہ میں سب سے بازی لے گئے۔ اِن کے دو ہم سبق بہت مشہور ہوئے: مفتی امین الحسینی (فلسطین) اور شیخ یوسف یاسین، جو اِس وقت سعودی حکومت کے ایک بڑے رُکن ہیں۔

یا تو چار برس ایک عربی لفظ نہ پڑھا تھا اور یا پھر نو مہینے میں عربی کے، عالم، ادیب، انشاء پرداز اور مقرّر بن گئے۔ علامہ رشید رضا مرحوم نے جو استاد تھے، اپنے اِس شاگرد سے ایسا رشتہ جوڑا جو باپ بیٹے کے رشتہ سے بھی سوا تھا۔ اُستاد کا آخری خط شاگرد کو استاد کی وفات کے دسویں دن ملا۔

مصر میں چار سال پڑھنے اور ہنگامہ آرائی کرنے کے بعد حجاز گئے۔ شریف مکّہ، حسین بن علی نے تُرکوں سے بغاوت کی تھی، اور مصر کے حاجی اب مکّے جا سکتے تھے۔ یہ حضرت بھی ''حج'' کے لئے تیار ہو گئے۔ سفر کی اصل غرض یہ تھی کہ شریف حسین کی بغاوت کے راز معلوم کریں اور حجاز سے چپکے سے ہندوستان بھاگ آئیں، مگر جدّہ میں شریف کی پولس نے گرفتار کر لیا۔ لمبی کہانی ہے، بڑی مشکل سے جان بچی اور ہندوستان

واپس آئے۔

سب حالات کیسے لکھے جائیں؛ مختصر یہ کہ بچپن سے انگریزی سامراج کو برباد کرنے کی قسم کھائے بیٹھے تھے اور پوری زندگی اسی خبط میں گزار دی۔ پہلے لکھنؤ میں، مولانا عبدالباری مرحوم فرنگی محل کے ساتھ ایک خفیہ انجمن بنائی اور ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیئے، مولانا حسرت موہانی مرحوم بھی اس انجمن کے ایک ممبر تھے، اور پڑھنے والے یہ سُن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ مولوی مظہرالدین شیرکوٹی، ایڈیٹر (الامان، دہلی بھی شروع شروع اس انجمن کے سرگرم رُکن تھے۔ لعد میں انگریزوں سے مل گئے، مگر خدا مرحوم کو جزائے خیر دے کہ آخری وقت تک انجمن کا راز فاش نہیں کیا، ورنہ بہت سی لاشیں پھانسی کے تختوں پر لٹکتی نظر آتیں۔

پھر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ساتھ ہو گئے اور جم کر دس سال اُن کے پاس رہے۔ اِن کے اخباروں، پیغام، پیام الجامعہ (عربی) اور الہلال کو ایڈٹ کرتے رہے۔ کلکتہ ہی میں دو سال جیل کو بھی آباد کیا۔ "اصحاب سجن" میں مولانا آزاد کے علاوہ سی آر داس اور سبھاش چندر بوس بھی تھے۔

مولانا آزاد نے پچاس روپیہ ماہوار جیب خرچ دینا تجویز کیا تھا، مگر بیچ میں تین سال ایسے بھی گزرے کہ خود مولانا کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ اِس دوران میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ اور اُن کے شاگردِ رشید، ابنِ قیم کی کئی کتابیں ترجمہ کر ڈالیں جو (الہلال بُک ایجنسی (لاہور) کے ہاتھ بیچ کر بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔

جب مولانا کے ہاں کام نہ رہا تو اُن کی اجازت سے الگ ہو گئے، مگر کلکتہ ہی میں رہے۔ اب ایک پیسہ کا بھی کہیں سے سہارا نہ تھا۔ دفعتاً طے کر لیا کہ مصری اخباروں کی نامہ نگاری کریں گے۔ اور مصر کے سب سے بڑے تین اخباروں: المقطم، الاہرام، اور البلاغ کے نامہ نگار بن گئے۔ اتوار کے دن آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کام کرتے، تینوں اخباروں کے مضمون تیار ہو جاتے، جس سے کئی سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی ہونے لگی۔

پھر خود اپنا اخبار ڈبل کراؤن کے آٹھ صفحوں پر کلکتہ ہی سے نکالا۔ ہند نام رکھا۔ اُس وقت کلکتہ میں دو روزانہ نکلتے تھے: عصرِ جدید اور جمہور۔ جمہور میں چراغ حسن حسرت مرحوم کام کرتے تھے۔ یہ دونوں اخبار شام کو نکلا کرتے جو ایک ورق کے ہوتے، خبریں انگریزی اخباروں سے ترجمہ کر لی جاتیں۔ ہند بالکل اَپ ٹو ڈیٹ نکلا۔ کمپنی سے خریدی ہوئی تازہ ترین خبریں، ایڈیٹوریل، اور وہ سب کچھ جو کسی مہذب اخبار میں ہونا چاہیئے۔ مگر لطف یہ کہ بغیر کسی سرمایہ کے نکالا۔ خوش قسمتی سے کاتب بھی وطن بر مل گئے، اور پریس والا بنگالی بابو بھی نہ جانے کیوں معتقد تھا۔ کسی کارکن کی کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ رات کو چنے بھگو دیئے جاتے اور دن بھر اخبار کا پورا عملہ، اپنے نشان پر کھڑا یہی دانہ کھایا کرتا۔ اور خود "سپہ سالاری" فرماتے تھے۔ مزے لے لے کر چنے چاتے .. .. اور چنے کے فضائل و محاسن پر آسمان زمین کے قلابے ملایا کرتے!

غرضیکہ اخبار چلا، خوب چلا۔ کاتب تک اپنے کچے گھروں کو پکا کر کے مطمئن ہو گئے۔ اُن کی اور اُن کے بھائیوں کی شادیاں بھی اخبار ہی کی آمدنی سے ہو گئیں۔ مگر خود جیسے بے سرو سامان تھے۔ ویسے ہی رہے اور اب خود ہی بتایا کہ "جو کچا جھونپڑا، سر چھپانے کو تھا، وہ بھی پچھلے سال کی برسات میں سربسجود ہو گیا! اور اِس پر بہت خوش ہیں کہ اب ساری دنیا ہمارا گھر بن چکی ہے!

خیر سے "دوستوں" کے رسیا بھی ہیں۔ ایک دوست مل گئے بیس۲۰ بائیس۲۲ برس دوستی کے حقوق ادا فرماتے رہے۔ حضرت کو سولہ آنہ بھروسہ ہو گیا۔ اخبار کو کمپنی بنا چکے تھے اور "دوست" کو کمپنی کا ڈائرکٹر۔ پھر لندن تشریف لے گئے، اور "دوست" کی "عنایت" سے اخبار ہی سے بے دخل ہو گئے!

اب پھر وہی ڈھاک کے تین پات ہاتھ میں تھے، لیکن شکست ماننے والے بھی نہ تھے، فوراً "ہفتہ وار" اجالا "جاری کر دیا، اور پہلے ہی نمبر سے اشاعت چار ہزار سے اوپر تھی۔ کسی نہ کسی طرح پریس بھی قائم کر لیا، اور آزاد ہند کے نام سے روزانہ بھی جاری کر دیا۔ یہ دونوں اخبار بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں، اور ان کے ہونہار لڑکے، مسٹر احمد سعید انہیں سنبھالے ہوئے ہیں۔

پھر ۱۹۴۹ء کے اواخر میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ایما پر دہلی چلے آئے۔ اب ہندوستان کی ثقافتی کونسل کے سہ ماہی علمی رسالے "ثقافت الہند" کو بھی ایڈٹ کر رہے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبہ کے سپروائزر بھی ہیں۔

علمی مشاغل پر میں نے کچھ نہیں لکھا۔ ملک بھر ان مشاغل سے واقف ہے۔ بہت سی تالیفیں اور ترجمے نکل چکے ہیں۔ بہت سے مسودے طباعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ اتنا لمبا علمی ادبی ساتھ رہا، مگر مولانا کا اسلوبِ نگارش قبول نہ کیا خود کہا کرتے ہیں۔ "مولانا کا اسلوب، مولانا ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اُس کی نقل اُتارنا، اپنی فضیحت کرنا ہے"۔

خود اپنا ایک اُسلوب پیدا کر لیا ہے۔ یہ اسلوب عجیب و غریب ہے۔ نہایت آسان، عام فہم، اور دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی محاسن سے بھرا پڑا ہے۔ مضمون تو مضمون اِن کی کتابیں کی کتابیں پڑھ جایئے، نہ اُلجھے ہوئے جملے ملیں گے، نہ بوجھل عربی فارسی لفظ۔ سیدھی سادھی ہموار تحریر ملے گی۔ کہیں آپ کو رُکنا نہ پڑے گا۔ مطالب بے تکلف ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں گے۔ خود کہا کرتے ہیں "میری اخبار نویسی کے کامیاب رہنے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اتنا آسان لکھتا ہوں کہ عورتیں اور بچے تک سمجھ جاتے ہیں"۔ تحریر میں ہلکی سی ظرافت اور چھپی ہوئی چٹکیاں ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا اُکتاتا نہیں بلکہ چٹخارے لیتا ہوا پڑھتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

ضیاء الحسن فاروقی

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم   بہ ایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

سنہ ۱۹۴۴ء میں میں جب میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو میرے زیرِ مطالعہ ایک کتاب تھی 'پردۂ غفلت' بیداریٔ شعور کی اس منزل میں مجھے کتاب کے مصنف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بس 'پردۂ غفلت' کے پلاٹ اور کرداروں سے اُلجھا ہوا تھا۔ مصنف کو میری جماعت کا کوئی طالب علم نہیں جانتا تھا اور شاید جو استاد ہم لوگوں کو اُردو پڑھاتے تھے انہیں بھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک بڑا ادیب اور انشا پرداز ہے۔

میٹرک کے بعد جب میں علی گڑھ پہنچا تو وہاں ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کی ہوئی اسٹینڈرڈ انگلش۔ اُردو ڈکشنری کی تالیف و ترتیب میں مولوی عبدالحق کے علاوہ جس شخص کی ذہنی و علمی کاوشوں کی آمیزش ہے اس کا نام ڈاکٹر سیّد عابد حسین ہے اور وہ جامعہ ملیہ۔ دہلی میں پروفیسر ہے۔ اس کے بعد مجھے اس پروفیسر کے بارے میں اور جاننے کا اشتیاق ہوا۔ ملنے کا موقع تو بہت بعد تک نہیں ملا البتہ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں میں نے عابد صاحب کے وہ ترجمے پڑھے جن کا اس وقت وہاں چرچا تھا. خاص طور سے میرے ایک دوست جو سائیکالوجی کے طالب علم تھے۔ نفسیاتِ عنفوانِ شباب کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور عالم ایڈورڈ اشپرانگر کی کتاب سائیکالوجی آف یوتھ (Psychology of youth) کا۔ ترجمے کے شروع میں جو دیباچہ ہے اس سے مترجم کی عالمانہ ژرف بینی کا کسی قدر اندازہ ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مترجم پروفیسر اشپرانگر کا شاگرد ہے اور برلن یونیورسٹی کا پی۔ایچ۔ڈی —— جگ بیتی جو پنڈت نہرو کی مشہور عالم Glimpses into World History کا ترجمہ ہے اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش جو خالدہ ادیب خانم کی تقریروں کے مجموعے Struggle between the East and the West in Turkey —— کا ترجمہ ہے —— یہ دونوں ترجمے بھی میں علی گڑھ ہی میں پڑھے۔ یہ دونوں کتابیں میں نے مولانا ضیا احمد بدایونی

(ریڈر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے کہنے پر انگریزی میں بھی پڑھیں (مولانا یوں تو مجھے فارسی پڑھاتے تھے لیکن اُردو کے متعلق میرا ذوق شوق دیکھ کر بڑے مفید مشورے دیتے تھے) اس وقت تو میں نہ سمجھ سکا کہ مولانا نے اُردو یا فارسی کی کسی کتاب کے بجائے انگریزی کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ کیوں دیا لیکن دو تین ہفتے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ دونوں کتابیں میں نے پڑھ لی ہیں تو فرمایا کہ "آپ نے مجھ سے کسی موقع پر جگ بیتی اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش کا ذکر کیا تھا۔ اب آپ یہ بتایئے کہ ڈاکٹر عابد حسین کے بارے میں بحیثیت مترجم کے آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "میں اس نقطۂ نظر سے تو ان کتابوں کا مطالعہ کیا نہیں اور پھر ایسے مسائل کے بارے میں ابھی میری رائے ہی کیا۔ البتہ مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ باوجود یہ جاننے کے کہ جگ بیتی ترجمہ ہے دوران مطالعہ میں کسی موقع پر یہ نہیں محسوس ہوا کہ یہ ترجمہ ہے"۔ کہنے لگے "یہی مترجم کا کمال ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی مضمون یا کتاب کا منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا چاہیئے اور پھر سب سے اہم کام الفاظ کے صحیح انتخاب کا ہے' اس پر اسے پوری قدرت ہونی چاہیئے ——— ڈاکٹر عابد حسین میں یہ دونوں کمال بدرجہ اتم موجود ہیں"۔

۱۹۴۸ء میں، میں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے کرنے کے لئے میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مجھے عابد صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ اخبار "نئی روشنی" کی خبر ملی۔ عابد صاحب سے جو ذہنی تعلق قائم ہو گیا تھا اس نے ایک دن "نئی روشنی" کو ڈھونڈ ہی لیا۔ پھر جب تک "نئی روشنی" نکلتا رہا اس کی آمد کا برابر مجھے انتظار رہتا۔ اس میں مَیں نے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کئے اور اس طرح ایک طرح کا قلمی تعلق بھی قائم ہو گیا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور ملک کو، خاص طور سے مسلمانوں کو، آگ اور خون کے جس سمندر سے گزرنا پڑا اس سے ایک طرح کی انفعالی کیفیت سبھی پر طاری تھی۔ چاروں طرف اندھیاری تھی، راہ اور نشانِ منزل سب گم ہوتا نظر آ رہا تھا مسلمانوں پر افسردگی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی کیفیّت طاری تھی جو صحیح طور پر سوچنے، حالات اور ان کے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے لئے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج کئے دے رہی تھی۔ حالات کی ان تاریکیوں میں نئی روشنی نے بہت پریشان ذہنوں کو سیدھی راہ کا پتہ دیا اور جمود و تعطّل کے سیاہ بادل میں اُمید کی کرن بن کر منزل کی نشان دہی کی۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ عابد صاحب کا یہی ایک کام بہت بڑا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دماغوں میں وسعت اور دلوں میں گرمی ہے اور جو ملک و ملّت کا درد رکھتے ہیں۔ نئی روشنی میں "بزمِ بے تکلّف" کے نام سے ایک کالم ہوتا تھا۔ اس کالم کے ذریعے عابد صاحب نے طنز و مزاح کے پردہ میں بڑے بڑے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل چھیڑے اور اُن کی طرف لطیف اشارے کر کے ذہنوں میں ایک بے چینی پیدا کی۔ ایسی بے چینی کہ اگر صحت مند بنیادوں پر اس کی پرورش کی جائے اور اُسے زندہ رکھا جائے تو وہ کسی قوم کا بھی سرمایہ بن سکتی ہے۔ موجوں کا اضطراب دریا میں زندگی کی علامت ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گیا۔ غالباً ۵۰ء کے آخر یا ۵۱ء کے شروع میں مجھے جامعہ آنے کا اتفاق ہوا اور جامعہ پہنچ کر سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ کہ عابد صاحب کے دروازہ پر صدا لگائی۔ عابد صاحب اتفاق سے تشریف رکھتے تھے۔ فوراً شرف باریابی حاصل ہوا، بڑی شفقت سے بٹھایا، پہلے میرے بارے میں پوچھا پھر مدینہ اور نئی روشنی کے بارے میں گفتگو ہوئی، پھر عام مسائل چھڑ گئے۔ ایک ایسے شخص سے جو عمر میں بہت چھوٹا ہو، علم میں بالکل تہی مایہ ہو، عابد صاحب نے دو ڈھائی گھنٹے گفتگو کی، بڑے اطمینان، سکون اور تفصیل کے ساتھ۔ جب میں رخصت ہوا تو آپ یقین مانئے میری آنکھیں نم تھیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ شاید فرطِ مسرت میں کہ اتنے بڑے آدمی سے ملاقات ہوئی! شاید اس لئے کہ اپنی ہیچمدانی کے باوجود پہلی بار اپنی شخصیت کا احساس ہوا تھا اس لئے کہ میں اتنی طویل اور مفصّل ملاقات کی توقع لے کر نہیں آیا تھا" ایسی محبت اور شفقت کی امید نہ تھی۔ میں نے

بزرگوں سے سُنا ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جو چھوٹوں کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ چھوٹے ہیں۔

اس ملاقات کے بعد عابد صاحب کو میں کبھی کبھی خط لکھتا تھا۔ عابد صاحب فوراً جواب دیتے اور اگر کوئی بات مشورہ طلب ہوتی تو مزید مشورہ دیتے اور مجھے اطمینان ہو جاتا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں جامعہ آیا تو عابد صاحب جرمنی میں تھے۔ ۱۹۵۴ء میں جب وہ جرمنی سے واپس تشریف لائے تو مجھ سے بڑی محبت سے معانقہ فرمایا اور کہا کہ جامعہ میں تو آپ کا دل لگ گیا ہوگا! اُس دن سے کہ آج تک کہ دو سال ہو گئے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ شام کو ٹہلتے ہوئے۔ مقالے پڑھتے ہوئے۔ ادبی و علمی جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے۔ علمی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے۔ چائے پیتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے۔ کبھی کبھی حقے کے کش لگاتے ہوئے اور سگار پیتے ہوئے' (ڈاکٹر صاحب نے تمباکو نوشی ترک کر دی ہے۔ لیکن جب مجیب صاحب سگار پیش کرتے تو پی لیتے ہیں) اور میں کہہ سکتا ہوں کہ عابد صاحب کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور انوکھاپن، بڑی سادگی اور اچھوتا پن ہے۔ ذہن صاف اور دل بڑا ہے۔

عابد صاحب ۴ ار صفر ۱۳۱۴ھ (جولائی ۱۸۹۶ء) کو بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مرحوم سید حامد حسین صاحب ملازم تھے۔ انہیں اردو، فارسی اور عربی اچھی آتی تھی، شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ خاندان کی روایت کے مطابق عابد صاحب کی تعلیم بھی پہلے گھر پر شروع ہوئی۔ قرآن پڑھا اور پھر عربی اور فارسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ خاندان کے بعض بزرگ انہیں عربی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ ابتدائی کتابیں ختم کر لینے کے بعد انہیں لکھنؤ بھیجا جائے۔ اور وہاں سے وہ مجتہد بن کر آئیں اور اس کش مکش میں تیرہ چودہ سال گزر گئے۔ آخر کار 'قدیم' پر 'جدید' غالب آیا اور عابد صاحب ۱۹۱۰ء میں بھوپال کے جہانگیریہ ہائی سکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی اور خاصی اُردو سیکھ لی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے اوّل درجہ میں میٹرک پاس کیا اور اسکالرشپ ملا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ میور سنٹرل کالج' الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ میں اُنہوں نے ریاضی اور سائنس لی، مگر ان مضامین سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اس لئے ایف۔ اے میں سیکنڈ کلاس ملی۔ بی۔ اے میں جب آئے تو ریاضی اور سائنس کی دردسری کو چھوڑ کر فلسفے کی موشگافیوں میں اُلجھے۔ فلسفے کی خشکی کے ساتھ فارسی اور انگریزی ادبیات کی رنگینی سے ایک خوشگوار امتزاج قائم کیا اور بی۔ اے میں فرسٹ کلاس لی۔ الٰہ آباد میں وہ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جو ایم۔ بی۔ ہاؤس کے نام سے مشہور ہے' رہتے تھے۔ ڈھائی سال تک وہ یہاں مسلم ہوسٹل میگزین کے ایڈیٹر رہے اسی زمانہ میں اُن کی ملاقات اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے ہوئی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں ایم اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں اس وقت ایک بے چینی تھی، ایک کش مکش تھی۔ عدم تعاون کی تحریک نے طلبہ اور اساتذہ کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ عابد صاحب اگرچہ اس تحریک سے الگ تھلگ رہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی لحاظ سے یہ سال اُن کا بیکار گیا۔ ۱۹۲۰ء میں باہر جانے کے لئے انہیں ریاست بھوپال سے وظیفہ ملا، تھوڑی بہت امداد ان کے چچا نے بھی کی اور وہ انگلستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں بی اے (آنرز) کے لئے فرسٹ پارٹ کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ وظیفہ کی رقم اتنی نہیں تھی کہ آکسفورڈ میں رہ کر وہ یکسوئی سے تعلیم حاصل کر سکتے اس لئے وہ مارچ ۱۹۲۲ء میں وہیں سے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ فلسفہ خصوصاً فلسفۂ تعلیم خاص مضمون تھا اور اس کے ساتھ عربی اور تاریخِ یورپ دوسرے مضامین تھے۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ جرمنی میں پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر کی رہنمائی میں علمی سرگرمیاں ہی ان کی توجہ کا مرکز رہیں۔ اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ عبدالحمید اور ڈاکٹر سلیم الزمان وہیں موجود تھے۔ ہندوستان ایسوسی ایشن ان سب کا علمی و تہذیبی پلیٹ فارم تھا۔ ذاکر صاحب سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب کی کوششوں سے برلن کے کاویانی پریس نے دیوانِ غالب شائع کیا تھا۔ اس

کی تصحیح میں عابد صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ عابد صاحب نے ایک مرتبہ مزاحاً مجھ سے فرمایا کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ تصحیح نہیں بلکہ تغلیط کے لحاظ سے بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔

جرمنی ہی کے دوران قیام میں یورپ کے ایک مشہور شہر میں ان ہندوستانی نوجوانوں کی ملاقات حکیم اجمل خاں مرحوم سے ہوئی تھی۔ مضامین عابد میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے "سچا افسانہ"۔ اس مضمون میں اس ملاقات کی طرف اشارہ ہے۔ ان نوجوانوں کے بڑھتے ہوئے ارادے اور بلند خیالات کا تصادم ہوتا ہے ایک پیر فرزانہ کی معتدل اور سبک رو افتادِ طبع سے۔ اس کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو کتنی حرارت ہے اس میں! کتنی پُرسوز حقیقت ہے یہ اپنے دامن میں لئے ہوئے!

"یہ ہمتیں اور یہ ارادے ہیں ان نوجوانوں کے، مگر دنیا میں بڑے کام کرنے والے کے لئے محض ہمت اور ارادہ کافی نہیں، جب تک تجربہ اور معلومات، دانائی اور تدبیر، احتیاط اور استقلال شریک کار نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات نوجوانوں کو نصیب نہیں۔ یہ اس پیرِ دانش کے حصے میں آتی ہیں جس کی رگوں میں خون کی گردش معتدل ہو چکی ہو اور جس کی سیرت میں وہی نوعیتیں امتزاج پا چکی ہوں۔ ان نوجوان سپاہیوں کو تلاش ہے ایک پیر مرد کی جو ان کا سالار بنے۔ یہ ایسا سالار چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے درمیان کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کیا ہے اور دونوں میدانوں میں دادِ شجاعت دی ہے جس نے [illegible] دیکھے ہیں اور معرکے جیتے ہیں، جس نے سختیاں جھیلی ہیں اور مشکلوں پر فتح پائی ہے۔ یہ لوگ چشمِ تصور سے ہندوستان کے تمام [illegible] دہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر دلی [illegible] ان کے کام کا نظر نہیں آتا۔"

[illegible] ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنا اصلاحی ڈرامہ "پردۂ غفلت" لکھا اور ڈچ مصنف ڈی بوئیر (De Boer) کی کتاب [illegible] فلاسفی [illegible] اسلام [illegible] سے اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اسلامی فلسفے پر نہیں ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ [illegible] جامع ہے۔

[illegible] جرمنی سے ہندوستان واپس آئے [illegible] کی تاریخ کا بڑا اہم سال ہے۔ [illegible] شخصیں جو ایک دور [illegible] اس قومی ادارے کے لئے اپنی جان کھپانے کو تیار ہو [illegible] حال امید افزا اور مستقبل کا پتہ ——— اپنے مستقبل [illegible] لیکن بڑی تحسین [illegible] اسی طرح "نقد" کو [illegible]

ایک مرتبہ میں نے عابد صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے [illegible] تھے۔ فرمایا کہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں میں انگریزوں کا طرفدار تھا [illegible] سیاسی خیالات وہی تھے جن کی تبلیغ یا [illegible] کرتا تھا۔ لیکن جب جلیانوالہ باغ کا حادثہ [illegible] تو میرے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی۔ جلیانوالہ باغ کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ اسی زمانہ میں مجھ پر گاندھی جی کی ایک تقریر کا جو [illegible] سے متعلق تھی اور جس میں [illegible] اور [illegible] سے بحث کی گئی تھی، بہت اثر ہوا۔ سامراجی نظام کی بیہودگیاں مجھ پر واضح ہونے لگیں۔ جب میں آکسفورڈ گیا تو وہاں میرے خیالات بلکہ میرا طرزِ خیال ہی بدل گیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے۔ آکسفورڈ میں جہاں

کچھ ہفتے پہلے میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا، ایک وحشت کے یہاں اکتوبر کے ماڈرن ریویو میں ٹیگور کا مضمون "حق کی ندا" (The call of truth) نظر سے گزرا جس میں عدم تعاون کی تحریک پر سختی سے تنقید کی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ۱۳ اکتوبر کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی کا جواب "The great Sentinel" کے عنوان سے پڑھا۔ ٹیگور اور گاندھی کی یہ بحث مشہور رہے۔ اپنے مضمون میں ٹیگور نے گاندھی جی کی تحریک پر جو اعتراضات کئے تھے ان میں بڑی جان تھی، لیکن گاندھی جی نے جو جواب دیا تھا اس میں بڑی حقیقت پسندی تھی، آزادی اور عزت نفس کی تعلیم تھی۔ "شاعر" اور "مصلح" کی اس بحث میں "مصلح" غالب رہا اور میں گاندھی کو ٹیگور کو، اپنے آپ کو اور زندگی کو اور ہی نظروں سے دیکھنے لگا ——— غالباً خیالات کی یہی تبدیلی عابد صاحب کو جامعہ لے آئی۔ اب جامعہ میں انہیں پورے تیس سال ہو چکے ہیں۔ اس تیس سال کے عرصہ میں جامعہ نے نہ معلوم کتنے نشیب و فراز دیکھے ——— اس پر جانکنی کا عالم طاری ہوا، پھر زندگی کے آثار ظاہر ہوئے ——— ڈاکٹر صاحب بھی اس نشیب و فراز سے گزرے ان کی شخصیت کی تعمیر میں جہاں بچپن اور جوانی کے بہت سے خانگی آلام و مصائب کا حصہ ہے وہاں عہد بلوغت کے اس نشیب و فراز کو بھی بہت دخل ہے۔

———————

بہت کم لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو کہ عابد صاحب نے شاعری بھی کی ہے اور ان کے اشعار اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ الٰہ آباد میں اکبر مرحوم سے ان کی ملاقات [illegible] کے ہوئی تھی۔ پھر جب وہ علی گڑھ آئے تو انہوں نے علی گڑھ میگزین میں اکبر الٰہ آبادی پر ایک مضمون لکھا اور رسالہ اسی اشاعت میں ان کی ایک نظم "شرح درد اشتیاق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اکبر مرحوم نے یہ مضمون اور نظم دیکھی تو رشید صاحب کو لکھا کہ یہ ڈاکٹر [illegible] الٰہ آباد کی ملاقات کی یاد شاید ان کے ذہن سے نکل چکی تھی۔ نظم کا آخری بند یہ تھا سے

باعث تسکیں اگر ہے یہ [illegible] عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
کشمکش نور و ظلمت تابکے چند لحظہ، چند ساعت، چند سال
پھر وہی آہنگ [illegible] پھر وہی سودائے حسن لازوال
[illegible] سے [illegible] شاہد معنی سے پھر ہوگا وصال

"مرغ بریاں را بہ تشبیہ نے وزیر است
اپنی ملکی را تم [illegible] دیگر است"

اکبر مرحوم نے عابد صاحب کو جو لکھا "آپ کی نظم میں نے پڑھی۔ خوب ہے۔ خصوصاً آخر کا بند اسے پڑھ کر میری زبان پر بے اختیار یہ شعر آگیا سے

آپ کی [illegible] تو ذوق یاد صرف [illegible] تھی کاش چھوٹے آپ کے دامن کو یونیورسٹی

عابد صاحب کی نثر بڑی پاکیزہ اور منجھی ہوئی ہوتی ہے۔ عبارت کا ہر لفظ اپنی جگہ پر نصب ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت لوگ اپنے [illegible] عابد کا علم [illegible] سے مستفیض ہوئے۔ بہت سے طلبہ نے جامعہ کالج میں ان سے اردو پڑھی ہے ان سے ذرا عابد صاحب کی ان حیثیت استاد اردو کے پوچھئے۔ آج جبکہ وہ درس و تدریس کے کام سے الگ ہو کر تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں طلبہ انہیں یاد کرتے ہیں اور تم سب ان کی کمی اس طرح محسوس کرتے ہیں [illegible] ان کا تعلق [illegible] ہوتا ہے مستطیع اور غیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ کو [illegible] سے [illegible] پہنچتا رہتا ہے۔ [illegible] ہر طرح سے [illegible] کتنے مدد کرتے ہیں۔ عابد صاحب جب جامعہ میں ہوتے ہیں تو کالج کے طالب علموں کو بڑا اطمینان رہتا ہے۔

مضامین عابد میں ایک مضمون "حدیثِ دیگراں" کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون ایک طرح سے تبصرہ ہے مولوی عبدالحق صاحب کے مجموعۂ مضامین "چند ہمعصر" اور خود مولانائے موصوف کی منفرد شخصیت پر۔ اس میں ایک جگہ عابد صاحب نے لکھا ہے "ایک مصنف خواہ وہ خود پوشی میں کتنا ہی اہتمام کرتا ہو، یوں تو اپنی ہر تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اُٹھاتا ہے، اس کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اُٹھ جاتا ہے، اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اس کے جوہر کھل جاتے ہیں" ——— کیا میں اس موقع پر یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ یہاں صیّاد خود اپنے دام میں آگیا ہے۔ اس مضمون میں کتنے ہی ایسے فقرے اور جملے ہیں جہاں عابد صاحب خود اپنے آپ سے نہیں بچ سکے ہیں۔ مرزا حیرت کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ "سچ پوچھئے تو مسندِ علم کی وہ منزلت ہے کہ جاہ و دولت کی طمع میں اس سے اوپر جانا حقیقت میں نیچے اُترنے کے برابر ہے۔" ایک مرتبہ، مجھے یاد ہے کہ انہوں نے بڑے پُر زور الفاظ میں "ملّائے مکتب" کے بلند مدارج کا مجھ سے ذکر کیا اور کہا کہ بوریائے علم کے سامنے مسندِ جم کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

عابد صاحب کے یہاں کنبے کا تصور بہت وسیع ہے۔ خاندان اور خانوادہ کا ہر فرد ان کا عزیز ہے، دل سے انہیں عزیز ہے اور جب کبھی کوئی موقع آتا ہے تو عابد صاحب کی موجودگی ان کے دل کو تقویت دیتی ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور وظیفہ پاتے تھے تو وظیفے کی رقم بڑی بہن کے علاج معالجہ میں صرف کرتے تھے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں۔ صالحہ باجی (بیگم عابد حسین) کا کہنا ہے کہ عابد صاحب کی شرافتِ نفسی کا اندازہ گھر میں ہوتا ہے۔ ملازموں سے انہیں بڑی محبت ہے اور جب کبھی میں کسی بات پر ملازموں سے باز پُرس کرتی ہوں اور عابد صاحب کو اس کی اطلاع ہوجاتی ہے تو وہ ہمیشہ ملازموں کی طرفداری کرتے ہیں۔ عابد صاحب کے دوست بہت کم ہیں۔ لیکن جو ہیں ان پر وہ جان چھڑکتے ہیں، ذکی الحس اور متمدن اتنے ہیں کہ دوستوں سے وہ دوسرے درجہ کی بات سُن نہیں سکتے۔ دوستوں کو بھی عابد صاحب کی رائے پر بہت بھروسہ ہوتا ہے، جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا ہے تو وہ ہی اسے حل کرتے ہیں اور سب مطمئن ہوجاتے ہیں۔

عابد صاحب کے مزاج میں بڑی سادگی ہے۔ لباس بہت سادہ اور کھانا بہت کم۔ بمشکل دو چپاتی کھاتے ہیں۔ میٹھا ان کی کمزوری ہے۔ طبیعت میں بھی بہت سادگی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس سادگی میں اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ بڑی چاشنی پیدا کردیتے ہیں۔ مزاح ان کی طبیعت کا ایک جزو لاینفک ہے۔

صبح و شام ایک دو میل تک ٹہلنا عابد صاحب کے معمولات میں سے ہے۔ روسو نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "میں بیٹھ کر سوچ ہی نہیں سکتا، میرے پاؤں کی 'حرکت' میرے دماغ کی 'حرکت' کا سبب بنتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عابد صاحب کے ساتھ بھی کم و بیش یہی معاملہ ہے۔ شام کے وقت کبھی کبھی میں ان کے ساتھ ہوجاتا ہوں، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے، میں کوئی بات چھیڑ دیتا ہوں، پھر 'گلِ افشانیِ گفتار' کا تماشہ دیکھتا ہوں۔ غالب کو اس کام کے لئے 'پیمانہ و صہبا' کی ضرورت پڑی تھی، عابد صاحب کو کھلی ہوئی فضا چاہیئے۔ عابد صاحب کی حاضر جوابی مسلّم ہے۔ سُنا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اُن سے گھبراتے ہیں۔ بے شمار لطیفے ایسے ہیں جو جامعہ والوں کی زبان پر ہیں۔ کچھ فطری طور پر وہ حاضر جواب ہیں، علم و شعور، مطالعہ اور مشاہدہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ ان کے والد مرحوم کے ایک دوست تھے جو اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ایک دن وہ آئے اور اُن کی طرف اشارہ کرکے اُن کے والد سے کہا۔ آپ نے عابد حسین کو کیا قحط میں مول لیا تھا۔ ابھی وہ کوئی جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ عابد صاحب نے کہا "جی ہاں، انسانوں کا قحط تھا۔" اس وقت اُن کی عمر دس سال کی تھی۔

صالحہ باجی چوروں سے بہت ڈرتی ہیں، اُن کے یہاں کئی چوریاں ہوچکی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اُن پر چوروں کی طرف سے دہشت ہونی چاہیئے، عابد صاحب اس معاملہ میں بہت بے نیاز ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ چور گھر کی چیزیں ہی تو لے جائیں گے لے جانے دو۔ ایک مرتبہ عابد صاحب ہفتہ عشرے

کے لئے کہیں باہر جا رہے تھے۔ صالحہ باجی کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر صاحب ذرا جلدی آ جائیے گا، عابد صاحب کہہ رہے تھے: ایسی کیا جلدی ہے؟ صالحہ باجی کی طرف سے جو دلیل دی جا رہی تھی، اس میں چوروں کا خاص ذکر تھا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی چور آئے اور میرا گلا دبا دے تو میں کیا کروں گی، شور بھی نہیں مچا سکتی۔ عابد صاحب نے برجستہ کہا "اور اگر میں ہوا اور دو چور آئے، ایک نے آپ کا گلا دبایا اور دوسرے نے میرا تو نتیجہ تو وہی رہا۔"

پونا میں ایک تعلیمی کانفرنس تھی۔ جامعہ کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ پروفیسر محمد مجیب اور عابد صاحب اس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مجیب صاحب اور عابد صاحب کا قیام ایک ہی کمرہ میں تھا۔ رات کو جب یہ لوگ لیٹے تو مجیب صاحب کچھ بے چین ہوئے۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ عابد صاحب نے کہا "مجیب صاحب! کیا بات ہے"، مجیب صاحب نے بڑے تکلف سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ چارپائی میں کھٹمل ہیں"، عابد صاحب نے بے ساختہ فرمایا "تو پھر مدح صحابہ پڑھئے" (مجیب صاحب شیعہ ہیں) عابد صاحب شیعہ تو ہیں لیکن عید بقر عید کی نماز جامعہ میں ہمیشہ سنیوں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور "واركعوا مع الراكعين" کی زندہ مثال ہیں۔

عابد صاحب دُھن کے آدمی ہیں، کوئی کام اُن کے ہاتھ میں ہو جب تک وہ پورا نہیں کریں گے دوسرا کام نہیں شروع کریں گے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داریوں سے بچتے رہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ سست سوچتے ہیں، فرماتے ہیں کہ زبان کی طرح دماغ میں بھی لکنت ہے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ جو کچھ سوچتے ہیں تہ تک سوچتے ہیں، ہر پہلو کی تفصیل پر نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا ہر فیصلہ دو اور دو چار کی طرح واضح، صاف اور مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔

صالحہ باجی کہتی ہیں کہ گھر میں لوگ چھوٹے موٹے مرض کی اطلاع کبھی عابد صاحب کو نہیں ہونے دیتے اس لئے کہ اگر انہیں خبر ہو جائے تو لکھنے پڑھنے کا سارا کام ترک کر کے اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے رجوع کریں گے یہاں تک کہ بیچارے مریض کو پچھتانا پڑے گا کہ ناحق انہیں اس کی اطلاع ہو گئی۔

عابد صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسان دوستی ہے، ان کی جان پرسوز اور سخن دلنواز ہے۔ فرد کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اب وہ ملک کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جن پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔

عرشی رامپوری

عشرت رحمانی

مارشس بجنے - ریاست رامپور (یو۔پی) میں "بزم ادب" کے نام سے ایک ممتاز علمی ادبی جماعت قائم تھی - اس کے روح رواں مولانا عزیزاللہ خاں مرحوم، مدیر رسالہ نیرنگ و مالک مطبع سعیدی تھے - عزیز مرحوم نہایت اعلیٰ خوبیوں کے انسان تھے۔ "نیرنگ" اپنے زمانہ کا ایک ممتاز علمی ادبی ماہنامہ شمار کیا جاتا - اور عزیز مرحوم نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی - اور اپنے کسب کمال سے عزیز جہاں بنے ہوئے اپنے گرد شیدائیانِ ادب کا ہجوم لئے خاموشی اور تندہی سے مصروف کار تھے - اس بزم کا مرکز نیرنگ کا دفتر عزیز مرحوم کا مکان واقع گھیر ملکیاں تھا۔ جو دفتر کم اور یارانِ میکدہ کا تکیہ زیادہ تھا -

بزم ادب کے زیر اہتمام یوں تو کبھی کبھار مختصر شاعرانہ محفلیں منعقد ہوتی رہتیں - اور سال میں ایک دو عالیشان قسم کے مشاعرے ہو جاتے - لیکن اس کی خاص سرگرمیوں میں روزانہ کی وہ محفل تھی جو چند مخصوص اہلِ علم و ادب پر مشتمل دوستوں کی نشست کہی جاتی - مگر اس میں علم و فن کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو آئے دن زیر بحث نہ آتا ہو - اس بزم کے اراکین میں رام پور کے معدودے چند حضرات شریک تھے - جن میں بزرگ بھی تھے اور جوان سال بھی - عزیز مرحوم کے خلوص نے ان سب کو اپنی بزم ادب کی شمع کا ہم ذوق پروانہ بنا لیا تھا - ۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا میں اپنی ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کرکے کلکتہ اور لاہور کے قیام کے بعد رام پور آیا تھا اور اپنے ذوق ادب کی تسکین کی خاطر بلکہ زانوئے ادب تہ کرنے اس بزم میں شریک ہو گیا - میری حیثیت ان چند بڑوں میں سب سے چھوٹے کی تھی - لیکن یہ یارانِ نکتہ داں کی محفل تھی جہاں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی - یہاں تو "زندگی برائے ادب" کا نعرہ سب کی زبان پر تھا اور ہر شام کے چند گھنٹے نہایت خلوص و یگانگت کے ساتھ ادبی گفتگو میں گزارے جاتے - علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے کے لئے آپس میں بجید دلچسپ و پُر کیف بحث مباحثے برپا ہوتے - اور ان سب مباحثوں اور مذاکروں کے نتیجہ میں بہت سا علمی مواد مجلہ "نیرنگ" کے صفحات کی زینت بن جاتا - ان مجالس میں نثر و نظم کی کوئی قید نہ تھی - کسی نشست میں ایک مصرع پڑھا جاتا اور تمام احباب فی البدیہہ فکرِ سخن میں مصروف ہو جاتے - اور تھوڑی دیر میں سب حضرات اپنی اپنی تازہ غزلیں سنا کر بزم

مشاعرہ منعقد کر ڈالتے۔ ان احباب میں بھائی امتیاز علی خاں عرشی کی شخصیت ہمہ صفت ممتاز نظر آتی تھی۔ عمر کے لحاظ سے تو کئی اور بزرگ ان سے بڑے تھے مگر علمی فضیلت اور ادبی ذوق میں ان کا پایہ جواں سال حضرات میں خاصہ بڑا تھا۔ اور ادبی مباحث میں ان کی اصابت رائے امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ شرکاء بزم میں چند بزرگ ایسے بھی تھے جو اپنی عمر اور علمیت سے حاضرین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے کسی موضوع کی باریکیاں سمجھاتے ہوئے آواز کو بلند کرنے پر اُتر آتے۔ اور جب اپنی برتری تسلیم ہوتے نہ دیکھتے۔ یا بالفاظ دیگر مرعوب نہ کر پاتے تو نوبت جھگڑے تک پہنچ جاتی۔ مگر ان بزرگوں کے درمیان ایک جوان رعنا نہایت شگفتہ مزاجی و خندہ پیشانی سے مسئلہ کو سلجھاتا اور جھگڑے کو نبٹاتا نظر آتا۔ یہ تھے بھائی عرشی (جنہیں اُس وقت یعنی آج سے تقریباً تیس سال پہلے بھی مولانا عرشی سے خطاب کیا جاتا) جن کے لبوں پر پُرکیف تبسم کھیلتا۔ اور وہ ہر رکن کو 'بھائی' اور 'مولانا' سے مخاطب کر کے اپنی دھیمی اور سُریلی آواز سے ان کے غیظ آلود تیوروں میں سلاستِ گفتار کی نرمی پیدا کر دیتے۔ اور ذرا دیر میں مشکل سے مشکل مسئلہ کو آسانی سے سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے۔ پھر مولانا عزیز کی مرنجاں مرنج طبیعت گفتگو کے اس پُرلطف انجام پر بشاش ہو جاتی۔ اور اُن کی لطیف آواز گونجتی سنائی دیتی کہ "چلئے بات ختم ہوئی"۔۔۔ پھر وہ کسی ملازم کو چاے لانے کے لئے پکارنے لگتے اور تمام احباب قہقہوں کی گونج میں گفتگو کی تلخیوں کو چاے کی چسکیوں پر اُڑا دیتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرشی صاحب کئی سال قبل علوم مشرقی کی تحصیل سے فراغت کر کے علوم مغربی کی تعلیم میں مصروف تھے۔ اور ان کے شب و روز علمی مشاغل میں گزرتے۔ کئی اداروں سے ان کو ملازمت کی پیش کش ہو چکی تھی مگر وہ اپنی علمی ادبی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد کرنا پسند نہ کرتے نہ ان کی عزلت گزینی شہرت کو گوارا کرتی۔ ان کے اکثر احباب جو پنجاب اور یوپی سے علمی ادبی رسائل شائع کرتے تھے ان سے مضامین کی پُرزور فرمائشیں کرتے۔ لیکن وہ ان کو کسی نہ کسی طرح بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ البتہ مولانا عزیز مرحوم کا خلوص ان پر غالب آتا اور نیرنگ کی کوئی اشاعت ان کے علمی یا ادبی مقالہ یا غزل سے خالی نہ ہوتی۔ کیونکہ عرشی صاحب خوش فکر شاعر ہونے کے باوجود عام طور پر حجاب میں رہتے تھے۔ اور ان کا کلام کسی مجلۂ ادب کی زینت نہیں بننے پاتا۔ نہ کسی عام مشاعرہ کی محفل میں ان کا نام پکارا گیا۔

بزم ادب کی شاعرانہ مجالس میں وہ کارکن و مہتمم کی حیثیت سے پیش پیش نظر آتے۔ مگر مشاعرہ کے وقت وہ ایک خوش ذوق سامع کی حیثیت اختیار کر لیتے۔ اور پیشتر ہی تمام احباب سے یہ وعدہ لے لیتے کہ ان کے سامنے شمع نہیں لائی جائے گی۔ نہ اصرار و تقاضہ سے ان کو مجبور کیا جائے گا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ مخصوص شاعرانہ صحبت میں ہم لوگ ان کو مجبور کر دیتے اور وہ عجیب شانِ تکلف سے شعر خوانی پر آمادہ ہو جاتے۔ بزمِ ادب کی شبانہ مجلسوں میں ایسے مواقع اکثر پیش آتے۔ دراصل عرشی صاحب کی طبع رسا میں شاعری کا قدرتی مادہ ودیعت ہوتے ہوئے وہ کئی وجوہ کی بنا، پر اپنی شاعرانہ حیثیت کو منظر عام پر لانے سے محترز رہے۔ ایک تو ان کی گہری ناقدانہ نظر ان پر کڑی پابندی لگائے رہی۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ علمی ادبی تحقیق و تدقیق کو دوسرے تمام مشاغل پر ترجیح دیتے اور انہی کو اولیت حاصل تھی اور آخر کار ان کے تخلص نے ان کے نام اور علمی مقام کی حیثیت اختیار کر لی۔ حالانکہ افغانی النسل ہونے کے باوجود ان کا پیشۂ آبا سپہ گری نہیں تھا مگر ان کے لئے شاعری ذریعہ عزت نہیں۔

عرشی صاحب کا خاندان افغانستان کے یوسف زئی سلسلہ میں اکوزئی شاخ حاجی خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کو ہندوستان آئے سوا سو سال ہوئے اور اسی عہد سے ان کے آباؤ اجداد رامپور کے محلہ پہلوار میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور اسی آبائی مکان میں وہ آج تک رہتے۔ ان کے دادا صاحب مرحوم مولوی اکبر علی خاں صاحب اپنے عہد کے جید عالم اور مشہور محدث تھے۔ لیکن عرشی صاحب کے والد ممتاز علی خانصاحب کو ورثہ میں ان علوم کا کوئی حصہ نہ ملا۔

ان کو علوم مذہبی سے ذوق ضرور تھا مگر فضیلت کے درجہ تک نہیں پہنچے اور وہ رام پور کے مویشی خانہ سرکاری کے ہسپتال کے افسر اعلیٰ

تھے۔ مگر انہوں نے ہونہار فرزند کی تعلیم میں اپنے حق کی تلافی کی سعی فرمائی اور بھائی عرشی نے "آنچہ پدر نتواں کرد پسر تمام کند" کے مصداق دادا صاحب کے نقش قدم پر چل کر مدارجِ فضیلت حاصل کئے۔ انہوں نے رام پور کی مشہور زمانہ درس گاہوں مدرسہ مطلع العلوم و مدرسہ عالیہ میں عربی و فارسی کے مروجہ درسیات کی تکمیل کی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی ادب کے مطالعہ سے معقول استفادہ کیا۔ اس طرح اپنے ذوق اور ضرورتِ وقت کے لحاظ سے علومِ جدید میں وافر استعداد بہم پہنچائی۔

جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے بھائی عرشی نے تحصیلِ علم کو اپنا سب کچھ سمجھ کر عرصہ دراز تک اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اور اپنی ضروریات کو محدود کر کے دولت کی آستاں بوسی گوارا نہ کی۔ موروثی جائداد اور والد صاحب کی ذاتی آمدنی خاندان اور ان کی ضروریاتِ حیات کے لئے کافی تھیں۔ ڈاکٹر ممتاز علی خاں صاحب بھی اپنے سعادت مند و فاضل فرزند کے مشاغلِ علمی سے مسرور و مطمئن تھے انہوں نے کبھی کسی حالت میں عرشی صاحب کا وطن سے باہر نکل کر کسی اعلیٰ ملازمت سے وابستہ ہونا گوارا نہ کیا۔

ابتدا سے عرشی صاحب کا زیادہ وقت مشرقی علوم کے مطالعہ اور چھان بین میں صرف ہوتا۔ ان کا حلقۂ احباب محدود و مخصوص تھا۔ ان کے خاص علمی احباب میں ابتدا سے مولوی عزیز اللہ خاں عزیز مرحوم — مرزا ہادی علی بیگ وامق شادانی (حال استاد السنۂ شرقیہ گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور) اور ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی (صدر السنۂ شرقیہ ڈھاکہ یونیورسٹی) شامل ہیں۔ باقی ... کے اکثر علماء و فضلاء اور اہلِ ادب حضرات سے رشتۂ یگانگت قائم تھا اور ہے۔ عرشی صاحب نیک سیرت، نیک نفس اور سادہ مزاج انسان ہیں ان کا رہن سہن، لباس تمام تر خالص مشرقی ہے۔ ہر موسم ہر وقت پٹھان کا لباس کرتہ پاجامہ اور اچکن اور رامپوری ساخت کی مخملی ٹوپی رہا۔ اور آج تک وہی وضع قائم ہے۔ وہ اکہرے جسم کے خوش وضع خوش شکل خوش شمائل مردانہ حسن کا مجسمہ ہیں اس لئے ان کو اپنی طرز کا لباس زیب دیتا ہے۔ انہوں نے ابتدا سے خاندانی وضع کے مطابق داڑھی رکھی، جو ان کے حسین چہرے پر نہایت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ پابندیٔ مذہب نے ان کی طبع سلیم میں خاص صلاحیت پیدا کی۔ اوائل عمر سے پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ لیکن کٹر ملائیت کے سخت مخالف۔ انہوں نے مذہبی علوم کو برتا ہے۔ احکامِ قرآنی کو سمجھا اور ان کی روشنی میں شرع دین کی تعلیم کو عملی جامہ پہنا کر اپنے عقائد و اعمال میں حقیقی اسلامی صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور اور دوسروں کو اس سے متمتع کیا ہے۔ بزرگوں، عزیزوں اور بیگانوں سے تعلقات میں تلطف و مدارات، امتیاز اور حفظِ مراتب کو برقرار رکھتے ہوئے تعلقات و مراسم کو نبا ہنے کا ان کا طریقہ ... وضعِ سلیم میں خاص ملکہ ہے۔

عرشی مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں۔ میرے ان کے تعلقاتِ یگانگت کی ابتدا تقریباً ۱۹۲۳ء سے ہوئی ... بزمِ ادب رامپور کے دور میں اس قربت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور علمی فضیلت میں تو وہ مجھ سے بزرگ تر ہیں۔ مگر ابتدا سے آج تک حاضر و غائب ہمیشہ سے میرے ان کے درمیان پُر خلوص مساوی تعلقات برادرانہ قائم ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان تو برادرانہ و مخلصانہ مراسم استوار ہیں لیکن میں نے اکثر ان کو دوسرے احباب سے بحث و تمحیص کے دوران میں بھی کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا کہ جس سے یہ گمان ہو سکے کہ وہ خواہ مخواہ کسی پر اپنی فوقیت جتائیں یا فرد مخالف کے آگے اپنی اصابتِ رائے منوانے کے لئے ملائیت کی درشتی اختیار کر کے کج بحثی پر آمادہ ہوئے ہوں۔ عرشی کی ہر نیاز مرنج طبیعت کسی دشمن کے خلاف بھی قدم اٹھانے کی حیثیت سے آمادۂ انتقام نہیں ہوتی۔ اور یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ شاید عرشی وہ فرشتہ خصلت انسان ہیں جن کا کوئی دشمن نہیں اور اگر کوئی بلا وجہ دشمنی پر آمادہ بھی ہو تو عرشی میں بذاتِ خود دشمن آزاری کا مادہ نہیں۔ وہ دشمن کو اپنی حلیم الطبعی سے دوست تو بنا سکتے ہیں مگر اس کی تلخ کلامی یا ترش روئی کے جواب میں اپنے تیور اور زبان کو نہیں بگاڑ سکتے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو اس دور کے بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ بلا شائبہ دیگر وہ ان معدودے چند انسانوں میں سے ایک منفرد انسان ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ع

سخت دشوار ہے انسان کا انساں ہونا

عرشی کا ظاہر و باطن یکساں ہے وہ جس سے ملتے ہیں کھل کر ملتے ہیں۔ ہر کسی کو "بھائی" نہیں کہتے مگر جس کو اس رشتہ سے مخاطب کرتے ہیں اس کو صدق دل سے سمجھتے بھی ہیں۔ وہ عقائد کے لحاظ سے اہل سنت والجماعت ہیں۔ اور علمی و مذہبی مسائل و معتقدات میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے پیرو اسی لحاظ سے ان کے نام کے ساتھ "نعمانی" کی نسبت پائی جاتی ہے۔

عرشی کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ کو اپنے آبائی مکان محلہ پھلوار (رام پور) میں ہوئی اور شاید اس ماہِ مبارک کی تمام برکات و فیوض ان کے حمیدہ عادات و خصائل میں بدرجۂ اتم ودیعت ہوئیں لیکن اپنی تمام علمی و مذہبی صلاحیتوں کے ساتھ وہ ایک عملی انسان اور روشن خیال شارحِ حیات ہیں۔ ان کی پیدائش کے ماہ و یوم نے انہیں "رمضانی یا جمعراتی" نہیں بنایا۔ وہ اس نوع کی کٹر ملائیت سے متنفر اور اس قدر منکسر المزاج بزرگ ہیں کہ صحیح معنوں میں مولانا ہوتے ہوئے اس لقب سے شرماتے اور دوسروں پر اپنی فضیلت جتانے گھبراتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی خاموش طبیعت نے شہرتِ عام سے ہمیشہ نفرت کی۔ اور کتاب خانہ کے گوشہ میں مقید ہو کر علم کے دریا بہانے کے باوجود اپنی ذات و صفات کو منظرِ عام پر لانا گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ عرشی کی علمی، عملی زندگی تمام تر مشعل ہدایت ہے۔ مگر وہ کبھی برسرِ عام نظر نہیں آتے ——— ان کے علمی، ادبی کارناموں کے دفاتر ہیں تحقیق و تنقید کے ذخائر ہیں لیکن ان میں سے بہت کم اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ اس کا بڑا سبب ان کا فطری حجاب اور قناعت اور پھر مقامی حالات کی وہ تنگ حدود جو انہوں نے اس محدود دائرہ میں اپنے اوپر عائد کر لیں۔

عرشی کی شخصیت کا قلمی پیکر جو ہمارے سامنے آتا ہے اس سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا پورا پورا اندازہ اس طرح ہوتا ہے:

"تخلص کے عرشی۔ مزاج میں فرشی۔ فرشتہ صفت، خجستہ خصلت، نسلی افغان، اصلی انسان۔ طبیعت میں وہ لوچ اور نرمی کہ افغانی گرمی کا شائبہ تک نہیں، سادگی کا مجسمہ۔ اخلاص و مروت کا پیکر، مخلص و متواضع، خوش خلق، خوش اطوار۔ یاروں کے یار۔ دشمن کے لئے بیکار۔ علم و فضل میں واقعی مولانا۔ مگر شگفتہ مزاجی و زندہ دلی میں جوانِ رعنا! کشادہ پیشانی، ذہین، منقلب نیک مشرب، نیک دل۔ تہذیب و علوم مشرقی کے دلدادہ، زمانہ کے انداز پر ہر معقول جدت تبدیل کرنے پر آمادہ۔ صورت و سیرت میں حسین، ظاہر و باطن سنجیدہ و متین۔ کم سخن مگر خوش گفتار، کم آمیز، نرم و بے ستیز مگر علم و عمل میں تیز! اس ممتاز شخصیت کو اسم بامسمّیٰ کا لقب زیب دیتا ہے۔ جس کی ذات میں وہ امتیازی جواہرِ علم و فن پوشیدہ ہیں جو ہر کسی بحرِ علوم میں نہیں پائے جاتے۔ مگر وہ ایک ذخار سمندر کی طرح خاموش ع۔ جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے ——— کے مصداق اپنے علمی فضائل و ادبی کمالات سے موج در موج تشنگانِ علم و ادب کو متبحرانہ سکوت کے ساتھ فیضیاب کئے جا رہا ہے۔"

پیشتر کہا جا چکا ہے کہ عرشی صاحب نے ابتدا سے اپنے آبائی وطن رام پور کو اپنا ملجا و مسکن بنانے پر قناعت کر کے اس کو اپنی تمام و کمال سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔

شروع میں چند دیگر علمی مصروفیتوں کے علاوہ کتاب خانہ عالیہ رام پور (جو اب رضا لائبریری کے نام سے موسوم ہے) کے نایاب و نادر کتب ہائے گرانمایہ سے استفادہ کر کے [illegible] سال تک خلیفۂ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خطبات و خطوط اور حکیمانہ اقوال کی تحقیقات کی اور ان کو مرتب کیا۔ اسی زمانہ میں مسٹر چیمپین (Mr. Champan) کتاب خانہ سرکاری کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اور انہوں نے عرشی صاحب کے ذوقِ علمی اور تجسس و تدقیق کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر بڑے اصرار سے ان کو اپنی نیابت کے لئے رضامند کر لیا۔ عرشی نے اس عہدہ کو محض اس خیال سے قبول کیا کہ ان کا زیادہ وقت اس کتاب خانہ میں صرف ہوتا ہے۔ اگر وہ باضابطہ اس سے منسلک ہو جائیں تو ان کے مطالعہ میں

وہ نادر مخطوطات بھی آسکیں گے جن تک ان کی رسائی ابھی ایک عام شہری کی حیثیت سے نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ اس مردم شناس انگریز کے ساتھ کام کرنے کے بعد ان کی صلاحیتوں کا حال اس کی زبانی نواب صاحب کو بھی بخوبی ہو گیا۔ یہ دیدہ ور فاضل انگریز مسٹر چیمپین تو عرشی کے تبحرِ علمی تحقیقی لیاقت کا قائل و مداح تھا لیکن رفتہ رفتہ نواب صاحب بھی ان کے فضل و کمال اور اہلیت سے کما حقہٗ واقف ہو گئے۔ عرشی نے چیمپین کی رہنمائی میں اس کو اپنا مونس و مشفق اُستاد تصور کر کے بڑی تندہی اور دل سوزی سے کام کیا۔ پھر ان کے ذوقِ علمی و فطری صلاحیتوں نے ان کے کام کی اہمیت کو اور بھی واضح کر دیا۔ یہ کتاب خانہ دنیا بھر کے ان چند گنے چنے عالیشان کتاب خانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے جن کے گرانمایہ نوادر کی زیارت کے لئے شیدایانِ علم و ادب دور دراز کے سفر اختیار کر کے وہاں آتے اور اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کی خاطر منت و محنت گوارا کرتے ہیں۔

ریاست رام پور روہیل کھنڈ (یو۔ پی) کے علاقہ میں اپنے علم و کمال کے لحاظ سے ایک خطۂ مردم خیز تسلیم کیا جاتا ہے، جو سالہا سال سے فضل و کمال کا منبع رہا ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات اور علوم شرقیہ کی درسیات کے لئے مدرسۂ عالیہ۔ مدرسۂ قادریہ اور مطلع العلوم وہ ادارے ہیں جو عرصۂ دراز سے مرجعِ خلائق بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں دور دراز مقامات حتیٰ کہ بیرونی اسلامی ممالک سے طالبانِ علم آ کر دینی و دنیوی علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ اس سرزمین نے متعدد اکابرینِ دین و ملت اور کاملینِ علم و فن کو جنم دیا اور ملک کے اکثر علماء و فضلاء اور مشاہیر ادباء و شعراء کا مدت مدید تک مرکز بنی۔ ہندوستان کے بیشتر شعرائے متقدمین و متاخرین ہر دور میں دربارِ رام پور کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اسی لئے سرکاری کتاب خانہ میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ نادر کتب اور گرانمایہ نسخہ جات قدیم تصاویر اور خطاطی کے بے بہا نقوش محفوظ ہیں جن میں سے بیشتر کمیاب و نایاب نوادر کا درجہ رکھتے ہیں۔

جب عرشی صاحب نے مسٹر چیمپین کی نیابت میں اس کتاب خانہ کا جائزہ لیا اور اس کے ترتیب و نظام کا بہ غائر مطالعہ کیا تو ان کو اندازہ لگا کہ اُن نادرات کے ذخائر بے ترتیب بدحالی میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کئی سال کی شبانہ روز جانفشانی کے بعد ان کو درست و منظم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناظم اعلیٰ مسٹر چیمپین اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان روانہ ہوئے تو کتاب خانہ کی نظامت عرشی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اور نواب صاحب کا کلی اعتماد ہونے کے بعد انہوں نے کتاب خانہ کی مکمل و مفصل فہرست مرتب کی۔ اور اس کی ایسی اصلاح و تنظیم کی کہ ملک کے اکثر مشاہیر علم و ادب نے اس کو ہندوستان کا بے نظیر ادارہ تسلیم کیا اور عرشی صاحب کی گرامی خدمات و اعلیٰ لیاقت کی قرار واقعی داد دی۔ اس مخزنِ علم و فن کی محافظت عرشی صاحب کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس پر ہمیشہ فخر کیا جا سکتا ہے۔

اس تنظیم نے کتاب خانہ کے نادر جواہرات کو محفوظ کر دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو کاوش و محنت کی اور متعدد علمی ادبی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا اس سے ان کے ذوق کی جلا بھی ہوئی۔ اس دوران میں ملک کے بیشتر شیدایانِ علم و ادب اور مشاہیر اس ادارہ سے استفادہ کرنے وہاں آئے عرشی صاحب کو ان سے ملنے، علمی مباحث میں حصہ لینے اور ان کے ساتھ ان کے ریسرچ کے کاموں میں شرکت و نگرانی کا بھی موقعہ ملا۔

بھائی عرشی کو خاص طور پر مذہب۔ تاریخ و تنقیدِ ادب سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی دقتِ نظر اور تحقیق و تفحص سے جو تخلیقات پیش کی ہیں ان کا مرتبہ دنیائے ادب میں نہایت بلند ہے۔ مولانا عرشی کا تبحرِ علمی، ذوقِ تنقید اور نکتہ رسی و ژرف نگاہی مسلّم ہے وہ ایک جید عالم اور اُردو فارسی اور عربی کے بلند پایہ نقاد ہیں۔ اور ان کی یہ مسلّم الثبوت حیثیت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے لئے وقف، اور کسی نہ کسی شعبہ کی تحقیق و جستجو میں گزرتا ہے۔

عرشی صاحب ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت درجہ صحت مند اور علی الشان ہیں۔ وہ اپنے فرائض و معاملات میں نہایت متدین و مستعد

ہیں۔ اعزاء و احباب کے ساتھ برتاؤ میں بھی وہ اپنے اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ہر معاملہ اور تعلق میں کامل خلوص و دیانت برتتے ہیں۔ اور اپنے علمی ادبی مشاغل کی انجام دہی میں بھی پوری طرح اپنے مقررہ اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اسی لئے پابندیٔ وقت ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ کوئی ترغیب یا کوئی قوت ان کے عزائم و اصول میں تغیّر یا اضمحلال نہیں پیدا کر سکتی۔

عرشی صاحب کی تحریر اور تقریر کا انداز تقریباً یکساں ہے، ان کا طرزِ ادا نہایت شستہ، سلیس اور نکتہ رسی کا مظہر ہے، زبان و بیان میں بلا کی سلاست اور قدرت ہے۔ اور ایسی شگفتگی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع بہارستان نظر آتا ہے۔

وہ ایک خوش بیان مقرر بھی ہیں۔ اور طرزِ بدیع کے مالک بلند پایہ انشا پرداز اور خوش فکر شاعر بھی۔ مگر دقیقہ سنجی و نکتہ دانی تمام صفات میں نمایاں ہیں۔ پھر گفتار و کردار کی یکسانیت نے ان کو ایک ایسی امتیازی شان کا مالک بنا دیا ہے کہ عرشی سے ہم کلام ہو کر ہر شخص ان کی لطیف و جمیل شخصیت کے تمام اوصاف سے بآسانی روشناس ہو جاتا ہے۔ اور ان کے دلکش کلام کی لطافتوں سے بہرہ اندوز ہو کر طبیعت میں فرحت و انبساط محسوس کرنے لگتا ہے۔ اگر گفتگو علمی موضوع پر ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ بحرِ علم سے سیراب ہو رہا ہے۔ موضوعِ شعر و ادب ہو تو باغ و بہار کا احساس لے کر اٹھے۔ اور پھر اس ہمہ صفت موصوف انسان میں ان تمام کمالات کے باوجود علمیت و فضیلت کا غرور نام کو بھی نہیں۔

ان کے حسین و متین چہرہ پر وقت بشاشت نظر آتی ہے۔ اور ان کو رنج و فکر میں بھی مسکراتے ہی دیکھا گیا ہے۔ علماء و فضلاء کی محفل میں عرشی ایک فاضل اجل ہوتے ہیں۔ سیاسی مذاکرات میں ایک باخبر مدبر اور بزمِ احباب میں ان کی شگفتہ مزاجی و بذلہ سنجی کچھ اور ہی بہار دکھاتی ہے۔ خصوصاً بے تکلف دوستوں میں وہ گلزار بن جاتے ہیں۔ ان کی متانت و سنجیدگی میں بھی ایک کیف ہے۔ زاہدانہ خشکی کا شائبہ تک نہیں۔ ان کی خشک رندی پر ہزار پارسائی قربان ہیں۔ مزاج میں متین شوخی اور سنجیدہ مزاح کی چاشنی ہے۔ بعض اوقات وہ مطائبات کے ایسے لطیف پہلو نکالتی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ظرافت منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ برجستگی و بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ تحریر و تقریر میں کہیں بھی تکلف، تصنّع یا آورد کا نام تک نہیں ہوتا۔ احباب کے رنج و خوشی میں اس طرح شریک نظر آتے ہیں جیسے اپنے گھر میں۔ قدیم دوستوں سے کہیں کسی حالت میں بھی ملاقات ہو بغلگیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور موقعہ پر خوش طبعی سے نہیں چوکتے۔

ایک بار سنہ [illegible] میں عرشی صاحب میرے قیامِ لکھنؤ کے دوران میں وہاں علمی مصروفیت کے سلسلہ میں تشریف لائے ہوئے تھے اور میرے پاس قیام پذیر تھے۔ اسی عرصہ میں میرے ایک عزیز جنہوں نے پنجاب میں شادی کی تھی اور اپنی نئی دولہن کے ساتھ آئے تھے وہ بھی غریب خانہ پر مقیم تھے۔ میرے یہ عزیز عرشی صاحب کے بے تکلف دوست تھے۔ لیکن کسی وجہ سے عرشی صاحب کو ان کی شادی کی قبل سے اطلاع نہ تھی۔ جب عرشی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی اور شادی کا حال معلوم ہوا۔ تو انہوں نے کہا "ہم رسمی مبارکباد کے قائل نہیں۔ اور شادی کی اس افواہ کو ماننے کے لئے نہیں تیار۔ یہ شادی پھر ہوگی اور یہیں ہوگی۔ بھاوج کو سلام مزید کہدو رہا مزاج تو ظاہر ہے۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد اس کا کیا پوچھنا!"

آخر ایک پُر تکلف دعوت کے ذریعہ میں نے شادی منانے کا انتظام کیا اور دوبارہ پھر منائی گئی۔ اور اس واقعہ سے پانچ سال قبل جبکہ میں دہلی میں مقیم تھا۔ میری شادی کے موقعہ پر دوسرے مخصوص اعزاء و احباب کو جو دعوتی رقعے روانہ ہوئے ان میں جب عرشی صاحب کو یہ رقعہ پہنچا تو انہوں نے مجھ کو لکھا:

"بھائی! آپ کی شادی کی اطلاع ملی۔ آپ کی معقولیت کا خیال کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ لیکن مجبوری، اپنے ابوالآبا (آدمؑ) کی سنتِ کہن پر عمل کر کے آپ کو انسانیت کا جامہ اختیار کرنا ہی ہوگا۔ بہر حال سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہونا مبارک"! سوچتا ہوں آپ

جیسا سنجیدہ انسان جب شادی کرے تو احباب کیا کریں گے"۔

شادیوں کے اس پُر لطف سلسلہ میں بھائی عرشی کی اپنی شادی بھی یاد آگئی - میری شادی سے کچھ عرصہ کے بعد اُن کی شادی ہوئی - میں دہلی میں ہی تھا - میرے نام رسمی دعوتی رقعہ کی بجائے ان کے قلم کی ایک تحریر موصول ہوئی - لکھا تھا ع

مبارک باد مرگِ تو بہ عرشی

بھائی — یہ سوگ منانے آیئے - بھاوج کو بیگم عرشی کا سلام کہہ کر ضرور لایئے - آخر ایک دن وہ آئیں گی اور یہ رسم آمنے سامنے ادا ہوگی - پھر میں یہ فریضہ پیشگی کیوں نہ ادا کر دوں - ہمیں بھی مرزا نوشہ کے "خمار رسوم و قیود" نے مار ڈالا! اور "تیشہ بغیر" نہ رہ سکے"۔

عرشی کے ادبی لطائف اور علمی مطائبات بے شمار ہیں - لیکن اس مضمون میں ان کی ذات و صفات کا تذکرہ ہے - فضل و کمال پر تفصیلی تبصرہ نہیں - اس لئے میں دانستہ چند ذاتی لطائف کے ذکر پر اکتفا کروں گا - بزمِ احباب کے لطیفوں کا بھی اگر تفصیلی بیان کرنے لگوں تو اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں، ۱۹۴۳ء میں عرشی صاحب لاہور آئے ہوئے تھے - ان کے مخصوص احباب میں مولوی غلام ناصر خاں نگار مرحوم سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی - حسنِ اتفاق سے ولادت کے وقت عرشی صاحب غلام ناصر خاں صاحب کے مکان پر موجود تھے - لڑکی کی ولادت کی خبر سنتے ہی عرشی صاحب نے ان کو مبارک باد دی - اور فرمایا -

"مٹھائی منگوایئے"۔

اسی دوران میں کسی عزیز نے کہا کہ "کسی مولوی کو بلایا جائے لڑکی کے کان میں اذان دی جائے گی"۔

عرشی نے مسکرا کر کہا "بھئی - ہم سے بڑا مولوی کون ہوگا، ہم خود اذان دیں گے" اور بڑے اصرار سے ہنستے ہوئے زنانہ میں پہنچے - اذان دی - اور باہر آکر مٹھائی کی مکرر فرمائش کی - اور بولے -

"اب تو میرے دو حصے ہو گئے - ایک بہ حیثیت مولوی اور ایک بچی کے چچا ہونے کا!

پھر لڑکی کا نام رکھنے کے ذکر پر فرمانے لگے -

"اس کی فیس علٰحدہ لوں گا - آخر داڑھی کی لاج بھی تو رکھنا ہے"۔

عرشی صاحب کے عزیز ترین احباب میں مرزا ہادی علی بیگ وامق (جن کا نام پہلے آچکا ہے) کا نام خاص ہے - مولانا وامق شادانی عرشی صاحب سے عمر میں بڑے ہیں - اور فضل و کمال میں خاص درجہ رکھتے ہیں - شادانی برادری میں ہم سب احباب اُن کو "ہادی بھائی" کہتے اور ان کا بہت احترام کرتے ہیں - اور یہ محترم بھائی ہم میں سے ہر ایک کو کبھی "میاں" کبھی "بھیا" کہہ کر بڑی شفقت سے مخاطب کرتے ہیں -

"ہادی بھائی" بڑے پختہ عقائد کے شیر دل عالم فاضل بزرگ ہیں - کسی موضوع پر بحث ہو ان کے سامنے کسی کی مشکل ہی سے پیش چلتی ہے - اردو زباندانی میں ان کو زندہ لغات کا درجہ حاصل ہے - عربی فارسی کے مستند فاضل ہیں - ساری عمر تحقیق علمی میں بسر کی - اور عروسِ علم کو گلے لگا کر تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں - دوستوں کے جاں نثار، ہمدرد اور دشمنوں کے جانی دشمن ان کے پُر خلوص کردار کی خاصیت ہے،

عرشی صاحب مولانا کا بیحد احترام کرتے ہیں اور دونوں میں انتہائی خلوص و مودت کے تعلقات ہیں - وہ عرشی صاحب کو "عرشی"، "نیاز" اور کبھی "امتیاز علی خاں" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں - ان دونوں احباب کے درمیان جب کسی موضوع پر گفتگو چھڑ جائے تو کئی کئی گھنٹے

مسلسل جاری رہ سکتی ہے اور یہ موقع بیحد دلچسپ اور قابلِ دید و شنید ہوتا ہے۔

ہادی بھائی، کا بلند بانگ طرزِ خطابت اور عرشی صاحب کی دھیمی اور رسیلی شگفتہ بیانی۔ بحث میں کئی ایسے موڑ آتے ہیں جہاں ہادی بھائی عرشی صاحب سے روٹھنے اور بگڑنے لگتے ہیں۔ اور عرشی صاحب کو اصل موضوع کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے ان کو منانا بھی پڑتا ہے۔ لیکن بیجا شکست پر دونوں میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ عرشی صاحب کے لئے محترم بھائی کے بگڑنے کا موقعہ ذرا نازک بھی ہوتا ہے۔ لیکن اکثر خلوص پر انجام بخیر ہوا کرتا ہے۔ کبھی ہادی بھائی عرشی صاحب کی نکتہ سنجی اور علمی نکات سے متاثر ہو کر ان کو بے اختیار گلے لگا لیتے ہیں۔ اس وقت ہادی بھائی اپنے شکستِ پندار، پر ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے بلکہ عرشی صاحب کے تبحرِ علمی کو تسلیم کرکے عالمِ سرخوشی میں جھومنے لگتے ہیں۔ عالمانہ فتح و شکست اور مخلصانہ مجادلہ کا یہ نظارہ نہایت پُر کیف اور دیدنی ہوتا ہے۔

غرضیکہ عرشی صاحب کا مخلص ترین دوست اور شدید ترین مخالف۔ بڑے سے بڑا عالم اور بلند پایہ ادیب ان کی علمی فضیلت اور دقیق و عمیق فکر کا قائل نظر آتا ہے۔ دوستوں کو ان کی ذات و صفات پر ناز ہے اور مخالف ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بے لوث، بے غرض ایثار و خلوص کا مجسمہ احباب کا مونس و غمخوار اور دل آزاروں کے حق میں بے آزار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔

ایک محترم عزیز دوست کی حیثیت سے مجھے ان کے اخلاص و مودت پر فخر و مسرت ہے اور یہ امر میرے لئے باعثِ ناز ہے کہ میں نے جب کبھی ان سے اپنے رسالہ نیرنگستان (دہلی) اور بعض احباب کے لئے مضمون کی فرمائش کی تو انہوں نے محروم نہ رکھا۔ اور ان کا ارشاد ہے کہ " تمہارا اصرار میری کوتاہ قلمی پر سدا غالب آتا ہے۔

لیکن جس زمانہ میں (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک) میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ڈائرکٹر تھا اور لکھنؤ اسٹیشن پر تعینات رہا۔ عرشی صاحب سے بارہا تقاضہ و اصرار کرتا رہا کہ ریڈیو اسٹیشن سے کسی علمی ادبی موضوع پر تقریر نشر کریں مگر انہوں نے ہمیشہ کتاب خانہ کی مصروفیت کا عذر پیش کرکے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ آخر میرا اصرار حد سے متجاوز دیکھ کر انہوں نے دورانِ ملاقات میں مجھے اس ٹال مٹول کی وجہ صاف طور پر بتا دی۔ انہوں نے فرمایا۔

" بھائی۔ بات یہ ہے کہ آپ اس محکمہ کے با اختیار رکن ہیں۔ اور میرے عزیز دوست۔ اس کا علم اکثر اصحاب کو ہوگا۔ میں آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر چند بار تقریر نشر کردوں گا۔ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے گا کہ میں آپ کی دوستی سے فائدہ اُٹھا کر ریڈیو کو اپنی شہرت کا آلۂ کار بنا رہا ہوں، میرے انکار اور آپ کے اصرار سے کون خبردار ہے۔ آپ پر خواہ مخواہ دوست نوازی کا الزام آئے گا اور میرا ضمیر مطمئن نہ ہوگا۔"

اس سے عرشی صاحب کے عقائد کی پختگی اور قناعت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں جب میری کوئی بحث و تکرار کارگر نہ ہو سکی مجھے بیحد مایوسی ہوئی۔ اکثر اربابِ ذوق جو عرشی صاحب کے مدّاحوں و متعلقوں میں سے تھے ان کے سامنے بھی مجھ کو ندامت محسوس ہوتی۔ وہ طعنے دے کر مجھ کو نذر دیتے کہ مولانا عرشی سے آپ کے ایسے یگانگت کے مراسم ہیں اور آپ کا ریڈیو اسٹیشن ان کی تقریروں سے محروم ہے۔

مجھے اپنی ناکامی کے احساس نے ستانا شروع کیا۔ آخر میں نے ان کی بلا اطلاع "یوم غالب" پر ان کی تقریر پروگرام میں شامل کر دی۔ اور مقررہ تاریخ سے چند روز قبل خود رام پور گیا۔ اور محض تفریح کی خاطر ان سے لکھنؤ اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ وہ میری اس فرمائش کو نہ ٹال سکے اور لکھنؤ پہنچ کر میں نے مطبوعہ پروگرام ان کے سامنے پیش کرکے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے اور تقریر لکھنے کی عرضداشت پیش کر دی۔

عرشی صاحب حیران تھے اور جب میں نے ان سے کہا کہ اگر اب آپ میری اس درخواست پر انکار کریں گے تو میری عزت اور ریڈیو اسٹیشن کی پابندیٔ نظام (جو میرے سپرد ہے) معرضِ خطر میں ہوگی۔ آخر عرشی صاحب نے مسکرا کر قلم اٹھایا۔ کنٹریکٹ فارم پر دستخط کئے اور تقریر لکھنے کی فکر کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مختصر مدت میں معرکہ آرا تقریر لکھی اور نشر کی۔ جو بیحد مقبول ہوئی اور ہمیں بے شمار تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ میں نے اس کامیابی پر بصد شکریہ ان کی خدمت میں عرض کیا ؎

لائے عرشی کو التجا کر کے　　　کفر توڑا خدا خدا کر کے

ہنس کر فرمایا "خدا خدا کرو بھائی۔ میں اس لائق کہاں!"۔ اس کے بعد چند بار اور بھی انہوں نے میرے تقاضوں پر مجبور ہو کر ریڈیو اسٹیشن پر لطف فرمایا۔ اور میں ہمیشہ اُن کو اس حیلہ سے منا لایا کہ "بر سبیلِ تقریر چند روز کے لئے آپ لکھنؤ تشریف لے آتے ہیں اور ملاقات کا لطف نصیب ہو جاتا ہے۔"

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے عرشی صاحب خاموش طبع قانع اور کم آمیز بزرگ ہیں۔ لیکن اربابِ علم و ادب سے ان کے مراسم بڑی حد تک قربت و یگانگت کے ہیں۔ اور گو وہ طبعاً شہرت پرستی سے محترز رہتے ہیں لیکن ہندوستان و پاکستان کے علاوہ تقریباً تمام بیرونی اسلامی ممالک میں ان کی علمی و ادبی تخلیقات اور مستند فاضل شخصیت کو بڑے احترام و وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا عرشی کی ہمہ گیر شخصیت پر سیر حاصل مقالہ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرشی کی فضیلت میں ایسا تنوع اور خلوص و صداقت ہے کہ ان کے علمی ادبی کارناموں کے مطالعہ ہی سے اربابِ علم و ادب ان کی شخصیت سے غائبانہ طور پر روشناس ہو جاتے ہیں۔ اور اس پیارے انسان کی پیاری علمیت و شخصیت سے والہانہ پیار کرنے لگتے ہیں یہ مختصر مقالہ بھائی عرشی کے عالمانہ خلوص و محبت کی نذر کر کے میں وہی مسرت محسوس کر رہا ہوں جو ان سے گلے مل کر ہوتی ہے۔

—

سیّد امتیاز علی تاج

شوکت تھانوی

"چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" یہ تھا وہ مضمون جسے پڑھ کر سید امتیاز علی تاج ذہن میں کچھ اس طرح اُبھرے جیسے جوانی میں کسی کو اپنا کوئی وہ کھلونا یاد آ جائے جس سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ اور کچھ ایسا محسوس ہُوا کہ گویا بچپن کا کوئی بچھڑا ہُوا ساتھی یکایک مل گیا ہو۔ حالانکہ میں کبھی سید امتیاز علی تاج سے نہ ملا تھا مگر ان کے اخبار پھول ہی سے تو اصل میں نے اردو سیکھی تھی۔ یہی پہلا اخبار تھا جو باقاعدہ میرے نام آتا تھا اور یہی اخبار تھا جس میں میرے بڑے بھائی ارشد تھانوی صاحب میرے نام سے کہانیاں لکھ لکھ کر چھپوایا کرتے تھے حالانکہ میں اس وقت شوکت تھانوی نہیں صرف محمد عمر سلمہٗ تھا۔

چچا چھکن کے سلسلۂ مضامین کو بڑی یگانگت کے ساتھ پڑھتا رہا۔ پھر سید امتیاز علی تاج کا زندۂ جاوید کارنامہ انارکلی کی صورت میں نظر سے گزرا اور دل میں ایک بے ساختہ ارمان پیدا کر گیا کہ کاش میں ان سے کبھی مل سکتا۔

۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ لاہور آنا ہوا۔ لاہور میں میرے لئے جو کشش تھی وہ علامہ اقبال۔ سر عبدالقادر اور امتیاز علی تاج کی تھی یعنی جہانگیر کے مقبرے اور شالامار باغ سے بھی زیادہ کشش جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں سفر میں نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے گیا نہ شالامار کی سیر کی البتہ علامہ اقبال۔ سر عبدالقادر اور امتیاز علی تاج سے نہایت بے تابی کے ساتھ ملنے کے لئے پہنچ گیا۔

ریلوے روڈ پر دارالاشاعت میں سید امتیاز علی تاج کو بڑے بانکے سجیلے جوانِ رعنا کی صورت میں مَیں نے دیکھا۔ خوبصورت پنڈلیوں میں چُھبا ہُوا چوڑی دار پاجامہ، پیر میں سلیم شاہی جوتا۔ کٹاؤ کے کام کا کرتا پہنے۔ سنہری کمانی کی عینک لگائے آپ اپنے ڈرائینگ روم میں مجھ سے ملے۔ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم بھی اُس وقت آپ کے پاس ہی موجود تھے۔ یہ ملاقات اس قدر رسمی اور واجبی سی ثابت ہوئی کہ آج تک اپنی اس ہیچمدانی پر شرم آتی ہے کہ اُن سے مل تو لئے مگر اپنا تعارف اُن سے نہ کرا سکے اور تعارف کراتے بھی کیا۔ تھے ہی کس کھیت کی مولی۔

تفصیلی ملاقات پھر ۱۹۴۰ء میں ہوئی جب سیٹھ دلسکھ پنچولی کے بلاوے پر لاہور آنا پڑا۔ تاج صاحب اُس زمانے میں بہاولپور روڈ پر رہتے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں پہنچتے ہی ایک نہایت اشرف المخلوقات قسم کے طوطے کا عظیم الشان پنجرہ نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انواع و اقسام

کی بلیاں اسی برآمدے میں کلیلیں کرتی ہوئی نظر آئیں مگر اس سے قبل کہ اس کوٹھی کو ذرا سمجھ کر میں لوٹتا خود تاج صاحب برآمد ہوئے اور اپنے اس ڈرائینگ روم میں لے گئے جس میں جھانسی کی رانی کا قلعہ مثل پیس کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور پیتل کے بگلوں اور مارسوں کی وہ کثرت تھی کہ گویا اگر ایک سے بچے تو دوسرا سر پر ٹھونگ ضرور مارے گا۔ نارنجی رنگ کا یہ ڈرائینگ روم جس کی ہر چیز نارنجی تھی کچھ عجیب رومانی فضا پیش کر رہا تھا۔ لاہور میں میرے لئے یہ پہلا گھر تھا جس میں مجھ کو صحیح قسم کے پان کھانے کو ملے اور یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ خود تاج صاحب بڑے سلیقے سے پان کھاتے ہیں۔ بڑی تفصیلی باتیں ہوئیں۔ ملاقاتوں کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو گیا کبھی پنچولی کے اسٹڈیو میں ملاقات ہوتی تو کبھی ریڈیو اسٹیشن پر مگر ابھی تک ایک خاص فاصلہ درمیان تھا اور ۱۹۴۷ء تک یہ فاصلہ اسی طرح قائم رہا۔

قیام پاکستان کے بعد تاج صاحب کی تجویز پر ریڈیو پاکستان نے ایک تعمیری پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" کے نام سے شروع کیا۔ میں تو ریڈیو میں تھا ہی اب تاج صاحب بھی آ گئے اور شروع کر دیا یہ پروگرام۔ یوں تو خیر اس وقت جوشِ عمل کا ہر شعبہ اور ہر گوشے سے حیرت انگیز مظاہرہ ہو رہا تھا مگر ہم لوگوں نے تو واقعی یہ سمجھ رکھا تھا کہ پاکستان گویا ہم ہی دونوں کو بنانا ہے صبح سے شام تک وہ جنوں انگیز مصروفیت کہ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا بس عالم یہ تھا کہ ؎

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

نہر کی ایک طرف میں ہوں دوسری طرف تاج صاحب وہ بھی لکھ رہے ہیں اور میں بھی پروگرام ایک ہی ہے مگر دونوں مل کر اس طرح لکھ رہے ہیں کہ نہ وہ تھکتے ہیں نہ میں تھکتا ہوں کہ یکایک تاج صاحب نے لکھتے لکھتے کہا۔ "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہئے ایک نظم لحافوں کے متعلق۔"

جی ہاں اس قرب نے اب یہ تعلقات پیدا کر دیئے تھے کہ تاج صاحب نے مجھ کو علامہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ خیر علامہ تک بھی غنیمت تھا مگر خدا اس "یار علامہ" کی ترکیب ملاحظہ فرمایئے —— ہاں تو کہنے لگے "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہیئے ایک نظم لحافوں کے متعلق۔"

اب بتایئے لحاف کے متعلق نظم کہاں سے لائی جائے۔ نہ اقبال نے لحاف کو کبھی موضوعِ سخن بنایا نہ مولانا ظفر علی خاں نے مگر تاج صاحب ہیں کہ لحاف پر نظم ضرور چاہتے ہیں۔ آخر عاجز آ کر عرض کیا۔

"تاج صاحب لحاف پر تو مشکل ہی سے اساتذہ میں سے کسی نے نظم کہی ہوگی۔"

بڑے اطمینان سے بولے "تو کہہ ڈالو نہ علامہ آٹھ دس شعر لحاف نہ سہی کمبل سہی۔"

پھر مصیبت یہ کہ نظم بھی وہ ایسی نہ چاہتے تھے کہ ؎

رب کا شکر ادا کر صاف
جس نے بنایا تیرا لحاف

بلکہ مقصد یہ تھا کہ سردی میں اکڑنے والے مہاجرین کا وہ دلدوز مرقع اس نظم میں پیش کیا جائے کہ سننے والوں کے بستر میں کانٹے بچھ جائیں اور وہ اپنے گدے گدے بستر چھوڑ کر کھلے آسمان کے نیچے سرد راتیں گزارنے والے مہاجرین کے لئے اوڑھنا بچھونا لے کر دوڑ پڑیں۔ چنانچہ شروع کی یہ نظم کچھ اس طرح کہ ؎

کانپتے تارے لرزتی چاندنی سکڑی فضا
برف کی پیغامبر تھی رات ہر مرج ہوا
آتش جو آلہ کو تھا پے کسی کا اعتراف
آگ خود ہی سو رہی تھی راکھ کا اوڑھے لحاف

اور ختم یہ نظم اس طرح ہوئی کہ جب میں کمبل تقسیم کرنے ایک مہاجر خاتون کے پاس پہنچا ہوں جو گود میں بچہ لئے بت بنی بیٹھی تھی تو اس کا عالم یہ تھا ؎

گود میں بچہ تھا اُس کے پھر بھی وہ بے آس تھی
اس کو تو مغرور ہونا تھا کہ دولت پاس تھی
لیکن اُس نے دیکھ کر کمبل جو کھینچی آہِ سرد
اس میں مایوسی تھی اُس میں بیکسی تھی اس میں درد

دفعتاً بجلی گرائی اُس نے جب مجھ سے کہا　　　آپ اب لائے ہیں کمبل جب یہ بچّہ سو گیا
جائیے لیجائیے کمبل تو اب بیکار ہے　　　مجھ کو کمبل کی جگہ اس کا کفن درکار ہے

اور اب جرات کو آٹھ بجے یہ پروگرام پیش ہوا ہے تو پروگرام ختم کرنے کے بعد ابھی ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ لحافوں اور کمبلوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ جس کو ہم لوگوں نے کیمپ کی طرف روانہ کیا معلوم نہیں یہ حالات کا تاثر تھا یا جوش عمل کا خلوص کہ اسی پروگرام کے متعلق مہاتما گاندھی تک نے اپنی پرارتھنا سبھا میں کئی مرتبہ تاج صاحب کا اور میرا نام لے لے کر کہا کہ یہ دونوں پاکستان سے جو تعمیری پروگرام پیش کر رہے ہیں وہ صرف پاکستان کی خدمت نہیں کر رہا ہے بلکہ عام انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

اس ذکر کو تفصیل میں لے جانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ تاج صاحب کی اس سخت کوشی کے بعد اب ذرا اس کا وہ عالم بھی ملاحظہ فرمائیے جس کو لیلائیں بخاری "پینک" کہا کرتے ہیں۔ تاج صاحب کو ایک فیچر لکھنا ہے اور اُن سے فیچر لکھوانا ذمہ داری میری ہے چنانچہ مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل ہی سے میں روزانہ ان کو ٹیلیفون کر دیا کرتا ہوں اور جواب میں یہ سن لیتا ہوں "لاحول ولا قوۃ میں سمجھا تھا کسی ضروری کام سے فون کیا ہوگا" یہاں تک کہ اب گویا کل وہ فیچر ہونے والا ہے اور مسودہ آج بھی نہ ملا۔ مجبور ہو کر دوڑا ان کی کوٹھی کی طرف اور وہ ادھم مچایا کہ آخر تاج صاحب کو کچی نیند میں خواب چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے آفس روم میں آ گئے۔ بجائے اس کے کہ میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا میں نے براہ راست فیچر کا مطالبہ تو بالکل قرض والے تقاضے کی طرح شروع کر دیا کہ "تاج صاحب کب اس کی ریہرسل ہوگی کب وہ پیش ہوگا۔"

میرا یہ اضطراب دیکھنے اور آپ کا یہ اطمینان کہ عینک آنکھوں سے اُٹھا کر ماتھے پر لگالی آنکھوں کو ملا اور پھر نہایت سنجیدگی سے فرمایا "یار علامہ میں نے کئی مرتبہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نوٹس بھی تیار کئے۔ مگر کچھ موڈ پیدا نہ ہو سکا۔ کوئی ڈھب پیدا نہ ہوا۔ اوپر ہی اوپر خیالات آئے اور اوپر ہی اوپر غائب ہو گئے۔ یار چھوڑو بھی اس ذکر کو۔ پان کھاؤ۔"

اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں پان کے بجائے سر کھانے کا ارادہ ہو رہا ہے اور آزردگی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ رو دینے کو جی چاہ رہا ہے تو ایک دم یہ جمائیاں بھی ختم اور انگڑائیاں بھی غائب اور ایک دم کمر باندھ کر تیار بھی ہو گئے۔

"تو یار علامہ مر کیوں جاتا ہے لکھے دیتے ہیں نا۔ چار بجے مسودہ منگا لینا۔"

اور پھر تین بجے ٹیلیفون آ گیا کہ مسودہ منگا لو۔

تاج صاحب کی یہ کیفیت اور کیفیات کا یہ تضاد ان کی زندگی کا ایک عام خاصہ ہے کہنے لگے "یار علامہ یہ فلمی مشاغل واہیات اس تضیع اوقات کے بجائے اگر اپنا ہی کام دیکھیں تو بڑا پار ہو جائے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ بس یہ دھندا ختم۔"

میں یہ سن کر آ گیا اور اتنی ہی دیر میں نہ جانے کس کس سے کہہ بھی دیا کہ تاج صاحب فلمی مشاغل سے کنارہ کش ہو گئے ہیں کہ اتنی ہی دیر میں ٹیلیفون چلا آ رہا ہے "یار علامہ یہ کیا واہیات ہے کہ ہر وقت دفتر میں بیٹھے رہتے ہو۔ ذرا آ کیوں نہیں جاتے۔"

پوچھا "خیریت؟"

"معلوم ہوا کہ کسی پروڈیوسر نے کچھ ایسے اخلاقی دباؤ ڈالے کہ پھر کہانی دینے کو تیار ہو گئے اور یہ بھی نہیں معاوضے کی معقولیت نے ارادہ بدلنے پر مجبور کیا ہو۔ جی نہیں صرف چند جذباتی باتیں کچھ ملکی اور قومی قسم کی اپیل کہ پاکستان کی نئی انڈسٹری منجدھار میں ہے اور اس تلم سے پڑتی ہو بار ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ بس تاج صاحب پھر پگھل گئے۔ حالانکہ اگر یہی بات اُن سے کہی جائے تو صاف مکر جائیں گے کہ "یار علامہ عجیب مسخرہ ہے تو بھی میں ایسا بھی موم کی ناک نہیں ہوں۔" حالانکہ موم کی ناک ہی کیا سرتا پا وہ موم کے ہیں۔

میں نے اپریل ۱۹۴۳ء میں اپنی کتاب "شیش محل" میں تاج صاحب کے متعلق کس قدر غلط بات لکھی ہے کہ "خالص تجارتی آدمی ہیں گو ہو نٹ

سے بالکل ساہوکار نظر نہیں آتے" تاج صاحب پر اس سے بڑا اتہام اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کو تجارتی آدمی کہا جائے۔ پہلے میں نے یہی بات لکھی تھی اور اب خود تاج صاحب اسی بات کا مجھ کو یقین دلانا چاہتے ہیں مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ تجارتی آدمی کسی صورت سے ہو بھی سکتے ہیں۔ روپے پیسے کے معاملے کی بات میں ان کی طرح شرمانے والا کیونکر تجارتی آدمی ہو سکتا ہے۔ یہ معاملات ان کی طرف سے اکثر مجھ کو طے کرنا پڑے لہٰذا ان سے زیادہ تجارتی آدمی تو میں ہوا۔

تاج صاحب میں ممکن ہے کچھ خامیاں بھی ہوں مگر ان کی ایک خوبی نے کم سے کم میری نظر سے ان کی ہر خامی کو چھپا دیا ہے کہ وہ آج بھی طالب علم ہیں۔ ڈرامہ اُن کا فن ہے۔ مکالمہ نویسی میں ان کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا دھاندلی ہے مگر آج بھی وہ کسی مبتدی سے کسی آئے گئے سے مطلب یہ کہ کسی سے بھی اپنے اسی فن کے سلسلے میں کوئی مشورہ لیتے کبھی نہیں ہچکچاتے اور اگر کسی نے ایسا مشورہ دے دیا جس کو ان کے دل نے قبول کر لیا تو داد دینے میں بھی دیر نہیں کرتے " ہاں اب بات بن گئی یار آدمی ہو زرخیز"۔

اسی کے ساتھ وہ خطرناک حد تک اُس شخص کے لئے مُنہ پھٹ بھی بن جاتے ہیں جو غیر ضروری طور پر اُن کے سامنے بننے کی کوشش کرے۔ بڑے بڑے بُت وہ گرا چکے ہیں اور چبھتے ہوئے ایک آدھ فقرے سے رخود غلط قسم کے لوگوں کی ایسی قلعی کھولی ہے کہ وہ ان کی چشم مروّت ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔

گھر میں اُن کی حیثیت ایک دوست باپ۔ ایک مہذب شوہر اور ایک فراخ دل آقا کی ہونے کے علاوہ ایک معصوم بچّے کی بھی ہے جو آنکھ بچا کر بد پرہیزی بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر نہایت بھولپن سے اُس کا اعتراف بھی کر لیتا ہے۔ مثلاً پھوٹ گئی نکسیر اور ڈاکٹر نے طے کر دیا کہ یہ بلڈ پریشر کا شاخسانہ ہے چنانچہ تمباکو قطعاً بند نہ پان میں کھا سکتے ہیں نہ سگرٹ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور کمال کیا تاج صاحب نے کہ واقعی وہ پان بھی چھوڑ دیا جو ان کی زندگی کی واحد عیاشی تھا۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ نکسیر لاکھ پھوٹے مگر پانوں کے سلسلے میں تقدیر پھوٹ جائے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ خیر میں تو یوں بھی بد پرہیز ہوں اور بڑی گھٹیا قسم کی بد پرہیزیاں کر گزرتا ہوں مثلاً گلے میں درد تھا ڈاکٹر نے بولنے کی قطعی ممانعت کر دی۔ اور کاغذ پنسل سرہانے رکھ دیا کہ لکھ کر بات کیا کرو۔ چنانچہ میں باتیں تو لکھ لکھ کر کرتا رہا مگر جب تنہائی ملتی تھی تو تھوڑا بہت گا لیا کرتا تھا۔

تاج صاحب نے شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پرہیز کیا پان واقعی نہیں کھایا مگر جب ان کو حقّہ پینے کی اجازت مل گئی تو چوری چھپے سگرٹ بھی پینے لگے اور بیگم حجاب امتیاز نے مورد الزام ان کو نہیں بلکہ اُن کو قرار دیا جو اُن کو سگرٹ پلا دیتے ہیں۔ میں نے اب تک سنجیدگی سے پان یا پان کے خشک مسالے کی دعوت نہیں دی ہے ورنہ شاید میں ان کو اپنے اعتماد میں لے کر اور رازداری کا وعدہ کر کے تمباکو بھی کھلا دیتا اور وہ میری دوستی کے بے انتہا قائل بھی ہو جاتے۔

تاج صاحب مدّت سے لکھ رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اُن کا قلم ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے مگر فلمی سرگرمیوں نے انارکلی کے خالق سے کوئی ایسی ہی تخلیق اب تک ممکن نہ ہونے دی۔ وہ کہتے ہیں کہ "یار علاّمہ یہ فلمی مشاغل واہیات"۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اب یہ کمبل نہیں چھوڑتا۔

حال ہی میں آپ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے دارالاشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اس توجہ کے کئی شاندار ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں۔ سلیقہ۔ محنت اور انہماک کی اب بھی کمی نہیں مگر خدا کرے کوئی فلم پروڈیوسر کچھ نہ آ جائے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

محمود نظامی

تبسّم پروفیسر صوفی غلام مُصطفےٰ کا نام اور تخلّص ہی نہیں حُلیہ بھی ہے فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ لیکن اگر پروفیسر تبسّم صوفی بھی کہلاتے ہیں تو یہ تصوّف پر ایک ذی روح طنز ہے کیونکہ جو لوگ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کو پوری طرح نہیں جانتے انہیں اِس پوشیدہ دلی پر بعض اوقات کھُلے کافر کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔

میرے اُن شفیق اُستادوں میں جنہوں نے پچھلے تیس برس کے عرصے میں مجھے سکھانے پڑھانے کی ایک مسلسل کوشش کو جاری رکھا ہے صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم ایک ایسے بزرگ ہیں جن کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جو کچھ نظر آ رہے ہیں وہ دراصل ہیں یا نہیں اور وہ جو کچھ دراصل ہیں وہ نظر بھی آتے ہیں یا نہیں، میں نے جب انہیں پہلے پہل دیکھا تھا تو میں خود کئی قسم کے اوہام میں گرفتار ہو گیا تھا، یہ انیس سو اٹھائیس کی بات ہے میں اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ائیر میں پڑھتا تھا۔ ایک شام میں اور میرے چند ہم جماعت، اپنے اُستاد ڈاکٹر تاثیر کے ہاں بارود خانہ روڈ والی حویلی میں بیٹھے کسی درسی مسئلے پر ان کے خیالات سُن رہے تھے کہ اچانک ایک چھوٹے قد کے دُبلے پتلے بزرگوار جو اپنے حلیئے کے اعتبار سے لاہور کے پبلشروں کے نمائندے معلوم ہوتے تھے کمرے میں وارد ہوئے اُن کے آتے ہی تاثیر کا چہرہ یوں کھل گیا گویا انہیں کوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہے۔ اور وہ "آ بھئی صوف" کا نعرہ ادا کرتے ہی درس و تدریس کے مسئلے کو بھول کر نو وارد پر اپنی فقرہ بازیوں، پھبتیوں اور طرح طرح کے مزاحیہ کلمات کے ساتھ پل پڑے۔ ان میں سے اکثر فقروں میں بڑے خوفناک قسم کے ذم کا پہلو نکلتا تھا، جس سے صوفی صاحب کی ذات کے بارے میں کوئی شریفانہ یا معقول رائے قائم کرنا قدرے مشکل تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے صوفی صاحب نہایت متانت اور سکونِ قلب سے تاثیر کے ان فقروں کے چپ چاپ لطف لیتے رہے۔ کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے تاثیر کے شاگردوں کو ایک نظر دیکھ لیتے غالباً اس خیال سے کہ ان برخورداروں کی موجودگی میں اب کوئی جواب میں کیا کہے لیکن جب تاثیر کی "خوش کلامی" بہت ہی طوالت اختیار کر گئی تو صوفی صاحب نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹ میں سے پان اُٹھایا اور اسے چباتے ہوئے ایک ہی مرتبہ جو تاثیر پر ایک فقرہ چست کیا۔ تو طلبہ کی ساری مجلس اپنے اُستاد کے ادب کے باوجود ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

اسی مجلس میں مجھ پر پہلی مرتبہ تبسم کی طبیعت کے کئی ایسے جوہر کھلے جو آج بھی ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا سکون اور ٹھہراؤ۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کا خلوص اور اُن کی شفقت، برخورداروں کا لحاظ، ہمعصروں کا احترام یہ سب باتیں جو میں نے ان میں روزِ اوّل دیکھی تھیں آج تیس برس گزر جانے پر بھی میں اُنہیں جوں کا توں دیکھتا ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں جس خاص بات نے مجھے حد درجہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ اپنی تمام قابلیت کے باوجود تبسم نے کسی پر اپنے تبحر علمی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ آج بھی ان کی یہی حالت ہے۔ کہ برسوں کی معلمی کے بعد جب بھی مجھ ایسے کسی نااہل شاگرد سے ملتے ہیں تو ان کی سعی یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے اس کی ذاتی نااہلیت کا احساس نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس پر اپنی قابلیت اور علم کا رعب بھی کسی طور پر نہ گانٹھا جائے

لیکن اس پہلی ملاقات میں مجھے صوفی صاحب کی ادبی شخصیت کا کوئی زیادہ علم نہ ہو سکا تھا، کیونکہ یہ مجلس زیادہ تر پُرمذاق فقروں اور پھبتیوں تک ہی محدود رہی البتہ اتنا ضرور پتہ چلا کہ صوفی صاحب ٹریننگ کالج سے تبادلے پر گورنمنٹ کالج میں گئے ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی ادبی عظمت کا حال ہم معتقدین پر کھلنے لگا۔ چند ہفتے بعد ایک دن تاثیر نے کہا آج صوفی کے ہاں ہلہ بولنے کا دن ہے۔ شب دیگ اور مچھلی کی ضیافت ہے۔ کون کون آئے گا میرے ساتھ۔ صلائے عام دیکھ کر ہم میں سے کئی لوگ ہتھے مارنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور فوراً ایک مختصر سا قافلہ بارود خانہ روڈ سے تانگوں میں سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے عقب میں ذیلدار روڈ کی ایک گلی کے دہانے پر جا پہنچا۔

کھانے کے بعد نمکین چائے کا دور چل رہا تھا کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل کا ایک مصرع گنگنانے لگے اور پھر احباب کی فرمائش یا اصرار کا انتظار کئے بغیر اُنہوں نے اپنی خود غزل سُنانا شروع کر دی۔ جملہ حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اور اُن کے کلام کا لطف لینے کے لئے آگے کو ان کی طرف سرک گئے لیکن اس دوران میں یہ بات ہم طلبہ کے لئے اچنبھے کا موجب بنی رہی کہ اپنا کلام سنانے کے دوران میں حفیظ کا روئے سخن بیشتر صوفی تبسم ہی کی طرف رہا [illegible] کو مخاطب کر کے شعر پڑھتے رہے اور پھر خود تبسم کی باری آگئی۔ اُنہوں نے اپنا کلام سُنایا جس پر تاثیر اور حفیظ نے خوب دل کھول کر داد دی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ بھی سُنایا وہ صرف فارسی میں تھا اور پھر عرصے تک ہم نے صوفی صاحب کا جو بھی کلام سُنا یا پڑھا فارسی ہی میں تھا۔ یہ بات کئی برس بعد معلوم ہوئی کہ صوفی صاحب کی طبیعت فارسی سے اُکتا کر اب اِدھر اُدھر ہر طرف میدان مار رہی ہے۔

چنانچہ اگر آج آپ صوفی صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ دیں کہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہیں تو وہ صاف مکر جائیں گے کہ میں ہمہ گیر تو ضرور ہوں مگر اسپورٹسمین۔ آپ بحیثیت ایک پنجابی شاعر کے ان کے فن کو سراہنا شروع کریں تو وہ اپنا فارسی کلام سُنا کر آپ کو سوالیہ نشان بنا دیں گے۔ آپ اب اُن کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالنے لگیں گے تو وہ اردو کی غزل سُنا کر آپ کو ایک مرتبہ پھر چکرا دیں گے آپ گھبرا کر جب یہ فیصلہ کریں کہ وہ اردو پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں کے نہایت بالغ نظر شاعر ہیں تو وہ اپنے کلام کا خوردہ سا مجموعہ لے کر اپنا تخلص اپنے چہرے پر برساتے نظر آئیں گے اور بڑی معصومیت سے آپ کو سُنانا شروع کر دیں گے ؎

" ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ "

نتیجہ یہ کہ خود آپ کو اپنے اوپر ٹوٹ بٹوٹ ہونے کا شبہ ہونے لگے گا اور آپ اب مجبور ہو جائیں گے کہ تبسم کی شخصیت نگاری میں وہی طریقہ اختیار کریں۔ جو شعرائے کرام غزل کہتے ہوئے اختیار کرتے ہیں کہ پہلے دوسرا مصرعہ کہا جائے۔ یعنی بجائے یہ لکھنے کے کہ تبسم کیا ہیں آسانی اس میں رہے گی کہ یہ لکھا جائے کہ وہ کیا نہیں ہیں تاکہ اس کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے کہ وہ جو کچھ نہیں ہیں اس کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔

مگر تجربے کے بعد یہ اندازہ بھی فوراً غلط ہو جائے گا کہ یہ صورت بھی اتنی ہی مشکل ہے جتنی آسان نظر آتی ہے اس لئے کہ تحقیقات کرنے کے

بعد پتہ چلے گا کہ در اصل صوفی صاحب وہ بھی ہیں جو نہیں ہیں لہٰذا اس ہونے نہ ہونے کا جھگڑا ختم کر کے اس ہمہ گیر شخصیت کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ گو صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کسی صوفیانہ خانوادے کے لئے کبھی کسی سے بیعت نہیں کی لیکن ان کی مختصر سی ذات میں شخصیت اور قابلیت کے کئی انمول جوہر یوں یکجا ہو گئے ہیں کہ ان کے جاننے والے ان سے وہی والہانہ عقیدت رکھنے پر مجبور ہیں جو صوفیائے کرام سے ان کے معتقدین اور حلقہ بگوشوں کو ہوتی ہے۔

تبسم زندگی بھر جہل کو عرفان بنانے کی کاریگری فرماتے رہے ہیں لڑکوں کو پڑھانا وہ فن ہے جس کا ہمیشہ یہ حشر ہوتا ہے کہ پیر تو درماندہ ہی رہتے ہیں مرید شفاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں تبسم نے بھی خدا جانے کتنے شاگردوں کو دستار فضیلت سے نوازا ہے۔ اس مجلس میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی نہ کسی موقع پر ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا نہ ہو۔ مگر طالب علموں کو یہ سکھانے پڑھانے والا طالب علموں سے خود کچھ حاصل نہ کر سکا۔ نئی روشنی کے اس دور میں بھی یہ وضعدار انسان وہی چراغ مروت جلائے بیٹھا ہے جسے اس دور کے عجائب خانوں میں ہونا چاہئے تھا ہزاروں طالب علموں کا یہ اُستاد اپنے شاگردوں کے سامنے زانوئے تلمیذ کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ وہ زمانے سے کس قدر پیچھے ہے۔ تبسم آج بھی دوستوں سے دوستی کا دم بھرتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ شہر کوراں میں اس آئینہ فروشی پر دنیا ہنستی ہے۔ یہ آج بھی دوستوں کے لئے وقف ہیں۔ ان کو آج بھی دوستی پر دشمنی کا شبہ نہیں ہوتا۔ یہ آج بھی دوستوں کو گھیر گھیر کر لاتے ہیں۔ دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہیں اور ان کی مدارات میں خود اپنے کو بیچ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس دوستوں سے جو کچھ بچ رہا ہے وہ آج بھی دوستوں ہی کے لئے ہے۔ ان کے گھر کا سامان، ان کے جسم کے کپڑے حد یہ ہے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز وہ کتابیں جن کو الماری میں بند کر کے کنجیاں دانستہ کسی کنوئیں میں پھینک دی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی شرافت کی وجہ سے ان سے کچھ طلب نہ کرے مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی کچھ مانگ بیٹھے تو تبسم میں انکار کرنے کی تاب نہیں۔ البتہ مانگنے والا ذرا سلیقے کا آدمی ہو۔ سوال کرنے کا ڈھب جانتا ہو۔ موقعہ اور محل کا اس کو احساس ہو جس وقت صوفی صاحب انگلیوں میں سگریٹ اور لبوں میں حقے کی نے دبائے۔ اپنا بنایا ہوا قوام چاٹ رہے ہوں۔ اگر کوئی شخص ان کے قوام کی مہک کی داد دے دے اور ذرا سا قوام انتزاعاً چاٹ کر اس کی تعریف کر دے تو صوفی صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جائے گی۔ ان کی ناک کچھ اور سرخ ہو کر خطرناک بن جائے گی یہ وقت ہوتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے مانگ لے۔ ویسے بھی ان کے گھر میں دوست نام کے ہر شخص کے لئے روٹی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور کپڑے بھی ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ پیسہ درکار ہو تو تاش کی گڈیاں حاضر ہیں۔ کھیلئے چند بازیاں اور لے جائیے اپنی قسمت کا پیسہ۔ وہ جو کچھ کھا چکے ہیں اس میں دوستوں کا حصہ اُن کے ساتھ دیانت برت کر اور اہل و عیال کے ساتھ بددیانتی کر کے ہمیشہ نکالتے رہے ہیں جو کچھ کمانا چاہتے ہیں اس میں بھی دوستوں کی پتی ہے۔ ورنہ خود ان کی ذات کے لئے سب ہی کچھ موجود ہے خود ان کے پاس نہ سہی اُن کے اُن قدردانوں کے پاس جو صوفی کو سر آنکھوں پر جگہ دینا چاہتے ہیں مگر ہمت اس لئے نہیں کرتے کہ مولی اپنے پتوں کی وجہ سے بھاری ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی ساری زندگی کا ایک محبوب مشغلہ دوست بنانا تو رہا ہی ہے مگر باقی تمام دنیا کی دوستیوں کو اپنی کوششوں سے قائم رکھنا بھی ان کا ایک بے ساختہ شغل ہے اگر ان کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ دو دوستوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے تو وہ دونوں کے علٰحدہ علٰحدہ دوست بھی نہیں رہ سکتے۔ دونوں میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے حریف بھی نہیں بن سکتے۔ اور نہ دونوں پر فاتحہ پڑھ کر خود الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ اس اختلاف کی خبر سننے کے بعد ان کا ہر سرور بے کیف ہو جائے گا۔ اور ہر نشہ ہرن۔ وہ بیقرار سے نظر آنے لگیں گے اور اُن کی تمام کوششیں سمٹ کر اس ایک مرکز پر آ جائیں گی کہ یہ بچھڑے ہوئے دوست کسی طرح آپس میں مل جائیں۔ اکثر ان کی حیثیت اس اختلاف میں اُس دانے کی سی ہو جاتی ہے جو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ جائے مگر ان کی یہ مقدس کوشش جاری رہتی ہے۔ اور انجیل مقدس کی یہ آیت اپنی تفسیر ان کی صورت پیش کرتی ہے کہ :۔

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔"

خدا کو وہ بے شک دیکھ لیں مگر ڈر تو یہی ہے کہ خدا نے اگر ان کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ خدا کی طرف سے ان کو دیکھتے ہی ایک سوال یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ اسے بندے ہم نے تجھ کو دنیا میں جس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا۔ اُس سے تو کس حد تک عہدہ برآ ہُوا۔ ظاہر ہے کہ مقصد صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستیاں کیں اور نباہ کی حد تک کیں اور نہ صوفی صاحب بارگاہِ خداوندی میں یہ کہہ سکیں گے کہ رب العزت میں نے تیرے بیشمار بندوں کو شب دیگ کھلائی ہے میرے دسترخوان پر تیرے خدا جانے کتنے بندے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ روزی اپنی کھا رہے ہیں صرف خوان میرا ہے۔ نہ صوفی صاحب یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر سکیں گے کہ میں نے جو علم حاصل کیا تھا وہ بے شمار طالب علموں پر تقسیم کیا۔ سوال کی اصل نوعیت تو یہ ہوگی کہ اپنے بعد اپنی کیا یادگار چھوڑی۔ سرسید کو اگر یہ اطمینان تھا کہ اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ تو کیا لایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں، ظاہر ہے کہ اسی قسم کے سوال پر خود حالی نے یہ کہا ہوگا کہ میں مسدس پہلے ہی سرسید کے ہاتھوں بھجوا چکا ہوں۔ مگر تبسم جن صلاحیتوں کے مالک ہیں اور دُنیائے شعر و ادب کو ان سے جو توقعات ہیں اُس معیار کی یہ کیا چیز پیش کریں گے۔ اپنے علم و فضل اور اپنی اہلیت و صلاحیت کو بروئے کار نہ لانے کا شکوہ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کی طرح ان کی جان سے دور، ان سے بھی ہے۔ تاثیر اور حسرت سے جو شکایت ہے وہ بعد از وقت ہے مگر تبسم سے یہ شکایت برمحل ہے۔ تاثیر اور حسرت نے اپنے ساتھ خود انصاف نہیں کیا۔ تو شعر و ادب کے مؤرخ ان کے ساتھ کب تک انصاف کریں گے۔ کام نہ ہو تو نام کب تک زندہ رہ سکتا ہے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم خدا ان کو ہزاری عمر عطا کرے اگر اب ان کے پاس وقت ہے کہ اپنے شایانِ شان کوئی بلند پایہ تخلیقی کام ایسا کر جائیں جو رہتی دنیا تک ان کو زندہ رکھے۔ اور وہ صلاحیتیں جن کے یہ امین ہیں ان میں خیانت کا الزام ان پر نہ لگے۔

مسعود حسن رضوی

علی عبّاس حسینی

میری شخصیت تین ذوات گرامی سے بہت متاثر ہوئی [illegible] مرزا [illegible] حسین [illegible] پروفیسر
مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤی، نواب زادہ [illegible] مسعود صاحب کے [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] مسعود صاحب اس طرف توجہ [illegible] تعلیم [illegible]
[illegible] زمانے میں [illegible] مسعود حسن صاحب نے [illegible]
[illegible] کا چراغ جلانے والے [illegible]
[illegible] تفسیر [illegible] مسعود صاحب کی [illegible]

سوانح } مسعود صاحب کون ہیں [illegible] شخصیت کی [illegible]
[illegible] جولائی [illegible] پیدا ہوا [illegible] بسم اللہ
[illegible] عربی فارسی کی تعلیم [illegible] علوم اسلامی [illegible]
[illegible] میری تعلیم [illegible] امتحان اوّل درجے میں پاس کرنے کے بعد [illegible] درجے تک پہنچا [illegible]
[illegible] کالج [illegible]
[illegible] تعلیم [illegible]
[illegible] کے ساتھ مرتب کرے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ملازمت [illegible] قبول [illegible]

اوّل درجے میں اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ یونیورسٹی نے طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۲۷ء میں اُردو لکچرار کی نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ تین سال بعد فارسی کے ریڈر شعبۂ فارسی و اُردو کے صدر کی جگہ خالی ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۳۵ء میں سیاحت ایران کے لئے روانہ ہوا۔ اور عراق عرب کے مشہور شہروں اور وہاں کی عتبات عالیات کی زیارت کر کے بحری راستے سے ہندوستان واپس آ گیا۔ اب تک جن کتابوں کی تصنیف و تالیف ترتیب یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے ان کے نام یہ ہیں: ۔ امتحانِ وفا۔ فرہنگ امثال۔ ہماری شاعری۔ فیضِ میر۔ مجالس رنگین۔ دبستانِ اُردو۔ روحِ انیس۔ نظامِ اُردو۔ ہماری ... حصہ دوم، شاہکار انیس، دیوانِ فائز۔ متفرقاتِ غالب۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے ...... شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے مگر اس کا اظہار شعرگوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور منظم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان خود رو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ مرتب کر لیا ہے —— (ہماری شاعری۔ پانچواں ایڈیشن)

ان سوانح میں اتنے اضافے کی اجازت دیجئے کہ مسعود صاحب اپنے حسنِ خدمات کے صلے میں ۱۹۵۳ء میں ریڈر کی جگہ شعبۂ اردو و فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور جون ۵۴ء میں اسی عہدۂ جلیلہ سے وہ ریٹائر ہوئے۔

حُلیہ اور خصوصیات

(۱) متوسط قد، بلند پیشانی، گیہواں رنگ جو کبھی کھلتا ہوا ہو گا۔ چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک۔ خوش وضع۔ شریف الطبیعت۔ خوش مزاج، متین اور سنجیدہ۔ باتیں سنئے تو ایسی مزے دار اور پر از معلومات کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو گھنٹوں سنا کیجئے اور آپ کا دل نہ بھرے۔ زبان ایسی صاف شستہ اور دھلی ہوئی کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے منہ سے ہر لفظ تلا تلا نکلتا ہے۔ باوجودیکہ خالص لکھنوی نہیں ہیں لیکن لکھنؤ میں رہتے رہتے زبان اتنی منجھ گئی ہے کہ خود لکھنؤ والے غلطی کر جائیں تو کر جائیں لیکن ان کے منہ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال سے باہر نہ پائیے گا۔ تقریر نہایت مدلل، منظم اور مفصل کرتے ہیں، ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ حتی الوسع تشنہ نہیں رہتا۔ یہ تقریریں اردو میں ہوں یا انگریزی میں، ہندی میں ہوں یا فارسی میں، نہایت روانی، فصاحت اور شستہ زبان میں کی جاتی ہیں۔ لکھنے کا انداز آپ نے آپ کی مشہور کتاب "ہماری شاعری" میں دیکھا ہو گا جو بحث اٹھائی ہے ہر ممکن دلیل اور شواہد سے واضح بلکہ واضح ترین کر دی ہے (فروغ اردو۔ جون ۱۹۵۴ء۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

(۲) سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے کا وطن نیوتنی ضلع اناؤ ہے —— موصوف کو اتفاقاً ... کہا جاتا ہے۔ سید مسعود حسن صاحب صرف لکھنے ہی میں ادیب نہیں بلکہ ان کی بات چیت اور انداز گفتگو میں بھی ایک خاص ادبیت پائی جاتی ہے۔ اور جب تقریر کرتے ہیں تو وہ بھی ادبیت کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے —— اپنے علمی و ادبی شوق کے سلسلے میں سید مسعود حسن صاحب نے اردو اور فارسی کی کمیاب قلمی اور مطبوعہ کتابیں جن کی تعداد کئی ہزار ہے بہت کچھ صرف کر کے جمع کی ہیں جن میں بہت سے ادبی نوادر شامل ہیں —— موصوف اردو زبان کے فاضل اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی اردو کے عاشق بھی ہیں جس کی بقا و ترقی کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے —— مسعود الحسن صاحب طبیعتاً بہت سنجیدہ، بہت نیک اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ آپ مذہبی آدمی نہیں ہیں مگر آپ کا شمار تعلیم یافتہ شیعوں کے اس گروہ میں کیا جاتا ہے جو آج کل کی اصطلاح میں "ترقی پسند" کہا جا سکتا ہے۔ ایک علمی و ادبی شخص میں سنجیدگی تو بہرحال ہونا ہی چاہئے مگر مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان باتوں میں ایک خاص ادبی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے —— (حقیقت مئی ۱۹۵۳ء۔ الباقیات الصالحات۔ انیس احمد عباسی)

(۳) مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرز استدلال سے اثر نہ لینا آسان نہیں (مختصر تاریخ اردو۔ ۱۹۲۶ء۔ ڈاکٹر اعجاز حسین)

(۴) آپ تمدن سے خاص شغف یعنی خوراک، پوشاک اور مکان کے حسن پر فریفتہ رہنے والے ہیں۔ کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں۔ کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہوا پہنتے ہیں —— مکان آپ کا دریا کے کنارے بدر روڈ پر دلکش ہے فرش تک یعنی چھت سے زمین تک آپ کی جودتِ طبع اور خوش مذاقی کا بہترین ثبوت ہے۔ اپنے مخلص

ادیب کے لحاظ سے آپ نے ادب کے دونوں پہلو یعنی (۱) لٹریچر اور (۲) تہذیب: اخلاق اچھی طرح اختیار کئے ہیں۔ مزاج میں نفاست۔ سلامت روی، حسنِ سلوک اور استقامت و پختگی ہر ہر بات سے نمایاں ہے ——— داڑھی منڈاتے ہیں، سر کے بال بوضع اہل ایران پیچھے سے اٹھے اور بل کھائے ہوئے" (من کیفیتم ۱۹۴۲ء۔ مرزا محمد عسکری)

میں مسعود صاحب کو ان سب سے پہلے سے جانتا ہوں۔ ۱۹۱۵ء میں جب میں ایف۔ اے کی تعلیم کے لئے لکھنؤ آیا تو وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھے اور ہم دونوں شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ اس زمانے کا حلیہ مرزا عسکری و ڈاکٹر ہاشمی کے بیان کردہ حلیہ سے قدرے مختلف تھا۔ رنگ نسبتہً زیادہ صاف تھا میری ہی طرح دبلے پتلے تھے اور خشخشی فرنچ کٹ داڑھی رکھتے تھے۔ مگر ان کی بلند اور روشن پیشانی ان کے درخشان مستقبل کی طرف اس وقت بھی اشارہ کرتی تھی۔

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　می تافت ستارۂ بلندی!

ان کی آواز بڑی شیریں تھی۔ خود بھی شعر بڑے لحن سے پڑھتے تھے اور اس زمانے کے تمام خوش الحان شعراء کا کلام انہی کے انداز لب و لہجہ میں سنانے پر پوری قدرت رکھتے تھے عام طور سے متین تھے مگر مخصوص احباب کی بزم میں ہنس مکھ بھی، بذلہ سنج بھی اور نقال بھی۔

بورڈنگ ہاؤس دو منزلہ تھا۔ زیریں حصہ کے سینئر تھے سید غلام حسین نقوی (جناب حاجی ہو کر ہر طرح محترم بن گئے ہیں) اور بالائی حصے کے مکرم تھے مسعود صاحب میں اور مرزا حامد حسین ایف۔ اے کے طلبا ہونے کی وجہ سے ان سے جونیر تھے۔ جس طرح مسعود صاحب متانتوں کے سرچشمہ تھے اسی طرح مرزا جی شرارتوں کے منبع تھے۔ میرا معاملہ بین بین کا تھا۔ مرزا نے تحریک پیش کی۔ چونکہ قہقہہ اور ہنسی زندگی کو بڑھاتی ہے اس کے حفظانِ صحت کے اصول کے ماتحت ایک قہقہہ کلب قائم کیا جائے جس کا مخصوص کام یہ ہوگا کہ ہم بالائی حصے کے طلبا ہر روز سہ پہر کو ایک جگہ جمع ہو کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی ورزش کریں گے مسعود صاحب کی ظاہری متانت نے دو ایک دن پس و پیش کرنے پر مجبور کیا مگر فطری ظرافت غالب آئی اور وہ بھی اس انجمن قہقہہ بازاں کے رکن رکین بن گئے۔ طلبا کی انجمنوں کا جیسا دستور ہے بغیر کچھ کھائے پیئے ان میں زور اور گرمی نہیں آتی اس لئے یہاں بھی قہقہہ سے پہلے کچھ شغل نائو نوش ہوتا یعنی کبھی بسکٹ کباب کھائے جاتے کبھی آلو یا امرود کے کچالو، کبھی دہی بڑے اور پیاس بجھتی کبھی فالسے کے شربت سے، کبھی لیموں کے شربت سے کبھی برف ٹھنڈے پانی سے! اب اس ناشتے کے لئے چندہ بھی ضروری تھا اور اس چندہ کے لئے خزانچی بھی۔ یہ معزز عہدہ مسعود صاحب کو تفویض کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کے بارے میں اس زمانے میں بھی یہ یقین تھا کہ یہ کبھی ایک پیسہ بھی خورد برد نہ کریں گے۔ اور ابراہیم لنکن کی طرح وہ فاقے کر سکتے ہیں، بھوکے ننگے رہ سکتے ہیں مگر امانت کی رقم نہیں چھو سکتے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جب میں اور مرزا ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں داخل ہوئے تو مسعود صاحب اس شہر میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت صیغہ تعلیم کے کیٹلاگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور رانی منڈی میں رہتے تھے۔ میں اور مرزا ہر اتوار اور چھٹی کے دن صبح سویرے مسعود صاحب کے ہاں پہنچ جاتے دن بھر اپنے ہاتھ سے طرح طرح کے کھانے پکائے جاتے اور مختلف ادبی موضوعات پر بحث ہوتی رہتی۔ ہم سب غالب دانیس پرست تھے لیکن ایک دوسرے کو جلانے اور تپانے کے لئے کبھی کبھی ان اصنام ادب و سخن پر بھی خشت باری کر دیتے۔ اس ضمن میں ایک دن مرزا نے کہا بعض حیثیتوں سے ذوق غالب سے بڑے شاعر تھے میں نے کہا وہ سرے سے شاعر ہی نہ تھے۔ موزوں کر لینا اور چیز ہے اور شعر کہنا اور شے۔ بڑی گرما گرم بحث رہی۔ بالآخر حکم مسعود صاحب بنائے گئے۔ انہوں نے کہا کلام بے سند قبول نہ ہو نہیں۔ مرزا صاحب دو دو ورق ذوق کے دیوان سے اشعار چن کر پیش کریں تو صحیح سیر بھر برفی کھلائیں ورنہ مرزا جی۔ حامد نے پورا دن دیوان ذوق پر صرف کیا۔ تین بجے انہوں نے صرف ساڑھے نو شعر منتخب کئے۔ دن بھر بحث ہوئی اور بالآخر ساڑھے تین شعر ایسے مانے گئے کہ ان میں سے ایک پورے پورے دیوانوں پر بھاری تھا میں نے مان لیا کہ خاقانی ہند یقینی شاعر تھے اور سیر بھر برفی نے مل کر سعادت کی۔

اس طرح کی صحبتوں میں بھی مسعود صاحب کی شخصیت کی انفرادیت نہ جاتی تھی۔ وہ کبھی اتنے زور سے نہ ہنستے کہ ہماری طرح پیٹ پکڑ کر لوٹنے لگیں نہ کبھی غصہ ہوتے، نہ جھنجلاتے، ہر بزرگ داشت کا خیال ان کے ذہن سے محو ہوتا۔ بورڈنگ کے رہنے والے اکثر بے تکلفی یا جوش اخلاص میں ایک دوسرے سے اب بے تبے، تو تکار بھی کر لیتے، یہاں تک کہ مذاق کا سلسلہ بعض اصحاب کے درمیان فحش اور گالی گلوج تک بھی پہنچ جاتا مگر مسعود صاحب کا نام کسی کی

زبان پر بغیر صاحب کی دُم کے نہ آتا اور نہ کوئی انہیں آپ کی جگہ "تم" کہہ کر مخاطب کرنے کی جرأت کرتا۔

یہی باہمہ و بے ہمہ کیفیت ان کی عمر بھر رہی۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے کو لئے دیئے رکھا۔ وہ فطرتاً نہ میلے بلکہ جھینپو تھے۔ مجھ سے خود بیان کرتے تھے کہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جب لکھنؤ آئے تو برس ہا برس یہ حالت رہی کہ جہاں دو چار لڑکوں کو ایک جگہ کھڑا دیکھتے تھے رستہ کترا کر نکل جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے سچا بہادر وہ ہے جو ڈرنے کے باوجود ہمت و جرات کا کام کرے۔ اس نظریہ کے ماتحت مسعود صاحب یقیناً جری ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے لکھنؤ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں تعلیم کی تکمیل کی، شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا جہاں کے گیارہ طلباء قواعد و ضوابط کے خلاف بغاوت کرنے پر پہلے ہی سال نکال دیئے گئے (ان میں سے ایک میں بھی تھا)، معلّم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بڑے بڑے درجوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے اور بڑے بڑے مجمعوں میں عالمانہ، ادیبانہ اور مدلّل تقریریں بھی کیں۔

اسی باطن میں چھپے ہوئے ڈر نے انہیں ہر طرح کے احتساب کا اور اپنے جذبات کو چھپانے کا عادی بنا دیا۔ اور اسی نے خودداراںہ احساس کو ضرورت سے زیادہ بڑھا بھی دیا۔ ان کے رہن سہن سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ انہیں کوئی مالی دشواری بھی پیش آسکتی ہے۔ طالب علمی میں بھی جب سوائے وظیفوں کے کوئی سہارا نہ تھا ان کا لباس صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور ان کے چہرے مہرے سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ بعض وقت ان کے پاس فیس کے روپے بھی نہیں ہوتے۔

ایف۔ اے کا امتحان سر پر تھا۔ امتحان اور کالج کی فیس ملا کر پچاس روپے دینے تھے۔ تین مہینہ سے وظیفہ نہ ملا تھا۔ سخت پریشانی تھی کہ کیا کریں۔ ایک عزیز سے جو صاحب ثروت بھی تھے اور ان کے والد مرحوم کے مرہون منت بھی رہ چکے تھے۔ روپے قرض مانگے۔ انہوں نے سوچا میری طرح حساب دوستاں در دل یہ بھی نہ کریں اس لئے حیلہ شرعی کر کے ٹال دیا۔ مسعود صاحب کو ناگوار ضرور ہوا مگر خاموش ہو رہے۔ اتفاق یہ کہ احسان فراموش کے ایک بزرگ کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی۔ انہوں نے پچھلا زمانہ یاد دلایا، غیرت بھی دلائی اور خود ضمانت بھی کر لی۔ ان حضرت نے مجبور ہو کر ایک عزیز کے ذریعے اب روپے بھیجے۔ مسعود صاحب نے کہا امتحان دے سکوں یا نہ دے سکوں اب ان کے روپے نہ لوں گا۔ انہوں نے مجھے بے اعتبار سمجھا، دوسرے کی ضمانت ضروری سمجھی۔ بڑی ردوکد رہی، بڑا اصرار کیا گیا مگر مجروح خودداری اپنی بات پر اڑا رہا۔ شاید یہی انداز استغنا خدا کو پسند آگیا کہ بغیر کوشش و فکر کے دوسری جگہ قرض حسنہ مل گیا۔ امتحان میں بھی شریک ہوئے اور ممتاز حیثیت سے اسے پاس بھی کیا۔

اسی خودداری نے انہیں شادی کے بازار میں بکنے سے بار بار روک لیا۔ میٹرک پاس کرتے ہی ایک نواب صاحب کی طرف سے فرزندی میں لینے کی خواہش کی گئی۔ مکان، اثاثہ، گاڑی گھوڑا سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ مگر انہوں نے کہا "الفقر فخری"۔ اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں ایک مشہور و مقتدر تعلقہ دار کے ہاں سے اسی طرح کی خواہش کی گئی اور بہت سے سبز باغ دکھائے گئے مگر انہوں نے کہا "شادی کے معاملے میں میں اس کا قائل ہوں کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں صاحب مسعود صاحب کے خسر ہیں نہ یہ کہ مسعود صاحب فلاں صاحب کے داماد ہیں۔ یعنی دامادی ذریعہ عزت و ترقی و امتیاز نہ بنے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت۔"

مسعود صاحب کا حافظہ بلا کا ہے۔ جس چیز کو دھیان دے کر دو تین بار پڑھ لیتے ہیں وہ حرف بحرف یاد ہو جاتی ہے۔ شعراء تو بہت سے ایسے دکھائی دئے جنہیں اپنے کلام کے سینکڑوں شعر زبانی سنانے میں کوئی تامّل نہیں ہوتا مگر سوائے مسعود صاحب کے کوئی صاحب طرز نثر نگار میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے مضامین کے صفحے کے صفحے زبانی سناتا چلا جائے۔ مسعود صاحب کے اس حافظے نے جہاں ان کا اپنا علم تازہ رکھنے کا کافی موقع دیا اور انہیں ایک فاضل اور ایک ادیب بے عدیل کی خود اعتمادی بخشی وہیں انہیں مشاعروں کی شرکت سے معذور بنا دیا۔ جہاں کسی شعر کی زیادہ تعریفیں ہوئیں اور انہیں اساتذہ قدیم میں سے کسی کا اس سے بہتر شعر یاد آگیا ہے اب اگر صاحب شعر کی تعریف کرتے ہیں تو سرقہ کو صراحتاً سراہتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو سکوت سخن شناس کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس لئے کنارہ کشی ہی میں سلامتی دکھائی دی۔

عمر بھر سرکاری و نیم سرکاری علمی و ادبی انجمنوں کے ممبر رہے۔ مگر سوائے مسلم اکاڈمی اور انجمن اردو لکھنؤ کے کبھی کسی ادارے میں کوئی عہدہ نہ قبول کیا۔ ان دونوں جماعتوں کی عہدہ داری سے انہیں تجربہ ہو گیا کہ خاموش ادبی کام کرنے والوں کے لئے انجمن بازی تضییع اوقات ہے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو کی ممبری اب بھی ان کے لئے پریشان کن ہے۔

مسعود صاحب نے اپنے اور دوسروں کے لئے مختلف حدیں کھینچ رکھی ہیں۔ بے تکلفی کی حد، دوستی کی حد، عزیز داری کی حد، اس لئے کہ ہر چیز میں انضباط ضروری ہے۔ وہ کبھی بے آپے نہیں ہوتے۔ نہ اپنی طالب علمی و عسرت کے زمانے میں کسی سے مدد کے طالب ہوئے اور نہ وہ اب اپنی فراغت و اطمینان کے زمانے میں خود بخود کسی کی مدد کے لئے جلدی سے تیار ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ نہ کسی نے قربت سمجھنے، درمے والا اخلاص ان سے برتا، اور نہ ان کے ہاں "تو من شدی من تو شدم" والا جوانی جذبہ پیدا ہوا۔ اس پر بھی دل میں گداز ایسا ہے کہ غیرت و حمیت، شرافت و محبت، وفا و اخلاص کے ذکر پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ بس ضبط و تحمل مزاج کا جزو بن گئے ہیں اس لئے چاہتے ہیں کہ آپ خود بھی حدود کے اندر رہیں اور انھیں بھی ان کی رگ احساس کو چھیڑ کر اس احاطے سے باہر نکلنے پر مجبور نہ کریں۔

صنف نازک کا ذکر مجھ جیسے بے تکلف دوستوں سے کبھی نہ کیا۔ بظاہر وہ اس کے قائل ہیں کہ ع عشق عصیاں است اگر مستور نیست۔ لیکن "ہماری شاعری" میں انھوں نے معاملات "عشق" کا بیان جس تفصیل سے کیا ہے اور اس سلسلے میں جو پتہ پتہ کی باتیں لکھی ہیں ان سے غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

وہ ہندی، انگریزی اور فارسی کے فاضل ہیں۔ اردو کے وہ بلند نژاد ادیبوں ہی میں سے نہیں بلکہ اس کے موجودہ دور کے محسنین میں سے ہیں۔ انہیں الفاظ کے استعمال پر بے پناہ قدرت ہے۔ ان کا ہر فقرہ جچا تلا سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ ایسے علوم میں بھی جن میں انہیں دستگاہ حاصل نہیں وہ ایک منِ علم رازدہ من فعل بایستے کے مصداق ہیں۔ علاوہ ان تصنیفات و تالیفات کے جن کی فہرست ان کے سوانح کے ضمن میں دے دی گئی ہے ان کا غیر مطبوعہ کام بہت ہے۔ انھوں نے تاریخ اودھ پر بہت سا بیش بہا مواد جمع کر رکھا ہے۔ اور واجد علی شاہ کی جو تصنیفی تالیفی و ثقافتی زندگی پر جتنی وسیع ان کی معلومات ہیں اور اس فن دار بادشاہ کی جتنی تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں ہندوستان و پاکستان میں کسی کے پاس نہیں۔

مرثیوں کا ذخیرہ جیسا کہ مسعود صاحب نے جمع کیا ہے وہ عالم میں کہیں نہ نکلے گا۔ مرزا عسکری مرحوم لکھتے ہیں "خود مجھ پر حیرت طاری ہوئی کہ اس دور سے مرثیہ گو یوں سے لے کر آج تک کے تمام جید مرثیے متعدد الماریوں میں رکھے ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر آپ کے تجسس و تلاش، قوت انتخاب اور صرف زر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک بار مرثیہ نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے میرے ساتھ آپ کے مرثیہ خانے کی زیارت کی تھی اور مراثی کی کثرت و تنوع دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ یہی حال راجہ میر احمد خان صاحب والی محمود آباد کا ہوا تھا جو مراثی کے جمع کرنے کے خاص طور پر شائق تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی مرثیہ گو ایسا ہوگا جس کا مرثیہ مسعود صاحب کے پاس نہ ہو۔ یہی حال فارسی اور دوسری زبانوں کے مرثیوں کا ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے اور مسعود صاحب نے ہر ایک کو بغور پڑھ کر ہر ایک کی خصوصیات منفرد و نادر بیان لکھ رکھی ہیں"۔

باریک بینی، نفاست پسندی اور سلیقہ مندی ان کی فطرت و طبیعت ہے۔ لباس ہو یا غذا، مکان ہو یا تصنیفات کی کتابت و طباعت ہر باب میں جزئیات پر نظر رہتی ہے۔ جب تک ایک ایک بات نوک پلک سے درست نہ ہوگی منظر عام پر نہیں آسکتی۔ تحقیق کے معاملے میں یہی باریک بینی اکثر دیر کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کام میں تحقیق کی خورد بین ساتھ رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتیں جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں ان کے لئے کلکتہ، پٹنہ، حیدر آباد، دہلی لکھ کر سند کا سامان بن جاتی ہیں جب تک وہ مکمل تحقیق کر کے اپنے کو مطمئن نہ کر لیں یہ مضمون نامکمل رہے گا۔ سیکڑوں مکمل تحقیقی کام اب تک محض اس لئے زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے کہ ان میں کوئی نہ کوئی مشکوک سی ہے۔ میں نے بار ہا عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے شائع کر دیجئے۔ مزید تحقیق آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ دیجئے مگر محقق کا ضمیر ایسے قول کو کہاں مانتا ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں!

اب تک جتنا کام مسعود صاحب انجام دے چکے ہیں وہ اردو ادب میں زندہ رہنے کے لئے کافی ہے اگر وہ چیزیں بھی طبع ہو گئیں جو اب تک مسودے کی صورت میں پڑی ہیں تو پوری طرح آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ مسعود صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو "ادبی دیو" کہا جاتا ہے!

علی عباس حسینی

کشور ناہید زیدی

کہ پہلا سا طریقہ ہوتا تو میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہتی

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ!

یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ!

لیکن وہ دور گذر چکا۔ اب مضمون شروع کرنے کے لئے اتنے بھی الفاظ سوچنے پڑتے ہیں۔ بہرحال نقوش میں شخصیات نمبر کی پیشکش دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ علی عباس حسینی کی شخصیت۔ جسے مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا۔ گو میرے الفاظ ان کو اچھی طرح روشن اور واضح نہ کر سکیں بلکا سا خاکہ تو بن ہی جائیگا تکلف و تصنع سے بے طرف۔ ایک شفیق باپ۔ ذرا ہم نے شرارت کی ڈانٹا اور کھینچ فریادی۔ آنسو پونچھے گئے، تھوڑی سی بہت نصیحت بھی ہوئی۔ ساتھ ہی والدہ بھی لپیٹ میں آگئیں۔ آپ ہی نے بگاڑ رکھا ہے بچوں کو..... وہ بگڑ گئیں .... وہ چپ ہو گئے وہی شفیق پیار بھری مسکراہٹ۔ جو انسان کے چہرے کو فرشتہ بنا دیتا۔ ہنستا دیکھا ہے کسی کو پیسے دئے کسی کو کچھ لا لانے کا وعدہ ہوا۔ اور کوئی کھیل کی خوشی میں اچھلنے لگا ——

اپنے ہی بچے نہیں اوروں کی بھی یاد بھی اسی دلسوزی سے سنتے ہیں کسی کی فیس نہیں۔ داخلہ نہیں ہوئی کسی کے پاس کتابیں نہیں ہیں کسی کے پاس کورس کی کتاب نہیں ہے کسی کے یہاں بیمار کے جوڑوں میں لگی پڑی ہے.... غرض کہ دنیا کے ہر مرض کی دوا صرف ایک "امرت دھارا" یعنی حسینی صاحب.... گو کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اظہار کرنا کچھ بیکار و لاطائل ہے۔ لیکن مجھے تو غصہ صرف اس بات پر آتا ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ساتھ رہے۔ پڑھایا لکھوایا سرپرستی کی۔ وہ آج کہتے ہیں کہ حسینی صاحب نے ہوتے تو کی فضول خرچی کی ہمدردی یا ممنون احسان ہونا تو دور کی بات ہے۔ میرے خیال میں حسینی صاحب کو خود ان ہی لوگوں کا ممنون کرم ہونا چاہئے۔

ہزاروں روپے کماتے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ گو کہ کمائی خالص حلال کی تھی لیکن روپے ایسے اڑنچھو ہو جاتے کہ بس آدمی دیکھتا رہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی شناسا شہر میں آیا ہے تو اس نے قیام سوائے حسینی صاحب کے اور کہاں؟ اگر کسی کو تعلیم حاصل کرنی ہے تو بہترین معلم کا گھر موجود ہے، اگر مہینے میں کم از کم آٹھ دس شاندار دعوتیں نہ ہوں تو پھر جینے کا لطف ہی کیا.......

والد کے ساتھیوں نے اپنی عمارتیں بنوالیں۔ لاکھوں کا کیش بینک میں جمع کر لیا لیکن یہ جیسے کے تیسے رہے، خدا نے صبر اور مستقل مزاجی کی ساری

حد یہ ان پر ختم کر دی ہیں۔ سادات ہونے کے لحاظ سے اور کیا چاہیئے؟ کھانے کو مل جائے، تن ڈھک جائے، اور اگر اس کے علاوہ کسی کو کھلایا اور پہنایا جا سکے تو ایک سو ایک فی صدی جنتی ——— گھر کا ہر فرد بیمار، دواؤں اور ڈاکٹروں کا سیلاب ہے کہ اُمڈا آ رہا ہے، روپے ختم ہو چکے ہیں پھر بھی اگر کوئی دوست آ گیا تو ایک دعوت اور ایک پکچر...... چلیئے پریشانی کا علاج ہو گیا، پکچر دکھا کے خوش خوش گھر پلٹے، باری باری سے سب کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا اگر بہت محبت آئی تو دوا بھی پلا دی اور چلے گئے اُوپر۔ بس کتاب ہیں اور وہ ہیں..... رات کے ایک دو بجے تک مطالعہ میں مشغول رہے۔ صبح سویرے اٹھتے ہی اخبار مانگا۔ اخبار ختم ہوا اور پھر کتاب ہاتھوں میں آ گئی۔ صبح سے شام ہو گئی نہ کہیں باہر گھومنے پھرنے جائیں گے، نہ کسی دوست کے گھر ملنے ملانے ان کی ساری دنیا تو انہی کتابوں میں سمٹ آئی ہے جن میں اپنی ساری فکریں، پریشانیاں، غم سب کچھ غرق کر دیتے ہیں۔ غصہ بہت کم آتا تھا کیونکہ اب کافی آنے لگا ہے، اس لئے سب ان کے غصہ سے بہت ڈرتے ہیں... غصہ صرف کھانے پر آتا ہے یا کسی دعوت کے سلسلے میں.......... کیا بھئی اس قورمے میں گھی کی کفایت کیوں برتی گئی۔؟ اور صبح ناشتے میں صرف کباب ہی کیوں ہیں —؟ انڈا کہاں غائب ہے —؟ اگر انڈا فوراً آ گیا تو خیر۔ ورنہ دو چار لقمے جلدی جلدی کھائے اور پھر کتاب ایسے جلدی سے اٹھائی گویا معذرت کر رہے ہوں..... معاف کرنا عزیزم میں تجھ سے اتنی دیر جدا رہا —!

کہیں سے افسانے کا تقاضہ آیا ہے مگر یہاں خاموشی۔ آخر ہم لوگ ہمت کرتے ہیں۔ ابا دیکھئے فلاں کا آج بھی خط آیا ہے — اگر موڈ میں ہوئے تو حکم ہوا پنسل کاغذ لاؤ میں بولتا جاؤں تم لکھتے جاؤ... حکم حاکم۔ کیونکہ کبھی افسانہ پڑھنے میں ضرور لطف آتا ہے۔ ٹائپ رائٹر کی طرح لکھنے میں نہیں.... اور بات جہاں ذرا رومینٹک ہوتی تو اپنا تو دم ہی نکل جاتا لیکن آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا کہ فنکار کی حیثیت سے رشتوں کا موازنہ کرنا حماقت ہے۔ یوں بھی وہ جو کہانی لکھتے ہیں ہمیں ضرور سناتے ہیں تاکہ ہمارے اندر سمجھنے کا شعور پیدا ہو۔ وہ بھی اب جبکہ ہم خود سن شعور کو پہنچ گئے.... شروع شروع میں جب میں نے کہانیاں لکھیں تو والد کو دکھاتے بڑی شرم آتی۔ چنانچہ کہانیاں شائع ہو گئیں تو انہوں نے پڑھیں۔ بلا کے شاباش دی، کچھ تصحیح کر کے دکھایا... مگر ہم تو یہی مرتے رہے کہ والد نے وہ رومینٹک ٹکڑا پڑھ کر اپنے دل میں کیا سوچا ہو گا۔؟ خیر اب ہم ایسے احمق نہیں رہے...... آموں اور پان کے بیحد شوقین ہیں اس بارے میں بھی کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے لیکن شوکت تھانوی کی طرح پاندان سے شوق نہیں۔ پانوں کی ڈبیا رکھتے ہیں پاندان ان کے خیال میں صرف مستورات ہی کا حق ہے۔

مہینے جتنی نئی کتابیں خرید سکتے ہیں خرید لیتے ہیں گو کہ یاراں شاط کچھ باقی نہیں چھوڑتے پھر بھی سینکڑوں کتابیں گھر میں موجود ہیں۔ کتابیں خرید کر پڑھیں، پھر ان سے بے نیاز ہو گئے خواہ وہ ردی میں جائیں یا کسی صاحب ذوق کی الماری میں محفوظ ہو جائیں انہیں کوئی خبر نہیں ——— اگر کبھی ضرورت پڑ گئی کسی کتاب کی تو گدھے کے سر سے سینگ۔ تو شاید مل جائیں مگر کتاب نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ صرف والد ہی کے دوست نہیں۔ ہمارے دوستوں میں سے بھی

ع - جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حد یہ ہے کہ خود اپنی تصنیفات میں سے بھی ایک کی کوئی جگہ گھر میں نہیں ہے۔ والد کی خاص ذاتی کاپی بھی لوگ مانگ لے گئے اور امّی بیچاری کو جو کاپی نذر ہوئی تھی وہ بھی کسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

یوں تو آپ انہیں کافی آزاد خیال سمجھیں گے لیکن حقیقتاً والد کافی قدامت پرست ہیں۔ نسل۔ ذات پات کے قائل۔ اور اپنے سید ہونے پر فخر.....

لڑکیوں کو ڈاکٹری پڑھانے کے قائل نہیں۔ نہایت ہی بے شرمی کی پڑھائی ہوتی ہے اور جانے کیا کیا۔ لڑکیاں پڑھ لیں لیکن اگر نوکری نہ کریں تو بہتر ہے۔

کھانے پر بیٹھیں گے تو گھر کا ہر فرد ساتھ ہو خواہ جگہ کتنی ہی کم ہو ہر ایک سمٹ سمٹا کر اسی میں بیٹھ جاتے۔ اکیلے کھانا نہیں کھا سکتے، اکیلے کوئی تفریح نہیں کر سکتے اکیلے بس وہ ایک ہی کام کرتے ہیں — مطالعہ —!

لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ بے فکر۔ بس صاف اور اُجلا ہونا چاہیئے قمیص کا کالر اگر ترچھا ہے تو کیا ہوا —؟ شیروانی زیادہ چوڑی لمبی ہے تو کیا خرابی —؟ چنانچہ پہلے پہل میں نے والد ہی کی قمیصوں کو تختۂ مشق بنایا اور وہ بہت خوش ہو ہو کر میرے بنائے ہوئے جھولوں کو پہنتے رہے

لیکن اس لاپروائی کے باوجود آپ ان کے پاجامے کی مہری کو "نوکِ پاپوش" سے چاک گریباں نہیں پائیں گے اور نہ کبھی سڑک کی گندگی سے "کف دردہاں"۔ قمیص کے گریبان میں اگر نچلے بٹن نہ ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن گلا ضرور بند رہے گا۔ گھر میں صرف تہمد اور بنیان پر قناعت کرتے ہیں اگرمیوں میں الیکن آپ انہیں اس لباس میں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ بغیر کرتے پاجامے کے وہ ڈرائینگ روم میں نہیں جاتے اور بغیر شیروانی، ٹوپی اور چھڑی کے قدم گھر سے باہر نہیں نکالتے۔ اپنی صحت کے معاملہ میں بھی مستغنی ہیں، کھانا بہت کم چھوڑتے ہیں۔ ہلکی سی حرارت یا پیٹ کی گرانی کسی وقت کے کھانے ناشتے میں حارج نہیں ہوتی۔ آج اسکا نتیجہ ہے کہ ماشاءاللہ اب بھی اپنے لڑکوں سے زیادہ قوی ہیں ۔ ۔ ۔ کسی کام سے عار نہیں ہے۔ بہ ضرورتِ شوق آپ انہیں کباب کی سیخیں بھی سینکتے دیکھ سکتے ہیں اور لڑکی کے پھوڑے پر پلٹس لگانے کے لئے آدھی رات کو نیم کی پتیاں بھی کچلتے ——— شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خالص دیہاتی ماحول کو پسند کرتے ہیں۔ زمیندار کے بیٹے لیکن تعلیم حاصل کرنے روز شہر سات میل پیدل آتے اور جاتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ آج ان کے بیٹے چند قدم پیدل یونیورسٹی نہیں جا سکتے ۔

لکھتے پڑھتے ایک عمر آئی لیکن نہ تو اب تک کوئی خاص لکھنے کا کمرہ ہے نہ میز نہ کرسی۔ حتیٰ کہ کسی وقت کاغذ کی بھی کمی پڑ جاتی ہے۔ بان کے پلنگ یا زیادہ سے زیادہ بستر پر گاؤ سے ٹیک لگائے تہمد بنیان میں ملبوس، ایک پنسل اور چند کاغذات اپنے سامنے بکھیرے آپ اپنے اس فنکار کو کسی تخلیق میں مشغول دیکھ سکتے ہیں۔ اسی دوران میں بچے آ آ کر اپنی شکائتیں اور فرمائشیں بھی صادر کر دیتے ہیں۔ کبھی ذرا مسکرا کر تسلی دیتے ہیں کبھی ہلکی سی ڈانٹ۔ اور زیادہ تنگ آئے تو کاغذ سمیٹے اور راہ لی اپنے گھر کی — یعنی اوپر چلے گئے ۔

ادھر انہوں نے ایک ناول پندرہ دن کے اندر لکھ کر ختم کیا ہے۔ جس کے ہیرو کے کردار کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے یہ ناول مسلسل سترہ اٹھارہ گھنٹے تک یک لخت بیٹھ کر لکھا ہے اور ساتھ ہی اپنے چہیتے نواسے "عسکری میاں کی ساری فریادیں بھی سنتے رہے اور ان کو تسلی بھی دیتے رہے ان کی چوٹوں کی مرہم پٹی بھی کرتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے وہ اب اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں اور زیادہ جوش اور لگن کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ خداوند عالم ان کو ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور وہ ہمیشہ اسی طرح اردو ادب کو زندہ جاوید کرنے والے ادب پارے پیش کرتے رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حامد علی خاں

محمد عبداللہ قریشی

حامد علی خاں منشی سراج الدین احمد خاں بانئے اخبار زمیندار لاہور کے فرزند ہیں۔ جو ۴ ار جنوری ۱۹۰۱ء کو کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے تعلیم کی روشنی اور شعر و ادب کے چرچوں کی وجہ سے یہ سارا گھر آفتاب بنا ہوا تھا۔ منشی سراج الدین احمد خاں خود بڑے اچھے انشا پرداز اور شاعر تھے۔ ان کے فرزند اکبر مولانا ظفر علی خاں کا تو اس باب میں کوئی حریف ہی نہیں۔ غلام حیدر خاں صاحب جو مولانا ظفر علی خاں سے صرف تین سال چھوٹے ہیں۔ دنیائے صحافت میں کافی شہرت اور نام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے ایک بھائی محمد اکبر خاں جو علی گڑھ کالج کے ایک قابل گریجوایٹ تھے اور اخبار زمیندار میں مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے۔ وہ بھی اگر زندہ رہتے تو اپنے دَور کے نامور شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے۔ ایک بھائی پروفیسر محمود احمد خاں جو کئی سال تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں پروفیسر کیمسٹری (کیمیا) اور اس کے بعد رجسٹرار رہ چکے ہیں ہمیشہ یونیورسٹی کی مجلس اصطلاحات علمی کے رکن رکین رہے ہے اب مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب کے میر شعبۂ ترجمہ ہیں۔ جن کی نگرانی میں اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حامد علی خاں نے یہ آنکھیں دیکھیں اور ان گودوں میں پرورش پائی۔ پروفیسر حمید احمد خاں (اسلامیہ کالج لاہور) بھی انھی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے نہایت بلند پایہ ادیب اور نقاد ہیں۔ انھوں نے غالب کے متعلق بہت محققانہ کام کیا ہے۔

حامد علی خاں نے ابتدائی درسی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول لاہور اور چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن ہائی سکول وزیرآباد میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن کے انچارج ڈاکٹر ٹامس گراہم بیلی اس زمانے میں ان کے انگریزی کے معلم تھے ——— وہ بعد میں لندن یونیورسٹی میں اردو ادبیات کے شعبہ کے صدر ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بیلی یورپین ہونے کے باوجود اردو اور پنجابی ایسی بے تکلفی سے بولتے تھے کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔ پنجابی میں بالخصوص ان کا لہجہ ایسا تھا کہ کوئی شخص ان کے ٹھیٹھ پنجابی ہونے میں شبہ نہ کر سکتا تھا۔ ان کے ذہن میں پنجابی اتنی رچی ہوئی تھی کہ وہ خاص خاص اشیاء کے نام بھی جان گئے تھے۔ وہ اپنے شاگرد حامد علی خاں کو ایسے کھاتے پیتے امیر گھرانہ کا بچہ سمجھتے تھے جس کا طرز ماندوبود انگریزی ہو۔ ایک روز پنجابی میں کہنے لگے "تسی تاں ڈبل روٹی کھاندے ہوو گے۔ پر پنڈاں دے لوگ گھیو لگا کے اک طراں دی روٹی پکاندے نے جنہوں پرونٹھا آندے نے۔ اوہ بڑا ثقیل ہوندا اے" یعنی تم تو ڈبل روٹی کھاتے ہو گے۔ مگر دیہاتی لوگ گھی چپڑ کر ایک قسم کی روٹی پکاتے ہیں جسے پراٹھا کہتے ہیں۔ وہ بڑا ثقیل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بیلی اپنے شاگردوں کو بے تکلفی سے خالص پنجابی طرز میں بلایا کرتے تھے۔ کسی کا نام شاہ محمد ہوا تو اسے جھٹ کہہ دیا "او شاہنیا" محمد دین

"منا" اور عبدالحمید کو "میدا"۔ اسی طرح ایک دفعہ انہوں نے حامد علی خاں کو سبق شروع کرنے کے لئے یوں مخاطب کیا "چل بھئی حامدا" حامد علی خاں کی عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ایک دوست کو رازدار بنا کر پلاٹ تیار کیا۔ کہ وہ انہیں ڈاکٹر بیلی کے سامنے انہی کی طرح حامدا کہہ کر پکارے۔ تاکہ براس پر بگڑ کر ڈاکٹر بیلی کو "حامدا" کہنے سے روک سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ڈاکٹر بیلی نے دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور حامد علی خاں سے کہا "کیوں صاحب! "حامدا" کہنے میں کیا برائی ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی اور بے تکلفی کی نشانی ہے۔ میں نے کونسل میں ممبروں کو دیکھا ہے کہ وہ میاں محمد شفیع کو شفیع شفیع کہتے ہیں اور وہ بُرا نہیں مانتے"۔ مگر جب ڈاکٹر بیلی کو شفیع کے صحیح ہونے اور "شفیا" میں خرابی واقع ہونے کا فرق معلوم ہو گیا۔ تو انہوں نے حامد علی خاں کو پورا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا۔ جب موج میں آتے یا کبھی مذاق کی سوجھتی تو کہہ دیتے "ہن راجپوتاں دی واری لے"۔

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں حامد علی خاں نے نیشنل یونیورسٹی لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا اور اپنے مضامین اقتصادیات تاریخ، سیاست، اردو وغیرہ میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ اس یونیورسٹی کا نظام تعلیم امریکن یونیورسٹیوں کی طرز کا تھا۔ گاندھی جی نے حامد علی خاں اور دوسرے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سند عطا کی اور جلسۂ تقسیم اسناد کے بعد الگ لے جا کر باتیں بھی کیں۔

۱۹۲۳ء میں حامد علی خان اسی یونیورسٹی میں اکنامکس (اقتصادیات) اور اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ یونیورسٹی بریڈلا ہال لاہور کے متصل واقع تھی۔ اور بریڈلا ہال کالج ہال تھا۔ جو اس وقت کانگرسیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ملک کے تمام بڑے بڑے قومی راہنما وقتاً فوقتاً یہاں آتے تھے اور حامد علی خاں کو ان کے خیالات سننے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔ طبیعت میں انگریز دشمنی اور آزادی کی تڑپ شروع ہی سے موجود تھی۔ گویا ابتدائے عشق ہی میں آگ تھے۔ مسٹر گاندھی۔ سی آر داس۔ لالہ لاجپت رائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ مسز سروجنی نیڈو اور دیگر محب وطن اور آزادی پسند زعماء کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور آپ شعلۂ جوالہ بلکہ آتش کا پرکالہ بن گئے۔ اگرچہ آپ عام شوریدہ سر نوجوانوں کی طرح اپنے جوش و خروش کا اندھا دھند اظہار نہ کرتے تھے۔ بلکہ اسے پوری قوت سے اپنے سینے میں چھپائے اور دبائے رکھتے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ لاوا پھوٹ بہتا اور طوفان برپا کر دیتا تھا۔ چنانچہ دو تین موقعوں پر ضبط کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ کہ مولانا ظفر علی خاں کسی سفر سے واپس کرم آباد پہنچے۔ ستارۂ صبح ان دنوں کرم آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اور علامہ عبداللہ عمادی اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے وہیں رہتے تھے۔ مولانا نے علامہ عمادی سے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا۔ کہ بعض انگریز بڑے مہذب اور شریف النفس ہوتے ہیں۔ ان کا برتاؤ دیسی شرفا کے ساتھ ایسا اچھا ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ اس کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ بات یہ تھی کہ ریل گاڑی میں مولانا کے ہم سفر انگریز ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ تھے۔ رات کے وقت گاڑی وزیر آباد اسٹیشن پر پہنچی۔ دونوں نے کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ویٹنگ روم کا رُخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہاں صرف ایک ہی کوچ ہے۔ اس پر اس انگریز نے مولانا سے نہایت نرم لہجے میں کہا "افسوس یہاں صرف ایک ہی آدمی کی گنجائش ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہاں دوسرا کوچ بھی ہوتا"۔

مولانا کو اس کا یہ انداز جو حقیقت میں نہایت مہذب امتناع تھا۔ اتنا پسند آیا کہ آپ نے اس کا ذکر اپنے اخبار ستارۂ صبح میں کرنا چاہا۔ حامد علی خاں اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان سے نہ رہا گیا۔ فوراً بول اٹھے کہ یہ معمولی بات ہے۔ ہم کیوں اپنے وطن کے دشمنوں کی قصیدہ خوانی کریں۔ مولانا ظفر علی خاں مسکرائے اور کہنے لگے "یہ حامد صاحب تو بڑے انتہا پسند ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے اخبار میں اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔

نیشنل کالج میں حامد علی خاں نے اردو انجمن قائم کی اور وقتاً فوقتاً اس کے اہتمام میں مشاعرے بھی کرائے۔ ہندو نوجوانوں میں اردو کا شوق پیدا کرنے کے لئے کئی دفعہ ان کو خود غزلیں لکھ کر دیں اور پھر مشاعروں میں ان کی زبانی سُن کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک مشاعرے کے صدر مولانا

عبدالمجید خاں سالک تھے۔ انہوں نے ہندو نوجوانوں کی غزلوں میں حامد علی خاں کا رنگ پہچان کر اور حامد علی خاں کو داد میں شریک دیکھ کر مشاعرے کے اختتام پر کہہ ہی دیا کہ "حامد صاحب! آج تو آپ نے اپنے کلام پر خوب داد دی"۔

یہ اسی قسم کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ نیشنل کالج کے پچانوے فی صدی طلبہ اردو پڑھتے اور باقی پانچ فی صدی ہندی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ تحریک خلافت کے عروج کا زمانہ تھا۔ حامد علی خاں بڑے جذبہ کے ساتھ نیشنل کالج میں گئے تھے۔ مگر وہ ہندو نوجوانوں میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی پاتے تھے۔ پھر بھی ان کا دل وطن کی آزادی کے جوش میں یہ اجنبیت گوارا کر لینے کو تیار تھا۔ مگر ادھر ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کو کامیابی حاصل ہوئی ادھر ہندو نوجوانوں کی آنکھیں بدلیں اور انہوں نے خفیہ خفیہ سازشیں شروع کیں۔ ورزشی اکھاڑے قائم کئے اور اردو چھوڑ ہندی پڑھنی شروع کر دی۔

حامد علی خاں اپنے ہندو دوستوں کو باہم سرگوشیاں کرتے دیکھتے اور جب ان کے قریب جاتے تو وہ چپ سادھ لیتے ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ آخر یہ بے رُخی کیوں ہے۔ کرشن گوپال دت ان کے نہایت مخلص دوست تھے۔ انہوں نے ایک دن اُن سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا۔ پھر کہا "ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کو یہاں رہنا ہے۔ تو ہندو ہو کر رہیں۔ ورنہ افغانستان چلے جائیں"۔ اس واقعہ نے حامد علی خاں کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ دراصل سیاست کی ابتدا تھی۔ ہندوؤں کی اسی تنگ نظری اور تعصب نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو دو قوموں کا نظریہ اور پاکستان کا مطالبہ پیش کرنے پر مجبور کیا۔

رسالہ ہمایوں سے مولانا تاجور نجیب آبادی کے علیحدہ ہو جانے کے بعد دسمبر ۱۹۲۵ء میں حامد علی خاں اس کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور دو ایک چھوٹے چھوٹے وقفوں کے سوا کم و بیش دس بارہ سال اس سے وابستہ رہے۔ آپ نے مضامین کے انتخاب اور زبان کی درستی میں اتنی کاوش اور محنت کی کہ ہمایوں پورے ہندوستان کے دو چار بہترین پرچوں میں شمار ہونے لگا اور واقعہ یہ ہے کہ ہمایوں آپ کی توجہ اور محنت سے جس بلندی تک پہنچا۔ ہمایوں کا کوئی دوسرا مدیر اسے وہاں تک نہ لے جا سکا۔

ہمایوں کی ادارت کا طویل زمانہ آپ نے نہایت محنت و تندہی اور امانت و دیانت سے گزارا۔ جو کتب وغیرہ تبصرہ کے لئے آتیں یا جو اخبار اور رسالے آپ اس دوران میں انتخابات و اقتباسات کی خاطر دفتر سے اپنے گھر لے جاتے۔ آج کل کی روش کے خلاف مطالعہ کے بعد ان کو نہایت احتیاط سے واپس لے جا کر دفتر میں رکھ دیتے۔ اخبار و رسائل کے اس ڈھیر میں سے آپ نے کبھی کاغذ کا ایک پرزہ بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔

حامد علی خاں نے اپنے زمانۂ ادارت میں نہایت سختی اور استقلال کے ساتھ اس امر کا لحاظ و خیال رکھا کہ ہمایوں ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر لازماً شائع ہو جایا کرے۔ یہ پابندی رسالہ کا ایک امتیازی وصف بن گئی اور اس کا اظہار بھی بارہا ہوتا رہا۔ مگر آپ کے بعد آنے والوں نے ہمایوں کا یہ امتیاز خاک میں ملا دیا۔

بیچ میں ہمایوں کی ادارت چھوڑ کر حامد علی خاں نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۹ء میں دوبارہ بی۔ اے کی سند لی۔ اور پھر ۱۹۳۰ء میں لا کالج لاہور میں داخلہ لے کر قانون کی تیاری شروع کی۔ مگر وہ درمیان ہی میں چھوڑ دی۔

لا کالج کی طالب علمی کے دنوں میں بھگت سنگھ اور دت جیسے پرجوش نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا اور اُن کی لاشیں جلا کر راکھ فیروز پور کے قریب دریائے ستلج میں بہا دی گئی۔ لاہور میں ان کے ماتمی جلوس نکلے۔ جب ایک ایسا ہی جلوس لا کالج کے سامنے سے گزرا۔ تو آپ نے دیکھا کہ نوجوانوں کی آنکھیں پُرنم ہیں۔ وہ بے حال و محزوں غم کی مجسم تصویر بنے۔ سر جھکائے ایک ماتمی جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں۔ اور پوری فضا پر سوگ طاری ہے۔ بھگت سنگھ نیشنل کالج میں ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ دبی ہوئی بارود کو آگ لگ گئی۔ ایک شعلہ دل میں بھڑکا اور آپ نے آگے بڑھ کر بے اختیار "بھگت سنگھ زندہ باد" کے تین نعرے لگائے۔ جن سے جلوس میں جوش اور حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جلوس ان کی آواز پر زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کے بعد آپ نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے دوسرے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ لا کالج کے

پرنسپل مسٹر سی ایل آنند کھڑے آپ کی اس حرکت پر مسکرا رہے تھے۔

۱۹۳۴ء میں حامد علی خاں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کی خواہش اور مشورے کے مطابق لاہور میں اردو سبھا کی بنیاد ڈالی جس کے مستقل صدر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور نائب صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ پروفیسر بخاری۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ دل محمد تھے۔ اس سبھا کے جلسے ڈاکٹر بھٹناگر کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی کی کیمیکل لیبارٹری میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اُردو کے دلدادہ و شیدا تھے۔ اس لئے سبھا کی کارروائیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ علامہ کیفی نے اس سبھا میں بہت سے دلچسپ اور مفید مقالے پڑھے۔ جن میں سے "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" "تذکیر و تانیث" اور "اردو کی موجودہ ضروریات" وغیرہ بعد میں رسالہ اردو اور ہمایوں میں بھی چھپے اور کیفی صاحب کی کتاب منشورات کی زینت بھی بنے۔ شاید دو سال بعد اردو سبھا میاں بشیر احمد کی "انجمن اردو" میں مدغم کر دی گئی۔

کچھ مدت بعد حامد علی خاں ایم۔ اے عربی کی تحصیل کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ مگر دوسرے سال کے آخر میں آپ کے دوست ن۔م راشد نے آپ کو بطور مشیر ادبی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کرنے کی دعوت دی۔ اور آپ قیام دہلی کے شوق میں کالج چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔

جن دنوں آپ اورینٹل کالج لاہور کے دارالاقامہ میں مقیم تھے تو انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے یوم آزادی منایا جانے لگا۔ ہندو طالب علموں نے اس موقع پر کانگرس کا جھنڈا لہرانے کی تیاری کی۔ انہوں نے حامد علی خاں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر آپ نے کہا کہ چونکہ کانگرس مسلمانوں کی قومی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اُدھر ہندو نوجوانوں نے کانگرس کا جھنڈا نصب کیا۔ ادھر مسلمان طلبہ نے مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں حکومت کے خلاف تھیں۔ اس لئے کالج کے ارباب حل و عقد ڈرے اور انہوں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ یونین جیک بھی کھڑا کر دیا جائے۔ یونین جیک دیکھ کر ہندو طلبہ سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اسے کسی طرح اتروا دیا جائے۔ حامد علی خاں کو جب انگریزی جھنڈا نصب کئے جانے کا حال معلوم ہوا۔ تو ان کی قومی غیرت ایک دم جوش میں آگئی۔ اور آپ نے کانگرس پارٹی کے نوجوانوں سے کہا کہ اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ان کی قیادت ہاتھ میں لے کر بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے نہایت تیکھے الفاظ میں اپنے مطالبات کا اظہار کیا اور نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ کہ بورڈنگ میں ہندو طالب علم رہتے ہیں۔ اس لئے کانگرس کا جھنڈا لہرانا سمجھ میں آسکتا ہے، یہاں مسلمان طالب علم بھی رہتے ہیں اس لئے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی لہرایا جائے تو مقام تعجب نہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس بورڈنگ ہاؤس میں انگریز کون ہے جس کی نمائندگی یونین جیک کر رہا ہے؟ اس احتجاج سے گھبرا کر بورڈنگ ہاؤس اور کالج کے منتظمین کو یونین جیک اتارنا پڑا ———

اسی روز پچھلے پہر میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اعزاز میں دعوت چائے دی جس میں اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع اور حامد علی خاں دونوں شریک تھے۔ مولوی عبدالحق نے از راہ تفنن پرنسپل محمد شفیع سے پوچھا۔ آپ کے کالج میں تو قومی جھنڈا لہرانے پر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی؟ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ بڑے پیر کا جھنڈا لہرا دیتے۔ حامد علی خاں فوراً بول اٹھے کہ جی ہاں بڑے پیر کا جھنڈا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا وہ کیا؟ کہا۔ یونین جیک۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

جب حامد علی خاں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تھے۔ تو ان سے وہاں کے افسروں نے ریڈیو پر نشر کرنے کے لئے اُردو کے قدیم و جدید ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب کرایا اور تمام دواوین اور بیشتر قیمتی سرمایہ جو بڑی کاوش سے جمع کیا گیا تھا ایک الماری میں بند کر کے ان کی تحویل میں دے دیا۔ حامد علی خاں نے منتخب کلام کی دو نقلیں کرائیں۔ ایک نقل دفتر میں ان کے پاس محفوظ رہی۔ اور دوسری بوقت ضرورت استعمال ہوتی رہی۔

جب برعظیم پاکستان و ہند میں ۱۹۴۷ء کی قیامت برپا ہوئی اور دہلی میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی آندھی تیزی سے چلنے لگی تو حامد علی خاں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو آگ کی اس دہکتی ہوئی بھٹی سے نکل کر لاہور پہنچنا چاہئے۔ مگر شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا سڑکوں پر اور گلیوں میں خون مسلم سے ہولی

کھیلی جا رہی تھی۔ کسی مسلمان کی مجال نہ تھی کہ ایسے خطرناک موقع پر گھر سے نکلتا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے اور سر چھپانے کی فکر میں تھا۔ ایسی پر آشوب ساعت میں آپ تن تنہا جان ہتھیلی پر رکھ کر ترکمان دروازہ سے نکلے اور ریڈیو اسٹیشن نئی دہلی پہنچ گئے تا کہ دفتر کی امانتیں دفتر والوں کے سپرد کر کے سرخروئی حاصل کریں۔ آپ نے تمام کتابوں کی فہرست تیار کرائی اور کتابیں لائبریرین کے حوالہ کر کے رسید لی۔ پھر منتخب اردو اشعار کا مجموعہ ڈائرکٹر کے سامنے پیش کر کے کہا کہ چونکہ اب میرا دہلی میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

ڈائرکٹر نے ایک نظر مجموعہ اشعار پر ڈالی۔ پھر ان کی طرف دیکھا اور کہا "حامد علی خان! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری جان اس امانت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور اب کس طرح گھر واپس جاؤ گے جب کہ بسوں کی آمد و رفت بند ہو چکی ہے۔ کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملتی اور اکیلے سڑک پر پیدل جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

حامد علی خان ریڈیو اسٹیشن سے نکلے تو واقعی پریشان تھے۔ کہ اب کس طرح گھر پہنچیں گے۔ نہ کوئی تانگہ نظر آتا تھا۔ نہ بس۔ تھوڑی دور آگے بڑھے تو ایک ہندو ملا جو شکل صورت سے خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے دل میں بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک خیال آیا اور آپ جھٹ اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آپ نے مسکرانا شروع کر دیا۔ حامد علی خان کے نہ ڈاڑھی تھی نہ شرعی پاجامہ۔ کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس انسان کو کون مسلمان سمجھتا۔ اس ہندو نے جب ان کو بلاجھجک اپنے قریب آ کر مسکراتے دیکھا تو فطری طور پر ہندو اور اپنا ہم خیال ہی سمجھا اور کہا "مدکام تو خوب بن گیا تھا مگر اس بڈھے گاندھی نے خراب کر دیا" حامد علی خان نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "یہ بڈھا ہر جگہ ہمارا کام خراب ہی کرتا ہے" اس پر اس ہندو نے دانت پیستے ہوئے کہا "یہ پٹ جائے راستے نہیں کتا۔ ہم سے کہتا ہے کہ ہاتھ روک لو۔"

اس قسم کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک تانگہ آ نکلا جس میں تین چار ہندو پہلے سے سوار تھے۔ یہ بھی اس میں لد گئے اور بچتے بچاتے کسی طرح گھر آ گئے۔ اور ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو بذریعہ ہوائی جہاز والٹن ائرپورٹ لاہور میں پہنچ گئے۔

وہاں سے لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں نو دس ماہ روزنامہ امروز لاہور کے عملہ ادارت میں کام کیا مگر فضا راس نہ آئی۔ سارا عرصہ لڑائی جھگڑے میں گزرا البتہ جماعتی سیاست کا خوب تجربہ حاصل ہوا۔

اس کے بعد رسالہ مخزن کی ادارت سنبھالی جس کی طباعت و اشاعت کا انتظام ادارہ نوائے وقت کے ذمہ تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد سے اب تک اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ چلا رہے ہیں جو سنجیدہ، متین، مہذب اور شائستہ لٹریچر کا بہترین نمونہ ہے۔

حامد علی خاں ایک نرم گفتار، نرم گفتار اور نرم دل انسان ہیں۔ فخر اور غرور ان میں نام کو بھی نہیں۔ بہت متواضع، ملنسار اور خوش اخلاق ہیں۔ عزلت پسند اور گوشہ گیر ہیں۔ خلوت ہی کو انجمن سمجھتے ہیں۔ بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ تنہا نشینی ہی میں خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ ادبی مجالس میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں۔ صوبائی تعصب سے بالا ہیں۔ ذات پات کی تمیز کو اچھا خیال نہیں کرتے۔ ٹھیٹھ پنجابی ہونے کے باوجود پنجابی کہلانے کی بجائے پاکستانی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مولانا مودودی اور اس قسم کے شخصی امتیازات اور خطابات سے سخت نفرت ہے۔ نام و نمود بھی پسند نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ دیباچہ نگاری کو بھی جھوٹی شہرت کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس سے کتراتے ہیں۔ مگر ایک دفعہ ڈاکٹر محمد باقر نے ان کا یہ غرور خاک میں ملا دیا۔

بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر باقر اپنی ایک کتاب کا دیباچہ ان سے لکھوانا چاہتے تھے مگر آپ کسی صورت راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ ان کے اصول کے خلاف تھا لیکن کتاب کا مسودہ ہی ڈاکٹر صاحب نے ان کے ہاں چھوڑ دیا ... صاحب اس وقت تو ٹال گئے۔ وہ مسودہ ... چھوڑ کر چلے گئے کہ جب کسی وقت آپ کو فرصت ملے ... کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب ... کے لئے ولایت روانہ ہو گئے۔ اور حامد علی خاں ... اس مسودہ پر مقدمہ لکھنے کی بلا ٹل گئی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ... کمپنی کے کسی دوسری ایجنسی ... کتاب ... دیکھ کر حیرت ہوئی

کہ اس کے شروع میں حامد علی خاں کے نام سے مقدمہ موجود تھا۔ جس کی زبان بھی ناقص تھی اور انداز بھی اچھا نہ تھا۔ حامد علی خاں اس وقت تو اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش رہے۔ اس خیال سے کہ ع

نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے

لیکن جب ڈاکٹر باقر صاحب ولایت سے واپس آ کر ملے۔ تو ان سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تاج کمپنی سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ہم نے دو تین مرتبہ اپنا آدمی حامد صاحب کے پاس مقدمہ لکھوانے کے لئے بھیجا۔ مگر وہ نہ ملے۔ اس پر ہم نے دیباچہ کسی اور سے لکھوا کر ان کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس جواب سے جو عذر گناہ بدتر از گناہ تھا۔ آپ کو تسلی تو نہ ہوئی۔ مگر آپ مروّت کی وجہ سے خاموش ہی رہ گئے۔

آپ خودداری سے بھی زیادہ ایمانداری کے قائل ہیں۔ صداقت۔ راست بازی اور جرأت کا یہ عالم ہے کہ سچی بات منہ پر کہہ دینے سے کبھی نہیں چوکتے اور اس کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اس سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناراض۔ امروز کی ادارت کے زمانے میں سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ اشاعت کے لئے آیا۔ آپ نے دیکھ کر واپس کر دیا کہ یہ شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ مملکت پاکستان کے خلاف ہے۔ اس سے پاکستان کی توہین کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ اس مضمون کے مختلف حصوں میں مختلف بیہودگیوں کی طرف اشارہ کر کے بار بار پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا گیا ہے۔ منٹو کی درخواست پر مولانا چراغ حسن حسرت کی رائے پر فیصلہ ٹھہرا۔ انہوں نے فرمایا کہ مضمون تو اچھا ہے۔ مگر فی الحال اسے شائع نہ کیا جائے۔

اس کے چند روز بعد جب حسرت، منٹو اور پطرس بخاری کسی مجلس میں جمع ہوئے تو حسرت نے منٹو کی دل دہی کے لئے روتی صورت بنا کر کہا کہ آپ کا افسانہ تو بہت اچھا تھا۔ مگر حامد علی خاں نے اسے شائع نہیں ہونے دیا۔ بخاری نے کہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ چیف ایڈیٹر آپ ہوں۔ آپ کوئی مضمون شائع کرنا چاہیں اور وہ شائع نہ ہو سکے۔ حسرت نے کہا ہاں صاحب! مگر وہ بھی تو آخر ذمہ دار آدمی ہیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ منٹو نے خود یہ واقعہ حامد علی خاں کو سنایا۔ حامد علی خاں نے حقیقت حال بیان کرنا چاہی تو منٹو نے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی درست ہے۔ حسرت صاحب کی بات درست نہیں۔ البتہ ان کے حق میں ایک بات جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت وہ نشے میں تھے۔

اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب حامد علی خاں نے الحمرا نکال کر خود منٹو سے مضمون مانگا۔ اس نے مضمون لکھنے سے تو انکار نہ کیا۔ مگر کہا۔ "حامد صاحب! آپ متانت پسند ہیں میرا مضمون برداشت نہیں کر سکیں گے۔" اس واقعہ سے حامد علی خاں کی سیرت کے کئی پہلو روشنی میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کام آپ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اسے پوری ذمہ داری۔ فرض شناسی اور محنت سے نباہتے ہیں۔ دوسرے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے خلاف کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتے جس سے اس کا مذاق اڑانا مقصود ہو یا جس سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ آپ کی سلامت روی اور اصابت رائے کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

آپ اس قدر ترقی پسند بھی ہیں کہ روس۔ جرمن۔ اٹلی۔ جاپان۔ امریکہ۔ فرانس اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے آدمیوں اور تحریکوں کا ذکر اپنے پرچوں میں ہمیشہ چھیڑتے رہتے ہیں۔ تاکہ معلومات عامہ ترقی کرے اور لوگوں کو اچھی باتیں اختیار کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس خیال سے انہیں سخت وحشت ہوتی ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اندھادھند دوسرے ملکوں کے اصول اور نظریئے اپنے ملک پر مسلط کر لئے جائیں۔

حامد علی خاں نثر میں خوب لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ غزل بھی نہایت عمدہ کہتے ہیں۔ اور نظم بھی۔ ان کا کلام پاکیزہ خیالات۔ رنگین و بلند تخیل اور دلپذیر انداز بیان کا حامل ہوتا ہے۔ دل میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اردو کی بے لوث خدمت اور ادب و شعر کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ طمع اور لالچ ان میں نام کو بھی نہیں۔ اپنی حالت پر قانع اور مطمئن ہیں۔ ... جوڑ توڑ۔ دھڑے بندی۔ ہنگامہ آرائی اور پارٹی بازی کی لعنت میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ فرقہ وارانہ تعصب سے بھی ان کا دامن پاک ہے۔ مختلف فرقوں کے آپس کے جھگڑوں میں نہ کبھی دخل دیتے ہیں نہ کسی کے متعلق برے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبت یا نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے

اور نفرت کرنے والوں سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ مگر اس میں ذاتی غرض مندی کا دخل نہیں ہوتا۔

حامد علی خاں کی کوئی مستقل اور پائدار تصنیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ رسالہ ہمایوں۔ مخزن اور الحمرا کی جلدیں کسی اچھی تصنیف یا تالیف سے کم قیمتی نہیں۔ عرصہ ہوا منصور احمد مرحوم مدیر ادبی دنیا لاہور نے آپ کے سو شعروں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس کے شروع میں آپ کی شاعری پر بھی مختصر سا تبصرہ کیا گیا ہے۔

افسانہائے عشق آپ کی دوسری تالیف ہے۔ اس میں مثالی محبت کے سات نہایت دل کش اور پاکیزہ رومانی افسانوں کے تراجم جمع کئے گئے ہیں۔ ان کی زبان اتنی صاف اور شستہ ہے کہ بالکل طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ میں اتنا لوچ اور ترنم ہے کہ بقول مدیر ساقی دہلی "جا بجا انگریزی بھی اردو کا منہ تکتی رہ جاتی ہے"۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا چراغ حسن حسرت نے زمیندار میں لکھا تھا کہ "بعض مقامات پر روح بے اختیار اہتزاز کرنے لگتی ہے"۔

غزل کے مندرجہ ذیل چند شعروں میں ان کی روح شاعری کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے ؎

نمود زیست اک ایجاد ہے تیری محبت کی ۔ کہ خود بنیاد جاں بنیاد ہے تیری محبت کی
یہ درد و سوز یہ کرب والم یہ حسرت و ماتم ۔ مری یہ زندگی فریاد ہے تیری محبت کی
ہوئی مدت جہنم بن گئی دنیا مرے دل کی ۔ مگر جنت ابھی آباد ہے تیری محبت کی
کھڑی ہے یونہی تیز و تند طوفانوں کی زد میں بھی ۔ وہ سنگین آہنی بنیاد ہے تیری محبت کی
وہی غم ہے وہی دل ہے وہی دیوانگی دل کی ۔ وہی قید ابد میعاد ہے تیری محبت کی

پھر یہ شعر دیکھئے ؎

عمر دو روزہ حسرت و حرماں میں کٹ گئی ۔ مجھ سے تری جفا کا گلہ بھی نہ ہو سکا
بیگانہ دو جہاں سے ہوا جو ترے لئے ۔ وہ دل ہزار حیف ترا بھی نہ ہو سکا

بقول منصور احمد "حامد کی شاعری کی ایک دل کش خصوصیت وہ ایمائی الفاظ ہیں۔ جن کے استعمال سے وہ شعر میں پوری کہانی کہہ جاتا ہے۔ جب وہ کوئی تصویر کھینچتا ہے تو اپنے قلم کے ایک مختصر سے مس سے اس کے لئے ایک ایسا دھندلا دھندلا سا پس منظر تخلیق کرتا ہے کہ ہماری چشم تصور اصلی تصویر سے گزر کر اس میں کھو جاتی ہے۔ اور دیر تک اس نامعلوم اور حسین سرزمین کی سیر کرتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے ؎

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

"وہی" اور "ابھی تک" دو لفظ ہیں جو اس شعر میں کوئی افسانہ کہہ رہے ہیں۔ وہ کیا حشر تھا جو گلزار کے سایوں میں بپا ہوا۔ اور کیوں پھولوں سے ابھی تک اس کی خوشبو نہیں جاتی؟ صرف وجدان ہی ان سوالات کی پہنائی کو پا سکتا ہے"۔

ایک اور شعر دیکھئے ؎

آنکھیں تری آنکھوں سے ملائی نہیں جاتیں
سر اب ترے قدموں سے اٹھایا نہیں جاتا

"اب" نے ایک پورا افسانہ پیدا کر دیا ہے۔ کیوں اب آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملائی جاتیں۔ کیوں اب سر قدموں سے نہیں اٹھتا۔ اسے سوچیے تو دل میں تصورات کی ایک دنیا بس جاتی ہے۔

الفاظ کی سحر کاری کے ساتھ ساتھ بعض جگہ الفاظ کی موسیقی بھی ایسی ہے کہ شعر پڑھتے ہی وہ سماں زندہ ہو جاتا ہے اور انسان تصور کی آنکھوں اور کانوں سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن لیتا ہے جو شاعر نے دیکھا اور سنا۔ ذیل کے دو شعروں میں خزاں کی رخصت کا سماں اور بادِ خزاں سے پتوں کے گرنے کی آواز کس خوبی سے پیدا کی ہے ؎

خزاں رخصت ہوئی دبتی سمٹتی کانپتی ڈرتی
چمن سر پر اٹھاتی ناچتی گاتی بہار آئی
لڑھکتی لڑکھڑاتی کھڑکھڑاتی پتیاں بھاگیں
سپاہِ گل قطار اندر قطار اندر قطار آئی

اور پھر ؎

اب جوئبارِ زندگی چپ چاپ سی ہے ہاں کبھی
اٹھی صدائے درد جب کوئی کنارہ کر گیا

پہلے مصرعہ میں ساحلِ دریا کی خاموشی کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے اور پھر دوسرے مصرعہ میں اس عظیم الشان سکوت کو ایک نہایت ہی مختصر لفظ "کرنہ" سے توڑ کر اس تقابل کو ظاہر کیا ہے۔ جس کا اندازہ کبھی دریا ہی کے کنارے پر کھڑے ہو کر ہمیں ہو سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری

ارشد تھانوی

مولانا حالی عین عنفوان شباب میں اپنی نئی نویلی دلھن کو اس کے خوشحال میکہ میں پہنچا کر پانی پت سے دلی بھاگ آئے تھے تاکہ اپنی تعلیمی کمی کو مکمل کر لیں اور میں ایک ایسے ۱۵ سالہ طالب علم کو جانتا ہوں، جو اتنی سی عمر میں اسی علمی تشنگی کے تقاضے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔

یوپی کے ضلع سیتاپور میں ایک مردم خیز قصبہ خیرآباد ہے، وہاں کے مکتب میں ایک یتیم سید زادہ پڑھا کرتا تھا۔ معمولی نوشت و خواند اور ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس قصباتی مدرسہ میں بقدر ذوق اس کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کسی بڑی درس گاہ کا طالب علم بننا چاہیئے۔ ماں اور بڑے بھائی اس کمسنی میں اپنے سے علٰحدہ کرنا اور کہیں دور بھیجنا نہ چاہتے تھے۔ لڑکے میں خواہش فرار پیدا ہوئی۔ ایک روز ماں نے کسی بات پر ڈانٹا بیٹا تو خفا ہونے کا بہانہ ہی ڈھونڈتا تھا۔ موقع پا کر گھر سے نکلا اور لکھنؤ پہنچ کر دم لیا۔ یہ بات راز ہے کہ زاد سفر جائز طریقہ پر مہیا کیا تھا۔ یا ماں کی صندوقچی پر ہاتھ مارا تھا، اگر آخری عمل کیا تو بھی یہ گناہ کسی طرح ثواب سے کم نہیں۔ بہرحال لکھنؤ پہنچ کر اپنی ذاتی کوشش سے دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا۔ اور پڑھنے کا جو حق ہوتا ہے، وہ پورا پورا ادا کیا۔ جتنی جتنی علمی مدارج میں ترقی کی، اتنی ہی فکر و تدبر میں بھی صلاحیت پیدا کی مگر درجہ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے کارکنان ندوہ کے خلاف سرکشی کی، انجمن اصلاح کے نام سے طالب علموں کی ایک انجمن بنالی تھی۔ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے ہڑتال کرا دی اور جب معاملات رو براہ ہو گئے تب بھی بغاوت کا جوش ٹھنڈا نہ پڑا۔ اور اس دارالعلوم میں رہنا گوارا نہ کیا۔ معتمد ندوہ اس زمانہ میں سید سلیمان تھے۔ وہ اس ہونہار طالب علم پر بہت شفقت کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بقیہ تعلیم نامکمل رہے اپنے خط کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس دہلی بھیج دیا۔ بقیہ علمی مراحل جامعہ ملیہ میں طے ہو گئے۔ اس کے بعد ندوہ میں پہنچ کر بھی سند فضیلت حاصل کر لی۔ دینی و دنیوی تعلیم کا یہ پیکر اب مولوی رئیس احمد جعفری تھا۔ میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۳ء میں ہوئی جب یہ روزنامہ خلافت بمبئی کے چیف اڈیٹر تھے۔ اور خلافت ویکلی کے نام سے ایک علمی و ادبی اڈیشن بھی علٰحدہ شائع کرتے تھے۔ ایک روز میں علمائے اسلام کا کوئی تذکرہ دیکھ رہا تھا۔ متعدد بزرگانِ کرام کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ صرف پڑھنا جانتے تھے، لکھنا انہیں نہ آتا تھا۔ ان کی تصانیف دوسروں کے قلم کی رہین منت ہیں۔ جو بیشتر ان

کے شاگرد ہوتے تھے۔ اسی وقت ڈاک آئی۔ ایک لفافہ جو کھولتا ہوں تو شاہد نذیر بیٹے پر نامۂ خلوص مرقوم تھا۔ الفاظ بہت خوب، عبارت بہت اچھی، مگر حروف بڑے ایندے بیندے۔ میں عرصہ دراز تک کورٹ انسپکٹر رہا ہوں سینکڑوں نہیں ہزاروں بد خط لکھی ہوئی رپورٹیں اور روزنامچے پڑھ چکا تھا۔ ندوی جعفری صاحب کا خط بلا تکلف پڑھ لیا اور سوچنے لگا کہ حضرت علوم مشرقی کے مستند عالم ہیں، بقدر ضرورت مغربی تعلیم بھی پائی ہے۔ ورنہ شاید بالکل لکھنا نہ سیکھتے۔ اور قدیم علماء کی طرح علم کے ساتھ فن پر توجہ کرنا غیر ضروری سمجھتے، یہ اب سے ۲۰ برس پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو یہ اندازِ نگارش اور بھی پختہ ہو گیا ہوگا۔ معلوم نہیں ان کی تصانیف کی کتابت کیونکر ہوتی ہے۔ کاتب لوگ ان کی لکھی پر لکھی بھی تو نہیں مار سکتے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خط منشیانہ ہے۔ اور اگلے وقتوں کے اندازِ تحریر کا دراثتی نمونہ دورِ حاضر کے ادیب و انشا پرداز اور صحافی اتنے بڑے بڑے دائرے نہیں کھینچتے۔

میں بالالتزام خلافت ویکلی کے لئے نظم و نثر لکھا کرتا تھا۔ اس لئے فیما بین غائبانہ ربط قائم ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد بھوپال کے ایک صاحب جامعہ ازہر میں اپنی تعلیم کی تکمیل کر کے واپس آئے وہ جعفری صاحب کے دوست تھے، انہیں بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ میں انہیں پہلی دفعہ دیکھ کر کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ دبیز جسم کے، ڈاڑھی لگائے نوجوان مولانا۔ اس پر طرّہ یہ کہ بہت کم سخن اور سنجیدہ بیان۔ خلافت ویکلی میں ایک بہت ہی دلچسپ افسانہ قسط وار ان کا شائع ہوا کرتا تھا جس میں موجودہ معاشرت کے بعض نازک پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کئے جاتے تھے میں سوچنے لگا کہ یہ ٹھوس نہیں ٹھس قسم کا آدمی ایسی باریک بینی اور نکتہ سنجی کا اہل کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود نہیں لکھتا کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیتا ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بدوران طالب علمی جبکہ ۱۵ سال کی عمر تھی، یہ ماہنامہ اعجاز کی ادارت کر چکے تھے، جو ان کے بڑے بھائی مولوی عقیل احمد نے بارہ بنکی سے نکالا تھا۔ اور جب جامعہ ملیہ میں تھے تو مولانا محمد علی جوہر کی سوانحمری لکھی تھی جو مکتبۂ جامعہ نے چھاپی اور شائع کی۔ ان کے نانا مولوی سید نیاز احمد، یو، پی پولیس سے پنشن لے کر بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے تھے۔ میں ان کی ماتحتی میں بھی رہ چکا تھا۔ اور چونکہ وہ میرے والد اور چچا کے دیرینہ دوست تھے۔ ان کا مستحقِ شفقت بھتیجا بھی رہا تھا۔ اس لئے بغیر دیکھے اِن کے اس عزیز ترین نواسے کے حالات سُن چکا تھا۔ پس دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ ؎

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

اس لئے دیئے پن کی رسمی و اخلاقی ملاقات کے کئی سال بعد،

عادل نے بلایا مجھے، میں بمبئی پہنچا

اپنی روانگی کی اطلاع جعفری صاحب کو بھی رسمی طور پر دے دی تھی۔ خیال تھا کہ جب ملیں گے تو اپنے بڑے نانا حضرت ریاض کے مصرعہ کی ہو بہو تصویر ہوں گے۔ ؎

اک عبا پہنے عصا تھامے عمامہ باندھے

مگر۔ ؎ ۔ ہر دم بہ لباس دگر آں یار بر آمد۔ ایک نوجوان ملنے آیا۔ دبلا پتلا۔ اکہرے جسم کا، کلین شیو، میں نے پہچانا نہیں۔ بڑے خلوص سے علیک سلیک کی۔ بمشکل پتہ چلا، تو یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی جعفری ہیں، جو ایک بھاری بھر کم مولانا کے پیکر میں بھوپال تشریف لے گئے تھے، گفتگو کی، تو منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ خوب کُھل کے باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اپنا ذاتی پریس قائم کر لیا ہے، اور ایک روزنامہ بھی کامیابی سے نکال رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ قائد اعظم کی سوانحمری لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے، میں ان دنوں کٹر کانگرسی اور بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی مجلس عاملہ کا سرگرم ممبر تھا۔ اس لئے سیاسی موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے متعدد دوستوں کی کوشش کے باوجود میں کانگریس سے بدظن نہ ہوا تھا۔ لیکن جعفری صاحب سے ایک گھنٹہ رد و کد کرنے کے بعد میں تہ دل سے مسلم لیگ کا حامی بن گیا

کچھ عرصہ کے بعد جب نواب بہادر یار جنگ صدر اسٹیٹس مسلم لیگ بھوپال آئے تو میں نہ صرف اسٹیٹ پیپلز کانفرنس سے مستعفی ہو چکا تھا۔ بلکہ اسٹیٹ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ میری وہ انقلابی نظمیں جو کانگرسی اخبارات چھاپا کرتے تھے ردّی ہو چکی تھیں۔ اور نئی نظمیں کچھ اس قسم کی ہونے لگی تھیں ؎

ہندوانہ ذہنیت نے ودّیا اسکیم کی ساکھ کھو دی کانگرس کے شعبۂ تعلیم کی
مدرسوں کو ودّیا مندر کہا جانے لگا محض ضد میں پیروانِ دینِ ابراہیمؑ کی

وقت گزرتا رہا۔ لیگ طاقتور ہوتی گئی۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو کر رہا۔ مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں بھوپال کو میں نے بھی خیرباد کہا۔ لاہور آ کر کچھ دنوں بعد کراچی پہنچ گیا۔ مولانا رئیس احمد صاحب جعفری ندوی پہلے ہی پاکستان آ چکے تھے کسی نہ کسی روزنامہ کی ادارت کر رہے تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، نفسیاتی، افسانوی، دینی موضوعات میں کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر انہوں نے تصنیف و تالیف، ترجمہ، تلخیص کا حق ادا نہ کیا ہو۔ کراچی کی بے پایاں آبادی میں بھی انہیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑی، ایک دن ارادہ کیا اور بہت آسانی سے انہیں پا لیا۔ اسی خلوص، اسی محبت اسی شگفتگی سے ملے۔ اور ملتے رہے ہیں بھی گیا۔ وہ بھی آتے۔ اس آمد و رفت میں عجیب بات میں نے پائی۔ میرے ہاں وہ ناشتہ چھوڑ دیں گے۔ چائے پی لیں گے۔ اور اپنے یہاں ناشتہ ضرور کرائیں گے، چائے چاہے پیو یا نہ پیو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اتفاقی بات ہو۔ لیکن میرا متعدد بار کا تجربہ ہے۔ اور اس بات پر میری بیوی ان سے کچھ کچھ خفا بھی ہیں۔ بقول ان کے بھوپال آئے تو سب کچھ کھا یا اب ذرا ذرا سی چیز سے پرہیز ہے۔ ایک مزے کی بات اور ہے میں مدت سے ناول یا مختصر افسانے بالکل نہیں پڑھتا ؎

ہوئی رخصت جوانی کی بہار آخر حیف طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

جعفری صاحب از راہِ محبت مجھے اپنی وہ کتاب تحفتاً دیتے ہیں جو میرے ذوق کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک ناول بھی عطا کر دیا۔ جو تازہ شاہکار نہیں بلکہ ۱۹۴۹ء کا چھپا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

میں نہ پڑھوں گا تو گھر میں اور بہت پڑھنے والے ہیں۔ لا کر میز پر رکھ دیا۔ اگلے روز ریڈیو کے لئے ایک اسکرپٹ لکھنے بیٹھا۔ موڈ نہ ہوا۔ ناول سامنے تو تھا ہی غیر ارادی طور پر اُسے اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ زائد ورق ہٹا کر ٹائیٹل دیکھا۔ موٹے حروف میں نام لکھا تھا —— چاندنی —— نیچے عبارت تھی۔ —— جنت۔ جہنم، اور قیامت کی داستان —— دونوں عبارتوں کے درمیان 'فلمی دنیا' بھی لکھ دیا تھا۔ شبہ ہوا کہ شاید دوزخ، بہشت اور حشر نشر کو ملا دیا گیا ہے، اور یورپین فلم کمپنیاں جس طرح اپنی مذہبی روایات کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا کرتی ہیں، ایسی ہی کوئی جسارت کہیں جعفری صاحب تو نہیں کر بیٹھے۔ مگر اس مردِ مسلمان سے ایسی توقع نہیں۔ ورق پلٹا۔ جعفری صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔

کاردار پروڈکشن سے وابستہ رہ کر ڈیڑھ برس تک میں نے فلمی دنیا کا کلوز اپ دیکھا۔ جنت کا لطف، جہنم کا عذاب، قیامت کی نفسا نفسی سب کچھ اس جہانِ خراب آباد میں ہے۔ یہ ناول اسی دنیا کی ایک جھلک ہے۔

جی چاہا کہ اس نئی دنیا کی میں بھی سیر کروں، اور یہ بھی اندازہ کروں کہ دینی عالم جعفری نے اس دنیوی منظر کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ پڑھا اور خوب پڑھا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انجان تخلص کے جس مفروضہ "اسٹوری رائٹر" کی زبانی یہ فسانہ دہرایا گیا ہے۔ یقیناً وہ خود جعفری صاحب ہی ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

ناممکن ہے کہ کسی سوسائٹی کو پورے طور پر اپنائے بغیر اس کی اس قدر صحیح عکاسی کی جا سکے کہ کوئی باریک سے باریک پردہ حائل نہ ہو۔ اور اس بحرِ بے پایاں میں گہرا غوطہ لگائے بغیر تہ کے موتی اور خزف ریزے نکالے جا سکیں۔ نعمان صاحب ڈوب کر اچھلے بغیر اس قدر جانکار کیونکر ہو گئے یقیناً

شناور بحرِ الفت میں کہیں ڈوبے کہیں نکلے

جعفری صاحب کا اس گندگی سے دامن بچا کر نکل آنا معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ اچھا ہوا کہ جعفری صاحب کراچی سے لاہور چلے گئے۔ ورنہ ممکن تھا کہ میں یہ ستائش منہ در منہ کر بیٹھتا۔ اور وہ اس داد ایثار کو اپنی ذات پر ایک بیہودہ الزام سمجھ کر مجھ سے بظاہر نہیں تو دل میں آزردہ ہو جاتے۔ میں اس کو واقعی معنوں میں داد ایثار کہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے کردار کی ایسی ہی اونچی قربانی دی ہے۔ جیسی بعض مغربی ڈاکٹر بعض خطرناک امراض کی تحقیق و علاج کے لئے اپنے جسم اور بعض اوقات جان کی دیا کرتے ہیں۔ اور شدید مرض کی اذیت کا اندازہ لگانے کو اس مرض کے جراثیم اپنے خون میں داخل کر لیتے ہیں۔ اور ذاتی تجربہ کے بعد اس کی مدافعت کر کے مخلوقِ خدا کی تکالیف دور کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ جعفری صاحب نے بھی ایک شدید ترین معاشرتی مرض کا تجربہ کر کے چاندنی کے نام سے نسخۂ شفا پیش کیا ہے۔ اور خود بھی اس مرض سے پاک صاف ہو کر ادبی و صحافتی فضا میں آ گئے ہیں۔ جعفری صاحب میں ایک بڑی اچھی بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتے اور دوستوں کو دشمن بنانا انہیں بالکل نہیں آتا۔ حالانکہ یہ بہت آسان بات ہے۔ اور عیب یہ ہے کہ حاسدوں کو جو دشمنوں ہی کی ایک بدترین قسم ہے دوست بنانے کی ناکام سعی سے باز نہیں آتے۔ اور با شماتتِ ہمسایہ کے اصول پر نقصانِ مایہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شبلی بی کام

قمر تسکین

میکسم گورکی نے اپنے "روزنامچے کے پریشان اوراق" میں ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ کسی پارک کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہیں ادھیڑ عمر کے ایک شخص پہ پڑیں جو ایک بنچ پر بیٹھا کبھی ہیٹ اوڑھ لیتا اور کبھی اسے اتار کر سورج کے سامنے کر دیتا تھا۔ گورکی نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ تو وہ چیخوف تھا۔ گورکی نے سوال کیا۔

"کیوں میاں چیخوف، یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

چیخوف نے منہ اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یار یہ دھوپ قابو میں نہیں آتی۔ میں ہیٹ میں شعاعیں جمع کر کے جلدی سے اوڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہ نکل بھاگتی ہیں۔"

چیخوف کو سمجھانا بے سود تھا۔ گورکی اسے اپنے حال پر چھوڑ کر اپنی راہ لگ گیا۔

شبلی بی کام دھوپ پکڑنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ لیکن میں اسے ۱۹۴۳ء سے جانتا ہوں اور اگر میں اپنے علم میں ان لوگوں کی معلومات بھی شامل کر لوں جو اسے مجھ سے بھی پہلے سے جانتے ہیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گزشتہ بیس برس سے طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش ضرور کر رہا ہے!

مجھے ایک قریبی دوست ہونے کی حیثیت سے اُس کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ جن دنوں وہ "عالمگیر" اور "خیام" کا ایڈیٹر تھا۔ اندرون شہر کے ایک تنگ و تاریک بازار میں رہتا تھا۔ وہ اُس وقت مجرّد تھا اور اس وقت بھی مجرّد ہے۔ اُس نے سات روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا چوبارہ کرایہ پر لے رکھا تھا جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اُس کی سامنے کی دیوار لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں تین دریچے تھے جو بازار کی جانب کھلتے تھے۔ روشندانوں میں اور بازار سے گزرنے والی بجلی کے تاروں پر جنگلی کبوتروں کی ایک ڈار غٹرغوں غٹرغوں کرتی رہتی کمرے کے اندر تین الماریاں تھیں۔ ایک میں آئینہ، کنگھی، کریم اور سنگھار کا دوسرا سامان پڑا رہتا تھا۔ دوسری میں کتابیں اور رسالے بری طرح اٹے رہتے

تھے۔ تیسری میں مٹی کی تہیں جمع رہتی تھیں۔ جن میں چوہوں نے بل بنا رکھے تھے۔ اسی تیسری الماری کے اوپر ایک طاقچہ تھا۔ جس میں بے شمار خطوط کے ڈھیر اوپر نیچے بے ترتیبی سے پڑے رہتے تھے۔ یہ خطوط راس کماری سے ہمالیہ تک کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ایڈیٹروں کے لکھے ہوتے تھے۔ ان میں نوآموزوں کے خطوط بھی ہوتے اور کہنہ مشق شخصیتوں کے بھی۔ بعض خطوط کے ہمراہ جواب کے لئے ٹکٹ بھی ہوتے اور جوابی لفافے بھی —— لیکن شبلی بی کام کے لئے کسی خط کا جواب دینا ایسا ہی ہے جیسے بقول منٹو مرحوم کے ماں بہن کی گالی دے دینا۔ وہ اپنے نام آئے ہوئے تمام خطوط پڑھتا۔ ایک آدھ خط کا اپنے دوستوں سے بھی تذکرہ کرتے ہوئے اس مصمم ارادے کا اظہار کرتا کہ وہ اس خط کا جواب ضرور لکھے گا۔ اُس نے اکثر ضروری خطوط "اپنے کوٹ اور پتلون کی جیبوں میں اڑسے ہوتے جب جیبیں جواب دے جاتیں تو وہ ان کو نکال کر مٹی سے اٹی ہوئی الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیتا۔ جب وہاں بھی انبار لگ جاتا اور چوہے ان خطوط کو اپنا تختۂ مشق بنا چکتے تو وہ ان سب کو اُٹھا کر اوپر طاقچہ میں ڈال دیتا۔ میں تقسیم سے قبل چھ برس تک خطوط کے اس ڈھیر کو وہیں رفتہ رفتہ پھولتے دیکھتا رہا لیکن اُسے ان کے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ اُسے جواب دینے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے؟

وہ دن چڑھے چارپائی سے اُٹھتا اور وہ بھی اس لئے کہ مہتر اور بہشتی کو آنا ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس کا شاکی رہتا کہ سالے سونے نہیں دیتے۔ پھر یہ عذاب ناگزیر تھا۔ کیونکہ اگر وہ اُٹھ کر کواڑ نہ کھولتا تو پانی کہاں سے آتا؟ صفائی کون کرتا؟

وہ بیدار ہو کر سب سے پہلے لوٹا ہاتھ میں پکڑ کر چھت پر چڑھ جاتا۔ شاید دن بھر میں یہی ایک موقع ایسا ہوتا جب وہ اردگرد کی منڈیروں اور چھتوں پر جھانک سکتا۔ لیکن اُس کے شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ مالک مکان سے یہ کمرہ کرایہ پر مانگنے چلے آتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا۔ پھر وہ شیو بناتا، غسل کرتا اور کپڑے پہن کر سیڑھیوں سے اُتر کر ساتھ کے پان فروش سے سگریٹ کی ایک ڈبیا اور ایک پان خریدتا اور ہیرامنڈی کے ایک ہوٹل "بسم اللہ" کا رُخ کرتا۔ رستے میں اُس کے ایک ہندو پروفیسر کے بھائی کی دوکان تھی۔ وہ اس ہندو حلوائی سے اکنی کا بند اور پانچ پیسے کی مکھن کی ٹکیہ خریدتا اور بسم اللہ ہوٹل میں پہنچ کر ایک سپیشل چائے کا آرڈر دیتا۔ یہ چائے دودھ، چائے کے رس اور چینی کو ملا کر ایک ہی ساتھ بنائی گئی ہوتی۔

لاکھ آندھی آئی، موسلا دھار بارش ہوئی، لام لگ گئی، خاکساروں پر گولی چلی، فسادات ہوئے۔ لیکن شبلی بی کام کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ اپنے اس روزمرہ پر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک عمل پیرا رہا۔

"بسم اللہ ہوٹل" سے نکل کر وہ تحصیل بازار کی راہ لیتا۔ یہاں "عالمگیر" اور "خیام" کا دفتر تھا۔ بشرطیکہ اُسے دفتر کہا جا سکے کیونکہ میرے خیال میں اُسے دفتر کی بجائے کباڑ خانہ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ جگہ انتہائی تنگ، ڈربے ڈربے سے اور سب سے زیادہ مصیبت عالمگیر پریس کی گڑگڑاہٹ۔ "سید مٹھا بازار" سے "تحصیل بازار" کی طرف چلیں تو اس بازار کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مسجد کے ساتھ ایک بڑا سا پھاٹک ہے اس پھاٹک سے داخل ہوں تو دو بڑی سی مشینیں نظر آتی تھیں۔ یہ مشینیں پہلی جنگ عظیم کا ماڈل تھیں۔ اس لئے پوری قوت سے چیختی چلاتی رہتی تھیں اُن کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں حافظ محمد عالم مرحوم ایک لمبے بازوؤں والی گہری آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک میز کرسی شبلی بی کام کے لئے مخصوص تھی۔ دوسری میز ایجنسی کلرک کے سپرد تھی۔ تیسری میز اشتہارات کے زیر استعمال تھی۔ چوتھی میز پر ایک کلرک بیٹھتا تھا اور پانچویں میز ایک ٹائپسٹ کو دے دی گئی تھی۔ میں آج بھی اُس چھوٹے سے کمرے کا تصور کرتا ہوں تو "بلیک ہول" کے واقعہ پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس قدر تنگ و تاریک کمرے میں اتنے لوگ، اتنی میزیں اور اتنی کرسیاں کس طرح سما جاتی تھیں۔ پھر ملاقاتی بھی تو ہوتے تھے اور حافظ صاحب سے کاروبار کرنے والے لوگ اس پر مستزاد!

اس کمرے کی ایک چھوٹی سی واحد کھڑکی سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ جہاں پانچ سات منٹ کے بعد ایک آدھ پھیری والا ضرور ہانک لگا کر گزرتا تھا۔ دال مرمرے —— کھیلاں گجک —— نان کباب —— آلو چھولے —— کتابوں رسالوں کی ردی —— پرانی بوتلیں —— منجی پیڑھی ٹھکوا لو۔

ـــــ ہر نوع کی ہانکیں سُننے میں آتیں ـــــ پریس کی کرب آلود پکار ـــــ حافظ مرحوم کے وقتاً فوقتاً بلند ہوتے نعرے ـــــ " رحمدار کہاں ہو؟ ـــــ بھئی ادھر آؤ ـــــ چار سیر آم لاؤ۔ نہایت اعلیٰ، نہایت نفیس، نہایت میٹھے، نہایت عمدہ، نہایت اچھے ہوں۔" لیکن ان سب باتوں کا شاید ـــــ شبلی بی کام پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ صبح سے شام تک اسی پریس میں کام کرتا۔ اسی شور و غل کے مچھلی بازار میں مسلسل دس برس تک شبلی بی کام نے تخلیقی کام کئے، اور کسی ایک بار بھی اُس کے قلم نے ٹھکنے کا نام نہ لیا۔ ایک دفعہ اُس نے " شاعر آگرہ " میں " میں اڈیٹر ہوں " کے عنوان سے لکھا تھا کہ جب تک مشینوں کے پہیئے گڑگڑاتے ہیں، گراریاں گھومتی ہیں، سولر پھرتے ہیں اور پٹہ چلتا ہے۔ اُس کا قلم بھی کاغذ کی سطح پر جولانیاں دکھاتا ہے۔ لیکن جونہی مشینیں ٹھہر جائیں اُس کا قلم بھی تھم جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمین نے اپنے محور کے گرد گھومنا چھوڑ دیا ہے، جیسے گنبدِ افلاک کی گردش رُک گئی ہے، جیسے اس کے ذہن پہ تاریکی سی چھا گئی ہے اور اب وہ اپنے ذہن سے کام نہیں لے سکتا، اپنے خیالات کی دُنیا نہیں سنوار سکتا۔

شبلی بی کام مسلسل دس برس تک ہنگاموں کی اسی دُنیا اور گڑگڑاہٹ کے اسی عالم میں بیٹھ کر ہفت روزہ " خیام " اور ماہنامہ " عالمگیر " کو ایڈٹ کرتا رہا۔ ان دونوں جریدوں کا شمار اُس وقت کے معیاری اور کثیر الاشاعت جرائد میں ہوتا تھا۔ اور ان کا ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی ضخیم خاص نمبر شائع ہوتا رہتا تھا۔ وہ ان پرچوں کا تن تنہا چیف ایڈیٹر، مینجنگ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر تھا۔ وہ کام کی فراوانی کے باوجود اپنے فرائض کو جس خوش اسلوبی سے نبھاتا رہا وہ دنیائے ادب و صحافت میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ لوگ اُسے " ادبی اور صحافتی جن " کہا کرتے تھے۔ غالباً اسی تن دہی سے متاثر ہو کر نیاز فتحپوری نے ایک دفعہ اُسے لکھا تھا۔

" اگر تمہاری طرح کا محنتی آدمی مجھے مل جائے تو میں نگار اُس کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو جاؤں۔" اسی زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے اُس کے کسی مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کلیم میں یہ رائے ظاہر کی کہ

" محنت و جانفشانی اور عرق ریزی اس کا نام ہے۔"

اسی دور میں اُس نے عالمگیر کے صفحات پر بیس بائیس صفحات کا ایک مقالہ " لاشعور اور اُس کی زندگی اور ادب پر اثر " لکھا تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا۔

" آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں نے اتنی کتابیں نہیں پڑھیں۔"

اس مقالہ پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ مولانا عبدالستار صدیقی، عندلیب شادانی، برجموہن دتاتریہ کیفی، محی الدین زور قادری اور بے شمار دوسرے علماء و فضلا نے جو خراجِ تحسین اُسے ادا کیا وہ خطوط میں نے بھی دیکھے ہیں اور " عالمگیر " میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

وہ اسی پریس میں بیٹھ کر " حرف و حکایت " کے عنوان سے جواہر ریزے بکھیرتا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کے کئی کئی سو صفحات کے ناول بھی اسی پریس کی نمناک اور دھندلی فضاؤں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔

سورج ڈھلے شبلی پریس سے نکلتا اور اخبار رسالوں کا پلندہ بغل میں داب کر سیدھا لوہاری دروازے کی طرف ہو لیتا۔ وہاں اُردو اکیڈیمی میں بیٹھ جاتا۔ سامنے کے ہوٹل سے چائے کا ہاف سیٹ آتا اور وہ چائے کی پہلی پیالی کے ساتھ ہی تازہ دم ہو جاتا۔ اُس کے دوست احباب بھی یہیں آجاتے اور یا تو رات گئے تک یہیں گپ شپ گرم رہتی یا وہ دو تین دوستوں کے ہمراہ انارکلی سے مال روڈ کا چکر کاٹتا اور بھاٹی دروازے کے رستے واپس عالمگیر پریس میں پہنچ جاتا۔

اسی زمانہ میں احمد ندیم قاسمی نے اُس کی سیروں کا حال سُن کر اُسے لکھا تھا کہ سُنا ہے آپ پرے کے پرے باندھے انارکلی بازار میں نکلتے ہیں عالمگیر پریس میں " میس " کا انتظام تھا۔ ایک کاتب کھانا تیار کر دیتا اور وہ پریس کی چھت پہ بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ چائے پیتا۔ کھُری چارپائی پر لیٹ کر ایک آدھ سگریٹ کے کش لگاتا اور پھر رات کے نو بجے اُسی ڈربہ نما کمرہ میں آجاتا۔ سیڑھیوں میں داخل ہوتا تو سب سے پہلے سیڑھیوں کا دروازہ بند کرتا۔

پھر اُوپر پہنچکر کمرے کے تمام کواڑوں کو چٹخنی لگا دیتا۔ دراصل یہ وقت اُس کے مطالعہ کا ہوتا۔ اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ نو بجے رات کے بعد اُس کے کسی عزیز ترین دوست کو بھی اُس کی ضرورت محسوس ہوا اور وہ اُس کے کمرے پر جا کر لاکھ آوازیں دے۔ اُسے پکارے دروازہ کھٹکھٹائے لیکن وہ سب کے جواب میں چپ سادھے رہتا۔ حتیٰ کہ اُس کا دوست مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔ اس وقت وہ "حرف و حکایت" "فکر و نظر" اور "ذکر و فکر" کا مواد تیار کرتا یا بیرونی رسائل کے لئے مضمون لکھتا۔ اُس نے ناول اور افسانوں کی بیشتر کتابیں بھی اسی وقت میں لکھی ہیں۔

میرے علاوہ احسان بی اے اور میرزا ادیب کا بھی اُس کے ہاں آنا جانا تھا۔ اس لئے ہمیں ایسے وقت میں بھی اُس سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میرزا ادیب نے اپنے ایک افسانے "عبدالرحمٰن" کا مواد شبلی کے اس کمرے سے لیا تھا اور عبدالرحمٰن دراصل عبدالرحیم شبلی کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس افسانے کے آخری حصہ میں میرزا ادیب ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ لیکن ماحول نگاری میں ان کا یہ افسانہ بڑا کامیاب ہے۔ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

"گرمیوں کے دنوں میں مچھروں کے حملے سے بچنے کے لئے وہ پاؤں کو کسی چادر میں چھپا لیتا اور اگر موسم سرما ہوتا تو اوور کوٹ میں لپٹا لپٹایا دیوار سے سہارا لگائے کسی کتاب کا مطالعہ کرتا، لکھتا اور ساتھ ہی ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگاتا رہتا۔"

اس وقت دیوار سے سہارا لگا کر سوال اِنک چارپائی پر رکھی رہتی۔ سیاہی کی بوتل اکثر چارپائی پر اُلٹ جاتی۔ چادر سیاہی سے تربتر ہو جاتی لیکن وہ افسوس نہ کرتا بلکہ ہنس پڑتا کیونکہ اس کے بجٹ میں ہر ماہ ایسی آٹھ دواتوں کی رقم مخصوص رکھی جاتی تھی۔

ایک بجے رات تک وہ فکر و مطالعہ میں کھویا رہتا۔ پھر جب ایک بجے جب بازار میں ہنگامہ ختم ہو جاتا۔ پان فروش پتیلی سے منہ دھا ہوا تختہ مانجھنے لگ جاتا۔ دودھ دہی والا کونڈے صاف کر کے ایک طرف رکھ دیتا اور کڑاہی رگڑ رگڑ کر صاف کرتا اور بازار کے تمام ریڈیو اپنی ریکارڈنگ ختم کر دیتے تو شبلی بی کام چپ چاپ نیند کے آغوش میں جا سمٹتا۔

برابر بیس برس تک اُس کا یہی پروگرام رہا۔ اُسے دُنیا کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کی مجردانہ زندگی اسی ڈگر پر بسر ہوتی رہی۔ اُس کے بیوی بچے تھے ہی نہیں کہ گھریلو اُلجھنوں کے حل کی فکر ہوتی۔ شادی کے متعلق اُس کے خیالات عجیب ہیں میرزا ادیب نے لکھا ہے کہ

"اس کی ذہنی تخلیقات کے مداح ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکے تھے۔ وہ اسے بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ اگرچہ دو تین دوست اس کے بہت قریب تھے اور اس کے معمولاتِ حیات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اکثر حیران ہو کر یہ سوچنے لگتے تھے کہ اپنی بے پناہ قابلیت کے باوجود یہ شخص اپنی زندگی کے معیار کو بلند کیوں نہیں کرتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی نگاہوں میں دولت کی کوئی وقعت نہیں تھی اور عورت کے تصور نے اس کی زندگی کی سرد فضا کو ابھی چھُوا تک بھی نہیں تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا نظریہ عجیب و غریب تھا۔ جب کبھی گفتگو میں شادی کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ مسکرا کر کہتا "میں شادی صرف اس لئے کروں گا کہ میرے گھر میں ایک عورت ہر صبح میرے لئے چائے کی گرم گرم پیالیاں بنا دیا کرے اور جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر آؤں تو میرے لئے کھانا بالکل تیار موجود ہو۔"

اس کے موڈ کی ایک بات یاد آ گئی۔ قیام پاکستان سے قبل میں لاہور سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا شبلی سے ذکر ہوا تو اُس نے ایک ریستوران میں جو خاکہ بنا کر مجھے دیا تھا۔ وہ یہ تھا۔

ماہنامہ ندیم لاہور ـــــ ایڈیٹر قمر تسکین

ایڈیٹوریل ـــــ پڑھنے والے بھائیو! میں نہ تو ادیب ہوں، نہ شاعر! ایک معمولی ایڈیٹر ہوں جس کا کام نوآموز لڑکوں سے تحریریں چھیننا اور اُن کو ٹھیک ٹھاک کر کے شائع کر دینا ہے۔

ماہنامہ ندیم کا پہلا شمارہ ایک طویل ہیر پھیر کے بعد پیش کر رہا ہوں۔ اگر آپ اس کی سرپرستی قبول فرمائیں تو آپ بڑے اچھے آدمی ثابت ہونگے

اور میری روٹی پانی کا بندوبست ہو جائے گا — آداب عرض ۔ قمر تسکین

پہلا افسانہ

وہ ایک لڑکی پر عاشق ہوا لیکن لڑکی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔

ڈراما

"تم"!

"ہاں میں!"

معاف کیجئے ۔ میری نظر کو دھوکہ ہوا

نظم

یہ صبح کا وقت اور یہ راوی کا کنارا
اب کیا ہے نہانے کے سوا درد کا چارا!

مزاحی گیت

مورے ڈھنڈیا میں
جو بنے ناچت رہے

نفسیات

ادیب اس لئے لکھتا ہے کہ اس کی ماں نے اُس کا دودھ چھڑا کر اُسے ذہنی صدمہ پہنچایا

ریڈیو

"وحشیات" اس دور کی مایۂ ناز تصنیف ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں مغز نام کو بھی نہیں ۔ بس چھلکا ہی چھلکا ہے۔

جب وہ موڈ میں ہو تو سینکڑوں لطیفوں چٹکلوں اور حکایتوں سے پوری محفل کو کشتِ زعفران بنا کر رکھ دیتا ہے ۔ خوب ہنسنا اور خوب ہنساتا ہے ۔ اس کے احباب اس کے قریب بیٹھ کر اپنی ہر پریشانی کو بھول جاتے ہیں ۔ لیکن اگر وہ کام میں مصروف ہو تو اُس سے بڑھ کر خشک مزاج انسان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے ۔ پروفیسر اختر اورینوی پٹنہ سے آئے تو لاہور میں ایک آدھ دن کے لئے ٹھہر گئے میں اور میرزا ادیب اُنہیں شبلی بی کام سے ملانے عالمگیر پریس لے گئے ۔ شبلی دیوار کی طرف منہ کئے کاغذوں پر جھکا "خاص نمبر عالمگیر" کے کام میں مصروف تھا ۔ ہم تینوں اُس کے عقب میں جا کھڑے ہو گئے اور میں نے شبلی کو متوجہ کرتے ہوئے تعارف کرایا — "آپ ہیں اختر اورینوی صاحب" ۔ شبلی نے منہ پھیرے بغیر اپنا ہاتھ عقب کی طرف بڑھایا ۔ اختر اورینوی اور اس کا ہاتھ مل گئے ۔ ایک منٹ ، دو تین اور چار منٹ گزر گئے ۔ شبلی پروف پڑھنے میں مصروف رہا اور منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا ۔ چنانچہ ہم تینوں "اسلام علیکم" کہہ کر پریس کی گڑگڑاہٹ سے نجات پا آئے ۔ تمام راہ میں اور میرزا ادیب انتہائی شرمندگی کے عالم میں قدم اُٹھاتے رہے ۔ بیچارے اختر اور میری خاموش رہے اور اپنی منزل پر ہم سے جدا ہو گئے ۔ واپسی پر ہمارے مابین شبلی کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی ۔

شبلی بی کام کی زندگی کے اس عجیب و غریب اسلوب نے اُسے ایک افسانوی کردار بنا کر رکھ دیا ہے ۔ چنانچہ اختر اورینوی نے پٹنہ پہنچ کر "انار کلی اور بھول بھلیاں" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ۔ یہ افسانہ شبلی کے گرد گھومتا ہے ۔ اس افسانے کی اُٹھان بہترین ہے لیکن کلائمکس خلافِ واقعہ ہے ۔ میرزا ادیب نے بھی اپنے افسانے "عبدالرحمٰن" میں کھوج لگانے کی کوشش کی کہ شبلی بی کام کی تفریح کا انحصار کس چیز پر ہے ۔ اختر اورینوی کا خیال ہے کہ شام کے وقت اُس نے انار کلی سے کھلونا خریدا اور اسی میں لذت محسوس کر کے مطمئن ہو گیا — میرزا ادیب اپنے افسانے میں اچانک ایک روز اُس کے کمرے میں تبدیلی دیکھتا ہے ۔ نیلے پردے ، کرسی ، میز وغیرہ دیکھ کر کچھ اندازے لگاتا ہے ۔

لیکن میری رائے میں یہ دونوں حضرات تہ تک نہیں پہنچ سکے ۔ شبلی کی تفریح کے اسرار کی گتھی اُن سے نہیں کھل سکی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس معمّا کو نہیں سمجھ سکا ۔ اس زمانہ میں شبلی کے گھر پر کس مپرسی کا عالم تھا ۔ اس لئے وہ کسی کو اپنے گھر کا پتہ نہ بتاتا تھا ۔ اس کے کمرے کا نقشہ میرزا ادیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ۔

"کمرے کی ہر چیز فرسودہ ، بے جان اور بے روح تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا زندگی کی حرارت نے اس تنگ و تاریک اور محدود دُنیا میں کبھی سانس لیا ہی نہیں ہے ۔ جس وقت وہ کمرے میں موجود ہوتا تو کبھی کبھی پُرسکوت فضا میں چلنے پھرنے یا برتن اُٹھانے اور رکھنے سے ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی ۔ مگر چند لمحوں کے بعد ہی یہ لرزش اس طرح غائب ہو جاتی جیسے کسی جھیل کی کائی جمی سطح پر پتھر گرنے سے اضطراب کے ہلکے سے

آثار پیدا ہو کر آناً فاناً ایک اُبھرتے ہوئے دائرے میں ڈوب جائیں۔ اس کی زندگی کے ہزاروں دن اور ہزاروں راتیں اس ویران کمرے میں گزر چکی تھیں۔ مگر اس کی حالت آج بھی وہی تھی جو آج سے سات برس پیشتر تھی۔ سات سال کی لمبی مدت اس نے اس کمرے میں اس طرح گزاری تھی جیسے وقتی طور پر ایک سرائے میں قیام کر رہا ہو۔ چائے پینے کام کرنے اور سونے کے علاوہ اسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔"

تقسیم سے کچھ عرصہ قبل حافظ محمد عالم کی بیماری کے دوران میں شبلی میں کچھ بیزاری سی پیدا ہوئی۔ شاید وہ مسلسل دس سال تک ایک ہی جگہ کام کرتا کرتا تھک گیا تھا۔ اُس نے کمپنی بدلی اور ہفتہ وار، ماہوار رسالوں کو چھوڑ کر روزناموں کی دُنیا میں چلا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی شبلی بی کام کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سید مٹھا بازار والا چوبارہ تو فسادات کی نذر ہو گیا اور تقسیم کے بعد وہ مہاجر بن کر اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آیا تھا۔ اُس نے نئی انارکلی میں دو تین کمرے الاٹ کرائے ہیں لیکن یہاں بھی اُس کے حصّہ میں صرف ایک ہی کمرہ آسکا ہے۔ اُس کے گھر میں اگرچہ اب بھی بیوی نہیں ہے تاہم ماں باپ موجود ہیں۔ اس کے باوجود وہ صبح سویرے اُٹھتا ہے۔ شیو بناتا، نہاتا دھوتا اور ناشتہ سے فارغ ہو کر تانگے کر سیدھا دفتر پہنچتا ہے۔ پہلے وہ اپنے دفتر کا کام ختم کرکے دو بجے کے بعد رسالہ "فلم لائٹ" کے دفتر میں محفل احباب جماتا تھا۔ اب رسالہ ڈائرکٹر کے دفتر میں بیٹھتا ہے۔ اُسے فلموں سے دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک فیصد بھی "فلمی آدمی" نہیں۔ اُسے تو محض ان فلمی دفتروں کے اُن گدّوں سے دلچسپی ہے جو اُس کے تھکے ہارے جسم کو چند گھنٹوں کے لئے آسودگی دیتے ہیں۔ فلم لائٹ کے دفتر کا صوفہ اُس کی بے پروائی کے باعث جل گیا تو وہ رسالہ ڈائرکٹر کے دفتر میں اُٹھ آیا۔ یہاں سے اُکتائے گا تو کسی اور ایسی جگہ جہاں اُس کے بقول پیشاب کرنے کی جگہ ہو، پنکھا ہو، ایک صوفہ سیٹ ہو اور چائے منگوائی جا سکے، چلا جائے گا اور اُسی دفتر میں ہر روز اپنی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر چائے منگوائے گا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے سب لوگوں، سب ملاقاتیوں اور سب دوستوں کو چائے پلائے گا۔ کوئی کھانا کھانا چاہے تو اُسے کھانا کھلانے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔

وہ کہا کرتا ہے۔ "میں چاہتا ہوں کہ نیوزی لینڈ چلا جاؤں، سمندر کے کنارے کسی سرسبز و شاداب تختہ پہ لیٹ رہوں۔ لیٹا رہوں۔ حتیٰ کہ کئی صبحیں طلوع ہوں اور شامیں غروب ہو جائیں" ——— دراصل اس کا جسم تھک چکا ہے لیکن تعجب ہے کہ اُس کا ذہن ابھی تک نہیں تھکا۔ اس میں ایک لاوا سا سلگ رہا ہے۔ جس کی چنگاریاں اُس کی تحریروں میں اُڑتی رہتی ہیں۔ تقسیم کے بعد سے وہ روزانہ اخباروں میں چیف ایڈیٹری کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ وہ اداریئے لکھتا ہے۔ کئی ملک گیر تحریکیں چلا چکا ہے۔ کئی وزارتوں کو اُلٹ چکا ہے۔ عوام کے ان گنت مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد میں کئی نمونوں کے بخیئے اُدھیڑ چکا ہے۔ لیکن وہ ایک عجیب کردار ہے جسے سچی بات ہے میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔

اُس کی بہترین تفریح ہوٹل میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھنا ہے۔ جہاں اُسے اک ذرا چھیڑ دیا جائے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اُس کا تجربہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ گزشتہ پچیس برس سے بے شمار سیاسی، ادبی اور مذہبی تحریکوں کا عروج و زوال دیکھ چکا ہے اس لئے معاشرے کا ایک مزاج بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے ادب اور صحافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ باتیں بڑے پتے کی کہتا ہے اور اس حد تک بے باک ہے کہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ وہ ناشروں کے بھی خلاف ہے اور مصنفوں کے بھی، سیاستدانوں کے بھی اور ——— سب کے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خدا اور انبیاء اولیا بھی اُس کی زد میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ بایں ہمہ اُس کی گفتگو بے معنی اور بے تکی نہیں ہوتی۔ انداز خواہ کچھ ہو۔ اُس میں علمیت کا رنگ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً وہ حسرتؔ، سالکؔ اور سلیمان ندوی کو کوسنے بیٹھے گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے گا کہ حسرتؔ صاحب نے فلاں تاریخ کا مادّہ غلط نکالا ہے اور فلاں کتاب کا نام غلط لیا ہے۔ سالکؔ صاحب نے قصہ چہار درویش کا کردار الف لیلہ کے سر منڈھ دیا ہے۔ سلیمان ندوی نے مستشرقین کی کتابیں ترجمہ کرا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہیں۔ لیکن وہ عمر خیام کی تاریخ پیدائش متعین نہیں کر سکے۔ حالانکہ گوسوامی نے نجوم کی رُو سے منٹ اور سیکنڈ بھی بتا دیئے ہیں۔ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور وہ پتے کی باتیں کہتا ہے اب انکار کون

کرے؟ بُرا مانے بھی تو تدارک کس طرح ہو؟

وہ Idealist (آئیڈیالسٹ) ہے اور اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ شاید اسی لئے صبح سے رات کے دس بجے تک اخباروں اور رسالوں کے دفتروں میں ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ سکون مانگ رہا ہے۔ کیا وہ اپنے آئیڈیل کو پالے گا؟ کیا اُسے سکون میسر آسکے گا؟

میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ آرٹ کی بلندیوں پہ پرواز کرتا ہے۔ لیکن زندگی کے آرٹ سے آگاہ نہیں۔ وہ ایک "حقیقت پسند" دنیا میں "عینیت" کی تلاش میں سرگرداں ہے —— اُس کی حالت قابلِ رحم ہے ——!

اُس کے والد اور والدہ دونوں نثر نگار تھے۔ اس لئے جب شبلی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اس کے اردگرد اخباروں اور کتابوں کے انبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا مضمون دس برس کی عمر میں بچوں کے اخبار "پھول" میں شائع ہوا۔ اس زمانہ میں وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نویں جماعت سے شبلی بی کام نے انگریزی میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ اُس کا سب سے پہلا مضمون پندرہ روزہ "سن رائیز" میں شائع ہوا۔ سکول کے زمانہ میں اس نے زیادہ تر وہی کچھ لکھا جو پڑھنے یا سننے میں آیا تھا۔ لیکن عبدالرحیم میں جو شبلی چھپا بیٹھا تھا وہ سب سے پہلے ٹیکسلا کے کھنڈروں میں گھومتے وقت بیدار ہوا۔ اُسے ویرانے خاص طور پر پسند ہیں۔ ویرانوں میں وہ صرف اُجڑے ہوئے دیار شامل نہیں کرتا بلکہ سنسان پہاڑ بھی شامل کرتا ہے۔ اُسے آبادیوں میں رہنے سے اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ کے دامنوں میں گنگناتی ہوئی ندیوں اور آبشاروں کی خاموش موسیقیوں میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ اس کے احساسات اس وقت بیدار ہوئے جب وہ ڈلہوزی کی "پانچ پلی ندی" کے کنارے بیٹھ کر قدرت کے پُرکیف نظاروں کی اتھاہ میں کھو گیا۔

بی کام اس کے نام کا جزو بن چکا ہے۔ جسے کوشش کے باوجود وہ آج تک علٰحدہ نہیں کر سکا۔ حتیٰ کہ اب تعارف کے وقت بھی لوگ پوچھتے ہیں۔ کون شبلی؟ شبلی بی کام! —— تو مجبوراً اسے اثبات میں سر ہلانا پڑتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ اپنے مضامین پر شبلی بی کام کے بجائے عبدالرحیم شبلی لکھ دیا ہے اور یہ مضامین جب اس کے دوستوں کی نظر سے گزرے تو اُنہوں نے پڑھ کر کہا —— "اچھا تو آپ تھے۔ ہم نے سمجھا۔ وہ کوئی اور شبلی ہوگا۔" اس نے اپنے نام کے ساتھ بی کام لکھنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن بدقسمتی سے بعض ایڈیٹروں نے اس کے پتہ میں سے یہ الفاظ نکال کر نام کے ساتھ نتھی کر دیئے۔ شروع شروع میں ایڈیٹروں نے غالباً مولانا شبلی مرحوم سے عبدالرحیم شبلی کو علٰحدہ شخصیت ظاہر کرنے کے لئے ڈگری کو نام سے نتھی کیا تھا اور بعد میں یہ ایک ایسا جزو بن گیا جسے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اُس کے خاندان میں یہ رواج ہے کہ ہر شخص کا ایک تخلص رکھ دیا جاتا ہے۔ عام اس کے کہ وہ شاعر ہو یا نہ ہو اُس کا تخلص بھی اُس کی والدہ محترمہ نے اس کے پیدا ہوتے ہی تجویز کیا تھا۔ غالباً اُس وقت مولانا شبلی نعمانی نئے نئے فوت ہوئے تھے اور اُن کے ادیبانہ کارناموں کی گونج ابھی تک فضا میں باقی تھی۔ اس لئے ممکن ہے اُس کی والدہ نے یہ خیال کیا ہو کہ شاید یہ لڑکا بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے اور عجب نہیں کہ اُن کی طرح شاعر ہی نکلے۔ اس لئے یہ تخلص (شبلی) اس پہ ٹھونس دیا گیا۔ تاہم اس میں شعر و شاعری کا فطری ذوق موجود ہے جو کبھی کبھی معاشیات کی ٹھوس تعلیم کے باوجود اُبھرتا رہتا ہے اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے جب یہ کلام موزوں کی صورت میں ڈھل گیا تاہم اس کے نام سے جتنی بھی غزلیں یا نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ ان کو اپنے ادب میں شامل کرنے کو تیار نہیں ہے۔

سانولی رنگت، لمبے بالوں، ستواں ناک اور موٹی موٹی آنکھوں والا انتالیس[۳۹] سالہ سیّد عبدالرحیم ہاشمی (شبلی بی کام) دوستوں کی محفل میں بے باکی کے ساتھ قہقہے لگاتا، ہنستا اور سگریٹ پھونکتا ہوا جب معلمانہ انداز اختیار کر لیتا ہے تو بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ معلمانہ انداز چھوٹے بڑے تمام ادیبوں کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے کسی دوست اور کسی ملاقاتی کو نہیں چھوڑتا۔ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ ادیبوں کے دکھ درد سے

بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا مستقبل بھی ان ہی سے وابستہ ہے۔ صرف اسی کا نہیں بلکہ اُردو سمیت تمام زبان کے تمام ادیبوں کا۔ اسی لئے وہ ایک ادیب کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا احساس کرتا ہے۔ اس کے دل میں خلوص ہے اور جب وہ انتہائی خلوص سے کسی ادیب کو چھوٹے اور معمولی مسائل سے لے کر بڑے اور دقیق مسائل کے بارے میں سمجھا رہا ہو تو اس کا یہ انداز بالکل معلّمانہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے اپنے اس مضمون میں شبلی بی کام کی کمزوریاں نہیں گنوائیں۔ اس لئے کہ میں اس کا دیرینہ دوست ہوں اور مجھے اس میں خوبیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اس کی شخصیت بڑی پیاری، بڑی حسین اور بڑی عجیب وغریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ "عجیب وغریب" کا لفظ قدرے وضاحت طلب ہے ——!

شبلی بی کام جب بولنے پر آتا ہے تو اپنے مخصوص انداز میں اپنی عینک کے دائروں سے اپنی شعلہ بار آنکھیں نچا نچا کر بولے چلا جاتا ہے اس وقت اُسے آپ کسی ناراضی، ندامت، آزردگی، مصروفیت غرضیکہ کسی شے کی پروا نہ ہوگی اور اُس کے دلائل کا سلسلہ اس وقت رکے گا جب آپ اپنی مکمل شکست کا اعلان کردیں گے۔

آپ اپنے کسی ذاتی مسئلہ پر اُس سے انتہائی ضروری مشورہ کر رہے ہوں گے تو وہ اچانک اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے فضا میں کچھ لکھنے لگے گا اور آپ کے مسئلہ پر قطعی توجہ نہ دے گا۔ اس وقت بھی اُسے آپ کسی ناراضی، آپ کے جذبات و احساسات غرضیکہ آپ کا بالکل خیال نہ ہوگا!

اگر وہ مُوڈ میں ہوگا تو آپ کو ہلکے سے اشارے پر دو چار سو روپے تک ادھار دینے سے دریغ نہ کرے گا اور اس کے ذہن میں ان روپوں کو واپس لینے کا خیال تک نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ کی جان پر بن آئے اور آپ اُس کے سامنے ایک آدھ روپے کے لئے دست سوال دراز کریں۔ وہ موڈ میں نہ ہو تو آپ کی کسی بات سے متاثر نہ ہوگا اور ایک پھوٹی کوڑی بھی جیب سے نہ نکالے گا۔

وہ مال، لارنس، میکلوڈ اور انار کلی میں اس قلندرانہ شان سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے کہ کسی روزانہ اخبار کے چیف ایڈیٹر کے بجائے کسی دفتر کا معمولی سا کلرک نظر آتا ہے۔

آج کی مادی دُنیا میں وہ ہر بڑے آدمی، ہر ظالم، ہر وزیر امیر سے نفرت کرتا ہے حتّٰی کہ ان کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہر بے حیثیت آدمی، ہر مظلوم، ہر نتھو خیرے اور ہر غریب کے گلے میں باہیں ڈال کر گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔

جس کام میں مالی فائدہ ہو۔ اُسے ٹالتا رہتا ہے حتّٰی کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کے ان گنت کام بھی کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی جیب سے دشمنی کرنے سے بھی نہیں چُوکتا۔

ہر روز ایک نئی اسکیم بناتا ہے۔ اُس کے ذہن میں ہزاروں، لاکھوں اسکیمیں تہ در تہ جمی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ آج تک کسی اسکیم کو بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ خود ہی کہا کرتا تھا کہ علم النجوم کی رو سے میں "کیکڑا" ہوں جو آگے بڑھتا بڑھتا عین منزل کے قریب پہنچ کر کچھ اس طرح پلٹ کر غائب ہو جاتا ہے کہ اُس کے ساتھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

یہ ہے شبلی بی کام! وہ عجیب وغریب کردار۔ جسے میں اب تک نہیں سمجھ سکا اور جو میرے خیال میں آج بھی طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

بدر الاسلام فضلی

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ اُن سے میری پہلی ملاقات آج سے تینتیس ۳۳ سال پیشتر حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے کتب خانے میں ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کتب خانے کی بڑی میز کے پاس ایک نہایت سنجیدہ جوان گہرے مطالعہ میں مصروف ہے۔ اور بار بار ایک کاغذ پر کچھ یادداشت لے رہا ہے چھریرا جسم ستا ہوا چہرہ، سیاہ داڑھی، سر کے بال باریک کٹے ہوئے۔ بدن پر ایک صاف مگر سادہ کرتا اور شرعی پاجامہ۔ یہ تھے شیخ محمد اسماعیل۔ اُن کی شخصیت میں جو چیز میرے نزدیک سب سے زیادہ جاذبِ توجہ تھی وہ اُن کا خلوص تھا، اُن کی حق گوئی، راستبازی اور نیک نیتی تھی۔

شیخ صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اُس میں تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ اُن کو نہ تو انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کا شوق ہے نہ اُن کو بہت عمدہ قسم کے لباس سے شغف ہے۔ اور نہ کھیل تماشوں میلوں اور دوسری تفریحات کی طرف میلان۔ اُنہوں نے غالباً عمر بھر سینما نہیں دیکھا۔ اور کسی قسم کا کھیل بھی نہیں کھیلا۔ عملی سیاست سے بھی وہ ہمیشہ علٰحدہ رہے۔ اُن سب چیزوں کو چھوڑ کر اُن کو ایک اور صرف ایک چیز سے عشق ہے۔ وہ ہے کتاب، مطالعہ، علمی تحقیق اور تصنیف و تالیف۔ ہم نے مطالعہ کے شوقین بہت دیکھے ہیں مگر اس لحاظ سے شیخ صاحب کی دھج نرالی ہے۔ اپنے لڑکپن کا ذکر شیخ صاحب نے بارہا کیا ہے۔ خود اُن کے قول کے مطابق وہ اُس زمانے میں رات کو دو ڈھائی بجے تک کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ والدین کی تاکید تھی کہ رات کو جلد سو جائیں اُن کے لحاظ سے مُنہ لحاف میں ڈھک لیتے اور لحاف کے اندر سرسوں کے تیل کا چراغ جلا کر مادے شیخ صاحب کتاب پڑھتے رہتے۔ گھر والے سمجھتے کہ سو رہے ہیں۔

شیخ صاحب نے ہمیشہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا اور ہمیشہ اچھی کتاب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک بے نظیر ذاتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ جو بیش بہا قلمی نسخوں اور نایاب مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ جس خوش اسلوبی سے شیخ صاحب اُس کو استعمال کرتے تھے بہت کم لوگ ذاتی کتب خانوں سے ایسا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اکثر شائقین علم اس کتب خانے کو دیکھنے کے لئے دُور دُور سے آتے تھے۔ یہ

کتب خانہ شیخ صاحب کی زندگی بھر کا عزیز ترین اور نہایت قیمتی سرمایہ تھا۔ افسوس ہے کہ یہ ۱۹۴۷ء کے انقلابات کی نذر ہو گیا۔ شیخ صاحب کی صحت پر اس کے ضائع ہو جانے کا بہت بُرا اثر پڑا ہے۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ ذاتی کتب خانوں کے مالک اپنی کتابوں کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیتے۔ مگر شیخ صاحب اس معاملہ میں بہت فیّاض رہے ہیں۔ اُن کے کتب خانے سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔

شیخ صاحب کی یادداشت نہایت عمدہ ہے۔ بعض اوقات اُن کی اس خوبی سے عجیب لطیفے رونما ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں سیّد محی الدین صاحب پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد نے اپنے کالج میں حالی سینٹنری (صدسالہ جشن ولادت) بڑے شان سے منائی تھی۔ شیخ صاحب اور میں حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے نمائندوں کی حیثیت سے وہاں مدعو تھے۔ مسٹر اکبر حیدری وزیر اعظم جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مولانا حالی پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران میں دفعتہً مولوی صاحب نے شیخ صاحب سے سوال کیا کہ مجالس النسا مولانا حالی نے کس سنہ میں لکھی تھی۔ شیخ صاحب اُس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ مگر بلا تامّل انہوں نے سوال کا جواب دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تمام حاضرین جلسہ کی نظریں شیخ صاحب پر پڑیں اور لوگ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو حالی کے متعلق ایسا یقینی علم رکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب بھی استفسار فرماتے ہیں۔ اور بھروسہ کرتے ہیں اور جن کو حالی کی لائف کے جزئیات گویا ازبر ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ حالی کی تحقیق پر شیخ صاحب نے ساری عمر جس قدر کاوش و کوشش کی ہے کسی دوسرے کو میسّر نہیں۔ اُنہوں نے اس قدر مواد اس موضوع پر جمع کیا ہے کہ اگر وہ لکھیں تو بہت آسانی سے ہزار صفحہ کی سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔ لائف لکھنے کی آرزو تو اب تک پوری نہ ہو سکی مگر شیخ صاحب نے مولانا حالی کے غیر مطبوعہ کلام اور کلیات کے کئی مجموعے مرتب اور شائع کئے ہیں۔ اُن کے علاوہ دو جلدیں مقالات حالی مرتب کئے۔ جن کو انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا۔ ایک مختصر سوانح حیات تذکرۂ حالی کے نام سے لکھی۔ اور بکثرت مضامین مختلف رسائل کے لئے لکھے۔

شیخ صاحب نے ملک کے موقر رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے کا سلسلہ پندرہ سال کی عمر سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ ان کے تعداد بتانا مشکل ہے۔ لیکن بعض تحقیقی مقالے واقعی قابل صد تحسین و آفرین ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ ان مضامین پر تحقیق کا کام آپ نے دس پندرہ سال تک کیا۔ یہ استقلال حیرت انگیز ہے۔ ایسا ہی ایک مقالہ "سنسکرت کے عربی و فارسی تراجم ہے۔" جس کو شیخ صاحب نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا۔ مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی فرمایا کرتے تھے کہ اس مضمون کو دیکھ کر میں فخر کرتا ہوں کہ میرے اہلِ وطن میں ایک ایسا فاضل محقّق موجود ہے۔ میں نے بھی اس مقالے کا اُس وقت انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

شیخ صاحب کو میں نے کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ ذاتی تمتّع کے خاطر وہ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔ جن بڑے لوگوں سے اُن کا ملنا رہا وہ برابر کے درجے میں رہا۔ اپنی رائے کے اظہار میں اُن کو ہمیشہ بے باک پایا۔ مگر اس کے ساتھ وہ دوسروں کی رائے کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ بے حد خلیق متواضع اور ملنسار انسان ہیں۔ شیخی۔ ریاکاری۔ تصنّع سے اُن کو دور کا واسطہ نہیں۔ دوستوں کے مخلص اور ہمدرد دوست ہیں۔ اعزّہ و اقارب کے ساتھ اُن کا سلوک ایسا ہے کہ ان کی شکایت کسی سے سننے میں نہیں آئی یہ بڑی بات ہے۔

اُن کی صحبت کا رنگ خالص علمی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے مجھے پانی پت میں سالہا سال تک اُن کی گفتگو سے لُطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ایک عرصے تک یہ معمول رہا کہ ہم دونوں علی الصباح سیر کے لئے جاتے اور دو گھنٹے تک علمی باتوں پر گفتگو کرتے رہتے یہ لُطف میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور اب بھی یہ تمنّا دل میں موجود ہے کہ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آئے۔

شیخ صاحب غالباً ۱۸۹۳ء میں دہلی کے قریب ایک گاؤں پالی میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ اپنے اسی آبائی مکان واقع پانی پت میں بسر کیا یہ مکان محلہ انصار میں اُس مکان کی پشت پر تھا۔ جس میں مولینا حالی پیدا ہوئے تھے۔ نیچے کے مکان میں وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ اوپر کی منزل

شیخ صاحب کا کتب خانہ تھا۔ دن بھر اسی جگہ بیٹھے تصنیف و تالیف و تحقیق کے دل پسند مشغلہ میں محو رہتے تھے

بچپن دہلی میں گزرا جہاں ان کے والد بسلسلہ کاروبار رہا کرتے تھے۔ عنفوان شباب میں پانی پت آ گئے۔ کچھ عرصہ تک حالی مسلم ہائی اسکول کے کتب خانہ میں لائبریرین رہے۔ اسی زمانے میں یہ بھوپال اور پھر حیدر آباد پہنچے۔ ..... ١٩٣٢ء میں ان کا انتخاب ہفت روزہ "عروج" کے ایڈیٹر کے حیثیت سے ہوا۔ جو ضلع جھنگ کا سرکاری اخبار تھا۔ مگر وطن کی محبت نے کچھ ایسا مجبور کیا کہ ڈھائی سال بعد ہی استعفیٰ دے کر پانی پت واپس آ گئے۔ دو سال تک "پیغامِ حیات" کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالتے رہتے لیکن بعض وجوہ سے اس کو بھی بند کرنا پڑا۔ ١٩٤٧ء سے وہ مسلسل لاہور میں مقیم ہیں۔ اور اُن کا محبوب مشغلہ تالیف و تصنیف برابر جاری ہے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد اس قدر ہے کہ اُن سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

شیخ صاحب اگرچہ بہت سنجیدہ آدمی ہیں۔ لیکن اُن کی طبیعت میں برجستہ مزاح کی بھی بہت عمدہ صلاحیت ہے۔

ایک بار اُن کے ایک بے تکلف دوست اپنے جوان بیٹے کی شکایت کرنے لگے۔ اُن کے دوست کا نام محمد نوح تھا۔ شیخ صاحب نے ہمدردی کرتے ہوئے فرمایا۔ "کیا کیا جائے آخر پسرِ نوح ہے"

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ کسی دوسرے سے ملنے جاتے ہیں تو میز کے قریب بیٹھ کر میز کی چیزوں مثلاً پن کشن، پیپر ویٹ وغیرہ سے کھیلتے رہتے ہیں یا میز پر رکھے ہوئے خطوط ہی پڑھنے لگتے ہیں جو ایک قسم کی بدتہذیبی ہے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب بھی ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھوں تنگ آ گئے۔ اخلاق مانع تھا کہ اُن کو سختی سے روک دیں۔ اس موقعہ پر شیخ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت خوب تھا۔ وہ حضرت حسب عادت پھر آئے اور اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ شیخ صاحب نے میز کی دراز میں سے ایک خوبصورت گڑیا نکال کر اُن کے آگے رکھ دی۔ "لیجئے اس سے شوق فرمائیے"۔ دوسرے لوگ بے حد محظوظ ہوئے اور وہ خود ایسے کھسیانے ہوئے کہ پھر نہ لوٹے۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی طبیعت میں رنگا رنگی نہیں ہے اس کے باوجود وہ اچھے افسانے لکھنے میں کامیاب ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُن کے افسانوں کے کردار بالعموم تاریخی ہوتے ہیں۔

———

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

محمد عثمان

انسان فرشتہ ہے نہ شیطان۔ اس قول کی تصدیق ہو اور زندگی سے ہر پہلو کا ثبوت ہو ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی شخصیت سے بڑی ہو سکتی ہے اور اس کی طرح وہ جرات ہے کہ انہوں نے اگرچہ کم و بیش تیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور دو قرآن، دو اسلام اور ایک اسلامی ثقافت پر دینی کتابوں سے شہرت حاصل کی، مگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے اس شہرت اور اس تصنیف و تالیف کا اثر نہ اپنے ظاہر پر پڑنے دیا ہے اور نہ باطن پر۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ ایک سیدھے سادے آدمی ہیں اور وضع قطع وہی ہے، وہی بے تکلفی اور رکھ رکھاؤ، گویا خوش مذاقی، نارمل، سکول کے گمنام ٹیچر ہیں، یعنی کالج کے نہ ہو، یہ طلبہ میں بھی خصوصیت سے قائم ہے اور باطن پر یوں نہیں کہ ایک عام انسان میں اخلاق و کردار کی جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ڈاکٹر برق میں اپنی ڈاکٹری، ادیب، نقاد، مفسر اور محقق کے باوصف ان کا ایک معقول حصہ بہ تمام و کمال موجود ہے۔

ڈاکٹر برق کی ابتدائی زندگی اور تعلیم دونوں بے قاعدہ اور نا ہموار تھیں۔ ابھی تیسری جماعت میں تھے کہ والد کے پیر و مرشد نے سرکاری اسکول کی بجائے مسجد میں بھیجنے کا حکم سنا دیا۔ اس کے بعد غلام جیلانی برسوں ایک مسجد سے دوسری مسجد اور ایک ملا سے دوسرے ملا تک پڑھنے اور سیکھنے کی غرض سے جاتا رہا اور حالانکہ ... اس کو قیام و طعام بھی بدلنا رہا۔ آج والد کے پاس، کل بھائی کے پاس اور پرسوں ان دونوں سے تنگ آ کر یا دونوں کو تنگ کر کے کسی ... ویران مسجد کو بسا لیا ہے اور قریب کے گاؤں سے دونوں وقت کی روٹیاں مانگ کر کھانے پر مطمئن ہے۔ اس کشمکش میں نہ جانے زندگی کی اور کتنی راتیں گزر جاتیں، مگر مسجد نیلا گنبد لاہور میں ایک شام ایک خیال نے اس کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ عربی اور فارسی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ نماز مغرب کی اذان پر اپنے حجرے سے نکلتے اور وضو کے لئے آستینیں چڑھاتے ہوئے جیلانی نے دل میں سوچا "اب کوئی باقاعدہ امتحان کیوں پاس نہ کیا جائے؟" وضو کرنے اور نماز پڑھنے اس کا ذہن زندگی میں پہلی مرتبہ ایک "باقاعدہ" کام کر گزرنے کا منصوبہ بناتا رہا۔ امام نے قرأت شروع کی تو جیلانی امتحان کے کمرے میں بیٹھا منشی فاضل کا کوئی پرچہ تیزی سے حل کر رہا تھا۔ جب امام سجدے میں جھکا تو دوسرے مقتدیوں کے ساتھ اس نے بھی اپنا سر تو سجدے پر رکھا تھا مگر وہ ابھی تک پرچے کے جوابات لکھ رہا تھا۔ امام رکوع و سجود کی منزلیں طے کرتا گیا اور جیلانی منشی فاضل کے مختلف پرچے ... وہ ... لیکن ابھی تک اسے اس پرچے کا خیال نہ آیا تھا جو پہلے پرچے سے بھی پہلے ہونا ہے

اور اب گویا اس کے ذہن میں منصوبے کا سب سے کڑا سوال پیدا ہوا۔ "مگر داخلے کی فیس کہاں سے لاؤں گا؟" اور جب امام نے سلام پھیرا تو جیلانی کے منصوبے کا فقط "اقتصادی پہلو" طے ہونا باقی تھا۔

اس رات اس نئے خیال اور شوق نے جیلانی کو پوری نیند نہ سونے دیا۔ وہ داخلے کے لئے روپے کی فراہمی پر غور کرتا رہا۔ سب سے پہلے اسے والد کا خیال آیا۔ اس نے سوچا والد پٹواری ہیں۔ ضلع کیمبل پور کے مشہور گاؤں بسال کے پٹواری، مانا کہ دوسرے پٹواریوں کی طرح وہ رشوت نہیں لیتے اور نہ بد گزاری میں آپ اپنی مثال ہیں مگر چودہ روپے ماہوار تنخواہ کے باوجود اپنی طبعی کفایت شعاری کی بدولت ان کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور جمع ہے اور اگر وہ انہیں لکھ دے تو ... اس کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ جیسے اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کی گتھی سلجھ گئی۔ حتیٰ کہ اسے اپنی بلاوجہ فکر مندی پر تعجب سا ہونے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اطمینان اور تعجب کی یہ کیفیت پھر پریشانی میں بدل گئی۔ اس نے سوچا نہ جانے انہوں نے کچھ جمع کیا ہو اور والد دو چار روپے سے زیادہ کی رقم بھیجنے کے عادی نہیں۔ اور پھر اس کا ذہن گذشتہ سات سالہ زندگی کی راہوں پر بھٹک گیا۔ مسجد کی زندگی کے بیتے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور پھر نہ جانے کیونکر اس نے والد کی دی ہوئی یا بھیجی ہوئی مختلف رقموں کا میزان لگانا شروع کر دیا جو اس سے پہلے وہ بارہا لگا چکا تھا اور یہ ہمہ وقت اس کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ وہ چاہتا تو فقط میزان کو ذہن میں تازہ کر لیتا مگر آج وہ پھر اس کی تفصیلات میں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایک موقع کو یاد کیا اور آخر میں جب سب رقموں کو جمع کیا تو پہلے کی طرح ٹوٹل پھر پچیس نکلا۔ اس نے سوچا سات سات برس کے طویل عرصے میں پچیس روپے اور اس کی طبیعت پر افسردگی چھا گئی۔ پھر اسے اپنے لباس کا خیال ستانے لگا۔ اس کے پاس کھدر کے دو جوڑے تھے جنہیں وہ باری باری ہر جمعہ کو مدرسے کی طرف سے ملنے والے صابن سے دھو لیتا تھا۔ ایک عید کو اس کے بعض ہم جماعتوں نے جن کے پاس دو سے زیادہ جوڑے تھے، انتہائی بے تکلفی کا ثبوت دیتے ہوئے داتا کی عید کا پروگرام بنا ڈالا اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکا مگر جب وہ دوپہر کے وقت لوٹ کر آئے تو نماز جمعہ سے پہلے کپڑے دھونے کا وقت باقی نہ رہا تھا۔ اس روز اسے اس بات کا شدید احساس ہوا تھا کہ اس کے پاس کم از کم تین جوڑے کپڑوں کے ضرور ہونے چاہئیں۔ اس روز بھی اسے والد کا خیال آیا تھا اور طبیعت پر تھوڑی دیر کے لئے افسردگی چھا گئی تھی اور بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جوڑے کے لئے والد کو تکلیف نہ دے گا اور اگلے روز جب اس نے اپنی مشکل اپنے ایک مہربان استاد مولانا غلام مرشد سے بیان کی تو انہوں نے انار کلی بازار کے ایک مخیر اور نیک دل مسلمان خان بہادر محمد تقی سے ضرورت کے بارہ روپوں کا انتظام کر دیا۔

اس سے بیس سال بعد جیلانی نے ایک اور منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ پہلے منصوبے سے جس قدر مختلف تھا اس قدر وہ حالات بھی مختلف تھے جن میں یہ منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔ مسجد نیلا گنبد کے مدرسہ حمیدیہ کا متعلم جیلانی اب ماسٹر غلام جیلانی بی۔ او۔ ایل، منشی فاضل، مولوی فاضل، ادیب فاضل تھا اور چکوال ہائی اسکول میں پچاس روپے ماہوار پر فارسی کی تدریس پر مامور تھا۔ وہ حجرہ مسجد کی بجائے دو روپے ماہوار کرایہ کے ایک کچے مکان میں رہتا تھا جس کے تین کمرے اور ایک کھلا صحن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماسٹر جی نے اپنے گھر کے لئے ہر چیز کے طور پر ڈیڑھ روپے میں ایک لکڑی کا اسٹول خریدا تھا اور جب وہ مکان کے سب سے صاف کمرے میں اپنی چارپائی کے پاس آرام کرسی بچھا کر اور سامنے تازہ خریدا ہوا اسٹول رکھ کر کرسی پر دراز ہوا تو اس نے دل میں اطمینان اور خوشی کی ایک عجیب کیفیت محسوس کی۔ ایک ایسی کیفیت جس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ ہوا تھا اور پھر اس کے ذہن میں ایک نیا پلاؤ پکنے لگا۔ اس نے سوچا عربی، فارسی اور اردو کے کئی مرحلے طے ہو چکے ہیں۔ اب انگریزی کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ وہ اس سے پہلے اسلامیہ ہائی اسکول نوشہرہ اور دو ایک اور مقامات پر مدرس رہ

له شاہی مسجد لاہور کے پاس موجود ہے۔

کا کام کوئی اڑھائی تین سال کے قریب کر چکا تھا اور یونیورسٹی سے مذکورہ بالا امتحانات پاس کرنے سے اس کا حوصلہ زیادہ ہو گیا۔ اس کا عزم پختہ اور علم میں آگے بڑھنے کا شوق تیز تر ہو چکا تھا۔ کئی سال پہلے جب وہ مدرسہ حمیدیہ لاہور میں زیرِ تعلیم تھا اس نے علامہ اقبال مرحوم کو انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں اپنی نظموں سے حاضرین پر جادو کا سا اثر کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ نظمیں اسی زمانے میں بعض اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئیں اور شاعر کے نام کے ساتھ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لکھا پایا تو ان لفظوں کی حقیقت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ ایم اے کے بعد کی یہ علمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے تو منعم جیلانی نے جس کو یہ تک خبر نہ تھی کہ منشی فاضل یا کسی دوسرے امتحان میں شریک ہونے سے پہلے یونیورسٹی کو کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے، دل میں ٹھان لی کہ وہ بھی اس علمی مرتبے کو پانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اب حالات کو ساز گار پا کر اس نے ایک جامع منصوبہ مرتب کیا جس کی تکمیل کا تعلق پی۔ ایچ۔ ڈی سے اور آغاز کا اسی سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے سے تھا۔

۱۹۲۹ء میں ۳۲ برس کی عمر میں ماسٹر غلام جیلانی برق نے بی۔ اے پاس کیا تو وہ فکر و خیال کی نئی وادیوں میں قدم رکھ چکا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے قریب اسے محمود علی میاں کی ضخیم کتاب تہذیبِ اسلام پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اسلامی طرزِ حیات اور اندازِ نظر کی برائی کی گئی تھی اور کچھ ایسے غیر منطقی دلائل دیے گئے تھے جن کا جواب اوسط درجے کے پڑھے لکھے مسلمان کی قابلیت اور قدرت سے باہر تھا۔ کچھ دنوں بعد سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش ہاتھ لگ گئی۔ اس کے بعد پنڈت لیکھرام اور [illegible] اسلام مستشرق مصنفین کی باری آئی اور مارگولیتھ تک پہنچ گئے۔ پہلے تلاوتِ قرآن موقوف ہوئی۔ پھر نماز چھٹی۔ پھر روزے ترک ہوئے اور آخر میں ہستیٔ باری تعالیٰ سے انکار کا مرحلہ آیا۔ یہ دور کوئی پانچ سال بعد [illegible] میں ہوا [illegible] اس کی [illegible] نگاہیں [illegible] رہتی تھیں [illegible] ظاہر و باطن سے مسلمانی کا ہر نشان رخصت ہو گیا [illegible] وہ [illegible] داڑھی [illegible] ایمان کے [illegible] درحقیقت مرزا غالب کی شمع خاموش تھی ۔ سے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۱۹۳۴ء میں [illegible] ڈیڑھ سال بعد [illegible] گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں تعینات ہوئے تو ان کی زندگی میں نئی دلچسپیوں نے قدم رکھا۔ [illegible] شطرنج [illegible] خوب کھیلا کرتے تھے مگر اب [illegible] کا عام یار کھیل کھیلتے تھے اور [illegible] کے ساتھ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ناواقف تھے۔ [illegible] سیکھی تو دو چار دن میں طبیعت راہ پر لگی اور حوصلہ اتنا بڑھا اور شوق اتنا مچلا کہ [illegible] کلب کے علاوہ [illegible] کلب کے بھی [illegible] کھیل [illegible] گھنٹوں [illegible] ٹینس بھی انھوں نے اسی زمانے میں سیکھی۔ انگریزی لباس [illegible] سے [illegible] آگاہ نہ تھے۔ [illegible] چلا کہ داڑھی کی موجودگی اس کے حق میں [illegible] بنانے [illegible] آراستہ ہوئے [illegible] ان کا [illegible] ان کی [illegible] ان کی رفاقت کا حق ادا کرنے کی بالکل اہل نہیں۔

مگر اس کے معنی نہیں۔ وہ اپنے منصوبے کی طرف سے غافل ہو کر انھی دلچسپیوں میں کھو گئے تھے۔ [illegible] زمانۂ قیام میں ان کے وقت [illegible] کے [illegible] کی تیاری میں صرف ہوا۔ وہ [illegible] کے قریب کلب سے [illegible] گھر جاتے اور کھانا کھانے کے بعد [illegible] میں لگ جاتے۔ [illegible] سے کچھ کم [illegible] رات گئے تک [illegible] بجے تک [illegible] چارپائی اور اس کے ساتھ [illegible] میز کے اوپر نیچے [illegible] انگریزی، عربی اور فارسی کی کتابیں اور رسالے بکھرے پڑے ہوتے۔ [illegible] بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کے ساتھ ان سے [illegible] معلومات اخذ کرتے [illegible] ان کو ایک خاص انداز سے مرتب کرتے اور ان سے اپنی کتاب کے لئے مستند [illegible] سلسلہ [illegible] شفقت [illegible] سال تک جاری رہی۔

۱۹۴۰ء میں پروفیسر برق نے مدرسۂ عربیہ کا وہ متعلم جیلانی جس کو سترہ برس کی عمر تک یہ خبر نہ تھی کہ امتحان کے لئے کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے، پنجاب یونیورسٹی کو دو صد روپیہ فیس ادا کرکے اور امام ابن تیمیہ کی زندگی اور کارنامے پر اپنی تحقیق کا لوہا منوا کر ڈاکٹر برق بن گئے۔ لیکن اس منصوبے کی تکمیل سے کچھ عرصہ پہلے ان کا دماغ ایک نیا منصوبہ سوچ چکا تھا اور اب انہیں اپنے تیسرے منصوبے کی دھن سمائی تھی۔ آپ پوچھیں گے یہ تیسرا منصوبہ کیا تھا؟

۱۹۳۰ء کے قریب علامہ مشرقی کی تصنیف 'تذکرہ' سے وہ دیباچہ اور لیکچر امرتسر کے جنگل سے نکلے تو دل میں اسلام کی حقانیت اور قرآن کی عظمت کا یقین پہلے سے ہزار گنا بڑھ چکا تھا۔ آٹھ دس سال کے مزید مطالعہ، تحقیق اور غور و فکر سے وہ جس نتیجے پر پہنچے اس کے تین پہلو تھے:۔

۱۔ اسلام کسی سائنسی حقائق سے متصادم نہیں۔ قرآن حکیم نہ صرف مطالعہ فطرت اور تسخیر کائنات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے بلکہ اس کی سینکڑوں آیات اور سائنس کے جدید اکتشافات اور نظریات میں حیرت انگیز مطابقت اور ہم آہنگی پایا جاتا ہے جو دین اسلام کی حقانیت اور قرآن کے من جانب خدا ہونے کا زبردست ثبوت ہے۔

۲۔ اسلام وہ نہیں جو اکثر علماء کی زبان و قلم سے پیش کیا جاتا ہے بلکہ وہ ہے جس کی تعلیم و تصدیق قرآن اور فقط قرآن سے ہوتی ہے اور ان دونوں 'اسلاموں' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملا کا پیش کردہ اسلام مذہبی تعصب، کج بحثی اور فکر و عمل کی سنگینی کا نام ہے مگر حقیقی اسلام علم و اخلاق کی بلندی، نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی ہے۔

۳۔ مذاہب عالم کی اصل ایک ہے اور ان کا باہمی تضاد اور موجودہ مغایرت کم نظر اور حقیقت ناآشنا پادریوں، پنڈتوں اور ملاؤں کی پیدا کردہ ہے

حسب تذکرہ بالا خیالات ڈاکٹر برق کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئے اور طبیعت ان کے اظہار کے لئے بے چین ہونے لگی تو انہوں نے ان کو سلسلہ وار شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ یہی ان کا تیسرا منصوبہ تھا جو 'دو قرآن' (۱۹۴۸ء)، 'دو اسلام' (۱۹۵۰ء) اور 'ایک اسلام' (۱۹۵۱ء) کی صورت میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

ان حالات کا بیان اور ان 'منصوبوں' کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ ان کے بغیر ڈاکٹر برق کی شخصیت کا وہ پس منظر اجاگر نہ ہو سکتا جس میں اس نے اپنی تعمیر کی اور ان واقعات کا اندازہ نہ ہو پاتا جن سے وہ دوچار ہوئے، جن سے انہوں نے اثر لیا اور جن کی مدد سے ان کی شخصیت کو اپنا مخصوص آب و رنگ حاصل ہوا۔ پیش منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا دیکھنا بہرحال ایک ناگزیر چیز ہے۔

جو لوگ اپنی محنت اور قابلیت سے ابھرتے ہیں بعض اوقات ان میں خود رائی اور اپنی ذات کا ضرورت سے بڑھا ہوا احساس بھی ابھر آتا ہے۔ ڈاکٹر برق کو یہ جذبہ چھو تک نہیں گیا۔ نخوت و پندار سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی ذات سے دور نہیں۔ آپ ان سے ملئے، ان سے الجھئے اگر جی چاہے تو ان کے منہ پر ہی ان کے سارے کارنامے کی نفی کر ڈالئے، وہ اس کے جواب میں کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالیں گے، اٹھنے بیٹھنے پہلو بدلنے یا مخاطب کرنے کا کوئی ایسا انداز اختیار نہ کریں گے جس سے یہ پایا جائے کہ وہ اپنے کو آپ کی ذات یا بات سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کو اپنے علم اور مصنفانہ صلاحیت پر کوئی ناز نہیں بلکہ ان میں ایک نوع کی 'نفی ذات' بھی بڑی نمایاں ہے۔ یہ 'نفی ذات' نہ تو صوفیانہ عجز و انکسار سے کوئی تعلق رکھتی ہے اور نہ 'اخلاق جلالی' کے تحمل و بردباری سے۔ ایسا نہیں کہ وہ بھڑک نہیں اٹھتے یا برس نہیں پڑتے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن روزمرہ کی زندگی میں، گھر میں ہوتے ہوئے، کالج کے اوقات میں، احباب کی صحبتوں میں، کلب میں، سینما میں، سیر و شکار کے موقعوں پر غرض ہر جگہ جہاں وہ قلم و کتاب کے بغیر چلتے پھرتے اور ملتے ملاتے موجود ہوتے ہیں ان کو اپنی مصنفانہ شہرت یا عالمانہ حیثیت بالکل اور قطعاً یاد نہیں ہوتی اور کوئی اجنبی ان کی گفتگو، غیر علمی مشاغل میں ان کے انہماک اور

دوستوں سے ان کی بے تکلفی کی نوعیت سے ہرگز نہیں پا سکتا کہ یہ "دو قرآن" یا "ایک اسلام" والے ڈاکٹر برق ہیں۔
خوش دلی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا جوہر ہے۔ ان کی عمر اس وقت باون ترپن برس کی ہے اور اتفاق دوئی شعور رکھے اس عہد میں، وہ نو بچوں کے
باپ اور جہاں تک نان نفقہ کا تعلق ہے ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر ہیں، اس کے باوجود ہنستے ہنساتے ہیں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے
وہ تبسم زیر لب کے نہیں، فلک شگاف قہقہوں کے قائل ہیں۔ یہ قہقہے ان کے دیوان خانہ میں، کلب میں، کھانے اور چائے کی میز پر اور کالج سٹاف کے
رسمی وغیر رسمی اجتماعوں میں بھی بلند ہوتے اور ہو سکتے ہیں مگر ان کی بہار دیکھنی ہو تو کوئی اس وقت دیکھے جب کالج کے اوقات ختم ہونے پر وہ بے تکلف
ساتھیوں کی محفل میں باغ و بہار بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ عالمانہ اور شاعرانہ نکات کے علاوہ ان کے حافظہ میں سعدی و رومی کی حکایات بلند سے
لے کر سکھوں، مرانیوں، جولاہوں اور ملاؤں کے سچے اور جھوٹے، گفتنی اور ناگفتنی لطائف کا اتنا بڑا خزینہ محفوظ ہے اور ان کا طرز بیان اس قدر
دلکش، نظر تازہ اور ترقی پسندانہ ہے کہ محفل ایک بار جم جائے تو گھنٹوں کوئی اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ آغازِ مجلس عام طور پر علمی قسم کا ہوتا ہے۔
ڈاکٹر صاحب یا کوئی اور رفیق کسی مضمون یا کتاب کی تیاری میں مصروف ہیں اور انہوں نے اپنے زیر تدوین نظریہ کا انکشاف کر دیا ہے یا خصوصیت
سے کوئی مسئلہ در پیش ہے، مسائل کا دائرہ حدیث کی حجیت سے لے کر فرائڈ اور اوڈی پس الجھاؤ تک وسیع ہے، تو دو چار احباب کے درمیان
ہونے سے بحث چھڑ جائے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب خواہ اس وقت سٹاف روم میں موجود ہیں یا نہیں آج "اجلاس" ضرور ہوگا۔
چنانچہ رفقاء جوں جوں جماعتوں سے فارغ ہوتے آئیں گے، اراکین کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب اور حزبِ اختلاف کے لیڈر یا
ڈپٹی لیڈر تشریف لے آتے ہیں۔ اب باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ آیاتِ قرآنی پڑھی جا رہی ہیں (اتفاق سے دو رفقاء حافظِ قرآن ہیں) احادیث
بیان ہو رہی ہیں۔ توریت اور انجیل سے حوالے سنائے جا رہے ہیں، تفسیر کے نکتے حل ہو رہے ہیں، منطق و استدلال کے مہرے بڑھ رہے ہیں
اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نظریات کے منظور کرانے میں علمی ایوانوں کے ماہر عموماً کیا کرتے ہیں مگر اب بحث نے طول کھینچا ہے اور
طبیعتوں میں کچھ تیزی آنے لگی ہے۔ اس موقع پر سرکاری یا مخالف بنچوں میں سے کسی باذاق نے منہ کا مزا یا محفل کا رنگ بدلنے کے لئے اپنے
کسی فاضل دوست پر کوئی فقرہ چست کر دیا ہے یا پھبتی کہہ دی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اب محفل کا پہلا دور ختم ہوا اور کارروائی جب دوسرے دور میں
داخل ہوتی ہے تو فضا قہقہوں سے گونج رہی ہوتی ہے۔ وہ چہرے جو تھوڑی دیر پہلے ذرا تمتمائے ہوئے اور علم کی سنجیدگی سے بوجھل بوجھل نظر آتے
تھے اب پھول کی طرح شگفتہ ہیں اور بقول پطرس کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہیں آتیں۔ ڈاکٹر صاحب پہلے بھی
صدر نشین تھے، اب بھی صدر مجلس ہیں۔ لطائف و ظرائف کا دفتر کھل گیا ہے مگر اصل کشش ان کی قدرت بیان میں ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے
بعد یہ کمال میں نے ڈاکٹر برق میں دیکھا ہے کہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، ملتانی، سندھی، پشتو، کشمیری اور ڈاکٹر صاحب کی حد تک انگریزی بھی اس
فہرست میں شامل ہے۔ غرض لطیفہ جس زبان اور طبقے کا ہوگا اس کو اسی زبان اور اسی طبقے کے لب و لہجہ میں ادا کر سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب جب
ان صاحب لوگوں کے واقعات جن کا ذاتی تجربہ بھی ان کو کچھ کم نہیں، کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے مخصوص تلفظ سے کام لیتے ہیں تو سماں بندھ جاتا
ہے۔ اسی طرح جب وہ ان بے شمار ہیڈ ماسٹروں، اسکول انسپکٹروں، پرنسپلوں اور ڈائرکٹروں کا ذکر خیر کرتے ہیں جن سے انہوں نے نفع یا
نقصان اٹھایا تو ایک ایک کی انفرادیت اس کی مخصوص آواز، طرز گفتگو اور اندازِ کار کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور سامعین
کو بے حد محظوظ کرتی ہے۔ لیکن اس تمام لطیفہ گوئی اور واقعہ نگاری پر غالب اور سب سے بڑھ کر دلچسپ ان کی "آپ بیتی" ہے جسے موقع و
محل کی رعایت سے وہ انتہائی بے باکی اور صدق گوئی کے ساتھ "منظر عام" پر لاتے ہیں۔ ماضی میں ان سے جو کچھ سرزد ہوا، انہوں
نے جو کچھ کیا، بیانِ واقعہ سے خواہ ان کی اہانت و سبکی کا پہلو نکلتا ہو خواہ ان کی کسی نفسی یا اخلاقی کمزوری کا پتہ چلتا ہو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر
اس کا ذکر کریں گے۔ مرزا غالب نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں" ڈاکٹر صاحب کا سلوک بھی اپنی ذات کے ساتھ

حد درجہ بے باکانہ اور غیر جانبدارانہ ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی مجلس آرائی کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ایک اور بات کا ذکر یہاں نہ آئے۔ ان کے پاس ، دریں دو درجن کے قریب الفاظ و محاورات ایسے بھی ہیں جو بقول شخصے کسی اسکول یا مدرسے میں پڑھائے نہیں جاتے اور نہ شریف گھرانوں میں بولے سنے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ و محاورات انہوں نے اس وقت سیکھے تھے جب ابھی وہ اسکول نہیں جاتے تھے یا اسکول سے بھاگ جاتے تھے مگر ان کے بے تکلف اور بے ساختہ استعمال میں دستگاہ انہوں نے برسوں کی ریاضت اور مشق و مہارت سے بہم پہنچائی ہے اور اس میں بڑی بڑی جدتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں اور اب یہ الفاظ مع حواشی اور جدید فرہنگ کے ان کی شخصیت اور بزم آرائی کا جزو لاینفک ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ پنجاب یونیورسٹی کے سند یافتہ محقق ہیں مگر تحقیق کئے بغیر نتیجے پر پہنچنا یا فیصلہ کرنے کے بعد تحقیق کی کوشش کرنا ان کی شخصیت کا ایک طرفہ پہلو ہے۔ اس میں بری نیت کو کچھ دخل نہیں۔ ان کا ارادہ ہمیشہ معصوم ہوتا ہے مگر ان کی طبیعت میں جلدی سے نتیجہ نکالنے اور ریل نکلے یا نکالے ہوئے نتیجے پر اعتماد کرنے کی صلاحیت بڑی غیر معمولی ہے۔ اس سے بارہا دوسروں کے جذبات اور خود ڈاکٹر صاحب کی شہرت کو صدمہ پہنچا ہے اور اگرچہ احساس دلانے یا حقیقت واضح ہونے پر وہ تلافی مافات کی کوشش کرتے ہیں مگر بعض اوقات ان کی یہ "زود پشیمانی" غالب کے روایاتی محبوب سے کم بے راز وقت نہیں ہوتی۔ چند سال اُدھر کی بات ہے۔ کالج میں طالبات کو ایک خاص نظم اور ضابطے کے ساتھ تعلیم پاتے ابھی دو تین برس ہی ہوئے تھے اور اس دوران میں ایک آدھ معمولی درجے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا تھا کہ ایک سُلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان نئے نئے لیکچرار مقرر ہو کر یہاں آئے۔ ان کے آنے کے دو اڑھائی ہفتے بعد اسبابِ کالج کو کسی کاپی میں پڑا ہوا ایک محبت آمیز خط ملا جس کے آخر پر ان کا نام درج تھا۔ ان دنوں کوئی مستقل پرنسپل نہ ہونے کے باعث اگرچہ برائے نام انچارج ایک اور صاحب تھے مگر عملاً ڈاکٹر صاحب ہی کرتا دھرتا تھے انہوں نے خط دیکھتے ہی سارے معاملے کو بھانپ لیا اور نوجوان لیکچرار کو بلا کر صاف صاف اور خاصے نا ملائم لفظوں میں گفتگو کر ڈالی۔ خود دار اور بے یار و مددگار اجنبی پر تو قیامت ہی گزر گئی۔ وہ تو خدا بھلا کرے اس طالب علم کا جس کے کان تک جب یہ بات پہنچی تو بھاگا بھاگا آیا اور اصل ماہنامے کو بھی اٹھا لایا جس سے وہ مکتوب نگار کے نام کے اس نے محض پسندیدہ اسلوب کی بنا پر وہ خط نقل کیا تھا اور کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ ورنہ بے خطا لیکچرار اپنی "صفائی" میں ناکام اور اپنی نیک نامی سے مایوس ہو ہی چکے تھے۔

میں نے یہ واقعہ بہت سوچ بچار کے بعد یہاں درج کیا ہے اور محض اس لئے درج کیا ہے کہ اس کے بغیر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا یہ سنگین رُخ تشنۂ اظہار رہ جاتا۔ فیصلے میں یہی جلدی اور طبیعت کی یہی تیزی ان دو خطوط کا باعث ہوئی جو انہوں نے "دو قرآن" کے ایک تبصرہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی کو پارسال یا دو سال پہلے لکھے تھے۔ علاوہ اور باتوں کے اس میں ڈاکٹر صاحب کا مولانا کو یہ مشفقانہ مشورہ بھی شامل تھا "قبلہ! آپ علمی و اسلامی مسائل پر لکھنا چھوڑ دیں، اس لئے کہ یہ کام آپ کے ڈھب کا نہیں. . . . ." اپنے اسی خط میں ایک جگہ مولانا کو یقین دلاتے ہیں "آپ کی اسلام سوز جہالتوں پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن کوئی صاحبِ فکر و نظر آپ جیسی متعفن لاش پر وقت کیوں ضائع کرے"

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو متذکرہ بالا دونوں واقعات کا بعد میں بے حد افسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے رفیق سے بھی معذرت چاہی اور مولانا کے لئے بھی ان کے دل میں معذرت خواہی کے سینکڑوں ارمان پوشیدہ ہیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب تک دم میں دم ہے ہر ایسی صورت پیدا ہونے پر وہ فیصلے پر تحقیق سے پہلے ہی پہنچیں گے۔

ان کی طبیعت کا یہ رُخ لطیف پہلو بھی رکھتا ہے اور کثرت الوقوع کے اعتبار سے لطیف پہلو سنگین پہلو پر بلاشبہ غالب ہے۔ اب تو خیر

جلدی اُٹھ آتے ہیں۔ چند سال پہلے تک وہ گرمی ہو یا سردی کلب سے آدھی رات کو لوٹتے تھے اور ظاہر ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر یا جاگتے رہ کر دروازہ کھولنے کا فرض اور ایثار صرف اہلیہ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب دروازہ کھٹکھٹاتے تو اہلیہ احتیاطاً اور کچھ عادتاً پوچھ لیتیں "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب شاید دیر سے آنے کے احساس کو دور کرنے یا بیگم کے اس ایثار کی نقد داد دینے کی خاطر ان کے مستقل "کون ہے" کے جواب میں اکثر کوئی نہ کوئی خوش دلی کا جملہ کہتے۔ کبھی کہتے "آپ کا سرتاج!" کبھی بولتے "آپ کا فرمانبردار شوہر!" کبھی کہتے "تمہارے درجن بھر بچوں کا باپ" وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ گھر میں ساس آئی ہوئی تھیں۔ اہلیہ نے ماں کی شفقت اور مامتا سے فائدہ اٹھایا اور دروازہ کھولنے کا کام ان کے سپرد کر کے خود سو رہیں (بقول ڈاکٹر صاحب کے ماں بیٹی کی آواز میں مماثلت بہت ہے)، حسبِ معمول بارہ بجے کے قریب جب ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک نسوانی آواز نے پوچھا "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے کھٹ سے "تمہارا" کے ساتھ پنجابی میں خاوند کا ایک بھرپور مترادف لڑھکا دیا . . . . اور پھر کئی روز تک وہ جس احساس سے مغلوب رہے اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

کلب کا ذکر آ گیا ہے تو اس کو یہیں نمٹاتے چلیں۔ ہوشیارپور سے ڈاکٹر صاحب کو زندگی کے دو نہایت مخلص اور وفادار ساتھی میسر آئے۔ دوسری بیگم اور برج۔ گرمی ہو یا سردی، بادل برس رہا ہو یا آندھی اُٹھ رہی ہو، لکھنے پڑھنے کا کوئی ضروری کام ہو یا طبیعت ناساز ہو، ہر حال میں یہیں اس وقت جب مؤذن نمازِ مغرب کے لئے پکار رہا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب اپنی سائیکل پر کلب پہنچتے ہیں اور پھر تین ساڑھے تین گھنٹے تک برج میں لگے رہتے ہیں۔ اتوار کے روز البتہ خاص کھیل بھی ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے بعد سے نو بجے رات تک مسلسل اور لگاتار جاری رہتا ہے۔ اس طرح آج کل اوسط کوئی چار ساڑھے چار گھنٹے یومیہ سے زیادہ کی نہیں مگر ایک زمانے میں وہ چھ چھ سات سات گھنٹے یہ کھیل کھیلتے تھے اور برسوں ان کے "سگریٹ پان" کا خرچ اس سے پورا ہوتا رہا۔ ("سگریٹ پان" تو میں نے یوں ہی (محاورۃً) کہہ دیا ورنہ جنگ سے پہلے کے ساٹھ ستر روپے ماہوار بڑی چیز ہوتے تھے) اور کیا عجب علامہ طنطاوی مصری کی تفسیر (جس سے متاثر ہو کر انہوں نے "دو قرآن" لکھی) اور علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمۂ قرآن جس کے وہ بے حد معترف ہیں، اسی مد سے خریدے گئے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ اس کھیل میں ہارتے بہت کم ہیں۔ ان کی جیت کا ریکارڈ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا ہے مگر ہار اٹھارہ روپے سے آگے نہ بڑھی اور یہ ہار بھی انہیں کسی معمولی آدمی کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ غالباً ۴۸ء کے شروع کا ذکر ہے۔ راجہ غضنفر علی خان مرکز میں وزیر تھے اور ان دنوں پنجاب کے دورے پر تھے کہ ایک روز کیمبل پور آ نکلے۔ دن بھر تو آس پاس کے مہاجر کیمپوں میں کمبل اور لحاف بانٹتے رہے اور رات کے ابتدائی حصے میں مقامی کلب کے مقامی اور مہاجر کھلاڑیوں سے پیسے بٹورتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حصے کے طور پر مبلغ اٹھارہ "چہرہ شاہی" نذر کئے۔

برج کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو شطرنج، شکار اور شمع معمے سے بھی شغف رہا ہے۔ شطرنج پر اب بھی توجہ فرماتے ہیں۔ سال میں دو تین بار شکار پر بھی نکلتے ہیں البتہ "شمع" والوں کی بے اصولی سے تنگ آ کر انہوں نے معمے حل کرنے ترک کر دیئے ہیں۔ بیچ میں کچھ دنوں "بیسویں صدی" اور "آستانہ" سے بھی شغل فرمایا مگر وہ بھی بالآخر بے اصول ثابت ہوئے۔

انگریزی میں یہ خیال ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے کہ ماتحت اپنے افسر کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ وہ اس کو پسند کرے گا یا ناپسند، اس سے محبت کرے گا یا نفرت۔ ڈاکٹر صاحب اس خیال کی زندہ اور نہایت زوردار تائید ہیں۔ وہ پرنسپل کی شخصیت کو بالکل اور ہرگز نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگر پرنسپل ان کے ڈھب کا ہے یا اس سے ان کے مخلصانہ تعلقات استوار ہو چکے ہیں تو وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کی نیک دلی اور انسان دوستی کی تعریف کریں گے۔ اگر ایسا نہیں تو ان کی قوتِ بیان کا ایک خاص حصہ اس کی "مردم آزاری" کی تشہیر کے لئے وقف رہے گا۔ البتہ اس میں وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں۔ "مردم آزار" پرنسپل جب تک کیمبل پور میں ہے ڈاکٹر صاحب اس کی قدح میں محتاط رہیں گے۔

صرف ایسی محفل اور موقع پر 'حقیقت' کا 'انکشاف' کریں گے جس میں ان کے اندازے کے مطابق 'سرکاری' آدمی کوئی نہ ہو۔ ورنہ 'مخلوط' قسم کی محفلوں میں وہ بڑی حد تک 'غیر جانبدار' ہو جاتے ہیں۔ اس میں اخلاقی جرأت کی کمی کو اتنا دخل نہیں جتنا ان کی 'امن پسندی' اور کالج کی فضا کو 'مکدر' ہونے سے محفوظ رکھنے کے جذبے کو ہے۔ وہ طبعاً صلح کل اور تعاون پسند ہیں اس لئے اپنی طرف سے کبھی پہل نہیں کرتے لیکن اگر دوسری طرف سے پہل ہو جائے، جو بدقسمتی سے خارج از امکان نہیں، تو وہ برہم ہونے کے علاوہ پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ برہم اس لئے کہ پرنسپل نے ان کے جذبۂ تعاون کی قدر نہ کی اور پریشان اس لئے کہ وہ کسی قیمت پر بھی کیمبل پور چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور پرنسپل سے اَن بَن کی صورت میں ماتحت کا تبادلہ ہمارے محکمے کی دیرینہ روایت ہے۔ کیمبل پور ان کا وطن ہی نہیں، اور بھی بہت کچھ ہے۔ دو سال پیشتر وہ سیر کی غرض سے کراچی گئے تو ڈیڑھ دو ہفتے میں 'بے لطف' لوٹ آئے۔ کسی ذاتی یا سرکاری کام سے لاہور جائیں تو جلدی سے جلدی واپس آنے کی فکر کرتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد سے ان کے پاس یہاں ایک فراخ اور عمدہ مکان ہے جس کی دوسری منزل کے بعض حصے 'مغلیہ فن تعمیر' کی یاد دلاتے ہیں اور اپنے تارکِ وطن ہندو مالک کی خوش مذاقی پر دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے کلب اور یہاں کی دوستیاں اور تعلقات۔ یہ سب عناصر ان کی 'امن پسندی' کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لاپروا مگر مخلص خاوند اور حد درجہ شفیق اور مہربان باپ ہیں۔ ان کے ماشاء اللہ نو بچے بچیاں ہیں (بچیوں کی تعداد بچوں سے دوگنی ہے) ایک جو سب سے بڑا ہے پہلی بیگم سے ہے جو گذشتہ اٹھارہ بیس برس سے ڈاکٹر صاحب کے گھر کی بجائے گاؤں میں اپنے والد اور ڈاکٹر صاحب کے حقیقی ماموں کے گھر میں رہتی ہیں اور اس دوران میں فقط دو چار مرتبہ اپنے بچے کی علالت کے دنوں پر یہاں آئی ہیں۔ باقی آٹھ بچے دوسری بیگم سے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا پشاور یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہا ہے اور سب سے چھوٹی بچی نے ابھی پار سال اسکول جانا شروع کیا ہے۔ باقی سات درجہ بدرجہ کالج اور اسکول کے مختلف درجوں میں ہیں۔ ان سب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سلوک نہایت محبت آمیز اور بے تکلفانہ ہے۔ میں نے تاثیر مرحوم کو اپنے بچوں کا دوست، ہمجولی اور شریر ساتھی پایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی اپنے رنگ میں بچوں کے ساتھ خاصے خوش دل اور شوخ واقع ہوئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں لاپروا اور مخلص خاوند کہا ہے۔ مخلص اس لئے کہ میاں بیوی کے درمیان خلوص اور اخلاص کا جو تصور عام اور رسماً طور پر پایا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب (میرا مطلب دوسری بیگم کی نسبت سے ہے) اس پر پورا اترتے ہیں اور لاپروا اس بنا پر کہ ...... ذرا ٹھہریئے میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہوں۔ چند سال اُدھر کا واقعہ ہے ایک دوست نے جو کلب میں دیر تک بیٹھنے کے عادی تھے شادی کی لیکن اس کے باوجود کلب سے اپنے 'تعلقِ خاطر' کو کم نہ کیا۔ بیگم صاحبہ ذرا جدید وضع کی واقع ہوئی تھیں، ہفتہ عشرہ تو صبر کر گئیں پھر ایک روز بولیں "میرا خیال ہے آپ کی شادی مجھ سے ہوئی ہے کلب سے نہیں" اُدھر میاں بھی عورتوں کی 'مساوات' کے جدید تقاضوں سے ناواقف نہ تھے۔ جذبات کی نزاکت کو فوراً سمجھ گئے۔ لیکن میرا اندازہ ہے ڈاکٹر صاحب کے لئے 'جذبات کی نزاکت' سمجھنے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا اور یوں بھی وہ 'نزاکتوں' کے قائل نہیں اور جو شخص زندگی اور جذبات کی نزاکتوں سے چنداں سروکار نہ رکھتا ہو اور یوں معقول آدمی ہو میرا یقین ہے وہ بطور خاوند کے ضرور لاپروا ہوگا۔

البتہ ایک لحاظ سے وہ بڑے 'بیوی پرست' واقع ہوئے ہیں۔ انہیں عورتوں کے سیاسی، معاشرتی یا معاشی حقوق سے تو چنداں دلچسپی نہیں اور نہ وہ تحریک نسواں کے مساواتی نظریہ سے کوئی ہمدردی رکھتے ہیں مگر وہ 'بیوی' کو، ماں کے یا زیادہ واضح لفظوں میں 'بہو' کو اس کی 'ساس' کے 'جارحانہ عزائم' سے محفوظ رکھنے کے بہت بڑے حامی اور مؤید ہیں۔ رفقاء میں سے کوئی شادی کرے تو مبارکباد کہنے کے بعد اکثر پہلا سوال یہی کرتے ہیں "والدہ ماجدہ زندہ ہیں؟" اگر جواب نفی میں ہو اور مخاطب سے بے تکلفی بھی ہو تو اس کو ایک بار اور مبارکباد کہنے میں کچھ مضائقہ نہ سمجھیں گے اور شادی کی کامیابی کی فی البدیہہ پیشگوئی کر دیں گے اور جواب مثبت میں ہو تو ذرا سوچ میں پڑ جائیں گے اور بڑے مؤثر لہجے میں مشورہ دیں گے کہ جہاں تک ممکن ہو بیگم صاحبہ کو والدۂ ماجدہ کے سایۂ عاطفت سے

دور ہی رکھے گا۔ بس شادی کی کامیابی کا یہی گُر ہے۔" اور اگر موڈ میں ہوں تو پھر اس بات کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے کہ ان کی اپنی والدۂ محترمہ اپنی تین عدد پیاری بہوؤں کی طلاق کا سامان کر چکی ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ڈاکٹر صاحب عورت کے متعلق کوئی اونچی رائے نہیں رکھتے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس سے خود ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اونچی رائے قائم کرنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

طوالت کے خوف سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بعض اور پہلوؤں پر مختصر طور سے لکھتا ہوں۔ اگرچہ میرا ارادہ ان پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا تھا۔ وہ شعر و سخن کا بہت عمدہ اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، بڑے زوردار قسم کے عوامی مقرر ہیں۔ سپاس نامہ لکھنے میں وہ یدِ طولیٰ حاصل ہے کہ چاہیں تو ملّا شور بازار جیسے افغان کی چیخیں نکل جائیں[1]۔ پرنسپل کے پاس جب کوئی ایسی تجویز یا سفارش لائیں جس کی منظوری خود ان کی نظر میں مشتبہ ہو تو "جناب" کا لفظ معمول سے زیادہ فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ایسے طریق کار کو بھی آزما دیکھتے ہیں جس کو اخلاق پر مضمون لکھتے یا تقریر کرتے وقت وہ جائز نہیں ٹھہراتے۔ بڑے متواضع، مرنجاں مرنج، بردبار اور دوست نواز ہیں مگر کبھی کبھی اس وصف حمیدہ کے ڈانڈے "دھڑا بندی" اور "ناحق" سے بھی جا ملتے ہیں۔ ایک زمانے میں پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محنت اور شوق کی کارفرمائی تھی۔ اب بہ کفایت پڑھتے اور بہ عجلت لکھتے ہیں۔ دیر سے سونے اور دیر سے اٹھنے کے عادی ہیں۔ برسوں سے انہوں نے سورج طلوع ہوتے نہیں دیکھا، سوائے ایسے موقعوں کے جب وہ دوستوں کے اصرار یا اپنے شوق سے سیر و شکار کی کسی مہم میں شریک ہوں اور اس کے لئے صبح سویرے کی کسی گاڑی، بس یا موٹر سے روانہ ہونا ہو۔ دیر سے اٹھ کر پہلے اخبار دیکھتے اور پھر شیو بناتے ہیں۔ اس کے بعد وضو کر کے دو رکعت نمازِ فجر تمامی پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سردیوں میں بس یہی "دو رکعت" ان کا "پنجگانہ" ہے۔ البتہ گرمیوں میں رات کو جب کلب سے لوٹتے ہیں تو کھانا کھانے سے پہلے اور غسل کرنے کے بعد اکثر دو رکعت بطور نمازِ عشا کے اور ادا کرتے ہیں۔ نمازِ جمعہ کے وہ قطعی "تارک" ہیں۔ گذشتہ چودہ برس سے انہوں نے مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ روزے کی بجائے وہ ایک روپیہ یومیہ "فدیہ" ادا کرتے ہیں۔

آخر میں میرا جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہبی افکار و خیالات پر بھی کچھ کہوں مگر اس مضمون کے اصولی اور تکنیکی تقاضے اس امر کے مانع ہیں۔ البتہ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرے نزدیک وہ بعض سچے دعووں کے قدرے کمزور وکیل ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ مجھے یا خیال جس قدر اونچا اور بلند ہوگا اسی قدر اپنے حق میں اونچے اور بے داغ استدلال کا تقاضا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے سے بڑے اور اونچے سے اونچے خیال کی حمایت میں ایک آدھ محکم دلیل دینے کے بعد تھک سے جاتے ہیں اور پھر اس شاعر کی طرح جو غزل میں دو ایک اچھے شعر کہہ چکنے کے بعد بھرتی کے اشعار پر اتر آتا ہے، وہ ایسے دلائل دینے لگتے ہیں جو اپنے اندر کچھ زیادہ وزن اور واقعیت نہیں رکھتے۔ غور سے دیکھا جائے تو غزل اور سنجیدہ مضمون نگاری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غزل میں ایک آدھ کام کا شعر بھی نکل آئے تو بقول مولانا حالی ساری غزل چمک اٹھتی ہے اور بالفرض وہ نہ بھی چمک اٹھے تو بھی اس کے بُرے شعروں کا اس کے اچھے شعروں پر چنداں بُرا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن سنجیدہ مضمون میں خواہ اس کا تعلق مذہب و فلسفہ سے ہو یا کسی اور علم سے صرف ایک بودی دلیل کے ہونے سے سارے مضمون کے وقار اور قدر و قیمت کو دھکا لگتا ہے۔ دوسرے اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان اپنے اندر ایک خاص نوع کی شگفتگی اور ادبیت رکھتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی اس میں گھن گرج زیادہ ہے اور نرمی اور دل سوزی کم ہے۔ گھن گرج بھی زندگی اور ادب میں ایک مقام رکھتی ہے مگر اس کے علاوہ بھی

---

[1] چند سال پہلے اپنے دورۂ پاکستان کے وقت جب ملّا صاحب یہاں تشریف لائے تو حکامِ ضلع کی سفارش و درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے ان کی خدمت میں بہ زبانِ فارسی ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس میں مشرقی پنجاب کے مظالم کا ذکر کچھ اس انداز سے تھا کہ ملّا صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

بہت سے مقامات ہیں اور ایک مبلغ کا، ایک ایسے شخص کا جو دلوں کی کھیتیاں سیراب کرنے اور عقائد و اخلاق میں تبدیلی پیدا کرنے کا خواہاں ہو ان مقامات سے بطورِ خاص آگاہ ہونا ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم نے دین کی نشر و اشاعت کو حکمت اور محبت دونوں کا پابند بنایا ہے اور اس کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ "دشمن تمہارا جگری دوست بن جائے"۔ علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے:

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ڈاکٹر صاحب "کوہ و بیاباں" میں تو "سیلِ تند رو" بنے بنائے ہیں مگر راہ میں "گلستاں" آ جائے تو "جوئے نغمہ خواں" نہیں ہو پاتے ——

اس کے باوجود مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے خلاف انہوں نے اپنے رنگ میں جو جہاد کیا ہے اور انسان دوستی کے جس جذبے کے وہ علمبردار ہیں اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

اے آر خاتون

زبیدہ خاتون

ایک بیٹی کا اپنی ماں کے صحیح نقش و نگار اور جیتی جاگتی تصویر کو لفظوں میں پیش کرنا، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرنا کچھ عجیب سی بات ہے بلکہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور پھر اے آر خاتون کی شخصیت تو بالکل بحر اوقیانوس کی طرح گہری ہے، بلکہ ایک معمّہ ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کی کن کن عادات کو خوبیوں کے دائرے میں داخل کیا جائے اور کس بات کو کمزوری سمجھا جائے۔ یہ دونوں آپس میں اس قدر گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کو سلجھا کر الگ الگ کرنا ذرا دقت اور دیر طلب کام ہے، کیوں کہ کوئی بھی انسان خوبیوں اور برائیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ہی خوب کر سکیں گے۔ مگر سچّی سچّی بات کہہ دینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک باعمل انسان ہیں اور انہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ایک مرض سا ہے۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتی ہیں کہ "کوئی نہ کوئی کام کرتے رہو اور کچھ نہ ملے تو کھیل ہی کھیلو" اگر سننے والے کوئی توجہ نہیں دیتے تو وہ خود کوئی کتاب یا کھیل شروع کر دیتی ہیں، کوئی اُن کا ساتھ نہ دے۔ تو بچّوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہیں، بچّے تو اس کے منتظر ہی رہتے ہیں کہ گھر کا کوئی خاص فرد اُن کے کھیل میں دلچسپی لے۔

وہ چپکے ہی چپکے اپنے کام میں ایسے مصروف رہتی ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور دیکھنے والوں کو ان کا کیا ہوا کام ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جن آ کر کر گیا ہو۔ بعض وقت تو اُن کے مسلسل کام ہی کام سے دیکھنے والوں کی طبیعت اُکتا جاتی ہے، مگر اُن کی کوشش اور مستقل مزاجی میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے پاتا۔ چاہے کتنا بھی کوئی انہیں اس کام سے بیزار کرانے کی کوشش کرے طرح طرح سے اُس کام کے عیوب اُن کے سامنے ظاہر کرے، مگر توبہ کیجئے وہ بغیر کسی کی بات کا جواب دیئے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں اور اس کو مکمل کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔

مشغول و مصروف رہنا ان کی عادت ہے ان کا کہنا ہے کہ بیکاری سے انہیں اُلجھن ہوتی ہے صحت پر خراب اثر پڑتا ہے اپنی پریشانیوں

اور اُلجھنوں سے بچنے کے لئے اُنہوں نے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔

اُنہوں نے ہمیشہ زندگی کو خوشگوار اور آسان بنانے کی سعی کی ہے اور اب تک اسی جدوجہد میں کوشاں رہتی ہیں اس راہ میں انہیں بڑی بڑی رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں، مگر وہ بڑے صبر و استقلال سے اپنی دھن میں لگی رہتی ہیں نہ جانے اُن میں چیونٹی کی سی ہمت کہاں سے آگئی ہے۔

وہ بہت جلد آنکھوں ہی آنکھوں میں مشکل سے مشکل کام سیکھ لیتی ہیں اگر کسی کو بڑے جدید اور نرالی قسم کا سلا ہوا کپڑا پہنے دیکھیں گی اور وہ انہیں پسند آجائے گا" کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جدید طرز کا فیشن انہیں پسند آجائے) تو یقین مانئے کہ بالکل ویسا ہی بلکہ اُس سے بہتر جب تک، وہ اپنے ہاتھ سے تیار نہیں کریں گی انہیں چین نہیں آئے گا۔ ان میں سیکھنے کا شوق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ہر کسی کی وہ بات یا کام جو انہیں پسند آجائے ضرور سیکھ کر دم لیں گی" جستجو" بھی اُن کی ایک فطرت ہے۔ وہ دنیا کی ہر قسم کی معلومات و حالات اپنے میں جذب کر لینی ہیں خبروں یا کسی میچ کی کمنٹری کے وقت اگر انہیں تلاش کیا جائے تو وہ ریڈیو کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی دلچسپی سے خبریں یا کمنٹری سنتی ہوئی ملیں گی۔

گھر کے دوسرے لوگوں کی زیادہ تر یہی خواہش ہوتی ہے کہ گھر میں رسالے یا کتابیں کم آیا کریں کیونکہ وہ کتاب کا کیڑا بھی ہیں کوئی کتاب ہاتھ لگ جانی شرط ہے۔ وہ اس کو ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اگر کبھی کوئی بے حد موٹی تازی کتاب مل جائے گی (چاہے وہ مخزن ہو یہ پیتھک ہی کیوں نہ ہو) ایسا معلوم ہوگا جیسے امی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کہہ اُٹھتا ہے" ارے یہ موٹی موٹی کتابیں کہاں سے آجاتی ہیں۔ خدا کے لئے انہیں نہ لایا کرو"۔ مگر امی تو چشمہ لگائے کتاب میں اس قدر غرق ہوتی ہیں کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے یا ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ کتاب ختم ہونے کے بعد وہ ان کے ذہن میں اس قدر سما جاتی ہے کہ اکثر کئی کئی دن وہ اسی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ کتابوں کی وجہ سے وہ اپنا آرام تک بھول جاتی ہیں (جس کی انہیں اشد ضرورت ہے) انہیں یہ تک خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں، کیا کرنا ہے، ضروری سے ضروری کام کتاب ہاتھ میں آکر کچھ دیر کے لئے اُن کے ذہن سے نکل جاتا ہے وہ اپنا اچھا خاصا وقت باورچی خانہ میں بھی صرف کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے کاموں میں بھی گھری رہتی ہیں جیسے لکھنا پڑھنا، خطوط کے جواب دینا، یا کسی آئے گئے سے بات چیت کرنا، اور کوئی نہ کوئی کھانا بھی پکتا رہتا ہے یا کسی کھانے میں جدت ہوتی رہتی ہے ورنہ کسی غیر ضروری اور بچے ہوئے کھانے کی شکل اور ذائقہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً رات کا بچا ہوا قورمہ صبح کے کھانے پر بہترین پلاؤ کی صورت میں ملے گا۔ یا دن کی بچی ہوئی دال رات کو کریلوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ سالن کے بچے ہوئے آلو یا اروی شام کی چائے پر کچالوؤں اور چاٹ کا کام دیں گے۔ اور بوٹیاں کبابوں کی شکل اختیار کر لیں گی، صبح کے دودھ پر سے اُتری ہوئی بالائی اگر کسی نے نہیں کھائی ہے تو دوپہر کے کھانے پر پراٹھوں میں نظر آجائے گی۔ کوئی کسی قدر بھی کوشش کرے مگر ان کھانوں کی اصلیت ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔ اُن کے یہ سب کام ایک ہی وقت میں چلتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ محرم کے مہینہ میں شاید دس تاریخ کو دوپہر کے کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ قبل نیاز کے سلسلہ میں کہیں سے کوئی چیز آئی اُس کو دیکھ کر ہم میں سے کسی کی زبان سے نکلا" کاش یہ کھچڑا ہو" اور اس کو صرف کھیر پاکر ہم لوگ اچھے خاصے مایوس ہو گئے۔ مگر جس وقت سب کھانا کھانے بیٹھے تو دیکھا کہ دو ڈونگے بھرے بہترین قسم کے خوشبودار کھچڑے کے میز پر موجود ہیں۔ ہم سب نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا، انہوں نے مسکرا کر صرف اس قدر کہا "تم سب کا کھچڑا کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مجھ سے جس طرح بھی ہو سکا کھچڑا تمہارے واسطے تیار کر دیا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم لوگوں سے خود کوئی کام نہیں ہو سکتا بس زبانی جی چاہ کر رہ جاتا ہے"۔

چنانچہ خوب جی بھر کر وہ مزیدار کھچڑا کھایا گیا اور ایک حضرت کے تو پیٹ میں درد تک کی نوبت آگئی مگر انہوں نے کھچڑے سے ہاتھ نہیں روکا مگر ہم میں سے کسی کو آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس دن والا لذیذ کھچڑا جس کے تیار کرنے میں سنا ہے ایک مدت درکار ہوتی ہے کون سے

بچے ہوئے اور بے مصرف کھلونے کی رُوح تھا۔

ان سب کاموں اور باتوں کے باوجود ان کا دماغ کسی اور ہی فکر میں رہتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی ممکن ہے کسی ناول یا افسانے کا پلاٹ اس میں گھومتا ہو، یہ وہ کسی کو نہیں بتاتیں۔ اُن میں قوتِ برداشت کافی سے زیادہ ہے وہ اکثر لوگوں کی کڑوی کسیلی بات بھی سن کر خاموش ہو جاتی ہیں، بلکہ شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتی ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ زندگی میں کسی سے مخالفت اور دشمنی نہیں پیدا کرنی چاہئے بلکہ ایسی بات ہی نہیں کرنی چاہیے جس سے شر و فساد کی بُو آئے اور اگر اس کوشش کے باوجود مجبوراً کسی سے بدمزگی ہو جائے تو تمام عُمر کے لئے اس سے تعلقات ختم کر لینے چاہئیں۔ اُن کی اس بات سے ایک قسم کی غیرت و خودداری پائی جاتی ہے، اگرچہ وہ خود اس کو اپنی ایک بڑی کمزوری مانتی ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد اُن کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ کبھی کسی کے منہ سے اُن کے بارے میں شکایت کے الفاظ نہیں سُنے گئے بلکہ اکثر لوگ ان کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ عام طور سے وہ خاصی کم گو ہیں نہ کبھی کسی سے ملنے یا بات کرنے میں پہل نہیں کرتیں۔ کسی محفل یا جلسہ وغیرہ میں انجان لوگوں کے سامنے وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔

بعض وقت ان کی خاموشی کچھ ناجائز سی معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ کچھ اُلجھی ہوئی اور بیزار سی نظر آتی ہیں جس کو سب ہی محسوس کرتے ہیں اور وہ اپنی اس عادت سے کبھی کبھی اچھا خاصا نقصان اُٹھا لیتی ہیں کیونکہ وہ ضرورتاً بھی نہیں بولتیں مگر وہ مجبور ہیں اپنی فطرت کو کس طرح بدل سکتی ہیں۔ انہیں خود اس بات کا احساس ہے اس کو بھی اپنی بڑی کمزوری سمجھتی ہیں۔

دیکھنے والے پہلی نظر میں انہیں کچھ مغرور اور متکبر ضرور سمجھتے ہوں گے مگر جتنا زیادہ وقت وہ اُن کے ساتھ گزارتے ہوں گے ان کی رائے یقینی طور پر بدل جاتی ہوگی کیونکہ طبعیتاً وہ منکسر المزاج ہیں۔

اکثر لوگ ان سے ملنے یا آٹو گراف وغیرہ کی قسم کی چیزوں کے لئے ان کے پاس آتے رہتے ہیں جس میں زیادہ تر کالج کے لڑکے لڑکیوں کا حصّہ ہوتا ہے، ایسے موقعوں پر گھر والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ تکلّف کرکے آنے والوں سے ملیں مگر ان کا جواب ہوتا ہے "نہیں میں جس حالت میں ہوں اسی طرح سب سے ملوں گی میرا یہی دستور ہے میں لوگوں پر بناوٹی رعب جمانا نہیں چاہتی"۔ اور وہ اسی حالت میں سب سے ملتی ہیں چاہے اس وقت وہ باورچی خانہ میں بیٹھی پسینہ میں شرابور ہی کیوں نہ ہو رہی ہوں یا ہاتھ میں کھُرپی لئے کسی کیاری وغیرہ میں پانی لگا رہی ہوں، گھر والے ان کی اِس عادت سے جِز بِز ہو کر رہ جاتے ہیں مگر ان کو ایسی باتوں کی قطعی پروا نہیں ہوتی، وہ اپنے لئے کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتیں بہت ہی سادہ قسم کا لباس پہنتی ہیں مگر دوسروں کے لئے بناؤ سنگار اور تکلفات کو ایک قسم کا ہُنر اور سلیقہ خیال کرتی ہیں۔

وہ وقت اور موقعہ پر ہر قسم کی عادت ڈال لیتی ہیں اور زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر حد سے تجاوز نہیں کرتیں۔ بلکہ وقت کی بہتر اور آسان روش اختیار کرتی ہیں اسی وجہ سے انہوں نے اپنے کوئی سخت اُصول نہیں بنائے جو بدلے نہ جا سکتے ہوں وہ کہتی ہیں کہ بیحد سخت اصول بعض وقت انسان کو بڑی ذہنی اُلجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اُن کے پاس آنے والے لڑکے لڑکیاں اُنہیں جدید قسم کی الٹرا ماڈرن سمجھ کر خاصی تیاری کرکے ملنے آتے ہیں اور اُن کی سادگی اور گھریلو پن دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں، مگر جیسے جیسے وہ اُن سے بات کرتے ہیں، اُن کی شخصیت سب پر چھانے لگتی ہے اور اُن سے مل کر کوئی مایوس نہیں ہوتا بلکہ لوگ گرویدہ ہو جاتے ہیں، وہ عمر اور شخصیت کا لحاظ رکھ کر سب سے بات کرتی ہیں لڑکے لڑکیاں اُن کی صحبت میں اپنائیت پاتے ہیں اور بڑی عمر والے انہیں خود سے زیادہ تجربہ کار اور ہوش مند سمجھتے ہیں۔ اُن کی گفتگو سطح سے اُبھری ہوئی، کھلی اور صاف ہوتی ہے۔

وہ اپنے آپ کو کسی سے بیجا بے تکلف نہیں ہونے دیتیں، ان کا خیال ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اکثر بدمزگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے وہ کسی کی بات میں قطعی مداخلت نہیں کرتیں اگر اُن کے سامنے دو شخص آپس میں لڑتے ہوں تو انہیں بالکل اعتراض نہیں ہوگا۔ ان کا

مشاہدہ بے حد وسیع ہے وہ چہرہ دیکھ کر بڑی آسانی سے انسان کے عادات و اطوار کا پتہ لگا لیتی ہیں بقول شخصے وہ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتی ہیں۔ ان کی نگاہوں سے بچ کر اور چھپ کر کوئی کام کرنا بڑا مشکل ہے، وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ تاڑ جاتی ہیں۔ اور حافظہ تو ایسا پایا ہے کہ رشک ہوتا ہے معلوم نہیں کس کس زمانہ کی لوگوں کی سُنی سُنائی باتیں تک انہیں ازبر رہتی ہیں اور واقعات تو انہیں ایسے یاد رہتے ہیں جیسے وہ ابھی ہو چکے ہوں۔

صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ اب بعض وقت زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ مجمع عام میں جانے سے پرہیز کرتی رہتی ہیں اور اچھی اچھی ادبی محفلوں سے گریز کر جاتی ہیں۔ بارہا ریڈیو کے پروگرام جو انہیں اکثر پیش ہوتے رہتے ہیں مسترد کر دیتی ہیں۔ اُن میں قوتِ تقریر بہت کم ہے وہ اپنے آپ کو برسرِ عام پیش نہیں کر سکتیں۔ وہ بحالتِ مجبوری کسی بڑے جلسہ یا پارٹی وغیرہ میں شرکت کرتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں روک ٹوک اور جھجک کافی سے زیادہ ہے وہ کبھی بے دھڑک اور آزادی سے کوئی کام یا بات چیت نہیں کر سکتیں۔ نہ سوچ بچار کی عادی ہیں۔

یہ تو ہیں ان کی عادتیں اور خصلتیں مگر اب آخر میں اُن کے مختصراً خاندانی حالات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ اس تاریکی میں بھی روشنی پڑ جائے

ان کا نام امت الرحمٰن ہے وہ ۱۹۱۰ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں خواجہ میر درد کی بارہ دری کے قریب اپنے دادا صاحب کے مکان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے دادا مولوی محمد یوسف صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی کے نواسے شاہ اسحاق صاحب کی اولاد میں تھے۔ اور ان کی دادی صاحبہ خواجہ میر درد صاحب کی اولاد میں تھیں۔ امّی صاحبہ کی عمر مشکل سے سات سال کی ہو گی کہ اُن کے والد مولوی محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہو گیا اور جب وہ چودہ سال کی ہوئیں تو والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان کی شروع کی تعلیم اور پرورش ریاست بھوپال میں ہوئی کیونکہ اُن کے دادا صاحب بھوپال میں مجلسِ علماء کے رکن اور جاگیردار تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنی دادی صاحبہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلی گئیں اور تین سال تک وہاں رہیں۔

اُنیس کی عمر میں اُن کی شادی اپنے ماموں خان بہادر ڈپٹی سید بہاء الدین کے لڑکے سید ظہیر الدین سے ہو گئی۔

یہ ہیں اُن کے مختصر سے خاندانی حالات۔ شادی کے بعد ہماری امّی زیادہ تر دہلی سے باہر رہیں۔ کیونکہ ہمارے پاپا یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ امّی کو بچپن ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مگر خاندانی روایت کے مطابق اس زمانہ میں لڑکیوں کو اسکولوں کی تعلیم دلانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے جس قدر بھی سیکھا اور لکھا پڑھا، سب اپنے شوق اور جستجو کا نتیجہ ہے۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ عصمت میں شائع ہوتے رہے۔ جن میں "سچ کا چرچہ" اور "شین کی شورش" خاص طور پر مقبول ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "شمع" ۱۹۳۹ء ہی میں مکمل ہو گیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا اور اسی جنگ کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی میں بھی کشمکش اور انقلاب پیدا ہونے لگا۔ ۱۹۴۰ء میں ہمارے پاپا جو آرمی میں کیپٹن بھی تھے لڑائی کے سلسلے میں ملایا بھیج دیئے گئے۔ امّی اور ہم پانچوں بھائی بہن دہلی میں اپنے دادا خان بہادر سید بہاء الدین صاحب کے پاس رہے اور ایک سال تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا اور پھر امی نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے علی گڈھ میں کوٹھی بنوا کر وہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۲ء میں سنگاپور انگریزوں کے قبضہ سے نکل کر جاپانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا یعنی انگریزی فوجوں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سال تک ہم لوگ اپنے پاپا کی طرف سے ایک امید و بیم کی حالت میں وقت گزارتے رہے۔ اس عرصہ میں "شمع" اور اس کے بعد "تصویر" شائع ہو چکی تھیں۔ تین سال بعد انگریز حکومت نے پاپا کے لڑائی میں کام آجانے کا اعلان کر دیا۔ اور امید کی ہلکی سی آخری کرن بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

اب امّی کی زندگی میں ہر طرف انقلاب اور مشکلات کا طوفان تھا۔ جو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے بھی ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا یعنی اُسی زمانہ میں پاکستان وجود میں آگیا۔ وہ بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائی بہنوں کی طرح وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں اور لاہور میں

سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں آکر انہیں جن جن مشکلات اور پریشانیوں اور جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ مشکل ہی سے کسی خاتون کو کرنا پڑا ہوگا اور انہیں اب تک کسی قسم کا ذہنی سکون میسّر نہیں ہوا ہے انہی مشکلات اور اُلجھنوں کی وجہ سے اب اُن کی صحت بالکل خراب ہو گئی ہے اُن کے اعصاب پر بہت خراب اثر پڑا ہے، مگر وہ اپنی تکالیف کو ٹالنے کی بہت کوشش کرتی ہیں۔ اور اِس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود ہر قسم کے تفکّرات اور پریشانیوں کے جو اُنہیں گھیرے رہتی ہیں، اُنہوں نے کبھی اس کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے دیا۔ بلکہ اپنی اولاد تک کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ خود ہر مشکل بہت ہنس کھیل کر جھیل لیتی ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُن جیسی بلند حوصلہ باہمت اور وسیع النظر خاتون مشکل سے ملے گی۔

اس چھوٹے سے خاکے میں اگرچہ ابھی بہت کچھ تشنگی باقی ہے پھر بھی اے۔آر۔خاتون کی دھندلی سی جھلک ضرور ملے گی۔ مگر اس کو پڑھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ "گھٹنے پیٹ کی طرف جھکے ہیں۔"

(۳)

زشرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے

اقبال

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

(سید احتشام حسین)

اکبر کو اپنے عہد کے الٰہ آباد میں اپنے اور امرودوں کے سوا کچھ بہبود کے وسیلے سے سامان بالکل نظر نہ آئے۔ مجھے معلوم نہیں الٰہ آباد سے پہلے الٰہ آباد میں کسے ایسی شہرت اور اہمیت حاصل تھی جیسے وہاں کے امرودوں کے ساتھ یاد کیا جاتا ہو اور یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ الٰہ آباد کے امرودوں کو کس زمانے میں وہ انفرادیت نصیب ہوئی جب اُن کا ذکر دوسری جگہ کے امرودوں سے الگ کیا جانے لگا لیکن اپنے زمانے کے الٰہ آباد کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے جن لوگوں کو جانے بغیر الٰہ آباد کی معرفت ادھوری رہ جاتی تھی ان میں ایک ذات پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ، صدر شعبہ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی ہے۔ امرود اب بھی اپنی جگہ پر ہیں لیکن انسان ایک زمانے کے بعد جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ اعجاز صاحب اس سارے مضمون میں انہیں ان کے نام سے یاد کیا جائے گا، ... ساتھ ذہنی ہم آہنگی ... ہوں لیکن وہاں کے امرودوں کی بُرائی نہیں سُن سکتے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب اکبر کی بُرائی سُن لیتے تھے ... الٰہ آباد ... نہیں خیر تو ذکر ہے اعجاز صاحب کا اور اُن کی انفرادیت کے پیشِ نظر میں انہیں اکبر یا امرود کے ساتھ ملا کر نہیں دیکھنا چاہتا اگرچہ ان کا تعلق دونوں سے ہے۔ اکبر پر انہوں نے ہندی میں ایک کتاب لکھی ہے اور امرودوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اکبر تو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، امرود دکھاتے اور کھلاتے ہیں۔

اعجاز صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہو گیا جنہیں میں اب بھی اُن کی ذات اور شخصیت کا جُزو سمجھتا ہوں، یہ خصوصیات شعر و ادب سے متعلق نہیں، انسان کی روزمرہ کی اخلاقی، سماجی اور عملی زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہاں اپنے متعلق کچھ کہنا ناگزیر ہوگا اور اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

اعظم گڑھ سے ۱۹۳۰ء میں ہائی سکول کرنے کے بعد میں نے مزید تعلیم کے لئے الٰہ آباد کا رُخ کیا۔ وہاں کچھ آسانیاں تھیں اور میری قدرے محدود زندگی کے لئے اس اہم علمی اور سیاسی مرکز میں ایک کشش، چنانچہ وہاں دو برس گورنمنٹ انٹر کالج میں پڑھتا رہا۔ اس دو سال میں اعجاز صاحب کا نام تو میں نے کبھی کبھی سُنا لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ چوک میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ آتے جاتے میں اس پر بھی ٹھہر جاتا تھا۔ کتابیں خرید تو مشکل سے سکتا تھا لیکن نگاہوں کی دعوت ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک نئی کتاب نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا تو ایک تازہ تصنیف

تھی "آئینۂ معرفت"، مصنف کا نام سید اعجاز حسین۔ دوکان پر جو بوڑھے میاں بیٹھے تھے، انہوں نے مجھے بہت زیادہ پُرشوق دیکھ کر چند جملے کتاب کی تعریف میں کہے اور مصنف کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ میں نے اُن کی آنکھیں بچا کر اپنی جیب ٹٹولی تو کتاب کے آدھے دام بھی نہ تھے، چلا آیا اور اس کتاب کے پڑھنے کے لئے بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کا سوال تھا۔ وہ سہارا ختم ہو چکا تھا جس کے بھروسہ پر الٰہ آباد میں تھا۔ کوئی نوکری تلاش کروں یا پڑھوں۔ اسی کشمکش میں تھا کہ میرے دو بھائی اور دوست سید محمد شفیع مرحوم اور سبط حسن آ گئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ بی اے میں نام لکھا لو، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ وہی سبط حسن ہیں جو پاکستان کی جیلوں میں کئی سال کی قید و بند جھیل کے اب لاہور میں ایک صحافی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ شفیع بھائی مرحوم نے اسی سال بی اے پاس کیا تھا، سبط حسن بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ جب یہ لوگ الٰہ آباد جانے لگے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ یونیورسٹی پہونچ کر نام لکھا لیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات میرے امکان میں نہ تھے۔ چاہتا تھا کہ دوسرے طلبہ کے ساتھ کہیں قیام کروں اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔ شام کے وقت شفیع بھائی مرحوم مجھے ساتھ لے کر نکلے اور اپنے بعض جاننے والوں سے ملے کہ میرے قیام کی کوئی صورت نکل سکے۔ جب سب دوستوں سے مل ملا کر واپس آنے لگے تو شفیع بھائی مرحوم نے کہا چلو تمہیں اعجاز صاحب سے بھی ملا دیں، بہت اچھے آدمی ہیں۔ اعجاز صاحب اُن دنوں محلہ راجہ پور میں گنگا کے کنارے اپنے ننہالی مکان میں رہتے تھے۔ اندر مکان بہت بڑا تھا لیکن باہر ایک کمرہ تھا جس میں کچھ زیادہ سامان نہ تھا، ایک میز اور چند کرسیاں۔ بے ترتیبی سے پڑی ہوتی تھیں، لکھنے پڑھنے کا سامان تھا نہ کتابیں۔ سامنے صحن تھا جہاں سے دریائے گنگا اور اس کے گرد و پیش کا برساتی منظر دکھائی دے جاتا تھا۔ اطلاع کراتے ہی اعجاز صاحب باہر تشریف لائے، اخلاق اور گرمجوشی سے ملے، ایسا اخلاق جو تصنع سے سراسر معرا ہوتا ہے، صاف شفاف شیشے کی طرح، جس کے پار دیکھا جا سکتا ہے۔ کمرے کے سامنے ہم لوگ صحن میں بیٹھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اس دن کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن یہ یاد ہے کہ جب میرے قیام کے لئے کسی جگہ کی تلاش کا سوال آیا تو کہا کہ جب تک کہیں انتظام نہیں ہو جاتا یہیں رہیں، یہ کمرہ خالی ہی تو رہتا ہے۔ کچھ تکلفات اور عذر معذرت کے بعد یہی بات طے ہو گئی، اعجاز صاحب کا اصرار دوسرے خیالات اور تاملات پر غالب آیا۔ میں چند دنوں میں وہیں اُٹھ آیا اور چند دن قیام کرنے کا ارادہ کم و بیش چھ سال کے قیام میں تبدیل ہو گیا۔

انہیں دنوں ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ گرمیوں کی تعطیل کے زمانے میں جب وطن میں مقیم تھا اور سبھی عزیز اور دوست اکٹھا تھے کسی سلسلہ میں یہ طے پا گیا کہ چھ مہینے تک بال نہ ترشوائے جائیں۔ بالوں پر تقریباً دو مہینے گذر چکے تھے جب میں اعجاز صاحب کے یہاں آیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہتی۔ چند دن تو اعجاز صاحب نے میرے بالوں کی بے ترتیب باڑھ کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ شاید کوئی زبردست انقلابی اور آشفتہ سر [illegible] ہے لیکن جب ان بالوں کی کوئی خاص علامت مجھ میں نظر نہ آئی تو انہوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا، احتشام صاحب! آپ بال کیوں نہیں ترشواتے؟ میں جانتا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ سوال ضرور اُٹھے گا، میں نے کہا فرصت نہیں ملی، اگلے اتوار تک بنوا لوں گا، اور اگلا اتوار بھی گذر گیا۔ اب کچھ ایسا تھا کہ اعجاز صاحب سے دیر دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔ گھر، خاندان، تعلیم، ادبی دلچسپی اور تفریحی مشاغل کا ذکر آتا تھا۔ آخر انہوں نے ایک دن کسی قدر سختی سے کہا، آخر بات کیا ہے کہ آپ بال نہیں ترشواتے، کیا پیسے نہیں ہیں؟ میں نے سوچا اب اتنی دور بیٹھ کر کسی شرطیہ پابندی اس طرح کرنا کہ دیکھنے والوں کو ناگوار گذرے، حماقت ہے، میں نے کہا، کل ضرور بنوا لوں گا۔ اتفاقاً دوسرے دن دوستوں کے دستخط سے خط آ گیا کہ بال کٹوا ڈالو کیونکہ ایک صاحب کو ٹائیفائڈ ہو گیا اور ڈاکٹر نے "رسمِ موتراشی" ادا کرا دی، اب کسی پر پابندی نہیں۔ میں نے اعجاز صاحب کو وہ خط دکھایا اور بال ترشوانے چلا گیا۔ انہوں نے اس عجیب و غریب عہد و پیمان سے جو لطف لیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ لطیفہ یوں لکھنا پڑا کہ چند ہی دن میں مجھے اعجاز صاحب کے مزاج، اندازِ فہمائش اور اندازِ گفتگو کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا۔ وہ نہ تو کسی کے ذاتی معاملہ میں ضرورت سے زیادہ اُس کے پیچھے پڑتے ہیں۔ نہ اس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ ناگوار ہو، نہ یہ ظاہر ہونے دیتے ہیں کہ چلو جی ہمیں اس سے کیا مطلب۔ مزاج کی یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کے دوستوں اور شاگردوں کو اُن کا گرویدہ بنا تی ہے۔ اعجاز صاحب اپنی محبت، شفقت اور ذاتی توجہ سے ہر شخص کی نجی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور بہت جلد تکلف، تصنع اور دوری کی وہ حدیں ٹوٹ جاتی ہیں جو ابتدائی ملاقات میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اُن کے تمام دوستوں اور شاگردوں نے اس سحر کاری کا تماشا دیکھا ہے۔

بی اے میں میں نے جو مضامین لیے اُن میں اُردو ادب بھی تھا۔ مجھے اُردو سے دلچسپی تھی، کچھ اُلٹا سیدھا لکھتا بھی تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، جو کتاب ہاتھ لگتی پڑھ بھی لیتا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری زندگی میں اُردو کی کیا جگہ ہے لیکن یونیورسٹی کے باہر میں نے اعجاز صاحب کو اُردو زبان و ادب ہی کے عشق میں سرشار پایا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اُردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا اور بات ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے۔ اعجاز صاحب نے کبھی واضح الفاظ میں مجھے اس کی تلقین نہیں کی، مجھے خاص طور سے اُردو لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہیں کیا لیکن وہ جس طرح اپنی زبان سے دلچسپی لیتے تھے، اُٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرتے تھے، شعر سے لذت لیتے تھے، ان میں ایک چھوت کی سی کیفیت تھی۔ ان سے ہو کر اُردو دوستی کی برقی لہریں دوسروں تک پہنچتی تھیں اور اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی تھیں چنانچہ مجھے زبان و ادب کے متعلق کچھ نئے تجربے ہونے لگے۔

ان دنوں اعجاز صاحب مختصر تاریخ ادب اُردو لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب اس طرح لکھی جا رہی تھی کہ چند صفحے لکھ کر کاتب کو دیئے جاتے تھے، کتابت کی تصحیح ہو کر کاپیاں پریس کو بھیج دی جاتی تھیں۔ پروف پڑھے جاتے تھے اور کتاب چھپتی جاتی تھی۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اعجاز صاحب کے بعض ایم اے کے طلبا اُن کے پاس آ جاتے ہیں۔ کتاب کے بعض مباحث پر بحث ہوتی ہے۔ کچھ حصے پڑھے جاتے ہیں، تنقید ہوتی ہے، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کام نہیں رکتا۔ ان شاگردوں میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ذوالفقار عظیم، طالب الہ آبادی، عقیل قدوائی ہوتے اور میں دخل در معقولات کا مرتکب ہوئے بغیر ان دلچسپیوں میں شریک رہتا۔ دو چار ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کاپیاں اور پروف دیکھتے دیکھتے ہو گئے۔ چھوٹے موٹے مشوروں میں بھی شریک کیا جانے لگا اور کبھی کبھی لائبریری سے بعض کتابوں کے حوالے تلاش کرنے کا کام بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ مجھ سے کم تر ادبی ذوق رکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا بھی ہوتا تو ان باتوں سے فائدہ اُٹھاتا۔ میں نے جو کچھ بن پڑا سیکھا۔ اعجاز صاحب کا یہ عمل آج تک جاری ہے۔ وہ کتاب چھپا کر نہیں لکھتے، اس کا ڈھنڈورا بھی نہیں پیٹتے، بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتے، خاکہ بنانے سے لے کر آخر منزل تک دوستوں اور شاگردوں سے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ مشورے سے گریز نہیں کرتے، آسانی سے اپنی رائے نہیں بدلتے لیکن اپنی بات پر اَڑتے بھی نہیں۔ جب وہ مشورہ کرتے ہیں تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ واقعی وہ کوئی کتاب یا مضمون لکھنے والے ہیں بلکہ یہی خیال ہوتا ہے کہ شاید کوئی خیال آ گیا ہے اور اس پر گفتگو کر رہے ہیں لیکن سارا مواد اُن کے ذہن میں یکجا ہوتا رہتا ہے۔ اب کتاب یا مضمون لکھنے کا ذکر آ گیا تو اس بات کو مکمل ہی کر دوں۔

اعجاز صاحب جو کچھ لکھتے ہیں اُس کا خاکہ زیادہ تر صبح کی سیر میں مرتب ہوتا ہے اور کئی دن تک ذہن ہی میں اس کی ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ سورج نکلنے سے پہلے ہی لکھا بھی جاتا ہے۔ دن کی شورش میں وہ عموماً سنجیدہ اور غور و فکر سے لکھے جانے والے مضامین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ رات کے وقت بھی شاذ و نادر ہی لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ اپنے موضوع کے متعلق برابر سوچتے رہتے ہیں اس لیے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو تیز لکھتے ہیں اور عام طور سے زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتے۔ مضامین کو دہراتے بھی کم ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے انہیں نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اس بات کا تعلق کسی حد تک اعجاز صاحب کے مزاج سے بھی ہے جس میں ایک

فطری نشست روی کے ساتھ سب تک کام کو خاتمہ تک پہونچانے کی دُھن کا امتزاج ایک خاص انداز سے ہوا ہے۔ اس کا اثر اُن کی گفتگو، تحریر، تقریر اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے اعجاز صاحب نے اس خاموشی سے اس کام کو انجام دیا ہے کہ شاید ان کے بہت سے شاگردوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ اس وقت تک اُن کی ہندی اُردو ملا کر آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دو ایک کتابیں زیرِ تصنیف ہیں جن میں سے ایک تو جلد ہی طباعت کی منزلوں سے گزرنے والی ہے۔ "آئینۂ معرفت" "مختصر تاریخ ادبِ اُردو" جس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں کافی ترمیم ہوتی رہی ہے) "نئے ادبی رُجحانات" (نیا ایڈیشن) "مذہب اور شاعری"، "ملک الادب کے شہزادے"، "انتخابِ آتش"، "مہاکوی میر" (ہندی)، "اکبر الٰہ آبادی" (ہندی)؛ یہ کتابیں تو گہرے تنقیدی مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں لیکن مضمون کی نوعیت ان کے سرسری جائزے اور تعارف سے بھی روکتی ہے تاہم اتنا کہنا ضروری ہے اُردو ادب کے طالب علموں کو اعجاز صاحب سے اس سے زیادہ واقف ہونا چاہیئے جتنا وہ اس وقت واقف ہیں۔ یہ تو صرف تصنیف کا ذکر ہے جن میں ادبی مضامین شامل نہیں ہیں، جن کی تعداد کافی ہے لیکن یہ بات تو بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ اعجاز صاحب ایک مدت سے شاعری کی دیوی کے قدموں میں بھی اپنے قیمتی افکار چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ کلام جن عن الصباح تاروں کی چھاؤں میں ٹہلتے ٹہلتے ہوا ہے کیف، نیئی تال اور مسوری کی فضا بھی شعر کہنے پر اکساتی ہے اور کئی نظمیں ان فضاؤں کی یادگار ہیں۔ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں لیکن انہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ بس مخصوص لوگ ہیں جنہیں اُن کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی خاص مشاعرے کے لئے کسی دوست یا بزرگ کے اصرار پر کوئی غزل لکھی ہے ورنہ زیادہ تر غزلیں ذاتی تجربے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اعجاز صاحب کو شاعری کا یہ ذوق اپنے نانا سید حسین صاحب فوق مرحوم سے ملا جن کا سلسلۂ تلمذ آتش سے ملتا تھا۔ اپنی شاعری کے متعلق ایک دفعہ اعجاز صاحب نے میرے ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھا کہ "آٹھ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن نانا مرحوم کلام پر اصلاح دینے کے لئے راضی نہیں ہوتے تھے۔ لیتے تھے دیکھ لیتے تھے کہہ دیتے تھے کہ ابھی اسے آگے کوئی سال رہنا ہے۔ ۔۔۔ اس سے پہلے تو میری ماں کی بڑی بہن یعنی میری خالہ نے ادھر توجہ کی تھی جو میری غزلیں دیکھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں سید مہدی حسن ناصری مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ کالج کے علاوہ اُن سے گھر پر بھی ملتا تھا۔ ان کی صحبت ایک درس گاہ تھی۔ تنوع کی گفتگو میں علمی مسائل، زندگی و تہذیب، بزرگانِ ادب سے ذکر سے برابر آتے رہتے۔ میں کلاس میں اُن سے عربی پڑھتا تھا۔ گھر پر اُردو کی باتیں ہوتیں۔ نانا کی آنکھیں جواب دے رہی تھیں تو خیال سے میرے ہمعصر کی اصلاح کا کام بھی باقاعدہ ناصری صاحب کے سپرد کر دیا۔ تقریباً دو سال تک اصلاحِ سخن میں بھی ناصری مرحوم ہی سے فیض اُٹھایا۔"

یہ تو اعجاز صاحب کا بیان ہے۔ میں نے خود انہیں ہمیشہ اپنے نانا مرحوم اور ناصری صاحب مرحوم کا ذکر بڑے ادب اور عقیدے کے ساتھ کرتے ہوئے سنا ہے۔ ناصری صاحب کے انتقال پر انہوں نے ایک پُر درد مرثیہ حالی کے مرثیۂ غالب کے تتبع میں لکھا تھا۔ یہ سب چھوٹے لیکن سنجیدگی سے اعجاز صاحب کی دلچسپیوں کا بہت کم ہی نہیں ہے۔ بہت کم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے اس کا بہت تھوڑا سا حصہ اُن کے پاس محفوظ ہے۔

اعجاز صاحب کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی تصویر کئی آئینوں میں دکھائی جا سکتی ہے جیسے ادب اور زبان کی خدمت اور ایک معتمد کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں وہ کسوٹیاں ہیں جن پر انہیں پرکھا جا سکتا ہے جو شخص انہیں ایک انسان کی حیثیت سے نظر انداز کرے گا۔ ان کے طرزِ زندگی اور ارتقاء کے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کرے گا وہ انہیں سمجھ نہیں سکے گا۔ اس کے لئے مختصراً اُن کے حالاتِ زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اعجاز صاحب اگست ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ننھیال مرحوم سید پور شہر الٰہ آباد میں تھا اس کو اپنا گھر جانا۔ والد مرحوم کی کمائی سے غریب اور کم پڑھے

لکھے آدمی تھے۔ اس لئے نانا ہی نے پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی۔ ابتدائی زندگی نازو نعم میں بسر ہوئی لیکن جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی گھر کی حالت خراب ہوتی گئی۔ پانچ چھ سال کے اندر والدہ اور ان کی تین بہنوں کا انتقال ہو گیا اور نہ جانے کس طرح خاندان کی مالی حالت بھی تقسیم ہو گئی۔ ابتدا میں فارسی عربی پڑھی، پھر انگریزی اسکول میں نام لکھایا۔ ریاضی سے ان کی طبیعت [illegible] ثابت ہوئی اور انٹرنس میں دو سال کی ناکامیابی کے بعد کلکتہ جا کر وہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کلکتہ میں زندگی [illegible] سے بسر ہوتی تھی، بعض بعض ناقے کی نوبت بھی آتی تھی لیکن یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے شوق نے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ ابھی بی اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ شادی ہو گئی۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن شادی میں کسی حد تک اعجاز صاحب کی پسند یدگی کو بھی دخل تھا۔ اس لئے مالی دشواریوں کے باوجود یہ ذمہ داری خوش گوار تھی۔ لوگوں کے مشورے اور ضرورت اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ نوکری کر لی جائے لیکن جب ۱۹۲۶ء میں بی اے سے فراغت حاصل ہوئی تو آگے پڑھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اسی زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں اردو ایم اے کی ابتداء ہوئی۔ [illegible] شوق کو ایسا مہمیز کیا کہ تمام دشواریوں کو نظر انداز کر کے نام لکھا لیا اور ۱۹۲۹ء میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی نے اردو میں ریسرچ اسکالر بنا دیا اور سال بھر بعد لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ مالی حالت کچھ بہتر ہوئی [illegible] اب ضعیف العمر نانا کی خدمت کی جائے لیکن اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ نانا نے معمولی سی زمینداری اور کچھ مکانات چھوڑے تھے [illegible] وارث اعجاز صاحب تھے۔ [illegible] مکان میں رہتے تھے وہ بھی نانا صاحب [illegible] تھا [illegible] کے کنارے [illegible] سے کچھ مکان کا ذکر کیا [illegible] کی ملازمت [illegible] معلوم ہوا [illegible] رہنے سے الجھن تھی۔ [illegible] اپنے پرانے مکان سے کوئی ڈھائی تین میل دور [illegible] اور ۱۹۳۲ء میں [illegible] بعد کی بات ہے [illegible] نکلا اور ۱۹۳۳ء میں [illegible] پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

[illegible] اعجاز صاحب کی زندگی اور کردار کے سمجھنے میں اہمیت رکھتا ہے [illegible] ان کو بہت بڑی [illegible] عقیدت ہے [illegible] نہیں کسی [illegible] سے نہیں [illegible] کتابیں، کاغذ، قلم دوات [illegible] کتاب کے [illegible] درج کرتے ہوں۔ کتاب شروع ہو جاتی ہے اور سامان اٹھا کر [illegible] تین سال کی ملازمت [illegible] کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے [illegible] مکان بنا کے کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ لیکن [illegible] دلوں میں ایک [illegible] خواہش پیدا ہوئی۔ اگر چہ وہ بہت سی الجھنیں اپنے ساتھ لائی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اعجاز صاحب [illegible] میں [illegible] پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی [illegible] کی طرف متوجہ ہو سکے تو وہ ان کی [illegible] خوبصورتی [illegible] خیالات کو [illegible] سے [illegible] وقت [illegible] کبھی [illegible] کا اندازہ [illegible] اعجاز صاحب کے ایک بہت [illegible] ایک دن بڑے سویرے آ گئے اور اعجاز صاحب کو اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے گئے۔ انھوں نے تقریباً [illegible] ہزار روپے [illegible] اعجاز صاحب [illegible] لیکن اعجاز صاحب اس طرح سوچنے کے عادی نہیں ہیں اور نہ انھیں کبھی اس کا خیال آیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اچانک استاد سید ماجد علی صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا اور جلسہ

صاحب ایک بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب اعجاز صاحب نے بغیر شکوہ و شکایت کے ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر، اپنا پسندیدہ مکان کرایہ پر اٹھا کر برسوں میں اس قرض کا ایک بڑا حصہ ادا کیا۔ ساری جسمانی، ذہنی اور مالی کوفت انہوں نے بڑی خاموشی سے جھیل لی۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور ضرورتوں کی وجہ سے بوجھ جتنا ہلکا ہوتا تھا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا۔ ان باتوں نے ان کی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت پر زبردست اثر ڈالا جسے وہ اب تک بھگت رہے ہیں لیکن وہ نہ زمانے کے شاکی ہیں اور نہ ماضی کے مرثیہ خواں، نہ لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہمدردی سے خوش ہوتے ہیں نہ قسمت کے گلہ مند۔ انہیں مستقبل پر بھروسہ ہے، اور ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

یہی مستقبل پرستی اُن کے سیاسی تصوّرات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عملاً اور عقلاً اشتراکی نظام کے حامی ہیں۔ سیاسی کاموں میں حصّہ نہیں لیتے لیکن ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ہر اُس سیاسی اقدام کو قبول کرنے اور لبیک کہتے ہیں جو ترقی پسندانہ ہو اگرچہ اس میں جذباتیت کا بھی اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔

اعجاز صاحب کی زندگی بہت سے قانون اور قاعدوں کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی۔ سرکاری اور غیر سرکاری ہر کام ایک غیر رسمی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں یا اُن کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے اُسے اس کے سارے غیر ضروری لوازم کے ساتھ انجام دینے کے بجائے اپنے ڈھنگ سے پورا کر دیتے ہیں اور اسی بات کی توقع دوسروں سے بھی رکھتے ہیں۔ اُن کے شاگرد بڑی خوشی سے ان کے ہر کام کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انہیں حتی الوسع مایوس نہیں کرتے۔ یونیورسٹی میں طلبا کی دشواریاں کیا ہیں؟ داخلے کے شرائط میں کوئی نقص، فیس کی معافی، وظیفہ کے لئے سفارش، حاضری کی کمی، امتحان میں شرکت کی اجازت، سعی سفارش، نوکری کی تلاش میں مشورہ اور کوشش وغیرہ۔ اعجاز صاحب ان میں سے ہر کام کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اُن کی طبیعت خراب ہو یا کسی اور کام کا وقت ہو، لو دھوپ اور گرمی ہو یا شدید بارش ہو رہی ہو یا کڑکڑاتے جاڑے۔ جب وہ دوسروں کے کام کے لئے نکل کھڑے ہوں گے، اپنی سی کوشش ضرور کریں گے، چاہے سو فیصدی کامیابی نہ ہو۔ اپنے کام کے لئے وہ یہی امید دوسروں سے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مقصد اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

ان تمام خصوصیات میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ جلوہ گری ہوتی ہے وہ ان کے مزاج کی سادگی ہے۔ اس کی جھلک ان کی رفتار گفتار میں، طرزِ تحریر میں، لوگوں سے ملنے جلنے میں، طرزِ معاشرت میں ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ یہ سادگی ہر ایک پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہے۔ میں نے انہیں بڑے لوگوں، شاگردوں اور ادیبوں سے بھی ملتے دیکھا ہے۔ اور راجہ پور کے ناخواندہ یا معمولی لڑکوں سے بھی۔ اُن کا بنیادی انداز مشکل ہی سے بدلتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے خود اُن کی غرضیں وابستہ ہوں یا نہیں کوئی کام اعجاز صاحب سے ہو، چھوٹے چھوٹے لوگ اپنی ضرورت سے ان کا گھریلو نام یا محلہ کا رشتہ ظاہر کر کے اُن کے پاس آئیں، وہ یکساں انہماک سے گفتگو کرتے ہوئے ملیں گے۔ اعجاز صاحب کی گفتگو کا انداز بھی مخصوص ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہیں، اور نکتہ سنجی، خوش طبعی اور بے تکلفی کا انداز پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ طبیعت پر مزاح غالب ہے لیکن اگر بات چیت کو خوشگوار اور غیر سنجیدہ بنانے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس کام کو بڑی خوبی سے پورا کرتے ہیں۔ موقع نہیں ہے کہ ایسے لطیفے اور چٹکلے پیش کئے جائیں لیکن ایک واقعہ بے اختیار یاد آ گیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ ہندی میں ایک استاد ہیں ڈاکٹر رام کمار ورما، ہندی کے بڑے اچھے ادیب، شاعر اور ڈرامے نگار۔ اعجاز صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ادا شناس ہیں۔ میں اس کا مدعی تو نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دن میں اعجاز صاحب کے ساتھ تھا، راستہ میں ڈاکٹر رام کمار ورما کی کوٹھی پڑتی تھی، اُن کے یہاں پہونچ گئے۔ ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سرکاری افسر یا رئیس معلوم ہوتے تھے۔ ورما صاحب نے بے تکلف انداز میں اعجاز صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا بھئی کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی کیا کرتے رہتے ہو، اعجاز صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، اب تمہیں کیا بتاؤں، وہ جو تمہارے گورنر صاحب بہادر ہیں، [illegible]، وہ آئے اور پیچھے پڑ گئے کہ شکار میں چلو، کتنا جھوٹ بولا بہانے

کئے، وہ کمبخت نہ مانا، اور پھر اگر معاملہ شکار ہی تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، کہنے لگا چھوڑو یونیورسٹی میں تمہیں براہِ راست کلکٹر بنوائے دیتا ہوں، بڑی مشکل میں جان ہے، کیا کروں، اس کی دوستی تو وبالِ جان بن گئی ہے، جب دیکھو دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ورما تو اعجاز صاحب کی باتوں کے انداز سے واقف ہی تھے، انہوں نے بھی کہا، مارو گولی کلکٹری پر، کہاں جاؤ گے ہم لوگوں کو چھوڑ کر، بات اسی انداز میں ہو رہی تھی اور جو صاحب بیٹھے تھے، وہ حیران کہ آخر یہ کون شخص ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اُن کو حیرت ہی میں چھوڑ کر ہم لوگ چلے آئے۔ دوسرے دن وہ صاحب اعجاز صاحب کے یہاں آ موجود ہوئے اور پیچھے پڑ گئے کہ [illegible] کے لئے میری سفارش گورنر صاحب سے کر دیجئے۔ انہیں لاکھ یقین دلایا گیا کہ یہ محض مذاق تھا، مگر وہ کسی طرح نہ مانے، آخر اعجاز صاحب نے اُن سے جھوٹا وعدہ کر لیا، پھر مجھے یاد نہیں کیا گزری ——— ایسے دلچسپ قصے برابر پیش آتے رہتے ہیں اور وہ کبھی کسی بزم کو بے کیف اور خشک نہیں بننے دیتے۔ اُن کا مزاج مرنجاں مرنج ہے اور جان بوجھ کر کسی کو تکلیف پہونچانا اُن کی فطرت کے خلاف ہے۔ انہوں نے ایک زمانہ میں تصوّف کا مطالعہ کیا، مذاہب کے ظاہری لوازم سے گزر کر اُن کی بنیادی یک رنگی پر غور کیا اس لئے اُن کے مزاج میں ایک خاص قسم کی فراخ دلی پائی جاتی ہے۔ مذہب، رنگ و روپ، دولت اور افلاس کی بنیاد پر وہ انسانوں میں تفریق نہیں کرتے، بلکہ ان کی اخلاقی زندگی اور انسانی صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح خوشگوار ہوا اور ٹہل کر واپس آ جانے کے بعد بھی سورج نہ نکلے، مناظرِ فطرت کی دلفریبی دل نشین ہو تو وہ صبح کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ تصوّف نے اُن کے کردار اور خیالات پر گہرا اثر چھوڑا ہے جس کے اچھے اخلاقی پہلو ان کی زندگی میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا اعجاز صاحب بہت سی پابندیوں سے گھبراتے ہیں اور مہدی افادی کی زبان میں "عوائدِ رسمیہ" کے قائل نہیں ہیں اسی وجہ سے بڑی بڑی کانفرنسوں میں، شادی بیاہ میں، مجالس و محافل میں، جہاں دیر تک بے قابو رہ کر بیٹھنا پڑے اور دوسروں کے ہاتھ میں وقت کی لگام ہو، شرکت سے گھبراتے ہیں، اگر شریک ہونا ہی پڑے تو کسی وقت چپکے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وقت کی لگام خود اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے مسلسل کسی کام میں لگے رہنا اُن کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے اس وجہ سے ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ مگر جنہیں اُن سے ملتے رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی اکتاہٹ کا سبب آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔

اعجاز صاحب ایک اُستاد کی حیثیت سے غیر معمولی جذب و کشش کے مالک ہیں، انہیں اپنے شاگردوں پر بھروسہ رہتا ہے اور شاگردوں کو اُن پر۔ اُن کا بے تکلف، بے ریا اور تصنّع سے خالی انداز اُن کے طالب علموں کو اُن کے قریب لاتا ہے اور یہ قرب محض رسمی ملاقات سے گذر کر عزیزدارانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُن کے شاگردوں کے ذہن میں اُن کی ادبی اور انسانی حیثیت اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ وہ انہیں جُدا نہیں کر سکتا۔ ان کی ایک کمزوری کا تکملہ دوسری خوبی سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں اُن کی شفیق اور ہمدرد شخصیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہمدردی کا ایک بڑا حصہ ان کو ودیعت ہوا ہے، وہی غلطیوں کا ارتکاب بھی کراتا ہے، کمزوریوں کے روپ میں بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن اُن سے قریب رہنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اخلاقی نقص نہیں ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کوئی شخص الہ آباد جائے اور اعجاز صاحب سے نہ ملے تو اُس کی بدذوقی اور لاعلمی پر مجھے افسوس ہوگا۔

احتشام صاحب

ڈاکٹر محمد حسن

[illegible] کا نقاب ہے۔

احتشام صاحب کی شخصیت [illegible]

[illegible] دراصل کسی عظیم تر حقیقت کا عکس ہے۔

وہ عظیم تر حقیقت [illegible]

[illegible]

" درد و داغ، جستجو و آرزو کا انسان ہے۔ نہ جانے احساس کے کتنے گداز لمحوں اور پگھلا دینے والے تجربات سے اس شخصیت کا خمیر بنا ہے۔"

آپ نے یہ چند شعر کہے ہیں :

کل تو تیرا ان کی یاد آئی تھی　　　آج کیوں ہے فضا اداس اداس

———

جب حریم دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں لیکن چاندنی راتیں نہ تھیں

———

بھول جانے کی آرزو کیوں ہے　　　کیا محبت بھی ہے زمانہ شناس

یہ اس فن کار کی یادگاریں ہیں جو احساس کرتے ہوئے مینا گداز سے اپنا جام لبریز رکھتا ہے جو "دیدنی" کے افسانوں میں دل کے درد کا جوہری بنتا ہے۔ حادثات ہی سے نہیں چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی شکست سے بھی جس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور پھر بھی جس کی شخصیت اپنا آہنگ، توازن اور راستہ نہیں کھوتی۔

بارہ سال پہلے کی بات ہے جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اردو میرا مضمون تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صدر شعبہ تھے۔ آل احمد سرور کی بحث اپنے شباب پر تھی۔ ... اور کلاس کے باہر دریچے کے قریب "اورینٹل ... نہیں" بات بات میں پڑھی جاتی تھیں۔ احتشام صاحب ... اپنے وطن مراد آباد میں ... "نگار" ... پڑھا تھا ... وہ مضامین ... جو ... سے "امامت اور خلافت" کی بحث کے سلسلے میں لکھے تھے یا پھر افسانے تھے جن ... کا رنگ جھلکتا تھا یا ... سی عباس حسینی اور ... کا طرز صاف ابھرتا نظر آتا تھا۔

بہرحال کلاس میں احتشام صاحب کو ... سے دیکھا۔ ترچھی ٹوپی، سیدھی ... شیروانی پہنے ایک متوسط قد اور اوسط درجے کا جسم نظر آیا البتہ انہیں دیکھ کر پہلا احساس ان کے شائستہ اور کافی خوش رو ہونے کا ہوا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو یکایک ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ احتشام صاحب ہم میں سے ہر ایک سے فرداً فرداً باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی تھی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لئے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔

ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا مشکل ہے البتہ ان کے لکچروں ... ٹیکسٹ بک پڑھانے میں بھی بار بار اس کا احساس ہوتا تھا کہ طلباء اور استاد در اصل ایک فکری سفر پر ... ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ کوئی ایک قدم آگے ہے کوئی پیچھے اور احتشام صاحب ایک ... کی طرح جو خود بھی ہم سفروں کی ٹولی میں گھل مل گیا ہے اور ... راہ کی سمت پوشیدہ ... اور ... گلستانوں کو متعارف کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

ان کا پڑھایا ہوا شعر ایک جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے۔ صرف مشکل الفاظ کی تشریح ... ایک بار پوری گفتگو اس مباحثے کی نذر ہو گیا تھا کہ پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتی ہے تو اس کے نفسیاتی، جذباتی یا جمالیاتی اسباب کیا ہیں؟ پھر غالب کے اس شعر کے ساتھ ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

حسرت کے اس شعر کا تعارف ہوا ہے۔

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریٔ دل　　　التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

پھر فانی چلے آئے ؎

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا　　　ل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو غالب کے کلام کے زندہ اور تابناک ہونے کا احساس ہونے لگا۔ جو لوگ پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتے تھے ان کے کانوں میں لوکس کی "A NOKE ON LITIRARY NITICISM" فیرل کی "CONVENTION & RENOET IN POETRY." اور ڈوبل کی "LOVE IN THE NACHIME AGE" کے نام پڑنے لگے اور یوں ہی ہم لوگ کم از کم نفسیات، جنسیات اور مارکسیت کے نام سے روشناس ہونے لگے۔

پھر ان کی ذاتی واقفیت کا یہ حال تھا کہ سال میں چار چھ مرتبہ ضرور وہ صرف یادداشت سے حاضری لے لیا کرتے تھے قبل تقسیم کے لکھنؤ میں بی اے میں اردو طلباء کی تعداد کافی ہوتی تھی لیکن ہر طالب علم کے بارے میں احتشام صاحب کو نہ صرف پوری معلومات ہوتی تھیں بلکہ ہم میں سے زیادہ تر ان کو نجی طور پر جانتے بھی تھے۔

"زمانہ" میں میرا ایک چھوٹا سا افسانہ چھپا تھا۔ احتشام صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے وہ افسانہ پڑھا اور کلاس میں مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ احتشام صاحب ان دنوں ہمارے شعبے میں کیلئے آزاد نظم کے حامیوں میں تھے اور جب مسعود صاحب یا مولانا محمد حسین مرحوم سے ان کے مباحثے ہوتے تھے تو ہم لوگوں میں دو مختلف پارٹیاں بنتیں اور گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔

انہی دنوں میں نے "حلقہ احباب" کے نام سے ایک تحریک یا انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ چند ہم جماعت طلباء جمع ہوتے تھے، اُٹھتے بیٹھتے افسانے پڑھا کرتے تھے اور ان پر بحثیں ہوتی تھیں۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ تھوڑے سے تعلق میں چندہ جمع کر کے "مضراب" کے نام سے رسالہ نکالا جو چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔ ان دنوں ہمارے حلقے کا سب سے کامیاب افسانہ نگار احمد حسن تھا اور مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ وہ افسانے لکھتا رہتا اور "ڈان" اور "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی مسند ایڈیٹری میں اسیر نہ ہوتا تو یقیناً آج صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا۔

اس بے بضاعت حلقے کی صدارت کے لئے ہم لوگوں نے بہت ہی ڈرتے ڈرتے احتشام صاحب سے درخواست کی اور اس کے بعد سے چار چھ سال تک برابر احتشام صاحب ان جلسوں کی صدارت کرتے رہے۔

"حلقہ احباب" کی سیکریٹری شپ نے مجھے احتشام صاحب سے بہت قریب کر دیا۔ گوکل چند رستوگی، احتشام صاحب اور میں نے مل کر حلقہ احباب کا جو سہ سالہ پروگرام تیار کیا تھا اس میں نہ صرف اردو ادب کی تمام تر اصناف کا جائزہ لینے کا ارادہ تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے بعض اہم مقالات لکھانا بھی شامل تھا۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب کا اجمالی خاکہ پیش کرنا اور فنونِ لطیفہ کی اصناف میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ بھی ہماری فہرستِ مقالات میں شامل تھا۔ اس سہ سالہ پروگرام کا افتتاح کرنا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے منظور کر لیا تھا۔

اب یہاں احتشام صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ نہ جانے کتنی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ احتشام صاحب جس حوصلہ کو اپنے ہم نشینوں اور ملنے والوں کے دل میں جگا سکتے تھے اس کا عشرِ عشیر بھی خود ان میں بہت کم جاگتا ہے۔ خود اپنی بابت کہتا ہوں اپنے رفیقوں کے دل میں عمل کا ذوق بیدار کرنا اور جوش پیدا کرنا بہت آسان کام تھا۔ یہی نہیں اکثر مولوی عبدالحق اور خواجہ غلام السیدین جیسے بزرگوں کو دہلی اور بمبئی سے لکھنؤ کھینچ بلانا اور "حلقہ" کے لئے جوش پیدا کر دینا بھی دشوار نہ تھا۔ لیکن خود احتشام صاحب کو اس کے لئے آمادہ کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

ہم سب لوگ دن رات پروگرام بناتے، مقالے لکھنے، جلسوں کی نوعیت کے بارے میں سوچتے لیکن جب ہم یہ ساری تجاویز اور یہ سارے سنہرے خواب لے کر احتشام صاحب کے پاس پہنچتے تو وہ اس کے بارے میں کبھی کبھی ایسی مین میخ نکال دیتے کہ ہمارے سارے ولولے پہ پانی پڑ جاتا۔

ایک دفعہ کا قصہ سنئے۔ سنہ ۱۹۴۶ء کی ایشیائی کانفرنس میں آئے ہوئے ایرانی مندوبین کو میں نے لکھنؤ آنے کی دعوت دے دی۔ خیال یہ تھا کہ یہ لوگ

وقت کی کمی کی وجہ سے دعوت تو کیا قبول کریں گے البتہ ایک شکریے کا خط لکھیں گے اور ہمارا فرض پورا ہو جائے گا۔ "حلقۂ احباب" کے پاس کوئی سرمایہ سرے سے موجود ہی نہ تھا، وقت آنے پر البتہ پچاس ساٹھ روپیہ چندہ کر لیا جاتا تھا۔

ایسی حالت میں ہماری حیرت کا اندازہ لگائیے جب ایرانی وفد کا تار آیا کہ وہ لکھنؤ آ رہے ہیں اور انہوں نے ہماری دعوت قبول کر لی ہے گھبرائے ہوئے احتشام صاحب کے پاس پہنچے۔ احتشام صاحب بہت برہم ہوئے، بولے "بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ آپ لوگ بیٹھے بٹھائے شوشے چھوڑا کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ تین چار ہزار روپیہ سے کم خرچ نہ آئے گا۔ اب یہ رقم کہاں سے لائیے گا؟"

خیر ہم لوگ سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑتے رہے۔ یوپی گورنمنٹ کے وزراء سے ملے، وائس چانسلر سے ملے اور آخر کار رفیع احمد قدوائی مرحوم کی مدد سے ان کے قیام، طعام، سیر و تفریح وغیرہ سب کا انتظام ہو گیا۔ "حلقۂ احباب" کی طرف سے ایک عصرانہ دینے کا پروگرام طے کیا اور یونیورسٹی میں ایک جلسہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔

ہم سب لوگ بے حد مطمئن تھے کہ دیکھیں اب احتشام صاحب کیا دشواری بتلاتے ہیں؟ احتشام صاحب کے ہاں پہنچے، ساری روداد ایک ہی سانس میں سُنا ڈالی۔ جلسے کے بارے میں پروگرام بتایا ۹ اپریل کے لئے جلسہ طے کیا تھا۔ احتشام صاحب نے مخصوص انداز میں، اپنے مزاج کا ٹھیرا اور بڑے متوازن لہجے میں کہا:

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر جلسے کے لئے حاضرین کہاں سے آئیں گے؟"

بات غلط نہ تھی کیونکہ طلباء کے امتحانات ہو رہے تھے لیکن ہندو بین دہلی سے یہاں تک آ جائیں، یوپی گورنمنٹ کو ہم اس [illegible] کے بعد آمادہ کر لائیں اور اس کے بعد ایرانی وفد کے استقبال کے لئے حاضرین کی کمی پڑے ۔۔۔ یہ صرف احتشام صاحب کی دور بینی تھی [illegible] سوچ سکتی تھی۔

افسردگی پرست کی بجائے جی چاہتا ہے یاس پرست لکھوں لیکن یاس ایک مستقل اور اثباتی کیفیت ہے پھر مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہ الفاظ میں ایک ایسے نقاد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس نے ہماری تنقید میں عمرانی اور مارکسی اندازِ نظر کو رواج دیا ہے اور نئے افق بخشے ہیں۔ عمرانی اور مارکسی اندازِ نظر زندگی کے رجائی پہلو کے نمائندہ ہیں۔ اگر میں نے احتشام صاحب کی تحریریں نہ پڑھی ہوتیں تو ان کی ذات کو یا تو میر کے دوبارہ جنم لینے سے تعبیر کرتا یا پھر انہیں صوفی، وجودیاتی یا قنوطی تسلیم کر لیتا۔

غالب کا شعر ہے ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

بے دلی کا اتنا رچا ہوا احساس میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے جی چاہے اسے کاہلی کہئے، مجھے تو بار بار ایسا لگتا ہے کہ احتشام صاحب کے اندر ایک بہت ہی اچھا آدمی چھپا ہوا ہے جو وضعدار ہے، جس نے قصبہ ماہل کے ایک قدیم گھرانے میں پرورش پائی ہے۔ اور اس کی قدیم روایات کو اپنے میں جذب کیا ہے۔ یہ وضعدارانہ اور بہت ہی اچھا آدمی اتنا طاقتور ہے کہ وہ باغی نوجوان جو ان کی دوسری شخصیت کا جزو ہے ہر بار پہلے آدمی سے شکست کھا جاتا ہے۔ اس نوجوان باغی کو وہ کھلونے دے کر بھی نہیں بہلاتے اس کی دبی ہوئی کچلی ہوئی شخصیت ایک افسردگی کی شکل میں پھیل گئی ہے یہ وہ راکھ ہے جس کا ذکر کرشن چندر کے ناول "شکست" کے آخری صفحات میں ملتا ہے۔

اب ذرا اس بہت ہی اچھے آدمی کی چند پرچھائیاں دیکھئے:

میں نے ایسے آدمیوں کو ان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے جن سے انہیں شدید اختلاف ہے اور جن سے وہ سوائے "بور" ہونے کے

اور کوئی حظ حاصل نہیں کر سکتے۔ گھنٹوں گفتگو کیا کرتے۔ [illegible] بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے تو احتشام صاحب کھانے کے لئے اندرون خانہ سے آنے والے [illegible] لیکن اس بار ناظرین سے یہ کہیں گے کہ آپ کسی اور وقت تشریف لائیے گا۔ [illegible] ایک ہلکا سا پرتو بھی ان کے چہرے پر نہیں آنے پائے گا۔

ان سے ملنے آنے والوں کی عجیب عجیب قسمیں ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھوانے [illegible] خود ایک [illegible] سے زیادہ [illegible] اس مقدمہ بازی کی شکایت کی ہے [illegible] دیوں کے مجموعوں پر بھی دیباچے لکھے ہیں جو [illegible] نے کسی سے دہلی میں مجھ سے کہا کہ انجینیئرنگ کی ایک ابتدائی کتاب پر احتشام صاحب سے دیباچہ لکھا [illegible] ان سے فریاد کی۔

کہنے لگے لوگ یہ تو پوچھ بیٹھے ہیں کہ احتشام صاحب نے دیباچہ لکھا ہے [illegible] کوئی نہیں دیکھتا کہ احتشام نے کیا لکھا ہے۔ لوگ [illegible] کرتے ہیں [illegible] ہیں تو میں [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] لکھ دیتا ہوں۔

اور اس کی گواہی خود میں دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک [illegible] کتاب کے دیباچے کے لئے [illegible] ایک [illegible] کے خط موصول ہوتے دیکھے ہیں۔

امریکہ جانے سے پہلے [illegible] کتابوں کی دو [illegible] یہاں [illegible] دوست اور ہم نشین طرح طرح کے [illegible] ہوتے ہیں اور [illegible] کتابوں [illegible] سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں [illegible] پر بحث کرتے ہیں [illegible] بے تکلف [illegible] کیونکہ احتشام صاحب [illegible] کی عادی نہیں۔ ہاں [illegible] دو طرفہ خوشگوار [illegible] آپ یقین کیجئے کہ وہاں بیٹھنے والوں [illegible] احتشام صاحب [illegible] گرم [illegible] کے [illegible] ہیں [illegible]

ایک اور رخ دیکھیے۔ لکھنؤ یونیورسٹی [illegible] کا مسئلہ درپیش تھا امیدوار [illegible] یوں تو [illegible] لیکن [illegible] آل احمد سرور صاحب کے درمیان تھا [illegible] سرور صاحب [illegible] اگر لکھنؤ یونیورسٹی [illegible] سرور صاحب [illegible] کہہ سکتے ہیں تو وہ احتشام صاحب ہیں [illegible] سرور صاحب کی زبان سے [illegible] کا اندازہ کیا ہے جو احتشام صاحب [illegible]

یوں تو یہ معمولی سی بات ہے [illegible] خود اپنی [illegible] کا منظر دیکھتا ہے اور [illegible] کے سامنے [illegible] کرتا ہے [illegible] اچھے لکھنؤ [illegible] جاتے ہیں [illegible] ہمارے ادب میں [illegible] نہیں [illegible] ملے گی جب [illegible]

یہ چیز [illegible] احتشام صاحب کے کردار کی خوبی بھی ہے [illegible] وہ فن [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible] معصف اول [illegible] کے [illegible] کا [illegible] کا اظہار کرتے ہیں [illegible] نہیں [illegible] بہت [illegible] ہے۔

چاہے ان [illegible] کوئی شک نہیں کہ [illegible] ہیں وہ کہیں [illegible] اس طرح ہو جاتے ہیں کہ شاید بہت سے لوگ [illegible] انہوں نے [illegible] بہت کم لکھا ہے۔ ان کا کام اردو کی تنقید کو ایک [illegible] نظریاتی بنیاد بخشنا تھا اور ہر چند کہ [illegible] کیا ہے وہ اس کا [illegible] نہیں ہے جو وہ کر سکتے ہیں اور غالباً صرف وہی کر سکتے ہیں۔

پھر بھی ادبی تنقید کا یہ موڑ بڑا تاریخی موڑ ہے۔

شخصیت سے ہٹ کر بات تنقیدی فکر کی طرف جا پہنچی۔ دراصل احتشام صاحب کی ادبی خدمات سے ان کی سماجی خدمت کا مرتبہ کچھ کم نہیں ہے ان کا کارنامہ صرف وہ مضامین نہیں ہیں جو رسالوں میں چھپتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ احتشام صاحب خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ ان کے طالب علم، یونیورسٹی کا ہر وہ لڑکا جو انہیں جانتا ہے، میرا مطلب ہے ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر نوجوان جو انہیں جانتا ہے، احتشام صاحب کو اپنی شخصیت کا ایک جزو سمجھنے لگتا ہے وہ گھنٹوں کسی کی پتے کی باتیں سنیں گے، اس کی چند باقی الجھنوں میں غمخواری کریں گے، اس کو مشورے دیں گے، اس کے لئے ممکن ذرائع فراہم کریں گے اور چاہتے ہیں کہ اس نوجوان کے دکھوں کا مداوا کر سکیں مگر ان کی آواز ان کی شیریں گفتگو بے قرار دلوں کے زخموں پر مرہم ضرور رکھ دیتی ہے۔ امید کا نہیں غمخواری کا مرہم!

اس طرح وہ ایک سیدھا سادا کام کر رہے ہیں جہاں لوگ مداوا پانے نہیں جاتے شاید غم بانٹنے اور نئے حوصلے لینے جاتے ہیں یہ غم وہ بانٹتے ہیں یہ بات یقینی ہے یہ نہیں ہوتا کہ کوئی کام کی بات نکلے اور وہ آپ کا ذکر کریں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ صحبتوں میں وہ ادنیٰ سے ادنیٰ شناسا کو پہچان لیں گے اس سے بات کریں گے، اور اپنے سارے ساتھی بھول کر اس صحبت میں اس ادنیٰ سے شناسا کا ذکر شروع کر دیں گے۔

گھریلو زندگی میں بھی احتشام صاحب بڑے نرم، سنجیدہ اور جھگڑوں سے بچنے والے انسان ہیں۔ خریداری کے لئے وہ کبھی بازار نہیں جاتے۔ ان کے چھوٹے بھائی اقتدار ان کی تیمارداری کا بیڑا اٹھائے ان کے قلم کی روشنائی اور جوتے خریدتے دیکھے جاتے ہیں۔ جہاں تک اور شاعر ہیں ان سے ملنے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ جلسے جب تک ان کے لئے ناگزیر حادثہ نہ بن جائیں اس وقت تک وہ ان سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ ادبی محفلوں کے جلسے میں جاتے ہیں۔ سب کے ہاں ہوتا ہے تقریباً پابندی سے آتے ہیں۔ وہاں نوجوان ادیبوں سے ان کی گفتگو بڑی ہمدردانہ ہوتی ہے۔

احتشام صاحب یوں بہت گھریلو آدمی ہیں ان کا کمرہ بچوں سے آباد رہتا ہے۔ کوئی ان کا قلم لئے بیٹھا ہے کوئی ان کی گود میں بیٹھنے کے لئے تنگ کر رہا ہے، کوئی کتاب چھینے لئے جاتا ہے اور اس کی تصویریں دیکھ رہا ہے اور احتشام صاحب نہایت اطمینان سے بچوں کو پیار کر رہے ہیں اور کبھی آپ سے ادب کے فلسفہ پر بحث کر رہے ہیں۔ مگر ان کی بچی ذرا سی طبیعت ناساز ہو تو ان کے سارے پروگرام منسوخ ہو جائیں گے۔ حالانکہ خود بیمار سے رہتے ہیں۔

یہ بیماری جسمانی ہے یا صرف بقول رشید احمد صاحب صدیقی ۔۔۔ یہ کہنا مشکل ہے البتہ دونوں ہی باتیں ۔۔۔ ان کا مرض ہے لیکن اس کے علاوہ شخصیت کی گرانی، الجھن اور پریشانی کچھ کو کچھ بنا دیتی ہیں۔ ایک شام معلوم ہوا کہ احتشام صاحب آج دہلی جانے والے ہیں وہاں جامعہ کی طرف سے "یوم نظیر" منایا جا رہا ہے۔ حضرت گنج میں مجھے اطلاع ہوئی۔ ۔۔۔ اور گاڑی ۹۔۲۰ پر جاتی تھی مجھے ان سے ضروری کام تھا۔ بھاگم بھاگ بارود خانہ پہنچا۔

گھر کے سامنے رکشا کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں اقتدار میاں بستر لئے آئے، رکشا میں رکھ دیا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ٹھیک سے ملاقات بھی نہ ہو پائے گی۔ بہرحال اطلاع کرائی تو قمیص اور پاجامے ہی میں باہر چلے آئے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا:

"آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟"

بولے "طبیعت میں عجیب طرح کا ہیجان ہے۔ کچھ گرانی محسوس ہو رہی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔"

اتنے میں اقتدار میاں اور رکشا والے دونوں نے جلدی مچانا شروع کی کہنے لگے:

"میاں اقتدار! کیا ۹۔۲۰ کے بعد کوئی اور گاڑی نہیں جاتی؟"

اقتدار میاں نے کہا "غالباً ۱۰ بجے جاتی ہے۔" پھر بھی کوئی ۱۵۔۲۰ منٹ سامان اسی طرح رکھا رہا۔ فیصلہ ہوا کہ اس گاڑی سے جانا ملتوی کیا جائے۔

۱۲½ بجے دیکھا جائے گا۔ بستر اتار لیا گیا، رکشا رخصت ہوا اور ہم دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ۱۱ بجے میں اٹھ آیا۔ تیسرے دن معلوم ہوا کہ احتشام صاحب دہلی نہیں گئے۔

اب بھی اگر درویشی میں شبہ ہو تو یہ جان لینا مفید ہوگا کہ احتشام صاحب جو امریکہ، لندن اور پیرس کے نادر عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں کی سیر کر آئے ہیں آج تک آصف الدولہ اور شاہ نجف کے امام باڑے اور شاہانِ اودھ کی آرٹ گیلری دیکھنے کبھی نہیں گئے۔ آٹھویں محرم کی روشنی لکھنؤ سے باہر کے رہنے والے بھی دیکھنے کے لئے آتے ہیں لیکن اس حوصلہ مند شخص نے سیر کے انداز میں ہمیشہ اپنے ہی باغ و بہار سے مطلب رکھا ہے۔ پائیں باغ کے نظاروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

لکھنؤ کا کافی ہاؤس اور حضرت گنج یونیورسٹی اور شہر کے سارے جدید ذوق رکھنے والوں کا مرکز بن گیا ہے۔ شام کو [illegible] آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی، پنڈت جواہر لال نہرو کے اخبار نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر چھلپاتی راؤ، کبھی کبھی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور ان کا سیاسی گروپ اکٹھا ہو جاتا تھا مگر احتشام صاحب برس ہا برس میں صرف ایک آدھ بار اس محفل میں دکھائی دے جاتے تھے۔

شہر کے سب سے خوبصورت سینما ہال میں [illegible] کی روشنیاں جگمگاتی رہتی ہیں لیکن وہ ادیب جس نے نہ جانے کتنے طلبا کے سینے میں آرٹ کا ایک مربوط اور ہمہ جہت تصور پیدا کیا ہے، خود [illegible] یا کسی اور سینما ہال میں کبھی فلم دیکھنے نہیں جاتا۔ یہ وہی احتشام صاحب تو ہیں جنہوں نے امریکہ اور برطانیہ میں صرف انگریزی ہی نہیں فرانسیسی، سویڈش اور اطالوی فلمیں بڑی تعداد میں دیکھی ہیں۔ یہ وہی احتشام صاحب ہیں جن سے اگر رودن کی مجسمہ سازی پر بات کیجئے یا ہندوستانی موسیقی کا ذکر چھیڑیئے تو گھنٹوں اس طرح بات کرتے رہیں گے کہ آدمی ہیچمدان بن کے رہ جائے۔

امریکہ جانے کا واقعہ سنیے۔ انہی دنوں میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک عارضی جگہ پر شعبہ اردو میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ [illegible] اتفاق سے جب اس جگہ کے مستقل ہونے کا سوال آیا تو صدر شعبہ اور [illegible] کے باوجود ایک دوسرے صاحب اس جگہ پر [illegible] ہو گئے۔ جس روز اس نتیجے کا اعلان ہوا [illegible] احتشام صاحب اپنے [illegible] تھے۔

تیسرے پہر تھے [illegible] میری ملازمت کے آخری دن [illegible] دیکھا کہ احتشام صاحب [illegible] بجے یونیورسٹی سے چلے آ رہے ہیں اداس، خاموش اور رنجیدہ۔ مجھے دلاسہ دینے لگے۔ میں نے اس لمحے [illegible] محسوس کیا کہ ان کے دل [illegible] پھر کہنے لگے:

"شاید مجھے امریکہ جانے کے لئے سال بھر کی چھٹی لینا پڑے اس صورت میں ایک عارضی جگہ نکلے گی۔"

مجھے اس [illegible] شاید کی داستان معلوم تھی لیکن اس لمحے میں اس دردمندی سے اس درجہ متاثر ہو گیا تھا کہ اس کے بارے میں کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ البتہ یہ جانتا تھا کہ امریکہ والے ان کے بلانے کے بارے میں [illegible] ان کو جانے کے بارے میں [illegible] کہ کس کس طرح احتشام صاحب نے امریکہ کو ٹالنے کی کوشش کی، اپنے کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ [illegible] نہیں گئے اور [illegible] ہیں کیا حرج ہے۔

اور جب [illegible] تو بھی ان کو اچھی خاصی ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا ہوگا۔ انہوں نے امریکہ جانے کا فیصلہ [illegible] کے طور پر [illegible] کوئی ایسا [illegible] اس اقدام کی مخالفت کرتا اور [illegible] دونوں [illegible] جب راک فیلر والوں نے خاندان کا الاؤنس دینا بھی منظور کر لیا [illegible] کوئی بہانہ ایسا نہ رہ گیا جو [illegible] کو مطمئن کر سکتا۔ [illegible] کی ایک [illegible] سے بھی ان کا چہرہ مانوس نہیں ہوا۔ وہ مسکرا ضرور رہے تھے اور [illegible] کے لئے ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ ان کی گردن ہاروں سے بھر گئی تو وہ ہار اتار اتار کر اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتے جاتے تھے [illegible] گال تھپتھپاتے تھے لیکن ان کو امریکہ

کی وسعت، نیرنگی، حسن اور ساحرانہ ندرت انھیں کھینچ رہی تھی صرف فرنٹیر کا ایک جامد احساس تھا۔

اس جمِ غفیر پر نظر کیجئے اس میں پروفیسر مسعود حسن رضوی تھے جنھوں نے ہار پہنایا اور امام ضامن بازو پر باندھا۔ سارا ہجوم امام ضامن سے بندھا ہوا تھا — علی عباس حسینی تھے جن کی آنکھیں نمناک تھیں۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی تھے۔ سرور صاحب تھے کچھ سیاسی لوگ تھے، دانش محل کے مہ جبیں تھے، طلباء کی کثیر تعداد تھی، اردو اور انگریزی، صحافی تھے، یونیورسٹی کے اساتذہ تھے۔ ایسی خوبصورت الوداع لکھنؤ اسٹیشن کو بہت کم دیکھنی نصیب ہوئی ہوگی۔

امریکہ کیسا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جگمگاتا ہوا ایک بازار ہے جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا گیا ہے۔ وہاں ہنستے ہنگامے اور رقص و نغمہ کے طوفان تو ہر قدم پر ملتے ہیں لیکن خاموشی، سکون اور متانت شاید وہاں کے قومی کردار کا بنیادی جزو نہیں کہی جا سکتی۔ سڑکوں کے کنارے بنی کے کھمبے، پارکوں میں اونچے اونچے پیڑوں کے نیچے نوجوان اپنی محبوباؤں کی کمر میں ہاتھ ڈالے بوس و کنار میں مصروف ہیں۔ ہوٹلوں میں آتش زیرپا جاز کی موسیقی نغمہ بار ہے، تیز و تند شراب پانی کی طرح بہہ رہی ہے، ہینگنگ ہو رہی ہے اور جسم کی گردش و رقص کے آداب سب پر واضح ہیں، سیج پر آزاد ہیں۔ کسی شاعر نوراز کی طرح بکس رہے ہیں۔

ہنگامہ نیم شبی ہوٹلوں اور کلبوں میں نیم برہنہ نسوانی جسم متحرک رہے ہیں، مست ہو کر مرد اور عورت سبھی جھوم رہے ہیں، گا رہے ہیں، دھوم مچا رہے ہیں۔ ایسے موقعے پر تو گناہ ہے بڑے بڑے پاک باز زاہد کے ہونٹوں میں بھی "شرب لاالہ" دب کر رہ جاتی ہے۔ مگر ان خطروں سے جو امریکہ کے مختلف شہروں سے سرور صاحب کے پاس یا چند اور لوگوں کے پاس آئے اور جنھیں پڑھنے کا مجھے موقع ملا، وہی سنجیدہ اور نرم سی ٹوپی میں ملبوس بھلے مانس نوجوان کا چہرہ جھانکتا نظر آیا جنھیں پہلی بار میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔

امریکہ سے آئے تو سوائے لباس کے اور کوئی ظاہری تبدیلی نہیں تھی۔ تفصیل سے باتیں ہوتی رہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ امریکہ کی ہر ایک اہم یونیورسٹی کا دورہ کر کے آئے تھے وہاں کی لائبریریوں کو چھانا ہے، وہاں سنسکرت اور خاص طور پر اردو سے متعلق مسودات کی تعداد کو دیکھا ہے ... کی زیارت کی ہے، وہاں آئی اے رچرڈز، جیمس فیرل، پرل بک جیسے اہم فن کاروں سے ملے ہیں۔ لندن میں برٹش میوزیم، ڈاکٹر جانسن کے مکان، شیکسپیئر کے وطن ہی کی زیارت نہیں کی بلکہ کیٹس جیسے مستند شاعر کی زیارت کی ہے، پیرس کے لوور کی زیارت کی ہے، نئے لکھنے والوں سے ملے ہیں، قہوہ خانوں میں نئے ادیبوں اور فن کاروں کی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں۔

ان سب ملاقاتوں اور زیارت گاہوں نے احتشام صاحب کو متاثر ضرور کیا ہے ان کے ذہنی افق میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے۔ ان ملاقاتوں کا ذکر جب وہ صحبت میں ان کی زبانی سنئے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ خود ان دانشوروں سے باتیں کر رہے ہیں یا ڈاکٹر جانسن اور برنارڈ شا کی قیام گاہوں کی سیر کر رہے ہیں۔ چند روز ہوئے ان کا سفرنامہ یا ڈائری چھپ کر آ گئی ہے اس کے کچھ حصے میں نے غیر مطبوعہ شکل میں سنے تھے۔ میں نے ابھی اس تازہ کتاب "ساحل اور سمندر" کو ختم کیا ہے۔

اس میں باتوں کی وہ رنگینی کہیں کھو گئی ہے۔ صاف سیدھی سپاٹ باتیں ہیں۔ جی چاہتا ہے یوں سمجھئے کہ احتشام صاحب جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو اپنے اس وجود سے رخصت لے لیتے ہیں جو باتیں کرتے وقت رنگینی، بے تکلفی اور قدرے شناسا لہجہ قائم رکھتا ہے۔ یہی نہیں مجھے ان کی تقریروں، کلاس لیکچر اور ریڈیو کے لئے بےساختہ لکھے ہوئے مضامین میں اکثر وہ رنگینی، تازگی اور شناسا لہجہ مل گیا ہے جو ان کی تحریروں میں جھلک دکھلا کر چھپ جاتا ہے۔ کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تحریر میں اگر وہ کوئی شگفتہ اور رنگین جملہ لکھ جاتے ہیں تو نظرثانی میں اسے کاٹ دیتے ہیں۔

قلم شخصیت کے اظہار میں بڑے پردے قائم کر دیتا ہے اور یہ پردہ بھی جب احتشام صاحب کا فلسفیانہ قلم ہو، احتشام صاحب کی شخصیت ہو جو خود کو چھپانے میں ماہر ہے تو پھر ڈائری کتمانِ ذات کا ذریعہ ہو جاتی ہے یہ داخلی سفر ضرور ہے۔ جو امریکہ سے زیادہ مصنف نے کبھی کتابوں کی مدد سے اور کبھی سیاسی خبروں کی مدد سے کیا ہے۔ یہاں خارجی تجربوں کی روشنی کم ہے، امریکہ کے ساحل کے دلنشیں نظارے کم ہیں، برطانیہ کی پُراسرار کہر کی لذت یا پیرس کی ان شاموں کا کیف و رنگ نہیں ہے جن میں کوئی نوجوان بھی بہکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ چاہے پھر وہ دبے لفظوں میں ظہیر کاشمیری کی طرح اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جائے ؎

ہائے یہ مہکی ہوئی شامیں، یہ لوگوں کے ہجوم دل کو کچھ بیتی ہوئی تنہائیاں یاد آ گئیں

یہاں ساحل بھی ہے سمندر بھی اور اس کے طوفان بھی نہیں کیونکہ ان طوفانوں پر احتشام صاحب نے سختی سے بند باندھے ہیں کہ انہیں پارائے اظہار نہیں۔ احتشام صاحب ہمارے ان تنقید نگاروں کے میر کارواں ہیں جنہوں نے لفظ "نقطۂ نظر" بیدار کیا جن کے نزدیک تنقید نہ محض تشریح تھی نہ محض جمالیاتی موشگافی بلکہ اس کا عمرانی عمل بھی ہے اور اسی بناء پر نقاد کا زاویۂ نظر بھی ضروری ٹھہرا اور ادب کا حکیمانہ مطالعہ بھی۔ شاید اسی لئے حکیمانہ مطالعہ کی یہ اُمنگ خود انہیں اپنے تجربے کی طرف لے گئی۔ "ساحل اور سمندر" ان سطور کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

"تیراسی جویں اور تنہا سفر ہیں میں نے، گر کچھ دور نہیں سکا تو تنہائی میں میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش کی ..... عجیب انسان ہے، متضاد کیفیتوں کا حامل، حقیقتوں سے جدوجہد کرنے کا شائق اور خوابوں کے پیچھے مارا مارا پھرنے والا، اسے سمندر سے بھی محبت ہے، ساحل سے بھی۔ وہ موجوں کی خواہش بھی کرتا ہے اور سکون کا متمنی بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کے ساتھ بے پروائی برتی۔ اس کی وسعتوں میں سے صرف مطالعہ کو چنا، لیکن مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو، مشاہدے اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو کر تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سماجی جانور بننے کے لئے کبھی کبھی احمق، مجنون یا محض بچہ بننے کی ضرورت پڑتی ہے، اس نے اس راز کو نہیں سمجھا وہ ڈرتا رہا کہ کوئی اسے [illegible] کچھ کہہ نہ دے۔ یہ ایک مصنوعی ہوئی محدود شخصیت کی نشانی ہے۔ [illegible] اور لذت کوشیوں کے بہت سے در کھلے ہوئے دیکھ کر اس نے کچھ کہا بھی تو اس طرح جیسے اپنے گرد و پیش سے خود دور ہو رہا ہو۔ جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ پڑھتا۔ سمندر کی موجوں کا تماشا بھی تو میرا جی چاہتا کہ [illegible] اور کھول کر [illegible] ہرنفس کے ہنگامے یہ قمار بازی یہ محض ہنسی کے لئے ہنسی یہ صرف بات کے لئے بات [illegible] تو نہیں کچھ کچھ لذت تو حاصل ہوتی ہی ہوگی [illegible] لوگ خوش کیوں ہیں میں نے اس سے کہا بھی کہ [illegible] اس طرح اپنے خول کے اندر [illegible] دل ملتے ہیں جسم ملتے ہیں [illegible] ساحل ملتا ہے [illegible] غم اور اس کے احساس [illegible] [illegible] ہی کہہ دی او نچیں [illegible] [illegible] شیکسپیئر کے ڈرامے "ایز یو لائک اٹ" [illegible] As you like it [illegible] کا پہلا ایکٹ [illegible] کر دیا۔"

[illegible]

آپ اسی کے بارے میں جو کچھ اور روز نامچہ کا بھی کام پڑھئے۔ مجھے احتشام صاحب کے [illegible] پر رائیں قائم کرنے کی اور اجازت دیجئے۔

یہ آخری بات ان کی سیاست کے بارے میں ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ احتشام صاحب ذہن کے دریچے بند کر کے نہ کبھی کانگریسی ہوئے ہیں نہ کمیونسٹ، ایسے موقع پر بھی جب کمیونسٹ پارٹی غلط قسم کی پالیسی پر کاربند تھی احتشام صاحب نے اپنے توازن اور اعتدال کو نہیں چھوڑا۔ شاید اس لئے کہ وہ ان کی فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس غلط پالیسی کے زمانے میں وہ "علم و دانش" کے ادارے میں رہے۔ مارکسی مصنفین کی کانفرنس میں شمولیت کرتے رہے لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے ان کی سیاست سے اُلجھن ہوتی ہے۔ ادب بھی ایک محبوبہ ہے جو سوکن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ احتشام صاحب کی شخصیت جو سیاست اور امریکہ اور روس کے مناقشوں، ہائیڈروجن بم اور امن کے دھندوں میں گم ہو جاتی ہے اپنے جمالیاتی شعور کے ساتھ نکھر کر سامنے آسکے۔ اب "ساحل اور سمندر" کو لیجئے۔ یہاں بھی یہ سفر ایک حسن پرست ادیب سے زیادہ واضح اشتراکی رجحان رکھنے والے سیاست داں کا سفر معلوم ہوتا ہے جو Goods that failed جیسی غیر ادبی کتاب کا رد لکھنے کی فکر میں ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ ادب کے

سارے حسن کو بھول کر انسانیت کے عظیم ورثے کو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اگر میں احتشام صاحب سے اتنا قریب نہ رہا ہوتا تو شاید ان کی ادبی شخصیت پر بات کرنے لگتا یا ان کے ادبی شعور پر حرف زنی کرنے میں مہاتما ہوتا کہ ان کا مذاقِ شعر جمالیاتی حس اور رنگ و نور کے کمال سے پار ہو جانے والا نقطۂ نظر آپ ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں تازہ تر خواہشوں کے ترشے ہوئے اور تڑپا دینے والے شعروں ہی کو پیش کیا ہے۔ ہاں ان کی نظر تاریخ اور ادب کے دائرے ہی سے آگے نہیں بڑھی بلکہ ادبیات کے حلقے سے بھی آگے قدم رکھ کر عمرانیات اور سیاسیات کو سمیٹتی ہے۔

احتشام صاحب ان دنوں خاموش ہیں۔ میں جانتا ہوں ان کے پاس کہنے کے لئے بہت سی باتیں ہیں لیکن شاید اس ہیجان انگیز بین الاقوامی معرکے نے نہاں گوشوں اور ان کے سینے کو نئے افق دے دیے ہیں۔ اب ان کا ادبی مذاق صرف چند مضامین سے تسکین نہیں پاتا۔ ان کی نگر اب کائنات کی پہنائیوں تک ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے صرف شعور کی بلندی کافی نہیں۔ ہمتوں کی بلندی بھی ضروری ہے۔

مگر کیا ان سب باتوں کے بعد بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ احتشام صاحب کو جانتا ہے؟ ان احتشام صاحب کو جنہوں نے کبھی اپنی اصلی شخصیت کو خود اپنے سامنے بھی بے نقاب نہیں کیا، جو کبھی اپنی الجھنوں کا ذکر بلند آواز میں نہیں کرتے، جن کے سینے میں اسرار "حرم سرا کی حسیناؤں" کی طرح قید ہیں۔ ان کا شعری مذاق نکھرا ہے لیکن ان میں جو بھلا مانس مہذب انسان ہے وہ کسی برے شعر پر برہم ہونے یا کسی گھٹیا شاعر سے سختی سے پیش آنے کا عادی نہیں ہوتا۔ ان کی شخصیت میں بڑی تابناکی، بڑی سرمستی، بڑی رنگینی ہے لیکن اس شخصیت پر سنجیدگی، متانت اور توازن کے وہ پہرے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر سے سرگوشی میں بھی اپنے دل کے ارمان ظاہر نہیں کر سکتے۔

کب یہ پہرے اٹھیں گے، کب ان کی اصلی شخصیت کا طلوع ہوگا — کون کہہ سکتا ہے؟!

اختر حسین رائے پوری

دیویندر ستیارتھی

"حسن و عشق کے گیت تو بہت ہو لئے۔ بغاوت کے گیت ہوں تو نکالئے اپنے جھولے سے!"

"تو آپ نے مجھے کوئی مداری سمجھ لیا کہ جب چاہوں اپنے جھولے سے بے موسم کا پھل نکال کر پیش کر دوں۔"

"بہت خوب۔ لیکن بغاوت کے گیتوں سے میرا کیا مفہوم ہے۔ یہ شاید آپ نہیں سمجھے۔"

"ارشاد"

"میرا اشارہ کسانوں کے ان گیتوں کی طرف ہے جن میں انہوں نے قسمت کا رونا رونے کی بجائے اپنے قدموں پہ کھڑا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہو، جن میں ہمیں اُن کے وہ تیور نظر آ سکیں جو اپنے اقتصادی حالات پہ غور کرنے والے کسی شخص کے چہرے پہ اکثر دیکھے گئے ہیں۔"

"لوک گیتوں میں ایسے گیتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تو ذرا ایسے گیتوں کو منظرِ عام پہ لائیے۔ اُن کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے۔ خالص شاعری کے زاویے سے تو دوسرے گیتوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں لیکن جہاں تک ادب کی افادیت کا تعلق ہے، ہمیں کسانوں کے ایسے گیتوں کو ترجیح دینا ہوگی جن میں وہ اپنے کھیتوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں، اپنے قرض چکانے کی بات سوچتے ہیں، زمیندار کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔"

گفتگو کے یہ نقوش آج تک دھندلے نہیں ہوئے۔ اگرچہ یہ گفتگو بیس برس پیشتر ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اختر حسین رائے پوری کلکتے کے ہندی ماہنامہ "وشوامتر" کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور میں اس خیال سے دفترِ وشوامتر پہنچا تھا کہ کسی طرح ایک مضمون کی پیشگی مزدوری مل جائے اور اس سے دارجلنگ تک کا نہیں تو نزدیک کے راستے تک کا ٹکٹ لیا جا سکے۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ادیب نے مجھے ادب کے اقتصادی پہلو سے اتنی شدت سے روشناس کرایا۔ اختر حسین نے وعدہ کیا کہ وہ وشوامتر کے مالک سے پیشگی کہہ کر میرے لئے دارجلنگ کے کرائے کا انتظام کر دیں گے۔ میرا مضمون انہوں نے وشوامتر میں چھاپنا منظور کر لیا۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ادب کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مجھے دوسری زبانوں کے افسانوں کا پوری طرح جائزہ لینا چاہئے۔

"آپ پہلے پہل کلکتے میں کب تشریف لائے تھے؟" میں نے پوچھا "ظاہر ہے کہ آپ رائے پور میں پیدا ہوئے ورنہ اپنے نام کے ساتھ رائے پوری کیوں لکھتے۔"

"۱۹۱۲ء میں رائے پور میں میری پیدائش ہوئی جہاں میرے والد صاحب ملازم تھے۔" اختر حسین نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے ہمارا خاندان بہار سے تعلق رکھتا ہے۔ خیر چھوڑیئے۔ یہ پرانی باتیں ہیں۔"

"یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کلکتے میں کب آئے۔"

"۱۹۲۸ء میں مجھے کلکتے آنے کا موقع ملا۔ کلکتے کی مجھ پر گہری چھاپ ہے۔ ماہنامہ وشومتر شروع ہوئے تو خیر بہت دن نہیں ہوئے۔ روزنامہ وشومتر کلکتے کا پرانا ہندی اخبار ہے۔ روزنامہ وشومتر میں ترقی ہوتے دیر نہ لگی بہت بار سوچا ہے کہ کیا کبھی کلکتے کو چھوڑ بھی سکوں گا یا نہیں۔"

دارجلنگ سے لوٹ کر میں اختر حسین رائے پوری سے ملنے گیا تو انہوں نے تفصیل سے کلکتے میں اپنی زندگی کے حالات سنائے۔ پچاس پچپن روپے ماہوار سے اُن کی زندگی شروع ہوئی۔ جن میں سے ستر روپے ماہوار تو مکان کے کرائے میں ہی نکل جاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر انہیں رات کی ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی۔ کلکتے میں انہیں چار بار مکان بدلنا پڑا تھا۔ پہلے مکان کے صحن میں کسی رنگریز کی بھٹی چڑھتی تھی اور پتھر کے کوئلے کے دھوئیں کے مارے ان کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ اُس کشمیری رنگریز کے تپے ہوئے جسم اور دڑھیل چہرے کو میرے روبرو نقش کرتے ہوئے اختر حسین نے مسکرا کر کہا "آج ٹھہرے گیتوں کے رسیا۔ تو لیجئے آپ کو اُس کشمیری گیت کی یاد دلادوں جو اس کشمیری رنگریز کے ساتھی گایا کرتے تھے۔ اصل گیت کے بول تو یاد نہیں پہلے بول کا مفہوم یوں تھا ـــــــــ اے رومال، اُبلتے ہوئے پانی سے اب تو نکلے گی۔ پھر کہیں اس قابل ہو گی کہ محبوبہ کی سہیلی بن سکے!" پھر اپنے دُوسرے مکان کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اس کا راستہ ایک ایسی سڑک سے ہو کر گزرتا تھا جس کے دونوں طرف چمڑے کے گودام تھے راہگیروں کو کچے چمڑے کے ڈھیروں میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ نہ جانے کتنی بیماریوں کے جراثیم اُس گلی میں کلبلایا کرتے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا "آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کی اُس گلی کی بدبو میری ناک میں بسی ہوئی ہے۔ بھینس کے چمڑے کی بو کسی قدر پھرائی ہوئی ہوتی تھی۔ گائے کے چمڑے سے ایسی بُو آتی تھی۔ جیسے بھُنے ہوئے کھٹمل سے آتی ہے۔"

"لگے ہاتھ تیسرے اور چوتھے مکان کا حال بھی بتا دیجئے۔"

"تیسرے مکان کے بہت بڑے صحن میں دوسرا ہی منظر دیکھنے کو نصیب ہوتا تھا۔ مالک مکان نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ وہ جمعرات کی صبح اپنے ہاں آئے ہوئے بھکاریوں کو ایک ایک ادھیلا دے گا۔ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ہو کر کوڑھی لنگڑے لولے اور اندھے بھکاریوں کے جمگھٹے کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ منظر دیکھنے کے بعد کئی روز تک میری طبیعت پریشان رہتی تھی۔ مجھے ان سرمایہ داروں سے نفرت ہونے لگی۔ جو دان پُن کا ڈھونگ رچانے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اب سنیئے چوتھے مکان کا حال۔ اس کے سامنے ایک پنجابی ہوٹل تھا جہاں صبح سے لے کر آدھی رات تک تندور پر روٹیاں پکا کرتی تھیں۔ ہوٹل کا مالک تندور کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنے ہاتھ سے تندور میں روٹیاں لگایا کرتا تھا۔ اُس کا اپنا حساب تھا۔ کٹھوتی سے گندھے ہوئے آٹے کی ایک خاص مقدار نوچ کر پٹڑے پر رکھتا اور بیلن کی مدد سے گول شکل دیتے ہوئے اسے اٹھا لیتا اور دونوں ہاتھوں میں لے کر چپاتی کے نال کا سماں باندھنے کے بعد تیزی سے تندور کے اندر تھاپ دیتا۔ دھماکے کے ساتھ تندور میں روٹی تھاپنے کے بعد ہر بار وہ اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا اور پاس رکھی گڑگڑی اٹھا کر ایک کش لگا لیتا اس پر لگاتار تندور والے کی ڈنکی دن بھر بجتی ہی رہتی تھی۔ بیچ بیچ کے وقفوں میں گڑگڑی کی گڑگڑ۔ یہاں میرا یہ حال ہے کہ اُس کی ہر تھاپ کے ساتھ گویا میرے دماغ پر چوٹ پڑتی ہے۔ اُس کے آٹے کے کوسنے کی تھاپ میرے سر کے اندر طبلے کے چوتالے کی مانند گونج جاتی ہے۔ ہنسیئے گا نہیں بات سُن کر۔ اجی بس یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ روٹی پر مکّوں کی آواز اسی طرح گونج اٹھتی ہے جیسے کلاس سٹرگل کی تھیوری دماغ کے سُو

آسمان میں کھوئی کھوئی رہتی ہے۔

اس پر واقعی زوردار قہقہہ پڑا اور اختر حسین نے بات کا رُخ کسی اور رخ بدل کر میرے اُس مضمون کی تعریف شروع کر دی جو میں نے انہی کے حسب ہدایت وشرمتی کیلئے لکھ کر دیا تھا۔ وہ دیر تک مجھے سمجھاتے رہے کہ لوک گیتوں کے آئینے میں ہمیں کلاس وار کے فلسفے کو دیکھنا چاہئے اور اپنے عوامی ادب میں عوام کی وہ آواز سننی چاہئے جو اُن کی اقتصادی کشمکش کی یاد دلاتی ہے۔ میرے مضمون کا وہ گیت انہیں خاص طور پر پسند تھا جس میں بنگال کا کسان اپنے اللہ سے شکایت کرتا ہے کہ ندی میں سیلاب آگیا اور زیادہ اُلٹ جانے سے اُس کی فصل کا اناج بہہ گیا اور اب وہ اپنی بیوی کیلئے زیور بنوا کر دینے کا وعدہ پورا نہ کر سکے گا۔ اگرچہ اختر حسین ایک ہی سانس میں کہہ گئے تھے کہ محض اللہ سے شکایت کرنا تو کافی نہیں ہے کسان کو چاہئے کہ اپنے ہاتھوں اپنی قسمت بنانے کا پوری طرح تہیہ کر لے۔

باتوں باتوں میں اختر حسین نے اُس واقعہ کا ذکر کیا جب وہ ایک بار اپنی پتلون کی کریز بچاتے ہوئے اپنے گھر کے سامنے والے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے کہ اتنے میں ایک بھکاری نے ان کا بازو پکڑ لیا۔

"یقین کیجئے میری دیانتی بورژوا ذہنیت فوراً بیدار ہو گئی تھی۔" انہوں نے اسی قدر سنجیدہ ہو کر کہنا شروع کیا "میں اُسے فوراً دھکا دے کر پرے کر دینا چاہتا تھا کہ اتنے میں میرے پیسے رہ گئے۔ اُس کے ہاتھوں کو لقوہ مار گیا تھا اور وہ کھڈر کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ اُس کے بازو میں روٹی کے ٹکڑے دبے ہوئے تھے۔ اُس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ خود روٹی کھا سکے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ میں اُس کی روٹی اُسے کھلا دوں۔ کلکتہ جیسے شہر میں تو ان بھکاریوں کی کوئی کمی نہ تھی، میرے لئے یہ بڑا موقع تھا کہ میں اپنے ہاتھ سے اسی بھکاری کو اسی کی روٹی کھلا سکوں۔ میں اُس کے منہ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا اور وہ بمشکل اسے بنا چبائے نگل رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے لئے واقعی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں جی جان سے اس نظام سے نفرت کرنے لگا جس کی بدولت سینکڑوں ہزاروں لوگ بھکاری بننے پر مجبور رہتے ہیں۔"

اُسی روز مجھے اختر حسین کا ایک مضمون پڑھنے کا موقعہ ملا جو کچھ دن پہلے وشرمتی میں شائع ہوا تھا۔ اس شمارے ہی کا مضمون ہے، ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا:۔

"میرا نصیب۔ بھیرویں کا سفر، میری زندگی کسی ڈرائنگ ماسٹر کی پرکار یا پٹواری کی جریب کی مانند ہو گئی ہے۔ میں سچ مچ سندباد جہازی ہو گیا ہوں لیکن کہیں سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے اور میں ان کی تلاش میں اپنی بُری حالت کو بد سے بدتر بناتا جاتا ہوں۔"

اس مضمون میں آگے چل کر اختر حسین نے ملک کی سماجی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرا جسم ہی بیمار نہیں، میری روح بھی بیمار ہے۔ یہ ٹھیک کہ پڑھا لکھا ہے جس نے تعلیم کی روشنی سے پیڑوں کی طرح اتنے انسان کلیلا رہے ہیں۔ ان کے بیچ میں میری روح جگنو کی طرح کبھی جلتی ہے کبھی بجھ جاتی ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن دنیا میرے لئے یا تو بہت تنگ ہے یا اتنی بڑی کہ اُس کی کشمکش میں کھوئی کی طرح میں پسا جا رہا ہوں۔ کچھ دنوں سے پھر دل کی دھڑکن شروع ہو گئی ہے۔ کل پڑھتے پڑھتے یک دم میرے ہاتھ تھرانے لگے، دل پنکھے کی طرح گھومنے لگا۔ کان بھائیں بھائیں کرنے لگے، چہرہ خون کے دباؤ کی تیزی سے سُرخ ہو گیا۔ میں نے سانس روک لیا کہ کہیں اس دھڑکن میں رُک ہی نہ جائے۔ ایسا دورہ کبھی نہ پڑا تھا۔ پھر ردِ عمل سے ہاتھ پاؤں نڈھال ہو گئے۔ اندھیرا، سناٹا۔"

اختر حسین ایک ضروری کام سے باہر چلے گئے تھے۔ میرے ہاتھ میں اُن کا مضمون تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

"کیا انسان روٹی کمانے اور کھانے والے حیوان کے سوا کچھ نہیں؟ کیا یہی زندگی کا مفہوم اور اختتام ہے؟ کیا یہی اس لفظ کا آخری مفہوم ہے؟ اگر کام کرنے اور جینے میں کوئی فرق نہیں تو میں ہرگز کام نہ کروں گا۔ کیوں نہ پرندوں کے چہچہے اور ہوا کی چیخ و پکار کو سنتے ہوئے بنا ہلے جلے

پڑا رہوں اور اسی طرح مر جاؤں۔ دنیا کو میری زندگی کی ضرورت نہیں تو مجھے بھی اس دنیا کی ایسی کیا ضرورت ہے"

میں سمجھ گیا کہ اختر حسین کے یہ جذبات ان کی دل کی ہمدردی کی ہی پیداوار ہیں۔ ان کا مضمون پڑھتے پڑھتے ایک جگہ میری نظر پھر جم گئی:

"دو ہی دو تین چیزیں ایسی ہیں جو مجھے خدا کے اچھے ٹیسٹ کا قائل بنانے لگی ہیں۔ . . . . سمندر، عورت اور ہماچل ایک وسیع ہے۔ دوسری ابر بھری بہلی، تیسرے میں پنجابی تو اچھے والے کے بارہ ذائقوں کا مزہ ہے . . . . . روپے پہ حکمرانوں کی مہر کیوں دی جاتی ہے؟ کیوں نہیں ہو بہو پروردگار کی تصویر اس پہ نقش کر دی جاتی؟ . . . . . . چھتیسوں راگ راگنیوں کی شیرینی روپے کی جھنکار میں سمٹ آئی ہے۔"

اختر حسین لوٹ کر آئے تو میں نے کہا "لیجئے یہاں بیٹھے بیٹھے آپ کا یہ مضمون تو میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ گیا کہیں کہیں آپ نے خوب چوٹ لی ہے"

ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ ذرا سنبھل کر اختر حسین بولے "اب ذرا چائے والے کا انتظام کیا جائے"

چائے آئی تو ہماری گپوں کی گوشتی پوری طرح جم گئی۔ انہی دنوں وشال بھارت کے ایڈیٹر پنڈت بنارسی داس چترویدی نے "کسمی دیا ئے" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں ادب سے متعلق کچھ بنیادی سوال اٹھائے گئے تھے۔ اختر صاحب نے اس مضمون کا اپنے مضمون "ادب اور انقلاب" سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا کہ جہاں پنڈت جی نے اپنے مضمون میں محض حقیقت پسندی کے حق میں آواز اٹھائی ہے وہاں "ادب اور انقلاب" میں انقلابی حقیقت پسندی پر زور دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ آرٹ محض آئینہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک ہتھیار بھی ہے" اختر حسین نے یوں اپنا نظریہ پیش کیا "محض کسان کا دکھڑا رو دینے یا مزدور پہ ڈھائے گئے مظالم پر دید ... کا ... سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ مستقبل کس کا ہے تو میں تو ٹھنکے کی چوٹ سے یہی کہوں گا کہ مستقبل کسانوں اور مزدوروں کا ہے ... مستقبل ان ادیبوں کا ہے جو کسانوں اور مزدوروں کو ... کے لئے قدم بڑھاتے ہیں۔ ایسا ادب کوئی فرار کی چیز ... نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ... ان لوگوں کو بتایا جائے کہ لوٹ کھسوٹ کیوں ہوتی ہے اور اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ لوٹ کھسوٹ کیسے ہوتی ہے۔ حالانکہ ضرورت اس کی بھی ہے"

میں نے کہا "آپ کا مطلب یہ ہے کہ سب ہم کسانوں اور مزدوروں کے لئے لکھنا چاہتے ہیں تو انہی سے الگ ہو کر بھرتی کا ادب ... ضروری ہے"

"آپ ... پالیسی کسانوں اور مزدوروں کو تو ... یہ بتانا ہے کہ یہ ... کس طرح ... جا سکتا ہے ..."

... بات ... کا ... بدل کر اختر حسین نے بتانا شروع کیا کہ ... میں ... آج کا ... ادب ... اور وہ ... کی ... جانتے ہیں۔ میں نے ہنس کر ... مجھے ... بتا ...

"آپ ... کا کام کرتے ہیں" انہوں نے ہنس کر کہا "آپ کو ... بہرحال ... کہ لوک گیتوں ... کی آواز سننے تک ... ہے ... مطلب ہے ... بات ... ہے ... کہ آپ کا کام اسی ضرورت ... سے ... ہے"

"... آپ یہ تو نہیں ... کہ میں ... ان گیتوں کی تلاش میں"

... لوک گیتوں ... تو ... ہے ... شخص ... لوک گیتوں ... ہمارے ساتھ ... اپنے ملک کے ... کی ... باوجود اپنے ... کی ... سے روشناس کراتا ہے ... تمام ... ہونا ...

... فوٹو ... کے لئے ... گیا

اس کے بعد کلکتے میں اختر حسین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے یہ پتہ چلتے دیر نہ لگی کہ اختر صاحب نے وشو متر کی نوکری چھوڑ دی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں علی گڈھ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

میں بھی کلکتے سے کشمیر جا پہنچا۔ اور کشمیر میں تین مہینے گزارنے کے بعد میں نے پشتو لوک گیتوں کے سلسلے میں پشاور جا کر دم لیا۔ اس بیچ میں اختر حسین کی کوئی خبر نہ ملی۔ جب بھی کبھی کوئی "کلاس سٹرگل" کے موضوع والا گیت ملتا، اختر صاحب کی یاد ہو آتی۔ آخر میں نے "وشال بھارت" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر برج موہن ورما کو لکھا کہ اختر صاحب کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو ورما جی نے مجھے اس خط کی کچھ سطریں لکھ بھیجیں جو اختر صاحب نے ان کے نام ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء کو لکھا تھا: "پچھلے چار مہینے کیسے بیتے، اس کا حال سنئے۔ اکتوبر میں علی گڈھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر نے کہا کہ آپ خوشی سے بوریہ بستر نہ اٹھائیے گا، تو نکالے جائیے گا! اچھا یہی سمجھا گیا کہ ابھی اخباروں کی جیب پبلسٹی سے بچا جائے۔ کمانڈیس کا مبہ لگنے والا تھا۔ ہم بھی خود اپنے گشتی نامہ لگا لے بنے وہاں جا پہنچے۔ اگر حضرت دل . . . . ہائے ورما جی، اس دل نے کہیں کا نہ رکھا! کمبخت کسی پر آتا نہیں، یوں ہی دھڑکتا ہے۔ الیس صاحب ہم وہاں قریب قریب لمبے ہو چکے تھے کہ ڈاکٹر انصاری تک پہنچ ہوئی۔ نسخہ ملا مگر اس شرط کے ساتھ کہ دو مہینے چپ چاپ پڑے رہو۔ نومبر میں ایکس رے ہوا۔ انجکشن دئے گئے، اس روگ سے شاید بہت دنوں کے لئے چھٹی ملی"

ورما جی کے خط سے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ علی گڈھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد اختر حسین کو کچھ دن دلی میں فاقہ مستی میں گزارنے پڑے اور پھر اسی پریشانی میں وہ لاہور جا پہنچے۔ لاہور سے انہوں نے ورما جی کو خط لکھا:

پیارے ورما جی:

آپ کو یاد ہوگا کہ ہندی سنسار میں اختر نامی ایک آوارہ کبھی رہتا تھا۔ اب وہ پٹواری کی جریب کی مانند ناپتا ناپتا لاہور چلا آیا ہے۔ علی گڈھ، بمبئی، دلی . . . . کہیں بھی اسے آسرا نہ ملا۔ اس بیچ میں برابر بیمار اور بیکار رہا۔ تنگ آ کر ہندی سے ناطہ توڑ رہا ہے۔ ان دنوں "اردو" اور نگا باد کا کچھ کام کرنے لگا ہے۔ شاید روٹیوں کا کچھ سامان ہو جائے۔ کہیں مل جائے۔ دلیس یا بنارسی داس جی پوچھیں تو میری بندگی کہہ کر یہ شعر سنا دیجئے حالانکہ دونوں مہانو بھاوں کو حسن یا عشق سے کوئی واسطہ نہیں۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

اگر آپ اب بھی میرا مول اتنا سمجھتے ہیں کہ وشال بھارت مفت بھیج دیا کریں تو امیر منزل علی گڈھ کا پتہ بدل کر لاہور کا پتہ لکھ دیجئے۔ بہت دنوں تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔

امید ہے آپ سب لوگ بخیریت سے ہوں گے۔ جو یاد کرتے ہوں انکو دھنیہ باد، جو بھول گئے ہوں انکا بھی شکریہ۔

آپ کا

اختر حسین رائے پوری

اس کے بعد ایک مدت تک کسی دوست کے ذریعے بھی اختر حسین کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور سے انجمن ترقی اردو ... سے حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ ادھر یہ ناچیز بھی مسافرت قائم رہی یعنی ۱۹۳۶ء میں جب میں کلکتے میں تھا اور جنوبی ہند اور لنکا کی جاترا میں ... جاتا تھا کہ حیدرآباد جا کر اختر حسین سے بھی ملاقات کر لوں گا۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ اختر حسین تو نظام سرکار کا وظیفہ لے کر پیرس چلے گئے ہیں، اور اب وہاں سے ڈی لٹ لے کر ہی واپس آئیں گے تو جہاں مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی وہاں یہ سوچ کر افسوس بھی ہوا کہ اب نہ جانے کب اپنے اس دوست سے ملاقات ہوگی جس نے مجھے واقعی پہلی بار "کلاس سٹرگل" کے نظریے سے لوک گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے

کی تلقین کی تھی اور یوں مجھے عوامی ادب کے ترقی پسند عناصر کا ٹھیک ٹھیک اتہ پتہ چلانے کی طرف راغب کیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے آخری دنوں میں، جب میں لنکا سے لوٹ کر لاہور پہنچا تو مجھے ایک دن ایک دوکان میں ایک کتاب دیکھنے کا موقع ملا ...... گورکی کی آپ بیتی، حصہ اوّل، میرا بچپن، مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (ڈی لٹ) (پیرس)۔ مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ میرا ایک دوست ترقی کرتے کرتے ڈی لٹ ہو گیا اور اب مجھے بھی اُسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام سے یاد کرنا ہو گا۔

کسی نے یہ بھی بتایا کہ اختر حسین کے افسانوں کا مجموعہ "محبت و نفرت" دلّی سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کتاب مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں مجھے لاہور سے دلّی جانے کا اتفاق ہوا تو اختر حسین سے ملاقات ہو گئی۔ پیرس سے لوٹ کر وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوش نظر آتے تھے۔ اگرچہ کلکتے کی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اب بھی اپنے چہرے پہ ایک خاص طرح کی کیفیت طاری کر لیتے تھے جو اُن کی موجودہ آسودگی سے بہت کم میل کھاتی تھی۔

اُنھوں نے مجھے کھانے پہ بلایا، اپنی بیوی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ پتہ چلنے پر کہ بیگم اختر حسین ایک بہت بڑے پولیس افسر کی دختر بلند اختر ہیں میں زیر لب مسکرایا۔ لیکن خود اختر حسین صرف مسکرانے پر اکتفا نہ کر سکے۔ انھوں نے بہت بڑا قہقہہ لگایا اور کہا۔ وہ مضمون تو آپ نے بھی پڑھا ہو گا جو پنڈت بنارسی داس چترویدی نے بندہ کے بارے میں لکھ کر وشال بھارت میں شائع کرایا ہے۔

اتفاق سے وہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ وہ اندر سے اس مضمون کا کٹنگ نکال لائے اور لال پنسل کے نشان والی کچھ سطروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "پہلے یہاں سے پڑھنا شروع کیجئے۔"

میں نے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"ہمارے پاٹھکوں نے کالپی کا نام سنا ہو گا۔ اُس کالپی کا جو تین مہا پرشوں کی جنم بھومی ہونے کے کارن بہت دور دور تک ... ایک تو ... دوسرے امیر علی ٹھگ اور تیسرے لالہ مُول چند جی اگروال دشومتر والے، ہاں تو اسی کالپی کے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ہاں ڈاکہ پڑا کسی ساتھ سیدی کو اس کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ کوئی برات میں جا بھی کیسے سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے ہی ساتھی سنگیوں نے یہ خبر پھیلا دی — ہم تو پہلے ہی سے کہتے تھے کہ اختر سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہے، نہیں تو پولیس افسر کے ہاں کیوں اُس کی شادی ہوتی!"

خیر دوپہر کی دعوت کا خوب مزا رہا۔ ہم لوگ دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ کلکتے کی ملاقاتوں کا ذکر میں بار بار چھیڑ دیتا۔ بار بار اختر صاحب سے کلاس سٹرگل کی تھیوری پر مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کرتا۔ بیگم اختر حسین تو حیران تھیں کہ ہم لوگ کیسی بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ویسے میں تو تعقے کو ملانے سے ہی فرصت نہ تھی۔ ایک آسودہ حال گھر کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا ایک بالوں والا ایک ڈھیل مہمان اپنے میزبان سے اتنی بے تکلفی برتتے یہ بات شاید بیگم اختر حسین کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اختر صاحب نے بیگم اختر کو مرعوب کرنے کیلئے بتایا کہ جو شخص آج ان کے ہاں مہمان کے طور پر موجود ہے اُس نے اپنے پیروں سے ہندوستان کی دھرتی ناپ رکھی ہے اور بھی بہت سے تعریفی جملے وہ ایک سانس میں کہہ گئے۔ سچ پوچھو تو یہ اپنی تعریف سُن کر مجھے ذرا خوشی نہ ہوتی۔ اگرچہ میں بہت پھٹے حال تو نہ تھا۔ لیکن اپنے آسودہ حال دوست کے سجے سنورے ڈرائینگ روم میں مجھے اپنا لباس واقعی بہت بدزیب اور میلا نظر آنے لگا۔ کبھی میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنی طرف۔ کلاس سٹرگل کی تھیوری اپنی تمام تر شدت سے میرے سامنے اجاگر ہو گئی تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ کیا اختر صاحب اور میں ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دوست سے یہ سوال پوچھنے کی توجرأت نہ ہوئی کیونکہ وہ تو بہت دیر سے گورکی کی "آپ بیتی" کی تعریف کئے جا رہا تھا، جس کا ترجمہ اس نے بڑی خوبی سے اُردو ادب کی نذر کیا تھا۔ میرے دوست کی بات میں ایک طرح کا تیسا نہ تپاک موجود تھا۔ لیکن جب بھی میری نظر اپنے لباس کی طرف جاتی، جب بھی مجھے اپنی بے آسودگی کا خیال آتا مجھے یہ محسوس ہونے لگتا کہ اختر صاحب تو وضعداری میں آج بہت کمال کر رہے ہیں۔ اس وضعداری میں اگر کسی چیز کی کمی کھٹک رہی تھی تو وہ تھی اپنایت کی

کمی [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ ان سوئی لائنز میں ان کا گھر ہے۔ وہاں آکر ایسے ہی کسی گھر میں اپنی دنیا آباد کرنے کا تو میں سپنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

"یہ حضرت تو [illegible] سے کر [illegible] گئے ہیں" شام کی چائے پر اختر صاحب نے بیگم اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بارہا مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ اختر صاحب مجھ سے تو کسی کسی کی نوکری نہیں [illegible] کی ان میں تصور ہے اور تخیل بھی۔ حیات کا واضح مقصد ہے ان کے سامنے۔ یہ واضح مقصد سامنے نہ ہوتا تو کوئی ایسا شخص تھا کہ برسوں سے [illegible] لوگ [illegible] کی [illegible] کی خاک چھانتا پھرتا۔ گدھے کی طرح ہی ان کی زندگی بھی سڑکوں پہ گذری ہے۔ ان کے [illegible] سے اور [illegible] [illegible] و [illegible] سکتے ہیں۔ [illegible] بنا نہیں [illegible] سکتا کہ جو راستے مجھے ان کے مضامین میں نظر آتے ہیں ان سے ہمارے ادیب کوسوں دور ہیں۔ کملے کوسوں دور [illegible]

[illegible] مجھے دیکھئے اختر صاحب [illegible] ایک دوست کی زبان سے [illegible] لیکن اپنی تعریف کہاں [illegible] برداشت کی [illegible]

اُس [illegible] میرے اپنا ایک غیر مطبوعہ افسانہ [illegible] انہیں پڑھ کر سنایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ گوندوں کی ایک لوک کہانی [illegible] تذکرہ [illegible] افسانہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ایک اور افسانہ [illegible] جو میری اپنی زندگی سے متعلق تھا، جسے [illegible] جس سے کہیں زیادہ [illegible] ہی کے لئے میں نے دونوں افسانے ایک ساتھ پڑھ کر سنا ڈالے تھے۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب انہوں نے [illegible] افسانہ ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب انہوں نے مجھے [illegible] اپنی لوک گیتوں والی ڈگر پر ہی چلتا رہوں۔ میں نے ہنس کر کہا "شاید آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے [illegible]"

"یہ تو خیر [illegible] لیکن میں تو محض [illegible] کرنا چاہتا تھا کہ کہیں آپ لوک گیتوں کے کام کو بالکل [illegible]

میں نے ہنس کر [illegible] آپ [illegible] مجھے پنے ذمے لئے ہوئے کام کو تو پورا کرنا ہی چاہئے۔ جو بات آپ نے کہنے کی [illegible] ایک [illegible] دوست [illegible] یوں کہی کہ جب [illegible] دنیا سے کوچ کر جاؤں گا اور خدا کے دربار میں مجھے آواز [illegible] افسانوں والا [illegible] لوک گیتوں والا ہی کہہ کر مجھے آواز دی جائے گی۔"

[illegible] اس وقت [illegible] کی [illegible] لاہور لوٹ آیا۔ یہ بھی عجب بات ہوئی کہ [illegible] زیادہ [illegible] گیا۔ یہاں تک [illegible] شائع ہو [illegible] دوسرا افسانہ [illegible] اور [illegible]

[illegible] افسانوں [illegible]

ایک دن [illegible] جہاں نما کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کر رہے ہیں [illegible] دوں [illegible] لیکن بدقسمتی سے [illegible] ماہنامہ [illegible] اور نہ یہ افسانہ ہی [illegible] انہوں نے کوئی جواب نہ دیا [illegible] ہمارے ڈاکٹر [illegible] صاحب بھی [illegible] کی طرح [illegible] آدمی [illegible] والا [illegible] چھوڑ [illegible] ایک نسخہ موجود تھا۔ ایک مدت کے [illegible] افسانہ [illegible] ادب لطیف [illegible] میں شائع ہوا [illegible] شائع نہیں ہوا تھا۔ جب یہ افسانہ شائع ہوا تو میں نے ادب لطیف کے [illegible] کہا ایک [illegible] صاحب کو [illegible] بھجوا دی۔ انہوں نے [illegible] جواب [illegible] ایک دوست [illegible] میں نے [illegible] کر دیا تھا۔

چار پانچ [illegible] سے دلی چلا آیا تو میرے [illegible] اختر صاحب [illegible] کی ایجوکیشن منسٹری میں انڈر سیکرٹری

کے عہدے پر کام کرتے ہیں۔ اُن کی رہائش پاک دیور روڈ پر فردل باغ میں تھی۔ میں اس مکان میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ان کا ڈرائینگ روم پہلے سے بھی زیادہ سجا ہوا ہے۔

میں نے اُن سے شکایت کی کہ ادھر انہوں نے لکھنا کیوں کم کر دیا ہے۔ وہ دیر تک سرکاری فائلوں سے ہی فرصت نہ ملنے کا بہانہ کرتے رہے۔

میں نے بات کا رخ بدل کر کہا "گورکی کی آپ بیتی کے تینوں حصے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ گیا۔ آپ نے ترجمہ میں اصل کا حق ادا کیا ہے۔ قدم قدم پر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ زبان آسان رکھی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی ہے بول چال کی زبان کا انداز۔ کاش آپ نے اپنے طبع زاد افسانوں میں بھی اسی زبان کو اپنایا ہوتا۔"

اس پر اختر حسین نے ہنس کر کہا "اچھا تو آج آپ نے میری ٹانگ کھینچنے کی یہ ترکیب نکالی ہے!"

لیکن جب بیگم اختر حسین نے مجھ سے اتفاقِ رائے کا اظہار کیا تو میں نے [illegible] کہا "اب فرمائیے اختر صاحب! اب آپ لکھئے سہی، چاہے جس زبان میں ہی کیوں نہ لکھیں۔ حالانکہ آپ کی زبان میں بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ ہے اور ایک خاص مٹھاس بھی ہے۔"

"آپ تو لفاظ بنتے جا رہے ہیں!"

پھر بات کا رُخ اس نئی سیٹ کی خوبصورتی کی طرف گھوم گیا۔ اختر حسین دیر تک اس نئی سیٹ کی تعریف کرتے رہے۔ لیکن بہت جلد اختر حسین نے گورکی کا ذکر [illegible] کہا "گورکی کی آپ بیتی حصہ اول کے مقدمے میں [illegible] کہ گورکی کے ادبی شاہکاروں کا بیشتر حصہ [illegible] نیپلس کی بندرگاہ سے اسٹیمر پر سوار [illegible] نیلے سمندر کے بیچوں بیچ [illegible] اپنی آنکھوں سے وہ مکان دیکھا [illegible] اپنے خیالات اور احساسات کو ہمیشہ [illegible]

"[illegible] آپ [illegible] لکھیں۔"

"[illegible] کبھی کبھار جب کسی میگزین کے ایڈیٹر کا تقاضا حد سے بڑھ جاتا ہے [illegible] ویسے میں جو کچھ لکھتا ہوں [illegible] اپنے [illegible] کلاسیکل قسم کی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"[illegible] آپ بھی نہیں [illegible]"

"[illegible] آپ [illegible] مونٹیسری [illegible]"

[illegible] کسی طرح [illegible] پوشیدہ نہ تھی [illegible]

جب ملک کی تقسیم کا معاملہ [illegible] لیکن میری [illegible] معلوم ہوا کہ انہوں نے پاکستان [illegible] سکتے تھے۔ یہ ان کا اپنا انتخاب تھا [illegible] اپنا [illegible] تھا۔

ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اختر حسین ہمیں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب شاید اس زندگی میں کبھی ان کا نیاز حاصل نہیں ہوگا۔ اختر حسین کے پاکستان چلے جانے پر اتنی حیرت نہ ہوتی اگر وہ وہاں جا کر لکھنے کی رفتار تیز کر سکتے۔ لیکن اس کا نتیجہ تو دراصل اس توقع کے برعکس نکلا۔ پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل میں اختر حسین کا چہرہ کہیں تو نظر آ سکے، اس کے لئے میں بری طرح ترس گیا۔ بار بار نقوش کے بھاری بھرکم شماروں میں اپنے دوست کا چہرہ اور اس کی تازہ ترین تحریر کا کوئی نمونہ ڈھونڈنے کا جتن کیا۔ لیکن جب کہیں اختر حسین کا ذکر تک ملنا دشوار ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ اب اختر حسین نے لکھنے کی طرف سے یکدم سنیاس لے لیا ہے اور اب یہ سوچنا بیکار ہے کہ وہ پھر سے قلم اٹھا کر لکھنے لگیں گے کئی بار دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ لیکن لاکھ سوچنے پر بھی اس کا جواب نہ مل سکا۔

کئی سال کا عرصہ بیت گیا۔ اتنا ضرور پتہ چلتا رہا کہ اختر صاحب پاکستان کی ایجوکیشن منسٹری میں کام کر رہے ہیں۔ لیکن نہ کبھی میں انہیں خط لکھ سکا۔ نہ کبھی ان کا خط آیا۔ میں انہیں یہ بھی تو نہ لکھ سکا کہ میں بھی ادھر کئی برسوں سے ہند سرکار کی پبلیکیشنز ڈویژن میں ہندی آج کل کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں اور میں قریب قریب قلم سے کام لئے جا رہا ہوں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ اوپر اٹھی تو دیکھا کہ زینے سے ایک شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شخص میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ جانی پہچانی صورت۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کی طرف بڑھا۔ ہم بغلگیر ہو کر ملے۔ یہ اختر حسین ہی تو تھے۔

”کب تشریف لائے اختر صاحب!“ میں نے جھٹ پوچھ لیا۔

”دیکھو بھئی میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ شام کو انڈیا کافی ہاؤس میں آئیے گا۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ میں نے کہا

”بس ذرا اختر صاحب سے ملنے آیا تھا“ انہوں نے کھڑے کھڑے جواب دیا ”سوچا آپ کو اپنے آنے کی اطلاع کرتا جاؤں۔ شام کو کافی ہاؤس میں نرولا بھی آئے گا۔ آپ بھی آئیے گا۔“

وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح جلدی جلدی چلے گئے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہی اختر حسین تھے۔

شام کو نئی دہلی کے انڈیا کافی ہاؤس کی بالکونی میں پہنچا تو اختر حسین اور شمشیر سنگھ نرولا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ نئی پرانی بہت سی باتیں ہوئیں اختر صاحب کے چہرے پہ بار بار وہی رنگ جھلک اٹھتا تھا جو ہم ان کے چہرے پہ آج سے برسوں پہلے دیکھا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے اندر شباب کا رنگ ابھی تک بچا رکھا ہے۔ آواز میں وہی جھنکار۔ آنکھوں میں وہی تبسم۔ چہرے پہ وہی دلہن کی سی لاج کا احساس۔ لیکن ان کی باتوں میں بڑی گہرائی آ گئی تھی۔

اتفاق سے بالکونی کے ایک کونے میں مجھے اپنا ایک دوست نظر آ گیا۔ میں نے اسے پاس بلا کر اختر صاحب سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا ”یہ بھی آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔“

”بہت خوب!“ اختر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

”میرے دوست نے اپنی بغل سے ایک کتاب نکال کر اختر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”اس پہ اپنا آٹوگراف ہی دے دیجئے۔“

یہ ”پیام شباب“ کی جلد تھی جسے اتفاق سے میرا دوست اسی روز بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اختر حسین نے پیام شباب پہ چند الفاظ لکھ دئے۔ کافی آئی تو اختر صاحب دیر تک گرم کافی کی تعریف کرتے رہے، جیسے ان میں بھی قاضی نذرالاسلام کی کسی ہنگامی نظم کا ذائقہ گھلا ہوا ہو۔ ”پیام شباب“ میں نذرالاسلام کی شاعری آپ کو کیسی لگی؟“ انہوں نے میرے دوست سے جھٹ پوچھ لیا۔ اس کے جواب میں میرا دوست صرف مسکرا کر رہ گیا۔

کافی ہاؤس سے نکل کر میں اور نرولا اختر صاحب کو کنسٹی ٹیوشن کلب تک چھوڑنے گئے۔ راستے بھر مجھے بار بار اختر حسین سے یہ پوچھنے کا خیال آتا رہا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر اختر حسین یہاں ہمارے بیچ ایک مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور کہیں ان کے دل پر ٹھیس نہ لگے، میں خاموش رہا۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں کہہ اٹھا: "آپ کا یہ پانڈوؤں کا سا بن باس کا زمانہ کب ختم ہو گا؟"

"بہت خوب!" اختر حسین نے اندھیرے میں قہقہہ لگایا۔ "یہ تشبیہ بھی خوب رہی لیکن صاحب آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

نرولا نے بھی قہقہہ لگایا اور پھر ذرا سنبھل کر کہا: "سنتے رہتی تو یونہی کچھ نہ کچھ بول اٹھتا ہے۔"

"یوں وضعداری کو ہاتھ سے نہ جانے دو نرولا!" اختر صاحب نے نرولا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "سنتا رہتی ہم دونوں سے سینئر ہے۔"

لیکن نرولا کب چپ رہنے والا تھا۔ بولا: "بزرگی بہ عقل است نہ بسال!"

اندھیرے میں اختر صاحب کا چہرہ نظر نہ آ سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ ایک ادیب کو دوسرے ادیب پر یوں چھپٹتے دیکھ کر انہیں ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ جب میں نے ان سے وداع لی تو دبے الفاظ میں اتنا ضرور کہا: "دیکھئے اختر صاحب کنٹ ہاپنز کے ایڈیٹر نے ادب کے نئے معیار کے سلسلہ میں آپ پر کچھ لکھنا چاہا تھا لیکن اتنے میں وہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔"

"تم جس بھی پبلشر کی طرف دیکھو گے سنتیارتھی اسے تو اپنی دوکان بڑھانی ہی پڑے گی،" نرولا نے فقرہ کسا۔ اور پھر پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا۔

اختر صاحب واپس چلے گئے۔ بہت دن تک پھر ان کی کوئی خبر نہ ملی کہیں کسی میگزین میں بھی ان کے بارے میں یا ان کے قلم کا کوئی شاہکار بھی دیکھنے کو نہ ملا۔

پچھلے ایام روزنامہ نقوش کا افسانہ نمبر جنوری ۱۹۵۴ موصول ہوا تو میں نے بڑے اشتیاق سے اس میں اختر حسین رائے پوری کا کوئی تازہ افسانہ ڈھونڈنے کا جتن کیا۔ ان کا افسانہ اس افسانہ نمبر میں کہیں نظر نہ آیا۔ ہاں اس افسانہ نمبر کے آخر میں ایک بحث چھپی ہے ذرا دیکھیے —————— اردو افسانے میں روایت اور تجربے۔ جس میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، انتظار حسین، حمید اختر اور شوکت تھانوی نے حصہ لیا تھا۔ اس ادبی بحث کو میں بڑے غور سے پڑھنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ دیکھوں تو سہی کہ اختر حسین رائے پوری کے بارے میں ان نئے ادیبوں کی کیا رائے ہے۔ ایک جگہ میری نظر جم گئی:

حمید اختر: اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں؟

وقار عظیم: وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت بریلوی: افسانہ نگاری کی حیثیت سے ان کا کوئی خاص مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں ——— زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

پچھلے دنوں سہیل عظیم آبادی سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ اختر حسین رائے پوری دلی آ رہے ہیں۔ یہ خبر صحیح تھی۔ اختر صاحب دلی آئے تو ضرور لیکن وہ مجھ سے ملے بغیر ہی ایک مہمان واپس چلے گئے۔ حالانکہ وہ دو روز یہاں رہے، دوستوں سے ملتے رہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان سے ملوں لیکن ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی اور انہیں ڈھونڈنا ناممکن تھا۔

اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو میں ان سے یہی عرض کرتا کہ اختر بھائی نقوش میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے میں سو فی صدی متفق تو ہرگز نہیں ہوں۔ میں ان سے کہتا کہ آپ نے ہمارے ادب کی بہت خدمت کی ہے۔ لیکن پھر سے اپنا قلم اٹھائیے۔ آگے آ کر پھر سے کچھ لکھیے۔ اپنے ماضی کو اپنے ساتھ رکھ کر چلیے۔ حالات سے سمجھوتہ مت کیجئے۔ اپنے جوہر قابل کو عوامی ادب کی تعمیر میں لگائیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کہیں مجھے نکل کر اختر بھائی سے یہی بات کہنے کا موقعہ مل گیا اور انہوں نے قہقہہ لگا کر میری بات کو کاٹنا چاہا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا۔ یہ پہلی کمائی پر تو کوئی ادیب کب تک جی سکتا ہے اختر صاحب! تازہ کمائی بھی تو ضروری ہے۔

———

اختر اورینوی

شکیلہ اختر

[illegible]

دبلی دبلی سی رہتی ہیں۔ ان کا سارا بچپن تو بیمار یوں ہی میں کٹا ہے۔ پرہیز کرتے کرتے تھک کر بچا سے خود بسکٹ چرا کر کھانے لگے۔ میں نے ایک دن اماں کو یہ بات بتا دی پھر تو میری شامت ہی آگئی۔ خود تو ان میں سکت تھی نہیں، چھوٹی بہن رقیہ کو بلا کر اسی دن شام کو جب کہ میری گڑیا الماری کے اوپر رکھی تھیں سب کو اتروا کے ایک ایک کی ٹانگ توڑ توڑ کر پھینک دی۔ اور سینہ انکوں بانٹ آستین اور رکھنے لگے کا بلونہ بے حد نا پسند ہے۔ وہ اونچی آواز میں بولنے بھی نہیں دیتے اور بعض حد تو یہ ہے کہ تصویر کھنچواتے تک کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ تم نے یہ چھپا جایئگا کہیں؟ مگر ان کو کبھی بھی پسند نہ کرینا۔

[illegible] کر مجھ کو ہنسی آگئی تھی، وہ جو خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا تھا جس کے قہقہے اس گھر کی زندگی تھے جس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ساری دنیا سمٹ کر آگئی تھی جو وقت سے بہت پہلے بڑا ہو چکا تھا اور جس کے لئے خاندان کی ہر لڑکی آنکھیں بچھائے رہتی کے باوجود اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہ کرتی تھی اور جس سے خاموشی کے ساتھ محبت کرنے کے علاوہ احساس کے سوا زبان پر نام لانے تک [illegible] نہیں [illegible] لڑکے لئے [illegible] [illegible] مزاج پر سسی کہ گئی اور اسی وقت پھر ہر کو اپنی ایک حماقت بھی یاد آگئی، جب بھی اماں ان کو کوئی خط لکھتیں [illegible] کے کونے پر بڑی سعادت مندی سے کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتی تھی۔ ایک دن اماں کے نام کا ایک لفافہ جو آیا تو اس میں میرے نام کا بھی ایک پرچہ تھا [illegible] ایسا ہی تھا جو ایک دم کی طرح مجھ پر [illegible] تم جو [illegible] کہ تمہارا خط [illegible] تو اچھا ہے تمہارا خط نہیں ملا [illegible] کی زبان پر یہی جملہ تھا اور میرے لئے ڈوب مرنے [illegible] تھی۔ [illegible] جانے والی [illegible] نمناک تھی میں [illegible] کی طرف گھٹ رہے چھت پر خاموش بیٹھی تھی اور وہ بچھم کی طرف والی چھت پر سارے لوگوں کے ساتھ گپیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور ایسا [illegible] کہ کاش وہ چھتوں کے بیچ میں آنگن حائل نہ ہوتا اور میں محسوس کر جانے کی بجائے سامنے دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچ جاتی ——— مگر [illegible] کیا مزاج پرسی کرنے کی مجھ میں ہمت ہو سکتی تھی [illegible] پورے دو سال کے بعد وہ اپنے ہاتھ میں [illegible] سینہ [illegible] کھڑے تھے ان کی ہلکی ہوئی سفید رنگ کی پیشانی پر بیگ [illegible] [illegible] تھے اور سیاہ بال چمک رہے تھے اور موٹے موٹے شیشوں [illegible] آنکھیں میری [illegible] اسی رات کو جب سارے لوگ [illegible] فرش پر لیٹے بیٹھے تھے اور [illegible] باتیں ہو رہی تھیں میں اسی شام والے انداز میں سمٹی ہوئی ایک جانب بڑی نیاز مندی سے چپ چاپ بیٹھی [illegible] موقع تھا جس میں ان کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی اور ان کے قہقہوں کی گونج میں ان کی عجیب باتیں سن سن کر یہ سوچ رہی تھی کہ ممانی جان نے اپنے ناموں کے خلاف آخر کیوں اتنا طرار رکھا ہے۔ مگر [illegible] میں وہ [illegible] والی ڈانٹ یاد اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

ان دنوں میری عمر [illegible] تھی [illegible] اپنے گھر کی سب سے بڑی لڑکی ہونے کی [illegible] بیکسی [illegible] میرے بڑے پن کا احساس [illegible] [illegible] احساس بڑائی نے [illegible] مجھ کو [illegible] سے [illegible] پہلے ہی جگا دیا تھا۔ کمرے کے اندر سے جیسے ہی اماں اٹھ کر [illegible] شروع [illegible] میری طرف اٹھیں [illegible] ایک آ جاتے ہیں ابھی آپ لوگوں کا امتحان لوں گا۔ شکیل بھیا نے جو میرے چچا اور [illegible] کا لج میں [illegible] بڑے خلوص سے ان کی طرف دیکھا [illegible] ناموں کی شاعری [illegible] ان کے چھپے ہوئے انشائیہ [illegible] خاندان میں ہونے لگے تھے اور ہمیشہ [illegible] معصوم [illegible] میری منجھلی بہن [illegible] بڑے بھولے پن سے ان کی طرف حیرت سے تکتی ہوئی [illegible] [illegible] کی روشنی [illegible] کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور عینک سے ڈھکی ہوئی ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں [illegible] شرارت [illegible] میں اپنا ایک شعر سنا رہا ہوں تم سب مل کر مجھ کو اس کے معنی بتاؤ۔ دائیں طرف کو ذرا سے جھکے ہوئے ان کے گلابی لبوں پر ایک تھرتھراہٹ سی آئی۔

"شیشہ [illegible] کے لئے ہے یہی معراج کمال
تیری غیبت میں بھی جانا تجھے دیکھا کرنا"

اور اچانک ایک بڑی ہی لطیف حقیقت بجلی کی طرح میرے دل و دماغ پر لہرائی اور اچانک میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ شکیل بھیا دنیا بھر کی تشریح کرتے رہے اور میں رات بھر یہی سوچتی رہ گئی تھی کہ میری تین سال کی خاموش نگاہوں میں اتنی تاثیر کہاں سے بھر گئی تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیڑھ دو دن میں ان کی

طبیعت نہیں لگ سکی تھی اور مسوری کی بلندیوں پر ٹھنڈک لگنے کی وجہ سے وہ جلد ہی پٹنہ واپس آ گئے تھے، میڈیکل کالج میں ان کا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا اور اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے وہ ڈاکٹری کی تعلیم کو کسی طرح سے بھی مکمل کر لینا چاہ رہے تھے، مگر اس طرف اچانک پھر ان کے منہ سے تھوڑا سا خون آ گیا تھا اور پٹنہ کے سب سے بڑے پروفیسر اور ڈاکٹر ٹی۔ این۔ بنرجی نے مکمل طور پر آرام کرنے کے لئے انکوسون کے کنارے رہنے کی تاکید کر دی تھی، اسی لئے اب وہ ایک بیمار کی حیثیت سے تبدیل آب و ہوا کی خاطر ہمارے یہاں دریائے سون کے کنارے کچھ مہینے گزارنے کو آ گئے تھے، ان کے برتن علیحدہ طور پر آئے تھے پانی پینے کا گلاس تک الگ تھا اور ان کے گھر والوں نے بڑی تاکید سے اس بات پر زور دیا تھا کہ ان کو آوٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں الگ تھلگ رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کی چیزیں دوسروں سے بالکل علیحدہ رکھی جائیں۔ ٹی۔ بی کا کیڑا ابھی تک نکلا تو نہیں تھا مگر پھر بھی احتیاط رکھنا ضروری ہے" اماں خط پڑھ کر رونے لگیں، اُن کے اپنے چچا کا اتنا عزیز لڑکا جو مدتوں کے انتظار پر اتنے لاڈ و پیار پر دنیا میں آیا تھا اور آج جو ان کی خوش قسمتی سے ان کے گھر کا مہمان ہوا تھا تو وہ "پام ولا" کی اتنی بڑی شاندار کوٹھی کو چھوڑ کر ان کو آوٹ ہاؤس میں جگہ دیں گی؟ ابا جان کا چہرہ بھی بڑا افسردہ تھا انہوں نے بچپن میں کتنے پیار سے ان کو اپنی گود میں کھلایا تھا، اور آج جب موت کا سایہ ان کے سر پر منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا تو لوگ کس طرح سے ان بیچارے کا دل توڑنا چاہتے تھے "نہیں بھئی یہ تو نہیں ہوگا۔ اب جو بھی ہو ہم تو ایک ہی ساتھ رہ کر گزاریں گے" اور اماں ابا جان کے اس فیصلے پر بے حد خوش تھیں۔ یہ ۱۹۳۱ء کی شروع جنوری کی بات تھی آموں کے باغ، شیشم، نیم اور تاڑوں کے جھنڈ اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں ان کے لئے زندگی کا پیغام لاتے رہے۔ سرکنڈے کے ریشمی پھولوں سے ڈھکے ہوئے ریتوں کے اونچے اونچے سنہرے ٹیلوں میں اب ان کے نغموں کی گنگناہٹ کانپنے لگی تھی اور سون کے ساحل پر گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے یا تو اپنی تصویروں میں رنگ بھرتے رہتے یا بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھتے رہا کرتے تھے، اور چاندنی راتوں میں "پام ولا" کے سامنے نہر کے کنارے چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے وہ شیشم کے پتوں میں سے چھن چھن کر جھلکتی ہوئی بے قرار چاندنی کو دیکھتے ہوئے اپنی تازہ کہی ہوئی نظموں کو گنگنایا کرتے تھے انہی دنوں کی لکھی ہوئی نظم کا ایک ٹکڑا یہ بھی تھا۔

دل کی کلی کھلی بھی جو باد خزاں نے آ لیا
نغمے نکل رہے تھے کہ ساز مرا بگڑ گیا
خندہ ابھی تھا زیر لب آنسو کا ابر چھا گیا
اپنی خوشی کا آفتاب وقت سحر غروب تھا

ارول کی شاداب فضاؤں، ہرے ہرے باغوں اور لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جہاں وہ حیات نو پا رہے تھے، تو اسی جگہ میں وہ ایک بڑے ادیب شاعر اور نقاد بھی بن رہے تھے۔ ان دنوں نیاز فتحپوری کا بڑا گہرا اثر ان پر چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے الفاظ اور رنگین استعاروں کے ساتھ انہوں نے پہلی بار ارول ہی میں افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ جن میں سے کچھ تو بہارستان پٹنہ میں چھپتے رہے تھے۔ اور انہی دنوں ان کا ایک افسانہ "نیا شوالہ" نگار میں پہلی بار چھپ کر بہت مقبول بھی ہوا تھا۔ ان دنوں ان کی عمر بیس سال کی تھی اور ارول آ کر اپنی بیماری کو اس حد تک بھول چکے تھے کہ گھنٹوں سون میں تیرتے رہتے اونچے اونچے ریت کے ٹیلوں پر لمبے لمبے قدموں کے ساتھ گھومتے رہتے اور نہر میں دیر دیر تک کشتی رانی کرتے رہتے تھے۔ اور جب اتنے کاموں کے بعد بھی وقت بچ جاتا تو "پام ولا" کے ہرے ہرے لان پر ادھ منہ لیٹ کر وہ فطری مناظر کی تصویریں بناتے رہتے اور اس کے بعد پھر مجھ کو بانگ درا بھی پڑھایا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں انکو اتنا بڑا ادیب اور شاعر ارول ہی نے بنایا ہے، وہ لیئے دل و دماغ میں ادب کا بیج لے کر تو ضرور آئے تھے مگر سون کے ساحل پر ہی ان بیجوں میں سے کونپلیں پھوٹنی تھیں، اور ہرے پتے لگنے لگے تھے۔ چھ فٹ کا اونچا قد، دبلا جسم، لمبی گردن اور سیاہ برش کئے ہوئے سیدھے سے بال، وہ سارے لوگوں میں نمایاں طور پر نظر آ جاتے اور لمبے لمبے قدموں والی چال سے وہ دور ہی سے پہچان لئے جاتے تھے، نوجوانی کی چمک، روشنی اور زندہ دلی کے بعد بھی جب تک ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی دل کھول کر باتیں کرنے کو جی چاہتا۔ اور جہاں

سنجیدگی چھائی بس پھر تو "جی" اور "جی ہاں" سے زیادہ بولتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ میں نے ہمیشہ سے ان کے اندر دو شخصیتوں کو پایا تھا۔ ایک تو لطیف خیالات و جذبات کا بے پایاں محبت کرنے والا زندہ دل محبوب شاعر اور ادیب، اور دوسرا خاندان کا لاڈلا مگر دائمی بیماری سے ضدی، چڑچڑا، زود رنج کٹر مذہبی اور بڑے پرانے خیالات کا انسان۔ اور زندگی کے دونوں پلڑے اپنے اپنے وقت پر اونچے اور نیچے ہوتے رہتے تھے لیکن سون کے ساحل پر چلتی ہوئی بڑی لطیف اور صحت بخش ہواؤں نے زیادہ تر ادب اور شاعری والا محبوب پلڑا ہی جھکا ہوا رکھا تھا ——— دوسرے سال میرے نانا جان کا انتقال ہو گیا تھا اور ہم سارے لوگ ایک ہی ساتھ اورین آ گئے تھے وہی گھر میرا ننہال تھا اور وہی اختر صاحب کا اپنا گھر بھی کہ اختر صاحب کے والد اور میرے نانا جان کی جتنی بھی زمینداری اور کاشتکاری تھی سب کی سب ایک ساتھ تھی اور نانا جان کی موت سے سارا انتظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ انہی دنوں اختر صاحب مکمل طور پر ایک زمیندار اور کاشتکار بن کر رہ گئے تھے ان کا کھانا بھی کھیت ہی پر جایا کرتا تھا اور پانچ سو بیگھے والے کھلیان میں غلوں کے ہزاروں ہزار من اونچے اونچے پُرنج پر وہ سارا سارا دن اتنے آرام سے بیٹھے ہوئے ہل، بیل، لگت اور کھتیان کے کاموں میں جتتے ہوئے گزار دیتے کہ ذرا بھی اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کھیتی کے سوا کبھی انہوں نے دوسرا کام بھی کیا تھا اور جاڑے کی شام میں جب سارے کارندے اپنے کاندھوں پر ہل لئے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگتے اور پتھریلی گلیوں میں گزرتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیاں بجنے لگتیں تب ٹھیک اسی وقت بڑے بھاری بھاری جوتوں کی چاپ برآمدے کے پختہ فرش پر بھی گونج اٹھتیں اور گوبر سے لتھڑے ہوئے جوتوں کے تلے میں سے دھان کی سنہری کھیلیں نکل نکل کر ادھر ادھر بکھرتی جاتیں اور میں حیران نگاہوں سے دیکھتی ہوئی سوچتی رہ جاتی کہ وہ چاندنی راتوں میں شعر و ادب کی تفسیر بیان کرنے والا انسان کہاں چلا گیا؟

اب ان کی صحت ہر طرح سے اطمینان بخش تھی۔ چند مہینوں کی کاشتکاری کے بعد جولائی سے کالج کھلنے والا تھا۔ میڈیکل کا کورس پورا کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش کی مگر ڈی۔ این۔ بنرجی صاحب نے بڑی سختی سے روک دیا اور مشکلوں کے بعد انہوں نے صرف آرٹ کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی تھی۔ اختر صاحب پٹنہ جا چکے تھے مگر جیسے ہی چھٹیاں آتیں سیدھے بھاگ کر اورول چلے آتے اور سون کے ساحل پر پھر ایک زندگی سی آ جاتی تھی اتنے ہی دنوں میں انہوں نے میڈیکل کالج کی تیز اور تلخ دواؤں کی بو کو بھلا کر آرٹ اور ادب کو گویا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی حسرت سے کہا کرتے کہ میں نے صرف غریبوں کی خدمت کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہا تھا۔ مگر اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ادب اور آرٹ ہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ گھنٹوں وہ شیلی، کیٹس، بائرن اور ورڈزورتھ کی نظمیں مجھے سمجھاتے رہتے کبھی دیر دیر تک غالب، میر اور اقبال سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے مجھ کو ان کی خصوصیات بتلاتے اس وقت ان کے الفاظ اور خیالات کی روانی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ علم کا یہ سمندر کبھی بہت بڑے ساحل سے ٹکرانے کو بیچین ہے۔ اور میں! ——؟ میں تو اس سمندر کے کنارے خواہ مخواہ کی اُگی ہوئی ایک ایسی گھاس تھی جس کے کمزور جڑوں پر بھی کبھی کبھی سمندر کی جھاگیں ایک دائرہ سا بنا کر تھوڑی دیر کے لئے اس میں ایک حسن پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کو سچ مچ میں کیٹس سے محبت تھی، اس کی شاعری میں انہیں اپنے درد اور غم کی جھلک نظر آتی تھی اور اختر صاحب کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ کیٹس ہی کی طرح ٹھیک ۲۸ سال کی عمر میں وہ بھی اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ کیٹس کا نام اور اس کی درد میں ڈوبی ہوئی شاعری ہی ان کے دل میں اپنے مرض کا غم کھو دیا کرتی تھی، ویسے اپنی بیماری کا احساس ان کو کبھی بھولا کر ہوا کرتا تھا۔ اتنے دنوں میں میں نے بھی اپنے بچپن سے لکھنے لکھانے کے شوق کو پورا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اختر صاحب جس تیزی سے ادب میں صحت یاب ہو رہے تھے اسی رفتار سے میں بھی چھوٹے چھوٹے انشائیے لکھنے کی مشق کر رہی تھی۔ گھر کی پہلے سے ادب نواز فضا اور اس پر سے ایک ادیب مقرر، کچھ نہ کچھ روشنی تو کونوں کھدروں میں پڑ ہی جاتی ہے۔ میری اماں اور ابا جان کو اختر صاحب سے بے حد محبت تھی گھر کے اندر چھوٹے چھوٹے بچے بوڑھے بڑے سبھی مگر ایک دن بھی اس گھر میں یہ محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ کوئی چھوت کا مریض یہاں آیا ہے۔ ڈاکٹروں کا بھی خیال بہت کچھ بدل گیا تھا اسی لئے سنہ ۳۴ء میں ۲۴ مئی کی لہکتی ہوئی تاریخ کو وہ میری زندگی میں آ گئے تھے۔ پٹنہ کالج گرمی کی چھٹیوں میں بند تھا اور ریتوں کے اونچے اونچے ٹیلوں کی وجہ سے "پام ولا" کی ریفیوجس عمارت ایک لہکتا ہوا تنور بن کر رہ گئی تھی، سارا دن گرمی سے تڑپتے ہوئے گزرتا مگر سون کے کنارے

رات کا آنچل بڑا ہی ٹھنڈا خمار آگیں اور پُرسکون ہوتا تھا۔

اختر صاحب نے انگلش میں آنرز لیا تھا مگر ان کے پڑھنے کی شان بڑی نرالی تھی انہوں نے جب بھی کتابیں دیکھیں بس ایسے ہی جیسے افسانے پڑھے جاتے ہیں، آدھا گھنٹہ بھی جم کر کبھی نہ پڑھتے تھے۔ ان کو پٹنے کالج میں انگلش کا انگریز پروفیسر بل بہت پسند تھا۔ اکثر وہ اُس کے لیکچروں کا نوٹ مجھ کو سنایا کرتے اس کی قابلیت اور سادگی کے وہ بے حد مداح تھے۔

اکتوبر کی چھٹیوں سے پہلے ہی میرے منجھلے چچا کا سارا خاندان "پام ولا" میں آگیا تھا۔ منجھلے ابا ریٹائر ہو کر "پام ولا" کے قریب ہی اپنی کوٹھی بنوانے آگئے تھے اچانک طور پر آجانے والے ان سب حسین، بڑے رنگین اور بہت ہی دلچسپ تھے ایک تو ہم بہنوں کی بھی خاصی تعداد تھی اس پر سے ایک ہی ساتھ منجھلے ابا کی پانچ لڑکیاں آگئی تھیں، دو بڑی سے بڑی تو تقریباً ایک تمام ہماری عمر کی اور دو میری بہن صنوبر کی ہم عمر اور ان سے کچھ چھوٹی۔ بس پھر تو "پام ولا" میں جیسے پرستان آگئے تھے، چمن چمن کے شرارتیں کی جاتیں اور اختر صاحب۔ کی کہی ہوئی نظموں پر ان کی تعریفیں شاعرانہ مناظر اور حسن کو سراہا گیا تھا ان کے ہر ہر مصرع پر عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے تھے اور روشنی کی ہنسی پر جھوم اٹھتے، کوئلیوں کی طرح ہم اختر صاحب کے ان مصرعوں پر اہک اٹھتے تھے۔

سبزۂ شاداب پر شبنم جواہر کا ہجوم — سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم

شاعر رنگین کے رنگین خیالوں کا ہجوم

اور اختر صاحب اکتوبر کی چھٹیوں میں اتنی جلدی آئے تو ایک دوست اپنے اندر بن کر رہ گئے۔ وہ دن بڑے یادگار طور پر گزرے ہیں ہم سب کی سب اختر صاحب کے گرد ایک گھیرا لگائے بیٹھی رہتیں۔ کسی کے ہاتھ میں بانگ درا ہوتا کسی کے ہاتھ میں دیوان غالب، ہر طرف بس دیوان ہی دیوان نظر آتے تھے، مومن کی شاعری چھڑتی، غالب کا انداز بیان سمجھایا جاتا اور اقبال کے ترانوں میں ماضی پر تبصرے ہوتے رہتے۔ اختر صاحب نے ایک خالص شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہمارے الھڑ ذہنوں میں بھر دیا تھا۔ شاعری اور احساس شعریت سے ہم اتنے ہم آہنگ ہو گئے تھے کہ اچانک طور پر ہم ساری بہنوں نے ایک ہی ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ اختر صاحب حیران رہ گئے۔ یہ سون کے میٹھے پانی ہی کے کرامات تھے جو ایک ساتھ ایسی لڑکیاں جذباتی شعر کہنے لگ گئیں جو تعلیمی لحاظ سے بے حد کمزور تھیں۔ "پام ولا" پورے طور پر شعر و ادب کا گہوارہ بن کر رہ گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک بیت بازی ہوتی رہتی، مصرع طرح دیا جاتا شعر کہے جاتے اور پھر مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی۔ صدارت کی کرسی اختر صاحب کے لئے مخصوص تھی اور باری باری عائشہ شمیم، شکیلہ اختر، عزیزہ نگار، رضیہ رعنا، نفیسہ ناز اور نسیمہ سروناز اپنا اپنا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کرتیں۔ اندر سبھا کی محفل جمی رہتی اور راجہ اندر اپنی جگہ پر استفادہ کرتے رہتے۔ مگر ان ساری رنگینیوں کے ساتھ ہی ساتھ نمازوں کی پابندی بھی تھی، اسلامی خصوصیات پر وہ بڑے ہی عالمانہ رنگ میں روشنی ڈالا کرتے اور جمعہ کی نماز پڑھاتے ہوئے بہت ہی شاندار خطبے دیا کرتے تھے۔ اسکول سے لے کر میڈیکل کالج تک ان کی پڑھائی کا ایک اعلیٰ ریکارڈ تھا اور کوئی نہ کوئی وظیفہ ان کو ملتا ہی رہا تھا۔ میڈیکل کالج میں اسکالرشپ کے جتنے بھی روپے ملتے، وہ تعلیمی سلسلے میں چندہ دے دیا کرتے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں میڈیکل کالج بڑے ہی ٹھسّے اور فیشن کا کالج سمجھا جاتا رہا ہے مگر اسی کالج کے ہوسٹل میں اختر صاحب کے ایک بہت محبوب دوست ایسے بھی تھے جن کے پاس اوڑھنے کے لئے کچھ نہ تھا، انہوں نے اپنے ناشتے کے پیسوں کے ساتھ چادر کی قیمت بھی غریب لڑکوں کی فیس میں دے ڈالی تھی۔ ورنہ ان کی غیرت نے عشق کے ناشتے کا چوری چھپے چپلا رکھنا زیادہ پسند کیا تھا مگر گھر والوں کو اس کی خبر تک نہ پہنچنے دی تھی۔ اسی طرح سے جب وہ ارول پہنچے تھے تو ہم لوگ ان کے لحاف سے محروم کسی بچے کا توشک دیکھ کر حیران رہ گئے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ گھر میں ایک بزرگ خاتون کے پاس توشک نہیں تھا اختر صاحب نے خود قینچی سے کر اپنے توشک سے دو ٹکڑے کر دئے اور وہ توشک اب ایسی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایک دن "پام ولا" میں وہ سارا دن اپنے کوٹ کا گلا بند کئے ہوئے پہنے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ باہر ایک چپراسی ہے کے پاس کرتا نہیں تھا اختر صاحب نے اپنی قمیض اتار کر اس کو دے دی ہے اور اب اپنا کوٹ اس لئے پہنے پھر رہے ہیں کہ اس وقت کوئی دھلی ہوئی قمیض ان کے پاس نہیں تھی۔

اپنی طبیعت، مزاج اور آؤٹ لک کے لحاظ سے وہ بڑے عجیب و غریب انسان ہیں، ساری دنیا کا علم سمیٹ لینے کی تڑپ نے ان کو اچھا خاصا

ایک انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔ وہ جب بی۔ اے کرنے کے لئے پٹنہ کالج کے مسلم ہوسٹل میں رہنے لگے تو سارے لڑکوں کی سرداری انہی کو بخشی گئی تھی۔ اتفاق سے بڑا ہی اچھا اور زندہ دل گروپ اکٹھا ہو گیا تھا۔ شیطانی کی ساری اسکیمیں انہی کے کمرے میں سوچی جاتیں۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی بے جا مداخلت ان سبھوں کو بہت ہی کھلتی تھی اسی لئے اسٹیڈی پیریڈ کی گھڑیوں میں کورج کے بوٹ میں سارا گروپ مزے میں کالج کے پہلو میں بہتے ہوئے گنگا کی سیر کرتا رہتا اور جو اچانک سپرنٹنڈنٹ کی یاد آ جاتی تو پھر گنگا کے دوسرے کنارے پر سے ٹوٹی پھوٹی کالی ہانڈی میں پھٹے پرانے جوتے بڑے حفاظت کے ساتھ ہوسٹل میں لائے جاتے اور پھر ان کے نام پر فاتحہ پڑھ کے ان کے کوارٹر کی طرف بڑے زور کے دھماکوں سے ہانڈی پھوڑ دی جاتی تھی۔ ۱۱-۱۱ بجے رات کو ہوسٹل کے بند پھاٹک پر سے وہ بڑے اطمینان سے کود جاتے تھے جیسے ان کو کبھی احتیاط کی تاکید ہی نہ کی گئی تھی۔ ۱۵ جنوری ۳۴ء میں بہار کا ہیبت ناک زلزلہ آیا تھا اور اسی کی تباہ کاریوں کی وجہ سے یونیورسٹی کا امتحان بجائے مارچ کے مئی میں ہو رہا تھا۔ اختر صاحب کے سارے پرچے بڑے اچھے جا رہے تھے آخر کا صرف ایک پرچہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا۔ وہی خون جس نے ان کا محبوب میڈیکل کالج ان سے چھڑا دیا تھا اور اب وہ آخر کا پورا امتحان بھی ختم نہ کر سکے تھے۔ ہوسٹل کے دریچے سے باہر خون تھوکتے ہوئے ان کا چہرہ فق تھا اور ہوش اڑا ہوا۔ اگر خون آنے کی بات ذرا سی بھی پھیلتی تو پھر امتحان دینا تو درکنار ہوسٹل کو بھی چھوڑ دینا پڑتا۔ مگر جیسے ڈوبتا ہوا انسان ایک تنکے کا سہارا لے انہوں نے شکیل بھیا کو ساتھ لے کر جو اسی ہوسٹل میں تھے بظاہر بڑے سکون سے ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کے یہاں چلے گئے جو مسلم ہوسٹل سے [illegible] میڈیکل کالج کے [illegible] ہوسٹل میں چلے آئے جو پہلے بھی ان کے دکھوں کا شریک رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی ہمت افزائی کی، کیلشیم کا کوئی انجکشن دیا اور [illegible] ساتھ امتحان دینے کی تاکید کر دی۔ دوسرے روز [illegible] اختر صاحب نے کئی انجکشن لئے کیلشیم کی گولیاں کھاتے رہے مگر [illegible] کے باوجود بھی خون کے دھبے منہ سے آتے ہی رہے۔ دوسرے روز اسی حالت میں وہ امتحان دینے چلے گئے ان کے مرجھائے ہوئے زرد چہرے پر [illegible] اب بھی موجود تھی اگزامینیشن روم میں اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے وہ امتحان کا پیپر لکھتے رہے لیکن خون کا ابال آتا رہا اور وہ بڑی خاموشی کے ساتھ ان کو اپنے رومالوں میں [illegible] جیب میں ڈالتے چلے گئے ہال سے باہر برآمدے میں شکیل بھیا [illegible] لئے بیٹھے تھے اور وہ تھوڑی دیر کے بعد [illegible] جاتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ امتحان کے کمرے میں رومالوں کی گٹھڑی بھری ہوئی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور جیسے تیسے آخر [illegible] خون آنے کا وحشت ناک انداز پر امتحان کے بعد [illegible] اسی حالت میں ۲۲ میل [illegible] پہنچ گئے [illegible] آ گیا۔ گھر اور باہر کے سارے لوگوں کی ہمدرد نگاہیں ان سے زیادہ مجھ پر تھیں۔ اور دل کے سامنے علاقہ بھر میں ایک افسردگی سی چھا کر رہ گئی تھی اور [illegible] ہمدردی کے الفاظ میرے لئے سوہان روح بن کر رہ گئے تھے [illegible] رحمت کی صورت [illegible] کسی طرح سے خون آنا بند نہ ہوا تو پھر [illegible] ان کو پٹنہ واپس لایا گیا۔ میں بھی ساتھ تھی۔ پٹنہ کے ڈاکٹروں نے ڈھیروں ڈھیر دواؤں کی فہرست لکھی افسردہ چہروں کے ساتھ تسکین دیتے رہے۔ مگر اختر صاحب پر ایک وحشت سوار تھی وہ پٹنہ سے گھبرا کر پھر آرہ پہنچ گئے تھے۔ اب تک شکیل بھیا نے بڑی رفاقت کی تھی پر گھر ان کے والدین کا تھا اور یہاں ایک ڈاکٹر کے مکان کی وجہ سے علاج کی سہولت نظر آتی تھی۔ سارا دن انجکشن دیتے ہی گزرتا۔ مگر دوائیں جیسے بے اثر ہو چکی تھیں۔ اختر صاحب کو بات تک کرنے کی سخت ممانعت تھی چپ لیٹے ہوئے وہ بڑی حسرت سے صرف مجھی کو تکتے رہتے تھے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا لیکن کسی طرح سے ان کو بہلاتی اور تسکین دینے کی کوشش کرتی اور گھر کی بھولی باتوں کو چھیڑ چھیڑ کر کسی طور سے وقت کاٹنا چاہتی تھی۔ میری شادی کو پورا ایک سال ہو رہا تھا اور اپنی ناتجربہ کاری کے ساتھ میں نہیں جانتی تھی کہ اب میں کیا کروں! میرے جہیز کا بستر بچھا ہوا تھا اور ان کے مرجھائے ہوئے زرد اور نحیف چہرے کے نیچے میرا پھول بنا ہوا تکیہ کا غلاف [illegible] تھا جس کو میں نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ کبھی کبھی ان کا دبلا کمزور اور پیلا سا ہاتھ آہستہ سے اٹھتا اور وہ میرے شانے کو بڑے پیار سے تھپتھپانے لگتے۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے میں نہیں جانتی لیکن خاموش زبان کا اتنا پیارا اشارہ دل میں نشتر لگاتا آنکھیں ابلنے کو بے اختیار ہو جاتیں لیکن میں بڑی مشکلوں سے ان امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی جاتی اور کسی پاگل کی طرح ان کو آئندہ کے خواب سنانے لگتی: ہمارا اپنا ایک اچھا سا گھر رہے گا۔ جہاں ہم پھل پھول کھلائیں گے۔ ہمارا گھر کیسا اچھا سجا ہوا رہے گا۔ ہماری میزوں پر افسانے

اور نظر دیکھا ایک ڈھیر لگا رہے گا۔ میری ان باتوں کو سن کر ان کے لبوں پر ایک تھرتھراہٹ سی آجاتی اور نڈھال آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بہ کے مانہ [illegible] پر ڈھلک [illegible] اور میں ایک بے بسی کے عالم میں حیران رہ جاتی کہ آخر میں کیسے بھران کو بہلاؤں؟ — خالہ اماں بے حد پریشان تھیں اور خالو باوجود میرے اپنے [illegible] ایک [illegible] کی حیثیت سے زیادہ بے چین تھے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم مت گھبراؤ، بس ابھی خون رک جائے گا۔ ابھی سب سے [illegible] کو بلا [illegible] گیا ہے۔"

مگر [illegible] رات کے گیارہ [illegible] اور [illegible] بارش ہونے لگی تو ہیں اور [illegible] بھیا قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے [illegible] گھبرا اٹھے کہ ان کے منہ اور ناک سے [illegible] اور [illegible] خون سے [illegible] بھی بھول بنے ہوئے خلاف [illegible] اور سارا بستر خون سے تربتر ہو رہا تھا اور پاس پڑے بھی خون تھا کہ چلا ہی [illegible] صاحب کی نبض پکڑ کر [illegible] حیران [illegible] سے بس [illegible] ہی اور اختر صاحب ایک [illegible] بت بنے خاموش سامنے کی دیوار کو دیکھتے [illegible] ہو جائے [illegible] اس [illegible] ایک [illegible] انجکشن اور دئے گئے۔ وہ اور ان کو [illegible] چلا یا جاتا [illegible] کے ٹکڑے [illegible] رخصت [illegible] اپنے [illegible] ساتھ میرا ہاتھ تھام رکھا تھا جیسے موت کے منہ [illegible] ڈوبتے [illegible] کے سہارا [illegible] زندگی [illegible] پالیں گے۔ میری زبان پر سکتہ تھا، لیکن میری روح خدا کے آگے ایک عزیز ترین ہستی کی [illegible] بار بار امام ہمام حضرت [illegible] حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی خدمت میں قادیان تار پہ تار دئے جاتے [illegible] کی [illegible] دو [illegible] کا خاص فضل ہو تھا کہ وہ اندھیری رات سچ مچ میں آخر کٹ ہی گئی۔ اور ان کو کسی طرح سے تیزہ لاکر [illegible] داخل کیا گیا۔ اختر صاحب [illegible] اور کسی [illegible] بے حد بڑھ چکی تھی۔ انگریز جلنے اور بات [illegible] کرنے سے سختی کے ساتھ [illegible] ڈاکٹروں نے میڈیکل کالج میں [illegible] ایک اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کافی توجہ دے کر پڑھایا تھا وہ سب کے سب بڑی محبت سے دیکھنے اور علاج کے لئے [illegible] میڈیکل کالج ہوسٹل کے ایک ہر دلعزیز ڈاکٹر [illegible] نے ان کے بگ برش کئے ہوئے بالوں کو اپنے سامنے حجام سے کافی چھوٹا [illegible] تبدیل کرائے واپس جانے جاتے مڑ کے پھر پیچھے اور قریب آکر ہنستے ہوئے بولے "بالوں کی زیادہ فکر مت کرو کہ یہ پھر بڑھ [illegible] جلد [illegible] تم کو پروفیسر بنا [illegible] ایک مردہ سی ہنسی ان کے لبوں پر آئی جیسے ان کا دل کہہ رہا تھا "پروفیسر! پروفیسر کون [illegible] بڑے بڑے ڈاکٹروں کی بھی کوشش تھی کہ جہاں تک جلد ہو سکے رانچی کے پاس اٹکی سینی ٹوریم میں ان کو داخل کر دیا جائے۔ مگر وہاں سے [illegible] کا جواب [illegible] ابھی سیٹ خالی نہیں ہے اور ادھر زیادہ خون آجانے کی وجہ سے اختر صاحب کمزور بھی بہت ہو گئے تھے وہاں تک جانا ذرا مشکل ہی نظر آ رہا تھا ایک [illegible] آخر اس صورت میں آگئی [illegible] کی اجازت مل سکی تھی کہ اپنا ایک بڈا اور مریض کے استعمال کی ساری چیزیں خرید [illegible] اور اتنی ساری چیزیں [illegible] بھیجنے پر بھی [illegible] ایک پلنگ بچھنے کی جگہ مل سکی تھی۔ میں یہاں بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ میرے ہی سامنے ایمبولینس پر [illegible] ان کو [illegible] وارڈ میں لایا جا رہا تھا تو سینی ٹوریم کے [illegible] سپرنٹنڈنٹ نے اتنے کمزور مریض کو لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے پیلے [illegible] ہوئے گالوں والے چہرے پہ [illegible] کی ایک لہر دوڑی "یہ ہمارا اپنا ہے اور آپ یہاں رہنے کی ہمیں اجازت دے چکے ہیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچے سے اب بھی [illegible] بلند آواز نکل سکتی تھی [illegible] نے کہ ان کے [illegible] یہ پہلا مرتبہ تھا۔ یہاں آتے ہی ان کے چہرے سے پژمردگی دور ہو گئی تھی۔ اس دنیا کے سارے ہی لوگ ایک دوسرے [illegible] ہمدرد اور [illegible] ہی ہیں۔ ان کا بلغم پوزیٹو ہو چکا تھا اور یہی خبر ان کے لئے بڑی اذیت رساں تھی۔ اب تک وہ [illegible] رہے تھے کہ کسی [illegible] کے پھٹ جانے [illegible] آگیا۔ آکر ایک ہی ہفتہ میں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ نحیف آنکھوں سے [illegible] اور [illegible] کے چھیڑ چھاڑ میں رہے [illegible] پر وہ بھی دلچسپیاں لینے لگے تھے۔ ایک دن جب [illegible] میں [illegible] ہوئی ریل جب [illegible] اتنی دور اسٹیشن سے پیدل چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی تو شاید وہ پہلے سے کسی بات پہ ہنس رہے تھے اور اسی طرح سے ہنستے ہوئے انہوں نے ایک [illegible] کو پکڑے ہوئے مجھ سے ملایا دیکھو بھئی یہ [illegible] ہے یہ ننھی سی پھدکتی ہوئی ڈولی اور یہ ہماری

کھٹو ہوا ہی ہے اور میں بڑے خلوص کے ساتھ ان سب کو کلثیم گرلز اور طاقت کا انگلش سمجھ کر دن سے مل مل کر خوش ہوتی رہتی ۔ ایک ہی مہینہ کے بعد اٹھی جا کر
ان کا علم نیگیٹو ہو گیا تھا صحت کے ساتھ ان کی فن کارانہ صلاحیت بھی ابھرتی جا رہی تھی ۔ جب بھی سینی ٹوریم میں کوئی فنکشن ہوتا سب سے آگے یہی رہتے۔
میڈیکل سپرنٹنڈنٹ منصور صاحب کچھ اس طرح سے متاثر ہو چکے تھے کہ ہر بات ان کے مشورے سے ہوتی ۔ ڈرامہ کے لئے اسٹیج بنانے سے لے کر ڈرامہ لکھنے اور
اس کے ایک ایک کردار سے کامیاب طور پر ایکٹنگ کرانے کی کوشش انہی کی رہین منت ہوتی ۔ سینی ٹوریم کے انتظامی امور میں بھی وہ کافی حصہ لینے لگے تھے ۔ یہاں
تک تعاون کا سوال ہوتا تھا ٹھیک تھا مگر جہاں مریضوں کی عام سہولت کے سلسلہ میں ان کے بنائے ہوئے نقشے میں گڑ بڑ ہوتی پھر وہ ساری باتیں تفصیل کے
ساتھ رانچی سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار "سنٹنل" میں گمنام طور پر چھپ کر مشتہر ہو جاتیں ۔ چھوٹا ناگپور میں اس اخبار کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی جہاں بھی
اس قسم کی باتیں چھپ جاتیں منصور صاحب کی بدحواسیوں کا عجیب عالم ہوتا، وہ اخبار لئے سیدھے ان کے پاس چلے آتے ۔ صاف طور پر جانتے تھے کہ یہ گمنام شخصیت
کس کی ہے مگر جس انسان کے رعب سے سارا سینی ٹوریم کانپتا تھا، اختر صاحب کے وقار کے آگے اس کی بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی ۔ بار بار ان کے
شانے پر ہاتھ رکھ کر وہ یہی کہتے جاتے "تم پتہ چلاؤ گے کہ ہماری یہ اتنی گہری باتوں کو باہر چھپوانے والا کون رہا ہے؟" اختر صاحب کے چہرے کی رونق یکدم سے بڑھ
جاتی اور پھر انتہا... ایک دو مراسلات کے بعد ان کے سارے مطالبات پورے ہو جاتے ۔ اختر صاحب جس وارڈ میں تھے ان دنوں اس وارڈ کو ڈیتھ وارڈ
کہا جاتا تھا اس میں ۲۴ مریضوں کے بیڈ تھے ۔ ٹی ۔ بی کے مریض بخار اور کھانسی میں بے دم پڑے رہتے تھے ۔ زندگی ان کے سامنے سسک رہی تھی اور موت
کے پنجے جن کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور جو حریصانہ طور پر ایک ایک ڈش کچے ٹماٹروں کا بڑی تیزی سے نگل جاتے تھے تا کہ جلد سے جلد ان کے
جسم میں سارا وٹامن پہنچ کر سرایت کرتی ہوئی موت کا مقابلہ کر سکے ۔ اسی وارڈ میں اب قہقہے گونجنے لگے تھے اور موت کی تاریک راتیں ان کی ہنسی کی پھلجھڑیوں
سے چراغاں بھی ہونے لگی تھیں ۔ چند ہی مہینوں کے بعد اختر صاحب کے بی ۔ اے کا نتیجہ نکل گیا تھا ۔ وہ اپنے کالج سے انگلش آنرز میں فرسٹ آئے تھے اور یونیورسٹی
میں ان کا نمبر تیسرا تھا ۔ کنووکیشن ہوا مگر اختر صاحب بڑی خاموشی سے سینی ٹوریم کے بیڈ پر اپنے ریسٹ کا پیریڈ گزار رہے تھے ۔ یونیورسٹی کی طرف سے ان کو سونے
کا میڈل اور ڈھائی سو کی انگلش کتابیں انعام میں ملی تھیں ۔ مگر اب وہ ساری کیفیت سے بے نیاز ہو کر سینی ٹوریم پر اس طرح سے چھا گئے تھے جیسے کوئی فنکاری
کرتے کرتے وہ علاقے کی پوری تہذیب پر ہم تن رہ گئے تھے ۔ انہوں نے یہاں بھی کئی افسانے لکھے "سینی ٹوریم کا فقیر" اسی جگہ کا لکھا ہوا بہت پسند کیا گیا تھا ۔ پورے طور
پر چند ہی مہینوں میں وہ صحت یاب ہو گئے تھے بائیں پھیپھڑے میں اے ۔ پی پڑ رہا تھا اور چہرے کے سفید جلد کے اندر سے خون کی سرخی جھلکنے لگی تھی، وہ ایک
میل سے زیادہ ٹہلنے لگے تھے ۔ آگر ادس ... منڈا اور جنگلوں کی ٹولی میں بیٹھے ہوئے وہ گھنٹوں اسلام کی خوبیوں کو بڑے پیار سے سمجھاتے رہتے ۔ یہیں ان سے
دو میل دور ایک کسان کے یہاں رہتی تھی وہاں سے پیدل چل کر ان سے ملنے کو آتی تو کبھی وہ کسی کی مزاج پرسی میں گئے ہوتے یا نہ منزلوار ... کسی تقریب کی
تیاریوں میں لگے ... اندر سبھا ان کو یہاں بھی مل گیا تھا اور راجہ اندر ہر جگہ راجہ ہی رہتا ہے ۔ اسی سینی ٹوریم میں جب وہ بھلے چنگے تھے اور منظور صاحب نے
گرمی گزار کر ان کو واپس جانے کو کہہ دیا تھا اس وقت اچانک ان کے منہ سے کچھ خون آ گیا تھا ... نا پاتے ہی ... دل سے سیدھی ان کے پاس پہنچی اب
آئسولیشن روم میں وہ اکیلے پلنگ پر خاموش پڑے تھے ۔ دونوں ہاتھوں پر سختی سے داب کر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں ۔ ان کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی دل کا سارا
غم آنسوؤں میں بہہ نکلا ۔ اسی پرانے طریقے پر پھر انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا ۔ ان کے چہرے پر بے حد گھبراہٹ تھی ... خاص طور پر ... اپنے دل سے
کہہ رہی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے وہ مجھ سے بڑے پیار سے بولی ۔ اب تو بھیا اچھا ہے بھابھی ۔ سچ سچ اس نے تو مجھے ڈرا ہی
دیا تھا ۔ ہائے بھابھی! انجھری تو تیرے لئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ۔ مگر وہ جو منی ہے نا ۔ کھٹو ہوا وہ ذرا اچھا نکلنے تک نہ آئی یہاں ... بڑا کمال دیکھ چلی
تھی بھیا کر ... ہونہہ! آگ کے پھول! کتنا کہیں کی ... اختر صاحب نے اس سے پہلے جس ہمت سے اپنی بیماریوں کا مقابلہ کیا تھا اب ان کی طرف دیکھتے
ہوئے یہ لگتا تھا جیسے وہ اپنی ہار مان چکے ہیں ۔ سرہانے خاموش رہنے کا بورڈ لگا تھا اور وہ بے حس و حرکت ایک طرح سے لیٹے ہوئے سامنے سینی ٹوریم کے اس
آفس کو دیکھتے رہتے جہاں اپنی بلند آواز میں وہ کئی تقریریں کر چکے تھے، یہاں دھرے ہوئے فائلوں میں ان کے کئی اصلاحی نقشے موجود تھے اور جس جگہ پر منظور صاحب

جیسے سخت گیر ڈاکٹر کے چہیتے بن کر بھی انتظامی اُمور میں جھگڑا کر کے وہ اپنی بات منواتے رہے تھے۔ ایک دن ان کے منہ سے کچھ زیادہ خون آگیا تھا، یکایک وہ اپنی ترشی ہوئی بہت ہی نازک اور خوبصورت انگلیوں کو دیکھتے دیکھتے بے تابانہ طور پر انھیں چومنے لگے، وہ آہستہ آہستہ سسک رہے تھے اور ایک مصور، ایک شاعر اور ایک ادیب کی وہ فنکارانہ انگلیاں ان کے خشک اور کانپتے ہوئے لبوں پر دھری تھیں۔ ان کے مردانہ ہاتھوں میں اتنی حسین انگلیوں کو دیکھ کر ہمیشہ سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلطی سے اس ہاتھ پر لگ گئی ہیں اور اب یہی شمع کی کانپتی ہوئی لو شاید بجھنے لگی تھی۔ ڈولی بڑے خلوص سے ان کی خدمت کر رہی تھی۔ جب یہ کچھ اچھے ہونے لگے تب وہ ایک دن مجھ کو سمجھاتی ہوئی کہنے لگی "بھابی بھیا کو سمجھا دے کہ وہ اتنے زور زور سے گرج گرج کر کسی کو ڈانٹا نہ کرے۔ سچ کہتی ہوں بھابی! میں نے اپنی زندگی میں اتنی گرجتی ہوئی ڈانٹ کبھی بڑے صاحب کی بھی نہ سنی تھی — ہاں سمجھی! بس چلانے سے منع کرتی رہنا" اختر صاحب جب اچھے ہو گئے تب یہ راز کھلا کہ ڈولی نے کسی وارڈ سرونٹ کو کچھ زیادتی سے ڈانٹ دیا تھا جس سے اختر صاحب کو غصہ آگیا اور وہ انسانیت کی اس تضحیک کو برداشت نہ کر سکے۔ پہلے تو انھوں نے ڈولی کو سمجھایا کہ وہ اس نوکر سے معافی مانگ لے مگر ڈولی نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ "ایسے ایسے نوکر اس کی جوتی کی نوک پر دھرے رہتے ہیں۔" اتنی بات سن کر اختر صاحب اپنی بلند آواز میں ڈولی پر جو گرجنے لگے تو پھر سارا وارڈ اکٹھا ہو کر رہ گیا۔ اور اسی بات کو سوچتے سوچتے ہیں ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا — ڈولی اپنے کوارٹر جا کر خوب روتی رہی تھی مگر جیسے ہی اس کو ان کی بیماری کی خبر ملی تو رات ہی کو ننگے پیر دوڑتی ہوئی بدحواس چلی آئی۔

سوا سال اسی میں رہ کر اختر صاحب واپس چلے آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بڑی اچھی سرٹیفکیٹ دے کر ان کو خاندان اور سوسائٹی کے لئے بے ضرر کہہ دیا تھا۔ ان کا وزن کافی بڑھ گیا تھا اور زندگی بھر بہترین کھانے اور آرام کرنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ وہ [illegible] ہی چلے آئے تھے۔ زندہ دلی اور شوخی مزاج کے ساتھ [illegible] میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور ان کو دیکھ کر کسے بھی یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ کبھی ان کو دق سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ ان کی [illegible] میں وہی [illegible] خلوص اور [illegible] سا [illegible] مگر اس کے ساتھ ہی ایک چڑچڑاہٹ اور بیزاری کی جھلک بھی صاف نظر آنے لگی تھی [illegible] اور باغی ہو جاتے اور [illegible] جیسے اپنے راستے میں [illegible] چھوٹی سی [illegible] کو کبھی [illegible] دیکھنا ان کو گوارا نہ تھا [illegible] تھا [illegible] فسٹ کلاس [illegible] اور [illegible] اپنی زندگی کو [illegible] رہتے تھے مگر اب ان کو زندگی گزارنے کا راستہ تلاش [illegible] سے بے حد محبت تھی اور انھوں نے [illegible] انسانی زندگی کی قیمت بہت [illegible] اور [illegible] شروع ہی سے [illegible] ایمان رکھتے تھے۔ شادی کے فوراً ہی بعد میں نے [illegible] کہ میری [illegible] اچھے [illegible] واپس پہنچے تو [illegible] سے ان کی [illegible] کپڑے کے بیسیوں [illegible] کپڑے [illegible] نشان [illegible] دیکھتے ہوئے بڑے سکون سے پوچھنے [illegible] کرتے؟ وہ فوراً [illegible] ہسپتال [illegible] میرے پاس آیا [illegible]

اختر صاحب [illegible] ان پر [illegible] کا بڑا ہی سخت حملہ ہو گیا جوڑ جوڑ میں درد کے ساتھ سارا جسم سوج گیا تھا [illegible] کے ساتھ تیز بخار [illegible] ان کو [illegible] ہوسپٹل کے وارڈ میں داخل کئے گئے۔ بنرجی صاحب نے دیکھا [illegible] مہینے [illegible] سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ اس وقت جب ہم ان سے

ملنے کے لئے جاتے تھے تو ان کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ بھرا رہتا تھا اور کئی کئی دنوں تک وہ ہم لوگوں میں سے کسی سے بھی بات نہیں کیا کرتے تھے۔ مگر ایسا دَورہ بھی چند ہی دنوں تک رہتا تھا، دراصل ان کو اسلام سے بے حد محبت تھی اور خدا سے ناز کرنے کے بعد وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ لیٹے ہی لیٹے اشاروں میں بھی وہ ہمیشہ نماز پڑھتے رہے تھے۔ مگر ان دنوں وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ ان کا حشر کیا ہوگا اور ان کا مستقبل آخر کیسا بن کر رہے گا؟ یہ ایک ایسا دھندلکا تھا جس کے پار ان کی نگاہیں پہنچ ہی نہ سکتی تھیں۔ ڈاکٹر گھوشال نے اسپرین کی گولیاں کھلا کھلا کر ان کے درد کو دور کر دیا تھا اور اس وقت بھی جب کہ ان کے سارے جسم کے جوڑوں پر گل عنبر یا کی تیز بُو کے ساتھ سفید پٹیاں بندھی تھیں ڈاکٹر گھوشال بڑے پیار بھرے خلوص میں کہتے "اختر تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ ہم تم کو پروفیسر بنا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں" اور ڈاکٹر گھوشال کی باتیں خدائے تعالیٰ نے آخر پوری ہی کر دیں۔ ۱۹۳۸ء کے دسمبر میں بڑے ڈرامائی انداز میں اختر صاحب کو پٹنہ کالج میں اردو کی لکچراری مل گئی تھی۔ پبلک سروس کمیشن نے ان کا نام دوسرا بھیجا تھا ان کے دوستوں کی ساری کمپنی یہ دیکھ کر بے چین ہو گئی کہ پہلے سے ایک کالج میں کام کرتے ہوئے لکچرار کو کمیشن نے یونیورسٹی کے چند ہی اونچے نمبروں کے معیار سے سیدھے سادے طور پر فسٹ کر دیا تھا اور ذہنی بلندی، اعلیٰ صلاحیت، پرسنلٹی اور بے روزگاری پر اس کی نگاہیں نہیں گئی تھیں۔ تعلیم کے منسٹر ان دنوں ڈاکٹر سید محمود صاحب تھے اختر صاحب کے دوست علی اطہر صاحب کی پہنچ وہاں تک بھی تھی اور آخر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو انھوں نے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ پٹنہ کالج میں کھلے طور پر اردو کے کلاس میں تینوں فسٹ سکنڈ تھرڈ آئے ہوئے امیدواروں سے لکچر دلوایا جائے اور تب وزیر تعلیم خود سے یہ فیصلہ کریں کہ اس جگہ کا اصل حق دار کون ہو سکتا ہے! یونیورسٹی اور کالج میں یہ اک نیا تماشہ تھا، وزیر تعلیم کے ساتھ دو پارلیمنٹری سکریٹری، پرنسپل اور بہت سے پروفیسر بھی سیکڑوں لڑکوں کے ساتھ اردو کے کلاس میں پہنچ چکے تھے۔ اختر صاحب کے ہم چشموں نے یہ خبر مشہور کر رکھی تھی کہ پروفیسر نجم الدین صاحب نے اختر کو پہلے سے سوالات بتا دئے ہیں اور پروفیسر صاحب وہی مضمون ڈاکٹر صاحب کو اختر سے پوچھنے کو کہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے مقابلہ کے دو امیدواروں نے عین مقابلہ کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب سے جا کر یہ شکایت کر دی، ڈاکٹر صاحب کو بات بہت بُری لگی اور انھوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ امتحان لینے میں آیا ہوں نہ کہ پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب۔ اس کے بعد وزیر تعلیم نے پہلے امیدوار کے سامنے اسی وقت ایک مضمون پیش کیا اور اس پر کلاس کے سامنے تقریر کرنے کو کہا، جب وہ تقریر کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل سے چند اشعار دئے کہ اس کی تشریح کریں، جب وہ تشریح بھی کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب آپ بال جبریل میں سے جو اشعار چاہیں اختر صاحب کو تشریح کے لئے دے دیں۔ پہلے صاحب نے کتاب لے کر بڑے غور سے ورق گردانی شروع کر دی کہ کوئی سا شعر ایسا منتخب کریں جو اختر صاحب کے بس کا نہ ہو، جب کئی منٹ صرف ہو گئے تو بے چینی ڈاکٹر صاحب کو بُری لگی اور انھوں نے جلدی کرنے کی تاکید کی آخر انھوں نے اشعار منتخب کر کے دئے، اب اختر صاحب کی باری تھی اختر صاحب نے ان شعروں کی تشریح کر دی، پھر ڈاکٹر صاحب نے غالب اور ذوق کے متعلق خود ہی اختر صاحب سے سوالات کئے اور اسی موضوع پر ان کو لکچر دینے کو بھی کہا، جب وہ لکچر دے چکے تو انہی سے تیسرے صاحب کے لئے بال جبریل سے اشعار منتخب کرائے اتفاق سے وہ اشعار مسجد قرطبہ کے تھے جس کو تیسرے صاحب غلط طور پر پڑھ رہے تھے۔ کلاس کے لڑکوں نے اب ہوٹ کرنا شروع کر دیا تھا، اور ہمارے طفیل احمد خاں سلطانپوری اور مظفر نقوی نے چن چن کر سوالات کرنے بھی شروع کر دئے تھے۔

تینوں امیدواروں کی تقریریں اپنے اپنے نمبر حاصل کر چکی تھیں وہ کانگریس کی پہلی منسٹری کا دور تھا اختر صاحب کے سوا دونوں امیدوار کانگریسی تھے محمود صاحب ابھی پٹنہ کالج کے احاطہ ہی میں تھے کہ کالج کے لڑکوں نے اپنی کامیابی میں ایک بڑا ہی پُرجوش نعرہ لگایا اور مسلم لیگ زندہ باد کی گونج سن کر محمود صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا یہ نعرہ کیسا تھا؟ علی اطہر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ "لڑکے اختر زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے ڈرائیور کو موٹر تیز چلانے کا اشارہ کر دیا۔ اختر صاحب کے دوستوں میں علی اطہر صاحب، شرف الدین احمد شرف عظیم آبادی، تمنائی، یحییٰ نقوی اور رضا نقوی نے اختر صاحب کو ایک دولہا کی طرح سجا کر پہلے پہل لکچرار کی صورت میں پٹنہ کالج بھیجنا چاہا، بکس کو کھولا گیا اس کے اندر کوئی سوٹ یا شیروانی نہیں تھی بس یہی ایک پرانا سا کیمن کا اوورکوٹ تھا جس کو جھاڑ جھوڑ کر دوستوں نے ایک ساتھ مل کر پہنایا۔ اب جوتے کا سوال رہ گیا تھا مگر جوتے ایسے تھے کہ مرمل گئے

کی طرح ہانپتے نظر آرہے تھے ہماری بھرکم ساڑھ وسی کٹ کا وہ اوور کوٹ تو خیر کسی طرح سے لٹتے اور بچتے قدیہ خاصا رعب دار دکھ رہا تھا مگر پاؤں میں صاف طور پہ نظر آتے ہوئے پہ ٹمزسبو...تے سے جوتوں کا کیا بنتا۔ ؟ سب نے اپنے اپنے پیروں پہ نظر ڈالی، مگر تو بہ کیجئے وہاں تو ایک گز لمبے جوتوں کی ضرورت تھی۔ جیسے تیسے انہی جوتوں پہ پالش رگڑوا گیا اور پورے سات میل دور سے ایک ٹم ٹم پہ بیٹھ کر ساری برات کالج کے نئے دلہا کے ساتھ کورلج پہنچ گئی۔ وہ دن اختر صاحب کی کورلج کی زندگی کا پہلا دن تھا۔ پٹنہ کورلج کے اسم اعظ سے میں میڈیکل کالج کے بعد ان کو بڑا دبتی تھی، اسی جگہ مسلم ہوسٹل کی اونچی کھڑکیوں سے سپرنٹنڈنٹ اور بعض پروفیسروں کے نام فاتحہ کی ہانڈیاں پھوڑی جاتی رہی تھیں۔ انہی سبزہ زاروں پہ سے سہمے سہمے قدموں سے چل کر انھوں نے اپنی خطرناک بیماری کی حالت میں بی۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ ان کو اس احاطے کے کونے کونے سے بے پناہ محبت تھی۔ اختر صاحب کے دوستوں کی مختلف پارٹیاں ہیں جو بھی ان سے ذرا خلوص سے ملا وہ ان کی زندگی سے کبھی دور نہ ہو سکا، کالج کا شاف اگر ان کے دوستوں میں شریک ہیں تو کالج کے لڑکے ان کے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز! اور اختر صاحب کو اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آج دو ستر ہ سالوں سے صرف اپنے کلاس ہی کے نہیں بلکہ اکثر دوسرے کالجوں کے لڑکوں کے لئے بھی تابندہ مستقبل کی تعمیر کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق اپنے شاگردوں سے جہاں اپنے عزیزوں کی طرح ہے وہاں ایک باوقار اور پرخلوص دوست کی طرح بھی۔ بہار کے پرانے شاعر اور ادیبوں کے لئے اختر صاحب کی نگاہوں میں بڑی عزت بڑا احترام ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نئی پود میں ادب اور شاعری کی ذرا سی بھی صلاحیت دیکھ کر اپنی خوشیوں کا اظہار کرتے ہوئے اس کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہے ہیں۔ مگر اتنے وسیع اخلاق کے باوجود بھی اختر صاحب کے مخصوص دوستوں کا ایک بے تکلف گروپ بھی تھا جو اب پاکستان چلے جانے سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ دوستوں نے ان کے ساتھ جہاں محبت اور روا داری کا بہت سا ثبوت دیا ہے وہاں اختر صاحب کو بھی اپنے دوستوں سے بے حد محبت رہی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کی ضرورت کو ہمیشہ اپنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے ایک دوست کو اپنے والد کے مقدمے کی فیس جمع کرنے کو روپے کی ضرورت تھی اختر صاحب نے جب اپنی جیب خالی دیکھی تو پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں ملی ہوئی سونے کی میڈلوں کے ساتھ اپنے اور بھی جیتے ہوئے سونے اور چاندی کے میڈلوں اور کپوں کو اونے پونے بیچ کر روپے اپنے دوست کے حوالے کر دئے اور جب اس فرض کو ادا کر کے وہ مجھ کو یہ خوشخبری سنانے آئے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یادگار چیزیں جو گھر میں رہنے کی بجائے دوکانوں پہ بک چکی تھیں۔ اور اسی ڈر سے میں نے انگریزی اور اردو کی ان ساری کتابوں کو جو انہیں انعام میں ملی تھیں اردو میں اپنے کمرے کی الماری میں بند کر کے مضبوط تالا لگا دیا تھا۔

ایک نو مناؤں کے بعد پیدا ہونے والی اولاد عموماً لاڈ پیار ہی پر کر رہ جاتی ہے اس پر بچپن میں ماں نہ تھا اور کالا زار جیسی لمبی بیماریوں نے ان کی طبیعت میں لاڈ، ضد اور حکومت پیدا کر دی تھی آرام طلب بنا دیا تھا وہ تو کچھ خاندانی ذہانت ہی تھی جو ہمیشہ کام آتی رہی۔ ان کا سارا بچپن بیماریوں میں کٹ گیا تھا اور دعائیں کرتی رہنے والی شفیق ماں کے اٹھے ہوئے ہاتھ اختر صاحب کے میٹرک پاس ہونے سے کچھ دنوں پہلے ہی خاموشی کے ساتھ قبر میں چھپ گئے تھے۔ نوجوانی کے عالم میں تمام دنوں کی رنگینیوں سے بھی پہلے منہ سے خون کے تھکے آنے لگے تھے اور جب سینی ٹوریم سے اچھے ہو کر واپس آئے تو یو میٹزم کے ہمت شکنے کے ساتھ دل پہ بھی ہلکا سا اثر پڑ گیا تھا۔ بڑا پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے وہ اپنی ملازمت کو نبھاتے آ رہے ہیں عمدہ غذا، ہوا دار مکان اور آرام ان کی زندگی کا ایک ضروری جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ کورلج کے فرائض کے ساتھ دنیا بھر کے کاموں کا ایک جھنجھٹ ان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جلسوں میں گھنٹوں تقریریں کرتے رہنے کا تو اب جیسے پیشہ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اور اختر صاحب کے ساتھ سارے لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت امام جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی مخلصانہ دعائوں کی قبولیت سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ان کو باعزت طرح پہ زندہ رکھ کر انسانیت اور قوم کی خدمت کا موقعہ عطا کیا ہے۔ سنہ ۴۲ء کے ہنگاموں سے لیکر جنگ اور فتنہ و فساد تک کی ہولناکیوں میں روز زمانہ کی زندگی کتنی دشوار گذار بن کر رہ گئی تھی اختر صاحب آج تک ان سے لاعلم رہے ہیں آنے والے مہمانوں اور عزیزوں کی کثرت سے مجبور ہو کر میں کسی وقت ان سے پتر کوئلے یا چینی کی پرمٹ کے لئے درخواست لکھانے جاتی تو وہ صاف طور پہ میٹھی چیزوں اور بچے ہوئے کھانا کھانے سے ہی انکار کرتے ہوئے اعلانیہ طور پہ کہہ دیتے کہ وہ ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں۔ یا تو وہ کوئلا لکڑی اور چینی کی فکر کریں گے یا پھر پروفیسری۔ اور میں قلم اور سادہ کاغذ لئے بھناتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آتی۔ اختر صاحب کا گھر ان کی نوکری شروع ہونے

کے ساتھ ہی کبھی خالی نہ رہا تھا۔ ان کے اور میرے بھائیوں سے ہمیشہ ان کے مکان میں ایک رونق رہی تھی مگر وہ سب کے سب لڑکے اپنے لئے اپنے اپنے پیشے لیتے تھے جو اختر صاحب سے دُور رہیں۔ جب غصّے کی حالت میں قلم اور سادہ کاغذ لئے میں ان لڑکوں کے پاس پہنچتی تو وہ بھی بڑے خوش ہوتے اور شان سے کہتے "بار بار کہ ہم بھی ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں یا تو پرمٹ ہی لکھتے رہیں گے یا پھر کورٹ کی پڑھائی ہوگی" اور آخر جیسے تیسے لکھ لکھا کر میں نے ان کا لا ابالی پن نبھایا اور نوکروں کو ساتھ لئے کوئلے اور چینی کے ساتھ ضرورت کی اور بھی بہت سی چیزیں حاصل کرنے کو نکل جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اختر صاحب کے گھر سے ان سترہ برسوں میں کئی عزیز پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر نکلے ہیں، اپنوں کے ساتھ کئی غیروں نے بھی میٹرک۔ بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے اس گھر سے پاس کیا ہے۔ زمانے میں کیا کچھ نہ ہوتا رہا۔ اختر صاحب ابھی تک بے خبر ہیں کہ کون سی چیز نایاب ہوگئی تھی اور اب کن چیزوں کی فراوانی ہے مار کٹائی، شور اور ہنگاموں سے وہ بری طرح گھبراتے ہیں۔ اچھی... چیزوں کی بجائے... کے لحاظ سے کرتے ہیں ہر چیز سستی مل گئی بس زندگی گزارنے کے لئے وہی بہتر ہے۔ ایک دفعہ انگلی سے واپس آکر اپنی نوکری کے سلسلے میں علی گڑھ سے واپس آتے آرہ میں ٹھہرے اور وہاں میرے لئے خاص طور پر ایک تحفہ خریدا۔ ان دنوں میں امید سے تھی۔ آتے ہی بڑی محبت سے کہا "میں تمہارے لئے دو تحفے خرید کر لایا ہوں" اور جب ان تحفوں پر میری نظر پڑی تو جیا جل کر بس خاک ہی تو ہوگئی۔ موٹر کی ٹائر کا کالا سا سکڑا ہوا بہت ہی بدشکل ۷ ریتوڑہ والا چپل تھا اور کھدر کی بدصورت سی ایک ساری تھی۔ تب سے میں نے کہہ دیا کہ "کبھی میں تو یا نہ ہی آپ کے تحفے سے" مگر وہ پورے آٹھ دن بڑے مہر کے کا جھگڑا کرتے رہے تھے۔ اختر صاحب بہت بڑے ادیب، تنقید نگار اردو کے محسن، یونیورسٹی میں اردو کے چیئرمین اور ہر طرح سے آئیڈیل انسان ہوں تو ہوں ـــــ مگر وہ اہلی زندگی گزارنے سے ہمیشہ کوسوں دُور رہے ہیں! گھر کے اندر جہاں میرے ساتھ ان کو بھی صفائی کا خیال ہے وہاں وہ مجھ سے دیر دیر تک اس بات پر جھگڑتے رہیں گے کہ پلنگ کی چادر، تکیہ کا غلاف، میز پوش اور دروازے کے پردے فضول اور بیکار چیزیں ہیں اور یہی کپڑے غریبوں کے جسم پر ہونا چاہئے۔ لیکن جب میں اپنے روپے سے چادر وغیرہ منگا لوں گی تب بڑے اطمینان سے فرمائیں گے کہ تمہاری چادر کا ڈیزائن بڑا اچھا ہے اور اس کمرے کے فرش پر تھوڑا سا گندا ہوا دھبہ برا معلوم ہو رہا ہے۔ ان کے ملنے جلانے کا حلقہ بڑا عجیب ہے وہ بڑے سے بڑے منسٹروں اور راج کماروں کے مشاعروں کے منتظم کار بنتے ہوئے بھی اپنے آپ پر ان کا احسان لینا پسند نہیں کرتے انکو دعوتیں کرنے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ جب کبھی ان کو کسی کتاب یا امتحان کے پیپر دیکھنے کا پیسہ ملے گا وہ میرے پاس آئیں گے "مجھے اتنے لوگوں کی دعوت کرنی ہے" چیزیں سب گھر کی پکی اور عمدہ ہوں جوڑ کر بتاؤ کتنا خرچ آئے گا؟ اور تب میں مہمانوں کی تعداد اور کھانے کی قسمیں بتا کر کہتی کہ تیس یا چالیس روپے لگیں گے، تب وہ اکھڑ جاتے ہیں اور کہیں مہمانوں کو عمدہ قسم کا کھانا دس سے دس بارہ روپے میں کھلانے کی کوشش کریں گے۔ اُن سے زیادہ مجھ کو غصہ آجاتا ہے جہاں پانچ روپے سیر گھی ہو اور ایک ایک مرغیاں دو دو روپے میں آتی ہوں وہاں بیسیوں قسم کی عمدہ چیزیں پندرہ بیس روپے میں آپ کسی اور سے بنوا لیجئے" اور یہ بلا میرے سر سے ٹل جاتی ہے۔ اور کبھی ان کو بھی اپنے حساب سے فاضل خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ چیف منسٹر کو کھانے پر بلانے کا سوچ رہے تھے۔ کھانے کی فہرست تیار کر لی گئی کھلانے کے لئے کمرے تک کا انتخاب ہو چکا تھا کہ اچانک مجھ کو برتنوں کی یاد آئی وہ بڑے اطمینان سے بولے گھر میں جو بھی برتن ہیں اسی سے کام چلایا جائے گا میں نے صاف طور پر بے جوڑ برتنوں میں کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ لاکھ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ بیچارے لوگ تو پتّوں پر بھی کھانا کھایا کرتے ہیں۔ لیکن میں نہ مانی اور وہ بہت دیر تک پیچ و تاب کھاتے رہے ان کو رہ رہ کر اسی کا غم تھا کہ "اپنے" گھر میں وہ اپنی خوشی سے کچھ کر بھی نہیں سکتے ہیں" اور اسی "اپنے" کے لفظ پر میری اُن سے کافی لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اور ایسے ہی بے سر پیر کی لڑائیاں ہم اکثر لڑتے رہتے ہیں۔ اختر صاحب میں جو سب سے بڑا عیب ہے وہ یہی کہ معمولی سی معمولی بات کو بھی غصے میں اتنے زور سے بولا کریں گے کہ دُور سے دیکھنے والا بھی سمجھے گا کہ بڑی بھاری جنگ ہو رہی ہے اور وہ جہاں زور سے بولے بس میرے دماغ کا پارا اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو پھر میں بھی کوئی بات ہُرلی کر آہستہ سے بول ہی نہیں سکتے۔ پھر وہ جیسے خود انتہائی سادگی سے رہتے ہیں اُسی طرح سے اپنے معزز مہمانوں کو بھی رکھنا چاہتے ہیں اور ان کی یہی چیز مجھے کھولا دیتی ہے شام کی چائے ختم ہوتے ہی وہ میرے پاس آئے "کالج کے لڑکے موٹر لے کر آگئے ہیں میں اسٹیشن پر جگر مراد آبادی کو لینے جا رہا ہوں، لڑکوں نے کوشش کی تھی

کہ ان کو کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرائیں گے لیکن اتنا روپیہ جمع نہیں ہو سکا ہے اب میں جگن صاحب کو اپنے ہی پاس رکھ لوں گا" یہ سنتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ پہلے سے تیاری بیتے، گھر کی صفائی ہو جاتی، آخر وہ کیا کہیں گے کہ کیسے بدتمیز لوگ ہیں یہاں کے" اور وہ چڑھ کر بولتے، بڑے لوگوں کی نگاہیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں جاتیں کہاں گئے یہ! میں کوئی نواب کا ناتی نواسہ ہوں جو اپنی شان جماتا پھروں، بس ہم جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔" اور جب اختر صاحب کے مختلف گھروں میں مجاز، ساغر، حفیظ، سلام، حیادت بریلوی، سرور، احتشام، فراق، اپندر ناتھ اشک، عرش ملسیانی، عبدالقادر سروری، جعفر علی خاں اثر اور جگر مراد آبادی جیسے معزز مہمان آتے رہے تو اگرچہ ان دنوں میں پٹنہ میں رہتی تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ مہمانوں کے رہنے تک میں اس گھر سے کہیں دور چلی جاتی تاکہ اختر صاحب کے پھوہڑ پن کا الزام مجھ پہ عائد نہ ہو۔ بڑے سے بڑے محترم مہمانوں کو وہ بڑی فراخ دلی سے اپنے گھر میں ٹھہرا کر خوشی محسوس کرتے رہتے ہیں اور میں اتنے عرصے تک ان کی شایانِ شان خدمت نہ کر سکنے کے احساس اور غم سے تڑپتی رہتی ہوں۔ مہمان مجھ کو بے حد عزیز ہیں اور ہمارے یہاں کی مہمان نوازی بہار بھر میں مشہور ہے مگر یہ بات بھی تو ہے کہ اختر صاحب ٹاٹ کے اوپر بٹھانے پر تل جاتی ہیں زمین پر چٹائی بچھا کر مٹی کے برتنوں میں بھی اپنے مہمانوں کو کھلا کر خوشی محسوس کریں گے اور میں تو اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پہ بٹھانے کی قائل ہوں۔

گھر کے اندر جب ہم دو ادیبوں کی حیثیت سے گفتگو کرنے لگتے ہیں تو گھر میں آئے ہوئے عزیزوں کو ہمارا یہ کھیل بڑا اچھا لگتا ہے، ادب شاعری اور فلسفہ پر باتیں کرتے کرتے ہم مذہب اور قرآن شریف کی تفسیر کی بیز تک پہنچ جاتے ہیں، جب تک ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تب تک تو گفتگو میں اپنائیت قائم رہتی ہے مگر ایسا کچھ ہی دیر رہتا ہے پھر ہم الگ راستوں پہ مڑ کر بحثیں شروع کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم آٹھ آٹھ دنوں تک ایک دوسرے سے بول چال بند کر دیتے ہیں۔ اختر صاحب کا گھر کبھی مہمانوں سے خالی نہ رہا ان کے رشتہ داروں سے زیادہ میرے عزیزوں کو پٹنہ کی ضرورت رہتی ہے لیکن میرے عزیز بھی تو انہی کی چھایا دہن کے بچے ہیں۔ جب کبھی ان کو کہیں سے روپیہ ملتا ہے وہ تاش کے پتوں کی طرح پھینٹتے ہوئے روپے کو بانٹ دیتے ہیں اور روپے دینے کی عجیب عجیب صورتیں ہوا کرتی ہیں عذرا اگر دن بھر ہنستی رہیں گی تو ان کو دس روپیہ ملے گا، شمیم نے اگر آج ایک شعر کا بھی معنی بتا دیا تو وہ پندرہ روپے جیت لیں گی۔ اور شہلا کی دعا سے اگر ایک ہفتہ کے اندر بلیٹنر آگیا اور اُس نے انعام روپیہ دے دیا تو پچاس روپے شہلا کے ہوں گے۔ کسی کو افسانے کا فن سیکھنے پر انعام دیا جا رہا ہے تو کسی کو زیادہ شعر یاد رکھنے پر۔ لیکن ابھی تک مجھ کو یاد ہے کہ شادی سے پہلے پانچ روپے کا لالچ دے کر انہوں نے مجھ سے پورا شکوہ یاد کرایا تھا اور آج تک میرے وہ پانچ روپے باقی ہی رہ گئے ہیں۔ اختر صاحب سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہیں۔ جتنے نہیں ہیں قمیضوں کی سخت ضرورت ہے کوٹ میں سے پھوسڑے نکل آتے ہیں کبھی کبھی کالج جاتے وقت کپڑوں کی تنگی کا رونا رویا جا رہا ہے مگر پیسے جب بھی آئے فاضل ہی سمجھے گئے۔ اختر صاحب کے گھر میں ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے مگر جو ایک نسل پہلے پڑھ کر نکل چکی ہے اب اُن کی نسل پڑھنے آگئی ہے اور اس طرح سے خدا نے ایک ہی ساتھ چھپر پھاڑ کر آٹھ آٹھ بچے دے دیئے ہیں۔ میں اور بھی اختر صاحب کے بھائی فضل احمد آئی۔ پی۔ ایس اور میری اپنی تیسری بہن صوفیہ شہناز کے بچے ہیں اور جو چار سالوں کی عمر سے میرے پاس رہ کر کونونٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ میری منجھلی بہن رضیہ رعنا کا بچہ ممی سینیٹ نرسری میں ہے چوتھی بہن عذرا کی بچی سیمیں اور میرے بھائی لکچرر عزیز احمد کی بچی نسرین کونونٹ کے بچہ کلاس میں ہیں۔ اور لقمی ممی کی بہن شیرین اور میری سب سے چھوٹی بہن رُوحی ہائی اسکول میں۔ اور اختر صاحب کے چچا زاد بھائی کا بچہ تاج مسلم اسکول میں، گھر۔ اب گھر نہیں ہے وہ ایک بورڈنگ ہاؤس بن کر رہ گیا ہے جہاں قدم قدم پہ ماسٹر جگہ جگہ پر پنسل، سلیٹ اور اسکولوں کی کتابیں بکھری پڑی رہتی ہیں۔ صبح کو آٹھ بجے جب سارے بچے کونونٹ اور اسکول چلے جاتے ہیں تو دماغ ہلکا ہلکا سا لگتا ہے اور جب چار بجے کتنا مرٹریں اور کڑیاں ان سب کو لا لا کر پہنچا نے لگتی ہیں تو پھر گھر سے کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ اور آئے ہوئے مہمان بچوں کی اس فوج سے بُری طرح گھبرا گھبرا کر بھی آنے سے باز نہیں رہتے۔ اختر صاحب کا دسترخوان ہمیشہ سے بڑا لمبا چوڑا بچھتا رہا ہے گھر کے سارے لوگ ایک ہی ساتھ کھانا کھایا کرتے ہیں اور کھانے کے درمیان ایسی ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ چلتا ہے کہ گیارہ، بارہ بجے رات تک پراجماعے محفل جمی رہتی ہے جو بیٹھے ہاتھ سو کر سو کر جھڑ جاتے ہیں پھر بھی کسی کا جی پلنگ پہ جانے کو نہیں چاہتا ۔۔۔

اختر صاحب کی بعض خصلتیں عجیب ہیں وہ اپنی چابی کسی کو نہیں دیں گے بکس ہیں اگرچہ کوئی خاص چیز نہیں ہے پھر بھی کسی کو چھونے نہیں دیا جائیگا سارا گھر چھوڑ کر بس وہ اپنے لئے ایک کمرہ مخصوص کر لیتے ہیں اسی ایک کمرے میں ان کی ساری چیزیں اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر دھری رہیں گی کسی نے ان کے کمرے کی کسی ایک چیز کو بھی چھیڑ دیا بس تو پھر بھڑکے چھتے کو ہاتھ لگ گیا۔ ان کے لکھنے کی میز پر تو میں گرد ہوں تو ہوں مگر اس کو کوئی چھوئے نہیں۔ میں جب عاجز آکر مرنے مارنے پر تل جاتی ہوں تب غریب میز کی قسمت چمکتی ہے۔ اختر صاحب کے افسانے لکھنے کی بھی عجیب شان ہے کمرہ صاف ہو میز پر ساری چیزیں ان کے خیال سے اپنی اپنی جگہ پہ ہوں موسم ان کی پسند کا رہے کالج میں ان دنوں زیادہ کام نہ رہیں اور گھر کے اندر [illegible] تب وہ افسانہ یا کوئی مضمون لکھنا شروع کریں [illegible] انگلیاں دو تین ہی صفحوں تک چلتے چلتے تھک جائیں گی باہر دروازے پر کبھی ہلکے اور کبھی زور سے دستک ہونے لگے گی کبھی ملاقاتی کارڈ آنے لگیں گے اور اختر صاحب سے روزانہ ملنے والوں کا پھر اک تانتا بندھ جائے گا۔ صبح سے دوپہر دوپہر سے شام اور شام سے رات، رات تک نہ جانے کتنے قسم کے لوگ آتے رہیں گے اور اختر صاحب قلم سے زبان سے اور پھر اپنی تفصیلی باتوں سے ان سب کی خدمت کا پورا حق ادا کرکے تھکے ہوئے سے اپنی مسہری پر لیٹ کر آرام کرنا شروع کر دیں گے اور اس طرح سے کبھی کبھی تو پندرہ دن تک بھی ان کا افسانہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ہے، گھر کے اندر میری پانچوں بہن شہاہا تیز آواز میں ریڈیو بجاتی رہتی ہے بچے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اور ہماری بہنیں پٹنہ مارکٹ سے تازہ تازہ خریدی ہوئی چیزوں پر تفصیلی گفتگو کرنے لگتی ہیں اور جب میں اسی وقت ہی گھر کے نوکروں یا باورچی پر مجھے غصہ آجاتا ہے تب تو گورنمنٹ کا یہ کوارٹر ایک چڑیا خانہ ہی لگتا ہے اس وقت اختر صاحب بچارے اپنی چند بیا پہ مشکلوں سے بچاتے ہوئے کچھ غنیمت سے بال پر آملہ کا تیل سکھاتے ہوئے باہر اپنے احاطے میں ٹہلنے کو نکل جاتے ہیں۔

اختر صاحب کی ایک خاص چیز ان کا بجٹ ہے۔ یہ تھوڑے دنوں کے بعد وہ اپنا بجٹ بناتے ہیں، ہر مہینہ ایک خاصی رقم جو ان کی آمدنی پر لگتی ہے تبلیغ اسلام کے لئے چندہ بھیج دینے کے بعد اپنے روزانہ کا حساب بتاتے ہیں بجٹ ہی کے حساب سے بالکل نپے تلے ہوئے سارا مہینہ گزار دیتے ہیں ہاں اگر یونیورسٹی یا کسی پبلشر سے فاضل روپے مل گئے تب تو پھر جو جی چاہا خرچ کرتے رہے۔ انکو کسی چیز کی عادت نہیں ہے نہ وہ سگریٹ پیتے ہیں نہ پان اور نہ چائے، بس ایک عادت عمدہ غذا، دوائیں اور آرام کرتے رہنے کی ایسی ہے جو سب عادتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے — !

اختر صاحب کی اب تک دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں افسانے، ڈرامہ، ناولٹ اور تنقیدی مضامین سبھی ہیں، انھوں نے ایک ناول "تعمیر" بھی لکھا ہے جو کئی سالوں سے لکھا ہوا بکس میں دھرا ہے، ہندوستان میں غریب اردو پر کوئی پبلشر اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتا ہے اور پاکستان ہمارے لئے دوسرا ہی دیس ٹھہرا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ اور ایک نظموں کا مجموعہ بھی مسودوں کی صورت میں پڑا کسی آنے والے اچھے دن کی راہ تک رہا ہے۔

اختر صاحب کو بہار کے آم اور چھوٹا ناگپور کے مناظر بہت پسند ہیں۔ جب وہ کالج کا کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ادرین[1] کی پہاڑی پر حضرت بودھ کی طرح بیٹھ کر سکون اور نروان حاصل کریں گے۔

اختر صاحب جا جنیری زیدی سیدوں کے گھرانے سے ہیں۔ ادرین میں ان کے بزرگ سید احمد جان فیروز تغلق کے زمانے میں آکر بسے تھے اور فوجی کارناموں میں انھوں نے جاگیر پائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اپنی ضد اور چڑچڑاہٹ کے باوجود اپنی پُر مذاق طبیعت، سادگی، علمی صلاحیت اور نرمی کے ساتھ وہ بڑے ہی آئیڈیل آدمی ہوتے اگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں مجھ سے وہ الجھتے نہ رہتے۔

---

[1] نوٹ: ادرین کی بستی میں ایک پہاڑی ہے جس پر پالی زبان میں کتبے لکھے ہوئے ہیں اور بودھ کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں کہا جاتا ہے کہ مہاتما بودھ نے اس پہاڑی پر آکر وعظ کیا تھا۔ !

حیات اللہ انصاری

مسیح الحسن رضوی

جب کسی شخص کی زندگی ہنگاموں سے خالی ہو اس میں گھن گرج کی کیفیت نہ ہو بلکہ اس کے برعکس نرم رو دریا کی سی کیفیت ہو تو اس کے بارے میں کیا اور کیونکر کہا جائے؟ حیات اللہ انصاری افسانہ نگار ہیں، صحافی ہیں اور اب لیڈر بھی بنتے جا رہے ہیں، ان میں سے اگر کسی بھی حیات اللہ کو ہاتھ لگایا جائے گا تو دوسرے حیات اللہ کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا۔ اس سے بچنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ کے سامنے اس حیات اللہ کو پیش کیا جائے جو ان تینوں چیزوں کا مرکب ہے —— حیات اللہ جو انسان ہے اور سب کچھ بعد میں۔

اس حیات اللہ نے زمانہ کے بڑے سرد و گرم چکھے ہیں۔ عزیزوں کی خفگی، دوستوں کی بیزاری اور تمسخر۔ عزیزوں کی خفگی کے سبب ایک زمانہ میں فرنگی محل سے "بن باس" ملا اور دوستوں کی بیزاری کے سبب انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اب جب کہ حیات اللہ انصاری اپنی راہ الگ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو دوست تو دوست عزیز بھی انہیں اپنا رہے ہیں۔ فرنگی محلیوں سے ملئے تو وہ آپ کو بتلائیں گے کہ حیات اللہ کا تعلق فرنگی محل سے ہے۔ دوست کہیں گے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنانے میں حیات اللہ انصاری کا ہم سے کم ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ سو کانفرنس میں تو ڈاکٹر علیم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک زمانہ میں حیات اللہ ہم سے زیادہ گرم کمیونسٹ تھے اور ہمیں انہیں لگام دینے کے لئے کہنا پڑتا تھا کہ "ذرا سنبھل کے، آگے خندق ہے"۔ بہرکیف حیات اللہ انصاری خندق میں گرنے سے بچ گئے۔ اس میں ڈاکٹر علیم کا مشورہ شامل تھا یا خود حیات اللہ کی کوششوں اور سمجھ کا ہاتھ، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی اس تبدیلی کا ان کے دوستوں پر بڑا ناگوار ردِعمل ہوا جو بقول ان کے بزرگوں کے حیات اللہ انصاری کی صحبت میں پڑ کر خراب ہو چکے تھے۔ کمیونسٹ حیات اللہ گاندھیائی بن گئے تھے اور ہندستان (ہفتہ وار لکھنؤ) کی اڈیٹری کر کے بڑے زور شور سے گاندھیائی فلسفہ حیات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ دوست ان کی اس تبدیلی کا مذاق اڑاتے پھر رہے تھے۔ اس مذاق اڑانے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے چند سال ادھر اردو کو علاقائی زبان بنوانے کے لئے دستخطی مہم چلائی تب بھی ان کا مذاق اڑایا گیا۔ جب انہوں نے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں بیس لاکھ دستخط پیش کر دیئے تب بھی ان کا مذاق اڑایا

گیا ہے۔ انہوں نے کل ہند امن کونسل کے متنازعہ رکن اور ہندی کے افسانہ نگار یشپال کی اردو دشمنی کے خلاف اپنے اخبار میں احتجاج کیا اور انہیں کلچر دشمن ٹھہرایا اس وقت بھی ان کا مذاق اڑایا گیا۔ ایک بھرے جلسہ میں ملک راج آنند نے حیات اللہ کو اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دیا۔ اور شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہو کہ جب لکھنؤ کے ایک انگریزی روزنامہ میں کسی نیپالی نے پیغمبر اسلام کے نام پر اپنے کتے کا نام رکھنے کا تذکرہ کیا گیا کا استعفا دیا اور حیات اللہ انصاری نے اپنے اخبار قومی آواز کے ذریعہ اس کے خلاف احتجاج کیا تب بھی بعض حلقوں کی طرف سے ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کو فرقہ پرست اور رجعت پسند کہا گیا۔ جب اردو کی دستخطی مہم کے سلسلہ میں ایک بڑے جلسہ عام میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تو ان کی "گاندھیائی ستیہ گرہ" کا مذاق اڑایا گیا۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کی زندگی اس مذاق اڑانے کے شیطانی چکر کے درمیان پروان چڑھی ہے۔ لیکن خود ان کے کردار پر اس کا بڑا خوشگوار رد عمل ہوا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کے بھی دوست ہیں اور دوستوں کے یار غار۔ وہ ہر شخص کی زندگی میں اچھے پہلو ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ پھر ان ہی اچھے پہلوؤں کے سہارے وہ اس شخص سے اپنے تعلقات کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ ٹکنک اتنی کامیاب رہی ہے کہ اب ان کے مخالفین بھی ان کا احترام کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔

اس مضمون کو آگے بڑھانے سے قبل میں آپ کے سامنے ۱۹۲۶ء کے حیات اللہ کا کچھ ذکر کر دوں گا۔

غالباً اس وقت حیات اللہ کی عمر تیرہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ فرنگی محل کے ایک حصہ میں وہ اپنے والد مولانا وحید اللہ مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک بے چین بچہ جس کا اپنا کمرہ 'حیات منزل' (ایک کیوریو شاپ و نوادر کی دکان) تھا۔ جس میں ہر طرح کی چیزیں رہتی تھیں۔ کوک سے خود بخود چلنے والا پنکھا، توپ، تھیٹر کے پردے، بائسکوپ کی مشین، عجیب و غریب میزیں اور کرسیاں، طلسم ہوشربا، فسانہ آزاد اور نہ جانے کیا الم غلم۔ یہ سب چیزیں خود حیات اللہ کی بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے بچپن کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ اگر حیات کو انجینئری کی تعلیم دی جاتی تو وہ آج ملک کا ایک ماہر انجینئر ہوتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی، مسلمان اور خصوصاً اس کے علما کا طبقہ میدان میں آنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا تھا۔ حیات اللہ کا تعلق چونکہ علما کے خاندان سے تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی افراتفری اور علما کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے فرنگی محل کی قیادت کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا ان حالات اور ماحول میں حیات اللہ فرنگی محل میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کی جدت پسندی، ذہانت اور روشن خیالی کا احساس اس وقت عام طور پر فرنگی محل میں کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ ان کے ہم عمر ساتھیوں کو ان کی صحبت میں بیٹھنے اور اپنا وقت برباد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن فرنگی محل کے بچے اس وقت اپنے بزرگوں کے بچپن کے مقابلہ میں کم سعادت مند واقع ہوئے تھے اس لئے وہ چھپا چوری حیات منزل میں جمع ہوتے اور اس لڑکے کے کارنامے اور اسکیمیں سن کر اپنے جذبۂ تحیر کو تسکین دیتے۔ اس زمانہ کے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا کو فرنگی محل کے ایک مکان کے کمرہ میں "جلوۂ طور" نظر آنا اور حیات اللہ انصاری کا مسجد آصفی کے عقب میں واقع ایک دوسری چھوٹی مسجد کے مینار سے چھلانگ لگانا۔

پہلا واقعہ اس طرح ہے کہ حیات اللہ کہیں سے ایک تیز روشنی والا دھماکا لے آئے۔ اور جب مولانا تہجد ادا کرنے کے بعد سو گئے تو انہوں نے اس دھماکے کو داغ دیا۔ چاروں طرف روشنی ہو گئی اور مولانا چلائے کہ ——" نور الٰہی، نور الٰہی ——" کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد مولانا ہمیشہ کے لئے مجذوب ہو گئے۔

دوسرا واقعہ راوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن حیات منزل میں لڑکے جمع تھے۔ حیات اللہ نے ان سب سے اپنے مینار سے چھلانگ لگانے اور بانسوں کے درختوں کے ایک جھنڈ کے بانس کی مدد سے، جو مینار کی اونچائی تک پہنچتا تھا، اپنے نیچے تک بخیر و خوبی پہنچنے کی حیرت انگیز داستان بیان کی۔ لڑکوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ اس ٹولی کے مسلمہ لیڈر بن گئے۔ اب ان کی قیادت میں لڑکوں کی ٹولی گھومتی، ایلی گارد اور شہر کے دوسرے حصوں کو جاتی۔ اگر کسی دن دیر ہو جاتی اور لڑکے اپنے والدین کے ڈر سے گھبراتے تو حیات اللہ ان کا اطمینان کرا

دیتے ۔ پھر فرنگی محل کی گلی میں جب یہ ٹولی داخل ہوتی تو حیات اللہ حلوائی کی دوکان سے جلیبیاں لے کر اُن میں تقسیم کر دیتے اور کہتے کہ گھر پہنچ کر کہہ دینا کہ میلاد شریف سے آ رہے ہیں ۔ میلاد کے لئے جلیبیاں خریدنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیات اللہ اپنی کم عمری میں اپنے ماحول اور اپنے بزرگوں کی کمزوری سے اچھی طرح واقف تھے ۔ لیکن یہ لڑکا جس کا نام حیات اللہ تھا محض جدت پسند اور شریر ہی نہیں تھا وہ اس کم عمری میں بلا کا حاضر دماغ بھی تھا ۔ حیات اللہ نے ایک بار اس نے بھاپ سے چلنے والا پہیہ بنایا ۔ جس ڈبہ میں بھاپ بند تھی وہ اتفاقاً پھٹ گیا ۔ حیات اللہ کا آدھا منہ بھاپ سے جھلس گیا لیکن انہوں نے اس وقت شور نہیں مچایا ۔ منہ پہ پانی بھی نہیں ڈالا ۔ وہ خاموشی سے اس جگہ سے ہٹے اور فرسٹ ایڈ بکس سے انہوں نے کوئی چیز منہ پر مل لی ۔ یہ فرسٹ ایڈ بکس ان کی عمر عیار کی زنبیل میں دوسری چیزوں کے ساتھ موجود رہتا تھا ۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر حیات اللہ اس وقت حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو ان کا منہ ہمیشہ کیلئے آدھا سیاہ اور آدھا سفید ہو گیا ہوتا ۔ ان کی یہ زندگی بڑے ڈرامائی انداز میں اس طرح ختم ہو گئی کہ مولانا وحید اللہ کا انتقال ہو گیا ۔ ان پہلے ہی مر چکی تھیں اب ان کے سر پر کوئی وارث نہیں تھا ۔ اس عرصہ میں انہوں نے فرنگی محل کے عربی مدرسہ سے سند حاصل کر لی تھی لیکن اس تعلیم سے وہ بالکل مطمئن نہیں تھے انہیں کوئی آگے کی راہ سوجھانے والا بھی نہیں تھا ۔ ایک محبت کرنے والا ماموں زاد بھائی ضرور تھا ۔ لیکن وہ خود طالبعلم تھا جو انہیں محض مفید مشورے دے سکتا تھا ۔ ان مشوروں کے طفیل انہوں نے دو تین سال میں انٹرنس پاس کر لیا لیکن ان کے حوصلوں نے یہیں بس نہیں کی وہ کوشش کر کے علی گڈھ پہنچ گئے جہاں وہ اس زمانہ کے سب سے عزیب پرور ہوسٹل آفتاب ہال میں رہنے لگے ۔ یہاں کے قیام کے دوران میں ان کی زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اُردو میں تقریر کرنے کی مہم چلائی اور ساری یونیورسٹی میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ۔ اس سے قبل وہ لکھنؤ میں کمیونسٹ بن چکے تھے ۔ یہاں انہوں نے وجود باری کے مسئلہ پر مولانا عبدالباری مرحوم کی خفگی مول لی تھی ۔ یہاں شاید یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی دہریت سے متعلق تحریروں نے حیات اللہ کی زندگی میں بچپن ہی میں زہر گھول دیا تھا ۔ چنانچہ اس زمانہ میں انہوں نے اپنے اُستاد اور بزرگ مولانا عبدالباری مرحوم سے وجود باری کے مسئلہ پر تلخ باتیں کیں تو مرحوم نے انہیں اپنی صحبت سے اُٹھ جانے کا حکم دیا ۔ حیات اللہ خاموشی سے اس صحبت سے ، جس میں سید جالب دہلوی مرحوم وغیرہ شریک تھے اٹھ کر چلے آئے ۔ لیکن ابھی وہ اپنی " حیات منزل " کے راستہ ہی میں تھے کہ مولانا عبدالباری نے انہیں واپس بلایا ۔ شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور ان کو مخاطب کر کے کہا کہ " میں عالمانہ سطح پر عقیدہ کے اس خلوص کا احترام کرتا ہوں " ــــ اس واقعہ کے بعد مولانا مرحوم حیات اللہ کا آخر وقت تک احترام کرتے رہے ۔ عام مذہبی لوگوں کی کٹر ملائیت کے خلاف مولانا کا یہ رویہ حیات اللہ کے لئے ایک نیا تجربہ تھا ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ زندگی میں انہوں نے اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا ۔

علی گڈھ سے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد اب جو حیات اللہ لکھنؤ واپس آتے ہیں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی ۔ کمیونسٹ حیات اللہ بقول مولانا محمد علی مرحوم کھدر اسکیل پر رہنے لگے تھے ۔ یہاں سے دوستوں سے چھیڑ چھاڑ اور طعن و تشنیع کا دور شروع ہوا ۔

ان کی زندگی کے اس دور (۱۹۳۹ء) میں میں ان سے متعارف ہوا ۔ اس وقت ان کے افسانوں کا مجموعہ ' انوکھی مصیبت ' شائع ہو چکا تھا ۔ " آخری کوشش " جیسا غیر فانی شاہکار انہوں نے ابھی تخلیق نہیں کیا تھا ۔ کمیونزم کو وہ خیرباد کہہ چکے تھے ۔ لیکن گاندھیائی ہوتے ہوئے بھی وہ غیر طبقہ داری سماج کے علمبردار تھے ۔ میری طرح ان کی نظریاتی زندگی کا یہ معمہ بہتوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر گاندھی ازم کو مارکزم کے غیر طبقہ داری سماج سے کیا نسبت ہے ۔ لیکن اب بہت دنوں ساتھ رہنے کے بعد کم از کم میں نے اس معمہ کو حل کر لیا ہے ۔ حیات اللہ ناک کو سر کے پیچھے ہاتھ گھما کر پکڑتے ہیں دوسرے اسے سامنے سے پکڑ لیتے ہیں ۔ یہ طریق کار کا فرق ہے ۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حیات اللہ سرمایہ داری کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں فرد کو معاشی مساوات اور ترقی کے مواقع حاصل نہیں ہیں ۔ اس کے ساتھ وہ کمیونزم کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں ریاست کی جبریت کو بڑا دخل ہے ۔ پھر ان کے سامنے سماج کی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے کون سا فلسفہ حیات ہے ؟ یہ فلسفہ حیات

ان کی نظر میں گاندھی ازم کے علاوہ کوئی دوسرا ازم نہیں ہو سکتا۔ جس کی بنیاد معاشی مساوات کے اصولوں پہ ہے اور جہاں ریاست کی جبریت کا کوئی سوال نہیں ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں گاندھی جی کی تعلیمات میں بھرپور Human touch ہے۔

یہ ایک لمبی بحث ہے جس میں یہاں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم اب نئے حالات کے پیش نظر حیات اللہ کو اپنے طور پر اتنی کامیابی ضرور ہوئی ہے کہ ان کے دوست اور مخالف بھی انہیں رجعت پسند نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ کسی فرد کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟

آج حیات اللہ جس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لئے انہوں نے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا سرفروشانہ جذبہ کے ساتھ کیا ہے۔ دنیا میں شاید سب سے بڑی ذلت فاقہ کھینچنے کی ہے۔ اس فاقہ کا احترام صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جب آدمی اپنے اصولوں اور نظریات کے لئے بھوکوں مرنا گوارا کرے لیکن ناحق کے سامنے سر نہ جھکائے۔ حیات اللہ ان دشوار گزار راہوں سے بھی بڑی خاموشی اور پامردی کے ساتھ گزرے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں جب سامراجی جنگ ہٹلر کے روس پر حملہ کے بعد قومی جنگ بن گئی تھی اور حیات اللہ کے بیشتر ساتھی ریڈیو، مشاعروں اور پبلسٹی کے دوسرے ذرائع سے روپیہ بٹور رہے تھے تو اس وقت حیات اللہ لکھنؤ کی دسمبر کی سردیوں میں ٹھنڈی شیروانی پہنے اسی شان استغنا سے رہتے تھے اور چنے کے اکھووں سے وٹامن حاصل کرتے تھے۔ دوسرے ادیب عشرت کدوں میں جا کر دھوم مچاتے تھے اور حیات اللہ اپنے گھر پر سانپ پالتے تھے۔ ان سانپوں کے پالنے کا قصہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے ایک عزیز مسٹر کول جو مشہور سائنٹسٹ ہیں اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ ان کی کسی طرح سے حیات اللہ سے دوستی ہو گئی۔ نتیجہ کیا تھا دونوں نے مل کر سانپ پالنا شروع کر دئیے۔ میں کول صاحب کے بارے میں تو نہیں جانتا ہوں لیکن حیات اللہ کے بارے میں وثوق سے بتلا سکتا ہوں کہ انہوں نے اس فن شریف کو سیکھنے میں اپنا کافی وقت برباد کیا۔ اس زمانہ میں سانپوں سے متعلق قصے کہانیاں بھی لکھیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس موضوع پر جب ریڈیو پر ان کی تقریر ہوئی تو ان کے اس اصرار پر ریڈیو کے ذمہ داروں میں کافی کھلبلی مچ گئی کہ تقریر سے پہلے مائک پر بین بجائی جائے۔ بہرحال بعد میں ان سانپوں کا قصہ یوں ختم ہوا کہ کول صاحب انگلینڈ چلے گئے اور حیات اللہ کی زائد انرجی کے نکاس کے لئے دوسری راہیں نکل آئیں۔ انہوں نے پرانے لکھنؤ میں زور و شور کے ساتھ تعلیم بالغان کا کام شروع کر دیا۔ جو ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے ٹھیک پندرہ برس بعد انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے لئے اور انہیں دس روز میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے "حیات اللہ قاعدہ" تیار کیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان (ہفتہ وار لکھنؤ) بند ہو گیا۔ حیات اللہ کی تیس چالیس روپے ماہوار کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ اس وسیع دنیا میں جہاں ان سے ہمدردی کرنے والوں کا شدید قحط تھا وہ بالکل تنہا رہ گئے۔ تنہا اس معنی میں کہ حیات اللہ نے ہندوستان کے ذریعہ اس دور میں صحافت کی بڑی خدمت کی تھی۔ آج کے بیشتر ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ان کے اخبار میں نہ لکھا ہو۔ اس وقت اس ہفتہ وار اخبار کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہو گی (کیونکہ ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں نقادوں نے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے) لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حیات اللہ نے اس پرچہ کے ذریعہ اپنے ان متوازن خیالات کو ریہرسل کیا تھا جن کو بعد میں انہوں نے قومی آواز کے ذریعہ پیش کیا ——

قومی آواز کا ذکر کئے بغیر حیات اللہ کی زندگی بڑی ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو پر لکھنے سے قبل ان کی افسانہ نگاری کے زمانہ کا ایک نقشہ اور تجربہ ان کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے یہاں لکھنا ضروری ہے۔ جب ہندوستان کے تمام افسانہ نگاروں نے ایک ایک کر کے فلمی لائن کو اختیار کیا تو حیات اللہ نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے چیتن آنند کے ہاتھ اپنی ایک فلمی کہانی "نیچا نگر" فروخت کی۔ اس سلسلہ میں وہ کئی ماہ بمبئی رہے۔ جب اس کہانی کا فلم تیار ہوا تو اس نے فرانس میں اکاڈیمی انعام جیتا۔ لیکن اس عرصہ میں بمبئی کی فلمی دنیا نے حیات اللہ کو بدحواس کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنی فلمی کہانی کے پیسے جیب میں ڈال کر بمبئی سے بھاگ نکلے اور لکھنؤ آکر دم

لیے۔ یہاں رفیع احمد قدوائی مرحوم سے انہوں نے ملاقات کی اور انہیں ایک اردو روزنامہ نکالنے کا مشورہ دیا قدوائی صاحب اس وقت یوپی میں کانگریس کا الیکشن لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ وہ اخبار نکالنے پر فوراً آمادہ ہوگئے۔ حیات اللہ نے کام سنبھال لیا۔ اس وقت حسن عسکری دہلی میں تھے۔ جب پہلا پرچہ نکلا تو انہوں نے حیات اللہ کو جلبلا کر ایک مختصر کرخت سا کسیلا خط لکھا۔ حیات اللہ حسن عسکری کا خط پی گئے۔ پھر اس کے بعد شاید دونوں میں کبھی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ اس سلسلہ میں ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک الیکشن کے پرچہ کو اپنی کوششوں سے ایک باوقار روزنامہ بنا دیا اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی خدمت جس صحت مندانہ طریقہ سے قومی آواز انجام دے رہا ہے۔ اس کی مثال آزاد ہندستان میں مشکل سے ملے گی۔ قومی آواز کی بقا کے لئے انہوں نے اپنے محدود ساتھیوں سے بھی اس طرح جنگ کی جس طرح وہ باہر اپنے ترقی پسند ساتھیوں اور فرقہ پرست جماعتوں سے کرتے رہے تھے۔ انہوں نے خود پیٹ پر پتھر باندھ کر اور اپنے ساتھیوں کے پیٹ پر پتھر باندھ کر قومی آواز کو زندہ رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ادارہ کے اراکین میں تلخیاں پیدا ہوئیں شکوک پیدا ہوئے نیت کا سوال درمیان میں لایا گیا۔ دوستی اور تعلقات میں فرق آیا لیکن وہ اپنی بات پر جمے رہے۔ بات پر جمے رہنا حیات اللہ کا بہت بڑا وصف اور کمزوری ہے۔ وہ جب سوچ سمجھ کر ایک بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر بڑی مشکل سے اسے بدلنے پر تیار ہوتے ہیں بلکہ بدلتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں بعض اوقات کٹھ حجتی کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی مسئلہ کے بارے میں خلوص نیت سے اپنی رائے نہ قائم کی ہو۔

لیکن خود ان کی بھی ایک کمزوری ہے۔ یہ کمزوری ان کے تخیل کی اڑان ہے۔ جس کو اگر آپ حیات اللہ کے ساتھ رعایت برتیں تو ان کی امید پرستی کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ لیکن ان کے اس مایوس نہ ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ خدانخواستہ ان کی باتوں میں آ گئے تو یہ عین ممکن ہے کہ آپ امید کا دامن ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں انہوں نے اپنے ایک کمیونسٹ دوست گوکل چند رستوگی کے ساتھ مل کر کوہ پیمائی کا بڑا عظیم الشان پروگرام بنایا تھا۔ اس کے لئے ..... کے نام سے سامان جمع کرنے کی ایک طول و طویل فہرست بھی بنائی گئی تھی۔ دن بھر یہ دونوں دوست کوہ پیمائی کے اصولوں پر دلچسپ گفتگو کیا کرتے۔ غریب رستوگی اس گپ میں اتنا منہمک ہو جاتا کہ اس کی نوجوان آنکھوں میں ایورسٹ کی برفیلی چوٹیاں چمکنے لگتیں۔ لیکن کچھ دن کے بعد یہ ہوا کہ حیات اللہ کو اپنے تخیل کی اڑان کے لئے دوسرا شکار ہاتھ آ گیا۔ رستوگی غریب آج کل فارمنگ کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ شاید اسے اس بات کا علم نہیں ہے کہ تن سنگھ نے ایورسٹ سر کرنے سے قبل حیات اللہ اندھاری اپنے تخیل میں اسے کبھی کا سر کر چکے ہیں۔ تو یہ تخیل پرستی یا امید پرستی حیات اللہ کی فطرت کا خاصہ ہے جس کے سہارے انہوں نے اپنی زندگی کے کتنے ہی معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ لیکن حیات اللہ کے اس اسکیچ کو پڑھنے والوں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ رستوگی کی مثال نہ سامنے رکھیں اور زیادہ اڑان بھرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ بسا اوقات حیات اللہ کو اس اڑان کا بھگتان بھگتنا پڑا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بار یوپی اسمبلی میں کہیں وزیر مالیات حافظ محمد ابراہیم نے اپنی بدقسمتی سے بجٹ تقریر میں اردو کا ذکر نہیں فرما دیا۔ دوسرے دن جب یہ تقریر اخبارات میں چھپی تو حیات اللہ نے اپنی امید پرستی کے عنوان اس کی بڑی مٹی پلید کی ——— اردو کی بہت اور ان کے تخیل نے سینکڑوں ہوائی قلعے بنا ڈالے۔ پھر یہ ہوائی قلعے اڑا اڑا دھم کرے اور بے چارے حیات اللہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ وہ اردو کے مقدمے مایوس ہوتے جا رہے ہیں بلکہ اس پر بھی انہوں نے صبر اور تخیل کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اب وہ "سردو بنگ" کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ جمہوریت کی فتح پر پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

ان کے تخیل کی اڑان کی ایک دوسری مثال بھی سنتے چلئے۔

سنہ ۱۹۴۲ میں غیر منقسم ہندستان کی جو سیاسی صورت حال تھی اس سے کم و بیش سب ہی واقف ہیں۔ یہاں ان افسوسناک واقعات کا اعادہ

کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان حالات میں بھی حیات اللہ مایوس نہیں تھے۔ ان کے تخیل کی اڑان کا وہی حال تھا۔ چنانچہ ۱۸ر جولائی ۱۹۴۲ء کو مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ جو تحریک چلنے والی ہے اس پر مجھے پورا عقیدہ ہے۔ اب ہندستان کو آزاد اور لڑائی کو ختم سمجھئے آٹھ دس مہینوں کی اور بات ہے۔ یہاں قربانیوں کی ضرورت ہے"

مجھے اس کا اقرار ہے کہ رستوگی کی طرح اس بار میں بھی ان کے ساتھ بد رسٹ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے اس نے مجھے سخت مایوس کیا۔ اگر میں رستوگی ہوتا تو شاید میں بھی فارمنگ کے چکر میں پڑ گیا ہوتا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ حیات اللہ انصاری کی اس تخیل پرستی نے حقائق سے بالکل ناطہ توڑ لیا ہوتا ہے۔ میں نے اڑان کے لئے انہیں پر تولتے وقت زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے دیکھا ہے۔ اب اسی معاملہ کو یہ ہوا کہ وہ مجھے یہ خط تھا کہ اپنے دوست اور انگریزی ناول "کنتھا پورا" کے مصنف راجا راؤ کے ہمراہ اس کوشش میں لگے ہوئے کہ برطانی سامراج کے مظالم کی داستان کو غیر ملکی اخباروں میں شائع کرایا جائے۔ یہ راجا راؤ بھی عجیب خوابی انسان تھے۔ اپنے تخیل کی اڑان میں حیات اللہ سے ہزاروں ہزار ہاتھ آگے۔ حیات اللہ وکٹوریہ اسٹریٹ کے ایک کمرہ میں بیٹھ کر ایورسٹ کو سر کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ پھر راجا راؤ تو ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے۔ اس لئے یہ نہ پوچھئے ان کے تخیل کی اڑان۔ اس پر سہاگہ احمد علی (ٹہاری گلی والے) کی ذات تھی جو اپنی ٹھیٹ حقیقت پسندی سے دونوں کو بریک دیتے رہتے۔

اس وقت (۱۹۵۶ء) حیات اللہ انصاری قومی آواز، دستخطی مہم اور فرقہ پرستوں کے خلاف جہاد کرنے کا دوسرا نام ہے۔ دستخطی مہم کے سلسلہ میں اوپر کہیں ذکر آ چکا ہے۔ جب انہوں نے اس مہم کو شروع کیا تھا تو بہت کم لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ بیس لاکھ دستخط جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس زمانہ میں ہندستان کا جو سیاسی مزاج تھا اس میں یہ بات ناممکن بھی نظر آتی تھی۔ لیکن انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان تنظیم کھڑی کر دی۔ جس نے پوری لگن کے ساتھ بیس لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ آج اگر حیات اللہ کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی ہیں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ ہندستان کے جمہوری مزاج کا قصور ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حیات اللہ کو ہندستان کی جمہوریت پر اٹل بھروسہ ہے۔ اس لئے وہ اس سلسلہ میں اپنے بس بھر کام کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے سلسلہ میں حیات اللہ نے اک دیکھے میدانوں کو سر کیا۔ بڑے بڑے بڑوں سے ٹکر لی۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو کے معتمد قاضی عبد الغفار مرحوم تک کی مخالفت مول لی۔ اس سلسلہ میں انسانی فطرت کی کمزوری کے پیش نظر یہ ممکن ہے کہ دونوں میں زیادتی کسی کی بھی رسہ کشی ہوئی ہو۔ لیکن قاضی عبد الغفار کے انتقال کے بعد انہوں نے قومی آواز میں جو اداریہ لکھا اس میں اردو کی جد وجہد کا سہرا قاضی صاحب مرحوم کے سر باندھ دیا۔ جو لوگ حیات اللہ کے مزاج سے ناواقف تھے انہوں نے منہ میں انگلیاں دبا لیں۔ جب حیات اللہ کو اس حیرت کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ پر اکتفا کی۔

اسی طرح کا ایک ہنگامہ مجاز مرحوم کے انتقال کے موقع پر اس وقت پیش آیا جب انہوں نے "مجاز رخصت ہو گیا" کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس اداریہ میں حیات اللہ نے دل کھول کر مجاز کے فن کی تعریف کی۔ صحیح معنوں میں اس اداریہ میں انہوں نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی بھی خبر لے ڈالی اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ "مجاز اس لئے چاند بن کر نہ چمک سکے کہ وہ ایک ایسی جماعت سے وابستہ تھے جو ادب کو اپنے روزانہ کے مسائل اور ایک خاص سیاسی نظریے سے متعلق رکھنا چاہتی ہے۔۔۔"

علی سردار جعفری جو ان دنوں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے انہوں نے اداریہ کو پڑھا۔ اپنے مخصوص انداز میں بالوں

کو دونوں ہاتھوں سے سر کے پیچھے پھینکا اور کہا کہ "حیات نے سب ٹھیک لکھا ہے مگر یہ ......" پھر انہوں نے کمیونسٹ پارٹی والے پیراگراف کو قومی آواز کے ہر ہر رکن کو دکھایا "یہ غلط ہے اس موقع پر یہ نہ ہونا چاہئے تھا"۔

واقعی اگر حیات اللہ اس موقع پر پرانے زخموں کو نہ کریدتے تو اچھا تھا۔ یہ ان کا بغض معاویہ سہی لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسی ہمت کتنے لوگوں میں ہے جو بھیڑ بھاڑ سے متاثر ہوئے بغیر بے باکی سے اپنے خیالات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکیں۔ اس کے دوسرے دن مجاز کے سوگ میں ایک جلسہ ہوا۔ سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حیات اللہ بھی بولے۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی اپنی راہ دوسروں سے الگ نکالی اور مجاز کی بدنصیبی پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔

حیات اللہ بڑے پیارے دوست ہیں۔ ان کی سنجیدگی کے پیچھے ایک بڑی زندہ دل، ہنسوڑ اور چٹکلے باز شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انہیں تنگ کرتے ہیں۔ خود وہی اور [illegible] پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں عمدہ پراٹھے، قورمہ کباب اور پلاؤ کھلاتے ہیں۔ دوستوں کی بیویوں کو شوہروں کے خلاف بغاوت کرنے پر اکساتے ہیں۔ چنانچہ جذبی کے ساتھ علی گڑھ میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آ چکا ہے۔ حیات اللہ کسی کام سے علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ جذبی ان کے پرانے رفیق اور دوست ہیں۔ ان کی بیوی نے بتلایا کہ جذبی میرے ساتھ باہر نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کبھی سینما تک ساتھ نہیں جاتے۔ حیات اللہ نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس مرتبہ ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ جذبی ہمیشہ آپ کے ساتھ سینما جائے گا۔ وہ ٹھیرا بڑا شاعر اور یونیورسٹی کا لیکچرار شاید اسے ڈر لگتا ہوگا کہ اس کے طالبعلم [illegible] کہتا ہے۔ جب اس دن جذبی گھر واپس آئے تو حیات اللہ نے انہیں دوسرے شوہروں کی بیوی کے ساتھ سینما [illegible] خود اتنے شریف واقع ہوئے ہیں کہ اس شرارت کی مدافعت کرنا ان کے بس سے باہر ہے [illegible] جذبی کے طالب علموں کو اس بات کا علم ہوا یا نہیں کہ جذبی اپنی بیوی کے ساتھ سینما [illegible] کہ اس کی خبر مولانا عبد الماجد دریابادی کو نہ ہونا چاہئے۔ حیات اللہ دوسروں [illegible] کیا تو حیات اللہ کی [illegible] یاد آیا کہ قومی آواز بھی [illegible] شرارت میں [illegible] تو حیات اللہ [illegible] عبد الماجد دریابادی [illegible] حیات اللہ ٹھیرے ٹھنڈے مزاج کے انسان انہوں نے بلونت سنگھ کے بقول اس [illegible] ذکر حیات اللہ [illegible] دوست ہونے کا تھا۔ [illegible] کی طرح حیات اللہ کا بھی ایک مخصوص حلقہ احباب ہے [illegible] کمزوری ہے۔ یہاں حیات اللہ ایک بالکل مختلف انسان ہیں۔ جو آپ کو سستے پیسوں کے خریدے ہوئے [illegible] سستے ان کے ذریعہ گھر کو سجانے کی ترکیبیں بتلاتے نظر آئیں گے۔ حیات اللہ بچپن سے پیٹ کے مریض ہیں۔ شاید بچپن میں ماں کے [illegible] انتقال کی وجہ سے باپ نے بہت زیادہ دلار کیا ہوگا جس کی وجہ سے ان کا معدہ کمزور ہو گیا۔ بہرکیف وجہ کچھ بھی رہی ہو اس پیٹ کی بیماری کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اور اب وہ اس کا علاج غذاؤں اور دواؤں کے ذریعہ خود کر لیتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن آگے چل کر یہ معاملہ ذرا نازک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب ان کا کوئی دوست درد سر، بے خوابی یا اسی قسم کی کسی دوسری شکایت کا ذکر کرتا ہے۔ حیات اللہ فوراً سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں "اچھا تو آپ کو یہ شکایت ہے؟" پھر اس شکایت کا شجرہ پیچش سے ملا کر کہیں گے "یہ سب پیٹ کی خرابی ہے، کبھی آپ کو پیچش تو نہیں ہوئی؟" اب وہ بیچارہ دوست ذہن کو کھنگال کر کہتا ہے کہ "جی نہیں پیچش کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے کیا میری سات پشتوں کو یہ موذی مرض کبھی نہیں ہوا۔" لیکن حیات اللہ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ فوراً کھانے اور نہ کھانے کی ایک لمبی چوڑی فہرست گنا

دیں گے اور آخر میں مشورہ دیں گے کہ آج رات کو فاقہ کرنا اور سوتے وقت انیما لے ڈالنا۔ دوسرے دن جب یہ دوست ملے گا تو اس سے مزاج پوچھیں گے۔ پھر دریافت ہوگا انیما لیا تھا؟ دوست کسی ناگہانی آفت کا بہانہ کرکے بتلائے گا کہ انیما لینے کی نوبت نہیں آئی۔ چنانچہ تاکید کی جائے گی کہ آج سہی، دیکھو بھول نامت۔ آخر روز روز کے سوال جواب سے تنگ آکر دوست ایک دن حیات اللہ کو مژدہ سنائے گا کہ آپ کے انیما نے معجزہ کر دکھایا۔ درد سر، بے خوابی، اعصابی تشنج سب غائب اور یہ سن کر حیات اللہ کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں انہیں اپنے قومی آواز کے اسٹاف کی صحت کی طرف سے سخت تشویش پیدا ہوگئی۔ پہلے تو انہوں نے فرداً فرداً سب کو ان کی صحت کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن جب کسی نے نہیں سُنا اور بدستور ان کو سب کی صحت چوپٹ نظر آئی تو انہوں نے وٹامن والے سستے کھانوں کی ایک فہرست دفتر میں ٹنگوا دی اور اس کے ساتھ اپنا ایک طول طویل نوٹ بھی لگا دیا جس میں انہوں نے سب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سستی غذا کے ذریعہ بھی وٹامن حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی غربت کے زمانہ کے تجربات کو بھی گنوایا۔ ان کا یہ مشورہ اس سلسلہ میں واقعی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ فصلی پھل، آم خربوزہ وغیرہ اس وقت کھانا چاہیئے جب بڑے لوگوں کا ان کے استعمال سے پیٹ خراب ہو جائے اور وہ بازار میں سستے داموں فروخت ہونے لگیں۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ فصلی پھل مزے ہی کیلئے نہیں وٹامن حاصل کرنے کے لئے کھانا چاہئیں۔

پھر اسی صحبت میں حیات اللہ، خدا، حسن، سچائی اور آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت پر چٹخارے دار باتیں کرتے نظر آئیں گے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ایک زمانہ میں حیات اللہ خدا کے قائل نہیں تھے۔ لیکن اب ان کی منطق نے خدا کو پا لیا ہے۔ وہ اسے حسن اور سچائی کے روپ میں جلوہ کر دیکھتے ہیں اور ایک صوفی کی طرح پتہ پتہ پر اس کے نقش کو کندہ دیکھتے ہیں۔ ایک ایسی ہی صحبت میں قرآن کے بارے میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ اسے الہامی کتاب مانتے ہیں یا نہیں ——؟ حیات اللہ ایک ذرا مراقبہ میں چلے گئے۔ پھر سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی بولے ہاں مانتا ہوں۔ کس طرح؟ کچھ دیر وہ پھر خاموش رہے اور پھر بولے "بھئی اصطلاح میں یا بالفاظ دیگر دل کی زبان میں اس مسئلہ پر بات ہو سکتی ہے" "بتلائیے نا؟" ان سے اصرار کیا گیا۔ کہنے لگے میں ایک چھوٹا موٹا ادیب ہوں مجھ سے میری انا اور وجدان لکھاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ یہ انا کسی شخص میں نہ رہے یا یوں کہئے کہ کسی کی خودی مٹ جائے پھر وہ جو لکھے گا یا کہے گا وہ محض اس کی انا کی گونج نہیں ہوگی۔ ایک آفاقی پکار ہوگی۔ اب آپ اسے جو کچھ نام دے لیجئے۔"

ان کے اس استدلال کو ہم جیسے انسان تخیل کی اڑان کا نام دیں گے۔ لیکن دل کی زبان کو سمجھنے والوں کے لئے اس میں ہزاروں نکات پوشیدہ ہیں۔ حیات اللہ کا بچپن اور زندگی کا بیشتر حصّہ لکھنؤ میں گزارا ہے۔ ان کا لکھنؤ کے علماء کے فرنگی محل کے قدیم خاندان سے تعلق ہے۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے میں ان کی خاندانی روایات کا ہاتھ ہے یا ان کے گاندھیائی ہونے کا اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اگر اس سوال کا جواب دینے کے لئے حیات اللہ سے کہا جائے تو یقین ہے کہ وہ گاندھی جی کی تعلیمات کو اپنے خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیں گے۔

نفاست کے اعتبار سے حیات اللہ پورے لکھنوی ہیں۔ وہی لب ولہجہ (لیکن تصنع سے پاک) وہی لباس کا اہتمام اور وہی تہذیب کا رکھ رکھاؤ۔ لکھنؤ میں ان کا قیام شہر کی نئی آبادی والے حصّہ میں ہے۔ عید بقرعید کے موقع پر وہ صرف اپنے بزرگوں سے ملنے فرنگی محل جاتے ہیں اور اس بات پر شدّت سے اصرار کرتے ہیں کہ ان کے چھوٹے ان سے ملنے کے لئے نظر بانع آئیں۔ چنانچہ فرنگی محل جانے کا انہوں نے کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ لامحالہ ان کے چھوٹوں کو ان سے عید ملنے کے لئے ان کے گھر جانا پڑتا ہے۔

لکھنؤ میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک تہذیبی برائی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقے شیعہ اور سُنّی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں۔ لیکن حیات اللہ نے بہت شعوری طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شیعہ سنی علماء اور عمائدین شہر کا یکساں احترام کرتے ہیں۔ وہ دونوں فرقوں میں بے انتہا مقبول ہیں۔ شیعہ علماء اور شرفا کے گھرانے کی کوئی ایسی تقریب نہیں ہوتی ہے جس میں حیات اللہ کو مدعو

نہ کیا جاتا ہو۔ حد یہ ہے کہ جب لکھنؤ میں مدحِ صحابہ اور تبرّہ کے سلسلہ میں باہمی تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے تو ان ہی دنوں میں حیات اللہ نے شیعوں کی مشہور درس گاہ سلطان المدارس کے طلباء کے حقوق کے لئے ایک تحریک کی رہنمائی کی تھی۔ جس میں طلباء نے ایک لمبی ہڑتال بھی کی تھی۔ لیکن کسی موقع پر بھی حیات اللہ کو اس لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا۔ کہ وہ شیعوں کی درس گاہ کی تخریب کر رہے ہیں۔ وہ لکھنؤ اسکول کی شاعری کے کچھ ایسے معتقد نہیں ہیں لیکن انیسؔ کا لوہا مانتے ہیں۔

اس مضمون کے شروع میں آنحضرت کی ذات کے متعلق ایک دل آزار اشتہار کا ذکر آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں حیات اللہ نے شہر میں جو مجلس عمل بنائی تھی اس میں دونوں فرقوں کے نمائندوں کو شریک کیا تھا۔ پھر جب مجلس عمل کے ایک عالم نے جو ان کے عزیز ہوتے ہیں مجلس عمل کے فیصلوں سے انحراف کیا تو حیات اللہ نے بغیر کسی قسم کی رو رعایت کے اخبار کے ذریعہ ان کا پول کھولا۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی وہ غیر فرقہ پرست شخصیت بھی کافی مجروح ہوئی۔ لیکن اس کی انہوں نے ذرا پروا نہیں کی۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ اس تحریک کے ساتھ بہت دور تک چلے گئے ہیں تو انہوں نے نہایت ٹھنڈے لہجہ میں جواب دیا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حیات اللہ اگر اپنے اخبار میں اس تحریک کے خلاف کچھ لکھ دیں گے تو معاملہ ختم ہو جائے گا وہ معاملہ کی نزاکت اور مسلمانوں کے جذبات سے واقف ہی نہیں ہیں۔ لوگوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس دھن کے پکّے شخص نے اس معاملہ سے نپٹنے کے بعد دوسرا مورچہ سنبھالا اور بالآخر مخالفین کو یہ سمجھانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی کہ انہوں نے اِس معاملہ میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

حالات نے اس وقت حیات اللہ کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا ہے جس کے لئے وہ بالکل نادم اور شرمندہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ایک بہت افسوسناک بات ہے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایک فن کار اور مفکّر ہیں اور یہیں ان کی جگہ ہے۔ چند سال ادھر وہ ایک صحافتی وفد کے ساتھ مصر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ فراعنۂ مصر کی داستانیں، بادشاہوں اور شہزادیوں کے مجسمے اور وادیٔ نیل کے رومان کی کہانیاں لے کر آئے۔ مصر کی سماجی زندگی کے اور بہت سے پہلوؤں کا بھی نمالیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے لوٹے۔ لیکن اُنہیں وہاں شاہ فاروق کے خلاف ہونے والی سازش اور اس انقلاب کی کوئی بو باس نہیں ملی جو ان کی واپسی کے چند ماہ یا شاید چند ہفتوں کے بعد رونما ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص حالات کی وجہ سے وہ ایک سیاسی آدمی بن گئے ہیں ورنہ اس سے انہیں فطری لگاؤ نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا اب سے چند سال قبل یہ خیال تھا کہ کانگرسی حیات اللہ بس چند دنوں کی بات ہے کہ وزیر نہیں تو نائب وزیر اور وہ بھی نہیں تو پارلیمنٹری سکرٹری ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن حیات اللہ کی ذات سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اُردو کی تحریک اور اقلیت کے حقوق کے لئے جس جان جوکھم کی منزل میں قدم رکھا ہے وہاں سے سرکاری کرسیاں بہت دور ہیں۔ واضح رہے کہ بعض دوسرے لوگوں کی طرح حیات اللہ منزل سے پلٹ پڑنے کے لئے کوئی چور دروازہ کھلا ہوا نہیں رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنی منزل پر روانہ ہونے لگتے ہیں تو چور دروازہ تو چور دروازہ وہ معمولی روشندانوں اور جھروکوں کو بھی بند کر دیتے ہیں۔ آج اپنی اس سچائی اور خلوص کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ہندستان میں اقلیت کی تاریخ ختم نہیں ہو گئی ہے تو آگے چل کر حیات اللہ کا نام یقیناً ان چند انے گنے لوگوں میں ہوگا۔ جنہوں نے ہندستان کے جمہوری نظام میں اسے معزز جگہ دلوانے کے لئے کام کیا اور دوسروں کو ان کا کھویا ہوا اعتماد واپس دلوایا۔

حیات اللہ کو کسی نے غصہ آتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے۔ جو ان کے سب جاننے والوں کو معلوم ہے لیکن ان سے اسکے بارے میں استفسار کیا گیا تو وہ مسکرائے "سلطانہ نے یہ غصہ دیکھا ہے" —— اس مالمانہ سچائی نے استفسار کرنے والے کو غرقِ حیرت کر دیا۔ بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ حیات اللہ کو بھی غصہ آتا ہے وہ چائے بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ روٹھ بھی جاتے ہیں اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک عام شوہر کرتا ہے۔ لیکن اس داستان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ پھر کچھ باتیں سلطانہ حیات کو بھی تو کہنا چاہئیں جو حیات اللہ کے ساتھ دس بارہ برس سے بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک

کوشلیا اشک

اشک جی نے اپنی ایک ہندی نظم میں لکھا ہے :

اور میں دریا
چِر کا چلا
تھکا اور ہارا
نرنتر گتی سے میدانوں میں بہنے والا
موں اور گمبھیر، شانت اور شرانت
یوون کی سب یاد بھلا کر
لُوٹ، لُٹا کر
بہتا ہوں اوِشرانت[۱]

---

[۱] اور میں دریا
بہت دیر کا چلا ہوا
تھکا اور ہارا
آہستہ آہستہ میدانوں میں بہنے والا
خاموش، گمبھیر، شانت
جوانی کی سب یاد بھلا کر
لوٹ اور لُٹا کر
بہتا ہوں کھویا کھویا سا

لیکن رکاوٹوں کو پار کر کے میانہ روی کے ساتھ آہستہ آہستہ چپ چاپ، کھوئے کھوئے سے بہنا دریا کی رفتار کا محض ایک پہلو بھی ہے اور اس کی انتہا بھی۔ موسم سرما کا سوکھا سمٹا، نحیف و نزار بے جان اور بے حس سا بہنے والا دریا برسات کے موسم میں کناروں کو توڑ، قہقہے مارتا ہوا دیوانہ وار بہنے لگتا ہے اسے دیکھ کر کون سوچ سکتا ہے کہ یہ کبھی قریب المرگ زخمی سانپ سا آہستہ آہستہ بھی سرکتا ہو گا۔

دریا کی روانی کی یہی دو حدود اشک جی کے مزاج کی حدود ہیں۔ ان کے مزاج کی ایک انتہا کو دیکھ کر اس کے بارے میں کسی طرح کا یقین اپنے دل میں پکا کرنے والا شخص جب اس کی دوسری انتہا کو دیکھے گا تو نہ صرف اسے حیرت ہو گی بلکہ اس کے اس یقین کو بھی صدمہ پہنچے گا۔

اشک جی سے اپنے تعارف اور اپنی شادی کے اوّلیں دنوں میں میری حالت اسی شخص کی سی تھی جس نے دریا کی روانی کا محض سرمائی روپ ہی دیکھا ہو ـــــ چھوٹی عمر ہی میں اشک جی کی شادی ہو گئی تھی، ایک بھولی بھالی ناخواندہ دیہاتی لڑکی کے ساتھ! وہ کسی قابل ہوتی تو دق نے طویل اذیت کے بعد اسے موت کی گود میں سلا دیا۔ اس کی وفات سے اشک جی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کے ہاں پہلی بیوی کے مرتے ہی رشتے آنے لگتے ہیں۔ اشک جی کو پہلی بیوی پسند تو نہ تھی لیکن چار برس کی رفاقت کے بعد اسے چاہنے لگے تھے۔ انہوں نے جلدی دوسری شادی نہ کی۔ سب جج بننے کے لئے قانون پاس کیا تھا لیکن مقابلہ کے امتحان سے محض دو مہینے پہلے بیوی کے رحلت کر جانے کی وجہ سے افسردہ دل ہو کر انہوں نے سب جج بننے کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے فطری رجحان کے مطابق ادب کی خدمت میں محو ہو گئے۔

لاہور کی زندگی ان دنوں کافی دلچسپ لیکن رسوا تھی۔ کوئی نہ کوئی سکینڈل آئے دن پھیلا کرتا۔ وہاں سے سکون کی تلاش میں نکلے تو وسط پنجاب کے ایک گاؤں پریت نگر میں جا پہنچے۔ وہاں بھی رسوائی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک لڑکی کے سلسلے میں خاصہ سکینڈل پھیل گیا۔ اشک جی اتنے تنگ آ گئے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو لکھ دیا ـــــ "میری شادی کہیں طے کر دو" بھائی صاحب نے دیکھے سنے بغیر ایک جگہ سگائی پکی کر دی۔ کچھ دن گزرے اور کچھ سکون ہوا تو محسوس کیا کہ خاصی جلد بازی ہو گئی ہے۔ پہلے بھی شادی کچھ ایسے ہی ہوئی تھی، تجربات کافی تلخ تھے۔ انہوں نے بھائی صاحب سے کہا ـــــ "سگائی چھوڑ دیجئے" بھائی صاحب نے کہیں دور کے رشتے ہی میں سگائی طے کر دی تھی، وہ نہیں مانے۔ تذبذب اور کشمکش و پیچ کی ایسی ہی حالت میں تھکے ہارے اداس اور برگشتہ خاطر تھے، جب ان سے میرا تعارف ہوا اور میں نے ان کے مزاج کا وہی روپ دیکھا جس کا ذکر انہوں نے اپنی مندرجہ بالا نظم میں کیا ہے۔

میں ریناله ضلع منٹگمری میں ہیڈ مسٹریس تھی۔ لاہور آتی تو بیڈن روڈ پر اپنے ماما جی کے ہاں ٹھہرتی۔ اشک جی وہیں مجھ سے ملنے آیا کرتے۔ آتے تو ڈرائنگ روم میں ایسے چپ چاپ بیٹھ جاتے گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ کوئی بات پوچھتی تو اتنی دھیمی آواز میں جواب دیتے کہ قریب بیٹھا شخص بھی نہ سن سکے۔ ان دنوں میں سوچا کرتی تھی کہ ان کی اس مغموم اداس زندگی کو مسکرانا سکھاؤں گی ـــــ آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جب اپنی شادی کے ایک ماہ بعد ہی میں نے انہیں فلک شگاف قہقہے لگاتے دیکھا اور مجھے سوچنا پڑا کہ میں بے حد سنجیدہ مزاج ہوں اور شاید ایسے ہنس مکھ پھکڑ مزاج آدمی کے ساتھ نہ چل سکوں۔

کبھی اس حد پر اور کبھی اس کے عین برعکس دوسری حد پر چلنے والے اشک جی کے مزاج کا محض ایک پہلو دیکھنے والا جب اچانک اس کا دوسرا پہلو دیکھتا ہے تو وہ کچھ لمحے کے لئے حیران و مبہوت رہ جاتا ہے ـــــ اپنی ازدواجی زندگی کے گزشتہ سات برسوں میں (ہماری شادی ہوئے صرف سات برس گزرے ہیں) حیرت کے ساتھ دھچکا سا لگانے والے ایسے لمحے کم نہیں آئے۔

شادی کے اوّلیں دنوں کا ذکر ہے۔ ایک بار ہم نے کچھ احباب کو مدعو کیا۔ ان دوستوں میں کچھ اشک جی سے عقیدت بھی رکھتے تھے دہ ... خواں

بچھا کر، سبزی ترکاری اور سالن سلاد کے ڈونگے وغیرہ رکھ کر میں نے سب سے دسترخوان پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو میں نے اپنے دائیں طرف کونے پر بیٹھے ہوئے مہمان سے کہا کہ شروع کیجئے! انہوں نے کچھ اخلاق اور تکلف اور کچھ عقیدت کے سبب اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اشک جی سے کہا: ”جی آپ ہی شروع کیجئے“ اور مجھ سے ڈونگا لے کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

اشک جی اپنی عادت کے مطابق لگاتار باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈونگا بڑھایا تو کسی طرح کے تامل یا جھجک کے بغیر ان سے ڈونگا لے کے اشک جی نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا اور اسے آگے بڑھانے کی بجائے وہیں رکھ دیا اور دوسرے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ڈونگے پر ڈونگا اٹھا کر یہ سالن سلاد وغیرہ اپنی پلیٹ میں ڈالتے گئے اور اپنے سامنے ڈونگے اکٹھے کرتے گئے اور پھر یہ دیکھے بغیر کہ کسی دوسرے نے بھی کچھ لیا ہے یا نہیں آپ نے کھانا شروع کر دیا۔

میں نے دبی زبان سے کہا: ”آپ نے کھانا شروع کر دیا، ڈونگے آگے بڑھا دیجیے۔“

اشک جی نے توڑا ہوا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا: ”ارے بھائی لیجئے نا، تکلف نہ کیجئے اور لیتے جائیے۔“

اور بدستور کھاتے رہے۔

تب کچھ شرمسار سی ہو کر میں نے ڈونگے آگے بڑھائے۔

اسی طرح ایک بار کا ذکر ہے۔ خلاف امید دو تین مہمان زیادہ آ گئے۔ میں نے انہیں بیٹھک سے بلایا اور کہا: ”باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن بینگن کا بھرتہ شاید کچھ کم پڑے۔ تو رتی بھر بھی کوئی رہ نہ جائے۔ بازار تو بہت دور ہے۔ آپ کہیں تو جلدی سے دو بینگن منگا کر بھون لوں، دیر نہ لگے گی۔“

بولے: ”تم فکر نہ کرو جی، سب ٹھیک ہے اور کچھ پکانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں، میں سب سنبھال لوں گا۔“

میں نے کہا: ”تھوڑا تھوڑا خود ہی سب کی پلیٹوں میں ڈال دیجئے گا۔“

بولے: ”تم ذرا بھی فکر نہ کرو، میں سب دیکھ لوں گا۔“

اور باہر جا کر اپنے دوستوں سے باتوں میں محو ہو گئے۔ میں بھی بے فکر ہو گئی۔

جب وقت پر سب کھانے کے لئے بیٹھے تو میں نے بھرتے کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے بھرتہ اٹھایا اور کافی مقدار میں اپنی پلیٹ میں ڈال کر بولے: ”دیکھو بھئی یہ ترکاری بس اتنی ہی ہے۔ لیتے وقت ذرا دوسروں کا خیال رکھئے گا۔“

شرم کے مارے میرا منہ لال ہو گیا۔ میں نے کہا: ”آپ تو دوسروں کا خیال رکھئے۔“

”ارے یار.....!“ کہتے ہوئے انہوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”اب تو جو لیا ہو گیا نہیں واپس ڈال دیتا۔“ اور پھر مجھ سے معافی مانگتے ہوئے بولے ”غصے کیوں ہوتی ہو، یہ سب اپنے آدمی ہیں۔ یہاں کھانا کھانے تھوڑی آتے ہیں۔ اس بہانے کچھ دلچسپ گھڑیاں بیت جاتی ہیں۔“ اور دوستوں سے بولے ”لو یار تھوڑا تھوڑا۔ یہ تو اور پکانے لگی تھیں میں نے روک دیا کہ تم سب اپنے آدمی ہو، تکلف کی کیا ضرورت ہے۔“

اشک جی کے لئے سبھی اپنے آدمی ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر سرور نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

”اشک کی طبیعت میں اجنبی پن نام کو نہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ سے سب کہہ دیں گے
سب سے بے تکلف اور سب کے دوست۔“

اور مجھے ان کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی یاد آ جاتی ہے۔

مجھے رینالہ سے لاہور پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی لیکن یہ مجھ سے پہلے پریت نگر سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ میں ابھی غسل وغیرہ سے بھی فارغ نہ ہوئی تھی کہ آپ کا چھوٹا بھائی آ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اشک جی کو آئے چار پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ "ان کی طبیعت خراب ہے، ہلکی سی حرارت ہے، ہاکی کھیلتے ہوئے آنکھ پر گہری چوٹ آ گئی ہے اور اگر مجھے خاص تکلیف نہ ہو تو میں ہی اُدھر چلی چلوں۔"

اشک جی کے بڑے بھائی لاہور میں دانتوں کے ڈاکٹر تھے۔ بائیبل سوسائٹی کے سامنے ان کی سرجری تھی۔ ان کے بھائی نے مجھے وہاں کا پتہ بتایا میں نے کہا "اور آپ ان سے کہئے کہ میں آدھ گھنٹے میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے اشک جی کو پہلے بھی دو ایک بار دیکھا تھا۔ سلک کا بنگالی کرتا اور باریک کنارے کی دھوتی پہنے۔ ہندی سماج لاہور کے جلسوں میں ان کی نظمیں بھی سنی تھیں لیکن یہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ چند خطوں ہی کا تعارف تھا۔ دوکان کی چق اٹھا کر میں اندر داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ پاٹ میٹ اور کھلے گلے کی قمیص پہنے بیٹھے ہیں۔ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ نصف سر کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ قمیص کے کف میں تین تین اسٹڈ ہیں اور پینٹ کی پیٹی میں زنجیر لٹک رہی ہے۔ اپنی حیرت کو چھپا کر میں نے نمسکار کیا۔ میرے نمسکار کا جواب دیئے بغیر بولے "آؤ!" میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "یہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ گھر میں پتا جی آئے ہوئے ہیں اور بچے ہوئے ہیں۔ چلو بیدی کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتی آپ نے باہر نکل کر تانگے والے کو آواز دی اور اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

بیدی کا نام میں نے سن رکھا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ کسی ڈاکٹر کے یہاں جا رہے ہیں ——— ڈاکٹر بیدی ——— اور میرے تخیل میں جدید طرز پر سجا ہوا ایک ڈرائنگ روم آ گیا۔ لیکن جب تانگہ اسپتال کے سامنے سے ہو کر ریس نگر کے باہر کی سڑک پر چلتے ہوئے تانگہ ایک کیچڑ بھری گلی کے سامنے جا کر رکا اور دکانوں کے پیچھے سے گزرتے ہوئے بدبو سے دماغ پھٹنا گیا۔ اس وقت تک ریس نگر میں نالیاں نہ بنی تھیں اور دکانوں کا گندا پانی ان کے آگے بہتا رہتا تھا جو بدبو پیدا کرتا تھا تو میرا ماتھا ٹھنکا لیکن تانگہ سے اتر کر میں چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ نہ جدید تھا نہ میرے تصور کے مطابق سجا ہوا تھا اور نہ بیدی ہی ڈاکٹر تھے۔ کمرہ چھوٹا سا تھا اس میں ایک پلنگ بھی بچھا تھا۔ ایک بڑی میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں اور ایک چوکی پر بیدی کو کہ اشک جی نے جس شخص سے ہاتھ ملایا وہ منجھلے قد کا ایک سیدھا سادا سکھ نوجوان تھا۔ بنیان اور لنگی باندھے ہوئے۔

کمرے میں ایک نفیس سوٹ میں ملبوس ایک دبلا سا سکھ نوجوان بھی بیٹھا تھا۔ اشک جی اسے جانتے تھے یا نہیں یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن اس پر ایک اڑتی سی نگاہ ڈال کر بیدی اپنے دوست کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر صحن میں لے گئے اور اس سے بولے "بھائی اپنے اس دوست کو جلدی چلتا کرو خواہ تمہیں کتنا بھی عزیز ہو۔" اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ان کو ذرا سے بٹھاؤ اور مجھے کوئی پاجامہ لا دو تاکہ لنگی کی قید سے نجات حاصل کروں۔"

وہ اپنے دوست کو رخصت کرنے چلے گئے اور بیدی اندر سے ڈرا سہما اور سوکھا ہوا ایک پاجامہ لے کر مجھ سے "میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔

میں حیرت زدہ تھی بیدی صاحب کے ساتھ کیونکہ یہ بیدی اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ کوئی دوسرے نہ تھے پھر آپ اندر اسی کمرے میں آئے اور کرسی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اس پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

کچھ عقیدت کے مارے اور کچھ اس لئے کہ میں اتنی دور سے اشک جی سے ملاقات کرنے آئی تھی میں ان سب باتوں کے باوجود جو میرے نزدیک نہایت غیر مہذبانہ تھیں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ یہ جان کر کہ الفاظ سے کھیلنے والے یہ لوگ ہمارا ہی رہیں میں نے اس وقت تک اشک جی کی کوئی کہانی ہی پڑھی تھی اور پڑھی تھیں، ان کے افسانوں سے میں روشناس نہ تھی، یا کبھی اس انہماک سے کھیل سکتے ہیں کہ آنکھیں پھوڑ ڈالیں، مجھے حیرت ہوئی تھی اور اگر میں ان کی اس قریب قریب غیر مہذب بے تکلفی کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی تھی لیکن اس عجیب پھکڑپن کے باعث انہیں کچھ اور جاننے کا تجسس بھی

میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔

مجھے بیدی صاحب کی وہ بے بسی کبھی نہ بھولے گی۔ میں نے بعد میں انہیں نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس بھی دیکھا ہے اور جدید ڈھنگ سے سجے ہوئے ماڈل ٹاؤن کے بنگلے میں بھی۔ لیکن اپنے ملنے والوں کے معاملے میں میں نے انہیں اتنا ہی مہذب اور پر اخلاق پایا ہے۔ اشک جی کبھی کبھی بہت روکھے ہو جاتے ہیں لیکن بیدی صاحب کو میں نے کبھی خواندہ یا ناخواندہ مہمان سے روکھا سلوک کرتے نہیں دیکھا۔

مجھے بٹھا کر بیدی صاحب (اپنے ملاقاتی کو چلتا کرنے کی بجائے) مٹھائی کی طشتری اور سوڈے کا گلاس اندر سے لے آئے اور اسے ان بزرگ صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولے "لیجئے ڈاکٹر صاحب! اتنی دیر سے آپ بیٹھے ہیں، کچھ کھا لیجئے نا۔"

ڈاکٹر صاحب (جو بعد میں معلوم ہوا کہ کسی ڈاکٹر بنانے والی کمپنی سے ہومیو پیتھی کی ڈگری لئے ہوئے تھے) غالباً اپنے روحانی کارنامے سنا رہے تھے۔ اگرچہ بیدی صاحب نے "اتنی دیر" کہتے ہوئے ان الفاظ پر زور دیا تھا لیکن اس لطیف اشارے کو وہ کیا سمجھتے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے تپائی کو اپنی طرف کھینچ کر اس کے نیچے گھٹنے ٹکا دیئے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالنے لگے۔

بیدی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ اپنی کرسی پر بیٹھے وہ پہلو بدلنے لگے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنے دوست کو کبھی نہ ٹال سکتے لیکن اشک جی نے کپڑے بدل کر آنگن [illegible] "اب اپنی کانفرنس ختم کر دو یار، کچھ وقت ہمارے لئے بھی رہنے دو۔"

کوئی احمق ہی ہوگا جو اتنا سیدھا اشارہ نہ سمجھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب اچانک [illegible] اٹھے اور بیدی صاحب سے معافی مانگ کر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اشک جی نے آ کر مختصراً بیدی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ بیدی صاحب [illegible] اور اشک جی [illegible] پڑھتے ہوئے [illegible] گئے۔

وہیں لیٹے لیٹے انہوں نے [illegible] سے جو بات شروع کی [illegible] اپنی زندگی کی [illegible] باتیں کہہ گئے۔

[illegible] سے بے تکلف اور [illegible] دوست [illegible] دوسری [illegible] ہے۔ یوں تو اشک جی دونوں ہی [illegible] سے [illegible] کبھی ان کی [illegible] لیکن جنہیں وہ اپنا دشمن سمجھ لیں (کوئی ان کی توہین کر دے یا [illegible]) [illegible] ملنے [illegible] اپنا [illegible] ہیں [illegible] اور دس برس [illegible] بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہ بات [illegible] کردار کی اس [illegible] سے [illegible] بات چل پڑے تو اشک جی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں [illegible] اور ہمیشہ [illegible] اس عادت سے [illegible] کوشش کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایسے ماحول میں [illegible] کبھی کبھی [illegible] کوئی ان کی توہین کر دیتا ہے تو یہ پیدائشی جذبہ سے مجبور ہو کر [illegible] فلسفہ [illegible] اس توہین کا انتقام لینے کے [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] اس توہین کو بھول جاتے ہیں اور نہ اس وقت تک سکون پاتے ہیں جب تک اس کا بدلہ [illegible]

ان کی [illegible] کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے دھوکہ کھا کر یا [illegible] کی وجہ سے [illegible] دل میں کڑھتے اور [illegible] اس [illegible] کا بدلہ لینے کی سکیمیں سوچتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی اس حرکت پر اظہار افسوس کر دیتا ہے بس یہ سب کچھ بھول کر اس کے گن گانے لگتے ہیں۔

ابھی تین چار برس پہلے ان کے ایک دوست نے [illegible] ان کے بڑے بھائی [illegible] اشک جی [illegible] آنے پر میرا بھائی رہتا تھا اسے کرسی کر دے دیا بلکہ وہاں میرے بھائی کا جو سامان تھا وہ بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اشک جی نے سنا تو بڑے تلملائے لیکن جس کر اس نے

مکان دبا وہ بھی ادیب دوست تھے انہوں نے ٹھیک بات جانتے ہی لکھ کر افسوس ظاہر کیا۔ تب نہ صرف اشک جی نے مکان واپس لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ مالک مکان کو لکھ کر حتی الامکان انہیں وہاں جانے کی سعی کی۔ لیکن جس دوست نے دھوکہ دیا تھا اس سے انتقام لینے کا عہد کئے رہے۔

پچھلے دنوں جب ڈاکٹروں سے صلاح مشورہ کرنے بمبئی گئے تو کہیں وہ بھی بمبئی ہی میں تھا۔ اسے ان کے وہاں ہونے کا پتہ چلا تو ملنے چلا آیا۔ نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن وہ معافی مانگ گیا۔ واپس آئے تو بولے "شاید . . . پیچ گنی آئے!"

میں حیرت زدہ سی ان کا منہ تکنے لگی۔

تب بتانے لگے کہ کیسے وہ ملا۔ کیسے مسز بیدی کے ساتھ ملاڈ ان سے ملنے آیا، کیسے بحث ہوئی اور کیسے انہوں نے اسے لاجواب کر دیا۔ کیسے پاکستان میں اس کا بڑا نقصان ہوا ہے اور کیسے اس نے اپنے کردار پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

جب اس صفائی پر بھی میرے چہرے سے حیرت اور غصے کے آثار نہ مٹے تو بولے "جب اس نے معافی مانگ لی تو کیا میں اسے پھانسی پر لٹکا دیتا۔ بمبئی میں گرمی ہے، حال اس کا آج کل پتلا ہے۔ لاکھ برا سہی مگر آدمی دلچسپ ہے۔ میں نے اسے پیچ گنی آنے کے لئے کہہ دیا۔ اب ہٹاؤ اس قصے کو۔"

اور یہ کہہ کر بے پروائی سے سر کو جھٹکا دے کر اپنے کام میں محو ہو گئے۔

اشک جی اپنے کپڑوں کے سلسلے میں بڑے بے پروا ہیں۔ لوگوں نے انہیں ہر طرح کا لباس پہنے دیکھا ہو گا لیکن سوٹ بوٹ، اچکن ٹوپی قمیص شلوار، دھوتی کرتا وغیرہ ہر فیشن کے کپڑے پہننے کے باوجود انہیں تہ بند پہنے ننگے بدن رہنا بڑا پسند ہے۔ پہلے پہل یہ سوٹ وغیرہ بھی پہنتے تھے جب انہیں سرکاری دفتر میں کسی سے ملنے جانا ہوتا ورنہ سارا دن گھر میں ننگے بدن تہ بند اور کبھی کبھی محض کچھا پہنے بیٹھے رہتے (قمیص یا کرتا قریب ہی رکھتے، کوئی آتا تو جھٹ پہن لیتے) پھر جب خود سرکاری دفتر میں نوکر ہوئے تو اگرچہ ہمیشہ پینٹ وغیرہ کسے رہنا پڑا لیکن تہ بند سے ان کا موہ نہیں گیا۔ جب بھی گھر میں ہوتے تہ بند پہنتے۔

دلی میں یہ آل انڈیا ریڈیو میں نئے نئے ملازم ہوئے تھے، گرمی کا موسم تھا لیکن شامیں نسبتاً ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ ایک شام کھانا کھانے کے بعد بولے: "چلو ذرا سیر کی جائے۔"

اپنی عادت کے مطابق صرف تہ بند پہنے ہوئے تھے۔ مجھے تو بڑی بدتمیزی معلوم ہوتی تھی لیکن نئی نئی تھی زیادہ زور نہ دیتی تھی۔ آہستہ سے میں نے کہا "کپڑے تو بدل لیجئے!"

کہنے لگے "پھر سیر کا مزا کیا خاک آئے گا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ننگے بدن گھومنے کا جو لطف ہے وہ کپڑے ٹھونس کر جانے میں کہاں؟"

"میں تو نہیں جا سکتی۔"

بولے "اس وقت سڑک پر کون ہو گا؟"

"تو بھی" میں نے کہا "میں تو نہ جاؤں گی۔"

"تو میں ہو آتا ہوں، مہندر کو لے لوں گا۔"

مہندر، اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں اور خود بھی خوب لکھتے ہیں۔ ہمارے ان کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ مہندر بھائی کو ساتھ لے کر یہ ننگے بدن، صرف تہ بند پہنے، اس کی دائیں کور کو جالندھریوں کے خاص انداز میں اٹھائے۔ چلے جا رہے تھے کہ نظامی صاحب جو آل انڈیا ریڈیو میں شعبۂ موسیقی کے انچارج تھے اور خود بھی بہت اچھے موسیقار تھے، آتے دکھائی دئے۔ ہُول دہ رڈ روڈ پر بجلی کی روشنی تو ہے، لیکن

دونوں طرف نیم کے گھنے پیڑوں کے باعث وہاں اندھیرا سا رہتا ہے۔ سرِ شام وہاں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اس وقت تو نو، ساڑھے نو کا وقت تھا، سڑک سونی تھی اور نظامی صاحب آسمان کی طرف منہ کئے کوئی دھن بناتے اور گنگناتے چلے آ رہے تھے۔

بڑھ کر اشک جی نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارا "کیوں بھئی کدھر؟"

نظامی صاحب کا خیال اپنی دُھن میں تھا۔ سڑک پر خاصی تاریکی تھی۔ چند دن پہلے اس مقام کے نزدیک ہی ایک ریڈیو انجینئر پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ اشک جی کو اس عالم میں دیکھ کر وہ فوراً پہچان نہ سکے۔ ان کا رنگ فق ہو گیا اور لحظہ بھر کے لئے وہ ان کو ٹکر ٹکر تکتے رہے۔ پھر جب اشک جی نے اپنا فلک شگاف قہقہہ لگایا اور مہندر بھائی نے بڑھ کر انہیں آداب عرض" کیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ حیرت سے انہوں نے پوچھا "کیا بات ہے ایسے کیوں گھوم رہے ہو؟"

اشک جی کو اس میں حیرت کی کوئی بات نہ دکھائی دیتی تھی۔ جو شخص بی۔ اے تک لنگوٹ لگائے جسم پر تیل کی مالش کئے جالندھر کے بھرے بازاروں میں بھاگتا پھرتا رہا ہو، جسے کسی نے ٹوکا نہ ہو، اور جو اس بات کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتا ہو، اسے دلّی کی نسبتاً سونی سڑک پر لنگوٹ نہیں، تہ بند لگائے گھومنے میں کیا برائی نظر آ سکتی" تم بھی نرے گھونچو آرٹسٹ ہو" کہتے ہوئے اشک جی نے ان سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئے۔

ادھر کچھ برسوں سے اشک جی نے تہ بند نہیں پہنا اور متواتر نوکری کرنے کی وجہ سے اپنے قول کے مطابق زیادہ وقت کپڑوں کے قید خانے میں بند رہے ہیں لیکن نہ ابھی تہ بند کا موہ چھوٹا ہے نہ ننگے بدن بیٹھنے کا۔ بمبئی میں جب جب گھر پر کام کرتے رہے ہیں، اپنی پرانی عادت کے مطابق ہمیشہ دھوتی یا ہمیشہ انڈرویئر (under wear) میں کام کرتے رہے ہیں۔ یوں بھی کپڑوں کے معاملہ میں کچھ عجیب طرح کی بے نیازی ان کے مزاج میں ہے۔ اکیلے تھے تو جو بھی کپڑا باہر ہوا یا ٹرنک کے اوپر ہوا وہی پہن لیتے تھے۔ میں آئی تو جو بھی میں نکال دیتی وہی پہن لیتے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی جی سے پہنتے ہیں تو تب نفاست پسندی کی حد کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل مجھے یہ بے نیازی اور نیاز بڑا عجیب سا لگتا تھا لیکن اب میں ان کے مزاج کی اس انتہا پسندی کی عادی ہو گئی ہوں۔

دلّی ہی کی بات ہے۔ یہ دیکھ کر کہ پاس میں پیسے ہوتے ہوئے بھی یہ بڑے بھدے کپڑے پہنتے ہیں (سبب کچھ بھی ہو) جب میں آئی تو آل انڈیا ریڈیو کی نوکری کے باوجود گرمیوں کے لئے ان کے پاس صرف تین پتلون اور تین قمیص تھیں —— نوکر دھو کر لا کر لاتا اور یہ بدل کر چلے جاتے تھے اور سردیوں کے لئے محض ایک ذلیل سا سوٹ تھا) میں نے آتے ہی ان کے نہ، نہ کرنے پر بھی دو بڑھیا گرم سوٹ سلوائے۔ ایک دن جب میں نے نیا سوٹ پہننے کو نکالا تو ٹائی حسب پسند نہ ہونے کے باعث چھوڑ دیا۔ میں اسی شام کچھ بہت اچھی ٹائیاں لے آئی۔ کسرت کرتے، حجامت بناتے اور غسل لیتے ہوئے انہیں کچھ دیر ہو گئی تو جھلانے لگے۔ جلدی میں کبھی یہ قمیص پہنتے کبھی وہ۔ آخر جب سوٹ سے جچتی ہوئی قمیص پہنی تو ٹائی پر کافی دیر اٹکے۔ بوٹ پر پالش کیا گیا۔ آخر جب پوری طرح اطمینان ہو گیا تو ناشتے کا وقت نہ رہا۔ کسی نہ کسی طرح زور دینے پر ناشتہ کر کے بھاگے۔ ان کے جانے پر میں حیرت زدہ سی کھڑی سوچنے لگی کہ کہاں تو اتنی بے پروائی کہ کیا پہنتے ہیں کیا نہیں پہنتے، اس کا ہوش نہیں اور کہاں اتنی نفاست پسندی کہ کالج کے چھوکرے بھی مات کھا جائیں۔ کام کرتے ہوئے میں متواتر یہی سوچتی رہی۔

ان کو گئے پانچ چھ منٹ گذر گئے تھے اور میں منا رہی تھی کہ میٹنگ کے وقت پر پہنچ جائیں تاکہ اس دیر کا غصہ مجھ پر نہ اترے جبھی برآمدے میں پھر ان کے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ میں میز کی طرف بھاگی کہ کوئی فائل رہ گئی ہو تو دیکھ کر جلدی سے دے دوں۔ دوسرے لحظہ آپ داخل ہوئے اور سیدھے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا رہ گیا؟"

بولے "کچھ نہیں۔"

جا کر دیکھتی ہوں تو آئینہ کے سامنے کھڑے وینشنگ کریم مل رہے ہیں۔

ان کی ماتا جی سے ایک بار بات چلی تو کہنے لگیں: "لڑکپن ہی سے اس کی ایسی عادت ہے، نہیں پہنتا تو نہیں پہنتا، پہنتا ہے تو نواب زادوں کو مات کرتا ہے۔ ایک بار سریندر (بڑے بھائی) کی شادی پر بڑھیا سلک کا ایک کوٹ سلوایا۔ درزی نے اوپر کی جیب کہیں زیادہ ٹیڑھی کر دی مجھے تو اس میں کوئی نقص نہ لگتا تھا مگر اس نے وہ ایک بار پہن کر دیکھا اور پھر نہیں پہنا۔"

ان دنوں اشک جی آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔

ان کے اس دوہری مزاج کا ایک اور ثبوت مجھے انہی دنوں کچھ ملا۔ دلّی ہی کی بات ہے۔ میں نے اندر پرستھ گرلز ہائی سکول میں نوکری کر لی تھی لڑکیوں کے امتحان ہو چکے تھے اور پیپروں کا ڈھیر کا ڈھیر آیا پڑا تھا۔ انہی دنوں نوکر بھاگ گیا۔ کسی طرح رات کا کھانا پکا کر، برتن اور کپڑے وغیرہ اسی طرح چھوڑ کر میں پیپر دیکھنے لگی اور رات کے دو بجے تک دیکھتی رہی۔ یوں بھی میں صبح دیر سے اٹھنے کی عادی ہوں۔ اس دن کچھ اور دیر ہو گئی۔ اٹھتے ہی پہلی نظر جس چیز پر پڑی وہ رسّی پر سوکھنے کے لئے ڈالے ہوئے دُھلے دھلائے کپڑے تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ کس نے دھوئے۔ سوچا شاید علی الصبح کوئی نوکر مل گیا ہے۔ خوشی خوشی سے بھاگی اندر گئی تو دیکھا اوپر نہانے میں باپ بیٹا (اشک جی کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا ہے) بیٹھے برتن مل رہے ہیں اور اشک جی اپنے لڑکے کو برتن ملنے کے فن میں مشاق بنا رہے ہیں۔

میں کھسیانی سی چوکھٹ میں کھڑی رہ گئی۔ پھر جھینپ کر میں نے کہا، "بیٹھئے یہ کیا کر رہے ہیں، کیا میں مر گئی ہوں جو برتن ملنے آ بیٹھے ہیں۔"

کہنے لگے "مرنے کا نام نہ لو۔ چھوٹی بہو! اب تمہارا ہاتھ بٹانے کی؟"

میں نے کہا "جتنا تمہیں یہ مذاق مجھے پسند نہیں۔"

لیکن انہوں نے مجھے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کہنے لگے "میرے ہاتھ تو تھکے ہوئے نہیں، تم کیوں فضول میں اپنا حساب کرتی ہو۔ تم سے بڑے نہیں ملوں گا۔ اس بات کا یقین رکھو۔ کئی ایسے دنوں میں بیسوں برتن ملے ہیں۔ جاؤ جلد تیار ہو جاؤ۔ سکول پہنچنے میں نہیں دیر ہو جائے گی۔"

مجبور ہو کر مجھے ہٹنا پڑا۔ خوش قسمتی سے اسی دن نوکر مل گیا، نہیں تو جانے یہ کتنی دیر تک گندگی بنے رہتے۔

لیکن اس واقعہ کے چند دن بعد کا ذکر ہے۔ اتوار تھا۔ میں باہر صحن میں بیٹھی پیپر دیکھنے میں محو تھی اور اشک جی اندر کچھ لکھ رہے تھے کہ مجھے آواز پڑی۔ مجھے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی کہ پھر آواز آئی۔ پیپر چھوڑ کر میں بھاگی۔ بولے "ذرا وہ ڈکشنری دینا۔"

ڈکشنری دو فٹ کے فاصلے پر ریک میں پڑی تھی۔ بس سامنے دو دن پہلے کپڑے دھونے اور برتن ملنے کا واقعہ گھوم گیا۔ ڈکشنری دیتے ہوئے سوچنے لگی کہ جو آدمی ایسی تن آسانی اور آرام طلبی کا مالک ہو سکتا ہے کہ دو قدم اٹھ کر چیز اٹھانے کی بجائے دوسرے کو بلائے وہ کپڑے دھونے اور برتن ملنے جیسا مشکل کام کیسے کر سکتا ہے۔

لیکن یہی اتار چڑھاؤ اور انتہا پسندی اشک جی کے مزاج کا اکہرا پن ہے۔ ان کا یہ بھاؤ ایسے سکون پسند آدمی کا سا نہیں جو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر وہیں ڈیرا ڈال دے، بلکہ ایسا جیسا راہی ہے جس کو کبھی پہاڑوں کی چوٹیاں اچھی لگتی ہیں کبھی گہری گھاٹیاں، جو کبھی گنجان شہروں کو پسند کرتا ہے کبھی سنسان ویرانوں کو۔ سچ کبھی یہ انتہا مرغوب ہے کبھی وہ۔ کوئی ایک حد یا میانہ روی جسے پسند نہیں۔ بچپن ہی سے اشک جی کی زندگی حوادث سے پُر رہی ہے انہوں نے نہایت کڑوے جام بھی پئے ہیں اور رسیلے میٹھے بھی، فراوانی بھی دیکھی ہے اور فقدان بھی۔ بے انتہا محبت بھی پائی ہے اور بے پناہ نفرت بھی اور نہ جانے کن کن ایسی سنسنی کا روپ ماں باپ کی کن دوریوں اور خامیوں اور کن دوسری جسمانی و دماغی، معاشرتی اور اقتصادی پیچیدگیوں کے باعث ان کا سبھاؤ

ایک دوسری کے برعکس حدوں میں گھڑی کے پنڈولم کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ قہقہے مارتے ہیں تو چھت پھٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی جب کسی عزیز کی طرف سے ٹھیس پہنچنے پر رو پڑتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کیونکر انہیں تسکین دی جائے۔ ایک لمحہ میں اتنے کمزور کہ بے ساختہ رحم آ جائے۔ دوسرے لمحہ اتنے مضبوط کہ پہاڑ سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہو جائیں۔ لباس ایسے کہ کیا پہنتے ہیں اس کا دھیان نہیں، کیا کہتے ہیں اس کی پروا نہیں۔ لیکن دوسرے موقع پر اتنے نفاست پسند کہ لباس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا خیال رکھنے والے اور اتنے مہذب کہ منہ سے ہر لفظ جانچ تول کر نکالنے والے، کبھی اتنے فراخ دل کہ بڑی سے بڑی بات کو خاطر میں نہ لائیں اور کبھی اتنے تنگدل کہ چھوٹی سی بات پر راتوں کی نیند حرام کر لیں اور جب تک اس کا انتقام نہ لے لیں چین نہ پائیں۔ کبھی ایسے کنجوس کہ تکلیف سہہ کر پیسہ پیسہ جوڑیں اور کبھی ایسے فضول خرچ کہ اپنی مصیبت سے جمع کی ہوئی رقم لحظہ بھر میں خرچ کر دیں کبھی ڈھلمل یقینی کے ایسے شکار کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی تباہ کر دیں اور کبھی ارادے کے ایسے پکے کہ دو ٹوک فیصلہ کر کے اس سے انچ بھر بھی نہ ہٹیں کبھی بے حد سنگدل کبھی موم کی طرح پگھل جانے والے، کبھی اتنے شاطر کہ بڑے سے بڑے چالاک سے دھوکہ نہ کھائیں اور کبھی ایسے سادہ لوح کہ عام آدمی بھی ٹھگ کر چلا جائے۔ انہی انتہاؤں کو لے کر انشا جی کے اس تفاوت بھرے مزاج کے سلسلے میں ایسے دلچسپ واقعات ہیں کہ چھوٹے سے مضمون میں ان پر پوری روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

لیکن جس طرح کوئی عام اصول استثنا سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح انشا جی کا مختلف انتہاؤں پر چلنے والا سبھاؤ بھی مستثنیات سے خالی نہیں۔ میں نے پچھلے چھ برس میں ان کی طبیعت کے ایسے پہلو بھی دیکھے ہیں جن کی صرف ایک ہی انتہا ہے۔ اس کے مخالف دوسری حد نہیں۔

ان کے لکھنے ہی کو لیجئے۔ لکھنا ان کا شوق سا ہے اور یہ شوق انتہا ہی کا دیوانہ آتا ہے۔ بارہا ادیبوں کے اپنے تجزیے اور تجربات ہوتے ہیں کبھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی تخیل باڑھ پر آئی ہوئی ندی کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار کاغذ پر اتارتی جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت بھی آتا ہے جب تخیل کی باڑھ اتر جاتی ہے اور ان کا دماغ اترے ہوئے سمندر کے پیچھے رہ جانے والے سنسان ساحل کا سا ہو جاتا ہے۔ وہ مہینوں، مہینوں اور بارہا برسوں کچھ نہیں لکھ پاتے۔ انشا جی کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ لکھتے ہیں۔ ہر موسم، ہر زمانے میں متواتر بہنے والی دریا کی طرح ان کی تخلیق ہمیشہ ہری رہتی ہے۔ بیمار بھی ہوں یا بیکسی ہو، نوکر ہوں یا بیکار، اکیلے ہوں یا دوسروں میں، ہمیشہ لکھنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ان کے دوست ان کی اس عادت کو سنک کا نام دیتے ہیں۔ جیسے بھی سنک ہو لیکن ان کی یہ سنک ایک ہی انتہا پر قائم رہتی ہے۔ اس کی دوسری انتہا یعنی سستی یا بے حسی میں نے ان کے ہاں کبھی نہیں دیکھی۔ لکھے بغیر یہ رہ ہی نہیں پاتے۔ انھیں ایک برس پہلے جب ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دیتے ہوئے ہدایت کی کہ انہیں پورا آرام لینا چاہئے تو میں سمجھتی تھی کہ اب یہ کچھ دن چین لے سکیں گے۔ میں نے انہیں الگ کمرے میں لٹا دیا اور دروازہ لگا دیا کہ نہ کوئی ہوگا نہ بات کریں گے۔ انہوں نے نہ لکھا نہ پڑھا نہ باہر کہیں لیکن لیٹے لیٹے یادداشت سے دیپک جلے کے نام سے ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔ ایک مہینے بعد انہیں ذرا کچھ آرام آیا اور چار مہینے تک انہیں کام کرنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ دنوں بیٹھے بیٹھے ایک دوسری طویل نظم لکھتے رہے۔

عام طور پر انشا جی اپنے ناطے رشتہ داروں سے اسی حد تک محبت کرتے ہیں جس حد تک یہ ان سے پاتے ہیں۔ لیکن بڑے بھائی، ماں اور سب سے چھوٹا بھائی اس سے مستثنےٰ ہیں۔ ماں اور بڑے بھائی خواہ ان سے کیسا بھی سلوک کیوں نہ کریں، خواہ کتنی بھی ٹھیس کیوں نہ پہنچا دیں یہ ان کی رکھائی اور بے اعتنائی کا جواب ہمیشہ ادب اور محبت میں دیتے ہیں۔ ان کے برے سلوک سے رنجیدہ خاطر نہ ہوتے ہوں، یہ بات نہیں کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا واقعہ ان کی راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ یہ ان کی بدسلوکی پر جلتے کڑھتے رہتے ہیں، لیکن جب ان سے ملتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں اور ان کے دکھ سے دکھی اور ان کی مسرت سے خوش ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح دوستوں کے سلسلے میں بھی ان کی محبت ایک ہی انتہا پر رہتی ہے۔ انشا جی کا قول ہے کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں پیار کرتے ہیں،

جس کی دوستی کے خواہشمند ہیں اس کی خامیوں کو دیکھنا بے معنی ہے۔ اس کی دوستی میں جو مسرت ہمیں حاصل ہوتی ہے اسی پر ہماری نظر رہنی چاہیئے دوستی یکطرفی سی چیز ہے۔ جسے ہم چاہتے ہیں اسے دوست بنائے رکھنے کے لئے اس کی چھوٹی موٹی باتوں پر توجہ نہ دے کر ہمیشہ محبت دیتے رہنا چاہیئے انتقام کی تو بات ہی وہاں نہیں اٹھتی اور میں نے دیکھا ہے کہ اپنے عزیزترین دوستوں کے سلسلے میں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے) اشک جی ہمیشہ اپنے اس قول پر عمل کرتے ہیں۔

اشک جی کی ایک اور سنک تھی جس کی دوسری مخالف انتہا مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ تھی باقاعدہ صبح اٹھ کر ورزش کرنا۔ شادی کے بعد جب میں نئی نئی دلّی آئی تو میں نے دیکھا کہ صبح اٹھ کر لنگوٹ لگائے تیل کی مالش کر کے ڈنٹر بیٹھک نکالتے اور فری ہینڈ کسرت کرتے، بیدی صاحب ان دنوں دلّی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کبھی اشک جی کو فری ہینڈ کسرت کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس اچھل کود کو دیکھ کر انہوں نے اشک جی کو "ہنومان" کے خطاب سے سرفراز کر دیا اور جتنے دن وہ رہے صبح صبح اشک جی کی کسرت ایک فلک شگاف قہقہے سے شروع ہوتی رہی لیکن دُھن کے یہ ایسے پکے ہیں کہ کسی مذاق یا پھبتی کو سن کر اپنی دُھن نہیں چھوڑتے۔ اس لئے "ہنومان" کہلائے جانے کے باوجود بلا ناغہ ورزش کرتے رہے۔
مجھے پیچش کی پرانی شکایت ہے۔ دورہ پڑتا ہے تو نڈھال ہو جاتی ہوں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "تم ورزش نہیں کرتیں اسی لئے تمہاری آنتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ پرانے خیالات کی ہندوستانی عورتیں گھر کے کام کاج کی صورت میں اور مغربی عورتیں ناچ گانے کی صورت میں کافی کسرت کرتی ہیں اور تندرست رہتی ہیں۔" ان سب کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ورزش کی اہمیت پر چھوٹی موٹی تقریر کر ڈالی۔ سانس روک کر، سینہ پھلا کر مجھے بتانے لگے ——— کس طرح کسرت کرنے سے کمر پتلی ہو جاتی ہے، سینہ چوڑا ہو جاتا ہے اور جسم کی ایک الٹی تکون سی بن جاتی ہے۔ مجھے انہوں نے صلاح دی کہ اگر میں فری ہینڈ ورزش نہیں کر سکتی تو کم سے کم سانس روک کر سینہ پھلا کر رسّی ہی پھاندا کروں۔

ورزش کی اہمیت پر انہوں نے مجھے اتنے لکچر دئے اور بیدی صاحب کے قول کے مطابق ہنومان کی طرح کود پھاند کر اتنی طرح کی ورزشیں بتائیں کہ میں بھی ورزش کے ذریعے اپنی بیماری دور کرنے اور کمر پتلی بنانے کی کوشش کر دیکھنے کو تیار ہو گئی (یہاں میں یہ بتا دوں کہ نہ اشک جی موٹے ہیں اور نہ میں، لیکن ان کی کمر تو سانس روکنے اور سینہ پھلانے پر الٹی تکون کے نچلے زاویے کی سی بن جاتی تھی اور میری غالباً نہ بنتی تھی) کچھ دنوں تک میں نے بھی کود پھاند کی لیکن ایک تو مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں اور پھر کسرت کرنا مجھے نہایت خشک اور اکتا دینے والا کام معلوم ہوتا ہے۔ پھر میری آنتوں کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ کچھ ہی دن بعد میں نے ہتھیار ڈال دئے اور نہایت عاجزی سے کہا کہ کمر کی تکون آپ ہی کو مبارک ہو۔ مجھے کسی خوبصورتی کے مقابلہ میں تو بیٹھنا نہیں۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔

اشک جی نے پھر مجھے مجبور نہیں کیا۔ لیکن خود متواتر اچھل کود کرتے رہے۔ وقت ہوتا تو مالش بھی کرتے ورنہ ڈنٹر بیٹھکیں خواہ چھوڑ دیں — فری ہینڈ کسرت ضرور کر لیتے۔ کئی بار میں ناشتہ نہ رکھ دیتی۔ یہ قریب قریب ناشتے پر بیٹھ جاتے، لیکن پھر کسرت کرنے کا خیال آ جاتا اور "بس چند منٹ کے لئے معاف کرو" کہہ کر بھاگ جاتے اور پیٹ دبا، سینہ پھلا، جسم کی تکون بنا کر اچھل کود کرنے لگتے۔ آکر اپنے ضبط اور باقاعدگی کی داد چاہتے کبھی کبھی آئینہ دیکھتے تو افسوس ہوتا کہ اتنی باقاعدگی سے ورزش کرنے کے باوجود گلتے پچکے جا رہے ہیں۔ تب بازو کو دوہرا کر ابھرے ہوئے پٹھے کی سختی دیکھ کر مطمئن ہو جاتے کہ چربی خواہ نہیں بڑھی لیکن ورزش کرنے سے پٹھوں میں لوہے کی سی مضبوطی آگئی ہے۔

میں جب سے آئی ہوں میں نے انہیں باقاعدگی سے بلا ناغہ ورزش کرتے دیکھا ہے لیکن اتنی ورزش کے باوجود انہیں آنتوں میں تکلیف رہنے لگی۔ اپنی سنک میں انہوں نے ورزش کی مقدار کچھ اور بڑھا دی اور کسی شریف آدمی کے کہنے پر ابلی ہوئی ترکاریاں کھانا شروع کر دیں۔ اپنی عادت کے مطابق اس بات کو بھی انتہا تک لے گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے سوا سال سے بیمار پڑے ہیں۔ وقت پر پتہ چل گیا کہ بیماری معدہ میں نہیں پھیپھڑے میں ہے، ورنہ نہ جانے کیا ہوتا ——— جب علی الصباح اٹھ کر اور سانس روک کر جسم کی تکون بنایا کرتے تھے اس وقت ضرورت

اس بات کی تھی کہ بستر پر کچھ دیر اور لیٹ کر آرام کرتے اور ابلی ہوئی ترکاریوں کی بجائے طاقت ور غذا کھاتے۔ یہ سب معلوم ہونے پر اشک جی ایک فلک شگاف قہقہہ لگانا چاہتے ہیں لیکن اب اس کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس سے پھیپھڑے کو نقصان پہنچتا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ بیمار نہ پڑتے تو ان کی یہ سنک ہمیشہ رہتی۔ اس کی دوسری مخالف انتہا پر چلنا — یعنی مکمل آرام لینا ان کے لئے کبھی ممکن نہ ہوتا۔

آپ دق سے بیمار ہو کر ڈیڑھ برس پنج گنی کے سینی ٹوریم میں گذار کر الہ آباد آگئے ہیں۔ دل و دماغ آٹھوں پہر مصروف رہتے ہیں لیکن جسم سے آرام لینے کو مجبور ہیں۔ دق کی اس مجبوری نے انہیں تھوڑا بہت فلسفی بنا دیا ہے اور ان کی طبیعت اپنی انتہا پسندی چھوڑ کر میانہ روی سیکھ رہی ہے لیکن وہ میانہ روی سیکھ پائے گی اور مکمل طور پر صحت مند ہونے پر وہ سیکھ قائم رہے گی۔ اس میں کم سے کم مجھے شک ہے۔

———

حفیظ ہوشیارپوری

ناصر کاظمی

سن ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ خاصی سردیاں تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک انٹرکالجیئیٹ مشاعرہ تھا۔ رنگ رنگ کے طالب علم وہاں موجود تھے بعض جانے پہچانے مقامی و غیر مقامی شاعر بھی تھے۔ سامعین اور ارباب ذوق سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تاجور نجیب آبادی حسب معمول کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ ہی سٹیج پہ یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بیٹھی تھی۔ گہرا سانولا رنگ، پچکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، روئی برف سے بال، اکہرا جسم، چھوٹی چھوٹی کنچوں سی آنکھیں کرسی پر ستے اچھلتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آ کر اپنا کلام سناتا۔ صاحب صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں میں لگے رہتے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ شاعروں کو داد ملی طلبہ کو انعام ملے۔ پہلا انعام جسے ملا اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دوسرا انعام اعجاز بٹالوی کو ملا۔ میں عبدالمجید بھٹی کے ساتھ ساتھ ہوٹل میں آ گیا۔ پھر وہاں کچھ اور لوگ جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے حفیظ ہوشیارپوری سے تعارف کرایا۔ میں دنگ رہ گیا۔ خیر یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔

حفیظ نے کوئی ڈیڑھ درجن غزلیں سنائی ہوں گی۔ تاثیر صاحب نے آدھا دیوان غالب سنا دیا۔ ہاں یاد آیا اُن میں کچھ اُن کے اپنے شعر بھی تھے۔ ایک غزل داغ کے رنگ میں تھی باقی رنگ غالب۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور پھر دیکھا۔ میں نے بھی انہیں معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے دو ایک غزلیں سنائیں۔

اگلے دن میں سگریٹ لے کر کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میلا خورا گہرے سا سوٹ پہنے، ٹائی میں ٹھنسی سی گردن، دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اردگرد کی چیزوں سے یکسر بے خبر کسی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی چلتی دکھائی دی۔ جیسے کہہ رہی ہو

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

سنا ہے حفیظ خاصہ پڑھا لکھا شاعر ہے۔ ہوگا! میں نے تو اُس کے ہاتھ میں آج تک کبھی کوئی کتاب نہ دیکھی اور نہ ہی اُسے کبھی کتب خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ جب اُس نے ایک دن مجھے یہ بتایا کہ اُس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات کا ایم۔ اے کر رکھا ہے تو میں سنسان سا ہوگیا۔ کم از کم اس وضع قطع کا طالب علم میں نے اس کالج میں تو نہیں دیکھا۔ اور یہ نفسیات، نہ جانے اُسے کیسے ہضم ہوگئی۔ اُسے مل کر ذرا بھی تو احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک فرض شناس خاوند ایک شفیق باپ اور ریڈیو میں ایک ذمہ دار افسر بھی ہے۔ جب وہ پہلی بار سٹیشن ڈائریکٹر ہو کر لاہور آیا تو میں دو تین دن تک دانستہ طور پر اُسے ملنے نہیں گیا۔ ایک تو اُس کی نئی مصروفیات کا خیال دوسرے میں بھی اُن دنوں پریشان سا تھا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور میں پراگندہ روزی پراگندہ دل لاہور کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ سوچا اس بُرے حال میں حفیظ کو کیا ملوں! اُس حفیظ کو جس نے مجھے کبھی بڑے آسودہ حال میں دیکھا تھا۔ اُسے آئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے۔ رات کے کوئی ۱۱ بجے ہوں گے۔ میں اپنے تاریک کمرے میں موم کی شمع جلائے کلیاتِ میر پڑھ رہا تھا کہ ایک خفیف سی آواز آئی "ناصر" میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ حفیظ کھڑا تھا۔ اُس نے مجھ کو "ناصر!" میں نے کہا "جی!" اور حفیظ بولا "میاں اپنا درد کہاں تک چھپاؤ گے" یہ میرا ہی ایک مصرعہ ہے

ع ناصر میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا

حفیظ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے میرے شعر پڑھنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ لیتا ہے۔ پہلے میں اسے دل لگی سمجھتا تھا لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی ایک درد مند انسان ہے۔ وہ ہر آدمی سے اظہار درد مندی نہیں کرتا اور نہ ہی اُمید رکھتا ہے کہ اس انداز کو کوئی سمجھتا ہے۔ جب میں صاحب حیثیت تھا تو وہ خوش ہوتا تھا جب غریب الوطن ہو کر یہاں آیا تو اُس نے مجھ سے لفظی ہمدردی بھی نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی امداد کی حالانکہ وہ کر سکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اُس نے میری غربت کا کتنا احترام کیا! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دوست ہو کر بھی کام نہ آئے یہ بات نہیں۔ حفیظ اول تو کسی کو دوست نہیں بناتا اگر بناتا ہے تو اُسے برابر کا درجہ دیتا ہے۔ وہ ذرا ذہنی سپاٹ ہے دوستوں کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو وہ بظاہر ہنستا رہتا ہے مگر اُس کا دل روتا ہے۔ در اصل وہ اپنے ساتھ بھی یہی کرتا ہے مجھے اُس نے کبھی رسمی سہارا تو نہیں دیا لیکن کہنے بھی نہیں دیا۔ اور ایک بار ایسی مدد بھی کی کہ میں آج تک اُس کی بدولت چین سے دن گزار رہا ہوں۔

تقسیم ملک سے پہلے جب میں اسلامیہ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا تو اُن دنوں میں بھی ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۲۰ میں رہتا تھا۔ میرا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ماں باپ زندہ تھے۔ خاندانی جائداد قائم تھی۔ خوش قسمتی سے دانشمند کرنے کی بڑی ہمت تھی اور ہر وقت نئے نئے مضمون کی جستجو رہتی۔ اُن دنوں میں اکیلا رہتا تھا۔ ویسے میں تنہا بھی اکیلا ادیب اور شاعر لوگ تو گویا ہم سے مبرا تھے سے بھی بالکل الگ۔ ویسے سب مجھے جانتے تھے یہ مجھے اب معلوم ہوا میں کمرے میں بیٹھا شاید کسی شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دنوں ایک ہی شخص کا انتظار رہتا۔ وہی غالب والا شخص ——— اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کچھ ہنسی سی آگئی لیکن میں ضبط کر گیا۔ اُن کے ساتھ پروفیسر عبدالمجید بھی تھے جن کے ذکر کے بغیر میرے احباب کا حلقہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"معاف کیجئے۔ آپ کو زحمت ہوئی" حفیظ نے بڑے پیار سے کہا۔ میری آنکھیں بھر سی آئیں۔ خوشی بھی ہوئی کہ ایک معروف سا آدمی میرے پاس خود چل کر آیا اور پریشانی بھی کہ انتظار کسی اور کا تھا۔ حفیظ نے حسب معمول وقت کم ہونے کی معذرت کی اور فوراً جیب سے ریڈیو کا کنٹریکٹ نکال مجھے دستخط کرنے کو کہا..... میری عمر اُس وقت سولہ برس ہوگی اور میرے پاس صرف چار پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔ میں کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن ایسی سینکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے۔ کیونکہ روزی کا سوال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ کتنی بڑی گھڑی تھی جب میں ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ نہ میں غزل پڑھتا نہ لوگ مجھے جانتے اور نہ ہی میری زندگی عروسِ سخن کیلئے رسوائے عام ہوتی۔ پھر یہ خیال کہ اور بھی تو کچھ لوگ تھے جنہیں یہ دعوت نامہ ملا تھا۔ لیکن اب اُن کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی کلرک بن گیا کوئی

افسر ہو گیا کوئی پاگل ہو گیا وغیرہ وغیرہ ۔

آل انڈیا ریڈیو میں حفیظ جب محض پروگرام اسسٹنٹ تھا تو بھی وہ سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کے افسر خود چل کر اُس کے کمرے میں آتے تھے۔ اب ڈائرکٹر ہے۔ اب بھی وہی حال ہے۔ میں اُس کے دفتر گیا۔ چپراسی کو چٹ دی وہ اٹھ کر چلا۔ سگرٹ پیش کی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا کہ شاید ڈائرکٹر صاحب کے کوئی دیہاتی رشتہ دار انہیں ملنے آئے ہیں پھر ایکدم خیال آیا کہ یہ تو وہی حفیظ ہے۔ اتنا سیدھا سادا انسان۔ میں نے اُس سے اُس کے دفتر کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ نہ کسی افسر کی تعریف اور نہ ہی بدگوئی۔ وہ لوگوں کے متعلق بہت ہی کم باتیں کرتا ہے۔ بلا کا محنتی ہے۔ صبح نو بجے سے چراغ جلے تک کام کرنا تو خیر اس کا معمول ہے۔ دیانتداری اور محنت سے کام کرنا یوں تو اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس میں میاں بشیر احمد صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ میاں صاحب کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں انجمن اردو پنجاب میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا رہا۔ اور میاں صاحب اُن گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں وہ اپنا دوست سمجھنے کے علاوہ ایک نیک سیرت انسان بھی کہتا ہے ۔

حفیظ کو پرانی اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہ شوق اسے اپنے بڑے بھائی راحل مرحوم سے ورثہ میں ملا۔ اُس کی کتابیں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہ ننھی سی جان اتنی کتابیں کس وقت پڑھتی ہوگی! اس کے پاس فارسی، اردو کے تذکرے، پرانے شعراء کے دیوان کچھ قلمی نسخے جن میں بعض واقعی کمیاب ہیں۔ موسیقی، تصوف، عروض، نحو اور لسانیات اور بعض تاریخی کتابوں سے اس کی الماریاں اٹی پڑی ہیں۔ وہ اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کبھی کو قرض نہیں دیتا۔ مجھے اُس کی یہ بات بڑی بُری لگتی ہے۔ یہ ایک اچھا اصول سہی لیکن اس میں بزدلی کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے۔ کتابوں کا اُسے بُری طرح خبط ہے۔ میرے خیال میں وہ ان کی صرف ورق گردانی ہی کرتا ہے۔ چھٹی کے دن جب بھی اُسے پوچھا کہ بھائی کہاں چلے ہو تو اکثر یہی جواب ملا کہ چپنے بیوی کو کچھ رشتہ داروں سے ملانے گیا تھا۔ اب کشمیری بازار چلا ہوں۔ شاید کوئی کتاب ہاتھ لگے۔ ایک دفعہ میں اُس کے یہاں بیٹھا تھا کہ راحل مرحوم نے اوپر سے جرأت کا دیوان بھیجا۔ یہ بڑا کمیاب اور پرانا نسخہ تھا۔ اُس کی بڑی بیٹی صبیحہ نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا۔ کہنے لگی "اس کتاب کے اوراق بہت بوسیدہ ہیں آپ پڑھ لیں پھر پنکھا چلا دوں گی" میں نے حفیظ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ صبیحہ بلا کی ذہین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے بغیر حفیظ کی شخصیت ادھوری سی رہ جاتی ہے۔ وہ اور اس کے دوسرے بہن بھائی حفیظ کو فی ہوشیار پوری کہتے تھے۔ ماں باپ نے تو نام عبدالحفیظ رکھا تھا۔ عبد حفیظ نے خود اڑا دیا۔ ح اور ظ بچوں نے اڑا دی۔ میں نے صبیحہ سے پوچھا کہ فی کے کیا معنی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی کہنے لگی "ایک" میں نے کہا "ایک چیز" وہ شرما کر بھاگ گئی۔ صبیحہ کی فارسی دانی کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ حفیظ نے مجھے، نور عالم، انتظار حسین اور شیخ صلاح الدین کو چائے پہ بلایا۔ حفیظ نور عالم کو نور قطب عالم کہتا ہے۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی "یہ عالَم ہیں یا عالِم! اور یہ قطب ہے یا کتب" ہم سب حیران رہ گئے۔ حفیظ بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی بیٹی کا شاگرد ہے ۔

حفیظ بڑی روکھی پھیکی، بے کیف، اور بعض اوقات بے معنی باتیں بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لطیفے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ اُس کے بڑے بڑے عقیدت مند تنگ آ کر ادھر اُدھر جھانکنے لگتے ہیں۔ بعض تو روٹھ بھی جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اکثر یہی شک گزرا ہے کہ یہ شخص بہروپیا ہے۔ اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ لیکن یہ تو منافق کی تعریف ہے۔ وہ منافق نہیں۔

جلتے ہیں مگر دیکھ کے دلسوزئ احباب
یعنی سرِ ہر بزم فروزاں نہ ہوئے ہم

اُسے تاریخ گوئی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اور یہ فن بھی اُس نے راحل مرحوم سے سیکھا۔ چلتے چلتے اشتہاروں کو دیکھ کر تاریخ نکال دیگا۔ آپ کی باتوں میں سے تاریخی فقرے نکال دیگا۔ میں تو ایک دفعہ اُس کی تاریخ گوئی سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے شادی کر لی۔ اُس نے فوراً چند ایک تاریخیں کہیں ۔

شاعر شہ طرب شاداں شدہ　　　مراقبہ سے آزاد تھا سر چپ۔ ناصر کاظمی
شادی ہوئی تاریخ ہے پابند ناصر کاظمی

صبیحہ کو جب معلوم ہوا تو اُس نے فوراً کہا۔ ——— ناصر کاظمی بانو
۱۹۵۲

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ یہ سارا خاندان ہی تاریخ گو ہے اور حفیظ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہہ لیتا ہے۔

حفیظ میں بہت سی انسانی کمزوریاں ہیں لیکن گراوٹ کوئی نہیں۔ وہ فن کی عزت کرنا جانتا ہے۔ اچھی سے اچھی غزل سنا ڈالی جائے گا۔ ایک شعر پہ شاعر مان لیگا ہاں ایسے سلم کا قائل ہے جو اظہر من الشمس ہو۔ صرف و نحو، عروض اور زبان پر اُسے پورا عبور حاصل ہے۔ لفظوں کا بے محل و برمحل استعمال اس طرح کرے گا کہ شاعری کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ اس کی بے کیفی اور بے رونقی کے باوجود وہ بڑا ہی گہرا انسان بھی ہے۔ وہ دوستی تو کر سکتا ہے لیکن دشمنی نہیں کر سکتا۔ اُس نے اپنی خشک باتوں سے لوگوں کو خاصا مایوس کر رکھا ہے۔ شاعری کا رسیا ہے۔ جب بھی فرصت ملے فکر سخن کرتا ہے لیکن داد و ستد سے بالکل بے نیاز ہے۔ اہم باتیں سرسری طور پہ کرے گا اور معمولی باتوں کو بڑی اہمیت دے گا۔ ہر طرح سے ملنے والوں کا امتحان لیگا اور جو رائے قائم کرے گا اُسے دل میں رکھے گا۔ وہ تیرہ کی سال بہن کے بچوں کو ڈرانے کے بہت خلاف ہے۔ اسی لئے اُس کی شخصیت بڑی نرم و نازک اور دھیمی سی ہے کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ جوان ہو بوڑھا ہو یا بچہ ہو اُسے کسی نہ کسی طرح چھیڑے گا۔ ہنسے گا ہنسائے گا۔ جسے ملے گا اسے احساس ہوگا کہ وہ اسی کا ہے لیکن وہ بڑا ہرجائی ہے۔ بیٹھے کہیگا۔ بھائی صاحب جواب نہیں۔ آپ حیران ہونگے کس چیز کا جواب نہیں دیوار کا جواب نہیں میز کا جواب نہیں یا آپ کا جواب نہیں۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ کبھی بوڑھے آدمی کی تڑپ سے متاثر ہوا ہے۔ ایک بات کو بہ روز بے محل و برمحل اسقدر دہرائے گا کہ آپ بیٹھے کی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ ہر مجلس آپ کو کسی نہ کسی بات پہ ہنسا دے گا اور خود سنجیدہ ہو جائے گا۔ ویسے میں نے اُسے روتے بھی دیکھا ہے۔ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ۔ اُسے کار چلاتے دیکھو تو ہنستے ہنستے مر جاؤ گے۔ تیز نہ دیکھو تو رو پڑو گے۔

حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن اُس کا قالب نیا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ہنر میں اُستاد ہے۔ غالب کو جب لوگوں نے بے اُستادا کہا تو اُس نے ایک فرضی اُستاد ایجاد کیا۔ مجھے قسمت سے اصلی اُستاد مل گیا۔ اس جیسے فی البدیہہ شعر کہنے والے کم ہی دیکھے ہیں۔ انگریزی تو اُس نے بھی پڑھی ہے مگر وہ خواہ مخواہ ہیئت کے تجربے کرنے کا قائل نہیں۔ بیدل اور غالب کا قائل ہے۔ ویسے میرؔ کا نام اُس نے اپنے ایک مقطع میں استعمال بھی کیا ہے۔

نقش ہے قولِ میرؔ دل پہ حفیظؔ

”کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے“

مگر شیخ صلاح الدین نے اُسے قائل کر لیا کہ اُس پہ میرؔ کا بھی اثر ہے۔ شیخ صلاح الدین کا ذکر میں نے یہاں اس لئے کیا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی بات حفیظ کبھی نہیں موڑتا خواہ وہ سچی ہو یا اُس میں کوئی گھپلا ہو۔

جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کیلئے بہت بھاری زمانہ تھا۔ بیسیوں میں دو چار کا کہیں کچھ بنا تھا۔ لیکن حفیظ اپنی روش پہ ڈٹا رہا۔ وہ نگینوں کی طرح گھر میں گڑ کر بیٹھا رہا۔ اور اس نے اسی کنج تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے دیوانگی کی۔ شاعرانِ حال سے میں اُس کا مقابلہ نہیں کرونگا غزل کے فن میں کوئی بے تہہ اس کا معارض نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ دورِ خامی نے اُسے عام قبولیت کے طغرے سے ذرا محروم سا رکھا ہے لیکن اس سے اس کے مقام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُس نے سینکڑوں ہی غزلیں کہی ہیں۔ لیکن یہ اُسی کا حوصلہ ہے کہ اُس نے ابھی تک صاحب دیوان بننا نہیں چاہا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان دنوں ادیبوں پہ روایت سے بغاوت کرنے کا جنون سوار تھا۔ وہ اُلٹی سیدھی باتیں لکھ کر صرف طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پرانی نسل کا دور تو گزر گیا لیکن ابھی ان کے نام لیوا باقی ہیں یعنی لوگ تو اسے نئی تعلیم کی لوشیں سمجھتے ہیں بعضوں کا یہ خیال ہے کہ بے بحر کے مصرعے موزوں کر کے ہی قانع ہیں۔ اس پورے دور کے جواب میں حفیظ کا یہ شعر کافی ہے۔

بہت بلند ہے اس سے مرا مقامِ غزل　　　اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ حفیظ نے بچپن کا کوئی باقی ہے۔ جو بچوں کی طرح ہنستا ہے روتا ہے اور ضد کرتا ہے۔ جب بھی اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی مونگ پھلیاں نکال رہا ہو۔

ن ۔ م ۔ راشد

عطاء اللہ سجّاد

راشد اور میں زندگی میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب رہے ہیں اور ہماری رفاقت اس قدر طویل رہی ہے کہ میرے لئے ایک خارجی مبصر کی حیثیت سے اُس کی ذات اور شخصیت کا تجزیہ کرنا بے حد مشکل ہے۔

راشد سے میری ملاقات آج سے قریباً ستائیس سال قبل دسمبر ۱۹۲۹ء کی ایک شام کو ہوئی تھی۔ غالباً وہ شام بھی دسمبر کی عام شاموں کی طرح بے حد خنک اور ٹھٹھرا دینے والی ہوگی لیکن میرے لئے اُس کے تصور میں آسودگی اور راحت کے احساس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ضلع گوجرانوالہ کے ایک معمولی سے قصبہ سکھیکی منڈی میں ہمارے مرحوم دوست اشرف کا مکان تھا۔ اشرف نے ہمارا تعارف کرایا۔ عطاء اللہ۔ نذر محمد۔ میں نے دیکھا نذر محمد گندمی رنگ کا ایک خوب رو نوجوان ہے جس کی لمبی پلکیں اُس کے عینک کے شیشوں میں سے بھی نمایاں تھیں۔ جن لوگوں نے گذشتہ پندرہ سال میں راشد سے ملاقات کی ہے وہ شاید میرے اس بیان کو میری دوستانہ نظر کی خود فریبی پر محمول کریں کیونکہ راشد کے چہرے پہ آج کل جوانی کی اُس ملاحت اور دل کشی کی بجائے ایک درشتی جھلکتی ہے جسے اُس کی ثانت نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

اصل میں راشد نے بے حد حساس طبیعت پائی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ کئی بار استعفےٰ داغ چکا ہے۔ لیکن وہ کوئی بڑبولا آدمی نہیں وہ اندر ہی اندر سوچتا اور کڑھتا ہے اور قدرتی طور پر اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی خلفشار سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کے اپنے قول کے مطابق پروفیسر احمد شاہ بخاری نے ایک بار اُس کے متعلق (BORN UN HAPPY) یعنی پیدائشی افسردہ دل کی پھبتی کہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طبیعت کا آدمی محفل آرائی کے لئے موزوں نہیں اُس کی کم آمیزی اور کم گوئی بعض لوگوں کے دل میں اس کی طرف سے بجا طور پر بُعد اور خشکی کا ایک احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود جب وہ اپنے مخصوص حلقہ احباب میں موجود ہوتا ہے تو کم آمیزی کی دھند چھٹ جاتی ہے اور مودت و اخلاص کی روشنی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

جن دنوں ہماری ملاقات ہوئی وہ اپنے نام کے ساتھ راشد وحیدی لکھتا تھا۔ جب میرا اُس سے تعارف ہوا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہی نذر محمد راشد وحیدی ہے چنانچہ میں نے ادبی معاملات میں محبت کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے جب اس سے راشد وحیدی کی ایک نظم "اے محبت۔ ۔ ۔ ۔ " کا ذکر کیا جو اُس مہینے کے نیرنگ میں شائع ہوئی تھی۔ تو اُس نے بڑے منکسرانہ انداز میں کہا کہ وہ نظم میری ہے۔ میں یہ سُن کر اچھل پڑا اور اُس سے دوبارہ

ہاتھ ملاکر کہا کہ مجھے آپ سے مل کر واقعی بے حد خوشی ہوئی۔ راشد نے مسکرا کر اشرف سے کہا لو بھئی انہیں یہ معلوم کر کے کہ میں راشد وحیدی ہوں واقعی بے حد خوشی ہوئی ہے۔ شاید اس فقرے میں یہ طنز پوشیدہ تھی کہ مجھ سے پہلے مل کر اس شخص نے جس خوشی کا اظہار کیا تھا وہ محض رسمی تھا۔ راشد اپنے نام کے ساتھ وحیدی اپنے ایک خالو وحید گیلانی سے اظہارِ عقیدت کے طور پر لکھتا تھا۔ وحید گیلانی مرحوم بھاٹی گیٹ اسلامیہ ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے لیکن انہوں نے ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک "قوسِ قزح" کے نام سے ایک ایسا ادبی مجلہ شائع کیا جس کی مثال آج بھی کہیں نہیں ملتی۔ "قوسِ قزح" اردو صحافت میں ایک سے زیادہ مدتوں کا علمبردار اور شعر و ادب کے ایک نئے دور کا نقیب تھا۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت کی نوجوان پود اس مجلہ کے ادبی کارناموں سے بے حد متاثر ہوئی۔

سکھیکی میں راشد اور میں نے جو آٹھ دس دن مل کر کاٹے وہ ایک پائدار اور دوامی دوستی کی بنیاد بن گئے۔ ہر دوپہر ہم اشرف مرحوم کے مکان کے سامنے نہر کے کنارے کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور پھر گھنٹوں شعر و ادب کا چرچا رہتا، لطیفہ گوئی ہوتی اور اپنا اپنا کلام سنایا جاتا۔ ہمارے پاس سے کپڑے یا برتن دھونے والی عورتوں کی ٹولیاں ہنسی مذاق کرتی اور ہمیں کنکھیوں سے دیکھتی گزر جاتیں۔ اور ہم تینوں میں سے اشرف مرحوم حسن رہگزار کی اس فراوانی سے خوب متمتع ہوتا۔ ان دنوں کی یاد میں راشد نے لاہور پہنچ کر ایک نظم بھی لکھی جس کے چند مصرعے مجھے اب تک یاد ہیں۔

آہ وہ سکھیکی منڈی وہ پری زادوں کے ڈھیر

. . . .

ہر سحر وہ میلے کپڑے لے کے آنا نہر پر

اور تعفن چھوڑ جانا نہر کی ہر لہر پر

وہ کو شمبا کی بہن، وہ جس کا نام آتا نہیں

جس کے غمزے بیہدہ، جس کی ادائیں بے قریں

راشد کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں اس کے آبائی وطن اکال گڑھ یا علی پور میں ہوئی۔ اکال گڑھ کنارِ چناب پہ ضلع گوجرانوالہ کا ایک تاریخی شہر ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ چناب کا عشق انگیز اثر راشد کو شاعر تو بنا سکا ہے لیکن اسے رانجھا یا مہینوال نہیں بنا سکا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ہیر یا سوہنی داخل نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس نے اردو ادب کو چند لاجواب عشقیہ نظمیں بخشی ہیں لیکن اس کی کتابِ حیات میں معاشقہ کا کوئی باب نہیں۔ البتہ اس نے متوسط گھرانے سے ایک شریف مسلمان نوجوان کی طرح اپنی عم زاد کے لئے جو اس کی منگیتر تھی اور اب اس کی رفیقۂ حیات ہے ضرور ایک نظم لکھی تھی۔ ایک بند مجھے یاد رہ گیا ہے۔

حریمِ عفت و عصمت میں ہے قیام اُس کا

طوافِ خانۂ حرمت میں ہے خرام اُس کا

نجوم و ماہ سے بڑھ کر ہے احتشام اُس کا

اُسی سے پیار مجھے ہے اُسی سے پیار مجھے

راشد افلاطونی عشق کا قائل نہیں۔ اختر شیرانی سے کسبِ فیض کرنے کے باوجود وہ اس نے اس نظریہ سے کبھی متفق نہیں ہوا اور "یادِ سلمیٰ" میں جوانی کو گنوا دیا تھا۔ اس کی نظم "حزنِ انساں" افلاطونی نظریۂ عشق پر ایک طنز ہے۔ اس کے نزدیک جسم اور روح دونوں کے آہنگ کا نام محبت ہے۔ غالباً دورِ حاضر کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس جسارت کے ساتھ محبت میں جسموں کے آہنگ پر زور دیا ہے۔ اور محبت کے افلاطونی نظریہ کی تضحیک کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ راشد کی زندگی کبھی "اپیکورین" کی زندگی رہی ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ ان تمام "نفیوں" (NEGATIVES) پر عمل پیرا رہا ہے جس کی تعلیم اس جیسے لوگوں کو اپنے گھروں میں ملتی رہی ہے۔ البتہ اس نے زندگی میں جنس کی اہم حیثیت پر ہمیشہ زور دیا ہے اور جنس کے متعلق اس کا یہ نظریہ ہمارے درمیان کئی دفعہ بڑی لمبی بحثوں کا موضوع بنا رہا ہے۔ جن دنوں ہم قلعہ گوجر سنگھ میں مقیم تھے راشد نے اپنی مشہور نظم اظہار لکھی جس میں ایک مصرع تھا

میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا

میں نے کہا اس کی بجائے

میرے خوابوں نے تجھے پیدا کیا

ہونا چاہئے۔ راشد نے کہا اگر میں ہونٹوں کی بجائے خوابوں لکھ دوں تو میرا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

لاہور میں ہم قریباً تین سال قلعہ گوجر سنگھ میں مقیم رہے۔ میں اور چودھری اب مسٹر جسٹس محمد یعقوب علی خاں لا ر کالج میں پڑھتے تھے اور راشد ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مولانا تاجور کے نئے رسالہ شاہکار کی ادارت کرتا تھا۔ وہ زمانہ ہمارے لئے تنگدستی اور عسرت کا زمانہ تھا، ان سیکڑوں بے مایہ نوجوانوں کی طرح جو لاہور جیسے غدار شہر میں جہد للبقا کے لئے وارد ہوتے ہیں ہم لوگ بھی اپنے لئے راستہ بنا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ زندہ رہنے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے لیکن ان دنوں کی بے فکری، خود اعتمادی، صلاحیت کا ما ورد لجمعی کو تلاش کرتا ہوں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ ہم نے اپنے مکان کا نام لانشیمن یعنی آشیانہ رکھا ہوا تھا۔ میں لا ر کالج میں پڑھنے کے علاوہ احسان کے عملہ ادارت میں بھی منسلک تھا اور شام کو جب میں دس بارہ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد لانشیمن میں واپس آتا تو دو فاقہ مستوں کی پھبتیاں میرا استقبال کرتیں، تین قہقہے بلند ہوتے اور اس کے بعد زندگی کی ہر چیز مسکراتی ہوئی نظر آتی۔

لانشیمن میں ہمارے نقل مکان کرنے کا پہلا دن تھا کہ شام کے وقت پروفیسر احمد شاہ بخاری تشریف لائے۔ ہماری کتابیں ابھی چار پائیوں پر پڑی تھیں اور بخاری صاحب کو بٹھانے کے لئے اس وقت ہمارے پاس کوئی کرسی نہیں تھی۔ بخاری صاحب نے کتابوں کو چار پائی پر دیکھا تو

چار پائے بر و کتابے چند

کی پھبتی کہی۔ راشد نے کرسی نہ ہونے پر معذرت کی اور چار پائی خالی کر دی۔ اب بخاری صاحب جو بیٹھے ہیں تو علم و ادب کے دفتر کھل گئے، اتفاقات کے ایک ایک مصرع پر داد دی، راشد کی تشبیہات کے سلسلہ میں میتھیو آرنلڈ کی تشبیہات کا ذکر آیا۔ اس وقت کی انگریزی شاعری کے رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ راشد نے امریکہ کا ایک رسالہ دکھایا جس میں "اتفاقات" کا انگریزی ترجمہ چھپا تھا۔ انگریزی میں فرمایا "راشد تم سے انصاف نہیں ہوا"

غالباً یہ علمی صحبت دو ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ اور اس کے بعد صرف ایک بار پھر بخاری صاحب کی زیارت "لانشیمن" میں ہوئی۔

"لانشیمن" میں اختر شیرانی مرحوم، مولانا تاجور، راجہ مہدی علی خاں اور راشد کے دو ہم جماعت آغا عبد الحمید اور عمر فاروق بھی آیا کرتے تھے کبھی کبھی مولانا چراغ حسن حسرت بھی تشریف لاتے کیونکہ وہ "احسان" میں میرے رفیق کار تھے اور میں انہیں کھینچ لایا کرتا تھا۔ مولانا تاجور کا ہر معاملہ کے متعلق بات کرنے کا اپنا ڈھنگ تھا اور ان دنوں "جوانی بہ ناکہ اقتدا دانی" کے مصداق اُن کی باتیں ہمارے لئے کئی ایک ایکٹ کے ڈراموں کا موضوع بن جاتیں۔ راشد کو مولانا ان دنوں غالباً پینتیس روپے ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔ مولانا کا تمام کاروبار اُن کے برادر نسبتی سلیمان خاں صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اور مولانا ایک مشکل صورت حال سے بچنے کے لئے ہمیشہ سلیمان خاں صاحب کو سپر کے طور پر استعمال کرتے۔ مثلاً اگر وہ راشد کے کسی اداریہ یا نظم کی تعریف کرتے تو میں کہتا کہ مولانا بیچارے راشد کی تنخواہ میں بھی اضافہ فرمائیے تو کہتے "بھئی یہ تم نے بڑی مشکل بات کہی۔ اگر راشد کو ترقی دوں تو پھر سلیمان خاں بھی مانگے گا۔ اب تم ہی بتاؤ میں اس سے کیسے انکار کر سکوں گا۔ وہ میری بیوی کا بھائی ہے۔ نہ بھئی ترقی کی بات اس وقت نہ چھیڑو میں چپکے سے راشد کی تنخواہ بڑھا دوں گا"۔

اگر کسی اخبار یا رسالہ میں مولانا یا شاہکار کے متعلق کوئی تنقید شائع ہوتی اور ہم لوگ مولانا سے اس کا تذکرہ کرتے تو مولانا بڑے سنجیدگی سے فرماتے بھئی یہ تو غنڈوں کی ایک پارٹی ہے پارٹی۔ انہوں نے تو مجھے ختم کرنے کے لئے ہزاروں روپے چندہ جمع کر رکھا ہے"

قلعہ گوجر سنگھ کے قیام کا زمانہ راشد کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں اس نے "آنکھوں کے جال" "زوال" اور "رقص" جیسی نظمیں لکھیں کبھی کبھی اس کی کسی نظم پر بحث کے دوران میں میں اس کی نظم کی پیروڈی شروع کر دیتا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی اور ایک دن تو اس نے بری

سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ کیا میری نظمیں واقعی اس قدر قابلِ تضحیک ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال میرے طرزِ عمل پہ ناراضی کا ہلکا سا اظہار تھا ورنہ خود اُسے بھی اور اس کے لاتعداد مداحوں کو اس وقت بھی یقین تھا کہ راشد نے اُردو ادب پر شعر و سخن کی کئی نادیدہ اور شاداب دنیاؤں کے دروازے کھول دئیے ہیں۔

راشد ایک بے حد شاداب تخیّل کا مالک ہے۔ اس تخیّل، اپنی مخصوص Diction اور اچھوتی تشبیہات کے زور سے وہ ایک معمولی تجربہ کو ایک عظیم نظم کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ عرب ہوٹل کے ایک نیم روشن اور زنگ لگے کمرے میں ایک شام کھانا کھاتے اُس نے دیکھا کہ اُس کے گلاس کا عکس سفید پتھر کی میز کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ چند دن کے بعد اس نے اپنی نظم "آنکھوں کے جال" مکمل کر لی جس میں اب یہ مصرعے پڑھتا ہوں تو عرب ہوٹل کی وہ شام یاد آ جاتی ہے۔

آہ! تیری مدبھری آنکھوں کے جال
میز کی سطحِ درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیمانوں کا عکس سیمگوں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا

"زوال" کا پس منظر ہمارے مکان لانشیے کا صحن ہے جس میں گوندنی کے ایک درخت کے پیچھے سے راشد نے چاند کو اُبھرتے دیکھا اور ہمیں ایک ایسی نظم بخشی جو اپنے تاثر میں لازوال ہے۔

لاہور میں ادب کو ذریعۂ معاش بنانے کی سعئ لاحاصل کے بعد راشد نے کمشنر ملتان کے دفتر میں کلرکی پہ قناعت کر لی۔ یہ اُس کی زندگی کا غالباً تلخ ترین زمانہ تھا۔ تنگدستی، قلیل تنخواہ، متاہل زندگی کی ذمہ داریاں، نااہل اور نیم خواندہ افسروں کی دھونس اور ملازمت کے سبب اُس کی طبیعت کی مونڈ نیت۔ ان سب چیزوں نے مل کر اُس کی حساس طبیعت پر بے حد اثر کیا۔ اُس کی اُس زمانے کی نظموں سے بھی وہی تلخی نمایاں ہے۔ "شاعرِ درماندہ" اس کدورت کی یادگار ہے اور اردو زبان میں غالباً یہ پہلی عشقیہ نظم ہے جو سیاسی پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

اس زمانے میں راشد خاکسار تحریک میں شامل ہو گیا۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی نے کمشنر کو اس کے خلاف رپورٹیں بھیجنی شروع کیں۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ پہلے ہی اس سے مخالف تھا کہ راشد اس کے سامنے ٹوپی پہن کر نہیں آتا تھا۔ اس نے بھی رنگ آرائی کی لیکن خوش قسمتی سے کمشنر مشہور علم دوست مسٹر کننگ تھے انہوں نے الٹا سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو ڈانٹ پلا دی اور راشد سے ان کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا۔ اس کے بعد راشد کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر فیلڈن تھے۔ راشد نے جاتے ہی ان سے کہا

"جناب میں خاکسار تحریک میں شامل ہوں۔ کیا اس بات کا میری ملازمت پہ کوئی اثر پڑے گا"

فیلڈن صاحب نے مسکرا کر کہا "تمہارا ارادہ ہمارے کسی سٹوڈیو پر بم پھینکنے کا ہے؟"

راشد نے جواب دیا "نہیں"

"تو پھر جاؤ اپنا کام کرو"

دہلی کے دورانِ قیام میں بھی راشد کے لئے اس کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ عزتِ نفس اور ذکاوتِ حس باعثِ زحمت بنتے رہے۔ اور سٹیشن ڈائریکٹر مسٹر ایڈوانی سے مسلسل دانتا کلکل رہی۔ ایک دفعہ ریڈیو کے اعلیٰ افسران نے حکم دیا کہ پروگرام اسسٹنٹ پروگراموں کے نشر کے دوران میں کھانا نہ کھایا کریں۔ راشد نے یہ حکم سُنا تو کہنے لگا کہ ہم کوئی رجمنٹ ہیں کہ ہم پر ایسے حکم نافذ کئے جاتے ہیں۔ ایڈوانی صاحب کہنے لگے کہ میں تمہاری یہ بات افسرانِ متعلقہ تک پہنچا دوں گا چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور راشد کچھ عرصہ کے لئے اس وجہ سے افسروں کے زیرِ عتاب

رہا۔ اسی طرح ایک دفعہ ریڈیو کے انگریز چیف انجینیر سے لڑائی ہوگئی۔ راشد انتظار کے کمرے میں ایک کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا کہ چیف انجینیر صاحب وارد ہوئے اور انہوں نے حکم دیا کہ وہ ٹانگیں پھیلا کر نہ بیٹھے۔ راشد نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا "آپ تشریف لے جائیے اور اپنا کام کیجئے۔ آپ کو اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ میں کس طرح بیٹھتا ہوں۔ چیف انجینیر صاحب نے رپورٹ کر دی اور معاملہ افسرانِ بالا تک گیا لیکن راشد اپنی پوزیشن پر اڑا رہا۔

دہلی کے دوران قیام میں راشد نے اپنی نظم "دریچے کے قریب" لکھی جس میں سیاسی تلخی کا اظہار زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ راشد کی یہ پہلی نظم ہے جو اُس نے براڈ کاسٹ کی۔

جنگ عظیم کے دوران میں راشد فوج کے محکمۂ نشر و اشاعت میں کپتان بھرتی ہو کر چلا گیا اور اس عرصۂ ملازمت میں وہ قاہرہ، تہران اور لنکا میں تعینات رہا۔ تہران کے دوران قیام میں اُس نے وہ نظمیں لکھیں جو اب "ایران میں اجنبی" کے نام سے اُس کے دوسرے مجموعۂ کلام میں چھپ رہی ہیں۔

فوج کی ملازمت بھی راشد کو راس نہ آئی اور وہاں بھی اس نے افسروں کے جبر و تعدی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفٰی دے دیا اور ریڈیو کے محکمہ میں واپس آگیا۔ آج کل وہ نیویارک میں یونائیٹڈ (U N O) کے ریڈیو یونٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر تعینات ہے۔ یہ کام اسے بے حد پسند ہے اور وہ اپنی موجودہ ملازمت پر خوش معلوم ہوتا ہے۔

راشد ایک صاف گو انسان اور بے حد مخلص دوست ہے۔ اسے اپنی نفرت یا ناپسندیدگی چھپانے کے لئے ملائم الفاظ کا انتخاب کرنا نہیں آتا۔ وہ دوستوں کے وار بڑی خندہ پیشانی سے سینے پر سہہ لیتا ہے لیکن اگر اسے یہ شبہ ہو کہ فلاں گوشہ سے فلاں بات اسے ذلیل کرنے کے لئے اور محض عناد اور بغض کی وجہ سے کی گئی ہے تو پھر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہے۔ دل میں جب ہمارے ایک مرحوم و مغفور دوست سے رنجش کے لئے میرے دل میں ہمیشہ بے حد محبت اور عزت رہی ہے، راشد کے تعلقات خراب ہو گئے اور جانبین نے ایک دوسرے کی طرف توپوں کے منہ پھیر دئے تو راشد نے اپنی معرکہ آرا ہجو "اشتراکی مسخرے" لکھی۔ یہ نظم ایک ہجو کی حیثیت سے اتنی کامیاب تھی کہ اس نے اپنے ہدف سے بھی داد وصول کی۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں دوستوں میں مصالحت ہوگئی اور محبت کے شفاف پانی نے تمام گرد و غبار دھو دئے۔

مرحوم کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے راشد رخصت پر لاہور آیا ہوا تھا اور مرحوم نے کئی بار مجھ سے ذکر کیا کہ راشد اور بیگم راشد ان کی تیمارداری کے لئے ایک سے زیادہ بار آتے تھے۔

راشد ایک مخلص دوست، ایک شائستہ لیکن فاش گو انسان ہے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے لئے مبہم اور نرم الفاظ تلاش نہیں کرتا بلکہ جس انداز میں وہ کوئی بات محسوس کرتا ہے اسی انداز میں کہہ دیتا ہے۔ شاید یہ اُس کے کردار کی خامی ہو کیونکہ آج کل زندگی کی قدر بدل گئی ہے اور لوگ سانپ کے زہر کی بجائے اس کے حسن پر زور دینے لگے ہیں۔

احمد علی

سید علی اکبر قاصد

میرے مضمون کا عنوان "احمد علی" بہت ادھورا اور نامکمل سا ہے ـــــ کبھی ہیر کٹنگ سیلون والے آپ کے سر کے بال زیادہ تراش دیں تو آپ کا چہرہ دو چار دن عجیب اجنبی اجنبی سا لگے گا۔ اسی طرح احمد علی کا نام پروفیسر کے دُم چھلّے کے بغیر عجیب عجیب سا لگتا ہے ـــــ ہاں یہ ذکر خیر ہے پروفیسر احمد علی کا ـــــ "انگارے" والے احمد علی ـــــ "ٹوئی لائٹ آف ڈلہی" والے احمد علی ـــــ لکھنؤ یونیورسٹی والے احمد علی اور حکومت پاکستان کے محکمۂ امور خارجہ والے احمد علی۔

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے میرے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک بھری محفل میں کہا تھا کہ "احمد علی کے افسانوں میں زندگی کا سراغ ملتا ہے اور احمد علی نے تھوڑا ہی لکھ کر ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام حاصل کر لیا ہے ـــــ اس وقت میرے دل میں احمد علی سے ملاقات کی تمنا ابھری تھی ـــــ اور طالب علمی و کم عمری کا وہ جذبہ بھی دل میں پیدا ہوا تھا کہ کاش میں بھی احمد علی کی طرح لکھ سکتا ـــــ میں "احمد علی کی طرح" لکھ تو نہ سکا مگر آج اس کی بجائے "احمد علی پر" لکھ رہا ہوں۔

پانچ برس بیتے ـــــ میرے دوست سلیم اللہ فہمی ایک شام مجھے احمد علی کے مکان پر لے گئے۔ وہاں پروفیسر احمد علی اور چراغ حسن حسرت مرحوم سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی ـــــ یہ ملاقات میرے لئے ایک ڈرامائی تاثر رکھتی تھی ـــــ ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے میرے ذہن نے بھی ان دونوں کی خیالی تصویریں بنا رکھی تھیں ـــــ چراغ حسن حسرت، دُبلے پتلے سے نستعلیق آدمی ہوں گے۔ دھیمے دھیمے باتیں کرتے ہوں گے ـــــ باتوں کا لہجہ ان کے اشعار کا سا ہوگا ؎

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں　　زلف کی رخسار کی باتیں

اور احمد علی پروفیسروں کی طرح ہوں گے ـــــ خاصے بھاری بھرکم ـــــ چندیا پر بال کم، چہرے پر فارغ البالی کے اثرات ـــــ مگر یہ پہلی ملاقات ان ذہنی تصویروں کو لے ڈوبی ـــ مجھے تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی، لیکن تھوڑی دیر بعد ذہن نے حقیقت سے مطابقت حاصل

کرلی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ اور احمد علی کی شخصیت کے نقوش اُبھرتے گئے۔

احمد علی کو پہلی بار دیکھتے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص انسانوں کے ہجوم میں شامل بھی ہے اور اُن سے الگ بھی ہے ——— احمد علی اُن معنوں میں تو خوبصورت نہیں جن میں گریگری پک اور دلیپ کمار خوبصورت کہے جاتے ہیں لیکن اُن کے چہرے کے گرد ایک انفرادی فضا ضرور ہے، نقشہ تیکھا ہے، اور آنکھوں کی چمک ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر، مگر یہ چمک ویسی نہیں جیسی کسی ماہر مسمریزم کی آنکھوں میں ہوتی ہے بلکہ اس میں کچھ اُداسی اور خاکستری کیفیت بھی ملتی ہے ——— شعلے پر راکھ کا غلاف ——— احمد علی کی مخروطی لمبی انگلیاں بھی فوراً مرکز توجہ بن جاتی ہیں ——— زندگی کے اس سفر میں کتنے ہی لوگوں سے ملا ہوں اور

قامت و چہرہ، وہ وہ دیکھا، کبھی نہ بھولے، یاد رہے

لیکن کسی کی انگلیاں احمد علی کی انگلیوں کی طرح مرکز توجہ نہ بن سکیں، ——— ابھی پہلی ملاقات کی شام کی بات کر رہا ہوں، ——— جب چائے آئی اور سب پینے لگے تو احمد علی بڑی نفاست سے پیالی اُٹھاتے، اپنے ہونٹوں تک لے جاتے اور پھر طشتری میں رکھ دیتے ——— ان کے اس عمل میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے احمد علی پیدائشی بلکہ موروثی طور پر بت تراش ہیں، ——— احمد علی کے سر کے بال بڑے بڑے تھے اور بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب تھی جیسے غزل کے اشعار میں یا ستاروں میں ہوتی ہے ——— اُردو میں باتیں کرتے کرتے انگریزی بولنے لگتے اور لہجہ کا خیال رکھتے ——— پہلی ملاقات نے احمد علی کی شخصیت کے یہ تاثرات پیدا کئے اور یہ آج بھی قائم ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں قریب سے دیکھنے کے بعد اضافے ضرور ہوئے ہیں۔

لباس کے معاملے میں احمد علی ان لوگوں سے بہت الگ ہیں جو "انٹلکچوئل" کہلاتے ہیں، اگر کسی شام کسی ایسے آدمی سے آپ کی ملاقات کرائی جائے جو گہری ہری قمیص کے ساتھ گہری سُرخ ٹائی لگائے ہوئے (BRUTE AMERICAN CONTRAST) اور کہا جائے کہ "ان سے ملئے یہ ہیں پروفیسر احمد علی" تو یہ کسی پریشانی کی بات نہیں، اور اسی لئے یہ بات میں نے آپ سے احتیاطاً عرض کر دی ہے ——— اس ذوقِ لباس کی نفسیاتی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ احمد علی کراچی کی بے رنگ زندگی سے انتقام لے رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ نہ تو موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔ نہ رقص کی لہریں اُٹھتی ہیں، نہ ہم مشرب کہیں دو چار بیٹھے ہیں ——— اس کی ایک اور نفسیاتی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ غالباً احمد علی غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو جوان رکھنے اور جوان پیش کرنے کے لئے یہ اہتمام کرتے ہیں ——— اُن کی عمر اب یہی کوئی چوالیس پینتالیس سال ہے، پہلی نظر میں یہ عمر چھپتی بھی نہیں لیکن جب ملنے والا اُن سے قریب ہوتا جاتا ہے تو وہ کم عمر معلوم ہونے لگتے ہیں، شوخ کپڑے باتوں میں شوخی، حرکات و سکنات اور جنبشوں میں جوانوں بلکہ نوجوانوں کی سی بے چینی اور قوت کا اظہار، کچھ وارفتگی اور والہانہ پن، اور اسی ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے چابیوں کے گچھے سے کھیلتے رہنا ——— یوں گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

احمد علی دیکھنے میں خاصے لمبے آدمی ہیں مگر اس لمبائی سے بہت زیادہ ان کے اندر گہرائی ہے، علم کی اور مطالعے کی ——— بلاشبہ وہ ایک بڑے فنکار ہیں، متوازن نقاد اور شگفتہ ادیب، ادب اور زندگی پر غائر نظر رکھنے والے ——— خوشگوار اور دلکش مسکراہٹوں والے احمد علی ہمارے ادب اور کلچر کی تاریخ میں زندہ رہیں گے ———

احمد علی گفتگو کے فن کے بڑے ماہر ہیں ——— جس طرح اچھے بندوقچی کا RANGE بہت وسیع ہوتا ہے اُسی طرح احمد علی کی باتوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ——— جولیس سیزر اپنے بارے میں کہتا تھا کہ ——— "میں آیا ——— میں نے دیکھا ——— اور میں نے فتح کر لیا"۔ ——— احمد علی بھی بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "میں آیا ——— میں نے باتیں کیں ——— اور میں نے فتح کر لیا"۔

ایک بڑی بین الاقوامی قسم کی محفل میں، میں بھی شریک تھا اور احمد علی بھی ——— احمد علی کے سامنے پیمانہ و مینا تو نہیں تھے مگر چاروں طرف

خواتین ضرور تھیں ع پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار ۔ احمد علی بیک وقت ایک معمّر انڈونیشی خاتون، ایک ادھیڑ جاپانی خاتون، ایک نوجوان چینی خاتون اور ایک مسکراتی ہوئی ہسپانوی خاتون سے باتیں کر رہے تھے اور کیسی باتیں ؟ ——— انڈونیشیا میں شاعری کے نئے رجحانات، جاپان میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے معاشی حالات، چین کا مستقبل ——— پھر احمد علی کو ہسپانوی خاتون کی ابروؤں میں اسپینی فن تعمیر کی جھلک نظر آ گئی۔ محراب، اور وہ آدھے گھنٹے تک اسپینی فن تعمیر پر گفتگو کرتے رہے ——— کبھی کبھی احمد علی کی گفتگو عجیب انداز کی ہوتی ہے ——— بظاہر اُن کے عام تصورات و عقائد سے مختلف، ایسے موقعوں پر قدامت کا وہ اظہار کریں گے کہ حیرت ہو جائے گی ——— کوئی عورت سُنے تو بیاختہ کہے ۔ اللہ ! یہ انگارے کا مصنف بول رہا ہے ؟" ——— میں سوچتا ہوں کہ اصلی احمد علی کون ہے ؟ ——— یہ جملے کہنے والا "یا انگارے کا افسانہ نگار ! بھائی جان (حسن مثنیٰؒ ندوی) اور ابوالخیر کشفی نے ستم یہ کیا کہ مہر نیمروز کے پہلے شمارے میں کسی کا یہ جملہ چھاپ دیا کہ ——— "بندے کو خدا پر یہ فوقیت ہے کہ خدا لذتِ مرگ سے آشنا نہیں ؟" ——— میں نے چھپنے کے بعد پڑھا، مجھے فوقیت کے لفظ پر شدید اعتراض تھا۔ بھائی جان اور کشفی کہتے کہ ہمیں کب اتفاق ہے ؟ یہ تو کسی کا قول ہے، ہم نے چھاپ دیا، آپ جواب دیجئے" ——— ایک دن شام کو احمد علی آ گئے اور کشفی اور بھائی جان سے اُلجھ پڑے ——— "صاحب ! آپ نے یہ کیا چھاپ دیا ؟ اس قول کے لکھنے والے نے خدائے بلند و برتر کے بارے میں ایک منٹ بھی نہیں سوچا ——— خدا تو علیم و بصیر ہے ۔ دانائے رموزِ کل ہے ۔ سب سے بڑا فنکار ہے وغیرہ وغیرہ" ——— کشفی بڑی معصومیت سے بولے کہ ——— "یہ احمد علی صاحب بول رہے ہیں یا مفتی شفیع" ——— احمد علی ہنس پڑے اور بحث ختم ہو گئی ... لیکن وہ لمحہ بہت قیمتی تھا، خدا اور مذہب کے بارے میں احمد علی کے صحیح جذبات سامنے آ گئے۔ احمد علی نے دہلی کی روایات کی آغوش میں پرورش پائی ہے ——— وہ روایت شکن ضرور ہیں لیکن اُن کی زندگی اور ان کی تحریروں میں یہ روایات بغیر کچھ کہے سُنے در آتی ہیں ——— اسی لئے وہ دلّی والوں کی طرح کبوتر بھی اُڑاتے ہیں۔

احمد علی صرف کبوتر ہی نہیں اڑاتے بلکہ انہیں کئی اور جانوروں سے بھی دلچسپی ہے جمشید روڈ پر ایک مکان میں رہتے ہیں لیکن یہ مکان بھی اُن کے مذاق کا کسی حد تک آئینہ دار ہے ——— چھوٹا سا باغیچہ ——— چھوٹے چھوٹے پتھروں سے نمونے کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی ——— چھوٹا سا گڑھا گڑھے میں پانی ——— پانی میں رنگین مچھلیاں ——— جالیاں لگی ہوئی ——— جالیوں میں لال ——— رنگ برنگی چڑیاں، گھاس پر خرگوش اور ایک عدد بلّی ——— دروازے پر دو عدد کتّے ——— سودا کے ممدوح کی طرح احمد علی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی تو نہ پلا سکے، لیکن یہ صلاحیت ان میں ضرور ہے، بلّی اور کتّے کو رشتۂ رفاقت میں منسلک کر رکھا ہے، ایک زمانے میں تو وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچ رہے تھے کہ بلّی اور کتّے کو زنجیرِ مناکحت میں باندھا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ ——— اس سلسلے میں اُن سے اگر کوئی شکایت ہے تو بس اتنی کہ ہمیشہ کاٹ کھانے والا کتا رکھتے ہیں

عجائبات سے احمد علی کو بہت شغف ہے، اُن کا ملاقاتی کمرہ ——— کمرہ کاہے کو ہے ایک بڑا ہال ہے اور داخلے کا دروازہ بغدادی ہے آپ ملاقاتی کمرے میں پہنچیں گے تو قالین مجسّموں، تصویروں، ایک بہت بڑے چوبی صندوق اور ایسے ہی الّم غلّم سامان کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے احمد علی کو بھول جائیں گے ——— جب آپ اپنے عالم میں آئیں گے تو احمد علی کی آنکھوں کو مسکراتا پائیں گے ——— "یہ صندوق دورِ شوں شانگ کا ہے"۔ "یہ منقش جگ عہد چین چاں چانگ سے تعلق رکھتا ہے" وغیرہ وغیرہ ——— احمد علی نے یہ سب سامان اپنے قیامِ چین کے زمانے میں جمع کیا تھا۔ جب وہ پاکستان کے سفارتی نمائندے کی حیثیت سے چین گئے تھے ——— ایسے وہ پہلے بھی انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے قیامِ پاکستان سے پہلے بھی چین ہو آئے ہیں ——— اور وہ یہ سب سامان اُسی بڑے چوبی صندوق میں بھر کر لائے تھے۔ جو اب ان کے کمرے میں رکھا ہوا ہے، بھابی بانتیس (بیگم احمد علی) کا کہنا ہے کہ جب گھر میں زیادہ مہمان آ جاتے ہیں، تو احمد علی اسی صندوق پر سوتے ہیں مگر اس احترام و عقیدت سے کہ رات بھر سو نہیں پاتے ——— یہ کمرہ عجائب خانہ بھی ہے اور نگار خانۂ چین بھی، اسی لئے یہاں ٹھہرنا مومن کے

ایمان کے لئے باعث ضرر ہے، کیونکہ طبیعت چوری کی طرف ہمہ وقت مائل رہتی ہے۔

آج کل احمد علی کو ایک ہی دھن ہے اور وہ ہے مکان بنوانے کی ـــــ یہ دھن اُن کی تخلیقی قوت سے جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ ـــــ اُنہوں نے ہاؤسنگ یونین ایریا میں ایک پلاٹ لیا ہے، بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میرا تعلق یونین سے ہے اور احمد علی کا دوست بھی ہوں اس کے علاوہ مجھے وہ ماہر تعمیرات بھی سمجھتے ہیں، چنانچہ اب جب بھی ملتے ہیں اور اکثر ملتے ہیں تو مکان کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کی جگہ وہ جرمنی، انگلستان، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے مکانوں کے نقشوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ـــــ کسی مکان کی چھت پسند آتی ہے تو کسی کا برآمدہ ـــــ بال کی کھال نکالنے میں احمد علی اپنا جواب آپ ہیں، اُن کا تذکرۂ مکان اب تو دفتر طلسم ہوشربا بن گیا ہے، اور میں بور ہونے کے باوجود احمد علی سے کچھ نہیں پاتا۔ بگڑتے ہوئے آئیں گے ـــــ "بھئی اکبر! ـــــ آخر یہ کیا ہے؟ تم میرے مکان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے، کل کوئی پتھر اُٹھا لے گیا۔ اور آج مٹی لے گیا۔ یہ سب کیا ہے؟" ـــــ

آج کل بلقیس بھابی اور احمد علی کے درمیان بچوں کے علاوہ اگر کوئی موضوع گفتگو ہے، تو یہی مکان کا سلسلہ ـــــ فرصت کے اوقات میں دونوں میاں بیوی مکان کا نقشہ بناتے رہتے ہیں یا جھگڑتے رہتے ہیں ـــــ "باتھ روم یہاں ٹھیک رہے گا" ـــــ "بھئی میں اپنی اسٹڈی پائیں باغ کے مشرقی گوشے میں بنواؤں گا" ـــــ "سامنے کی جالیاں ویسی ہی ہوں گی جیسی ۔۔۔۔" یا پھر یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کسی مکان کا نقشہ لئے بیٹھے ہیں۔ چھت احمد علی کو پسند نہیں آئی اور دروازے بلقیس بھابی کو ناپسند ہیں ـــــ یہ سلسلہ اب معمولات کا حصہ ہو گیا ہے۔

احمد علی کی ازدواجی اور گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے، بھابی بلقیس اُن کے دُبلے پن کی تلافی اور تکمیل ہیں، احمد علی کی طرح وہ بھی گفتگو کے فن کی ماہر ہیں۔ اس تسلسل سے بولتی ہیں جیسے کتاب پڑھ رہی ہوں ـــــ شادی شدہ خواتین احمد علی اور بیگم احمد علی سے مل کر اپنے شوہروں سے اور شاکی ہو جاتی ہیں "میاں ہو تو ایسا ـــــ بیوی کا کتنا خیال رکھتا ہے، ہر بات مان لیتا ہے، ایک تم ہو کہ میری سنتے ہی نہیں" ـــــ اور بیچارے شوہر جل کر کہہ اُٹھتے ہیں ـــــ "بیوی میاں پر حاوی ہے" ـــــ حالانکہ ایسا کہنا حقیقت سے خاصہ دور ہے ـــــ احمد علی کے دونوں بچے عروج اور ارم بہت پیارے اور ذہین ہیں ـــــ ان ناموں میں بھی احمد علی کی دو معصوم تمنائیں چھپی ہوئی ہیں ـــــ ایک بات اور ـــــ احمد علی کو جب بلقیس بھابی کے سامنے گھر سے باہر رہنے کا بہانہ تراشنا ہوتا ہے تو بہترین ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں۔

زمانے کی طرح کراچی کا موسم بھی بدل گیا ہے اور اب کراچی میں آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں اور بارش ہوتی ہے تو ہوتی ہی چلی جاتی ہے، فضا کے ابر آلود ہوتے ہی لوگ سیر و تفریح اور پکنک کے لئے گھروں سے نکل پڑتے ہیں لیکن ایسے میں احمد علی کی مصروفیت دلچسپ اور مکمل طور پر انفرادیت لئے ہوئے ہوتی ہے، اپنی خاکستری "اوپل" میں اپنے دونوں بچوں کو بٹھا کر ـــــ بغیر نعرہ لگائے ـــــ ویرانے کی طرف نکل پڑتے ہیں، وہاں ان کے بچے مینڈکیاں پکڑتے ہیں اور احمد علی فورس اِن ریزرو (FORCE iN RESERVE) بن کر اپنے بچوں کو مینڈکیوں کی گرفتاری میں کمک پہنچاتے ہیں۔ جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو واپسی ہوتی ہے اور ان کے فراک میں شام کا ماحصل یعنی قسم قسم کی چھوٹی بڑی مینڈکیاں، بڑی احتیاط سے رومال میں لپٹی لپٹائی ان کے گھر آ جاتی ہیں، مینڈکیاں پکڑتے وقت ان کی لمبی مخروطی انگلیوں میں نفاست کے ساتھ نشانہ بھی ہوتا ہے اور پوری پلاننگ بھی ـــــ احمد علی پلاننگ کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ اس دلچسپ فنکارانہ کام میں بھابی بلقیس ان کی مدد تو نہیں کرتیں مگر اظہار ناپسندیدگی بھی نہیں کرتیں ـــــ وجہ ظاہر ہے، ایسے سہانے موسم میں انہیں احمد علی کی دوسری مصروفیتیں پسند نہیں۔

عرصہ سے احمد علی نے کوئی تخلیقی چیز نہیں لکھی ـــــ اُن کی زندگی اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں ـــــ ایک تو یہ کہ احمد علی اپنی گزشتہ تخلیقات سے مطمئن ہیں، دوسری بات یہ کہ انہیں کچھ یہ احساس بھی ہے

کہ نقادوں نے ان کے صحیح ادبی مرتبہ کا تعین نہیں کیا۔ اور اس احساس میں وہ حق بجانب ہیں ——— تیسری بات یہ کہ وہ موجودہ ادبی ماحول سے مطمئن نہیں، جس میں آدمی دو چار کہانیاں لکھ کر مشہور ہو جاتا ہے اور نقاد اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں ——— ویسے ابھی احمد علی کو بہت کچھ کہنا ہے۔ اِن کے دامنِ خیال میں ابھی بہت کچھ ہے ——— کتنے ہی افسانے نامکمل پڑے ہیں ——— دوست انہیں لکھنے پر اُکساتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ سنجیدگی سے لکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں تو وہی دوست یا معتقد میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ——— حسن مثنےٰ صاحب اور کشفی صاحب نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ MERMAIDS IN LUCKNOW (ناول) کا اردو میں ترجمہ کیا جائے گا۔ اور "انگارے"، "شعلے"، "ہماری گلی" اور "قید خانہ" کے افسانوں کا انتخاب ایک جلد میں شائع کیا جائے گا۔ ہر شام دو گھنٹے کام کیا جائیگا۔" کشفی تو یہ وعدہ کرکے ہندوستان چلے گئے اور بھائی جان دو مہینے گھر سے ہی نہ نکلے۔ اب اس کا کیا علاج؟ ——— ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ احمد علی خود ہی دن کے دو چار گھنٹے ادب کے لئے وقف کردیں۔

احمد علی بہت اچھے، مخلص، اور سچے دوست ہیں کیونکہ وہ اچھے آدمی ہیں، دوستوں کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی کرسکتے ہیں ——— قرض سے کر بحث و تمحیص تک ——— بحث و تمحیص قربانی یوں ہے کہ اس کے لئے وقت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

یہ ایک ادھوری جھلک ہے، اُس احمد علی کی، جو باغی ہونے کے ساتھ ساتھ روایت پرست ہے، ——— جسے پرانی شاعری بہت پسند ہے ——— اور کبیر کے ایک دوہے یا میر کے ایک شعر کے سہارے زندگی کے کتنے ہی لمحے کاٹ سکتا ہے ——— جو ادبی طور پر خاموش ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ خاموشی ایک بڑے ادبی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

اختر انصاری

عزیز عرفی

اختر صاحب کی کیفیت ایک جھیل کی سی ہے۔ خاموش اور پرسکون۔ جس کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ہوں، جو حلقے بناتی ہوئی حلقوں ہی میں مدغم ہو جائیں۔ ساحل پر کھڑا ہوا کوئی شخص پتھر پھینک دے تو تمام سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ساری جھیل میں لہریں ہی لہریں رقص کرنے لگیں۔ ہر گوشہ متحرک ہو جائے ــــ اور پھر اس کے بعد ساکن سطح پر مسکراتا ہوا سکوت۔ وہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر معدوم ہے جو اپنی قوی ہیکل دھاڑتی ہوئی موجوں سے ساحل پر کھڑے ہونے والے خندہ زن تماشائیوں کو دور تک دھکیل دیتا ہے۔ وہاں اس ندی کا جوش و لولہ اور عزم بھی نہیں جو سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتی، گنگناتی اور اٹھلاتی اپنی منزل کی طرف دوڑتی رہتی ہے ــــ وہ تو محض ایک جھیل ہے پرسکون اور ساکت جس کی سطح کے نیچے ننھی ننھی سرخ و سبز سنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں ــــ حسرتوں کی طرح پلتی رہتی ہیں ــــ اور پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ مچھلیاں مر جاتی ہیں۔ جھیل کی سطح مرتعش ہو جاتی ہے لہریں ساحل سے ٹکرانے لگتی ہیں جیسے وہ ساحل کو توڑ کر اتنی نکل جائیں گی اور ایک پہاڑی ندی کی طرح سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیرتی ہوئی اپنی منزل کو پا لیں گی ــــ یعنی پرانی حسرتیں دم توڑتے توڑتے بھی بپھریں گی ــــ لیکن پھر جھیل کی سطح اسی طرح ساکت ہو جاتی ہے۔ اور جھیل کا پانی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔

"کون اس بے سود پرانے سکون کو چھوڑ کر بیقرار رہے ــــ ٹکرائے ــــ"

اس طرح یہ کہنا قطعاً دقت طلب نہیں کہ اختر صاحب میں دنیا سے لڑنے اور جھگڑنے کی ہمت نہیں۔ انھوں نے زندگی بھر حسرتوں اور امیدوں کے آنسو بہائے ہیں۔ مرحوم آرزوؤں کا ماتم کیا ہے۔ لیکن دیوانہ وار نہ گریبان کو چاک کیا اور نہ دامن کو تار تار ــــ بلکہ ناکامی، مایوسی اور محرومی پر مسکرانے کے لئے ایک چھوٹی سی دنیا بسا لی۔ کوٹھی کی جنت تعمیر کی۔ جہاں اب وہ چاروں طرف سے دروازے بند کئے اپنے کوچ پر لیٹے آہستہ آہستہ پائپ پیتے رہتے ہیں۔ آتش دان پر شیلف میں رکھی ہوئیں اپنی تصانیف کو دیکھتے ہوئے فرنیچر کو دیوار پر آویزاں تصویروں کو اپنے گرد پھیلی ہوئی قیمتی اشیاء کو دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ انھوں نے دروازے کے شیشوں پر بھی رنگ کے غلاف چڑھا دیئے ہیں کہ مبادا ان کی ناکام حسرتیں جھانک کر رنگ میں بھنگ ملا دیں ــــ لیکن یہ سب باتیں تعبیر طلب ہیں۔

اختر صاحب نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ جامع مسجد دہلی کے اطراف کی گلیوں میں گزارا۔ ان کے والد دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ ایک شفیق باپ کی حیثیت سے ان کی خواہش تھی کہ اختر صاحب [illegible] میں [illegible] جائیں۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح اختر صاحب کی آرزوؤں کے بار آور ہونے کا وقت آیا ــــ ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اختر صاحب کا مستقبل بگڑ گیا۔ تصورات کا جھلملاتا ہوا دیا ڈگمگانے لگا۔ لیکن اختر صاحب نے حالات کے سامنے ہمت نہ ہاری اور اپنے اس قصہ پارینہ [illegible] کے حصول کے لئے لندن گئے۔ مگر قسمت کے دربان نے محل کے دروازے ہی سے ناکام

نامراد لوٹا دیا ـــــ اور جب وہ لندن سے واپس ہوئے تو ان کی دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی ـــــ اور اس تاریکی میں ان کی سوتیلی ماں، بہن، بھائی، بیوی بچے ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے ـــــ اختر صاحب کے والد سخت مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ وہ دہلی کے سول سرجن تھے۔ لیکن انہوں نے "دنیا کمانے" کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ لہٰذا ورثا کو ان کی قبل از وقت موت کے بعد کچھ جائداد اور ایک مختصر رقم کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ روپیہ جو تھا وہ اختر صاحب کے لندن آنے جانے میں اور دوستوں کو قرض دینے میں ختم ہو گیا ـــــ یہ واقعہ ہے کہ اختر صاحب نے پانچ چھ ہزار روپیہ سال دو سال میں اپنے چند دوستوں کو دے ڈالا ـــــ خود اس زمانہ میں نہ سگریٹ پیتے تھے نہ پان سے کوئی خاص دلچسپی رکھتے تھے ـــــ دوسرے تعیشات کا تو ذکر ہی کیا ہے ـــــ وہ روپیہ خرچ کرنے میں بقول خود نہایت پھوہڑ واقع ہوئے ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں۔

"میں اپنی اس کمزوری سے ہزار کوشش کے باوجود آج تک چھٹکارا نہیں پا سکا ہوں۔ جذبات کی رو میں بہ کر روپیہ خرچ کر ڈالتا ہوں اور پھر کرچ ھتاتا رہتا ہوں اور کف افسوس ملتا رہتا ہوں۔ اور ساتھ ہی دل میں عزم کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حماقت نہیں کروں گا لیکن وقت آنے پر بالکل وہی حماقت دوبارہ مجھ سے سرزد ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر کڑھنے کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے تا آنکہ از سر نو روپیہ ہاتھ میں آئے اور ایک دفعہ پھر وہی حماقت سرزد ہو۔ زندگی بھر یہی چکر قائم رہا ہے ـــــ" اس سلسلے میں اختر صاحب ایک مزے کی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ محض سکونِ طبع کی خاطر یہ ضروری ہے کہ میری جیبیں خالی ہوں کیونکہ جب تک میرے پاس پیسہ رہتا ہے میں خرچ کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا۔ ان کا یہ انگریزی کا جملہ انہیں اکثر یاد آتا ہے ـــــ

"FOR SHEER PEACE OF MIND I MUST BE PENNILESS."

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ایک بھرے پُرے خاندان کا بار اٹھانے کے باوجود اختر صاحب نے آج تک۔ بقول خود پانچ روپے بھی پس انداز نہیں کئے۔ اس سلسلے میں بھی وہ مذکورہ بالا قسم کی بات کہا کرتے ہیں ـــــ "میں اکثر یہ سوچتا ہوں اور یہ سوچ کر اپنے آپ کو عبرت دلاتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہوتے ہوئے مہینے کے تیس دنوں میں انتیس دن بڑا خالی ہاتھ رہتا اور جیب میں ایک پھوٹی کوڑی کا بھی نہ ہونا کس قدر خطرناک بات ہے چنانچہ اکثر دل ہی دل میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ضرور پس انداز کروں گا اور وقت بے وقت کے لئے ضرور کچھ روپیہ محفوظ رکھوں گا۔ لیکن یہ عہد آج تک تو شرمندۂ تکمیل ہوا نہیں ہے ـــــ"

خیر یہ سب باتیں تو ضمنی طور پر کہی گئیں۔ قصہ تو اصل میں اختر صاحب کی ابتدائی زندگی کا تھا۔ لندن سے واپسی پر اختر صاحب نے ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مارے۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا علی گڑھ جا کر بی۔ ٹی میں داخلہ لیا ـــــ اور جب وہ بی۔ ٹی (B.T.) کر کے نکلے تو انہیں ایک اچھی خاصی رقم ادا کرنا تھی۔ (جس کی تسبیح وہ ۱۹۱۱ء تک تو وہ یقینی ادا کرتے رہے) ایک اچھے خاصے فیملی (FAMILY) کو پالنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے سٹی اسکول میں کام شروع کر دیا۔ اس وقت تک ان کے عزائم جوان تھے اور ان کا یہ یقین محکم تھا کہ وہ اسکول سے جلد ہی نجات پا کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکیں گے جو ماحول کی ناسازگی کی بنا پر نہ پنپ سکیں۔ لیکن وہ تیرہ ۱۳ سال تک اسکول سے نہ نکل سکے۔

ماحول اور واقعات کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنا کچھ آسان بات نہیں۔ اختر صاحب کی آمدنی قلیل تھی اور اخراجات زیادہ ـــــ بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش ایک طرف ـــــ اپنی آرزوؤں کی تکمیل دوسری طرف ـــــ دونوں باتیں اس قلیل آمدنی میں ناممکن تھیں ـــــ انہوں نے اپنی آرزوؤں اور مسرتوں کا خون کیا۔ لیکن بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش سے ہاتھ نہ اٹھایا ـــــ اختر صاحب کو اچھے مواقع بھی ملے۔ لیکن ان میں RISK لینے کی ہمت نہ تھی ـــــ کیونکہ اختر صاحب کو ابتدا ہی میں ناکامیوں اور محرومیوں نے جکڑ لیا تھا۔ وہ ... بڑی فیملی (FAMILY) کی پرورش ان کا فرض بن چکی تھی۔ لہٰذا وہ ہمیشہ مزید مصائب کا مقابلہ کرنے سے کتراتے رہے اور انہوں نے اپنی ... حالت کو اپنا نصیب سمجھ لیا ـــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو ... متعین کیا تھا ...

رہے، کہ اسے بلندست بلند تر بنانے کیلئے کوشاں بھی رہے ——— یہ چیز اختر صاحب کی ذہنی الجھنوں سے قطع نظر ان کی داخلی اور خارجی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اختر صاحب کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب میں سٹی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا ——— نویں دسویں جماعتوں کو انگریزی پڑھانا، خالی گھنٹے میں اسکول کے لان پر پائپ منہ میں دبائے ٹہلتے رہنا، یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ ان کے مراسم بھی چند پڑھانے اور بارعب قسم کے اساتذہ سے ہی تھے۔

طلبا کا ایک خاص مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے تبصرے کیا کرتے ہیں اور زیادہ تر ان اساتذہ کا ذکر خیر ہوتا ہے جن سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے ——— لہٰذا آٹھویں جماعت تک کے تمام طلبا ان کے متعلق بہت کم جانتے تھے لیکن اس کے برعکس ان جماعتوں کے طلبا میں اختر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہمیشہ رہا اور وہ ہر جماعت میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا کہ ایک دن کسی ہم جماعت نے پوری کلاس کو اطلاع دی ——— "اختر صاحب بہت بڑے شاعر ہیں ..." یقین جانیے ہم بھی سنتے تھے کہ اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور مدت تک ہم ایک دوسرے سے کہتے رہے ——— "اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور ان کی نظمیں لندن کے رسالوں میں چھپتی ہیں ——"

اس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اختر صاحب ہمیشہ سوٹڈ بوٹڈ رہتے۔ جوتے کی چمکتی پالش سے لے کر فرانسیسی طرز کے تراشیدہ بالوں تک سر سے پیر تک سک سے درست! کیا مجال کہ جوتے پر گرد جم جائے یا بالوں کی ایک آدھ لٹ پریشان ہو جائے ——— اور پھر عام طور پر مشہور تھا کہ اختر صاحب روزانہ سوٹ تبدیل کر کے آتے ہیں۔ اگر پورا سوٹ نہیں تو کوٹ پتلون میں سے ایک چیز تو ضرور اور اگر اتفاق سے دونوں میں سے کوئی چیز بھی تبدیل نہیں کی گئی تو ٹائی تو یقینی طور پر وہ نہیں ہوگی جو وہ کل باندھ کر اسکول آئے تھے ——— پھر لباس کی مناسبت سے سگریٹ کی بجائے پائپ منہ میں دبائے رہتے ——— چنانچہ ہم لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ اختر صاحب ولایت ہو آئے ہیں ——— انہی وجوہ کی بنا پر ہم لوگ اختر صاحب کو مکمل "انگریز" تصور کرتے تھے ——— (یہ دوسری بات ہے کہ اختر صاحب کے رنگ کی مناسبت سے انگریزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں) اور ہم لوگوں کا مکمل یقین تھا کہ اختر صاحب گھر کے اندر بھی ہمیشہ کھاتے پیتے ——— حتیٰ کہ لیٹنے اور سونے میں بھی مغربی انداز میں ہوں گے ——— بلکہ بیوی اور بچوں سے بھی انگریزوں کی طرح ملتے ہوں گے۔ انہی باتوں کے پیش نظر اختر صاحب کے چھوٹے بھائی ارشد سے جب میری اور دوسرے ساتھیوں کی ملاقات آٹھویں جماعت میں ہوئی تو ہم لوگ اس سے اکثر اختر صاحب کی گھریلو زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ——— اور وہ اکثر چڑھ کر کہتا۔

"آخر تم لوگ اختر صاحب کو سمجھتے کیا ہو ——— ؟"

جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو اختر صاحب کو قدرے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جب کہ اختر صاحب انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کلاس میں تشریف لائے۔

اختر صاحب کا معمول تھا کہ وہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ لئے کلاس میں داخل ہوتے ——— ایک ایسی مسکراہٹ جس میں سنجیدگی کا عنصر بھی زیادہ ہی ہوتا۔ ہم لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے ——— اختر صاحب گردن کے ایک مترنم سے جھٹکے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے ——— اختر صاحب کوٹ کی اوپر کی جیب سے رومال نکالتے ——— چشمہ اتار کر چہرے کو اچھی طرح صاف کرتے اور پھر چشمے کو صاف کر کے لگا لیتے ——— رومال کو خوشنما تہہ کر کے پھر کوٹ کے اوپر کی جیب میں لگا دیتے ——— لیکن کبھی ٹائی کی ناٹ بھی

ڈھیلی کرنے کی ضرورت پڑجاتی ---- اس کے بعد کتاب لے کر کھڑے ہو جاتے اور پڑھانا شروع کر دیتے۔

اختر صاحب پائپ بہت پیتے ہیں۔ اگر آپ ان کے کمرے میں جائیں تو اور چیزوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی میز پر پائپوں کا ایک اچھا خاصہ انبار نظر آئے گا ---- اور پھر پائپ سے متعلق دیگر اشیاء بھی۔ ممکن ہے ہر چیز آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دے ---- لیکن یہ حقیقت ہے کہ اختر صاحب کو پائپ ریپئر (REPAIR) کرنے اور اس کا تمباکو بنانے میں مہارت حاصل ہے ---- پائپ اختر صاحب کی زندگی کا ایک لازمی جُز ہی نہیں بلکہ "شریک زندگی" ہے ---- وہ گھنٹوں تنہا بیٹھے رہتے ہیں اور پائپ پیتے رہتے ہیں۔ جہاں اور جب بھی آپ اختر صاحب کو دیکھیں گے وہ پائپ ضرور پی رہے ہوں گے ---- لیکن کلاس کے اندر اختر صاحب نے پائپ کبھی نہیں پیا۔ جب پڑھانا ختم کر دیتے یا تنبیہ کرنے کے لئے دیتے تو کمرے سے باہر برآمدے میں جاکر ٹہلتے رہتے اور پائپ پیتے رہتے ---- ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ اختر صاحب کو بہت شدید قسم کی کھانسی ہوگئی تھی ---- پائپ ہی کی زیادتی کی وجہ سے ---- اور کلاس میں پڑھاتے پڑھاتے اس قدر سخت قسم کا دورہ پڑتا کہ کتاب میز پر رکھ کے برآمدے میں چلے جاتے اور کافی دیر تک کھانستے رہتے ---- اتفاق کی بات انہی دنوں اسکول کا معائنہ ہوا ---- اور جب اختر صاحب ہماری کلاس میں پڑھا رہے تھے تو انسپکٹر صاحبان گھومتے ہوئے آگئے ---- اور اختر صاحب کو پڑھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ اختر صاحب اطمینان سے پڑھاتے رہے ---- لیکن چند ہی منٹ بعد ان کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہونے لگا اور انہوں نے پوری قوت کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا ---- ہم لوگ متحیر کہ یہ ماجرا کیا ہے اور اختر صاحب ہیں کہ انتہائی بلند آواز میں پڑھائے جا رہے ہیں اور اسی تیزی سے چہرہ سرخ ہوتا جا رہا ہے ---- تھوڑی دیر بعد جب انسپکٹر صاحبان چلے گئے ---- تو اختر صاحب کتاب میز پر پھینک بُری طرح کھانستے ہوئے برآمدے میں گئے اور کافی دیر تک کھانستے رہے ---- جب کھانسی تھمی تو بڑے زور سے ہنستے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے۔ سب نے خیریت دریافت کی تو کہنے لگے ---- "جس چیز سے ڈرتا ہوں وہی سامنے آجاتی ہے ---- میں سوچ رہا کہ ان لوگوں کے سامنے کھانسی پریشان نہ کرے ---- اور ان لوگوں نے جوں ہی اندر قدم رکھا مجھے کھانسی آنے لگی ---- اب میرے سامنے ایک یہی راستہ تھا کہ میں سانس روک کے زور زور سے پڑھاتا رہوں"

اسکول نے اختر صاحب کی زندگی پر کافی گہرے نقوش چھوڑے ہیں ---- اس کے دو پہلو ہیں۔ اول تو یہ کہ اسکول میں رہتے ہوئے اختر صاحب کو "فاضل وقت" کافی ملا ---- چونکہ ایک اسکول ٹیچر کی مصروفیات بہ نسبت دوسرے شعبہ جات کے ملازمین کے کم ہوتی ہیں۔ سال میں چھٹیاں بھی کافی ملتی ہیں اور روزانہ کے اوقات میں بھی کافی فرق ہوتا ہے ---- دوسرے یہ کہ ہمارے معاشرے میں اسکول ٹیچر کی جو وقعت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دراصل یہ سارا نظام تعلیم نہ اساتذہ کو اچھی تنخواہیں دیتا ہے اور نہ ہماری سوسائٹی ایک اسکول ٹیچر کو اس کی جائز عزت دیتی ہے۔ گر ان حالات میں اول تو اس شعبہ کو اچھے دماغ ملتے نہیں ---- اور جو ذہین مجبور ہو کر آجاتے ہیں تو ان کی ساری صلاحیتیں کچل کر رہ جاتی ہیں ---- لہٰذا اختر صاحب کی حساس طبیعت پر ایک اسکول ماسٹر کی کم حیثیتی کا شدید احساس ہوا۔ ایک مرتبہ اختر صاحب اپنے کسی عزیز کے یہاں بریلی گئے۔ ایک شام ان کے میزبان لے کر کلب میں وہاں کے معزز شہریوں سے تعارف کرایا۔ ان لوگوں نے اختر صاحب کا بہ حیثیت شاعر اور ادیب بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا لیکن جوں ہی ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک اسکول ماسٹر ہیں تو ان کے سارے اشتیاق پر جیسے اوس پڑ گئی ----

ایک خط میں اسکول کی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں: ----

"یہ دس سال علیگڈھ میں جس ذلت، مصیبت اور پستی کی حالت میں گذارے ہیں ان کی یاد عمر بھر دل میں ناسور ڈالتی رہے گی ----"

اس قسم کی باتوں سے اختر صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ اسکول ماسٹری سے وہ کبھی مطمئن نہ ہوئے۔ لیکن اس دنیا سے نکلنے کے لئے انہوں نے کبھی جدوجہد بھی نہ کی۔ حالانکہ اسکول چھوڑنے کی خواہش ہمیشہ رہی ----

اس بنیادی وجہ کے علاوہ اختر صاحب کے گوشہ نشین ہونے میں چند چیزیں اور بھی کارفرما ہیں۔ — پہلی چیز تو یہ کہ اختر صاحب ادبی ذوق رکھتے تھے۔ لہٰذا جب انہیں اسکول میں ملازمت مل گئی اس سے قطع نظر کہ وہ اس سے مطمئن تھے یا نہیں — انہیں اپنے اس ذوق کی پرورش کرنا تھی — لہٰذا انہوں نے مطالعہ اور تصنیف کے لئے اسکول کے "فاضل وقت" سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا — ان کی تقریباً تمام ہی تصنیفات اسی دور کی ہیں — اختر صاحب کی زندگی میں ناکامی سے ہی ادب کو فائدہ پہنچا — اگر بالفرض اختر صاحب سوسائٹی میں کامیاب ہو جاتے تو یقینی بات ہے کہ اختر صاحب کی حیثیت جو اس وقت اردو ادب میں ہے وہ نہ ہوتی — یا جو کچھ انہوں نے اردو ادب کو دیا ہے وہ نہ دے سکتے۔

دوسری بات یہ کہ اختر صاحب کی مالی حالت اس قدر اچھی نہ تھی کہ وہ دنیا کے ہنگاموں پر خرچ کر سکتے لہٰذا انہوں نے اپنی قلیل آمدنی کو اپنی گھریلو زندگی پر ہی خرچ کرنا بہتر سمجھا — چونکہ اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو خاکہ مرتب کیا تھا۔ اس کے حصول میں انہیں خارجی طور پر ناکامی ہوئی تھی لہٰذا اس کی تکمیل اپنی خانگی زندگی میں کرنا تھی — اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ معیار ذہن میں رکھ کر اپنے کمروں کو (FURNISH) کیا۔ ایک خط میں اپنے کمروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اصل میں میری شاعری اور دوسرے ادبی کام کو مشہور ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن شہرت نصیب ہو رہی ہے میرے کمروں کو۔ یہ شہرت دور دراز کے مشہور شہروں تک پہنچ گئی ہے۔ ماشاءاللہ!"

ادبی تخلیقات کے علاوہ یہی کمرے اختر صاحب کی زندگی کا ماحصل ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ اپنی جنت میں اور وہ اپنی اس "جنت" کے تخلیق خالق کی حیثیت سے ان کمروں میں پڑے رہتے ہیں اور پانپ پیتے رہتے ہیں۔

اختر صاحب کی گوشہ نشینی سے جہاں انہیں ادبی کام کرنے کے لئے اور اپنی حسرتوں اور آرزوؤں کی داخلی طور پر تکمیل کے مواقع ملے وہاں ایک سب سے بڑا یہ بھی نقصان ہوا کہ وہ اس گوشہ نشینی سے مکمل طور پر آرام طلب اور سست ہو گئے — ان کی تخلیقی صلاحیتیں گہری نیند سو گئیں — اختر صاحب کے لئے یہ کہنا کہ وہ فطری طور پر شروع ہی سے آرام طلب اور سست تھے میرے خیال میں غلط ہے — جو شخص اپنی تعلیم کے دوران ہمیشہ نمایاں طالب علم رہا ہو — باپ کی موت کے بعد ناموافق ماحول کی پروا کئے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لئے لندن کا سفر کرے اسے بنیادی طور پر آرام طلب اور سست نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ وہ بعد کے واقعات اور حالات تھے جن کی وجہ سے اختر صاحب گوشہ نشین ہوئے۔ اور گوشہ نشینی نے انہیں آرام طلب اور سست بنا دیا۔ ان کی جدوجہد کرنے کی قوت کو زنگ چاٹ گئی۔ ان کی حساس طبیعت مسلسل ناکامیوں اور محرومیوں کی وجہ سے سہم گئی اور مزید مصائب کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کتراتی رہی — ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ کر سکے لیکن انقلاب کے ہمیشہ منتظر رہے —

اختر صاحب جب تک اسکول میں رہے انہیں تعلیم کے علاوہ فلمی دنیا اور آل انڈیا ریڈیو میں جانے کے مواقع بھی ملے۔ لیکن وہ اسکول نہ چھوڑ سکے — ایک مرتبہ شاید ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے کچھ جگہیں مشتہر ہوئیں۔ اختر صاحب نے بھی درخواست دینا شروع کیا۔ احباب سے مشورہ کرتے رہے اور سوچتے رہے — حتیٰ کہ آخری تاریخ آ گئی۔ لہٰذا رات کو فیصلہ کیا گیا کہ دہلی جا کر ہی درخواست دی جائے — چونکہ ڈاک سے درخواست کا پہنچنا ناممکن تھا۔ لہٰذا دوسرے دن علی الصبح پہلی گاڑی سے روانہ ہو گئے — اردو بازار میں چند احباب سے پھر مشورہ کیا — ان لوگوں نے کہا — "ارے! کس مصیبت میں پڑ رہے ہو [illegible]" — "کچھ ریڈیو کی ملازمت کے واقعات بھی سنائے — اور اختر صاحب [illegible] درخواست دیئے بغیر [illegible] واپس آ گئے

اسکول میں رہتے ہوئے وہ [illegible] کرتے تھے۔ لیکن [illegible] کے لئے پرابلم بنا [illegible] نے ایم اے کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک دو بار شاید فارم [illegible] [illegible]

خدا بھلا کرے حبیب الرحمان صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کا کہ وہ ایک دن اختر صاحب کو پکڑ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے اور انہیں دو ماہ کی چھٹی منظور کرادی اور مسلسل ایم۔ اے کے لئے تقاضہ کرتے رہے ۔۔۔ ایک خط میں خود اس کا تذکرہ کیا ہے ۔۔۔

"۱۹۴۰ء میں، میں نے ایم کیا ۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بھی صرف حبیب صاحب کے اخلاقی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ میں تو تیرہ سال سے ارادہ ہی کر رہا تھا اور اسکول میں پڑھا رہا تھا ۔۔" (خط بنام اظہر حسین صاحب)

ایم۔ اے پریویس تو کر لیا۔ مگر جب فائنل کا وقت آیا تو بہت بیمار ہوگئے ۔۔۔ اور وہ ہمت چھوڑ بیٹھے۔ احباب نے ہمت افزائی کی۔ روزانہ ان کو یقین دلایا گیا کہ بھئی آپ کو تو امتحان کی تیاری کی ضرورت ہی نہیں آپ یونہی نمایاں طور پر کامیاب ہو جائیں گے ۔۔۔ ہر شام اختر صاحب احباب سے وعدہ کر لیتے لیکن ہر رات "غور" کرتے اور ارادہ چھوڑ دیتے ۔۔۔ لیکن کچھ احباب بھی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے تھے۔ انہوں نے اختر صاحب کو اسٹریچر پر ہال میں پہنچا ہی دیا ۔۔۔ اور وہ کامیاب ہوئے اور نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ان کو لے لیا۔

جب اختر صاحب اسکول چھوڑ کر یونیورسٹی پہنچے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے خفتہ عزائم اور حوصلے پھر سے بیدار ہو گئے ہیں ۔۔۔ انہوں نے اپنے نئے ایک پروگرام مرتب کیا اور پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لینے کا عزم صمیم ۔۔۔ ایک سال تک وہ پی۔ ایچ ڈی کرنے کے لئے سوچتے رہے ۔۔۔ دوسرے سال داخلے کے لئے فارم منگائے گئے۔ لیکن وہ فارم کبھی پُر نہ ہو سکے اور پی۔ ایچ ڈی کا خمار آہستہ آہستہ اتر گیا ۔۔

اب وہ شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج چلے گئے ہیں ۔۔

شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج تک داستان بھی بڑی عجیب قسم کی ہے ۔۔۔ اختر صاحب جب شعبۂ اردو میں پہنچے تو انہیں قدرے اطمینان ہوا کہ چلو ڈھنگ کی ملازمت مل گئی۔ لیکن بقول ان کے بدقسمتی ان کی تاک میں رہتی ہے۔ لہٰذا انہیں وہاں بھی چین نصیب نہ ہوا جس اسامی پر ان کا تقرر ہوا تھا وہ تقسیم ہند کے بعد اردو کو دیس نکالا ملنے کی وجہ سے تخفیف میں آ گئی۔ لہٰذا اختر صاحب کو حکم ملا کہ اسکول واپس جاؤ ۔۔۔ اور اختر صاحب تلملا گئے ۔۔۔

"میرے معاملے میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا ۔۔۔ جو صورت حال تمہارے سامنے تھی وہی اب تک ہے۔ یونیورسٹی کھلنے پہ شاید کچھ ہو ۔۔ بہرحال یہ طے کر چکا ہوں کہ اسکول واپس نہیں جاؤں گا ۔۔۔ اگر شعبۂ اردو میں مستقل تقرر نہ ہوا تو وہاں بھی نہ رہوں گا ۔۔ اپنے آپ کو کافی تباہ کر چکا اب اس سے زیادہ کا حوصلہ نہیں۔ سترہ سال سے علی گڑھ میں پڑا گھس گھس کر رہا ہوں اور آج تک ۱۸۰ روپیہ کا لیکچرر نہ ہو سکا ۔۔"

اس خط میں جو علی گڑھ سے فرار کا ثبوت ملتا ہے ۔۔۔ وہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ڈھاکہ یونیورسٹی کے لئے دعوت ہے ۔۔۔ جس کے متعلق وہ اکثر سوچتے رہے اور ٹالتے رہے لیکن جب انہیں علی گڑھ سے قطعی مایوسی ہوئی تو انہوں نے خود ڈاکٹر شادانی کی طرف رُخ کیا ان واقعات کی تفصیل بھی ان کی زبانی سنئے ۔۔

"گرمیوں کی تعطیل میں، میں نے ارادہ کر لیا کہ ڈھاکہ چلا جاؤں گا اور شادانی صاحب سے خط و کتابت بھی کی۔ لیکن ایک ماہ سے زیادہ اس ارادہ پر قائم نہ رہ سکا۔ میرے دماغ پہ اس کا بہت بڑا اثر ہوا۔ دن کی نیند اڑ گئی اور طبیعت ہر وقت بے انتہا پریشان اور وحشت زدہ رہنے لگی ۔۔۔ اتفاق سے شادانی صاحب رام پور آئے۔ میں نے سوچا کہ جب ڈھاکہ جا رہا ہوں تو ان سے ملنا اخلاقی فرض ہے ۔۔ چنانچہ رام پور گیا ۔۔۔ ان سے گفتگو کر کے میں نے محسوس کیا کہ میرا وہاں جانا حماقت ہوگی ۔۔۔ تفصیل ممکن نہیں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب مجھے ان سے پتہ چلا کہ وہاں زندگی خاصی مہنگی ہے اور مکان نایاب ہیں ۔۔۔ نیز بڑی کوشش کے بعد وہ ایک کمرے والا فلیٹ دلوا سکیں گے۔ تو میں نے دل میں کہا کہ کیا میرے دماغ میں پھوڑا نکلا ہے کہ میں دہلی کی جائیداد چھوڑ دوں، علی گڑھ کا آٹھ دس ہزار کا سامان خاک میں ملا دوں ۔۔۔ جمی جمائی زندگی پہ لات ماروں اور وہاں جا کر دو کمروں میں رہنا شروع کر دوں۔ اس وقت میں نے طے کر لیا کہ ہر حال میں یہیں رہوں گا ۔۔ چاہے اسکول ہی جانا پڑے ۔۔۔ چنانچہ وہ بدحواسی

جو مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے طبیعت بیمار تھی فوراً دور ہو گئی اور میں نہایت خوش و خرم علی گڑھ واپس آیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پرنسپل ٹریننگ کالج حبیب صاحب میرے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں اور مجھے اپنے یہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ کیونکہ خورشید الاسلام کراچی گئے ہوئے تھے اور خیال تھا کہ وہیں رہ جائیں گے اور شعبہ اردو میں ایک جگہ اور خالی ہو گی جس پر کب تک میرا تقرر ملتوی کیا جاتا رہے گا۔ گذشتہ تین سالوں میں بار بار ایسا ہوا کہ شعبہ اردو میں جگہ خالی ہوئی اور تخفیف میں لے آئی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ خورشید صاحب کے نہ آنے میں میرا فائدہ تھا اس لئے وہ واپس آ گئے — جب وہ واپس آ گئے تو میں دیوانہ وار حبیب صاحب کی طرف بھاگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال یکم نومبر ۵۰ء سے میرا تقرر مستقل لیکچرار کی حیثیت سے بغیر PROBATION کے کیا گیا ۔۔۔ اور علی گڑھ میں ۱۷ سال پاپڑ بیلنے کے بعد میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ میں بھی ملازم ہو گیا — چنانچہ اب ٹریننگ کالج میں ہوں۔ گھر سے ملا ہوا کالج ہے بڑے آرام کی زندگی ہے — — — میں نے ایم ایڈ میں داخلہ لے لیا ہے۔ چند ماہ میں مقالہ لکھ کر ختم کر دوں گا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لوں گا۔ اور اب اردو کے بجائے ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(خط بنام اظہر حسین صاحب)

لیکن شاید آج تک نہ وہ ایم ایڈ کر پائے ہیں اور نہ پی ایچ ڈی —

اختر صاحب کا روزانہ کا معمول ہے کہ وہ کالج سے آتے ہی غسل خانہ میں گھس جاتے ہیں — اس سے پیشتر کہ پسینہ خشک ہو، وہ اپنے جسم پر پانی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں — غسل کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں کمرہ بند کر کے سو جاتے ہیں — دن کی نیند اختر صاحب کو رات کی نیند سے زیادہ عزیز ہے۔ رات کو دو ڈھائی بجے سونا تو معمول کی بات ہے اگر اختر صاحب کو رات بھر جاگنا پڑے تو وہ بخوشی رات گزار دیں گے لیکن دن کی نیند ختم کرنے کے لئے دوپہر کا کھانا تو لازمی طور پر ترک کرنا ہوتا ہے — سردیوں میں جب اسکول کا وقت صبح دس بجے سے شام چار بجے تک ہو جاتا ہے تو اختر صاحب شام چار بجے اسکول سے واپس آ کر سوتے ہیں — دوپہر کو دو تین گھنٹے ضرور سوتے ہیں۔ سونے کے بعد کمرہ کی صفائی — ہر چیز کو صاف کرنے کے بعد اس کی مخصوص جگہ پر رکھنا روزانہ کا فریضہ ہے — کمروں کی صفائی اور چیزوں کی ترتیب کے معاملے میں اختر صاحب کو نہ ملازم پر بھروسہ ہے اور نہ بیوی پر — لہٰذا اس کام کو وہ بڑے انہماک، جوش اور شوق کے ساتھ خود کرتے ہیں۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد پھر غسل کرتے ہیں اور بالوں وغیرہ کو سنوارنے کے بعد اپنے کوچ پر آ کر پائپ سے شغل شروع ہو جاتا ہے — اسی دوران میں چائے آ جاتی ہے اور پھر اس کے بعد ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اختر صاحب سے ملاقات کرنے کا مخصوص وقت ہے۔ لہٰذا ہر شخص چراغ جلے ملنے آتا ہے اگر کوئی شخص پیشتر آ جائے تو اس سے اختر صاحب کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور اس شخص کو بھی — چونکہ ان کے معمول میں خلل پڑ جاتا ہے وہ کسی سے ملنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ملنا پڑتا ہے — ملاقاتی کو یا تو یہ سن کر ناامیدی ہوتی ہے کہ اختر صاحب سو رہے ہیں یا پھر برآمدے میں بیٹھ کر کافی دیر تک انتظار کرنا ہوتا ہے۔

احباب سے ملاقات کا سلسلہ رات کے دس گیارہ بجے تک رہتا ہے — اس دوران میں ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں، مشاعرے بھی ہوتے ہیں، خوش گپیاں بھی ہوتی ہیں، اختر صاحب اپنی مرحوم حسرتوں اور شکستہ امیدوں کا ماتم بھی کرتے ہیں۔ قسمت کو گالیاں بھی دے لیتے ہیں اور کمرے کی چمکتی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ایک فاتح کی طرح مسکرا دیتے ہیں۔

اختر صاحب کے ملاقاتیوں میں اسکول کے طالب علم بھی ہوتے ہیں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے بھی — یونیورسٹی کے نوعمر لیکچرار بھی ہوتے ہیں اور پیران کہنہ سال بھی — شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں اور غضنفر صاحب (لیکچرار ٹریننگ کالج) جیسے فلسفی بھی جو اکثر بیٹھے بیٹھے فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں محو ہو جاتے ہیں اور اختر صاحب مزے میں پائپ دبائے دوسری طرف بیٹھے رہتے ہیں یا دیگر احباب سے باتیں کرتے ہیں۔

اختر صاحب اپنے احباب کے حلقے میں جتنے زیادہ مقبول ہیں وہ شروع کی چند ملاقاتوں میں بہت کم کھلتے ہیں اور ملنے والے کو قدرے کلفت

سی جی ہونے لگتی ہے ـــ لیکن جب بے تکلف ہوتے ہیں تو اس کے سامنے اپنی محرومیوں کا اس بے تکلفی سے ماتم کرتے ہیں کہ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اختر صاحب سے اس کے مراسم بہت گہرے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اسے اختر صاحب کے ساتھ ہمدردی کے علاوہ عقیدت بھی ہو جاتی ہے۔ رات کو جب متعدد احباب اختر صاحب کے یہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ہر شخص اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب دوسرے حضرات تشریف لے جائیں تو میں اختر صاحب سے باتیں کروں ـ چنانچہ یہ سلسلہ کافی طویل ہو جاتا ہے۔

لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد اختر صاحب کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ دیر برآمدے میں چہل قدمی کرنے کے بعد اپنے کوچ پر آ کر لیٹ جاتے ہیں۔ تازہ رسائل پڑھتے ہیں، پائپ پیتے ہیں، اپنی سسکتی ہوئی حسرتوں کو پکارتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے راہیں سوچتے ہیں ـــ یہی وقت مطالعہ اور تصنیف کا ہوتا ہے۔ لیکن لکھنا تو انہوں نے ۱۹۴۰ء سے مستقل طور پر چھوڑ رکھا ہے ـــ ہاں مطالعہ روزانہ کرتے ہیں اور پھر رات ایک دو بجے اندر مکان میں جا کر سو جاتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوست احباب نہیں آتے یا جلدی رخصت ہو جاتے ہیں تو اختر صاحب ریڈیو سنتے رہتے ہیں یا پائپ پیتے رہتے ہیں۔ ریڈیو وہ اس قدر دھیمی آواز میں سنتے ہیں کہ کمرے میں بیٹھا ہوا دوسرا شخص مشکل سے ہی سن پاتا ہے ـــ لیکن وہ اپنے کوچ پر لیٹے رہتے ہیں، ریڈیو ان کے سرہانے دھیمی آواز میں بجتا رہتا ہے، پائپ پیتے رہتے ہیں اور سنتے رہتے ہیں ـــ ایک شب ریڈیو سن رہے تھے۔ شاید کوئی ڈرامہ ہو رہا تھا کسی کردار نے ایک شعر پڑھا۔ سن کر چونک گئے۔ اور بڑی دیر تک اس شعر کو پڑھتے رہے اور سر دھنتے رہے ـــ دفعتاً خیال آیا کہ یہ تو خود ان کا ہی شعر ہے ـــ لہٰذا فوراً اپنا مجموعہ کلام نکال کر تصدیق کی۔

اختر صاحب فطرتاً بہت زیادہ نفاست پسند ہیں۔ ان کی خارجی زندگی میں یہ نفاست پسندی دوسرے لوگوں کو تصنع کی حد تک معلوم ہوتی ہے۔ اختر صاحب کا ریٹائر ہونے کے بعد گھر سے بہت کم نکلتے ہیں ـــ اس کی وجہ آرام پسندی اور گوشہ نشینی کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ زیادہ تر احباب تو ان کے گھر ہی آ جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں دوسروں کے گھر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ لیکن جب کسی دوست سے ملے ہوئے بہت دن گزر جاتے ہیں تو بے چین ہو کر خود اس کی تلاش میں نکلتے ہیں ـ بازار وغیرہ بھی ماہ دو ماہ میں ایک دو بار ہی جاتے ہیں ـــ لیکن جب اختر صاحب گھر سے نکلتے ہیں خواہ بازار جانے کے لئے، کسی تقریب میں شرکت کے لئے یا کسی دوست سے ملنے کے لئے ـــ نکلتے ہیں ہمیشہ لیس کانٹے سے لیس ہو کر ہی ـــ منزل پر پہنچ کر رومال سے چہرے اور چشمے کے شیشوں کو صاف کرنا ان کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے ـــ اس کے بعد کنگھا نکال کر بالوں میں پھیرتے ہیں خواہ بال بکھرے ہوئے ہوں یا نہیں۔ جوتے کو خوب رگڑ کر چمکاتے ہیں۔ چہرہ اور جوتے کو صاف کرنا ان کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ اگر جوتے پر گرد بھی ہوتی ہو تو اس گرد کا عکس ساری شخصیت پر پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے ـــ اگر جیب میں دو رومال نہیں ہیں تو وہ ایک ہی رومال سے دونوں کا کام کر لیتے ہیں ـــ ان چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد پائپ میں تمباکو ڈالتے ہیں۔ تب کہیں جا کر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مٹی اور دھوئیں سے اختر صاحب بُری طرح بھاگتے ہیں ـــ اگر سڑک پر گرد اڑتے ہوئے یا بیٹھے ہوئے خاک دھول اڑ کر ان کے اوپر آ جائے تو اختر صاحب اپنا چہرہ پیٹ لیتے ہیں۔ اپنے شانے اور کوٹ کو اس طرح جھاڑنا شروع کر دیتے ہیں جیسے ماتم کر رہے ہوں ـــ وہ علی گڑھ میں مٹی اور جون کی لوؤں میں کمرے کو چاروں طرف سے بند کئے پسینہ میں شرابور پڑے رہتے ہیں، ایک ایک روزن کو اچھی طرح بند کر دیتے ہیں کہ مبادا ان میں سے دھول کے ذرّے آ جائیں۔

اختر صاحب کی زندگی میں دو چیزیں نہایت واضح ہیں ـ مایوسی اور محرومی ـــ مایوسی کی ابتدا ان کی عملی زندگی کے ساتھ ہوئی۔ میرے خیال میں ان کی زندگی میں کوئی ایسے غیر معمولی قسم کے واقعات تو ہوئے نہیں جن کا مداوا ہی نہ تھا ـــ البتہ اختر صاحب کی ناز و نعم میں پلی ہوئی غیر معمولی حساس طبیعت نے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی ایک پہاڑ سمجھا اور ان میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس چوٹی کو سر کرتے۔ کوشش کرنا تو درکنار انہوں

نے رائی کو پہاڑ سمجھ کر اپنا سر پیٹ لیا قسمت کو گالیاں دیں اور دنیا سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے انہیں یہ بھی گلہ رہا کہ وہ ایک خاص انسان ہیں۔ لیکن لوگ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے —— لیکن انہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ ہماری سوسائٹی اس شخص کو منہ ہی نہیں لگاتی جو "مکھن" کے دو چار ڈبے جیبوں میں ڈالے ناخداؤں کے درباروں کا طواف نہ کرے۔ خواہ وہ کتنا ہی قابل، عالم فاضل کیوں نہ ہو —— یہی حال ادبی دنیا کا ہے —— انہیں شکایت ہے کہ ادب والوں نے انہیں وہ جگہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے اور انہیں اکثر و بیشتر نظر انداز کیا گیا۔ تو یہاں بھی وہی چیز کار فرما ہے —— اختر صاحب ہنگامہ سے بھاگتے رہے —— وہ شاعر ہیں لیکن مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے خواہ مشاعرہ ان کے گھر کے قریب ہی ہوتا ہے وہ گروہ بندی کے بھی قائل نہیں۔ اگر وہ بھی ایک گروہ یا حلقہ بنا لیتے تو آج انہیں قطعاً یہ شکایت نہ ہوتی۔

اختر صاحب کی زندگی میں مایوسی اس قدر رچ گئی ہے کہ اب وہ ہر کام کی ابتدا ہی سے مایوس ہو کر کہنے لگتے ہیں۔ "چونکہ یہ کام میں کر رہا ہوں اس لئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا" —— مایوسی اور قسمت سے گلہ اختر صاحب کی زندگی میں قدم قدم پہ ملتا ہے

" دوسرے روز صبح ہی سے بڑی شدت کے ساتھ چلنے لگی اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا میں نے جو گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا —— "

(خط بنام اظہر حسین صاحب قادری)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں ——

" . . . . . غالب نے اپنے خطوط میں کہیں اپنی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ میں نے جس سے عشق کیا اس کو مار رکھا اور جس فرمانروا کی شان میں قصیدہ لکھا اس کی سلطنت کا بیڑا غرق ہوا۔ تو بھئی غالب کی کوئی اچھی خصوصیت تو مجھ میں ہوتی، مگر یہ ایک بدوصف جو ان میں تھا میرے اندر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے — مختصر یہ کہ اول درجہ کا منحوس ہوں —— جہاں جاتا ہوں اس نحوست کا اثر ساتھ لے جاتا ہوں —— آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے ستر سال پہلے ۱۹۴۲ء میں جب میں نئی ملازمت میں ٹیچر ہو کر آیا تھا تو بیاسی روپیہ ماہوار تنخواہ تھی [illegible] نہیں ہوتا تھا [illegible] INCREMENT [illegible] دس روپے مہینے ملتے تھے [illegible] مالی حالت خراب ہو گئی [illegible] استادوں کی [illegible] رہیں —— اور اس کے بعد [illegible] پنپ نہیں سکا اور اس کی مالی حالت گرتی ہی چلی گئی پھر جب میں نے خدا خدا کر کے ایم اے کیا اور شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گیا تو میرے تقرر کے بعد ہی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تم پر آ پڑا چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ اردو کو [illegible] ملا [illegible] دیس نکالا مل گیا۔ اور شعبہ اردو دم توڑنے لگا —— گویا میں اردو میں ایم اے کر کے ہندوستان میں اردو کا ستارہ گہنا گیا۔ اور صاحب! تکلف بر طرف میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسری بڑی لڑائی بھی صرف اس لئے لڑی گئی کہ ۱۹۴۲ء میں میری تنخواہ کسی قدر معقول ہو گئی تھی اور سخت ضرورت اس بات کی تھی کہ مہنگائی زیادہ سے زیادہ ہو [illegible] میں مستور جھوکا بنگال بنا رہوں —— چنانچہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے خاک دھول سے کس قدر وحشت ہوتی ہے —— آسمان پہ آندھی کا ہلکا سا غبار نظر آتا ہے تو میرا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ علی گڑھ تیزی سے ساتھ صحرا بنتا جا رہا ہے —— آپ کے سر کی قسم اگر میں پہاڑ کی چوٹی پہ سکونت اختیار کر لوں تو وہاں بھی خاک اڑنے لگے —— "

اس سلسلے میں اختر صاحب نے مجھے اس طرح لکھا تھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جب سے یونیورسٹی میں آیا تھا۔ بہت خوش تھا اور بہت مطمئن تھا اور "ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے" کے مصداق یہ سوچ سوچ کر لرزتا رہا تھا کہ دیکھئے کیا مصیبت نازل ہونے والی ہے ——— خوف بھری نظروں سے باری باری اپنے سب بچوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ خدا جانے ان میں سے کون اللہ کو پیارا ہونے والا ہے ——— بارے اس معبودِ حقیقی نے میرے بچوں کی جاں بخشی کی اور صرف میری ملازمت کی جان پر بنی۔"

اس مسلسل مایوسی نے اختر صاحب کو زندگی میں محرومی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ اس مایوسی سے قطع نظر اپنی آرزوؤں اور مسرتوں کے حصول کے لئے سوچتے رہتے ہیں اور اگر اتفاق سے ان کے حصول کا موقعہ مل جاتا ہے تو ایک حقیقی فاتح کی طرح قہقہے لگاتے ہیں ———

اسکول سے جب اختر صاحب شعبہ اردو میں آئے تو ان کی مالی حالت پہلے کی نسبت کافی بہتر ہو گئی۔ اول تو یہ کہ آمدنی میں اضافہ ہوا دوسرے یہ کہ چھوٹے بھائیوں کے ملازم ہونے سے ان کے شانوں سے بار بھی کم ہو گیا۔ لہٰذا اختر صاحب کے پاس گھر کے اخراجات نکالنے کے بعد ایک اچھی خاصی رقم بچنے لگی کچھ پس انداز رکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا انہوں نے بے تحاشا قیمتی چیزیں خریدنی شروع کیں۔

اختر صاحب کے پاس پائپ ہمیشہ ضرورت سے زائد رہے لیکن کوئی اس قدر قیمتی پائپ نہ تھا جو ان کے شوق کی صحیح طور پر تسکین کرتا لہٰذا ۔ ۔ روپیہ کا DUNHILL خریدا۔ اسی طرح ۵۰ روپیہ کا RONSON لائیٹر خرید لیا۔ اختر صاحب سگریٹ بہت پیتے ہیں ایک مرتبہ دہلی گئے۔ پندرہ روپیہ کا سگریٹ کیس پسند آگیا خرید لائے۔ دریافت کیا "بھئی یہ کس لئے؟" جواب ملا "بس یونہی"! ایک مرتبہ دہلی سے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد پینتالیس روپے کا جوتا اور ایک فیلٹ ہیٹ خرید کر لائے ہر دوست سے فخریہ کہا "کم از کم دہلی میں اس سے اچھا جوتا نہیں تھا ——— پورے دس دن بھاگ دوڑ کرنے کے بعد دستیاب ہوا ——— " لیکن فیلٹ ہیٹ چند دن بعد ہی طبیعت سے اتر گیا اور آخرکار ایک دوست کو عنایت فرما دیا۔

انہی دنوں اختر صاحب گرلز کالج میں بھی PART TIME LECTURE ہو گئے۔ آمدنی کے ساتھ ساتھ مصروفیت بھی بڑھ گئی۔ لہٰذا سائیکل کی ضرورت ہوئی۔ ایک پرانی سائیکل گھر میں پڑی تھی۔ اس کا بناؤ سنگار کرایا گیا لیکن بڈھی گھوڑی پر لال لگام نہ جچی۔ اسے فروخت کرکے تین سو روپے کی ریلے سائیکل خرید ڈالی ——— حالانکہ سائیکل چلانے سے اچھی طرح واقف بھی نہ تھے اور ایک دن ایسی ٹکر ہوئی کہ ہفتہ بھر تک پٹیاں باندھے رہے۔

ایک مرتبہ علیگڑھ میں راجے صاحب امراؤ سنگھ کی دوکان پر کھڑے تھے۔ شوکیس میں رکھا ہوا ٹائم پیس کا بنا ہوا گھڑی کا اسٹینڈ پسند آگیا ——— اختر صاحب نے قیمت دریافت کی۔ جواب ملا "صاحب یہ تو ہم دوکان کی شو کے لئے لائے ہیں فروخت کرنے کے لئے نہیں ——— آج تک کسی نے ہم سے طلب نہیں کیا" لیکن اختر صاحب بضد اور ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ——— لہٰذا خرید لیا ——— اسی طرح اختر صاحب نے اپنے کمرے کی آرائش میں اضافے کئے ہیں ———

اختر صاحب جب بھی کوئی چیز خریدتے ہیں تو سب سے اعلیٰ کوالٹی کی پسند کرتے ہیں۔ عمدہ اور حسین چیز خریدنا ایک طرح سے ان کی HOBBY ہے۔ ان کے سامنے ایک ہی قسم کی اگر دو چیزیں رکھ دی جائیں اور ایک کی قیمت کم اور ایک کی قیمت زیادہ بتائی جائے تو زیادہ قیمت کی چیز لینا پسند کریں گے ——— وہ جب کبھی کسی دوکان پر جاتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ دوکان کی اشیاء کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ عام طور پر دوکان دار سے چیزیں کم طلب کرتے ہیں بلکہ مطلوبہ اشیاء کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں اور دوکان دار پیک کرتا جاتا ہے ——— قیمت ٹھہرانا ان کے بس کی بات نہیں ———

اختر صاحب تنگ دست رہتے ہیں لیکن دل ہمیشہ غنی رکھتے ہیں۔ قرض مانگنے والوں کو وہ شاذونادر ہی مایوس کرتے ہیں۔ پھر اس قرض کی

واپسی کا انتظار بھی کرتے رہتے ہیں ——۔ ایک مرتبہ سکول کا چپراسی ایک خط بلکہ عتاب نامہ لے کر آیا کہ آپ یا تو اسکول واپس آ جائیے یا اپنی جگہ سے مستعفی ہو جائیے —۔ ان دنوں اختر صاحب شعبہ اردو میں آ چکے تھے اور وہاں بھی معاملہ ڈانواں ڈول تھا۔ مہینہ کی آخری تاریخیں تھیں۔ جیب میں شاید دو ہی روپے تھے وہ چپراسی کو دے دیئے — کیونکہ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ چپراسی ایک عرصہ کے بعد گھر پر آئے اور خالی ہاتھ واپس جائے۔

اختر صاحب اشتراکیت کے حامی ہیں — انہیں دعوٰی ہے کہ انہوں نے اشتراکیت کو پڑھا ہے، سمجھا ہے اور اسے اپنی نفسیات میں پیش کیا ہے لیکن اختر صاحب کی اشتراکیت ان کی ذات تک ہی محدود رہی ہے وہ نہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنے اور نہ ان کے کسی جلسے میں شریک ہوئے ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں کی گرفتاریاں ہوئیں یونیورسٹی سے بھی چند طلباء اور اساتذہ گرفتار ہوئے۔ اختر صاحب کو پریشانی لاحق ہو گئی، چونکہ صرف کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ وہ ادیب اور شاعر بھی گرفتار کئے جا رہے تھے جنہیں اشتراکیت سے ہمدردی تھی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے — "یوں تو نظر بندی سے کوئی ڈر نہیں۔ لیکن بیٹھے بٹھائے سارا سکون درہم برہم ہو جائے گا —"

مذہب سے اختر صاحب کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ وہ عید اور بقر عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ لیکن قربانی ضرور کرتے ہیں — خواہ وہ بچوں کی خاطر کرتے ہوں یا احباب کے لئے لیکن مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں — وہ دہلی کے سٹیشن پر NON VEGETRIAN ہوٹل میں جا کر کھانا بھی کھا لیتے ہیں —

گاندھی جی کے مرنے کی خبر سن کر انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ کمرہ صاف کرتے کرتے افسردہ ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے — لیکن اس لئے نہیں کہ گاندھی جی ہندوستان کے بڑے لیڈر تھے یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک "عظیم انسان" تھے۔

ایک مرتبہ اظہر حسین صاحب قادری نے دعوت افطار کی — اختر صاحب کو بھی بلایا — اختر صاحب افطار کا وقت ختم ہونے کے بعد پہنچے سب نے دریافت کیا "بھئی دیر کیوں ہو گئی —" جواب دیا — "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں بے روزہ دار ہو کر آپ لوگوں کے ساتھ شرکت کروں — لہٰذا اب آپ لوگ افطار کر چکے ہیں۔ باقی کے پروگرام میں آپ کا شریک ہوں —"

آپ اختر صاحب سے گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہیئے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی لیکن دبی دبی سی۔ یا طنز میں ڈوبی ہوئی — وہ خود کسی محفل میں کسی نشست میں ایسا واقعہ بیان نہیں کر سکتے جس سے سامعین کے پیٹوں میں بل پڑ جائیں — لیکن برخلاف اس کے ان کے سامنے اگر کوئی پر مزاح واقعہ یا لطیفہ بیان کیا جائے تو وہ انتہائی لطف لیتے ہیں، خوب ہنستے ہیں، بار بار بیان کراتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں —

ایک مرتبہ اختر صاحب "ریڈیو ٹاک" کے سلسلے میں دہلی گئے — میں بھی ہمراہ گیا۔ غازی آباد سے عطا محمد (مشہور فنکار جو کہ اب تحصیلداری کے فائلوں میں دب کر رہ گئے ہیں) بھی ہم رکاب ہو گئے — اس دن اختر صاحب بہت خوش تھے — واپسی پر جامع مسجد سے ریلوے اسٹیشن تک متعدد لطیفے بھی سنا ڈالے۔ جب ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے تو ریل پلیٹ فارم پر آ چکی تھی، حالانکہ روانہ ہونے میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے — عطا محمد تو قمیض اور پینٹ کا تکیہ بنا کر انڈرویر پہنے برتھ پر دراز ہو گئے — اختر صاحب نے اسٹیشن کے باہر شرنارتھیوں کی دوکانوں پر چاٹ کھانے کا ارادہ ظاہر کیا — میں نے کہا "اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں اور سنا ہے کہ یہاں رات میں مسلمانوں کے لئے نکلنا ٹھیک نہیں — بہتر یہی ہے کہ اسٹیشن پر رہیئے —" (یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے جب کہ فسادات تھمے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا) لیکن اختر صاحب نہیں مانے کہنے لگے — "ہم لوگ سوٹ پہنے ہوئے ہیں — انگریزی میں بات کریں گے، کوئی نہیں پہچانے گا —" بہرحال ہم لوگ اسٹیشن کے باہر پہنچ گئے — اختر صاحب نے خوب مزے لے لے کر چاٹ کھائی۔ ہم لوگوں نے اس دوران میں بہت کم بات کی لیکن جو بات کی وہ انگریزی میں کی۔ مجھے تو کسی حد تک ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن اختر صاحب بالکل بڑے اطمینان سے چاٹ کھاتے رہے —— اختر صاحب نے جب دوکان دار کو پیسے دیئے تو وہ کہنے لگا۔

"بابوجی آپ لوگوں نے بڑی ہمت کی —— ویسے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن سالے بدمعاشوں کو کون روکتا ہے —— آپ لوگ اب

اسٹیشن پہ ہی رہئے؟

اختر صاحب کی عمر اس وقت تقریباً ۵۴ سال ہے۔ اس عمر کو اگر جوانی نہیں کہہ سکتے تو شاید بڑھاپا بھی نہیں کہہ سکتے — لیکن اختر صاحب کو اپنے بوڑھے ہونے کا احساس آج سے پانچ سال قبل ہی سے ہو گیا ہے۔

"ہاں ایک بات لکھنی بھول گیا — بڑی تیزی کے ساتھ زندگی کے مدارج طے کر رہا ہوں۔ میرا مکان یونیورسٹی کی آخری حد ہے۔ میرے مکان سے کوئی سو قدم آگے ٹریننگ کالج ہے۔ جہاں تک میں پہنچ چکا ہوں ٹریننگ کالج سے سو قدم آگے قبرستان ہے؛ وہ میری آخری منزل ہوگی جیسا کہ ہر انسان کی ہوا کرتی ہے۔ زندگی کے مدارج طے کرنے کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب میری عمر ۴۱ سال کی ہوگی — بال سفید ہو گئے — آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی اور چہرے سے بڑھاپا ٹپکتا ہے — زندگی بڑی ظالم ثابت ہوئی ......"

(خط بنام اظہر حسین صاحب قادری)

اختر صاحب کی زندگی بڑی ظالم ثابت ہوئی ——— ٹھیک ہے —— اس نے مایوسی دی — محرومی اور ناکامی دی — آرزوؤں اور حسرتوں کو کچل ڈالا —— لیکن اختر صاحب میں اتنی جرأت بھی تو نہیں کہ باقی ماندہ زندگی کو زیادہ عیش و آرام سے گذار یں —— وہ ناکامیوں اور نامرادیوں سے اس درجہ خائف ہو گئے ہیں کہ آگے قدم بڑھانا چاہتے ہیں، قدم اٹھاتے ہیں اور پھر وہیں قدم جما لیتے ہیں۔

جب اختر صاحب ٹریننگ کالج میں ۲۶۰ روپیہ کے مستقل لیکچرار ہو گئے تو شادانی صاحب نے ڈھاکے سے پھر ایک بار دعوت دی۔

" اور سنئے گذشتہ ہفتہ شادانی صاحب کا ایک خط پھر آیا — لکھتے ہیں کہ کچھ دن ہوئے تم نے اپنے ایک دوست کی سفارش کی تھی (مطلب مجھی سے ہے) اب وقت آیا ہے کہ میں ان کے لئے کچھ کر سکوں —— ۴۰۰ روپیہ تنخواہ دلوا سکتا ہوں اور ۷۰ روپیہ مہنگائی الاؤنس —— "

اس خط کو پا کر وہ ساری کشمکش اور ذہنی انتشار جس کا تین ماہ شکار رہا پھر زندہ ہو گئی —— مگر میں بھی بڑا اڑیل ہوں — مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو سمجھا لیا —— " خوئے بدرا بہانۂ بسیار " —— اور شادانی صاحب کو انکار لکھ دیا ..... " اور جمیل کا پانی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے —— " کون اس برسوں پرانے سکون کو چھوڑ کر پتھروں سے سر ٹکرائے — "

اتنا کچھ لکھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ اختر صاحب کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکا —— اول تو ان کے ادبی کام کا ذکر بالکل نہیں آیا —— خیر یہ چیز تو میرے موضوع سے خارج تھی کیونکہ یہ ادبی نقادوں کا منصب ہے میرا نہیں — ویسے یہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ اردو کی دنیائے ادب میں اختر صاحب کی حیثیت معزز ترین ہے — "معزز ترین" کا لفظ میں نے سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے، اس لئے کہ اختر صاحب اردو ادب میں شاعر، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے مستقل مقام رکھتے ہیں —— ہمارے لکھنے والوں میں متعدد حضرات ایسے ہیں جو دو حیثیتوں سے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھتے ہیں ——

علاوہ ازیں اس مضمون میں، میں اختر صاحب کی ان ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا ذکر بالکل نہیں کر سکا جنہوں نے کم و بیش سات آٹھ سال سے انہیں معطل کر رکھا ہے اور جن کو بطور عذر کے اختر صاحب نے ایڈیٹروں کے خطوط کا برسوں سے مستقل جواب بنا رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انسان کی زندگی کا نازک ترین پہلو ہوتا ہے اور نہایت گہرے اور قریبی مطالعہ کے بغیر اس کے ذکر سے عہدہ برآ ہونا قطعی ناممکن ہے۔ میں اختر صاحب سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اس گہرے اور قریبی مطالعے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اسی لئے میں نے اس چیز کا ذکر چھیڑنے سے عمداً اجتناب کیا — ان دو چیزوں کے علاوہ — میرا خیال ہے کہ میں اختر صاحب کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے حساس بیدار اور خوبصورت ضمیر کو بھی پورے طور پر بے نقاب نہیں کر سکا۔ جس کا سبب تنگ دامانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آخر میں اتنا اور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پانچ سال پیشتر تک کی معلومات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ ان پچھلے چند سالوں میں اگر اختر صاحب کی شخصیت کی نئی تہیں نظروں کے سامنے آئی ہوں اور یقیناً آئی ہوں گی، تو ان سے میں بے خبر ہوں! ....

شاد عارفی

طاہرہ اختر

لڈن ماموں ـــــ اگر آپ اسے سمجھ نہ پائیں تو عرض کردوں کہ یہ نام انہی "پُراسرار شاعر" (بہ قول ماہنامہ ادبِ لطیف) کا گھریلو عرف ہے جنہیں ادبی حلقے احمد علی خاں شاد عارفی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان دو ناموں کے علاوہ موصوف کے دو نام اور بھی ہیں۔ ایک لطف علی خاں اور دوسرے پاپا۔ پہلا نام حامد ہائی اسکول کے درجہ الف کے ماسٹر کی غلطی کا ممنون ہے جو اسکول کی ساتویں جماعت تک چلتا رہا اور پھر درخواست دے کر حقیقی نام احمد علی خاں میں تبدیل کرا دیا گیا۔ مگر اس زمانے کے ساتھی انہیں آج بھی اسی نام سے جانتے ہیں۔ دوسرا نام "پاپا" لڈن ماموں کے بھتیجوں سے منسوب ہے جو محلہ بھر میں "قبولِ عام" کی سند حاصل کر چکا ہے۔

وہ جو کہا گیا ہے کہ ہر نام اپنے مسمّی پر اثر پذیر ہوتا ہے اس لیے بالکل ٹھیک ہے کہ محلہ بھر کے بچوں اور جوانوں میں لڈن ماموں پاپا کا کردار اس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں جیسے علی گڑھ کے ابّا حلیم طلبا میں گھرے بیٹھے ہوں اور بچے یا جوان یہ محسوس نہ کر رہے ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ان سے بڑی عمر کا آدمی بیٹھا ہے۔ نصیحت کرنے کا انداز بھی ان کا اپنا انداز ہے جس میں طنز اس طرح شامل ہوتا ہے کہ صاف نظر آتا ہے اور نہ محسوس بھی۔ ـــــ مثلاً کوئی لڑکا بستہ بغل میں دبائے ہوئے پتنگ بازی دیکھنے لگے تو یہ اس سے ہنس کر کہیں گے کہ لاؤ بستہ مجھے دو اور یہ پتنگ اٹھا لو۔ لڑکا جب اس پر کچھ پشیمان ہونے لگے تو یہ کہیں گے ـــــ پھینکو بھی ان کتابوں کو ان میں کیا تفریح ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پڑھنے لکھنے والوں نے ہمیشہ تیل بیچا ہے۔ جب لڑکا شرمندگی کی حد پر آ جاتا ہے تو یہ اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہیں ـــــ کھیلوگے کودوگے ہوگے نواب ـــــ اور وہ لڑکا اب اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ سیدھا سیدھا مدرسہ پہنچ جائے۔ بلحاظِ تخلص لڈن ماموں کو تلخ سے تلخ حالات میں بھی مغموم اور اداس نہیں دیکھا گیا۔ ہنسی ہر وقت ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ سنہ ۳۲ء کے ایک طرحی غزل کے مقطع میں انہوں نے اس طرف بہت واضح اشارہ کیا ہے اور یہی ان کا مزاج بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تلخیِ وقت و گردشِ دوراں پہ قہقہے
کچھ شاد نے ہی رنج و محن کا دیا جواب

یہی نہیں بلکہ رنج و محن کا جواب دینا انہوں نے اپنے عقیدے میں شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ جب ان کی جیب میں تھوڑے پیسے رہ جاتے ہیں تو وہ انہیں کسی فقیر کو دے کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان تھوڑے سے پیسوں کی وجہ سے اللہ میاں کو میری فکر نہیں تھی۔ اب جبکہ گرہ میں مال نہیں رہا ہے ظاہر ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہو کر خود کوئی سبب پیدا کرے گا۔ چنانچہ وہ بھی کوئی نہ کوئی سبب پیدا کرتا رہتا ہے اور ان کا کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ کوئی غلط بات یا توہین برداشت کرنے کی لڈن ماموں میں قطعاً تاب نہیں۔ چھ سات ملازمتیں ذرا ذرا سی زیادتیوں کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں تو مسکرا کر جواب دیں گے کہ "اللہ میاں مجھے پریشان کرنے اور اپنے اطمینان کے لئے مجھے ایک آدھ گھٹیا ملازمت دے کر جب بے فکر ہو جاتے ہیں تو میں استعفےٰ دے کر انہیں پریشان کرنے لگتا ہوں کہ لاؤ رازقِ مطلق ہو تو میرا انتظام کرو" اور جیسا کہ میرا عقیدہ ہے، وہ اپنے رازقِ مطلق ہونے کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ لڈن ماموں ضبطِ غم میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور بڑے بڑے صدمے ہنسی میں اڑا جاتے ہیں۔ اسی روشنی میں موصوف کا ایک شعر اور یاد آ رہا ہے جس میں انہوں نے زندگی کی دشواریوں کو جھیلنے کی تلقین کی ہے ؎

زرد چہرے نے تبسم کو کہیں کا ہے بدنام
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

یہاں میں لڈن ماموں کا اسی زمین میں ایک بہت عمدہ شعر سنانا چاہتی ہوں مگر معلوم نہیں آپ اچھے شعروں میں دلچسپی لیتے ہیں یا نہیں فرماتے ہیں ؎

جاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

یہ شیخ صاحب کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی بحث تو خواہ مخواہ بیچ میں آ گئی ورنہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ "کچھ شادی نے رنج و محن کا دیا جواب" اور واقعی طور پر لڈن ماموں نے گردش دوراں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور بقول حضرت حالی ان کے لئے یہی فتح و ظفر کی صورت بھی رہ گئی تھی جبھی تو لڈن ماموں نے اپنے اوپر وہ حملے کئے ہیں کہ بایدو شاید۔ ان حملوں کی تفصیل طولانی ہے اس لئے میں مختصر نویسی سے کام لے کر یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابھی آپ انٹرنس کا ششماہی امتحان ہی دینے پائے تھے کہ ان کے والد خان عارف اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں ان پر آن پڑیں جنہیں موصوف نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بھتیجا بھتیجی کے پڑھانے لکھانے، شادی کرنے اور والدہ کی خدمت کو اپنا فرض تسلیم کرتے ہوئے شادی کا خیال ترک کر دیا۔ مگر ۵۹ برس کی عمر میں ان کی والدہ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ بھتیجی کی شادی کر دی۔ بھتیجے کو بی۔ اے۔ بی ٹی کرا کے اس کی شادی کر دی اور وہ سسرال میں رہنے لگا۔ والدہ کی خدمت کے سلسلہ میں مجبوراً شادی نہ کرنے کا عہد توڑنا پڑا اور چالیس سال کی عمر میں شادی کر لی۔ ان کی نظم "نصف بہتر" اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لڈن ماموں کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ان کی اطاعت شعار بیوی ڈیڑھ سال زندہ رہ کر داغِ مفارقت دے گئی۔

البتہ درست ہے کہ شخصیت کے سلسلے میں کسی شاعر کی جائے پیدائش اور خاندانی حالات معہ اپنے تمام حدود اربعہ کے درج کئے جائیں تو مجھے یہ لازم آ جاتا ہے کہ اس بارے میں اختصار سے کام لے کر یہ بتاتی چلوں کہ لڈن ماموں کی ودھیال خانساں ہے اور آپ ڈوڈال اور زڑ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ننھیال رام پور میں ہے۔ ان کی نانی رام پور میں پیدا ہوئی تھیں مگر نانی کے والد اور والدہ خالص افغانی تھے اور نسلاً زڑ۔ لڈن ماموں کے نانا مولوی سید ولی حسن کا ذکر "تذکرۂ کاملانِ رام پور" میں موجود ہے۔ نواب علاؤ الدین خان والیٔ لوہارو کی خواہش پر ضیاء الدین ولی عہد لوہارو کے عربی معلم بن کر لوہارو چلے گئے جن کے ساتھ ان کے داماد مولوی محمد عارف اللہ خان یعنی لڈن ماموں کے والد بھی

لوہارو آگئے اور یہاں تھانیداری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لڈّن ماموں سنہ ۱۹۱۶ء میں وہیں لوہارو میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ نو سال کے تھے کہ ان کے نانا اور والد کو ریاست سے پنشنیں مل گئیں اور یہ اپنے وطن رام پور آگئے۔ چنانچہ لڈّن ماموں بھی رام پور آگئے۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے نانا اور والد سے گھر پر حاصل کی، اُردو حکیم عمّی میاں سے پڑھی۔ علم حاصل کرنے کی لگن سے تنگ آکر خاندانی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے ماموں کرامت علی خان کے ذریعہ جو اس وقت رام پور میں تھانیدار تھے، ۱۲ برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لے لیا جس پر لڈّن ماموں کے والد عرصہ تک ناراض رہے اور کہتے تھے کرامت علی خان نے میرے لڑکے کو کرسٹان بننے میں مدد دی ہے جسے میں کسی طرح معاف نہیں کر سکتا۔ مگر ایک دن ہوا یہ کہ دہلی سے لڈّن ماموں کے بڑے ماموں کا تار آگیا اور یہ دیکھ کر کہ لڈّن ماموں نے وہ تار حرف بحرف پڑھ سُنایا بہت خوش ہوئے اور اپنی ناراضگی کے ردِّ عمل میں بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا میں غلطی پر تھا۔ زمانہ کا تقاضا یہی تھا جو تم نے کیا۔ اب تم شوق سے انگریزی پڑھ سکتے ہو مگر اچھے بُرے کا امتیاز ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ”مجھ پر بھروسہ کیجئے“ لڈّن ماموں نے جواب دیا اور اس بھروسہ کو آخر تک نباہا۔ چونکہ قدرت نے انہیں علم حاصل کرنے کی تڑپ دی تھی اس لئے ان کے مطالعہ کا یہ عالم رہا کہ رات کے دو دو بجے تک کتاب ہے اور لڈّن ماموں ہیں اور آپ تعجب کریں گے کہ یہ شوقِ مطالعہ آج بھی کم نہیں۔ خصوصاً شعر و ادب کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سبعہ معلقہ کا ایک ایک شعر معہ اپنی تمام خوبیوں کے ان کا موضوعِ سخن تھا یعنی یہ مطالعہ ورق گردانی کے طور پر نہ تھا بلکہ ہمیشہ مفہوم و معانی میں ڈوب کر استفادہ مدِّنظر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی سبعہ معلقہ کے شاعروں میں عرف لبید کو ترجیح دیتے ہیں اور رکھتے ہیں اس میں شاعرانہ خود داری اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ لڈّن ماموں کے صحیح ذوقِ مطالعہ کا نتیجہ ہی تو ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے دیوانوں کا انتخاب ایک ایک شعر میں مرتب کیا ہے۔ مگر یہ وہ شاعر ہیں جو انہیں پسند نہیں پھر بھی ان کا گہرا مطالعہ کرکے یہ انتخاب تیار کیا ہے۔ حضرت میرؔ کا یہ شعر جس کا مصرعہ ہے ”یہ سُن کر کلی نے تبسم کیا“ خاقانیِ ہند ذوقؔ کے دیوان کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے ؎

منعم موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے

ناسخؔ اور اس قسم کے دوسرے خشک شعرا کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی عمر ضائع کی اور کاغذ بھی ——— زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے کلام سے رسالۂ تذکیر و تانیث تیار کیا جا سکتا ہے یا وہ اردو لغت جس میں اشعار کے ذریعہ مثالیں پیش کی گئی ہوں۔ حضرت آتشؔ کا یہ مطلع ”سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا“ الخ ——— رندؔ کا یہ شعر جس کا آخری مصرعہ ہے ”وگرنہ دام کہاں میں کہاں صیاد ——“ حد یہ ہے کہ اپنے استادِ فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ کو اس ایک مطلع کا شاعر کہتے ہیں ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اگر آپ حضرت غالبؔ کے دیوان کا خلاصہ چاہیں گے تو صاف صاف کہہ دیں گے کہ وہ تو خود انتخاب ہے، انتخاب کا انتخاب حماقت ہے ہاں اگر آپ یہ پوچھیں گے کہ ان کے نزدیک غالبؔ کا سب سے اچھا شعر کونسا ہے تو کہیں گے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دو چار دن کے بعد آپ اگر پھر یہی سوال کریں گے تو جواب ملے گا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اگر آپ معنوی بحث چھیڑ دیں گے تو ارشاد ہوگا۔ اس شعر میں غالب کی خودی اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ محبوب سے کہتے ہیں ہم تو گالیاں برداشت ہی نہیں کر سکتے وہ تمہاری ہوں یا کسی اور کی۔ مگر رقیب کے گالیاں سہہ جانے سے ہم اندازہ کرتے ہیں کہ تیرے لبوں کی شیرینی اپنی کوئی حد ہی نہیں رکھتی ـــــ اس کے بعد اگر آپ یاد دلائیں گے کہ چار دن پہلے تو آپ نے غالب کا وہ شعر پسند کیا تھا اور آج اس شعر کو سب سے اچھا شعر بتا رہے ہیں تو فوراً مسکرا دیں گے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ظالم تو سب ہی اچھے شعر کہہ گیا ہے۔ حضرت حالی کا یہ مقطع بہت پسند ہے ؎

بڑا ہی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ایک دن کہنے لگے جوش کو میں بہت اچھا شاعر سمجھتا تھا مگر اس کا یہ مقطع دیکھ کر "ابھی اگلی شرافت کے نشاں کچھ پائے جاتے ہیں" جوش سے میرا دل بُرا ہو گیا۔ حضرت حالی کے اس مقطع کا ایسا مذاق اڑایا ہے جس کا جواب نہیں۔ غرضیکہ لڈن ماموں نے اردو کے تمام شعراء کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے کچھ دن ہوتے میں لڈن ماموں سے امیر مینائی کے ایک شعر کا مطلب پوچھ رہی تھی مطلب بتاتے بتاتے کہنے لگے کہ یہ شعر امیر مینائی کا نہیں بلکہ نظام رامپوری کا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایسی دلیلیں پیش کیں جن سے ان کی بات کو تقویت پہنچتی تھی ایک دن کہنے لگے نظام کے کلام کا سرقہ ہوا ہے۔ میں پرانے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں پھر ثابت کروں گا کہ نظام کا بہت سا کلام امیر مینائی کے کلام میں شامل ہو گیا ہے۔

بہرحال لڈن ماموں کی شاعری اپنی جگہ ٹھوس اور پختہ ہے اور ان کے فطری شاعر ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔

شاعر کو الہام ہوتا ہے اس بات کی جانچ میں نے لڈن ماموں کی شاعری سے کی ہے۔ جس گھر میں لڈن ماموں رہتے تھے (اب وہ اپنے بھتیجے ماسٹر فدا احمد خاں صاحب کے پاس رہتے ہیں اور اپنا ذاتی مکان فروخت کر دیا ہے) اس کا نقشہ کھینچنا بہت مشکل ہے سودا کے شہر آشوب سے بڑھ کر ہے۔ کچی کھپریل سے ڈھکی ہوئی کوٹھڑی جس میں نہ گرمی کا آرام نہ سردی کا نہ بارش سے حفاظت ہو سکتی ہے بغیر پلاسٹر کی ٹوٹی لگی ہوئی دیواریں۔ ایک چھوٹا سا پلنگ ایک لوٹا دو تین مٹی کے گھڑے، دروازہ بغیر زنجیر کا جس کو جب جاتے تار لگا کر بند کر جاتے۔ یہ تھا اردو کے شاعر شاد عارفی کا مکان جس میں وہ شعر کہتا تھا۔

لڈن ماموں روز غزلیں لکھا کرتے تھے نظموں کے روپ میں سماج اور سماج کے زخموں پر نشتر چھیڑا کرتے تھے اور اب بھی یہی مشغلہ جاری ہے۔ جیسا میں نے پہلے لکھا لڈن ماموں انتہائی خوددار نک چڑھے اور ٹیڑھی قسم کے آدمی ہیں "جَو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ" ان کی زندگی کا اصول ہے خوشامد کرنا نہیں جانتے۔ صاف دل اور صاف گو ہیں لگی لپٹی کے قائل نہیں۔ خدا اور رسول پر پکا ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو ان کو دور سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ کمیونسٹ ہیں، کسی کی رائے ہے دہریہ ہیں۔ مگر میری رائے میں وہ ایک پکے مسلمان ہیں اور شاعر کے علاوہ کچھ نہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ رامپور کے اکثر رئیسوں نے ان کی امداد کرنا چاہی مگر لڈن ماموں نے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں اگر رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو ان کے خلاف پھر نظمیں کیسے لکھوں گا۔ میری شاعری کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

لڈن ماموں کی باتوں میں بلا کی کشش ہوتی ہے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے جائیں گے مگر درمیان میں لطیفے اور قصے بھی جاری رکھیں گے۔ لڈن ماموں کبھی اکیلے نہیں رہتے یاروں دوستوں اور شاگردوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اگر شعر و شاعری سے فرصت ہے تو شطرنج، چوپسی جاری ہے۔ اس کام سے فرصت ملی تو پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ ان کے پرانے گھر میں بہت سے کبوتر پلے ہوئے تھے۔ کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے بارے میں بہت کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا لڈن ماموں آپ نے اس قدر کبوتر کیوں پال رکھے ہیں۔ کہنے لگے ان کے

دم سے گھر کی تنہائی محسوس نہیں ہوتی ——— زندگی چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔

لڈن ماموں زندگی کی معمولی سی معمولی بات اور ہنگامہ میں دلچسپی لیتے ہیں اور اسی سے اپنی شاعری کا مواد تیار کرتے ہیں۔ فرد اور سماج عزیز اور دوست کسی کو شاعر کی حیثیت سے نہیں بخشتے۔ جس میں کوئی چار سو بیس قسم کی بات دیکھتے ہیں اس کی شان میں قصیدہ لکھ مارتے ہیں اور بہت تیز کہہ جاتے ہیں۔ دسہرہ، گنگا اشنان، مہترانی، نمائش وغیرہ نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لڈن ماموں نے کچھ دن ہوئے ایک غزل لکھی تھی جس کا مطلع تھا ؎

میں تو جیل سے کھا رہا ہوں شاد

دال ملتی ہے جیل خانہ میں

یہ شعر ان کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے مگر خدا کو رازق ماننے کی وجہ سے دونوں وقت مزے سے کھاتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے کہاں سے آتا ہے یہ وہ جانے جو دونوں جہاں کا رازق ہے اور پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔

سیّد عبدالحمید عدمؔ

شاد امرتسری

۱۹۴۵ء کی سردیوں کی ایک شام کا ذکر ہے میں فلیمنگ روڈ پر ایک چھوٹے سے ٹی سٹال میں بیٹھے چائے پی رہا تھا کہ چائے خانہ میں مراتب علی ثاقب داخل ہوئے کہ ان سے ہر شام وہاں ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ایک موٹا تازہ شخص سگرٹ کو انگوٹھے اور دو انگلیوں میں تھامے بھونڈا سا چھاتا اندر گھس آیا۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، توند کچھ بڑھی ہوئی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے از خود اس کے جسم پر اٹک گئے ہوں۔ بوسیدہ کوٹ کے بٹن غائب۔ پاجامہ نما پتلون ڈھلکی ہوئی تھی، وہ بار بار ہاتھ سے پکڑ کر اونچا کرتا تھا۔ گردن پر جمی ہوئی میل کی تہہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کئی دن سے نہیں نہایا۔ چہرہ مسکراتا ہوا اور آنکھوں میں ایک معصومانہ چمک۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچتا کہ آج ثاقب صاحب اپنے ساتھ کیا شے لے آئے ہیں انہوں نے مجھ سے کہا۔ شاد صاحب! آپ ہیں عدم صاحب یعنی سید عبدالحمید عدم، اردو کے مشہور شاعر۔ میں یہ سن کر بھونچکا سا رہ گیا کہ اس ڈیل ڈول کا شعر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے مگر اتنے میں عدم صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا "حضور آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی" اتنا کہا اور بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے۔ میں نے چائے منگانا چاہی مگر عدم صاحب نے پھر مسکراتے ہوئے کہا "حضور یہ چائے کا وقت نہیں اب تو شام ہو رہی ہے" یہ کہا اور پھر نہایت بے تکلفی سے داد طلب انداز میں میری جانب دیکھا۔ ثاقب صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے ختم ہوئی تو ہم تینوں ٹی سٹال سے نکلے۔ باتیں کرتے کرتے اور چلتے چلتے میکلوڈ روڈ تک پہنچے تو عدم صاحب جھٹ قلعہ گوجر سنگھ کے باہر والی ولایتی شراب کی دکان کی طرف لپکے۔ میں اور ثاقب صاحب بھی جھجکتے ہوئے دکان کے اندر داخل ہوئے۔ عدم صاحب بوتل کو ہاتھوں میں تھامے کھڑے تھے اور ان کے چہرے سے کچھ اس طرح کی مسرت ٹپک رہی تھی جو ایک بچے کو اس کی پسند کا کھلونا مل جانے پر ہوتی ہے۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹ کر بغل میں دبا عدم صاحب لپکے۔ "حضور یہیں بیٹھ جائیں؟" میں ان دنوں دیال سنگھ کالج کا طالب علم تھا اور بعض وجوہ کی بنا پر رام گلی میں اپنے ہوسٹل چھوڑ کر راج گڑھ روڈ پر ہی ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن کسی دفتر میں ملازم تھے۔ افسر کے بیٹے اور میرے عزیز دوست۔ میں نے بھی شراب خانے میں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا "عدم صاحب گھر چلتے ہیں" عدم صاحب کو جیسے کسی نے بہشت کی خوشخبری دے دی۔

سبحان اللہ کہا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

بوتل کھول لی گئی۔ اس سے پہلے میں نے دیسی شراب کبھی نہیں پی تھی مگر عدم صاحب نے اس خلوص اور بے تکلفی سے دعوت دی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ ٹھرا نہیں۔ چند ہی منٹ کے بعد شراب کا اثر ہوا اور عدم صاحب نے از خود اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ایک، دو، تین، چار اور معلوم نہیں کتنی غزلیں سنا ڈالیں۔ دور چلتا رہا اور شعر ہوتے رہے۔ یہ محفل کافی دیر تک رہی اور آخر عدم صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ مجھے اور ثاقب صاحب کو انہیں پکڑ کر ٹانگے میں لادنا پڑا۔

عدم صاحب سے بظاہر یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں اور عرصے بعد ملے ہیں۔

دوسرے روز شام کے قریب میں گھر پہنچا تو عدم صاحب کو موجود پایا۔ میری غیر حاضری میں وہ میرے دوست اور میرے کمرے کے ساتھی مسٹر حسن سے نہ صرف اپنا تعارف کرا چکے تھے بلکہ نہایت بے تکلفی سے محوِ گفتگو تھے اور انہیں اپنی کئی غزلیں بھی سنا چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی عدم صاحب نے اس طرح اٹھ کر میرا استقبال کیا جیسے وہ صاحب خانہ ہوں اور میں ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر آیا ہوں ——

تھری ایکس مرکی بوتل میز پر کھلی پڑی تھی اور اس کی بو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن (جو اب بھی میرے ہمسائے ہیں) شراب بالکل نہیں پیتے مگر پینے والوں کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا سعادت تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک پلیٹ میں کچھ کباب بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان دنوں ہمارے اس کمرے میں جس کا نام ہم نے پاکستان لاج رکھا ہوا تھا، شام کو روزانہ محفل آراستہ ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے احباب جمع ہو جاتے تھے۔ ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، مراتب علی ثاقب، لطیف انور اور ہمارے ایک کرم فرما مسٹر خلیل شام ہوتے ہی چلے آتے۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ خلیل صاحب لطیفہ بازی اور بذلہ سنجی سے ہمیں نوازتے۔ سیف صاحب کلام سناتے۔ ان سے بحثیں ہوتیں۔ ظہیر کاشمیری سے کمیونزم پر گرما گرم گفتگو ہوتی۔ علم و ادب کی باتیں ہوتیں اور گاہے گاہے شراب کا دور بھی چلتا۔ میرے دوست مسٹر حسن تاش کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے بھی کچھ دوست احباب آ جاتے۔ وہ الگ تاش میں مصروف رہتے اور ہم اپنے کام میں مگن۔ گویا یہ کمرہ صحیح معنوں میں سعدی کے اس شعر کی تفسیر تھا ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

عدم صاحب کے آنے سے اس روز کی محفل میں ایک نمایاں فرق یہ پڑا کہ شراب روز آنے لگی اور اکثر اوقات عدم صاحب اپنے ساتھ ہی بوتل لے آتے۔ وہ باقاعدہ شام ہوتے ہی وزیر آباد سے ہمارے ہاں چلے آتے۔ دوسرے احباب بھی جمع ہو جاتے۔ عدم صاحب شراب کے ساتھ ساتھ بیسیوں غزلیں بھی سناتے جاتے۔ ہمیں غزلوں سے اور خود کو شراب سے بے ہوش کرتے۔ عدم صاحب کا حافظہ بہت تیز ہے اور انہیں اپنی سینکڑوں غزلیں یاد رہتی ہیں اور خاص طور پر شراب پینے کے بعد تو انہیں تمام بھولے بسرے شعر بھی یاد آ جاتے ہیں۔

عدم صاحب کے سلسلے میں یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ شراب کے بغیر ان کی شخصیت بالکل بے معنی ہے۔ اس کے بغیر وہ پژمردہ اور بے نور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو بے جان، بے معنی اور عامیانہ ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ کسی بھی حسین شے سے ایسی حالت میں متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا ایک شعر اس سلسلے میں سنئے ؎

شراب پی کے مجھے آنکھ کھول لینے دے
ابھی چمکتے ہوئے رخ کو بے نقاب نہ کر

یوں بھی عدم صاحب کا علم و ادب کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ وہ کسی ادبی یا فنی نظریے یا کسی مکتبِ خیال کے اصولوں سے پوری طرح

شناسا نہیں ہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی نظریے یا کسی مکتبِ فکر کے اصولوں کے مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس لئے کہ وہ خود کو بہت عالم سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کا مزاج ہی کچھ اس قسم کا لااُبالی واقع ہوا ہے کہ وہ کسی سنجیدہ قسم کے ادب یا نظریے کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ شروع سے ہی انہوں نے سائنس کی تعلیم پائی۔ حساب کے مضمون سے بہت دلچسپی رہی۔ بی۔ اے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے اور ایس۔ اے۔ ایس کے امتحان میں (سبارڈی نیٹ اکاؤنٹس سروس جو بُک کیپنگ اور اکاؤنٹنسی کا امتحان ہوتا ہے) دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار پاس ہوئے اور پھر اس طرح سے دفتری کام میں محو ہوئے کہ انہیں ادبیات کا مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

عدم صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سادگی اور معصومیت ہے۔ معصومیت کا لفظ میں روایتی طور پر استعمال نہیں کر رہا بلکہ اگر اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ عدم صاحب کی شخصیت میں محض معصومیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ زندگی کا ہر پہلو چاہے وہ نجی ہو، دفتری ہو یا ان کے فن سے متعلق ہو ان کی شخصیت کی اس خصوصیت سے بہرحال اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کی طبعی سادگی اس حد تک ان کی زندگی میں رچ گئی ہے کہ بعض اوقات یہی معصومیت اور سادگی ان کے دوستوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں تاکہ ان کی سادگی اور معصومیت کا تکلیف دہ ہونا آپ پر بھی ثابت ہو سکے۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں جب لاہور میں فسادات شروع ہو چکے تھے لاہور میں روزانہ شام کے وقت کرفیو نافذ ہو جایا کرتا تھا۔ ان دنوں ہماری شام کی محفلوں میں احباب کی کمی کا شدید احساس ہوتا تھا مگر عدم صاحب قریب قریب بلاناغہ آتے تھے اور چونکہ کرفیو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے نافذ ہو جاتا تھا اس لئے بعض اوقات گھر واپس جانے کی بجائے میرے گھر ہی سو جایا کرتے تھے۔ انہی دنوں عدم صاحب دو تین روز کیلئے اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے: "حضور، ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے۔" میں حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ کہنے لگے "میں اسی لئے تین چار دنوں سے نہیں آیا۔ حضور بات یہ ہے کہ میرے پاس اس دن ایک بوتل رم کی اور کچھ بوتلیں بیئر کی تھیں۔ میاں میر سے کوئی ٹانگے والا لاہور آنے کے لئے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے۔ آخر ایک ٹانگے والے کو میں نے آمادہ کر ہی لیا۔ رم کی بوتل اور بیئر ساتھ تھی۔ راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہو گیا۔ پولیس نے ٹانگے والے کا چالان کر دیا۔ بوتلوں پر قبضہ کر لیا اور مجھے کوتوالی میں لے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ یہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست شاد امرتسری کے لئے لے جا رہا تھا۔ حضور، آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا پڑے گا تاکہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس مل جائے ورنہ حضور شراب مفت میں حرام ہو جائے گی۔" چنانچہ میں کئی دن ان کے ساتھ اس مصیبت میں مبتلا رہا اور خدا خدا کر کے قصہ پاک ہوا۔

اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہوں گے جہاں ان کی سادگی اور معصومیت نے کسی نہ کسی مصیبت سے دوچار کیا۔

عدم صاحب کا مزاج بالکل بچوں کا سا ہے۔ وہ بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ انہیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ یہ میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا۔ وہ اگر کبھی کبھار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کریں تو ان کے چہرے سے اس طرح عیاں ہو جاتا ہے جس طرح ایک ڈرپوک بچے کو جھوٹ بولتے وقت چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہیں رہتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید انہی فطری اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ان کے شعروں میں صداقتِ احساس اور خلوصِ اظہار ہوتا ہے ورنہ ان کی زندگی کا تجرباتی میدان بہت محدود ہے۔ وہ زندگی میں فقط تین کام کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی اور کل کائنات ہے۔ زندگی کے بے شمار متنوع پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ ریاکاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے اس طرح ناآشنا ہیں جس طرح آج کا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں، دے نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص مکتبِ خیال کے مقلد نہیں۔ ان کی آزادیٔ طبع اور آزادیٔ فکر کسی ضابطے کی متحمل نہیں اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آزادی بلکہ آزادہ روی کی وجہ ان کا طبعی لااُبالی پن ہے۔ میں نے اکثر غور کرنے کی

کوشش کی کہ انہوں نے شراب نوشی کو اس طرح اپنے آپ پر سوار کیوں کر رکھا ہے مگر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ یہ بھی زندگی کے ساتھ ان کے غیر سنجیدہ سلوک کی آئینہ دار ہے۔ وہ کسی مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ ایک عجیب قسم کی بے راہ روی اور لااُبالی پن ہر وقت ان کو اپنے دام میں پھنسائے رکھتا ہے۔ یہ بے راہ روی اور لااُبالی پن اس طرح مستقل صورت اختیار کر چکا ہے کہ عدم صاحب اس کے اثر سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ عدم صاحب نے کہیں یہ ایک مصنوعی لبادہ تو نہیں اوڑھ رکھا یعنی کیا یہ بے راہ روی ان کی زندگی اور ان کے فن کا نمائشی پہلو تو نہیں مگر ہر بار مجھ پر یہ عیاں ہوا کہ ایسی بات نہیں۔ یہ لااُبالی پن اور ایک فنکارانہ وارفتگی ان کی شخصیت کا ایک فطری جزو ہے۔ یہ محض سونا ہے اس پر سہاگہ نہیں۔ یہ کوئی ملمع نہیں بلکہ اصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت کچھ اور یوں بھی واضح ہوئی جب میں نے ان کے تصورِ عشق پر غور کیا۔ غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا۔ عشق سے میری مراد بالکل وہی مجنوں اور فرہاد کا عشق نہیں بلکہ زندگی کا وہ ایک اور فقط ایک یادگار جذباتی واقعہ ہے جو اکثر اوقات فن اور جذبات و احساسات میں ایک دائمی گداز پیدا کرتا ہے۔ کسی سے شدید قسم کا عشق نہ کرنے کا سبب ان کی وہی فطری بے راہ روی اور طبعی لااُبالی پن ہے۔ عدم صاحب نے کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق و پجاری ہیں اور یہ احساس اکثر اوقات ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ حسن پرستی اگرچہ ایک معمولی قسم کے حساس انسان کی حسن پرستی نہیں تاہم اس حسن پرستی میں وہ تڑپ اور وہ دائمی گداز بھی نہیں جو زندگی میں صحیح عشق کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے ایک گہرا غم، ایک دردمندی اور ایک ابدی دل سوزی پیدا ہوتی ہے جس کی دھیمی دھیمی آنچ میں گوہرِ مراد آبدار ہوتا ہے۔ مگر اس دردمندی اور کیفیتِ غم کی غیر موجودگی نے عدم صاحب کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو آتشِ سیّال کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

عدم صاحب کی وارفتگی بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ منفرد میں نے اس لئے کہا ہے کہ بعض اوقات ان کی وارفتگی نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ ۱۹۴۷ء ہی کا ذکر ہے۔ ان دنوں لاہور میں فسادات بہت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور عدم صاحب میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب تین بجنے والے ہوں گے کہ کمرے میں شور ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو کمرے میں بتی جل رہی تھی اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ظہیر کاشمیری چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ عدم صاحب کا تکیہ بالکل جل چکا ہے۔ بستر کی چادر جل رہی ہے، یہاں تک کہ عدم صاحب کے سر کے بال بھی جل رہے ہیں مگر انہیں قطعاً ہوش نہیں۔ آخر بعد مشکل میں نے اور ظہیر کاشمیری نے عدم صاحب کو جگایا۔ تکیے کو صحن کے دستی پمپ کے پانی سے بجھایا۔ عدم صاحب کو یہ معلوم کر کے بہت زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ ان کی گردن جل رہی تھی۔ کہنے لگے "حضور ایسا تو کئی بار ہوا ہے"۔ یہ کہا اور ایک سگرٹ جلایا۔ خیر کچھ دیر بعد سب کے سب پھر سو گئے۔ ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ ظہیر کاشمیری کی آواز پھر گونجی۔ پھر اُٹھے تو دیکھا کہ عدم صاحب کی قمیص جل رہی ہے مگر وہ بالکل بے سدھ پڑے ہیں۔ پانی کا گلاس ان کی قمیص پر ڈالا گیا مگر انہیں ہوش نہ آیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے کہا کہ اگر میں رات کو نہ جاگتا تو صبح اخبار میں خبر چھپ جاتی کہ سکھوں نے دو شاعروں کو جلا ڈالا۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام عدم صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ الطاف مشہدی بھی تھے۔ دور چلا۔ شراب ختم ہوئی تو الطاف مشہدی کے کہنے پر عدم صاحب ان کے ساتھ تلاشِ شراب میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا پھر میں سو رہا۔ صبح سویرے اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عدم صاحب نشے میں بہت نیلے آ رہے ہیں۔ منہ سوجا ہوا، کلّوں پر نیلے نیلے داغ، پتلون پھٹی ہوئی۔ میں نے پوچھا حضرت کیا معاملہ ہے؟ الطاف کہاں چلا گیا؟ لیکن چونکہ نشہ بہت تھا کوئی معقول جواب نہ دیا اور لیٹ گئے۔ میں نے ان دنوں سیکرٹریٹ میں عارضی طور پر ملازمت کر لی تھی۔ میں دفتر جانے کی تیاری کر چکا تو ثاقب صاحب آ گئے۔ اتنے میں عدم صاحب جاگے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا "حضور میں مر گیا۔ حضور میں دفنا دیا جاؤں گا"۔ ثاقب صاحب اور میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ بڑی مشکل سے گھر پہنچایا گیا۔ چند روز بستر میں رہے۔ کوئی دوا وغیرہ استعمال کرنے کی بجائے پانچ روز مسلسل صبح و شام ٹھرّا پیا اور ٹھیک ہونے پر بتایا کہ حضور اس رات الطاف مشہدی کے ساتھ انارکلی میں ایک سکھوں کے ہوٹل میں

شراب کی جستجو میں جا پہنچے۔ تھوڑی سی مل گئی۔ سکھوں سے کسی بات پر تو تو میں میں ہوئی تو میں نے ہوٹل کی بالکنی سے جان بچانے کی غرض سے چھلانگ لگا دی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے کیوں اور کب چھلانگ لگائی۔

وارفتگی کے سلسلے میں یاد آیا کہ عدم صاحب اکثر بچوں کی طرح پیسے گم کر دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ خریدنے کے لئے جیب میں سے روپے نکالے اور کئی نوٹ گرا دئے۔ اسی وارفتگی کے سبب وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے اور پھر لطف یہ کہ انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رکھتے ہیں۔ ان کے کوٹ اور پتلون کی تہہ اکثر خراب ہوتی ہے۔ کپڑے اکثر ان کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک منہ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اٹھے، کلی کی اور دفتر چلے گئے۔ جب تک جیب میں پیسے ہوں گھر کا رخ نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہفتہ ہفتہ بھر باہر پڑے رہے۔ بڑا لڑکا خالد بار بار آیا اور ہر بار انہوں نے کہا بیٹا میں آج ضرور آؤں گا۔ ایک دفعہ انہوں نے خود ایک واقعہ سنایا۔ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ کوئی پانچ سو روپیہ تنخواہ لے کر شام کو اختر شیرانی سے ملے اور ایک ہی شام میں پانچ سو روپے شراب اور عورت کی نذر ہو گئے۔ صبح گھر گئے تو بیوی نے تنخواہ مانگی۔ کہنے لگے کہ کسی جیب کترے نے کمال صفائی سے جیب کاٹ لی ہے۔ ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ بیوی جان گئی کہ جھوٹ ہے۔ لڑائی ہوئی اور بصد مشکل اسے منایا۔ اسی طرح ان کی بے راہ روی اور وارفتگی کے سینکڑوں واقعات ہیں۔ اسی وارفتگی نے ان کے کردار میں کئی خوبیاں بھی پیدا کی ہیں۔ اسی مستی اور رندی نے ان کو معصوم بنایا ہے۔ شراب کی ایک بری عادت رہی ذاتی طور پر تو اسے برا بھی نہیں سمجھتا نے ان کی تمام انسانی برائیوں کو ختم کر دیا ہے اور انہیں خلوص کا پیکر بنا دیا ہے۔ وہ دوستوں سے خلوص سے ملتے ہیں۔ دوستوں کی خاطر جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔ دل آزاری کا ڈھنگ ہی انہیں نہیں آتا۔ کسی کو دکھ دینا ان کی سرشت ہی میں نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں صاف گو اور صاف دل ہیں۔ ان کا ظاہر باطن ایک ہے۔ کسی سے کوئی بغض یا عناد رکھنا ان کی فطرت میں داخل ہی نہیں۔ ہر بات منہ پر کہتے ہیں اور خلوص سے کہتے ہیں۔ دل میں کبھی میل نہیں رکھتے اور دل میں میل رکھنے والوں سے ملتے بھی نہیں۔ شراب نے ان کو واقعی انسان بنا دیا ہے۔ ان کے کردار کی انہی خوبیوں نے ان کے فن میں بھی خلوص، صداقت اور سچائی کے عناصر پیدا کئے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہو نہایت سادہ، صحت مند اور صحیح ہوتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی یہ سادگی اور صحت شعور و لاشعور کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے اور جب وہ ان تجربات و مشاہدات کو شعری صورت دیتے ہیں تو یہ تمام سادگی، صحت اور خلوص شعر کے لازمی جزو بن جاتے ہیں اور اس طرح شعر کو صداقت بہ معنی اور ہمہ گیر بنا دیتے ہیں۔ ان کا فن نکھرا نکھرا ہے۔ ہلکے پھلکے مضامین ہیں جن میں کوئی الجھن نہیں جن میں ہلکے ہلکے اشارے اور کنایے مفہوم کو لطیف بنا دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا حسن کاریگری اور شعوری کاوش کی بجائے سادگی بیان، بے تکلفی اور بے ساختگی کے باعث ہے۔ کسی خاص نظریاتی فکر کا فقدان ان کے ذہن کو محدود دائروں میں گھومنے سے باز رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو جیسے دیکھتے ہیں اسی طرح اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار ہلکے پھلکے تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ رندی، اس کے اثرات اور اس کے رد عمل کے متعلق انہوں نے متنوع قسم کے شعر کہے ہیں جن میں روایتی رنگ کی بجائے ایک انفرادی رنگ کی جھلک موجود ہے۔

رندی کے متعلق چند شعر سنئے:

پیتا ہوں حادثات کے عرفان کے لئے — مے ایک تجربہ ہے غم روزگار کا

زمانے کی رفتار سے تنگ آ کر — عدم کر لیا مے کدے میں بسیرا

مے دن نہیں تمیز ہے اور واقعی حرام — میں کثرت شکوک سے گھبرا کے پی گیا

سو بار ان رندوں کی قسم ان کے چھیڑ دی — سو بار خود زمانے کی قسم کھا کے پی گیا

بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام — تصدیق کر رہا ہوں غم روزگار سے

عدم کی شاعری، شراب، حسن اور عشق کی شاعری ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی سنجیدہ اور صحیح فلسفہ یا انداز فکر نہیں مگر اس کے باوجود ان کی تمام شاعری

ایک نیم فلسفیانہ ہلکی پھلکی لہر رواں دواں ہے جس میں کبھی کبھار موجیں بھی اٹھتی ہیں۔ ان کے ہاں تصوف کی ہلکی سی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تصوف کا باقاعدہ رجحان تو نہیں مگر ہلکے ہلکے اشارے موجود ہیں۔ چند شعر سُنئے ؎

چھپے ہو حجاباتِ دیر و حرم میں — مگر بے تکلف نظر آ رہے ہو
بہار و خزاں کم نگاہوں کے وہم — بُرے یا بھلے سب زمانے ترے
ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام — انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے
جب کبھی ہوتے ہیں ہم عدمؔ تنہا — یار سے ہم کنار ہوتے ہیں
خبر نہیں یہ روایت ہے یا حقیقت ہے — سنا تو ہے وہ رگِ جاں کے پاس ہوتے ہیں
ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال — دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا

آج کے شاعروں نے جہاں کئی شعری لوازم کو نظر انداز کر دیا ہے وہاں نغمگی کو بھی کہ شعر کی بنیادی خصوصیت ہے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ عدمؔ کے ہاں نغمگی اور روانی مستقل طور پر موجود ہے۔ ان کی شاعری میں ایک ترنم فضا چھائی ہوئی ہے۔ حسین گاتے ہوئے الفاظ اور دلکش ترکیبیں ہی ان کی شاعری کا تار و پود ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں شوخی اور شرارت کے عناصر بھی ملتے ہیں مثلاً ؎

بے خودی میں مرا آغوش ہے مجھ سے آگے — شرم مت کیجئے میں شاملِ آغوش نہیں
تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر — ہنستا تو ہوگا حضرتِ یزداں کبھی کبھی

عدمؔ صاحب میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ وہ شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور انہیں اس بات کا دھیان نہیں رہتا کہ کون سا شعر اس قابل ہے کہ رکھا جائے اور کون سا تلف کر دیا جائے۔ یوں تو ہر شاعر کو اپنا ہر شعر عزیز ہوتا ہے مگر اس کے باوجود شعراء میں اکثر اس قدر تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے کہ وہ کون سے اشعار کو رکھیں اور کن کو تلف کر دیں۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ کے اسی تنقیدی شعور نے غالبؔ کو عظیم اور لافانی بنایا ہے۔

عدمؔ صاحب شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور بعض اوقات بلا وجہ انہیں کو بھی چھپوانے سے گریز نہیں کرتے۔ عدمؔ صاحب کی زود گوئی اور کثرت گوئی سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ۱۹۴۲ء ہی کی بات ہے۔ ایک رات وہ زیادہ تھکے ہوئے تھے اس لئے میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب آدھی رات کا وقت ہوگا کہ یونہی میری آنکھ کھلی دیکھا کہ بتی جل رہی ہے۔ عدمؔ صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں سگرٹ دوسرے میں پنسل لئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ نوٹ بک سامنے تکیے پر پڑی ہے۔ میں خیر سو گیا۔ صبح میں نے پوچھا مولانا رات کیا بات تھی۔ کہنے لگے حضور یونہی نیند کھل گئی خیال آیا کہ کچھ شعر ہی کہہ ڈالوں مگر فقط سات غزلیں کہہ کر ہی نیند آ گئی۔ اب جو شاعر گھنٹے دو گھنٹے میں سات غزلیں کہہ ڈالے اندازہ کیجئے کہ وہ کس کثرت سے شعر کہتا ہوگا۔ کثرت سے شعر کہنا بُرا نہیں مگر ان سب اشعار کو من و عن رکھ دینا یقیناً بُرا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ دیں اس میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ شعر اچھا ہوا بُرا ہوا بس ہو گیا۔ اب اس میں مزید غور و فکر کرنا ان کا اصول ہی نہیں۔ اسی وجہ سے بعض اوقات غزلوں میں بہت ہلکے شعر بھی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ شعر غزل میں نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے میں نے کئی بار کہا کہ فلاں غزل میں سے فلاں فلاں شعر نکال دیجئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ہاں ضرور حذف کر دوں گا لیکن جب غزل چھپی تو وہ اشعار موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے آج تک جتنے شعر کہے ہیں وہ انہیں قریب قریب سب کے سب زبانی یاد ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ حافظہ ان کا بلا کا ہے۔ اشعار کہنے کے بعد ازبر ہو جاتے ہیں اس لئے بعد میں اگر وہ چاہیں بھی تو ان اشعار کو حذف نہیں کر سکتے۔ حافظے سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ اتوار کا دن تھا، مجھے دفتر سے چھٹی تھی۔ عدمؔ صاحب صبح ہی تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد [illegible] صاحب بھی آ گئے۔ عدمؔ صاحب کہنے لگے حضور آج بیویوں کا کوئی

بندوبست ہوتا نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے آج ایک مجموعہ ہی ترتیب دے ڈالوں اور چوہدری نذیر کو دے کر پیسے حاصل کروں"۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے "حضور مجھے اپنے کوئی دو سو قطعات یاد ہیں ان کو نقل کرنے کی ضرورت ہے"۔ چنانچہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور دوپہر کے کھانے کے دو گھنٹے بعد تک پورے دو سو قطعات حافظے سے نکال کر کاغذوں پر بکھیرے۔ مجموعے کا نام "ہوائے برشگال" رکھا۔ شام ہوئی تو کہنے لگے "چلیے حضور چوہدری نذیر کے پاس چلتے ہیں تاکہ آج کی شام کا بندوبست ہو"۔

آخر میں میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدم صاحب میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کی شخصیت اور ان کے فن کو پرکھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے پیشہ ور نقاد حضرات کو میری کئی باتوں سے اختلاف ہو۔ میں سمجھتا ہوں انہیں مجھ سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے عدم کو جس طرح دیکھا ہے جس طرح ان کی زندگی اور ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کی ایک سیدھی سادی تصویر آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اگر اس تصویر میں عدم صاحب کے کچھ خدوخال آپ کو نظر آئیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے یہ چند سطریں بے مصرف نہیں لکھیں۔

جذبی

انور عظیم

"کیا لکھ مار رہے ہو؟"

"جذبی کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہا ہوں۔"

"اف! جذبی کے متعلق! ایسے UNINSPIRING آدمی کے متعلق؟ بھئی حد ہو گئی!"

واقعی حد ہو گئی۔ ذرا اس شاعر پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں جو اپنی پہلی جھلک میں لوگوں پر اپنا جادو چلانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کی شکل و صورت، اس کا قد، اس کی آنکھیں، اس کی باتوں کا انداز کہیں کوئی [illegible] کوئی دلکش جلوہ نظر نہیں آتا۔ اگر اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمکدار یا [illegible] نظر آتی ہے تو وہ اس کا [illegible] میدان ہے۔ اس چٹیل چکنے سر کے کنارے دونوں طرف بال پچھلے بال آگے ہوئے اس [illegible] میدان میں دونوں طرف سے آ کر مل گئے ہیں۔ اور انہوں نے اس چمکدار سطح مرتفع کا احاطہ سا کر لیا ہے۔ یہ سر جتنا بڑا جتنا پھیلا [illegible] آنکھیں اتنی ہی چھوٹی ہیں اور چمک سے محروم ہیں۔ جذبی کو پہلی نظر میں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ایک ایسے آدمی کے سامنے کھڑے ہیں [illegible] اور جینے کی علامت بالکل مفقود ہے۔ [illegible] نے اس شاعر کی شخصیت میں ایک تکلیف دہ پژمردگی سی پیدا کر دی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر اس سے باتیں کریں، گھل مل جائیں، پھر دیکھئے اس کے چہرے کی تھکن اور افسردگی سے مسکراہٹ کا ایک کوندا سا لپکتا ہے اور سب کچھ [illegible] کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں بھی مایوسی ہوگی۔ اتنے بڑے بڑے اور [illegible] دانت [illegible] مسکراہٹ کی معصومیت اور جذبات کی پاکیزگی پر پڑا [illegible] خیال ہے کہ جذبی کوئی دو [illegible] کا [illegible] نہیں ہوئے لیکن ان سے پہلی بار ملنے کے بعد مجھے اس شخص پر بڑا رحم آیا تھا۔ میں نے ہمدردی کے جذبات سے سوچا تھا بے چارا اس حملے سے کس طرح بچا ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو پھر میرا یہ قیاس صحیح ہوگا کہ [illegible] اور نظام پیران کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ [illegible] اپنا سارا حوصلہ اسی ایک تختۂ مشق پر نکال لیا ہوگا۔

واقعی جذبی میں اتنی تھکن، اتنی تلخی، اتنی کلبیت (جو ان کے فن پر پوری طور پر محیط ہونے میں ناکام رہتی ہے) کیوں ہے۔ کیا ایک انسان [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] حالات اور زندگی کے تجربے اس کے مزاج اور اس کی مجموعی شخصیت کی تربیت اور [illegible] کرتے ہیں۔ کیا جذبی [illegible] اندھیرے میں بھٹکتا ہوا، ایک افسردہ دل اور انجمن کو افسردہ کرنے والا انسان ہے۔ [illegible] کے گھپ اندھیرے کے اندر چنگاریاں [illegible] ہوتی نہیں ہیں؟ کیا [illegible] کی شخصیت میں اس کی داخلی دنیا کی، جذبات کی، اس کے شعور اور تجربے کی آئینہ دار اس کی شاعری میں ان چنگاریوں کے [illegible]

اُڑتے ہوئے نظر نہیں آتے، اس کی شاعری کو اس کی شخصیت سے الگ کر کے کیوں دیکھا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کی پوری ترتیب و تحلیل میں اس کی اپنی شخصیت کا کتنا درد، کتنی اداسی، کتنی حوصلہ پروری، مایوسیوں کی کتنی پکار اور ان مایوسیوں پر یلغار ہونے والی کتنی نت نئی تمنائیں اسیر ہیں۔ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں (یا جاننا چاہتے ہیں)۔

شاعر کی زندگی شعر سے نہیں شروع ہوتی۔ شاعر کی زندگی کے تلخ و تند، لطیف و خوشگوار تجربوں کا جذباتی رچاؤ جب فنی امنگ میں ڈھلتا ہے اور الفاظ کی موسیقی میں تجسیم پاتا ہے تو اس میں شاعر کی انفرادی زندگی کے ساتھ کے دور کے اجتماعی تجربوں کی بنیادی سچائیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان سچائیوں کے کل بوٹے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن ان کی جڑیں ماضی کے دامن میں پیوست ہیں۔ جہاں یہ بات پورے انسانی سماج کے لئے صحیح ہے، وہاں اس کو ایک فرد کی زندگی اور اس کے فنی مظاہر تک پہنچتے ہوئے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جذبی آج ہمارے سامنے جیسے ہیں ویسے ہیں۔ لیکن آیئے ذرا ہم پیچھے ہٹ کر دیکھیں۔ آج سے بہت پہلے جب جذبی حجاب عدم میں تھے۔ اور صرف معین احسن اس دنیا میں موجود تھا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ جذبی کسی ناشری جراح کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ اگر آپ حالات کی سختیوں اور نا انصافیوں کو ایک انسان کی زندگی میں ایک ظالم جراح کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں تو میرا قیاس حقیقت میں بدل جائے گا۔

جذبی کا خاندان جو بہت پہلے میرٹھ سے دانا پور (بہار) منتقل ہو گیا تھا، پھر دوبارہ لکھنؤ واپس آ گیا۔ ان کے دادا ڈاکٹر عبدالغفور شہباز کی بدولت خاندان کے پیش نظر اس ادبی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ جذبی کے بچپن ہی میں ادبی ماحول نے اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ خود ان کے دادا ایک لغت مرتب کر رہے تھے۔ جس کا چودہ سال کا کام دھرا رہ گیا۔ پھر ان کی پھوپھی خاتون اکرم (جن کی شادی راز ق الخیری سے ہوئی) کی ادبی دلچسپیوں، در مسرّیقیتوں نے بھی گھر کے ماحول میں ثانی ادبی رنگ پیدا کر دیا تھا۔ ابھی میاں معین احسن کی عمر ۸ یا ۹ سال کی تھی کہ ان پر شاعری کا حق ادا کرنا واجب ہو گیا تھا۔ ان کو روزانہ غزلیں یاد کرنے کے لئے کہا جاتا۔ میاں معین احسن جذبی کے بچپنے کا اندازہ اگر آپ کے بچپنے سے لگایا جائے تو وہ دیکھنے میں ایک بے حد مسکین خاموش اور سست لڑکا دکھائی دیں گے۔ یہی لڑکا پرانی تہذیب کا بار سر پر اٹھائے، سر پہ ٹوپی چپکائے آنکھیں نیچی کئے، نہایت ادب سے غالب، اسمٰعیل میرٹھی، حالی اور اقبال کی چیزیں زبانی یاد کرتا اور روزانہ اپنے بزرگوں کو سنایا کرتا۔ بچپن کے اس وقت کے یاد کئے ہوئے اشعار ابھی تک یاد ہیں۔ ذرا غور کیجئے وہ معصوم سا لڑکا انیس کے یہ اشعار سنا رہا ہے ؎

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند

سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب جوڑ بند

سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند

نازک مزاج، شوخ، سیہ چشم، سر بلند

دادا اور پھوپھی وغیرہ کی ادبی دلچسپیوں اور غزلیں اور نظمیں یاد کرنے کا اس خاموش لڑکے کے ذہن پر یہ اثر ہوا کہ ۹ سال کی عمر میں ہی جناب نے تک بندیاں شروع کر دی۔ ان دنوں جھانسی میں قیام تھا۔ اور ساتویں آٹھویں جماعت کی طالب علمی کا دور تھا۔ صادق دہلوی کا شمار ان دنوں استادوں میں ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد تھے حامد شاہجہانپوری۔ وہ معین احسن کے گھر والوں کے پڑوسی تھے۔ ان کے یہاں اس ننھے شاعر کا آنا جانا تھا۔ ان سے تعلقات کا اثر پڑا۔ عقیدت اتنی بڑھی کہ معین احسن نے ان کی پوری بیاض حفظ کر لی۔ ان ہی دنوں باقاعدہ شاعری کا آغاز ہوا۔ معین احسن نے اپنی ایک غزل دوسرے کے نام سے ان کو دکھائی۔ انہوں نے ایک آدھ شعر پسند کیا۔ اس طرح معین احسن نے، جو اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور جس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اپنا تخلص ملال رکھا۔ اور اپنی شاعرانہ زندگی کی پہلی منزل میں بے دھڑک داخل ہو گیا۔ ان دنوں دنیائے شاعری میں جگر اور فانی کے نام روشن تھے۔ ان کی غزلوں کا بڑا شہرہ تھا۔ ان دنوں نظموں کا رواج نہیں تھا۔ ایک ایسے زمانے میں ایک ہونہار شاعر نے اپنی فنی زندگی کے ابتدائی دور میں باقاعدہ اصلاح حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ غزلوں کا دور تھا۔ اور معین احسن ملال کے سامنے اپنی طبع آزمائی کے لئے وسیع میدان تھا۔ حامد شاہجہانپوری نے ملال کی طبع رسا کا اندازہ لگایا اور انہیں اپنے استاد

عمادؔ دہلوی سے رجوع کرنے کے لئے بھیج دیا۔ وہ ہر شعر پر بحث کیا کرتے تھے۔ ایک آدھ لفظ کے الٹ پھیر سے اگر شعر ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ وہ پورا شعر کاٹ دیا کرتے تھے۔ وہ بندش، چستی، ابہام وغیرہ پر بات چیت کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کو اپنے ابتدائی دور میں ہی کافی محنت کرنی پڑی۔ استاد پوچھا کرتے "بتاؤ تجربے کا شاعری سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کے بعد زندگی کے واقعات کی تشریح کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد ملال کے استاد نے کہا "تمہاری غزلیں دوسرے درجے کے استادوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ اگر دماغ خراب نہ ہو تو ——"

آگرے میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں اردو کے ایک اور مشہور سے ملاقات ہوئی۔ وہ شاعر تھا مجازؔ۔ مجازؔ ان کے ہم جماعت تھے۔ دونوں سائنس کے طالب علم تھے۔ ان دنوں آگرے میں میکشؔ اکبرآبادی وغیرہ کا دور تھا۔ کالج کا پہلا سال تھا۔ شاعری کی تحریکیں ابھی ابتدائی دور میں تھیں۔ بڑھنے سے لئے ... رہی تھیں۔ ان ہی دنوں ملالؔ کو فانیؔ سے ملنے کا موقع ملا۔

ایک دن حضرت ہمت کر کے فانیؔ کے یہاں پہنچے تو وہ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف پختہ کار شاعر تھے، ان کا رعب اور شہرت تھی اور دوسری طرف ایک نو مشق نوجوان۔ کالج کا طالب علم شاعر جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن جیسے شاعری کا جنون اس دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر کے یہاں کھینچ لایا تھا۔ وہ بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے۔

"کیجئے کیا شغل ہے؟" فانیؔ نے پوچھا۔

"سائنس پڑھتا ہوں" یہ وہ الفاظ تھے جو جلدی سے تھرتھراتی ہوئی آواز کے ساتھ معین احسن ملالؔ کی زبان سے ادا ہوئے۔

"شعر و شاعری کا شوق بھی ہے؟"

"صاحب بس یوں ہی تک جھک لیتا ہوں" یہ پایا کمسار آواز مشکل سے نکلی۔

"کچھ سنائیے۔"

ملالؔ نے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ ان کے سامنے بڑی متانت کے ساتھ ایک کشیدہ قامت بزرگ اچھے لباس میں بیٹھے تھے۔ ان کے کھچڑی بالوں نے ان کے اندر اور بھی مربیانہ شان پیدا کر دی تھی۔

ملالؔ نے اپنی غزل کا پہلا شعر پڑھا

دل کو ہونا تھا جو بیں خراب ... پاس تھی یوں تو منزلِ مقصود

فانیؔ نے شعر دہراتے ہوئے دوسرا مصرعہ یوں پڑھا

پاس تھی ورنہ منزلِ مقصود

نوجوان شاعر نے خاموشی سے اصلاح قبول کر لی اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ دوبارہ اصلاح شدہ شعر پڑھا (فروزاں میں یہ غزل اصلاح شدہ شعر کے ساتھ شائع ہوئی ہے)۔

پھر جذبیؔ نے فانیؔ کو ایک اور غزل سنائی —— فروزاں کی پہلی غزل جس کا مقطع ہے

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبیؔ

جو اس وقت تھا ــ

ضبطِ غم بے سبب نہیں ہے ملالؔ ... خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

فانیؔ ایک دم ... ڈر بیٹھ گئے۔ بہت داد دی۔ کہنے لگے

"بہت سے طالب ... میرے ... شاعر آئے۔ آپ سے استدعا کروں گا ... اس خلش کو زندہ و تابندہ رکھئے"

اس داد نے کیا گل کھلائے اور کیسے دردمند شاعر کو پروان پڑھایا، لوگوں کو معلوم ہے۔

مجازؔ ثانی حیدرآباد چلے گئے، لیکن ملالؔ سے تعلقات کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد بھی ان سے چار پانچ بار ملنے کا موقع ملا۔ یہی وہ دور تھا جب شاعری کا جنون پورے شباب پر پہنچ گیا۔ اس زمانے میں شاعروں کی میٹنگ میکش کے ہاں ہوا کرتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ملالؔ (جذبیؔ) اور شہیدؔ (مجازؔ) دونوں یارِ غار تھے اور دونوں ایک دوسرے کی لاج رکھتے ہوئے ایک ساتھ بڑی آن بان سے سائنس کے امتحان میں فیل ہوئے۔ شہیدؔ بھی شاعر تھے، اور دونوں میں دوستانہ چشمک بھی ہوتی تھی۔ جذبیؔ نے اپنے دوست کے تخلص کا فائدہ اٹھا کر ایک پیروڈی لکھ ڈالی تھی ؂

آہ شہیدا واہ شہیدا — دیکھ ادھر للہ شہیدا

ان دنوں شاعری کی موجیں زندگی کے ساحل کی بندشوں کو توڑ کر ہر طرف دوڑ جاتی تھیں۔

ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوسٹل میں ایک صاحب موتی تھے۔ ذرا نٹ کھٹ اور نک چڑھے تھے۔ یاروں کی ان سے بنتی نہ تھی۔ ملالؔ اور شہیدؔ کے ایک دوست عابد تھے۔ عابد سے موتی کی ہمیشہ جوتم پیزار ہوا کرتی تھی۔ موتی کے نام کا فائدہ اٹھا کر ملالؔ نے ایک قطعہ تیار کر دیا ؂

کیوں بھونکتا ہے رات کو کیا ایسی بات ہے — عابد نے یہ کہا کہ بڑا بدصفات ہے

میں نے کہا کہ آپ برا مانتے ہیں کیوں — جب جانتے ہیں آپ کہ کتے کی ذات ہے

انہیں دنوں آل احمد سرورؔ بھی اسی کالج میں تھرڈ ایئر میں پڑھتے اور ان دونوں شاعروں (کھلنڈرے لڑکوں) کے مقابلے میں ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ بزمِ ادب کے سیکرٹری تھے۔

اس زمانے میں جذبیؔ اور مجازؔ کی دوستی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ بقول جذبیؔ "دوستی ان دنوں صرف مجازؔ سے تھی۔ لڑکے کہا کرتے کہ ان دونوں کا نکاح کرا دو"۔ ہوسٹل کے وارڈن ان کے "جڑواں پن" سے کچھ اتنے قائل ہو گئے تھے کہ جذبیؔ ان سے سینما جانے کی چھٹی لینے آتے تو وہ فرماتے "YES ASRARULHAQ CAN ALSO GO."

فیل ہونے کے بعد دونوں کو جدا جدا ہونا پڑا۔ جذبیؔ لکھنؤ چلے گئے اور مجازؔ علیگڑھ سدھارے۔ اسی زمانے میں خبط ہوا کہ تخلص بدلنا چاہئے۔ اور ۱۹۳۳ء میں یہ نیک کام بھی ہو گیا۔ ملالؔ جذبیؔ میں منتقل ہو گیا۔

یہاں بھی شاعری کا سلسلہ اسی مجنونانہ بدحواسی کے ساتھ جاری رہا۔ کتابیں خوب پڑھی جاتیں۔ لیکن نصاب کی کتابوں کا خیال آتے ہی طبیعت الجھنے لگتی۔ "اف یہ کورس کی غیر شاعرانہ فضول کتابیں کون پڑھے۔" نتیجہ ظاہر تھا۔ یہاں بھی لڑھک گئے۔

جذبیؔ پر اس کے بعد بڑا کڑا وقت آیا۔ موصوف کے ابا جان کو دھچکا لگا۔ اور وہ اپنے صاحبزادے کے تعلیمی مستقبل کو رو بیٹھے۔ کہنے لگے "میاں، شعر و شاعری میں تمہاری ناؤ ڈوب گئی۔ اب چھوڑو۔ چپ چاپ پوسٹ آفس وغیرہ میں کام کر لو۔"

جذبیؔ جب ساڑھے تین سال کے تھے ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ سوتیلی ماں کی سختی کے شیاں سانپ کی طرح ان کے نوجوان دل کو ڈستی رہی تھیں۔ ابا بھی ان کے مشورے سے متاثر تھے۔ اپنے فیل ہونے نے معاملہ اور بگاڑ دیا تھا۔ جھانسی اور لکھنؤ میں غمِ عشق کے کچوکے بھی لگنا شروع ہو گئے تھے۔ جذبیؔ کا کہنا ہے "غمِ عشق کیا اسے دونوں طرف سے ایک معصوم اور مبہم خلش کہہ لو"۔ مختلف قسم کی جذباتی خلش جو زہر کی طرح ایک رہی تھی ۱۹۳۴ء میں زخم بن کر پھوٹ پڑا۔

"ایک شام جب ابا کی نظروں کے پھر جانے کا غم سینے پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ آسمان پہ ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے ——— اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ انتہائی ذہنی کوفت کے عالم میں ایک مصرعہ ہو گیا

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے

پندرہ منٹ میں غزل ہو گئی۔"

اسی غزل نے بعد میں جذبی کو مشہور کیا اور اس کو ایک فنو طیت پسند شاعر کا خطاب دلوایا۔ حالانکہ بقول جذبی "یہ غزل اس خاص لمحے کے موڈ کی بے ساختہ ترجمانی کرتی ہے۔"

اس غزل کی آگرے میں کوئی خاص داد نہیں ملی۔ دو سال تک پڑی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں "ساقی" کو بھیجی گئی۔ مجنوں نے وہی غزل "ایوان" میں شائع کی۔

اس غزل کا موڈ شاعر پر گہرا ہو کر چھا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سوتیلی ماں سے سخت جھگڑا ہوا۔ اس جھگڑے نے اس غزل کے دل شکستہ شاعر کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے ایک دوست کے بھائی کے ساتھ احمد آباد کی سیر کو چلے گئے۔ ٹرین میں ایک صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ فوٹو گرافر تھے ان سے معلوم ہوا کہ ایک نئی فلم کمپنی کھلی ہے ——— مودن فلم کمپنی! پھر اس زمانے میں مزید ذرا معلوم ہوئی کہ اس میں زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے۔ جذبی نے ان سے ایک خط لیا اور اس فلم کمپنی میں آ دھمکے۔ وہاں مہینہ بھر خاک چھانتے رہے۔ شوٹنگ ووٹنگ ادھوری رہ گئی۔ مینیجنگ ڈائرکٹر آدمی با مذاق تھے۔ جسے جو کچھ تھے کھا پی گئے۔ کمپنی ٹھپ ہو گئی۔ اسی زمانے میں جذبی کے پرائیویٹ امتحان کا نتیجہ نکل چکا تھا۔ اتفاق سے دل شکستہ کشتی کا ساحل ہموار ہو گیا تھا۔

ساحل کی تمنا اور بڑھی۔ جذبی نے اپنے والد کو ایک خط لکھا کہ "اگر آپ میری مدد کریں تو میں علی گڑھ جا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔" پھر انتہائی مصیبت کا دور شروع ہوا۔ تعلیم دہلی میں شروع ہوئی۔ حالات ناقابل برداشت تھے۔ والد وغیرہ ان دنوں بھوپال میں تھے کچھ مدد کر رہے تھے۔ اس دوران میں زبردست علالت کا حملہ ہوا۔ اور اس زمانے میں جذبی کو زندگی سے انتہائی نفرت اور اکتاہٹ ہونے لگی۔ فلسفے میں شاعر بیچارہ پھر لڑھک گیا۔ جناب کا خیال تھا "جیسی پیاس نہیں ہوتا۔ یا تو ممتحن کو فلسفہ نہیں آتا تھا یا میں واقعی فلسفے میں قابل تھا۔"

پھر وہی مسئلہ۔ پرانا روگ! لیکن ۱۹۳۶ء میں آخر کامیابی نصیب ہوئی۔ اور آپ نے طے ہو گئی۔ علی گڑھ میں انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن آپ نے سخت مخالفت کی اور پھر وہ دہلی واپس آ گئے۔ وہاں خالہ تھیں اور مجاز ریڈیو میں ملازم تھے ——— "آواز" کے نائب مدیر۔ ان کے ساتھ جذبی کا قیام رہا۔ لیکن مصیبت وہاں بھی منتظر تھی۔ مجاز برطرف کر دیے گئے۔ دونوں کا قیام اسی طرح دہلی پر رہا۔ اس زمانے میں جوش بھی دہلی آ گئے تھے۔ وہ قرول باغ میں مقیم تھے اور کلیم بے کار رہتے تھے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کے جنون کے سوا تھا ہی کیا۔ سب سے بڑا کام دن بھر خواتین میں بیٹھنا اور ٹیوشن تلاش کرنا تھا۔ اور اس سے جو وقت بچتا وہ جوش کی صحبتوں میں گزرتا۔

ان ہی دنوں رات کے اندھیرے میں قسمت کا ستارہ چمکا۔ بمبئی میں ایک جگہ تدریس کی مل گئی۔ یہ جگہ سیکنڈری ٹریٹ میں تھی۔ تین چار مہینے وہاں کام کیا۔ پھر وہاں سے بھی چھٹی ملی اور افتاں و خیزاں بھوپال پہنچے۔ ۱۹۳۸ء میں سکول میں جگہ ملی۔ اس اسکول کا نام ماڈل ہائی سکول تھا۔ جذبی نے ڈٹ کر یہاں دس مہینے تک کام کیا لیکن تنخواہ کا مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ یعنی یہی طے نہ ہو سکا کہ تنخواہ ملے گی یا نہیں۔

آخر جی چھوٹ گیا اور یہ شاعر آوارہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ وہاں سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ "نیا ادب" نکال رہے تھے۔ اس حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سردار اور سبط حسن ساتھ رہتے تھے۔ ۱۹۳۹ء تک جذبی بھی وہیں بطور مہمان رہے۔ افلاس اور تنگدستی کا آفتاب سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ یہاں ایک اسکول میں دس مہینے بھاڑ جھونکنے کا صلہ مل گیا۔ دس مہینے کی تنخواہ شاعر کی مٹھی میں تھی ——— چھ سو روپے! شاعر کو اتنی خوشی ہوئی کہ بیمار پڑ گیا۔ دو سو تو جھڑ سے کھاٹ ڈاکٹروں کی نذر ہو گئے۔ باقی چار سو روپے لے کر موصوف علی گڑھ وارد ہوئے۔ اس وقت ایم اے کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک ابھر رہی تھی۔ اور جذبی کو بھی اس تحریک کا ایک مبہم تصور تھا۔ ترقی پسندی کا معیار جب جوش کی نظمیں تھیں۔ اور اس وقت تک ترقی پسندی کی بنیاد ڈالنے والوں نے وضاحت بھی نہیں کی تھی۔

جذبی نے بھوپال کے دوران قیام میں "فطرت ایک مفلس کی نظر میں" لکھی تھی۔ اس کے بعد ۳۸، ۳۹ء میں ایک اور نظم "اے کاش" لکھی۔

[illegible] میں مکمل ہوئی۔

علی گڑھ آنے کے بعد جذبی کی صحت بالکل ہی خراب ہو چکی تھی۔ اونٹ کسی کل بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ وہاں ایک ایسا حلقہ ملا جو سیاست اور ادب میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اور جو [illegible] کے لئے بے تاب تھا۔ اس زمانے کی راتیں باتوں میں بیت جاتی تھیں۔ سورج ڈوبتا تھا اور ادھر جلوہ گر ہوتا تھا لیکن بحثیں ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ ادب پر بات ہوتی، سیاست پر بات ہوتی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بات ہوتی۔ دل کی تشنگی پھر بھی نہ بجھتی۔ اس حلقے میں ضیا، محسن، انور انصاری وغیرہ تھے۔ اس زمانے میں ادبی مسائل کے صحیح خد و خال ابھر کر سامنے آنے لگے تھے۔ اور ان کو سمجھنے کی بصیرت پیدا ہونے لگی تھی۔ لیکن پے در پے دھچکوں، ذاتی شکستوں، ماحول کی ستم ظریفیوں نے خود شاعر کی تخلیقی قوت پر اوس ڈال دی تھی۔ امنگوں کا دم نکل رہا تھا اور پائے ثبات ڈگمگا گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک خیال کا بھوت بہت ستایا کرتا۔ ایک صلاحیت تھی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک بار جبر کر کے کوشش کی۔ تین چار شعر ہوئے۔ ہمت جواب دینے لگی۔ پھر کوشش کی ——— یونہی بے خیالی میں مصرعے آنے لگے ——

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں

معلوم ہوا ایک بند ہو گیا جو ایک ہی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ امتحان کو چند دن تھے۔ ہیجان بے حد شدید تھا۔ پڑھا لکھا سب غائب ہوتے لگا۔ آ[illegible]نے ان ہی دنوں ایک طرف تو مینا کی امتحان کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ دوسری طرف رومانی تجربات نے دل کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ جذبات کی دنیا میں ایسی آگ لگی کہ سراپا زندگی دھوئیں کا زہریلا مینار بن گئی۔ دل کے تار تڑپ تڑپ جھنکار سے ٹوٹے اور دماغ کی کڑیاں ہل گئیں۔ یہ ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ اسی ہیجان اور انتشار کے دور میں جذبی نے سب سے زیادہ شاعری کی۔ نئی نظمیں خون جگر کا اعجاز بن کر یا چھلک پڑیں۔ —— کون جانے یہ اشعار تھے یا شاعر کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے شعلہ فشاں خون دل کے قطرے —— اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ وہی لہو کے قطرے آج تک جدید شاعری کی رگوں میں آتش کی طرح دوڑ رہے ہیں۔

'بیزار نگاہوں' کی داستان پر خوں شدہ دل کی داستان ہے جس میں محبت کی مقدس خواہش کا پورا ہیجان موجزن ہے۔ یہ نظم اسی دور کی نظم ہے اور شاعر کے جذباتی تجربے کی خوبصورت یادگار ہے۔ اس تجربے کا ہیجان انسان کے معصوم جذبے کو پائندگی بخشنے والا ہیجان ہے۔

علی گڑھ سے طبیعت اچاٹ ہو چکی تھی۔ 'آج کل' کی ملازمت مل گئی اور جذبی دہلی آ گئے ——— وہاں جذبی کو زیادہ تر بیمار رہنا پڑا۔ دوسری عالمگیر جنگ شباب پر تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی ادیبوں کے لئے ایک مستقل طبعی مقام بن گئی۔ فیض، تاثیر، راشد، کرشن چندر، منٹو، اپندر ناتھ اشک، بیدی، اختر [illegible] —— یہ پورا قافلہ یہیں بسا ہوا تھا۔ ان سب ادیبوں سے جذبی کا ملنا جلنا کافی تھا۔ ان ملاقاتوں میں ادبی زندگی کی باتیں تھیں اور بعض لمحات دلچسپ گزرے۔

لیکن اس نئی ملازمت کے کولہو میں جتنے کے بعد جلد ہی جذبی کو محسوس ہوا کہ گاڑی چلنے کی نہیں۔ پہیے کی نوک [illegible]۔ 'آج کل' کا ایڈیٹر [illegible] ایک ایرانی النسل [illegible] تھا۔ حکومت کا غلام خالص [illegible]۔ وہ انگریز حکام سے زیادہ انگریزی حکومت کا وفادار تھا۔ جب اس کو جذبی کے رجحانات اور میلانات کا احساس ہوا تو قدم قدم پر روڑے اٹکانے لگا۔ ایک بار 'آج کل' کے ٹائٹل کا رنگ سرخ چھپا۔ وہ ہندوستانی انگریز کہنے لگا "جناب یہ تو سوویت رنگ ہے!"

ایک انگریز پروڈکشن کا انچارج تھا۔ اس نے بھی یہی بات کی۔ جذبی کے دل میں آگ سلگنے لگی۔ اس کے بعد ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک مضمون ترجمے کو ملا جس میں کہا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی آغا خاں کے محل میں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جذبی نے اس کے ترجمے سے انکار کر دیا۔ کرنل ڈیپلر سے جھڑپ ہوئی۔ معاملہ بگڑتا گیا۔ جذبی نے آخر تنگ آ کر اور الکاتین مہینے کی چھٹی لے لی اور بمبئی چل دیئے۔ وہاں سبط حسن اور جعفری کے ساتھ رہے۔ جذبی کو یہ خیال تھا کہ وہاں فلم کمپنی وغیرہ میں جنس رہیں گے۔ جاں نثار، کیفی وغیرہ نے بڑی ہمت بندھائی۔ منٹو نے کہا فلمستان میں

بکریوں دلا دیں گے۔ چلو امید کی ایک اور کرن پھوٹی۔

"ڈائرکٹر مکرجی سے انٹرویو ہوا۔ انہوں نے پوچھا "کہئے آپ نباہ کر سکیں گے یا نہیں؟"

"جناب کیوں نہیں کر سکیں گے؟" جواب حاضر تھا۔

"جی، پریم چند بھی آئے یہاں لیکن نہیں چل سکے۔"

اس کے بعد جذبی کو وحشت سی رہنے لگی۔ سمجھوتے کی ایک حد ہوتی ہے۔ جذبی کو بمبئی کا سا بازاری شور و غوغا الگ کھائے جا رہا تھا۔ یہاں تنہائی میسر نہیں آتی تھی۔ اسی وحشت کے زمانے میں مسز نیڈو سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے جذبی نے ریسرچ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے وظیفہ دلا دیا۔ وہاں سے جذبی سیدھے دہلی آئے۔ استعفا دیا اور علی گڑھ میں کام کرنے لگے۔ اتفاق سے موقع نکل آیا۔ اور یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت سے آج تک جذبی اسی علی گڑھ میں زندگی گزار رہے ہیں جس کے بارے میں ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا

"یہ ایک کنواں ہے جہاں ہم مینڈکوں کی طرح ایک محدود دائرے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جب کوئی مینڈک باہر سے آ کر اس میں ٹپک جاتا ہے تو دل و دماغ میں کافی چہل پہل ہو جاتی ہے۔"

یہ بات انہوں نے میرے اچانک ٹپک پڑنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہی تھی۔

زندگی کا پر پیچ سلسلہ جذبی کو یہاں تک لے آیا ہے۔ جذبی اور ان کو جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ ایک شاعر کی زندگی کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ آج وہ مسلم یونیورسٹی میں ایک لیکچرار کی حیثیت سے ایک خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے ننگی اینٹوں سے بنا ہوا ایک مختصر کوارٹر۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک اچھے اور ذمہ دار شوہر اور شفیق باپ کی زندگی خاموشی سے گزار رہے ہیں۔

صبح آٹھ بجے سے یونیورسٹی کی پڑھائی شروع ہوتی ہے اور اس وقت سے ان کے فرائض کا چکر شروع ہوتا ہے۔ یونیورسٹی سے واپس آ کر پھر وہی بیوی وہی بچے، وہی گھر اور وہی گھریلو تقاضے۔ اس چھوٹے سے کوارٹر میں ایک چھوٹا سا حصہ باہر ہے جو اس شاعر کا کھلا ہے۔ یہاں چق اٹھا کر آپ جب اندر پہنچیں گے تو ایک ترتیب اور بے ترتیبی سی نظر آئے گی۔ ایک میز اس کے آگے ایک کرسی ایک اور آرام کرسی۔ اس کے آگے ایک چھوٹی سی میز اور اس چھوٹی سی میز پر کبھی کتابیں، کبھی چائے کا طشت اور کبھی سگار کا بکس نظر آئے گا۔

میں جب کبھی اچانک جذبی کے سر مہمان بے تکلف نازل ہوا ہوں تو میں نے اکثر ان کو تنہا پایا ہے۔ دو میزوں اور کرسیوں سے پرے ایک گوشے میں پڑی چارپائی پر دراز یا بیٹھے ہوئے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں کمرے میں گھس پڑا ہوں اور اس کے بعد شاعر کو میرے آدھمکنے کا علم ہوا ہے۔ جی نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ابھی میں باہر ہی ہوں اور ابھی اس کا یقین بھی نہیں ہوا ہے کہ حضرت گھر پر موجود ہیں یا تیر کمان سے نکل چکا ہے کہ تحسین و آفرین کی لے میں چق سے پیچھے سے خیر مقدم کے نعرے گونجنے لگے۔

میری عمر اور جذبی کی عمر میں ایک پوری ادبی نسل کا فرق ہے لیکن جذبی نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی عمر کی برتری کا سہارا نہیں لیا۔ اور بعض مباحث ایسے بھی آئے جب میں نے تلخ باتیں کہیں اور سختی سے کہیں۔ لیکن جذبی کے انداز گفتگو اور دوستانہ لب و لہجے اور برتاؤ میں فرق پیدا نہیں ہوا۔ میں جانتا ہوں اور جذبی بھی جانتے ہیں کہ ان کے بعض کٹر تصورات کو میں ان کے مدرسانہ داخلی ردعمل کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

جذبی میں بڑی زندگی ہے مجھے ان سے مل کر کبھی تھکن، اکتاہٹ اور بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ میں جب بھی ان سے ملا ہوں، مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک مخلص اور ہمدرد دوست سے بات کر رہا ہوں۔ جب اختلاف کی بات ہوتی ہے اصولی ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو علقہ بگوش اسلام کرنے والی ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا ہے۔ میں نے ان میں وہ لچک بھی محسوس کی ہے جو ایک سنجیدہ اور منطقی گفتگو کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ جذبی کے متعلق یونیورسٹی میں، یونیورسٹی سے باہر علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے باہر آپ کو مختلف رائیں سننے کا اتفاق ہوگا۔

"جذبی ——— اوہ جذبی بہت بور ہے، بالکل برف کی سل"

"جذبی بہت مغرور ہے وہ اپنے سوا کسی کو شاعر ہی نہیں مانتا"

"جذبی ساس اور بیوی سے بہت ڈرتا ہے"

"جذبی اپنے رفیقوں کی ترقی سے جلتا ہے"

"جذبی میں خود پرستی نے حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی ہے۔"

"جذبی کی ہاں میں ہاں ملاؤ اور اپنا اُلو سیدھا کرو۔"

اور بہت سی باتیں ——— باتیں اور باتیں۔ جھوٹی باتیں، سچی باتیں، اچھی باتیں اور بُری باتیں۔ ان میں سے اکثر باتیں غلط ہیں۔ اکثر باتیں تعصب، خود غرضی اور تنگ نظری سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ایک بات صحیح ہے۔ اوپر لکھی ہوئی باتوں میں سے آخری بات سو فیصدی صحیح ہے۔ ان معنی میں نہیں کہ وہ لوگوں کی خوشامدانہ اور چاپلوسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس معاملے میں انہیں واقعی سیدھا سمجھتا ہوں۔ ایسے یاروں کی مثالیں بھی موجود ہے جنہوں نے جذبی سے ہر قسم کی مدد لی، ان کی شخصیت کے سہارے روشناس ہوئے، بڑھے، ان کی معاشی امداد کی زمین پر باوقار طور پر کھڑے ہوئے ——— اور جب پر تولنے کی سکت پیدا ہوئی تو جذبی کو گالی دیتے ہوئے فضا میں اپنی بولیاں بولتے ہوئے بلند (معلق) ہو گئے۔

جذبی کو پچھلی زندگی اور پھر یونیورسٹی کی زندگی میں بڑے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ ہر شاخِ گل جس کی طرف شاعر کا ہاتھ بڑھا، کانٹوں کی بیل میں بدل گئی ہے۔ وہ بچہ جو ساڑھے تین سال کی عمر میں ماں کو کھو بیٹھا، جس کی تعلیمی زندگی میں برابر ٹھوکریں لگتی رہیں، جس کے باپ نے کم عمری ہی میں اپنا ہاتھ اس کے سر سے اٹھا لیا، جس نے مختلف ملازمتیں کیں اور ہر جگہ حالات سے ٹکر ہوئی، جسے فلمی دنیا میں ضمیر اور آزادی کے خیال نے کچھ کرنے نہ دیا، جس نے اپنی ساری زندگی افلاس، نیم فاقہ کشی، ناامیدی اور شکستوں کے اندھیرے میں بتائی، جس نے صبحِ نشاط سے شامِ غم تک کی منزلیں بہ یک قدم طے کیں، محبت کی ہلکی خلش بھی جس کے لئے ناکامی کا زہر بن گئی اور جس کے لئے دنیا تلخی سے بھری ہوئی، سلگی سلگی سی سپردگی بھی خودی کی آزمائش بن گئی ——— اس آدمی کے لئے مختلف لمحات میں افسردہ ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ان کی شاعری اس وقت میرا موضوع نہیں ہے لیکن جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں تو ان کی زندگی کی پوری کہانی سلسلہ وار آئینہ در آئینہ سامنے آجاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مایوسیاں، رقت خیز غم انگیزیاں، پھر ان غم انگیزیوں پر امید کی یلغار ——— (کچھ لوگوں کو ان کی زندگی یا شاعری کا یہ پہلو دکھائی نہیں دیتا) ——— اسی لئے جب بہت سے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں جذبی پر نظر ڈالتا ہوں تو میں ان کی ذات، ان کی زندگی اور ان کی شاعری کو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ذاتی زندگی اور شاعری کا اتنا رچا ہوا اور خوبصورت آہنگ بہت کم فنکاروں میں دکھائی دیتا ہے۔

اس وقت جبکہ جذبی کے حال پر ایک سرسری نظر ڈال رہا ہوں تو میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں جو میں کہہ نہ سکوں گا۔

وہ شام مجھے یاد ہے۔ زیادہ دن نہیں بیتے ——— سردیوں کا زمانہ تھا، میں اچانک علی گڑھ پہنچ گیا تھا۔ باہر پاگل بنا دینے والی سنہری چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے گیارہ بارہ بج رہے تھے اور ہم مسلسل زندگی کے مختلف مسائل پر بات کر رہے تھے، جذبی بہت جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ دور میں رومان جذباتی اور سطحی منزل سے آگے بڑھ کر رفاقت کا درجہ حاصل نہیں کرتا، وہ درجہ حاصل کرنے کے لئے مشکل پسندی اور گہرے خلوص کی ضرورت ہے۔ اس وقت جذبی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ان کے دل پر کھائے ہوئے زخم تازہ ہو گئے تھے اور منہ کھولے ہوئے نظر آرہے تھے، زندگی کے مختلف تجربوں میں شکست کھا کر جذبی نے زندگی کے صحیح پسند تقاضوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ انہوں نے اپنی ایک رشتہ دار خاتون سے شادی کر لی۔ رومان کو منطقی انجام تک پہنچانے کی فطری خواہش کا رد عمل ہونے کے بعد انہوں نے اپنی شادی کو نغمگی و دلآویزی تک پہنچانے کا عزم کیا اور بڑی ثابت قدمی اور حوصلے کے ساتھ پورا کیا۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ میں اس سے محبت کروں۔ وہ میرے بچوں کی ماں بن کر خوش ہے۔ یہ معصوم اطمینان زندگی کی گھٹن میں بڑا کام کرتا ہے۔

دوسری صبح کہنے لگے "میاں اگر زندگی میں کچھ کرنا چاہتے ہو تو کسی ایسی ہستی کو چاہو جو تمہاری چاہت کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہ دنیا کھلاڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔"

اسی وقت ان کی پیاری سی بچی جلیس وہاں آگئی۔ جذبی نے فوراً اس کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کے کٹے ہوئے لمبے بال اس کی آنکھوں پر آگئے۔ اس کے بال ہٹا کر اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے جذبی نے کھلکھلا کر کہا، "دیکھو میری محبوبہ یہ ہے جو مجھے کبھی دغا نہیں دے گی۔"

اس ایک جملے سے معلوم ہو جائیگا کہ جذبی کے جذبات زندگی کے کس موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں ایک طرف ان کے جذبات کا گداز محسوس ہوتا ہے وہاں ان کی تلخی اور قنوطیت پسندی بھی جھلک

پڑتی ہے جس کا چشمہ فیضان ان کی اپنی زندگی کا ذاتی تجربہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ تجربہ کبھی کبھی جذبی کی شاعری اور زندگی دونوں پر حاوی ہو گیا ہے۔ یہیں سے ان کے یہاں قنوطیت اور کلبیت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ لیکن یہ داسی یہ کلبیت، یہ شکست خوردگی ان کی پوری شاعری اور ان کی پوری زندگی پر محیط نہیں ہے۔

جذبی کو اپنی موجودہ زندگی میں، موجودہ سماجی نظام کی لعنتوں میں سے ہر لعنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی میں شخصیت پرستیوں، خوشامدوں [illegible]۔ دوسرے کی آنکھیں [illegible] دوسر پر لعنت [illegible] کی اس [illegible] وہ اکیلے ایک تماشائی کی طرح کنارے پر کھڑے ہیں۔ لیکن بالکل بے نیاز بھی نہیں جب اس فضا میں زہر بہت بھر جاتا ہے تو وہ چیخ اٹھتے ہیں۔ یار [illegible] انقلاب [illegible] جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں آ جائے ——— انتظار کب تک؟"

جذبی سردار جعفری کی شاعری سے شاکی ہیں۔ وہ کہتے ہیں "وہ شاعر محنت اور مشق سے بنا ہے۔ میں اسے بہت اچھا شاعر مانتا ہوں لیکن وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی [illegible] رکھوں [illegible] شاعر [illegible] اور اگر وہ [illegible] ہو تو پھر وہ سردار جعفری نہیں۔"

لیکن ساتھ ہی جب دوستوں کا ذکر کریں گے تو اسی شدت اور یقین کے ساتھ کہیں گے۔ "ادب کے میدان میں میرے اور سردار کے اختلافات جتنے بھی ہوں لیکن میرا دوست [illegible] ہی ہے۔ سردار کی خوبیوں اور انسانیت پر مجھے جتنا بھروسہ ہے اور کسی پر نہیں۔ جانتا ہوں اگر آج ضرورت پڑے تو میرے لئے وہی سب سے زیادہ تڑپے گا۔"

جب کبھی غم روزگار، محبت، دوستی، انسانیت، فرض، عمل اور مستقبل کا ذکر آیا ہے جذبی نے مجاز اور سردار کے لئے اپنی انتہائی دوستی کا اعلان کیا ہے اور ماضی کے لمحات یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔

جذبی [illegible] میں ایک شخص یہ بھی کہی جاتی ہے کہ وہ ایک بے عمل آدمی ہیں لیکن ابھی پچھلے سال کا ذکر ہے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کے سلسلے میں علیگڑھ کام سے گیا تھا تین دن تک مستقل جذبی میرے ساتھ چکر لگاتے رہے دوستوں اور [illegible] ان کے تضحیک آمیز جملے برداشت کرتے رہے لیکن انہوں نے چندہ [illegible] کی مہم میں پیچھے رہے۔ اور انہوں نے علیگڑھ کے باعمل دوستوں کے مقابلے میں زیادہ کام کیا اور کانفرنس کے [illegible] وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

کبھی کبھی جذبی پر ایک غیر منطقی بے نیازی کا دورہ پڑتا ہے اور وہ "سنیاسی" کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ محض لمحاتی اور جذباتی کیفیت ہوتی ہے۔

ہاں جذبی کو رات کے [illegible] کر دیر تک گپیں اڑانے میں بھی کافی مزا آتا ہے۔ لیکن گپیں [illegible] مسائل سے متعلق ہوتی ہیں یا زندگی کی [illegible] یا دوسرے تجربوں کے متعلق۔

ایک رات [illegible] گیارہ بجے جذبی پر نمائش میں جانے کا دورہ پڑا۔ میں ان کا مہمان تھا اس لئے بقیہ [illegible] ضروری تھا۔ ہم جگر مراد آبادی کے ساتھ نمائش میں گئے۔ علی گڑھ کی نمائش وہاں کی زندگی میں بڑا اہم حصہ ادا کرتی ہے۔ رات کافی ہو گئی۔ چلی تھی لیکن وہاں کافی [illegible] ہم جس ہوٹل پر بیٹھے وہاں لاؤڈ سپیکر پر جگر مراد آبادی اور جذبی کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف کھینچا جانے لگا۔ "یہ ہے وہ شاندار ہوٹل جہاں اس وقت ملک کے دو مشہور شاعر جگر مراد آبادی اور جذبی موجود ہیں۔" یہ گویا شاید شخص کباب فروش [illegible] ہم کافی لطف اٹھاتے رہے اور نمائش سے ایک بجے لوٹے۔

گھر پہنچ کر بھی دو گھنٹے تک گپ ہوتی رہی۔ موصوف اس پر بہت خوش تھے کہ وہ کانفرنس کے لئے جگر مراد آبادی سے [illegible] چندہ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جذبی پر ایسے لمحات کم ہی آتے ہیں ورنہ وہ ایک خاموش انسان کی طرح اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق فرائض ادا کرتے ہیں۔ [illegible] بچوں کو پیار کرتے ہیں، ان کو گود میں لے کر کھلاتے ہیں، میز پر بیٹھ کر [illegible] کتابیں پڑھتے ہیں اور کبھی اپنا [illegible] ——— اور یہ سب کچھ نہ ہو تو [illegible] چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سگار پیتے ہیں، سگار سے گھبراتے ہیں تو سگریٹ پیتے ہیں اور سگریٹ سے اکتاتے ہیں تو حقہ گڑگڑاتے ہیں ——— کمرے کو دھوئیں سے بھر لیتے ہیں ——— اس دھوئیں میں شاعر کے دل کی خاموشی [illegible] بھی ہوتا ہے اور [illegible] بھی ——— یہ تشنگی خود اپنی زندگی کی ہوتی ہے ——— اور وسیع تر زندگی کی بھی جس کی پشت ماضی کی طرف ہے اور نظریں مستقبل کی طرف۔

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار ——— ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

جذبی کو راکھ کا ڈھیر سمجھنے والوں سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ راکھ کے ڈھیر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے سے پہلے ایک ذرا رک کے اور اس ڈھیر کو کرید کر دیکھئے ——— [illegible] اس کے اندر چنگاریاں دبی ہوں جن کو اگر ہوا دی جائے تو جنگل کی آگ بن جائیں۔

شکیلہ اختر

صوفیہ فضل

بے حد گھنگھریالے سیاہ بال اور سنہرے رنگوں والی آپا کو ہم نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھا۔ جب بھی ان کی طرف نظر اٹھی تو بس ڈرتے ہی ڈرتے۔ سنا ہے کہ آپا کے آنے سے پہلے دو بھائی چھوٹے ہی چھوٹے اس دنیا سے جا چکے تھے، اب آپا جو آئیں تو ایک تو لاڈلی اس پر سے بیمار — اسی لئے ہاتھوں ہاتھ رہتے رہتے آپا بس آپا ہی بن بیٹھیں۔

پائیں باغ میں کچے کچے آم اور امرود کھاتے کھاتے بیمار پڑ کر جب میں اچھی ہوئی تو آپا نے مجھ کو سزا دینے کے لئے یسرنا القرآن پڑھانا شروع کیا۔ جہاں تک نقطوں کی بات تھی ایک، دو، تین تک کی گنتی میں سنا دیا کرتی تھی مگر کھڑے، پڑے اور بیٹھے ہوئے الفاظ کسی طرح بھی میرے پلے نہ پڑتے تھے اور آپا کو ساتھ ہی ساتھ یہ دھن بھی لگی رہتی تھی کہ ایک ہی دفعہ ساری کی ساری کتاب وہ مجھے ختم ہی کرا دیں۔ جانے یسرنا القرآن کو بھی مجھ سے کیسی اللہ واسطے کی بیر تھی جو اس کا کوئی اور اور چھور میری سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ ابھی ابھی دل و دماغ کو سنبھال کر عربی پڑھ رہی ہوں کہ بیچ صاحب دوسری سطر اردو کی موجود، جیسے تیسے اس بلا سے ابھی نجات ملی ہی تھی کہ ایک اور تیسری زبان "کتاب شد" کی سر پہ سوار — ابھی عربی، اردو اور فارسی کی جھنجھٹ میں دماغ خراب ہی ہو رہا تھا کہ ادھر سر اور پیٹھ پر آپا کے دھموکے پڑنے شروع ہو گئے۔ ہاتھ سے مارتے مارتے جب ان کا دل نہ بھرا تو ایک دن قینچی سے مارتے مارتے آپا نے اونچی کرسی والے برآمدے سے مجھے نیچے دھکا دے دیا — پھر تو بس اسی دن سے ہمارے نصیبے بھی کھل گئے۔ اماں جان نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسی پڑھائی سے باز رہی جس سے میری بچی کی جان ہی چلی جاتے" — شام تک جب آپا کا غصہ اتر گیا تب انہوں نے بھی یہ مان لیا کہ یہ کتاب ہے ہی فضول۔ آخر آپا نے کھیلتے ہی کھیلتے نو سال کی عمر میں اپنی ساری پڑھائی کیسے ختم کر دی تھی؟ پھر اس دن سے کبھی آپا نے کسی کو پڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ اب بھی کسی کسی بچے کی پڑھائی پر بس ہلکی سی نظر ڈال لیتی ہیں۔

شاید آپا کے مزاج میں سب سے پہلی چڑچڑاہٹ ان کے گھنگھریالے بالوں نے ہی پیدا کی ہو گی جو ان کو بے حد ناپسند ہیں اور اس کے بعد دائمی نزلہ کی بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہم سارے بھائی بہنوں میں آپا سب سے زیادہ خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی ہیں مگر کبھی اچانک ایسے ہی ہنستے بولتے آپا کو طوفانی غصہ آ جاتا ہے جیسے پہاڑی علاقوں میں یک بیک بدلیاں اٹھتیں اور بجلیاں کڑکتی ہیں اور پھر

زور کی بارش ہو کر دفعتہً دھلا ہوا آسمان صاف نکھرا لگتا ہے بالکل اسی طرح سے ابھی ابھی غصے، چڑچڑاہٹ اور بیزاری کے بعد آپا کا سنہرا چہرہ پیار بھری مسکراہٹ سے چمکنے لگتا ہے اور ہم حیران نگاہوں سے بس تکتے رہ جاتے ہیں کہ آپا کا غصہ نقلی تھا یا ان کی یہ مسکراہٹ نقلی ہے۔ کبھی ہی وہ لاکھ غمگین اور افسردہ ہوں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈوبی ہوئی ہوں لیکن اسی وقت اگر کوئی ان سے ملنے کے لئے آجائے تو پھر ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح وہی خلوص بھری مسکراہٹ تیرتی نظر آئے گی اور ان کی آواز میں دلی رنج و غم کا ایک سایہ تک نظر نہ آئے گا۔ وہ ایک ہی وقت میں جی بھر کے رو بھی جاتی ہیں اور دل کھول کر ہنسنا بھی۔

خاندان، گھر یا باہر جیسی بھی مجلس ہو گی، آپا اس پر چھا کر رہ جائیں گی۔ ٹھیٹ سے ٹھیٹ دیہاتی ماحول سے لے کر شہر کی اعلیٰ ترین سوسائٹی تک میں آپا کی قدر، محبت اور عزت یکساں طور پر ہوتی ہے۔ ابھی ابھی آپا اگر ایک دیہاتی گنوار چھوکری سے بڑے خلوص کے ساتھ دلچسپ باتوں میں منہمک ہیں تو شام کو بہترین ڈرائنگ روم میں نفیس صوفے پر اسی دلچسپی کے ساتھ مزے دار باتوں میں لگی نظر آئیں گی۔ ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بعض دفعہ گھر میں تماشے نظر آتے ہیں۔ گیسٹ پر عمدہ سی کارنگی ہے اور ڈرائنگ روم میں سے بڑی ہی بے تکلف اور چہکتی ہوئی آوازیں آ رہی ہیں، پھر اچانک دوسرے کمرے میں سے آپا کی آواز آنے لگتی ہے۔ فرق بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ آواز کی رفتار اور لہجے میں وہ پہلی سی روانی نہیں رہتی، دوسرے کمرے میں کچھ مہمان خواتین چوکی کے فرش پر ریزرو طریقے سے بیٹھی ہوتی ہیں، چہرے پر سنجیدگی چھائی ہے، لبوں پر پان کے لاکھے جمے ہیں اور خاص عظیم آبادی لہجے میں سنبھل سنبھل کر باتیں کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی وقت کچھ لوگ دروازے پر آ کر تھوڑی سی باتیں کرنے کو مصر ہو جاتے ہیں اور پردے کے پیچھے سے آپا کی اخلاق میں ڈوبی دبی دبی سی آواز ان کی ہر طرح کی امداد کا یقین دلاتی ہے۔ ڈرائنگ روم اور دوسرے کمرے کی مہمان دوستوں کی تنہائی کا خیال کر کے جب آپا دروازے سے پلٹتی ہیں تو برآمدے کے پائے سے لگی ہوئی چند ضرورت مند عورتیں انہیں اپنی دکھیا کہانی سنانے لگتی ہیں اور آپا کبھی ہسپتال اور کبھی کسی دفتر کا خط لکھ کر ان کو دینے لگتی ہیں اور پھر رکشے کے کرایے کے ساتھ گھر میں اپنی موجودہ رشتہ داروں سے چندے کرا کرا کے دو چار روپے سے فوری طور پر مدد دینے لگتی ہیں اور اس درمیان میں اگر وقت ہوا تو ڈرائنگ روم کی مہمان بیچاریاں ریڈیو پر کھول کر اپنا دل بہلانے لگتی ہیں اور دوسرے کمرے کے اندر ریشمی ساری کا سیدھا آنچل اوڑھے سونے کے زیوروں میں ریزرو قسم کی مستورات حیران نگاہوں سے آپا کو ڈھونڈھ رہی ہوتی ہیں۔

آپا کی مشغولیت کی کوئی انتہا نہیں۔ ان کو لمبی ملاقات رکھنے کا جنون ہے اور اپنے مہمانوں کے ساتھ اخلاق برتنے کے ساتھ ان کو قسم قسم کی چیزیں کھلانے کی ان پر دھن سوار رہتی ہے۔ اکثر آپا کا گھر مہمانوں کی کثرت سے ایک چڑیا خانہ نظر آتا ہے۔ کئی لوگ کھانے کھائے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آپا اپنے گھر کو ربڑ کی طرح کھینچ کر نہ جانے کیسے بڑا کر لیتی ہیں اور سارے مہمان جن کی تعداد کبھی کبھی ۵۰ سے بھی اوپر ہو جاتی ہیں رات کو اپنے اپنے بستروں پر سوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آئے گئے لوگوں سے ان کا گھر خالی رہا ہو۔ اس گھر کی حالت بالکل ویٹنگ روم جیسی ہے۔ ایک بستر ابھی بند ہو رہا ہے کہ گیسٹ پر موٹر یا فٹن لگی اور رکشے بستر سے اور بس اندر آ گئے۔ پٹنہ بہار کا مرکز ہے سبھی کو یہاں کی ضرورت لگی رہتی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بڑے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ "ان کا خرچ ہی کیا ہے؟ نہ بال نہ بچہ دو میاں بیوی اور دو چار نوکر ہوتے۔" بہنوئی صاحب مستقل طور پر ان کے ساتھ رہ کر پڑھنے والے بچوں ہی کی تعداد آٹھ آٹھ ہے۔ اس پر سے اول اور پنج اردہ گیا، مظفر پور اور چھپرہ کے رشتہ داروں کا کھڑی کھڑی آنا۔ پھر بھی گھر اکیلا کا اکیلا ہی ہے۔ اسی مہمان داری کے ہاتھوں آپا بیچاری نے بھرے گھر میں بیراگ لے رکھا ہے اور ان کا بکس بالکل غریب کی کٹیا کی طرح ہمیشہ سے خالی کا خالی ہی رہا یہاں تک کہ چپل، جوتے، کپڑے اور لحاف تک کے پیسے اسی چکر میں چلے جاتے ہیں۔ آپا کو ریڈیو کے مضمون اور درسی کتابوں اور افسانوں کے جتنے بھی روپے ملتے ہیں وہ سب کے سب بڑے اطمینان سے بھینٹ کے بنے ہوئے انگلش چولہے کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس پر بھی آپا ۲۰ تاریخ کے بعد گھبرائی گھبرائی سی رہتی ہیں۔

تیمارداری آپا کی فطرت کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ جو بھی بیمار رہا آپا بمع اپنی نرسنگ کے اس کی خدمت کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ ہفتوں وہ

ہسپتال میں دو کرسیوں کو جوڑ کر سوتی رہی ہیں۔ میلوں پھیلے ہوئے ہسپتال کا کونا کونا ان کا جانا پہچانا ہوا ہے۔ ہسپتال کا سارا اسٹاف ان کو دور ہی سے آتا دیکھ کر سلام کرتا ہے اور اس سلام کے بوجھ تلے ان بیچاری کا پرس ہلکا ہوتا جاتا ہے۔

آپا کے دل میں بغیر کسی تعصب کے ساری انسانیت کے لئے بڑی گہری محبت اجاگر رہتی ہے وہ ان کے دکھوں پر تلملا جاتی ہیں۔ اسی لئے اپنی شادی کے چند مہینوں کے بعد آپا نے اپنے ہزاروں روپے کے زیور اور شادی کے قیمتی کپڑے نارسا بیچ کر خیرات کر دئے۔ غریبوں کے ہر کام میں آپا بڑے خلوص سے حصہ لیتی ہیں، انہی کی تحریک اور کوشش سے اردو کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے جہاں غریبوں کے چالیس بچے پڑھ رہے ہیں۔ صحیح معنوں میں آپا انسانیت کی خدمت کے لئے ایک ایمبولنس کار ہیں۔ کوئی دکھی ہوا، کوئی تڑپا، کسی کو تکلیف ہوئی اور ایمبولنس کار کی محبت بھری گود کھلی ہے۔ مگر آپا ایک ایسی ایمبولنس کار ہیں جس کی چھت خود ہی ٹپک رہی ہے، جس کے کمزور پہیوں میں پنکچر کی بیسیوں چپیاں لگی ہیں، جس کا پرزہ پرزہ جھول گیا ہے اور وہ گاڑی ابھی تک صرف اپنی ہمت اور اپنی غیر معمولی محبت اور انرجی پر ہی چل رہی ہے اور اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک کہ ختم ہوتے پٹرول کی ایک ایک بوند سوکھ نہ جائے گی ہم لوگوں میں سے کوئی کتنا ہی بیمار ہو آپا کی بے پایاں محبت بھری خدمت ہمارے دلوں میں سکون بھر دیتی ہے اور ہسپتال کا ماحول پھر ہمارے لئے اذیت ناک نہیں رہتا۔ جہاں وہ دوسروں کی تسکین کی موجب ہیں وہاں دو سال ہوئے جب آپا کے پیٹ کا بہت ہی بڑا اپریشن ہوا تھا تو چند ہی دنوں کے بعد اسی کوریڈور کے دوسرے کمرے میں ورمے کا اچھا خاصا ایک مریض اپنے سارے خاندان کے ساتھ آیا اور دس بجے رات کو اس کی سانس اکھڑ گئی اور دوسروں کے ڈر میں ڈھارس دینے والی آپا پیٹ میں بنڈیج لپیٹے کمزوری سے جھکی جھکی دیوار کا سہارا لئے چلتی ہوئی رونے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے بھاگ گئیں اور ساری رات انہوں نے نرس کی ڈیوٹی روم میں جاگ کر گزار دی۔

آپا کی طبیعت میں بے حد سادگی ہے بڑی سی بڑی مجلس میں جہاں عظیم آبادی کٹھے اور اونچے طبقے کی شوقینی اور فیشن عروج پر ہوتا ہے وہ اپنے صاف دھلے ہوئے کپڑوں میں شریک ہوتی ہیں۔ کسی کی امارت کبھی بھی انہیں مرعوب نہیں کر سکتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے سوا وہ کسی چیز کو بہت کم اہمیت دیتی ہیں۔

جس طرح انجمن ترقی اردو کی میٹنگوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے ویسے ہی مارکیٹنگ میں بھی۔ جہاں وہ شعبۂ نسواں کی ایک بہت ہی مخلص ممبر ہیں، چندہ جمع کرنا اور ریلیف کے مختلف کاموں کی ذمہ داری انہی پر ہوتی ہے وہاں خاندان کے لئے رشتے کی تلاش اور شادی کا انتظام بھی ان کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ آپا کے ہاتھوں کے پکے ہوئے باقر خانی اور مرغ مسلم سے لے کر چٹنی، اچار اور مربے تک بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ہزار سلائیاں گھر میں ہوں نٹنگ ماسٹر ابھی تک صرف آپا ہی ہیں۔ سوئٹر کے نمونے اور دوسری چیزوں کے ڈیزائن انہی کے ذریعے ہم لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ اب جن کاموں میں ہم تھک سے جاتے ہیں آپا بڑے سکون سے ان کاموں میں لگی رہتی ہیں یہاں تک کہ بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھی کبھی کھلونے کبھی خرگوش کتے، ہاتھی اور گڑیا بنا بنا کر انہیں دیتی رہتی ہیں۔

آپا کے دل میں محبت اور خدمت کا ایک اتھاہ سمندر چھپا ہوا ہے۔ مگر ان کی طبیعت میں بلا کی عجلت، چڑچڑاہٹ اور ضد کے ساتھ تنک مزاجی بھی۔ خاندان بھر میں ان کی جیسی بے لوث محبت اور اخلاص برتنے والی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن وہ بے حد جذباتی ہیں اور بات بات پر ان کے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ ساری مجلسوں میں جہاں لوگ ان کو مومنی سمجھتے ہیں اور ان کی ہنسنے ہنسانے والی پر لطف اور خلوص بھری باتوں ہی سے ان کی طرف کھنچتے چلے آتے ہیں وہاں قہقہے پر قہقہے لگانے والی آپا گھر کے اندر پل بھر میں غصے سے لال بھی اٹھتی ہیں۔ گھر کے سارے ملازمین اور بچوں کے لئے بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ ”آپا آ رہی ہیں“ مگر اتنے رعب اور داب کے بعد بھی سارے لوگ ان پر جان دیتے ہیں۔

ادب اور شاعری سے آپا کو بہت ہی بچپنے سے لگاؤ رہا ہے۔ اماں جان اور ابا جان دونوں کو ادب سے گہری دلچسپی رہی تھی اسی لئے آپا نے ہوش سنبھالتے ہی نیرنگِ خیال، ایشیا، ہمایوں، جہانگیر، عصمت اور تہذیب ہی کو دیکھا۔ جب وہ صرف دس سال کی تھیں تو اسی وقت انہوں نے پہلی بار شعر

لکھا تھا۔ بچپن ہی سے آپا کی نگاہوں میں بڑی گہرائی تھی، وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بہت زیادہ محسوس کیا کرتی تھیں۔ آپا کی تعلیم تو بہت ہی معمولی طور پر ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے شوق اور کوشش سے اپنے مطالعہ کو بہت وسیع کر لیا ہے اور اب وہ دنیا کے بہت سے موضوعات کو اپنا چکی ہیں۔ ایسے تو وقت بے وقت وہ دنیا بھر کی تواریخ اور جغرافیہ اور ایسے ہی بے کار و بار کار کتابیں پڑھتی ہی رہتی ہیں لیکن ان کو اسلامی ہسٹری پڑھتے رہنے کا ایک مینیا سی ہے اور جب پڑھتے پڑھتے ان کو کوئی اچھی چیز مل جاتی ہے تو پھر وہ سیدھی ہم لوگوں کے پاس چلی آتی ہیں اور پھر گھنٹوں انہی باتوں پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ آپا کو پڑھنے کی لت اس حد تک لگی ہوئی ہے کہ ناشتہ، کھانے کے وقت میں بھی کوئی کتاب ضرور ان کے ہاتھ میں رہے گی۔

آپا کا سب سے پہلا افسانہ "رحمت" ۱۹۳۶ء کے ادب لطیف میں چھپا تھا اور اس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اسی کے بعد سے آپا نے اپنی شاعری ختم کر کے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔

اب تک ان کے جتنے بھی افسانے چھپے ہیں وہ سارے کردار ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔ ایک آدھ افسانہ جو انہوں نے پلاٹ سوچ کر لکھا بھی ہے تو اس طرح کہ نہ تو قلم ہی چلتا ہے اور نہ کہانی ختم ہی ہوتی ہے۔ "دریں"، "آنکھ مچولی" اور "ڈائن" ان کے تین مجموعے اب تک نکل چکے ہیں اور ان افسانوں کے کیریکٹر جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آپا کے دو افسانے "مظلوم" اور "موسیٰ" میں اتنی زندہ تصویر کھینچی گئی ہے کہ ان افسانوں کے چھپنے کے بعد "مظلوم" والی بڑھیا پٹنہ کے جن جن نئے گھروں میں جاتی گئی لوگ دور ہی سے اس کو دیکھ کر پہچان گئے کہ یہی "مظلوم" والی بڑھیا ہے اور اسی طرح سے ہسپتال میں کیبن کی جمعدارن (موسیٰ) کا ایک ایک نشان افسانے میں اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو پڑھنے والے بے اختیار موسیٰ کو یاد کرنے لگے اور آج مرنے کے بعد بھی موسیٰ ہمیں زندہ نظر آتی ہے۔

آپا کی افسانہ نگاری کی عجیب عجیب خصوصیتیں ہیں۔ ٹھیک بہن عصمت چغتائی کی طرح کبھی مسہری یا پلنگ پر پیٹ لیٹی ہوئی وہ تکیہ کے سہارے لکھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک افسانہ ختم ہوا دوسرا شروع ہوا تیسرے کی باری آئی۔ شور ہو رہا ہے، شادی کے ہنگامے ہیں، نوکرانیاں جھگڑ رہی ہیں — بچے دھما چوکڑی مچا رہے ہیں، بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہیں مگر آپا ہر چیز سے بے خبر اسی انداز میں جھکی ہوئی لکھتی چلی جا رہی ہیں۔ گھر سونا سونا لگ رہا ہے، ہم لوگوں کی سلائی ادھوری پڑی ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ دس دن اس جنونی کیفیت میں جب گزر جاتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپا نے ایک ساتھ چار افسانے لکھ ڈالے ہیں اور جیسے ہی انہوں نے اپنا قلم رکھا ہمارا یہ کام شروع ہو جاتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے افسانے سنتے چلے جائیں۔ افسانوں کو سنا کر اور ان کی پسندیدگی کے بعد آپا اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر ان افسانوں کو اپنے فائل میں بند کر دیتی ہیں اور پھر مہینوں وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ انہوں نے کبھی افسانہ بھی لکھا تھا — جب مہمان داری، شادی، مارکیٹنگ، خدمت خلق اور شعبۂ نسواں سے فرصت ملتی ہے تو کبھی کبھار ایک آدھ افسانہ صاف کر کے کہیں بھیج دیا۔ آپا نے ایک بہت ہی یادگار چیز لکھنی شروع کی تھی "مرج اور ساحل" ان کی یہ ناول بہار پر بیتی ہوئی ۱۹۴۶ء کی کہانی تھی۔ بہت سے حصے لکھے جا چکے ہیں۔ اس کا ایک حصہ نیا دور کے فسادات نمبر میں "ایک دن" کے نام سے نکل بھی چکا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ یادگار چیز اب کبھی شائع نہیں ہو سکتی ہیں۔ ان دنوں وہ ایک ناولٹ لکھ رہی ہیں جن کے دو حصے ماہ نو میں چھپ چکے ہیں۔ پہلا حصہ "بجھتے ہوئے چراغ" اور آخری حصہ "آگ اور پتھر" کے نام سے۔

آپا کو فطرت نے بڑا ہی نرم دل اور درد رس نگاہیں بخشی ہیں جس موڑ پر سے ہم لوگ آسانی سے گزر جاتے ہیں آپا ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں اور ان کی نگاہوں میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر روز مرہ کے اتنے سارے فضول کام آپا کے سپرد نہ ہوتے تو آج وہ افسانوی دنیا میں بہت آگے گئی ہوتیں۔

"آنکھ مچولی" اور "اُدھر پار" ... آپا کے اپنے افسانے ہیں اور "ڈائن" بھی انہوں نے ... کہانی لکھی ہے۔ آپا ... سے انیمیا کی مریض ہیں ... [illegible] ... ڈاکٹروں نے ان کو مکمل طور پر ریسٹ کرنے کی تاکید کی ہے مگر باغ کی دیکھ بھال، ترکاریوں کے لان اور ... پھولوں کی دیکھ ریکھ ... اسی لیے آپا ... [illegible] ... اسی پرانی ڈگر پر چلتی چلی جا رہی ہیں۔

(۴)

نوا ہا زندہ شد در شاخساراں

مولانا محمد علی

ضیاء الدین احمد برنی

محمد علی دو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے ان کی تعلیم و تربیت کا بار ماں کے ضعیف کندھوں پر آن پڑا۔ انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ علی برادران ان صفات سے متصف ہوئے جن کی وجہ سے وہ سارے بر عظیم ہند پر چھا گئے۔ محمد علی نے نہ صرف بین الاسلامی بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

محمد علی پہلے بریلی کے اسکول میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ وہاں سے انگلستان گئے اور آکسفورڈ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آئی سی ایس کے امتحان میں وہ گھوڑے کی سواری میں فیل ہو گئے اور ملک و ملت کے لئے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ زیادہ سے زیادہ کلکٹر بنتے اور سینکڑوں ہزاروں کلکٹروں کی طرح گمنامی کی حالت میں مر جاتے۔

ولایت سے آنے کے بعد وہ کچھ مدت تک رام پور کے محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ وہاں سے بڑودہ چلے گئے اور پھر نوساری میں کمشنر مقرر ہو گئے۔ بڑودہ میں تقریباً چھ سات سال تک ملازمت کی۔ مضامین نگاری کا شوق پہلے سے ہوا۔ ”ٹائمز آف انڈیا“ بمبئی کے ایڈیٹر سر لووٹ فریزر ان کے دوست تھے۔ ان کی درخواست پر انہوں نے ملک کی سیاسی حالت پر چند مضامین لکھے جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے۔

بعض باتوں کی وجہ سے وہ بڑودہ کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور اس لئے انہوں نے دو سال کی چھٹی لے لی اور کلکتہ چلے گئے۔ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر ان کے دوست تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ محمد علی خالی ہیں تو انہوں نے جاورہ کی وزارتِ عظمیٰ پیش کی۔ اسی طرح ایک دو اور ریاستوں نے بھی انہیں اپنانے کی کوشش کی مگر محمد علی نے ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا اور کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار ”کامریڈ“ نکالنے کے انتظامات میں لگ گئے۔ کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو نکلا۔ محمد علی کی پبلک لائف صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے ۲۰ سال تک ان کی ہنگامہ پرور شخصیت دنیا کے سامنے رہی اور بالآخر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں جہاں وہ برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبۂ آزادی پیش کرنے کے لئے گئے تھے، انتقال کر گئے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں۔ سو یہ دعا قبول ہوئی اور انہوں نے ایک آزاد ملک میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

محمد علی طالب علمی کے زمانہ ہی سے اپنی غیر معمولی ذہانت کے لئے مشہور تھے۔ بریلی میں بھی، علی گڑھ میں بھی اور آکسفورڈ میں بھی۔ ان کے حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ متعدد شعراء کی غزلیں کی غزلیں زبانی سنا دیتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے بیسیوں حصے انہیں ازبر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ یار لوگ بیٹھ جاتے تھے اور ان سے مختلف شعراء کا کلام سنتے تھے۔ "فسانۂ آزاد" کی بیسیوں طول طویل عبارتیں بھی انہیں یاد تھیں۔

ابتدا ہی سے وہ بہت محنتی تھے۔ حالانکہ ذہین طلبا بالعموم محنت سے جی چرایا کرتے ہیں۔ یہی حالت آخر وقت تک رہی۔ میرے خیال میں انہوں نے کم و بیش کئی ہزار کتابیں پڑھی ہوں گی۔ وہ حکومت اور کانگرس کی شائع کردہ رپورٹوں کا بھی گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ راتوں کو دیر تک جاگنے کے عادی تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے لندن ٹائمز کے اشتعال انگیز مضمون "ترکوں کی پسند" کا جو دندان شکن جواب دیا تھا وہ ایک ہی نشست میں جو ۳۶ گھنٹوں پر مشتمل تھی، لکھا گیا تھا۔ اس اثنا میں انہوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا تھا۔ صرف چائے، بسکٹ اور کافی پی پی کر وقت گزاری کرتے رہے۔ مجھے وہ سماں اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے لکھ رہے ہیں، بیسیوں کتابیں ادھر ادھر پڑی ہیں، کبھی اس سے اقتباس لیتے ہیں اور کبھی اس سے۔ یہ مضمون نہ صرف انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے بلکہ معلومات اور دلائل کے اعتبار سے بھی وہ اس قدر پُرزور ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران میں باوجود علالت کے وہ مطالعہ کرتے رہے۔ بیمار ہیں مگر ملک و ملت کے مسائل پر غور کر رہے ہیں، اسکیمیں تیار کر رہے ہیں، انٹرویو دے رہے ہیں، تقریریں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان کا حافظہ اس قدر قوی نہ ہوتا تو یقیناً ان کی تقریریں اور مضمون اتنے جامع نہ ہوتے۔ یہ سب ذہانت اور محنت کے کرشمے ہیں۔

علی برادران کی باہمی محبت :

محمد علی کو اپنے بڑے بھائی (شوکت علی) سے غیر معمولی محبت تھی۔ آج کل کے لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ شوکت علی ان سے بہت کام لیا کرتے تھے۔ محمد علی جز بز ہوتے تھے مگر انہیں احساس تھا کہ وہ چھوٹے بھائی ہیں اور اس لئے انہیں بڑے بھائی کا کہنا (بلا چون و چرا) مان لینا چاہیئے۔ ایک مرتبہ انہیں "سگ باش برادرِ خورد مباش۔ خر باش برادرِ بزرگ مباش"، کی مثل بتائی گئی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا "میں سگ بننا پسند کروں گا، لیکن یہ کبھی پسند نہ کروں گا کہ میرے بھائی خر کہلائیں"۔ علی گڑھ میں دونوں بھائیوں کے برادرانہ تعلقات کے چرچے رہا کرتے تھے۔ شوکت علی انہیں چھیڑنے یا غصہ دلانے کی غرض سے یا کبھی کبھار دوسروں کے سامنے اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کے لئے ان سے سب کے روبرو جھڑک جھڑک کر کام لیا کرتے تھے، مگر وہ اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبے کے ساتھ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

۲۳-۱۹۲۲ء میں جب دونوں بھائی بیجاپور جیل میں محبوس تھے، اس زمانہ کا ذکر ہے کہ شوکت علی کی بعض "حرکتوں" کی وجہ سے حکومت نے ان سے یہ رعایت چھین لی تھی کہ وہ بی اماں سے مل سکیں۔ اس وقت محمد علی نے نہایت ایثار سے کام لے کر اپنے ایک خط میں (جو جیل سے لکھا گیا تھا اور میرے پاس سنسر شپ کے لئے آیا تھا) بی اماں کو یوں لکھا:

> "...... میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں ہے یا آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ تاہم مجھے یہ قبول ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مگر یہ ہرگز قبول نہیں کہ میں تو آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت دنیا کے برادران کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں نہ صرف ماں کے احترام کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے بلکہ بڑے بھائی کی عزت کو بھی جس خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

انگریزوں سے دشمنی : ۔ اسے آکسفورڈ کا اثر سمجھئے یا کسی اور سبب پر محمول کیجئے مگر یہ حقیقت ہے کہ محمد علی شروع شروع میں یعنی "کامریڈ"

کی ابتدائی زندگی میں انگریزوں کے بالکل مخالف نہ تھے۔ ان کے بہت سے دوست جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے، ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان سب سے ان کے تعلقات دوستانہ اور صمیمانہ رہے مگر نظر بندی کے زمانہ میں ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور انہیں انگریزوں سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو گئی اور انہوں نے طے کر لیا کہ اب انگریزوں کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔ میرے خیال میں وہ سب سے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے کانفرنس میں بیٹھ کر انگریزوں سے للکار کر کہا کہ یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہندوستان پر سے برطانوی تسلط نابود ہو کر رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا مگر یہ پیشکش اس سے مختلف تھی جو "نوکا مربیٹہ" کے اجرا کے وقت کی گئی تھی۔

انگریز اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ انہوں نے ملکی و ملی جنگیں لڑنا شروع کر دی تھیں۔ سر جیمز میسٹن جو یو۔ پی کے لفٹیننٹ گورنر تھے، محمد علی کے خصوصی دوستوں میں تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے مشورہ کے برخلاف وہ کانپور کی مسجد کے قضیہ میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں تو وہ ان کے خلاف ہو گئے۔ یہ مخالفت اور زیادہ زوروں پر ہو گئی جب محمد علی نے ریمزے میکڈانلڈ اور دوسرے انگریز دوستوں کی امداد سے لارڈ ہارڈنگ پر زور ڈلوا کر کانپور کی مسجد کا فیصلہ بڑی حد تک مسلمانوں کے حق میں کرا لیا۔ محمد علی کی نظر بندی (۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک) ایک بڑی حد تک میسٹن کی مخالفت کی رہین منت ہے۔

مقدمۂ کراچی میں وہ عدالت میں انگریز جج بی۔ سی کینیڈی کی آمد پر کھڑے تک نہیں ہوتے تھے۔ سرکاری وکیل راس آلسٹن نے جن سے محمد علی کی پرانی شناسائی تھی، آخر ایک دن پوچھ ہی لیا کہ "مسٹر محمد علی! میں دیکھتا ہوں کہ آپ جج کی آمد پر کھڑے بھی نہیں ہوتے، حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ میں خود بخود کھڑا ہو جاتا ہوں۔" محمد علی نے جواب دیا کہ "آپ کو تو اسی بات کی فیس ملتی ہے۔"

اس معاملہ میں شوکت علی بھی محمد علی کے ہم نوا تھے۔ بمبئی کے محلہ مدن پورہ میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "گلیڈ اسٹون نے ترکوں کو یورپ سے بوریا بستر سمیت نکال دینے کا حامی تھا لیکن ہم انہیں نکلتے وقت بوریا بستر نہیں رکھوا لیں گے۔ یہ مال ہمارا ہے۔" ایک اور موقع پر انہوں نے انگریزوں کے خلاف تشدد برتنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "میں جب کبھی انہیں قتل کرنے کا خیال کرتا ہوں تو بیک آرنلڈ اور بہبوڈ دو مارسین کی نیلی نیلی آنکھیں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور میری تلوار کند ہو جاتی ہے۔" (یہ صرف مفہوم ہے، اصل الفاظ اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں)

گول میز کانفرنس:

انگریز دشمنی کے باوجود محمد علی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کی شرکت ان کی حب الوطنی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ وہ اس وقت سخت بیمار تھے اور جہاز میں اسٹریچر پر لٹا کر لیجائے گئے تھے۔ روانگی سے پیشتر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو ان کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ لیکن ایک بیان میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حکومت نے صلح و آشتی کا جو دروازہ کھولا ہے میں اسے بند کرنا نہیں چاہتا۔ اس موقع پر کئی ایک اخبارات نے لکھا تھا کہ جب اس کانفرنس میں کانگرس شرکت نہیں کر رہی ہے تو محمد علی کو بھی شریک نہیں ہونا چاہئے۔ اردو اخبارات میں مخالفت میں نظمیں بھی لکھی گئی تھیں۔ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں۔ غلام احمد خاں آرزو (مدیر ہندوستان، بمبئی) نے بھی ایک "سنجیدہ" نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:

اللہ کا سپاہی اور گول میز پنچایت

تیرا تھا قولِ فیصل "آزادیٔ مکمل" ‏ ‏ ‏ ہندوستان بھر میں جس سے مچی تھی ہلچل
گمراہ ہو گیا خود ہم کو دکھا کے مشعل ‏ ‏ ‏ وہ ولولہ وہ جذبہ سب ہو گیا معطل

اب دستِ جلیج اس کی جانب بڑھا ہوا ہے — جو ہاتھ مسلموں کے خوں میں رنگا ہوا ہے
اغیار کی مدد پر کیسا تُلا ہوا ہے — لیکن نہ جانے تیری غیرت کو کیا ہوا ہے

آزادیٔ وطن کیا یوں بے خطر ملے گی؟ — قربانیاں دیئے بن فتح و ظفر ملے گی؟
لندن کے ہوٹلوں میں کھا کر نہ ملے گی؟ — جیلوں ہی میں ملے گی وہ چیز اگر ملے گی

محل (بندرگاہ) پر اور تقریباً سارے راستہ کالی جھنڈیاں لہرائی گئی تھیں۔ محمد علی اسٹریچر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور گول میز والی تقریر میں انہوں نے اس واقعہ کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

مگر محمد علی ان چیزوں سے مطلق متاثر نہیں ہوئے۔ وہ جس چیز کا ارادہ کر چکے تھے وہ اٹل تھی

جب محمد علی کانگرس سے علیحدہ ہوئے اس وقت وہ سارے ہندو پریس کے غصہ کا نشانہ بن گئے تھے۔ لیکن مرنے سے چند ہفتے قبل سینٹ جیمز پیلس میں جب انہوں نے معرکۃ الآرا تقریر کی تو اس مخالفت کے سارے تار و پود بکھر گئے۔ بمبئی کے سب سے ممتاز قوم پرست اخبار "بمبئی کرانیکل" نے ان کی وفات پر جو خراجِ تحسین پیش کیا اس کا آخری حصہ ملاحظہ کیجئے:

"مولانا محمد علی کی آخری تقریر سے اس توانائی بخش قومیت کی اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے جو زندگی بھر ان کا نمایاں جوہر رہا۔ . . . اگرچہ وہ کانگرس سے الگ ہو گئے تھے لیکن انہوں نے گول میز کانفرنس میں اپنی گرجدار آواز میں کہا "ہندوستان اب برطانوی تسلط کو برداشت نہیں کرے گا" . . . اس جملہ سے کسی ایماندار کانگرسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات سے دنیا ایک دلچسپ اور ہنگامہ پرور شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔"

محمد علی کی بے باکی:-

محمد علی ہمیشہ سے بے باک تھے۔ انہوں نے کبھی نتائج و عواقب کی پروا نہیں کی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے برملا کہتے تھے۔ گول میز کانفرنس میں انہوں نے جو کھری کھری باتیں کہیں وہ ہندوستان کے کسی اور لیڈر نے نہیں کہیں۔ اسی طرح پہلی اسلامی موتمر میں جو حجاز میں منعقد ہوئی تھی انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں سلطان ابن سعود (مرحوم) کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا تھا:

"تو اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ (الملک الحجاز) کہتا ہے اور کہلواتا ہے جہاں رسولِ مقبولؐ نے اپنی زندگی بسر کی تھی حالانکہ تیرے پیشرو ترکوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خادم الحرمین کہا اور کہلوایا۔ تو بھی ان کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہہ اور ملوکیت پر جو حضرت معاویہؓ کی سنت ہے ہرگز ہرگز نہ چل۔"

یہ باتیں ایک سرپھرا ہی کہہ سکتا ہے اور محمد علی اپنے زمانے کا سب سے بڑا سرپھرا تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو گی؟

شانِ مذہبیت:-

محمد علی کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ بالفاظ دیگر ان کا ہر کام اور ان کی دوستی اللہ کے لئے تھا۔ نظر بندی کے زمانہ میں جب سپرنٹنڈنٹ پولیس عبدالمجید سی۔ آئی۔ ڈی نے انسپکٹر جنرل سر چارلس کلیولینڈ کے ایما پر چھندواڑہ پہنچے تا کہ رہا کرنے سے پیشتر علی برادران سے ایک عہدنامہ پر دستخط کرالیں جس میں یہ وعدہ درج ہو کہ وہ غیر آئینی طریقوں اور تشدد سے ہمیشہ محترز رہیں گے تو محمد علی نے اس عبارت میں یہ اضافہ کیا کہ سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں گے تو اس صورت میں میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا۔ حکومت وقت نے اسے قبول نہیں کیا اور اس لئے دونوں بھائیوں کو مزید دو سال تک قید و بند میں رہنا پڑا۔

مقدمہ کراچی میں بھی جو طویل بیان انہوں نے دیا تھا اس کے دوران میں راڈویل کا ترجمۂ قرآن ہاتھ میں لے کر فرمایا تھا :

"قرآن مجید کے اس ترجمہ کی طرف دیکھئے اس میں بہت سی باتوں کی بار بار تکرار موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے . . . . ہمارے مذہب کے تمام احکام اور جملہ قوانین کا واحد، اہم اور مرجان بخش منبع یہی کتاب ہے . . . . . آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرے مذہب کا حقیقی سرچشمہ کہاں واقع ہے۔ ہمارے مذہب کا ایک اور منبع بھی ہے جسے احادیث کہتے ہیں لیکن حقیقی اور اصل سرچشمہ یہی کتاب ہے اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جسے کسی آیت کے بارے میں کوئی اختلاف ہو۔ میرے مذہب کی یہی سب سے یقینی اور سب سے محفوظ بنیاد ہے اور اس کے بارے میں دو رائیوں کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ جہاں کہیں اور جب کبھی دنیوی اور مذہبی احکام کا ٹکراؤ ہو گا۔ میں ہمیشہ مذہبی احکام کو مانوں گا اور دنیوی احکام کو مذہبی احکام کے تابع سمجھوں گا۔

محمد علی کے لطیفے :۔

ان باتوں کے باوجود ان میں خشکی نام کو نہ تھی۔ ان کی بے شمار خوش گپیاں اور بذلہ سنجیاں ثبوت ہیں اس بات کا کہ وہ قدرت کی طرف سے کیسا دل لائے تھے۔ وہ درحقیقت اپنے دور کے دوسرے غالب تھے۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں:

ایک مرتبہ حکیم محمد اجمل خاں کے مکان پر محمد علی کسی مشاورتی جلسہ میں شریک تھے۔ حکیم صاحب کسی ضرورت سے زنان خانہ میں گئے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آموں کی سینی لایا جس میں ایک خط بھی رکھا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ خط کو تو پڑھ لیا جائے۔ محمد علی نے کہا کہ پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ پرچۂ ترکیب استعمال ہے۔ حکیم صاحب کا مکان اور پرچۂ ترکیب استعمال کس قدر برمحل ہے۔

ظفر الملک (ایڈیٹر "الناظر" مرحوم) ایک مرتبہ ردی کا سبز لبادہ پہنے ہوئے مسلم لیگ کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ ان کا کنٹوپ بھی اسی رنگ کا تھا محمد علی نے دیکھتے ہی پھبتی کسی "یہ ہریل کہاں سے آگیا؟" اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔

حکومت ہند میں ایک زمانہ میں سر ڈینس برے ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار "کامریڈ" میں محمد علی نے لکھا :

"کون کہتا ہے کہ اسمبلی میں گدھے نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے۔ کیا تم نے اسے (BRAY) یعنی رینگتے ہوئے نہیں سُنا؟" یہ مذاق "لندن ٹائمز" میں بھی نقل ہوا تھا۔

جن دنوں اینگلو انڈین اخبارات دربار دہلی میں مہاراجہ بڑودہ کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کر رہے تھے اس زمانہ میں بڑودہ کا ریذیڈنٹ ایک آئی۔ سی ایس تھا جس کا نام کوب تھا۔ اس نے مہاراجہ کے خلاف زہر چکانی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہاراجہ کو بادشاہ کی شان میں "بے ادبی" کرنے کی سخت سے سخت سزا ملے۔ اینگلو انڈین اخبارات اور ریذیڈنٹ کی مہم کے جواب میں محمد علی نے اپنے سابق آقا کی حمایت میں "کامریڈ" میں COB AND HIS COBWEBS کے عنوان سے کئی ایک مضامین لکھے جن میں کاب کی سازشوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ COBWEB مکڑی کے جالے (تارِ عنکبوت) کو کہتے ہیں۔ اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ کوب کے دلائل تارِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ محمد علی الگ چھٹی پر ہی تھے لیکن سلسلۂ مضامین شروع کرنے سے پیشتر انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ وہ مہاراجہ کے ملازم ہیں۔

محمد علی سیاسیات میں "نوچینجر" تھے یعنی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی نمائندے اسمبلیوں میں جائیں اور تضیع اوقات کریں۔ برخلاف اس کے ایک طبقہ ایسا تھا جو اسمبلیوں میں رہ کر تخریبی کام جاری رکھنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ محمد علی اسمبلی کا تماشا دیکھنے کے لئے پریس گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ پنڈت شام لال نہرو نے انہیں دیکھتے ہی کہا: "مسٹر محمد علی! جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو پھر نیچے آجائیے۔" محمد علی نے

برجستہ جواب دیا " میں اپنی اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھنے کے لئے آیا ہوں ـــــ " ممبرانِ اسمبلی کھسیانے ہو کر رہ گئے۔ محمد علی کے اصل الفاظ یہ تھے "
I HAVE COME HERE TO LOOK DOWN.

"ہمدرد" کے آخری دور میں محمد علی کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ عبد السمیع خان جو بلند شہر کے رہنے والے ہیں اور آج کل کراچی میں قیام پذیر ہیں، اس سلسلہ میں ان سے ملنے کے لئے گئے۔ محمد علی نے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو؟ سمیع صاحب نے کہا کہ سی۔ پی (صوبجات متوسط) کا رہنے والا ہوں۔ محمد علی نے حیرت سے پوچھا کہ کیا سی۔ پی میں بھی آرٹسٹ ہوتے ہیں؟ سمیع صاحب نے برجستہ کہا " آرٹسٹوں کو چھوڑئیے سی۔ پی میں موتی پیدا ہوتے ہیں "۔ محمد علی پھڑک گئے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں فوراً رکھ لیا۔ محمد علی عمر بھر اس لطیفہ کو نہیں بھولے۔ وہ جب کبھی " ہمدرد " سے ان کا تعارف کراتے تو کہتے کہ یہ سی۔ پی کے موتی ہیں۔

محمد علی اسمبلی جاتے وقت کبھی کبھی سمیع صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے تھے تاکہ وہ مختلف ممبروں کی نشست و برخاست کے انداز کو دیکھ کر اسکیچ بنائیں۔ یہ اسکیچ اخبار میں چھپتے تھے۔ ان اسکیچوں کی سرخیاں محمد علی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے جو بہت برمحل اور معنی خیز ہوا کرتی تھیں۔ کبیر الدین احمد ان دنوں بنگالی مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ ان کے اسکیچ کے نیچے محمد علی نے لکھا: " THE WIT AND WISDOM OF BENGAL " یعنی بنگال کی نکتہ سنجی اور دانشمندی۔ ان صاحب کی تقریریں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور دوران تقریر میں وہ اپنے مزاح سے ممبروں کو ہنسایا کرتے تھے۔ ـــــ سر فریڈرک وائٹ کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے نام کی رعایت سے لکھا " WHITE MEN'S BURDEN. " اس لئے کہ انگریز یعنی اہلِ سابق حکمران کہا کرتے تھے کہ خدائے برتر نے ہندوستان کی حکومت کا بار ہمارے کندھوں پر رکھا ہے اور وہ موقع بے موقع اس دلیل کو اپنی حکومت کے قیام کے جواز میں پیش کرتے تھے۔ انگریز (WHITEMEN) اس حکومت کو خدائی امانت سے بھی تعبیر کرنے کے عادی تھے۔ محمد علی جناح کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے لکھا ـــــ " THE BOMBAY DUCK RESTING. " اس میں جناح کے لباس کی طرف اشارہ ہے جو جناح اس بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط رہا کرتے تھے۔ ڈک بطخ کو کہتے ہیں جو سفید براق پروں کا پرندہ ہے۔ جناح کے لباس کی طرح ان کے لباس پر بھی شکن اور داغ تک نہ ہوتی تھی۔ اس ریمارک کی موزونیت کس قدر برمحل ہے۔

محمد علی کی مخالفتیں :۔

دار السلطنت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ محمد علی بھی کلکتہ سے دہلی آ گئے۔ کلکتہ سے " کامریڈ " کا آخری پرچہ ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا اور دہلی سے اسی اخبار کا پہلا پرچہ تقریباً ایک مہینے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا۔ محمد علی کے آتے ہی دہلی کے کرسی نشین لیڈروں نے محسوس کر دیا کہ ایک نیا نجم دار الآثارہ افقِ دہلی پر طلوع ہوا ہے اور یہ کہ اب ان سب کی لیڈری ماند پڑ جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے خان بہادروں اور رائے بہادروں نے لیڈری پر قبضہ کر رکھا تھا مگر ان کے آتے ہی یہ بت گر کر پاش پاش ہو گئے۔ انہوں نے چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے خوب ہی کان بھرے کہ اس شخص کو یہاں سے خارج البلد کر دینا چاہئے مگر ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ محمد علی نے آتے ہی دو معرکے سر کئے۔ ایک تو انہوں نے قصابوں کی زبردست ہڑتال کو حسنِ خوبی سے نمٹایا، دوسرے انہوں نے جامع مسجد والوں سے ٹکر لی اور زبردست اور مسلسل جہاد کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ نمازیوں کی آسائش کی خاطر مسجد میں فانوس اور شامیانے لگائیں۔ محمد علی کا مطالبہ عوام کا مطالبہ تھا اور اس لئے جامع مسجد کمیٹی کے ممبروں کا دل پسیجا اور انہوں نے مطالبہ کے سامنے ہزیمت خوردگی کے جذبہ کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیا۔ محمد علی نے ایک جدت یہ کی کہ آتے ہی جامع مسجد کو اپنی تقریروں کا پلیٹ فارم بنا لیا۔ ان کی آمد سے پہلے یہاں صرف مذہبی تقریریں کی جاتی تھیں۔ غدر میں مسجد کی واگزاری کے وقت منجملہ دیگر شرائط کے یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اس میں سیاسی تقریریں ہرگز نہ کی جائیں گی مگر محمد علی نے اس شرط کی مطلق پروا نہ کی اور برابر تقریریں کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ان کے مخالفین کو ایک اور موقع مل گیا کہ وہ حکام کو آمادہ کریں کہ وہ محمد علی کو جامع مسجد میں سیاسی مجمع کرنے سے روکیں۔ مگر اس دفعہ بھی حکام کچھ نہ کر سکے۔ محمد علی کی دہلی میں

مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس دن وہ جمعہ کی نماز کے بعد نظر بندی کے حکم کے ماتحت دہلی سے مہرولی چلے ہیں، لاکھوں آدمیوں کا جمِ غفیر جامع مسجد اور اس کے باہر انہیں الوداع کہنے کے لئے جمع ہو گیا تھا اور دونوں بھائی لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ سب کی آنکھیں اشکبار اور دل ان کی رہائی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

بعد کو بہت سے ایسے مسائل آئے جن کی وجہ سے ہندوستان کے لیڈر گروہوں میں بٹ گئے، مثلاً جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان، ہندو مسلم مناقشات، مسئلہ خلافت، نہرو رپورٹ، مسئلہ نقل مکانی، سائمن کمیشن، شدھی، گول میز کانفرنس وغیرہ۔ نہرو رپورٹ کے معاملہ میں پنجاب کے لیڈروں نے محمد علی کا ساتھ نہیں دیا اور اپنی ٹولی علیحدہ بنا لی۔ اسی سلسلہ میں محمد علی پر نثر و نظم میں سب و شتم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تقریباً ان کی وفات تک برابر جاری رہا مگر ان کی آخری تقریر پڑھنے کے بعد ان کے بہت سے مخالف ان کے گرویدہ ہو گئے اور کانگریسی اخبارات کی مخالفت بھی ایک گونہ جاتی رہی۔ مرنے کے بعد تو وہ تقریباً سب فرقوں کے ہیرو بن گئے تھے۔

محمد علی کا ایک معرکہ خواجہ حسن نظامی سے ہوا۔ چونکہ اس مبحث پر علیحدہ مضمون میں تفصیلی بحث کی جا رہی ہے اس لئے یہاں میں صرف اشارۃً اس کا ذکر کروں گا۔ اس جنگ میں مختلف اخبارات نے محمد علی پر اس قدر گندگی اچھالی گئی کہ پناہ بخدا۔ مگر محمد علی نے مقابلۃً اپنے مضامین میں متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھا اور یہ اردو صحافت کا درخشاں پہلو ہے۔ دوسرا معرکہ ظفر علی خاں سے ہوا جو محمد علی کے خلاف نظم و نثر دونوں میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اگر محمد علی "ہمدرد" میں قتیل مرتد کے خلاف مضامین لکھتے تھے تو "زمیندار" میں قتیل مرتد کی تائید میں مضامین نکلنے شروع ہو جاتے تھے و نفس علیٰ ھذا۔ محمد علی کی انصاف پسندی دیکھئے کہ دورانِ مخالفت میں بھی انہوں نے مجھ سے دو ایک بار کہا کہ ظفر علی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بمبئی میں حافظ علی بہادر خاں ایڈیٹر "الہلال" نے بھی کچھ عرصہ تک علی برادران کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔

مضامینِ محمد علی میں ڈاکٹر اقبال کے خلاف چند مضامین ملتے ہیں۔ یہ اس لئے لکھے گئے تھے کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے صوبہ کی کونسل میں دورانِ تقریر میں کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ انہیں ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں ہے اور اس لئے پنجاب میں انگریز افسروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مقرر کیا جائے۔ محمد علی بگڑ گئے اور انہوں نے ان کی نظموں کے طویل اقتباسات پیش کر کے پوچھا کہ اقبال! تمہارے علم و عمل میں یہ تفاوت کیوں ہے؟ محمد علی کا اندازِ تحریر نہایت شستہ ہے اور پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کے باوجود وہ ڈاکٹر اقبال کے احترام کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ اقبال بھی محمد علی کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔ "اسیری" اور "وفات" پر اقبال نے جو لافانی نظمیں لکھی ہیں وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اقبال کو محمد علی کا کس قدر احترام منظور تھا۔

سر سید کے بعد غالباً محمد علی ایسے لیڈر تھے جنہیں سب سے زیادہ گالیاں دی گئیں مگر وہ ؏

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوئے

پُر آشوب دور:۔

یہ حقیقت ہے کہ محمد علی نے بڑا پُر آشوب دور پایا تھا۔ جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان اور پہلی جنگِ عظمیٰ ان کے زمانہ میں ہوئیں۔ اس سے قبل روسیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں ایران کا گلا گھونٹنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مصر انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ طرابلس پر دولِ عظمیٰ نے اٹلی کا غاصبانہ قبضہ تسلیم کر لیا تھا۔ الجزائر کی دیگر شمالی ریاستیں فرانس کے پنجۂ استبداد میں تھیں۔ الغرض ساری دنیا نے اسلام ایسی ہیجانی کیفیت میں تھی کہ اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ بلقان میں بلقانی ریاستیں ترکوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھیں۔ محمد علی کو ایک ایک کا فکر تھا اور انہوں نے چندہ کر کے طبی مشن روانہ کر کے، ترکوں کی حمایت میں وفد خلافت بھیج کر عالمِ اسلام کے مصائب کو ہلکا کرنے کی امکانی کوشش کی۔ ہندوستان کی

آزادی کی جدوجہد اس پر مستزاد تھی۔ ایک جان تھی جو دنیائے اسلام کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کئے ہوئے تھی۔ اگر یہ ساری چیزیں نہ ہوتیں تو قدرت خدا جانے محمد علی سے کیا کیا کام لیتی۔

ذاتی خصوصیات:۔

پہلی جنگِ بلقان میں جو دولِ عظمیٰ کی سازش کا نتیجہ تھی، ترکوں کی پے درپے ہزیمتوں نے محمد علی کے دل پر بہت چرکے لگائے تھے۔۔۔ دوسری جنگِ بلقان میں جو لوٹ مار کی تقسیم پر بلقانی اتحادیوں میں برپا ہوئی تھی جب غازی انور پاشا نے دولِ عظمیٰ کے احتجاج کے باوجود ایڈریانوپل پر بے مثال بلغار کرکے قبضہ کر لیا تو جتنی خوشی محمد علی کو ہوئی اتنی کسی اور کو نہ ہوئی ہوگی۔ ایڈریانوپل کے قبضہ کا تار رات کو آیا تھا اور وہ سارے مسلمانوں کو اس مسرت میں شریک کرنے کے لئے سیدھے جامع مسجد پہنچے اور دھواں دھار تقریر کی جس میں ترکوں کو اس کامیابی پر مبارکباد دی گئی تھی اور دولِ عظمیٰ کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ یہ خبر دوسرے دن اخباروں میں نکلتی تھی لیکن محمد علی نے انتظار نہیں کیا اور راتوں رات سارے شہر دہلی میں یہ دل خوش کن خبر پہنچا دی۔ وہ رات بھی کیا ہیجانی رات تھی۔

حبیب احمد نظامی پر گولی چلی ہے اور اتفاقاً ان کے خسر اس میں شہید ہو گئے تو پولیس نے تحقیقات میں بہت کچھ لیت ولعل سے کام لیا۔ بھیا احسان الحق جو محمد علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں کے دوست ہیں، سیدھے محمد علی کے پاس پہنچے اور انہیں صورتِ حالات سے واقف کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خواجہ صاحب اور محمد علی میں قلمی جنگ ہو رہی تھی۔ لیکن ذاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پر ایک گھنٹہ تک گفتگو کی اور انہیں معاملہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ اس قتل کی پوری پوری تحقیقات کی جائے اور مجرموں کو فرار واقعی سزا دی جائے۔ محمد علی کے کیریکٹر کی اس بلندی کا ذکر آج بھی بھیا احسان بڑے فخر سے کیا کرتے ہیں۔

محمد علی ذیابیطس کے مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ مرض کا کما حقہ علاج اس لئے نہیں ہو سکا کہ وہ پرلے درجہ کے بدپرہیز واقع ہوئے تھے۔ وہ آموں کے عاشق تھے لیکن کسی نوع آموں کو چھوڑنے پر رضامند نہ تھے۔ ایک دن خود بھی آم کھا رہے تھے اور دوسروں کو بھی کھلا رہے تھے کہ دوران گفتگو میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا "خواہ جان چلی جائے مگر میں آم کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا" بعد کو ڈاکٹروں کے زور دینے سے انہوں نے ایک آم یومیہ پر قناعت کر لی تھی لیکن وہ ایک آم سائز میں کئی آموں کے برابر ہوا کرتا تھا۔

لباس کے معاملہ میں اکبر سے لے (ابتدائی دور میں) وہ دوسرے محمد علی جناح تھے۔ آخر میں جب انہوں نے اپنی وضع قطع بدل لی اور ڈھیلا ڈھالا جبہ پہننا شروع کر دیا اس وقت بھی وہ اچھی قسم کا کھدر استعمال کرتے تھے۔ مدت تک محمد علی کوٹ پتلون میں ملبوس رہے۔ ان کے ابتدائی فوٹو آپ کو اسی سوٹ بوٹ میں ملیں گے۔ وہ انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ بھی زیب تن کرتے تھے۔ ٹوپی سفید رنگ کی بالوں دار استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی ٹوپی میلی ہو گئی۔ جبل پور کے ایک خلافتی کارکن تھے جن کا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ وہ اس وقت لمبے بالوں کی نئی نئی ٹوپی پہنے پاس ہی بیٹھے تھے۔ محمد علی نے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی اور ان کی ٹوپی خود پہن لی۔ خلافتی کارکن اس عزت افزائی پر بے حد خوش تھے مگر اردگرد کے لوگ ہنس دئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لباس بھی وہ زیب تن کرتے تھے وہ ان پر خوب سجتا تھا۔ ترکی ... میں وہ فوجی لباس میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ڈیل ڈول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں کے کمانڈر انچیف ہیں۔ یہ فوجی لباس بھی انہیں خوب زیب دیتا تھا۔

غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے کہ تار کا ہرکارہ ایک ضروری تار بہت تاخیر سے لایا اور جب اس سے پوچھا گیا تو خاطر خواہ جواب دینے کی بجائے اس نے ترانا شروع کر دیا۔ اس پر محمد علی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے خوب پیٹا اور پھر خود ہی تار گھر والوں کو ٹیلیفون پر اطلاع بھی کر دی۔ پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ تار بہت دیر پہلے بھیجا گیا تھا، اس نے بالقصد راستہ میں وقت ضائع کیا ہوگا۔ پھر اس نے تار کے دیر سے پہنچنے کی معذرت چاہی اور کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ اسے سزا دے دی۔

ایک دن محمد علی میرے سامنے "روزنامہ خلافت" کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر کو ڈانٹ رہے تھے کہ انہوں نے سوقیانہ اشتہار اپنے یہاں کیوں چھاپا۔ وہ آمدنی کی کمی کا عذر کرنے لگے اس وقت انہوں نے فرمایا "میں فاقے کرنا بہتر سمجھتا ہوں لیکن سوقیانہ اشتہاروں کو کبھی قبول نہ کروں گا۔" اس دن کے بعد سے کبھی کوئی مخرب اخلاق اشتہار "روزنامہ خلافت" کی زینت نہ بن سکا۔ "مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا" یا "اس کے پڑھنے سے بہنوں کا بھلا ہو گا" جیسے اشتہارات بھی محمد علی کی نظروں میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اپنی زندگی میں انہوں نے بہت سوں کو مختلف ریاستوں میں اچھے اچھے عہدوں پر ملازم کروا دیا۔ وہ بہت دوست نواز تھے۔ کئی رئیسوں سے ان کے تعلقات گہرے اور دوستانہ تھے۔

جب کبھی انہیں روپے کی ضرورت پڑتی تو وہ اپنے دوستوں ہی کو تکلیف دیتے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ محمود آباد سے بھی انہوں نے بہت سی رقمیں لیں۔ نواب حمید اللہ خان بھی ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ریاست بھوپال نے شبلی کی سیرۃ نبوی کے ترجمہ کے سلسلہ میں انہیں پانچ ہزار روپے دیے۔ ترجمہ کا کام ابتدائی منزل سے کبھی آگے نہیں بڑھا۔ اگر وہ مکمل ہو جاتا تو ایک اور عظیم الشان خدمت ان سے بن پڑ جاتی۔

"محمد علی ہر اعتبار سے دیو پیکر تھے۔ ان کے رفقاء اور ان کے ہمعصر ان کے سامنے پودنے لگتے تھے۔" یہ سچ ہے کہ وہ بے حد جذباتی آدمی تھے اور بعض اوقات انہیں اپنے اوپر قابو نہ رہتا تھا۔ جب وہ دہلی سے ڈیرہ دون بیجائے جا رہے تھے تو شاید الہ آباد کے اسٹیشن پر انہیں چند انگریز نظر آ گئے انہوں نے چلا کر کہا "نکال دو ان حرامزادوں کو۔"

وہ دوستوں کے جاں نثار دوست تھے اور یہ حقیقت ہے کہ انہیں جتنے مخلص دوست اور کارکن ملے وہ مشکل سے کسی اور کو ملے ہوں گے میر محفوظ علی، حکیم اجمل خاں، عبد الماجد دریابادی، چودھری خلیق الزمان، پروفیسر نواب علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان ندوی، سید حسین، راجہ غلام حسین، ولایت علی بمبوق، عبد الرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی وغیرہ ان میں سے ہیں جو محمد علی کے ہمیشہ فدائی رہے۔ ہندوؤں میں مسز نائیڈو ان کی عاشق زار تھیں، ہار نیمن اور پکتھال پر ان کی قابلیت نے جو سکہ جما دیا تھا وہ آخر وقت تک قائم رہا۔ جو دوست ان سے الگ ہوئے وہ سیاسیات کی بنا پر علیحدہ ہوئے نہ کہ کسی اور بنا پر۔ سید عبد اللہ بریلوی ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" بھی اختلافات کے باوجود ان کے زبردست دوست اور مداح رہے۔

محمد علی کے ایک دوست نے جب ان سے غداری کی اور گول میز کانفرنس میں انہوں نے "پڑوسی جاسوس" کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، تو دوستوں کے بیچ میں پڑ جانے سے محمد علی نے ان کا قصور دریا دلی سے معاف کر دیا مگر وہ اسے کبھی بھولے نہیں۔ کہا کرتے تھے کہ میں معاف کر سکتا ہوں مگر بھول نہیں سکتا۔ یہ عین بشریت ہے۔

ایک دفعہ محمد علی نے مولانا شبلی کی دعوت کی تقضیہ کا نپور ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ اس دعوت میں راقم الحروف کے علاوہ اور بہت سے دوست شریک تھے جس میں پشاور کالج کے پروفیسر محمد شفیع بھی تھے۔ دعوت کے اختتام پر مولانا شبلی نے واقعۂ کانپور پر اپنی رباعیات اور نظمیں سنائیں اور پھر ایک تقریر میں محمد علی کی خدمات کو سراہا اور انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ آپ جس کسی شخص کے نام میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھیں تو سمجھ جائیے کہ وہ لازمی طور پر زمانہ کا بہت بڑا آدمی ہے، اور اس سلسلہ میں تاریخ اسلام سے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سے نام پیش کیے۔ محمد علی سر جھکائے اپنی تعریف سنا کیے اور پھر یکایک بولے "رسوائے عالم محمد علی والیٔ ایران کا بھی تو ذکر کیجئے" مولانا شبلی نے زمعا فرمایا کہ "یہ کلیہ کی استثنا ہے۔" اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔

بہر حال محمد علی کی شخصیت "عجیب و غریب" تھی۔ وہ بیک وقت لیڈر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، مقرر، مؤرخ اور زبردست انشاپرداز تھے

ؔ۱ چند ہمعصر از مولوی عبد الحق (بہ تغیر الفاظ)

"کامریڈ" کے فائل موجود ہیں۔ انہیں پڑھیے اور ان کی تحریرات پر سر دُھنیے۔ انگریزی انشا پردازی کے میدان میں انہوں نے انگریزوں تک کو شکست دے دی ہے۔ ان کے اردو کے مضامین بھی بڑے روح پرور ہوتے تھے۔

بیجاپور سے رہائی کے بعد محمد علی کی جو کتابیں میرے پاس آخری بار منتقل ہونے کے لیے آئیں ان میں دیوان غالب کا ایک نسخہ بھی تھا۔ محمد علی کی عادت تھی کہ وہ پڑھتے وقت اچھے اچھے شعروں پر ایک، دو یا تین نشانات (×) لگا دیا کرتے تھے۔ جو نسخہ جیل میں ان کے زیر مطالعہ رہا وہ نظامی پریس کا مطبوعہ تھا۔ بعض بعض جگہ وہ ریمارک بھی لکھ دیتے تھے جو بہت پُرلطف اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ ایک دو مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

غالب کا ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو:

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے ۔۔۔ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر ۔۔۔ جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

نظامی پریس والے ایڈیشن میں اس قطعہ پر جو شرح درج ہے اس پر محمد علی نے ذیل کے دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی تھی۔ فرماتے ہیں:

"اس لطیفہ کے آخری حصہ کا ستیاناس کر دیا۔ حکم ہوا کہ اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے دور ہو جا ورنہ کچا چبا جائیں گے۔ سب سے زیادہ پُرلطف نہ دلا ہوا ہوتا ہے نہ پِسا ہوا، نہ بھُنا ہوا، نہ پکا ہوا بلکہ کچا بونٹ"

اسی طرح غالب کے اس غیر مطبوعہ شعر پر جو نظامی والے ایڈیشن میں درج ہے:

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

محمد علی نے ذیل کی عبارت تحریر فرمائی تھی:

"تیور تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔ مرزا ایسے ہرجائی نہ تھے کہ چند بتوں اور حسینوں کی یادگاریں ان کا ترکہ ہوتیں۔ مگر ممکن ہے کہ شعر مرزا ہی کا ہے۔ بہرحال کچھ اچھا شعر نہیں ہے۔"

افسوس ہے کہ غالب کا یہ ایڈیشن جامعہ ملیہ لائبریری میں محفوظ نہیں رہا۔

بہرحال امید نہیں کہ آئندہ محمد علی جیسا کوئی اور سرپھرا لیڈر ہند و پاکستان کی سرزمین سے اٹھے۔ خدا ان کی تربت پر اپنے انوار کی بارش نازل کرے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی

رشید الوحیدی

مولانا حسین احمد مدنی سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد مرحوم مولانا حبیب اللہ صاحب ایک اسکول میں مدرس تھے ابھی مولانا کی عمر بہت کم تھی کہ ان کے والد بزرگوار اپنے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد واپس آگئے مولانا مدنی نے چشم ہوش اسی قصبے میں کھولی یہاں ان کے والد بزرگوار مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اس طرح آپ کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم حسبِ دستور گھر ہی پر شروع ہوئی اس سلسلے میں کسی چھان بین کی ضرورت نہیں مولانا خود اپنی سوانح عمری "نقش حیات" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے والد مرحوم کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا ہر بچے کو چار برس کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیتے تھے اور ذرا سی کوتاہی پر بلا لحاظ عمر کافی مرمت کر دیتے تھے۔" اس طرح مولانا کو آزادی کے ساتھ کھیلنے کا صرف ۴ برس بچپن کا حصہ نصیب ہوا آگے تحریر فرماتے ہیں۔ جب میں ۴ برس کا ہوا تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور سیپارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ صبح ساڑھے ۹ بجے تک تو گھر میں مقید رہتا اس کے بعد کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول چلا جاتا۔ آپ کے والد مرحوم بچوں کی تربیت کے خیال سے بچوں کو زیادہ تر باہر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کو منع کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اگر کبھی موقع مل جاتا تو اپنے ایک ماموں زاد بھائی کے یہاں جو ان کے گھر کے قریب رہتے تھے چلے جاتے اور گھر میں چھپ کر گولی کھیلتے۔ اگر کہیں شامتِ اعمال سے اس کی اطلاع والد کو ہو جاتی تو خاصی مرمت ہو جاتی۔ اس طرح ماں باپ کے زیر تربیت اور سایۂ عاطفت میں آٹھ برس کی عمر تک وطن ہی میں قرآن شریف (ناظرہ) اور فارسی کی چند کتابیں مثلاً آمدنامہ۔ دستور الصبیان۔ گلستاں وغیرہ پڑھ لیں اور اسکول میں ساتویں درجے تک پڑھ لیا تھا اس زمانے کی تعلیم کا معیار نیز فنون کی کثرت کی وجہ سے اسی درجے میں اکثر اقسام ریاضی حساب اقلیدس تاریخ عمومی تاریخ خصوصی مساحت عملی تحریر۔ املا۔ خطِ شکستہ اردو کورس وغیرہ شامل تھے۔ نیز ان تمام فنون میں مولانا نے اپنی ذہین طبیعت اور والد مرحوم کی تربیت سے بہت اچھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مولانا ابھی تیرہ سال کے ہوئے تھے کہ ان کے (......) والد مرحوم نے جو کہ مذہبی اور دیندار آدمی تھے، مذہبی تعلیم کے لئے انہیں دار العلوم دیوبند بھیج دیا جہاں انہوں نے رات دن کی محنتِ شاقہ سے اساتذہ

کی توجہ اور شفقت کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ دیوبند میں عسرت اور تنگی کا تالیق کی سخت نگرانی سے ہمیشہ پریشان رہے تاہم اس کو ایک رحمت خداوندی سمجھا۔ حسبِ قاعدہ دیوبند کے اہل شہر طلباء دارالعلوم کی امداد کے خیال سے اپنے گھروں سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے جو کہ مردم شناسی کا جوہر رکھتے تھے۔ انہیں اپنے دامن میں پناہ دی اور ان کا کھانا اپنے گھر سے کر دیا تھا۔ مدرسے سے صبح و شام مولانا کھانا لینے شہر تشریف لے جاتے اس بے نیاز اور سچے طالب علم کی ضروریات بہت محدود تھیں صرف چند کتابیں دو چار جوڑے کپڑے اور مٹی کا پیالہ جس میں مولانا اپنا اور اپنے بڑے بھائی کا کھانا لاتے تھے ان کا ساز و سامان تھا۔ ایک مرتبہ کسی طرح آپ کا پیالہ کھانا لاتے وقت ٹوٹ گیا آپ وہیں کھڑے ہو کر رونے لگے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے والد محترم ادھر سے گزرے رونے کا سبب دریافت فرمایا تو آپ نے کہا کہ ایک ہی پیالہ تھا وہ ٹوٹ گیا اب کھانا کس چیز میں لاؤں اور اگر مدرسے واپس جاتا ہوں تو بھائی ماریں گے۔ انہوں نے تسلی دی اور دوسرا پیالہ خرید کر دیا تو یہ نازک مرحلہ طے پایا آپ کی محنت کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں ۶ دن شب و روز کتابوں میں گھسے رہتے اور ساتویں دن پورا دن رات سو کر گزارتے حتیٰ کہ کھانے تک کا ہوش نہ رہتا صرف پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لئے الارم اٹھا دیتا تھا کھانا بہت کم ہوتا تھا زیادہ تر نیند سے بچنے کے لئے نمکین سادی چائے استعمال فرماتے تھے آپ کے نزدیک کتاب۔ درس گاہ۔ استاد کا ادب و احترام اور ان کی خدمت سچے علم کے حصول کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ عبرت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ایک مرتبہ شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی اہل شہر کی پریشانی کا عالم قابل دید تھا سخت گرمی کا زمانہ اس پر پاخانے کی سڑاند اور بدبو کسی سزا سے کم نہ تھی۔ شیخ الہندؒ نے مولانا سے فرمایا جاؤ بھنگی کو بلا لاؤ کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی ہے ابھی شاید ان کو بھنگیوں کی اس تحریک کا علم نہ تھا۔ مولانا صورتِ حال سے واقف تھے مگر تعمیل حکم ضروری تھا گئے اور مایوس واپس آئے گھر آکر چپکے چپکے تمام گندگی صاف کر ڈالی حتیٰ کہ بالٹی بھر بھر کر نالی تک بالکل صاف کر دی۔ بہت دنوں تک شیخ الہندؒ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ ہو سکی ۱۳۱۶ھ میں مولانا کے والد محترم ہجرت کر کے مدینے تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر . . . . . . جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ مولانا کی کتاب نقشِ حیات میں بالتفصیل درج ہے بہرحال ذرائع آمدنی کا فقدان اور خرچ کی ضرورت سے مجبور ہو کر معمولی سی پرچون کی دوکان کھولی مگر اس کی آمدنی زیادہ تر مکان اور دوکان کے کرائے پر صرف ہوتی۔ آخر مجبور ہو کر اُجرت پر کتابت شروع کر دی ادھر استاد کے حکم کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا بھی از حد ضروری تھا۔ چنانچہ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا رات کو گھر کی ضرورت کے لئے مشک بھر کر پانی لاتے۔ دن بھر دوسری جگہ مصروفیات کے علاوہ درس دیتے تھے بعض وقت عسرت کا یہ عالم رہا ہے کہ آدھ پاؤ مونگ کی دال ایک ہانڈی بھر کر پانی میں نمک ڈال کر اُبال لیا اور تھوڑا تھوڑا سب نے مل کر پی لیا اللہ کا شکر ادا کر کے اپنے اپنے کار خیر میں مصروف ہو گئے۔ کبھی تربوز کے چھلکے گلا کر نمک ملا کر کھائے اور کبھی سبزی منڈی سے گری پڑی سبزی کو دھو کر اُبال کر اس سے تارِ نفس کے قیام کا سہارا ڈھونڈا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر حرم شریف میں درس دینے کے لئے تشریف لے گئے اس طرح مولانا گوناگوں تنگیوں اور صعوبتوں سے گزرے اور امتحان میں پورے اُترے۔ آخر جب اہل مدینہ سے متجاوز ہو کر حلقہ درس ترک و بخارا سمرقند قازان قزق ترکستان مصر اور کابل کے طلبہ تک پہنچا تو مولانا نے خدا کے بھروسے پر کسبِ معاش کے اور ذریعوں کو ترک فرما دیا اور یکسو ہو کر درس حدیث میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ پھر ۱۹ سنہ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ گرفتار ہوئے اور مالٹا بھیج دیئے گئے۔ شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی جو عام طور سے "ریشمی خطوط کی تحریک" سے مشہور ہے۔ ہماری قومی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے شیخ الہندؒ کا کیا منصوبہ تھا اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے انہوں نے کیا اسکیم بنائی تھی برطانوی سامراج کے C — I — D سے دامن بچا کر وہ کس طرح حجاز پہنچے تھے اور وہاں شریف مکہ کی غداریوں کا کس طرح نشانہ بنے تھے۔ یہ بڑی جرأت انگیز مجاہدانہ داستان ہے اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئی ہے۔ حجاز میں مولانا مدنی کو جب اپنے استاد محترم کے منصوبے کا علم ہوا تو وہ دل سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہاں سے

مولانا کی جدوجہد آزادی کا آغاز ہوتا ہے، شیخ الہندؒ کے بعد مولانا نے ان کے نصب العین کو پوری طرح اپنایا اور آزادی کی راہ میں بڑی بڑی صعوبتیں اُٹھائیں۔ چنانچہ مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق کار رہے اور وہاں اپنے میرِ کارواں کی جی بھر کر خدمت کی وہاں انگریز حکام کی سختیوں کی وجہ سے شیخ الہندؒ کو گرم پانی نہ ملتا تھا اور گٹھیا کا مرض تھا جس کی وجہ سے سردی میں بہت دقت ہوتی تھی مولانا کو استاد کی اس تکلیف کا احساس ہوا آپ ایک لوٹا پانی لے کر پیٹ سے لگا لیتے اور تمام رات لحاف اوڑھ کر بیٹھ جاتے صبح سویرے بدن کی حرارت سے نیم گرم پانی پیش کر دیتے بہت دنوں تک یہ انتظام رہا مگر استاد کو اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

شیخ الہندؒ کا دور جس قدر پر آشوب اور انگریزوں کی ساحرانہ مکاریوں کا دور تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں شیخ الہند ایک عزلت نشین صوفی یا خانقاہی پیر کی حیثیت سے کبھی مسلمانوں کی موجودہ پریشانیوں کا علاج نہ کر سکتے تھے چنانچہ وقت اور حالات کی نبض کو پہچان کر مولانا میدانِ سیاست میں اترے اور ثابت کر دیا کہ وہ میدان سیاست میں ایک بہترین کمانڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی بنیاد بعد میں علماء کی سیاسی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کے اہم ہیرو مولانا مدنی۔ عبید اللہ سندھی۔ مفتی کفایت اللہ اور انور شاہ رحمہم اللہ وغیرہم قرار پائے۔ مولانا مدنی کے عہد میں بھی بہرحال وہی بدیسی حکومت کے مظالم اور وہی انگریزوں کی فتنہ پردازیاں قائم تھیں جن کے انسداد کے لئے ہر ہر لمحہ خانقاہوں سے نکل کر عوام کے دوش بدوش اس تحریک کو زندہ رکھنے کی ضرورت تھی جو آپ سے پہلے اس مہلک ناسور کو مندمل کرنے کے لئے اسلافِ کرام نے شروع کی تھی۔ چنانچہ مولانا نے شیخ الہند کے بعد جس ذمے داری سے اس کو زندہ رکھا اس کے خوشگوار نتائج انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کی صورت میں ظاہر ہوئے اس کے بعد مولانا نے سیاست کو جس قدر سمجھا اور اس کو اپنی جماعت میں ترقی دی اس کے ضمن میں مولانا کی ہندوستان میں قربانیاں روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ اگر مولانا کی پروردہ حلیم طبیعت اور قانع و شاکر فطرت نے اس آزادی کے صلے میں کسی اونچی پوزیشن کو قبول نہ کیا اور دنیا کے سامنے وہ منسٹر اور وزیر اعظم کی صورت میں نہ ظاہر ہوئے تو اس سے ان کی للہیت اور خلوص پر پردہ پوشی ناممکن ہے۔ بشرطیکہ مؤرخ کا قلم انصاف اور دیانت کا ساتھ نہ چھوڑے اور خدانخواستہ یہ قربانیاں کسی تعصب کی نذر نہ ہو جائیں۔

مولانا کی زندگی میں تقریباً ہر ہر گوشہ جہاد سے تعبیر ہے آپ کا روزمرہ کا معمول اسلامی طرز زندگی میں ڈھل چکا ہے۔ شب بیداری کا یہ عالم ہے کہ رات کو ۱۲ بجے تک دارالعلوم میں طلبہ کو حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اس کے بعد ڈیڑھ بجے تک تصنیف و تالیف کے سلسلے میں کچھ کام کرتے ہیں۔ پھر ۴ بجے سے اٹھ جاتے ہیں اس کے علاوہ آپ کے یہاں روزانہ تقریباً ۳۰ — ۴۰ مہمانوں کا ہجوم رہتا ہے جس کو بذاتِ خود مولانا وقت دیتے ہیں اور ان کے طعام و قیام کا پورا انتظام مولانا اپنے ذمے رکھتے ہیں۔ جس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔ ایک ایک ماہ بھی لوگ قیام کرتے ہیں جس میں پاکستان ہندوستان کے علاوہ مدراس کلکتہ بمبئی افریقہ سورت سبھی جگہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

مولانا کی محفل میں زاہد عابد شاعر ادیب لیڈر عوام شہری دیہاتی امیر غریب سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں اور مولانا کی ذات میں اپنے جذبات و افکار کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ کوئی مشکلات کا ذکر کرتا ہے جس میں مالی ذہنی حکام کی بدعنوانیاں خانگی مسائل غرض ہر طرح کی مشکلیں شامل ہیں اور مولانا ہر لمحہ نئے مسائل کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں کہیں میر و غالب کی شاعری زیر بحث ہے تو مولانا ایک ایک شعر پر پوری طرح تبصرہ فرمادیں گے کسی وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ذکر آ گیا تو ان کے جذبۂ دینی اور خودی کے مسئلے پر سیر حاصل تشریح فرمادیں گے کہیں ابو الکلام کی نثر موضوع سخن ہے کسی وقت قسطنطنیہ، تیونس، مراکش کی موجودہ کشمکش اور تاریخ مدود اربعہ الگ انتظامی امور الگ عنوان بحث بن گئے ہیں دوسرے وقت آپ کسی دیہاتی سے مصروف تکلم پائیں گے تو ربیع و خریف کی ہونے والی تمام فصلوں میں ہر قسم کے بیج اور اناج پر مفصل اظہار خیال فرمائیں گے اور اس قدر معلوماتی تبصرہ کہ بڑے سے بڑا گھاگھو کسان اور زمیندار بھی زانوئے ادب تہہ کر کے طبیعت مدعا کا درس حاصل کرے موسمی پھلوں میں بالخصوص آم اور خربوزہ پسند فرماتے ہیں لیکن ان کے انتخاب میں کسی کے محتاج نہیں عمدہ اور غیر عمدہ قسموں پر بخوبی تشریح فرمائیں گے چھلکے اور

مذاق کے سلسلے میں اوّل تو آپ کو محفل میں ہر وقت ایک نہ ایک ظریف الطبع ایسا مل جائے گا جو مولانا کی طبیعت کا ایما پاکر اپنے رنگ میں آجائے اور پھر مولانا کو ایک اچھوتے رنگ میں دیکھ لیجئے کسی کو گلاب جامن سے کسی کو برفی سے کدہ ہے تو اس کو اسی عنوان سے چھیڑیں گے اور صرف زبانی ہی نہیں بازار سے منگوا کر اسے کھلائیں گے اگر کسی نے سلوک اور تصوف کے مسائل چھیڑ دیئے ہیں تو اس قدر روحانی کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ شاید بزمِ ملکوتی میں بھی ایک مرتبہ اپنی عبادت اور اطاعت پر شک ہونے لگے اور راہِ طریقت کے اُلجھے سے اُلجھے مسائل کچھ نگاہوں سے کچھ زبان سے اس طرح حل ہوتے چلے جائیں گے کہ طالب راہ تصوف اطمینان قلب کے ساتھ وہاں سے اُٹھے گا۔ غرض کہ ہر قسم کے اذہان کو اپنی ذہنی طبعی روحانی غذا بخوبی اس محفل میں حاصل ہو جاتی ہے۔ مہمانوں کے مطالبے بعض اوقات انتہائی تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتے ہیں کوئی اصرار کر رہا ہے کہ میرے بچے کی بسم اللہ ہے تشریف لے چلیں۔ کہیں عقیقہ کہیں شادی وغیرہ یہ رسوم مولانا کے زحمتِ سفر کا اکثر باعث بنتے رہتے ہیں مولانا کچھ دیر تو سختی سے پھر سمجھاتے ہوئے پھر خوشامدانہ انکار فرمائیں گے آخر ان کے اخلاق کریمانہ کی تاب انکار نہیں رہتی اور ڈائری میں تاریخ لکھ لی جاتی ہے ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے اور آتے ہی پوچھا کہ حضرت موسیٰ کے والد کا کیا نام تھا مولانا نے اس کی طرزِ سوال کو بھانپ لیا فرمایا مجھے نہیں معلوم بس پھر کیا تھا مہذب اور غیر مہذب گالیاں جس قدر اُسے یاد تھیں سنا ڈالیں مگر کھانے کے وقت مولانا کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھایا اور کچھ روز وہیں قیام کیا ایسے بھی مہمان آتے ہیں جو بقول مولانا میرے اصلاحِ نفس کے لئے آتے ہیں۔ مولانا کو ایک باپ کی حیثیت سے جہاں تک دیکھا گیا ہے شاید کوئی شفیق سے شفیق باپ باوجود کمالِ محبت و قدرت کے وہ درجہ حاصل نہ کر سکے۔

ابھی ابھی مدراس بمبئی کے طویل سفر سے واپس آئے ہیں اگر درس کا وقت ہے تو فوراً مدرسے تشریف لے جائیں گے۔ وہاں سے آکر اطمینان سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ چاروں طرف سے ابا جی ابا جی کا شور بلند ہوا دوسرے لمحے کوئی بچہ پیروں سے چمٹا جا رہا ہے کوئی کرتے سے لپٹا جا رہا ہے کوئی پشت پر چڑھا ہوا گلے میں جھول رہا ہے مولانا غایتِ شفقت و محبت سے فرماتے ہیں ذرا ہٹ تو جا دیکھ تیرے لئے کیا لایا ہوں چھوڑ تو مگر سختی یا جھڑکی کا شائبہ تک نہیں حیرت ہے اس برداشت پر اور تعجب ہے اندرونِ دنیا اس للہیت پر اور اخلاق مصطفوی پر۔ بچوں کو پھل کھلونوں سے بہلا رہے ہیں مگر بچوں کو تو مدت سے بچھڑے ہوئے ابا جی کی ضرورت ہے اور والد محترم تھوڑی دیر بعد قوم و ملت سے بھرپور قلب سے تھوڑا سا حصہ بچوں کی دلجوئی کے لئے نکالتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے نے کوئی جلسہ منعقد کیا تو اس کی صدارت بھی ابا جی سے کرانا چاہتے ہیں۔ ابا جی پریشان ہو جاتے ہیں میرے پاس کہاں وقت ہے مگر اس وقت ایک شفیق باپ اور چھوٹے لختِ جگر کا مسئلہ ہے جہاں ضد اور ہٹ تمام مطالبات منوا لیتی ہے وقت کا نہ ہونا یا فرصت کم ہونا تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا عذر ہو سکتا ہے!۔

مولانا کے مکان پر مہمانوں کا ہجوم تو رہتا ہے اس کے علاوہ دارالعلوم میں طلبہ کی امداد کے سلسلے میں مولانا کی طرف سے کھانا جاری ہوتا ہے یہی نہیں کنبہ پروری آپ کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور پھر کنبے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو والد مرحوم کے زمانے کی بیوائیں ہیں خاندان کے ساتھ رہنے والوں میں جس قدر حاجتمند تھے سبھی مولانا کی امداد کے حقدار ہیں اور ان کا خرچ مولانا کے ذمّے ہے۔ عید الفطر عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پر آج بھی مولانا اپنے محلّے کے ہر گھر میں تشریف لے جاتے ہیں اور بڑوں سے بچوں تک کو حسبِ مراتب عیدی تقسیم فرماتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کو تقریباً ۔۔ سال کا عرصہ گزرا مگر ان کی صاحبزادیوں کے ساتھ وہ معاملہ ہے جو شاید ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ نہ رکھ سکے عید کے مبارک موقع پر اس گھر میں کافی رقم خرچ فرماتے ہیں اور خود بنفسِ نفیس تشریف لے جاتے ہیں تمام احوال دریافت فرماتے ہیں صاحبزادیوں کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے کسی بہت بڑے سرپرست یا باپ کے سامنے ہیں گفتگو میں تابعداری انکساری کا طرز نمایاں رہتا ہے۔

مولانا کو مہمانوں کے علاوہ درخت اور پرندوں سے بھی بہت اُنس ہے دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے میں کافی خوبصورت وسیع و عریض باغ ہے جو مولانا کے شوق اور طلب کا رہینِ کرم ہے جس میں بہت سے درخت بنگال۔ آسام۔ بمبئی۔ سورت۔ لکھنؤ سے مولانا کے اپنے جیبِ خاص سے

منگا کر لگائے جاتے ہیں اور اس کی نگہبانی و باغبانی ملازم سے زیادہ خود مولانا فرماتے ہیں۔ چمن کے سلسلے میں معمولی سے نقصان پر طلبہ سے سخت باز پرس فرماتے ہیں لیکن قصداً اگر کسی نے صدمہ پہنچایا ہے اس وقت تو آپ سے برداشت نہ ہوگا اور اگر کسی ضرورت سے یا اتفاقاً کسی سے کوئی نقصان ہوگیا تو کچھ خیال نہیں فرماتے ایک بار آسام سے قیمتی پودوں کے گملے آئے مولانا انہیں شوق سے ملاحظہ فرما رہے تھے اتفاق سے سب سے چھوٹی بچی بھاگ کر آئی اور کسی جھٹکے سے گملے پر گر پڑی ننھے پودے ذرا سی دیر میں ختم ہوگئے۔ برداشت اور درگزر کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں آئی وہ حیرت انگیز تھی۔ اطمینان سے بچی کو اُٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے کمرے میں تشریف لے گئے اور پھر اس کے بعد کبھی اس پر اظہارِ خیال نہ فرمایا۔

مجموعی طور پر مولانا کی زندگی بہت حسین، منظم اور مہذّب زندگی ہے۔ جس میں تماشا گاہِ عالم کی سیر کا سامان بھی ہے۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

نعیم صدیقی

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے —— اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے خوفناک توڑا آدمیوں ہی کا توڑا ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو اور ہر چیز کی کمی وہ پوری کر لے جاتی ہے۔ بلاشبہ مرد و زن کا ایک بے پناہ ہجوم ہے یا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو پاک زمین کے حصے میں آیا ہے —— آٹھ کروڑ نفوس! —— ان میں وزیر بھی ہیں، لیڈر بھی ہیں، ایم اے بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور اہل فن بھی ہیں، تاجر اور صناع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں۔ "بڑے آدمی" ہماری قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں، لیکن آدمی ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہر زندگی کے گرد پیر رومی کا "شیخ" چراغ ہاتھ میں لئے سرگرداں ہے اور "الاپتہ۔ یابتے کہ انسانم آرزوست" ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں روایتی مردم شماری کا ریکارڈ کئی اونٹوں کا بوجھ ہو، لیکن اگر ہم اپنے ہاں کے تہذیبی، عقلی، معاشی میدان کو محض بطور مروّت انسان کہنا چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا! —— یہ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ ماہرین خطاط چاول کے ایک دانے پر پورا سورہ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں! ہمیں آدمی بننے کیلئے ابھی ارتقا کی بڑی لمبی اور کٹھن راہ طے کرنی ہے۔

"آدمی گوشت اور ہڈی کے اس بولتے اور چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشات سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور و احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا۔ اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابلِ ذکر قلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اسی اقلیت کا ایک فرد ہے —— "ایک آدمی"!

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب، وہ خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ ایک ایسا آدمی جو پاکستان بھر میں نمایاں ہے۔ اگر ہم ہمالہ کی کسی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارض پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔ آخر کیوں؟ —— اس لئے کہ یہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور ہنگامی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار اور ایک سرگرمیٔ عمل کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ ایک آدمی ہے، وہ ایک انسان ہے!

ہاں مگر ——— اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا۔ اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک مکمل فلسفہ، ایک اجتماعی کیرکٹر، ایک سیاسی نقطۂ نظر، ایک منظم تحریک اور ایک نصب العین نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مودودی کا نام لیتے ہی اسلامی دستور کے مسائل ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں اور اسلامی نظام کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس معیار کی شخصیتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے۔ دیکھنا اور دکھانا ایک "اکابر پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے۔ لیکن اس دیکھنے اور دکھانے کا ایک اعلیٰ محرک بھی ہے، اور وہ یہ کہ اُن اوصاف اور عادات کو معلوم کیا جائے جنہوں نے ہم جیسے کسی پیکرِ آب و گل کو ابنائے نوع کیلئے بہت بڑے پیمانے پر خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اس تحریر کا منشاء بندگانِ خدا کیلئے ایک نیا ذہنی دیوتا گھڑ کے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ہم بھی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شخص جس کے نام سے پاکستان کا ایک ان پڑھ دیہاتی تک واقف ہے اور جس کا حلقۂ تعارف عراق اور شام اور حجاز تک پھیلا ہوا ہے، آخر اس کا اصل جوہرِ شخصیت کیا ہے۔

جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں ان کی سب سے بڑی چھوٹائی یہ ہوتی ہے کہ ان کا بڑا پن بالعموم ان کی شخصیت پر باہر سے ایک خول کی طرح چڑھا ہوتا ہے۔ اس چمکتے دمکتے خول کو دور ہی دور سے دیکھتے رہیئے تو بڑی مرعوبیت طاری رہتی ہے، اس کے اندر کے آدمی سے اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو ناظر کے تصورات کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن مودودی کی شخصیت اپنے بیرونی مظاہر سے لے کر اپنے باطنی جوہر تک بالکل یکساں اور یک آہنگ ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم جلا وطنی کا دور ختم کرکے وطن تشریف لائے تو کسی موقع پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ مولانا مودودی ان سے ملاقات کرنے پلیٹ فارم پر پہنچے مگر کچھ معلوم نہ تھا کہ مولانا سندھی کس درجے میں ہیں تلاش میں تھے۔ مولانا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر متوجہ کرکے (غالباً ہاتھ پکڑ کے) مصافحہ کیا، اور پہلے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بڑے جزم و یقین کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا "آپ مولانا مودودی ہیں نا؟" پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک "شخصیت" کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحب نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے۔ ظاہر و باطن کے درمیان خود پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں۔ تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ہیں۔ تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ دور سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے، قریب آنے پر وہی اور زیادہ نکھر کر نگاہوں میں آ جاتا ہے۔

آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے ——— اور اگر میں ان برسوں کو گنتی کر کے گن نہ لیتا تو میرا گمان یہی ہوتا کہ گویا کل کا واقعہ ہے۔ میں ابھی اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلق بنتے بگڑتے نقشوں میں گم سم، کچھ لکھنے، کچھ سوچنے اور زیادہ تر پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف! اُس چھوٹی سی دور افتادہ دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ہر روز ڈاک کا میلا سا تھیلا آیا کرتا تھا۔ اس میں میرے نام کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ ایک رسالے میں مولانا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں محض ایک اسلامی نو آبادی ——— دارالاسلام ——— کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی[1]۔ اس تحریر میں سادگیٔ بیان کا حسن تو تھا ہی، مگر اس کا خاص تأثر (جو اب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنہیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس نوعیت کے مضمون میں ایک تو جوش انگیزی موجود ہوتی اور دوسرے روشن ہی روشن پہلو پیش کئے جاتے۔ لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا، اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ الفاظ سے مدد لئے، لکھنے والے نے اس

---

[1] اسی نو آبادیوں کے ایک تخیل کا نقش میرے ذہن نے علامہ اقبال کے ایک مطبوعہ خطبے سے اخذ کیا تھا۔ اسی سلسلہ نظر کے سامنے اس نے جو مضمون پونہ جاسے شائع ہوا، بیچ میں یہی تھی دارالاسلام کی اسکیم سننے جیسے اقبال کا ذہن کام کر رہا تھا۔

میں پوری پوری ترغیبی روح پیدا کر دی تھی۔ اس مضمون کے بین السطور کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے تو میں قاصر تھا، لیکن جس کی جاذبیت نے مجھے اُسی لمحہ ناآشنائی میں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ کیا اسکیم ہے؟ بس یہ سوالات سامنے تھے اور مضمون کو بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ والد مرحوم سے ذکر کیا ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس رسالے کے مدیر نے اپنے نوٹ میں خود بھی مجوزہ سکیم سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا، لہٰذا ان کو خط لکھا اور خط کے جواب میں سرسری سی ابتدائی معلومات مزید حاصل ہوئیں مگر ان معلومات نے مزید تشنگی پیدا کر دی۔ میرے دل میں اس سے قبل صرف ایک ہی ملی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی کارفرما تھی ——— میرا اشارہ اقبالؒ کی طرف ہے ——— لیکن اب ایک اور منفرد قسم کی شخصیت سے میری دلچسپی کا آغاز ہو چکا تھا ——— بعد میں غائبانہ تعارف کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

۱۹۳۸ء کے بالکل آغاز میں ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آیا اور مدعا سفر یہی تھا کہ اقبالؒ اور مودودی دونوں سے ملاقات کروں گا۔ بلکہ اپنے اس دور کے ذہن کے مطابق کہنا چاہیے "زیارت"! لیکن زیارت صرف علامہ اقبالؒ ہی کی حاصل ہو سکی جو بیک وقت پہلی بھی ثابت ہوئی اور آخری بھی! چند ہفتے بعد اقبال اپنا نغمہ حیات افروز پورا کر کے ازلی و ابدی فضاؤں کی طرف پرواز کر گیا۔ ۱۹۳۸ء ہی کے وسطی حصے میں مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لئے ہوئے پٹھانکوٹ کا عزم باندھ کر دوسرا سفر کیا۔ غائبانہ تعارف تو اب کافی آگے تک جا چکا تھا، کیونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن کے متعدد شمارے نگاہ سے گزر چکے تھے۔ غالباً "سیاسی کشمکش حصہ اول" کے فکر انگیز مباحث دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے تھے۔ اور مولانا کے ساتھ کام کرنے والے ایک کرم فرما سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں اس امر کا ضمناً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ایک غیر سیاسی علاقے کا دیہاتی نوجوان تھا اور عملاً پارٹی پالیٹکس سے البعد تھا، لیکن ملک میں مسلمانوں کو انگریزی استبداد اور متعصب ہندو اکثریت کی دو بلاؤں سے جو ہمت آزما کشمکش درپیش تھی اس سے نظری حد تک گہرا ربط رکھتا تھا۔ اپنی پوری قوم کی طرح میں بھی اندھیرے میں تھا کہ اب کیا ہونا چاہیئے اور راہ نجات کیا ہے؟ مولانا مودودی کی تحریریں دیکھ کر امید کی ایک کرن ہاتھ آئی کہ شائد یہ شخص صحیح طرز پر سوچ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے الجھنوں کے اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ مل سکے جو واقعاتی تاریخ کی صورت میں دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری ابتدائی دلچسپی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ لیکن خود اس سیاست کے اندر "مسلم قومیت" کی روح تہ نشین تھی۔ ہاں تو میں گھر سے چلا اور کچھ وقفہ دارالاسلام کی اسی نوآبادی میں رہ کر مولانا مودودی اور ان کے خیالات اور ان کی عملی سکیم کو سمجھنے کا ارادہ لے کر چلا۔ بس والوں نے اپر باری دواب کی نہر کے کنارے اتارا۔ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاکروب "فقیریا" ادھر سے گزرا اور جب اُس کو معلوم ہوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے تو اس نے سوٹ کیس اور بستر سر پر رکھ لیا اور ہم چلے۔ میرا یہ راہنما مجھے بسوں کی سڑک کے بجائے ریل کے پُل کے رستے لے گیا جو نیچے سے بند نہیں تھا۔ اور ایک ایک قدم اس کے (غالباً ستر) سلیپروں پر رکھ کر اسے پار کرنا پڑتا تھا۔ پہلے تو اتنے لمبے پل اور اس کے نیچے شور کرتے اور بپھرے ہوئے رواں دواں پانی کو دیکھ کر دل دہل گیا۔ ارادہ کیا کہ واپس ہو کر جرنیلی سڑک کے راستے نہر کو پار کر لوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ایک خاکروب کے سامنے مجھے ایسی کمزوری نہیں دکھانی چاہیئے۔ چلا مگر دس پندرہ سلیپروں پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بعد سر چکرایا، بیٹھ گیا۔ لیکن ایک بار پھر اسی ہمت افزا خیال نے سہارا دیا اور پھر فقیریا کے نقوش قدم پر آگے بڑھنے لگا جو بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بے ساختگی سے چلا جا رہا تھا۔ پُل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں، درختوں اور سبز گھاس کے بنے ہوئے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں اوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔

نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا تو بستی کی مختصر سی آبادی ——— تین چار افراد ——— مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وائل کا کرتہ، ٹخنے کا "غرارہ نما" پاجامہ، سر پر

دائل ہی کی ایک ٹوپی (جو نماز کیلئے گویا خاص تھی)، پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ رنگ کے سلیپر ——— پُورا لباس نہایت اُجلا جو سبز پس منظر میں عجیب شان سے نمایاں تھا ——— اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جو ہر سیرت کی مخفی سی دمک لئے ہوئے) جس پر سکہ بند مذہبی معیار سے چھوٹی شوخ سیاہ رنگ ڈاڑھی!! ——— کسی تعارف کے بغیر میں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے "السلام علیکم" کہی جو آج تک میں نے کسی اور میں نہیں پایا۔ مؤدبانہ جھجک کے ساتھ مصافحہ کیا، کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور پھر نماز کھڑی ہوگئی۔ نماز کا امام بھی وہی شخص تھا دلچسپ یہ کہ نماز اور قرأت کا اسلوب بھی بے حد ندرت لئے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں آباد شدہ اسی ننھی سی بستی میں گزارا۔ مولانا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریوں، تصنیفی کاموں اور خط و کتابت میں صرف ہوتا۔ مولینا سے ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے کشادہ صحن میں ہوتی اور کبھی نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی، یا عصر کے بعد مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے مینیجر اور کاتب، مولینا صدرالدین اصلاحی اور میں ——— اور کوئی مہمان آجاتا تو وہ بھی ——— سب ساتھ جاتے۔ دین و سیاست کے اہم مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں، لطائف بھی ہوتے، بستی اور اس کی مقصدی سکیم سے متعلق معاملات بھی چھڑتے، ترجمان القرآن اور اس کے مکتبہ کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہو جاتی۔ اس "بزمِ متحرک" کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل و دماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ کبھی مغرب کے بعد کا کھانا یکجائی ہو جاتا اور سلسلہ گفتگو عشا تک جاری رہتا۔ اس "بزمِ متحرک" کا نشہ دو ہی چار دن میں اتنا تیز ہو گیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ "سورج خدا کے واسطے ہو جا تلے تلے"!

ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سامنے رہ گیا ہے۔ البتہ وہ تاثرات میں بیان کرسکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لئے میں بعد کی اسلامی تحریک کے اس چھوٹے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ شخص "مولوی" نہیں ہے (یہ بات مولویت کے بارے میں ہر طرح کے تحقیر آمیز تاثر سے الگ ہوکر محض حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں) پہلی بار چہرہ سامنے آنے پر میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔ بعد کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں نے اس رائے کو قطعی بنادیا۔ مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص "مسٹر" بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور مسلم اور دین کا رمز شناس ضرور تھا۔ مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پُرتکلف اور بوجھل فضا نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا، مگر اس میں وہ لاابالیانہ پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک گفتگو مجھے نہیں بھولتی جب کہ ہماری "بزمِ متحرک" میں ڈاڑھی کی بات چھڑی۔ مولانا مودودی کہہ رہے تھے کہ (الفاظ یاد نہیں صرف مفہوم ذہن میں ہے) ڈاڑھی کو آج جو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے اصُولاً وہ نظامِ دین میں نہیں تھی۔ مجھ ایسا روزانہ بدستِ خود شیو بنانے والا اور ڈاڑھی کے "منزدک" بارِ گراں سے ڈرنے والا نوجوان یہ الفاظ سن کر مطمئن بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی! اسی حیرت زدگی میں بے اختیار میں نے سوال کیا کہ کیا ڈاڑھی نہیں رکھنی چاہیئے؟ جواب ملا کہ میرا مطلب یہ نہیں، رکھنی تو چاہیئے لیکن اس کو دینی حلقوں نے جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دے دی ہے وہ خود دین میں نہیں پائی جاتی ——— آج تو ایک مسلمان سے مذہبی حضرات کے ہاں جو اہم ترین اوّلین مطالبات کئے جاتے ہیں ان میں ڈاڑھی سب سے پیش پیش ہے[1]۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ شخص متوازن مزاج اور انصاف پسند ہے۔ انصاف پسندی اور توازن کی

---

[1] اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ لباس، رہن سہن، پردے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلقہ مسائل میں مروجہ جامد اور انتہا پسندانہ مذہبی تصورات اور ان کے خلاف نمودار ہونے والے ردعملی نقطۂ نظر کے درمیان مجھے اس خطِ اعتدال کو پا لینے کا موقعہ ملا جو مدتوں سے کھو چکا تھا۔ ایسی گفتگوؤں کے زیر اثر بنیادی طور پر میرا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اگرچہ مجھے اس وقت اس تبدیلی کا پورا شعور نہ تھا۔

ایک اور اہم شہادت جو میرے سامنے آئی اس نے بھی مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ ان دنوں میرے دل میں مسلم لیگ کے لئے دبی دبی سی ہمدردی موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چند دوستوں کی مبلغانہ بحثوں نے خاکسار تحریک کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی تحریک پیدا کر دی تھی۔ مودودی صاحب سے کسی موقع پر میں نے مشرقی صاحب کے نظریے اور ان کی برپا کردہ تنظیم کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس پر ایک لمبا سلسلۂ گفتگو ہماری بزم متحرک میں چھڑ گیا۔ مولانا نے نظریۂ ارتقاء کی توضیح کرکے بتایا کہ درحقیقت علامہ صاحب نے اپنی فکر اور تحریک کی اساس اسی نظریے پر رکھی ہے اور اُوپر سے اسے اسلامی اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے مشورہ دیا کہ سنی سنائی باتوں کی بجائے مجھے علامہ صاحب کے اصل لٹریچر کو خود دیکھنا چاہیئے اور ٹھوس طریق سے کوئی رائے قائم کرنی چاہیئے کتابیں مولانا کے پاس موجود تھیں جن میں سے "تذکرہ" اور "اشارات" کو میں نے پڑھا۔ دونوں کتابوں پر مولانا مودودی کے حواشی موجود تھے اور ان کو میں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوق تجسس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں تو کلمہ ہائے اعتراف اور کلمہ ہائے تحسین موجود تھے، کہیں بیزاری اور اختلاف کا اظہار، اور کہیں کہیں فکری لغزشوں پر سخت درجے کی گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے اب تک زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں اگر کسی کے مخالف ہوں تو اندھے مخالف ہوتے ہیں اور حامی ہوں تو غالی حامی! لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے سمجھ لی کہ یہ شخص "بازمانہ ساز" قسم کا آدمی نہیں ہے، نہ جامد اور منفی اور منفعل قسم کی فطرت پر اس کی شخصیت مبنی ہے، بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے والے نایاب مردان کار کی طرح "بازمانہ استیز" کے حوصلے رکھتا ہے۔ تھوڑی سی معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے اب تک سفر مقصد قربانیاں دیتے ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی نقصانات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین تر مراحل ہیں لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے جو کچھ بھی سکیم ہے (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی عملی صورت میرے ذہن میں متحقق نہیں ہو سکی تھی) وہ ایک لمبا پروگرام اور ٹھنڈا طریق کار اور کسان کا سا صبر چاہتی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے جو ہماری قوم کا موروثی روگ بن چکا ہے۔

یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاع فکر و عمل منڈی کا مال نہیں ہے

سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کو جس کا علمی یا عملی، دینی یا سیاسی کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا، مولانا مودودی کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے یہ محسوس نہ کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے اور بڑے آدمیوں کے بارے میں میرا جو کچھ تصور چلا آ رہا تھا وہ مودودی صاحب کے حق میں قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بُعد مراتب کے بجائے میں نے قربِ اخوت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح تھی کہ مولینا "پیران کہن" سے نومید ہیں۔ اور بر جوانان سہل کن حرف مرا" کی دعا کے مانند قوم کی نئی نسل کی طرف روئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لئے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا عنوان تجویز کرنا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے "مستقبل کا کردار" ہے۔ "اگلے وقتوں" کے لوگوں کے بالمقابل یہ "آنے والے وقتوں" کا کردار تھا۔ یہ کردار مرعوب کن نہیں بلکہ جاذبیت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے لئے محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے! ان سارے تاثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کئے ہوئے میں نے "دارالاسلام" کو الوداع کہی۔

یہی ہے وہ "ایک آدمی" جس کی شخصیت کا مطالعہ کرنا پیش نظر ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا اصل مقصود اس جوہر سیرت کا سراغ لگانا ہے جس کا پرتو آدمی کی زندگی کے بعید ترین گوشوں تک جا پڑتا ہے اور جس کے سرچشمے سے زندگی کی کیاری کا ایک ایک ذرۂ خاک سیراب ہوتا ہے۔ کسی کے جوہر سیرت تک پہنچنے کیلئے جب ہم ذہنی سفر کرتے ہیں تو سب سے پہلے سابقہ "مظاہر شخصیت" سے پیش آتا ہے، اور آگے بڑھیں تو اخلاقی اطوار سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں جا کر نظریات و افکار اور اصول و مقاصد دیکھے جاتے ہیں۔ مولینا مودودی کی شخصیت کے فکری پہلو کو تو میں نے ایک الگ مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ اخلاق و اطوار پر یہاں براہ راست بحث کرنے کا ارادہ نہیں، یہاں صرف مظاہر شخصیت کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ "مظاہر شخصیت" سے میری مراد آدمی کے وہ مخصوص

لہ ملاحظہ ہو: "مولانا مودودی ———— اپنی اور دوسروں کی نظر میں"

اسالیب و اطوار میں جو بول چال، تحریر و تقریر، کھان پان، نشست و برخاست اور "ذوقیات" کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے اس کے ذہن اور اس کی سیرت کی کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی گھر کے جس ماحول میں رہتا ہے، جس بیٹھک میں بیٹھتا اور جس دفتر میں وہ قلم چلاتا ہے، جس لباس کو پہنتا اور جن اشیاء کو اپنے استعمال میں رکھتا ہے، ان سب پر اس کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ کوئی شخص فرنیچر اور دوسرے سامان کو جو ترتیب دیتا ہے، جس ڈھنگ سے وہ خط وہ لکھتا ہے، جس طرز پر وہ دستخط ثبت کرتا ہے۔ اس کے اندر اس کی شخصیت کی روح شامل ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہر شخصیت[1] ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے کسی شخص کے اصل جوہر سیرت کی قدر و قیمت مشخص کی جا سکتی ہے اور اس کا اخلاقی مقام متعین کیا جا سکتا ہے، چاہے اس سے ملاقات تک کا موقع نہ ملا ہو۔ آدمی کی داستان عمر بھر اس کے ماحول اور اس کے املاک اور اس کے مستعملات پر کسی پر اسرار قلم سے مرقوم ہوتی رہتی ہے۔ مظاہر شخصیت کے مطالعہ کے معنی خفیہ رسم الخط میں لکھی ہوئی اسی داستان کو پڑھنے کے ہیں۔ ورنہ بجائے خود یہ معلومات کہ فلاں کیا پہنتا اور کیا کھاتا ہے اور کیسے بیٹھتا ہے اور کیونکر بولتا اور لکھتا ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور ان کے حاصل کرنے اور قلم بند کرنے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں وقت اور قوت صرف کرنا کسی معقول آدمی کا مشغلہ نہیں ہو سکتا۔

آدمی کا سراپا اس کی شخصیت کا نشیمن ہوتا ہے اور سراپا کو ایک نظر دیکھتے ہی انسانی کرداروں کا ایک رازداں اس کے اندر رہنے بسنے والی شخصیت کا حدود اربعہ پا لیتا ہے۔ مولانا مودودی کا سراپا، بلکہ وجاہت دار چہرہ کسی بھی ماحول میں ہو ——— گھر میں، مجلس میں، دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر، گاڑی کے کسی ڈبے میں، جلسہ عام میں ——— بالکل ممتاز اور نمایاں رہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ جس شخصیت کا آئینہ دار ہے اس کے نمونے تقدیر نے بہت زیادہ تعداد میں نہیں بنائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر پیش کر دی جائے۔ یہ تصویر میں اپنے قلم سے کھینچنا چاہتا تھا، مگر اس میں وقت زیادہ درکار ہے۔ وقت بچانے کیلئے میں اپنے صحافی دوست علی سفیان آفاقی کی مرتبہ تصویر مستعار لئے لیتا ہوں:-

"چھوٹے بالوں کے پٹے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چوڑا ماتھا، آنکھوں پر ہلکے سے نیلے رنگ کے شیشوں کی عینک (نہیں ——— مولانا سفید شیشے استعمال کرتے ہیں۔ ن۔ ص)۔ دوہرا جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، چہرہ ہنس مکھ، اور سفید سی ڈاڑھی پر[2] جہاں تہاں سیاہی مترشح!"
("ابوالاعلیٰ مودودی")

مولینا مودودی ان "بہ قیمت بہتر" لوگوں میں سے ہیں جن کے قامت پر توجہ نہیں جاتی۔ یوں قد بہت چھوٹا نہیں ہے، دوہرے بدن کی وجہ سے نظر کو مغالطہ ہوتا ہے لیکن موزونیت اس درجہ کی ہے کہ مودودی صاحب کے سراپا میں کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ دوہرے بدن کے باوجود مولانا کی چال ڈھیلی ڈھالی اور مریل قسم کی نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشن پر جا رہا ہے۔ "چال" کے بارے میں ابھی دن تفہیم القرآن کے حاشیئے میں خود مودودی صاحب نے بڑے کام کی بات لکھی ہے، ملاحظہ ہو:-

"مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک

---

[1] کچھ لوگ ہمیشہ ایسے پائے گئے ہیں جو بڑے آدمیوں کے مظاہر شخصیت کا چربہ اتارتے ہیں۔ حالانکہ اصل نتیجہ خیز چیز اپنے اندر کسی اچھے جوہر سیرت کا پیدا کرنا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی کے اپنے مظاہر شخصیت ایک امتیازی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت کا لباس پہن کر ہم اپنا قد و قامت اس کے مطابق نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ہمیں اپنے ہی قد و قامت کے مطابق لباس سل سکتا ہے۔

[2] آفاقی صاحب نے دور اول نہیں دیکھا جب ڈاڑھی بالکل سیاہ تھی اور ذرا چھوٹی تھی۔ اس کے حلقے میں کشادہ پیشانی و لالہ روشن چہرہ عجیب منظر سامنے لاتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مولانا مودودی کی ڈاڑھی کے بال نیز معمولی تیز رفتاری سے سفید ہوئے ہیں۔ اور اب تو کوئی اکا دکا بال ہی سیاہ رہ گیا ہوگا۔

ظالم و جابر کی چال ایک خود پسند متکبر کی چال، ایک باوقار مہذب کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔" (ترجمان القرآن۔ ج ۴۶۔ عدد ۵)

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا مودودی کی چال یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص احساس ذمہ داری کے عالم میں کوئی فرض ادا کرنے جا رہا ہے، مگر گھبراہٹ کے انداز سے نہیں پروقار طریق سے۔ ممکن ہے دوسروں کا تاثر کچھ اور ہو، لیکن اتنا بہرحال ہر کوئی محسوس کرلیگا کہ "یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا" کے معیار پر یہ چال پوری اترتی ہے۔

مودودی صاحب کے سراپا کا ایک جزو لباس بھی ہے اور میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ گھر اور دفتر میں رہتے ہوئے کیسا لباس پہنتے ہیں۔ سردیوں میں کھلے پاجامے کے ساتھ دھاری دار قمیض اور اونی سویٹر استعمال کرتے ہیں۔ سر پر گرم اونی ٹوپی پہن لیتے ہیں۔ پاؤں میں جرابوں کے علاوہ چمڑے کے موزے بھی ہوتے ہیں اور باٹا کا کینوس کا نیوکٹ جوتا۔ گلے گاہے سخت سردی ہو جانے پر سفید رنگ کی اونی قبا بھی اوڑھ لیتے ہیں جسے زیارت سے آتے ہوئے ساتھ لائے تھے۔ باہر جانا ہو تو تنگ مہری کا چوڑی دار پاجامہ، موسم کے مطابق گرم یا سرد شیروانی اور قراقلی کی بنی ہوئی اونچی باڑھ کی سیاہ رنگ ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں باہر جانے کا لباس کبھی کبھی شیروانی سمیت بالکل سفید ہوتا ہے اور غالباً اس لباس میں مودودی صاحب کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ وضو کیلئے لکڑی کی کھڑاواں موجود رہتی ہیں۔ لباس کے تنوع کا دائرہ ہے محدود، لیکن شخصیت کی ترجمانی اور زیبائش کیلئے ہمیشہ موزوں رہتا ہے۔ مودودی کے لباس کے اصل اجزا ہیں ——— صفائی، سادگی اور حسن ذوق!!

آدمی ہے ناطق ٹھہرا۔ نطق سے بڑھ کر اس کا کوئی ترجمان اور غماز نہیں ہو سکتا۔ نطق شخصیت کے بہاؤ کی رودگاہ ہے۔ آدمی نے بات کہی اور اس کی حقیقت کھلی۔ ناطقہ کی ثانت، باجی تو زمانے نے جب راگ پالیا۔ "تار دھن شگفتہ" والی بات پرانی نہیں ہوئی۔ موضوعات کی پسندیدگی، زبان کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب، وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان عام کر دیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے۔ کسی کا ظرف کتنا ہے۔ کسی کا ذوق کس نوعیت کا ہے۔ کسی میں سنجیدگی کس درجہ پائی جاتی ہے، کوئی کہاں تک بااصول ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے ادا کرنے ہی کرتا ہے۔ مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گزشتہ چودہ پندرہ برس کے زمانے سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ مولانا کے انداز گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت میں میرے ذہن میں موجود ہیں، اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ تحریر یا تقریر کے آدمی کو ہم جتنا بلند پاتے ہیں، وہی آدمی مجلسی زندگی میں گفتگو کرتے ہوئے انتہائی پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر و تقریر میں اصول پسندی اور مقصدیت ہوتی ہے، لیکن اپنی گفتگوؤں میں اس کا بے اصولاپن اور اس کی لامقصدیت صاف صاف نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں جو سنجیدگی اور معقولیت کسی کی شخصیت میں محسوس ہو رہی تھی بے تکلفانہ گفتگو کے ماحول میں ملمع کی وہ ساری چمک دمک غائب ہو کر رہ گئی۔ تحریر و تقریر میں علمیت و تفکر کے کچھ آثار جھلملا رہے تھے لیکن گفتگو کے دائرے میں سامنا ہوتے ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تصنع کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں زبان کے ٹھاٹھ موجود تھے لیکن بات چیت میں سب غائب! الغرض تحریر و تقریر کا آدمی ہمارے ہاں بالعموم اس آدمی سے بالکل الگ ہوتا ہے، جس سے ہم مصافحہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ بیٹھتے اور جس سے بات چیت کرتے ہیں لیکن مولانا مودودی اس معاملے میں اپنی مثال آپ ہیں کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر کے دوگونہ میدانوں میں ایک ہی سی حالت پر رہتے ہیں بلکہ وہ اظہار کے ان وسیع میدانوں سے لوٹ کر جب کبھی عام بات چیت کے نسبتاً محدود دائروں کی طرف پلٹتے ہیں تو بھی اپنی یکسانی کو برقرار

رکھتے ہیں - وہی بلندیٔ فکر، وہی سنجیدگی و وقار، وہی حسنِ گفتار، وہی غیر جذباتی لب و لہجہ، الفاظ کا وہی حسنِ انتخاب، ظرف کی وہی وسعت، معلومات کی وہی بے کرانی، مقصدیت و اصولیت کا وہی زور، اور کلام کا وہی مزاج آپ کو عصرانہ نشست کی ہلکی پھلکی بات چیت میں بھی ملے گا جو موصوف کی تحریر و تقریر میں پایا جاتا ہے۔

بڑے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر دوسروں کے لئے بڑی زور دار جاذبیت پائی جاتی ہے اور جاذبیت کا یہ اثر ان کی گفتار میں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جاذبیت کیلئے بہت ساری چیزیں تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں مگر ان میں سے ایک سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہے آدمی کی خودی کا متورم ہو جانا۔ خودی جب متورم ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور اس کی گفتگو اس کے زہر سے متاثر ہوتی ہے۔ اس عالم میں آدمی کی "میں" کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر موقع پر اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونستا ہے۔ اپنے آپ کو اہمیت دیتا ہے۔ اپنے آپ کو کچھ تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ لیکن متورم خودی کے بوجھ کو اٹھانے پر کوئی دوسرا تیار نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ایسے شخص کی گفتگو سے انقباض ہوتا ہے اور وہ اس کے ارد گرد سے چھٹ چھٹا جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے صحت مند خودی دی ہے۔ اس شخص نے اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونسنے اور اپنے آپ کو کچھ منوانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں نے بارہ پندرہ برس میں سینکڑوں مجالس میں مولانا مودودی کی گفتگوؤں کو سنا ہے مگر کبھی کسی گفتگو کے دوران میں ایسا نہیں ہوا کہ میرے یا دوسرے ساتھیوں کے ذہن نے مولانا کے انا کا بارگراں اپنے اوپر پڑتا محسوس کیا ہو۔ ایک رخ یہ، اور دوسرا رخ یہ کہ مودودی کی زبان پر کبھی کوئی فریب کارانہ کلمۂ انکسار بھی نہیں آیا۔ یہ بھی انسانی خودی کا ایک دوسرا رنگ ہے، اور شاید پہلے سے کچھ زیادہ ہی خطرناک! مودودی صاحب سے ملنے والوں کو کبھی یہ ابتلا پیش نہیں آتا کہ انہیں ایک شخص کی مسلسل سننی پڑے اور خود ان کو مافی الضمیر کے کہنے کا موقع نہ ملے۔ یہاں ہر شخص کو بات کرنے کا کھلا موقع ملتا ہے۔ جس میں نہ مودودی صاحب کی شخصیت رکاوٹ بنتی ہے۔ نہ جدید یا قدیم قسم کے مراسم و آداب!

ہمارے معاشرے کی ایک عام روایت بن چکی ہے کہ لوگ اختلافی گفتگوؤں میں ضرور ہی لڑنے جھگڑنے پر اتر آتے ہیں۔ ہماری یہ قومی صفت صرف معمولی درجے کے لوگوں میں نہیں، اونچے درجے کے مصنفین، لیڈروں، وزیروں، حکام، اخبار نویسوں اور مذہبی رہنماؤں سبھی میں پائی جاتی ہے اور جو جتنا بڑا ہے اس میں یہ خوبی اتنی ہی وافر پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں گفتگو کا بنیادی فارمولا یہ ہے کہ اپنی بات دوسرے سے منوا کے چھوڑنا ہے اس کے لئے دو بڑے میتھڈ اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو ذرا کم کم استعمال میں آتا ہے وہ لجاجت کا میتھڈ ہے۔ یعنی ہونٹ لٹکا لٹکا کے، خوشامد کر کر کے، اور اپنے جذبات کے حق میں رحم کی اپیلیں کر کر کے مخاطب سے کوئی بات منوانا! دوسرا میتھڈ جو ہٹیار خانوں اور قہوہ خانوں سے لیکر پارلیمانی ایوانوں تک کثیر الاستعمال ہے۔ قوتِ غضبیہ کو کام میں لانے کا میتھڈ ہے۔ یعنی آپ نے بات کہی، نہیں مانی گئی تو پھر ذرا زور دے کر اسے دہرایا، پھر نہیں مانی گئی تو آواز اونچی ہو گئی۔ پھر نتھنے پھولنے لگے۔ ہونٹوں پر جھاگ آنا شروع ہوا۔ گردن کی رگوں کا ابھار بڑھ گیا —— آخری حد نہ جانے لیا ہو!

مولانا مودودی اختلافی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا میتھڈ افہام و تفہیم کا میتھڈ ہے یعنی مقصدِ کلام دوسرے کی بات کو سمجھ لینا اور اپنی بات سمجھا دینا ہوتا ہے! بارہا ایسا ہوا کہ مخاطب مولانا کا سارا استدلال سن کر اپنے موقف سے نہیں ٹلا۔ اسی پر قائم رہا۔ یا مولانا کے مقابلے میں کسی دوسرے عالم یا لیڈر کی رائے کو ترجیح دیتا رہا تو ایسے موقعوں پر مودودی صاحب ہمیشہ ٹھنڈے انداز سے یہ کہا کرتے ہیں کہ "آپ چاہیں تو وہ رائے رکھ سکتے ہیں!" —— اس فقرے نے بارہا مناظرہ پسند لوگوں کی اسکیموں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ مولینا مودودی کو مناظرانہ انداز کی گفتگو سے شدید درجے کی نفرت ہے۔ وہ ایسی گفتگو کو اوّل تو اپنے خاص حکیمانہ اسلوب سے افہام و تفہیم کے میتھڈ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی طرح کامیابی نہ ہو تو پھر "قَالُوْا سَلٰمًا" کی قرآنی ہدایت کے مطابق "حسنِ فرار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

معقول استدلال کو جب کوئی شخص محض حمق اور نامعقولیت یا عدمِ ضد کی وجہ سے رد کر رہا ہو، اور اندازہ ہو جائے کہ بار بار ایک ہی دلائل دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں مودودی صاحب بالعموم صاف صاف اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ "میرے پاس جو دلائل تھے وہ میں نے بیان کر دیئے۔ اگر آپ ان سے مطمئن نہ ہوں تو اپنی رائے پر قائم رہیئے۔ اور کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے" —— کم لوگ اس طرح اعترافِ شکست کر

سکتے ہیں۔

ہر لیڈر اور عالم اور بڑے آدمی کو خبطیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خبطیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے خیالات اور جذبات میں توازن نہیں ہوتا اور جن کو اپنے ذہن سے خود آگاہی نہیں ہوتی۔ نہ ان کو اپنے عالم افکار پر کوئی قابو حاصل ہوتا ہے۔

اس طرح کے غیر منظم ذہن کے لوگ طرح طرح کے مسائل، قسم قسم کی کہانیاں، رنگ رنگ کی بھارتیں لے کے مولانا مودودی کو بھی شرف ملاقات سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ نوع انسانی کی اس صنف سے اگر آپ بحث کرنے لگیں یا ان کے خیالات کو منظم کرنے کی کوشش کے درپے ہو جائیں یا ان کو آپ ان کے عدم توازن سے آگاہ کرنے کی کاوش میں لگ جائیں تو پھر ان کی طبع اور زیادہ رواں ہوتی ہے۔ پھر ان سے گھنٹوں اور ہفتوں گفتگو کرتے رہیئے، بلکہ برسوں دماغ لڑاتے رہیئے، یہ اسی حالت پر رہیں کے بس پہ بھتے۔ مودودی صاحب ایسے آدمی کو دو چار باتوں سے پہچان جاتے ہیں اور بڑے بھاری ایثار سے کام لیتے ہیں۔ یعنی اُسے کھلا موقع دیتے ہیں کہ وہ بولتا چلا جائے اور خود چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں کرتے، کسی چیز کی تردید نہیں کرتے۔ کسی بات پر لقمہ نہیں دیتے۔ بلکہ سراسر "تختۂ مشق" بن کر رہ جاتے ہیں۔ بچارا خبطی کتنا بڑا خبطی کیوں نہ ہو، مقابل سے کسی ردِ سخن کے بغیر گھنٹہ دو گھنٹہ مسلسل بولنے کے بعد آخر ہمت ہار دیتا ہے۔ چنانچہ ان تجربات سے مولانا مودودی کو ہم نے خود گزرتے دیکھا ہے اور جبھی یہ اندازہ کر لیا تھا کہ جو شخص اس شہادت گاہِ نفس سے یوں گزر سکتا ہے اسے جیل اور پھانسی لغزش نہیں دلا سکتے۔

ہم تو اتنی مدت سے مولانا مودودی کے ساتھ ہیں دو باتوں کی شہادت ہم بڑے وثوق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کو ہم نے ایک لمحے کے لئے بھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا، اور نہ آپ کو کبھی غضب آلود الفاظ میں بات کرتے سنا ہے۔ حد یہ کہ جن گوناگوں مخالفتوں اور الزامات اور گالیوں اور دوسری زیادتیوں کا مولانا کو لمحہ لمحہ سامنا کرنا پڑا ہے ان کے ردِ عمل کے طور پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا کی زبان کا معیارِ پاکیزگی و سنجیدگی اپنی مقررہ حد سے نیچے گرا ہو۔ بے شمار گھٹیا الفاظ ہیں جن کو ادیب اور صحافی گفتگو ہی میں نہیں، اخباری کالموں میں ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مولینا مودودی کے چمنستانِ تکلم میں ان کانٹوں کی کوئی جگہ نہ ہوئی۔ اَن گنت اسالیب ہیں جو ادنیٰ قسم کی جذباتیت نے اپنے اظہار کیلئے وضع کر لئے ہیں اور ہمارے معززین اور شرفا دن رات ان کو استعمال میں لاتے ہیں لیکن مولانا مودودی کے جہانِ ذوق میں ان کی سمائی قطعاً نہیں! مولانا کے حسنِ ذوق کا شعور رکھنے والے کسی آدمی کے سامنے آپ کوئی لفظ بول کے دریافت کریں تو وہ آپ کو بتا سکے گا کہ مولینا یہ لفظ بول سکتے ہیں یا نہیں!

ایک شخص جس کی مادری زبان دلّی کے شریف گھرانوں کی خاص بولی ہو، پھر اس بولی کو حیدرآباد کی علمی فضا نے سیراب کیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کے آدابِ اخلاق نے ایک خاص مزاج دیا ہو، اس سے آپ کو کس انداز گفتگو کی توقع کرنی چاہیئے؟ ——— حلقۂ یاراں ہو یا مجلس بیگانگاں، سوشل زندگی کے وسیع تر دائرے ہوں۔ یا گھر کی چاردیواری کے اندر کا حلقہ، بیوی بچوں سے ربط ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولانا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے معین معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی!

مولانا کے اندازِ گفتگو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑے جماؤ کے ساتھ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ بقول ملک غلام علی صاحب (مولانا کے خاص معاونِ کار) اگر کوئی شخص چاہے تو پوری گفتگو معمولی رسم الخط میں قلمبند کر سکتا ہے۔ یہ اندازِ گفتگو وہی شخص لے کے چل سکتا ہے جو غصے، تندی، جلد بازی اور ذہنی اضطرابات سے مغلوب نہ ہو۔ مولانا مودودی جیسی شخصیت کا ایک مستقل ابتلا یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے لوگ آ آ کر ذریعۂ امتحان بنتے ہیں۔ خبطی، ذہنی الجھنوں کے مریض، خود پسند، تیز زبان، مناظرہ باز، بحثیلے، متعصب غرضیکہ قسم قسم کی مخلوق ایسے لوگوں کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ ایسے لوگ بات کر کے مخاطب کا ذہنی سکون درہم برہم کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں انضباط کو قائم رکھنا معمولی آدمیوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا مودودی ایسے لوگوں کی گفتگوؤں کے ریلوں کے درمیان سنجیدگی و وقار کی چٹان بنے اپنے مزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ غالباً اس سلسلے کے چند خاص کڑے "امتحانات" میں سے ایک وہ تھا جب ایک قادیانی پارٹی مولانا پر تبلیغ کرنے "دارالاسلام" پہنچی تھی۔ اس "امتحان صبر و وقار" کے موقع پر میں بھی شریک مجلس تھا۔ مگر چونکہ یہ روداد پہلے سے ملک غلام علی صاحب بیان کر چکے ہیں اس لئے انہی سے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک مجلس میں مولانا اور ہمارے سامنے ان لوگوں نے اپنے فنِ مناظرہ اور علمِ کلام کے خوب خوب کرتب دکھائے۔ کئی گھنٹے تک اُلٹے سیدھے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمیں کوفت بھی ہوتی تھی اور غصّہ بھی آتا تھا۔ کبھی ہمارا جی یہ چاہتا تھا کہ ان سے رخصت اور معافی طلب کی جائے اور کبھی ہم اس پر آمادہ ہوتے تھے کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیئے جائیں۔ مگر مولانا تحمل سے ان کی باتیں سنتے رہے، نرمی سے جواب بھی دیتے رہے اور حق کو ان پر واضح کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ آخر کار جب مولانا نے دیکھا کہ ہمارا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو قادیانی حضرات سے دھیمے لب و لہجہ میں کہنے لگے کہ "میں نے اپنے ساتھیوں کو بڑی محنت سے کافی مدت تک ضبط اور برداشت کی مشق کرائی ہے۔ خطرہ ہے کہ آپ لوگ میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر کر نہ جائیں۔" اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کام کر گئی یا مبلغین اتمامِ حجت کرتے کرتے تھک گئے۔ بہرحال اس کے بعد وہ تشریف لے گئے۔" ("مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

جو لوگ مولانا کو دور ہی سے دیکھتے ہیں اور بے تکلفی کے دروازے کے باہر ہی باہر سے جھانکتے ہیں ان کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مولانا گفتگو اور ملاقات میں "بے پناہ" قسم کی گرمجوشی نہیں دکھاتے۔ کوئی نیا آدمی ملنے آئیگا تو وہ خوبصورتی سے سلام کا جواب دیں گے۔ ہاتھ کی تھوڑی سی مہذبانہ جنبش اور بالائی حصۂ جسم کے بالکل خفیف سے جھکاؤ کے ساتھ ہلکا سا مصافحہ کریں گے۔ نو وارد عام مجلس میں آکر بیٹھے تو تھوڑی دیر کیلئے سکوت اختیار کرلیں گے تاکہ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہو تو اُسے موقع ملے۔ ورنہ جو سلسلہ چل رہا تھا وہی از سرِ نو شروع ہو جائیگا۔ ملاقاتی علیحدگی میں خاص طور سے ملے تو دریافتِ مدّعا کیلئے سادہ انداز میں کہیں گے: "فرمائیے!" یا پھر یہ سوال کریں گے کہ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" مولانا نے بطورِ خود کبھی معانقہ نہیں کیا، البتہ ہمارے پٹھان رفقا اس معاملہ میں کبھی کبھی پیش دستی کرلیتے ہیں۔ ہاں، یاد آیا ——— جیل کے زمانے میں تنہائی اور رفقا سے علیحدگی کے ردّعمل کی وجہ سے مولانا معانقے کرنے لگے تھے۔ بعض لوگ مولانا کے طرزِ عمل کے اس ظاہری پہلو کو سرد مہری سمجھتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے پاکستان کے اندر پٹھان اور پاکستان کے باہر اہلِ عرب اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ مولانا کے مزاج کا ایک مجبورانہ جماؤ ہے جو علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس مزاج کی سطح کے نیچے ایک حد درجہ ملنسار آدمی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دارالاسلام سے لیکر اب تک مولانا کا یہ حال ہے کہ وہ رفقا اور ملاقاتیوں سے ملے بغیر اور عصرانہ مجلس میں کچھ وقت بیٹھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے ——— چاہے کیسے ہی سخت ضروری کام اور اہم معاملات درپیش ہوں۔ وہ "آدم گریز" اور "خانہ نشین" اور "اپنے آپ سے کام رکھنے والے" آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ ملنے والوں سے وہ ملتے ہیں اور بات کرنے والوں سے وہ خوب باتیں کرتے ہیں، مگر خواہ مخواہ کی زبان چلانے اور گپ لڑانے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ پروفیسر ہرمن آفانی کے فلسفے کی رُو سے ایسا آدمی عوامی نہیں ہو سکتا ———

طبائع اپنے جوہرِ سیرت کے لحاظ سے اپنا ایک مستقل رنگ رکھتی ہیں۔ کسی میں حزن و یاس، کسی میں اضطراب، کسی میں غضب و تنفر، کسی میں شوخی و شرارت اور کسی میں مسخرہ پن کا بنیادی رنگ نمایاں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا رنگِ طبیعت وقار کیساتھ شگفتگی کے امتزاج سے بنتا ہے۔ سنجیدہ شخصیتیں جو علمی تحقیقی اور فنی کاوشوں میں منہمک رہتی ہیں، بالعموم شگفتگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور نری سنجیدگی آخر کار خشونت بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف شگفتگی کا جوہر جن اشخاص میں اپنی حدود پھاند جاتا ہے وہ وقار کا رنگ کھو بیٹھتی ہیں۔ مودودی کی شخصیت دونوں جوہر صحیح تناسب کے ساتھ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس لئے حُسنِ اعتدال ضائع نہیں ہوتا۔

مولانا مودودی پر مختلف ادوار گزرے اور گوناگوں احوال سے سابقہ پڑتا رہا، لیکن تفریح اور بے تکلفی کے خاص الخاص لمحات میں بھی دامنِ وقار ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اسی طرح جب میں پچھلی تاریخ کو دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جو ایک پیکرِ خاکی کے لئے پوری طرح غارت گر سکون ہونے چاہئیں تھے اور ان کا اثر لازماً مودودی کے دل و دماغ پر رہا ہوگا ——— بلکہ کبھی کبھی تو ہم قریبی ساتھیوں کو ان پر رحم بھی آتا ——— لیکن نمازوں میں، دفتر میں، اجتماعی کھانوں میں، مجالسِ گفتگو میں اور سیر کے اوقات میں جب بھی سامنا ہوا تو ہمیشہ ایک ایسا چہرہ سامنے آیا جس پر گویا ایک غیر مرئی تبسّم کی افشاں چھڑکی ہوئی ہو۔ مضمون نگارانہ اور مصنّفانہ کاوش کے لمحات ہوں، جماعتی و تحریکی مسائل کی پیچیدگیوں کا دور ہو، مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کی نادانیوں سے

سابقہ ہو، کسی بھی حال میں اس چہرے کی شگفتگی کا رنگ نہیں مرجھایا۔ یہ شگفتگی گفتگو میں ہلکے ہلکے مزاح کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ بے جا نہ ہوگا کہ اس موقع پر چند مثالیں بیان کر دوں، جن سے مولانا کے مخصوص اسلوب مزاح کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک مذہبی طرز کے بزرگ اپنے اخبار میں کئی برس سے مولانا مودودی پر خدا واسطے کی عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے کسی مجلس میں مودودی صاحب سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ لکھتے تو مناسب ہوتا۔ "میں ان سے بالکل مایوس ہوں" مودودی صاحب دھیمے انداز میں کہنے لگے "میں نے ان کی شخصیت کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ اس میں جزم کہیں نہیں ہے، بس زیر و زبر ہی زیر و زبر ہے۔"

مرکز کی گاڑی کی چھت پر سامان رکھنے کیلئے ایک مربع شکل کا جنگلہ لگوایا گیا ہے۔ یاد نہیں کب کی بات ہے، ہم مولانا کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں لاہور کی کسی سڑک پر کھڑے تھے، دور سے اسی رنگ اور ماڈل کی کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ کسی نے کہا کہ لیجئے گاڑی آگئی۔ مولانا نے ایک نگاہ ڈالی اور کہا نہیں ——— اس کے سر پر وہ ملکہ وکٹوریہ کا سا تاج نہیں ہے۔

قیوم خانی دور میں پشاور جانے کے لئے مولانا مودودی گاڑی کے انتظار میں ہم کو ساتھ لئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ اور جماعتی اور سیاسی امور پر بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب میری توجہ کی زد میں آگئے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلتے اور پھر جب ہم ایک سرے پر پہنچ کر مڑتے تو وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ گفتگو میں احتیاط کی ضرورت واضح تھی، مگر مولانا ساتھ لگے ہوئے سائے سے بے خبر تھے۔ میں نے توجہ دلانے کی مختلف تدبیریں سوچیں، مگر بالآخر "ڈائرکٹ میتھڈ" ہی اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی میں کہا: "There is a fifth person behind us" (واضح رہے کہ ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا۔) مولانا نے برجستہ کہا: "نہیں۔ کہنا چاہیئے۔ "a fifth-Columnist"۔

ماہر القادری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ایسا ہی ایک مزاح آمیز نکتۂ لطیف درج کیا ہے۔ جس زمانے میں علمائے کرام دستوری رپورٹ پر مشورت کر رہے تھے، ایک صاحب نے پوچھا: "مولانا علماء کی مجلس مشاورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا: "صبغۃ اللہ[1]!"

(ماخوذ از "مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

۱۹۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ میں بھی تھا۔ ایک مقام پہ کار کسی ضرورت سے روکی گئی۔ چودھری محمد اکبر صاحب فطرت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر لوٹے تو مولانا نے پوچھا: "کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا: "نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا۔" مولانا نے فوراً کہا: "اچھا تو یوں کہیئے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے"۔ (ماخوذ از "مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے، پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دفعہ کہیں سے گاڑی پر آ رہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا: "دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ہی نہ ہو جائے[2]" (حوالہ: ایضاً)

ایک لطیفہ ——— جو ہے تو پرائیویٹ قسم کا، لیکن شاہکار درجے کا ہے، اسے راز نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک موقعہ پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقرخاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "افسوس ہے کہ ہم باقرخانی کا انتظام نہ کر سکے"! ——— خوب قہقہہ ہوا۔ (حوالہ ایضاً)۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس لطیفہ کی موجد اوّل بیگم ملک نذیر مرحومہ تھیں۔ ایک بار انہوں نے باقرخاں صاحب سے پوچھا تھا کہ "آپ کی باقرخانی کا کیا حال ہے؟"

زمانۂ جیل کے لطائف میں سے ایک اور شاہکار عرض ہے جو حسن تمثیل و تشبیہہ کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا اختر علی خاں اپنی رہائی کے لئے بر سر لحجہ

---

[1] مسلم سوسائٹی کے مزاج کے بارے میں آیتِ قرآنی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً! (ترجمہ: "یہ اللہ کا رنگ ہے! ——— اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟")

[2] آیت ہے: وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔

بے چینی سے منتظر تھے اور کبھی کبھی مولانا سے ملتے تو اپنا درد دل بیان کرتے اور ان کی گفتگو سے کچھ سرمایۂ تسکین حاصل کرتے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ اب مولینا مودودی کی اسارت کا تسلسل مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے اصحاب کی رہائی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسی حقیقت کو مودودی صاحب نے ایک لطیفہ میں سمو کر کہا: "بات یہ ہے کہ گلی میں ایک ٹرک پھنس گیا ہے اور اس کے پیچھے کاریں، بیل گاڑیاں، تانگے سبھی رکتے جاتے ہیں اور پورا ٹریفک جام ہو گیا ہے۔ ٹرک نکلے تو ٹریفک رواں ہو۔"

لطائف تمثیل و تشبیہ کے سلسلے میں دو تین چیزیں اور قابل ذکر ہیں

اضطرابات پنجاب ۵۳ء کی تحقیقاتی عدالت میں ایک تحریری بیان میں مولینا نے اپنی پوزیشن کو حکومت کی زیادتی کے بالمقابل واضح کرنے کیلئے امر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ "اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جا کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں موٹر لے جا کر اس کو ٹکر ادے۔" ایک فقرے میں پوری تصویر آجاتی ہے۔

مولانا کو پتھری کی تکلیف ہے۔ کسی نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگے: "ایک بار آپریشن کرا چکا ہوں مگر کیا کروں کہ میرے جسم میں پتھر بنانے کی مستقل فیکٹری کام کر رہی ہے۔"

اضطرابات پنجاب ہی کے سلسلے میں مولانا نے ۶ مارچ کو جو اخباری بیان دیا تھا اسمیں ایک جملہ تھا کہ "کیا اس حکومت میں اب ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہا جو ایک تھانیدار کی سطح سے بلند سطح پر سوچ سکے" ——— چار لفظوں میں شہری حقوق کی پامالی، جمہوری اصولوں سے بے نیازی، دھونس اور قوت کے بیجا استعمال اور سیاسی سوجھ بوجھ اور حاکمانہ صبر و تحمل سے بالاتر ہو کر اندھا دھند اقدامات کرتے چلے جانے کی پوری تاریخ بیان ہو گئی جو پاکستان بننے کے بعد سے نشو و نما پا رہی تھی۔ ایک لفظ "تھانیدار" کے لطیف تمثیلی استعمال کو دیکھیے!

"جماعت کی تاریخ اور لائحہ عمل" میں ایک مقام پر یہ واضح کرتے ہوئے کہ ہماری اصل کشمکش اشتراکیت، مغربی الحاد اور فسق و اباحیت کے خلاف ہے، جماعت کے خلاف مہم چلانے والے مولوی حضرات کے بارے میں لکھا ہے کہ "علمائے کرام خواہ مخواہ بیچ میں آکھڑے ہوتے ہیں، یا کر دیا بنا کر لا کھڑے کئے گئے ہیں۔"

ایک خاص عنصر کے اندر مولانا مودودی دستوری مہم کے سلسلے میں کام کرنے کا نقشہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے تیار کر رہے تھے۔ رفقا نے خطرناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا: "سانپوں سے کھیلنے جا رہا ہوں! ——— ہاتھ ٹھیک پڑ گیا تو کامیابی! نہ پڑا تو ڈسے جانے کا خطرہ واضح ہے۔"

ماہر القادری صاحب کا بیان کردہ ایک لطیفہ اور ہے، جی چاہتا ہے کہ اُسے بھی لے لیا جائے: "مولانا نے اپنے صاحبزادے (غالباً فاروق: م[1]) کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے مولانا کے صاحبزادے ان سے مشینوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر نکالتے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔ مسکرا کر بولے: باپ مولوی، بیٹا لوہار!" ("مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

سود حصہ دوم میں اشتراکیت پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے اس کی "آہنی ڈکٹیٹر شپ" کے بارے میں دو تین صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں مذکور ہے کہ "جب کوئی کارکن اپنے گھر پر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔۔۔ ۔۔۔ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آجاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ اس کا فرض ہے کہ اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے۔" (صفحہ ۲۴۶[2]) ——— "لینن کو پیارا ہوا" اور "کامریڈنی" کی لطافت اس موقع پر ہر صاحب ذوق کو محسوس ہوگی۔

ہاں، وہ بھی تو ایک دلچسپ چیز تھی۔ "دارالاسلام" کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ سرنا اسٹیشن سے اسے دو فرلانگ دور لے جانا تھا۔ بالمعاونہ حمالی کا کوئی قابل حصول انتظام تھا نہیں، اس لئے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں میزیں

---

[1] مولانا کے صاحبزادوں کے ناموں میں "فاروق" تو بطور ردیف آتا ہے، یعنی احمد فاروق، عمر فاروق، خالد فاروق وعلیٰ ہذا۔

[2] پہلے یہ باتیں سرمایہ داروں کا مخالفانہ پراپیگنڈہ قرار دے کر مسترد کر دی جاتی تھیں۔ لیکن اب خود خروشچیف اور بلگانن کے بیانات نے ان کی صداقت ثابت کر دی ہے۔

اور دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جاسکتی تھیں، البتہ ایک بڑی الماری کا بوجھ "اجتماعی مہم" چاہتا تھا۔ سو اسے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے ہوئے لے چلے جن میں خود مولینا مودودی بھی شامل تھے۔ وہ کبھی ادھر سے سنبھالتے، کبھی ادھر سے سہارا دیتے۔ اس موقع پر خوب کہا کہ "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔"

بے شمار یاد رہ جانے والے اور بھول جانے والے لطائف و نکات میں سے یہ چند چیزیں ہی اس وقت عرض کی جاسکیں۔ ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مودودی کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی میں شگفتگی کا کیا مقام ہے۔ اور اس کی اصلی تصویر ان ڈراؤنی تصویروں کے مقابلے میں کیسی ہے جن کو دور ہی دور بیٹھ کر بعض مصوروں نے مرتب کیا ہے۔ ان ڈراؤنی تصویروں کے ذریعے جن لوگوں نے مودودی کو دیکھا ہے ان کی نظر میں ایک ایسا کٹھ ملّا اور ایک ایسا مجسمۂ خشونت بسا ہوا ہے کہ بسا اوقات وہ اسی وجہ سے ڈرپوک بچوں کی طرح راتوں کو چونک چونک اُٹھتے ہیں۔

ایک صاحبِ دعوت کی، کم سے کم اس دور میں، یہ بہت بڑی کمزوری ہوگی کہ وہ قلم سے جہاد نہ کرسکتا ہو اور کاغذ کے میدان میں تگ و تاز نہ دکھا سکے۔ وہ لیڈری جو محض زبان کے چٹخارے پر چل جاتی تھی، اس کا دور کبھی کا گزر چکا۔ ایسے بہت سے اہلِ زبان آج دانتوں میں زبان دابے دور دراز گوشوں میں پڑے ہیں۔ یہ لوگ کاغذ کے میدان میں ہر گئے۔ کیونکہ رہوار قلم جس ٹھوس فکر کی غذا کے بل پر ترکتازیاں دکھا سکتا تھا وہ فراہم نہ تھی۔ تقریر کی لیڈری آسان ہے، تحریر کی لیڈری مشکل ہے۔ مولانا مودودی جس دعوت کو لے کے اُٹھے ہیں وہ زبان و قلم دونوں کو استعمال کئے بغیر اپنا راستہ نہیں نکال سکتی۔ خدا کی عطا ہے کہ مودودی کو اس نے قلم کی طاقت سے بہرۂ وافر عطا کیا۔

قلم سے آدمی جو کچھ لکھتا ہے، اس کے معانی و مطالب سے قطعِ نظر، محض لکھنے کا ظاہری اسٹائل اور اس کا رسم الخط بول کر کہہ دیتا ہے کہ لکھنے والا کیا ہے، کیا نہیں ہے۔ آدمی کی ہر تحریر میں، خواہ وہ ایک سطر بھر کی کیوں نہ ہو اس کا اپنا ہاتھ اور اس کا اپنا قلم اس کی شخصیت کے احوالِ پنہاں کاغذ پر نقش کرتا چلا جاتا ہے۔ ہماری تحریریں گویا ہماری خود نوشت سوانح عمریاں ہیں ——— معنویت کے اعتبار سے بھی اور ظاہری انداز کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ نفسیاتی مطالعہ و تجزیہ کا فن اب یہاں تک ترقی کر چکا ہے کہ ماہرین ایک آدمی کے اپنے لکھے ہوئے نام، پتے یا دو چار سطروں کے مشاہدہ سے اس کے احوال و اطوار کے تمام ضروری پہلو سامنے لاسکتے ہیں اور اچھے اندازے بالعموم اسی بچاسی فیصد صحیح نکلتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کی تحریر کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا پیشِ نظر ہے۔ یعنی ہم ان کی تحریر کی ادبیت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نہیں، بلکہ اس کے ظواہر پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

مولانا مودودی کے لکھنے کا ہمیشہ ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ ان کا لکھنے کا کمرہ ——— جو دفتر بھی کہلاتا ہے ——— دوہری دیواروں پر مشتمل ہوتا ہے اینٹ گارے کی دیواروں کی اندرونی جانب ایک چار دیواری الماریوں کی ہوتی ہے۔ جن میں دینی اور مغربی علوم کی کتابیں مولینا مودودی کی جائے نشست کے چاروں طرف صف بستہ حاضر رہتی ہیں۔ ایک طرف اگر مسند اور سنن کی قطار ہے تو دوسری انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی رجمنٹ کھڑی ہے۔ اس ہاتھ بخاری اور اس کی شروح ہیں تو اس ہاتھ دستوریات اور قانونیات پر انگریزی کتابیں ہیں۔ ادھر اگر اسلامی تاریخ پر بیش بہا قدیم عربی لٹریچر ہے تو ادھر یورپ کی سیاسی، مذہبی اور فکری تاریخ سے متعلق انگریزی زبان میں جدید لٹریچر آراستہ ہے۔ اس الماری میں قرآن کی بھاری بھرکم تفاسیر ہیں تو اس الماری میں بائبل سے متعلق سیرٹل وزنی مجلدات موجود ہیں۔ کہیں فقہ اسلامی کی مستند کتابیں سجی ہیں تو کسی دوسری جگہ انگریزی دور کے محمڈن لاء پر چیدہ چیدہ تصانیف موجود ہیں ——— وہاں ابن خلدون جلوہ فرما ہیں تو یہاں افلاطون۔ وہ ابن تیمیہ ہیں تو یہ کارل مارکس۔

لکڑی کے فریم میں مرتب کی ہوئی کتابوں کی اینٹوں سے جو چار دیواری بنتی ہے اس کے درمیان ایک جہازی میز پھیلی ہوئی ہے۔ اس جہازی میز پر بائیں جانب کاغذات، رجسٹر کا مجموعہ ساتھ ہی دفتر کا ریک پڑا ہے اور کس کے ساتھ چند کتابیں قطار میں کھڑی ہیں۔ دائیں جانب نئی آئی ہوئی کتابیں، مسودے، پیڈ، خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ سامنے ایک میز پوش گتہ بچھا ہوتا ہے اور اس پر لکڑی کا زیرِ مشق تختہ نوشت کے ساتھ سامنے وسط میں رکھا ہے۔ اس تختۂ نوشت کے

ساتھ لگے ہوئے "کلپ" نے کاغذ کے تہ بہ تہ تختے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں پکڑ رکھے ہیں۔ اس سے آگے نکل پالش کیا ہوا قلمدان، دو پیپر ویٹ، ایک کاغذ جاذب لگانے کا پیڈ، ایک پن گیر، ایک خاکستر دان، ایک گھنٹی ——— مکمل سیٹ ——— ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ دو تین شیشے کے پیپر ویٹ بھی کاغذات پر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ہمیشہ ترتیب میں رکھا پائیں گے اور ان میں سے ہر چیز کی ایک جگہ ہمیشہ متعین رہے گی۔ ملاقاتی اور رفقاء اگر اس ترتیب کو بدل دیتے ہیں تو ان کے جانے کے بعد مولانا کا ہاتھ سب سے پہلے ان کو ان کی اپنی صحیح جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کسی چیز کا بے ڈھنگے پن سے رکھا ہونا مولانا مودودی کے ذہن پر فوری اثر ڈالتا ہے۔ کمرے یا برآمدے میں کوئی کرسی ٹیڑھی رکھی ہو، نماز کیلئے بچھنے والی چٹائیاں غیر متوازی ہوں، میز پر کے کاغذات ترچھے رکھے ہوں وہ نگاہ پڑتے ہی اپنے ہاتھ سے پہلے اسے ٹھیک کر لیں گے۔ دو ایک موقعوں پر کرسیوں یا چٹائیوں کے ترچھے ہونے پر مزاحاً فرمایا: "اس سے بچھانے والے کے ذہن کا ٹیڑھا ہونا واضح ہوتا ہے"۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر مطالعۂ شخصیت کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے میں داخل ہو اور اُسے کمرے کا ماحول صرف پانچ منٹ دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مودودی صاحب کی آدھی سیرت تو ضرور صحیح صحیح لکھ دیگا۔ اس پرسکون مگر خیال انگیز ماحول میں مودودی صاحب سوچتے اور لکھتے ہیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے وقت مقررہ پر آکر کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوا ساتھ ہوگا۔ پان کھائیں گے اور دماغ میں فکر و کاوش کا پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا۔ بالعموم ان کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ اس وقت وہ کسی مضمون یا کسی مسئلے پر کاوش میں ہیں۔ جب پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکے گا تو وہ قلم اٹھائیں گے، ورنہ یونہی علی الحساب انہوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا ——— بلکہ پہلے سے سوچے بغیر کوئی بھی کام وہ نہیں کرتے۔ کیا عجب کہ وہ سونے اور کھانے کیلئے بھی پہلے سے سوچتے ہوں۔ پورا مواد اکٹھا کر لینے، حوالے جمع کر لینے اور سلسلۂ بحث کی کڑیاں دل ہی دل میں جوڑ لینے کے بعد وہ قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ یوں سمجھئے خط ہو یا مضمون یا کچھ اور ——— پہلے وہ اسے اپنے دماغ کے اوراق پر لکھتے ہیں اور پھر ان اوراق کو دیکھ دیکھ کر کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے میں بڑی روانی رہتی ہے اور زیادہ قطع و برید نہیں ہوتی۔

مولانا کا قلم بڑا کاغذ خور واقع ہوا ہے۔ ذوقِ نفاست کی وجہ سے وہ ہمیشہ اچھے چکنے اور دبیز کاغذ کو پسند کرتے رہے ہیں اور کئی کئی رِم یک وقت خرید لیتے رہے ہیں۔ مگر اب کاغذ کی ——— اور خصوصاً اچھے کاغذ کی ——— نایابی کے سبب وہ بات نہیں رہی۔ تاہم اب بھی عمدہ سے عمدہ کاغذ موجود رہتا ہے۔ وہ فل سکیپ سائز کے پورے تختے پر لکھنے کے عادی ہیں۔ کاغذ کی پٹیوں اور چٹنیوں پر کبھی نہیں لکھتے۔

لکھنے سے پہلے وہ شکن ڈال کر داہنی طرف کھلا حاشیہ چھوڑتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت مولانا کے دو قلمی مسودے ہیں۔ ایک ۱۹۴۷ء کا (تقریر اجتماع شمالی ہند منعقدہ "دارالاسلام") دوسرا ماضی قریب کا (ترجمان القرآن کی ایک سابق اشاعت کے "اشارات") ۔ دونوں مسودوں کا حاشیہ اڑھائی انچ چھوڑا ہے۔ ہمیشہ تقریباً اتنا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ء والے مسودے کے ہر صفحے پر پوری انتالیس انتالیس سطریں ہیں، اور بعد کے مسودے میں سینتالیس سینتالیس ——— یہ منظم سطر بندی سفید کاغذ پر بغیر زیر سطر کے ذہن کی اقلیدسی مہارت اور اعصاب پر اس کے انضباط کی دلیل ہے۔ دونوں میں سے کسی مسودے کے اوراق کو دور ان کے پہلے پر چھپا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی تحریر کی مشینی نقلیں ہیں۔ قطع و برید بہت ہی کم ہے اور جو کچھ ہے بھی اس کا زائد از نصف حصہ ایسا ہے جو نظر ثانی کرتے ہوئے ضروری محسوس ہوا۔ پورے اوراق میں تمام کی تمام سطریں بالکل سیدھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بائیں جانب سے عبارت صفحے کے آخر تک جا کر انچ کے دسویں حصے کی حد تک نیچے کو جھکاؤ رکھتی ہے۔ ہر پیراگراف واضح طور پر الگ سے شروع ہوتا ہے۔ حروف کی اشکال بالکل یکساں ہیں۔ نقطے، شوشے، علامات، اوقاف اور واوین اپنی اپنی جگہ پر لازماً موجود ہیں۔ بلکہ الفاظ ضروری حرکات بھی اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں۔ حلقہ دار حروف (مثلاً ص، ط، ظ وغیرہ) کے حلقے اندر سے لازماً خالی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ جہاں کسی لفظ کو کاٹا گیا ہے یا کوئی جزو بعد میں بڑھایا گیا ہے وہاں ضرور ہی علامت اضافہ (٨) دی گئی ہے۔ لکھی سطروں کے با وجود بین السطور نمایاں ہیں۔

اس طرزِ تحریر کو دیکھتے ہی جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے والا بہت ہی متوازن مزاج آدمی ہے اور پورا پورا احساسِ ذمہ داری رکھنے والا۔

وہ دوسروں کے حقوق اور آرام کا لحاظ کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں ضبط و نظم اور باقاعدگی ہے۔ وہ جذباتی آدمی نہیں ہے بلکہ مزاج میں مفکرانہ ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ وہ مستقل مزاج، صاحبِ عزیمت اور تلوّن سے خالی ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم نتائج انسانی شخصیت و کردار کا ہر رازداں برآمد کر سکتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان نتائج کے حق میں پورا پورا استدلال کیا جا سکے جس کے پیشِ نظر شخصیت خود ان پر گواہ ہے۔ مجھے صحافت کے دائرے میں کام کرنے کی وجہ سے قسم قسم کے رسم الخط دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور نئے لوگوں کی طرف سے جو خطوط اور نگارشات موصول ہوتی ہیں ان کے پس پردہ کام کرنے والی شخصیت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات لفافے پر لکھا ہوا پتہ دیکھ کر ہی ابتدائی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ اونچی اور صاف ستھری شخصیتوں کے رسم الخط کے چند اہم نمونے میری نگاہ میں ہیں میری شہادت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے طرزِ تحریر کے ہم پایہ کوئی دوسرا نمونہ میرے تجربے میں نہیں آیا۔

تحریر ہی کے سلسلے میں آدمی کے خطوط کا طرزِ انشاء بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کے لکھے ہوئے خطوط دیکھنے کا خاص موقع مجھے حاصل رہا ہے ایک زمانے میں ترجمان القرآن اور مرکزِ جماعت کی ڈاک کا کام مولانا کی نگرانی میں میرے ذمے رہا ہے۔ اُن کی مستقل عادت یہ ہے کہ وہ ڈاک خود دیکھتے ہیں اور پوری توجہ سے دیکھتے ہیں اور مختلف شعبوں کے ناظمین کی رہنمائی کیلئے نشانات لگا کر مختصراً ہدایات لکھ دیتے ہیں۔ جن خطوط میں خود ان کو مخاطب کیا گیا ہو یا اسلام یا جماعت کے متعلق اصولی مسائل دریافت کئے گئے ہوں ان کے جواب وہ اپنے قلم سے لکھتے ہیں یا املا کراتے ہیں۔ وہ کم سے کم جوابی مضمون کا خلاصہ اور اس کی ترتیب زبانی بتلا دیتے ہیں۔

اپنے قلم سے لکھے ہوئے خطوط میں مولانا مودودی کی چند مستقل روایات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ وہی حاشیہ چھوڑنے اور پیرے بنانے اور علامات ڈالنے کی باقاعدگی اور سطروں کی سیدھائی اور تحریر کی صفائی خطوط میں اور بھی زیادہ اچھا معیار پیش کرتی ہے۔ ہر خط کی پیشانی پر تاریخ ضرور درج ہوتی ہے۔ بلا استثنیٰ تمام خطوط کا سرنامہ "محترمی و مکرمی! (خواتین کے لئے محترمہ و مکرمہ) السلام علیکم و رحمۃ اللہ" کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر جوابی خط کا آغاز عنایت نامہ ملا" سے ہوتا ہے۔ خاتمہ ہمیشہ "خاکسار ابوالاعلیٰ" کے لفظوں پر ہوتا ہے جو خط کے نچلے بائیں کونے میں اوپر تلے لکھے رہتے ہیں۔ خط کا پتہ ہمیشہ "بخدمت شریف جناب" کے مقررہ الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ تر تین سطروں میں مکمل ہوتا ہے۔ شہر یا مقام زیرِ خط کشیدہ ہوتا ہے۔ خط کے اس نقشے میں شاید برسوں سے کبھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ بے شمار خطوط کے سابق مطالعہ کے بل پر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی خط میں مصنوعی ادبیت اور غیر ضروری طور پر مزاح کا استعمال نہیں ہوتا اور نہ ضروری نفسِ مضمون پر غیر ضروری فقروں کا اضافہ کہیں محسوس ہوتا ہے۔ خطوط میں مضمون نگاری کے بجائے زیادہ تر گفتگو کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عامیانہ گفتگو کا نہیں عالمانہ گفتگو کا!

وہ لمبا عرصہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی، بالعموم بعدِ ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود املا کراتے ——— کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے۔ کبھی کبھی تو مودودی صاحب مجھ سے خطوط پڑھوا کر پہلے سنتے بھی، لیکن اکثر محض یادداشت کی بنا پر بالکل اسی ترتیب سے جوابات لکھوا دیتے جس ترتیب سے خطوں میں سوالات درج ہوتے تھے ——— اور کمال یہ کہ سوالات آیات اور احادیث اور فقہ کے مباحث سے بھی متعلق ہوتے۔ پھر وہ املا ایسی روانی سے کراتے کہ کسی موقع پر جملے کا تسلسل اور بحث کا ربط نہ ٹوٹتا۔ بیچ میں اگر اٹھ کر جانا پڑتا یا کوئی صاحب آ جاتے تو بعد میں آنا پر پوچھتے کہ آخری فقرہ کہاں تک پہنچا۔ بعض اوقات کچھ خطوط میں اپنی میز پر ہی بھول آتا، لیکن مولانا اچانک کسی خاص خط کے بارے میں دریافت کرتے اور مجھے اٹھ کر وہ لانا پڑتا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی آئی ہوئی ڈاک کے ایک ایک خط کا ان کو متعین طور پر خیال رہتا اور اس کا نفسِ مضمون مستحضر رہتا لیکن سارے خطوط املا ہی نہیں کرائے جاتے بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اور ان کو لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتے۔ اس احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا۔ یہ مولانا کا ایک مستقل طریقِ تربیت تھا۔

اکثر لوگ شرعی مسائل میں "استفتاء" بھیجا کرتے۔ ایسے ہر استفتاء کے جواب میں تمہیداً یا خاتمہ پر یہ ضرور لکھواتے کہ میں مفتی نہیں ہوں۔ فتویٰ نہیں دیا کرتا، صرف اپنی معلومات کے مطابق رائے عرض کرتا ہوں۔ فتویٰ مطلوب ہو تو کسی دارالافتاء کی طرف رجوع کیجئے۔ اور "رائے" مسئلے کی ٹیکنیکل صورت بتانے

کے بجائے اس کی اسپرٹ اور مقصدیت کو نمایاں کرتی۔ خاص بات میں نے یہ نوٹ کی کہ مولانا مودودی نے کبھی کسی سوال، اعتراض یا اختلاف کرنے والے کو نفرت اور تحقیر اور غیظ و غضب سے مخاطب نہیں کیا، بلکہ ایسی چیزوں کے آنے کو ہمیشہ کام کے حق میں مفید سمجھتے تھے، چاہے ان کے الفاظ اور انداز سخت بھی کیوں نہ ہوں۔ البتہ مناظرانہ اور شر پسندانہ ذہن کا انہوں نے کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے کہ مناظرہ بازیاں اور ٹیڑھے سوالات تلاشِ حق میں کبھی مدد نہیں دے سکتے۔ اختلافی معاملات میں بالعموم یہ لکھواتے کہ میرا مطالعہ یہ ہے، آپ کو یہ قرینِ حق معلوم ہو تو قبول کیجئے ورنہ جس کی رائے آپ کو صحیح معلوم ہو اسی کو اختیار کیجئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے متعلق خطوط کو بھی وہ خوش آمدید نہیں کہتے تھے۔ اور معلمانہ انداز سے لکھواتے کہ ان جھگڑوں کے بجائے دین کی اصل حقیقت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ فقہی اور فروعی اختلافات کے لئے باہم دگر توسع کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیئے۔ مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں کہ پوری خط و کتابت میں مولانا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق! —— بلکہ زجر و توبیخ کا مربیانہ انداز بھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے ایک طرف اس خطوط نویسی کے زمانے میں مولانا کی سیرت کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقع مفت میں ملا۔ ساتھ ساتھ میری فکری تربیت ہوتی گئی اور نظامِ اسلامی سے متعلق علمی کاوش کے دروازے مجھ پر کھلتے گئے۔ شائد میرے اسلوبِ نگارش پر بھی اس دور کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے۔

ہاں! —— ہر بڑے آدمی کی طرح مولانا مودودی کو خطوط میں بڑے بڑے قصیدے بھی موصول ہوتے اور کبھی کبھار زہریلی گالیاں بھی لکھی ہوئی آتیں۔ مگر نہ کوئی قصیدہ مودودی صاحب کے مزاج پر اثر انداز ہو سکا اور نہ گالیوں کا ردِ عمل بجز ایک بے نیازانہ تبسم کے کچھ اور میرے سامنے آیا۔ اس ڈاک کے سوا جو علمی مسائل یا جماعتی معاملات سے متعلق ہوتی، بقیہ خطوط کو محفوظ رکھنے کا اہتمام مودودی صاحب نے کبھی نہیں کیا، ورنہ انبار جمع ہو جاتے۔ اہم محفوظ شدہ خط و کتابت اب "رسائل و مسائل" نامی مجموعے کی صورت میں مطبوعہ ہے۔

ان اشارات سے میں خود نتائج اخذ کرنے کے بجائے یہ کام اس مقالے کے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔

ہر صاحبِ دعوت کو زبان کی طاقت کی ضرورت ہے۔ محض قلم کے بل پر علمی کام کئے جا سکتے ہیں مگر عوام کے قریب ہو کر ان کو سمیٹنے اور منظم کرنے اور کسی تحریک کو آگے لے چلنے کیلئے وہ آدمی موزوں نہیں ہو سکتا جو اسٹیج پر آکر گنگ ہو جائے۔ مولانا مودودی گنگ نہیں ہیں، خطیب ہیں۔

میں نے ان کا اولین خطاب دارالاسلام کی مسجد میں جمعہ کے موقع پر سنا۔ ان پڑھ دیہاتیوں کی کثیر تعداد کے اندر تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ پٹھانکوٹ اور سجان پور کے قصبوں اور قلعہ جمال پور کی مختصر سی آبادی سے آکر شامل تھے۔ مولانا نے ان دنوں اردو زبان میں خطباتِ جمعہ کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ (اور اب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے)۔ اذانِ ثانیہ پر وقار سے اٹھے، منبر کے (غالباً) پہلے زینے پر کھڑے ہوئے، آہستگی اور سادگی سے خطاب شروع کیا۔ —— ایسے جیسے لوگوں سے باتیں کر رہے ہوں۔ یہ مستقبل کا ایک بڑا مقرر تھا۔ سیدھے سادے کلمات کا تر اس خاموش فضا میں پوری طرح نمایاں تھا۔ بعد میں مودودی صاحب نے متعدد مواقع پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجے کے علمی خطبے دیئے۔ ارکانِ جماعت کے مختصر اجتماعات میں بار بار تقاریر کیں۔ سوالات کے جوابات دیئے اور ہدایات دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی خطابت آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بہت سے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب وہ اپنی نوعیت کے بہت ممتاز مقرر ہیں۔

انہوں نے اپنی دعوت کی نوعیت کے لحاظ سے خطابت کے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے اور پرانے خلافتی مکتبِ خطابت سے الگ ہو کر ایک نیا مکتبِ خطابت استوار کیا ہے۔ مولانا خطابت کو ایک اہم ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک ایک لفظ پہلے سے غور کرنے کے بعد زبان پہ لایا جائے۔ کیونکہ ہزارہا بندگانِ خدا پر اس کا اچھا یا برا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سلسلے میں آدمی کو آخرت کی عدالت میں جواب دہی کرنی ہے۔ بے ہنگم اور بے ربط اور موضوع سے آزاد ہو کر پہاڑی نالوں کی طرح جھاگ اٹھا اٹھا کر بہنے والی تقریر کو وہ تعلیم و تربیتِ عوام کے لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کا سوچا سمجھا ہوا نظریہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں سطحی جوشیلے پن کا مرض بڑھ گیا ہے۔ اور اس میں سنجیدہ اور تعمیری دعوت کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ نیز

خطابتی ساحروں نے اس کا مذاق حد درجہ بگاڑ دیا ہے۔ لہٰذا اب اسے جوشیلی اور بے ربط تقریروں کی مزید غذا دینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ مودودی کے مکتبِ خطابت میں ایسی تقریر کی کھپت نہیں ہے جس میں چٹکلے، لطیفے، کہانیاں، قوالی، مسخرہ پن، شورش انگیزی، شوریدہ سری، دریدہ دہنی اور فکری آوارہ گردی کے عناصر پائے جائیں۔ اس مکتبِ خطابت کی تقاریر سادہ، رواں، سنجیدہ، مدلل اور ٹھنڈی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کی رُوح معلمانہ ہوتی ہے۔ مودودی صاحب نے عمر میں کبھی کوئی ایسی بے سروپا تقریر نہیں کی جو ایک محدود اور معینہ وقت کی حد سے آگے بڑھی ہو اور ساری ساری رات ہوا میں طوفانی لہریں اُٹھاتے صبح کر دی ہو۔ پھر نہ نعروں کی بہار، نہ واہ واہ اور سبحان اللہ کا ہنگامہ، نہ زندہ باد ——— مردہ باد کا شور۔ کہنے کی بات کہی اور اسٹیج سے رخصت ہو گئے۔

تقریر کے اس مخصوص اسلوب کے تقاضے سے مودودی صاحب پہلے سے کئی کئی گھنٹے صرف کر کے تیاری کرتے ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں۔ مواد اکٹھا کرتے ہیں پھر سلپ لے کر ان پر تقریر کے مطالب کی کڑیاں مختصر اشارات کی شکل میں درج کر لیتے ہیں۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو تقریر کے پورے "موڈ" میں آ جاتے ہیں۔ تقریر کرنے سے پہلے کے تھوڑے سے وقفے میں ان کے چہرے پر ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے جس کو قریب سے جاننے والے ساتھی ہی پہچان سکتے ہیں۔ اپنے انہی اشارات کے ذریعے وہ اپنی پوری تقریر بعد میں کسی کو بٹھا کر لفظ لفظ کی ترتیب سے املا کرا دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی تقریر مختلف مقامات پر کرنی پڑی تو بالعموم ہر جگہ لفظ بلفظ دُہرائی گئی اور اس کی ترتیب میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔

اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے ان کا جو کچھ مخصوص انداز ہوتا ہے اس کے امتیازی خد و خال کو میں نے ایک خاص موقع پر تعین سے سمجھا۔ ہمارے ایک دوست کرداروں کا ڈرامائی چربہ اُتارنے میں ماہر ہیں۔ خصوصیت سے مقررین کا تو زندہ ریکارڈ بن کر حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مجبور کن اصرار پر ایک مرتبہ بڑی جھجک کے ساتھ مودودی صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سُنایا۔ اس ریکارڈ کو سننے کے بعد اب میں بآسانی بتا سکتا ہوں کہ مودودی صاحب کے امتیازات کیا ہیں۔ وہ اسٹیج پر زیادہ تر ڈائس کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور کاغذات سامنے رکھ لیتے ہیں۔ سینے تک کا بالائی حصہ کسی قدر آگے کی طرف جھکاؤ لئے ہوئے ہوتا ہے، ایک ہاتھ ——— غالباً بایاں ——— کمر کے پیچھے رہتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ شیروانی کے تیسرے یا چوتھے بٹن کو ذرا ذرا چھیڑتے رہتے ہیں۔ یہی ہاتھ کبھی کبھی بڑی آہستگی سے مختصر سی اشاراتی حرکت کرتا رہتا ہے۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ حرکت تیز یا سست ہوتی ہے۔ تقریر کی ابتدا دھیمی آواز اور انتہائی ٹھہراؤ سے ہوتی ہے اور الفاظ میں شخصیت کا وزن محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ آواز اور لہجہ چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں، مگر بس ایک متعین حد تک۔ اس حد سے آگے کوئی ایسا جملہ ہی جا سکتا ہے جس کے پیچھے شدتِ جذبات کام کر رہی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم وقفے کیلئے یہ رنگ آتا ہے۔ تقریر پھر اپنی مقررہ مقدار اعتدال پر آ جاتی ہے۔ موضوع کے راستے پر مودودی صاحب گویا بخطِ مستقیم چلتے ہیں اور ادھر اُدھر کی آوارہ گردی نہیں کرتے۔ تقریر میں دردمندی کی روح ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انہوں نے دستور اور جمہوریت اور انتخابات اور دوسرے اہم اور پیچیدہ مسائل پر جب کبھی خطاب کیا ہے، اپنی بات کو عام فہم بنا کے پیش کیا ہے اور ہر پیچیدگی کا حُسن و خوبی سے تجزیہ کر کے غیر تعلیم یافتہ سامعین تک کو متاثر کیا ہے۔ ان کا اندازِ تفہیم اپنی مثال آپ ہے۔

اس طرح کی "غیر رنگین" اور "بے تفریح" تقریر جس میں مجمع کو اس کی دل پسند ذہنی کوکین نہ کھلائی جاتی ہو، دو دو گھنٹے عوام کو بٹھا کر سنانا آسان نہیں۔ اس کے لئے مودودی صاحب نے جلسوں اور اجتماعات کی ایک نئی فضا برسوں کی محنت سے پیدا کی ہے۔ پہلے اپنے رفقا کو اور پھر ان کے ذریعے عوام الناس کو نظم و ضبط اور سنجیدگی اور خاموشی کی تربیت دی ہے۔ "کھیل تماشے" کا عنصر اجتماعات سے بالکل خارج کر دیا ہے خصوصاً پابندیٔ وقت کے معاملے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ گزشتہ کل پاکستان اجتماع کے موقع پر جلسہ عام بھی رکھا گیا تھا۔ لوگ آٹھ بجے سے جہانگیر پارک میں جمع ہو چکے تھے اور کچھ ابھی آ رہے تھے۔ سوا آٹھ بجے مودودی صاحب کی تقریر ہونی تھی۔ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے قریب کے دوسرے ساتھی سے پوچھا "وقت کیا ہوا ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "ابھی آٹھ بج کر سولہ منٹ نہیں ہوئے ورنہ مودودی صاحب کی تقریر شروع ہو چکی ہوتی۔"

بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی مخالف طاقت نے شرپسند عنصر کو تیار کر کے مودودی صاحب کی تقریر میں شرارت کرنے اور جلسہ خراب کرنے بھیجا۔ لیکن

جماعتِ اسلامی کے جلسوں کی سنجیدہ و منضبط فضا اور مودودی صاحب کی شخصیت اور ان کے اندازِ تقریر نے ہمیشہ ایسی فضول کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اِس سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ مولانا مودودی (بلکہ ان کے دوسرے رفقا بھی) اس طرح کے حالات میں کبھی بھی گھبراتے نہیں۔ بلکہ جرأت مندی اور اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے حوادث کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور خدا کا ان کو عملاً بھی کامیابی دیتا ہے۔

جلسوں میں جا کر وہ سوالات کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔ چنانچہ چٹوں پہ چٹیں آتی ہیں اور ڈھیر کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔ بڑی حوصلہ مندی سے مولانا مودودی ان چٹوں کو ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں۔ اور ایک فقرے میں حاضر دماغی سے ان کے ایسے پھڑکتے ہوئے جواب دیتے چلے جاتے ہیں کہ سامعین اثر لیتے ہیں۔ مثلاً گول باغ کی تقریر (۱۹۵۱ء) میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ "جب دوسری پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ صورت اختیار کر لی ہے تو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بنائی؟" مولانا نے فوراً جواب دیا کہ "افسوس ہے کہ مجھے ڈیڑھ ہی اینٹ مل سکی، ورنہ میں اس سے بڑی مسجد بناتا"۔

تقریر کے دوران میں (گردے کی تکلیف کی وجہ سے) وہ دو تین بار پانی پیتے ہیں۔ نعرے لگائے جانے کو دل سے پسند نہیں کرتے، بس گوارا کرتے ہیں۔ تقریر کرنے کے بعد چند لمحے ستانے کیلئے کرسی پر بیٹھتے ہیں، پھر جلد روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن لوگ آ آ کر مصافحے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفقا راستہ بناتے ہیں اور ان کو جلد از جلد بھیڑ سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے مولانا کی ریڈیائی تقریریں بھی سنی ہیں (جو اب مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں) عام رائے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی آواز ریڈیو کی ضروریات کے مطابق بہت ہی موزوں ہے۔ آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، اچھی طرح پہچانی جاتی ہے اور تلفظ کی پوری صراحت محسوس ہوتی ہے۔ ریڈیائی تقریروں میں بولنے کی رفتار اکثر اوقات تیز رہی ہے کیونکہ ۱۰ یا ۱۵ منٹ میں وہ موضوع سے متعلق اپنی پوری بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب تو مولانا مودودی پر ریڈیو کے دروازے بند ہیں، کیونکہ "سیاسی آدمی" ہونے کا قصور پاکستان میں ایسا قصور ہے جس کے بعد آدمی سے خالص علمی اور فکری اور دینی استفادہ کرنا بھی حلال نہیں رہتا۔

سالانہ اجتماع کی تقریر کا بنیادی نقشہ مطالب مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے بنتا ہے اور امیرِ جماعت ―――― خواہ وہ کوئی ہو ―――― اسی نقشے کی پابندی کرتا ہے۔ مولانا مودودی اتنی اونچی شخصیت رکھنے کے باوجود اس پابندی سے کوئی استثنیٰ نہیں رکھتے۔ یوں بھی کسی مہم کے سلسلے میں دورے اور خطابات ہوں تو ان کے لئے بھی مجلسِ شوریٰ ہی کے اندر باقاعدہ منصوبہ بنتا ہے اور تقریر کے اساسی خطوط معیّن ہو جاتے ہیں۔ البتہ فوری اور ہنگامی اور متفرق مواقع پر جبکہ جماعت کی پہلے سے بنی ہوئی پالیسی کے اندر کام کرنا ہوتا ہے مولانا مودودی (اور جو کوئی بھی امیر ہو) تازہ مشورہ کے بغیر خطاب کرتے ہیں۔ جماعت کا موسس اور داعیِ اوّل بھی، اپنی امتیازی شخصیت کے باوجود جماعت کے نظم کی پابندی سے بالاتر نہیں ہے۔

نماز کے بھی گوناگوں اسٹائل ہیں اور ہر اسٹائل شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ریاکار آدمی کی نماز اور خدا ترس کی نماز، بے سمجھے بوجھے کی نماز اور شعوری نماز، زندگی سے ہم آہنگی رکھنے والی نماز اور اس سے تضاد رکھنے والی نماز، جذباتی آدمی کی نماز اور مستقل مزاج شخص کی نماز، عادت کی نماز اور ارادے کی نماز، عامیانہ شخصیت کی نماز اور کسی ممتاز شخصیت کی نماز ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔

مودودی صاحب ہمیشہ پابندی سے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے ہیں، لیکن اب جب سے پتھری کی تکلیف اور نزلہ کے پے در پے حملوں نے عمر کے تیسرے مرحلے میں آ کر ان کے اعصاب کو حد درجہ کمزور کر دیا ہے، وہ بیشتر نمازیں مرکز کے لان میں رفقائے مرکز اور ملاقاتیوں سے مل کر ادا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی جمعہ کو ضرور محلے کی مسجد (مسجد رسول پورہ) میں جاتے ہیں۔ ہر قسم کے خطیبوں کے خطبے سنتے ہیں اور ہر سطح کے اماموں کی اقتدا کرتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے آج دوستوں دشمنوں کے حلقوں میں چرچے ہیں اور جس کے ساتھ حامیانہ اور مخالفانہ دلچسپیاں رکھنے والے ہزار ہا انسان بیرونِ پاکستان کے مختلف ممالک تک میں پھیلے ہوئے ہیں اُس کو آپ مسجد رسول پورہ کے کسی کونے میں ایک درویش بے نیاز کے انداز سے بیٹھا پائیں گے۔ اس کا سر جھکا ہوگا اور وہ خطبہ لفظ کرے

ساتھ بس رہا ہوگا۔ فرض نماز کے بعد دعا ہوتے ہی وہ اُٹھے گا اور ایک موجِ نسیم کی طرح غیر محسوس طور پر چلا جائیگا۔

"دارالاسلام" کی مسجد کی امامت زیادہ تر مودودی صاحب کرتے تھے اور اب بھی مرکز میں یا جماعت کے اجتماعات کے موقعوں پر وہی مصلے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وضو ہمیشہ گھر سے کر کے پہنچتے ہیں۔ سنتیں کبھی گھر سے پڑھ کر آتے ہیں اور کبھی مسجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ امامت کیلئے کھڑے ہوں تو سیدھے کھڑے ہوتے ہیں مگر مودبانہ جذبات قیام کے اسلوب میں صاف جھلکتے ہیں۔ نماز کیلئے استقبالِ قبلہ کرتے ہی ان کے اندر ایک خاص طرح کا احساسِ ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی ہے ——— نہ غیر معمولی طور پر طویل، نہ جلد بازانہ ! ——— سکون اور وقار ادائے ارکان میں شروع سے آخر تک جھلکتا ہے۔ قرأت کا انداز بالکل ہی خاص قسم کا ہے۔ ایک ایک آیت الگ الگ کر کے اور اس کے اجزائے مطالب کو واضح کرتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لہجے میں ٹھیک معانی و مطالب کے مطابق اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ نہ تو مصنوعی طریق سے سُر بناتے ہیں اور نہ بے لطف طریق سے عبارت کی طرح آیات پڑھتے ہیں۔ کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے اور وہ ساتھ نماز پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ جیسے کائنات کے فرماں روا کی خدمت میں کھڑے ہیں اور اپنے جذبات پیش کر رہے ہیں اور اُدھر سے لطف و عنایت طلب کر رہے ہیں۔ مودودی کی نماز میں وہی تحریکی روح پائی جاتی ہے جو اُن کے علمی کام میں ہے۔ اس میں دلوں کو بجھا دینے والا وہ جمود نہیں ہوتا جو ہماری نمازوں پر وارد رہتا ہے۔ یہ تو اقلین ہے اور جس کی وجہ سے اول تو نماز کی طلب ہی ختم ہو گئی ہے، اور اگر اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جائیے بھی تو اکتا اور اوس پڑ جاتی ہے۔ فرض پڑھنے کے بعد مختصر سی دُعا ہوتی ہے اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر مولانا مودودی بھی جائے نماز سے الگ ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگیں گے۔ مودودی صاحب نوافل مسجد میں نہیں پڑھتے کیونکہ قرآن و حدیث کے مطابق ان کا نظریہ یہ ہے کہ فرائض اجتماعی طور پر اور نوافل اخفاء کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں۔ مودودی صاحب کی نماز اور امامت نہ بے جا طور پر بوجھل ہوتی ہے، نہ بے روح اور بے کیف ! بلا مبالغہ عرض کرونگا کہ پہلی نماز جو میں نے مودودی صاحب کے ساتھ ادا کی اس کا ذائقہ پہلے کی تمام نمازوں سے مختلف تھا۔ اس امامت میں نئی شخصیت جلوہ گر تھی۔ نماز اور قرأت کا یہ خاص اسلوب میں نے پہلے بھی اور بعد میں بھی کسی دوسرے میں نہیں پایا اگرچہ دوسرے حضرات کی نماز و امامت میں بھی طرح طرح کی خوبیاں اور اثر انگیزیاں محسوس کی ہیں۔ نماز کو اصل میں تصورِ نماز بناتا ہے اور تصورِ نماز تصورِ خدا پر مبنی ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی نماز میں ان کا انقلاب آموز تصورِ خدا طاری و ساری رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ چیز صرف نفسیاتی و روحانی تجربہ سے تعلق رکھتی ہے اور مقالاتی بحثیں اس کی متحمل نہیں ہیں۔

دارالاسلام میں میں نے دوسرے رفقا کے ساتھ مولانا مودودی کے حلقۂ درس میں قرآن اور حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے درحقیقت اس نے میرے ذہنی سانچے کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ کر موجودہ شکل دی ہے۔ مسلسل پانچ برس یہ حلقہ درس ایک "اسٹڈی سرکل" کے سے انداز پر ہماری ذہنی و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ درس بہت جگہ ہوتے ہیں، بہت سے بزرگ درس دیتے ہیں، لیکن مجبوراً پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کے درس کا انداز بھی بالکل مختلف پایا !

طریقہ یہ تھا کہ نمازِ فجر یا نمازِ عصر کے بعد تمام لوگ حلقہ زن بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے مصحف سامنے رکھ لیتے۔ اکثر اوقات ہم لوگ پہلے سے زیر درس آنے والے حصہ کا مطالعہ کر لاتے اور اس کے بارے میں سوالات اور الجھنیں نوٹ کر لاتے۔ مولانا ہلکی آواز سے تعوذ اور تسمیہ کہہ کر آغاز کرتے پھر گزشتہ سلسلہ کلام کا خلاصہ ذہنوں میں مستحضر کر دیتے، پھر اگلی آیات کا معنوی ربط سامنے لاتے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت پڑھتے، اُس کا سادہ مگر جاندار اور اثر انگیز اور جدید اردو کے مبین میں ترجمہ کرتے، پھر خاص خاص اصطلاحی کلمات کی وضاحت کرتے، جو مغالطے متعلقہ مضمون کے بارے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو صاف کرتے اور آخر میں احکام اور تقاضے واضح کرتے۔ پھر اگلی آیت، پھر اس سے آگے ——— اور اسی طرح تقریباً ایک رکوع ہر نشست میں ہو جاتا۔ اس درس میں کبھی بھی صرف و نحو اور منطق اور بلاغت کی ٹیکنیکل بحثوں کا پرتو انہوں نے نہ پڑنے دیا۔ ان کا

اسلوب عام آدمی —— خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان —— کو سمجھانے کا ہوتا اور اسی کی ذہنی سطح، دلچسپی اور الجھن کو وہ پیش نظر رکھتے۔ جس بحث سے جدید علوم اور جدید مسائل کا کچھ بھی تعلق ہوتا تو ساتھ کے ساتھ ان پر ضرور گفتگو کرتے۔ نیز مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کو متقابلاً سامنے رکھ دیتے۔ صاحب درس کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ شرکاء اپنے اندر قرآن کا اذعان مطلوب پیدا کریں اور درس حدیث کے ذریعے اس کے تفصیلی خدوخال نمایاں کریں۔

درس کی ایک ایک آیت اور حدیث پر ہر مرحلے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوتی۔ سوالات ہر قسم کے ہوتے تھے۔ اونچے علمی قسم کے بھی، مذہبی گروہوں کے پیدا کردہ، جدید طبقوں کے اٹھائے ہوئے، تشدد کے انداز کے، جذباتی طرز کے —— اور اکیلا مودودی ان سارے حملوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ چار جانب سے سینے پر لیتا۔ حکیمانہ و تفہیمانہ اسلوب سے ہر بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی۔ کسی معرکے کے مسئلے کے چھڑ جانے پر لمبی بحث کا سلسلہ چل نکلتا اور اس کی وجہ سے درس ایک ہی آیت یا حدیث پر رکا رہتا۔ بحث میں نوعمر سامعین تیزی بھی دکھاتے اور باہر سے آنے والے مہمان بھی طرح طرح سے حصہ لیتے۔ مگر صاحب درس ٹھنڈے انداز پر بار بار اصل حقیقت کو نمایاں کرنے کی سعی مسلسل کرتا چلا جاتا اور آخری جیت اسی کی ہوتی۔ خصوصیت سے جہاں کہیں معاشی اور سیاسی بحثیں پیدا ہوتیں وہاں بڑی بڑی گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ کمیونسٹ پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے تصور مساوات کی بنیاد پر تو ہم لوگ خوب خوب الجھے بلکہ ندامت کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک موقعوں پر ہماری طرف سے زیادتی ہی ہوتی۔ مگر وہ مجسمۂ استقلال نہ کبھی گھبرایا، نہ کبھی بگڑا، نہ ہم سے مایوس ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت ملامت پر اتر آتا، حلقۂ درس سے نکال باہر کرتا بلکہ سلسلۂ درس ہی کو برطرف کر کے بیٹھ رہتا۔ مگر ہم نیا دیکھتے کہ پھر وہی مسکراتا چہرہ، وہی ٹھنڈا مزاج اور وہی تفہیمی انداز ہمارے سامنے ہوتا۔ باہر سے مودودی صاحب کے نئے نئے عقیدت مند پیری مریدی کی روایات ذہن میں لئے ہوئے آتے اور ہماری بے تکلفانہ اور آزادانہ بحثوں کو "غیر شرعی" اور "غیر مودبانہ" سمجھ کر خفا ہوتے۔ کبھی تو حلقۂ درس ہی میں ٹوک دیتے۔ ہم چپ ہو جاتے اور خود مولانا مودودی ہماری مدافعت کرتے اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی وکالت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بحث فلسفۂ ارتقاء کے سلسلے میں بہت طول پکڑ گئی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ (السلطان ظل اللہ) (حدیث) پر خوب خوب دماغ سوزی ہوئی۔ غالباً ایک یحییٰ صاحب تھے اور دوسرا میں، ہم دونوں کسی علمی بنیاد کے بغیر اصرار تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور قابل استرداد۔ مولانا مودودی نے بخلاف اس کے اس کا ایک ایسا مفہوم ہمارے سامنے رکھا جس پر کسی پہلو سے اعتراض وارد نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ یہ تھا کہ السلطان کے معنی یہاں بادشاہ نہیں بلکہ حکومت و سلطنت بلکہ "حاکمیت" ہیں اور حدیث کا منشا۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ بادشاہت یا حاکمیت یا اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا ایک پرتو ہے اور جو شخص اس خدائی امانت کو پاکر اس کی اہانت کرتا ہے خدا بھی اسے ذلیل کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے علم خدا کا ایک عطیہ ہے اور جو عالم علم کو نفسانیت کیلئے استعمال کرے وہ مجرم ہے۔ اس مفہوم نے نئے دروازے کھول دیئے۔ مگر حدیث کا جو استعمال ہماری تاریخ میں ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے جو انقباض عام طور پر نوجوانوں میں پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہم اصرار کرتے تھے کہ ایسی حدیث کو آخر بنائے استدلال بنانا ہی کیا ضرور ہے۔ یحییٰ صاحب تو بڑی صفائی سے یہ کہتے تھے کہ مولانا! جب معلوم ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے حفظ اقتدار کیلئے دنیا پرست عالموں نے حدیثیں گھڑی اور استعمال کی ہیں تو یہ جانتے ہوئے ایسی حدیثوں کو کیوں لیا جائے۔ صاحب درس نے بڑی مغز ماری کے بعد یہ اصول ہمارے ذہن نشین کرایا کہ کوئی حدیث روایت و سند کی صحت رکھتے ہوئے کوئی ایسی تاویل و تشریح قبول کرتی ہو جو دین کے اصولوں اور اس کے مجموعی تاثرات کے مطابق بیٹھ سکے تو پھر بلا وجہ اسے رد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہو سکتا ——— بہر حال اس آزادانہ فضا میں ہم نے دین کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھا۔

درس ختم ہوتا تو ہم سب اپنے اپنے مصحف لئے منتشر ہو جاتے۔ کسی دن جاتے ہوئے اپنی کسی فکری غلطی اور کسی عملی کوتاہی کا شعور و احساس لے کے جاتے اور اس کی اصلاح کا جذبہ موجزن محسوس ہوتا۔ کسی دن دین کی کوئی نئی حقیقت دلوں کے دامن میں لئے ایک عجیب سی مسرت کے ساتھ —— جسے مسرت علم کہنا چاہیئے —— مسجد سے نکلتے۔ کسی دن ذہن کی کوئی الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی اور وہ اگلے روز سابق درس کے بارے میں از سر نو بحث چھیڑنے کا محرک بنتی۔ کسی دن مختلف الخیال رفقاء آپس میں بحث کرتے ہوئے نکلتے اور چوبیس گھنٹے میں فرصت کے

موا قع پر وہی بحث بار بار جاری رہتی یہاں تک کہ اگلے دن کا درس سامنے آجاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ درس کے بعد ہم لوگ مودودی صاحب کو ان کے دفتر میں جا گھیرتے اور "دماغ کی رہی سہی بھڑاس" نکالتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر بدتمیزی کے رنگ سے خدا نے فضا کو پاک رکھا۔ کیونکہ بنیادی کلمہ اور مرکزی نظریہ سب کو انضباط میں لئے ہوئے تھا اور سب طالب العلم تھے نہ کہ مناظرہ باز۔ نظریات ٹوٹتے اور بنتے، جامد خیالات پگھلتے اور نئی شکل اختیار کرتے۔ شخصیت و کردار میں ایک زلزلہ سا آتا رہتا۔ ذہنوں میں ہر روز نئے اتار چڑھاؤ رہتے۔ اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے اندر تخریب و تعمیر کا متوازی عمل جاری ہے۔ ہمارے اندر کا پرانا انسان دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ مذہب کے زنگ آلود موروثی تصورات اکھڑ رہے ہیں اور تحریک اسلامی کا نیا تصور دل و دماغ کے مطلع پر جگمگا رہا ہے۔ الغرض ہم نے مودودی صاحب سے جو چیز بھی قبول کی ہے اپنی آزادی رائے کو برقرار رکھتے ہوئے اور دلیل و عقلیت کی بازیاں ڈٹ کر قبول کی ہے۔ عقیدت مندی کے ساتھ آمنا و صدقنا" شائد کسی ایک امر میں بھی نہیں کہا۔ مودودی صاحب نے بھی اس طریق تعلیم و دعوت کو سوچ سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ دراصل اندھے مرید (followers) نہیں چاہتے تھے کہ جن کا گلہ بنا کر وہ اپنی عقیدت کے باڑے میں رکھیں اور اس کو اپنی کرامات کی چراگاہ میں چرا کر اس کے گوشت اور دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائیں اور پھر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہ گلہ اپنی اولاد کیلئے بطور ترکہ اور جائداد کے چھوڑ جائیں ——— وہ ایک سوچنے سمجھنے اور اپنے اندرونی جذبے سے حرکت کرنے والی طاقت پیدا کرنے کے اہتمام میں تھے جو اسلامی اصولوں پر ایک نئی دنیا بنانے کا پارٹ ادا کر سکے۔ ہمیں کبھی مغالطہ نہیں ہوا کہ ہم فی الواقع اس گراں بہا کام کے پوری طرح اہل بن گئے ہیں، احساس صرف یہ ہے کہ دارالاسلام کی تربیت نے ہمیں ایسے سوچنے سمجھنے والے پیروان اسلام میں بدل دیا ہے جن کا سرچشمۂ فکر قرآن و حدیث ہے۔ اور جو اعتماد کے ساتھ مخالفانہ حالات کے مقابلے میں کھڑے ہو کر دو ہاتھ میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔

اس درس کا سلسلہ کبھی کبھی مرکز میں اب بھی جاری رہتا ہے اور اب بھی سوالات اور بحثیں چھڑتی ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہم دارالاسلام کے دور کے درسوں کو ترس گئے ہیں۔ "کتنا اچھا تھا ہمارا وہ زمانۂ ناآشنائی! کتنے ناقابل فراموش ہیں وہ اجنبیت کے مزے"!

اب اس صاحب درس کی شخصیت کا نقشہ آپ خود اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

آیئے اب ذوقیات کے دائرہ کی طرف!

مولانا مودودی کے ذوقیات کا شجرۂ طیبہ چائے اور پان سے سیراب ہوتا ہے۔ اور اس کی ٹہنیاں پان کے پتوں سے آراستہ ہیں۔ پان مولانا کے ہاں مسرت و تفریح کا ترجمان ہے اور یہی نازک سا برگ سبز پریشانیوں کے بارہائے گراں اپنے کف سنائی پر سہارتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کاوش و تفکر کی گھڑیوں کا رفیق ہے۔ دماغ میں جونہی سوچنے کی تحریک ہوتی ہے معاً مولانا مودودی کا ہاتھ ڈبیہ یا بٹوے کی طرف بڑھتا ہے۔ ادھر زردہ چھالیہ ڈالا جا رہا ہوتا ہے اور ادھر خیالات ترتیب پانے لگتے ہیں۔ پان چبانے کے لئے جبڑوں کی ہلکی ہلکی جنبش قلزم افکار کی نرم خیز لہروں سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مودودی کی تحریروں میں کوئی شک نہیں کہ پان کے پتے کی سبزی اس کے کرارے پن، چھالیے اور چونے کی تیزی اور زردے کی حرارت انگیز اور تحریک ذالطیف تلخی کے سارے پہلو شریک رہتے ہیں۔

کل ہی مولانا مودودی سے احباب اس مجلس میں (جو سفر حج سے واپسی پر فوراً ہی مرکزی دفتر میں منعقد ہوئی) دریافت کیا گیا کہ کیا پان اس لمبے سفر میں ملتا رہا۔ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انتظام یہ کیا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کو ہم سفر بنایا۔ ان کے ساتھ پان کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریقہ جانتے تھے۔ چنانچہ پان ملتا رہا۔ کوئی چار دن کا فاقہ کیا ہو گا کہ مکہ پہنچ گئے اور مکہ کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ضمانت ہے ہی کہ یہاں رزق ضرور ملے گا۔ ایک صاحب نے پوچھا: "کیا مولانا! پان بھی رزق کی تعریف میں آتا ہے؟" ——— "اجی واہ، تو کیا روٹی اور سالن ہی کا نام رزق ہے" ——— مودودی صاحب خندہ آمیز انداز سے فرمانے لگے "اصل رزق تو پان ہے"۔

ایک گفتگو ماہر القادری صاحب نے یوں روایت کی ہے :

"ایک بار پان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے مزہ لے لے کر تمباکو کھاتے ہیں۔ مگر میرا یہ عالم ہے کہ چھالیہ میں تمباکو چھو بھی جائے تو اس چھالیہ کو نہیں کھا سکتا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں بھی پہلے تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا (میرا خیال یہ ہے کہ پنواڑی نے غلطی سے تمباکو ڈال دیا تھا۔ ن م) اور اس پان کو کھا کر مجھے گھمائی آئی۔ بس اس گھمائی کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ——— مگر اس عادت پر اتنا قابو بھی ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو وہاں پان کی یاد نہیں آتی۔"

("مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

جیل جانے کا واقعہ بھی سن لیجئے جسے میں پہلے لکھ بھی چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ کی گرفتاری (۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء) کے موقع پر ضروری کارروائی اور تیاری ہو چکنے پر مولانا روانگی کیلئے نکلے۔ برآمدے میں رفقاء سے ملے، سیڑھیوں کے کنارے کھڑے ہوئے اور بہ طرز معمول پان طلب کیا: "ڈبیہ ٹڑا کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔" پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے "بس اب طلاق دے رہا ہوں۔" پان جیسے رفیق کے بارے میں یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا: "نہیں یہ طلاق رجعی ہے، مغلظہ نہیں"۔ اس پر سید نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کیلئے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

("مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

مولانا کی رائے میں پان کی ترکیب و ترتیب الہامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے اجزاء کے تنوع اور ان کی باہمی مناسبت کو دیکھئے۔ کہاں کہاں سے یہ اجزا لا کر جوڑ ملائے جاتے ہیں۔ انسانی ذائقہ محض عقل کی رہنمائی سے کہاں یہ ترکیب پیدا کر سکتا ہے۔

ایک بار جب کہ انگریزی دور حکومت تھا، کہنے لگے کہ ان انگریزوں نے اپنی عادت بد کا تو اتنا اہتمام کیا ہے کہ گاڑیوں کے اونچے درجہ کے ڈبوں میں شراب کے پیگ رکھنے کے لیے اسٹینڈ لگا رکھے ہیں تاکہ راستے میں بھی ——— ضرورت ہو تو پیتے لیٹے ——— شراب کی چسکیاں لی جاتی رہیں۔ لیکن ان کمبختوں کو ہمارے پان کا کچھ خیال نہیں کہ اگالدان لگوا دیئے ہوتے۔ اسلامی نظام حکومت کبھی آیا تو گاڑیوں کے ڈبوں میں اگالدان ضرور لگیں گے۔

دارالاسلام کے دور میں مولانا مودودی کے پاس ایک بڑا سا پان دان تھا جس پر نکل پالش کیا ہوا تھا۔ یہ بالعموم دفتر کی میز پر رکھا رہتا اور جب مولانا مجلس بالا خانہ میں آ بیٹھتے تو پان دان بھی ساتھ آتا۔ حسن ذوق کا یہ نمونہ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا، کیونکہ مولوی منش لوگ باہر سے آتے تو ——— سامنے تو نہیں ——— ادھر ادھر دبی زبان سے کہتے کہ یہ پاندان خلاف شریعت ہے۔ ہم لوگ مسکرا کر رہ جاتے۔ بعضوں پر یہ راز کھلا کہ ایسے حضرات اسے چاندی کا پاندان سمجھتے رہے تھے اور سونے چاندی کے برتنوں کو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے حرام ٹھہرایا ہے۔ خود پان بھی بعض لوگوں کے فتووں کا ہدف بنے بغیر نہ رہا۔ کچھ لوگ اسے ناجائز نہیں کہتے تھے مگر بڑی لجاجت سے مولانا سے درخواست کر دیتے تھے کہ عام تصورات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ اسے ترک کر دیں۔ مگر مولانا مودودی دور دراز کو دکھانے اور دوسروں کو خوش کرنے کیلئے نہ کوئی چیز اختیار کرتے ہیں نہ کچھ ترک کرتے ہیں۔ ایک پان ہی پر کیا موقوف، کوئی اگر میز کرسی کی نشست پر اعتراض کرتا، کوئی سفید اجلے لباس پر ہی اپنے انوکھے نظریات کے دھبے ڈال دیتا، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک مہذب قسم کے مہمان نے دوران گفتگو میں دیواروں کی سفیدی کو بھی خلاف اسلام قرار دیا۔ مودودی صاحب ان امور میں بحث کرنے کے بجائے ——— خوبصورتی سے طرح دے جاتے۔

ضمناً ایک ضروری بات یاد آئی۔ مولانا مودودی "ذوقیات" کے معاملے میں گھٹے ہوئے مذہبی ذہنوں کے برعکس بڑے فراخ دل اور عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ جامد تصور مذہب ہر ہر چیز پر اعتراض کی انگلی رکھتا ہے۔ خصوصیت سے پان اور چائے اور سگریٹ تو بہت ہی بڑے مظلوم ہیں۔ جماعت میں آنے والوں میں جو لوگ حقہ اور سگریٹ کے عادی تھے ان کی اکثر شامت آتی رہی ہے۔ خصوصاً مرکز میں جا رہنے والوں کو تو کسی نہ کسی نووارد کی

خشونت سے نت سابقہ رہتا۔ میں خود اس تلخ تجربہ سے گزر رہا۔ گر میری اور اس طرح کے دوسرے رفقا کی محفوظ پناہ گاہ مولانا مودودی ہوتے۔ وہ رسمی مسئلوں کو شریعت کا جزو نہیں مانتے اور نہ ممنوعات کے دائرے کو خواہ مخواہ وسیع کرتے چلے جانے کے قائل ہیں۔ بلکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اباحت اور رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق کوئی کسی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ابتدا میں احتراماً میں مولانا مودودی کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیتا تھا اور خطوط نویسی کے دوران میں جب مولانا کے دفتر میں زیادہ دیر بیٹھنے سے اعصاب میں ہلچل ہونے لگتی تو چپکے سے ان کے پاندان سے زردہ کے چند ریزے لے کر منہ میں رکھ لیتا۔ مولانا میری کمزوری سے جب آگاہ ہو گئے تو کسی مجلس میں بسلسلۂ حدیث دیگراں اشارۃً واضح کیا کہ سگریٹ جسے پینا ہو وہ پیئے، اس میں کیا حرج ہے۔ جب سے اب تک مولانا ہمارے سامنے پان کھاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے سگریٹ پیتے ہیں۔ کسی طرف سے حملہ ہوتا ہے تو ہم اس پناہ گاہ میں سمٹ جاتے ہیں۔ یوں اب کئی سال کی تربیت سے اس قسم کے جملہ معاملات میں جماعت کی مجموعی فضا انتہائی فراخدلانہ قسم کی ہو گئی ہے اور کوئی بھی اب تمرد و گیریاں نہیں کرتا۔

میں نے جیل کی ڈائری میں (جس کے چند اوراق شائع ہوئے ہیں) لکھا ہے کہ اپنی دو روزہ رہائی کے دوران میں مولینا کے خلاف مقدمے کی کارروائی سننے ہم فوجی عدالت میں گئے۔ کارروائی ختم ہونے پر ملاقات ہوئی۔ برسبیل تذکرہ میں نے بیان کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے۔ مولانا ہنس کر فرمانے لگے: "ایسے نہیں جیل میں آئیے تو چھوڑ دیجئے۔ باہر جائیے تو پھر پیجئے۔ پھر جیل آئیے تو پھر چھوڑ دیجئے۔"

مولانا مودودی چائے سے بھی خاص رغبت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کے ذوق سے آپ کا ذوق بالکل برعکس ہے۔ مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نسخہ کے قائل ہیں، یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو، دودھ بھی بہت ہو، شکر بھی بہت ہو۔ چنانچہ شکر کے تین چمچے آپ کے لئے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں۔ چائے کی گرمی کے ساتھ آپ کو برف کی ٹھنڈک سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ "ٹھنڈا پانی" مولانا مودودی کے دائمی مرغوبات میں سے ایک ہے۔ مگر ٹھنڈے پانی کا مفہوم ان کے ہاں یہ ہے کہ آدھی برف ہو اور آدھا پانی۔ حتیٰ کہ جاڑے میں بھی وہ ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یاد ہے کہ جب دارالاسلام کے زمانہ میں خطرناک راتوں کو پہرے کا انتظام ہوتا تھا اور ڈیوٹی دینے والے گروپوں میں مولانا مودودی کی باری بھی جس رات آتی تھی تو آپ برف کا خاص انتظام کر لیتے تھے۔ گھنٹے گھنٹے بعد برف کی سل کو ہتھوڑے سے توڑا جاتا اور مولانا خود بھی برفاب پیتے اور دوسرے ساتھی بھی!

کھانوں میں مولانا مودودی کے گھر کا ایک خاص مرغوب کھانا "شب دیگ" ہے۔ یہ شب دیگ مولانا کی والدہ محترمہ کی ہدایت و نگرانی میں زمانہ قدیم سے عید الاضحی کے موقعوں پر پکتی ہے اور سارے رفقا مولانا کے ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ واقعی یہ چیز خوب رہتی۔ تقسیم کے بعد شاید ایک بار اس قصۂ ماضی کی یاد تازہ کی جا سکی ہے۔

مودودی صاحب کے ذوقیات کے سلسلے میں کھانے کا ایک دلچسپ فلسفہ سنئے۔ ابھی گزشتہ رمضان میں ہمارے ایک پروفیسر دوست نے سمن آباد میں مودودی صاحب کو دعوت افطار دی۔ یہ دعوت افطار مکمل کھانے سے کسی قدر زیادہ ثقیل تھی۔ دستر خوان فرش پر بچھا لیکن چونکہ کانٹا موجود تھا دو چار دوستوں نے چھری کانٹا اٹھایا، مگر مولانا مودودی نے مشرقی وضع نہ چھوڑی۔ میزبان نے پلاؤ کے قریب چمچہ رکھ کر اپنا مشورہ پیش کیا۔ ساتھ ہی کسی صاحب نے پوچھا "چھری کانٹے سے کھانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟" فرمایا "جائز کیوں نہیں، مگر دست و دہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزہ غارت ہو جاتا ہے۔" اب ایک لطیف سلسلۂ گفتگو چھڑ گیا۔ جملوں اور ہلکی مسکراہٹوں کے ساتھ چل نکلا۔ مودودی صاحب نے باتوں باتوں میں کھانے سے متعلق ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ کھانے کا مزہ محض اس ذائقہ کا نام نہیں جو ذائقہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس میں مختلف حسیات حصہ لیتی ہیں۔ کھانے کا ایک رنگ اور اس کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے آنکھیں بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ ایک خوشبو ہوتی ہے جس سے مشام متاثر ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر ذائقہ کی حس لطف اندوز ہوتی ہے۔ کھانے میں لمس کا بھی ایک حصہ ہے اور وہ یہ ملتا ہے کہ انگلیاں براہ راست مس کریں۔ چھری کانٹے اور چمچے سے کھانے میں لمس کا یہ حصہ غارت ہو جاتا ہے۔

ذوقیات کے دائرے میں اور بہت سی چیزیں قابل ذکر ہیں لیکن اس مضمون کیلئے اتنا ہی حصہ کافی ہے۔

کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ بس کر ہی اسے جانچا پرکھا جاسکتا ہے۔ خصوصیت سے لیڈروں، وزیروں، علماء، مصنفوں اور صحافیوں کو دور سے کبھی جانا ہی نہیں جاسکتا ہے۔ کتابوں اور مقالوں، تقریروں اور بیانوں میں بالکل دوسرا آدمی جلوہ گر ہوتا ہے جو تمام محاسن و کمالات کا جامع معلوم ہوتا ہے۔ اصل آدمی ستر پردوں کے پیچھے بہت دور تاریکی میں چھپا دیکھ رہا ہوتا ہے کہ دنیا کس طرح بیوقوف بن رہی ہے۔ شہرت شخصیت کا حجابِ اکبر ہے۔ مولانا مودودی کے ساتھ ہم نے رہ بس کر دیکھا ہے۔ ان سطور میں یہی دکھانا مطلوب ہے کہ وہ رفقا کے درمیان کس طرح رہتا سہتا اور گھلتا ملتا ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اولین بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملنے والوں اور کسی طرح کا تعلق رکھنے والوں میں سے ایک ایک فرد کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصیت سے ساتھ کام کرنے والے رفقا، چاہے وہ عمر، علم، منصب، کارکردگی اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کسی بھی درجے کے ہوں، سب کے سب ان کی نگاہ میں ایک ہی طرح کی دوستانہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ہر ملاقاتی اور اجتماعات میں شریک ہونے والے تمام کارکنانِ جماعت پر وہ فرداً فرداً توجہ صرف کرتے رہے ہیں (اب چونکہ تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور شرکائے اجتماع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہ دورِ اول والی بات تو نہیں رہی پھر بھی ہر ایک سے انفرادی رابطہ رکھنے کی کوشش مولانا ضرور کرتے ہیں)۔ وہ تقریباً تمام ارکانِ جماعت کو فرداً فرداً نام اور شکل سے جانتے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں ان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل اور ان کے جماعتی احوال کو سمجھتے ہیں، خوبیوں اور کمزوریوں سے باخبر رہتے ہیں، مقامی جماعتوں کے حالات کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ کئی کئی سال پہلے جن لوگوں کو کبھی ایک بار دیکھا تھا ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اسی طرح گزشتہ سلسلۂ واقعات کو مستحضر کر لیتے ہیں۔ گردے کے آپریشن کے بعد ان کا حافظہ اگرچہ متاثر ہوا ہے اور اب کسی کسی موقع پر وہ کوئی چیز یاد لانے کے لئے ان کو ذرا سی کاوش کرنی پڑتی ہے، لیکن متعلق افراد کو اہمیت اور توجہ دینے کی خو اب بھی قائم ہے۔ ہر ایک کو اہمیت اور توجہ دینا خود پسندی، علیحدگی پسندی اور اپنی ذات میں سمٹے رہنے کی عادت کے بالکل نقیض ہے اور مولانا مودودی کی شخصیت کی مستقل جاذبیت کا ایک سبب یہی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کو اعتماد میں لیتے ہیں، شریکِ مشورت کرتے ہیں اور ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے ساتھیوں سے بات چھپانے کی کوشش کی ہو یا ان کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔ ہماری ہزار کوتاہیوں کے باوجود مودودی صاحب کی اس افتادِ مزاج میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ انہوں نے رفقا کے درمیان کبھی اقرب اور ابعد کا امتیاز نہیں کیا۔ ایک کے خلاف دوسرے کے سامنے کسی طرح کا اظہارِ تکدر اور اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ دارالاسلام کے دور سے لے کر اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی کسی سفر سے آمد ہوئی، کسی ملاقات اور گفتگو اور مشاورت سے فراغت ہوئی، کوئی اجلاس شوریٰ ختم ہوا تو مولانا مودودی کے گرد رفقا جمع ہو جاتے ہیں اور بے تکلفی سے باتیں پوچھتے ہیں اور باتیں سنتے ہیں۔

مولانا مودودی بہ حیثیت امیر اگرچہ کارکنانِ مرکز اور باہر کے ماتحت امراء کیلئے، نیز خاص طور پر دفتر ترجمان القرآن کے کارکنوں کیلئے افسر کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن برسوں کا تجربہ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی افسرانہ اور تحکمانہ انداز سے کوئی کام کسی کو سونپا ہے، نہ باز پرس کی ہے اور نہ بالادستی کے اظہار کے لئے اس طرز سے کارروائی کی ہے۔ سارا معاملہ دوستانہ انداز سے چلتا ہے۔ اسی دوستانہ انداز کی بات ہے کہ مولانا کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا ہر کسی کو شوق رہتا ہے اور کوئی ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا جب تک جماعتی مصالح کا شدید تقاضا نہ ہو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کے ہاں ہر شخص کو خصوصیت سے رفقا کو اختلاف اور تنقید کا پورا پورا حق حاصل رہا ہے۔ عام اصطلاح کے لحاظ سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی اٹھے گا اور علیحدگی میں مولانا سے ملے گا اور رو در رو ہر بات کہہ دے گا جو اس کے ضمیر کی آواز ہو۔ تنہائی تک ہی محدود نہیں، عام مجالسِ گفتگو میں کوئی رفیق کسی بات پر کہہ دے گا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے یا آپ کا یہ نقطۂ نظر فلاں بنیادی اصول سے یا آپ ہی کے فلاں قول سے ٹکراتا ہے۔ اور پھر اجتماع میں ———— رفقا اٹھ کر بے دھڑک سوالات کریں گے۔ اعتراضات سامنے لائیں گے اور اپنے اختلافات بیان کر دیں گے۔ جماعتی فیصلے تو نظری اختلاف کے باوجود ہر رکن عملاً قبول کرتا ہے لیکن مولانا کے علمی نظریات اور ذاتی تصورات سے اختلافات کیے جاتے اور مسلسل برقرار رہتے

ہیں۔ ہمارے جماعتی نظم میں اسلامی جمہوریت کا یہ پہلو بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بھی منصب پر آنے والا شخص ایک کڑے امتحان سے گزرتا ہے۔ چونکہ سب سے بڑا منصب مرکزی امارت کا ہے۔ لہٰذا مرکزی امیر پر معاملات و مسائل اور نزاعات کے بھاری بوجھ کے ساتھ تنقید کی اتنی بوچھاڑ رہتی ہے کہ ہمالہ کا سا عزم درکار ہے۔ تنقید کے حق کو اسلامی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے کی تربیت پاتے رہنے کے باوجود جماعت میں ہمیشہ ایسے نئے لوگ موجود رہتے ہیں (اور بعض دیرینہ ساتھی بھی اپنے مزاج کی وجہ سے اس معاملہ میں ہمیشہ نئے رہتے ہیں) جو بے ڈھنگے پن سے تنقید کرتے ہیں مگر مولانا مودودی اس بوچھاڑ کا مقابلہ تحمل اور شگفتگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ڈانٹ ڈپٹ یا ترش روئی کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتے۔ انھوں نے اسلامی اصول کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح جماعت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے کسی بھی صفحے کی کسی بھی عبارت پر ہر رفیق کو اظہار رائے اور تنقید، بلکہ کہنا چاہیئے کہ بازپرس کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ جماعتی اُمور سے آگے نکل کر مولانا کے گھر اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے شخصی معاملات تک پر متعدد بار لوگوں نے کھل کر گفتگوئیں کی ہیں۔ زندگی کو اس طرح سب کے سامنے رکھ دینا اور تنقید و اعتراض کا عام حق دے دینا کوئی آسان کام نہیں۔ جسے آسان معلوم ہو وہ اسے ذرا کر کے دیکھے۔ اس مقام تک شاید ہی کوئی لیڈر اور عالم دین مشکل ہی سے رسائی رکھتا ہوگا۔ اور رفقا نے جس شخص کو بار بار اعتراضات کی چھلنیوں چھان کر اور تنقید کے چھاجوں پھٹک کر دیکھا ہے وہی اس کی صحیح قدر پہچانتے ہیں۔ مولانا مودودی کو مصنوعی زندگی سے سخت گریز ہے۔ لباس و وضع قطع، اور دوسرے پہلوؤں میں مختلف لوگوں نے ان کو طرح طرح کے مشورے دیئے ہیں۔ لجاجت سے اصرار کیا ہے۔ لیکن مولانا نے کسی کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی ایسی تبدیلی اپنے اندر نہیں کی جس کے لئے دین خود تقاضا نہ کرے اور ضمیر کے اندر حس کیلئے تحریک نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ آپ نوافل پڑھا کریں۔ بعض کا اصرار تھا کہ داڑھی زیادہ لمبی رکھیں، بعض کا مشورہ تھا کہ سر کے بالوں کی ہیئت بدل دیں۔ بعض کا تقاضا رہا کہ اسلوبِ نگارش اور طرزِ گفتگو میں تبدیلیاں کریں اور کچھ یہ چاہتے کہ لباس میں پیوند لگایا کریں۔ لیکن مولانا مودودی دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لئے کسی ادنیٰ سی ترمیم پر بھی کبھی راضی نہیں ہوتے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی کسی عادت اور اپنے کسی معمول کو کبھی کسی سے اخفا میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ڈرامائی کردار بننے پر کبھی ایک لمحہ بھی تیار نہیں ہوئے۔

رفقا کی عزتِ نفس کا مولانا کو ہمیشہ خاص خیال رہتا ہے۔ وہ ان کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اور اسلامی آداب کے ساتھ ان سے مساویانہ معاملہ کرتے ہیں انھوں نے کبھی کسی رفیق کو ملامت نہیں کی، برا بھلا نہیں کہا، غضبناک ہو کر سخت گیرانہ معاملہ نہیں کیا۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تربیت سے تغافل برتا ہے۔ تربیت ہمیشہ مدنظر رہی۔ بس اس کا منصوبہ جداگانہ نوعیت کا تھا۔ مولانا مودودی کے طریق تربیت کا ایک جز تو یہی اعتماد میں لینا، احترام ملحوظ رکھنا، ذمہ داریاں سونپنا اور دوستانہ سطح پر معاملہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کریم النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر گرفت نہیں کرتے اور اہم تر کوتاہیوں پر وہ ایک خفیف سے اشارے یا بالواسطہ طرز کے ایک جملے کے ذریعے ہنستے مسکراتے احساس دلا دیتے ہیں۔ اس سے آگے کا معاملہ ہو تو بغیر کسی گرماگرمی کے پاس بٹھا کر تفصیل سے بات سمجھا دیتے ہیں۔ اظہارِ ندامت پر فراخدلی سے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی رفیق یا ملازم کی اصلاح سے لمبے تجربے کے بعد وہ بالکل مایوس ہو جائیں ——— اور ایسی صورتیں پورے گزشتہ دور میں شاذ و ہی چار پیش آئی ہیں ——— تو خوبصورتی سے معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ طویل المیعاد طرز تربیت نتائج کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب رہا ہے۔ خصوصاً انھوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ حیرت ناک ہے۔ ہماری یہ بہن ایک ایسے خاندان سے آئیں جس میں مغربیت تیزی سے چھا رہی تھی۔ مولانا مودودی کی والدہ مکرمہ کے اصرار سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ شادی کے بعد جب مولانا مودودی کے نظریات و عزائم زیادہ اچھی طرح واضح ہونے لگے اور جب وہ ایسے ایسے راستے کی طرف مڑ گئے جو دنیوی کامرانیوں کے باغ و بہار سے نہیں، بلکہ فقر و فاقہ کے خارزار سے ہو کر گزرتا تھا اور وہ خارزار عملاً دار الاسلام کی بے رونق اور سادہ دیہاتی زندگی کی صورت میں بالکل سامنے آ گیا تو ہماری ان محترم بہن کے سارے خواب درہم برہم ہونے لگے۔ وہ گویا عیش و مسرت کی ایک دنیا سے ایثار و امتحان کی بالکل ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گئیں۔ دل و دماغ میں جو ہلچل ایسے انقلاب سے ہو سکتی تھی یا ہونی چاہیئے تھی وہ ہوئی۔ لیکن مولانا مودودی ٹھنڈے دل سے ایک ٹھنڈی اسکیم کے تحت ان کی دلجوئی کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ پردہ نشین کچھ لٹریچر پڑھتے پڑھتے اور ایک خاص ماحول میں رہتے سہتے آخر کار اپنی جگہ سے ہل

گئیں۔ پھر جو وہ ایک بار آگے بڑھیں تو ایسی جگہ آ پہنچیں کہ جہاں ان کے اندر ایک نئی شخصیت پیدا ہو گئی۔ بالکل اسی طرح مولانا مودودی اپنے بچوں کو مارنے اور برا بھلا کہنے اور بات بات پر ٹوکنے کے بغیر مشفقانہ انداز میں تربیت دینا پسند کرتے ہیں۔ کبھی اچانک کوئی غلط حرکت کریں تو ایک آواز آئے گی "ہا آں ——— ہائیں ——— یا اُونہہ ہونہہ"! ——— بس یہی مولینا مودودی کا عصائے تربیت ہے جسے وہ بچوں پر استعمال کرتے ہیں۔

رفقا نے ہمیشہ مولانا مودودی کی شخصیت سے درسِ عزیمت و استقلال لیا ہے۔ موقع بہ موقع مولانا ہی کی ذات نے ان کی ہمت بندھائی ہے۔ ڈرپوک اور کمزور شخصیتیں اپنی کمزوری اپنے ساتھیوں میں بھی منتقل کر دیتی ہیں۔ اور اسی طرح عزیمت و استقلال کے پیکر قریبی لوگوں پر بھی اپنے اس جوہر کا پرتو ڈال دیتے ہیں۔ دارالاسلام کے دورِ خطر میں مولانا مودودی آس پاس کی بستیوں کی فضا کو درست رکھنے کے لئے ہمارے گروپ مرتب کر کے بھجواتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ کوئی شخص ایک چھڑی اور ایک چاقو تک ساتھ لے کے نہ جائے، کیونکہ مسلح ہو کر امن و سلامتی کی دعوت دینا بے معنی ہے۔ اور ہم بے دھڑک علاقے بھر میں گھوم آتے، حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ نفرت و کدورت اور فتنہ و فساد کی بارود ہر آبادی کے نیچے بچھ رہی ہے۔ جب دورِ فساد شروع ہو گیا تو اس عالم میں مولانا مودودی نے بہ نفسِ نفیس بستی کی حفاظت کے لئے فوجی نظام تجویز کیا اور بہترین منصوبہ بنایا۔ خود وہ اس نظام کے کمانڈر تھے اور تمام انتظامات میں حصہ دار رہے۔

جن دنوں کشمیر کے نام پر ہمارے خلاف "جہادِ اکبر" لڑا جا رہا تھا لاہور کے ایک روزنامے نے (جسے جماعتِ اسلامی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے) ایک زہریلا نوٹ لکھا اور جھوٹ کی کڑیاں ملا ملا کر فتویٰ دیا کہ یہ لوگ غدار ہیں۔ میں تسنیم کے ادارے میں شریک تھا۔ مولانا سے مشورہ لینے گیا کہ اس پر تردیدی نوٹ لکھنا چاہیئے۔ مولانا مودودی مزاحاً کہنے لگے "تردیدی کیوں ——— صاف صاف کہیئے کہ ہم اقراری مجرم ہیں ———" بس اتنے سے فقرے نے مجھے اور دوسرے شرکائے مجلس کو متاعِ عزم و ہمت سے مالا مال کر دیا اور اُس وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا ——— "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں!" ——— اگلی صبح تک نظم مکمل ہو گئی۔ پھر جب یہ ہنگامہ بڑھا اور جوابی کام کرنے کیلئے اخبارات کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی تو طے پایا کہ شہر کے ہر حلقے میں جلسے کر کے اپنی بات واضح کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ابتدا کس حلقے سے کی جائے۔ مودودی صاحب کہنے لگے کہ سب سے پہلے "خطرناک ترین" موقع کو لیجئے، اور وہ موچی دروازہ تھا۔ ان کے اس مشورے نے جو خاص روح کارکنوں کے اندر پھونک دی اس کا آج تک ہمیں اندازہ ہے۔

اور پھانسی کی کوٹھڑی میں! ——— اعزہ و رفقا ملنے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ "جی ہاں! عینک کے خانے اور ململ کے چند تنکوں کی"۔ یہ تھا اس شخص کا جواب جس کے لئے پھانسی کا پھندا تیار ہو رہا تھا۔ مولینا مودودی نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں دریافت کرنے پر جو تین وجوہ آپ نے بیان فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرے جیسے آدمی نے بھی جان بچانے کے لئے رحم کی اپیلیں کرنا پسند کر لیا تو پھر اس ملک میں غیرت و حمیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اور جب فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا ——— مولانا کے وکیل نے ایک راہ یہ سجھائی کہ آپ "تسنیم" کے شائع کردہ بیان کو اپنانے سے انکار کر دیں۔ لیکن مولانا مودودی کی سیرت نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور جب عدالت میں پوچھا گیا تو آپ نے کسی قدر زور دے کر کہا کہ "ہاں! یہ لیجئے! بیان میرا ہے"!

مولانا اپنے رفقا کے درمیان اس سادہ زندگی کی وجہ سے بھی محبوب ہیں جو ان کا تعلق دوسروں سے مساویانہ اخوت کی بنیادوں پر جوڑتی ہے۔ ان کا لباس ہمیشہ سادہ رہا اور بسا اوقات تو ان کے کرتے اور پاجامے پر خوبصورتی اور مہارت سے لگے ہوئے بار بار پیوند بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ نمائشِ فقر سے ہمیشہ خالی پائے گئے۔ ان کے ہاں سے کھانے بارہا کھانے کا موقع ملا اور دعوتوں میں شرکت کی لیکن کھانا ہمیشہ سادہ پایا۔ دفتر میں میز کرسی ہمیشہ رہے لیکن صوفوں اور قالینوں کو کبھی بار نہ مل سکا۔ کبھی کوئی ماما یا کوئی بچہ گھر میں ملازم رہتا ہے۔ لیکن تمام کاموں کے لئے نوکروں کا بیڑہ کبھی بھرتی نہیں ہوا۔ اس سبب سے مولینا مودودی کو دن میں کئی کئی بار خود بھی اُٹھ کر گھر جانا پڑتا ہے اور نیچے دروازے پر دستک دے کر بلاوا دیتے رہتے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے ہاتھ سے بہت سارے کام کر لیتے ہیں اور ایسے کاموں کی فہرست بہت دلچسپ ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔ یہ سادہ زندگی ان کے لئے رفقا سے مساویانہ رابطہ رکھنے کو آسان بناتی ہے ———

دارالاسلام میں ہر روز شام کو کبھی کرسیوں پر کبھی چٹائیوں پر اور کبھی کنارِ نہر پتھروں اور گھاس پر تکلف برطرف کر کے برادرانہ محفل جمتی اور مولانا مودودی اس

میں نیکے از منا" بن کر بیٹھتے۔ رات کو اجتماعی کھانا ہوتا اور گوناگوں کھانے یکجا ہو جاتے اور باہم دگر "دست درازیاں" ہوتیں۔ اجتماعی کھانے کی طرح روال ہمیشہ مودودی صاحب رہے۔ وہ نہ ہوتے تو کھانا پھیکا ہو جاتا۔ اب لاہور میں صرف عید کے موقع پر اس اجتماعی کھانے کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

اجتماعات کی شورت میں کئی برس تک مولانا ایک عام رکن کی طرح قیام و طعام کے عام انتظام میں حصہ دار ہوتے۔ فرش پر سوتے اور سب کے ساتھ مل کر رہتے۔ اب ان کی صحت کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کے رفقا نے پرہیزی کھانے کا انتظام شروع کیا ہے اور ان کو اجتماع گاہ میں قیام گاہ کا ایک گوشہ الگ کر کے دے دیا جاتا ہے تاکہ وہاں وہ ضروری امور کیلئے سوچ سکیں، تقریر کی تیاری کر سکیں اور آرام لے سکیں۔ مگر آرام کہاں! اسی طرح وہ سفر میں جب بھی رفقا کے ساتھ جاتے ہیں تو اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں سب کے لئے سفر کرنا ممکن ہو ——— اور یہ تیسرا درجہ ہی ہو سکتا ہے۔ دونوں کل پاکستان اجتماعات (۵۱ء، ۵۵ء) میں کراچی تشریف لے گئے تو اسی آخری درجے میں سفر کیا۔ کسی ایک موقع پر کہیں ان سے کسی ملاقاتی کی جانب سے سوال کیا گیا کہ "ہیں! آپ اور تھرڈ کلاس میں؟" فرمایا "اگر کوئی چوتھا درجہ ہوتا تو اسی میں سفر کرتا"۔

اندازہ کر لیجئے کہ یہ کیسی شخصیت ہے اور اس کے ساتھ اس کے رفقا کی وابستگی کس نوعیت کی ہو گی۔

ہاں ——— اس سادہ زندگی کے پس منظر میں وہ ایثار کام کر رہا ہے جو اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہے جب اپنا نصب العین معین کر کے آپ نرم فرض کے راستے پر چل پڑے تو بار بار ایسے مواقع آتے کہ ترجمان القرآن سے کبھی ایک حلقہ کے خریدار ٹوٹ جاتے، کبھی دوسرے حلقہ کے۔ لیکن مودودی کے ایمان نے اس ٹوٹ پھوٹ کی کبھی پروا نہیں کی۔ آخر میں مسلم لیگی حلقوں کے ناراض ہونے کا تو رسالہ کی خریداری پر نمایاں اثر پڑا۔ مگر حق کا وہ سپاہی اپنے موقف سے نہیں سرکا۔ حالات کی اس گردش میں بار بار مولانا مودودی فقر و فاقہ کی بالکل سرحد پر جا پہنچتے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف تن تنہا بہت ساری ذمہ داریاں اٹھانے کی وجہ سے رات کو دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ ترجمان کے مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں آئے اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں تو یہ لٹریچر حد درجہ مقبول ہوا اور کئی کئی ایڈیشن اب تک نکلے ہیں۔ آمدنی کا یہ ایک جائز اور وسیع ذریعہ تھا اور اس سے مولانا مودودی اپنے مالی حالات کو ہمیشہ کیلئے مضبوط بنا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ کتابیں تحریک کیلئے وقف کر دیں۔ اس وقت دو چار کتابوں کے علاوہ باقی کتابیں جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب ہو گی، سب جماعت اسلامی کی ملک ہیں۔ اس ایثار کے ساتھ دوسرا ایثار یہ تھا کہ جماعت اور تحریک کے عائد کردہ مختلف فرائض کا بار شروع سے بلا معاوضہ اٹھایا ——— حالانکہ یہ شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں تھا کہ مولانا اپنا پورا وقت دیتے ہوئے بقدر کفالت جماعت سے معاوضہ یا کم سے کم وظیفہ لیتے۔ اس کے لئے اصرار بھی کیا گیا، لیکن وہ قرض اٹھا اٹھا کر تو کام چلاتے رہے، یہ صورت بالکل قبول نہیں کی۔

سوچئے کہ ہمارے پاس کتنی ایک مثالیں ایسی موجود ہیں!

اسی موضوع کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مولانا مودودی کا پارٹ مجلس شوریٰ میں دکھایا جائے جو بیرونی دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے۔

مودودی صاحب ہمیشہ مقررہ وقت پر پہلے سے "ایوان" (جو بیشتر ان کا دفتر ہی ہوتا ہے) میں موجود ہوتے ہیں۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ سابق کارروائی پڑھی جاتی ہے۔ ایجنڈا پڑھا جاتا ہے اور اکثر اوقات تمام ارکان شوریٰ باری باری اپنے اپنے علاقوں کے تحریکی حالات کے بارے میں معلومات پیش کرتے ہیں۔ پھر مسائل پر بحث شروع ہوتی ہے۔ مولانا مودودی بحث کے دوران ہر نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے کے موڈ میں پرسکون طریق سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابتدائی عام بحث کے بعد آہستہ آہستہ دو یا زیادہ اختلافی آرا متعین شکل میں سامنے آجاتی ہیں اور ضرورت ہو تو ان کو مولانا مودودی بصیرت مندانہ تجزیہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اب ان آرا کے حق میں مختلف افراد (جو کبھی مستقل گروہ بندیوں کی شکل اختیار نہیں کرتے) انفرادی طور پر استدلال کرتے ہیں۔ بحث اگر الفضباط سے ذرا ادھر ادھر ہو تو مولانا ٹھنڈے انداز سے از سر نو تجزیہ کر کے اسے پھر راہ راست پر ڈال دیتے ہیں۔ اگر لوگ زیادہ بولنے لگیں تو کسی کسی موقع پر یکایک مولانا اٹھیں گے اور مسکرا کر کہیں گے "اچھا حضرات! آپ بحث جاری رکھئے میں ذرا ڈبیہ بھروا لاؤں"۔ اس پر اکثر چہرے مسکرا اٹھتے ہیں اور لطیف ترین انداز کی اس تنبیہہ کو سمجھ کر بحث لیے پن کا از خود سدِ باب کر لیتے ہیں۔ مولانا مودودی نہ تو اس دوران میں اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور نہ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے

سے وہ کوئی چیز طے کئے بیٹھے ہیں جسے منوانا چاہتے ہیں۔ واقعی صورت ہوتی بھی یہی ہے کہ وہ دوسروں کی بحث سے بہت کچھ اخذ کر کے وہیں کے وہیں اپنی رائے کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اپنے منصب کے زور سے انہوں نے کبھی کسی بات کو نہ پیش کیا ہے، نہ منوایا ہے۔ وہ اگر کوئی نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو وہ بحث کے بعد کسی موقع پر دلنشین انداز میں دلائل و وجوہ کے ساتھ اسے پیش کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ وہ اپنے رفقائے شوریٰ سے اخذ کرتے ہیں اور کچھ ان کا نقطۂ نظر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح لین دین سے متفقہ فیصلے طے پاتے ہیں۔ دو یا تین اختلافی رجحانات کے درمیان جب بحث بہت طول کھینچ جاتی ہے تو مولانا مودودی ان کے مابین نقطۂ اعتدال پیدا کر کے اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بحث کا طوفان چھٹ چھٹا جاتا ہے۔ شوریٰ کی تاریخ میں گنتی کے مواقع ایسے آئے ہیں جن پر رائے شماری سے فیصلہ ہوا ہو، ورنہ عمومی معمول بلکہ روایت یہ ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اتفاقِ رائے اور اطمینانِ قلب و ذہن کے ساتھ ہی معاملات طے پاتے ہیں۔ مجلس شوریٰ میں مولانا مودودی کا ایک اہم پارٹ یہ رہتا ہے کہ جب بھی بحث کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے تو وہ ایک تبسم انگیز فقرے سے اس کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں۔ یہ حقیقت باہر کے لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی کہ ہمارے ہاں اگرچہ تمام مسائل پر ارکانِ شوریٰ باہم بھی اور امیر جماعت سے بھی گفتگوئیں کرتے رہتے ہیں، لیکن "ایوان" سے باہر امیر کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ہم خیال تیار کر کے لائے اور نہ ارکانِ شوریٰ علیحدگی میں امیر کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ یہ سارا کام ایوان کے اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ اس سبب سے نہ گروہ بندی پیدا ہوتی ہے، نہ سازشیں! ——— اور ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کا حصہ دار ہے اور اس کی رائے ویسی ہی قیمتی اور اس کا استدلال ویسا ہی اہم ہے جیسے کسی اور کا اور خود امیر کا!

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میرے اس مطالعۂ شخصیت میں اچھے ہی اچھے پہلو دیکھ کر مجھ پر قصیدہ گوئی کا الزام رکھے۔ میں کسی کو روک نہیں سکتا، مگر اتنا حسنِ ظن اپنے آپ سے ضرور رکھتا ہوں کہ قصیدہ گوئی کے لئے میرا مزاج بنایا ہی نہیں گیا۔ مگر دوسری طرف میرا مزاج یہ بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا تکلف کر کے کچھ کیڑے کسی کے اندر نکالوں۔ مودودی صاحب کی شخصیت کا مجموعی ڈھانچہ بہت ہی صاف ستھرا اور نفیس ہے اور اس میں کوئی بنیادی اور اہم قسم کی کوتاہی یا فساد موجود نہیں ہے۔ یوں وہ انسان ہیں، رائے قائم کرنے، فیصلے دینے، معاملات کو سمجھنے اور تدابیر اختیار کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں، ہم سب ایسی غلطیوں پر ان سے بحث بھی کرتے ہیں اور اگر ہمارے دلائل مضبوط ہوں تو مولانا مودودی قائل ہو کر تبدیلی بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اُن کے اخلاق اور کردار کی ساخت کا تعلق ہے اس میں کوئی رخنہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ کمزوریاں ان میں ہوں گی مگر آخر تحریک کی بھٹی میں پڑ کر اپنے رفقا کے ساتھ ساتھ خود مودودی صاحب بھی تو بنے ہیں۔ اور وہ تو ہم سب سے پہلے (۱۹۳۰-۳۲ء میں) یہی اس سلگائی ہوئی بھٹی میں از خود پڑے تھے اور اس میں تپتے ہوئے ان کو آج ۲۵، ۲۶ سال ہو چکے ہیں ——— میں اپنے ضمیر کے سامنے بہرحال مطمئن ہوں کہ میں نے عقیدت مندی کے رنگ سے نہیں بلکہ یہ تصویر واقعیت اور حقیقت کے رنگ سے مرتب کی ہے ——— اور اتنی اچھی تصویر سامنے ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مودودی ہرگز کوئی فرشتہ نہیں، وہ معصوم نہیں، وہ انسان ہے اور غلطیاں اور کوتاہیاں اور کمزوریاں رکھنے والا انسان ہے۔

مودودی کی شخصیت کا یہ مطالعہ و تجزیہ ختم کرتے ہوئے میں علی سفیان آفاقی کے چار لفظوں کو دہراتا ہوں کہ "مولانا مودودی کی زندگی اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ وہ ایک انسان کی زندگی ہے"۔ ("ابوالاعلیٰ مودودی") اور ان الفاظ ہی کی روشنی میں تعصب کی ان دیواروں پر ماتم کرنا چاہتا ہوں جن کو لوگوں نے خود اپنے اور مودودی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کو اذن دے رکھا ہے کہ ان دیواروں پر نت نیا پلستر لیپتے رہیں۔ مودودی صاحب سے جسے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے، جو ان کے مذہبی تصور کو غلط سمجھتا ہو وہ اپنا کلامی اور فقہی نقطۂ نظر پورے زور سے سامنے لائے اور جسے اُن کے سیاسی پروگرام سے بُعد ہو وہ سیاسی دائرے میں ان کا پورا پورا مقابلہ کرے ——— مگر وہ اپنی نوعیت کے "انسان" اور ایک تاریخی شخصیت ہونے کے لحاظ سے ساری ملت کی ایک قیمتی متاع ہیں بلکہ انسانی دنیا کے بنیادی سرمایۂ شخصیت و کردار کا ایک جزء!

——— اور ان کی ذات میں علم اور عمل کے کچھ نہ کچھ ایسے پہلو موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی ہمیں ضرورت ہے۔ انہی پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ نکالنے کیلئے ان کا مطالعۂ شخصیت مفید ہے، ورنہ محض ایک شخص جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے کسی دوسرے سے قابلِ ترجیح نہیں ہے۔

علّامہ مشرقی

غلام جیلانی برقؔ

یہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے۔
کہ میرے گاؤں ایسال ضلع اٹک میں میرے والد صاحب کے مُرشد فروکش ہوئے۔ حضرت والد صاحب عقیدت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں اور میرے ایک بھائی غلام ربانی عزیز بھی ہمراہ تھے۔ ہم نے بھی نذرانہ پیش کیا۔ مرشد نے پوچھا کہ یہ بچے کیا کرتے ہیں۔ حضرت والد نے بتایا کہ سرکاری سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بڑا چھٹی میں اور چھوٹا ... میں۔ یہ سنتے ہی مُرشد کے تیور بدل گئے۔ جلالی میں فرمایا۔ ان کو آج ہی سکولوں سے اٹھا لو۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ہم دونوں بھائی مسجد میں بٹھا دیے گئے۔ جہاں ہم نے پہلے فارسی کا نصاب ختم کیا۔ پھر دس برس عربی، نحو، فقہ، منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر اور تاریخ پڑھتے رہے۔

مسجد کے یہ تیرہ برس میری زندگی میں بہت اہم تھے۔ اوّل اس لئے کہ یہاں مجھے زبان پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اور دوم اس لئے کہ مجھے مُلّا و پیر کی اندرونی زندگی دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ یونانی فلسفہ پڑھنے سے میری تقلید کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اور فکر آزاد ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس مذہب کے ہر پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا جو مُلّا پیش کر رہا تھا۔ سینکڑوں شبہات پیدا ہوئے۔ جن کا جواب مُلّا کے پاس موجود نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شبہات بے چینی میں بدل گئے۔ اور اس بے چینی نے بغاوت والحاد کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک میں خدا و رسول اور اسلام و قرآن سے باغی رہا۔ نہ احکام رسول خدا کی تعظیم باقی اور کتاب اللہ کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور مذاق بھی ایسا۔ کہ بڑے بڑے زندیق میرے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اور ابلیس مجھ سے پناہ مانگتا تھا۔

میرا الحاد عین شباب پر تھا۔ کہ ایک دن (اگست ۱۹۲۶ء) ایک دوست علامہ مشرقی کی مشہور کتاب تذکرہ میرے پاس لائے۔ اور کہا۔ کہ اسے پڑھو۔ شاید تمہارے بعض شبہات کا حل اس میں موجود ہو۔ میں نے نفرت و حقارت سے کتاب کو اٹھایا لیکن پہلے ابتدائی جملوں ہی نے میری دنیائے دل میں ایک زلزلہ سا بپا کر دیا۔

"دنیا کی سب سے مسلّم اور مروّج اشیاء میں سب سے بڑا راز مذہب ہے۔ یہ پوچھنا کیوں ہے۔ یہ سمجھنا کیا ہے۔ یہ بھی عقائد۔ یہ شرعی مراسم۔ یہ برہمن کے قشقے۔ یہ بت پرست کی مورتیاں۔ یہ مسلم کی قربانیاں اور ہندو کے

چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ پیر فقیر کی شعلہ نوازی اور عیسائی ماہرین نے دیا ہے۔ اور یہ تسبیح اور سجدہ بار بار۔ حج کے مناسک، جنازے، نماز، تپسیا، پن، دان، زیارت، مزارات، نذر، نیاز، لمبی لمبی داڑھیاں، منتشرع چہرے، تعویذ، اصطباغ، ہون، اشنان وغیرہ...... وہ امور جاری ہیں...... جن کو ہر شخص نہایت عقیدت و التزام سے کرتا ہے۔ ان کے سچ یا جھوٹ ہونے کے متعلق ایک حرف زبان پر نہیں لاتا۔ جاہل اور عالم، کم فہم اور عاقل سب اس مشق نامعلوم میں جتے رہے ہیں اور ان کو بنا بنتے رہنا زندگی کی منتہائے دو سمجھتے ہیں.........

تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس تمام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ کون سا مذہب سچا ہے۔ کونسا شارع کائنات کی منشا کے مطابق ہے اور مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے؟..... ...... اور یہ علم الطبعیات کے حقائق پر سارا جہان متحد ہے.............. زمین کی محوری حرکت یا سورج کے اضافی سکون پر ساری دنیا متفق ہو چکی ہے........ لیکن ہندو اور بدھ، گبر، برہمن، عیسائی اور مسلمان کے درمیان اختلاف بدستور قائم ہے اور رہے گا۔ صداقت کی جامع الاوصاف کیفیت کیوں ان سب کو کسی مشترک حقیقت پر جمع نہیں کرتی؟......

میرا یقین ہے کہ دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے۔ انہوں نے اس کو ایک ہی چشم تحیر سے دیکھا تھا۔ وہ انسان کو ایک ہی مقام بلند سے دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے۔ حیرت کی بجلیاں اور علم و تدبر کی سفید اُن کے باطنوں میں ایک ہی راہ سے داخل ہوئی تھیں........ چونکہ ان کا سب ایک تھا۔ خدا ایک تھا۔ شیطان ایک تھی۔ کلمہ ایک تھا۔ بوسہ یہ پیغام ایک تھا۔ جب تک یہ خرم اسرار لوگ اس دنیا میں رہے اس کو برملا کہتے رہے۔ سولی پر چڑھ چڑھ کر اور رسوا ہو ہو کر خلق خدا کو آمادہ عمل کرتے رہے۔ سب کو ایک نصب العین اور ایک قانون پر متحد کرتے رہے۔ لیکن اُن کے بعد جب نا حقیقت شناس لوگوں نے اس کام کو سنبھالا تو لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پیغام خدا غلط سمجھ کر اپنے پیچھے صفیں کھڑی کر لیں۔ آج سطح زمین پر خدائے قاہر کا منتہائے مذاہب الکثرت میں فساد اور بغاوت مستقر ہے........ یہ مذہب کہنہ فی الحقیقت جہالت اور ناشناسی کی ضد ہے...... علم اور نبوت کی ضد قطعاً نہیں۔ علم جہاں ہوتا ہے اتحاد و اشتراک پیدا کرتا ہے۔ امن و سلام اور سعی و عمل پیدا کرتا ہے........ اس کے ہوتے جھگڑے پیدا نہیں ہوتے...... دو مخالف فریق آج تک اس بات پر نہیں لڑے کہ پانی سیال نہیں۔ آگ ٹھنڈی ہے۔ یا بوجھل چیز آسمان کی طرف جاتی ہے.........اسی طرح اگر روئے زمین کے تمام مذاہب علم کی کسوٹی پر پرکھے جائیں........ تو آج ہی نسل انسانی متحد...... ہو سکتی ہے۔

(تذکرہ علامہ مشرقی، نمائش)

میں اس کتاب کو پڑھتا گیا۔ ان الہامی تشریحات کے متعلق میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہ بات میرے کانوں میں پہلی مرتبہ پڑی۔

"دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے"

مجھے تو ملّاؤں نے یہ سمجھایا تھا کہ پچھلے انبیا کے پیغام نامکمل و ناقص تھے اور ان میں زبردست تضاد و تباین تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک خدا نے ایک نسل انسانی کی طرف سینکڑوں متضاد مذاہب کیوں بھیجے تھے۔ اور اقوام و ملل کو باہم الجھا کر کس طرح نت نئے فتنہ و فساد کی آگ کیوں بھڑکائی تھی۔ علامہ مشرقی نے مجھے پہلی مرتبہ بتایا کہ

"انبیا نے انسان کو اس زمین پر رہنے کا ڈھنگ سکھایا...... اجتماعی بقا کی راہ دکھائی۔ اقوام کے عروج و زوال کے اصول

بیان کئے۔ حکومتِ خدا کو ظلمت سے قطعاً بری ثابت کر کے دنیاوی سزا کی تعبیر کی۔ اُخروی سزا و جزا کی تبیین کی۔ امتوں کو راہِ راست پہ چلا کر صدیوں تک دوام و تمکن دے گئے۔ نافرمانوں کو ان آنکھوں سے سزا ملتی دکھا گئے۔ یہی ان کا اپا ہوا دین تھا...... انبیا کو اس فطرت کے محکمہ کے مسئلے کا علم ان کی بے مثال بصیرت کے باعث ملا...... کمال غور و انہماک سے ملا۔ وسیع نظری و بلند بینی سے ملا۔ تعلّم کے بام بلند اور تدبّر کے اُفقِ اعلیٰ پر چڑھ کر ملا۔ زمین سے کئی منزلیں بلند ہو کر بلکہ ستاروں کی صدہا گاہوں پہ پہنچ کر ملا۔ نہیں نہیں۔ آسمان سے اور آسمان پہ بسنے والے خدا سے ملا۔ وحی اور نبوت سے۔ عجز اور عشق سے۔ تدبّر اور تعلّم سے ملا...... ہر زمانے میں ان انبیا کی بدولت **اصل دین** کی تجدید و تکمیل ہوتی رہی۔ کوئی مخالف راہِ عمل کوئی نیا دین یا جدا مذہب دنیا کے کسی نبی نے حتماً قائم نہیں کیا" (تذکرہ ص ۔۔۔)

زورِ بیان کے علاوہ بات کہنے کا طریقہ اس قدر دلنشیں، مؤثر اور مدلل تھا کہ بات دل میں اُترتی گئی۔ دورِ الحاد میں انبیا کے متعلق میری یہ رائے تھی کہ یہ سب لیڈری کے بھوکے اور دنیوی وجاہت کے شوقین تھے۔ یہ اپنے جلوس نکلوا کر نعرے لگوانا اور پیری مریدی کی دکان چمکا کر دنیا کو لوٹنا چاہتے تھے۔ علامہ نے میرے ان وساوس پہ یوں آگ برسائی۔

"یہ سوال کہ کیا سب رہنمایانِ خلق اور احبیّت (الناس جو اپنی مدت العمر سعی و عمل کے بعد خلقِ خدا کو ایک راہ پہ لگا گئے تھے جو اپنی دھن کے اس قدر پکے تھے کہ گردنیں کٹوا گئے مگر اپنی بات کو نہ چھوڑا۔ کیا یہ سب معاذاً باللہ جھوٹے اور دغاباز تھے۔ کیا ان کا تنا ہوا بانا سب مکر و فریب کا جال تھا...... کیا ان سب کو نفس نے اس قدر دھوکہ دے رکھا تھا کہ دھوکے میں جیتے رہے۔ دھوکے میں کٹتے رہے۔ دھوکے میں قوموں کو امن و امان کے فلک الافلاک تک پہنچا گئے۔ اور دھوکے میں مر گئے...... کیا موسیٰؑ فی الحقیقت ایک بے علم، بدحواس، دیوانہ اور مختل الحواس مجنون تھا جو فرعون کی طاغوتی طاقت کے خلاف یہ سوال علانیہ برسرِ پیکار رہا۔ جو اپنی بے سروسامانی کے باوجود اس کو علی الاعلان ہلاکت کا اٹل پیغام سناتا رہا۔ جس نے ڈنکے کی چوٹ اُسکو اور اس کی قوم کو عذاب کی دھمکیاں دیں..... کیا عیسیٰ علیہ السلام محض ایک مرنجان مرنج، سادہ لوح، خالی الذہن، دنیا و مافیہا سے نابلد اور بھیڑوں کو چرانے والا گڈریا تھا جس پہ قیصرِ روم نے افترا باندھا اسے واجب القتل قرار دیا تھا...... جس کی سنجیدہ آنکھوں میں اُسے ہیبت و خوف نظر آتا تھا...... کیا بدھ علیہ الرحمۃ والسلام جیسا باکمال شخص جس کے پیروؤں کی تعداد آج دنیا کے سب نئے اور پرانے مذاہب کے ماننے والوں سے بڑھ کر ہے... فی الحقیقت ایک بیہ کش و نفس کش، ایک خشک مغز اور بیرمعنی آکیس زاہد ہی تھا جس نے تختِ سلطنت کو لات ماردی اور باشندگانِ زمین کو راہِ راست پہ لانے کیلئے وہ اندوہناک مشقتیں جھیلیں کہ سطحِ زمین یکسر کپکپا اُٹھی اور قرنوں تک اس لرزش کا اثر چار دانگِ عالم میں باقی رہا......

...... کیا وہ سالارِ انبیا اور ختم الرسل محمد علیہ السلام والصلوٰۃ جس کے آسمانِ تشکلات علم و عمل کو دیکھ کر [illegible] کامو سلادھار مینہ ہو کے زمین پہ ابدالآباد تک برستا رہے گا۔ جس کے قانون انقاد فنا کی زمین پہ [illegible] اور [illegible] تو سلام بھیجتے رہیں گے۔ جس کی قدرتِ تغیر و انقلاب کا اندازہ کر کے ہم تمام دنیا ان [illegible] کی دائمی آرزو رکھتے ہیں ایسا سرورِ عالم فی الحقیقت ایک کنج نشین، کملی پوش، بے علم آدمی، نادان زاہد، ایک نماز گزار اور متوکل اور [illegible] منتقی ہی تھا جس نے اتنی قلیل مدت میں عرب کی ایسے نام اور بے سود زدہ قوم سے علم و عمل کے وہ تماشے قرآن سے [illegible] [illegible] کے کارنامہ اور دنیا میں [illegible] کیا [illegible] [illegible] اور

پیشوایان زماں العیاذ باللہ بھڑتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ان کی مہتم بالشان کامیابی ۔ کروڑ در کروڑ انسانوں کی ان سے عقیدتمندی ، ان کے لگائے ہوئے پودوں کا اس قدر پھیلاؤ ، اُن کی پیدا کی ہوئی تحریک کا اس قدر دوام بذاتِ خود اس امر کی دلیل نہیں کہ یہ لوگ فطرت کے محکم تدبیر کے مستقل کارندے تھے ۔ وہ ملکوتِ زمین کے متعلق اللہ کے کارکن تھے ۔ کیا آج ایک یا دس یا دس ہزار بڑے بڑے فلسفی بیسیوں برس کی متفقہ سعی و عمل سے ساکنانِ زمین پر وہ قلبی و اجتماعی اثر ۔ وہ ذوقِ یقین ۔ وہ لذتِ اعتقاد ۔ وہ حرکت و تموّج اور وہ بات پیدا کر سکتے ہیں جو ان رہنمایانِ زمین میں سے کسی ایک فرد نے پیدا کی تھی ؟

(تذکرہ ص ۱۵-۱۰)

میں "تذکرہ" کو پڑھتا گیا ۔ یہ شکوہ بیاں ۔ یہ جلالِ تراکیب ۔ یہ ندرتِ اسالیب اور یہ جدّتِ تشریح ۔ بات دل میں یوں اترتی گئی ۔ جیسے گھٹا ٹوپ ظلمت میں آفتاب کی کرنیں ۔ دفعتہً داخل ہو کر ایک گُلبیں سی پیدا کر دیں ۔ میرا جہل و تعصبِ علم میں بدلتا گیا ۔ اور میں مشرقی کے قالب میں ڈھلتا گیا ۔ اس کتاب نے خلائی تصورات کو تار و پود نفتا میں بکھیر دیا ۔ اور قرآن کا سیدھا سادا اسلام کچھ ایسے انداز میں پیش کیا ۔ کہ میری سرکشی اطاعت میں اور میری رعونت تسلیم و انقیاد میں تبدیل ہو گئی ۔ وہی قرآن جو ایک ہفتہ پہلے مجھے تعویذ اور منتر کا شاستر معلوم ہوتا تھا اب نسلِ انسانی کا مکمل ضابطۂ حیات نظر آنے لگا ۔ وہی رسولِ عربی کی قیادت مجھے ایک دنیادار پیر کا جو دھراپا معلوم ہوتی تھی ۔ اب ایک عظیم الشان منفکر ۔ ابن آدم کا سچا رہبر اور کائنات ، الوالعزم نظر آنے لگا ۔

علامہ مشرقی نے اس کتاب میں تین باتیں پیش کی ہیں ۔

اوّل :- کہ ایک اللہ کا پیغام ایک نسلِ انسانی کی طرف ہمیشہ ایک تھا ۔ یہ پیغام کبھی عربی میں نازل ہوا کبھی عبرانی میں ۔ کہیں بابل میں تو کہیں سنسکرت میں ۔ زبانیں الگ الگ تھیں ۔ لیکن نوا ایک تھی ۔ ساغر جدا جدا تھے ۔ لیکن شراب ایک تھی ۔ مذہب ایک زبردست صداقت کا نام ہے جو اقلیموں میں تقسیم نہیں ہو سکتا ۔ وہ ادوار و عہد ہر زمانے میں یکساں رہے ۔ لوہا پانی سے ہمیشہ بھاری رہا ۔ اور پانی نشیب کی طرف بہتا رہا ۔ اگر آج ہمیں اقلیم مذہب میں اختلاف نظر آتا ہے ۔ اگر انسان دشمن کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے ۔ اگر آج بنی اسرائیل عربوں کو فلسطین میں برداشت نہیں کر سکتے ۔ تو اسی فرقہ داری ، تولیت و قوم پرستی [illegible] کو شوں ۔ ہمنوں اور پادریوں پر عائد ہوتی ہے جو نسلِ انسانی کے اتحاد کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ جزیرہ العرب و وادی نیل میں محبت و یگانگت کی وہ نہر سلسبیل نظر نہیں آتی ۔ جو آدمؑ سے لے کر محمدؐ تک نسلِ انسانی کو سیراب کرتی رہی ۔ اور جس کی گھٹی میں تشنگانِ الفت کو اپنی طرف پکار پکار کر بلا رہی ہے ۔

دوم :- کہ صحیح علم مطالعۂ کائنات سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہ کائناتی علم ہی تھا جس کی بنا پر [illegible] ملائکہ سے بڑھ گیا ۔ یہی وہ علم ہے جس سے ہم فطرت کی قوتوں ۔ فضاؤں اور ہواؤں کو مسخر کر سکتے ہیں ۔ سمندروں کو تھم کر توڑ سکتے ہیں ۔ کوہساروں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں ۔ اسی سے خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اور اسی سے الٰہی حکمت و دانش کے رموز کھلتے ہیں ۔ اقبال اور گوئٹے کا [illegible] ہی سمجھ سکتا ہے ۔ جو ان کے ان کارناموں سے پوری طرح آگاہ ہو ۔ یہ کائنات اللہ کا تخلیقی عمل ہے ۔ جب تک اللہ کے اس عمل کا تجربہ [illegible] کا ہوں میں بیٹھ کر مطالعہ نہ کیا جائے ۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ آب و ہوا اور دیگر مکوّنات کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں ۔ پانی میں [illegible] رطوبت اور لذت کہاں سے آئی ۔ رنگترے میں حلاوت کس نے بھری ۔ طاؤس کو رنگینی [illegible] سے بنا دیا ۔ اور لوہا لوہا کیوں رہا ۔ عقاب کو جھپٹ اور بلبل کو نوا کس نے عطا کی ۔ خالق اکبر کی عجیب حکمت اور نیرنگی دانش کا سکہ دل پر نہیں بیٹھ سکتا ۔

علامہ نے اس سلسلے میں انتقاد و سنجیدگی نظریات پر وہ خرد افروز بحث کی ہے [illegible] ایمان سے چھلکنے لگتا ہے ۔

سوم :- یہ مسئلہ مدتوں سے زیرِ بحث چلا آتا تھا کہ جب اللہ نے قرآنِ حکیم [illegible] مقامات پر صرف مسلمانوں سے خلافتِ ارضی کا وعدہ

کیا تھا۔ تو آج نصاریٰ، ہنود اور یہود پیروان بدھ زمین کے بیشتر حصے پر کیوں حکمران ہیں۔ "تذکرہ" کا اصل موضوع یہی مسئلہ ہے۔ اور ... تفاصیل بتائی ہیں
اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ الہامی صحائف کو زبانی زبانی ماننا اور عملاً کچھ نہ کرنا یہودی اور منافقین کی اختراع ہے۔ یہ دنیا دار العمل ہے ...
سے بیڑے پار ہوتے ہیں۔ اللہ کے خزانۂ عامرہ سے وہی اقوام انعام پاتی ہیں جو کام کرتی ہیں۔ جن میں تنظیم، محنت، جذبۂ سرفروشی، اتحاد و ...
کائنات کا ذرہ ذرہ ... سارا عالم گواہی دے رہا ہے۔

"... آمنت میں ... اقبال کا اسلام عملاً و عقداً موجود ہوگا۔ جو قوم اس قانون خدا کا اتباع اپنے تن بدن کو دکھ ... ڈال کر کرے گی ... وہ ... صبر آزما طلب اور صبر آزما خدا سے لپٹے کر رہے گی۔ وہی اس کی ... معنوں میں محبوب و منظور نظر ... ہوگی ... اور ... کہلائے گی ... اگر خلیفۃ اللہ اور ... نیک اعمال ... اسلام اور ... قرآنی ہے۔ تو بس کچھ عمل اور صرف عمل سے ہو سکتا ہے ... اور ... روزی تکلیف ... سے ہو سکتا ہے۔ ... کے نئے ڈھنگ ... ان کا ارادہ ... قوانین خداوندی آسانیاں جمع کر کے اس مقام جلیل کے برقرار رہنے کی امید رکھنا ہوش ... قوم کا کام نہیں۔ ... اور عقیدہ کلمہ ... اور قوموں پر اکتفا کر کے شرعی پاجامے اور باعزت پگڑیاں پہن لینا اور اس طرح اپنے آپ کو مسلمان بنائے رکھنا ... مجبور اور نابکار امت کا شیوہ ہے۔ اس ... واشگاف ... کو دھوکا دینا ہے۔ ... کے ساتھ مکر کرنا ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس زبانی جمع خرچ اور لفظی عبادت کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ... زبانی ... کو ... اسے ملازمت سے برطرف کر دیتا ہے۔ پھر آفتاب ... رقم سے اس کام پر اجرت یا نعمت کی امید رکھنا پوری ... ہے ... بس میری دانست میں اگر ایک شخص اپنے لفظی اور زبانی عقیدے پر عامل نہیں۔ تو اس کا عقیدہ خدا کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا ... کہنا اور کچھ کرنا ... منافقت ہے۔ ... معاشیہ ... قرآن ... کبیرہ ہے ... منافقین کا ... ہے ... برخلاف اس کے جو شخص عمل کر رہا ہے ... وہی اس کے ... ہوتے پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ وہی اس کو ... معنوں میں مان رہا ہے۔ وہی اس کو دل سے آقا تسلیم کرتا ہے وہی **مسلم** اور **مومن** ہے ... مسلمانوں ... قوم نے آج عمل کی تکلیف دہ صورت کو خیرباد کہہ کر **عقائد** کی آرام دہ مکاری پر تکیہ کر لیا ہے۔ اور اس ... کے اندر ایک نیا مکر یہ پیدا کر لیا ہے۔ کہ نہایت عقیدتمندی سے اس بات کے در پے رہتے ہیں کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے عقائد کو درست کیا جائے۔ **اعمال** کے درست ہونے پر بحث قطعاً بند ہو چکی ہے۔ کیا ہم سے مکار ... اس لئے **چھینے** جا رہے ہیں کہ حاکم زمین و آسمان کو اس **لاڈلی** امت کے ... پسند ... رہے ... اسلام عمل اور صرف **عمل** ہے۔ جو عامل ہے۔ اس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ ... بلکہ اسے زبانی عقیدے کی ضرورت ہی نہیں تمام قول و عقیدہ بہر نوع کچھ نہیں۔ آج کچھ نہیں۔ کل کچھ نہیں اور ابد الآباد تک کچھ نہیں۔"

(تذکرہ ص ۸۲-۸۶)

۷۴۰ صفحات اور بڑی تقطیع پر چھپی ہوئی یہ کتاب ... از اول تا آخر اسی طوفانی انداز کے ساتھ چلتی ہے۔ قدم قدم پر جدتیں۔ ترجمہ و تشریح کی ندرتیں، رسوم مناسک کی تنومند تفاصیل اور ضابطۂ عروج و زوال کی ایمان افروز تفاسیر۔ کتاب کو پڑھ کر

ع۔ غل پڑا دنیا میں ... کافر مسلماں ہو گیا

اُس زمانے میں میں اور میرے بڑے بھائی غلام ربانی عزیز (آج کل پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان) گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور میں مدرس تھے۔ وہ بھی "تذکرہ" پڑھنے سے پہلے ملحد سے تھے۔ وہ بھی میری طرح اس کتاب سے متاثر ہوئے۔

اور علامہ مشرقی کو جو اُس وقت گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں پرنسپل تھے۔ خط لکھا کہ میں اور میرے بہت سے احباب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ڈیڑھ سو آدمی آپ کے ہاں آئے۔ تو آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ اس لئے آپ ہی یہاں آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ علامہ نے جواب میں سخت قسم کا انکار کیا۔ لیکن ہم مسلسل لکھتے رہے۔ اور سختانہ غلوت سے کام لیتے رہے۔ آخر علامہ نے سپر ڈال دی۔ اور ہمیں اطلاع دی۔ کہ میں ۱۵ رمضان المبارک (غالباً ستمبر ۱۹۲۹ء) کو آپ کے ہاں بچہ سمیت موٹر میں آرہا ہوں۔ دو تین گھنٹے ٹھہروں گا۔ ہم نے اُن کی بیگم صاحبہ کو ایک ایڈووکیٹ قاضی محمد شفیع مرحوم کے ہاں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔ سڑک پر تین میل تک سکاؤٹ کھڑے کر دئیے تھے۔ اُن کے پاس بگل تھے۔ مقصد یہ کہ جب انکی کار نمودار ہو۔ تو بگل بجائیں۔ تاکہ ہمیں اطلاع ہو جائے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اُن کی کار قاضی صاحب کے مکان کے سامنے رُکی۔ اندر سے ایک طویل قامت۔ خوش پوش۔ گندمی رنگ۔ ڈاڑھی صاف۔ اور گھنی مونچھوں والا انسان نمودار ہوا۔ سفید ریشمی پتلون۔ اوپر سفید ریشمی اچکن۔ سر پہ ترکی ٹوپی۔ "مجھے مشرقی کہتے ہیں۔ اور یہ ہے اکرام ابن المشرقی" اکرام کی عمر بمشکل آٹھ نو برس کی ہوگی۔ علامہ صاحب بیٹھک میں تشریف فرما ہوئے۔ خیر و عافیت کی رسمی گفتگو کے بعد علمی مسائل زیر بحث آگئے۔ آپ نے جنت و دوزخ پہ بھی روشنی ڈالی۔ اور فرمایا۔ کہ جنت و جہنم دنیا میں بھی موجود ہیں سکونِ قلب ایک جنت ہے جو صرف قرآنی کردار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ سلطنت بھی جنت ہے۔ علم بھی جنت ہے۔ قابل اور سعادت مند اولاد بھی جنت ہے حسین اور شریف رفیقۂ حیات بھی جنت ہے۔ اسی طرح تکالیف۔ امراض۔ پریشانیاں۔ افلاس جہالت۔ غلاظت۔ بدکردار بیوی سب جہنم ہیں۔ انسان جنتوں اور جہنموں میں محصور ہے۔ قرآن ایک ایسی زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے آپ کی زندگی میں بے شمار جنتیں جمع ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں دنیوی آرائشوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں جنّات (جنت کی جمع) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ اُخروی جنت صرف ایک ہے۔ اس لئے اُسے ہر جگہ "جنت" کہا، جنّات نہیں کہا۔ آپ نے اُخروی جنت کے متعلق فرمایا۔ کہ وہاں داخل ہو کر ہر جنتی کو ایک زبردست مسرت حاصل ہوگی اللہ تعالیٰ اس مسرت کو دوام عطا کر دیں گے۔ دنیا کی تمام مسرتیں عارضی ہیں۔ ایک شخص کو ڈربی کا ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا ہے۔ اُسکی مسرت چار پانچ دن کے بعد مدھم پڑ جاتی ہے۔ لیکن جنت کی خوشیاں اور مستیاں لازوال ہوں گی۔ اگر دنیا میں جنسی لذت کے بعض لمحات کو لازوال کر دیا جائے تو یہیں جنت بن سکتی ہے۔

گفتگو جاری تھی۔ کہ ظہر کی اذان ہوگئی۔ بیٹھک ہی میں صفیں آراستہ ہوگئیں۔ ہم سب مسرور تھے۔ کہ آج ایک عظیم مفکر و مفسر کی قیادت میں نماز ادا کریں گے۔ لیکن علامہ نے یہاں بھی جدت کو نہ چھوڑا۔ اور اپنے نابالغ بچے اکرام کو فرائض امامت سرانجام دینے کے لئے آگے کر دیا۔ بچے کی خود اعتمادی دیکھئے۔ کہ بے دھڑک آگے بڑھا۔ اور پوری صحت سے نماز پڑھائی۔ بعد نماز علامہ مشرقی نے اجازت چاہی اور واپس چلے گئے۔

۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں مجھے عربی ایم۔ اے کے لئے جانا پڑا۔ اس سال دسمبر کے آخری ہفتے میں مجھے علامہ مشرقی کا ایک خط پشاور سے ملا۔ کہ میں مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے ہالینڈ جا رہا ہوں۔ فلاں تاریخ (غالباً ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء) کو شام کے چار بجے مجھے میکلوڈ روڈ پر خواجہ فیروز دین بار ایٹ لاء کے مکان پر ملو۔ میں چند ہم جماعتوں کے ساتھ وہاں گیا۔ یہ صحبت رات کے ۱۰ بجے تک جاری رہی۔ ہم نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ اس دوران میں مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ میرے حافظے میں صرف چار محفوظ ہیں۔

(۱) اس مرتبہ علامہ نے ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی۔ میں نے اس "مُلّاپن" کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگے۔ اس کی وجہ ایک فوری جذبہ ہوا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ جب مس سر سلیمان مجھے ملنے کے لئے آئے۔ تو آتے ہی بہ رنگِ معذرت کہنے لگے۔

لہ درمیان میں کھانے کا کوئی وقفہ نہ تھا۔ اس لئے کہ سب مع اکرام بھی، روزہ دار تھے۔ (برق)

لہ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ کسی نے "زمیندار" میرے ہاتھ میں تھما دیا جس میں خواجہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر درج تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (برق)

"معاف فرمائیے گا۔ میں آج شیو (SHAVE) نہیں بنا سکا"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا " کیا ڈاڑھی اتنی بڑی چیز ہے۔ کہ ایک دن بھی منہ پر رہ جائے۔ تو دوسروں سے معافی مانگنا پڑتی ہے ؟

اگر گاندھی بکنگھم پیلس میں ننگے پیروں اور ننگے جسم کے ساتھ جا سکتا ہے۔ تو ایک مسلمان یقیناً ڈاڑھی کے ساتھ دوسروں سے مل سکتا ہے۔ میں اب سے ڈاڑھی رکھوں گا"

بات سن کر لطف ہی آ گیا۔

۲۔ فرمایا :۔

"اس سال جب گرمیوں میں حسب معمول حکومت پنجاب و ہند کے دفاتر شملے میں منتقل ہوئے۔ تو صوبائی و مرکزی دفاتر کے مسلمان آئی سی۔ ایس افسروں نے ایک ادبی جماعت بنائی اور مجھ سے التماس کی۔ کہ آپ "تذکرہ" کی باقی نو جلدیں جلد از جلد شائع فرمائیں۔ اور ساتھ ہی پانچ ہزار جلدیں خریدنے کا نہ صرف وعدہ کیا بلکہ بیس ہزار روپے پیشگی ادا کرنے کی پیش کش بھی کی"

"تو پھر آپ نے کیا جواب دیا" میں نے پوچھا

فرمایا "میں نے انہیں لکھا ہے۔ کہ کیا آپ لوگ "تذکرہ" کی پہلی جلد پر عمل کر چکے ہیں"

علامہ کے اس ٹیڑھے جواب پر غصہ بھی آیا۔ اور مایوسی بھی ہوئی کہ اگر علامہ صاحب قوم کے عمل کا انتظار کرتے رہے۔ تو پھر ان کا وہ وعدہ جو "تذکرہ" کے صفحۂ عنوان پر بایں الفاظ درج ہے۔

"قرآن حکیم کے صحیح مقاصد اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر دس جلدوں میں ایک مکمل اور مبسوط علمی تبصرہ"

کبھی شرمندۂ وفا نہیں ہوگا۔ تذکرہ کی پہلی جلد ۱۹۲۴ء میں نکلی تھی۔ آج پورے تیس برس گزر چکے ہیں۔ علامہ نے چھ جلدوں کے مسودے تیار بھی کئے۔ ان میں سے جلد دوم کا ایک مضمون "گاندھی اور چرخہ" (غالباً یہی عنوان تھا) میں نے بھی پڑھا۔ لیکن کوئی جلد قوم کے مشتاق ہاتھوں تک تا ہنوز نہیں پہنچ سکی۔

۳۔ فرمانے لگے

"ابو الکلام آزاد کی تفسیر جلد میدان میں آ رہی ہے۔ سنا ہے کہ آزاد نے نظریۂ عمل "تذکرہ" سے چرا لیا ہے۔ اور علمی بد دیانتی کی حد یہ کہ اعتراف تک نہیں کیا۔"

چند روز بعد تفسیر آزاد کی پہلی جلد مجھے ملی۔ اور "مالک یوم الدین" کے تحت علامہ کے مشہور نظریۂ عمل کی تفاصیل پڑھیں۔ تو حیرت بھی ہوئی۔ کہ امام الہند مُلّا کے اسلام سے بچ نکلے ہیں۔ اور افسوس بھی۔ کہ "تذکرہ" کا احسان مان لیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ بہرحال میری حیرت بہت زیادہ تھی اور افسوس محض رسمی سا۔

۴۔ اللہ کے قول (الہامی صحائف) و عمل (کائنات) کا ذکر چل پڑا۔ تو ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ جس کا تعلق انگلستان سے تھا۔

"۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ کہ اتوار کا دن تھا۔ اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام کے لئے باہر نکلا۔ تو جامعۂ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (SIR JAMES JEANS) پر نظر پڑی۔ جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا۔ تو وہ متوجہ ہوئے۔ اور کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو" میں نے کہا۔ دو باتیں۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے۔ اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ اگر کوئی مصلحت مانع نہ ہو۔ تو تان لیجئے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔

دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ یہ کیا؟ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں سائنس کے انکشافات اور فرو بزو حقائق نے مذہب کو تعلیمی حلقوں سے باہر نکال دیا تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کے نام تک سے بیزار ہو چکا تھا۔ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے۔ اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے "آج شام کو چائے میرے ساتھ پیئو" میں شام کے وقت ان کی رہائش گاہ پہ پہنچا ٹھیک چار بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں "سر جیمز تمہارے منتظر ہیں" اندر گیا۔ تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ لیڈی جیمز نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے اور ایک پروفیسر صاحب کو دی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "تمہارا سوال کیا تھا؟ اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق۔ اُن کے حیرت انگیز نظام۔ لرزہ فگن پنہائیوں اور فاصلوں۔ انکی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفانہائے نور پہ وہ ایمان افروز تفاصیل پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت سے دہلنے لگا۔ اور ان کی اپنی کیفیت تھی۔ کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت و خشیہ کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے اُن کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے "عنایت اللہ خان! جب میں اللہ کے تخلیقی کارناموں پہ ایک ہلکی سی نظر ڈالتا ہوں۔ تو میری تمام ہستی اللہ کے تصور و جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ اور جب کلیسا میں اللہ کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں۔

"تو بہت عظیم ہے" "تو بہت بڑا ہے"

تو میری ہستی کا ہر ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون و سرور نصیب ہوتا ہے اور ان سجدوں کے بعد میں کچھ ہلکا سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ عام لوگوں کی صرف زبان نماز پڑھتی ہے۔ اور میری ہستی کا ہر ہر ذرہ محو تسبیح و تحمید ہو جاتا ہے۔ مجھے دُوسروں کی نسبت ہزار گنا زیادہ کیف نماز میں ملتا ہے۔ کہو! عنایت اللہ خان! تمہاری سمجھ میں آیا۔ کہ میں گرجے میں کیوں جاتا ہوں؟"

پروفیسر جیمز کی ان تفصیلات نے عجیب کہرام سا میرے دماغ میں پیدا کر دیا۔ میری نگاہِ تصور قرآن کریم کے طول و عرض کا جائزہ لینے لگی اور ایک دلچسپ آیت سامنے آ گئی۔ میں نے کہا

"جناب والا! میں آپ کی رُوح افروز تفاصیل سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کر دوں" فرمایا "ضرور پیش کرو"۔ وُہ آیت یہ تھی۔ "ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانه کذالک انما یخشی الله من عباده العلماء۔

(قرآن)

(وہ دیکھو پہاڑوں میں سفید، سُرخ اور سیاہ رنگ کی تہیں موجود ہیں۔ اسی طرح انسانوں۔ حیوانوں اور دیگر جانداروں کے مختلف رنگ ہماری حکمت کا تقاضا ہیں۔ اور مت بھولو کہ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں)

"کیا کہا۔ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز۔ بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی۔ محمدؐ کو کس نے بتائی تھی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے۔ تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمدؐ ان پڑھ تھا۔ اُسے یہ عظیم حقیقت خود بخود کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب۔ بہت عجیب....." اور پروفیسر جیمز کئی منٹ تک اس آیت پہ سر دھنتے رہے۔ اور محمد عربی علیہ السلام کی خدمت اقدس میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ اسی صحبت میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ آج قرآن کو سائنس کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی خیال نے مجھ سے "تذکرہ" لکھوایا۔

ذرا سلسلۂ اسباب پہ غور فرمائیے۔ مشرقی کا بارش میں باہر آنا۔ سر جیمز سے اتفاقاً ملاقات۔ وہ شام کی چائے۔ وہاں وہ معجزات تخلیق و تکوین پہ حیرت انگیز بحث۔ وہ مشرقی کے قلب و دماغ کا تلاطم۔ اور وہ "تذکرہ" کا تخیل۔ یہاں شاید یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے "ایک اسلام" "تذکرہ"

کے زیرِ اثر لکھی ہے۔ اور "دو قرآن" کا تخیل بھی اسی کتاب کی بعض تفاصیل سے لیا تھا۔

اسی صحبت میں علامہ نے ملازمت ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ تو کہا۔ "والدہ اکرام بار بار طعنے دیتی ہے۔ کہ "تذکرہ" کا مصنف اور انگریز کی ذہنی غلامی کا طوق گلے میں! یہ بات کچھ سجتی نہیں۔ چنانچہ آپ نے کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر دی۔ اور جس کی ترغیب پہ ملازمت چھوڑی تھی۔ وہ علامہ صاحب کو چھوڑ گئیں۔

تیسری ملاقات

۱۹۳۲ء میں خاکسار تحریک پورے جوبن پہ تھی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اندازاً چار لاکھ مسلح رضاکار ہر طرف چپ راست کرتے نظر آتے تھے۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج ہوشیارپور میں معلم تھا۔ کسی کام کو لاہور آیا۔ تو علامہ سے ملنے کی اُمنگ اُٹھی۔ تانگے پہ بیٹھ کر "اچھرہ" جا پہنچا۔ مجھے ایک خاکسار دفتر کی بالائی منزل میں لے گیا۔ یہ تھا علامہ کا خاص کمرہ۔ جس میں نہ کوئی کرسی تھی نہ میز۔ نہ قلم نہ کاغذ۔ فرش پر ایک پھٹی پرانی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک مقام پہ دو مربع فٹ میں چٹائی اڑی ہوئی تھی۔ اور فرش میں یوں گڑھا پڑ گیا تھا۔ جیسے پانی کا قطرہ برسوں ایک ہی جگہ پڑتا رہے۔ اور اس کے نیچے گڑھا بن جائے۔ دس بارہ منٹ کے انتظار کے بعد زینے پہ سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اور چند لمحات کے بعد علامہ مشرقی بایں ہیئت نمودار ہوئے۔ کہ سر کے بال بے طرح بکھرے ہوئے اور گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ نسواری رنگ کا کرتہ بدن پہ۔ اور ویسا ہی ڈھیلا سا پاجامہ کمر میں۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل۔ میں تعظیماً اُٹھا۔ آپ نے خشونت سے لبریز نگاہ میرے قیمتی سوٹ۔ ہیٹ اور ریشمین ٹائی پہ ڈالی۔ بے دلی سے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ مصافحہ کے بعد اس گڑھے والے مقام پر جا بیٹھے۔ اور ڈاک پڑھنے لگے۔ کافی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے۔ "آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے دیرینہ تعلقات جتلاتے ہوئے لیمبرج میں آپ کی آمد کا ذکر کیا۔ تو جھٹ کہنے لگے۔ "وہ ریشمی سوٹ پہن کر بیس ہزار کی موٹر میں مزے اُڑانے والا مشرقی فوت ہو چکا ہے آپ کے تعلقات اسی مشرقی سے ہوں گے۔ یہ مشرقی آپ کو بالکل نہیں پہچانتا۔" اور پھر ڈاک پڑھنے میں کھو گئے۔ علامہ کی یہ طنز میرے لئے ایک الٹی میٹم تھی یا تو ملازمت چھوڑ کر خاکسار تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ اور یا مجھ سے تعلقات منقطع کر دو۔ لیکن میں اتنی بڑی قربانی کے لئے تیار نہ تھا۔ چند لمحات کے بعد میں نے اجازت طلب کی۔ اور یہ تھی علامہ سے میری آخری ملاقات۔ اس کے بعد نہ ملاقات کا موقع ملا اور نہ سلسلۂ مکاتبت جاری رہ سکا۔

حالاتِ زندگی

عنایت اللہ خان ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عطا محمد خان ایک باثر رئیس اور صاحبِ علم بزرگ تھے۔ ایف۔ اے تک امرتسر میں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر فارمن کرسچین کالج لاہور سے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے حساب کی خصوصیت سے ۱۹۰۷ء میں ایم۔ اے ریاضی درجۂ اول میں پاس کیا۔ اور یونیورسٹی کا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں چلے گئے۔ جہاں ۱۹۰۹ء میں آپ ریاضی کے امتحان میں اول رہے اور فاؤنڈیشن سکالر کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۹۱۰ء میں ریاضی کا ٹرائی پوس" اس امتیاز سے پاس کیا۔ "سینئر رینگلر" کا خطاب پایا۔ ۱۹۱۱ء میں "ٹرائی پوس" کے دوسرے امتحانات (عربی و فارسی) میں شامل ہو کر درجۂ اول حاصل کیا۔ ہر ٹرائی پوس" کی میعاد تین برس ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے صرف چار برس میں تین "ٹرائی پوس" میں امتیازی کامیابی حاصل کی تو بہت لندن کے اخبارات نے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ انجینئرنگ کے سب سے بڑے امتحان یعنی مکینکل سائنس ٹرائی پوس میں شامل ہوئے۔ اور نہایت شان سے کامیاب ہوئے۔ اس پہ آپ کو دنیا کے مختلف حصوں سے پیغاماتِ تہنیت موصول ہوئے۔ اور اخبارات نے جلی سرخیوں سے آپ پر شذرات لکھے۔

انگلستان سے واپس آئے۔ تو مندرجہ ذیل اسامیوں پر فائز رہے۔

۱۹۱۳ سے ۱۹۱۶ تک	اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل
۱۹۱۶ سے ۱۹۱۰ تک	〃 〃 〃 پرنسپل

۱۹۱۰ سے ۱۹۱۹ تک انڈر سیکرٹری تعلیمات، حکومتِ ہند۔

۱۹۲۰ 〃 ۱۹۳۱ 〃 سرحد میں پرنسپل ٹریننگ کالج۔ انسپکٹر مدارس۔ رجسٹرار اور پرنسپل گورنمنٹ ہائی سکول پشاور

آپ کو سنہ ۱۹۲۰ء میں آئی ای ایس بنا دیا گیا تھا۔ جب آپ سنہ ۱۹۳۱ء میں مستعفی ہوئے تو اُس وقت آپ کی تنخواہ دو ہزار کے قریب تھی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے خاکسار تحریک کا آغاز کیا۔ جسے سنہ ۱۹۴۰ء میں حکومتِ برطانیہ نے کچل دیا۔ گو یہ تحریک سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد بھی زندہ رہی لیکن موت مسلسل اس کے تعاقب میں رہی۔ یہاں تک کہ ختم ہو گئی۔

تصانیف

علامہ کی تصانیف یہ ہیں:-

۱۔ تذکرہ۔ جس کے متعلق ایک پروفیسر نے علامہ کو لکھا تھا۔

"سماوی کتابوں میں سب سے بڑی کتاب قرآن ہے اور ارضی کتابوں میں "تذکرہ"۔

جہاں تک اقوام کے فلسفۂ عروج و زوال کا تعلق ہے حقیقتاً تذکرہ زمین کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ تعمیرِ اقوام پر آج تک دو ہی اہم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ تذکرہ۔ اور ہٹلر کی مائن کیمف۔ موخر الذکر تذکرہ کے بعد دوسرے درجے پر آتی ہے۔

۲۔ خریطہ۔ جس کا موضوع یہ ہے۔ کہ شاعر دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ جب کوئی قوم ترقی کے انتہائی نقطہ پر پہنچ جاتی ہے تو شاعر مفقود ہو جاتا ہے۔ اور جب زوال شروع ہوتا ہے۔ تو شاعر آجاتا ہے۔ اس نظریہ پر ہر قوم کی تاریخ سے یقین انگیز شہادت پیش کی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

۳۔ اشارات۔ جس میں خاکسار تحریک کا پروگرام اور کچھ ہدایات درج ہیں۔

۴۔ **قولِ فیصل**۔ "تذکرہ" کے رنگ میں لکھی ہوئی ایک مہیّج کتاب۔ جس کا موضوع "حرکت و عمل" ہے اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ہمارا مذہب۔ ہمارا دین۔ ہمارا اسلام۔ ہمارا ایمان عبارت بنتا ہے۔ دنیا کو زیرِ نگیں کرنا ہے۔ [illegible] موسیٰ کی طرح منصور رہنا ہے۔ [illegible] صادقؓ۔ عمرؓ [illegible] نہیں بلکہ [illegible] اور ختمِ رسل کے عمل کی پیروی کرنا ہے۔ اگر یہ نہ کریں۔ تو مسلمان نہیں رہ سکتے .... تم انگریز ابھی کل بادشاہ بنے ہو۔ اور ہم ماں کے پیٹ سے بادشاہ بن کر نکلے تھے۔ بادشاہت ہمارا مذہب ہے۔ اور تم نے مذہب میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس لئے ہم اپنے مذہب پر چل رہے ہیں .... تم اگر اس مذہب کو پسند نہیں کرتے۔ تو پہلے قرآن۔ حدیث اور [illegible] [illegible] دنیا سے مٹا دو [illegible] اپنا مذہب [illegible] [illegible] قُل اعوذ [illegible] اور خود غرض [illegible] کو پیش کیا [illegible] اسلام ہم نہیں مانتے .... کہ [illegible] اور بزدلی کا نام [illegible] کا اسلام ہے۔ [illegible] ایک زمانے میں فرنگیوں نے فتح کیا کرتا تھا۔ جس پر خدا کا [illegible] [illegible] .... [illegible] سے ایک [illegible] سے چلتے پھرتے [illegible] انگریز دنیا کے بادشاہ بنے بیٹھے ہوئے [illegible] بیٹھے ہوئے غریب۔ مولوی اور باسی ٹکڑے کھانے والے بیچارے ملّا کو کیا خبر کہ اسلام کیا ہے۔"

―――――――――――――――――――――――――――

لہ پوشیدہ ہیں بیچارے مولوی کی نظر سے
شہبازِ فلک سیر کے احوال و مقامات — اقبالؒ

"یہ عجیب مکاری ہے۔ کہ تم کہتے ہو۔ رسولِ خدا صلعم نے مسواک کی۔ اس لئے اے مسلمانو! مسواک کیا کرو۔ سرورِ کائنات تہمد پہنا کرتے تھے۔ اس لئے تہمد پہنو۔ ختم رسل ڈھیلے سے استنجا کیا کرتے تھے۔ اس لئے پانی ہوتے ہوئے بھی ڈھیلے سے استنجا کرو ...... یہ عجیب مسخرا پن ہے کہ تم رسولِ خدا کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو دین و ایمان کا جزو سمجھتے ہو۔ لیکن ...... اُنکی چوبیس گھنٹے کی سپاہیانہ زندگی۔ ان کے ہر وقت تلوار اور تیر و کمان سے مسلح رہنے ...... ان کے پے در پے غزوات اُن کے خون فشاں معرکوں ... اور ہر وقت کے عمل اور مستعدی کو شیرِ مادر کی طرح بے ڈکار ہضم کر جاتے ہو ... اور تمہاری شیطانی لغات میں رسول کے ان اعمال کا نشان تک موجود نہیں ...... رسولِ خدا سے تمہاری جھوٹی محبت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جب کوئی شخص تمہیں پھر اُسی سپاہیانہ زندگی۔ اُسی صحبت و مواخات۔ اُسی حرکت و عمل اور اُسی فاتحانہ اور غالبانہ انداز زندگی کی طرف بلاتا ہے ...... تو تمہارے آرام پرست جسم اور غفلت زدہ نفس پکار اُٹھتے ہیں۔ کہ یہ شخص نبی بننا چاہتا ہے۔ تمہارے ارادے صاف ہیں کہ تم عمل سے بھاگنا چاہتے ہو۔ اس غریب کو بدنام کر کے اپنا آرام مانگتے ہو۔ اپنی چند روز کی دکان کی حفاظت چاہتے ہو۔ اور رسولِ خدا کے مشکل پروگرام سے منہ موڑتے ہو ...... کیا مُلّا سے تمہاری صلح صرف اس لئے نہیں۔ کہ وہ بیچارا تمہارے گھر کا نمک کھا کر ...... ایک مسواک۔ ایک تہمد۔ ایک ڈھیلے اور داڑھی کے بدلے تم کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے۔ تم سے ڈر کر قرآن کی آیات چھپاتا ہے ...... تمہاری روٹیاں کھا کر نوکروں اور ذلیلوں کی طرح تمہارے حکم کا بندہ بنا ہوا ہے۔ وقت بے وقت جیسی نماز چاہو پڑھا دیتا ہے۔ مالکِ مسجد کو نام پیدا کرنے تو ظہر کو عصر کر دیتا ہے۔ طلاق چاہو تو طلاق کا فتویٰ لے دے دیتا ہے۔ رجوع چاہو۔ تو رجوع کرا دیتا ہے۔ نکاح پہ نکاح چاہو تو باندھ دیتا ہے۔ اور جہاد و قتال کو ممنوع قرار دیتا ہے ... وہ تمہارے مطلب کا آدمی ہے۔ تمہیں اسلام کا کوئی تکلیف دہ حکم نہیں سناتا۔ تمہاری غلطیوں کی تاویلیں کرتا اور گناہوں کے حیلے ڈھونڈتا ہے ...... یہ ہے تمہارا مولانا۔ مولوی۔ لیڈر۔ مرشد۔ دین کا عالم اور سند لیکن جو شخص سرورِ کائنات کے چوبیس گھنٹے کے عمل کی طرف تمہیں بلائے ...... وہ دجال۔ کافر اور مدعی نبوت۔

یا للعجب (صے)

۵۔ **مولوی کا غلط مذہب**۔ غالباً سولہ رسائل پر مشتمل ہے۔ اس میں مولوی کے آسان اسلام پر بڑی طرح آتشباری کی ہے۔

لغزشیں | میرے مضمون کا تعلق علامہ کی ادبی و ثقافتی زندگی سے ہے۔ سیاسی زندگی سے نہیں۔ لیکن یہ مقالہ ان کی سیاسی زندگی کو چھیڑے بغیر نامکمل رہتا۔ اس لئے اس پر بھی کچھ کہنا پڑا۔

عام دستور یہی ہے۔ کہ جب کوئی مہم کامیاب ہو جائے۔ تو صاحبِ مہم کو بہادر۔ با تدبیر اور ہوشمند بہادر کہا جاتا ہے۔ اور ناکام ہو جائے تو مورخ اسبابِ ناکامی پر بحث کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ کمال اتاترک کامیاب ہو گیا۔ تو مشرق و مغرب کے مورخین نے اس کی جرأت۔ شجاعت۔ تدبیر اور جانبازی پر طویل مقالے لکھے۔ دوسری طرف نپولین کو واٹرلو میں شکست ہوئی تو اُس کی لغزشوں پر بیسیوں کتابیں نکل آئیں۔ یہی حال علامہ مشرقی کا ہے کہ آپ نے عین اُس وقت جب خاکسار تحریک کی حیثیت سے برطانیہ کا ایوانِ تدبر کانپ رہا تھا ... دو خطرناک قدم اٹھائے۔ پہلا ۱۹۳۹ء میں۔ جب علامہ شیعہ و سنی کے تصادم کو روکنے کے لئے کئی ہزار خاکساروں کے ہمراہ یو۔پی میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں مسلح پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا۔ اس تصادم میں درجنوں خاکسار مجروح و شہید ہوئے۔ اور مشین گنوں نے خاکساروں کی ہمت و استقلال پر کاری ضرب لگائی۔ دوسرا تصادم حکومتِ پنجاب سے ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اُس زمانے میں دوسری جنگِ عالمگیر چھڑی ہوئی تھی۔ اور حکومتِ برطانیہ چار لاکھ خاکساروں کی فوج کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتی تھی۔ جنگ میں بعض اوقات حکومتوں کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ اور ہر سپاہی محاذ پہ جا پہنچتا ہے ضعف و

بے چارگی کے ان لمحات میں اگر کوئی شخص ہمت کرے۔ تو حکومت کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ کچھ ایسے ہی خطرات کی بنا پر حکومت نے خاکساروں پر یہ پابندیاں لگا دیں کہ وہ پنجاب کے چار شہروں یعنی جالندھر۔ امرتسر۔ لاہور اور راولپنڈی میں مارچ نہ کیا کریں۔ تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ علامہ مشرقی اس عارضی پابندی کو قبول کر لیتے۔ لیکن وہ قانون شکنی پر ڈٹ گئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء کے شدید تصادم میں خاکساروں کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ علامہ گرفتار ہو گئے۔ اور خاکساروں کے گروہ لاہور کی مختلف مساجد میں جا گھسے۔ جہاں سے تیس چالیس یوم تک مقابلہ جاری رکھا۔ آخر تا بکے۔ حکومت نے سب کو گرفتار کر لیا۔ تحریک کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ ملک میں وسیع پیمانے پر خاکساروں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ اور اس طرح دس برس کی تعمیری کوششیں چشم زدن میں برباد ہو گئیں۔ اور ہماری اُمیدوں کا سر بفلک محل دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

ان تمام حادثات میں مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں علامہ کے ساتھ تھیں۔ لیکن جب تحریکِ پاکستان نے قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم قیادت میں زور پکڑا۔ تو علامہ مشرقی نے پریس اور پلیٹ فارم سے حضرت قائداعظم پر شدید بمباری شروع کر دی۔ ابتدا سے علامہ کا نصب العین آزادی اور اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ جو مجاہد (قائداعظم) اس جہاد میں دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی کمان کر رہا ہے۔ علامہ صاحب اُس ہستی پر کیوں برس رہے ہیں؟ علامہ کی یہ وہ خطرناک لغزش[1] تھی جس نے انہیں مسلمانانِ ہند کی ہمدردی و محبت سے یکسر محروم کر دیا۔ اور وہ منزلِ مقصود میں یوسفِ بے کارواں بن کر رہ گئے۔ اس وقت (مارچ ۱۹۵۴ء) وہ پاکستان میں ایک بے حرکت سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ لکھتے ہیں نہ بولتے ہیں، حالانکہ قدرت نے انہیں ایک شاداب دماغ۔ تنومند فکر۔ طوفانی قلم۔ فلک سیر تخیل اور ایک تند و تیز جذبۂ ایمان عطا کیا ہے۔ وہ تعمیرِ ملت میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارا ملی و انفرادی اخلاق روبہ زوال ہے، ہمارے گراں فروش تاجروں نے عوام کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ ہمارے کارخانہ دار ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ہمارے راشی اہلکار ہماری بنیادوں میں پانی دے رہے ہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جرائم بڑھ رہے ہیں۔ صداقت و دیانت کا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔ رُوح کی کھیتی اُجڑ رہی ہے۔ اور ابلیس کی دنیا بس رہی ہے۔ کیا ان نازک اوقات میں قوم کے اخلاق کو سدھارنے کی ضرورت نہیں؟ کیا بدکردار اقوام کی سلطنت کبھی بھی باقی رہی ہے؟ اگر نہیں رہی۔ اور ہماری بدکاریاں پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکی ہیں۔ تو پھر علامہ صاحب خاموش کیوں ہیں؟ آج خاکسار تحریک کی بہت ضرورت ہے۔ کس لئے؟ بازاروں سے گراں فروشی۔ چور بازاری۔ جھوٹ اور کھوٹ کی لعنت کو مٹانے کے لئے۔ ہر گھر اور ہر فرد تک یہ آواز پہنچانے کیلئے۔ کہ وہ اہلکار جو حرام کھا رہے ہیں۔ وہ افسر جو راشی، کنبہ پرور، استحقاق کش اور انصاف فروش ہیں۔ وہ عوام جو جھوٹ بول رہے ہیں۔ جو اتحاد و تنظیم کی قوت سے محروم ہیں اور جن کی دنیائے دل برباد ہو چکی ہے۔ وہ سب اپنی آزادی کے دشمن اور دولتِ خداداد پاکستان کے بدخواہ ہیں۔ اگر یہ لوگ باز نہ آئے۔ تو دیر و زود اُن سے دولتِ آزادی چھین لی جائے گی۔

فرض کی آواز

میری یہ محکم رائے ہے کہ علامہ مشرقی میں اصلاح و تعمیر کی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ان کا گلکارِ قلم لاکھوں دلوں میں زلزلے پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کی مہیب آواز کروڑوں غفلت زدہ نفوس کو خوابِ غفلت سے جگا سکتی ہے۔ اور اُن کی آتشیں تقریریں برباد و ویران دلوں میں ایمان و یقین کی دہکتی ہوئی چنگاریاں بھر سکتی ہیں۔

کیا علامہ صاحب اپنے فرض کو پہچانیں گے؟

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے (اقبال)

---

[1] میں نے اس تحریک سے پوری ذہنی وابستگی رکھتے ہوئے، پورے خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ باتیں ناگوارِ خاطر ہوں تو معذرت خواہ بھی ہوں۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

شورش کاشمیری

مولانا ابوالکلام آزاد کے پیرایۂ بیان کو ملحوظ رکھیں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۸۹۱ء مطابق ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں ہستیٔ عدم سے اس عالمِ ہستی نما میں وارد ہوئے اور نہرِ حیات سے منہ مہ۔ ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننھیال کی جانب سے شرف الدین احمد نام رکھا گیا۔ عوام نے بانڈے والا پیر کہنا شروع کیا، عقیدت مند صرف شاہ جی کہتے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہ نے انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ اجلاس میں امیرِ شریعت کا لقب تجویز کیا، خود بیعت فرمائی۔ ان کے علاوہ پانچ سو علماء نے بھی بیعت کی جن میں مولانا ظفر علی خان مدیر زمیندار بھی شامل تھے۔

اسلافِ خاندان بخارا سے سمرقند وارد ہوئے۔ سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر کے زمانہ میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان کی رحلت پر خاندان کی شاخیں ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بس گئیں۔ ایک شاخ نے گجرات میں اور دوسری نے پٹنہ میں قیام کیا ــــ آپ کے والد بزرگوار کی شادی اسی شاخ کے ایک بزرگ حکیم سید احمد شاہ اندرابی کی دختر فرخندہ اختر سیدہ فاطمہ اندرابی سے ہوئی۔ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی رحلت پر والد پٹنہ سے گجرات چلے گئے اور دوسری شادی کر لی۔ شاہ جی ننھیال ہی میں رہے جہاں نانی مرحومہ نے بیٹی کی نشانی سمجھ کر بڑی شفقت سے پالا۔ آپ کے نانا ابا کا مکان شعر و ادب کی محفلوں کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی آپ کی نانی صاحبہ سے محاورہ اور روزمرہ کی سند کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ان کی صحبتوں سے آپ نے بھی استفادہ کیا۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری اور زبان و کلام کا ذوق منجھ گیا ــــ

غالباً نانی صاحبہ کی وفات پر آپ نے پٹنہ سے گجرات کا قصد کیا۔ اثنائے سفر میں موانعات پیش آتے رہے۔ ایک آدھ جگہ ملازمت بھی کی۔ کچھ دنوں بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے حتیٰ کہ امرتسر پہنچ گئے وہاں مختلف اساتذہ سے قرآن، حدیث اور فقہ پڑھی۔ بنے خوش الحان اور خوش الحانی کا یہ جوہر آپ کو نانا مرحوم سے ورثہ میں ملا تھا۔ وعظ شروع کیا تو سارا امرتسر گرویدہ ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر پنجاب اور امرتسر کو گولیوں کا تحفہ ملا تو ملک میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا، مولانا داؤد غزنوی کی تحریک پر آپ نے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کی ــــ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ملک میں آپ کی خطابت کا شہرہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں یہ بات متفق علیہ ہو گئی کہ اردو زبان میں آپ سے بڑا کوئی عوامی خطیب نہیں۔

شاہ جی اور خطابت ہم نشیں ہیں۔ آپ نے تقریباً تیس یا پینتیس برس (قید کا زمانہ چھوڑ کر) اس دشت پیمائی میں بسر کئے ہیں۔ برصغیر کی تقریباً دو نسلیں

آپ کے لوٹے لالہ سمیٹ چکے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو آپ کی سیاست سے اختلاف رہا۔ اب بھی اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن کوئی سا شخص بھی اس سے اختلاف نہیں کرے گا کہ خطابت ان کی لونڈی ہے۔ وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں —— ان کی برجستہ گوئی، ان کی حاضر جوابی، ان کی بذلہ سنجی، ان کی نکتہ آفرینی، ان کی زبان دانی، ان کی شعر و سخن سے دلچسپی، غرض —— ع

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

درحقیقت وہ ایک چلتا پھرتا شعری انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اردو، فارسی، پنجابی کسی زبان میں بھی ان کی طبیعت بند نہیں۔ وہ ایک بحرِ مواج ہیں، ان کا کوئی صدف موتی سے خالی نہیں —— بلاشبہ ان کا نام ڈیماستھینز، سسرو، ایڈمنڈ برک، صہبان ابن عزال اور سعد زاغلول کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خطابت اختیار نہیں کی بلکہ خطابت نے انہیں اختیار کیا ہے، برصغیر کی بہت سی تحریکیں انہوں نے چمکائی ہیں۔ وہ زبان و بیان کا ایک ایسا مرقع ہیں جس میں رنگا رنگ تصویریں ہیں، ان کی خطابت کو نگار خانے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے —— ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایک خوبصورت وجود میں عنفوانِ شباب کی جو رعنائیاں ہوتی ہیں وہ تمام تر ان کی خطابت میں ہیں۔ انہوں نے اپنے نیاز مندوں کی سزا بھی بھگتی ہے۔ انگریزوں سے بھی اور مسلمانوں سے بھی لیکن انگریزوں کی سزائیں ان کی متاعِ عزیز ہیں، مسلمانوں سے انہیں کوئی گلہ نہیں، وہ اس کے ڈانڈے تیرہ سو برس کی تاریخ کے مختلف حلقوں سے ملاتے ہیں —— اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ ہے۔ اس حساب سے انہوں نے ہفتہ میں سے ڈیڑھ دن قید و بند میں بسر کیا ہے —— ع

خوردہ افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

—— ان کی نجی محفلیں باغ و بہار ہوتی ہیں —— ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

تمام رات بیت جائے گی لیکن وہ بولنے سے نہیں تھکیں گے اور آپ سننے سے نہیں تھکیں گے۔ جب آتش جوان تھا وہ شروع رات سے پو پھٹنے تک تقریر کرتے اور لوگ تھے کہ نقش کالحجر ہو کر بیٹھے رہتے۔ ان کا مضمون، زلفِ یار کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا کہیں ختم نہیں ہوتا۔

تنہائی سے انہیں سخت نفرت ہے۔ غالباً اس کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں۔ وہ زندگی کو بازار سمجھتے اور بازار ہی پر مرتے ہیں لیکن سب سے بڑا عوامی خطیب ہونے کے باوجود عوام کو کالانعام سمجھتے ہیں۔ غالباً ان کا خیال ہے کہ رائے عامہ ہوا کی موج یا بادل کا ٹکڑا ہے۔ ان کے نزدیک رائے عامہ، نظمِ معریٰ، بے تکا راگ، برطانوی سیاست اور غلام احمد کی نبوت عجیب و غریب پہیلیاں ہیں۔

دوستوں پر غایت درجہ اعتماد کرتے ہیں۔ دشمنوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے —— سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد اب سیاسیات سے سخت متنفر ہیں، انہیں انتخاب کے نام سے چڑ ہے، غیبت کرتے نہ سنتے ہیں، دل کی دوستی کو دماغ کی دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ اختلافِ فکر و عمل کے علی الرغم مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سید احمد شاہ بخاری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی یاری کا دم بھرتے تھے مگر جس زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ سے اتحادِ فکر و عمل تھا ان سے دل کی رسم و راہ کا کوئی معاملہ نہ تھا۔

جماعت احرار سیاسیات میں ان کی مساعی شکستہ انجام کا ثمرہ ہے۔ اب تو خیر حکومت ہی نے اسے خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے لیکن ایک زمانہ میں احرار کا طوطی بولتا تھا۔ چودھری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست و بازو تھے۔ اب وہ سبو ٹوٹ چکا، صہبا چھلک گئی، میکدہ اجڑ گیا، آبگینے کے ریزوں میں تلچھٹ باقی ہے اور بقول اقبال ——

بیا یک لحظہ با عاماں درآمیز
کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

حسن جہاں کہیں ہو ان کی کمزوری ہے، پلکوں کی سنانوں سے لے کر پھریروں کی اڑانوں تک میں وہ حسن تلاش کرتے اور اس پر مرتے ہیں۔ وہ جذبات کے لئے جیتے اور جذبات پر مرتے ہیں۔ انہیں عمارتی حسن سے قطعاً لگاؤ نہیں۔ تاج محل کو گاندھی جی کے الفاظ میں مزدوروں کے بیگار کی یادگار کہتے ہیں۔ تمام زندگی سیر و سیاحت میں گذار دی لیکن سیر و سیاحت کے عادی نہیں۔ موٹا جھوٹا پہنتے سادہ غذا کھاتے اور ہنسی خوشی جیتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے طبیعت بیمار ہے، دوستوں کے بچھڑنے اور بچھڑنے کا سخت رنج ہے، فرماتے ہیں:

"میاں اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا، شریف دشمن سے لڑنے میں تو لطف آتا تھا۔"

چہرۂ خوش اور آوازِ خوش ان کی طبعی خوراک ہیں، گو صوفی منش ہیں لیکن مزامیر کے قائل نہیں، صرف گلے کے رس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں ایک گونہ دلبستگی ہے، تمام اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر ازبر ہیں۔ ان کے با موقع استعمال میں جو خصوصیت انہیں حاصل ہے، وہ کسی اور کو نہیں، مولانا آزاد کی طرح ان کے حافظہ کی گرہیں بھی، طبیعت شگفتہ ہو تو کھلتی اور بکھرتی چلی جاتی ہیں، بقول شاعر ع

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

کبھی سرو قامت تھے، اب ان کا قد بھی ان کے دل کی طرح اللہ کے حضور میں جھک گیا ہے۔ چہرہ پر جھریوں کی مسجع عبارتیں، ماتھا کشادہ لیکن تفکر کی کائنات پہنائیوں سے مجروح، آنکھیں ——— ایک زمانہ میں ساری مستی شراب کی سی تھی ——— اب چپ چاپ، گویا کچھ سوچ رہی ہیں۔ لہجہ میں عرب شہسواروں کا بانکپن، قرآن پڑھیں تو قرنِ اوّل کا مدینۃ النبی یاد آ جاتا ہے۔ شعر سنائیں تو عجمی درباروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

"دنیا کسی کے لئے کبھی نہیں بدل سکتی۔ تمام زندگی نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس ہے۔"

اور اب اس مرحلہ میں ع

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

رحمان

اثر صہبائی

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا یہ چیف جسٹس اور پاکستان کا مایۂ ناز فرزند وزیر آباد کے ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں ۱۲ جون ۱۹۰۳ء کو عالم وجود میں آیا۔ ابھی زندگی کی صرف تین بہاریں گزرنے پائی تھیں کہ قدرت نے ایک نہایت ہی کڑا امتحان لیا۔ یعنی ۱۹۰۶ء میں آپ کے والد ماجد جناب شیخ غلام علی صاحب کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ اب صرف آپ کی والدہ ماجدہ تھیں اور آپ کا توام بھائی رحیم۔ زندگی کے آغاز ہی میں مصیبت کا یہ عظیم پہاڑ اس مختصر سے کنبے کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں بھائیوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کا بار آپ کی والدہ کے بھائیوں نے اٹھایا۔ اس گوہر آبدار کی تربیت ان خوش نصیب انسانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ ان میں سے شیخ مولا بخش صاحب تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن شیخ عنایت اللہ اور شیخ رحمت اللہ صاحب اپنی محنت اور ہمت کا پھل دیکھنے کے لئے زندہ ہیں۔ رحمان صاحب کے دل میں ان دونوں بزرگوں کے لئے بے پناہ احترام ہے۔ ان کے احسانات کا آپ کو بڑا احساس ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی اپنے لخت جگر اور نور نظر کی شاندار کامیابیاں دیکھنے کے لئے ۱۹۴۴ء تک زندہ رہیں۔

آپ کی تعلیم وزیر آباد کے ایک مشن اسکول میں ہوئی۔ بچپن سے نہایت ذہین و فطین مگر خاموش طبع تھے۔ غالباً والد کے سانحۂ ارتحال نے آپ کو بہت قبل از وقت سنجیدہ بنا دیا تھا۔ رحمان صاحب نے ۱۹۱۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور صوبہ بھر میں دوئم رہے۔ یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ آپ کے توام بھائی رحیم (آج کل چیئرمین امپروومنٹ ٹرسٹ لاہور) بھی آپ کے ساتھ تھے دونوں بھائی نہایت بھولے بھالے، خاموش اور سنجیدہ تھے۔ دونوں ذہین اور محنتی تھے۔ بڑے شرمیلے اور معصوم تھے۔ لیکن دونوں کے لبوں پر ایک لطیف سا تبسم ہر وقت کھیلتا رہتا تھا۔ دونوں میں بڑی دلکشی اور جاذبیت تھی۔ رحمان صاحب البتہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے باعث بہت ممتاز تھے۔ میں بھی ان ایام میں اسی کالج میں سیکنڈ ایر کا طالب علم تھا۔ گو ہم ایک دوسرے سے کچھ زیادہ متعارف نہ تھے تاہم میرے دل پر رحمان صاحب کی قابلیت، ذہانت، سنجیدگی اور کردار کی مضبوطی کا نہایت گہرا نقش تھا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور بی اے میں HONRS' SCHOOL OF MATHEMATIC

لے لیا اور صوبہ بھر میں اول آئے۔ دو سال کے بعد ریاضی میں ایم۔ اے بھی کیا۔

گورنمنٹ کالج میں ہی آپ نے انگریزی میں انشا پردازی شروع کی۔ آپ کے انگریزی مضامین کالج کے میگزین "راوی" میں شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کے مشہور پروفیسر مسٹر [illegible] رحمان صاحب کی انشا پردازی سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رحمان صاحب کی توجہ اردو ادب کی طرف مبذول کرانے میں بھی پروفیسر صاحب پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ جبکہ آپ ایم۔ اے میں تھے آپ نے اپنی سب سے پہلی نظم "بانگِ جرس" لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی ادبی حیثیت کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے زندہ رہے گی۔

افسوس کہ ہمارے ملک کے بہترین دل و دماغ حکومت کی مشین کے کل پرزے بننے پر مجبور ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اتنی دلکشی نہیں۔ علم و ادب کی قدر پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ کوئی ادیب آزادانہ طور پر محض اپنے ادب کے بل بوتے پر عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں ہر ذہین و فطین شخص اضطراری طور پر ملازمت کے امتحانات کی طرف لپکتا ہے۔ چنانچہ رحمان صاحب بھی آئی۔ سی۔ ایس کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں میں اوّل اور ہندوستان بھر میں تیسرے نمبر پر رہے۔ مزید تربیت کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں عربی اور فارسی بھی ان کے مضامین تھے۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے جملہ اعزازات کے ساتھ اپنے وطنِ عزیز میں واپس تشریف لائے اور مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں لاہور ہائی کورٹ کے اور اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

کچھ ہمتِ مرداں ہوتی ہے کچھ رحمتِ یزداں ہوتی ہے
قطرے ہی سمندر بنتے ہیں، ذرے ہی بیاباں ہوتے ہیں

ایف۔ اے کے بعد رحمان صاحب سے پھر ایک مدت تک ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی سال بعد غالباً ۱۹۴۲ء میں کشمیر میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان دنوں وہاں وکالت کیا کرتا تھا۔ ایک دعوت میں ہم دونوں اکٹھے تھے۔ سرسری سی ملاقات رہی۔ اس وقت تک بھی مجھے رحمان صاحب کی شعر گوئی سے متعلق کوئی علم نہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان پر مجھے بھی کشمیر سے ہجرت کرنا پڑی۔ اس دورِ پرآشوب کا تذکرہ اب لاحاصل ہے۔ میں بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں سیالکوٹ پہنچا۔ ناداری اور بیکاری زوروں پر تھی۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ تمام کاروبار بند پڑے تھے اور اخراجات پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے آبائی شہر میں بھی ایک اجنبی تھا۔ وکالت کا کام غالباً نومبر ۱۹۴۷ء میں شروع کیا۔ طبیعت بیزار رہتی تھی۔ آزردگی اور شکستہ دلی کے باعث کام کاج میں جی نہ لگتا تھا۔ انہی ایام میں رحمان صاحب کی ایک نظم "ناسورِ ازل" ہمایوں میں دیکھی۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔ حیرت بھی کہ اتنی پختہ اور دلآویز نظم رحمان صاحب نے کیونکر لکھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ برسوں سے مشقِ سخن فرما رہے ہیں۔ ان دنوں رحمان صاحب ہائی کورٹ کی ججی کے علاوہ کسٹوڈین کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک مختصر سا خط لکھا جس میں ضمناً اس وقت کی ذاتی پریشانی کا بھی کچھ تذکرہ تھا۔ چند دنوں کے بعد آپ نے مجھے سیالکوٹ میں ہی اسسٹنٹ کسٹوڈین مقرر فرما دیا۔ رحمان صاحب کی اس عملی ہمدردی کا مجھ پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ شکریہ ادا کرنے کے لئے میں لاہور پہنچا۔ آپ نہایت تپاک اور محبت سے ملے اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ آپ نے اپنی افسریت کا مجھے مطلق احساس نہ ہونے دیا۔ شعر و ادب، سیاست، اور زندگی کے دوسرے مسائل پر ایک بے تکلف اور غمگسار دوست کی طرح باتیں کرتے رہے۔ آپ کی ہمدردی اور انسان دوستی کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اس کے چند ماہ بعد مجھے سیالکوٹ کا پبلک پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کے سلسلے میں مجھے آنریبل مسٹر جسٹس ایم۔ آر کیانی [illegible]

شکریہ ادا کرنا ہے جو ان دنوں حکومتِ پنجاب کے مشیرِ قانونی تھے۔ آپ کی بے لوث محبت، ذاتی دلچسپی اور ادب پروری کا میرے دل پر گہرا نقش ہے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ مجھے کبھی کبھی لاہور آنا پڑتا تھا اور لاہور آنے کی سب سے بڑی کشش رحمان صاحب کی ذاتِ گرامی تھی۔ ان کی ملاقات کے تصور سے ہی خوش ہوتا تھا۔ ان سے مل کر عجیب ذہنی اور روحانی راحت محسوس ہوتی تھی اور جب میں ان سے رخصت ہوتا تو ان کی محبوب شخصیت کی ملاقات کئی دن تک میرے لیے باعثِ فرحت و انبساط رہتی۔ یہ ملاقاتیں اگرچہ نسبتاً طویل ہوا کرتی تھیں اس لیے مجھے ان کو ذرا زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہتے تھے۔

آپ بڑی دلکش اور محبوب شخصیت کے مالک ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ افسرانہ تحکم اور طمطراق کو عدالت میں ہی چھوڑ آتے ہیں اور ملنے والوں سے اتنی گرمجوشی، بے تکلفی اور خلوص و محبت سے ملتے ہیں کہ ہر ملنے والا یہ احساس لے کر اٹھتا ہے کہ رحمان صاحب اس کے بہترین دوست ہیں۔ جس کا جی چاہے ملاقات کے لیے آئے۔ جب تک جی چاہے باتیں کرے اور جب جی چاہے اٹھ کر چلا جائے۔ میں نے آج تک رحمان صاحب کو کبھی اس قسم کا اشارہ تک بھی کرتے نہیں دیکھا کہ ملاقاتی ان کے لیے بارِ خاطر بن رہا ہے۔ حالانکہ بعض ملاقاتی ضرورت سے بہت زیادہ طویل اور بیکار گفتگو بھی کرتے ہیں ۔۔۔

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

رحمان صاحب ہر شخص کی بات نہایت غور اور ہمدردی سے سنتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری پوری مدد کرتے ہیں۔ ع

ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشکباری کی

میں سیالکوٹ سے آتا تو علمی اور ادبی موضوعات پر بڑی دلچسپ گفتگو رہتی۔ میری خواہش تھی کہ میں لاہور چلا آؤں۔ چنانچہ محض ضمنی طور پر میں نے اپنی اس دبی دبی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے نہایت گرمجوشی سے اس کی تائید فرمائی اور محض لفظی تائید پر اکتفا نہ کیا بلکہ عملی طور پر اس معاملے میں پوری پوری دلچسپی بھی لی چنانچہ آپ کی اس توجہ خاص کے باعث میرا تبادلہ لاہور میں ہو گیا۔

دوسروں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتے ہوئے رحمان صاحب کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا شخص ان کے احسان کے بوجھ کو محسوس نہ کرے۔ اس قسم کی لطیف خواہش میں نے بہت تھوڑے لوگوں میں پائی ہے۔

لاہور آنے کے بعد مجھے رحمان صاحب کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہے۔ رحمان صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت توازن یا اعتدال ہے۔ ان کے دماغ میں ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ تیزی اور ان کے دل میں حرارت کے ساتھ ساتھ سلامتیٔ طبع کا نہایت عمدہ رچاؤ ہے۔ میں نے آج تک آپ کو خفگی یا برہمی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ ان کی محبت اور گرمجوشی میں بھی رکھ رکھاؤ اور توازن پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں نہ خودی کا نشہ ہے نہ بے خودی کی لغزش۔ علم و حکمت ہے مگر پندار نہیں، خلوص و محبت ہے لیکن حد سے بڑھی ہوئی وارفتگی نہیں، محنت و مشقت ہے لیکن یبوست اور تلخی نہیں، ہمدردی اور دستگیری ہے لیکن نمود و نمائش نہیں، دینداری اور مذہبیت ہے لیکن تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں جب بھی رحمان صاحب کے پاس جاتا عام طور پر ایک معمر اور مفلوک الحال شخص وہاں ضرور آ جاتا اور اپنے آلام و مصائب کی داستان دہراتا رہتا۔ اکثر اوقات وہ باتیں کرتے کرتے رونا بھی شروع کر دیتا۔ بے چارے کو کچھ ثقلِ سماعت کی بھی تکلیف تھی اس لیے خود بھی چیخ چیخ کر باتیں کرتا اور رحمان صاحب کو بھی اپنی طبیعت کے خلاف کچھ اونچی آواز میں جواب دینا پڑتا۔ میں خود بھی اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوتا لیکن اس کی طویل کلامی، ایک ہی بات کا بار بار اعادہ اور چیختا چلاتا مجھ پر کچھ گراں سا گزرتا تھا۔ البتہ رحمان صاحب اس کی رام کہانی بڑے صبر و سکون، تحمل اور

ہمدردی سے سنتے اور تسلی آمیز کلمات سے اس کا دل بڑھاتے۔ اس شخص کے لئے آپ نے روزگار مہیا کیا، سفارشی خطوط لکھے، ٹیلیفون پر متعلقہ حکام سے بات چیت کی۔ غرض اس کی امداد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ بعد میں رحمان صاحب نے اس شخص کی کہانی یوں بیان فرمائی: "وہ ایک ذی عزت اور شریف مہاجر ہے۔ تقسیم سے قبل ایک متمول اور خوشحال انسان تھا۔ اب بڑھاپا ہے۔ ناداری اور بے کاری ہے، اس کا ایک ہی لڑکا تھا جس کو میں نے ایک جگہ ملازمت دلا دی تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ لڑکا ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور اب یہ شخص زندگی کے جملہ آلام و مصائب کا پہاڑ اٹھانے کو تنہا رہ گیا ہے۔"

یہ کہانی سُن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رحمان صاحب کی وسعتِ قلب اور انسان دوستی کا میرے دل پہ نہایت گہرا اثر پڑا۔

۲۴/ اپریل ۵۵ء کا ذکر ہے۔ پہلا روزہ تھا میں رحمان صاحب سے ملنے گیا۔ گرمی کی شدت تھی لُو چل رہی تھی کوئی دس ساڑھے دس کا وقت ہو گا ہم باتوں میں مصروف تھے، یکایک آپ کی نظر باہر پہرہ دینے والے سپاہی پر پڑی۔ دھوپ کی تیزی بڑھ رہی تھی اور سائے گھٹ رہے تھے۔ آپ نے سپاہی کو آواز دی۔ کھڑکی بند تھی وہ سُن نہ سکا۔ میں خود اٹھا اور سپاہی کو آواز دی پھر رحمان صاحب سے دریافت کیا کہ کیا ارشاد ہے۔ فرمایا: "یہ سپاہی غالباً روزے سے ہو گا۔ باہر اب سایہ بھی کم ہی ہو گا۔ اس شخص کو ناحق کی تکلیف پہنچ رہی ہے۔ یہ مقررہ وقت سے پہلے جا سکتا ہے۔"

میں نے سپاہی سے یہ ساری بات کہہ دی۔ سپاہی بے حد خوش اور شکر گزار تھا اور میں دیر تک اس عظیم المرتبت شخص کی انسان دوستی سے متاثر رہا۔

آنچہ بر بستیم و کہ دیدیم بسیار است و نیست
نیست جز انسان درین عالم کہ بسیار است و نیست

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست — ما زندہ از آنیم کہ آرام نہ داریم

آپ اب پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدہ پر ہیں … بالکل ان تھک … چیف جسٹس کا عہدہ بجائے خود انتہائی توجہ اور مصروفیت کا متقاضی ہے لیکن رحمان صاحب کی دیگر مصروفیتیں بھی اتنی ہی ہیں کہ ان کے لئے … [illegible] … آپ شہر کی ادبی مجالس کی صدارت، "الحمراء" کی تنظیم، بزم اقبال اور ادارہ ترقی ادب کی رکنیت اور "مجلس زبان دفتری" کی صدارت وغیرہ وغیرہ۔

عام طور پر ثقافتی مجلسیں بڑے بڑے "آدمیوں" کو صدر وغیرہ محض اس لئے منتخب کر لیتی ہیں کہ ان کے نام کو استعمال کیا جائے۔ نہ اس بڑے آدمی کو مجلس کے کام سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ مجلس کو اس بڑے آدمی سے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ ایسے باعزت عہدے کو بعض لوگ اپنے لئے باعث طمانیت سمجھتے ہیں۔ رحمان صاحب کی رکنیت یا صدارت محض نمائشی یا آرائشی نہیں ہوتی۔ ان مجالس کی کارروائیوں میں آپ ایک حقیقی رکن اور صدر کی طرح دلچسپی لیتے ہیں اور ان کے پروگراموں کو کامیاب بنانے میں وقت اور دماغ صرف کرتے ہیں۔ جو فرض بھی اپنے ذمے لیتے ہیں اس کو پوری دیانت داری سے نباہتے ہیں۔ "مجلس زبان دفتری" کے بعض اراکین نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ رحمان صاحب اصطلاحات کے ترجمے میں پوری پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ ترجمے کے الفاظ پر اچھی طرح غور فرماتے ہیں اور اکثر اوقات اپنی طرف سے الفاظ تجویز بھی فرماتے ہیں جو عام طور پر قابلِ قبول ہوتے ہیں۔ دفتری زبان کے ترجمے کا کام نہایت خشک اور غیر دلچسپ ہے لیکن فرض کی ادائیگی کا احساس سب کر اس کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

"ادارۂ الحمراء" (پاکستان آرٹ کونسل) ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ رحمان صاحب اس کے … [illegible] … ترویج و اشاعت کے سلسلے میں نہایت عمدہ کام کر رہا ہے۔ چغتائی اور زین العابدین وغیرہ کی تصاویر کی نمائش کر چکا ہے۔ شعر و نغمہ کی محفلیں باقاعدہ اور … منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

"بزمِ اقبال" کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ "اقبال" انگریزی اور اردو میں بالالتزام شائع ہو رہا ہے۔ علامہ مرحوم کے متعلق ایک مبسوط اور مستند کتاب زیرِ تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہوگی (یہ کتاب اب شائع ہو چکی ہے "ذکرِ اقبال" اور "فکرِ اقبال") پہلا حصہ مولانا عبدالمجید سالک اور دوسرا حصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے سپرد کیا گیا ہے۔ "ادارۂ ترقیِ ادب" کی طرف سے بھی غیر ملکی زبانوں کی چند بلند پایہ علمی کتابوں کے ترجمے شائع کئے جا چکے ہیں۔

ان تمام اداروں کی روحِ رواں رحمان صاحب کی شخصیت ہے۔ اکثر بڑے لوگ خط کا جواب دینا گوارا نہیں فرماتے اور اس میں اپنی بڑائی محسوس کرتے ہیں لیکن رحمان صاحب اپنی تمام عظمتوں اور مصروفیتوں کے باوجود اپنے ملنے والوں کے خطوط کا جواب دینے میں بڑے مستعد ہیں۔ ہر خط کا جواب مناسب وقت پر مل جاتا ہے۔ خط اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور عام طور پر اردو میں بڑے خوشخط ہیں۔

اگرچہ ہر مسلمان جج کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی فقہ سے براہِ راست متعارف ہو لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اکثر جج اور وکلا صاحبان اسلامی قانون کا مطالعہ بھی انگریزی زبان میں ہی کرتے ہیں۔ بہت کم جج اور وکیل ایسے ہیں جن کو عربی زبان پر اتنا عبور ہو کہ وہ اسلامی فقہ کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ رحمان صاحب عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن آپ نے یہیں تک بس نہیں کی۔ آپ نے باقاعدہ طور پر ایک پروفیسر رکھا ہوا ہے جس سے ہفتے میں دو مرتبہ صبح کے وقت عربی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اس عمر میں باقاعدہ طور پر عربی پڑھنے کا کیا مقصد ہے؟ کیا آپ اسلامی قانون پر کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں؟ فرمانے لگے "اسلامی قانون پر ایک مستند کتاب لکھنے کو جی تو چاہتا ہے اور وقت کی یہ نہایت اہم ضرورت بھی ہے لیکن افسوس کہ میرے پاس تحقیق و جستجو کے لئے اتنا وقت نہیں بہرحال میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ میں فقہ کی کتابوں کو انگریزی کی جگہ عربی میں پڑھ سکوں۔"

آپ بڑے باہمت انسان ہیں اور آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ قانون، انگریزی ادب، فلسفہ، اور اردو ادب کی پرانی اور نئی کتابیں آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ میں نے اردو کی بہت سی نئی کتابیں سب سے پہلے آپ کی میز پر دیکھیں۔ پھر وہ کتابیں محض الماریوں اور میز کی آرائش کے لئے نہیں ہیں بلکہ آپ ہر کتاب کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور ایک بے لاگ رائے قائم کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کی بات تو خیر رہنے دیجئے۔ بعض بڑے بڑے ادیب بھی پوری کتاب پڑھنے کے بغیر ہی اپنا گراں قدر تبصرہ سپردِ قلم فرما دیتے ہیں اور اس حرکت پر فخر بھی کرتے ہیں۔ رحمان صاحب اس گروہ سے الگ ہیں۔ آپ رائے دینے سے قبل پوری کتاب کو ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ایک منصف مزاج جج کی طرح بے لوث فیصلہ دیتے ہیں۔ آپ کی تنقید بے لاگ ہونے کے باوجود ہمدردانہ اور فیاضانہ ہوتی ہے۔

میں نے اپنی کتاب "بامِ رفعت" کا ایک نسخہ پیش کیا اور تبصرے کی خواہش کی۔ ایک دو ماہ بعد آپ سے ملاقات ہوئی تو خود ہی فرمانے لگے "ابھی میں نے 'بامِ رفعت' ایک مرتبہ تو پڑھ لی ہے لیکن تبصرہ لکھنے سے پیشتر میں اس کو دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں۔" چنانچہ اس سے قریباً ایک مہینہ بعد رحمان صاحب نے ایک سیر حاصل تبصرہ رقم فرمایا۔

درگرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم — با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آپ کو صرف اپنے کام سے کام ہے۔ آپ کی زندگی ایک پُروقار، خاموش اور تیز دریا کی طرح ہے۔ نہایت خاموشی اور [illegible] سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ میں نے آج تک آپ کی زبان سے کسی کی تنقیص یا مذمت نہیں سنی [illegible] کی نسبت عیب پوشی بہت زیادہ پسند ہے اور پھر آپ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی کا پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ نمود و نمائش [illegible] خود نمائی اور غیبت کے دھبوں سے آپ کی تصویرِ حیات یکسر پاک ہے۔

۱۹۲۴ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ آپ کی سب سے پہلی غزل ۱۹۲۶ء میں رسالہ "نیرنگِ خیال" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کسی نے اصرار کیا تو کوئی چیز اشاعت کے لئے بھیج دی ورنہ از خود کہیں نہ بھیجی۔ پھر ایک مدت تک آپ کا کلام "زمیندار" [illegible] "ہمایوں" اور ہفتہ وار اخبار رفتار) میں شائع ہوتا رہا اور اس کا علم آپ کے بہت تھوڑے سے احباب کو تھا۔ علامہ اقبالؒ کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ آپ نے ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ شروع کیا اور نہایت مستعدی اور خاموشی کے ساتھ اسے چار پانچ سال میں ختم کیا۔ یہ ترجمہ [illegible] ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ علامہ مرحوم کے کلام کے ترجموں کا جب بھی تذکرہ لکھا جائے گا "ترجمانِ اسرار" کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ لیکن آپ نے اس عظیم کارنامے کو بڑے وقار اور متانت سے سرانجام دیا۔ تصنع، فخر، غرور، تفاخر و تبختر اور خود اشتہاری آپ کے خمیر میں نہیں ہے۔

آپ ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی مجلس INTERNATIONAL CONGRESS OF THE ORIENTALISTS کے اجلاس میں شرکت کے لئے قاہرہ مدعو کئے گئے۔ فواد الاول یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری آپ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن مجھے اس کا علم صرف اس وقت ہوا جب اس مضمون کے سلسلہ میں میں نے آپ سے تفصیلی ملاقات کی۔ میرا خیال ہے کہ اکثر احباب کو اس کا علم ان سطور کے ذریعے ہوا ہوگا۔ آج تک آپ نے اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" نہ لکھا نہ لکھوایا۔ البتہ پنجاب یونیورسٹی والے لکھ دیتے ہیں تو آپ نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ انکسار اور بے نیازی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی!

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند در شہنشاہی فقیری کردہ اند

رحمان صاحب کی روزمرہ زندگی میں شرقیت اور مغربیت کا نہایت خوشگوار امتزاج ہے۔ عام طور پر مغربی لباس پہنتے ہیں لیکن گھر پر [illegible] کا کرتہ اور [illegible] استعمال کرتے ہیں۔ [illegible] اردو میں [illegible] گفتگو ہوتی ہے۔ کھانا بالکل سادہ اور دیسی ہوتا ہے۔ اکل و شرب میں شریعت کی عائد کردہ حدود کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ [illegible] کے پابند ہیں۔ تلاوت قرآن روزانہ تو نہیں البتہ کبھی کبھی ضرور ہوتی ہے۔ ہر ماہ رمضان میں ایک مرتبہ قرآن کریم ختم کرتے ہیں۔ ٹینس کا شوق ہے اور بڑے التزام سے کھیلتے ہیں۔ اگر ٹینس نہ کھیل سکیں تو سیر کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ جسم مضبوط اور موزوں ہے۔ زندگی میں بڑا توازن اور باقاعدگی ہے۔ امیری ہے لیکن امیرانہ ٹھاٹھ یا نخوت نہیں، قوت و اقتدار ہے لیکن بدمزاجی اور رعونت نہیں۔ حقیقت میں رحمان ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

شرافتِ نفس اور خلوص و وفا آپ کے کردار کی نہایت نمایاں خصوصیت ہے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ کی شادی آپ کے ماموں جناب شیخ مولا بخش صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ افسوس کہ یہ ساتھ نہایت ہی مختصر ثابت ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کی رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لئے آپ سے جدا ہو گئیں۔ [illegible] آپ کی عمر [illegible] ولایت کی تعلیم و تربیت [illegible] اور ایک اعلیٰ عہدہ [illegible]

اس دوران میں آپ نے صرف دو نظمیں لکھیں [illegible]

اے تو نزدیک دلی و [illegible] از ما [illegible]

پہلی شادی سے آپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں دوسری شادی کی۔ خدا کی قدرت! اس بیوی سے بھی پورے نو برس تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ کئی مخلص احباب و اقربا ایک اور شادی کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ اگر آپ اولاد کی خاطر تیسری شادی کر بھی لیتے تو اس میں اخلاقاً یا شرعاً کوئی قباحت نہ تھی۔ لیکن آپ ان تمام ترغیبوں اور تحریکوں کو ٹالتے رہے اگر کسی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بس اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئے "بھئی! اگر خدا نے مجھے اولاد دینی ہے تو اس بیوی سے بھی دے سکتا ہے" خدا پرستی اور وفا پرستی کی کتنی روشن مثال ہے! آخر پورے نو برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی بیوی سے فرزند عطا فرمایا اور اب بفضلہ آپ کے تین فرزند اور ایک دختر ہے۔

دورِ حاضر میں ایسے وفا پرست شوہر کی مثال کم ہی ملے گی

رحمان صاحب کی شرافت، انسان دوستی، رحمدلی اور نرم مزاجی کو ان کی کمزوری پر محمول کرنا شدید غلطی ہوگی۔ جہاں کسی اصول کا تعلق ہو وہاں آپ کے کردار کی پختگی کا پوری شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔ یہی فرشتہ سیرت رحمان ایک مردِ آہنی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جب آپ وائس چانسلر تھے تو کالجوں کے طلباء نے ایک منظم اور مضبوط تحریک شروع کی کہ ان کے امتحانات ملتوی کر دیئے جائیں۔ اخبارات میں مضامین نکلے، جلسوں میں تقریریں کی گئیں، جلوس نکالے گئے اور بڑے بڑے زوردار نعرے لگائے گئے۔ وفد پر وفد پہنچا یہاں تک کہ رحمان صاحب کی کوٹھی کے سامنے شدید قسم کے مظاہرے بھی کئے گئے لیکن یہ مردِ خدا ایک چٹان کی طرح اس طوفانِ بلاخیز کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ نہیں کہ طلباء کے ساتھ آپ کو کوئی ہمدردی نہ تھی وہ تو ہمدردی کا ایک پیکر ہے۔ سوال صرف بنیادی اصول کا تھا۔ امتحانات کے التواء کا یہ مطلب تھا کہ آئے دن طلباء کے جائز ناجائز مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یونیورسٹی کا وقار خاک میں مل جاتا اور اس کا تمام نظم و نسق تباہ و برباد ہو جاتا۔ نیز اس میں یونیورسٹی کو بہت سا مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اگر رحمان صاحب اس وقت ذرا سی بھی کمزوری دکھلاتے اور ان مظاہروں کے سامنے جھک جاتے تو یونیورسٹی کے امتحانات حقیقی معنوں میں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ وقتی طور پر آپ سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیتے اور "رحمان زندہ باد" کے بھی چند نعرے بلند ہو جاتے۔

دیانت داری اور فرض شناسی رحمان صاحب کو اپنے والد مرحوم سے وراثت میں ملی ہے۔ آپ کے والد محکمہ ریل میں ملازم تھے۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی، اور کوئی ذریعۂ آمدنی نہ تھا۔ بالائی آمدنی سے پرہیز کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل سے بیوی بچوں کے لئے آسائش کے سامان مہیا نہ کئے جا سکتے تھے۔ آپ کی بیوی کبھی تنگدستی کا گلہ کرتیں تو آپ فرمایا کرتے "کیا میں ان بچوں کے لئے حرام کا لقمہ مہیا کروں؟"

رحمان صاحب نے فرمایا "ہماری والدہ ماجدہ ہمیں اکثر والد مرحوم کی اس قسم کی باتیں سنایا کرتی تھیں اور میں ان باتوں سے بچپن میں ہی بہت متاثر ہوا کرتا تھا۔ ایک شریف، ایماندار اور غریب باپ حقیقت میں رحمتِ الٰہی ہے! انسانی سیرت اور کردار کی تشکیل و تکمیل کچھ ایسے ہی ماحول میں ہوتی ہے۔"

یہ فقرے رحمان صاحب نے بڑے رقت انگیز لہجے میں ادا فرمائے۔

میں نے پوچھا "آپ کا محبوب شاعر کون ہے؟" فرمایا "میرا محبوب ترین شاعر اقبال ہے۔" علامہ مرحوم سے آپ کو بے پناہ عقیدت اور محبت ہے۔ مرحوم کے کلام پر آپ کی بڑی گہری نظر ہے۔ بچپن سے پڑھ رہے ہیں۔ نہ معلوم ایک ایک شعر کتنی کتنی مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ آپ کی اس والہانہ عقیدت کا زندۂ جاوید ثبوت "ترجمان اسرار" (اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ) ہے جو کئی برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اقبالؒ کے بعض "شاہین بچے" تو مرحوم کے لئے بدنامی کا باعث ہی ثابت ہوئے لیکن رحمان کی زندگی میں اقبالؒ کی تعلیم متشکل نظر آتی ہے۔ رحمان کے کردار کی تعمیر میں اقبال کے افکار کو بہت دخل ہے۔

"شاعری کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟" میں نے مزید سوال کیا۔

فرمایا: "شاعری کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جو علامہ مرحوم نے پیش کیا ہے۔ ادب میں اگر اخلاقی اور روحانی افادیت نہیں تو وہ محض ذہنی تعیش ہے میں اپنا نظریہ "بامِ رفعت" کے تبصرے میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔"

"بامِ رفعت" کے تبصرے میں آپ یوں رقمطراز ہیں، "روایتی شاعری جدید قسم کی بھی ہو سکتی ہے اور قدیم نوع کی بھی۔ پرانی روایتی شاعری معروف ہے لیکن نئی روایتی شاعری کی حدیں کسی قدر ترقی پسندی کے غبار نے دھندلی کر دی ہیں۔ میرے نزدیک ہر وہ شاعرانہ تصنیف جو خلوص اور احساس پر مبنی نہ ہو بلکہ محض ایک مقبول طرز کی پیروی میں رونما ہو روایتی ہے، خواہ اسے گل و بلبل کے افسانے کی شکل دی گئی ہو اور خواہ "مزدور" یا "دیہاتی لڑکی" کے عنوان سے، جدید رومانوی انداز میں اسے پیش کیا گیا ہو۔ ایسی شاعری درحقیقت شاعری نہیں ہوتی بلکہ قدماء کی اصطلاح میں محض "قافیہ پیمائی" اور جدید طرز کی نظم کے پیشِ نظر "آہنگ آرائی" کہلا سکتی ہے۔ حقیقی شاعری وجود میں نہیں آتی جب تک کہ خارجی واردات جذبات کی بھٹی میں سلگ سلگ کر قلبی کیفیات میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کی شاعری میں ذاتی تجربہ کا ضمناً یا براہِ راست انعکاس ہونا چاہیے۔"

حال ہی میں "حلقۂ اربابِ ذوق" کے سالانہ جلسے کے موقعہ پر رحمان صاحب نے ایک نہایت ہی مختصر عالمانہ، پرمعنی اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا ہے۔ چند اقتباسات بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں:۔

"ادب برائے ادب کا فرسودہ نظریہ اس حقیقت کی روشنی میں مرچکا یا باطل ٹھہر سکتا ہے۔"

"میری نظر میں تقلیدی اور بے روح ادب جسے مصنف کے ایقان و اخلاص نے جلا نہیں دی، محض روایتی ہے، خواہ روایت پرانی ہو یا نئی۔"

"اس طبقے کے ادیبوں کا ایک گروہ تحت الشعور اور لاشعور کے گڑے مردے اکھاڑنے کو ہی ادبی خدمت سمجھتا ہے۔ اسی ذریعہ سے عریانی، فحاشی، جنسی کج روی اور رسوفیانہ رجحانات نے جدید ادب میں راہ پائی ہے۔ افراط و تفریط نے نوبت یہاں تک پہنچائی کہ بعض من چلوں نے بغاوتِ محض کو اپنا شعار بنا لیا۔ سماج سے بغاوت، قانون سے بغاوت، مذہب و اخلاق سے بغاوت، خدا سے بغاوت، ہر بلند آدرش سے بغاوت۔"

"عظیم ادب وہی ہے جس کے پس منظر میں ایک صحت مند نظریۂ حیات، ایک جیتا جاگتا نصب العین کارفرما ہوتا ہے۔"

روایتی ادب کے علمبرداروں کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ لوگ محض دیرینہ یا جدید روایت کی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سرمایۂ خیال نہیں۔ ان کا تصورِ ادب سراسر میکانکی ہے، ان کی جدت یا ندرت محض الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ ان کے یہاں صورت ہے معنی نہیں، جسم ہے جان نہیں، انہیں ایک طرح سے کاروانِ حیات کا پسماندہ غبار سمجھئے۔"

میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک زندگی کا بہترین نصب العین کیا ہے؟"

فرمانے لگے: "انسان کے لئے بہترین نصب العین وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اقبالؒ نے اسلام کی نہایت دلکش مگر حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسرے نظامِ حیات کی حاجت نہیں۔ اگر ہم لوگ تخلقوا باخلاق اللہ کو پیشِ نظر رکھیں اور سرورِ کائناتؐ فداہ امی و ابی کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں پھر صدیقؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ پیدا نہ ہوں۔ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی ہی زندگی کا

بہترین فلسفہ ہے۔ کام، کام، اور کام، ہی انسان کا فرض ہے۔ نتیجہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی اسلام کی روح ہے۔ السعیُ منّی والاتمام من اللہ۔" رحمان صاحب کے ان الفاظ سے میں بے حد متاثر ہوا۔ یہ محض رنگین بیانی یا وعظ گوئی نہ تھی بلکہ ایک صاحبِ عمل کی روح کی گہرائیوں میں سے اٹھی ہوئی آواز تھی۔ رحمان کی زندگی خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا ایک سبق آموز اور ولولہ انگیز مجموعہ ہے۔

"کون سی کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟" میں نے مزید دریافت کیا۔

فرمایا، "قرآن پاک نے۔ میں نے اس مقدس صحیفے کو بار بار پڑھا ہے اور اب بھی اکثر پڑھتا ہوں اور انشاء اللہ عمر بھر پڑھتا رہوں گا۔ کلامِ ربانی سے بہتر اور کون سا کلام ہو سکتا ہے۔ زندگی کے سفر میں یہ ایک شفیق رہنما اور بہترین رفیق ہے۔"

اس مغرب زدگی، الحاد و زندقہ، اخلاقی انتشار اور روحانی انحطاط کے تاریک و یاس انگیز دور میں رحمان کا وجود حبِ اسلام، حبِ پاکستان اور حبِ خیر و حق کی ایک روشن شمع ہے۔ خدا اس شمع کو دیر تک روشن رکھے اور اس کی روشنی کو تیز سے تیز تر کرے۔ آمین!

اسی ہائی کورٹ میں پہلے بھی دو ادیب اور ادب پرور جج ہو گزرے ہیں، جسٹس ہمایوں مرحوم اور جسٹس سر شیخ عبدالقادر مرحوم۔ ایک شاعر تھے اور دوسرے شاعر گر اور نثر نگار۔ ہمایوں مرحوم کا عہد تو میں نے نہیں دیکھا لیکن سر عبدالقادر مرحوم سے میری کچھ شناسائی بھی تھی اور جن ایام میں، میں لاہور میں زیرِ تعلیم تھا مرحوم اکثر مشاعروں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔ بڑے خوش وضع، خوش پوش، خوش خلق اور خوش ذوق بزرگ تھے۔ تحریر و تقریر میں بڑی شگفتگی اور سلاست تھی۔ بڑے ادب دوست اور ادیب پرور تھے۔ آج جب میں رحمان صاحب کی تصویر کشی میں مصروف ہوں تو بار بار بے اختیار سر عبدالقادر مرحوم کی تصویر کے مختلف پہلو میری نظروں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ معمولی اختلافات سے قطع نظر رحمان صاحب مجموعی طور پر حقیقی معنوں میں شیخ مرحوم کے جانشین ہیں۔

رحمان صاحب ایک اچھے ادیب، بہت اچھے جج اور نہایت ہی اچھے انسان ہیں۔ جب کبھی رحمان صاحب کے جاننے والوں میں ان کا ذکرِ جمیل چھڑ جاتا ہے تو میں اکثر احباب کو ان کی تعریف میں رطب اللسان پاتا ہوں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی ایسا ذاتی واقعہ سناتا ہے جس سے میرے تاثرات کی تائید ہوتی ہے اور میں اپنے حسنِ انتخاب پر خوش ہو کر زیرِ لب یہ شعر گنگناتا ہوں ؎

ہر کس کہ دید روئے تو، بوسید چشمِ من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نہ کرد

حمید نظامی

شورش کاشمیری

پہلی دفعہ حمید نظامی سے ملئے تو آپ کے لئے یہ باور کرنا محال ہوگا کہ یہی وہ شخص ہے جس کا وجود قصرِ حکومت کے شہزادوں سے لے کر کافی ہاؤس کے کھلنڈروں تک زیرِ بحث رہتا ہے، جو اپنے اخبار میں واشگاف ہونے کے باوصف اپنے وجود میں پُراسرار ہے، جس سے وزراء خوف کھاتے اور صحافی حسد کرتے ہیں، جس کی ذات پر پچھلے دس برس میں اتنی بے رحمانہ تنقید کی گئی ہے کہ اس تمام مواد کو جمع کر لیں تو روایتی بھٹیار خانوں کی مسجع و مقفیٰ آوازوں کا ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے لیکن اس نے اپنے بے حوصلہ ناقدوں، کو دلچسپ سزائیں دی ہیں۔ مثلاً "معاصرین" کی تاثرات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا اور حتی الامکان اس بے پروائی سے انہیں نظر انداز کیا ہے جیسے وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتے ہیں۔ جن حکمرانوں سے اس کی ٹھن گئی ان کا ہر جہت سے تعاقب کیا۔ بالآخر وہ مستر چاروں شانے چت ہو گئے۔ کتنوں نے گھٹنے ٹیک دیئے اور اکثر اپنا ستے نظر آنے لگے۔ اس نے ہر معرکہ میں جم کر مقابلہ کیا، ہمیشہ تنہا لڑا، بارہا زخم بھی کھائے لیکن پیٹھ پر نہیں، سینہ پر، کئی دفعہ "موت و حیات" میں ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ غنیم نے شادیانے بجائے لیکن ایکا ایکی ققنس کی طرح وہ اپنی خاکستر سے زندہ ہو گیا۔ اس کی دوستی محدود ہے لیکن جس سے ہے چند اصولوں کے تحت ہے اور پکّی ہے، دوست اس پر اعتبار کرتے اور اس کی رفاقت میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

—— دشمن وہ سخت ہے بلکہ سنگدل، اس کا تیر ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ کوئی وار خطا ہو جائے تو وہ اس سے پژمردہ نہیں ہوتا بلکہ تازہ دم ہو کر دوسرا وار کرتا ہے۔ ایک وار، دو وار، تین وار —— ہاری وار —— آخر وہ پالا مار ہی لیتا ہے۔ اس کی دوستی میں عزت ہے لیکن اس کی دشمنی میں ذلت۔ اس نے حریفوں کے لئے اپنے لغت سے عفو کا لفظ ہی نکال دیا ہے۔ کسی مرحلے میں بھی وہ دشمنوں سے رحم یا تلطف کا عادی نہیں۔ وہ قبروں تک پیچھا کرتا ہے، اس کے ہاں حریفوں کے کفن بھی نوچ لینے کی چیز ہیں۔

—— ہندوستان میں پاکستان کی جدوجہد کے دو بڑے صحافتی سورمے تھے۔ انگریزی صحافت میں الطاف حسین، اردو اخبار نویسی میں حمید نظامی —— حمید نظامی نے روایتی اصولِ جنگ کے تحت ہر حربہ استعمال کیا، نتیجہ معلوم کہ میدان اس کے ہاتھ رہا —— جس سے تاریخِ پاکستان کی صحافت میں اس کا نام سلامت روی (symbole) بن گیا۔ نتیجۃً اس نے اپنے گرد پاکستانی اذہان کی ایک بڑی کھیپ جمع کر لی جو "میدانِ جنگ ——"

میں تو "قوتِ ارادہ" کا کام دیتی رہی لیکن انقلاب کے بعد بعض لوگ نشۂ اقتدار سے بہک گئے۔ بعض نے ساتھ چلنا چاہا لیکن دشواریٔ منزل کے احساس سے پنڈ چھوڑ دیا اور بعض تماشائی ہونے کی خواہش میں خود تماشا ہو گئے۔

اس دور میں مرحوم لیاقت علی، خواجہ شہاب الدین اور میاں ممتاز دولتانہ — یہ تینوں حضرات تھے جن سے ان کی لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ اسباب کیا تھے؟ یہ ایک اختلافی مضمون ہے لیکن عدم کے الفاظ میں ؎

چھوٹی چھوٹی رنجشیں اک حادثہ سا بن گئیں!
چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے دوستی جاتی رہی

منہ سے طرح کہاں سے آیا؟ اس سے قطع نظر یہ لڑائی یک غزلہ دو غزلہ سہ غزلہ ہو گئی۔ نظامی نے جو مکھی لڑی، بانکے پہلوان کی طرح اس کے وار تیز ہوتے گئے۔ کئی جھڑپوں میں وہ خود چور رنگ ہو گیا لیکن "نوائے وقت" دب کر ابھرتا ہی رہا۔ خان لیاقت علی خان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اب انہیں بیچ میں لانا مناسب نہیں لیکن خواجہ شہاب الدین کو اس حقیقت کے اقرار میں تامل نہیں ہوگا کہ وزیر و مدیر دونوں میں کس کا قلم طاقتور رہا۔۔۔

خواجہ صاحب کا ایک خط حمید نظامی کے نام حال ہی میں جدہ سے آیا تھا جس میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"جہاں میں آج بیٹھا ہوں وہاں دل و دماغ دنیوی علائق سے عموماً زنگاری رہتے ہیں۔ کسی "معذرت" کے لئے نہیں، واقعہ کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ "نوائے وقت" ہی اردو صحائف میں پڑھنے کی چیز ہے"

میاں ممتاز دولتانہ سے لگاتار "پدھڑ" رہا۔ انہوں نے "بدلہ" لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور معاملہ اس سے مختلف نہ تھا کہ ؎

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

لیکن یہاں بھی حمید نظامی ہی سرخرو نکلے۔ گو دولتانہ کا دورِ وزارت ان کے لئے سخت ابتلا کا عہد تھا۔ ایک اخبار بند ہوا، ماہنامہ بند، ڈیکلریشن منسوخ، پریس چھاپنے سے انکاری، عملہ غائب، احباب غائب، بیعت لینے حملہ آور، ترقی پسند تماشائی لیکن حمید نظامی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وقت پر اٹھنا، وقت پر لکھنا، وقت پر کھانا، وقت پر چلنا، وقت پر سونا۔۔۔ ہفتہ میں دو بار سینما دیکھنا، دن ڈھلے میٹرو پول پہنچ جانا، ساتھیوں میں گپ لڑانا، ہنسنا کھیلنا اور گھر چلے جانا۔۔۔ دوستوں سے صرف دوستی کی بات کرنا، اور بس۔۔۔ اس سارے عرصۂ مصیبت میں انہوں نے کبھی دوستوں کو اپنی افتادِ صبح و شام سے آگاہ نہیں کیا۔ ہر چہ بادا باد، دوسرے قارئین کے ساتھ ان کے خاص احباب کو بھی اخبار ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ روز نوائے وقت پر کیا گزری؟ "جہاد" کیوں بند ہوا؟ اور "نوائے پاکستان" کیسے از مطبوعات نوائے وقت ہے۔۔۔

پھر ان کا یہ "رویہ" اپنے احباب ہی سے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی ہے۔ گورنر موڈی کے زمانے میں ان پر مقدمہ دائر کیا گیا کہ بغیر لائسنس کے پستول رکھا ہے، وارنٹ نکلے، گرفتاری ہوئی، ضمانت لی گئی۔۔۔ اگلے دن اخبار میں چھپا تو اہلیہ نے حیرت سے استفسار کیا۔ انہوں نے جو "جواب" دیا ملاحظہ ہو:

"اس کا گھریلو معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور اب آپ نے اخبار میں پڑھ ہی لیا ہے۔"

ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مصائب میں جب اپنی بیوی کو بھی حصہ دار نہیں بناتے جو حقیقتاً ان کی شریکِ حیات ہے تو پھر بھلا وہ ان لوگوں پر اپنے مصائب کا کوئی بوجھ کیونکر لاد سکتے ہیں جو محض ان کے شریکِ سخن ہیں۔۔۔ وہ انتہائی گہرے ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے کسی "راز" کا کریدنا

انتہائی مشکل ہے۔ ان کی آنکھوں پر دن کو گہرے چشمے کے سیاہ خول چڑھے رہتے ہیں جن سے کوئی بات بھی نہیں ابھرتی ہے —— چہرہ ان کا گوشت کی تہوں سے اس قدر مجلد ہے کہ ورق الٹے بغیر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب میں کیا ہے۔ انہیں غصہ ضرور آتا ہے لیکن روزانہ نہیں، کبھی کبھار، افراد پر بھی اور خیالات پر بھی۔ اس وقت وہ تھر تھر کانپنے لگتے ہیں" ان کے صاف ستھرے ماتھے پر سلوٹیں جم جاتی ہیں۔ آخر کار قصہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اور عموماً "غیروں" ہی کے گریبان ان کے ہاتھوں چاک ہوتے ہیں —— آج جس گروہ کے ہاتھ میں ملکی سیاست کی باگ ڈور ہے اس کا خمیر رعیت کی خاک میں گندھا ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی عہدِ حکومت میں نہ صرف اپنے ہی خاندانوں کو پروان چڑھایا بلکہ اپنے آپ کو نطفے کا مافوق البشر سمجھا۔ ان کی ساری تاریخ، جمہور المسلمین پر غرّانے کی تاریخ ہے۔ بالخصوص مرحوم پنجاب کے شعوب و قبائل انگریزوں کے خود کاشتہ پودے ہیں ——

حمید نظامی ان کے رخسار پر ایک زبردست چپت ہے۔ اس نے زندگی کی مراعات ورثہ میں حاصل نہیں کیں بلکہ جوڑ بٹور کر بنائی ہیں، اس نے معاشرہ کے خلاف جد و جہد کر کے اپنی راہ پیدا کی اور موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔

سلطان عبدالحمید نے عزلِ خلافت کے فوراً بعد ایک بیان میں کہا تھا "اگر خلافت کا تخت مجھے دوبارہ مل جائے تو میں سب سے پہلے ترکی کے اخبار نویسوں کو دار پر لٹکا دوں" —— یہاں جن خاندانوں کے ہاتھ میں عنانِ اختیار ہے ان میں سے کچھ افراد کی ایک جمعیت، اس کی دوست بھی ہے اور وہ ہر عوامی آنچ سے بے پروا ہو کر دوستانہ روابط نبھا رہا ہے لیکن ان کے اندرونی خیالات میں (الا ماشاءاللہ) طبقاتی شرانہ ضرور ہے۔

جہاں تک اس کے سیاسی خیالات کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے افق ہی سے طلوع ہوا ہے۔ اس میں اور اس سے ثقہ امرا میں خیالات کا کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں، جو ٹکراؤ ہے وہ طبائع اور طبقات میں ہے اسی لئے اربابِ اختیار کی انا اس سے دبکتی، اور وہ جی ہی جی میں کڑھتے ہیں لیکن نظامی ان کی طبقاتی فتح مندیوں کے خلاف ایک تنقیدی قہقہہ ہے۔ وہ غربا کے بچوں کا انتقام ہے، جو بڑی مدت کے بعد پنجاب کے بااقتدار خاندانوں سے بہ جبر لیا گیا ہے ۔

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اس نے اپنے ذکر و فکر کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال لیا ہے اس کی بعض کاوشوں میں اونچے طبقے کے عادات کی ملاوٹ ہے۔ اس خصوصیت نے اس کے "گرد و پیش" بعض ایسے عناصر پیدا کر دئے ہیں جو محض تنور شکم کی خاطر اس پر گالیوں کا جھاڑ باندھتے ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۹ اور ۴۰ سال کے درمیان ہے۔ اس نے زندگی کی عمارت اٹھانے میں ایک ایک اینٹ خود چُنی ہے، وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے خاندانوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی وجہ سے ان کا خاندان پہچانا جاتا ہے۔

اس نے اپنے بل پر تعلیم حاصل کی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایف۔ سی کالج لاہور سے ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔ پڑھاتا رہا، کماتا رہا اور پڑھتا رہا ——

اس کو بڑا بننے کا شوق شروع سے تھا، اس کی طبیعت کے دروازے ادب و سیاست دونوں کے لئے کھلے تھے، ابتداً جرائد و رسائل میں لکھتا رہا۔ "شیرازہ" "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں طبعزاد افسانے، ہلکے پھلکے مضامین اور خاکے لکھے۔ کئی تراجم بھی چھپے، آخر کار اس کی طبیعت کا ایک رُخ بن گیا، اِدھر سیاسیات کا ایسا چسکہ پڑا کہ بہ عہدِ طالب علمی ۱۹۳۷ء میں مسلمان طلبہ کی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سنگِ بنیاد رکھا اور صدر منتخب ہو گیا ۱۹۳۹ء میں صدارت سے علیحدگی اختیار کر لی، پھر ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم کے ایماء اور دوستوں کے اصرار پر صدر بن گیا۔ اسی اثنا میں کالجوں کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ زبان پر قابو تھا، خیالات تقریباً منجھ چکے تھے، بیسیوں مباحثوں میں شرکت کی اور کوئی پندرہ کے قریب انعامی کپ بھی۔

حاصل کیے۔ لاہور سے علی گڑھ تک مارکی، جہاں گئے کامیاب لوٹے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ایم۔ اے کیا تو معیشت کا سوال سامنے تھا۔ کئی راہیں کھلی تھیں، لیکن طبیعت کا میلان صحافت کی طرف تھا۔ انہی دنوں اپنے ایک دوست کے لیے جو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دے رہے تھے، ادبیاتِ اردو کا چار سو صفحات کا ایک خلاصہ تیار کیا جو ایک معروف پبلشر کو پسند آگیا اس نے قیمتاً خرید لیا۔ اپنے نام سے چھاپا چنانچہ اب تک اس کے کئی اڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو ہفتہ وار نوائے وقت نکالا جو پہلے ایک فکری ہفت روزہ تھا۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم کی تحریک "اور آشیرباد" سے روزنامہ ہو گیا۔ پاکستان کے لیے نوائے وقت نے جو کچھ کیا مخفی نہیں۔ ہر کہ و مہ کو معلوم ہے تین چار برس ہی میں ان کی شہرت کا مطلع روشن ہو گیا ——— اس سے پہلے صحافت کا مزاج زیادہ تر ادبی تھا مسلمانوں میں صحافی شاذ اور انشا پرداز عام تھے۔ ایک ایڈیٹر کے لیے شاعر و ادیب ہونا شرط ہوتا تھا، نوائے وقت نے اس سنت سے اعراض کیا ——— جو لوگ اردو اخبار نویسی کو شعر و انشا کی چیز سمجھتے تھے یا جنہیں انگریزی میں دستگاہ کے باعث اردو اخبار نویسی کا وجود ہی اضافی نظر آتا تھا، نوائے وقت نے ان کے خیالات کی نفی کی اور اخبار کو صرف اخبار کی حیثیت سے پیش کیا۔

انگریزی کی برتری نے انگریزی خوانوں کو اردو اخبارات سے بے تعلق کر رکھا تھا اور مشرقی مزاج کے معدودے چند انگریزی خواں بھی اردو اخبار محض اداریوں کی خاطر پڑھتے تھے، نوائے وقت نے اس ذہنیت کو یکسر بدل ڈالا اور اب غالباً نوائے وقت پہلا روزنامہ ہے جو پاکستانی انگریزوں میں بھی خوف یا شوق سے پڑھا جاتا ہے ——— ہمارے ملک کی سیاست میں اس کا وجود ناگزیر ہو گیا ہے، اس کے حامی و مخالف کالی دینے یا تعریف کرنے کے لیے اس کو ضرور پڑھتے ہیں ——— اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ ملکی سیاسیات میں مسائل تخلیق کر سکتا اور بسا اوقات ایسے موضوع پیدا کر لیتا ہے جن پر نقد و نظر اور تنقید و تنقیص کی ایک عام بحث شروع ہو جاتی ہے ——— جس سے ایک خاص ذہن مترشح ہوتا ہے اور مرحوم پنجاب کے اضلاع میں اس ذہن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

"نوائے وقت" یا حمید نظامی لازم و ملزوم ہیں، دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں پیوست ہے، ایک کی نفی سے دوسرا ابھر نہیں سکتا۔ اس کی اپنی پسند و ناپسند بھی شدید ہے بلکہ سنگین، اسی طرح اس کے مخالف و موافق بھی، افراط و تفریط پر ہیں ——— اس کے مخالفوں کی سب سے بڑی تعداد اسی کے طبقے میں ہے۔ اس کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ ان کے طبقے کا ہو کر ان سے آگے نکل گیا ہے ——— اس کے اداریوں میں طوالت نام کو نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور لگی بندھی بات۔ "سر راہے" (فکاہی کالم) کی ادبی حیثیت محل نظر ہو سکتی ہے لیکن اس میں ایک ہلکی سی چوٹ ضرور ہوتی ہے جس سے ضارب و مضروب دونوں لطف لیتے ہیں۔

اکثر لوگوں میں اس کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ مغرور ہے لیکن وہ مغرور نہیں، صرف رکھ رکھاؤ کا عادی ہے، عام لوگوں میں خلط ملط نہیں ہوتا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے "رسم و راہ" پیدا ہو ——— جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے عام ہو جاتے ہیں وہ تبرک کی طرح تقسیم ہو کر اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔

وہ ان کھٹولوں میں بیٹھنے کے بجائے ان کی گالی کھانے میں عزت کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔

اور حمید نظامی کی ساری تصویر الفاظ کے انہی نسخ یا نستعلیق جوڑوں میں ہے۔

آغا شورش کاشمیری

(محمد وارث کامل بی اے)

لاہور کی وہ تفریح گاہ جو شہر کے گرد حاشیہ بناتی ہوئی کہیں ناک کی سیدھ اور کہیں بل کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے آج سے پچیس سال پہلے کسی جوانِ رعنا کے خرامِ ناز کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ اس نوجوان سے میری آنکھیں نہ صرف ایک دو بار بلکہ بار بار چار ہوئیں لیکن کچھ تو اپنی کم آمیزی کے باعث اور کچھ اس وجہ سے کہ اس جوانِ رعنا کی عقابی نگاہیں اذنِ خطاب تو درکنار کسی راہرو کو رسمی علیک سلیک کی اجازت بھی نہیں دیتی تھیں میرے اور اس جوانِ رعنا کے درمیان اجنبیت کی دیواریں حائل رہیں۔ یہ عقدہ بھی نہ کھل سکا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟ نظر کے آئینے پر اس نوجوان کے چہرے بشرے کے جو نقش ابھر آئے تھے میں تصور میں کبھی کبھی انہی سے ہم کلام رہا اور اس ہم کلامی کو بزعمِ خود تعارف سے تعبیر کرتا رہا حالانکہ اس ہم کلامی اور اس تعارف کی حیثیت ایک طلسمِ خیال کی سی تھی۔ اس نوجوان کی ہیئت کذائی جن خصوصیات کا حسین آمیزہ تھی قلم کی زبان آج بھی ان کا مرقع کھینچ سکتی ہے۔ کتابی چہرہ، [illegible] آنکھیں، ستواں ناک، ڈھلکے ہوئے رخسار، شاداب ہونٹ، پتلے کان، کھلی پیشانی، گتھے ہوئے دانت، گھمبیر سر، دائیں بائیں خم کھاتی ہوئی گردن خلقتاً نہیں بلکہ عادتاً، سانولا رنگ، کھچا ہوا قد۔ زبان خاموش لیکن نگاہیں ہر لحظہ گردش میں، چہرے پر متانت ظرافت سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی۔ رفتار ایسی کہ ہر قدم پر سینہ تنے جھکائے اور گفتار ایسی (اس کا اندازہ بعد میں ہوا) کہ پری شیشے میں اتر آئے عزم و حوصلہ کی یہ شان (چہرے کی تراش خراش سے یہ چیز ٹپکتی تھی) [illegible] شعر کا مفہوم سمجھ لیجئے ؎

ہر چند کوہ سے بھی گراں تر ہے بارِ عشق
ہمت یہ کہہ رہی ہے کہ تنہا اٹھائیے

شاہی مسجد میں ایک جلسہ کا پروگرام تھا۔ لوگ شہر کے اطراف و اکناف سے اس کثیر تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ مسجد کا صحن عرفات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس اجتماع میں میں بھی شریک تھا لیکن میری حیثیت ایک ایسے تماشائی کی سی تھی جس کی بیدلی نہ اسے درسِ عبرت دیتی ہے نہ اس کے لئے تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے غالب نے بھی ایسے ہی تماشائی کی ذہنیت کا اس شعر میں ماتم کیا ہے ؎

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

خوش قسمتی سے میں سٹیج کے قریب ہی بیٹھا تھا اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس قرب کی خاطر میں نے اپنے وقت کا کتنا قیمتی سرمایہ صرف کیا تھا۔ مجمع جمے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوپائی تھی کہ میں نے سٹیج پر بچھی ہوئی ایک کرسی پر اس شیر بیشۂ سیاست کو متمکن دیکھا جسے ان ایام میں "زندہ دلان پنجاب" اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے۔ یعنی ظفر الملت والدین مولانا ظفر علی خاں (جو آج کل کس مپرسی کے عالم میں بستر علالت پر اپنی بچی کھچی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں) شاہی مسجد کے بام و در اللہ اکبر اور مولانا ظفر علی خاں زندہ باد کے نعرہ ہائے زلزلہ انداز سے گونج اٹھے۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی۔ تقریر کیا تھی شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک بصیرت افروز مقالہ تھا یا کسی کوہ آتش فشاں کا شعلۂ جوالہ! سامعین "صم بکم عمی فہم لایرجعون" کی تصویر بنے بیٹھے تھے اور اگر اس پورے مجمع میں کسی کو مولانا کے خیالات سے اختلاف بھی تھا تو اس پر یہ کیفیت گزر رہی تھی ؎

دل میں گھٹ گھٹ کے رہ گئی حسرت
لب پہ آ آ کے رہ گیا مطلب

دیکھتا کیا ہوں کہ دہرے چھریرے بدن کا کشیدہ قامت نوجوان سٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور کسی رسمی تمہید کے بغیر تقریر شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ مولانا ایسے بلیغ البیان اور فصیح اللسان مقرر کے بعد اس طوطی کی صدا نقار خانے میں کون سنے گا لیکن اس نوجوان نے اس ٹھسے اور اس زناٹے سے تقریر کی کہ مجمع اس کی تقریر کے اختتام تک جما رہا بلکہ کچھ نعروں سے اپنی دلچسپی کا ثبوت بھی دیا مجھے یاد ہے کہ اس نوجوان نے مولانا کی بارگاہ فضل و کمال میں خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد یہ بھی کہا تھا۔

"مولانا آپ کی شخصیت واجب الاحترام ہے۔ میں آپ کے فضل و کمال کا اعتراف
کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کی ہر بات تسلیم کر لی جائے آپ نے
جو روش اختیار کی ہے میرے خیال میں اس سے قوم کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے کسی فائدہ
کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

میں اس نوجوان کی تقریر کے دوران کچھ ایسا کھو سا گیا تھا کہ قوت متخیلہ بھی جواب دے گئی جو نہ پہچان اور نہ دیکھی بھالی شکل کی شناخت بھی نہ کر سکا۔ جب اس نوجوان کی تقریر کے خاتمہ پر لوگوں میں کھسر پھسر ہوئی تو میں نے بھی کان لگائے۔ کوئی صاحب اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ یار! یہ شورش ہمارے سامنے کا لونڈا ہے کل تک اسے بستہ بغل میں دبائے سکول جاتے دیکھتے تھے اور آج یہ اتنے بڑے مقرر کے کان کتر رہا ہے۔ جس کی دھاک دور دور بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ لونڈا تو آفت کا پرکالہ نکلا یہ بات چیت ابھی ختم ہوئی تھی کہ پیچھے سے ایک صاحب نے میرا شانہ ہلایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ (یہ صاحب کیپٹن شفیق احمد خان ایم اے پی سی ایس ہیں جو آجکل جھنگ میں مجسٹریٹ درجہ اول لگے ہیں) کیوں وارث صاحب! سنی شورش کی تقریر! یہ ہے قابلیت۔ ایک مدت سے ہم دونوں کتابوں کے ورق چاٹ رہے ہیں لیکن پھر بھی ہمارے اندر یہ اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اس دھڑلے سے تقریر کر سکیں۔ وارث صاحب اور اصل تقریر ہی ایک ایسا فن ہے جس سے کسی کی شخصیت بلند ہو سکتی ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہم نے اتنے امتحان پاس کئے ہیں اور ہمارے پاس اتنی سندیں ہیں جو دنیا کی نظر میں ہمارا وقار اونچا نہیں کر سکتیں میں نے کہا بھائی صاحب اس نوجوان شورش کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کئی ماہ برابر میری اور اس نوجوان شورش کی گذرگاہ ایک ہی رہی ہے۔ اندازہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ نوجوان چھپا رستم ہے اور ہونہ ہو ضرور اس کی گدڑی میں لال چھپے ہوئے ہیں لیکن یہ میرا کہنا کہ میں نے اس سے کچھ اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔

یہ نوجوان شورش یہ جوان رعنا شورش جس کی کتاب زندگی کا ایک ورق میں نے اوپر کی سطور میں پیش کیا ہے آج صرف شورش نہیں بلکہ آغا شورش کاشمیری ہے۔ آغا شورش کاشمیری ابھی پیغمبرانہ سن کو نہیں پہنچے ایک سال کے بعد غالباً انھیں عزت، وجاہت اور شہرت کی وہ معراج نصیب ہو گی جس پر ان کے اقران و اماثل رشک کریں گے یہ کوئی منجمانہ پیش بینی نہیں بلکہ ایک پیش قیاسی ہے جو میں نے ان کی عمر کی مناسبت سے کی ہے۔ آغا شورش کاشمیری

نے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو اس رنگ و بو کی دنیا میں آنکھیں کھولیں اس حساب سے وہ اس گلستان آب و گل کی ۴۳ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ کسے خبر تھی کہ آغا شورش کی تاریخ ولادت ۳۰ سال بعد ایک نوزائیدہ اسلامی مملکت "پاکستان" کی تاریخ ولادت ثابت ہوگی۔ یہ تاریخی مناسبت بھی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے یا پھر اسے ان خدمات کا صلہ کہنا چاہیئے جو اس نوجوان سیاسی کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہی ہیں۔

آغا شورش کاشمیری نے عملی سیاست کے میدان میں بال بھارت سبھا کے سیکرٹری کی حیثیت سے قدم رکھا یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ شروع ہی میں زمیندار کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ اور وہ ادبی شہ پارے جو مولانا ظفر علی خاں کے قلم جواہر رقم سے نکلتے تھے آغا شورش بڑے شغف اور بڑے انہماک سے ان کے معانی و مطالب پر غور کرتے اور ان کے محاسن پر سر دھنتے تھے شعر گوئی اور نثر نگاری کی صلاحیتیں بھی انہی دنوں بیدار ہوئیں الہلال و البلاغ کے مطالعہ نے ان کے آئینہ طبع پر کچھ اور صیقل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں کی جذباتیت اور دوسری طرف مولانا آزاد کی ابو الکلامیت دونوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور آغا شورش کی شخصیت پر ادب و انشا، شعر و سخن، تقریر و خطابت اور فکر و نظر کے ایسے رنگین غلاف چڑھائے کہ برصغیر کے طول و عرض میں ان کی دھوم مچ گئی۔ برطانوی دور میں جب تحریک آزادی کی مہم زوروں پر تھی تو اس نوجوان خطیب نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنی شعلہ مقالی اور آتش بیانی کے جھنڈے گاڑ دیئے اس حقیقت سے آج آغا شورش کاشمیری کے بدخواہ بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جہاں تک فن خطابت کا تعلق ہے آغا کا کوئی ہمسر دور دور تک نہیں ہے۔ اسی سال جب یوم اقبال کی تقریب پر آغا نے تقریر کی تو پورے ہال کی روح کھنچ کر آغا کی انگلیوں میں آگئی تھی۔ آغا کی تقریر کا راز جس چیز میں مضمر ہے وہ یہ ہے کہ آغا اپنے خیالات کا اظہار زبان سے نہیں بلکہ زبان دل سے کرتے ہیں۔ زبان و دل کی کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنی آواز کی پوری گونج اور کڑک سے جب آغا شورش کاشمیری تقریر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر معانی و مطالب کی بارش ہو رہی ہے ان کے مطالب الفاظ کے تابع نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ مطالب کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ آغا شورش ایسی زبان لکھتے اور ایسی زبان بولتے ہیں جو عوام کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں گھر کر جاتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری کو تحریک آزادی میں شرکت کی یہ سزا ملی کہ برطانوی استعمار نے انھیں دس سال ۷ ماہ کی طویل مدت تک قید رکھا آغا نے ایک سال دو ماہ قید تنہائی کی سختیاں سہیں دو ماہ دو دن بھوک ہڑتال کی۔ یہ قید ۲۴ الف اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت عمل میں آئی تھی۔ اسی طویل المیعاد اسیری کے عالم میں آغا شورش کو غالباً اپنی زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ انسانیت کا معیار کتنا گر چکا ہے۔ انسان اپنے ہی ایسے دوسرے انسانوں کے ساتھ کتنا بہیمانہ برتاؤ کرتے ہیں انعام عہدہ اور منصب کی ہوس میں لوگوں کا خون کتنا سفید ہو گیا ہے کہ وہ یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس شخص کے ساتھ ہم وحشت و درندگی کا سلوک کر رہے ہیں وہ خود انہی کی قوم کا ایک فرد ہے۔ بیڑی، ڈنڈا بیڑی، ہتکڑی، تو بڑے ... سنٹرل جیل کے صحن میں بہتے ہوئے گندے گٹر یہ ہیں وہ تقریری ہتھکنڈے جو ملک کے اشارے پر جیل کے حکام نے آغا کے خلاف بڑی بے رحمی کے ساتھ استعمال کئے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک آغا کی زندگی کے دس سال قومی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر بسر ہوئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا کی سیرت کی تعمیر اسی دس سالہ مدت کا ماحصل ہے۔ اگر آغا کی زندگی کے دامن پر قید و بند کی صعوبتوں کے داغ نہ ہوتے تو غالب قیاس یہ ہے کہ انکی شخصیت کا نقش کبھی نہ ابھر سکتا اور وہ مدت بعد کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے۔

آغا شورش کاشمیری کوئی ۹ سال سے ہفتہ وار چٹان لاہور کے مالک و مدیر ہیں ۱۹۴۶ء میں مجلس احرار نے جب روزنامہ "آزاد" نکالا تھا تو کچھ عرصہ کے لئے اس کی ادارت کے فرائض بھی آغا نے سرانجام دیئے تھے اس وقت تک آپ کے قلم سے جو تصانیف نکل چکی ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

(۱) قیدی کا روزنامچہ (جسے جیل کے حکام نے پنجاب سی آئی ڈی کے مشورہ سے ضبط کر لیا تھا)

(۲) آزاد ہند کے فوجی عناصر (۳) اس بازار میں (۴) گفتنی و ناگفتنی (مجموعہ کلام) (۵) پس دیوار زنداں (زیر طبع) (۶) مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (زیر ترتیب)

آغا شورش کاشمیری بلند پایہ طرز نگارش کے مالک ہیں "چٹان" کے قارئین جو قریب پاکستان اور بھارت کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں آغا کے

تم کا لوہا مانتے ہیں اس ہر دلعزیزی اور اس قبول عام کا راز شاید اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آغا گفتار کا غازی بھی رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی کردار کا غازی بھی، تقریر ہو یا تحریر، نظم ہو یا نثر ان کی تہہ میں جو ہر عمل کارفرما نظر آتا ہے "گفتنی و ناگفتنی" کے دیباچہ میں آغا نے لکھا ہے کہ

"میں نے جو کچھ کہا، اس پر عمل بھی کیا۔ ان سیاسی شعروں میں میرے کردار کی پوری پوری جھلک موجود ہے۔ میری خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ یہاں مجھ میں قدرے انا جاگ اٹھتی ہے جو شاعر مستعار انقلابی نعروں سے ہیرو بنتے ہیں مجھے نہ صرف ان سے ہمدردی پیدا ہوتی بلکہ ان کے شیوۂ ستائش باہمی پر رحم آتا ہے ان کا سارا گھمنڈ خود فریبی کے کھوکھلے دعووں پر ہے جن لوگوں کو اپنے ملک کی سیاسی جدوجہد کے ابجد سے واقف نہیں اور جن عوام کا وہ نام لیتے ہیں کبھی ان کے لئے کانٹے کی چبھن محسوس نہیں کی وہ انہیں تلوار کے زخم کھانے پر کیوں کر آمادہ کر سکتے ہیں مجھے فخر ہے کہ میں نے عوام کو قریب سے پکارا اور انھوں نے قریب سے سنا ہے میرے ہر شعر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ میں انہی کے لہجے میں بولتا اور انہی کے ذہن کی بات کہتا ہوں۔ مجھے اس مقصد کے لئے اپنے ماحول سے باہر کسی مزدور کا گلنار چہرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ پرائے دیس سے محرکات شعر ڈھونڈنے کی احتیاج ہے میرا ملک اور میری قوم ایک نظم مسلسل ہیں میں انہی میں سے موضوع، مضمون اور عنوان ڈھونڈتا ہوں میرے گرد و پیش اتنا مواد پڑا ہے کہ اس کے سامنے شاعر و ادیب ایک طرف رہے۔ آفتاب و ماہتاب بھی دامن پھیلا سکتے ہیں ؎

دامان باغباں سے کف گل فروش تک

بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنوان مرے لئے"

آغا شورش کاشمیری کو واقعی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہیں ؎

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو — بہت قریب سے کچھ راز پائے ہیں میں نے

کہوں تو گردش لیل و نہار رک جائے — وہ راز جن سے بہت زخم کھائے ہیں میں نے

آغا شورش کاشمیری کی سیاسی اور ادبی زندگی کے چند پہلوؤں پر تو میں نے اپنی بساط کے مطابق سطور بالا میں روشنی ڈالدی ہے لیکن ابھی میں نے انکی عادات و اطوار کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس موضوع کو حرف آخر کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ اور اس لئے کہ کسی مضمون کی آخری سطریں ذہن پر کچھ امٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں دوسرے ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے قارئین پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ نوجوان جس کی زندگی انقلابات کے ہولناک ماحول میں بسر ہوئی ہے اور جس کے قلم کی جولانیوں نے اچھے اچھے ادیبوں، خطیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں انوکھے کردار اور نرالے اطوار کا مالک ہے۔ طبیعت میں بلا کا جوش، مزاج میں غضب کی خشونت، تنی ہوئی بھنویں ایسی جیسے کھچی ہوئی کمانیں اٹھی ہوئی، نگاہیں ایسی جیسے کسی بلندی پر ڈالی ہوئی کمندیں، چہرہ کی تراش خراش میں غیظ و غضب کے جذبات گھلے ملے، کچھا ہوا قد فتنہ خیزیوں کی آماج گاہ۔ اگر میں یہ کہوں تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا ؎

تیور بدل گئے تو زمیں کا نپنے لگی

ابرو کے اک اشارہ سے محشر بپا ہوا

اگر یہ عیب ہیں تو آغا شورش کاشمیری کا دامن ان سے ضرور داغدار ہے۔ آغا کی افتاد طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ ان سے ان کے بہت سے متعارفین

کو لگتا ہے کبھی تو آغا بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور کبھی اس بلا کی سرد مہری کا ثبوت دیتے ہیں کہ ملاقاتی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے ان کے قریبی دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ آغا شورش کاشمیری نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ آغا ٹھیٹھ پنجابی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن تقریر و تحریر میں ان کی زبان ابوالکلامیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے ہوش پر جوش غالب آجاتا ہے لیکن یہ غلبہ صرف چند لمحات کے لئے ہوتا ہے پھر فوراً اپنے جذبات پر قابو پا لیتے ہیں۔ آغا صاحب جب ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو طنز و ظرافت کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔ چٹان کے مالک و مدیر کی حیثیت سے ان کا کردار بہت بلند ہے۔ کاتب، ادارۂ تحریر، منیجر اور چپراسی سبھی ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ ان کا برتاؤ ان سب سے برادرانہ ہے، حاکمانہ نہیں اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آغا نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ہر رنگ کی زندگی بسر کی ہے۔

---

(۴)

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(غالب)

حیدرآباد کی چند شخصیتیں

تمکین کاظمی

[illegible] شخصیات نمبر کے لیے [illegible] شخصی [illegible] لکھے [illegible] اہل علم نے بہت پسند کیا اور بعض لوگ برابر تقاضا کرتے رہے کہ [illegible] [illegible] کی [illegible] البتہ [illegible] سال [illegible] سب بزرگوں [illegible] شخصی خاکے لکھ [illegible] [illegible] چنانچہ بعض [illegible] متعلق الگ الگ [illegible] خاکہ نویسی میں [illegible] شخصیات نمبر [illegible] ہوا اور مجھے [illegible] کی [illegible] کا حصول مشکل ہو گیا ہے۔ [illegible] مشکل سے [illegible] سکتے ہیں۔ بالآخر عزیزم سعادت نظیر نے [illegible] شخصیات نمبر [illegible] اور میں نے [illegible] میری [illegible] میں کر لی اور ایک طویل خط طفیل صاحب کو لکھا مگر [illegible] خط یا تو انہیں ملا نہیں یا وہ انجان ہو گئے۔

گزشتہ مہینے میں محبی نصیر الدین ہاشمی نے مجھ سے خواہش کی کہ شخصیات نمبر کے لیے [illegible] حیدرآبادی [illegible] ان کی فرمائش کی تعمیل [illegible] اور انہوں نے [illegible] کا شخصی خاکہ طفیل صاحب کو بھیج دیا اور پھر طفیل صاحب نے فرمائش کی کہ حیدرآباد والوں کے خاکے لکھ دوں۔

میری ولادت ۱۹۰۲ء کی ہے اور میرا گھرانا علمی ادبی [illegible] سے بچپن ہی سے مجھے علماء فضلاء [illegible] سے واقفیت رہی ہے اور بعض مشاہیر سے میں بچپن ہی سے مانوس تھا، اس طرح میں سینکڑوں بزرگوں [illegible] چند بزرگوں کی ایک فہرست بنالی [illegible] خاکے پیش کر رہا ہوں۔

شخصیات نمبر میں بعض لوگ [illegible] انہیں [illegible] مختصر طور پر [illegible] لکھے ہیں اور [illegible] نہیں [illegible] گیا ہے۔

[illegible] مجھے پسند [illegible] دونوں [illegible] حیدرآبادی [illegible] حیدرآباد [illegible] وہ ملکی [illegible] انہیں [illegible]

شمار کرتا ہوں

مشکل یہ ہے کہ اگر شخصی خاکے کے ساتھ مستقل تنقید اور نظم و نثر کے اقتباس بھی چاہئے ہیں اور ان چیزوں کی سمائی ایک جگہ نہیں ہو سکتی، خاکہ بالکل مستقل چیز ہے اس پر تنقید نہ ہو اور اقتباس کی گنجائش نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ کسی کے متعلق کوئی ایسی بات سننے کے لئے قطعاً تیار نہیں جو اخلاقی یا مذہبی لحاظ سے ذرا گھٹیا ہو۔ چنانچہ حال ہی میں میں نے اورنگ آباد میں پرمیشر کے ایک مضمون لکھا اور اس میں [illegible] کی [illegible] بازی پر بھی روشنی ڈالی تو میرے بزرگوں نے خوب لے دے کی، حیران ہوں کہ کیا کروں بقول توفیق حیدرآبادی

حیراں ہوں یا الٰہی! توڑوں تو کس کو توڑوں

پیمانہ ہاتھ میں ہے پیماں سامنے ہے!

بہرحال میں یہ کوشش کروں گا کہ جو بھی لکھوں سچ لکھوں اور لگی لپٹی نہ رکھوں، واقعات ایمانداری اور دیانت کے ساتھ پیش کر دوں۔

آپ اس حصہ میں ایسے بزرگوں کے خاکے ملاحظہ فرمائیں گے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ایسے لوگوں کے خاکے بھی دیکھیں گے جو اللہ کے فضل سے اب بھی بقید حیات ہیں۔ میں نے جو معیار قائم کیا ہے اسی پر سب کو جانچتا جاتا ہوں چاہے وہ مرحوم ہوں یا موجود۔ فقط!

علامہ عبداللہ یوسف علی

سنہ ۱۹۲ء میں [illegible] مجھے [illegible] کے بیرونی بہ حیثیت سے بھی کام کرنا پڑا ہے۔ میرے تفویض شہر گلبرگہ کی وکالت کا بھی کام کرنا تھا [illegible] کی نگہداشت بھی تھی [illegible] کا استقبال اور ان کا انتظام بھی بعض موقع پر میرے تفویض رہا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں بعض مشاہیر سے بھی مجھے نیاز حاصل ہو گیا۔ جن میں عبداللہ یوسف علی بھی تھے۔

عبداللہ یوسف علی صدر المہام وزیر، مال وصنعت و حرفت و تجارت کی حیثیت سے دورے پر آنے والے تھے اور میں گورنمنٹ باڑہ پر ان کا انتظار کر رہا تھا کہ [illegible] بس بھی پہنچی [illegible] داخل ہوئیں یہ موٹریں بیدر سے آ رہی تھیں اور بیدر کی لال مٹی سے لالہ لال تھیں۔ پچھلی موٹر سے ایک [illegible] شخص ٹیک کو سوٹ پہنے ہوئے اترا اور اپنے سوٹ کی گرد جھاڑتا ہوا [illegible] دیکھ کر مجھ سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے [illegible] سوال کیا صدر المہام صاحب کہاں ہیں؟ اس نے [illegible] ویکلی اور پیچھے کی موٹر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے [illegible] رخ کیا تو [illegible] باسط جنگ رعبدالمعان [illegible] تھے۔ [illegible] بعد میں ان سے یہی سوال کیا تو انہوں نے [illegible] کی طرف [illegible]۔ میں نے ان سے کہا [illegible] صدر المہام تو تھے [illegible] شکریہ کہتے ہوئے آگے اور موٹر سے اتر کر پہلی موٹر کی طرف بڑھے اور اس صدر المہام [illegible] میرا تعارف کرایا۔ اس طرح مجھے علامہ عبداللہ یوسف علی سے نیاز حاصل ہوا۔

عبداللہ یوسف علی بیدر سے موٹر پر آئے تھے راستہ بھی ناہموار تھا اس لئے [illegible] پہنچے پر تھا۔ میں نے گورنمنٹ باڑہ دکھایا۔ اتنی دیر میں ان کے ملازمین [illegible] گئے اور وہ غسل خانہ میں چلے گئے غسل سے فارغ ہو کر [illegible] تبدیل کر کے کپڑے پہننے کے لئے آ بیٹھے تو مجھے بلا لیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باسط جنگ بہادر ان کے ساتھ بہ حیثیت ناظم انجمن امداد باہمی (رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز) تھے۔ چونکہ باسط جنگ سے میرے خاندانی مراسم تھے اور والد مرحوم سے انہیں بڑی محبت تھی۔ اس لئے وہ جب کبھی گلبرگہ آتے تو ہمارے ہی مہمان ہوتے یا گورنمنٹ باڑہ میں بھی ٹھہرتے تو ایک دو دن ہمارے گھر پر ضرور رہتے تھے۔

پہلی ملاقات میں علامہ نے ادھر ادھر کی باتیں کیں مگر دوسری تیسری ملاقات سے وہ کھل گئے اور بڑی دلچسپ باتیں کرنے لگے گلبرگہ

کے آثار قدیمہ اور دفاتر، محبس، تالاب وغیرہ کا معائنہ میرے ساتھ کیا اور جہاں جاتے مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ باسط جنگ بہادر مولوی قسم، خشک دفتری آدمی تھے۔ وہ علامہ کی اس روش پر حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علامہ باوجود اتنے قابل، ایسے مشہور اور بڑے عہدہ دار ہونے کے ایک نوجوان کے ساتھ قہقہے لگانے اور بات بات پر ہنسنے پر کیسے مائل ہو گئے۔

باسط جنگ بہادر جب بھی گلبرگہ آتے والد مرحوم ان کی دعوت کیا کرتے تھے اس لئے اب بھی ان کی دعوت کی اور ان سے کہا کہ اپنے ساتھ صدر المہام صاحب کو بھی لائیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے: میں صدر المہام کو اپنی طرف سے آپ کے پاس چلنے کو نہیں کہہ سکتا۔ آپ عابد[ل] سے کہلوا دیجئے۔ والد نے مجھ سے فرمایا کہ کل رات کا کھانا باسط میاں ہمارے پاس کھائیں گے، اگر تم بلا سکو تو عبداللہ صاحب کو بھی بلا لو۔ میں نے علامہ سے عرض کیا کہ کل رات غریب خانہ پر ماحضر تناول فرمائیے تو انہوں نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کر لی اور فرمایا بھئی دکنی بگھارا ہو تو بہتر ہے۔ چنانچہ اس دعوت میں دکنی بگھاران ہی رکھے جنہیں علامہ نے بہت پسند کیا۔

گلبرگہ میں پانی بھیم رگے کے تالاب سے آتا تھا اور یہ تالاب بہت ہی مختصر تھا۔ میں نے اس کو وسیع کرنے کی تحریک کی تو علامہ نے تالاب کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے نوٹس میں اس کو بھی شریک کر لیا۔ بھیم رگے کا تالاب دیکھ کر واپس ہوتے ہوئے حضرت رکن الدین تولہ کے مزار پر پہنچے تو میں نے حضرت موصوف کی سوانح سنائی کہ یہ مجذوب تھے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز جس وقت یہاں آئے ہیں اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بندہ نواز نے یہاں پہنچ کر دو جیتل (سکہ رائج الوقت) بطور نذر پیش کئے تو آپ نے ٹکا کر یہ نذر قبول کی۔ چونکہ مدت سے چار زانو بیٹھے ہوئے تھے اس لئے جب اٹھ کر کھڑے ہوئے تو تکلیف ہوئی اور آپ نے فرمایا "تولا"۔ چونکہ یہی ایک لفظ ان کی زبان سے لوگوں نے سنا تھا اس لئے ان کو تولا کہنے لگے جو رفتہ رفتہ تولہ ہو گیا۔ حضرت کے پاس ہی آپ کے ایک معتقد عبداللہ کا مزار ہے جو ایک برہمن تھے اور آپ کے معتقد تھے آپ ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور یہیں رہنے لگے۔ لوگ زیارت کے لئے آتے اور گائے کا گوشت ساتھ لا کر کھایا کرتے تھے جو انہیں ناگوار گزرتا۔ انہوں نے شکایت کی تو حضرت تولہ نے اس کی ممانعت کر دی چنانچہ اب تک یہ دستور ہے کہ جو بھی حضرت کی زیارت کے لئے جاتا ہے ایک روز پہلے سے گوشت کھانا چھوڑ دیتا اور نہا دھو کر جاتا اور اپنے ساتھ گوشت نہیں لے جاتا ہے۔ میں نے یہ قصہ سنایا تو علامہ بہت متاثر ہوئے فرمانے لگے "تو یہ بھی ہوا ہے۔ بزرگوں نے ماحول و قرب کی کتنی باتیں کیں اور اپنے اخلاق و کردار سے کس قدر اثر قائم کیا اور کس سادگی سے تبلیغ کی"۔ پھر فرمانے لگے "کہا جا سکتا ہے کہ یہ باتیں ان بزرگوں کے ساتھ ختم ہو گئیں اب کہیں باقی نہیں ہیں"۔ میں نے عرض کیا "ان بزرگوں میں خلوص تھا محبت تھی۔ جو کام تبلیغ کرتے تھے اس سے فائدہ ہوتا تھا۔ اب خلوص کا فقدان ہے۔ محبت نہیں رہی۔ نمود و نمائش رہ گئی ہے اور ہر چیز کو مشہور کیا جاتا ہے اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا"۔ کہنے لگے "جیسے کچھ ہو رہے ہیں آپ واقف ہیں"۔ فرمانے لگے "سچ کہتے ہو"۔ پھر دیر تک صوفیائے کرام کا ذکر فرماتے رہے اور ان کے طریقہ تبلیغ کی وضاحت فرمائی۔

سنٹرل جیل کا معائنہ کیا تو کارخانہ جہاں قالین، شطرنجیاں، نواڑ، رسیاں بنتے جاتے تھے بڑی تفصیل سے ملاحظہ کیا اور بہت پسند فرمایا اور دوران معائنہ میں جرائم اور ان کے ارتکاب، سزا اور اس کے اثرات پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ میں تو گرویدہ ہو گیا۔ ایک دریا تھے جو ہر جگہ بہتے اور ہر مقام کو سیراب کرتے تھے۔

آستانہ خواجہ بندہ نوازؒ کا ملاحظہ کیا تو پوچھا: تم بتا سکتے ہو کہ کئی سو سال سے یہ قبریں کیوں زیارت گاہ خاص و عام ہیں؟ میں نے کوئی معمولی جواب دیا تو روحانیت پر ایک۔ انہوں نے تقریر فرمائی اور ثابت کیا کہ روحانی اثر مٹ نہیں سکتا اور تا قیامت ان کی یہی کیفیت رہے گی۔

ل یہ میرا عرف تھا۔

گلبرگہ لے گئے۔ انہوں نے کالج بھی دیکھا اور شہر کی عمارتیں بھی دیکھیں۔ وہاں شہر کی بس [illegible] نہایت بڑی وضع سے ہوتی ہے۔ علامہ نے وہاں کا معائنہ بھی کیا اور دیوں کے عکس اور رنگ کے متعلق ہندو مسلم کشمکش کا حال سنا تو فرمانے لگے: بھائی ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے اقتدار اعلیٰ انگریز ہی ہیں ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ مسلمان ہندو دیوں کے عکس پڑھنا تک نہیں دیتے۔ جب کبھی ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور ہماری اپنی حکومت ہوگی تو چند برسوں کے اندر یہ مسجدوں کی پوری عمارت فرقہ پرستی کے عناد کو ڈھا کر رہیں گے۔"

علامہ کا یہ خیال حرف بہ حرف پورا ہوا۔ شاید اچھا ہی ہوا وہ دیکھنے نہیں آئے، وہ تنگ وطن کر کے افسردہ چلے گئے۔

میرے ساتھ میں دو دوستوں ڈاکٹر عالم ایم اے ایل ایل بی جو ان دنوں لیکچرر تھے، ایل ایل بی کر رہے تھے اور سید المنعم صدیقی بی اے رہ گیا۔ جو حیدرآباد سے ایل ایل بی کر رہے تھے، نے خواہش کی کہ علامہ سے انہیں ملاؤں۔ اس لیے میں نے علامہ سے استدعا کی کہ میرے پاس چائے پر تشریف لائیں اور ان لوگوں سے ملیں تو بڑی خوشی سے آمادہ ہو گئے اور شام کی چائے پر میرے احباب سے ملاقات کی۔ اکبر علی نے بیان کیا کہ وہ نہایت سعیدی سے ملا ہے۔ دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ وہ طالب علم بھی تھے ان سے بھی دیر تک باتیں کیں۔ ایک طالب علم جو تعلقہ کا تھا کے ایک غریب خاندان سے تھے میرے پاس رہتے تھے، ان سے خصوصیت کے ساتھ بات چیت کی اور دوسرے روز انہیں ملنے گئے۔ کہا اور سب لوگوں کے سامنے اپنی طالب علمی کے حالات سنائے کہ کس طرح انہوں نے افلاس اور تنگ دستی میں طالب علمی کی اور کس طرح ایک مخیر شخص نے ان کی مدد کی۔ اپنے حالات بڑی بے تکلفی سے سنائے اور اپنی فلاکت اور تنگ دستی کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ ما شاء اللہ کیا لوگ تھے۔ کتنے حقیقت پسند اور کیسے سچے اور کھرے۔ یہاں کسی بڑے آدمی کو اپنی سابقہ زندگی اور افلاس کا ذکر کرتے نہیں دیکھا۔ ان لوگوں پر یہ زمانہ گزرا ہے وہ بھی ہمیشہ اس کے یاد سے گریز کرتے رہتے ہیں۔ مگر علامہ نے فخر کے ساتھ سب کچھ سنا دیا۔ ان کی سابقہ اور ابتدائی زندگی کے حالات سننے کے بعد ہم لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت اور زیادہ ہو گئی اور ہم انہیں ایک نمونہ سمجھنے لگے۔

یوں تو علامہ کے مضامین اور کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں مگر جب وہ حیدرآباد آئے تب انہیں ایک دفعہ ہی دیکھا تھا۔ اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ وہ بڑی معلومات کے بزرگ ہیں۔ تاریخ پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی۔ انہوں نے بہمنیہ کی گنبدیں دیکھیں تو بڑے مزے سے تاریخ بیان کرنے لگے۔ چونکہ ان دنوں میں نے گلبرگہ کی ایک مختصر تاریخ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی سوانح عمری مرتب کی تھی اس لیے میری معلومات تازہ تھیں۔ مجھ سے اس ضمن میں علامہ نے گفتگو فرمائی تو بہت خوش ہوئے اور میری معلومات کی بڑی داد دی اور بڑے اچھے مشورے سے سرفراز فرمائے۔ اسی طرح مذہب پر بھی بڑی خاص نظر تھی اور تصوف سے متعلق بڑی خاص معلومات تھیں اور ایک خصوصیت یہ بھی کہ عربی، فارسی، انگریزی، مرہٹی، گجراتی کے علاوہ کنٹری بھی اچھی طرح جانتے اور روانگی سے بولتے تھے۔ عربی، لاطینی اور سنسکرت کے قائل تھے کہ یہ تینوں امہات ہیں بقیہ زبانوں کو اتنی اہمیت نہ دیتے تھے۔ اردو بڑی صاف اور شستہ بولتے اور اردو کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔

میں اردو میں سعدی اور ان دنوں شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا ترجمہ کر رہا تھا۔ میں نے ذکر کیا تو فرمایا۔ یہ ڈراما جس کا ترجمہ تم کر رہے ہو کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ اگر شیکسپیئر کا ترجمہ کرنا ہو تو اس کے "مرچنٹ آف وینس" کا ترجمہ کرو مگر اس سے تم ابھی عہدہ برآ نہ ہو سکو گے۔ اگر ڈراموں کی مشق جاری رکھو۔ جب تم [illegible] کے بعد اس ڈرامے کا ترجمہ کر سکتے ہو۔

علامہ [illegible] ادبی [illegible] اور [illegible] شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر اس سے بہرہ ور تھے۔ اساتذۂ اردو کے کلام سے واقف تھے۔ غالب اور اقبال کے اکثر شعر زبانی یاد تھے اور میر کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔

ہم [illegible] علامہ [illegible] اور ان دنوں [illegible] جو سے تمام شہر میں [illegible] کے ساتھ [illegible] بعض [illegible] کے [illegible] گئے۔ مجھے میرے حال پر بہت [illegible] رہیں۔ واپس جانے کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب کبھی حیدرآباد

آتا ضرور علامہ سے ملتا۔ ایک روز اسی طرح ملنے کے لئے گیا تو ایک قدیم ایرانی تصویر مجھے دی کہ اس کی فوٹو کاپی کرا دو۔ میں نے وہ تصویر لے لی اور ایک فوٹوگرافر سے اس کی کاپی کرالی اور یہی تصویر ایک نقاش کو جو پرانی تصویروں کی نقلیں کرنے میں بڑا ماہر تھا دے کر اس کی ایک نقل بھی کرائی۔ دو تین روز کے بعد میں نے نقاش کی بنائی ہوئی نقل اور فوٹو کی فوٹو کاپی [illegible] پیش کی۔ آپ نے دیکھ کر رکھ لیا۔ پھر میں نے وہی اصل تصویر جو علامہ سے دی تھی پیش کی تو بہت [illegible] ہوئے دونوں کو ملا کر دیر تک دیکھتے رہے اور پھر اصل اور نقل کو الگ الگ رکھ کر بڑی تعریف کی کہ بڑا اچھا مصور ہے اور خوب نقل کی ہے۔ پھر فرمایا کہ میں چند تصویریں بھیجوں گا [illegible] ان کی نقل بھی کرا دو۔ مگر بدقسمتی سے اس کے چند ہی روز بعد وہ حیدر آباد سے تشریف لے گئے۔

[illegible] اسٹیشن کی پلیٹ فارم [illegible] نشست تھا [illegible] پلیٹ فارم [illegible] اکثر آتے جاتے ہوئے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی تھی اسی طرح ایک روز پلیٹ فارم [illegible] ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ علامہ نظر آئے [illegible] ٹرین میں سوار ہو گیا [illegible] ملاقات کی تو فرمایا میں حیدر آباد سے واپس جا رہا ہوں [illegible] کا ذکر فرمایا جو حیدر آباد میں ہوئے اور [illegible] حیدر آباد کے متعلق گفتگو فرماتے رہے [illegible] میں نے [illegible] زمانے میں مجھے [illegible] اتفاق [illegible] آخری ملاقات [illegible] علامہ سے [illegible] ہو سکا۔

[illegible] کا مجموعہ [illegible] علامہ نے بہت پسند فرمایا [illegible] اور مجھے لکھا کہ [illegible] اور [illegible] تذکرہ بھی بھیجوایا [illegible] کو دیکھ کر تحریر فرمایا [illegible] کتاب مجھے [illegible] وقت [illegible] عجیب [illegible] تذکرہ [illegible] ملاحظہ فرمایا کہ مجھے تحریر فرمایا تھا [illegible] اور اخلاقی نقاط نظر میں [illegible]۔

[illegible] سے زیادہ جو بات [illegible] پسند [illegible] مضمون نگاری [illegible] اچھا چھوٹا مضمون میرے جیب چکے تھے جنھیں دیکھ کر علامہ نے [illegible] مفید اور [illegible] میرے لئے مستقل راہ ثابت ہوئے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر میں نے مضمون نگاری کی۔

مطالعہ کا طریقہ اور اپنے مفید مطلب [illegible] علامہ نے [illegible] ہدایات دی تھیں۔ علامہ نے [illegible] تفصیلات سے مجھے بتایا تھا کہ [illegible] موضوع پر [illegible] مصنفین کی کتابیں پہلے [illegible] پامالی نہ سمجھو ہر موضوع کا مطالعہ کرو، اس طریقہ [illegible] باتیں علامہ نے بتائی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ابتدائی مضامین جو ایک اٹھارہ سالہ نوجوان [illegible] دیکھ کر اگر علامہ [illegible] میری تو لیدہ [illegible] اور سمجھ ہج زبانی دیکھ کر خاموش ہو جاتے [illegible] مگر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی [illegible] اور ہمت پیدا کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں [illegible] علامہ [illegible]

خداوند عالم علامہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

عبداللہ العمادی

ہوش سنبھالنے کے بعد سے علامہ عبداللہ العمادی کی تصانیف اور مضامین میرے مطالعہ میں رہتے مگر کبھی ان سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ دارالترجمہ کے قیام کے بعد جب عمادی حیدرآباد آئے تو مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھے ایسا گرویدہ کر لیا کہ میں ان کا حلقہ بگوش ہو کر رہ گیا۔ معلوم نہیں کس شخص نے میرا تعارف کرایا تھا یا کسی اور نے، بہرحال میرا نام سنتے ہی بے انتہا مسرور ہو گئے، میرے بعض مضامین کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے مضامین پڑھ کر خوش ہوتا اور تمہارے لئے دعا کیا کرتا۔ وہاں تم مجھ سے ملنے نہیں آئے، میں مدت سے تم سے مانوس ہوں۔ ان کی اس شفقت و عنایت کا مجھ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ میں نے انہیں اپنا شفیق بزرگ اور قدردان سمجھ لیا اور یہ شفقتیں وقت آخر وفات تک میرے حال پر مبذول رہیں۔

عمادی کم رو اور کم گو تھے، کم قد تھے اور رنگ سانولا تھا۔ نیا شخص ان سے مل کر انہیں عالم نہیں سمجھ سکتا اور نہ کوئی معقول آدمی بلکہ اجنبی اگر ان کے نام گرامی اور علمی کارناموں سے واقف نہ ہوتا تو انہیں کسی گنتی میں نہ لاتا۔ بظاہر کم گو تھے مگر مسائل علمیہ کے وقت ان کی زبان آوری قابل دید ہوتی۔ جب مجلس میں بیٹھتے تو ان کی ظرافت لسانی ظاہر ہونے لگتی اور ایسے جواہر بکھیرتے کہ سننے والا مالا مال ہو جاتا۔ سوا مطالعہ کے کسی بات کا شوق ہی نہ تھا۔ کپڑا بالکل معمولی پہن لیتے، کھانا بھی اسی طرح ہوتا، مزاج البتہ تیکھی ہوتی تھی کیونکہ دور رہنا اچھا تھا۔ طبیعت میں اس قدر مروت اور انکسار تھا کہ میں نے اس قسم کے کسی بزرگ میں نہیں دیکھا۔ کوئی اپنی کتاب لا کر ضد کرتا کہ مولانا تقریظ لکھ دیجئے، کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، سرسری طور پر پڑھ لیا اور برداشتہ قلم تقریظ لکھ دی۔ لطف یہ کہ صاحب تصنیف کی تعریف ایسی کہ وہ پھولوں نہ سماتا اور آخر میں ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے کہ [illegible] سب ایک بلندی کی داد [illegible] لکھا ہے۔ معلومات کا یہ حال تھا کہ کسی موضوع پر گفتگو کیجئے یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس فن کے ماہر ہیں۔ میں انہیں صرف عالم سمجھتا تھا، فن تاریخ میں ان کی قابلیت مجھے معلوم نہ تھی۔ ایک دفعہ پوچھا کیا کر رہے ہو، جواب میں میں نے عرض کیا "ارسطو جاہ" پر کام کر رہا ہوں۔ آپ نے ارسطو جاہ کا نام اور پورے خطابات بیان کر کے پوچھا — وہی ارسطو جاہ نا، میں نے عرض کیا جی ہاں وہی۔ بس ارسطو جاہ کی کارگزاریاں جو گنانے لگے تو معلوم یہ ہوا کہ میں نے آٹھ دس سال کی محنت میں جو چیزیں جمع کیں وہ عمادی کی زبان کی نوک پر ہیں۔ میں نے حیرت ظاہر کی تو فرمایا کہ چونکہ تحقیق کر رہے ہو اور مسلسل اس موضوع پر کام کر رہے ہو اس لئے تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔ تاریخ کے پورے مقامات میری نظر میں ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی یہ کتاب جس کی نظر ثانی فرما کر بڑی داد دی اور جہاں جہاں میں نے تحقیق کی تھی اور جو باتیں میں نے گھر بیٹھ مواد اور تاریخی اسناد کی بنا پر لکھی تھیں ان کی داد دی کہ یہ کام تم نے بڑا اچھا کیا ہے، یہ داد دوسرا شخص فراہم نہ کر سکتا تھا۔

طبیعت میں بے انتہا عفو و درگذر کا مادہ بہت تھا۔ ہمیشہ اپنی حالت پر قانع رہتے اور بڑے سے بڑے مخالف کو بھی مخالف نہیں سمجھا۔ ہر ایک کو دوست ہی سمجھتے تھے، اسی وجہ سے ان کے مخالفین بھی بات چیت کرتے اور جو تھے بھی تو مخالفت کرتے ہوئے شرماتے۔ یہ ان کے کردار تھے جن کی وجہ سے دشمن بھی دوستی پر مجبور رہتے۔

ارسطو جاہ پر کام کرنے میں نے نواب یوسف علی خان سالار جنگ کو دشمن بنا لیا تھا۔ چونکہ ارسطو جاہ میر عالم کے آقا اور میر عالم کی زندگی بنانے والے تھے اس لئے ان کی سوانح حیات میں میر عالم کا چہرہ بے نقاب ہو رہا تھا۔ نواب صاحب نے ابتداً یہ چاہا کہ میر عالم کے خلاف جتنی باتیں ہیں انہیں قلم زد کر کے شائع کروں مگر میں اس کے لئے آمادہ نہ ہوا تو انہوں نے کوشش کی کہ یہ کتاب چھپنے نہ پائے۔ چنانچہ اپنے ذاتی اثر سے کام لے کر حکومت سے جو امداد اس کتاب کی اشاعت کے لئے مل رہی تھی اسے رکوا دیا۔ اس پر بگڑ کر میں نے "خیر النساء" کا قصہ ناول کے

طور پر لکھا جس میں خیر النساء کا تعلق میر عالم کے خاندان سے ثابت کرکے میں نے اپنے دل کا غبار نکال لیا تھا۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو عمادی نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ مجھے دکھاؤ۔ میں نے مسودہ پیش کیا تو یہ کہہ کر رکھ لیا کہ دیکھ کر واپس کروں گا۔ دو تین روز کے بعد جب میں نے مسودہ مانگا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فرمایا اگر تم سے میں کوئی خواہش کروں تو پوری کر دوگے؟ میں نے عرض کیا ضرور! تو فرمایا اس مسودے کو ضائع کر دو اور یہ کتاب ہرگز شائع نہ کرنا۔ میں نے بحث شروع کی تو فرمایا تم نے وعدہ کیا ہے میری خاطر یہ کام کر دو۔ چنانچہ میں نے ان سے مسودہ لے کر وہیں چاک کر دیا اور پرزے انھی کی میز کے نیچے رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔ میرے اس طرز عمل سے خوش ہو کر بہت دعائیں دیں اور فرمایا میاں! ایک بڑے گھرانے کی عورت کا ناجائز تعلق ریذیڈنٹ ہی سے سہی مگر شرمناک بات ہے۔ تم فقط عاقل الدولہ کے خاندان کو ذلیل کرنا چاہتے تھے جس میں میر عالم ضمنی طور پر آ جاتے ہیں مگر یہ تو پورے دکن بلکہ سارے ہندوستان کے لئے ذلت کی بات ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ذلیل کر لینا کیا بات! اچھا ہوا جو تم نے مسودہ چاک کر دیا۔ خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے گا۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ عمادی نے یہ مسودہ چاک کروا کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ اگر یہ طبع ہو جاتا تو بڑی بری بات تھی۔ اس طرح وہ اپنے چھوٹوں کی زندگی بنایا کرتے تھے۔

مومن خان مومن دہلوی پر میں نے کام شروع کیا تو مجھے بہت سا مواد نوٹ کرا دیا اور بڑی دلسوزی سے مشورے دیتے رہے۔ عمادی کو جب مومن کے فارسی کلیات کی نقل میں نے منگوائی تو بہت خوش ہوئے اور کتاب آتے ہی لے کر خود ملاحظہ کیا اور بعض بہترین اشعار پر نشانات لگا دیئے۔ باوجود لکھنؤ اسکول کے مؤید ہونے کے مومن کے معترف اور مداح تھے اور مومن کے قصے بڑی دلچسپی سے سناتے تھے۔

علمیت کا یہ عالم تھا کہ دریا تھے تمام شعبہ ہائے علوم پر حاوی تھے اور ہر شعبہ پر یکساں نظر تھی۔ عام طور پر پرانے علماء کسی ایک فن کے ماہر ہوتے تھے۔ حدیث پر عبور ہو تو صرف و نحو میں نیازمند، صرف و نحو پر عبور ہو تو حدیث و فقہ میں کورے، مگر عمادی کی نظر سب پر یکساں تھی۔ ادب الجاہلیہ اور ... قرآن، حدیث، فقہ سے لے کر تاریخ، جغرافیہ، طب اور علوم جدیدہ تک پر حاوی تھے اور جس فن پر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوتا تھا کہ اس فن کے ماہر خصوصی ہیں اور عمر اسی فن میں گزاری ہے۔ ایسے ہمہ گیر عالم کم از کم میری نظر سے ایک دو ہی گزرے ہیں ورنہ میں نے بیشتر علماء کو ایک آدھ فن ہی پر حاوی پایا ہے۔

حیدرآباد میں ایک بزرگ حکیم ابراہیم جامعہ طبیہ کے پروفیسر تھے جو بڑے دماغ دار اور ذہین تھے۔ ہزاروں شعر نوک زبان تھے، شعرائے جاہلیہ، شعرائے اسلام، شعرائے ایران اور شعرائے ہند کے ہم معنی شعر ہزاروں یاد تھے جنہیں وہ گھنٹوں سنایا کرتے تھے مگر ان میں صرف حافظہ کا کمال تھا علمیت نہ تھی۔ برخلاف ان کے علامہ عمادی باوجود علمیت کے ان سے اچھے حافظے کے مالک تھے۔ قاضی تلمذ حسین نے ریاض خیرآبادی کی خمریات کا ابو نواس سے مقابلہ شروع کیا تھا۔ ایک روز معلوم نہیں قاضی صاحب نے عمادی کو بلایا تھا یا وہ خود پہنچ گئے تھے کہ خمریات کا دور ہو رہا تھا۔ خوش نصیبی سے میں بھی پہنچ گیا تو عمادی نے کاغذ قلم میرے آگے رکھ دیا۔ اب یہ ہونے لگا کہ قاضی صاحب ریاض کا شعر پڑھتے جسے سنتے ہی عمادی ابو نواس کا شعر اسی مضمون کا سناتے اور پھر عرب کے دوسرے شعراء کے شعر یکے بعد دیگرے سنا کر اساتذۂ عجم کے شعر بھی سناتے جنہیں میں لکھ لکھ کر قاضی صاحب کو دیتا جاتا کیونکہ قاضی صاحب کا بہرہ پن اتنا بڑھ گیا تھا کہ چیخنے پر بھی سنائی نہ دیتا تھا۔ ابو نواس کے شعر قاضی صاحب کو بھی یاد تھے مگر دوسرے شعرائے عرب اور ایران کے شعر سن کر یا پڑھ کر قاضی صاحب پھڑکتے جاتے تھے۔

صرف شعر ہی عمادی کو یاد نہ تھے بلکہ وہ عروض پر بھی حاوی تھے اور عروض کی غلطیاں بیشتر اساتذہ کے اشعار سے نکالتے رہتے۔ قاضی تلمذ حسین نے ریاض کا کلیات چھپوانا شروع کیا تو سب سے پہلے عمادی نے اس کی مخالفت کی کہ اتنا رطب و یابس چھپا کر روپیہ برباد کرنے کی بجائے ریاض کے کلام کا انتخاب شائع کر دو مگر قاضی صاحب بھی ضدی تھے اور انہیں کچھ ایسی عقیدت یا محبت ریاض سے تھی کہ انھوں نے اتنا ضخیم کلیات ریاض رضوان چھپوا ہی ڈالا۔ اس سلسلہ میں عمادی کے خیالات بڑے ترقی پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص کے شاہکار ہی منظر عام پر لائے جائیں

اور اسی چیز کو پیش کیا جاتا ہے جو دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارآمد ہو یا اپنا مقام پیدا کر سکتی ہو۔ رطب و یابس شائع کر کے عوام کو پسند کرنے کا موقع دینا صاحبِ تصنیف کی عظمت کو کم کرنا ہے کیونکہ دنیا میں ایسے لوگ کم ہیں جو کانٹوں کو ہٹا کر پھول چن سکیں۔ بیشتر کانٹوں ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور پھولوں تک پہنچنے نہیں پاتے۔

عمادی میں ذوقِ صحیح تھا، شعر کی پرکھ تھی، مومن کے عاشق تھے۔ وہ نیاز کے مداح تھے۔ جن دنوں نیاز فتحپوری پر ہندوستان بھر میں [illegible] تھے یہ بھی تھی عمادی برابر ان چیزوں کو پڑھتے اور اس ہنگامہ آرائی پر مسکراتے تھے اور ہمیشہ نیاز کی انفرادیت اور ان کی مدح کیا کرتے تھے، خصوصاً نیاز کے ذوقِ شعری کے معترف تھے۔

جوش ملیح آبادی چونکہ عمادی کے دارالترجمہ کے ساتھی تھے اس لئے جوش کا ساتھ بھی زیادہ رہا اور اس قربت کی وجہ سے جوش کی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں سے بھی زیادہ واقف تھے مگر انہوں نے کبھی بھی جوش سے نفرت نہیں کی اور نہ ہی جوش کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ جوش [illegible] سے ان دنوں میں جوش کے ساتھ زیادہ رہتا تھا۔ جوش کی کثیر رباعیاں میں نے لکھی تھیں کیونکہ جوش ان دنوں فی البدیہہ کہا کرتے تھے اور میں بھی لکھ لیا کرتا تھا۔ یہ رباعیاں میں سناتا تو عمادی بہت ہنستے جاتے تھے۔

حیدرآباد کے مولوی اور مشائخ طبقے نے جوش کی شکایتیں شروع کیں تو جوش نے رباعی کہی ؎

پھر اہلِ ستم کو [illegible] سینے والو — خوں قوم ہی دست کا پینے والو
تم اہلِ خرد سے کیوں [illegible] کے نشاد — امداد پہ [illegible] کی جینے والو

[illegible] بیچ میں [illegible] ایک [illegible] بزرگ سے [illegible] کی شکایت کی۔ میں حاضرِ خدمت ہوا تو عمادی نے فرمائش کی جوش کا تازہ کلام [illegible]۔ ایک روز جب آیا [illegible] جیب [illegible] رہا تھا اس پر جوش نے فی البدیہہ کہا تھا ؎

اک [illegible] کی زباں پہ [illegible] — [illegible] کہ [illegible] پائی ہے
کل یہ دیکھا تخت [illegible] کی تھا — آج [illegible] گدائی ہے

میں نے یہ قطعہ سنایا تو عمادی آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے اس ملحد کے دل میں کتنی روشنی ہے، پہلی شکل والے قرآن کے الفاظ پڑھتے ہیں اور یہ ملحد اس کی روح تک پہنچ جاتا ہے۔

عمادی میں وسعتِ نظر خاصی تھی، وہ قطعاً تنگ نظر نہ تھے، بڑے ہی عالی ظرف اور وسیع النظر تھے۔ جوش انہیں اکثر چھیڑتے۔ کبھی جوش کے ساتھ ڈاکٹر [illegible] اور [illegible] الحق بھی عمادی کے پاس پہنچ جاتے۔ دونوں مل کر فقرے اور پھبتیاں کستے۔ ان کے ساتھ عمادی بھی ہنستے [illegible] داد دیتے اور جوش [illegible] ان لوگوں [illegible] کر دیتے اور ان لوگوں کے [illegible] تنفر کا اظہار نہ کرتے تھے۔ کوئی ان کی اس [illegible] کا ذکر بھی کرتا تو مسکرا کر کہتے [illegible] ایک رنگ ہے، اسی حال میں خوش ہیں، اللہ انہیں نیک توفیق دے۔

جوش کے شہر بدر ہونے کا افسوس عمادی کو بھی اتنا ہی ہوا جتنا جوش کے چاہنے والوں کو ہوا۔ میں جب بھی ملتا جوش کی خیر و عافیت پوچھا کرتے اور ان [illegible] کیا کرتے تھے۔ عمادی کو لوگ نہایت ہی مذہبی اور متعصب [illegible] ملا سمجھتے تھے۔ وہ ملا کسی طرح نہ تھے اور نہ ان میں [illegible] مولویوں کا طرز و طریقہ تھا۔ عمادی ایک روشن خیال عالم اور اپنے [illegible] سے زیادہ وسیع المشرب آدمی تھے۔ علم کے چاہنے والے، ادب کے پرستار اور طالب علموں اور راہیوں کے سرپرست تھے۔ ذرا بھی کسی میں علمی کیفیت یا ادبی لگاؤ پاتے اس کی دل افزائی کرتے۔ انہوں نے ہزارہا ادیب، سینکڑوں عالم بنائے اور لاکھوں جنیدیوں کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں کارآمد بنایا۔ یہ لافانی خدمتِ علم و ادب کی عمادی نے کی ہے۔ اب ایسے لوگ کہاں؟

ترکی نور محلی

علامہ احمد ترک علی شاہ قلندر ترکی نور محلی پانی پتی، عجیب و غریب بزرگ تھے ابتداً غلامی تخلص کرتے تھے پھر غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے سلسلہ میں قلندر ہوگئے اور ترک علی شاہ نام رکھ کر ترکی تخلص کرنے لگے۔ فردوسی کی باقیات الصالحات سے تھے۔ ناطق مکرانی، واثق ہرانی، امام بخش صہبائی کی شاگردی کا فخر تھا ان بزرگوں سے فارسی پڑھی تھی مگر اردو پر بھی ترکی نازاں تھے اور ریختہ میں [illegible] سے تلمذ تھا۔

ترکی خود تو کچھ نہ تھے مگر شاعر گر ضرور تھے۔ ہزاروں کو شاعر بنا دیا تھا۔ چنانچہ شیخ غلام [illegible] گرامی جالندھری کو ترکی ہی نے شاعر بنایا۔ گرامی ان کے ملنے والے تھے اس لئے ترکی نے گرامی کی پرورش پر [illegible] پڑھایا اور شاعر بنا کر چھوڑا، چونکہ ترکی [illegible] طبیعت کے آزاد تھے اور [illegible] اس لئے گرامی [illegible] کا ساتھ چھوڑ دیا تھا [illegible] میں [illegible] گئے تھے مگر ترکی [illegible] پنجاب کو اس چھوڑا اور خود حیدر آباد پہنچ گئے [illegible] یہاں بھی گرامی [illegible] کرتے رہتے۔

[illegible] فارسی کلام ترکی [illegible]

[illegible] تھے [illegible] مرزا رحیم [illegible] کیا [illegible] شعرا [illegible] مرزا [illegible] کرتا ہے

[illegible]

[illegible] تھا [illegible]

ترکی نے [illegible] اطمینان سے [illegible] زیادہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دیوان [illegible] پیچھے [illegible] اس قسم کی باتیں کر کے [illegible] استاد کی [illegible] کم ہوا۔

[illegible] ترکی کی [illegible] ایک کتاب ترکی نے لکھی ہے [illegible] اعتراض [illegible] کلام پر اعتراض کیا ہے بعض اعتراضوں کا جواب بھی خود ہی دیا ہے اور بعضوں کی [illegible] کی ہے۔

جس سے خوش ہوتے اس کی داد دیتے اور جس سے خفا ہوتے اس پر کچھ نہ کچھ اعتراض جڑ دیتے تھے چنانچہ داغ کے حیدر آباد آنے کے بعد

ظہیر دہلوی بھی آگئے اور انہیں داغ نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے پاس رکھوا دیا تو اختر مینائی (خلف امیر مینائی) اور جلیل (فصاحت جنگ) جو پہلے سے مہاراجہ کے پاس تھے ظہیر کی مخالفت کرنے لگے اور ان دونوں نے ترقی کو ہموار کر کے آگے کر دیا چنانچہ بر سر مشاعرہ ترقی نے ظہیر پر فقرے کسے اور داغ پر پھبتیاں اڑائیں۔ داغ چونکہ اس مشاعرے میں شریک نہ تھے اور ظہیر نے غزل پھاڑ کر مشاعرے سے نکل کر داغ کو سارا واقعہ سنا دیا تھا اس لئے داغ نے مہاراجہ بہادر کو لکھا اور مہاراجہ نے ترقی کی خوب خبر لی اس طرح ترقی کی ترقی تمام ہو گئی اور انہوں نے تنبیہ اور اختر کو چھوڑ کر ظہیر سے دوستی کر لی اور پھر ایسے دوست بن گئے کہ ظہیر کے مرنے تک رفاقت کی بلکہ ظہیر کے دفن کے وقت رو رو کر بدحال ہو گئے۔ اس طرح ترقی کی دشمنی وقتی ہوتی تھی مگر دوستی کے معنی ترقی کے پاس اعتراض نہ کرنے کے نہ تھے وہ ہر ایک پر اعتراض کرتے اور ہر ایک کی ہنسی اڑاتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد ان کے مربی تھے سو روپیہ ماہوار دیا کرتے اور عید بقرعید دیوالی دسہرے پر الگ سلوک کرتے پھر بیچ میں ترقی اپنی ضرورت کا اظہار کر کے الگ لے لیا کرتے تھے مگر باوجود اس کے موقع پر نہ چوکتے بلکہ مہاراجہ کی ہنسی بھی اڑاتے تھے مہاراجہ بہادر تو حقیقی مربی تھے مگر طوطی شوستری، صاحب افکن جنگ، نواب ناظرین، ضیا یار جنگ طلسمی، وکیل، وزیر الدولہ، عبدالجبار خاں آصفی، تجلی، محمد علی خاں ناظم، صولت جنگ، عابد وغیرہ ہمیشہ ترقی کی مالی امداد کرتے تھے مگر یہ ان لوگوں کو بھی نہ بخشتے بلکہ موقع پر ڈنک مار ہی دیتے تھے۔

عبدالجبار خاں آصفی بڑے اچھے شاعر اور بڑے عالم تھے ترقی پر بہت مہربان رہتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ چنانچہ آصفی اکثر کہا کرتے تھے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "کاٹھیاواڑی" کا نام ترقی رکھا گیا ہے، چونکہ کاٹھیاواڑی گھوڑا بدخصلت اور منہ زور ہوتا ہے اس لئے آصفی ترقی کو انہی صفات سے متصف مانتے تھے۔

ملک الشعرا طوطی شوستری بڑے عالم تھے۔ ایرانی نژاد تھے مگر عربی زبان پر قادر تھے اور باوجود عجمی ہونے کے عربی پر اتنی قدرت تھی کہ عربی ان کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ترقی کے مربی اور محسن تھے مگر ترقی انہیں خاطر ہی میں نہ لاتے تھے اور ہمیشہ ان پر اعتراض کیا کرتے تھے ایک روز آغا شوستری بیٹھے ہوئے ایرانیوں کی تعریف اور اہل ایران کی فضیلت بیان کر رہے تھے اور ڈینگ مار رہے تھے کہ ایرانی نہایت ہی فہیم ذہین اور زیرک ہوتے ہیں، ان کا دماغ نہایت رسا ہوتا ہے، ہر چیز بڑی آسانی سے سیکھ جاتے ہیں چنانچہ ؎

عقل و دانش ہمہ با مردم ایراں دادند!

بالکل صحیح کہا گیا ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضور نظام مرحوم کا چوبدار آیا اور کہنے لگا کہ حضور نے یاد فرمایا ہے۔ آغا شوستری نے کہا "فہ چلیا ہم آتا ہے" بس یہ جملہ منہ سے نکلا تھا کہ ترقی جھاڑ کا کانٹا بن کر پیٹ گئے۔ کہنے لگے استاد! آپ پندرہ بیس سال سے ہندوستان میں ہیں دن بھر اردو بولتے اور سنتے رہتے ہیں اب تک آپ کو اردو نہ آئی۔ ابھی آپ نے فرمایا "فہ چلیا ہم آتا ہے" بر خلاف آپ کے ہم ہندوستانیوں نے ایران کی صورت تک نہیں دیکھی نہ تو ایرانیوں سے صحبت رہتی ہے اور نہ ہمارا روزمرہ فارسی ہے۔ پھر بھی ہم صحیح فارسی بولتے، لکھتے، پڑھتے ہیں اور شعر بھی ایسے کہتے ہیں جنہیں سن کر آپ بھی رشک کرتے ہیں، ایسی شستہ گر یہ زبان تو تم نہیں کہتے جیسی ابھی آپ نے کہی۔ اب فرمائیے ایرانی افضل ہیں یا ہندوستانی؟ اس طرح ترقی کسی کو نہ بخشتے تھے۔

امجد حیدر آبادی جو حیدر آباد کے مشہور اور ہندوستان کے واحد رباعی گو شاعر ہیں ترقی کے شاگرد تھے۔ شاید انہیں اپنی قابلیت کا زعم ہو مگر ترقی اسے برداشت نہ کر سکے بلکہ اپنی شاگردی سے نکال دیا اور اتنے خفا ہوئے کہ اپنے تذکرہ سخنوران چشم دیدہ میں لکھ مارا:

"امجد تخلص احمد حسین نام حیدر آبادی سی سال عمرے دارد اقدرے از عربی و فارسی

بہرہ یافتہ بتلامذۂ ثقہ منسلک شد و ہر شعر خود در چند روز تا زبان دراہر کسے بچرپدن

آشنا نکرد، لہذا او را از آمدن منع کردم۔

غور فرمائیے آخر یہ جس بلا غت کی قدر ہے۔ انوری و خاقانی بہرہ یافتہ کا متعلق ظہور ہے تو دوسرے کا شمار مرزا میں اس کی کمال تو یہ تھا کہ اساتذۂ عجم بھی ان کو [illegible] سمجھتے۔ ایک [illegible] اردو قطعہ جس کے چند شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں:

یہ وہ شعر [illegible] ہے کا یہ قہر　　شاہد مرے سخن کا ہے یہ شہرہ عادل

انہیں سوا کر چلے ہی [illegible]　　سعدی و انوری و [illegible] و [illegible]

ورنہ دکھلاسکے رنگ [illegible] انہیں　　کچھ ٹوٹی پھوٹی ان کی بھی سخن بنا پارسی

بلا شبہ [illegible] سعدی، انوری، [illegible] اور [illegible] کی ٹوٹی پھوٹی فارسی سننے کا احسان کرنا ہے وہ بھلا معاصرین اور شاگردوں کی کیا ملل افزائی کرتا ہوگا [illegible] ان لوگوں کی [illegible] سی تعریف کیا کرتے تھے ان کے مداح، معتقد [illegible] سخن تھے [illegible] بات تو یہ کھلی رہتی مگر اپنے بھی سمجھتے بلکہ ان پر بھی منہ مارتے تھے [illegible] اپنے [illegible] کے اعتبار سے اپنے آپ کو آتش کا ہم کیسہ سمجھتے تھے مگر بقول [illegible] کی اس [illegible] کا [illegible] اور [illegible] عیب [illegible] سے منصف [illegible]۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت نیک [illegible] اور رقیق القلب تھے۔ استاد ظہیر دہلوی سے جب ان کی دوستی ہو گئی اور ان کی حالت سے واقف ہو گئے تو ان کی [illegible] امداد و اعانت کرتے رہے [illegible] واقف ہوں کہ لوگوں سے کہہ کر ظہیر کی رقمی امداد کرائی اور خود بھی دلے درمے قدمے سخنے کام آتے رہے۔ [illegible] مہاراجہ کے پاس پیش کر کے امداد دلواتے۔ نواب صاحب ٹانک سے رقم دلواتے اور [illegible] ہو سکا سعی و سفارش میں دریغ نہ کرتے تھے۔ اعتراض تو وہ [illegible] کرتے تھے اس سے ان کی دانست میں [illegible] یا کسی کی [illegible] ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی [illegible] طبیعت اور ذہانت کے اظہار اور تفریح سے غرض تھی اس لئے وہ اس کو [illegible] دیتے تھے۔ مشاعرے میں [illegible] اعتراض کر کے ناک میں دم کر دیتے اور دوسرے روز اسی شخص کے گھر جا کر جس پر اعتراض ہوتا تھا مل لیتے۔ ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا کسی پر اعتراض کرتا تو خود آستین چڑھا کر معترض کے اعتراضوں کا ایسا دندان شکن جواب دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ ہزاروں شعر یاد تھے اور عروض پر بڑا عبور تھا۔ سند میں شعر پیش کرنے میں تو کمال تھا۔ پے در پے سینکڑوں شعر سند کے سناتے اسی لئے ہر شخص ان سے ڈرتا تھا اعتراض میں لطف یہ ہوتا تھا کہ آپ نے کسی پر اعتراض کیا اور اپنی تائید میں دس پندرہ شعر سنا دیے اور کسی نے یہ اعتراض سن کر ویسے ہی موقع پر یہی اعتراض [illegible] اور یہ موجود رہے تو فوراً معترض سے لپٹ پڑتے اور اس کے خلاف بحث کرنے لگتے اور اپنی تائید میں اساتذہ کے شعر بھی سناتے جاتے۔ اس طرح بحث کبھی ان کی رہتی اور بات بھی ان کی، غرض مدعا یہ ہوتا کہ ہر دو صاحب بندھی رہے اور میں سب پر چھایا ہوا رہوں۔ والد مرحوم ان کی اس حرکت پر ہمیشہ ٹوکا کرتے مگر وہ ایک نہ سنتے تھے۔

دوسرا ان پر اعتراض کرتا تو بھی خفا نہ ہوتے بلکہ خوش ہو کر بحث کرتے اور معترض کو قائل کر کے دم لیتے تھے۔ ایک روز ہمارے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تازہ غزل سنا رہے تھے مطلع کا دوسرا مصرعہ تھا ع

رگ لیلیٰ زند آں جا ز مجنوں خوں پکید ایں جا

مجھے چونکہ ضیاء پر اعتراض کر کے ترکی سے چڑا دیا تھا اس لئے میں موقع کا طالب ہی تھا یہ مصرع سنتے ہی میں نے کہا [illegible] اردو کے مشہور مصرع

کھلی فصد لیلیٰ نے نیزباں مجنوں کے خوں نکلا

کا ترجمہ ہے، یہ سن کر استاد [illegible] گئے۔ والد مرحوم نے بھی ذہانت بتائی مگر تھوڑی دیر کے بعد استاد نے مجھے شاباشی دی کہ برخوردار ایسا ہی خیال

رکھا کہ جہاں کوئی پہلو نظر آئے فوراً کہہ دیا کرو۔ چنانچہ استاد نے اس کے بعد مشاعروں میں مجھے اپنے پاس بٹھانا شروع کر دیا اور لوگوں پر مجھ سے اعتراض کرانا شروع کیا۔ اس طرح کہ کوئی شعر کہتا تو آپ کہتے یہ اعتراض کرو اور میں اعتراض کر دیتا تو آپ اس پر خود صاد فرما دیتے۔ کوئی جواب دینا چاہتا تو آپ بحث کرنے لگتے اور سارے سند کے شعروں اور دلیلوں کے بحث کرنے والے کا ناک میں دم کر دیتے۔ والد نے یہ رنگ دیکھا تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی اور میں نے مشاعروں میں ترکی کے پاس بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔

ترکی کی یہ شوخی بعض وقت تکلیف دہ بھی ہو جاتی تھی ایک صاحب خان آغا غلام … نام تھا کسی آغا کے ایرانی کے تربیت یافتہ تھے اور فارسی خوب کہتے تھے، غالباً شوکت تخلص کرتے تھے انہوں نے مشاعرے میں غزل شروع کی … ردیف اور قافیہ … تھا۔ چونکہ انہوں نے … ایرانی لہجے میں غزل شروع کی تھی … مطلع خود … ترکی نے اسی لہجے میں … کا نعرہ بلند کیا۔ لوگوں کو دل لگی سوجھی سارا مشاعرہ دہرانے لگا اور … سے محفل گونج اٹھی۔ بیچارے شوکت غزل پھاڑ کر مشاعرے سے چلے گئے اور پھر کسی مشاعرے میں نظر نہیں آئے۔

ایک بزرگ شوکت … تھے ان کی ایک کتاب ترجمہ رباعیات عمر خیام … چھپ چکی ہے … ایک … مشاعرے میں غزل شروع کی مطلع کا دوسرا مصرع تھا

شب … ہوگی

ترکی نے … تو … سے … مطلع … اٹھایا پھر کیا تھا سارا مشاعرہ … پر بھی … ہو کر … گئے۔ … کبھی … بیٹھے تھے … تماشائی شامل … ہوتی تھیں۔

… شعر … اور فارسی اور … دونوں زبانوں میں غزل کہتے تھے … کی شام … ایک … غزل گوئی کا … تھا … اپنے گھر … پہنچے … شریک … ہونے والوں نے جو کچھ سنا ہے وہ نہیں سنتا … روح … گی۔

غرض ترکی عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ بچوں میں بچے، بڑھوں میں بڑے … شاعروں میں … عالموں میں عالم، چونکہ … تھے اس لئے … بہت … کرتے تھے۔ مگر یہ صرف تمسخر اور … کی حد تک ہوتی تھی، … غیبت … نہ کرتے تھے۔

شاگردوں کی غزل … کا اس … کیا کرتے … ایک طرف سے دوسری طرف غزل کہہ دیتے تھے اور … سے … جو … غزل کہی تھی … غزل … خود غزل کہہ دی … بعض … شاگرد … غزل … تھا مگر … اور … شعر اور … پڑھتا … اصلاح سخن … کامیاب نہ تھے چنانچہ ایک … کہانی ہے۔

… اور … کرتے تھے … پہنا کرتے تھے … پہنتے تھے … کی ہوتی … یا کبھی ٹوپی … پہنتے … کالی … تھے، ڈاڑھی منڈواتے تھے مگر … کے ساتھ … شروع ہوا کرتی تھی کانوں میں بندے پہنتے تھے صدری اور کوٹ … ایک … جیبی گھڑی … کا … ہوتی تھی جس کی … رنگ سنائی دیتی تھی اور چاندی کا … لگایا کرتے تھے،

ماشاءاللہ پورے قد کے آدمی تھے، بدن بھی [illegible] مضبوط تھا، غذا بھی خوب تھی۔ آخر میں مسہری کا شوق فرمانے لگے تھے غالباً افیون بھی کھانے لگے تھے کیونکہ مٹھائی سے بہت رغبت ہو گئی تھی۔

میری والدہ مرحومہ کو ترکی سے بڑا [illegible] تھا۔ اس کا ایک قصہ والدہ سنایا کرتی تھیں کہ میری ولادت سے پہلے ایک لڑکا تولد ہوا تھا۔ ترکی نے اس کی تاریخ ولادت کہی [illegible] قطعہ لکھا [illegible] کے پاس بھیجا [illegible] روز کے بعد [illegible] سے والد مرحوم سے [illegible] اس قطعے کو صاف لکھوا کر فریم کرا دیں چنانچہ والد [illegible] اس قطعے کو فریم کرا کے گھر میں لگانے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد [illegible] تاریخ [illegible] لکھوا کر آئینہ لگوا کر پڑیں گے وہ دیوار پر لگا [illegible] والد [illegible] سمجھ کر خاموش ہو گئے مگر والدہ نے کہا [illegible] سب [illegible] عجب کی باتیں [illegible] چنانچہ [illegible] کے بعد اس لڑکے نے انتقال کیا اور اس کے بعد میری ولادت ہوئی چنانچہ [illegible] تاریخ ولادت کہہ کر رنگین کاغذ پر خوش خط لکھوا [illegible] سونے کا کام کرا کر فریم کر کے ترکی نے دیا کہ اسے دیوار پر لگا دو [illegible] والدہ مرحومہ ترکی کی معتقد ہو گئی تھیں [illegible] ترکی کو زندہ ولی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی فاتحہ نذر دیا [illegible] سب سے پہلے ترکی [illegible] اور ترکی جب گھر آتے تو گھر کے [illegible] دودھ [illegible] [illegible] والدہ ان [illegible] میٹھا [illegible] بالائی اور چائے [illegible] پیالی چائے [illegible] دودھ ملائی اور آدھی پیالی شکر ڈال کر [illegible] پیالی بنا لیتے [illegible] جس کا نام انھوں نے [illegible] رکھا تھا۔

ترکی [illegible] دوست اور سب پر مہربان سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے تھے، کسی کی [illegible] البتہ [illegible] اور اعتراض کرنے میں [illegible] مطلق نہ تھی، [illegible] اور منافت مطلق نہ تھی۔

مشاعرے میں پڑھنے کا انداز [illegible] ترنم سے پڑھتے [illegible] مشاعرے میں بیٹھنے والوں [illegible] اور [illegible] پڑھنے کا انداز بھی نہایت اچھا تھا، آواز [illegible] زور سے پڑھتے تھے۔ فارسی غزل [illegible] آتے ہیں [illegible] غزل پڑھتے [illegible] کبھی صفت سے آگے [illegible] اور کبھی [illegible] جاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں رباعی پڑھی۔

دیکھو برتر کو جو غالب کو نہیں دیکھا ہے
ذوق کی گر ہے تمنا تو [illegible] کو دیکھو

نادر علی برتر کی طرف اشارہ کیا، مجھے مرزا [illegible] کی طرف بتایا۔

اور تاریخ کی جو صورت کی سب نے [illegible]
[illegible] کے [illegible] ادا کو [illegible]

[illegible] ترکی [illegible] اور [illegible] یاروں کے [illegible] [illegible] پیشواز [illegible]

[illegible]

[illegible] تخلص [illegible] صاحب ان [illegible] نہیں [illegible]

ضرور تھے جو ہزل بڑی اچھی کہتے تھے۔ نہایت چلبلی طبیعت پائی تھی فارسی اور اردو ملا کر کہنے کا بہت شوق تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کمال کرتے تھے۔ یہ چوبیس گھنٹے ترکی کے ساتھ رہتے تھے، چونکہ دونوں افیونی اور بٹیر باز تھے اس لئے خوب گھٹتی تھی مگر تفضل ترکی سے بھی زیادہ مسخرہ تھے ہمیشہ ترکی کو چھیڑتے اور پٹتے بھی تھے۔

ایک رات مہاراجہ کی ڈیوڑھی سے ترکی گھر واپس ہو رہے تھے تفضل ساتھ تھے ہری باولی کے پاس پہنچ کر ترکی نے کہا، "اماں تفضل یہاں سید صاحب کا مزار ہے ذرا فاتحہ پڑھ لیں" تفضل نے کہا چلئے۔ مزار سڑک ہی پر تھا مگر اندھیرے میں تفضل نے ترکی کو ایک مکان میں داخل کر دیا جہاں چند عورتیں صحن میں سو رہی تھیں۔ ترکی نے زور زور سے فاتحہ پڑھنی شروع کی تو عورتیں نیند سے جاگ کر غل مچانے لگیں، سارے محلے والے جمع ہو گئے اتفاق سے مکان بھی مہاراجہ بہادر کے ایک متوسل کا زنانہ کا تھا وہ اوپر بنگلے پر تھے انہوں نے نیچے آ کر دیکھا تو ترکی نظر آئے۔ پوچھا استاد کیا حال ہے تو کہا، "میں سید صاحب کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا مجھے رات کو سجھائی نہیں دیتا ہے اس منحوس تفضل نے یہاں پہنچا دیا۔" غرض صاحب خانہ نے قندیل ساتھ دے کر اپنے ملازم کو بھیجا اور ترکی گھر پہنچے۔ ایسی دل لگیاں تفضل بہت کرتے تھے ترکی ہی نے مہاراجہ سے سفارش کر کے محکمۂ نظم جمعیت میں تفضل کو نوکر رکھوا دیا تھا۔ نوکری معاف تھی مگر بیٹھے تنخواہ آ جاتی تھی۔ ایک مشاعرے میں فارسی طرح تھی "یار رم کردہ اند" تفضل نے نصف اردو نصف فارسی غزل پڑھی ؎

وصل کے وعدے پہ ازبس بے قرارم کردہ اند　　ایک لبِ ستم کے لئے امیدوارم کردہ اند

وہ نہ آتے تھے جو آئے تو قیامت ساتھ لائے　　دامنِ ساقی میں تا گُل شمعِ مزارم کردہ اند

اپنی نوکری کے متعلق بھی ایک شعر کہا تھا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں آرہا ہے دوسرا مصرع تھا

نظم میں نوکر جناب پیشکارم کردہ اند

ایک اور مشاعرے میں طرح ہوتی تھی "جواں کن، زباں کن" وغیرہ تفضل نے تجدید ومرمت دھانہ کی غزل پڑھی تھی مقطع تھا ؎

تفضل جب کہ تو ہو جاتے بڈھا

مرا پیشِ وقت میں بچہ رو جواں کن

بہر حال ترکی اور تفضل کی خوب گھٹتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ترکی فارسی کے بہت اچھے شاعر اور علوم شعر کے ماہر تھے مگر اردو میں انہیں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اصولاً انہیں اردو میں شعر کہنا چاہیے تھا مگر اپنی استادی کے زعم میں اردو زبان کی ٹانگ بھی توڑتے رہتے تھے اور ایک دیوان بھی اردو کا چھپوا ڈالا تھا۔

بحیثیت مجموعی نہایت دلچسپ اور قابل شاعر تھے۔ ان ساری کمزوریوں کے باوجود بہت غنیمت آدمی تھے اور اپنی وضع کے ایک ہی تھے۔ ترکی کو انتقال کئے ۱۲ سال ہو گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی مرے ہیں۔ آج کل میں سلطان شاہی میں مقیم ہوں۔ ان کے مکان کے سامنے سے اکثر گزرتا ہوں اور وہ مجھے بے تحاشا یاد آ جاتے ہیں اور شاید زندگی بھر یاد آتے رہیں گے۔

وجودی شاہ

میں نے نوکری سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کئی بار کی تین چار دفعہ تو نوکریاں چھوڑیں مگر پھر آخر نوکری ہی کرنی پڑی۔ اسی طرح ۱۹۳۰ء میں بھی میں نے متاوست ملازمت کی اور اپنے حساب میں نوکری چھوڑ کر ایک بک ڈپو قائم کیا جس کا نام "ادارۂ علمیہ" رکھا اور بڑی تن دہی سے

اسے چلانا شروع کیا، اس کاروبار کی ابتدا ہی تھی کہ ایک روز میرے قدیم اور محترم دوست حضرت سید شاہ عبدالقادر صاحب اپنی ڈاک کارڈ پر بڑی تیزی سے تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ اسی گاڑی میں بٹھا کر لے چلے اور نامپلی کے آرائش بلدہ کے بنوائے ہوئے مکانات پر پہنچ کر گاڑی روکی۔ ایک اے کلاس کے مکان پر پہنچے تو دیوان خانہ میں ایک ریش دراز، جسیم شحیم، سرخ و سپید خوش رو مقدس نظر آئے شاہ صاحب نے بڑی ہی عقیدت سے دست بوسی کی اور میرا تعارف کرایا کہ یہ میرا دوست اور علوم مشرقیہ کا طالب علم اور ادب و انشا کا رسیا ہے۔ پیر و مرشد نے بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی، تعلیم کے متعلق سوالات فرمائے، بعض عرب مصنفین کے متعلق گفتگو کی پھر فارسی شعراء کا تذکرہ کیا اور اردو شاعری پر دیر تک گفتگو اور بحث فرماتے رہے۔ شاہ صاحب نے شاید پہلے ہی سے میری شکایت کر رکھی تھی اس لئے پیر و مرشد نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے میرا امتحان لینا شروع کیا، اور جن جن چیزوں پر خود حضرت کے معلومات تھے ان کے متعلق بڑی تفصیل سے بات چیت کی گویا مجھ غریب کو ٹٹول رہے تھے کہ کتنے پانی میں ہے، دو تین گھنٹے تک گفتگو فرمانے کے بعد جب حضرت قبلہ نے اپنے اس نئے شاگرد کو کہیں بند نہ پایا تو "ابن وحشیہ" پر گفتگو فرمانے لگے، بدنصیبی سے ابن وحشیہ سے میں بالکل ہی ناواقف تھا اس نام کے ایک مصنف کے دو مختصر رسالے فن نیرنجات میں کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں ضرور نظر آئے تھے مگر چونکہ مجھے اس فن سے دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ حضرت نے جب مجھے ابن وحشیہ سے ناواقف پایا تو اس کے فضائل و مناقب کہنا شروع کیا اور بڑی تعریف و توصیف فرمائی، بہرحال اس صحبت میں پیر و مرشد نے مجھے خوب پرکھ لیا اور دوسرے روز ملنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا ساتھ ہی ساتھ میری کتابیں بھی دیکھنے کی خواہش کی۔ دوسرے روز صبح صبح شاہ صاحب نے پھر گرفتار کر لیا اور میں اپنی کتاب "غنچۂ تبسم" بغل میں داب کر شاہ صاحب کی ڈاک کار میں سوار ہو گیا۔ حضرت قبلہ میرے منتظر ہی تھے۔ گرما گرم میٹھا کھلایا اور بڑی نفیس چائے پلائی۔ میں نے اپنی کتاب پیش کی تو الٹ پلٹ کر دیکھا اور میرے والد مرحوم کی تصویر دیکھ کر چیخ اٹھے "ایں! پاشا بھائی! یہ تمہارے کون تھے؟" (میرے والد کا عرف پاشا میاں تھا اور ان کے بے تکلف قدیم دوست اور ساتھی پاشا بھائی پکارا کرتے تھے اس لئے میں بھی حیران ہو گیا کہ یہ حضرت میرے والد کو پاشا بھائی کیسے کہہ رہے ہیں) میں نے جب بتایا کہ میں انہی پاشا میاں کا بیٹا ہوں تو حضرت نے کھڑے ہو کر مجھے گلے سے چپٹا لیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ دیر تک پرانے تذکرے کرتے رہے جب ذرا ان کی رقت کم ہوئی تو میں نے پوچھا آپ کب آیا کرتے تھے؟ فرمانے لگے تجھے خواجہ میاں یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں وہ میرے ماموں تھے، دو چار تو معلوم رہ ہی ہیں تھے، البتہ ایک پولیس میں امین تھے۔ کہنے لگے ہاں ان کا کوئی بھائی بھی تھا؟ میں نے عرض کیا ہاں ایک ان کے چھوٹے بھائی پاشا محی الدین تھے جو ذرا فن کا شوق فرماتے تھے۔ کہنے لگے میں وہی پاشا محی الدین ہوں۔ پھر میرے بچپن کا حلیہ اور میرے خاندان کے افراد کا پتہ نام بنام بتایا اور فرمانے لگے تجھ سے پہلی ملاقات ہی میں مجھے خلوص پیدا ہو گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تو میرا عزیز ہے۔ اب تجھے چچا بن کر رہنا۔ پھر کیا تھا میں چچا پکارنے لگا، یہ تھے میرے شفیق بزرگ سید شاہ محی الدین پاشا قادری ثم جنیدی شمسی۔

وحمدی تخلص فرماتے تھے اور چونکہ حضرت شمس الدین اورنگ آبادی کے مرید اور خلیفہ تھے اس لئے اپنے آپ کو شمسی فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۱۵ء تک بھی یہ حضرت ہمارے پاس آتے جاتے تھے اس کے بعد سے نظر ہی نہیں آئے۔ ان دنوں جب یہ غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے جوان تھے، چہرے پر خشخشی سی داڑھی اور سر پر انگریزی تراش کے بال تھے، دوہرا پاجامہ، پاؤں میں نوک دار پمپ شو ہوتا تھا سر پر کشتی نما ٹوپی ہوتی اور نئی تراش کی رنگین شیروانی پہنا کرتے تھے۔ گویا اس زمانے کے فیشن ایبل لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ حضرت نظامی بدایونی اور ظہیر دہلوی کے ساتھ مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔

اب جو پندرہ سال کے بعد نظر آئے تو اس شان سے کہ سر پر لمبے لمبے بال شانوں پر گرتے ہوئے منہ پر لمبی داڑھی بالکل سفید دوازدہ انگشت جسم خاصا بھاری بھرکم اور چہرہ صعوبات زمانہ سے جھریاں لیا ہوا، سوا آواز اور بات کرنے کے طریقے کے اور کوئی بات سابقہ نہ تھی۔ بہرحال

ان بزرگ نے مجھے بھتیجا بنا لیا اور ایسا بنایا کہ بس میری حاضری روزانہ ہونے لگی۔ بعض لوگوں نے مجھے مرید سمجھا بعضوں نے غرض مند اور بعضوں نے کیمیا کا خواہش مند اور کسی نے فقط دیوانہ کیونکہ حضرت کے پاس اسی قبیل کے لوگ زیادہ آیا کرتے تھے۔

صبح ۷ بجتے ہی [illegible] کرتے کہ [illegible] معتقدین اور ضرورت مندوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مرید تو خیر اپنی سعادت مندی سے اپنی حاضری دیتے۔ معتقدین حاجت و ضرورت کے [illegible] ایک جماعت [illegible] کی گردوں کی [illegible] طرح [illegible] کا ڈھونگ رچا کر آتی اور [illegible] کیمیا بنا [illegible] [illegible] لوگ عملیات [illegible] [illegible] کے [illegible] اور بعض [illegible] روحانی [illegible] کی تمام [illegible] ہوتے تھے۔

[illegible] جب [illegible] حضرت سب کو چھوڑ کر [illegible] متوجہ ہو جاتے، پیسے لئے چاہتے تھے یا پان منگوانے اور شعر و شاعری، لطیفہ گوئی، بدیہہ گوئی [illegible] باتوں [illegible] سے گرما گرمی شروع ہو جاتا، اور بعض [illegible] بے تکلف مخاطبات بھی رواں ہو جاتیں۔

مریدین اور معتقدین حیران ہوتے کہ حضرت [illegible] نوجوان سے اتنے مانوس کیوں ہیں مگر وہ فطرت انسانی سے ناواقف تھے۔ حضرت بھی آخر انسان تھے دن بھر حدیث، فقہ، مسائل اور وحدت الوجود بیان کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ مریدین اور معتقدین سے دل لگی نا ممکن تھی کہ [illegible] اور [illegible] میں کوئی اس کا اہل نہ تھا اس لئے اس تفریح کے واسطے انہوں نے مجھے منتخب فرمایا تھا چنانچہ میرے پہنچتے ہی ایک ایک کرکے سب [illegible] کر دیتے۔ بعض بے تکلف جو رہ جاتے وہ بیٹھے رہتے اور پھر سید شاہ [illegible] صاحب فقط وجودی رہ جاتے اور ایک شاعر کی طرح بے تکلف ہو جاتے۔

حضرت شمس الدین صاحب قبلہ [illegible] حیدرآباد میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی چشتیہ گھرانے کے بزرگ تھے قوالی سنتے سنتے کھڑے ہو جاتے عطردان لے کر لوگوں کو [illegible] لگاتے۔ جس کے جسم پر عطر مل دیتے وہ بندہ بے دام ہو جاتا۔ بیشتر طوائفوں کو تائب کرا کر نکاح کرا دیا چنانچہ [illegible] جان اور [illegible] جان وغیرہ [illegible] حضرت کے ہاتھ تائب ہوئیں اور لوگوں سے نکاح کرکے گھر بیٹھ رہیں۔ بیشتر ہندو خاندان بھی [illegible] تھے چنانچہ [illegible] اور [illegible] پرشاد وغیرہ کا خاندان پورا معتقد تھا۔ [illegible] پرشاد صاحب بہادر کو کمال الدین احمد [illegible] شمس الدین کے دست گرفتہ تھے جنہیں بعد میں [illegible] محمد حسین صاحب (ناظم [illegible]) نے [illegible] کیا۔

اپنے پیر کی طرح وجودی شاہ صاحب نے بھی کبھی خدمت کی [illegible] مرید کرنے کی خواہش ظاہر [illegible] تھے لوگ مرید ہونے آتے تو اپنے پیر بھائی [illegible] میاں یا اپنے خلیفہ [illegible] میاں وغیرہ کے پاس بھجوا دیتے۔

نہایت ہی نڈر، بڑے بے باک اور [illegible] باتیں کہتے۔ حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد بڑے پیر پرست فقیر دوست اور بزرگ نواز تھے حیدرآباد کے پیران باصفا حیدری صاحب سے طرح طرح فائدے اٹھاتے تھے میں نے جب یہ دیکھا کہ وجودی صاحب کی کوئی معاش نہیں ہے اور ان کی گزر بسر بڑی تکلیف سے ہوتی ہے تو میں نے کہا حیدری صاحب کو آپ کے پاس پہنچا دیتا ہوں ان سے اپنے لئے تنخواہ کرا لیجئے اور خانقاہ کے لئے کچھ نقد رقم منظور کرا لیجئے۔ یہ سنتے ہی مجھ پر برس پڑے، خوب بھلا [illegible] سنائیں مگر میں نے بھی ان کا ناک میں دم کر دیا۔

مولوی محمد سجاد صاحب بہار کے خاندان کے [illegible] بزرگ تھے۔ مدرسہ دارالعلوم میں والد مرحوم اور چچا مولوی سید غلام حسین صاحب مرحوم [illegible] پڑھ چکے تھے اور اتفاق سے میرے [illegible] [illegible] رکھتے۔ [illegible] صاحب کے روحانی سیکریٹری تھے کیونکہ جتنے مرید [illegible] [illegible] حیدری صاحب [illegible] ملتے وہ انہی کے توسط سے ملتے تھے۔ اور جو ان [illegible] چاہیں حیدری صاحب کو سفارش کرتے تھے، [illegible] ایک [illegible] مولوی سجاد صاحب [illegible] وجودی شاہ صاحب سے ملا دیا اور شاہ صاحب نے سجاد صاحب [illegible] [illegible] تھا کہ سجاد صاحب [illegible] [illegible] صاحب یہ بزرگ [illegible] صاحب کمال ہیں "میں نے کہا

"پھر کیا ہے کسی روز مرزا اکبر کو یہاں لے آئیے مگر شاہ صاحب کو پہلے سے اطلاع نہ دیجئے، اچانک لے آئیے۔" چنانچہ سجاد صاحب نے وعدہ کر لیا۔ ایک روز دفتر میں مجھ سے کہنے لگے "اچھے تمکین صاحب! کل تعطیل ہے دس بجے آپ بھی شاہ صاحب کے پاس آ جائیے ہم بھی آ جائیں گے۔" چنانچہ دوسرے ہی روز نو بجے میں نے شاہ صاحب [illegible] پہنچ کر [illegible] سے پہلے [illegible] کو چلتا کر دیا اور چائے کا انتظام کر دیا۔ ٹھیک دس بجے حیدری صاحب معہ سجاد صاحب تشریف لائے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ "حضرت! مرزا اکبر آ گئے ہیں آپ اپنے لڑکے کی بہتری کی خاطر انسانیت سے ملاقات فرمائیے اور انہیں ناراض نہ کیجئے ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔" یہ سن کر شاہ صاحب [illegible] اور حیدری صاحب ولیاں خانہ میں داخل ہو گئے۔ میں نے تو فوراً [illegible] [illegible] تو قدرتی [illegible] شاہ صاحب نے حیدری صاحب سے بڑی عمدگی سے ملاقات کی اور [illegible] باتیں کرتے رہے اور [illegible] کا تحفہ لیا۔ چنانچہ [illegible] حیدری صاحب [illegible] حیدری صاحب کی بہتری اور [illegible] وغیرہ مگر اس کے [illegible] کے [illegible] کوئی [illegible] نہیں کی کہ تم پر حرف آئے [illegible] [illegible] حیدری صاحب [illegible] [illegible] [illegible] سفارش کر [illegible] [illegible] سفارش کرتا [illegible] وہ نہ سنیں گے تو مجھے تکلیف ہو گی [illegible] اس لئے اب [illegible] [illegible] چنانچہ میں نے بحث مباحثہ کرنے [illegible] خیال کو بدل دیا اور وہ خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد [illegible] حیدری صاحب [illegible] اور وجود شاہ صاحب سے مل کر گئے مگر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ تیسری دفعہ آنے کے بعد پھر کبھی انہوں نے تکلیف نہیں کی۔ اس کا سبب نہ تو حیدری صاحب نے بتایا نہ [illegible] میں سمجھتا ہوں کہ حضرت کی کسی بات [illegible] ہو گئی جس کے لئے حیدری صاحب رک گئے۔

[illegible] شاہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سونا بنانا آتا تھا [illegible] [illegible] [illegible] فروخت کر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سلسلہ شروع ہوتا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو جاتے تو [illegible] [illegible] [illegible] حاصل کر [illegible] سے فروخت کر کے رقم لا دو۔ ایک دو بار [illegible] ان کے [illegible] فروخت کر لائے۔ وہ تعین وقت شاہ صاحب اور [illegible] صاحب کے اور میرے [illegible] آٹھ آٹھ تولہ سونا [illegible] کا ہوتا تھا جس [illegible] سونا [illegible] فروخت کرایا گیا [illegible] [illegible] کا بنایا ہوا سونا پچیس روپیہ تولہ فروخت [illegible] اس طرح زندگی بڑی عمدگی سے گزرتی رہی۔

[illegible] کیمیا کا نسخہ معدوم ہو گیا مگر انہوں [illegible] حجاز اور عراق میں بھی بہت رہ چکے تھے نہ جانے کس نے سکھا دیا تھا [illegible] [illegible] اولاد نہ تھی اکثر مریدوں کے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔

[illegible] مریض تھے اور سلسلہ البول بھی تھا اس لئے کہیں جاتے آتے نہ تھے گھر پر

بیٹھے رہتے۔ بڑے ہی حاضر جواب اور نفسیات داں تھے۔ حیدرآباد میں مشہور ہو گیا تھا کہ ایک لڑکا جو سترہ سال کا تھا لڑکی بن گیا، اور یہ حضرت یوسف شریفؒ کے تصرف سے ہوا۔ اسی شہرت کے زمانے میں ایک مولوی صاحب جو دارالعلوم کے فارغ التحصیل اور مدرسہ عالیہ کے مدرس تھے حضرت سے ملنے کے لئے آئے اور یہی ذکر کیا اور کچھ ایسی گفتگو کی کہ شاہ صاحب کو جلال آگیا۔ جھٹ سے آپ نے داڑھی کو آدھی موڑ کر دانتوں میں دبا لیا اور کہنے لگے ارے مولوی! یہ لوگ تو بڑے بزرگ ہیں میں ایک ادنیٰ غلام ان کا ہوں، دیکھ ابھی تجھے عورت بنا دیتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے جو آنکھیں نکالیں اور چہرہ خوفناک بنایا تو مولوی ساری شیخی بھول گئے اور جوتیاں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ مارے ہنسی کے میرا برا حال ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت بھی ہنسنے لگے۔ اس طرح بعض حرکتیں بڑی مزے دار کر لیتے تھے۔

نواب اسمٰعیل خاں رہا گیردار جہانگیر آباد، نبیرۂ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اکثر حیدرآباد آیا کرتے تھے کیونکہ جسٹس خلیل الزماں سے ان کی قرابت تھی۔ ایک دفعہ وہ ملنے آئے تو میں بھی بیٹھا ہوا تھا ان سے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ میرے بھتیجے ہیں۔ بعد میں کہیں ان سے پھر ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا، جناب! آپ کے چچا صاحب کہیں رک گئے ہیں اسی لئے تکمیل نہ کر سکے اور باتیں کرتے کرتے تو بہک جاتے ہیں میں نے کہا "پہلے ہی کب تھے جو کہیں پہنچ کر رکتے" اس پر وہ بہت مسرور ہوئے اور دیر تک شاہ صاحب کا ذکر کرتے رہے۔ وہ جب کبھی آتے شاہ صاحب سے ضرور ملتے تھے۔

حضرت امجد سے وجدی شاہ کی بہت دوستی تھی سید ابراہیم ادیب جو عربی کے پروفیسر اور ادب الجاہلیہ کے بہت جید عالم تھے، بھی ان کے بڑے مخلص دوست تھے، وجدی شاہ کو اور امجد کو شاید مدرسہ کا ساتھ تھا اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی ساری دنیا امجد صاحب کو صوفی سمجھتی تھی مگر وجدی شاہ ہمیشہ ان سے یہی کہتے کہ آج تم تھوڑا سا تصوف پڑھ لو اور وہ بجائے اس کے خاموش ہو جاتے اور سید ابراہیم صاحب تو وجدی شاہ سے باقاعدہ مسائل تصوف پوچھا اور سمجھا کرتے تھے۔

مریدین کی تعداد خاصی تھی کوئی دو تین سو مرید ہوں گے، چند خلیفہ بھی تھے۔ خالد میاں نثار جنگ کو بھی خلافت دی تھی اور خالد میاں ان کے چہیتے خلیفہ تھے۔ اپنا کتب خانہ بھی انہی کو دے دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ خالد میاں کے باغ میں دفنایا جائے چنانچہ خالد میاں نے انہیں اپنے باغ ہی میں دفنایا اور مقبرہ بھی بنا دیا اور ہر سال بڑی دھوم سے عرس بھی کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں بزرگان دین ہمیشہ آیا کرتے ہیں ایک دفعہ ایک بزرگ عوض علی شاہ تشریف لائے جو شاہ صاحب کے پاس بھی آنے جانے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے وہاں اکثر دیکھا اور حضرت سے بے تکلف پایا تو ایک دفعہ میرے سامنے ہی پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو کہا کہ ایک سلسلہ میں یہ میرے پیر ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا سلسلہ تو کہا "ابلیسیہ" وہ حیران ہوئے کہ ابلیسیہ سلسلہ کیسا تو کہا آپ کو شاید معلوم نہیں کہ معلم الملکوت نے بھی اپنے خلفاء بنائے ہیں چنانچہ یہ انہی کے خلیفہ ہیں اور سلسلۂ ابلیسیہ میں صاحب خرقہ و سجادہ ہیں میں نے اس سلسلہ میں انہی سے بیعت کی ہے۔ عوض علی شاہ یہ سن کر اتنے پریشان ہوئے کہ پھر انہوں نے وہاں آنے کی ہمت نہیں کی۔

اپنے قدیم ملنے والوں اور پرانے دوستوں سے وجدی شاہ کو بڑی ہمدردی تھی چنانچہ ڈاکٹر راحت اللہ خاں کیوریٹر آصفیہ لائبریری کو جو ان سے [illegible] اور دوست کے فرزند تھے بہت چاہتے تھے اسی طرح بعض اپنے قدیم دوستوں سے بڑی وضعداری سے ملتے تھے۔

وجدی شاہ کا خاندان بہت بڑا تھا مدراس، اور گیر اور نیلور میں ان کے قرابت دار بہت تھے حیدرآباد کے مشہور صاحب "قادری" کے [illegible] جو "نواب محی الدین پاشا" کا خاندان کہلاتا تھا قرابت قریبہ تھی، مشہور ہفتہ وار اخبار "مخبر دکن" مدراس کے ایڈیٹر اور مالک سید [illegible] اس طرح خاندان بہت بڑا اور پھیلا ہوا تھا مگر وجدی شاہ سب سے دور دور اور الگ تھلگ رہتے تھے۔ مجھے [illegible] بہت ہی خوددار اور وضع دار تھے۔

حتی الامکان کسی کی برائی نہ کہتے اور اگر کوئی کسی کی برائی کرتا بھی تو اسے بھی روک دیتے اور ہنس بول کر موضوع بدل دیتے تھے۔

شعر بھی خوب کہتے تھے، دیوان مکمل کر لیا تھا۔ اس میں سے کچھ حصہ ان کے ایک مرید جعفر علی صاحب نے دو سال ہوئے چھپوا بھی دیا ہے مگر کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہوئی ہیں۔

بہرحال وجودی شاہ صاحب بہت غنیمت بزرگ تھے اور یہی ایک بزرگ ہیں جو پیران طریقت میں سے مجھے پسند آئے ورنہ دوسرے بزرگوں سے نہ تو میں نے زیادہ ملاقات کی اور نہ ہی وہ مجھے متاثر کر سکے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ کے مالک عبدالحق بھی وجودی شاہ کے مرید ہو گئے تھے اور خلیفہ بھی، انہوں نے داڑھی پیر سے زیادہ ہی بڑھا لی ہے ؎
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی؟

مولوی سیّد محمد یوسف الدین

بعض لوگ اس نام کو پڑھ کر حیران ہوں گے کہ یوسف الدین صاحب کا شخصی خاکہ میں کس طرح لکھ سکتا ہوں کیونکہ ان کو انتقال کئے ۵۷ سال ہو گئے اور ان کی وفات کے وقت میری عمر ۱۰ سال کی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ مرحوم سے میری واقفیت کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے، میرے نانا (سید عبدالرحیم صاحب جو حکومت حیدرآباد کے اول تعلقدار (کلکٹر) اور غالب الملک کے اسٹیٹ کے معتمد تھے) نے جس وقت انتقال کیا ہے میری والدہ کمسن تھیں انہیں مولوی صاحب نے اپنے پاس بلا لیا اور خود اپنی نگرانی میں تعلیم دلاتے رہے، اس طرح شادی ہونے تک والدہ انہی کے پاس رہیں، شادی کے بعد اپنے گھر رہنے لگیں مگر مولوی صاحب ہر ہفتہ گھر سے آیا کرتے اور میں دو دو دن تک ان کے ساتھ ہی ساتھ رہتا تھا۔

یوسف الدین صاحب کی ولادت اور تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تھی مگر عجیب و غریب دماغ انہوں نے پایا تھا، باوجود صلاحیت اور خاندانی اثرات کے معمولی ملازمت قبول کر لی اور ترقی کرتے کرتے چند ہی سال میں اول تعلقدار (کلکٹر) ہو گئے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علیخان شاہ دکن کو آپ پر پورا پورا اعتماد تھا، چنانچہ صرفخاص (پرائیویٹ اسٹیٹ) کی معتمدی بھی دی تھی مگر آپ نے وہاں کے حالات دیکھ کر کچھ اصلاحیں کرنے اور پہلا موازنہ (بجٹ) مرتب کرنے کے بعد معذرت کر لی اور پھر تعلقداری پر چلے گئے۔

مولوی صاحب کی ایک بڑی نفیس پارٹی تھی جس کے اراکین ڈاکٹر رگھو ناتھ، نواب عماد جنگ (راول)، نواب رفعت یار جنگ (راول)، حاکم الدولہ، کاظم علی صاحب معتمد تعمیرات، محبوب علی صاحب کمشنر کروڑگیری (کسٹم)، مولوی مدنی صاحب، مولوی عبداللہ صاحب عرف کتّے والے شاہ صاحب، ملا عبدالقیوم وغیرہ تھے۔

حیدرآبادیوں میں یوسف الدین صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے شہر سے دور جنگل میں پیرن کے قریب (ٹولی چوکی) قلعہ گولکنڈہ کے راستے میں ایک اونچی پہاڑی پر بنگلہ بنوایا اس کا نام انہوں نے "جبل السلام" رکھا، یہ یورپین وضع کی خوشنما کوٹھی اب تک موجود ہے۔

ابتداً یوسف الدین صاحب نے ایک اینگلو انڈین گھرانے میں (جو مسلمان ہو گیا تھا) شادی کی، ان خاتون سے کئی [illegible] ہوئے مگر زندہ نہ رہے، بالآخر اپنی بہنوں یعنی میری نانی اور دوسری تین بہنوں کے مجبور کرنے سے حیدرآباد کے ایک امیر گھرانے میں شادی کی اور ان خاتون کے بطن سے کئی لڑکیاں لڑکے ہوئے جن میں سے بیشتر اب بھی موجود ہیں چنانچہ بیگم نواب [illegible] الدولہ [illegible] پائیگاہ، مرحوم [illegible] کی [illegible] ہیں اور مولوی نظام الدین صاحب ناظم دارالعلاج [illegible] سنٹرل پریس، آپ ہی کے فرزند ہیں۔

امر آباد ایک بہت اونچا مقام ریاست حیدر آباد میں تھا جس کی چوٹی تک پہنچنے کی کسی نے ہمت نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب نے امر آباد کا چپہ چپہ چھان ڈالا یہاں تک کی چوٹی تک پہنچ کر ایک نفیس رپورٹ مرتب کی اور اس مقام کو سینی ٹوریم بنانے کی تحریک کی، یہ رپورٹ انہی دنوں طبع ہوئی تھی جو قابلِ دید ہے اس میں امر آباد کے متعلق کوئی بات چھپی نہیں وہاں کی پیداوار، زرعی کیفیت، آب و ہوا، جغرافیائی حالت، بلندی سے لے کر وہاں کی جڑی بوٹیوں کے نام اور ان کے خواص تک لکھے ہیں اب پچاس سال کے بعد ان کی رپورٹ پر عمل کیا گیا ہے اور امر آباد کو سینی ٹوریم بنایا گیا ہے۔

اسی طرح تنگبھدرا پراجیکٹ کا خیال بھی سب سے پہلے یوسف الدین صاحب ہی کو آیا اور انہی نے بڑی لمبی چوڑی رپورٹ لکھی تھی جو گم ہو گئے کئی سال تک [illegible] پڑی رہی اور اب کہیں یہ منصوبہ پورا ہوا۔

دیسی ریاستیں ہمیشہ سازش کا گہوارہ بنی رہیں۔ چنانچہ حیدر آباد بھی اس سے بچ نہ سکا، بیان کیا جاتا ہے کہ آج سے ساٹھ سال پہلے ۱۸۹۲ء میں ایک منظم سازش یہاں شروع کی گئی تھی ایک محضر بنایا گیا تھا اس میں سلطنت کا روبار سے حضور نظام کی بے توجہی کا اظہار کر کے خواہش کی گئی تھی کہ یہاں ریجنسی قائم کی جائے اور اس محضر پر حیدر آباد کے بڑے بڑے لوگوں نے دستخط کئے تھے اور یہ محضر وائسرائے کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے سب سے پہلے حضور نظام کو یہ اطلاع پہنچا دی اور پھر اس کے انسداد کی فکر کرنے لگے اس زمانے کے وائسرائے جو سازشیوں سے ہمدردی رکھتا تھا اس نے بھی [illegible] اس مسئلہ پر دلچسپی لی تھی اور حیدر آباد کے ریذیڈنٹ سے بھی اس قسم کی کوئی رپورٹ [illegible] حاصل کی تھی بہرحال وائسرائے [illegible] اس محضر کو دوسری شہادتوں کے ساتھ منسلک کر کے اپنی [illegible] رپورٹ کے ساتھ لندن بھجوانے کے [illegible] لفافہ تیار کر لیا تھا اور یہ لفافہ وائسرائے [illegible] کے خانے میں محفوظ تھا کہ مولوی صاحب [illegible] پہنچ کر کسی [illegible] طرح یہ لفافہ حاصل کر لیا اور حیدر آباد واپس ہو گئے مگر مولوی صاحب [illegible] کہ [illegible] ہوگئی اور وائسرائے کو معلوم بھی ہو گیا کہ انہوں نے لفافہ حاصل کر لیا ہے چنانچہ ٹیلیگرام [illegible] لگے اور مولوی صاحب جب حیدر آباد اسٹیشن پر اترے تو انہیں گرفتار کر دیا گیا [illegible] صاحب نے راستے ہی میں بعض [illegible] او رو [illegible] آباد اور [illegible] بعض لوگ موجود تھے جنہیں مولوی [illegible] صاحب نے اپنا اٹیچی کیس دے دیا تھا [illegible] اس طرح لفافہ حیدر آباد پہنچ کر محفوظ [illegible] نے گرفتار [illegible] شروع کیا کہ ریاست میں [illegible] کا قانون [illegible] حکومت برطانیہ کو اسی سلسلے میں [illegible] کا قانون نافذ کرنا پڑا [illegible] کے ضمانت پر چھوڑ دیا گیا مگر [illegible] صاحب نے جو جرم کیا تھا اس کا اظہار کیا نہ جا سکتا تھا اس لئے [illegible] الزامات مثلاً وائسرائے کے [illegible] کے ملازمین کو رشوت دینا وغیرہ پر مقدمہ چلایا گیا مگر پریوی کونسل نے مولوی صاحب کو عزت کے ساتھ بری کر دیا اور حکومت حیدر آباد نے دوران مقدمہ میں جو انہیں معطل رکھا تھا [illegible] کونسل کے فیصلے کو دیکھ کر بحال کر دیا اور ایام معطلی کی پوری تنخواہ [illegible] اور بعد [illegible] میں اول تعلقداری (کلکٹری) سے صوبہ داری (ریونیو کمشنری) پر ترقی بھی دی گئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس محضر [illegible] ملاحظہ [illegible] تو مولوی صاحب نے عرض [illegible] کر کے روک دیا [illegible] کہ [illegible] کر دیا گیا، البتہ چند سرغنے جو اس سازش کے بانی تھے حیدر آباد سے نکال دیئے گئے تھے [illegible] کے وسیلے بخیر گذشت۔

یہ تو تھے مولوی [illegible] صاحب کے سیاسی اور انتظامی [illegible] کا کارنامہ خط انتقالی [illegible] قصہ یہ ہے کہ مولوی [illegible] صاحب کو اردو رسم الخط کی خرابیوں اور اردو ٹائپ کے [illegible] چنانچہ [illegible] مدت تک غور و فکر کرنے کے بعد ایک

رسم الخط "خط انتظامی" کے نام سے تیار کیا تھا اور اس سلسلہ میں سرجان ملکم، جرجی زیدان وغیرہ سے بھی انہوں نے مشورہ کیا تھا۔ خط انتظامی میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ موجودہ حروف تہجی ہی کو ہم قامت بنا لیا تھا۔ کوئی نیا حرف یا نئی شکل نہ تھی۔ ابتداً مولوی صاحب نے ایک کتاب "خط الاسلامی" کے نام سے لکھی جس میں سرگزشت خط بیان کی گئی تھی اور پھر موجودہ رسم الخط کی برائیاں اور کمزوریاں ظاہر کی گئی تھیں اس کے ساتھ ساتھ خط انتظامی کے اصول اور اس کی تخلیق کے وجوہ بیان کئے گئے تھے یہ کتاب ہندوستان کے اہل الرائے کے پاس بھیجوائی گئی اور محسن الملک، شبلی، حالی، نذیر احمد، شرر وغیرہ نے اسے بہت پسند کیا اور مولوی صاحب نے خط انتظامی کا ٹائپ بھی ڈھلوا لیا۔

اس سلسلہ میں میرے والد کو مولوی صاحب نے گلبرگہ بلا لیا کیونکہ گلبرگہ میں مولوی صاحب کے ساتھ رہنا ضروری تھا اس لئے والد کا تقرر بھی [illegible] کی [illegible] یوسف الدین صاحب نے [illegible] کر دیا اور والد مرحوم گورنمنٹ ہائی اسکول میں رہنے لگے۔ مولوی صاحب جس بنگلہ میں رہتے تھے اس کے برابر ہی [illegible] کورٹ تھا [illegible] ملے ہوئے چند پختہ کمرے تھے جو دو حصوں پر تقسیم کئے گئے تھے ایک حصے میں والد مرحوم رہتے تھے اور دوسرے حصے میں مولوی صاحب کی صاحبزادیوں کی یورپین اتالیق رہتی تھیں۔

خط الاسلامی کی ترتیب، حروف تہجی [illegible] کے لئے یہاں تمام چیزیں مولوی صاحب نے والد کو سونپ دی تھیں [illegible] والد [illegible] کی نگرانی [illegible] خط انتظامی کی [illegible] ظاہر [illegible] یہ [illegible] ہوگئی اور والد نے مدراس جا کر خط انتظامی کو [illegible] اور [illegible] والد [illegible] مدراس کا پہلا [illegible] ٹائپ [illegible] رہتے تھے انہی کی [illegible] ایک [illegible] ٹائپ [illegible] اور خط انتظامی کی چھپائی شروع ہوئی چنانچہ [illegible] اور [illegible] شائع کئے گئے اور مختلف زبانوں کی عبارت خط انتظامی میں چھاپ کر [illegible] مسعود [illegible] نے بہت پسند فرمایا [illegible] خط انتظامی [illegible] ہو گئیں اور یہ ٹائپ عام ہو جاتا مگر بدنصیبی سے [illegible] اور ان کی جگہ [illegible] یوسف الدین صاحب کو اتنا شدید صدمہ ہوا کہ وہ چند ہی مہینوں کے بعد بیمار ہو گئے اور ان کے گلے [illegible] اور [illegible] ڈاکٹروں اور حکیموں کے یونانی علاج نہ کر سکے۔ بالآخر مولوی صاحب کو مدراس جانا پڑا مگر [illegible] رہے تھے کہ قیام گاہ سے اسٹیشن جانے کے لئے کرسی پر بٹھا کر جوں ہی اٹھایا گیا اللہ کو پیارے ہو گئے اور مدراس ہی میں مدرسہ محمدیہ کے احاطے میں آسودہ ہوئے۔

خط انتظامی مولوی صاحب کا کارنامہ اور ایسا کارنامہ ہے کہ اس پر ہندوستان و پاکستان ناز کر سکتا ہے۔ آج جو ٹائپ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور [illegible] ٹائپ، لینو ٹائپ اور ٹیلی ٹائپ رائٹر کے نہ ہونے سے اردو زبان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اور اسی ضرورت کو محسوس کر کے یار لوگ اردو زبان کے لئے ہندی اور رومن ٹائپ استعمال کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور اردو رسم الخط کی بے مائگی پر زور دے رہے ہیں۔ اس ضرورت کو آج سے پچاس سال پہلے مولوی صاحب نے [illegible] کیا تھا اور [illegible] علاج حادثہ قبل از وقوع کے تحت اس کا حل بھی انہوں نے نکال لیا تھا۔

مولوی صاحب کے انتقال کے بعد والد مرحوم کو خط انتظامی سے بڑی دلچسپی تھی مگر یہ حسرت ہی رہی مولوی احمد شاعر مرحوم کے [illegible] ملازمتی تعلق کی وجہ سے اصلاح کو روکنے کی مقدرت بھی نہ تھی اس لئے کچھ نہ کر سکے۔ مولوی صاحب کے تین فرزند تھے اور یہ تینوں ہی ان کے انتقال کے وقت کم سن تھے البتہ مرحوم کی صاحبزادی بیگم [illegible] نہایت قابل، سمجھدار اور بڑی ہی منتظم خاتون تھیں جو بفضلہ اب تک موجود ہیں مگر انہیں اپنے اسٹیٹ کے انتظامی امور ہی سے فرصت نہ مل سکی جو اس ٹائپ کی طرف توجہ کر سکتیں۔ بڑے فرزند مولوی سید فضل الدین نے نظامت امور مذہبی کی مددگاری پر پہنچ کر [illegible] میں انتقال کیا۔ منجھلے فرزند مولوی سید نظام الدین گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد کے نائب ناظم ہوئے اور انہیں بھی چاہیئے

دلچسپی رہی اور خود انہوں نے دو تین قسم کے اردو ٹائپ ایجاد کئے اور نسخ کا مانو ٹائپ بھی بنا لیا جو ہندوستان اور پاکستان میں پہلا اردو کا مانو ٹائپ ہے مگر اس میں وہی جوڑوں کی دردسری اور نشست اور کرسی کی آفت ہے۔

میں بچپن ہی سے خط النظامی سے مانوس ہوں۔ میرے سامنے اس کی کاسٹنگ ہوئی اور دس بارہ سال کی عمر میں میں نے اس کی کمپوزنگ سیکھی ہے مگر اردو دنیا چونکہ نستعلیق ٹائپ کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اس لئے میں انتظار کر رہا تھا کہ نستعلیق ٹائپ کا دھوکا بے نقاب ہو جائے اور اردو دنیا نستعلیق کی ناکارگی کو اچھی طرح سمجھ لے تو میں اس خط کو پیش کروں، خدا کا شکر ہے کہ اب وقت آ گیا ہے اور اردو زبان کے لئے ایک ایسے ٹائپ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو مفرد حروف رکھتا ہو، خوبصورت ہو، پڑھنے میں آسان ہو، جس کا مانو ٹائپ اور لینو مشین بھی بن سکے اور ٹائپ رائٹر بھی عمدہ بنے۔

ان سب خصوصیات کا حامل "خط النظامی" ہے۔ چونکہ یہاں موقع نہیں ہے اس لئے میں اس خط کو پیش نہیں کر سکتا انشاء اللہ تفصیل سے کسی آئندہ شمارہ میں خط النظامی پیش کروں گا۔

معاف فرمائیے اس تفصیل میں زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے اور مولوی یوسف الدین کی شخصیت ابھی پردے ہی میں ہے۔ مولوی صاحب سرخ و سپید بزرگ تھے انتقال کے وقت ساٹھ ایک سال کی عمر تھی پوراقد، بھاری بھرکم جسم، گول چہرہ بڑا ہی رعب دار بھرواں داڑھی جسے خضاب لگایا جاتا تھا، سر پر انگریزی وضع کے بال، ہمیشہ سیدھی مانگ نکالا کرتے تھے، سر پر صرف منصب داری پگڑی یا دستار ہوتی، دوسری ٹوپی بھی کبھار پہنتے تھے، طنیانی رود موسیٰ (۱۹۰۸ء) سے پہلے میں نے انہیں سوٹ پہنے ہوئے بھی دیکھا ہے مگر ٹائی نہ لگاتے تھے گلوبند لپیٹ لیا کرتے تھے۔ جس کپڑے کی شیروانی ہوتی اسی کپڑے کی پتلون بھی ہوتی تھی۔ صرف نماز کے لئے عیدین یا جمعہ کو مسجد جاتے تو ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے یا گھر پر پاجامہ ہوتا ورنہ ہمیشہ پتلون اور شیروانی پہنا کرتے، گھر میں ململ کا کرتہ اور پاجامہ پہنتے مگر یہ پہنے ہوئے یا تو اندر اپنے کمرے میں رہتے یا پھر اندرونی حصے ہی میں اس لباس میں نظر آتے، ڈرائنگ روم میں بغیر شیروانی کے نہیں آتے تھے۔ متانت اور سنجیدگی کا یہ عالم تھا کہ انہیں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا البتہ مسکراتے ضرور تھے، گفتگو نہایت مختصر کرتے بلکہ اشاروں سے مطلب ادا کیا کرتے تھے، تحریر اور تقریر دونوں مختصر، تقریر تو ان کی کسی نے نہیں سنی کیونکہ دو چار جملوں ہی میں اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے۔

میری والدہ کو بہت چاہتے تھے اور وہ ان کی خدمت میں گستاخ بھی بہت تھیں چونکہ باتیں بہت کرتی تھیں اس لئے مولوی صاحب انہیں طوطی پکارا کرتے تھے، میری ولادت ہوئی تو مولوی صاحب نے میرا نام رکھا "ابو رضا سید مصباح الدین" یہ تاریخی نام تھا اور سنہ ولادت ۱۳۲۰ھ نکلتے تھے مجھے ابو رضا پکارا کرتے تھے کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو "طوطا" بھی کہتے۔

میری تسمیہ خوانی (بسم اللہ) ہوئی تو مولوی صاحب نے مجھے سوٹ سلوا دیا اور اس کے بعد سے اپنے انتقال تک ہر مہینے مجھے ایک سوٹ سلوا دیا کرتے، اپنے بچوں کے لئے جب کپڑے بنواتے میرے لئے بھی بنوا دیتے اور اپنی لڑکیوں کے لئے جب کپڑے تیار کرواتے میری والدہ اور خالہ کے لئے بھی بنواتے تھے۔

میرے نانا سید رحیم الدین صاحب کی جائداد سے جو روپیہ ملا تھا اسے مولوی عبدالباقر خاں وکیل حیدرآباد کے پاس محفوظ کرا دیا تھا۔ جب ضرورت پڑتی میری نانی مجھے بھیج کر وکیل صاحب کے پاس سے روپیہ منگوا لیتیں۔ مولوی عبدالباقر خاں سے مولوی صاحب کی بڑی گہری دوستی تھی کوئی گھریلو کام بغیر ان کے مشورے کے نہ ہوتا تھا، اسی طرح مولوی عبدالغفور صاحب وکیل سے بھی ان کے پرخلوص مراسم تھے انہی مراسم کی وجہ سے مولوی صاحب کی بڑی صاحبزادی مولوی عبدالغفور صاحب کے صاحبزادے سے بیاہی گئیں اور مولوی عبدالباقر خاں صاحب کے فرزند مولوی عبدالباسط خان (جو بعد کو باسط جنگ ہوئے) کو مولوی صاحب نے دوم تعلقدار بنایا اور پھر صوبہ داری گلبرگہ کی مددگاری پر مقرر کیا تھا۔

مولوی صاحب کی متانت اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ کسی سے بے تکلف ملتے ہی نہ تھے، صرف کاروباری باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میری ولادت سے ڈیڑھ سال پہلے والدہ کو ایک لڑکا ہوا۔ والدہ مولوی صاحب ہی کے بنگلہ پر تھیں انا نے شاید ٹولی چوکی تک جا کر سیندھی (تاڑی) کا شوق کیا اور واپس آ کر بچے کو دودھ پلا کر سُلا دیا۔ بچہ ایسا سویا کہ بس سو ہی گیا، صبح جب سب لوگ جاگے تو دیکھتے کیا ہیں کہ لڑکا نیلا پڑ گیا ہے اور زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں اسی روز مولوی صاحب نے خاندان بھر میں اعلان کر دیا کہ آئندہ سے کسی بچے کے لئے انا ملازم نہ رکھی جائے۔ اگر ماں کا دودھ کافی نہ ہو سکے تو ڈبے کا دودھ پلایا جائے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ میرے پیدا ہونے کے بعد چونکہ والدہ کو دودھ کم آتا تھا اس لئے مجھ شیشوں کے دودھ پر میری پرورش ہوئی۔

ایک دفعہ مولوی صاحب بیدر کے دورہ پر گئے ہوئے تھے واپسی میں گلبرگہ سے کوئی آٹھ دس کوس (بیس میل) اُدھر تانگہ خراب ہو گیا اور مولوی صاحب تانگے سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے گلبرگہ پہنچے، بیس میل پیدل چلنے کا اتفاق انہیں عمر بھر میں پہلی دفعہ ہی ہوا ہوگا، شام میں چائے پی کر حسب معمول ٹینس کورٹ پر ٹہل قدمی بھی نہ کر سکے بلکہ اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ میں چونکہ زیادہ تر یہ واقع ہوا تھا اس لئے ان کے سونے کے کمرے میں بھی پہنچ جاتا تھا اور وہ میری ہاں کہ کے خاموش رہ جایا کرتے تھے۔ شام میں جب میں نے کمرے میں پہنچ کر دیکھا تو مولوی صاحب پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ دابتے ہوئے نظر آئے۔ اپنے پاؤں آپ دابنا میرے لئے نیا تماشا تھا میں نے لپک کر والدہ کو سنا دیا کہ "ماموں پاشا پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ داب رہے ہیں"۔ یہ سن کر والدہ نے کہا کہ "تمہارے ماموں پاشا پندرہ بیس میل پیدل چل کر آئے ہیں اس لئے پاؤں دُکھ رہے ہوں گے"۔ دس پندرہ چھوکریاں اور دس بارہ ہی خانگی نوکر تھے مگر انہوں نے کسی سے پاؤں دلوانا پسند نہیں کیا اور اپنے پاؤں آپ دابتے رہے۔

میری نانی جو مولوی صاحب کی چھوٹی بہن اور اپنے بھائی پر نثار ہونے والی تھیں مولوی صاحب کے گھر کا پانی تک نہیں پیتی تھیں جب میں نے بڑے ہو کر دیکھا تو ان سے پوچھا "اماں! آپ ماموں پاشا کے گھر میں کھانا کھاتی ہیں نہ پانی پیتی ہیں یہ کیوں؟" تو کہنے لگیں "بیٹا! پاشا کو دشمنوں نے ورغلا کر مسان بنالیا ہے اس لئے ان کے گھر کا کھانا پانی میرے لئے حرام ہے"۔ مدت تک میں لوگوں سے پوچھتا رہا کہ مسان کیا چیز ہے مگر کسی نے نہیں بتایا ایک روز جبکہ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ سکندرآباد لئے جا رہے تھے میں نے خود انہی سے مسان کے معنی پوچھے اور وہ خود بھی حیران ہوئے کہ مسان کیا بلا ہے پھر میں نے سارا قصہ سنایا اور بتایا کہ اماں نے ایسا کہا ہے۔ تو مولوی صاحب نے خاصا قہقہہ لگایا اور کہا — فری میسن ایک سوسائٹی ہے جسے فری میسن لاج کہتے ہیں یہ ایک اخلاقی سوسائٹی ہے جس کے رکن وہی ہو سکتے ہیں جو کسی مذہب کے پیرو اور خدا کی وحدانیت کے قائل ہوں۔ میں بھی اسی لاج کا ممبر ہوں۔ یہاں کے جہلاء نے اس سوسائٹی کو نہ جانے کیا سمجھا ہے کہ [illegible] دیں۔ یہی بات تمہاری نانی نے بھی سنی ہوگی، چنانچہ سکندرآباد سے واپس آ کر مولوی صاحب نے اپنی بہن کو سمجھایا اور وہ اپنے بھائی کے گھر میں کھانے پینے لگیں۔

مولوی صاحب کی وضعداری اور خرانٹ پن حیدرآباد بھر میں مشہور تھا کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مسٹر ڈنلپ صدر ناظم اور معتمد مال تھے اور بلحاظ عہدہ ان کے افسر تھے جب کبھی ڈنلپ دورے پر آتے، مولوی صاحب صوبہ داری کی جوڑی کی گاڑی اسٹیشن بھیجوا دیتے اور اس میں نائب [illegible] بیٹھ کر استقبال کے لئے جاتے اور اسٹیشن سے ساتھ لاتے مولوی صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھے رہتے جب ڈنلپ بگھی سے اتر کر برآمدے میں پہنچ جاتے تو یہ کرسی سے اٹھ کر دروازے تک جا کر ان کا استقبال کرتے اور ہاتھ ملا کر ڈرائنگ روم میں لا کر اپنے برابر آرام کرسی پر بٹھا لیتے اور جب ڈنلپ واپس ہونے لگتے تو بھی انہیں چھوڑنے اسٹیشن نہ جاتے بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھڑے کھڑے خدا حافظ کر دیتے تھے۔

کرم خاں نامی کروڑ گیر منشی دوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) رائچور کے دفتر کے تھے کسی سلسلہ میں ان سے خفا ہو کر ڈنلپ نے لکھا کہ کرم خاں ڈاکو ہے۔ مولوی صاحب نے اس کے جواب میں ڈنلپ کو لکھا کہ کرم خاں معمولی شخص ہے اس نے اگر رشوت لی بھی ہو تو اپنی حیثیت کے مطابق چالیس پچاس روپے لئے ہوں گے۔ یہ رقم ڈاکہ نہیں کہی جا سکتی۔ علاوہ ازیں یہ غریب ہندوستانی غیر مہذب ہے اس لئے مہذب ڈاکو کا اطلاق بھی اس پر نہیں ہو سکتا۔ مہذب ڈاکو وہ ہے جس نے لاکھوں روپیہ قحط کا ہضم کر لیا اور ڈکار تک نہ لی۔ یہ آخری فقرہ ڈنلپ پر چوٹ تھی کیونکہ انہوں نے قحط کے انتظامات میں خوب وارے نیارے کئے تھے۔

تزک و احتیاط میں مولوی صاحب ضرب المثل تھے۔ خانگی خط بھی سرکاری سیاہی سے نہیں لکھتے تھے، دفتری ملازمین سے خانگی کام مطلق نہ لیتے تھے انہوں نے کبھی سرکاری کاغذ خانگی تحریروں کے لئے استعمال نہیں کیا۔ ایک دفعہ محبوب نگر کے دورہ پر تھے۔ والد نے انہیں خط لکھا تو پندرہ روز کے بعد جواب دیا اور شروع ہی میں لکھا "میں دورہ پر تھا، تمہارا خط وہیں ملا مگر چونکہ میرے ساتھ لفافہ کاغذ نہ تھے اور نہ وہاں مل سکتے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سرکاری لفافے کاغذ میں خانگی کاموں کے لئے استعمال نہیں کرتا اس لئے مجبوراً گھر واپس آ کر جواب لکھ رہا ہوں۔"

سلطان نواز جنگ حیدرآباد کے ایک بہت بڑے جمعدار عرب تھے انہوں نے موتی لال سے بہت سا روپیہ لے لیا تھا اور کام مقدمہ چلتا رہا بالآخر ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے رکن مولوی صاحب بھی بنائے گئے، سلطان نواز جنگ کی بیوی میرے والد کی حقیقی خالہ تھیں اس لئے والد نے خصوصیت سے مولوی صاحب سے سفارش کی مگر مولوی صاحب نے فوراً ہی ٹکا سا جواب دیا اور والد نے سلطان نواز جنگ کو منع کیا۔ سلطان نواز جنگ نے اس خوف سے کہ مولوی صاحب میرے خلاف تصفیہ نہ کر دیں حضور نظام سے عرض کیا اور انہوں نے مولوی صاحب سے فرمایا کہ سلطان نواز جنگ سے رعایت کریں تو مولوی صاحب نے عرض کیا مقدمہ صاف ہے سلطان نواز جنگ سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی، بہتر ہے کہ کمیٹی میں میری شرکت نہ ہو اور میری غیر حاضری میں دوسرے ارکین تصفیہ کر دیں میں تو ان سے کسی قسم کی رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مولوی صاحب کی غیر موجودگی میں مقدمہ کا تصفیہ ہوا اور رقم بیٹھنے کی اقساط مقرر ہوئیں۔

رعب داب کا یہ عالم تھا کہ اول تعلقدار (کلکٹر) ان سے آنکھ نہ ملاتے تھے۔ کبھی کسی کو آپ کے سوا نہیں کہتے تھے، عزیزوں کو البتہ تم اور تو کہہ کر مخاطب کر لیتے مگر غیروں کو کبھی تم نہ کہتے تھے۔ ان کا چپراسی تک بھی آپ ہی سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے امراء سے برابری سے ملتے تھے اور کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ نظام الدین حسن بی اے بی ال چیف جسٹس ہوئے تو نہ جانے کیا بات ہوئی کہ مولوی صاحب سے سخت مراسلت ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اس شدت سے حملہ کیا کہ نظام الدین پریشان ہو گئے اور معافی مانگ کر جان چھڑائی۔

چونکہ مولوی صاحب کے والد حکیم زین العابدین بڑے اچھے طبیب تھے اس لئے انہیں بھی طب سے خاصا لگاؤ تھا اور اس فن کے معلومات خوب خاصے تھے۔ خود ذیابیطس کے مریض تھے لیکن پرہیز بہت سخت کرتے تھے۔ صحت کے متعلق مشورے بہت عمدہ دیتے تھے۔ والد مرحوم جگر کی خرابی سے علیل ہو گئے تو انہیں مسلسل ہدایات لکھتے رہے یہ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور بڑے کار آمد ہیں۔ اردو بڑی صحیح لکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں دکنیت کا نام نہ تھا۔ البتہ بول چال بالکل دکنی تھی البتہ لہجہ دکنی نہ ہوتا تھا بلکہ دہلی کے لہجہ میں بات چیت کرتے تھے۔

مظفر جنگ

اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن کی ہمشیرہ نواب مظفر جنگ سے بیاہی گئیں اور نواب موصوف کے بھائی نواب

جہانگیر جنگ کی صاحبزادی حضور میر عثمان علی خان بہادر سے بیاہی گئیں اس لئے اس خاندان کو شاہی قرابت کا اعزاز بھی حاصل ہو گیا۔ یہ خاندان قدیم اور عالم خاندان ہے [illegible] بخارا کے پایۂ تخت سے اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان [illegible] کا تعلق تھا اور [illegible] آصف جاہ کا خاندان بھی اورنگ زیب ہی کا تھا۔ آصف جاہ کے خاندان میں [illegible] وزارت [illegible] اور [illegible] کا اعزاز تھا [illegible] بادشاہ [illegible] آئے پایا تو بخارا سے اس خاندان کے لوگوں کو بلوایا اور نواب مظفر جنگ کے جد بھی آ گئے۔ یہ خاندان [illegible] علمی و ادبی خاندان تھا۔ نواب مظفر جنگ اس خاندان کے مکمل نمائندے تھے۔

حیدرآباد کا محلہ [illegible] اسی خاندان نے آباد کیا [illegible] جنگ [illegible] نے اپنی ڈیوڑھی کی بنا ڈالی ان کے برابر نواب شکرہ جنگ نے اپنی ڈیوڑھی بنائی اور ان کے پیچھے نواب [illegible] الدولہ نے اپنی ڈیوڑھی کی بنیاد رکھی۔ ان کے پہلو میں نواب تیمور جنگ نے اپنی ڈیوڑھی بنانی شروع کی اور [illegible] نواب سید یار جنگ نے اپنا مکان بنایا اس طرح ایک دائرہ بن گیا جو اب تک کچھ کھنڈر اور کچھ دیواروں کی شکل میں موجود ہے۔ البتہ رفیع الدولہ کی ڈیوڑھی [illegible] مظفر جنگ کی ڈیوڑھی کے نام سے اب تک [illegible] ہے اور اس میں مرحوم کے ایک صاحبزادے نواب قادر جنگ موجود ہیں۔

مظفر جنگ بہادر عالم و فاضل بذلہ سنج ادیب [illegible] بزرگ تھے، چونکہ میرے ہمسایہ تھے اس لئے میری آمد و رفت ان کے پاس بہت تھی والد مرحوم سے بڑے پُرخلوص مراسم رکھتے تھے [illegible] نشست تھی مظفر جنگ کے اور میرے مکان کے بیچ میں [illegible] نواب حفیظ اللہ خان کا مکان (تیمور جنگ کی ڈیوڑھی) تھا [illegible] زیادہ تھی۔ شام میں محلے کے شرفاء علماء اور [illegible] بزرگ اور بعض ملاقاتی ڈیوڑھی پر آ جاتے مغرب سے عشا تک [illegible] بڑی پُرلطف صحبت رہتی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم، ادب، شعر [illegible] پر بحث رہتی، بالکل درباری ٹھاٹھ ہوتا تھا۔ نواب صاحب متوسط [illegible] بزرگ تھے [illegible] گول چہرہ [illegible] روشن بڑی بڑی آنکھیں نہایت [illegible] سفید [illegible] قد متوسط [illegible] بات بات سے [illegible] آہستگی اور متانت سے [illegible] اور بہت [illegible] شعر [illegible] ادا کرتے تھے [illegible] شبلی وغیرہ جو جو علماء حیدرآباد آتے ضرور یہاں حاضری دیتے تھے۔

ڈیوڑھی کے بیچ کے ہال میں [illegible] مسند بچھی ہوتی اس پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نواب صاحب بیٹھتے اطراف حاضرین اپنی اپنی حیثیت کے موافق بیٹھ جاتے [illegible] حقہ [illegible] کو سرفراز ہوتی [illegible] میں پان رکھے رہتے سب لوگ بے تکلف پان کھاتے حقہ پیتے اور باتیں کرتے مگر اس بے تکلفی میں بے ادبی کا شائبہ تک نہ ہوتا [illegible] عمدہ [illegible] کے پیش نظر رہتا۔

خاندان کے کتابی ذخیرے کے علاوہ خود نواب صاحب نے بہت زیادہ کتابیں جمع کی تھیں دو کمرے کتب خانے کے تھے جس میں [illegible] جلدوں کی ہزاروں کتابیں تھیں اور بیشتر قلمی مطلا مذہب [illegible] خود نواب صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا کم از کم پچاس کتابیں خود انہوں نے لکھی تھیں [illegible] دوستوں کو سنایا کرتے [illegible] ان کی ڈیوڑھی میں کبھی کوئی بات بیکار نہیں ہوتی ہمیشہ علمی ادبی مذہبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ علاوہ خاندانی جاگیر اور منصب کے عہدہ "صدر الصدور" سے بھی سرفراز تھے اور غالباً صدر المہام (وزارت) امور مذہبی اسی عہدے کا ضمیمہ تھی۔ اس وجہ سے سارے علماء یہیں جمع ہوا کرتے تھے۔ طالب علموں سے نواب صاحب کو بڑی دلچسپی تھی اور ان کی بہت مدد کرتے تھے [illegible] میں ایک لڑکا جماعت [illegible] میں میرے ساتھ پڑھتا تھا یکایک اس نے مدرسہ چھوڑ دیا چونکہ تیز اور ذہین لڑکا تھا اور مجھ سے خاص دوستی ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کا پتہ چلایا اور اس کے مکان پر جا کر ملاقات کی اور مدرسہ [illegible] دریافت کی تو اس نے کہا کہ اس کے والد نے یکایک انتقال کیا ہے اور چونکہ وہ ملازم تھے اور انہی کی تنخواہ پر خاندان کی گذر بسر تھی اس لئے اب کوئی ذریعۂ معاش خاندان کا نہ رہا اور اس کی والدہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنے باپ ہی کے دفتر میں نوکری کرے اس لئے اس نے تعلیم چھوڑ دی ہے۔

یہ حال سن کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے اسے مجبور کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور نواب صاحب کے پاس لے جا کر پیش کیا میں نے حالات سنائے۔ یہ تو نواب صاحب بہت متاثر ہوئے پھر مجھ سے فرمایا کہ اس لڑکے کی ماں کی طرف سے ایک درخواست اور دو بہنوں کی طرف سے دو درخواستیں الگ الگ لکھوا لو اور قلمدان منگوا کر ایک چٹھی ناظم تعلیمات کے نام لکھ دی کہ اس لڑکے کے نام وظیفہ (اسکالرشپ) جاری کر دیا جائے اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو پچیس روپے نقد سرفراز فرمائے اور تسلی دلاسا دیا اور فرمایا کہ کل سے مدرسہ جایا کرو۔ تمہاری ماں بہنوں کے نام اور تمہارے نام جو وظیفہ ہوگا ان سب کی مجموعی رقم تمہارے والد کی تنخواہ کے برابر ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس لڑکے نے اطمینان کے ساتھ منشی فاضل کامیاب کر کے تعلیمات میں ملازمت کر لی اور جلد ہی صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر) بھی ہو گیا۔

مولوی عبد الجبار خان آصفی رامپوری کے گھر کے سامنے ایک بوڑھا درزی رہتا تھا اس کی بڑھیا درزن آنکھوں سے معذور تھی۔ درزی مر گیا تو مولوی صاحب نے میرے سامنے ہی نواب صاحب سے عرض کیا تو نواب صاحب نے درخواست پیش کرنے کے لئے فرمایا۔ دوسرے روز مولوی صاحب نے میرے ہاتھ سے درخواست لکھوائی اور خود اس پر تصدیق کی اور پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ کی سفارش بھی لکھی اور مجھی کو دیا کہ پیش کر دو۔ میں نے پیش کیا تو درخواست پڑھ کر نواب صاحب نے دس روپیہ ماہوار کی اجرائی کی تجویز کی اور دوسرے مہینے ہی سے تنخواہ جاری ہو گئی۔

نواب صاحب کے انتقال کے وقت کئی صاحبزادے تھے، نواب حبیب اللہ خاں جو عالی رفاعی کے نام سے مشہور ہوئے بڑے علم دوست اور ادب نواز اور اچھے شاعر تھے مگر طبیعت میں لاابالی پن تھا سرود نگر میں رہتے تھے "ادارۂ ادب اردو" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی اور اسی انجمن سے ایک ماہنامہ "تحفہ" بھی نکالتے رہے جو ایک آدھ سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ آخر میں عالی رفاعی نے ترک لباس کر دیا تھا اور تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نواب صاحب کے دو اور صاحبزادے نواب سردار جنگ اور نواب قادر جنگ ان کے انتقال کے وقت کمسن تھے۔ بعد کو تکمیل تعلیم کی غرض سے یورپ گئے اور بیرسٹری کر لی، سردار جنگ بہادر اب مجسٹریٹ ہیں اور قادر جنگ بہادر نے معتمد کروڑگیری کسٹم سپرنٹنڈنٹ رہ کر وظیفہ (پنشن) لے لیا ہے۔

مرحوم کی کتابیں نہ تو عالی رفاعی نے چھپائیں اور نہ سردار جنگ اور قادر جنگ نے، معلوم نہیں مسودے باقی بھی ہیں یا تلف ہو گئے۔

حیدرآباد میں محرم میں جو تماشے اور مخرب اخلاق حرکات ہوتی تھیں ان کے سدباب کی طرف سب سے پہلے نواب صاحب ہی نے قدم اٹھایا اور مکہ مسجد میں شبینہ کا خاتمہ اور خاص خاص ایام میں نمازوں اور وعظوں کا بندوبست بھی شروع کیا، اضلاع میں واعظین مقرر کئے اور حیدرآباد کے مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کی طرف توجہ کی مگر زمانہ ایسا تھا کہ شرک و بدعت کو بھی عروج ہو گیا تھا اس لئے نواب صاحب کی عمر کم ہو گئی اور انہوں نے ایسے وقت انتقال کیا جب کہ حیدرآباد کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ اس خاندان کا علم و فضل انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ سچ ہے ع

فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

انوار اللہ خان

مولانا انوار اللہ خاں المخاطب بہ فضیلت جنگ بہادر مرحوم حیدرآباد کے قدیم علماء میں سے تھے۔ آپ کا خاندان قدیم رکنی تھا اور مشہور بزرگ حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری قدس سرہ سے آپ کے خاندان کا تعلق تھا۔ بلحاظ فضیلت و علمیت حیدرآباد میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا

نہ تھا مگر آپ کو نہ تو اپنی علمیت و فضیلت کے اظہار کا شوق تھا نہ ہی آپ کا انکسار اور عجز اس کی اجازت دیتا تھا۔ آپ کو شاہِ دکن کی استادی کا شرف حاصل تھا پھر آپ صدر الصدور اور صدر المہام امورِ مذہبی بھی ہو گئے تھے مگر عہدہ دارانہ شان اور امارت آپ میں پیدا ہی نہ ہوئی وہی عالمانہ وقار بلکہ طالب علمانہ انکسار آپ میں تھا جو آخر تک رہا۔

آپ کے دو کارنامے بڑے اہم ہیں ایک "مدرسۂ نظامیہ" کا قیام اور دوسرے "مجلس اشاعت العلوم" کی بنیاد۔ آپ نے درسِ نظامیہ کی ترویج کی خاطر مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی ساری توانائیاں اس کے لئے صرف کر دیں۔ خود حضور نظامِ دکن نے بھی اس سے دلچسپی لی اور نظامیہ کا آغاز نہایت عمدگی سے ہوا۔

انوار اللہ خاں عالم تھے نیک دل تھے اور حریص علی الخیر تھے نیک کام میں جلدی کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کے قیام میں بھی انھوں نے بڑی جلدی کی چونکہ نرے عالم تھے اس لئے سیاسیات سے قطعاً ناواقف تھے اور ضروریاتِ زمانہ سے بھی بے خبر ہی تھے۔ انھوں نے اپنی نیکدلی سے یہ سوچ رکھا تھا کہ دکن کو دینی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور ملک کی خدمت اسی طرح کر سکتے ہیں مگر یہ غور نہیں کیا کہ صرف دینی تعلیم سے کام نہیں چل سکتا اس کے ساتھ ہی ساتھ روشن خیالی اور دنیوی تعلیم بھی ضروری ہے چنانچہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کا درس [illegible] جو سینکڑوں سال پہلے تجربہ ہوا تھا اور اب خود بغداد و مصر میں نہ تھا یہاں مقرر ہوا اور ملا سازی یا مولوی گری شروع کی گئی۔ اساتذہ بھی پرانے خیال کے فراہم کئے گئے اور طریقۂ تعلیم و طرزِ رہائش بھی قدیم ہی رکھا گیا۔ مدرسہ چلنے لگا۔ فارغ التحصیل نکلنے لگے مگر نظامیہ نہ تو دار العلوم حیدرآباد بن سکا نہ دار العلوم دیوبند نہ ہی ندوۃ العلماء بنا۔ ندوہ، دیوبند اور دار العلوم سے زیادہ روپیہ نظامیہ پر صرف ہوا مگر نظامیہ کسی ایک فارغ التحصیل کو بھی دنیا کے سامنے فخر سے پیش نہ کر سکا۔ اب بھی نظامیہ چل رہا ہے مگر اس کا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔

دوسرا کارنامہ مولانا کا "مجلسِ اشاعت العلوم" کا قیام تھا۔ اس مجلس سے زیادہ تر مولانا ہی کی کتابیں [illegible] اور بیرونی مصنفوں کی کتابوں کی اشاعت بھی عمل میں آئی اور یہ کام نسبتاً نظامیہ کے زیادہ فائدہ مند [illegible] رہا۔ مولانا [illegible] اسلام کا سلسلہ بڑا ہی عمدہ تھا اس کے علاوہ فتنۂ قادیانیت کے خلاف بھی مولانا نے کئی کتابیں لکھیں جو طبع ہو گئی ہیں اور دوسرے علوم و فنون پر بھی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ بہرحال عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں بہترین کتابیں اس مجلس نے شائع کیں اور یہ ایک [illegible] احسانِ عظیم [illegible] پر مولانا کا رہا۔

ان علمی کاموں کے علاوہ مولانا نے امورِ مذہبی کے دفتر میں "دار الافتاء" بھی قائم کرا دیا تھا اور اہلِ خدمات شرعیہ قاضی، خطیب، ملا وغیرہ ائمۂ مساجد، مؤذنین وغیرہ کے لئے [illegible] مقرر کر کے امتحان بھی مقرر کرا دیا تھا جس سے دیہات کے مذہبی لوگوں کو فائدہ پہنچنا چاہیے تھا مگر بدنصیبی سے نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ مولانا کے بعد محکمہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پھنسا جن کو ان باتوں سے دلچسپی ہی نہ تھی۔

میرے والد مرحوم سے مولانا کے مراسم بڑے قدیم اور پُر خلوص تھے جس کی وجہ سے مجھ پر بھی بڑی شفقت و عنایت فرمایا کرتے تھے اور میں جب بھی حاضرِ خدمت ہوتا مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ملتے [illegible] میں چونکہ بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق رکھتا تھا اور اساتذہ کا کلام مجھے بہت یاد تھا اس لئے مجھ سے فرمائش کر کے شعر سنتے اور اگر کوئی شعر کہا ہوتا تو اپنے شعر بھی مجھے سناتے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ عالم شاعر نہیں ہو سکتا (معاف کیجئے میں نے غلط لکھ دیا ہے "عالم شاعر نہیں ہوتا") اگر وہ شعر کہنے لگے تو شاعر تو رہ جاتا ہے مگر شاعری کی روح ختم ہو جاتی ہے اور صرف موزونیت باقی رہ جاتی ہے خصوصاً عربی ادب کا ماہر اور عربی شعر کا واقف کوئی ہو اور اردو زبان میں شاعری کرنے لگے تو پھر موزونیت کی بھی خیر نہیں ہوتی موزوں اردو شعر بھی عربی شعر کی نہج پر اس طرح [illegible] ہے کہ ناموزوں معلوم ہونے لگتا ہے، چنانچہ یہی کیفیت میں نے مولانا میں محسوس کی۔ مولانا کا پایہ علم میں بہت بڑا تھا۔ عربی ادب پر بھی خاصا عبور تھا اسی وجہ سے طبیعت میں ایک قسم کی پیوستگی تھی جو شاعری کے

مذاق نقی اس پایہ کا نہیں کہ مولانا صاف اور بے عیب شعر کہتے تھے مگر کلام موزوں ضرور ہوتا تھا اور کچھ نہیں چنانچہ مولانا کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔

باوجود اس علم و فضل کے مولانا تقریر میں کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے اور مناظرہ تو وہ کبھی نہ کر سکتے تھے۔ کوئی ان کی بات کاٹ دیتا تو خاموش ہو جاتے اور گفتگو ہی ختم کر دیتے۔ ایک دفعہ میرے سامنے ہی ایک شخص نے کچھ پوچھا اور مولانا اس کو جواب دینے لگے مگر اس نے بیچ ہی میں کہا نہیں ایسا نہیں ہے ایسا ہے تو مولانا نے خاموشی اختیار کی پھر اس نے سخت کہا کہ فرمائیے مگر کوئی بات ہی نہیں کی اور ٹال گئے۔ اس طرح مخالف کو چپ کر دینا یعنی مباحثہ مناظرہ کرنا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ نہایت متین خاموش اور باوقار تھے۔ لکھنے کے قریب تھے اور مسائل علمیہ کو اس عمدگی سے تحریر فرماتے کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ تحریر میں زیادہ شگفتگی نہ تھی مگر صاف اور مدلل تحریر ہوتی تھی۔

بدنصیبی سے ایک جماعت حیدرآباد میں ان کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی تھی اس لیے ان کے خلاف خاصا پروپیگنڈا ہوا اور بعض جھوٹے الزام ان پر لگائے گئے اور مشہور کیا گیا کہ مولانا نے ائمہ کے خلاف فتوے دیئے ہیں مگر یہ سب غلط تھا۔ مولانا نہایت محتاط اور شرع کے پابند بزرگ تھے۔

میں نے مولانا کی شاگردی باقاعدہ نہیں کی ہے مگر بیشتر فائدہ اٹھایا ہے چنانچہ جب کبھی حاضر خدمت ہوتا کوئی نہ کوئی بحث چھیڑ دیتا یا مسئلہ پوچھ بیٹھتا اور مولانا اس کو بڑی عمدگی سے بیان فرما دیتے اس طرح بہت سے پہلے بہت کچھ پڑھ لیا۔

بدنصیبی سے نظامیہ سے کوئی خاص ہستی نہ نکل سکی جو اس دارالعلوم کا نام روشن کرتی ورنہ جتنے فارغ التحصیل طلبہ [illegible] بادشاہ [illegible] شاہ قادری، [illegible] رشید پاشاہ [illegible] مفتی اشرف علی [illegible] مولوی [illegible] نکلے [illegible] مولوی سید [illegible] مولانا سید سلیمان، مولوی معین الدین، مولانا عبدالباسط [illegible] کر سکتا ہے [illegible] نہیں کر سکتا [illegible] مولانا [illegible] نظامیہ کے لئے وقف کر دیا اور چونکہ وہ خود پرانے زمانے کے بزرگ تھے اس لئے [illegible] نظامیہ کے کار پردازوں کو زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے روش بدلنی چاہئے تھی مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

عبدالجبار خاں آصفی

مولانا عبدالجبار خاں آصفی کا خاندان رام پوری تھا اور مولانا رام پور ہی سے حیدرآباد آئے تھے۔ پرانی وضع کے عالم اور متقی بزرگ تھے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی ان کے معتقد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جید عالم اور مستعد طالب علم تھے۔ کسی کو خاطر میں لاتے نہ کسی سے دبتے تھے۔ علم و ادب میں بڑی پہلوانی فرماتے تھے۔ [illegible] میرے مکان کے قریب رہتے تھے۔ والد مرحوم سے بڑی دوستی تھی اور میرے خاندان کے بیشتر افراد سے محبت و مروت تھی اس لئے مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ ایک روز میں کتاب بغل میں دابے ان کے مکان کے سامنے سے جا رہا تھا [illegible] سلام کیا۔ پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا فلاں صاحب کے پاس۔ کہنے لگے کتاب [illegible] میں نے عرض کیا ظہوری [illegible] وہ صاحب تمہیں ظہوری پڑھا سکیں گے [illegible] خود پڑھ نہ سکیں گے [illegible] اس جاہل سے پڑھتے ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فرمانے لگے کل سے میرے پاس آیا کرو۔ چنانچہ دوسرے روز سے میں نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ فارسی کا ایسا طرار عالم میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک دریا تھا جو رواں تھا۔ اس خوبی سے پڑھاتے کہ بغیر یاد کئے سبق ذہن نشین ہو جاتا اور لغات اس عمدگی سے حل کرتے کہ پھر ذہن سے نہ اترنے پاتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آصفی سنہ [illegible] آصفی

کے نام سے سرشر طہوری کا ترجمہ فرما رہے تھے۔ ڈیڑھ نثر میں نے پڑھی ہے اس کے بعد کچھ ایسا معروف رہا کہ وقت نکال ہی نہ سکا۔

بہر حال میں نے وقتِ واحد میں پہلوانی، علم، ادب، شعر، تاریخ اور علومِ متفرق کو آسی میں جمع پایا ہے۔ کوئی پہلوان آ جائے تو آپ کشتی لڑنے کو تیار، داؤں گھات پر مسلسل تقریر فرمانے لگیں گے۔ کوئی پنجہ کش آ جائے تو پھر پنجہ کی شرائیں گے اور پنجہ کشی کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر تقریر بھی فرمائیں گے اور اگر بدنصیبی سے کوئی شاعر پھنسے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ اپنا فارسی کلام جو سنانا شروع کریں گے تو دم لینے نہ دیں گے۔ اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے وہ سناتے مثلاً حافظ کی پوری غزل سنا دیتے پھر اپنی غزل سنانے لگتے۔ کمال یہ کہ پہلے حافظ کا شعر سنایا جاتا کہ حافظ نے اس قافیہ کو یوں باندھا ہے اور میں نے یوں ادا کیا ہے اس طرح ان کی ایک غزل سننے کے لئے تین گھنٹے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو غزل کسی کی غزل پر کہی گئی ہو اور قافیہ کو خاص طور پر باندھا گیا ہو وہ کتنی مہمل ہو گی۔ یہی حال ان کی غزلوں کا تھا۔ ایک ضخیم کلیات تقریباً ایک ہزار صفحات کا مرتب فرما دیا ہے جو مشاقی اور موزوں طبعی کا اچھا نمونہ ہے مگر اس میں شعریت ہے نہ تغزل۔ فارسی ہی زیادہ کہتے تھے کبھی کبھار اردو بھی کہہ لیا کرتے تھے جو فارسی ہی کی طرح مشاقی کا نمونہ ہوتی تھی۔

دس بارہ بڑی نفیس کتابیں لکھیں جن میں سے تین چار طبع ہو چکی ہیں۔ کئی صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے تھے۔ ایک حواری [illegible] لیے اور دوسرے جو تقریباً میرے ہم عمر ہیں لیونزار [illegible]۔

مولانا شبلی نے تاریخ دکن پر کام کیا تو آسی سے بھی کام لیا اور سلسلہ آصفیہ میں جو تاریخ دکن لکھی گئی ہے اس میں بھی آسی کا بڑا حصہ ہے۔ طبیعت کے سخت اور مزاج کے تیکھے تھے۔ زبان بہت صاف تھی اور گالیاں بھی بے تکلف دے دیا کرتے تھے، چھوٹے عاشق فرماتے [illegible] تو [illegible] اس لیے مجھے گالی نہیں دے سکتا [illegible] نہ جی تو جو [illegible] کہ تو ہے [illegible] بیان [illegible] میں عرض [illegible] ہمیں [illegible] نکال لیجئے تو فرماتے [illegible] بہ عافیت [illegible] کہا [illegible] جا [illegible] آسی کے [illegible] اتفاق کرتے [illegible] ہوتا۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر [illegible] ایک موقعہ مہاراجہ نے ایک لطیفہ [illegible] غزل [illegible] اصلاح کے لئے [illegible] کو دکھائی اور ان کی اصلاح سے بعد [illegible] آسی کے [illegible] اصلاح دی [illegible] غزل [illegible] جب [illegible] اصلاح شدہ غزل انہیں جا [illegible] آسی کے پاس [illegible] جیسے [illegible] آسی [illegible] کی [illegible] چاہا لکھ دیا [illegible] خاموش ہو گئے پھر بلوایا مگر آسی نہ گئے بالآخر مہاراجہ نے معذرت کی اور بڑی مشکل سے انہیں منایا۔

ترکی نے انہیں بہت ہو رکھا تھا ہر ان کی [illegible] واقف تھے ان کی غزل پر غزل کہتے [illegible] مقطع میں ان کی تعریف کر دیتے بس آسی پھولوں نہ سماتے۔ حالانکہ ترکی کی غزل کے سامنے آسی کی غزل پھیکی پڑ جاتی مگر یہ محسوس نہ کرتے [illegible] کیا کرتے تھے۔

سب سے بڑی [illegible] لگی [illegible] سیدھے سادے بزرگ تھے لگی لپٹی نہ رکھتے تھے۔ جب خفا ہوتے تو جو منہ میں آتا کہہ جاتے اور [illegible] غصہ [illegible] ہو جاتا تو صاف [illegible] تھے۔ علمی تبحر کے ساتھ قلبی فراخ دلی بھی نمایاں تھی۔ طلباء کی امداد کرتے [illegible] صاحب کی خدمت [illegible] طلبہ کی ستائش [illegible] ساتھ ہی ساتھ وکیلوں کی خدمت بھی کرتے جاتے تھے۔

عبدالجبار خاں صوفی

مولانا عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری بہاری ثم حیدرآبادی [illegible] حیدرآباد کے مشہور [illegible]

خاندانِ شاہی سے قرابتِ قریبہ رکھنے والوں کے لئے قائم کیا گیا تھا، چونکہ والد مرحوم نے بھی مدرسۂ اعزہ میں تعلیم پائی تھی اور صوفی صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے اس لئے جب بھی وہ سلطان پورہ کی طرف جاتے صوفی صاحب سے ضرور ملتے تھے اور ان کے ساتھ میں بھی ملا کرتا تھا۔ چونکہ باپ کے استاد تھے اس لئے مجھے کچھ زیادہ ہی ادب کرنا پڑتا تھا۔ سلطان پورہ میں میرے احباب اکثر رہتے تھے جن کے لئے میں جایا کرتا تھا اور جب بھی مجھے ملاحظہ فرماتے صوفی صاحب پکار لیا کرتے اور گھنٹہ دو گھنٹے اپنی علمی مصروفیات کا حال سناتے تھے۔

تذکرۂ شعراء دکن دو جلدوں میں، تذکرۂ اولیائے دکن دو جلدوں میں اور تاریخ دکن کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ تذکرے تو مکمل چھپ گئے مگر تاریخ دکن کی ایک ہی جلد طبع ہو سکی، مرحوم کو کام کرنے کا ڈھب آ گیا تھا اور بڑا سستا کام کر کے کرارے دام وصول کرتے تھے۔ سستا اس لئے کہ دو چار تذکروں کو سامنے رکھ کر اور چار چھ آدمیوں کے حالات حاصل کر کے تذکرے مرتب کر دیئے تھے اور انہیں سرکار میں پیش کر کے ہزاروں روپیہ ان کی چھپائی کے لئے بھی حاصل کر لیا تھا اس طرح خوب فائدہ اٹھایا۔

بڑے تعلّی پسند اور بر خود غلط قسم کے بزرگ تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے میاں! تصنیف و تالیف بڑی مشکل چیز ہے۔ خونِ جگر کھانا پڑتا ہے تب کہیں کتاب لکھی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا قبلہ ایسی کتاب جیسی کہ آپ نے شعرائے دکن لکھی ہے حکم ہو تو ایک ہفتے میں مکمل کر دوں۔ یہ سن کر بہت خفا ہوئے۔ میں تو بھاگ کھڑا ہوا مگر آپ نے فوراً مولوی غازی الدین احمد (جو بعد کو غازی یار جنگ ہوئے) سے شکایت کی۔ کیونکہ یہ بزرگ بھی ان کے شاگرد رشید اور والد کے اسکول فیلو تھے انہوں نے میری خوب خبر لی اور مجھے صوفی صاحب کے پاس جا کر باقاعدہ معافی مانگنی پڑی۔

نایاب کتابوں کے متعلق ہمیشہ فرماتے کہ میرے پاس موجود تھی طغیانی میں تلف ہو گئی۔ ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد کی ”موسیٰ ندی“ میں ایک زبردست سیلاب آیا تھا جس میں اکثر مکانات برباد ہوئے اور صوفی صاحب کا مکان بھی شاید گر گیا تھا۔

ان کمزوریوں سے قطع نظر آدمی قابل تھے عربی فارسی کے فارغ التحصیل تھے اردو کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ شعر گوئی کا شوق بھی تھا، مطالعہ بھی اچھا تھا۔ معلومات نہایت اچھی تھیں۔ بڑھاپے کے باوجود حافظہ نہایت ہی اچھا تھا اور ہر بات بڑی تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔ حیدر آباد کے بڑے بڑے لوگ مثلاً نواب تلاوت جنگ صدر المہام مال، نواب رستم جنگ ناظم کروڑگیری، نواب غازی یار جنگ انسپکٹنگ آفیسر عدالت وغیرہ ان کے شاگرد تھے جن کی شاگردی پر مولوی صاحب ناز فرمایا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کا اصل کارنامہ تاریخ دکن ہے، دکن کا تاریخی مواد نہایت مبہم اور منتشر ہے مگر مولوی صاحب نے بڑی عمدگی سے اسے فراہم کیا اور بڑے ہی سلیقے سے مرتب کیا ہے چونکہ میں بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اور تاریخ دکن میرا موضوع ہے اس لئے ان کی محنت کا اندازہ میں نے اچھی طرح کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولوی صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور اپنے زمانے کے قابل لوگوں میں سے تھے۔ بیس پچیس کتابوں کے مسودے مولوی صاحب نے چھوڑے ہیں مگر ان کے ورثاء نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

حکیم وحید الدین عالیؔ

حیدر آباد سے سینکڑوں صاحبانِ فضل نکلے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر حکیم وحید الدین عالیؔ ہیں۔ اتفاقاً حکیم صاحب اور والد مرحوم مدتوں ہم درس رہے تھے اس لئے ہمارے گھرانے سے عزیزانہ مراسم تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے پھوپھی زاد بھائی مولوی قطب الدین محمد علی

ناضل بھی حکیم صاحب کے ساتھی تھے اس لئے بھی زیادہ مراسم رہے۔

بظاہر حکیم صاحب نہایت کم گو اور کھوئے ہوئے سے نظر آتے تھے مگر حد درجہ ذہین اور بڑے ہی ذہین تھے۔ یوں امتحان کی حد تک انہوں نے فقط مولوی فاضل کامیاب کیا تھا مگر عربی پر انہیں حاکمانہ عبور اور ماہرانہ قدرت تھی بڑے بڑے علماء ان سے بات کرنے سے جھجکتے تھے ایک دریا تھے جو بہتے رہتے۔ طبیعت کا یہ حال کہ ؎

نہیں پانی ہوئی جس شعر کی پتھر زمیں نکلی

کبھی سبع معلقہ کا جواب لکھتے تو کبھی متنبّی کی چندیاں بکھیرتے۔ کبھی صاحب قصیدۂ بردہ کی خبر لیتے تو کبھی انوری و دقیقی کو جھنجھوڑتے۔ غرض بلا کے طباع اور ذہین تھے۔

ناد الملک۔ طوبی شوستری ایک بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ عراق اور ایران میں عمر گزاری تھی اور علمائے عالم میں یکتا شمار ہوتے تھے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن کے استاد تھے اور واقعہ یہ ہے کہ عربی و فارسی میں اپنی نظیر آپ تھے مگر وحید الدین عالی کے سامنے ان کا چراغ نہیں جلتا تھا، طوبی شوستری نے عراق میں عربی کی تکمیل اہلِ زبان اساتذہ سے کی تھی اور ایران میں فارسی کی تکمیل کی تھی اور لطفِ خاص یہ کہ مادری زبان فارسی تھی بخلاف ان کے عالی نے نہ تو اہلِ زبان علمائے عرب سے تحصیل کی تھی اور نہ عراق و عرب کی صورت ہی دیکھی تھی مگر طبعی مناسبت، ذاتی کوشش اور فطری لگاؤ کی وجہ سے عربی ادب اور خصوصاً عربی شعر پر اتنے حاوی تھے کہ طوبی شوستری تک ان کے معترف تھے۔

عالی کے فرزند حکیم نظام الدین صاحب نے بعض قصائد اور طوبی شوستری کے چند خطوط شائع کئے ہیں۔ کاش عالی کے عربی اور فارسی کلام کی اشاعت ہو جاتی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ عالی کے جیسا عربی کا شاعر ہندوستان بھر میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ بالکل قدرتی چیز تھی ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہ حال عربی کا تھا۔ فارسی میں بھی خوب شعر کہتے تھے خصوصاً نعت بہت کہی ہے مگر افسوس ہے کہ فارسی کلام بھی شائع نہ ہو سکا۔

طب میں بھی غیر معمولی مہارت تھی تشخیص بڑی اچھی کرتے تھے اور نسخہ نویسی میں بھی کمال تھا اور بہت سوچ سمجھ کر علاج کرتے تھے طبیب کی حیثیت سے ملازم تھے اور باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو عربی کی پروفیسری کے لئے انتخاب ہوا۔ ابھی جائزہ بھی حاصل نہیں کیا تھا کہ انتقال ہو گیا۔ عمر مشکل پچاس ہو گی کہ دنیا سے منہ موڑ لیا۔

عجیب و غریب بزرگ تھے۔ ذاتی العلم تھے کھانے پینے اور پڑھنے کا شوق مطلق نہ تھا۔ صرف مطالعہ ان کا مشغلہ تھا جو کتاب پڑھتے اس پر نوٹ ضرور کیا کرتے۔ چنانچہ والد کے کتب خانے میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جن پر عالی۔۔ کے نوٹس تھے۔

ایک دفعہ والد کو درد گردہ ہو گیا اور بڑی تکلیف ہونے لگی حکیم محمود ہمدانی کا علاج ہو رہا تھا، مجھ سے راستے میں ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ والد عثمان آباد سے بیمار ہو کر آ گئے ہیں۔ درد گردہ ہے اور محمود ہمدانی کا علاج ہے۔ سن کر خاموش ہو گئے دوسرے روز صبح تشریف لائے نسخہ ملاحظہ کیا نبض دیکھی، قارورہ رکھنے کے لئے کہا اور جو شاندہ جو بلا ہوا رکھا تھا پھنکوا دیا خود گھر جا کر دوا بھجوائی۔ دوسرے ہی روز سے تکلیف کم ہونے لگی اور ایک ہفتے میں صحت ہو گئی۔

مشہور ہے کہ عالی مفت دوا نہ دیتے تھے مگر میں نے ہمیشہ ان سے دوا مفت ہی لی ہے کبھی مجھ سے دوا کی قیمت نہیں مانگی اور نہ دوا دینے سے انکار کیا البتہ کتابیں انہوں نے مجھے بھی نہ دی کئی دفعہ میں نے بعض کتابیں مانگیں مگر وہ ٹالتے رہے نہ تو صاف انکار کیا اور نہ کتاب ہی دی۔

والد جب کبھی اضلاع سے آتے تو عالی سے ملنے ضرور جاتے اور دن بھر عالی کے پاس گزارتے۔ اس کے دوسرے روز عالی صاحب ہمارے گھر آجاتے اور شام تک یہیں ٹھہرتے۔ والد کو عربی سے شغف نہ تھا اس لئے فارسی شاعری ہی معرض بحث میں آتی اور دونوں ایک دوسرے کو اپنا اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ والد فارسی بھی کہہ لیتے تھے مگر عالی کی شاعری سے ان کی شاعری کو کوئی نسبت نہ تھی۔ ان کا سرمایۂ فارسی بیس پچیس غزلوں سے زیادہ نہ تھا اور عالی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک نشست میں تیس چالیس غزلیں سنا دیتے تھے مگر تھے دونوں دوست اور ایک دوسرے کے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔

عالی کے انتقال سے دو ایک مہینے پہلے کا قصہ ہے کہ عالی صبح صبح تشریف لائے اور شام تک غریب خانہ پر ہی ٹھہرے رہے۔ پھر والد سے فرمائش کی۔ والد نے ایک نئی غزل سنائی۔ اس شعر پر عالی پھڑکتے رہے اور بہت دیر تک داد دیتے رہے ہے

ہمہ رو جفائے آسمان خورد فشرد دل لحد

وائے بہ بستن استخواں چیرہ چناں زمیں زمیں

ہندوستان میں عربی کا ایسا شاعر کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ پیدا ہوگا۔ کاش بھائی حکیم نظام الدین اپنے والد کا عربی کلام چھپوا دیں اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہندوستان نے بھی عربی شاعر پیدا کئے ہیں۔

قطب الدین فاضل

مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد کو صرف دو ہی آدمیوں کو پیش کرنے کا فخر بھی [illegible] اور [illegible] حیدرآباد پر ہوتا ہے دونوں حکیم حمید الدین شاطر اور حکیم قطب الدین محمود ملی فاضل تھے۔

قطب الدین صاحب کا خاندان حیدرآباد کا علمی خاندان تھا۔ ان کے دادا بھی قطب الدین ہی کہلاتے [illegible] ہوئے تھے اور وہاں سے [illegible] غیاث الدین [illegible] یا ہم کے بزرگ تھے جو ہمارے خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ غیاث الدین [illegible] کے تعلقدار [illegible] سے اپنے بڑے بیٹے قطب الدین کے حق میں [illegible] شروع کر دی۔ نواب غیاث الدین خاں سے غیاث الدین شاہ بن گئے اور مرتے دم تک ایک [illegible] پر قائم رہے۔ [illegible] سے میری بھی [illegible] تھیں اس رشتہ سے قطب الدین میرے چچیرے بھائی ہوتے تھے [illegible] ماموں کہتے [illegible] ہو گئی کہ [illegible] تو دونوں [illegible] ہے اس لئے قطب الدین میرے والد کو ماموں پکارنے کے بجائے [illegible] پکارنے لگے۔

قطب الدین حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئے اور [illegible] پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کیا پھر طب [illegible] دونوں حیدرآباد میں [illegible] کامیابی حاصل کی۔ پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ [illegible] پڑھائی جاتی تھی۔ طب کا امتحان دینا تھا [illegible] کر [illegible] درجہ اعلیٰ کے نمبر دیئے ہوئے اس پر رائے لکھی کہ [illegible] اعلیٰ نہیں ہے جس کے پورے نمبر میں نے دئے ہیں [illegible] ایسے [illegible] نے حل کیا ہے جو عربی کا [illegible] رکھتا ہے۔ عربی اتنی فصیح با محاورہ اور تعبیر لکھی ہے کہ [illegible] کسی ہندوستانی کو ایسی عربی لکھتے ہوئے نہیں دیکھا [illegible] قطب الدین کو سررشتہ طبابت سے اس رائے کی وجہ [illegible]

نثر ہی میں نہیں بلکہ نظم میں بھی تھا اور عربی فارسی دونوں زبانوں میں دریا بہتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا شوق ہوا تو کتابیں لکھنی شروع کیں فانون کی کتابوں کی شرحیں لکھیں، خلاصے لکھے اور پھر مختلف موضوعات پر سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ ابتداً پائگاہ میں تعلقدار رہے پھر معتمد ہو گئے تھے۔ امیر پائگاہ نواب لطف الدولہ بہادر برادرانہ سلوک فرماتے تھے۔

قصیدہ لامیہ کی طرف ایک دفعہ جو توجہ کی تو اسی میں لگ گئے۔ چار چار سو شعر کے بہت سے قصائد لکھ ڈالے۔ ان کا مقابلہ حیدرآباد میں اگر کوئی کر سکتا تھا تو علامہ وحید الدین عالی ہی تھے ان دونوں میں بہت محبت تھی اور ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن نے ایک دفعہ مسندالملک آغا شوشتری سے پوچھا کہ آپ حیدرآباد میں کس کو پسند کرتے ہیں، تو انہوں نے کہا یوں تو یہاں بہت سے عالم ہیں مگر قطب الدین سب سے تیار اور بڑے ہی ذہین ہیں۔ یہ سُن کر حضور نے یاد فرمایا اور یہ باریاب ہوئے دیر تک گفتگو ہوتی رہی حضور نے فرمایا قطب الدین تم کو میں عدالت یا تعلقات میں مقرر کرنا چاہتا ہوں تو عرض کیا سرکار! چار پشت سے پائگاہ کا نمک خوار ہوں لطف الدین خان اس وقت تک لطف الدولہ نہیں ہوئے تھے، نے پائگاہ کو میرے سپرد کر دیا ہے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ حضور نے فرمایا میں لطف الدین خان سے کہہ دوں گا تو عرض کیا سرکار وہ حکم کی تعمیل میں خانہ زاد کو اجازت تو دے دیں گے مگر خانہ زاد انہیں کس طرح چھوڑ سکے گا۔ اس جواب سے حضور کچھ متاثر ہوئے مگر پھر مسکرا کر فرمایا اچھا تم پائگاہ ہی میں رہو چنانچہ قطب الدین نے پائگاہ ہی میں عمر گزار دی تقریباً ۸۰-۸۴ سال کی عمر ہوگی کہ انتقال کیا۔

ان کے انتقال کی اطلاع جب ان کے والد بزرگوار کو دی گئی تو انہوں نے نہایت ہی صبر و استقلال سے کیفیت سنی اور جنازہ حافظ ڈنگہ میں لانے کو کہا کیونکہ یہ مغلپورہ میں رہتے تھے اور قطب الدین صاحب نے فتح دروازے کے مکان میں انتقال کیا تھا جب جنازہ حافظ ڈنگہ کی مسجد میں لایا گیا اور غیاث الدین شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تو وہ اٹھ نہ سکے۔ بد نصیبی سے یہ اطلاع میں نے ہی دی تھی مگر جب وہ اٹھ نہ سکے اور میں بھی انہیں سہارا دے کر اٹھا نہ سکا تو ان کے مرید چودھری شہاب الدین اور عبدالکریم کو میں نے بلایا اور تینوں آدمی مل کر انہیں کھڑا کر سکے۔

بیٹے کی اطلاع پا کر کمر بیٹھ جانا ہم نے سنا ضرور تھا دیکھا نہ تھا مگر عمر میں پہلی اور آخری بار کمر بیٹھتی ہوئی نظر آئی۔ غیاث الدین شاہ صاحب کی واقعی کمر بیٹھ گئی تھی گو مدتوں وہ زندہ رہے مگر چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔

قطب الدین صاحب مجلسی حیثیت سے زیادہ دلچسپ نہ تھے باتیں اکھڑی اکھڑی کرتے، باتیں کرتے کرتے اپنی دھن میں کھو جاتے اور جھول جھول کر باتیں کرتے جس طرح کہ پرانے مکتبوں میں لڑکے جھول جھول کر پڑھا کرتے ہیں غالباً یہ جھولنے کی عادت انہیں مکتب ہی سے ہوئی تھی۔

حافظہ غیر معمولی قوی تھا۔ بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں تک ازبر تھیں اور بے تکلف سنایا کرتے تھے، ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کیا پڑھتے ہو، میں نے جواب دیا سکندر نامہ۔ پوچھا بحری یا بری؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ دو سکندر نامے بحری اور بری الگ الگ ہیں میں نے کہا وہی جو نظم میں ہے، تو کہا میاں! یہ دونوں ہی نظم میں ہیں۔ تم جس سکندر نامہ کو پڑھ رہے ہو اس کا کوئی شعر سناؤ۔ میں نے شعر سنایا ؎

شنیدم زپیرانِ دینار سنج
کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج!

شعر سُن کر کہا یہ سکندر نامہ بری ہے۔ پھر آپ نے سکندر نامے کے شعر سنانے شروع کیے اور تقریباً ڈھائی تین سو شعر ایک سانس میں سنا دیئے۔ چند شعر جو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے میں نے بتائے تو انہیں سمجھا بھی دیا۔

عربی قصائد، فارسی قصائد اور غزلیات اور اردو کلام کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، بیشتر قصائد اور نظمیں چھپی ہیں مگر اشاعت محدود ہوئی ہے۔
میرزا نادر علی خان ابوالسلامی، ڈاکٹر سیادت علی خان، ڈاکٹر ولی الدین انہی کے فرزند ہیں۔
قطب الدین صاحب کی کتابوں میں سے شرح شرح محمدی بہت مشہور اور مقبول ہوئی قانونی کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں طبع نہیں ہوئیں یہ مسودات غالباً نادر علی صاحب کے پاس ہیں جو شاید تلف ہو جائیں گے کیونکہ اب کوئی امید ان کی طباعت اور اشاعت کی نہیں ہے۔

محبِّ حسین

مولوی محب حسین یو۔پی کے باشندے تھے ابتداً حیدرآباد آکر افسر جنگ کے توسط سے فوج کے دفتر میں ملازم ہوئے اور افسر جنگ کی لڑکیوں کو پڑھاتے بھی رہے [illegible] معقول، پڑھے لکھے اور وضع دار تھے حیدرآباد میں بہت جلد مقبول ہوگئے۔ پردے کے خلاف تھے اور شدت [illegible] کی مخالفت کرتے تھے، چونکہ ان کی دو تین صاحبزادیاں میری والدہ مرحومہ کے ساتھ پڑھتی تھیں اس لئے ہم لوگوں سے خاصے مراسم [illegible] بچپن میں ایک دو بار یہ لوگ ہمارے گھر آتے اور ہم بھی ان کے گھر جایا کرتے تھے اس آمد و رفت کی وجہ سے میں بھی محب حسین صاحب سے مانوس تھا اور ان سے خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ والد [illegible] ان کے مخالف تھے کیونکہ وہ انہیں دہریہ، ملحد اور نیچری کہتے تھے مگر انہوں نے مجھے کبھی ان سے ملنے کی ممانعت نہیں کی۔

حیدرآباد کی مشہور خاتون صغرا ہمایوں مرزا کو محب حسین نے بہت مشہور کیا۔ اپنے [illegible] "معلم نسواں" اور "شفیق نسواں" میں ان کا خاصا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ غالباً محب حسین کی بے پردگی کی اسکیم پر کاربند ہونے والی حیدرآباد میں سب سے پہلی خاتون یہی تھیں۔

محب حسین [illegible] اچھے تھے [illegible] ناول "امیر علی ٹھگ" اور "میرا پہلا جرم" اردو میں منتقل کیے [illegible] مدتوں تک اردو ماہنامے نکالتے رہے اور ان میں اکثر ترجمے شائع کرتے رہے حیدرآباد میں علمی و ادبی [illegible] نئے خیالات کے نوجوانوں میں علمی کاموں اور ادبی ہنگاموں کا شوق پیدا کیا چنانچہ حیدرآباد کے شرفا کی ایک بڑی جماعت [illegible] سے علم و ادب کی طرف مائل ہوگئی [illegible] کام کیا۔ نوجوانوں میں مباحثوں اور تقریروں کا شوق بھی محب حسین [illegible] سیاسی آدمی تھے [illegible] طبیعت سازش کی طرف مائل تھی اس لئے [illegible] رہتے رہے۔

عربی فارسی [illegible] اچھی تھی۔ انگریزی [illegible] تھا کہ اردو میں ترجمہ بڑی عمدگی سے کر لیتے تھے، باتونی بہت تھے [illegible] باتیں کرنے [illegible] سے بڑا انس تھا اور دونوں میں خوب بنتی تھی۔

اس زمانے [illegible] داڑھی ضرور رکھ لی تھی اور مولوی [illegible] مشہور تھے مگر بالکل غیر مذہبی آدمی تھے۔ کئی ایک کتابیں چھپوائی ہیں۔ اب تو ان [illegible] آخر میں بصارت سے محروم ہوگئے تھے اور مرنے تک اسی حال میں رہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب [illegible] بہت ہی جلد [illegible] کرا لینے کے لئے مجھے [illegible] ۲۵ [illegible] ۲ [illegible] چلے گئے اور دماغ بھی [illegible] ہو گیا تھا۔ گلبرگہ میں ایک وکیل تھے سلیم الدین جن سے [illegible] ایک صاحبزادی بیاہی [illegible] کے انتقال کے بعد کچھ جائداد (مکان اور زمینیں وغیرہ) ان کی صاحبزادی کے حصے میں آگئی۔

جس کے انتظام کے لئے یہ گلبرگہ آیا کرتے تھے۔ اتفاق سے گلبرگہ کے آخری سفر میں دو تین روز میرے مہمان رہے۔ ان دنوں خدائی کرنے لگے تھے ایک روز فرمانے لگے "عابد تم مجھے خدا مانتے ہو یا نہیں؟" میں نے کہا حضرت! یہاں تماپور میں ایک پیغمبر ہیں جن کا نام ہے عبداللہ اور عبداللہ تماپوری مشہور ہیں۔ چونکہ گلبرگہ انہی پیغمبر کے جورس ڈکشن میں ہے اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اپنی خدائی کی توثیق عبداللہ تماپوری سے کرانی چاہئے تب کہیں یہ گلبرگہ والے آپ کو خدا مانیں گے، فرمانے لگے بیٹا! تم مذاق کر رہے ہو، میں نے کہا جی نہیں بالکل واقعہ عرض کر رہا ہوں ان تماپوری پیغمبر کے ایک داماد یہاں وکیل ہیں آپ اجازت دیں تو انہیں یہاں بلا کر اپنی طرف سے شہادت میں پیش کر دوں گا۔ کہنے لگے بے وقوف نہ بنو، کوئی جاہل ہوگا جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا قبلہ! خدائی اور پیغمبری کا دعویٰ قابل اور فاضل لوگ ہی کرتے ہیں جاہل نہیں کرتے خود آپ بھی تو بڑے قابل ہیں۔ یہ سن کر بگڑنے لگے میں نے بڑی منت سماجت کے بعد منایا ورنہ بستر باندھ کر چلنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

اس طرح دو ایک سال گزار کر محب حسین نے انتقال کیا، کئی شادیاں کیں اور ہر ایک بیوی سے اولاد ہوئی اور سب خوش حال ہیں۔ ایک بیٹے جوان ہی مرے، ان کا ایک لڑکا یہیں گزیٹڈ پوسٹ پر ہے، ڈاکٹر صادق حسین ایک بیٹے ہیں جو صدر اعظم کے دفتر میں منتظم تھے وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے ہیں اور تھیاسوفیکل سوسائٹی میں روح پر تقریریں کرتے رہتے ہیں ایک صاحبزادے اعجاز حسین بی اے ایل ایل بی ہیں جو وکالت میں ناکام رہ کر ملازمت اختیار کر چکے ہیں۔ سال چھ مہینے میں یہ بھی وظیفہ پر سبکدوش ہو جائیں گے۔ لڑکیاں بھی خوش حال ہیں۔ محب حسین صاحب کی علمی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ حیدر آباد کی علمی ادبی فضا ان کی شرمندۂ احسان ہے۔

عزیز جنگ ولاؔ

مولوی احمد عبدالعزیز المخاطب بہ عزیز جنگ متخلص بہ ولاؔ بڑے قابل بزرگ تھے۔ مولوی یوسف الدین صاحب سے بڑے اچھے مراسم تھے، مرحوم کے بڑے فرزند مولوی غازی الدین احمد المخاطب بہ غازی یار جنگ چونکہ والد مرحوم کے ہم مکتب تھے اس لئے بھی ہم لوگوں سے بزرگانہ مراسم ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اتفاق سے غازی یار جنگ گلبرگہ پر اول سیشن جج ہو کر آئے، مولوی علی الدین احمد ناظم عدالت (مجسٹریٹ) بن کر آئے اور مولوی رکن الدین احمد وہاں پہلے ہی سے مہتمم خزانہ (ٹریژری آفیسر) تھے اس طرح تینوں بھائی ایک جگہ جمع ہو گئے اور ان حضرات کے قیام تک تقریباً روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں اس لئے بھی میرے مراسم اس خاندان سے زیادہ ہو گئے۔

عزیز جنگ بہادر کی خدمت میں والد کے ساتھ اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا، پھر تنہا بھی جانا رہا۔ وظیفہ لینے کے بعد ولاؔ نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی تھی، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا منتظم، ایسا سلجھا ہوا، ایسا دور اندیش، ایسا نکتہ رس حیدر آباد بھر میں کسی کو نہیں پایا۔ ولاؔ مدراسی تھے اور مدراس کے شریف ترین گھرانے نائطہ سے تھے یہ خاندان اپنے رہن سہن، بود و باش، معاشرت، سوشل اصول اور وضعداری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ولاؔ اس نائطہ گھرانے کے صحیح جانشین اور نمائندے تھے۔ ابتدا چھوٹی سی خدمت پر مامور ہو کر ترقی کرتے کرتے اول تعلقداری مددگاری اور پھر پہنچ کر وظیفہ لیا۔ مختلف محکموں میں مامور رہے اور جس کام کو بھی انجام دیا نہایت دیانت اور خوش سلیقگی سے انجام دیا۔

تعلیم پائی ہوئی تھی، عربی فارسی کی بڑی اچھی استعداد تھی، مطالعہ بھی بڑا اچھا تھا جوانی ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق تھا اور ہر چیز پر لکھتے لکھتے تھے مجموعی کی کثرت سے کر انگور کی کاشت پر تک ایک ایک کتاب لکھی ہے اور ہر کتاب اپنے موضوع پر مکمل اور مفید ہے۔

"فنِ عمل تاریخ گوئی" پر ایک نفیس کتاب لکھ دی۔ اس کے علاوہ اردو میں تاریخ گوئی سے متعلق کوئی کتاب نہیں۔ یوں تاریخی جملے اور فقرے جمع کر کے "گلبنِ تاریخ"، "آئینۂ تاریخ" وغیرہ ناموں سے بہت لوگوں نے کتابیں شائع کیں مگر فنِ تاریخ گوئی اور اس کی تاریخ پر یہ اولین اور آخرین کتاب ہے۔

اسی کے ساتھ والد نے "قانونِ مال"، "قانونِ عطیات"، "مصطلحاتِ عطیات" وغیرہ پر بیسیوں کتابیں شائع کیں۔ ان کی خوش قسمتی سے حکومت نے ہر کتاب پر صلہ و تحسین دیا اور سرکاری طور پر جلدیں خریدی جاتی رہیں چنانچہ تصنیف و تالیف سے خاصا رقمی فائدہ انہوں نے اٹھایا۔

"آصف اللغات" کے نام سے ایک لغات کی ترتیب شروع کی اور اس کو ساتھ ہی ساتھ چھپواتے بھی رہے۔ غالباً دس بارہ جلدیں چھپوا بھی دیں، یہ بڑی اچھی اور جامع لغات تھی جو اب نایاب ہو گئی ہے۔ یہ تمام کتابیں والد نے اپنے ذاتی پریس میں چھپوائی تھیں کیونکہ انہوں نے اپنے مکان ہی میں ایک پریس قائم کر لیا تھا۔ کاتب اور سنگ ساز بھی ملازم رکھے تھے اور اپنی ہی نگرانی میں چھپواتے رہتے تھے۔

طبیعت میں انتظامی صلاحیت اور نفاست بہت تھی، سلطان پورہ میں ایک مکان اور باغ بنا لیا تھا۔ مکان نہایت ہی وسیع اور بڑا ہی نفیس بنوایا پھر اپنے لڑکوں کے لئے الگ الگ حصے بھی بنوا دئے تھے چنانچہ چاروں بیٹوں کے لئے چار قطعات الگ الگ تھے اور یہ چاروں ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ "عزیز باغ" ایک نمونے کا مکان تھا اس گھر کے کپڑے تک باہر نہ جاتے تھے۔ اندر ہی دھوبی ملازم تھا جو اندر ہی کپڑے دھوتا تھا اور چاروں بھائی ایک ساتھ ہنسی خوشی رہتے تھے۔

والد بڑے ہی خوش قسمت بزرگ تھے ان کے صاحبزادے سب کے سب قابل اور کارآمد نکلے، غازی یار جنگ نے عدالت کے انسپکٹنگ آفیسر کی حیثیت سے وظیفہ لیا۔ محی الدین احمد صاحب ناظم کروڑگیری ہوئے۔ زین یار جنگ بہادر صدر ناظم کوتوالی (انسپکٹر جنرل پولیس) ہوئے اور اب حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ کی کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ رکن الدین احمد صاحب ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل رہ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور اب بھی حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ میں کارگزار ہیں۔

والد کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی، اردو زبان میں خوب شعر کہتے تھے۔ اردو کا ایک ضخیم کلیات اور فارسی کا ایک دیوان شائع کیا ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپائے مبارک فارسی میں نظم کیا ہے جو طبع ہو چکا ہے۔

والد نے حیدرآباد کی مطبوعات جمع کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ واقع لندن کو تحفۃً دیں جنہیں یورپ کے اہلِ علم نے تشکر کے ساتھ قبول کیا اور برٹش [illegible] سے "شمس العلماء" کا خطاب بھی پایا تھا۔

والد نہایت ہی وضع دار اور پابند بزرگ تھے اور جن لوگوں سے جس طرح ایک دفعہ مل لیتے اسے آخر تک نباہتے تھے، میں جب کبھی جاتا اگر کوئی میوہ کا موسم ہوتا تو پہلے وہ میوہ منگوا کر کھلاتے تھے۔ اپنے باغ کے آم عموماً کھلایا کرتے تھے ورنہ مٹھائی تو ضرور ہی منگائی جاتی۔ ہر بار ہر ایک کی خیر و عافیت پوچھتے اور پھر عام گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اپنی تصانیف بھی سرفراز کیا کرتے اور اس کے متعلق گفتگو کی جاتی تو خوش ہوتے تھے۔

ایک زمانہ تک مجھے کتب خانۂ آصفیہ جانے کی عادت ہو گئی تھی۔ کوئی خاص کتاب مطالعہ میں نہ ہوتی تو اساتذۂ فارسی کے دواوین کا مطالعہ کرتا اور ایسے شعر جن میں محاورات یا خاص خاص تلمیحات وغیرہ ہوتیں نوٹ کرتا جاتا اور ان کو جمع کر کے جب بھی حاضر ہوتا لیجا کر پیش کر دیتا۔ وہ میری اس حقیر کوشش سے بہت خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دیا کرتے تھے۔ شاید ہی ان میں سے کچھ چیزیں ان کے لئے کارآمد ہوتی ہوں گی مگر چونکہ میں محنت کر کے جمع کرتا اور ان کا خیال رکھ کر بھیجا یا کرتا تھا اس لئے خوش ہوتے تھے۔

والد کی اصولی زندگی اور باقاعدگی ضرب المثل تھی اور لوگ اس پر رشک کرتے تھے۔ یہی جھلک ان کے صاحبزادوں میں بھی ہے چنانچہ زین یار جنگ نے سب سے زیادہ اسی ورثہ سے حصہ پایا ہے۔

کشن پرشاد شادؔ

ہز ایکسیلنسی مہاراجہ یمین السلطنت کشن پرشاد بہادر شادؔ ان بزرگوں میں سے تھے جو نہ صرف شاعر اور ادیب تھے بلکہ شاعر نواز شاعر ساز اور ادیب گر بھی تھے، مہاراجہ بہادر نے وزارت کی گود میں پرورش پائی اور تعلیم و تربیت بھی شاہانہ طریقے پر ہوئی۔ بچپن سے حضور غفران مکان میر محبوب علیخان بہادر شاہِ دکن کی مصاحبت حاصل رہی اور حضور مرحوم کے وصال تک شرفِ خدمت حاصل رہا۔

مہاراجہ کو شاعری اور ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا مہاراجہ چندولال بھی شاعر ادیب اور ادیب پرور تھے چنانچہ ان کی علم پروری اور ادب نوازی نے دکن کو چمن بنا دیا تھا، شاہ نصیر، شیخ حفیظ وغیرہ کو انھوں نے ہی دہلی سے بلوایا تھا اور یہ دونوں ایسے آئے کہ سرزمین دکن ہی میں آسودہ ہو گئے۔

مہاراجہ بہادر نے بھی چندولال کی طرح سینکڑوں کو بلوایا اور ہزاروں کی پرورش کی۔ حیدرآباد کی علمی چہل پہل زیادہ تر انہی کی زیر بارِ منت ہے یوں تو وہ ہر ایک کی پرورش کرتے اور ہر ایک کو نوازتے تھے مگر شعراء اور ادباء کو خصوصاً بہت سرفراز کرتے تھے۔

رتن ناتھ سرشار، سہا مجددی، ثاقب بدایونی، برتر غازی پوری، ظہیر دہلوی، ترکی بانی پتی، جلیل مانکپوری، رفعت جنگ، حسرت جنگ، اختر یار جنگ، فانی بدایونی وغیرہ سینکڑوں شعراء کی پرورش مہاراجہ نے کی اور سینکڑوں شعراء اور نثر نگار، ہوش بلگرامی، ہوش یار جنگ، جوش ملیح آبادی، محوی صدیقی وغیرہ کی سرپرستی اور اعانت کرتے رہے حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی بدنصیب ہوگا جسے مہاراجہ سے فیض نہ پہنچا ہو۔

لالہ سری رام دہلوی، مؤلف خمخانۂ جاوید، سے لے کر خواجہ حسن نظامی تک ہزاروں مؤلفین اور مصنفین مہاراجہ کے مہمان ہوئے کسی کو خانہ باغ میں ٹھہراتے تو کسی کو کسی ہوٹل میں اور کسی کو اپنے کسی متوسل کے گھر پر اور پھر اس کو اس کی حیثیت سے زیادہ "رخصتانہ" دے کر رخصت فرماتے تھے۔

مہاراجہ کی تعلیم خاصی اچھی ہوئی تھی۔ فارسی اچھی طرح جانتے تھے عربی سے بھی ناآشنا نہ تھے انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت تھی اردو پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ مہاراجہ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں اور تقریباً اسی قدر چھپیں بھی۔ کسی موضوع پر بند نہ تھے فوٹو گرافی سے لے کر ناول افسانہ ڈرامہ عروض سفرنامہ تصوف اور ادب سب پر تصنیف فرماتے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ ابتدا میں ظفرالدین معلیٰ سے مشورۂ سخن کرتے تھے پھر استاد داغ سے مشورہ کرنے لگے۔ داغ کے بعد جلیل کو مہاراجہ بہادر ہی نے استاد شاہ بنایا اور خود بھی مشورہ کرتے لگے۔

مہاراجہ بحیثیت انسان بڑے مکمل تھے، کردار نہایت بلند اور شخصیت بڑی مکمل تھی۔ عفو و درگزر کا مادہ شاید ہی کسی میں اتنا ہو جتنا مہاراجہ میں تھا۔ میں نے ہزاروں آدمی دیکھے مگر ایسا وسیع القلب کوئی نظر نہ آیا۔ بڑی سے بڑی خطا بلا معذرت خود بخود معاف کر دیتے تھے۔

میرے گھر کے سامنے پرپانی رسیعت الملک کی ڈیوڑھی کے اندر رہتے تھے ایک کریم الدین نامی نوجوان رہتے تھے ۲۰۔۲۵ سال کی معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ واجبی واجبی تعلیم یافتہ تھے۔ ترکی ٹوپی پہنا کرتے اور کلائی میں بنایا کرتے تھے۔ ایک روز مہاراجہ کے ایک ملازم نے میرے پاس آ کر ان کا پتہ پوچھا میں نے پتہ بتا دیا تو دس پندرہ منٹ کے بعد انہیں ساتھ لئے ہوئے آیا اور میرے سامنے دو سو روپئے انہیں دے کر رسید لکھوالی اور مجھ سے گواہی بھی لکھوالی کہ میرے سامنے یہ رقم کریم الدین کو دی گئی ہے، کریم الدین نے رقم لینے کے بعد کہا کہ انہوں نے چھ آٹھ مہینے پہلے مہاراجہ کی خدمت میں ایک منظوم درخواست بھجوائی تھی کہ میں اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں، زادِ راہ سے سرفراز فرمایا جائے۔ چنانچہ اب مہاراجہ نے سرفرازی فرمائی ہے۔

چونکہ مہاراجہ اس قسم کی داد و دہش کے عادی تھے اس لئے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ دو چار روز کے بعد میں حاضر ہوا تو مہاراجہ بہادر کو یاد آیا اور انہوں نے پوچھا کریم الدین جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہے کون شخص ہے۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ جانتا تھا عرض کر دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ استاد ذوقؔ کی اردو غزل بتاتے ہیں۔ یہ سن کر مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے فرمانے لگے کیا ذوقؔ صاحب اردو زبان کے بھی استاد ہو گئے؟ میں نے عرض کیا وہ ہر زبان کے استاد ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں پر انہیں یکساں عبور ہے اور اب تو مشاعروں میں اردو غزل بھی پڑھنے لگے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد مہاراجہ بہادر نے کمرے میں جا کر ایک گول لپیٹا ہوا کاغذ لا کر مجھے عنایت فرمایا کہ اسے دیکھ کر تلف کر دو۔ یہ ایک موٹا کاغذ تھا جو بڑی سائز کا تھا اور اس پر موٹے قلم سے ایک نہایت بیہودہ شعر مہاراجہ کے متعلق لکھا ہوا تھا جس میں بڑی غلیظ گالی تھی۔ اس شعر کو پڑھ کر میں نے کاغذ کے پرزے پرزے کر دئے اور میرا چہرہ غصے سے متغیر ہو گیا۔ میرا یہ حال دیکھ کر مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا "پانچ چھ مہینے پہلے اس شخص نے ایک تحریر بھیجی تھی کہ اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں آمد و رفت کے لئے اخراجات پانچ سو روپے دئے جائیں۔ میں نے اس وقت کوئی توجہ نہیں کی۔ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پھر اس شخص نے ایک تحریر بھجوائی مگر میں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ اب دو تین مہینے کے انتظار کے بعد اس نے اس طریقے سے یاد دہانی کی ہے۔ پہلا مصرع ع

شاد ہو کر کیوں نہ خاطر شاد کی؟

ہی کافی تھا دوسرے مصرعے میں اس نے گالی دے کر ہجو کی ہے۔ یہ عام طریقہ ہے شعراء پہلے قصیدہ پیش کرتے ہیں پھر تقاضا کرتے ہیں اور آخر میں ہجو کرتے ہیں۔ اس غریب نے ہجو ہی لکھا"۔ میں نے عرض کیا بالکل صحیح ارشاد ہوا مگر کسی شاعر نے کسی امیر کی ہجو ایسی نہیں لکھی ہے۔ اتنا ہی کہ ہجو فردوسی سے منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ایسی بیہودہ نہیں ہے۔ فرمانے لگے تم سچ کہتے ہو مگر وہ فردوسی تھا اور یہ کریم الدین ہے ع

قطرۂ نیساں بعد یکساں است و لے

بعد کو جب میں نے ذوقؔ سے یہ قصہ کہہ دیا تو انہوں نے کریم الدین کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیا تھا اور [illegible] کر دوں کہ یہ قصہ ذوقؔ نے سنا بھی دیا تھا۔

غور فرمائیے اس حیثیت کے بیہودہ شخص سے ایسی گالی سن کر درگزر کر دینا مہاراجہ کے کردار کی بلندی نہیں تو کیا ہے؟ [illegible] کسی [illegible] کی شاگردی مہاراجہ کے کسی بزرگ نے کی تھی اس کا لحاظ وہ مرتے دم تک فرماتے رہے اور میں ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا [illegible] وزارت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد مہاراجہ [illegible] جن لوگوں نے بے اعتنائیاں کی تھیں اور جو لوگ انہیں سلام کرنے بلکہ ان کا سلام لینے تک کے روادار نہ تھے ان سے جو سلوک مہاراجہ نے کئے ہیں ان کی تفصیل [illegible] ان سب لوگوں کی پرورش کر دی [illegible] قصائد، قطعات، تاریخیں پیش کیں [illegible] اور مہاراجہ اسی طرح شگفتہ رہے جیسے مدار المہامی کے زمانے میں [illegible] ایسا وسیع القلب [illegible] پیدا ہو۔

مہاراجہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی کسی کا دل نہ توڑتے اور جو شخص جو بھی خواہش کرتا اس کے پورا کرنے کا وعدہ کر لیتے اور اپنی حد تک کوشش بھی کرتے تھے۔ اپنے آپ کو انہوں نے کبھی بڑا آدمی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر فقیر [illegible] سمجھتے رہے۔ خود نیک [illegible] الطبع تھے اس لئے ہر ایک پر اعتماد کرتے تھے۔ ابتدا ان کی پیشی میں مولوی محمد علی [illegible] مولوی کرامت علی محدث دہلوی [illegible] کہ سارا کام انہی پر چھوڑ رکھا تھا ان کے دستخط دیکھ کر خود دستخط کر دیا کرتے تھے اور محمد علی کا یہ حال تھا [illegible] کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ہمیشہ ان پر اعتماد کرتے رہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے مخالف ہو گئے چنانچہ [illegible] نے [illegible] اور محمد علی کا عذر [illegible] آخر محمد علی کو شہر بدر کر دیا اور وہ حیدرآباد سے پونا چلے گئے اور بعد میں احمد نگر چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ مہاراجہ کی مدار المہامی کے معتمد علیہ تھے

مہاراجہ کی صدارتِ عظمیٰ کے زمانے میں مہدی نواز جنگ بہادر ان کے معتمد ہوئے جو نہایت ہی قابلِ اعتماد اور شریف آدمی ہیں۔ مہاراجہ نے ان پر بھی اتنا ہی اعتماد کر لیا جتنا کہ مولوی محمد علی پر کرتے تھے، اسی وجہ سے لوگ ان کے بھی مخالف ہو گئے چنانچہ حیدری صاحب نے سرِ اعظم ہونے پر مہدی نواز جنگ کو خاصا پریشان کیا مگر مہدی نواز جنگ بہادر بھی بڑے مردِ میدان نکلے اور بڑی ہی مستعدی اور حاضر دماغی سے مقابلہ کیا اور آخر کامیاب رہے۔

مہاراجہ کے انتقال کے بعد ایک کتاب مہدی نواز جنگ بہادر نے مہاراجہ کے متعلق شائع کرائی ہے جو بہت غنیمت ہے مگر ایک کتاب سے کیا ہو سکتا ہے مہاراجہ کی ایک ایک خصوصیت پر ایک ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

مہاراجہ نے علم و ادب کی نہ صرف خدمت کی بلکہ اس گلشن کی آبیاری بھی کی اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح علم و ادب کے لیے وقف رہے۔

مہاراجہ کی داد و دہش ایک مستقل موضوع ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ راجہ چندو لال بھی بہت دینے والے مشہور تھے مگر ان کی سخاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے راجہ مکھن لال نے اپنی "تاریخ یادگار مکھن لال" میں یہ لکھنے کی جرأت کی ہے کہ "ایک ہاتھ سے رشوت لیتے اور دوسرے ہاتھ سے خیرات کرتے تھے" مگر مہاراجہ کے عہد کا مورخ ایسی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ مہاراجہ نے کبھی بھی رشوت نہیں لی تھی بلکہ اپنی جاگیر کی آمدنی اور اپنی پیشکاری کی تنخواہ اور اپنی صدارتِ عظمیٰ کی تنخواہ ہی سے داد و دہش کرتے تھے۔ آخر میں جب داد و دہش بڑھ گئی اور آمدنی کم ہو گئی تو قرضہ لیتے رہے مگر ہاتھ نہ رکا۔

مہاراجہ ضرورتاً اور بلا ضرورت دیتے ہی رہتے تھے کوئی مانگے یا نہ مانگے مگر وہ دیتے ضرور تھے اور عجیب و غریب طریقے سے دیتے تھے۔ خاص خاص باشندوں کو زیادہ دیا کرتے تھے۔ صبح جب موٹر پر سوار ہو کر نکلتے تو ایک تھیلی میں روپے، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں بھری ہوتیں۔ ڈیوڑھی سے نکلتے ہی مٹھی بھر بھر کر پھینکتے جاتے واپس آنے تک یہ تھیلی ختم ہو جاتی۔ دن میں چار دفعہ بھی نکلتے تو اسی طرح نکلتے اور تھیلی کی مٹھیاں بٹتیں۔ پھر جو حاجت مند اور غرض مند آتے انھیں الگ سرفرازی ہوتی۔ رات کے کھانے پر اکثر خاص باشندوں کو روک لیتے اور جب وہ کھانا کھا کر جانے لگتے تو جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے اور چپکے سے دے دیتے۔ ایک زمانے میں ہوش بلگرامی اور میں ایک ساتھ جایا کرتے تھے اور ہم بارہا ان کے کھانے پر روک لیے جاتے چنانچہ ایک روز لفافہ ہوش کو ملتا اور ایک روز مجھے۔ اس لفافے میں کم سے کم پچیس اور زیادہ سے زیادہ پچاس روپے ہوا کرتے تھے۔

۱۹۴۳ء میں مجھے ٹائیفائڈ ہو گیا۔ میری علالت کی اطلاع ملی تو مکان پر تشریف لائے۔ جاتے جاتے سرہانے کے تکیہ کے نیچے نوٹ ایک ایک سو روپے کے رکھ کر تشریف لے گئے۔ اس طرح تین دفعہ تشریف لائے اور تینوں دفعہ تکیہ کے نیچے نوٹ چھوڑ گئے۔ روزانہ آدمی کو بھیج کر خیریت دریافت کراتے اور حکیم حبیب احمد صدیقی رجواب جے۔ اے۔ ڈی کے مددگار ہیں، کے ہاتھ الگ روپے بھجواتے اور کہلواتے کہ علاج معقول کرائیں ضرورت ہو تو اور روپیہ منگوا لیں۔

میں نے ادارۂ علمیہ کے نام سے ایک بک ڈپو قائم کیا تھا جو عابد روڈ پر تھا۔ ہمیشہ آتے جاتے تشریف لاتے اور کتابیں لے جاتے، بل بھجوانے سے پہلے رقم آ جاتی، میرا چھوٹا بھائی رشید اکثر بلایا جاتا اور جب بھی جاتا فرماتے "بھئی وہ کتابیں جو آئی تھیں ان کی قیمت لیتے جاؤ" چنانچہ بسا اوقات ستر روپے اسی وقت دے دیتے۔ اس طرح کتابوں کی قیمت چار چار دفعہ ادا ہو جاتی۔ یہ دینے کے بہانے تھے۔ عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کوئی تقریب ہو سرفرازی لازمی تھی۔ دیتے وقت اس کی حیثیت نہیں دیکھتے جسے دے رہے ہیں بلکہ اپنی حیثیت پیش نظر ہوتی۔ دل کھول کر دیتے اور پھر شرماتے کہ میں نے کم دیا ہے۔ یہ بات میں نے مہاراجہ کے علاوہ صرف مولانا خورشید علی ناظم دفتر دیوانی میں پائی ہے اور کوئی تیسرا

اس صفت سے متصف نظر نہیں آیا۔

مذہب کے معاملہ میں مہاراجہ "گول" تھے۔ سبحان اللہ کہہ کر پوجا بھی کر لیتے نماز بھی پڑھ لیتے، دھیان گیان بھی کرتے اور ذکر و شغل بھی فرماتے اولیاء کی جاترا بھی دھوم دھام سے کرنے گیارھویں کی نیاز بھی تزک و احتشام سے ہوتی اور محرم بھی بڑی عقیدت سے منایا جاتا۔ مشائخین کے ہاتھ چومتے، گورو بابا کے پاؤں پڑتے، دونوں طریقوں پر چلتے رہے۔

ایک مسلمان خاتون سے عقد کیا تھا اور ساہیہ میں اپنے آپ کو مسلمان لکھوا دیا۔ مرنے وقت وصیت کی کہ ہندو طریقے پر جنازہ اٹھایا جائے کیونکہ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ اگر آپ مرتے وقت کوئی وصیت نہ کریں اور مسلمان طریقے پر دفن ہوں تو آپ کی موروثی پیشکاری آپ کے فرزند خواجہ پرشاد کو نہ ملے گی۔ محض خواجہ پرشاد کی خاطر مہاراجہ نے چتا میں جلنا پسند کیا مگر بدنصیب خواجہ پرشاد کو پھولنا پھلنا نصیب نہ ہوا، بمبئی میں ایک ہوٹل کی بالائی منزل پر سے گر کر بیچارے کی جان گئی۔

جی تو نہیں چاہتا کہ مہاراجہ کا ذکر ختم کروں مگر لکھنا بہت ہے اور وقت کم ہے اس لئے مجبوراً ختم کر رہا ہوں۔

حیدرآباد کے دور اول کے بزرگوں میں سے میں نے تینوں کو انتخاب کیا ہے یہ وہ ہیں جن سے میں ذاتی طور پر واقف رہا ہوں اور جو باتیں میں نے لکھی ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور اپنے محسوسات کو ایمانداری سے پیش کیا ہے۔

لیجئے دوسرے دور کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے یہ دور بڑا لمبا ہے اس میں سینکڑوں بزرگ آسکتے ہیں مگر میں نے صرف چند کا انتخاب کیا ہے۔

ضیاء یار جنگ

مفتی نور الضیاء المدعو المخاطب بہ ضیاء یار جنگ دکن کے قدیم شرفا سے اور حیدرآباد کے عالم فاضل بزرگ تھے۔ اورنگ آباد کے مشائخ گھرانے سے تعلق تھا۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی تھی فارغ التحصیل اور نہایت ذہین بزرگ تھے۔ علم و ادب کے علاوہ قدیم مشاغل پتنگ بازی، شطرنج، شکار، شاعری، پلاؤ میں سبھی کا شوق تھا۔ "تماش بینی" میں بھی مشہور رہے۔ مختلف خوبیاں جمع تھیں۔

یہاں بھی پیش لئے وہی شخصیت سے بحث کرتا ہوں۔ ضیاء یار جنگ بہادر کی حیثیت حیدرآباد میں وہی تھی جو یوپی میں نواب صاحب جہانگیرآباد یا چودھری محمد علی ردولوی کی تھی۔ اس فن کو ترقی دی تو انہوں نے فن کی طرح استعمال کیا تھا اور اس میں ماہر کامل تھے مگر تفصیلات نہ تو طفیل صاحب پسند کریں گے اور نہ حیدرآباد کے لوگ پڑھنے کے بعد مجھے زندہ رہنے دیں گے اس لئے ع

کردم اشارتے و مکرر نمی کنم!

شطرنج کمال درجہ کی جانتے تھے۔ بڑے بڑے مشاق کھلاڑی ان کے سامنے ہوتے، جیتتے تو انہیں کھلاتے پلاتے۔ ان کی عادت کے موافق ہر بات دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ بڑے مفتی تھے ایک علمی بحث چھڑ جاتی تو گویا پٹارا کھل جاتا، مسائل علمیہ سے بھرے ہوئے ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

بڑے سے بڑا فتویٰ چلتے چلتے لکھ دیتے، اہم سے اہم مسئلہ شطرنج کھیلتے کھیلتے حل کر دیتے اہم سے اہم مقدمہ کا حقہ گڑگڑاتے ہوئے

فیصلہ کر دیتے، ہائی کورٹ میں مفتی اور جج کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ایسا اچھا کام کیا کہ بڑے بڑے قانون داں لوہا مان گئے۔ اسراف کی وجہ سے لینے دینے کی ضرورت تھی اس لئے تحائف اور نقدی سنا ہے کہ قبول کر لیتے تھے مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا علم نہیں ہے۔

۱۹۱۱ء میں جب حیدر آباد میں بلیگ ہو گیا تو ہم لوگ ٹولی چوکی میں مولوی سید یوسف الدین صاحب کے بنگلہ میں منتقل ہو گئے، ضیاء یار جنگ کا باغ بھی قریب ہی تھا، ایک روز صبح ناشتہ کر کے والد ضیاء یار جنگ کے پاس جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہو گیا، والد مرحوم کے ہم عمر اور شاید استاد بھائی بھی تھے اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ والد کو دیکھتے ہی لپٹ گئے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور بیٹھ کر شاعری شروع کی دوپہر کا کھانا وہیں کھایا۔ شام میں واپس "جبل السلام" تک پہنچا گئے۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو ان سے ہوئی اس کے بعد والد کے ساتھ اور تنہا ان سے ملتا رہا، شمس آباد میں پتنگوں کا جلسہ ہوتا تو مجھے بھی یاد فرماتے، دو دو دن روک رکھتے اور بڑے خلوص سے مہمانداری فرماتے تھے۔

مقرر بڑے اچھے تھے، ایسی اچھی تقریر فرماتے کہ سن کر جی خوش ہو جاتا تھا، کسی موضوع پر تقریر کر رہے ہوں باغ و بہار کا لطف پیدا کر دیتے تھے، مگر ہٹ دھرم اور بر خود غلط نہ تھے۔ معاصرین کا لحاظ کرتے تھے چھوٹوں کی دل افزائی کرتے کسی میں کوئی بات قابل التفات پاتے تو دل کھول کر داد دیتے اور صحیح رہبری کرتے تھے۔

فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے، فارسی غزل بڑی اچھی کہتے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعروں میں خصوصیت سے شریک ہوتے اور بڑی سیر حاصل غزلیں پڑھتے تھے۔ شاگردوں کو بنانے اور تیار کرنے کا شوق تھا عبداللہ خاں کامل شاگرد ہوئے تو ان پر بڑی محنت کی نہ صرف انہیں تیار کیا بلکہ "دربار کاہ سلطانی" میں بھی پیش کر دیا، اور ان کے لئے بڑی جدوجہد کی مگر کامل صاحب میں نقص یہ تھا کہ محسن کش تھے انہوں نے ضیاء یار جنگ ہی کے خلاف ریشہ دوانی شروع کی۔ ضیاء یار جنگ اس میدان کے بھی مرد تھے، ایسا پینترا بدلا کہ کامل ناقص ہو کر رہ گئے، بہر حال کسی جگہ رُکتے نہ تھے۔ ہر کام کو تیار ہر بات کے لئے آمادہ تھے۔

اگر ضیاء یار جنگ میں یہ دوسری باتیں نہ ہوتیں اور وہ صرف علمی ادبی کام میں لگ جاتے تو ملک کو بے انتہا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ یوں بھی انہوں نے ملک کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی خدمت خاصی کی ہے۔ ایک ضخیم کلیات یادگار چھوڑا ہے جو شاید تلف ہو جائے گا کیونکہ ان کے پس ماندوں کو شعر و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

غلام حسین داد

آج سے پچاس سال پہلے ایک بڑی اچھی جماعت نوجوانانِ دکن کی ابھری جو ... غلام حسین داد ... ملکی اور شرابیات الخ ندان تھے، گھر کے بھی خوش حال تھے، طبیعت میں جدت اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ تھا ... ساتھ علمی، ادبی جدوجہد بھی کرتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں بڑی اچھی کہتے تھے، ان دنوں مرغ بازی اور بٹیر بازی کا عام شوق تھا جس طرح مندروں میں دیو داسیاں ہوتی ہیں اسی طرح حیدر آباد میں ایک طبقہ مرلیوں کا تھا یہ نیچ ذات کی ہوتی تھیں مگر ہوتی خوبصورت تھیں۔ ان میں سے کچھ "کارذن" کی حیثیت سے ڈیوڑھیوں میں نوکر ہوتیں کچھ "ملازمہ" کی حیثیت سے گھروں میں نوکر رہتیں اور کچھ "پیشہ" کرتی تھیں مگر یہ سب ہوتی تھیں ... حیدر آباد کا نوجوان طبقہ ان سے بہت متاثر تھا۔ ... لوگوں نے ایک مرلی بطور "داشتہ" رکھ چھوڑی تھی۔ شرفاء اور امراء کم مگر متوسط اور ادنیٰ طبقہ بہت زیادہ اس سے متاثر تھا۔ ان دنوں یہ معیوب بھی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرلی ہوتی بھی عجیب تھی۔ ایک دفعہ ان کے پکڑ میں

پھنسنے کے بعد نکلنا مشکل ہوتا تھا۔ اکثر لوگوں نے اپنی بیاہتا بیویوں کو چھوڑ کر مرلیوں کو گھر ڈال لیا تھا اور انہی کے ہو رہے تھے۔ سماج کے اس ناسور کا علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سب سے پہلے غلام حسین وآد نے ایک لمبی نظم کہی اور کراؤن ۱/۱۶ سائز کے چھ صفحہ رقیہ کی صورت میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کی۔ اس کا نام رکھا "مرلی کی بہار" پھر سیلینڈی چھوری پر ایک نظم کہی اور "شربت زنانا" کے نام سے چھپوائی۔ اس کے بعد "مرلی نامہ" "سیلنڈی نامہ" "لونڈے کی دوستی" وغیرہ قسم کی نظمیں بڑی عمدہ عمدہ کہیں اور شائع کیں۔

یہ نظمیں صرف وآد ہی کی نہیں ہوتی تھیں۔ وآد کے علاوہ عبدالحئی بازغ، میرے والد رتجلی، کیفی، زعم رزاکر، زور کے والد بھی شاعر تھے۔ مونے تھے کبھی یہ تینوں چاروں مل کر ایک نظم پوری کرتے، کبھی آدھی ایک کہتا اور آدھی دوسرا مگر چھپواتے اسے بغیر نام کے یا فرضی نام سے تھے اور اس کے طابع و ناشر وآد ہی ہوتے تھے۔ والد کی شادی میں جو مبارکبادیں، سہرے، قطعات وغیرہ کہے گئے تھے، انہیں بھی ایک جگہ کر کے وآد نے کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا۔ اس طرح کیفی کی شادی پر سہروں کا مجموعہ وآد نے چھپوایا، اس طرح وآد نہ صرف دوستوں کی خدمت کرتے تھے بلکہ ملک کی خلاقی اور سماجی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ حیدرآباد میں ہاکرز نہ تھے ہی نہیں وآد نے اپنی چھوٹی چھوٹی کتابوں کی دو دو پیسے قیمت رکھ کر لڑکوں کو بیچنا شروع کیا اور وہ گھوم پھر کر بیچنے لگے اس طرح وآد ہی نے حیدرآباد میں ہاکرز پیدا کئے اور پھیری والے کتب فروش بھی انہوں نے پیدا کئے۔ ان کتابوں کے ساتھ "آمدن" بغدادی قاعدہ وغیرہ بھی رکھ کر چلتے پھرتے بیچنا شروع کر دیا۔ وآد کی نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں۔ یہ سلسلہ وآد اور ان کے ساتھیوں نے سات آٹھ سال تک جاری رکھا۔ میں نے ان تمام کتابوں کو اکٹھا کر کے جلدیں بنوا لی تھیں مگر میری زندگی "دشت گردی اور صحرا نوردی" میں بسر ہوئی اور پچھلے بیس سال سے حیدرآباد میں ہم کبھی تو "محلہ [illegible]" کبھی کوٹلہ میں تو کبھی سلطان پورہ میں، کبھی عثمان پورہ میں تو کبھی سلطان شاہی میں اس طرح کرایہ کے مکانوں میں رہنے سے میری کتابیں جو ایک جگہ تھیں الگ الگ ہوئیں اور ادھر سے ادھر آنے جانے میں الگ ضائع ہوئیں اب ان میں سے ایک کتاب بھی میرے پاس نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے انہیں حقیر سمجھ کر ان کی حفاظت بھی نہیں کی، ہائے کتنے کام کی چیزیں میں نے برباد کیں۔

بچپن میں یہ نظمیں جیسے جیسے لکھی جاتی تھیں میں یاد کر لیتا تھا کیونکہ ہمارے دیوان خانہ ہی میں یہ لکھی جاتی تھیں۔ ایک نظم کے چند شعر یاد آ گئے ہیں سن لیجئے، شان نزول یہ ہے کہ ایک صاحب بیوی بچوں، گھر بار کو چھوڑ کر مرلی کے گھر پڑ گئے ہیں اور ان کے بیوی بچے یوں دن گزار رہے ہیں۔

ماں سے فرما رہے ہیں بچے کہ کچھ بھی نہیں
بچے بلک رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں
بیٹی سے پاس تن ہم چھپانے کو کچھ نہیں
گھر کا یہ حال ہے کہ چھپانے کو کچھ نہیں
رے وے نت بنے بچے کو سودا میرے

. . . .

بہرحال وآد نے [illegible] کی بڑی خدمت کی۔ ایک پریس انہوں نے قائم کر لیا تھا، کتابت کبھی خود کرتے کبھی کسی سے لکھوا لیتے، نہایت رنجاں مرنج اور درویش منش دل کے مالک تھے۔ مجھ پر بڑی عنایت فرماتے۔ جب کوئی کتاب چھپواتے سب سے پہلے مجھے عنایت فرماتے تھے رہتے کہاں تھے مجھے معلوم نہیں کیونکہ ہم کبھی ان کے گھر جاتے ہی نہ تھے۔ یہی آتے اور بہت آتے بلکہ دو دو دن ہمارے پاس ہی رہتے تھے سعید بن علی مصلعی ایک عرب جمعدار والد کے دوست تھے وہ بھی بہت آتے تھے۔ وآد سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ دونوں جب موڈ میں ہوتے تو آپس میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ اب تو بہت کم لوگ وآد کو جانتے ہیں مگر ان کو حیدرآباد کبھی بھلا نہیں سکتا۔

———

عزیز یار جنگ

نواب مشرف جنگ کے فرزند تھے۔ حیدرآباد کے قدیم شرفا کے نمونے، باپ بھی بڑے شاعر اور مشہور شاعر فیض کے شاگرد تھے۔ فیض کا مشاعرہ وہی منعقد کرتے تھے۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت پائی تھی اول تعلقدار اور ناظم عطیات رہ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ داغ کے شاگرد تھے اور شعر خوب کہتے تھے۔ دو دیوان ایک واسوخت طبع ہو چکے ہیں۔ والد کے خواجہ تاش ہونے کی وجہ سے مجھ پر بھی مہربان تھے۔

پچیس سال ہوئے کہ حیدرآباد کے ایک ماہنامے نے مجھ سے خواہش کی کہ عزیز یار جنگ کی شاعری پر مضمون لکھوں میں نے اس سلسلے میں ایک خط لکھا تو فوراً جواب دیا۔ اتفاق سے ان کے واسوخت پر میرے ایک ملاقاتی نے مضمون لکھا اور مجھ سے کہا کہ میں اس مضمون میں عزیز یار جنگ بہادر کی تحریر کا نمونہ بھی شائع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ وہ خط جو آپ کے نام ہے مجھے دے دیجئے چنانچہ میں نے وہ انہیں دے دیا۔ اب جو ان صاحب نے مضمون چھپوایا تو یہ خط اس طرح شائع کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہی کے نام آیا ہے۔ اتفاق سے یہ مضمون عزیز یار جنگ کی نظر سے گزرا تو بہت خفا ہوئے مجھے یاد فرمایا کر خفگی کا اظہار فرمایا کہ "تمہارے والد کے تعلقات کی وجہ سے میں نے تم ہی کو یہ خط لکھا تھا اور یہ بے تکلفانہ مراسلت تھی۔ اس اجنبی شخص کو میں ایسا خط کس طرح لکھ سکتا تھا اس لیے اسے شائع کر کے اپنے ہم چشموں میں اپنی عزت [illegible] کیا کہیں گے کہ ایسے معمولی شخص کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔ اب تم اعلان کر دو کہ یہ خط میرے نام تھا۔ فلاں شخص نے مجھ سے حاصل کر کے شائع کیا ہے۔"

میں نے ان کی خفگی دور کرنے کی خاطر اعلان کرنے پر فوراً آمادگی ظاہر کر دی مگر ایسا اعلان کرنا [illegible] جو خط اپنی طرف منسوب کر کے [illegible] بہرحال عزیز کا غصہ بڑی مشکل سے کم ہوا۔ یہ ان کی وضعداری اور احتیاط کی معمولی ادا تھی [illegible] داغ جب ترک بازار میں آ گئے تو یہ [illegible] قریب ہو گئے۔ یہی اس لیے داغ کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے تھے اور شاگردان داغ سے بہت مانوس تھے۔

داغ کے بھتیجے مرزا نادان داغ کے بعد بہت پریشان ہو گئے تھے۔ آخر میں عزیز ہی کے گھر پر رہتے تھے اور عزیز ہی ان کے کھانے اور [illegible] کے ذمہ دار تھے چنانچہ [illegible] نادان کا [illegible] مقرر کر دیا تھا اور نادان کے مرنے تک ان کی امداد و اعانت کرتے رہے۔ [illegible] نادان نے ترک بازار کے [illegible] اور [illegible] باہر نکلے [illegible] کر گرے۔ لوگوں نے [illegible] سنایا۔

مست سے کوچۂ جاناں میں گرا

میں نے ٹھوکر ہی کا احسان کھایا ہے؟

نادان کا کلام پرچیوں کی شکل میں تھا اور یہ پرچے ایک تکیے میں بھرے رہتے تھے جو عزیز یار جنگ کے پاس رہتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عزیز یار جنگ کے دیوان "ارمغانِ عزیز" میں کچھ حصہ نادان کا بھی ہے۔ [illegible] جانتا ہے کہ حقیقت حال کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ عزیز خود داغ کے شاگرد تھے اور اچھے شاعر تھے۔

انہوں نے کوٹھی کے قریب [illegible] کے گھر کے سامنے [illegible] بنا لیا تھا اور ڈاکٹر [illegible] سے دوستی تھی جس کی وجہ سے خود بھی بہت باقاعدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ [illegible] یورپ کا سفر بھی کیا تھا۔ شعر و سخن کا ذوق بہت تھا [illegible] کا چرچا رہتا تھا۔ مرتے دم تک یہی کیفیت رہی۔ بڑے وضع دار اور شریف آدمی تھے۔

اکبر علی

مولوی اکبر علی مدیر صحیفہ کیفی صاحب نے ابتداً صحیفہ کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا مگر وہ ایک لاابالی آدمی تھے۔ پابندی سے رسالہ نکالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے رسالہ جلد ہی بند ہو گیا اور اسے اکبر علی صاحب نے لے لیا۔ چند پرچے ماہوار نکالے اور پھر ۱۹۱۱ء میں حضور میر عثمان علی خان بہادر کی تخت نشینی کی تقریب میں صحیفہ کو روزنامہ بنا دیا اور اس اخبار کو بڑی عمدگی سے چلاتے رہے۔ اکبر علی حیدر آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ غالباً فوجی گھرانے سے تھے۔ دار العلوم سے مولوی فاضل کامیاب کر کے صدر محاسبی میں ملازمت کر لی تھی۔ پھر صحیفہ جاری کیا تو نوکری چھوڑ دی اور بڑی محنت سے صحیفہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ بڑے پابند وضع دار، ضدی، ہٹ دھرم تھے جس بات پر اڑ جاتے اڑے ہی رہتے۔ والد کے دوست تھے اس لئے مجھ پر بڑی عنایت فرماتے تھے۔

۱۹۱۶ء میں جبکہ میں والد کے ساتھ عثمان آباد میں تھا، اکبر علی صاحب نے مجھے نامہ نگار بنایا اور اضلاع کی ہفتہ وار خبریں بھیجنے کے لئے کہا چنانچہ میں ۱۶ء سے ۲۶ء تک عثمان آباد اور گلبرگہ سے صحیفہ کی نامہ نگاری کرتا رہا۔ ہر دو چار مہینے کے بعد دو چار روپے کے ٹکٹ اور چھپے ہوئے فارم اکبر علی صاحب میرے پاس بھجوا دیا کرتے تھے۔ یہ معاوضہ دیتے تھے وہ نامہ نگاروں کو۔ فارم حالات لکھنے میں کام آتے اور ٹکٹ لفافے پوسٹ کرنے میں لگ جاتے۔

۱۹۲۶ء میں جب میں مستقل طور پر حیدر آباد آ گیا تو مجھ سے ترجمہ کی خواہش کی اور میں نے صحیفہ کے لئے ترجمہ کرنا بھی شروع کیا مگر کبھی اکبر علی صاحب نے اس کا معاوضہ نہیں دیا۔ عبد الرؤف صاحب بی اے ایل ایل بی جو بعد میں حیدر آباد میں وزیر بھی ہو گئے تھے، مدتوں روزانہ تین چار گھنٹے مطبع میں بیٹھ کر ترجمہ کرتے رہے مگر مولوی جی نے انہیں بھی سکھا ہی رکھا اور کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ کاتب پریس مین سبھی تنخواہوں کو روتے رہتے مگر مولوی جی کے کان پر جوں نہ رینگتی۔

صحیفہ ڈائری شائع کر کے خاصا فائدہ اٹھایا پھر دہلی اور کلکتہ کے سفر میں حضور نظام کے ساتھ جا کر سفر شاہانہ کا روزنامچہ مرتب کیا اور اس کی طباعت اور اشاعت کے لئے خاصی رقم لی۔ اس طرح آمدنی کے ذرائع پیدا کرتے تھے مگر نقیبہ مشاعرہ کرتے تو مجبور کر کے دل خوش کا کھلاتے۔ اس سے زیادہ ہمت نہ کرتے تھے اس طرح بخالت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس بخالت کے ہاتھوں ان سے سب تنگ تھے۔

اس سے قطع نظر آدمی بڑے ہی پاس اور دھن کے پکے تھے، جو بات ذہن میں آتی لکھتے، اور بے دھڑک لکھتے تھے کسی بڑی سے بڑی ہستی کا خوف بھی نہ تھا، البتہ سرابر حیدری کو بہت مانتے تھے۔ ریلوے کے سلسلہ میں سرکار کی موافقت کے پوسٹر چھپوائے اور خود اپنے ہاتھ سے پیسٹر بھی لئی کی ہانڈی اور پوسٹر رکھ کر رات بھر حیدر آباد میں گھوم کر دیواروں پر اپنے ہاتھ سے پوسٹر لگائے اور سر حیدری سے روپے بھی پائے۔

پرانی وضع کے آدمی تھے بعض باتیں نہایت ناپسند تھیں۔ اپنے اخبار میں ایک کالم مستقل افسانے کا رکھا تھا جس میں عورتوں کی برائیاں چھپتی تھیں اور یہ سمجھتے تھے کہ عورتوں کی بدکرداریاں چھاپتے تھے۔ آج کل جس طرح صدق جدید والے عورتوں کی برائیوں کو مزے لے لے کر لکھتا ہے اسی طرح اکبر علی بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک خبر ملی کہ کوئی لڑکی اپنے موٹر ڈرائیور کے ساتھ فرار ہو گئی مولوی جی نے سرخی بنائی "شوفر سے شوہر" اس طرح بڑے مزے کی چیزیں چھاپتے رہتے تھے۔

بعض اخبارات پر ایک مدت سے خفا ہوتے تو بڑی عمدگی سے اس کے خلاف لکھتے اور یہ قلمی جہاد مسلسل کرتے رہتے تھے غرض حیدر آباد کے قصر صحافت کے ایک ستون تھے۔ تقریباً چالیس سال تک صحیفہ چلاتے رہے اور بڑی عمدگی سے چلایا، ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے پرچہ نہ چلا سکے۔ پریس اب تک چل رہا ہے جو انہی کی یادگار ہے۔

ادبی ذوق بھی خاصا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک عربی ناول "انسان الغاب" کا ترجمہ "جنگلی انسان" کے نام سے کیا تھا جو طبع ہو چکا تھا۔ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ آخر عمر میں نعتیہ مشاعرہ ماہوار کرتے تھے اور خود بھی اپنی نعت مشاعرے میں سناتے تھے، بہرحال غنیمت آدمی تھے۔

راجیشور راؤ اصغر

حیدر آباد کے مشہور سمستان جٹپول کے والی تھے یوپی میں یہ سمستان ہوتا تو راجہ اصغر ہز ہائنس کہلاتے مگر یہاں نہ تھا۔ راجہ تھے زیادہ وقت حیدر آباد ہی میں گزارتے تھے اور علمی ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا خصوصاً کتابیں بہت چھپواتے رہتے، شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر راجہ صاحب نے کوئی کتاب نہ چھپوائی ہو، آخر آخر میں بڑا اچھا کام کرنے لگے تھے ایک بڑی ضخیم ہندی لغات چھپوائی تھی جو اب بڑی کارآمد ہو گئی ہے ایک انتخاب شعرا کا "نغمۂ عندلیب" کے نام سے چھپوایا تھا جو نہایت ضخیم اور نفیس ہے۔

ابتدا مجھ سے ملاقات رہی پھر میں راجہ صاحب کے پاس آنے جانے لگا، آہستہ آہستہ بے تکلف ہو گئے اور آخر میں خاصے بے تکلف ہو گئے تھے، بولتے کم تھے اور اردو صاف نہ تھی مگر لکھتے خوب تھے، مولانا مختار احمد سے مشورہ کرتے تھے اور اپنے مسودات انھی کو دکھاتے اور انھی کی معرفت چھپواتے بھی تھے۔ پندرہ ایک سال ہوئے کہ سورگباش ہوئے تخمیناً ساٹھ سال کی عمر تھی ایک دفعہ اپنی تصانیف مجھے بتائیں تو میری آنکھیں کھل گئیں، تقریباً سوا سو کتابیں تھیں اور زیادہ تر میری پیدائش سے پہلے کی چھپی ہوئی تھیں۔ عام طور پر لوگ نہیں جانتے، پچیس کتابوں کا مالک سمجھتے ہیں مگر یہ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔

چونکہ قوت تقریر نہ تھی اور اپنا پروپیگنڈہ کرنا نہ آتا تھا اس لئے زیادہ مشہور نہ ہو سکے، احباب بھی ایسے نہیں رکھے جو اچھا لکھتے اس لئے بیچارے تقریباً گمنام رہے۔

مختار احمد

"مخطط اسلامی علامہ مختار احمد" ٹونک کے باشندے تھے مدتوں پہلے حیدر آباد آ گئے اور ایسے آئے کہ یہیں پیوند زمین ہوئے علمی خدمات کے سلسلے میں کچھ تنخواہ بھی مقرر تھی اور نوشک خانہ عامرہ سے سال میں دو تین بار خاص رقم الگ مل جاتی تھی جو یا تو کتابیں خریدنے میں صرف ہوتی یا دعوت میں، تنخواہ آتی تو بڑی ہی شاندار دعوت کرتے خود کھلاتے دوستوں کو کھلاتے تنخواہ ختم ہو جاتی تو فاقہ کشی کرتے لیکن بھی بیمار ہو جاتے، مگر اپنی فلاکت اور تنگ دستی زبان پر نہ لاتے، مجھ سے دوستی اس طرح ہوئی کہ ایک رسالے میں ان کا مضمون چھپا تھا میں کتب خانہ ابراہیمیہ میں بیٹھا تھا کہ یہ تشریف لائے، بغیر کسی تعارف کے مجھ سے پوچھا آپ کیا پڑھ رہے ہیں میں نے رسالے کا نام بتایا تو پوچھا مضمون کس کا ہے میں نے بتایا تو پوچھا آپ جانتے ہیں یہ کون ہے میں نے لاعلمی ظاہر کی تو پوچھا مضمون کیسا ہے، میں نے تعریف کی تو کہا میرا مضمون ہے۔ اس کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک گپ شپ اڑاتے رہے پھر تو یہ حال ہوا کہ جہاں ملتے روک لیتے۔ لمبی گفتگو ہوتی اور خوب باتیں ہوتیں، جغرافیہ ان کا خاص موضوع تھا۔ اسلامی شہروں کے متعلق بڑی معلومات رکھتے تھے اور اسی قسم کے مضامین خوب لکھتے تھے مگر صرف جغرافیہ ہی کی حد تک معلومات محدود نہ تھیں تاریخ اور ادب پر بھی خاصا عبور تھا، عالم و فاضل بزرگ تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی مولوی وقار احمد ایم اے، ایل ایل بی مدیر روزنامہ نظام گزٹ کی تعلیم و تربیت انھی کی محنت کا نتیجہ ہے اپنے

ایک بیٹے نثار احمد کو بھی بڑی عمدگی سے تیار کیا تھا مگر غریب نے داغِ مفارقت دیا۔ حکمی جواب نظام گزٹ میں کام کرتے ہیں انہی کے فرزند ارجمند ہیں۔ مولوی غلام مصطفیٰ ذہین حیدرآبادی سے بڑی دوستی تھی۔ اپنے ایک لڑکے کی شادی ان کی لڑکی سے کی تھی۔

لغات پر بھی مختار احمد صاحب کی نظر بڑی اچھی تھی۔ آخر میں دکنیات کی طرف بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ دکنی زبان کی ایک لغات بھی مرتب کر رہے تھے، اپنے موضوع سے ہٹ کر دوسرے فنون پر کتابیں لکھتے اور فروخت کر دیتے تھے۔ بعض بڑی اچھی کتابیں فروخت کر دیں جو دوسروں کے نام سے چھپیں۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر بھی ان سے اچھا سلوک کرتے تھے مگر یہ اتنے شاہ خرچ تھے کہ زندگی تکلیف ہی میں بسر کی۔ آدمی وضعدار اور بڑے مخلص تھے۔ علمی فراخ دلی اور ادبی بلند حوصلگی خاص تھی، طبیعت میں جبن اور بخالت مطلق نہ تھی۔

مانک راؤ وٹھل راؤ

پائگاہ کے جاگیردار اور وہیں ملازم بھی تھے، پرانی وضع کے عربی فارسی پڑھے ہوئے بزرگ تھے۔ تاریخ کا ذوق فطری تھا تاریخ دکن پر بڑی اچھی نظر تھی۔ بستانِ آصفیہ کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کی نو جلدیں چھپوا دی تھیں چونکہ یہ جدید طریقۂ تحقیق اور طریقۂ ترتیب سے ناواقف تھے اس لئے اپنی کتابیں پرانے طریقے پر ہی مرتب کیں اور چھپوائیں۔ مگر مواد نہایت ہی عمدہ جمع کیا ہے۔ آنے والی نسلیں اس مواد کو اپنے حسب منشا استعمال کر سکتی ہیں جو بڑا کار آمد ہوگا۔

ان میں خصوصیت یہ تھی کہ نہایت متدین قسم کے بزرگ تھے تعصب و تنگ نظری مطلق نہ تھی تاریخ کو تاریخ ہی کی طرح مرتب کرتے تھے افسانوی واقعات سے تاریخ مرتب کرنے کے قائل نہ تھے۔ سو سال پہلے ایک مؤرخ لچھمن لال گزرے ہیں جو ریذیڈنسی کے میر منشی تھے۔ انھوں نے ایک بڑی نفیس تاریخ آباد کا لچھمن لال نے مرتب کی تھی، دربڑی ہی دیانت داری سے واقعات مرتب کئے تھے، ان کے بعد مانک راؤ ہی کا نمبر ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میری ملاقات راؤ صاحب سے کب ہوئی مگر ۳۵ سال سے ملاقات تھی میں جب کبھی جستجو علم کی طرف جاتا ان سے ضرور ملتا اور وہ جب کبھی چار مینار کی طرف آتے مجھ سے ضرور ملتے تھے تاریخ کی ترتیب کے سلسلے میں مشورہ کرتے تھے مگر مشورے پر عمل نہیں کرتے تھے جیسا اپنے حسب ہی پر ترتیب دیتے تھے۔

کام کرنے کا ڈھنگ بڑا اچھا تھا اخبارات کے کٹنگ تاریخ وار سے جوڑ رکھتے تھے اور الگ الگ عنوانات پر ایک الگ کتاب مرتب کرتے تھے اس طرح انھوں نے تاریخ مسلسل مرتب کی تھی اور بڑی عمدہ چیز محفوظ کر دی تھی مثلاً حیدرآباد کی طغیانیاں ایسی بعض چیزیں بعض جدید ہیں مستقل نادی تھیں جو بڑی اہم تھیں۔ گزشتہ تیس چالیس سال میں ایسا اچھا اور کار آمد مواد کسی نے بھی فراہم نہیں کیا۔

ذات کے برہمن تھے اور پابند مذہب بھی تھے۔ کھانے پینے میں احتیاط کرتے تھے مگر ملنساری رواداری اور تہذیب سے سبھی خاص تھی طبیعت میں انکسار تھا اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، مرنے سے پہلے ایک جلد تیار کر رکھی تھی اور چھپانے کی فکر ہی میں تھے کہ انتقال ہو گیا، بہرحال پانچ جلدیں جو انھوں نے چھپوا دی ہیں یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

سرفراز نواز جنگ

آج سے تیس پینتیس سال پہلے آپ نے انگریزی اخباروں میں "سید سردار علی کی کھلی چٹھی" پڑھی ہو گی، یہ کھلی چٹھی نواب سید سردار علی خاں

المخاطب بہ سردار نواز جنگ کی ہوتی تھیں۔

یہ حیدر آباد ہی کی پیداوار تھے ان کے والد سردار دلیر الملک بہادر یہاں معتمد وغیرہ رہے اور آخر میں اپنے مقدمے کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں جبکہ ہم لوگ ضلع رائچور میں تھے سردار صاحب کو میں نے دیکھا جہاں وہ دوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) ہو کر آئے تھے، ہمارے مکان کے قریب ہی ان کا رہائشی مکان تھا شام میں اکثر والد انہی کے پاس جا کر بیٹھتے اور رات میں اکثر سردار صاحب ٹہلتے ہوئے ہمارے پاس آجاتے تھے، سردار صاحب مجھ سے بہت مانوس تھے۔ کاغذ، لفافے، پنسل اور رنگین تصویروں کے رسالے مجھے دیا کرتے تھے۔ رائچور سے والد کا تبادلہ عثمان آباد ہو گیا اور پھر سردار صاحب بھی واسی کے دوم تعلقدار ہو کر آئے اور پھر منصرم اوّل تعلقدار ہو کر مستقر عثمان آباد پہنچے، اس طرح مسلسل ملنے کا اتفاق ہوتا رہا، پھر سردار صاحب رائچور اور اس کے بعد گلبرگہ کے اوّل تعلقدار ہو کر چلے گئے، والد عثمان آباد ہی میں تھے اور میں حیدر آباد میں تھا کہ ۱۹۲۰ء میں سردار صاحب نے والد کا تبادلہ گلبرگہ کر دیا اور مجھے بھی بلا لیا اور مجھ سے اپنے پاس صوبہ داری ہی میں کام لینے لگے اور مسلسل ڈیڑھ دو سال تک میں ان کے پاس کام کرتا رہا، صوبہ داری تخفیف ہو گئی تو میں معلق رہ گیا اور پھر لوکل فنڈ میں چلا گیا اور سردار صاحب ناظم ڈاک (پوسٹ ماسٹر جنرل) ہو گئے مگر مجھ سے مراسم آخر تک رہے۔

مسئلہ برار پر ایک مستقل کتاب اور کئی وائسراؤں کی سوانح عمریاں سردار صاحب نے لکھی ہیں ایک مختصر سی اردو کتاب برار سے متعلق "خیابان برار" کے نام سے بھی شائع کی ہے، لوگ ان سے انگریزی کے مصنف کی حیثیت سے واقف ہیں مگر کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ اردو کے بھی بڑے اچھے ادیب اور شاعر تھے آخر میں شاعری تو چھوڑ دی تھی مگر ادب کا ذوق باقی تھا۔

میں نے سردار صاحب کی طرح کا انسان کہیں نہیں دیکھا، معاف فرمائیے نہایت ہی ایمانداری سے عرض کر رہا ہوں کہ سردار صاحب میں بوقت واحد صفات ملکوتی بھی پائے جاتے تھے اور خصوصیات اسفل بھی، گفتگو کرنے لگتے اور تصوف بگھارتے تو معلوم ہوتا کہ بایزید وقت میں ان سے بڑا صوفی اور پیر کامل شاید ہی ہو مگر جب گفتگو ختم ہو جاتی اور عمل کا دور آتا تو محسوس ہوتا کہ چنگیز یا ہلاکو کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ ایسی متضاد شخصیت کہیں دیکھنے میں آئی نہ سننے میں۔ میں ان کا ذکر خیر برائیاں گنانے اور بدنام کرنے کے لئے نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس لئے کر رہا ہوں کہ علمائے فلسفہ کے لئے ایک مسئلہ پیش کر دوں اور وہ اس پر غور کر سکیں ایسی مشترکہ شخصیت اور مزاج [illegible] کا کوئی مقام میں تجویز نہیں کر سکا۔ آپ ہی ان کے لئے کوئی مقام تجویز کریں تو بہتر ہو گا۔

مجھے ان کے پاس کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور چونکہ میں [illegible] وہ مجھ پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے اس لئے میں ان سے یہ کہہ بھی دیتا تھا کہ آپ کی یہ حرکت [illegible] ہو جاتی ہے یا یہ فعل [illegible] اور فرمایا کرتے "میاں! انسان فطرت میں بدی ہے، تاوقتیکہ کسی نے سلسلہ نیکیوں کا [illegible] جب اس کی [illegible] نیکیاں [illegible] کا ازالہ کر سکتے ہو یقین پھر بھی نہ کرو۔"

یہ تھا ان کا فلسفہ اور اسی پر وہ عمر بھر کاربند رہے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ان کا دوست نہ بن سکا اور دو چار بد نصیب جو [illegible] کی وجہ سے دوستی نباہتے رہے وہ بھی دل ہی دل میں ان سے متنفر تھے۔

عربی، فارسی تعلیم بڑی اچھی ہوئی تھی انگریزی کے تو خاصے ادیب تھے [illegible] اردو [illegible] سلیس اور بامحاورہ اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ مطالعہ اتنا اچھا کہ تصوف، فلسفہ [illegible] تاریخ، جغرافیہ [illegible] معقولات منقولات سب پر یکساں نظر تھی۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے یہ معلوم ہوتا کہ خاص اسی [illegible] ماہر ہیں [illegible] کے علاوہ قانونی اور [illegible] معلومات کا بھی یہی حال تھا۔ اجمیر شریف سے واپس ہوتے ہوئے [illegible] مجھ سے فرمانے لگے یہاں سے کالج اور فریڈ [illegible]

انڈیا سوسائٹی دیکھنا چاہتا ہوں میں نے جا کر ان لوگوں کو اطلاع دی اور انہوں نے آنے کی اجازت دے دی تو سائیکل لے کر پہنچا، کان ہی کے پروفیسر اور سوسائٹی کے ممبروں کو ایسا الجھایا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بعض تو ایسے گرویدہ ہوئے کہ اسٹیشن آ کر خدا حافظ کہہ گئے۔ مجھ سے بعض نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ تمہارے حیدرآباد میں ایسے قابل لوگ کس طرح پیدا ہوئے یہ تو بڑی غیر معمولی قابلیت اور بڑے اعلیٰ دماغ کے مالک ہیں۔ میں نے جواب دیا " آپ لوگوں نے فقط ایک سو برادنس کمشنر کو دیکھا ہے معتمدین اور صدر المہام لوگ ان سے زیادہ قابل ہیں" خیر یہ مصلحتاً تعلّی کی مگر حقیقت یہ ہے کہ پونا والوں کو سردار صاحب نے متحیر کر دیا۔ یہ حال ان کی قابلیت کا تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں حیدرآباد کے متعلق بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی چونکہ حالات نازک صورت اختیار کر چکے تھے اس لئے حضور نظام کو دہلی بلوایا گیا تھا، سردار نواز جنگ نے حسن نظامی کو فراہم کر کے دہلی میں حضور نظام کے استقبال کی تیاریاں کرائیں اور ایسا ٹھاٹھ کا استقبال کرایا کہ انگریز بھی دنگ رہ گئے یہ سارا کھیل سردار صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھ کر کھیلا۔ پھر جب حضور دہلی سے واپس ہونے لگے تو حیدرآباد میں جشن اور چراغاں کرنے کی تحریک کی اور سب سے زیادہ خود سردار صاحب نے حصہ لیا، ایسے کھیل وہ بیٹھے بیٹھے کھیل لیتے تھے، اس کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ انگریز سخت ناراض ہو گئے اور ریذیڈنسی ان کی علیحدگی کا مطالبہ کرتی رہی اور انہیں وظیفہ پر سبکدوش ہونا پڑا بدنصیبی سے میری آمد و رفت اس زمانے میں بھی سردار صاحب کے پاس تھی اور بیشتر مراسلت میرے سامنے ہوتی رہی اور بعض خطوط مجھی سے لکھوائے گئے اس لئے میں اس واقعہ سے واقف ہوں۔

سردار صاحب کو عبدالمقتدر صاحب بدایونی سے بیعت تھی اور ان کا بہت احترام کرتے اور باقاعدہ پاؤں پڑتے تھے مگر بعض لوگوں کے متعلق انہوں نے سفارش کی تو وعدہ کر لیا کہ ان کی سفارش سنیں گے مگر ان کے جاتے ہی ان لوگوں کو ڈانٹ بتائی کہ بھولے بھالے مرشد کو تم نے روپیٹ کر ہمدرد بنا لیا میں نے ان کے کہنے سے وعدہ تو کر لیا ہے مگر یاد رکھو تمہیں اسی طرح سزا دوں گا۔

بعض لوگوں کو منصرم تحصیلداری دے کر بھجواتے پھر بعض لوگوں سے کہہ کر ان کے خلاف درخواستیں دلواتے اور ان درخواستوں پر کارروائی کر کے انہیں تحصیلداری سے ہٹا دیتے یہ لوگ روتے پیٹتے آتے تو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور توبہ تلّا کراکر پھر کسی تحصیلداری پر بھجواتے، اس طرح کے کام بہت کرتے اور اس سے خوش ہوتے تھے۔

فصیح جنگ ان کے بڑے مرشد، مربی اور ہمدرد تھے جنہیں وہ "حضرت محسنی" لکھتے اور کہتے تھے، ایک مرتبہ مشہور ہوا کہ سردار صاحب کو زوال لاحق ہو رہا ہے تو فصیح جنگ نے نواب حسین دوست خاں سے میرے سامنے ہی کہا کہ "ارے نواب! سردار صاحب کو زوال ہو رہا ہے میں میں تو اپنا بستر باندھ رہا ہوں، تم بھی اپنی جاگیر کا رُخ کرو اب حیدرآباد کی خیر نہیں ہے" سردار صاحب بیٹھے ہوئے ہنستے رہے۔

کمال یہ تھا کہ اپنے ماتحتین کو معطل، موقوف، برطرف کر کے یا تبادلہ کر کے سردار صاحب یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے بڑا نیک کام کیا ہے اور خلق اللہ کو اس طرح فائدہ پہنچایا ہے۔

سردار صاحب کی دو خصوصیتوں کا میں قائل ہوں۔ ایک تو یہ کہ شاہ پرست تھے مرتے تک شاہ پرست رہے، اور دوسری یہ کہ چاہے کسی شخص کے کتنے ہی دشمن ہوں وہ مر جاتا تو اس کے بیوی بچوں سے امکانی ہمدردی کرتے، بعض لوگوں کا سردار صاحب نے تبادلہ کیا پھر انہیں معطل کیا اور پریشان کرتے رہے اسی پریشانی میں وہ مر گئے تو آپ نے ان کے بچوں کو جیب سے روپے دئے، بیوی کے وظیفے کی کارروائی کی، ذاتی طور پر سفارش کر کے وظیفہ منظور کرایا بعضوں کے لڑکوں کے تقررات کرائے مگر زندگی بھر وہ لوگ معتوب رہتے ہیں۔

شیر دل ایسے تھے کہ کسی سے نہ ڈرتے تھے اور ہر ایک سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے مگر پہل اپنی طرف سے نہ کرتے تھے۔ نہایت ہی سلجھے ہوئے طریقے سے ہر شخص سے پیش آتے اور وہ ذرا بھی بے اعتدالی کرتا تو کچھ مقابلہ شروع ہو جاتا اور ایسا پیچھا کرتے کہ توبہ بھلی۔

گلبرگہ پر بریرے ماموں ڈاکٹر عبدالرب جیل سرجن تھے جو سردار صاحب کے بھی معالج تھے، ناظم طبابت نے ان کا تبادلہ لاتور پر کر دیا اور ڈاکٹر صاحب اپنا سامان باندھنے لگے میں نے سردار صاحب سے ذکر کیا تو کہا ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ تبادلہ نہیں ہوگا سامان نہ باندھیں اور خود سردار صاحب نے ایک نیم سرکاری ناظم طبابت کو لکھی کہ ڈاکٹر عبدالرب بڑے ہی خلیق اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں گلبرگہ کے باشندوں، درعہدہ داروں کو ان کی موجودگی سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے اس لئے ان کا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے مگر ناظم طبابت بھی ایک ہی کائیاں تھے انہوں نے جواب دیا کہ لاتور پر ایک ہمدرد اور خلیق ڈاکٹر کی ضرورت ہے، وہاں مدت سے کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہے اس لئے ڈاکٹر عبدالرب کا وہاں بھجوایا جانا لاتور والوں کے لئے ضروری ہے، گلبرگہ ڈاکٹر صاحب سے بہت فائدہ اٹھا چکا اب لاتور والوں کو بھی فائدہ اٹھانے دیجئے۔ یہ جواب بڑا دندان شکن تھا مگر سردار صاحب بھی کاٹنے کے آدمی تھے نیم سرکاری وصول ہوتے ہی ایک ٹیلیگرام ناظم طبابت کو کیا کہ ڈاکٹر عبدالرب کے لئے میں بارگاہ خداوندی میں معروضہ پیش کر رہا ہوں براہ کرم فرمان کا انتظار فرمائیے ——— یہ ایسی ضرب تھی کہ ناظم طبابت اسے روک نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب کو تار کے ذریعہ اطلاع دی کہ فی الحال تبادلہ ملتوی کیا جاتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو وہاں سے جانے نہ دیا۔ اب انہوں نے معروضہ پیش کیا یا نہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر ناظم طبابت تو مرعوب اور مجبور ہو گئے۔

بہرحال سردار صاحب کی شخصیت معجون مرکب تھی اور عجیب و غریب بزرگ تھے۔

توفیق

دکن میں شاعری کا چرچا مدت سے ہے اور ہزاروں شاعر ہوئے اور ہیں مگر یہاں کی شاعری کچھ فیشن کچھ شوق اور کچھ بیکاری کے تحت رہی، پڑھے لکھے لوگوں نے اپنا تخلص مقرر کر لینا لازمی سمجھ لیا تھا جس طرح علماء خواہ مخواہ اپنی کنیت رکھ لیتے ہیں اسی طرح بیکاران قوم بھی ایک نہ ایک تخلص رکھ لیا کرتے تھے اور تخلص کی لاج رکھنے کے لئے غزل بھی کہہ لیتے اور اپنا نام خواہ مخواہ پانچوں سواروں میں لکھوا لیتے، ان کے علاوہ بعض شوقین ایسے بھی تھے اور ہیں جنہوں نے عمر بھر دو دو غزلیں کہیں مگر ہمیشہ انکساراً اپنے آپ کو شاعر سمجھتے رہے اور اب تک سمجھ رہے ہیں۔ اس قبیل کے لوگ نہ صرف دکن میں تھے اور ہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی موجود ہیں مگر انہی میں چند ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو واقعی شاعر تھے اور جن کا شعراء میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ایسے ہی لوگوں میں سید جلال الدین توفیق بھی تھے یہ بزرگ سید زادے اور سادات مہدویہ سے تھے۔ پرانی وضع کے تعلیم یافتہ اور خاصے پڑھے لکھے تھے ضروریات شعری سے باخبر اور عروض و قافیہ پر اچھی نظر تھی، صدر محاسبی میں ملازمت تھی، منتظم رہے، کلرک تھے، بچپن سے شعر و سخن کا شوق تھا اور بڑی اچھی مشق تھی۔

طبیعت میں سلجھاؤ تھا، سوچ سمجھ کر شعر کہتے اور احتیاط بھی کرتے تھے، ابتداً شعرائے لکھنؤ کی اتباع کی اور آتش و ناسخ کی پیروی کرتے رہے مگر جلد ہی اسے چھوڑ کر غالب و مومن کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان دونوں استادوں کا مطالعہ اتنا گہرا کیا کہ خود بھی ان دونوں کی صدائے بازگشت بن گئے اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ ان دونوں استادوں کے رنگ میں بے تکلف شعر کہنے لگے مگر نقصان یہ ہوا کہ اپنا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

توفیق نے زیادہ تر کوشش مومن کا رنگ اختیار کرنے کی کی ہے اور ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے مگر تصوف اور اخلاق کی طرف جو وہ مائل ہوتے گئے تو غالبیت آتی گئی اور زیادہ تر غالب ہی کی پیروی کرتے رہے، توفیق فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت شاعری کے لئے موزوں تھی مگر مومن کا رنگ ان پر کھلتا نہ تھا اس لئے کہ مومن کے پاس تغزل اور صرف تغزل ہی تھا اور اس کے لئے "رندی" کی ضرورت تھی اور توفیق ایکدم "زاہد" بنا جاتی تھے اس لئے مومن کے رنگ میں جو کچھ کہتے گویا مومن کو اپنے الفاظ میں دہرا دیتے تھے اس لئے

اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ تغزل تخیل سے پیدا نہیں ہوتا یہ عمل کا محتاج ہے۔ مومن اگر ابتداً عاشق مزاج نہ ہوتے اور پانچ چھ بار عاشقی کر کے "عشق پروف" نہ بن جاتے تو ان سے بھی تغزل نبھ نہ سکتا۔ جس طرح امیر مینائی نے مفروضاتِ عشق کو سامنے رکھ کر غزل کہی ہے اور داغ کا مقابلہ کرنا چاہا ہے اسی طرح توفیق نے بھی مصلے پر بیٹھ کر مومن کا تغزل نباہنا چاہا ہے۔ یہی وجہ ان کی ناکامی کی ہوئی۔

رہا غالب سو اس کا اندازِ بیان ہی اور تھا۔ طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا توفیق سے کیا ہو سکتا اس لئے اس رنگ میں بھی وہ مسائلِ تصوف ہی بیان کر کے رہ گئے۔ آدمی دماغ دار اور ذہین تھے اگر اپنے دماغ سے مومن و غالب کے تتبع کا خیال دور کر دیتے اور اپنے طرز پر فکرِ شعر کرتے تو یقیناً اچھے شاعر بن جاتے مگر وہ اس طرف غور کر ہی نہ سکے۔

توفیق نے ابتداً مشاعروں میں بھی شرکت کی اور فرمائشی نظمیں، سہرے اور قصائد بھی کہے مگر درمیان میں وہ بہت محتاط ہو گئے تھے جی چاہتا غزل کہتے ورنہ نہ کہتے لیکن دفعۃً تو وہ مہینوں شعر نہ کہتے اور پھر شعر کہنے لگتے تو مسلسل کہتے رہتے۔

والد مرحوم سے توفیق کی دوستی تھی صدر محاسبی میں توفیق کے علاوہ ایک اور شاعر تھے شہزادہ حافظ مرزا منیر الدین ضیا گورگانی دہلوی بھی تھے جو شہزادہ مرزا ضیا دہلوی کے فرزند اور داغ کے شاگردِ رشید تھے۔ یہ بھی بڑے قابل اور عروض کے ماہر تھے۔ والد مرحوم نے ان سے عروض پڑھی تھی اور داغ کے انتقال کے بعد انہی سے مشورہ کرتے تھے۔ صدر محاسبی کا دفتر نافے شہر میں سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں تھا۔ آتے جاتے میں اکثر صدر محاسبی میں چلا جاتا اور پہلے ضیا اور ان کے بعد توفیق سے ضرور ملتا تھا۔ مجھے توفیق سے مل کر خوشی ہوتی تھی کیونکہ نہایت منکسر، بہت ہی متواضع اور بڑے ہی مخلص بزرگ تھے۔ ضیا جتنے بد دماغ اور رعونت مآب تھے اتنے ہی توفیق اور ملنسار تھے۔ [illegible] مجھے شعر [illegible] بات کرتے بھی روادار نہ ہوتے تھے [illegible] ان کے لئے بار [illegible] برخلاف ان کے توفیق [illegible] ملتے ہی بیٹھنے کو کرسی دیتے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے بڑی محبت سے [illegible] غزل کی فرمائش کرتے تو بھی سنا دیتے کبھی [illegible] ساتھ لے لیتے۔

[illegible] توفیق کے برادر [illegible] آتے جاتے تھے۔ وہاں [illegible] پڑھا کبھی [illegible] اپنی غزل کا [illegible] اپنی غزلوں کی [illegible] خود ہی [illegible] تھے [illegible] زیادہ [illegible]

[illegible] حیدرآباد [illegible] داغ [illegible] غزل [illegible] شعر [illegible] دو [illegible] اور [illegible] قوال [illegible] غزل [illegible] داغ کے پاس [illegible] سہیلیوں کو [illegible] اس کے دوسرے روز شہر [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا۔ داغ [illegible] غزلیں [illegible] داغ کی غزلیں [illegible]

اور چھوٹے سے چھوٹا دل پکڑ کر بیٹھ جاتا بڑی خصوصیت یہ تھی کہ داغ عوامی شاعر تھے کلام اتنا صاف، بے ساختہ اور ایسی روزمرہ میں ہوتا تھا کہ سُن لینا کافی تھا۔ کانوں کے راستے دماغ میں پہنچ کر حافظے میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ بخلاف اس کے توفیق مومن کی لکیر پیٹتے اور غالب کا قالب بدلتے رہتے تھے جن سے عوام بالکل نا آشنا تھے۔ پھر بھی ایک زندگی کے منہ سے مشہور ہو کر توفیق کی یہ غزل چند سال تک زبان زد خواص رہی۔

اس نے کہا ہستی تری میں نے کہا جلوہ ترا — اس نے کہا پھر نیستی میں نے کہا پردہ ترا

اس نے کہا جانا مرا میں نے کہا مرنا مرا — اس نے کہا پھر زندگی میں نے کہا [illegible]

اس نے کہا تنہا مرا میں نے کہا کعبہ ترا — اس نے کہا تسبیح صفا میں نے کہا پھیرا ترا

اس نے کہا [illegible] میں نے کہا خدمت مری — اس نے کہا [illegible] میں نے کہا [illegible]

اس نے کہا دل لے گیا [illegible] میں نے کہا — اس نے کہا وہ کون تھا میں نے کہا [illegible]

اس نے کہا [illegible] میں نے کہا تقدیر ہے — اس نے کہا [illegible] میں نے کہا [illegible]

علامہ اقبال کی یہ غزل مشہور ہوئی ہے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو توفیق نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی جو حیدرآباد میں خاصی مشہور ہوئی ہے

کبھی پردہ در ہے [illegible] راز کا [illegible] میں پردہ راز میں — کہ حقیقت اک مری [illegible] ہے حقیقت اور مجاز میں

[illegible] کے جلوے [illegible] کئے [illegible] چھپا گئے — کہ ہزاروں آئینے ٹوٹ گئے ہیں [illegible]

[illegible] — [illegible] نماز میں

توفیق [illegible] کے [illegible] مگر [illegible] اصول اور طریقہ نہ جانتے تھے اور [illegible] اس کی [illegible] اور عوام [illegible] ہے اسی سے وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے [illegible] واقف [illegible] ہے

[illegible] سوز [illegible] کے [illegible]
[illegible] ہستی ہے [illegible] دل [illegible]

[illegible] عوام [illegible] پسند آئے اس سے توفیق [illegible] لوگوں [illegible] مقبول رہے۔

توفیق کے معاصرین میں [illegible] اور امجد تھے۔ امجد نے غزل [illegible] اس لیے [illegible] اور اپنے آپ [illegible] وقف کر دیا [illegible] غزل میں وہ توفیق اور [illegible] کا [illegible] اور وہ عوام کے [illegible] اس لئے [illegible] روزمرہ [illegible] شعر کہنے [illegible] زیادہ [illegible] توفیق [illegible]

[illegible] سے بھی اجتناب کرتے تھے [illegible] شاگرد [illegible] احباب [illegible] توفیق [illegible]

[illegible] توفیق [illegible] ان کا ایک دیوان [illegible] چھپا [illegible] دوسرا دیوان [illegible] ۱۹۴۳ء [illegible] طبع ہوا ہے عبدالرزاق [illegible]

توفیق کے لائق فرزند توصیف نے ایک انگریزی پیش لفظ مسٹر ونا ناریا نائب معتمد فینانس سے بھی لکھوا لیا اور اسے دیوان کے ساتھ چھپوا کر خوش ہو گئے کہ نائب معتمد فینانس توفیق کا مداح ہے، توصیف صاحب بیچارے بھی صدر محاسبی کے کلرک ہی تھے ان کی دانست میں یہ اعزاز بہت بڑا تھا کہ نائب معتمد خامہ فرسائی کرے انہیں یہ معلوم نہیں کہ شاعر کا کلام ایسا کرنسی نوٹ ہوتا ہے جس پر عوام کے دستخط ہوتے ہیں، فینانس کے عہدہ داروں کے نہیں۔

بہرحال باوجود اپنی کوشش اور اپنے بیٹے کی جدوجہد کے توفیق حیدرآباد میں زیادہ شہرت نہ پا سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے اچھے شاعر اور بہت خاص شخصیت کے مالک اور بڑے ہی نیک دل بزرگ تھے۔

تجلّی

سید منتجب الدین نام تجلی تخلص تھا، سید یار جنگ کے پوتے اور بخت بلند جنگ کے نواسے تھے والد کا نام سید سیادت علی خاں تھا جو ناظم دیوانی بلدہ حیدرآباد تھے، اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز پیدا ہوئے اماں نے منحوس سمجھ کر پہلو سے جدا کر دیا تو خالہ بیگم سلطان نواز جنگ نے اپنے گھر لے جا کر پرورش کی آہستہ آہستہ ماں کو بیوگی پر صبر آیا تو بیٹے کو اپنے گھر بلا لیا اور بڑے چاؤ چونچلے سے بسم اللہ (تسمیہ خوانی) کی تھی کہ خود اللہ کو پیاری ہو گئیں، بڑی بہن رحیم بیگم غیاث الدین علی شاہ اور خالہ نے پال پوس کر پروان چڑھایا۔ بہنوئی یعنی غیاث الدین علی شاہ نے اپنی نگرانی میں اپنے بیٹے سید قطب الدین محمود علی فاضل کے ساتھ تعلیم و تربیت کی۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزہ میں ہوئی۔ پھر دارالعلوم حیدرآباد میں شریک ہو گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی، طبیعت پر تصوف کا رنگ غالب تھا نوجوانی ہی میں آغا داؤد کے ہاتھ پر بیعت کی اور تصوف ہی کے ہو رہے۔ شعر و سخن کا ذوق بھی تھا اور یہ موروثی ذوق تھا کیونکہ باپ اور دادا دونوں شاعر تھے اس لئے خود بھی شعر کہنے لگے پہلے مشق کرائی، پھر داغ حیدرآباد آ گئے تو داغ کو کلام دکھانے لگے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے فارسی میں پہلے استاد الملک آغا شوستری کو دکھاتے رہے، ان کے انتقال کے بعد سے ترکی پاتی بنی کو دکھلانے لگے ربوبیتی منصب سے سرفراز تھے، سید عبدالرحیم اول تعلقدار کی صاحبزادی سے جو مولوی سید محمد یوسف الدین صوبہ دار گلبرگہ کی بھانجی تھیں، شادی ہوئی، یوسف الدین صاحب کے کہنے پر نوکری کر لی۔ ابتداً صوبہ داری گلبرگہ میں صیغہ دار ہوئے پھر ضلع رائچور کے خزانہ دار (ٹریژری آفیسر) ہو گئے۔ رائچور سے عثمان آباد تبادلہ ہوا اور وہاں سے گلبرگہ تبادلہ ہوا اور گلبرگہ ہی میں اللہ کو پیارے ہوئے اور خواجہ بندہ نوازؒ کے پائیں میں آسودہ ہیں۔ یوں تو آٹھ دس لڑکے لڑکیاں ہوئے مگر تین لڑکے باقی رہے ۱۔ راقم الحروف ۲۔ سید رفیع الدین کاظمی ۳۔ سید رشید الدین کاظمی۔ رفیع الدین مجرد رہے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ راقم الحروف اور رشید الدین قضیۂ اہل و عیال میں مبتلا ہیں۔

تجلی کی نشو و نما محلہ ... میں ہوئی سنہ ۱۹۰۸ء تک وہ حیدرآباد ہی میں رہتے اور اس زمانے کی سوسائٹی میں خاصا رسوخ رکھتے تھے، برتر، بازغ، داغ، توفیق، کیفی، محفوظ، رسا، ناظم، بلبل، اختر، سہا، ثاقب وغیرہ سے برادرانہ اور دوستانہ مراسم تھے، دیوان خانہ ان بزرگوں سے بھرا رہتا تھا رات دن شعر و سخن، نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں گلبرگہ چلے گئے، آتے بھی لمبی تعطیلات میں ورنہ ہر جمعہ کو حیدرآباد آ جاتے اور پھر وہی گہما گہمی رہتی، سنہ ۱۹۱۲ء میں عثمان آباد تبادلہ ہو گیا تو آمد و رفت کم ہو گئی اور دیر دیر سے حیدرآباد آنے لگے اس طرح حیدرآباد کی صحبتیں چھوٹ ہی گئیں۔

اضلاع رائچور، عثمان آباد، گلبرگہ اور ان ضلعوں کے تعلقات میں (جہاں جہاں یہ منصرم تحصیلدار رہے) مشاعرے کرتے رہے اور اپنے ذاتی اثر اور دلچسپی سے لوگوں میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کیا، مطالعہ کا بڑا شوق تھا اور مرنے تک مطالعہ کرتے رہے۔ بڑی محنت سے کتابیں جمع کی تھیں

جو تلف ہوئیں حیدر آباد سے جب ہم لوگ باہر گئے تو یہاں کا ذخیرہ تباہ ہوا اور مرحوم کے انتقال کے بعد جب ہم اضلاع کا جمع شدہ ذخیرہ گیبر گہ میں رکھ کر حیدر آباد آ گئے اور یہاں مستقل طور پر انتظام کر کے اس ذخیرے کو منتقل کرنا چاہا تو وہ بھی برباد ہو چکا تھا اُس طرح مرحوم کا بہتر پرفوٹو ضائع ہوا۔

نثر نویسی کا شوق تھا، چونکہ حیدر آباد میں فارسی عام تھی اور والد کے بچپن میں فارسی ہی میں مراسلت ہوا کرتی تھی اس لئے فارسی ہی لکھتے تھے میرے بچپن میں وہ رائچور اور عثمان آباد سے جو خطوط مجھے لکھا کرتے وہ فارسی ہی ہوتے تھے اور میں جواب بھی فارسی ہی میں لکھا کرتا تھا۔ جب میں نے اردو نثر لکھنی شروع کی تو انہیں بھی اردو میں خطوط لکھنے لگا اور وہ بھی اردو ہی میں مراسلت کرنے لگے۔ فارسی برتتے بھی بڑی روانی سے تھے مگر لہجہ بالکل ہندوستانی ہوتا تھا ایرانی لہجہ میں بات نہیں کر سکتے یا کھینچتے تھے بہرحال اچھی فارسی بڑے لہجے میں بولنا ان کا معمول تھا۔ یہی حال اردو کا بھی تھا اردو بھی اپنے دکنی لہجے میں بولتے اور [illegible] دکنی محاورے استعمال کرتے تھے البتہ تحریر میں دکنی محاورات کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے

خطاط بڑے اچھے تھے نواب نظام الدین خان مشہور خوشنویس سے شاگرد تھے اور قطعات [illegible] لکھتے تھے [illegible] [illegible] [illegible] خط [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سے درست کرایا اور [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لفظ [illegible]

میں [illegible] پارہ پڑھ لیجئے اور رات میں پڑھا دیجئے [illegible] ہر پارہ غور سے پڑھا کرو اور [illegible] جب میں [illegible] شوق سے [illegible] پڑھنے لگے اور [illegible] سے [illegible] حافظ ہونے کا جو شوق تھا جاتا رہا۔

جوانی میں [illegible] کا امتحان بھی دیا تھا عملی تجربہ [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] اور [illegible] کان [illegible] اور [illegible] معتقد تھے جو مجذوب مل جاتا اسے پکڑ کر گھر لاتے [illegible] جتنے بزرگان دین ہیں ان سب کی فاتحہ بڑے اہتمام سے کرتے میں چونکہ ان کے اس طریقے کا عادی تھا اس لئے [illegible] اور طبیعت بگڑنے لگی تو میں نے حیدر آباد لانا چاہا کہنے لگے [illegible] حیدر آباد لے چلنا چاہتے ہو تو لے چلو مگر میں مرنے والا ہوں [illegible] نعش گلبرگہ لا کر خواجہ صاحب کے پائیں میں دفنا دو گے اگر ایسا کر سکتے ہو تو لے چلو ورنہ انتظار کرو۔ ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر [illegible] نے بھی

اس کی تائید کی کہ جب وہاں دفن ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں تو کیوں لے جاتے ہو۔ چنانچہ وہیں انتقال کیا اور خواجہ صاحب کے پائیں میں آسودہ ہوئے۔
چار دیوان مکمل کئے تھے، ان چاروں کو اکٹھا کر کے ایک دیوان بنایا جو بہت ضخیم ہو گیا اس کی طباعت کے لئے ایک منشی ابوالعلائی سٹیم پریس آگرہ سے معاملہ کیا ڈھائی سو صفحہ بھیجا اور مسودہ بھجوایا مگر مطبع ہی برخاست ہو گیا اسی زمانے میں دیوان کی بائنڈنگ بھی لوگوں سے منگوالی تھیں، مطبوعہ تخلص نام رکھا تھا، اس دیوان کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کی طباعت کی فکر کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ چھپوا لوں گا۔

مرحوم کی شاعری کا یہ حال تھا کہ طبیعت موزوں پائی تھی، مگر ای آدمی تھے عشق و عاشقی سے محض نابلد فرضی مضامین ہجر و فراق باندھتے تھے ظاہر ہے کہ کیا بات پیدا ہو سکتی ہے؟ مشق بھی جاری نہ تھی جی چاہتا تو روزانہ دو دو غزلیں کہہ ڈالتے۔ جن مضمون پر کہتے شعر کہنے کا طریقہ یہی قافیہ پیمائی تھا، پہلے قافیے چن لیتے ان کو مصرعوں میں موزوں کرتے پھر ان مصرعوں پر مصرعے لگا دیتے اس طرح غزل ہو جاتی۔ اس میں آورد ہی آورد ہوتی تھی آمد نام کو۔ ایک آدھ شعر صاف نکل آتا ورنہ سارا دیوان ایسا ہی ہے۔

آخر میں نعت بہت کہنے لگے تھے شروع میں شاید طبیعت زیادہ رواں تھی۔ ابتدائی غزلیں کچھ اچھی ہیں، عموماً اپنے حسب حال شعر کہتے تھے:

دشمنوں سے بھی جھک کے ملتا ہوں — یہ تخلص شعار ہے میرا
لگانا آگ دل کو دفن کر دینا تحمل کو — نہ کرنا حال ظاہر کسی نااہل انساں سے
با مردم اہل تند خوئی مشکل — با مردم بدنہاد نکوئی مشکل
با مردم بد مزاج کہ حرف معقول — گوئی مشکل و گر نہ گوئی مشکل

اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں سے کبھی کوئی کام نہیں لیا، موعود الخدمت تحصیلدار تھے اور فصیح جنگ کے بے تکلف یار غار مگر کبھی فصیح جنگ سے اپنی مستقل تحصیلداری کے لئے نہیں کہا۔ میں فصیح جنگ کے پاس بہت جایا کرتا تھا مگر مجھے ہمیشہ منع کرتے تھے کہ خبردار میرے لئے یا اپنے لئے فصیح الدین سے کچھ نہ کہنا۔

داغ سے والہانہ محبت تھی جب داغ کا ذکر کرتے آب دیدہ ہو جاتے اور اس احترام سے "استاد داغ" کا نام لیتے جیسے کسی ولی کا نام لے رہے ہوں، اسی طرح حضرت خواجہ سید یوسف الدین صاحب سے بھی انہیں عقیدت تھی۔

حساب میں بہت کمزور تھے اس لئے تاریخ بھی کہہ نہ سکتے تھے۔ ایک دن بیٹھے ہوئے تاریخ کہہ رہے تھے میں نے پوچھا کیا ہے تو کہنے لگے جلال لکھنوی کے انتقال کی تاریخ نکال رہا تھا۔ ایک مصرعہ اچھا نکلا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہے تو کہا "جان اندر کی سید ضامن علی جلال" میں نے کہا یہ تو وفات کی تاریخ نہیں کہنے لگے پھر کیا ہے میں نے کہا یہ تو نزع کی تاریخ ہے۔ جان کندنی تو ہے وفات یا انتقال کہاں؟ کہنے لگے ٹھیک تو ہے مجھے خیال نہ رہا۔ اور استاد جانی مولوی حسین نے تاریخ نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں ریختی الفاظ جملے وغیرہ تھے اسی کی مدد سے بڑی محنت شاقہ کے بعد تاریخ نکالتے تھے وہ بھی وفات ہوا کر جائے تو ...

مولوی مضمون نگاری سے بہت خفا رہتے تھے، لاہور کے بعض رسائل پر سے نام کے ساتھ "مولانا" لکھتے تھے کوئی مضمون مولانا مکین کاظمی کے نام سے طبع ہوا تو دیکھ کر بڑے خفا ہوتے کہنے لگے میاں یہ بھی ... بڑی محنت کی ہے مگر اب بھی لوگ مولوی کہتے ہیں تو شرم آتی ہے کہ ہم اس لقب کے مستحق نہیں ہیں لوگ غلط اندازہ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ بائیس سال کی عمر میں مولانا بن گئے وہ لوگ جو تمہیں مولانا لکھتے ہیں جب تم پچیس کے ہو گے تو کیا لکھیں گے؟

عظمت اللہ خاں دہلوی کی شاعری پر میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو جمالیات میں چھپا تھا۔ یہ مضمون پڑھا تو بہت خفا ہوئے، کہنے لگے یہ گیتی کی گنتیاں ہیں ان میں شاعری کہاں سے آئی، تم ہو کہ اسے شاعری ثابت کرنے چلے ہو۔ شعری تم کو ابھی نہیں لگی، استادوں کا کلام

پڑھا کرو تو شعور پیدا ہوگا۔

مگر باوجود اس قدامت کے بعض باتیں بڑی اچھی تھیں۔ مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ان سے جھوٹ نہ بولوں گا۔ میں نے کبھی کوئی بات مرحوم سے جھوٹ نہیں کہی۔ کوئی بات صحیح نہ کہہ سکتا تو چپ رہ جاتا اور وہ سمجھ جاتے تھے۔ رات گانے کی پارٹی ہوتی اور میں غائب ہو جاتا۔ دو تین بجے آتا اور سو جاتا۔ صبح پوچھتے میاں رات کہاں تھے؟ تو میں "ہوں" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ تھوڑی دیر جواب کا انتظار کرتے پھر کہتے کچھ کہہ دیا کرو کہ دعوت میں جا رہا ہوں۔ یہ اس لئے کہ مجھے انتظار کی زحمت نہ ہوتی۔ تم کہتے نہیں، میں پریشان ہوتا ہوں۔ ابھی تمہیں میری پریشانی کا احساس نہیں ہے۔ جب تم باپ بنو گے تو قدرِ عافیت معلوم ہوگی۔ ع قدرِ بابا آں زماں دانی کہ خود بابا شوی

مرحوم نے بڑی محنت سے میری تربیت کی تھی۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا ہر بات سکھایا کرتے تھے۔ خصوصاً علمی مجلسوں میں تو انہوں نے مجھے مکمل کر دیا تھا۔ یہ کہ ۵۳-۶۰ سال سے لکھ رہا ہوں یہ انہی کی فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ وہ کیمبرج میٹرک پاس تھے۔ ان کی ایک مختصر نظم ... میں چھپی تھی جسے ... نے پڑھا تھا اور انہوں نے ہی مجھے ساتھ لے جا کر عظمت اللہ خاں سے ملایا تھا۔ اس کے بعد میں ان سے اکثر ملا کرتا اور بڑی پُرلطف صحبت رہتی تھی۔ ان دنوں آغا حیدر حسن دہلوی بھی اکثر آیا کرتے تھے۔

عظمت مرحوم ان دنوں ... حیدرآباد میں ... رہے۔ اکثر ملنا ہوتا اور ہم مختلف باتیں ہوتیں۔ ایک روز صبح صبح میں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ کمرے میں دو ایک آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اور گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ میرے پہنچتے ہی عظمت نے پوچھا: مکین صاحب! آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ... میں کیا ... ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے وضاحت چاہی تو ایک صاحب نے تفصیل سنائی کہ ... حسن کا تعلق رنگ سے ہے یا نہیں۔ ... میں نے کہا ہے اور حسن رنگ پر منحصر ہے۔ سنتے ہی حاضرین نے نعرہ لگایا اور عظمت خاموش ہو گئے۔ میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور سب لوگ ... ہو گئے۔ بحث صرف یہ تھی کہ کالا رنگ حسن میں داخل نہیں ہے، کالا رنگ حسن نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا رنگ چاہے گورا ہو یا کالا، حسن اس میں بھی ہوتا ہے۔ اور میں نے عظمت کا ہم خیال تھا۔ صرف عظمت ایک طرف تھے اور باقی گروہ دوسری طرف۔ بحث بڑی طویل ہو گئی تھی، آخر بغیر کسی تصفیہ کے ختم ہو گئی۔ ابتدا میں عظمت بے تکلفی کی وجہ سے مجھ سے نہایت ... تھے مگر اس روز جب نکلے ہوئے تو ... کہ اپنی ساری زندگی کی روداد ... اور مجھ سے بھی ان کا اعتراف کر دیا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔

عظمت نہایت تربیت یافتہ، باوقار، مخلص اور قابل آدمی تھے۔ محنتی اور کارگزار بھی بہت تھے۔ کام کرنے سے تھکتے نہ تھے۔ جو کام کرنا ہوتا اس کو بنانے میں تو بس لگن تھا، وقت پر کام پورے ... کر کے آتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا وقت انہیں کم ملتا تھا۔ ... ہزار روپے ... مجھ سے ملنے آتے تھے ... ایک روز میں نے کہا اپنی نظمیں چھپوا دیجئے تو کہنے لگے ایک شرط پر چھپوانا ہوں کہ جمع کر دو اور ایک مضمون بھی نظموں کے متعلق ایمانداری سے لکھو۔ ورنہ مجھ سے نہ تو نظمیں جمع کرنا ہو سکے گا اور نہ ان پر کچھ لکھنا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کلبرگہ واپس ہونے کے بعد مجھے خیال ہوا کیوں نہ نظمیں اکٹھی کر دوں۔ چنانچہ میں نے "اردو" اور مختلف میگزین وغیرہ سے نظمیں نقل کر لیں اور ایک مضمون "عظمت اللہ خاں اور ان کی شاعری" لکھا اور سب کو لاہور کو بھجوا دیا۔ اس وقت تک عظمت کو عام لوگ نہ جانتے تھے۔ "اردو" پڑھنے والے اور علیگڑھ کے طلبا ہی جانتے تھے۔

ہمایوں [illegible] اس مضمون کے طبع ہوتے ہی یار لوگوں نے میرا پیچھا شروع کیا کہ عظمت اللہ خاں کی غیر مطبوعہ نظمیں بھیجو چنانچہ اکثر رسالوں کو میں نے ان کی نظمیں بھجوائیں، میرا مضمون جب عظمت نے پڑھا تو مجھے ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ تم نے واقعی مجھے شاعر ثابت کر دیا ورنہ میں تو اسے شاعری نہیں سمجھتا تھا۔ اب وہ جو نظمیں تم نے جمع کر لی ہیں مجھے بھیج دو میں چھپوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی وہ بیمار ہوئے اور [illegible] ورم پھیلے گئے۔ میں حیدرآباد آگیا تو وہ سینی ٹوریم میں تھے۔ مجھ سے مراسلت ہونے لگی آخری خط میرے پاس آیا کہ اب ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دے دی ہے ایک آدھ ہفتے میں واپس بھی ہو جاؤں گا، اسی مضمون کا ایک خط عبدالرزاق بسمل کو بھی ملا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انتقال کی اطلاع بھی ملی۔

عظمت کی بہت ناوقت موت ہوئی۔ ملک کو ان کی شدید ضرورت تھی ان کے جیسے معتدل لوگ بہت کم تھے کاش وہ اور جیتے اور کام کرتے۔

عظمت کے مضامین اور ان کی نظموں کا مجموعہ دونوں طبع ہو گئے ہیں مگر ان کے ترجمے نہیں چھپ سکے۔ عظمت نے سیکڑوں کو شاعر، مضمون نگار، ایڈیٹر کیا کچھ بنا دیا۔ [illegible] بیگ نے عظمت ہی کے مشورے سے [illegible] کا کام لیا اور [illegible] معیاری کیا۔ فرحت اللہ بیگ [illegible] اپنے مضامین میں عظمت ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ [illegible] تمام مضامین عظمت نے عصمت اللہ بیگ کو ہی دے دئے تھے۔ امجد صاحب نظموں اور رباعیوں [illegible] شائع کرنے کے بعد رسالوں کو بھیجتے یا مجھ سے [illegible] اسی طرح [illegible] نظمیں کہ کر عظمت کو دکھایا کرتے [illegible] عظمت ان [illegible] لیتے تھے، تونثر عجیب و غریب [illegible] عنایت اللہ خاں:

[illegible]

"ہم امیروں کی [illegible] اللہ کے [illegible] ہوں گے"

[illegible] ایک [illegible] انگریزی اور اردو [illegible] مجھ [illegible] لیتے رہتے [illegible] ان کے [illegible] ہیں اور [illegible] نہیں ملتے۔

[illegible] آدمی تھے [illegible] کا کرتا [illegible] اپنے [illegible] باتیں بھی کرتے شعر بھی کہتے مضمون بھی لکھتے، اصلاح بھی دیتے، مشورے بھی دیتے [illegible] وقت گزار دیتے [illegible] اور دوسروں کو [illegible] کرتے تھے۔

[illegible] سے لے کر [illegible] تک [illegible] ہر بات سے [illegible] حد درجہ سیدھے نہایت اچھے بڑے ہی وفادار دوست تھے۔

حکیم شمس اللہ قادری

حیدرآباد کے سب سے بڑے [illegible] مضمون نگار تھے غالباً حیدرآبادی مضمون نگاروں میں حکیم صاحب پہلے ہیں جو ہندوستان کے اچھے رسالوں میں تحقیقی مضامین لکھتے رہتے ورنہ [illegible] کے لوگ پہلے تو لکھتے پڑھتے ہی [illegible] اور لکھتے پڑھتے بھی تو حیدرآباد سے باہر کے رسالوں میں چھپوانے سے جھجکتے تھے۔

حکیم صاحب کی تحقیق کے قائل بڑے بڑے لوگ تھے چنانچہ شبلی نعمانی وغیرہ ان کو بہت مانتے تھے۔ حکیم صاحب تھے بھی بڑے ہی محنتی اور دماغ دار، ہزاروں کتابیں حافظے میں محفوظ تھیں، حیدرآباد میں حوالے کے لوگ دو تھے۔ ایک تھے عبداللہ خاں جو کتب خانۂ آصفیہ میں رہتے تھے، غالباً مہتمم تھے جو شخص ملتا اس سے کتاب پڑھوا کر سنتے صفحہ پر صفحہ پڑھ جاتے اور سب مضمون حافظے میں محفوظ ہوتا۔ کوئی آکر پوچھتا تو کتاب کا

نام بتا دیتے کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر اس کی تفصیل ہے دیکھ لو۔ شبلی، حالی وغیرہ بھی عبداللہ خاں سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ "تذکرۂ گلشن ہند" (مرزا علی لطف) کو کسی کباڑی کی دکان سے نواب محمد یار جنگ نے خریدا تھا جن سے عبداللہ خاں نے لے کر عبدالحق (بابائے اردو) سے مقدمہ لکھوا کر شائع کیا تھا۔ عبداللہ خاں کے بعد حکیم صاحب ہی کا نمبر تھا مگر عبداللہ خاں اُمّی محض تھے اور حکیم صاحب پڑھے لکھے تھے مگر عمیت حافظے سے کم تھی حافظہ غضب کا تھا۔

نوجوان مضمون نگاروں سے بہت خوش ہوتے اور ان کی رہنمائی کرتے تھے چنانچہ حکیم صاحب نے ہمیشہ مجھ پر عنایت کی ہے۔ بیچ میں ایک شخص کی وجہ سے مجھ سے حکیم صاحب سے ناچاقی ہو گئی تھی مگر مولانا سید خورشید علی صاحب نے مصالحت کرا دی اور پھر وہ ویسے ہی مہربان رہے۔

آثارِ قدیمہ، مسکوکات، دکنیات، کتابیات وغیرہ پر کئی ایک کتابیں چھپوائیں۔ بیشتر تاریخیں ایڈٹ کر کے چھپوائیں، سب سے اہم کتاب "اردوئے قدیم" چھپوائی جو بڑی اہم اور کارآمد ہے۔ مدتوں رسالۂ تاریخ مرتب کرتے رہے۔ اس طرح ملک کی بڑی خدمت کی۔

عبدالحق (بابائے اردو) حکیم جی کے بڑے قدیم دوست تھے۔ آخر آخر میں حکیم صاحب نے عبدالحق کے [illegible] چلنا شروع کر دیا اور وہی فوائد حاصل کئے جو [illegible] تھے۔ بہترین مکان اور موٹر ذاتی ہو گئی تھی۔ ایک بہترین کتب خانہ [illegible] انتقال کیا، حکیم صاحب کے [illegible] اور کئی دوبارہ اچھی طرح چھپا رہے ہیں۔

حکیم صاحب میں برائیاں بھلائیاں دونوں تھیں مگر برائیاں ان کی [illegible] ان کا اثر [illegible] تھا ان کی ذات سے لوگوں کو نقصان کم، فائدہ زیادہ پہنچا ہے اور یہی ان کے لئے [illegible] کافی ہے۔

[illegible] تھا جس سے آپ روشناس [illegible] دور کے بعد کے بزرگ میں سے منتخب کئے ہیں ورنہ [illegible] فہرست [illegible] ہے۔

[illegible] دور کو ملاحظہ فرمائیے اس دور سے بھی چند شخصیتیں [illegible] منتخب کی ہیں۔

نظامت جنگ

حیدرآباد میں ایک خاندان بڑا مشہور، قابل اور دیانت دار گزرا ہے جس کے رکن عماد الدولہ، عماد جنگ اول و دوم، رفعت یار جنگ وغیرہ تھے۔ نواب سر نظامت جنگ بہادر ایم اے ایل ایل بی بیرسٹر ایٹ لا بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ ابتدا سررشتۂ عدالت میں مامور ہوئے پھر صدر المہام سیاسیات، پولیٹیکل ممبر ہو گئے تھے۔ [illegible] کا یہ عالم کہ دوسروں کا پانی بھی نہ پیتے تھے۔ احتیاط کا یہ حال [illegible] رہتے، معمولی [illegible] کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا [illegible] خیر خواہی [illegible]۔

شادی نہیں کی [illegible] چند روز مکانات بنانے کا شوق رہا۔ ہل فورٹ بنوایا [illegible] خوبصورت کر دیا اسی طرح کئی مکانات اور باغات بنوائے۔ نہایت ہی خاموش [illegible] دفتری آدمی [illegible] انگریزی ادب پر [illegible] عبور تھا۔ نظم [illegible] حضور نظام دکن کی اکثر نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا تھا، خود بھی انگریزی میں فکرِ سخن کرتے تھے۔

حیدرآباد نے جہاں عربی، فارسی اور اردو کے شاعر پیدا کئے وہاں انگریزی کے شاعر بھی پیدا کئے ہیں جن میں پہلا نمبر سروجنی نائیڈو کا [illegible]

اور دوسرا سر نظامت جنگ کا۔ انگریزی کے ادیب تھے اور بڑے بڑے انگریز ان کا لوہا مانتے تھے۔ مولانا محمد علی کامریڈ کے لئے ان سے مضامین لکھوایا کرتے تھے۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی عظیم الدین احمد ایک ضلع عثمان آباد پر مددگار تعلقدار ہو کر آئے اتفاق سے ہم لوگ بھی وہیں تھے۔ اس لئے ہم سے بھی مراسم ہو گئے چونکہ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے اس لئے میں بھی ان سے زیادہ ملتا تھا۔ یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح کم گو، کم سخن اور بے غرض بزرگ تھے۔ عثمان آباد سے تبادلہ ہوا تو کروڑگیری (کسٹم) کے مددگار ناظم ہو گئے۔ ان دنوں نواب صاحب نظامت منزل کنگ کوٹھی روڈ پر رہتے تھے اور عظیم الدین صاحب بھی ساتھ رہتے تھے۔ میں اکثر صبح کے وقت ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ورانڈے کے سامنے چبوترے پر آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھتے نظر آتے۔ سامنے کوئی گوالا بھینس کا دودھ دوہتا رہتا اور نواب صاحب اس طرح بیٹھے گویا گوالے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ گوالا دودھ دوہتا ہوا ایک ٹھلوئی (ٹھلیا) بھر کر دودھ روزانہ اپنے گھر لے جاتا تھا کسی عزیز نے دیکھ لیا یہ چوری پکڑی اور نواب صاحب کے سامنے ٹھلوئی پیش کی کہ اس طرح گوالا روزانہ چوری کرتا ہے۔ نواب صاحب نے یہ سن کر بڑے غصے سے فرمایا "یہ تو ہم بارہ سال سے دیکھ رہے ہیں، تم نے کونسی نئی بات معلوم کی"۔ ٹھلوئی گوالے کو دے دی گئی اور معاملہ حسب دستور ہوتا رہا۔

اخبار "نظام گزٹ" ہفتہ وار ہماری ادارت میں اس وقت "گپ" کالم لکھا کرتا تھا۔ نواب صاحب نے شاید کبھی پڑھ لیا اور یہ کالم پسند آ گیا۔ مسلسل پڑھتے رہے اور پھر مجھے یاد فرمایا۔ میں نے دفتر میں ملاقات کی تو بڑی عمدگی سے ملاقات فرمائی اور گپ کے سلسلہ پر داد دی اور مجھے فرصت سے ملنے کے لئے فرمایا۔ ایک روز شام ساڑھے سات بجے وقت تھا ہیں نے بنگلہ پر حاضری دی صبح کا وقت تھا ورانڈے کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے میں نے اطلاع دلوائی تو بلا لیا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، میں فطرتاً کچھ ادائے متکبر ہوں، یہ ادا مجھے پسند نہ آئی۔ بدقسمتی سے وہاں کرسی نہ تھی، ایک اسٹول پر اخبارات رکھے تھے میں نے اخبارات اٹھا کر نیچے ڈال دیئے اور اسٹول پر بیٹھ کر گفتگو شروع کی نواب صاحب کو اس طرح بلا اجازت میرا بیٹھنا یا اخبار کا گرا دینا ناگوار گزرا یا باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی اور دو چار منٹ کے انتظار کے بعد چلا آیا۔ اس کے بعد مجھے کبھی ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میرے ہم زلف مولوی محمد حسن صاحب منصبدار نواب صاحب کے قریبی عزیز ہیں ان کی لڑکی کی شادی میں اچانک سامنا ہو گیا تو صورت دیکھتے ہی نام لے کر مخاطب کیا دیر تک گفتگو کرتے رہے اور شکایت کی کہ آپ ملتے نہیں، میں نے اس دن کا واقعہ دہرایا تو مسکرا کر فرمایا معلوم نہیں کیا بات تھی مجھے یاد نہیں مگر پھر بھی میں نے ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں کی۔

وظیفہ پنشن لینے کے بعد بالکل مذہبی آدمی ہو گئے تھے قرآن کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ایک انجمن "علم و عمل" کے نام سے قائم کی تھی جس کے لئے ایک مکان اور نقد رقم وقف کی ہے۔

مرحوم میں جو صلاحیتیں تھیں وہ ان کی کم گوئی اور بے جا رواداری کی وجہ سے بروئے کار نہ آ سکیں۔ بر سر خدمت رہتے ہوئے نہ مذہبی خدمت انجام دی بلکہ مذہب سے دور دور ہی رہے، وظیفہ کے بعد جو مذہبی خدمت شروع کی تھی وہ ان کے شایان شان نہ تھی معمولی عالم دین سے لوگ بھی یہ کام کر سکتے تھے۔ ان سے جو توقعات تھیں پوری نہ ہو سکیں۔

اپنی جگہ نہایت مخیر اور رواداری آدمی تھے بعض قرابتداروں کی مالی امداد بھی کرتے تھے مگر اپنے خاندان کی خوشحالی اور ترقی کی کبھی کوشش نہیں کی، اتنا بڑا شخص جس کی دنیا مانتی تھی مگر وہ اپنے خاندان والوں کو بھی نہ بنا سکے اس بحالت کو وہ رواداری سمجھتے تھے۔ سماجی حیثیت سے میں تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتا ایک انگریزی شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد ان پر فخر کر سکتا ہے۔ انگریزی نظموں کے چار پانچ مجموعے طبع ہو چکے ہیں جو عام طور پر ملتے ہیں۔

بہادر یار جنگ

حیدر آباد کے ایک مشہور اہلِ سیف (فوجی) خاندان سے تھے، بڑی غیر معمولی شخصیت تھی، بچپن ہی سے تقریر کا شوق تھا۔ مشہور ہے کہ کمسنی میں اپنے والد کے ساتھ نظام کلب گئے تو والد نے اپنے دوستوں سے کہا کہ بہادر خاں تقریر بھی کرتے ہیں چنانچہ لوگوں نے مجبور کیا کہ تقریر کرو تو تقریر شروع کی اور تمہید اس طرح شروع کی کہ آپ لوگ بزرگ اور قابل ہیں مجھ جیسے کم معلومات کا آپ کے آگے تقریر کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے، اس پر ہنسی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضرب المثل الٹی استعمال ہو گئی تھی اس طرح جو کچھ پڑھتے یاد رکھتے اور تقریر میں اس کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔

حیدر آباد والے تقریر کے معاملے میں ہمیشہ پیچھے رہے ہیں تقریری مادہ ان میں ہمیشہ کم رہا ہے، غالباً نواب بہادر یار جنگ حیدر آباد میں پہلے شخص ہیں جنہیں قدرت نے طلاقتِ لسانی سے سرفراز کیا تھا، آدمی بھاری بھرکم سرخ و سفید تھے، تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنی ظاہری شخصیت ہی سے حاضرین کو مرعوب کر لیتے اور پھر جب "گل افشانیٔ گفتار" دکھاتے تو غضب ہی کر دیتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی مگر بہادر یار جنگ نے بعد میں درسی کتابیں بڑی محنت سے پڑھیں اور اچھی قابلیت بہم پہنچا لی تھی، معمولی عربی اور اچھی خاصی فارسی پڑھ لی تھی اردو کا مطالعہ بڑا اچھا تھا، مشاہیرِ ہند جو حیدر آباد آتے تھے، ان سے بہت ملتے اور حصولِ معلومات کی کوشش کرتے رہتے تھے، سیاسیات سے بڑی دلچسپی تھی، شخصی اعتبار سے فلسفی اور عملی آدمی تھے جلد بازی بھی طبیعت میں تھی۔ ابتداً عراق اور ایران کا سفر کر کے آئے تو حیدر آباد میں اپنے مشاہدات بصورتِ تقریر بیان کرنا شروع کیا اس طرح ان کی تقریریں شروع ہو گئیں۔

مغلپورہ کے چند نوجوانوں نے اتحاد المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے روحِ رواں خواجہ بہاؤ الدین تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بہادر یار جنگ غیر معمولی طور پر ابھر رہے ہیں تو اتحاد المسلمین میں کھینچ لیا اور نواب اس طرح اتحاد المسلمین سے ایسے وابستہ ہوئے کہ انجمن ان ہی کا نام ہو گئی اور وہ انجمن میں جذب ہو گئے۔

سیاسی حیثیت سے ملک کا مفاد اور وطن کی محبت ان میں تھی، چونکہ ناتجربہ کار اور کمسن تھے اس لئے غور و خوض کا مادہ کم تھا۔ اگر چند سال اور زندہ رہتے تو غیر معمولی لیڈر ہوتے، تھوڑے عرصے میں نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ قائدِ اعظم انہیں بہت پسند کرتے تھے۔

علم و ادب سے بھی شغف تھا۔ ادبی کتابیں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرتے رہتے اور کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ عین جوانی میں خون کے دباؤ کی وجہ سے اچانک موت واقع ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ناوقت موت ہوئی۔ ع

ایں نہ مصرعست کہ گویند بہ [illegible]

احمد محی الدین

حیدر آباد کے قدیم اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی ایک خاندان سے تھے جن کا ... حیدر آباد ہی میں ولادت، تعلیم و تربیت ہوئی، حیدر آباد سول سروس کے لئے کوشش کی مگر انتخاب نہ ہو سکا۔ بددل ہو کر ملازمت کی کوشش کی مگر گزیٹڈ عہدہ نہ مل سکا تو نان گزیٹڈ خدمت پسند نہ آئی، چند روز نہایت بددل اور بے قرار رہے، ان دنوں معین الدین صاحب بی اے ...

بی ڈی سٹی کالج کی بورڈنگ کے مہتمم تھے جو ان کے عزیز تھے۔ ہر جمعرات کی رات وہاں "یارانِ غافل" جمع ہوتے، بڑی اچھی صحبت رہتی — ذوالفقار علی حقانی بی اے بی ٹی، مولوی سیف اللہ صدیقی، احمد محی الدین، راقم الحروف وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ ان دنوں نواب مسعود جنگ نے حقانی صاحب کو ذرا جھنجھوڑا تھا اور وہ بہت چراغ پا تھے، سیف اللہ اور میں انہیں چھیڑنے کے لئے ہر جمعرات کی رات کو ایک "اکیڈمی" بنا کر کبھی تعلیمی ہفتہ وار اخبار کی اسکیم مرتب ہوتی "معلم" نام تجویز ہوتا، ذیلی عنوانات بنائے جاتے اور ایک مکمل خاکہ ایسا تیار رہتا گویا کل سے اخبار جاری ہی ہوگا۔ کسی جمعرات کی رات روزنامے کا خاکہ بنتا، نام تجویز ہوتا "اثر کے لحاظ سے" "الوقت"، ذیلی عنوانات تجویز ہونے، تمام کام زبانی انجام پاتا، کبھی بک ڈپو اور پبلشنگ ہاؤس کی تجویز ہوتی اس طرح رات دلچسپی سے گذرتی۔ صبح معین الدین صاحب نہاری کا نفیس ناشتہ کرا دیتے اور سب لوگ واپس ہو جاتے، چند روز بڑی دلچسپی رہی اس کے بعد جب معین الدین صاحب نے بورڈنگ چھوڑ دی تو جمعرات پارٹی بھی ختم ہو گئی، میں گلبرگہ چلا گیا اور اسکیمات چونکہ وقتی تھیں اس لئے سب بھول گئے، چونکہ مجھے کلکرک سے ہر ہفتہ حیدرآباد آنے کی عادت تھی اس لئے ایک دفعہ حیدرآباد آیا تو "خداوند" رحیم الرحمٰن نے سیف اللہ کا نام رکھا تھا اور ہم لوگ انہیں خداوند ہی کہتے تھے [illegible] نے اخبار نکالنے کی [illegible] "الوقت" [illegible] سے ملاقات ہوئی تو [illegible] کر چکا ہوں مگر نام [illegible] "الوقت" [illegible] اس وقت [illegible] "رہبرِ دکن" [illegible] ہو سکے اور روز [illegible] "رہبرِ دکن" [illegible] جاری کیا تھا [illegible] کی خدمت کی اور [illegible] خدمت ادا کیا۔ حیدرآباد میں اس وقت دو روزنامے اور نکلتے تھے ایک [illegible] دوسرا "مشیرِ دکن" [illegible] اگلے وقتوں سے [illegible] ایڈیٹر مولوی [illegible] تھے [illegible] صحیفہ [illegible] اخبار [illegible] کسی جانداری [illegible] طبع ہوتی تھی [illegible] سکتی تھی "مشیر" کے پنڈت [illegible] کرتے تھے مولوی [illegible] "مشیر" [illegible] لکھا [illegible] چھاپ سے وہ بے تعلق تھے، ایسے زمانے میں ایک روشن خیال اخبار کی [illegible] سالگرہ نمبر وغیرہ نکلنے لگے، [illegible] نے [illegible] والانسان کی تصویریں [illegible] رہبرِ دکن ہی میں طبع ہوئیں غرض حقیقی بیداری [illegible] ہوتی رہی، کارکن بھی بڑے مخلص ملے، احمد میاں [illegible] کے بھائی یوسف الدین مہتمم تھے، عبداللہ [illegible] پاشمی کنٹرولر تھے اور زیادہ تر وہی اداریہ لکھتے تھے، مترجمین اور دوسرے کارکن بھی بڑے ہی مستعد اور مخلص ملے اور خوب کام ہوتا [illegible] سے اپنے [illegible] سہولتیں مہیا نہیں کی تھیں جتنی احمد میاں نے کیں، اپنے محلے کا کوئی آدمی مر جاتا تو وہ تجہیز و تکفین کے مصارف برداشت کر لیتے [illegible] وظیفہ مقرر کر دیتے، تنخواہیں خواہ [illegible] سے مقرر کرتے [illegible] اور دوسری [illegible] اس سے ان کو [illegible] تھا۔

رہبرِ دکن جاری ہونے کے [illegible] سر محمد اقبال حیدرآباد کے مہمان ہوئے تو [illegible] پاس مقتل ہو گئے [illegible] اقبال [illegible] اس طرح [illegible] [illegible] دیا [illegible] مسرور ہوئے [illegible] اضلاع کا دورہ کیا اور [illegible] فراہم کئے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کے ایک بیٹے سیوبلین ہوئے اور ابتدائی تقرر گزیٹڈ خدمت پر ہوا اور وہ احمد محی الدین حسن [illegible] آباد میں [illegible] صاحب نے گزیٹڈ خدمت نہیں دی تھی، اپنے احباب [illegible] گزیٹڈ خدمتیں دلاتا رہا۔

خوش قسمتی احمد میاں کی ہر بات میں رہی، اولاد اچھی ہوئی، تعلیم و تربیت اچھی دلا سکے، اولاد کو خدمتیں بھی اچھی ملیں، جائداد خاصی چھوڑی جسے ان کی اولاد حفاظت سے رکھ بھی رہی ہے۔ یہ برکت ان کی کنبہ پروری اور نیک دلی کی ہے، اپنے عزیز و اقارب کی انہوں نے کافی مدد کی اپنی آمدنی کا خاصا حصہ ان پر صرف کرتے رہتے۔

مدتوں بلدیہ (میونسپل کارپوریشن) کے رکن (ممبر) رہے، شہری خدمت بھی خوب کی بیشتر کمیٹیوں کے رکن رہتے تھے اور اپنی ذاتی رائے بڑے بے لاگ طریقے سے بیان کر دیتے تھے۔

خاص نمبر نکلنے سے پہلے ترتیب اور مضامین کے متعلق مجھ سے اور تصاویر اور اشتہارات کے متعلق عبدالرزاق صاحب بسمل سے مشورہ کر لیتے اور ایک لائحہ عمل بنا کر اس پر سختی سے کاربند ہو جاتے تھے، ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے لائق فرزندوں نے بڑی عمدگی سے رہبر دکن جاری رکھا۔ پولیس ایکشن کے بعد جب سب پرچے بند کر دیئے گئے تو یہ بھی بند کر دیا گیا۔ انہی کے ایک عزیز نے رہنمائے دکن کے نام سے اجازت لے کر دوبارہ پرچہ جاری کر دیا جو اسی طریقے پر چلایا جا رہا ہے مگر۔ ؏

وہ بات کہ وہ کن کی گئی کہ وہ کن کے ساتھ!

فانی

فانی بدایونی کا کلام مدت سے پڑھ رہا تھا، ان کی تصویریں بھی دیکھی تھیں مگر ان سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک روز سر مغرب مکتبۂ ابراہیمیہ سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک دبلے پتلے، متوسط قد و قامت کے شریف آدمی نے مجھ سے ہوش بلگرامی کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اتفاق سے میں ہوش ہی کے پاس جا رہا تھا۔ ہوش ان دنوں حیدر گوڑہ میں رہتے تھے، میں نے کہا چلئے میں بتا دیتا ہوں وہ ساتھ ہو گئے۔ مجھے سائیکل لے کر اپنے ساتھ پیدل چلتا ہوا دیکھ کر راستے میں انہوں نے ایک دو معذرتی جملے کہے اور پھر خاموش ہوش کے گھر تک پہنچ گئے۔ ہوش اپنے گھر کے دالان ہی میں بیٹھے ہوئے تھے، ہوش سے ان صاحب کی شاید کبھی ملاقات نہ ہو چکی تھی مگر ہوش نے بھی انہیں پہچانا نہیں بالآخر انہیں اپنا تعارف آپ کرانا پڑا کہ میں فانی بدایونی ہوں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ یہ دبلا پتلا کھویا کھویا سا شخص فانی ہے۔ ہوش نے بہت مجبور کیا کہ ان کے مہمان ہو جائیں مگر فانی نے انکار ہی کیا اور نظامیہ ہوٹل کے قیام ہی سے خوش رہے، یہ تھی پہلی ملاقات فانی سے، اس کے بعد مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، مہاراجہ بہادر کے پاس، ہوش کے پاس، جوش کے پاس، نظامیہ میں! چند روز رہ کر فانی چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو نامپلی اسٹیشن کے پاس "صلح سرائے" میں قیام کیا اور پھر ملا پلی میں اس مکان میں منتقل ہو گئے جو آتش بلدہ کا مکان تھا اور مہاراجہ بہادر نے ان کے لئے محفوظ کرا یا تھا۔ یہ قیام مستقل تھا، پھر تو ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔

اردو شعراء میں سب سے زیادہ نکما شاعر میر تھا جس نے سوا شاعری کے کچھ نہیں کیا اور اگر شاعری کے علاوہ کچھ کیا تو فاقہ! شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری محتاج ہوتی ہے نفسیات کی اور غیر نفسیات داں شاعر، شاعر نہیں کہلا سکتا۔ میر کے بعد کوئی غیر نفسیات داں شاعر اگر پیدا ہوا تو وہ فانی ہی تھا۔ فانی کو نفسیات سے چڑ تھی، وہ نفسیات کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتے تھے، انہیں دنیا اور دنیوی مخلوق سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ قنوطی تھے اور ایسے قنوطی کہ دنیا ان کی نظروں میں تاریک تھی، مجسم محرم، مجسم حزن و ملال، رونا ان کا روزمرہ تھا، صورت بھی بسورتی ہوئی پائی تھی۔

مجھے راشد الخیری سے بعض تھا، اس لئے کہ وہ مجسم بیوگی اور رونے پیٹنے کے حامی تھے، فانی سے میری دوستی ہو گئی، وہ مجھے بھی اس قابل کہ ان سے دوستی کی جائے، نہایت شریف، بڑے ہی مخلص اور پکے وفادار دوست، مگر دوستوں کو بھی دعوتِ گریہ دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دنیا ان کے ساتھ روتی رہے، حالی ہی سب ریڈیو پر گایا گیا تھا

محبت میں سارا جہاں رو رہا ہے ۔۔۔ زمیں رو رہی آسماں رو رہا ہے

بالکل یہی حال فانی کا تھا۔

میں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ وکالت کریں مگر تیار نہ ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر بنائے گئے تو بھی کھوئے ہی رہے، وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ میں بجائے تعلیم کے ماتم ہوتا رہے، لڑکے سینہ کوبی کریں، مدرسہ میں چیخ پکار مچی رہے اور سب مل کر روتے جائیں اور سے

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

کا سماں رہے۔

اور کوئی شخص ہوتا تو دنیا بنا لیتا، حیدرآباد پر چھا جاتا مگر فانی فلسفے کرتے رہے، مہاراجہ بہادر سرپرست، نظر جاہ بہادر مربی، پورا حیدرآباد مانوس، سارے عہدہ دار ہمدرد، علمی طبقہ سر پر بٹھاتا تھا اور حیدرآباد کے عوام تمام مانوس ہو گئے تھے۔

داغ حیدرآباد آئے تھے تو ان کو مدار المہام کی سرپرستی نصیب تھی نہ کسی شہزادے کی قربت، دو ایک شاہی مصاحبوں سے ملاقات تھی مگر داغ نے ایک ایک کرکے سبھوں کو ہموار کیا، عوام کو مسخر کیا، عہدہ داروں کو مسخر کیا اور دلّی سے فلک ناز پہنچ کر رہے، داغ ہی تو تھے جو بہت [illegible] ان کی نہ تھی فانی کی طرح انہیں سرپرستیاں نصیب تھیں مگر داغ استاد السلطان بنے اور فانی فنا ہو گئے۔

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہمیں!
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

کہہ کر حیدرآبادیوں کو خفا کر بیٹھا، حیدرآباد والے اپنے وطن کو دکن کہتے ہیں اور عرف عام میں شمالی ہند کو ہندوستان، چنانچہ داغ کے زمانے میں لوگ ایسا ہی کہتے تھے، داغ نے بھی ایسا ہی کہنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ جب وہ اہل دکن کو خط لکھتے تو [illegible] ہندوستان [illegible] بڑے درد سے [illegible] لکھتے تھے، داغ اس نکتہ سے واقف تھے [illegible] چنانچہ انہوں نے حیدرآباد میں حیدرآبادیوں [illegible] گزاری اور اسی لئے کامیاب بھی ہوئے مگر فانی [illegible] ناواقف اور [illegible] بیشتر ان کی عزت میں اضافہ [illegible] اور نہ حیدرآبادیوں کے حالات بدل سکا، البتہ فانی سے لوگ بددل ہو گئے اور [illegible] حیدرآباد [illegible] سے نفرت کرنے لگا، بہرحال فانی نے بڑی زندگی گزاری آخر زمانے میں ان کے حالات بہت بدتر ہو گئے تھے [illegible] کے قریب ہی تھا، بیچارہ اوس سے بہت ملتا اور ان کی حالت پر روتا تھا، ہم لوگ رو کر بیا کر سکتے تھے، دو روتے بھی [illegible]

تنہا [illegible] کے [illegible]

مجھے فانی سے محبت تھی، ان کے لئے اکثر روتا ہوں [illegible] تو غالب، داغ، اکبر، اقبال بنانے، مگر فانی نہ بنانے [illegible]

فصاحت جنگ

حافظ [illegible] جلیل مانک پوری المخاطب بہ نواب فصاحت جنگ [illegible] امیر مینائی [illegible] امیر مینائی کے [illegible] امیر [illegible] انہوں نے [illegible]

ٹھہرے تھے امیر کو باریاب کرایا تھا اور حضور نے انہیں حیدرآباد آنے کا حکم دیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل اور داغ کے تقاضے پر امیر معہ اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے حیدرآباد آئے مگر ایسے آئے گویا مرنے کے لئے آئے تھے۔ آتے ہی بیمار ہوئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے لوگ تو واپس ہو گئے مگر جلیل اور اختر مینائی (اختر یار جنگ، فرزند امیر مینائی) حیدرآباد ہی میں رہ گئے، ابتداً داغ نے ان دونوں کی مدد کی پھر مہاراجہ کشن پرشاد نے دونوں کو ملازم رکھ لیا۔ داغ کا انتقال ہوا تو مہاراجہ نے جلیل کو پیش کیا اور حضور غفران مکان کی استادی کا شرف حاصل ہوا، حضور غفران مکان کے بعد حضور بندگان عالی نے بھی اپنی استادی سے سرفراز فرمایا اور پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور پانچ سو روپیہ سالانہ بھی منظور ہوا، آخر میں حضور نے مکان بھی دلوا دیا تھا جو اب "جلیل منزل" کے نام سے موسوم ہے۔

جلیل صاحب نہایت متقی پرہیزگار، پابند اور نیک دل بزرگ تھے۔ والد مرحوم چونکہ داغ کے شاگرد تھے اور جلیل داغ کے پاس زیادہ آمد و رفت رکھتے تھے اس لئے والد سے بھی مراسم ہو گئے تھے پھر مہاراجہ کی ڈیوڑھی سے متعلق ہونے تو تسکین کے ساتھ رہنے لگا اور تسکین والد کے بڑے گہرے دوست اور رشتہ کی کے استاد بھی تھے اس لئے مکان پر بھی آمد و رفت رہتی تھی اور میں بچپن سے جلیل سے واقف تھا۔ حضور نے جلیل القدر لقب سے سرفراز فرمایا تھا جس کی نسبت میں جلیل نے ایک مرصّع قصیدہ پیش کیا تھا جس کا ایک شعر تھا:

جلیل القدر کر دیکھو جلیل زار کو دیکھو
لقب جو شاہ سے ملتا ہے جیرجا ہو ہی جاتا ہے

جب بھی جلیل تشریف لاتے ہیں یہ شعر گنگنانے لگتا جسے سن کر جلیل بھی خوش ہوتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں والد گلبرگہ چلے گئے اور ایسے گئے کہ آخر تک اضلاع ہی میں رہے۔ والدہ مرحومہ کی زندگی تک میں کبھی حیدرآباد اور کبھی گلبرگہ یا رائچور میں رہتا تھا مگر والدہ کے انتقال کے بعد سے میں بھی حیدرآباد میں مسافرانہ آیا کرتا تھا اور "سفر در وطن" کا لطف اٹھاتا تھا، ۱۹۲۶ء تک یہی حال رہا۔ اس اثنا میں مجھے جلیل سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں مستقل طور پر حیدرآباد آ گیا تو یہی سوچتا رہا کہ کسی دن ملوں گا مگر مل نہ سکا، ایک دفعہ میں نے کسی مضمون میں یہ لکھا تھا کہ پوری غزل کسی استاد کی بھی مرصّع اور منتخب نہیں ہوتی [illegible] دیوان میں سے [illegible] لوگوں نے [illegible] شعر چنے ہیں، آج جلیل استاد ہیں مگر باوجود اس استادی اور کہنہ مشقی کے ان کی غزل میں [illegible] شعر ہی اچھے [illegible] ورنہ بقیہ شعر بھرتی کے ہوتے ہیں۔ جلیل کے ایک شاگرد [illegible] علی [illegible] بیچارے واجبی پڑھے لکھے [illegible] غصہ آیا کہ استاد جلیل کی یہ توہین و تذلیل کی گئی ہے چنانچہ جلیل کو سنایا کہ یہاں ایک بدلگام [illegible] ہے لکھ دیا ہے چنانچہ اس نے حضرت کے متعلق یہ لکھا ہے۔ جلیل جیسے ہی سمجھدار [illegible] چنانچہ [illegible] پیش کیا تو جلیل نے پڑھا اور کہا [illegible] لکھا ہے کہ میری غزل میں ایک دو شعر اچھے ہوتے ہیں [illegible] مقصود [illegible] پھر میرے متعلق پوچھا کہ کون ہے کہاں [illegible] رہنے والا ہے [illegible] تک بتایا تو کہا انہیں کسی دن لے آئیے کہنہ میں [illegible] چنانچہ [illegible] تھا میں ملا تو غور سے دیکھنے لگے میں نے عرض کیا آپ نے [illegible] مگر [illegible] کہاں دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا آپ کسی تخلص سے واقف ہیں، یہ سنتے ہی [illegible] قدر [illegible] ہوا مگر تخلص کا جھنپ آنا کا [illegible] میں اخیر کے [illegible] میں جا رہا اور ان کی جلیل منزل کے [illegible] رہا تھا اکثر [illegible]

بڑے وضع دار اور مخلص بزرگ تھے، اوقات اتنے معمور کہ ولی نظر آتے تھے۔ جاڑا ہو یا گرمی تہجد برابر پڑھتے تہجد کے بعد ذکر و شغل میں مصروف ہو جاتے تھے اور پھر فجر پڑھ کر ذرا لیٹ جاتے۔ نمازیں با جماعت ہوتیں، گھر ہی پر جماعت ہوتی تھی، مہمان نواز تھے، آئے دن دو تین مہمان رہتے تھے، خوش نصیب ایسے کہ بیٹے، نواسے، پوتے، پڑپوتے سبھی تھے اور سب خوشحال تھے اور اب بھی ہیں۔

کسی کی برائی سنتے اور نہ خود برائی کرتے، چاہے کوئی ہو غزل سناتا تو سن لیتے اصلاح چاہتا تو اصلاح دیتے ورنہ داد دیتے۔ امیر مینائی کا بڑا احترام کرتے تھے اور اختر مینائی سے بے انتہا انس تھا ایک لطیفہ سنئے تنخواہ آتی تو تنخواہ کی پوری تھیلی اختر میاں کے پاس بھیج دیتے۔ وہ اس تھیلی کو رکھ لیتے اور پھر مٹھائی منگوا کر تنخواہ کی تھیلی مٹھائی کی چنگیر کے ساتھ واپس بھجواتے تو مٹھائی سب میں تقسیم ہوتی اور تنخواہ کی تھیلی کھولتے آخر تک یہ معمول رہا۔

پوتوں نے ریڈیو خریدا اور گھر میں لگا دیا تو بہت خفا ہوئے حکم ہوا پھینک دو۔ بچوں نے اختر میاں سے کہا، انہوں نے آکر پوچھا حافظ صاحب ریڈیو کہاں ہے، کبھی سنیں، تو کچھ اظہار ناراضگی کیا مگر اختر میاں نے کہا کیا مضائقہ ہے اچھی چیز ہے تو خاموش ہو رہے اور خبریں سنیں پھر اکثر سن لیتے تھے۔ ایسا خلوص اور اتنی محبت بہت کم دیکھنے میں آئی دونوں (جلیل و اختر) ایک دوسرے کے عاشق تھے، ان بڈھوں کی محبت جوانوں کے لئے سنگ میل تھی۔

حیدر آباد میں ہزاروں شاگرد ہیں اور حیدر آباد سے باہر بھی ہزاروں ہیں، دو تین دیوان اور کئی ایک تصانیف طبع ہو چکی ہیں۔ آخری دیوان "روح سخن" اب تک نہیں چھپا واقعہ یہ ہے کہ یہ دیوان "روح سخن" ہی ہے۔

جلیل کے بیٹوں اور شاگردوں نے ایک بزم جلیل قائم کی ہے مشاعرے کرتے رہتے ہیں۔ کاش مشاعروں پر روپیہ ضائع کرنے کی بجائے دیوان چھپوا دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جلیل بہترین غزل گو تھے، لکھنؤ اسکول میں اتنا اچھا غزل گو کوئی پیدا نہیں ہوا۔

صفی اورنگ آبادی

بہبود علی صفی اورنگ آبادی، اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں باپ کے ساتھ حیدر آباد آگئے اور یہیں مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ باپ نیابت پیشہ تھے صفی خوش نویس تھے۔ باپ کی زندگی تک نوکری نہیں کی پھر مہاراجہ بہادر کے پاس خوش نویسوں میں ملازم ہو گئے۔ مگر جب مہاراجہ کو یہ معلوم ہوا کہ ان کا دیوان صاف کرنے والا خوش نویس بھی شاعر ہے اور صفی تخلص کرتا ہے تو نوکری چھوڑ دی، حیدر آباد کے مشہور امیر نواب معین الدولہ بہادر نے مدتوں اپنی مصاحبت میں رکھا، پھر نواب تراب یار جنگ سعید نے بھی سرپرستی کی، آخر میں خود انہوں نے اپنے شاگردوں سے ماہوار رقم مقرر کر لی تھی اور اسی پر گزر بسر کرتے تھے۔

ابتداً مولوی ظہور علی کو استاد بنایا پھر ظہیر دہلوی کی شاگردی کی اس کے بعد داغ حیدر آبادی سے مشورہ کرتے رہے۔ آخر میں کیفی حیدر آبادی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ علمی لیاقت اچھی تھی، عروض اور قافیہ کی تعلیم باضابطہ پائی تھی۔ یوں تو اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے مگر غزل پر زیادہ مائل تھے اور خوب کہتے تھے۔ چھوٹی بحریں زیادہ کہتے تھے۔

حیدر آباد میں عوامی شاعر ایک ہی پیدا ہوا وہ صفی تھا۔ ان کی غزل کا یہ حال تھا کہ ادھر غزل ہوئی اور ادھر مشہور ہو گئی۔ پھر بچے بچے سے سن لیجئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے گا گا کر گاتے پھرتے تھے۔

جب کبھی تیری دید ہوتی ہے　　اپنی اُس روز عید ہوتی ہے
جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے　　اس سے بڑھیا مرید ہوتی ہے
اچھے اُن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ　　سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

شفق کی یہ روش عوام ہی میں ہوتی تھی اور وہ زیادہ تر عوام ہی سے ربط رکھتے تھے اور انہی کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتے رہتے تھے، اسی وجہ سے عوام ان کے کلام سے خوش بھی تھے۔

اپنے استاد کیفی کی طرح مرنجاں مرنج، سیدھے سادے، سادہ دل آدمی تھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ کسی بات کے پابند نہ تھے جو مل گیا پہن لیا، جو مل گیا کھا لیا اسی طرح جو مل جائے "پی" بھی لیتے تھے، ولایتی دیسی کی تخصیص نہ تھی مگر آخر عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ مرنے سے پہلے بڑے پابند نمازی ہو گئے تھے۔

فانی کی رحلت [illegible] آدمی تھے، ایک ضخیم دیوان موجود ہے مگر شاگردانِ شفق کہاں سے دیوان چھپوانے کے مشاعرے کئے جا رہے ہیں۔

علی منظور

سادات [illegible] سے تھے، نہایت [illegible] غریب، بہت ہی شریف اور بے انتہا نیک آدمی تھے، ہر ایک سے محبت سے ملتے بڑے ہی خلوص سے بات چیت کرتے [illegible] اللہ تعالیٰ خوش رکھے [illegible] ایک سال سے مراسم [illegible] ان کے گھر جانا [illegible] جب بھی [illegible] محبت سے ملتے اور بعض ایسے احباب [illegible] مثلاً [illegible] علی [illegible] وغیرہ [illegible] شاعر تھے اور خوب کہتے تھے۔ نظم، غزل، نعت سبھی کہتے تھے جو بھی کہتے [illegible] کہتے اور [illegible] مشہور [illegible] نعت کا ایک مختصر دیوان [illegible] ان کے ایک [illegible] کے نام سے چھپوا لیا [illegible] واقعہ یہ ہے۔

[illegible] مجموعے طبع ہو چکے [illegible] انتقال ہوا [illegible] کلام انتخاب کر رہے ہیں کوئی [illegible] کرے تو [illegible] طبع ہو جائے گا۔

ہوش بلگرامی

کیفی حیدرآبادی کے ایک شاگرد تھے۔ راجہ [illegible] جو [illegible] کی وجہ سے [illegible] ہوش [illegible] اس طرح [illegible] وقت کی بات ہے جب [illegible] اور [illegible] تھے۔

[illegible] میں ہوش [illegible] ہوئے اور یہ ملاقاتیں [illegible] ہوش کو [illegible] لگی تھیں اور ایسے تجربے ہوئے [illegible]

ہو رکھے تھے۔ علمی خدمت ادبی ذوق [illegible] صاحب باقی [illegible] بہت کام آئی۔ یہ دور مہاراجہ کشن پرشاد کی مصاحبت سے شروع ہوا۔ مہاراجہ نے [illegible] اپنی ذاتی سرپرستی میں رکھا پھر نظامت [illegible] سیونگ بنک [illegible] انسپکٹر بنا دیا اور جوش دفتر میں کام کرنے لگے ۔

ان دنوں [illegible] نظام [illegible] ولی عہد پرنس [illegible] واپس حیدر آباد میں بڑا جشن چراغاں ہوا اسی ہنگامے میں جوش بارگاہ سلطانی میں بھی باریاب ہونے لگے۔ [illegible] روز بروز بڑھتا گیا مہاراجہ بہادر نے معتمدی فوج (ملٹری سیکرٹری) کی مددگاری بھی دلوا دی اور اب جوش [illegible] اور مصاحبت [illegible] سے سرفراز ہو گئے [illegible] علمی ادبی مشاغل بھی شروع ہو گئے ایرانہ ٹھاٹھ پیدا ہو گیا اور دعوتیں بھی شروع ہوئیں [illegible] دربار [illegible] میں رہ کر زبان [illegible] کھانے کا شوق تھا ہی اسی کو وسیلہ کا سامان بھی بنا لیا اور لوگوں کو کھلانے بھی لگے۔ بڑی پر تکلف دعوتیں ہونے لگیں اس طرح ماحول کو ساز گار بنا لیا ۔ سارے عہدہ داروں سے بے تکلف مراسم ہو گئے اور جوش [illegible] WIN [illegible] جانے لگے ۔

مددگاری سے ترقی کر کے نائب [illegible] ہو گئے [illegible] کی نظامت کی اور اس میں اتنا فائدہ ہوا کہ [illegible] اور دعوتیں اور [illegible] جوش [illegible] نواب [illegible] دکن سے برابری [illegible] مہاراجہ بہادر [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

معتمد فوج بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش سے یہ سن کر کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے میں نے ان مشاہدات کے متعلق گفتگو ہی نہیں کی مگر خود انہوں نے ذکر چھیڑ دیا اور ہیں سے نزاکتِ حال کی وضاحت کی اور صورت حال بھی واضح کر دی۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کرنل نذیر الاسلام بھی آ گئے اور انہوں نے بھی شدید مخالفت کتاب کی اشاعت کی کی۔ بڑی ردوکد کے بعد جوش اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ بقیہ جلدیں ضبط کر دیں چنانچہ نذیر الاسلام کو انہوں نے اجازت دی کہ فریق ثانی سے بات چیت کر کے کتاب کی سب جلدیں ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔ اس تصفیہ کے بعد جوش نے بڑی گرمجوشی اور خوشی سے مجھے رخصت کیا اور میں ۱۹ نومبر کو ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

۱۹ نومبر ۵۵ء کو صبح صبح ایک خط کا رکا اور جوش ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو گئے۔

جوش سے ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے پاس جوش سنبھالا تھا، نواب عماد الملک کے پاس رہ چکے تھے، نہایت ذہین، طباع، ذکی اور تیز تھے، فارسی عربی بقدر ضرورت جانتے تھے، مطالعہ نہایت اچھا تھا، صحبت یافتہ تھے، علم مجلسی کے ماہر تھے، طبیعت میں اپج تھی، لکھتے خوب تھے، مضامین بہت لکھے تھے، ایک مجموعہ عروس ادب کے نام سے طبع ہو چکا تھا بقیہ مضامین چھپوانے کی فکر میں تھے۔ ابتدائی دور میں ایک چھوٹی سی کتاب [illegible] بھی شائع کی تھی، مذہب کے بارے میں اتنے وسیع المشرب تھے کہ لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے [illegible] [illegible] ایک طویل مثنوی بھی چھپوائی تھی۔

[illegible] کے بعد [illegible] مرنے سے پہلے بھی [illegible] آباد چھپوا [illegible]

[illegible]

[illegible] دیکھا تھا وہ ان کے [illegible] [illegible] مجھے بھلائیاں [illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible] نے انتخاب [illegible]

[illegible] کی۔

[illegible] کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے [illegible] میں [illegible] عصر حیات کے [illegible] بڑی طویل ہے، چونکہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے اس لئے میں نے اس فہرست کو مختصر سے مختصر بنا لیا ہے۔

[illegible]

زین یار جنگ

مولوی زین الدین انجینئر المخاطب بہ نواب زین یار جنگ جنہیں حال ہی میں بھارت سرکار نے 'پدما بھوشن' کے اعزاز سے نوازا ہے حیدرآباد کے ان بزرگوں میں سے ہیں جو عاقبت بین اور معتدل ہیں، ہر دور میں آپ نے بڑی سلامت روی دکھائی۔ آپ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مترجم تمدن عرب و تمدن ہند کے داماد ہیں۔ یورپ سے انجینئرنگ کی ڈگری لی اور حیدرآباد آکر مختلف خدمات پر فائز رہے، شروع سے آپ کا تعلق کنگ کوٹھی سے نہایت ہی قریبی رہا۔ حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کے وزارتی دور سے پہلے آپ صدر المہام (وزیر) تعمیرات تھے اس کے بعد جو بحرانی کیفیت رہی تو آپ نے حکومت ہند اور حضور نظام کے درمیان میں رہ کر بڑی کوشش کی کہ حالات سازگار ہو جائیں، پولیس ایکشن کے بعد جدید وزارت بنی تو اس میں بھی آپ کو وزارت پر لیا گیا۔ عہدہ سررشتہ تعمیرات آپ ہی کے ذمہ رہا اور جب تک عام انتخابات ہو کر جدید کابینہ نہ بنی آپ وزارت پر فائز رہے۔ انتخاب میں آپ کے فرزند ارجمند سعادت علی خاں صاحب نے کامیابی حاصل کی اور منتخب ہو کر مدتوں کام کرتے رہے پھر سیکرٹری بنا لئے گئے۔

حضور نظام نے جو ٹرسٹ بنائے ہیں ان میں آپ ٹرسٹی اور چیئرمین کی حیثیت سے شریک ہیں، آپ کی غیر جانبدارانہ پالیسی اور اعتدال پسندی ہمیشہ کامیاب رہی ہے اور اسی وجہ سے آپ ہر وقت ہر طبقے میں مقبول رہے، آپ کی فنی معلومات کا یہ حال ہے کہ دنیا کے بہترین آرکیٹکٹ مانے جاتے ہیں، آپ نے تین دفعہ دنیا کا دورہ کیا ہے۔ پہلا دورہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر کے سلسلہ میں ہوا دوسرا اس کے بعد اور تیسرا دورہ گزشتہ سال حکومت ہند کی طرف سے قومی تھیٹر کے نقشے کے سلسلہ میں ہوا ہے۔ عہد عثمانی کی بہترین عمارتیں عثمانیہ یونیورسٹی، کتب خانہ آصفیہ وغیرہ آپ ہی کے نقشے پر بنے ہیں، قائد اعظم کے مقبرے کا نقشہ بھی آپ ہی نے بنایا ہے جو اپنی جگہ نہایت نفیس نقشہ ہے۔

بحیثیت انسان آپ جیسے صاحب کردار اور بڑی خاص شخصیت کے مالک ہیں، علم و ادب سے بھی بہت لگاؤ ہے، سماجی کاموں سے بھی دلچسپی رہی ہے، تمام بڑی بڑی کمپنیوں اور تعلیمی اداروں سے منسلک ہیں۔ مدرسہ انوار العلوم کو آپ ہی نے کالج بنایا اور اپنی پوری توانائیاں اس پر صرف کیں۔ [illegible] اور ادب پر [illegible] ذوق آپ کو شروع سے ہے اور ہر قسم کی خدمت کئے جاتے ہیں۔

عمر ستر سال کی ہے مگر آپ میں نوجوانوں کی سی پھرتی اور جوانوں کی سی ہمت ہے۔ کام سے تھکتے نہیں دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ سرکاری کاموں اور ذاتی کاموں میں [illegible] مصروف رہتے ہیں، عملی زندگی آپ کی قابل رشک ہے، بچپن سے میں آپ کی فطرت کا مطالعہ کرتا رہا ہوں ہمیشہ ایک ہی طرز اور ایک ہی رنگ میں دیکھا ہے، آپ کی وضع شروع سے جیسی تھی ویسی ہی اب تک ہے، خلق و ملنساری بے حد ہے، شفقت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

سیّد خورشید علی

[illegible] میں جب [illegible] طغیانی ہوئی اور سیلاب کا زور ہوا تو والد مرحوم اپنی ایک بہن کے گھر کا حال دیکھنے کے لئے جانے لگے اور میں بھی [illegible] بہت [illegible] جگہ جگہ [illegible] سید خورشید علی صاحب بھی تھے جو [illegible] سفید [illegible] والد نے بتایا کہ یہ خورشید علی ہیں اور بڑے پرجوش نوجوان ہیں۔ اس کے بعد [illegible] جب میں نے گلبرگہ [illegible] حیدرآباد کی سکونت اختیار کی تو [illegible] حیثیت [illegible] ایک سال [illegible] انکار کر دیا اور [illegible] پوسٹ اور

امداد باہمی (رکوا پریٹو) میں جگہ سردار نواز جنگ اور رباسط جنگ نے مجھے منتقل کرنا چاہا تو میں نے پسند نہیں کیا۔ نصر اللہ خان کی شکایت جب میں نے فخر یار جنگ معتمد فینانس سے کی تو انہوں نے بکمال عنایت و نوازش مجھے ایک تعارفی چٹھی دے کر مولوی سید خورشید علی صاحب کے پاس بھجوادیا۔ جب میں نے اس چٹھی کے ذریعے ملاقات کی تو موصوف نے بڑی یگانگت اور شفقت سے مجھے اپنے دفتر میں منتقل کرنا قبول فرمالیا مگر مشکل یہ تھی کہ دفتر دیوانی مال و ملکی میں جائدادیں (اسامیاں) خالی نہ تھیں اور کلکٹر کرمالے میری مزید رخصت منظور نہیں کر رہے تھے اس لئے میں نے کلرکی کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر دفتر دیوانی میں کام کرنا شروع کر دیا اور مولوی صاحب نے چند ہی روز کے بعد میرا تقرر کر دیا۔

دفتر دیوانی بالکل اسنادی اور تاریخی دفتر تھا۔ مولانا نے اسے بڑی عمدگی سے منظم کیا تھا۔ منتخب لوگوں کو جگہ دی تھی اور سب کو بڑی ہی عمدگی سے تیار کیا تھا۔ اس دفتر کی تنظیم کے علاوہ ایک اخلاقی ترتیب بھی ایسی قائم کی تھی کہ دفتر کے لوگ اس طرح رہتے تھے گویا ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ دفتر دیوانی میں ایک ہی خاندان ہے جس کے سرپرست مولانا خورشید علی ہیں۔

مولانا کی شخصیت بڑی ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ حیدرآباد کے قدیم اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی پھر نظام کالج میں بھی آپ نے تعلیم پائی اور نوجوانی ہی میں علم و ادب، ملک اور سماج کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ ابتداً فینانس میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور پھر جلد ہی ترقی کر کے مددگار معتمد اور پھر ناظم دفتر دیوانی و مال ہو گئے۔ اتفاقاً آپ کو سر گلانسی اور سر اکبر حیدری جیسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا اور ان عہدہ داروں نے آپ کی حقیقی قدر افزائی کی، نوجوانی ہی سے آپ تحریر و تقریر میں خاصے مشہور ہو گئے تھے "ادیب"، "افادہ"، "زہرہ"، "خاتون" وغیرہ رسائل اور متعدد جرائد میں آپ کے مضامین بہت چھپا کرتے تھے۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں آپ کو کمال تھا، گوکھلے پر سب سے پہلے اردو میں آپ نے ہی ایک مختصر سی کتاب شائع کی تھی اور اردو داں طبقے کو سروجنی نائیڈو کی شاعری سے آپ ہی نے روشناس کرایا تھا۔

بیت المعذورین، نظام کلب، والنٹیر کور، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے مدتوں سیکرٹری رہے۔ آپ نے عہدِ عثمانی کی تعلیمی، علمی ادبی ترقیوں پر ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری، رائے جانکی پرشاد سے مختلف کتابیں لکھوا کر چھپوائیں اور ایک شاہ پرست کی طرح ہمیشہ فدائی رہے۔

پندرہ سال سے زیادہ ہوا کہ آپ نے ریٹائر ہو کر اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر دی ہے، دکن کی کئی تاریخیں آپ نے ایڈٹ کیں چنانچہ "تاریخ راحت افزا" چھپوا بھی دی ہے اور مآثر نظامی وغیرہ مرتب شدہ رکھی ہیں۔ اب بھی آپ علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور کچھ نہ کچھ کئے ہی جاتے ہیں۔ تاریخ خصوصاً تاریخ دکن پر آپ کی نظر بڑی وسیع ہے اور ادب پر بھی انشا پردازانہ عبور رہے۔ اردو بڑی لطیف اور پیاری لکھتے ہیں۔

مجھ پر دفتر دیوانی میں جانے کے بعد سے بزرگانہ عنایت و شفقت فرماتے ہیں اور میں اپنے بزرگ کی طرح احترام کرتا ہوں۔ بدنصیبی سے میرے خاندان میں میرا کوئی بزرگ باقی نہیں رہا ہے مگر مولانا کی ذات کو میں اپنا بزرگ سمجھ کر مطمئن اور مسرور رہتا ہوں شروع سے مجھ پر جو عنایت و نوازش ہے وہ اب تک مسلسل جاری ہے۔ نہ صرف میری خانگی زندگی بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی مولانا امداد و اعانت فرماتے رہتے ہیں اور اپنے زریں مشوروں سے مجھے نوازتے رہتے ہیں۔

نہایت خاموش کارکن اور مخیر بزرگ ہیں۔ سینکڑوں زندگیاں آپ نے بنا دیں مگر "گیت خاندان" پر ہمیشہ عامل رہے یعنی جن لوگوں کی مالی امداد کی اس طرح کی کہ دوسروں کو خبر تک نہ ہونے پائی۔ بیشتر ایسی ہستیاں آج نام و نمود حاصل کر چکی ہیں جو مولانا کی امداد پر تعلیم و تربیت پاتی رہیں اور مولانا ہی نے ان کی زندگی سنواری، صرف یہی ایک صفت ایسی ہے جو انہیں ممتاز بناتی ہے۔

میں نے اپنی عمر میں دو ایسے سخی دیکھے ہیں جو دے کر شرماتے تھے کہ میں نے کم دیا۔ ایک مہاراجہ بہادر دوسرے مولانا خورشید علی۔ ان دونوں کا یہی طریقہ تھا کہ اپنی حیثیت سے زیادہ دینے اور پھر شرماتے کہ کم دیا ہے۔

زود رنج، مغرور المزاج اور ذرا ضدی طبیعت کے بزرگ ہیں۔ غصہ آتا ہے مگر جلد فرو ہو جاتا ہے خفا جلد ہوتے اور معاف بھی جلد کر دیتے

اور پھر صاف بھی ہو جاتے ہیں۔ البتہ جن باتوں پر اڑ جاتے ہیں ان سے دنیا کی کوئی قوت بھی ہٹا نہیں سکتی۔ وظیفہ لینے کے بعد سے خانہ نشین ہیں پائیگاہ صرفخاص وغیرہ کہیں بھی دوبارہ ملازمت نہیں کی۔ بعض جگہ سے پیشکش ہوئی بھی تو ٹھکرا دیا، نہایت قانع، مسرور اور مطمئن بزرگ ہیں اپنے قدیم ملنے والوں سے یگانگت خلوص اور ہمدردی رکھتے ہیں اور بڑی عمدہ زندگی گزار رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن خاں

پہلے پروفیسر رہے پھر پرنسپل ہوئے اور پھر "شیخ الجامعہ عثمانیہ" ہوئے۔ بڑے قابل اور خاموش بزرگ ہیں، قدیم ملکی خاندان سے ہیں، لندن سے ڈگری لاکر نظام کالج میں صدر شعبۂ سائنس ہوئے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے پرنسپل بنے، نواب سعادت جنگ مرحوم صوبہ دار و صدر المہام صرفخاص کی صاحبزادی سے شادی کی، خان صاحب کے سسرال سے برسوں سے قدیم مراسم تھے اور ان کے چھوٹے سالے رشید اللہ خاں سے دوستی تھی اس لئے خان صاحب سے بھی شادی کے بعد سے مراسم ہو گئے۔ بڑے ہی شریف، نیک اور علمی بزرگ ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اولین سند یافتہ طلباء کو ویژن اسکالرشپ دلوا کر لندن وغیرہ بھجوایا۔ ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر سیادت علی خان، ڈاکٹر ولی الدین، ڈاکٹر زور وغیرہ آپ ہی کے زمانے کے فارغ التحصیل آپ ہی کے یورپ بھجوائے ہوئے ہیں سینکڑوں طلباء کی سرپرستی کر کے تعلیم دلوائی اور پھر ملازمت بھی دلوائی، بیشتر غریب طالب علم آپ کی وجہ سے آج خوش حال، فارغ البال اور مشہور و معروف ہیں۔

فلکیات سے آپ کو ذاتی شغف ہے اور اسی فن پر آپ اب تک کام کئے جا رہے ہیں باوجود وظیفہ لے لینے کے اب بھی آپ کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی ہیں اور ستاروں کے پھیر میں پھنسے ہوئے ہیں، نئی نئی دریافتیں کرتے ہیں، مضامین چھپواتے ہیں، لکچر دیتے ہیں، ہندوستان میں آپ واحد ماہر فلکیات ہیں جو اس فن کے کامل سمجھے جاتے ہیں اور ساری دنیا کے فلکی آپ کو مانتے ہیں۔

چونکہ آپ "ملازمتی سیاسیات" کے ماہر نہ تھے اور نہ "خوشامد پیشہ" واقع ہوئے تھے اس لئے آپ کو قبل از وقت وظیفہ پر سبکدوش کیا گیا مگر آپ نے اس کا کوئی اثر ہی نہ لیا، اپنے کام میں لگے رہے۔ باوجود کبر سنی کے قویٰ نہایت ہی اچھے ہیں اور اب بھی آپ بیگم پیٹھ سے حیدر آباد تک کبھی کبھی سائیکل پر بھی آ جاتے ہیں، بہرحال خان صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک اور حیدر آباد کی خاص شخصیت ہیں۔

علی یاور جنگ

آپ ایرانی النسل ہیں آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر خدیو جنگ بہادر تھے اور آپ کی والدہ ماجدہ طیبہ بیگم صاحبہ نواب عماد الملک بہادر مرحوم کی صاحبزادی تھیں، آپ کی والدۂ مرحومہ نے حیدر آباد کی نسوانی دنیا میں تعلیم کی روح پھونک دی تھی۔ آج حیدر آباد کی نسوانی ترقی اور تعلیمی چہل پہل جو نظر آتی ہے یہ بیگم صاحبہ کی جد و جہد کا نتیجہ ہے، نواب علی یاور جنگ کی ولادت حیدر آباد ہی میں ہوئی ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی پھر آپ نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ڈگری لی اور حیدر آباد آ کر کالج میں پروفیسر ہو گئے مگر آپ کو قدرت نے سیاسی گتھیاں سلجھانے کے لئے پیدا کیا تھا اس لئے آپ جلد ہی ناظم اطلاسات (ڈائرکٹر آف انفارمیشن بیورو) بنائے گئے پھر سکریٹری آف پولٹیکل آفیسرس ہوئے اور ہوم سیکرٹری بن کر وزیر تعلیمات بن گئے۔

حیدر آباد میں اصلاحات کا نفاذ آپ ہی کے ہاتھوں ہوا اور حیدر آباد کی شمولیت ہند کا مسودہ بھی آپ ہی نے مرتب کیا مگر آپ کی مخالف

پارٹی نے ہنگامہ مچا دیا جس کی وجہ سے آپ مستعفی ہو کر خانہ نشین ہو گئے، جب پولیس ایکشن ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور آپ کی مخالفت کا نتیجہ لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا، ملٹری گورنر کے دور میں آپ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے اور پھر آپ کی خدمات مرکزی حکومت نے حاصل کر لیں اور آج کل آپ مصر کے سفیر ہند ہیں۔

علم و ادب کا ذوق آپ کو ورثہ کے طور پر ملا ہے، اس پر ذاتی دلچسپی طرہ ہے، آپ نہایت منتعد، بڑے ہی کارگزار اور باریک بین و نکتہ رس دماغ کے مالک ہیں، انگریزی ادب پر انشا پردازانہ عبور ہے، تاریخ کا مطالعہ بڑا اچھا ہے خصوصاً پولیٹیکل تاریخ میں آپ استنادی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرے نہایت ہی قدیم عنایت فرما اور کرم گستر ہیں، ہمیشہ میری اعانت اور دل افزائی فرماتے رہے اب تک موصوف کی عنایتیں میرے شاملِ حال ہیں، میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ یہ تابناک ستارہ افقِ ہند پر تاباں و درخشاں رہے۔

سجاد مرزا

مولوی عزیز مرزا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سرسید کے آنکھوں کے سامنے تعلیم پائی اور جنہیں حیدرآباد نے خصوصیت سے بلا کر خدمت دی۔ اگر سازش کا شکار نہ ہوتے تو عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری کے بعد شاید وزارت پر بھی ترقی پاتے مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم کے صاحبزادے حیدرآباد ہی میں رہے، پھلے پھولے اور اب بھی حیدرآباد ہی میں ہیں، مولوی احمد مرزا انجینئر، مولوی ابو سعید مرزا اسسٹنٹ جج نے بڑی ترقی کی مگر افسوس ہے کہ ان دونوں بزرگوں سے میرے زیادہ مراسم نہ تھے۔ مولوی احمد مرزا صاحب سے نہایت مختصر مراسم رہے مگر مولوی سجاد مرزا صاحب سے میرے مراسم بہت زیادہ رہے۔ موصوف جب صدر مہتمم تعلیمات بن کر گلبرگہ تشریف لائے تو میں گلبرگہ ہی میں تھا اس لئے مدت تک نیاز حاصل رہا، پھر موصوف حیدرآباد آ گئے تو بھی نیاز حاصل ہوتا رہا۔ صدر مہتمم تعلیمات، پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج، ناظم تعلیمات اور پھر معتمد تعلیمات (ایجوکیشنل سیکرٹری) رہ کر موصوف نے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کی، چونکہ آپ ماہر تعلیم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اس لئے یونسکو نے آپ کو مشیر تعلیم بنا لیا اور آپ نے بڑی عمدگی سے اس اہم خدمت کو انجام دیا اور اب پھر حیدرآباد واپس ہو گئے ہیں۔

علمی خدمت کا جذبہ آپ میں اتنا ہے کہ حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو کے ہال کے لئے آپ نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے ایک کثیر رقم عنایت کی اور ہال بنوا دیا۔ مدتوں تک "المعلم" نام سے ایک تعلیمی ماہنامہ نکالتے رہے، آپ کی کھدرپوشی بڑی قدیم ہے۔ شروع میں جب ترکِ موالات کی مہم چلنے لگی تو آپ نے کھدرپوشی شروع کی اور ہمیشہ ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا پہنتے رہے، انتہا یہ کہ آپ اپنا رسالہ دیسی ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر چھپواتے اور خط لکھنے کے لفافے کاغذ تک دیسی استعمال کرتے تھے۔

بڑی سوجھ بوجھ کے مالک، نہایت ہی دماغ دار اور شگفتہ مزاج، دوست نواز، وضع دار اور سلیم الطبع بزرگ ہیں ملنے جلنے کی بھی ایک خاص وضع رہتی ہے اور جس سے جیسے مراسم ہوتے ہیں اسی طرح آپ ملاقات بھی رکھتے ہیں۔ لوگوں سے سینکڑوں کتابیں لکھوا دیں مگر آپ نے کوئی کتاب اپنے نام سے نہیں چھپوائی۔ نام و نمود سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔

کیقباد جنگ

کیقباد آپ کا نام ہے، ملنشی آپ کا خاندانی نام ہے، بڑے پرانے گریجویٹ ہیں، حیدرآباد میں پارسی خاندان بڑی مدت سے آباد ہیں اور تجارت و ملازمت بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔ آپ کا خاندان بھی حیدرآباد کا قدیم خاندان ہے، آپ نے مختلف محکموں میں ملازمت کرنے کے بعد نائب معتمد سیاسیات (پولیٹیکل جوائنٹ سیکرٹری) بن کر وظیفۂ حسنِ خدمت حاصل کیا، بڑے ہی صاحبِ ذوق اور علم دوست بزرگ ہیں، آپ کا کتب خانہ بے نظیر ہے۔ مطبوعات جدیدہ کا آپ کو شوق نہیں بلکہ عشق ہے ناممکن ہے کہ کوئی نئی کتاب طبع ہو اور آپ نہ منگوائیں۔ حافظہ نہایت قوی، اور معلومات بڑے ہی بہتر ہیں۔ فارسی پر آپ کو ماہرانہ عبور ہے قدیم پہلوی سے بھی واقف ہیں اور جدید فارسی کے ماہر ہیں۔

مذاہبِ عالم کا مطالعہ آپ نے بڑی تحقیقی نظر سے کیا ہے۔ مذہبِ اسلام سے آپ کو لگاؤ ہے اور بڑا وسیع مطالعہ رہا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے لاہور سے ایک کلامِ مجید شائع ہوا جسے آپ نے فوراً منگوا لیا اور مطالعہ کیا تو اعراب کی بیشتر غلطیاں نظر آئیں چنانچہ آپ نے یہ غلطیاں نوٹ کر کے مجھے دیں اور میں نے مذاکر دیکھا تو واقعی یہ سب غلطیاں اس نسخے میں موجود تھیں لطف یہ ہے کہ یہ غلطیاں آپ نے کسی صحیح اعراب والے نسخے سے مقابلہ کر کے نہیں نکالی تھیں بلکہ سرسری طور پر "ناظرے" میں نظر آئی تھیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا قرآنی مطالعہ کتنا گہرا اور مستقل ہے۔

مجھ سے تیس ایک سال سے مراسم ہیں اور آپ کے کتب خانے سے میں فائدہ اٹھاتا رہتا ہوں۔ اپنے نوجوان لڑکے کے ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے سے بدحال ہو کر کتابیں فراہم کرنا چھوڑ دیا تھا مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی مہینے سے بغرضِ علاج بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ مہینے میں اپریشن بھی ہوا ہے جو سنا ہے کہ کامیاب رہا مگر ابھی مراسلت کرنے کے قابل نہیں ہیں، آپ کے فرزند سے جو سالار ہیں خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے، خداوندِ عالم صحیح و سلامت واپس لائے۔

مہدی نواز جنگ

حیدرآباد ہی کے شرفاء سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی اور محکمۂ مال میں ملازم ہو گئے۔ غالباً بہ عہدۂ تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) تھے کہ مہاراجہ بہادر نے صدرِ اعظم ہوتے ہی آپ کو معتمدِ بابِ حکومت (رجسٹرار) بنا لیا اور مہاراجہ کے معتمدِ علیہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے، آپ نے جس دیانت، محنت، سلیقے اور تجربے سے معتمدی کی ہے۔ سارا ملک واقف ہے، اس اہم خدمت پر رہ کر سب ہی کو خوش رکھنا ناممکن تھا چنانچہ سر اکبر حیدری آپ سے خفا ہو گئے اور جب صدارتِ عظمیٰ پر فائز ہوئے تو آپ کو بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا مگر مہدی نواز جنگ نے بڑی بہادری سے ان آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو کر دکھا دیا کہ وہ بڑے سے بڑے معرکے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

جب تک ملازمت میں رہے ملک کی خدمت کی پھر وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہو کر بھی خدمت کرتے رہے۔ گزشتہ انتخابات میں دوست احباب نے مجبور کیا تو کانگرس کی طرف سے آپ بھی کھڑے ہو گئے اور منتخب ہو کر عوامی وزارت سے سرفراز ہوئے۔

سابقہ دور کے تین ہی بزرگ ایسے ہیں جنہوں نے انقلاب کے باوجود اپنے آپ کو کامیاب و کامران بنا لیا۔ پہلے نواب زین یار جنگ، دوسرے نواب علی یاور جنگ، تیسرے نواب مہدی نواز جنگ۔ اب وزارتِ طبابت سے سرفراز اور کارگزار ہیں۔ خدمتِ ملک بہرحال کئے ہی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر کے اسٹیٹ کی کمیٹی کے صدر نشین بھی ہیں اور بڑی عمدگی سے اسٹیٹ اور نمائش کو باقی رکھا ہے۔

بڑی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اور عجیب و غریب بزرگ ہیں، علم و ادب سے بڑی دلچسپی ہے، مطالعہ نہایت اچھا اور معلومات بڑے ہی نفیس ہیں۔ مہاراجہ بہادر کی ایک مختصر سی لائف بھی آپ ہی نے مرتب کرا کے شائع کی ہے جس میں بڑا ہی اچھا مواد ہے۔

خدا کرے آپ کی کوشش بار آور ہو اور سالار جنگ کا کتب خانہ عوام کے مطالعہ کے لئے کھول دیا جائے، اگر ایسا ہو جائے تو ملک کی بڑی خدمت ہوگی اور لوگ علمی ادبی تحقیق بڑی آسانی سے کر سکیں گے۔

ڈاکٹر عبد اللطیف

گرنول کے مشائخ گھرانے سے ہیں۔ انگریزی ادب میں لندن سے پی۔ ایچ ڈی کیا ہے اور انگریزی کے بڑے اچھے ادیب ہیں جامعہ عثمانیہ میں شعبہ انگریزی کے صدر رہے اور پھر وظیفہ مختصر خدمت حاصل کر لیا۔ غالب پر ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی اور پھر اس کا ترجمہ بھی کرا کے چھپوایا۔ سیاسیات اور مذہب پر بھی بڑی اچھی نظر ہے چونکہ انگریزی بڑی اچھی لکھتے ہیں اس لئے قائد اعظم بھی انہیں بہت پسند کرتے تھے اور تقسیم ہند سے پہلے آپ سے کام بھی لیا کرتے تھے۔

اب حیدر آباد ہی میں قیام ہے اور احادیث پر کام کر رہے ہیں۔ بڑے بالغ نظر اور ٹھوس معلومات کے بزرگ ہیں۔ عملی آدمی نہیں ہیں، کتابی اور تحریری آدمی ہیں۔ خود لکھیں خود چھپوائیں یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کاش کوئی ادارہ اس کام کو اپنے ذمہ لے لے اور ان سے صرف لکھوایا جائے، بڑے ہی کار آمد بزرگ ہیں۔

ڈاکٹر سیادت علی خان

آپ مولوی قطب الدین فاضل کے فرزند ہیں۔ حیدر آباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مولوی فاضل، ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد لندن جا کر آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی سی ایل اور ڈی فل اور بار ایٹ لا (لنکنز ان لندن) کیا۔ حیدر آباد آ کر جامعہ عثمانیہ کے قانون کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر سر رشتۂ عدالت میں منتقل ہوئے اب ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان ملک کے ان ہونہاروں میں سے ہیں جن پر ملک ناز کر سکتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو انگریزی پر یکساں عبور ہے۔ مذہب، ادب اور قانون پر یکساں نظر ہے مگر اپنے مخاطب کو اپنی علمیت سے مرعوب کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ مرنجاں و مرنج، بار باش، نیک دل اور وضع دار آدمی ہیں، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا وقار ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ ان کے والد میرے والد کے بھانجے تھے مگر عمر میں چند سال بڑے تھے اور یہ میرے بھتیجے ہیں مگر ہم عمر، ہم دونوں میں چند ہی مہینوں کا فرق ہے۔

آج کل قانون ہی کی طرف زیادہ مائل ہیں، "شرح قانون شہادت" بڑی نفیس لکھی ہے جو بہت مقبول ہے اور بہت سی شرحیں لکھی ہیں، مضامین خوب لکھتے ہیں مگر آج کل عدالتی مصروفیات کی وجہ سے کم لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ولی الدین

آپ جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حیدر آباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ منشی فاضل، ایم۔ اے، ایل ایل بی کرتے

کے بعد لندن گئے آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی کیا اور بارایٹ لا کرکے واپس آ گئے جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ فلسفہ ہیں۔
تصوف کا مطالعہ بڑا گہرا ہے اور آج کل مذہب اور تصوف پر کام کر رہے ہیں ایک درجن سے زیادہ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی ایک بڑی نفیس کتاب لکھی ہے جو بہت مقبول ہوئی۔

خاموش کارکن ہیں، ہنگاموں میں نہیں پھنستے۔ اطمینان سے بیٹھ کر کام کئے جاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی علوم پر حاوی ہیں۔ پڑھانے سے جو وقت بچتا ہے وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں باوجود فلسفی ہونے کے تحریر میں شگفتگی ہے اور مضامین بڑے اچھے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین

حیدرآباد ہی کے قدیم خاندان کے فرد ہیں۔ مولوی فاضل کامیاب کرنے کے بعد بی۔ اے کرتے کرتے لندن چلے گئے اور عوفی پر تحقیق کرکے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ حیدرآباد واپس آکر جامعۂ عثمانیہ کے فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ حال ہی میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے ہیں۔

عمادالملک، قطب الدین فاضل، محمد یار جنگ نے ایک دارالاشاعت "دائرۃ المعارف" کے نام سے قائم کیا تھا جو پچاس سال سے عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں شائع کر رہا ہے، جب اس کا تعلق جامعہ عثمانیہ سے ہوا تو ابتداً پروفیسر الیاس برنی اس ادارے کے نگران رہے اور پھر ڈاکٹر نظام الدین کے سپرد ہوا، ڈاکٹر صاحب عربی کے نہ صرف فارغ التحصیل ہیں بلکہ انہیں عربی زبان اور ادب سے بڑی ہی محبت بھی ہے اس لئے انہوں نے بڑی دلچسپی سے دائرۃ المعارف کو چلایا اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی نہایت ہی مستعدی سے چلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین بھی نہایت خاموش کام کرنے والے ہیں، ٹھوس اور اہم کاموں میں لگے رہتے ہیں، ایران والوں نے فردوسی کی ہزار سالہ یادگار منائی تو حیدرآباد سے بطور نمائندہ آپ ایران بھجوائے گئے اور "جشن ہزار سالہ فردوسی" میں شرکت کی۔ بہرحال آپ ملک کے مایۂ ناز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجھ سے پچیس تیس سال سے مراسم ہیں، دوسرے برادرانِ ملک کی طرح آپ بھی اپنا پراپیگنڈہ نہیں کر سکتے اور نہ تعلّی اور خودستائی سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے ہیں، خاموشی سے علمی ادبی خدمت کئے جا رہے ہیں مگر چونکہ عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں آپ ایڈٹ کرکے چھپواتے ہیں اس لئے عوام ان خدمات سے ناواقف ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان

مولوی فدا حسین خان وکیل حیدرآباد کے مشہور اور قابل وکلاء میں سے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان انہی فدا حسین خان صاحب کے فرزند ارجمند اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے بھائی ہیں۔ ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جامعہ ملّیہ قائم ہوئی تو آپ ملّیہ میں شریک ہو گئے اور وہاں سے لندن جا کر پی ایچ ڈی کیا۔ پھر حیدرآباد آکر شعبۂ تاریخ کے ریڈر ہو گئے آج کل جامعہ عثمانیہ کے تاریخ کے پروفیسر ہیں۔
نہایت زندہ دل، مرنجان و مرنج، قابل اور محنتی شخص ہیں۔ دفتر دیوانی کے کیوریٹر کی حیثیت سے بھی مدتوں کام کیا۔ تاریخ اور ادب پر بڑا عبور ہے۔

ایک درجن کے قریب کتابیں چھپوا دی ہیں، سیاسیات، ادب اور تاریخ پر تمام کتابیں ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے جو بہت پسند کی جاتی رہی۔

میں نے جب مومن خاں مومن پر کام کرنا شروع کیا تو مجھے دی تاسی کے تذکرے سے مومن کے حالات لینے کی ضرورت پڑی۔ اپنے شفیق اور محترم ڈاکٹر ستار صدیقی سے میں نے خواہش کی تو انہوں نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کو لکھا اور یوسف حسین خاں صاحب نے مجھے دی تاسی کا ترجمہ کر دیا۔ یہ پہلی ملاقات بیس سال پہلے ہوئی تھی اور آج تک ڈاکٹر صاحب اسی خلوص اور محبت سے ملتے ہیں جس طرح پہلی ملاقات کی تھی بڑے ہی وضع دار واقع ہوئے ہیں۔

اردو زبان سے ڈاکٹر صاحب کو والہانہ محبت ہے اور اردو میں مستقل طور پر کام کئے جاتے ہیں۔ حال ہی میں کسی نے اردو کی بجائے ہندی رسم الخط کو رواج دینے کی تحریک کی تو آپ نے سخت اختلاف کیا اور بڑی عمدگی سے اردو رسم الخط کی حمایت کی۔ بہرحال اردو کے سچے خدمت گزار ہیں۔

یہ خاکے ہیں حیدرآباد کے چار ادوار کے، میں نے مرحومین کو زیادہ اور موجودین کو کم لیا ہے، کیونکہ موجودین پر پھر بھی لکھا جا سکتا ہے، طوالت کی وجہ سے بیشتر اصحاب کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ انشاء اللہ پھر کسی وقت اس کی تلافی بھی ہو جائے گی ——— فقط

تمکین کاظمی

علی گڑھ کی چند شخصیتیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے الفاظ و حروف کے پردوں پر ثبت ہوئے غیر فانی نقوش کے ساتھ نقش گروں کی شخصیت سے دلچسپی لینا ایک فطری امر ہے۔ کوئی کتاب، کوئی شعر، کوئی ڈراما، کوئی ناول اور کوئی کہانی جب ہم پر اپنی تخلیق کا جادو جگانے لگتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں اس فن پارے کے خالق کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے۔ اچھی کتاب اور اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق اپنے پڑھنے والے کے اندر بھی ایک طرح سے تخلیق کا جذبہ بیدار کر دیتی ہے اور وہ اس طرح کہ ہمارا ذہن اس فنکار کی شخصیت اور اس کے خدوخال کی ایک مکمل تصویر بنا لیتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ادبی شاہکار سے متاثر ہونے کے بعد ہم اپنے ذہن میں اس کے خالق کی جو تصویر بناتے ہیں وہ اتنی خوبصورت اور دل آویز ہوتی ہے کہ اس کی اصل تصویر دیکھ کر ہمیں کچھ مایوسی سی ہوتی ہے اور دل کو عجیب دھکا سا لگتا ہے شاید اسی لئے رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش صرف منافقت یا کھلی ملکیت کا نمونہ ہیں" دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان تصانیف میں مصنف نے اپنا اصل چہرہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے جس طرح قدیم زمانے کے پیغمبروں اور صوفیوں، اوتاروں اور رشیوں منیوں کی شخصیت کے گرد انسانی تخیل نے ایک ماورائی اور خوبصورت ہالہ بنا رکھا ہے اور مختلف صدیوں اور مختلف ادوار کے انسانوں نے ان کو اپنے زاویئے سے دیکھ کر ان کی تصویریں بنائی ہیں اسی طرح ان شاعروں ادیبوں یا مصنفوں کے ذاتی حالات اور ان کے کردار اور شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ محدود ہے ان کی تصویریں بھی صنم گری کی حدود میں آتی ہیں۔ گوتم بدھ، رام چندر، کرشن، مسیح، زرتشت اور دوسرے روحانی پیشواؤں کے مجسمے اور تصویریں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان سب تصویروں میں اصل شخصیت سے زیادہ روایات اور تصورات اور کسی قوم یا کسی فرد کے اپنے ذہن کی پرواز کا عنصر نمایاں ہے۔ قدیم فلسفیوں اور شاعروں کے بارے میں بھی ہم زیادہ تر اسی صنم گری کے شکار ہیں۔ ہومر، کالیداس، فردوسی، دانتے، اور شیکسپیئر وغیرہ کی تحقیقات پڑھ کر ہمارے ذہن میں ان فنکاروں کے جو خدوخال ابھرتے ہیں وہ اصل سے کہاں تک مطابق ہوں گے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اکثر ذہنوں کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ غالباً یہی جذبہ محرک بنا کہ دنیا میں جو لوگ قوم و ملک اور آنے والی نسلوں

کے لئے اپنے کارنامے چھوڑ جائیں ان کی زندگی کے حالات بھی لکھے جائیں، ان کی ذاتی اور نجی شخصیت اور کردار کا ریکارڈ رکھا جائے، ان کے پرائیویٹ خطوط اور دوسرے کاغذات محفوظ کئے جائیں اور کچھ لوگ نکیرین کے مانند اپنے اوپر یہ فرض عائد کرلیں کہ ان غیر فانی ہستیوں کی غیر فانی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھیں۔ غالب نے بڑی خوبصورتی سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے اور آدمی کی لکھی ہوئی تحریر کو خدا کی طرف سے تعینات کئے ہوئے کاتبوں کے مرتب کردہ اعمال نامے سے زیادہ معتبر و مستند ٹھہرایا ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

رشید احمد صدیقی کا ایک قول اور یاد آیا جسے اس موقع پر نقل کردینا نامناسب نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:-

”داعیِ اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کرسکتا کہ میری پرائیویٹ زندگی کی تمام جزئیات منظرِ عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالت مآب کا ضبط و ظرف دیکھئے کہ مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو و فصل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے۔ اس محک آتشیں پر آزمائے جانے کے لئے کون آمادہ ہے؟“

واقعہ یہ ہے کہ اس ”محک آتشیں“ پر آزمائے جانے کے لئے ایک پیغمبر ہی آمادہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ اسے اپنے اوپر یہ اعتماد ہوسکتا ہے کہ اس کے ظاہر و باطن اور قول و عمل میں مکمل مطابقت ہے لیکن فنکار کی شخصیت عموماً پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر بہ یک وقت دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو باہر سے نظر آتی ہے یہاں وہ ایک آدمی، ایک مرد، ایک عورت، شوہر، بیوی، بیٹا، باپ، بھائی، جوان، بوڑھا، خوبصورت، بدصورت، اندھا، لنگڑا، بہرا، بھینگا، جوشیلا، معتدل، رحمدل، غضبناک، باہمت، بزدل، توانا و مضبوط، کمزور و ناتواں، فاتح و کامراں، شکست خوردہ و آزردہ، چاہنے والا، چاہے جانے والا اور چاہت سے محروم ـ غرض عام آدمیوں کے اندر جو سیکڑوں اور ہزاروں رنگ روپ ہیں کم و بیش ہمارا فنکار بھی ان کی گرفت میں ہوتا ہے۔ فنکار کی دوسری شخصیت اس کا اندرون ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن اس کی تصانیف اسی کا کرشمہ ہوتی ہیں۔ بعض فنکاروں کے یہاں اندر کا یہ انسان ہمہ وقت بیدار رہتا ہے بعض کے یہاں کبھی کبھی چونک اٹھتا ہے اور کچھ نشانات چھوڑ کر پھر گہری نیند سو جاتا ہے۔ ان دونوں شخصیتوں کا رشتہ ملانے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے ان کا تجزیہ کرنے کا کام ایک ماہر نفسیات ہی کرسکتا ہے۔ لیکن ماہر نفسیات اس جگہ بے بس ہوجاتا ہے جب معمول (Subject) کے بارے میں اس کے پاس خاطر خواہ مواد (Data) نہ ہو۔ [illegible] کی طرح ایسے لوگ کہاں ہوں گے جو [illegible] کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہیں اور اس کا سیاہ و سپید عوام الناس کے حوالے کردیں اور [illegible] کے مانند کس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ اپنے پیرہن کا ایک ایک تار نوچ کر پھینک دے اور اپنے آپ کو سربازار عریاں کرکے کہے کہ آؤ اے لوگو! اس شخص کا تماشا دیکھو جس نے [illegible] کی تخلیق کی ہے۔

اردو زبان میں [illegible] سوانح کی تاریخ ابھی سو برس سے بھی زیادہ کی نہیں ہے۔ ”آب حیات“ پہلی کتاب ہے جس میں محمد حسین آزاد نے اردو کے شعراء کی [illegible] چلتی پھرتی تصویریں [illegible] انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں لیکن صاحب آب حیات کے پاس ماضی کے شعراء کے بارے میں جو مواد تھا اس کی حیثیت [illegible] کی سی تھی اس میں آزاد کی صناعی [illegible]۔ آزاد نے اتنی رنگ آمیزی [illegible] کے باوجود افسانہ طرازی کے لوچ [illegible] غالباً اسی لئے موجودہ دور کے ایک ذہین افسانہ نگار [illegible] آب حیات [illegible] [illegible] حقائق [illegible] [illegible] قابل [illegible] ہر زندہ [illegible] نہیں کیا جاسکے یہی وجہ ہے کہ بعد میں [illegible] جب

غالب کے سوانح نگاروں نے ان کی شراب نوشی، قماربازی، ڈومنی سے محبت اور ان کی چھوٹی چھوٹی اخلاقی کمزوریوں کا ریکارڈ مرتب کرنا شروع کیا تو "بادہ خوار" غالب کو صرف "ولی" سمجھنے والا طبقہ چیخ اٹھا۔ شبلی نے حالی کو یہ طعنہ دیا تھا کہ حیات جاوید "کتاب المناقب" اور "مدلل مداحی" ہے لیکن خود شبلی کے سوانح نگار سید سلیمان نے اپنے ممدوح کو جنید و شبلی، بایزید بسطامی، غزالی اور شاہ ولی اللہ کے پہلو میں بٹھانے کی کوشش کی اور جب دوسرے لوگوں نے عطیہ فیضی کے نام شبلی کے پرائیویٹ خطوط کو مرتب کر کے شائع کر دیا اور ان کی حیات معاشقہ کے لئے نفسیات دانوں کو مواد مل گیا تو پرستاران شبلی چیں بر جبیں ہو گئے۔ شیخ عطاء اللہ نے مکاتیب اقبال مرتب کئے اس کی پہلی جلد کی اشاعت محض اس لئے روک دی گئی کہ اس سے اقبال کے عقیدت مندوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور کتاب سے ان حصوں کو خارج کر دیا گیا جن سے اقبال کی شخصیت یا علم پر کوئی دھبہ آ سکتا ہو۔

اب ادھر کچھ دنوں سے ہمارے یہاں اخلاقیات کا یہ تصور تبدیل ہو رہا ہے۔ غالباً سر رضا علی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنا کچا چٹھا پیش کرنے کی جرأت کی ہے اور اس حیثیت سے "اعمال نامہ" اس صنف ادب کا ثمر پیش رس ہے۔ اب نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے یہ خطرناک فریضہ اپنے اوپر عائد کیا ہے کہ ہماری زبان کی وہ علمی ادبی شخصیتیں جو ہمارے درمیان موجود ہیں ان کے پیچھے کچھ محتسب لگا دیئے ہیں جو "درون خانہ" قسم کے اندراجات مرتب کریں اور وہ حضرات جو ہماری محفلوں سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کا کوئی نہ کوئی ہم صحبت اب بھی ان کی یاد اپنے سینے میں دفن کئے ہوئے [illegible] میں [illegible] سے وہ اس دبے ہوئے خزانے کو باہر نکالے تاکہ وہ متاع بے بہا جو در اصل قوم کی ملکیت ہے قوم [illegible] ہے یہاں [illegible] کا ہے۔ کس میں اتنا بوتا ہے جو اس بال سے باریک [illegible] پر چل سکے اور قدم نہ ڈگمگانے پائیں [illegible] تاریخ پیدائش [illegible] ناموں کا ہی نہ سنانا اپنی [illegible] کا حال [illegible] بیان کرنا اور اس طرح چل [illegible] سفید [illegible] کر [illegible] سوانح کا سامان فراہم کر دے اور نفسیات والوں کو خود [illegible] قوم [illegible] کا موقع دے [illegible] سوچنے کی بات ہے۔ کم از کم مجھے یہ اعتراف [illegible] نہیں [illegible] عقول دینا پڑے گا [illegible] لوگوں نے [illegible] نفوش و تاثرات [illegible] ذہن پر نقش [illegible] سے کھینچی گئی ہو [illegible] قریب ترین زاویۂ تصویر سے باہر (out of focus) ہو [illegible] "خوف فساد خلق" کا اندیشہ ہے۔ [illegible] حق کا اظہار [illegible]

[illegible]

طفیل صاحب کا اصرار ہے کہ [illegible] علی گڑھ والوں پر قلم اٹھاؤں لیکن مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی علمی ادبی شخصیتوں اور یہاں [illegible] واسطہ اس طرح پڑا ہے [illegible] صرف دور سے سڑک پر چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ کوئی صاحب لندن سے اپنی خوبصورت کار میں میرے پاس [illegible] کوئی صاحب سٹیج پر تقریر کرنے یا تحقیقی و علمی مقالہ پڑھنے آئے ہیں اور علم و ادب کا دریا بہا کر چلے گئے ہیں [illegible] صاحب [illegible] ایک طالب علم کا بھیس بنا کر کہیں پچھلی صف میں بیٹھا ہوا اونگھتا رہا ہوں۔ کسی کو کسی ڈنر یا ایٹ ہوم میں [illegible] اتفاقاً [illegible] احباب میں ہنستے ہوئے دیکھ لیا ہے کسی سے بطور عقیدت ملنے گیا ہوں اور اس کے آراستہ [illegible] یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ کہیں کسی شیشے کی نازک شے سے ٹکرا نہ جاؤں اور مجھے خفت اٹھانی [illegible] ملنے کے لئے تعارفی خط لکھوا [illegible] ہوں اور چند منٹ [illegible] علی گڑھ کے [illegible] کے اندر [illegible] کا مجھے موقع [illegible] صاف [illegible] خوانی کے پاس [illegible] اپنے بڑی

بچوں سے چہل کرتے یا لڑکوں کو پیٹتے اور تنخواہوں سے لڑتے دیکھا ہے۔ اگر بعض لوگوں کو دیکھا ہی ہے تو کبھی کبھی اور ان کو بھی بیان کرنے کی اس لئے جرأت نہیں کہ مجھے ابھی یہاں رہنا ہے۔ ابھی اسی دریا کا پانی پینا ہے کسی مگرمچھ سے بیر کرنا نادانی نہیں تو کیا ہے۔ پڑھنے والوں کا تو ممکن ہے ہر طرح بھلا ہو لیکن لکھنے والے کا تو جینا دوبھر ہو جائے گا۔ اس لئے ناظرین کرام کو پہلے ہی آگاہ کئے دیتا ہوں کہ میری اس تحریر کو ایک اخبار نویس نامہ نگار کی سرسری رپورٹ اور ایک ایڈیٹر کی فرمائش کی تعمیل سے زیادہ وقعت نہ دی جائے۔ اگر کوئی بات زبان قلم سے ناموزوں و ناسزا سب نکل جائے تو اسے محض میرے طرز نگارش کی خامی و ناپختگی پر محمول کیا جائے۔

جہاں تک شہر کا تعلق ہے علی گڑھ ہندوستان کا ایک بہت ہی معمولی اور حقیر فقیر سا شہر ہے بلکہ بعض اعتبار سے اسے شہر بھی کہنا درست نہیں۔ یہاں نہ تو بادشاہوں کے محلات اور تاریخی آثار ہیں اور نہ ہی کوئی قابل ذکر اور قابل دید مقام۔ ایک پرانا قلعہ ضرور ہے لیکن وہ بھی ایسا قلعہ جو غالباً مرہٹوں نے فوجی سامان رکھنے اور اپنی سپاہ کی محافظت کے لئے بنایا تھا اس لئے وہ دور سے ایک پہاڑی کی شکل میں نظر آتا ہے اور قریب جانے سے ایک بڑے پھاٹک کے اندر کچھ پرانی [illegible] تہ خانے اور سرنگیں ہیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ نیست و نابود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پہلے یہ ایک قصبہ تھا اور اسے کول کہا کرتے تھے۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک سے قبل علم و ادب کے سلسلے میں علی گڑھ سے صرف چند ہی نام وابستہ ہیں۔ غالب کے بعض احباب اور تلامذہ جن میں منشی ہرگوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر، منشی [illegible] بالمکند بے صبر اور ہواری لال شعلہ کا نام لیا جاتا ہے کول ہی میں مقیم تھے۔ اور وہ بھی کچہریوں میں ملازمت کے سلسلے میں۔ البتہ پچھلی صدی میں استاذ العلماء مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی مرحوم پہلے اور سب سے زیادہ شہرت عام [illegible] رہے ہیں۔ جن کا ایک عربی کا مدرسہ تھا اور دور دور سے لوگ تحصیل علم کے لئے آیا کرتے تھے۔ کول کا نام [illegible] علی گڑھ [illegible] علی [illegible] صاحب تھے جن سے نسبت [illegible] یقینی [illegible] جب [illegible] سنہ [illegible] سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر یہیں منتقل کر لیا تو اس کا نام علی گڑھ [illegible] پرچہ [illegible] ایک [illegible] وہ دلبستی ہے جو سرسید کی [illegible] پہلے یہاں غالب [illegible] علاقے کی [illegible] ہندی [illegible] علمی [illegible] علم سے علاوہ تربیت اور تعمیر [illegible] سرسید [illegible] تہذیب [illegible] جامعہ [illegible] آکسفورڈ [illegible] کیمبرج [illegible] تعلیم [illegible] علم و فضل اور تہذیب کی شمعیں [illegible] اس طرح آباد کیا [illegible] دلی، لکھنؤ، عظیم آباد [illegible] اور حیدرآباد کے [illegible] تشنہ کامان ادب نے کھنچ کھنچ کر اس چشمے سے سیراب ہونے کے لئے اپنے اپنے ڈیرے ڈال دیئے۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں [illegible] اس کی نیو پڑی تھی لیکن اس عرصے میں یہاں سے کیا کیا فاتح نہ اٹھے جنہوں نے اردو زبان اور [illegible] دھارا موڑ دیا [illegible] تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ترتیب و تدوین سید کے مبارک ہاتھوں یہیں کہیں ہوتی تھی۔ حالی نے [illegible] بنگلے میں [illegible] اسلام کے [illegible] سید [illegible] بنگلے کے قریب [illegible] مکان میں [illegible] محسن الملک، وقار الملک، وحید الدین سلیم [illegible] عنایت اللہ دہلوی کی کوٹھیوں [illegible] چکے ہیں [illegible] یادوں کی [illegible] ابھی تک [illegible] کلاس روم ہیں آج [illegible] کہیں [illegible] [illegible] حسرت [illegible] علی [illegible]

اردو ادب کے معماروں کی آوازیں گونجی ہوں گی جب انہیں اس حیثیت سے کوئی نہ پہچانتا ہوگا - اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، سردار جعفری، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، مجاز، جاں نثار اختر، باری، منٹو اور شاہد لطیف کے مانوس چہرے اب بھی اس بستی کو یاد ہیں - اب بھی ان کی آوازیں یہاں گونج رہی ہیں۔

اس تحریر کا لکھنے والا آج سے گیارہ سال قبل ۱۹۴۵ء میں ایک کم سواد طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ میں داخل ہوا اور یہاں کی ہوا کچھ اس طرح لگی کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اسی بستی کا ہو رہا۔ اس کی نس نس میں علی گڑھ کی مٹی کچھ اس طرح رچ گئی ہے کہ اب شاید اس کی خاک یہیں ٹھکانے لگے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ "خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں"۔ ان کو دیکھنے والے ان کے بارے میں لکھیں گے۔ ناچیز نے جن چہروں کو دُور یا نزدیک سے دیکھا ہے ان کے بارے میں مختصراً لکھتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

علی گڑھ اسٹیشن سے اترتے ہی سید کی جس بستی کا میں نے ذکر کیا ہے اس طرف دو سڑکیں جاتی ہیں - ایک یونیورسٹی روڈ دوسری میرس روڈ - اب اس سڑک کا نام تقسیم ہند کے بعد ٹیکا رام مندر روڈ ہو گیا ہے لیکن یہ نام صرف بورڈ پر لگا ہوا ہے اسے اب بھی میرس روڈ ہی کہتے ہیں - اس سڑک پر چلیے تو ایک فرلانگ آگے جا کر نواب چھتاری کی کوٹھی سے متصل اور نواب دھرم پور کی امریکن کوٹھی کے مقابل ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ملے گی جس پر "حبیب منزل" لکھا ہوا ہے - یہ نواب صدر یار جنگ کی کوٹھی ہے - علی گڑھ میں اتنی وسیع اور پرشکوہ عمارت شاید ہی اور ملے۔ نواب صدر یار جنگ بھیکم پور (ضلع علی گڑھ) کے رہنے والے تھے اور شروانیوں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں انہوں نے اپنے نام سے بھی ایک بستی بسائی جس کا نام "حبیب گنج" رکھا ان کا کتب خانہ جو ہندوستان کے نادر ترین کتب خانوں میں سے ہے وہیں ہے۔ علی گڑھ کی اس کوٹھی کی تعمیر سے متعلق یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ جس زمانے میں نواب صاحب مرحوم حیدر آباد میں صدر الصدور اور امور مذہبی کے مشیر [illegible] تھے اسی دوران میں ایک بار [illegible] دکن کا کسی [illegible] آپ پر عتاب نازل [illegible] وہاں سے علیحدہ ہو کر حبیب گنج پہنچ آئے اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے لیکن نظام دکن کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ انہیں اپنے [illegible] پر نظر ثانی کرنی پڑی اور [illegible] سال کے بعد دوبارہ نواب صدر یار جنگ کو [illegible] پر مامور [illegible] اس عرصہ کی تنخواہ یکمشت عنایت فرمائی - اس رقم سے نواب صاحب مرحوم نے "حبیب منزل" تعمیر کرائی اور وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا مستقل قیام علی گڑھ میں رہنے لگا [illegible] یہ مکان ہندوستان کے تمام مشاہیر علم و ادب کی جولان گاہ تھا - نواب صاحب نہ صرف اس دور کے زبردست عالم [illegible] صاحب تصنیف بزرگ تھے بلکہ ان کی [illegible] ایک [illegible] مشرقی تمدن کا آخری اور بہترین نمونہ اور علم و فضل کا مجسمہ تھے - ہندوستان کی کوئی قومی و مذہبی تحریک ایسی نہ تھی جس [illegible] سوال نہ رہے [illegible] ندوۃ العلماء [illegible] کانفرنس اور علی گڑھ یونیورسٹی تینوں آپ کی قیادت سے مشرف ہو چکے ہیں۔

آخر [illegible] یونیورسٹی کی [illegible] سے علی گڑھ آتے ہی مجھے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ میرے [illegible] نواب [illegible] فضل اور ان کی عظمت [illegible] چکا تھا - میرے والد مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے [illegible] کے نام سے میرا اسم گرامی [illegible] نواب صاحب مرحوم [illegible] نواب صاحب [illegible] نواب صاحب [illegible]

ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی روحِ رواں تھے اس لئے مجھے کانفرنس سے عربی کے ایک وظیفے کے ملنے کی بھی توقع تھی۔ چنانچہ میں علی گڑھ کے ایک سینئر طالب علم مولوی محمد صابر ندوی اندونیسی کی معیت میں نواب صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔ انہیں دیکھ کر مجھ پر تھوڑی دیر کے لئے ایک رعب سا چھا گیا، سرخ و سپید رنگ، لمبا قد، خوش پوش اور خوبصورت آدمی تھے۔ سفید نورانی داڑھی تھی لیکن چہرہ عام علماء جیسا نہیں تھا، شائستگی اور نفاست کا ایک پیکر میرے سامنے تھا۔ بڑی نرم آواز میں انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا لیکن میں سُن نہ سکا۔ کچھ بولا تو کسی نے کہا کہ زور سے بولئے نواب صاحب اونچا سنتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں میں اپنے حواس پر قابو پا گیا کیونکہ نواب صاحب کے لب و لہجے میں تمکنت کے بجائے شفقت و مرحمت تھی۔ اس ملاقات کے بعد بھی مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں نواب صاحب کے یہاں جانے کا موقع ملا لیکن کسی نہ کسی ضرورت سے۔ اس زمانے میں میری علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ مرحوم سے کچھ استفادہ کر سکتا۔ کئی امور ایسے تھے جن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہمّت نہ پڑی۔ نواب صاحب کی شرافت، وضعداری اور رکھ رکھاؤ اور ان کی علم دوستی کے چرچے علیگڑھ میں عام تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب صاحب کے یہاں شام کو دیوان خانے میں نشست ہوتی تھی جس میں علی گڑھ کے اکثر اہلِ علم حضرات جایا کرتے تھے۔ وہاں کیا کیا علم و ادب کے خزانے لٹتے ہوں گے کاش اس میں میرا بھی حصّہ ہوتا۔ نواب صاحب کی بگھی روزانہ شام کو میں دیکھتا تھا جو مفتی عبداللطیف صاحب کے مکان "نور ولا" کے سامنے رکتی تھی اور انہیں لے کر مولوی بدرالدین صاحب علوی (استاد شعبہ عربی) کے یہاں جاتی اور پھر یہ دونوں حضرات نواب صاحب کے یہاں تشریف لے جاتے۔ نو ساڑھے نو بجے رات میں یہی بگھی ان دونوں بزرگوں کو اپنے مکانوں میں واپس لاتی تھی۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

نواب صاحب کا جب بھی ذکر آتا تو علی گڑھ والے اس بات پر بہت افسوس کرتے کہ ان کے خاندان میں اب اس جگہ کو کوئی سنبھالنا نظر نہیں آتا۔ مرحوم کے بڑے صاحبزادے مجذوب ہو گئے ہیں اور مستقل طور پر کچھ چھ شریف (فیض آباد) میں مخدوم اشرف جہانگیر کی درگاہ میں رہتے ہیں۔ دوسرے فرزند عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی آج کل مسلم یونیورسٹی کے ٹریزرار ہیں لیکن ان کے حصّے میں باپ کا علم و فضل نہیں آیا۔ عبید الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے یعنی نواب صاحب کے پوتے ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے عربی میں ایم۔اے کیا ہے اور یونیورسٹی میں عربی کے اُستاد ہیں۔ ان کو پڑھنے لکھنے سے ضرور دلچسپی ہے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ خدا کرے نواب صاحب کی روایات کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوں۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ ہی میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے مرنے سے مشرقی علم و فضل اور وضعداری کا آخری چراغ گُل ہو گیا۔

مرحوم جہاں مذہبی علوم، تاریخ و فلسفہ اور فقہ اسلامی کے زبردست عالم تھے وہاں شعر و ادب کا اعلیٰ اور ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ میر حسن کا تذکرہ اور دیوان خواجہ میر درد کی ترتیب و تدوین اور ان کے مقدمے ان کی یادگار ہیں۔ شاعر بھی تھے اور حسرت تخلّص کرتے تھے۔ "کاروانِ حسرت" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ مرحوم کی خط و کتابت حالیؔ و شبلی سے لے کر پچھلے دور کے تمام مشاہیرِ ادب اور علماء سے تھی اور ان کے کتب خانے میں یہ نوادر محفوظ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خلوت پسند طبیعت نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لئے مولانا شروانی کو اپنا مخاطب بنایا اور احمد نگر کے ایامِ نظر بندی میں جو خطوط لکھے وہ "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان خطوط کی اشاعت نے نواب صدر یار جنگ کی شخصیت کو اور بھی دلکش بنا دیا اور ابوالکلام کا یہ حبیب سارے ملک کا محبوب بن گیا۔ کاش ہندوستان کے اہلِ علم مولانا شروانی کے نادر کتب خانے سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں کیونکہ اس مرحوم نے جس عرق ریزی سے یہ سوتی چن چن کر اکٹھا کئے ہیں ان کی قدر و قیمت کا پہچاننا موجودہ نسل کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ

میرس روڈ پر "حبیب منزل" سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر ایک مکان ہے جس کا نام ہے "عبداللہ لاج" ہے۔ یہ مکان مسلم گرلس کالج کے احاطے میں ہے اس میں نوّے سال کے ایک بڈھے پھوس نورانی صورت کے بزرگ ملیں گے جو باہر نکلیں گے تو ترکی ٹوپی سر پر ہوگی۔ انہیں علی گڑھ والے "پاپا" کہتے ہیں۔ یہ شیخ عبداللہ ہیں جو مسلمان قوم میں تعلیم نسواں کے اوّلین معمار ہیں۔ سرسیّد نے جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا اور نئی تعلیم سے اپنی قوم کو بہرہ ور کرنا چاہا تو قدامت پرستوں نے ان کی کتنی مخالفت کی اور انہیں کس کس طرح مطعون کیا وہ دنیا کو معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نئی تعلیم کو ہمارے ملک میں مردوں کے لئے اس قدر مہلک قرار دیا گیا تو عورتوں کے سلسلے میں اس کا نام لینے کی کسی کو کیا ہمت ہو سکتی تھی۔ سرسیّد کے ذہن میں یہ پروگرام بھی تھا لیکن اس وقت قوم کی ڈوبتی ناؤ کو پار لگانے کے لئے صرف مردوں کی تعلیم کے لئے بنیاد ڈالنا ہی ایک کٹھن مرحلہ تھا، بعد میں اس مشن کی تکمیل شیخ عبداللہ کے ہاتھوں ہوئی۔ شیخ عبداللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ایک کشمیری برہمن تھے اور کمسنی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو کر علی گڑھ کی درسگاہ میں داخل ہوئے تھے اور سرسیّد کے دامن تربیت نے انہیں کچھ اس طرح ڈھال دیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ مسلم گرلس کالج کی بنیاد ڈالی اور تعلیم نسواں کی حمایت میں علی گڑھ سے رسالہ "خاتون" نکالا۔ ان کے اس کام میں ان کی وفا شعار بیگم اعلیٰ بی نے بڑا ہاتھ بٹایا۔ سب سے پہلے خود شیخ صاحب نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوائی اور پردے کی سختیوں کو کم کر کے انہیں قومی اور ملکی کاموں میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ ان کی صاحبزادی رشید جہاں نے اُردو میں پہلی بار جدید طرز کی افسانہ نگاری شروع کی۔ خود ان کے شوہر محمود الظفر نے اس طرز میں ان کا ساتھ دیا۔ "انگارے" جو اُردو افسانہ نگاری اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں ایک اہم تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس میں سجاد ظہیر اور احمد علی کے علاوہ ان دونوں میاں بیوی کی کہانیاں بھی ہیں جو قدامت پرستی کے خلاف بغاوت کا ہمارے ادبی سرمائے میں نشان اوّلین ہیں۔ دوسری صاحبزادی ممتاز جہاں بیگم تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گرلس کالج کی پرنسپل ہو گئیں۔ انہیں سارا علی گڑھ ممتاز "آپا" کہتا ہے۔ خورشید جہاں بھی شیخ صاحب کی لڑکی ہیں جنہوں نے ایک زمانے میں "رینوکا دیوی" کے نام سے فلمی دنیا میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کے صاحبزادے محسن عبداللہ بھی ایک عرصے تک فلم سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ محسن عبداللہ کی بیوی یعنی شیخ صاحب کی بہو شاہدہ خاتون بھی فلمی دنیا میں چلی گئیں اور "نینا" کے نام سے اداکاری کے کمال دکھائے۔

مسلم گرلس کالج نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمائے اور ہزارہا مسلم خواتین اس کالج سے تعلیم پا چکی ہیں۔ عصمت چغتائی بھی اسی کالج کی پروردہ ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اور ان کا مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" یہیں کے مشاہدات پر مبنی ہے۔

شیخ صاحب باوجود پیرانہ سالی کے ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی نرمی اور معصومیت ہے۔ چہرے پر داڑھی نہیں ہے لیکن مونچھیں موجود ہیں۔ اب جھک کر اور آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لوگوں کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ گرلس کالج کی تمام بچیوں سے باپ کا سا برتاؤ رکھتے ہیں اور اپنی بیٹی ممتاز جہاں کے کام میں اب تک ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر سال سرسیّد کے یوم وفات کے موقع پر ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں شیخ صاحب کا شریک ہونا ضروری ہے۔ اس موقع پر ہر سال وہ ایک تقریر کرتے ہیں اور سرسیّد کی باتیں کر کے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی جوبلی منائی گئی۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں بھی ایک جلسہ ہوا۔ شیخ صاحب نے جو تقریر کی اس کا ایک فقرہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "جس جگہ آج تم بیٹھے ہوئے ہو انہی کرسیوں پر کہیں پیچھے میں بھی بیٹھا کرتا تھا اور میری طالب علمی کے زمانے میں جب کوئی بڑا آدمی آتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھی اسٹیج پر آ کر تقریر

کرسکوں گا اور لوگ میرے سُننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوں گے۔ میں اس درسگاہ کا ممنون ہوں کہ اس کی تربیت نے مجھے اس قابل بھی بنایا۔"

خان بہادر حبیب اللہ خاں

علی گڑھ سے باہر کم حضرات، ان سے واقف ہوں گے لیکن علی گڑھ میں ان کی حیثیت ایک ادارہ سے کم نہیں۔ یہ علی گڑھ کی زندہ انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ان کی عمر بھی پچاسی نوّے سال سے کم نہ ہوگی۔ یہ سرسیّد اور علی گڑھ کے عاشقوں میں ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر حضرت محمد صلعم آخری نبی نہ ہوتے تو نبوّت کا خاتمہ سرسیّد پر ہوتا، سرسیّد پر اعتراض اور نکتہ چینی یا کسی نوع کی تنقید وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ حبیب اللہ خاں اصلاً شاہجہان پور کے پٹھان ہیں۔ علی گڑھ میں سرسیّد کے زمانے میں ہی داخل ہوئے اور یہاں سے فارغ ہو کر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے دوران میں بھی وہ علی گڑھ کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے اور یہاں کی آئے دن کی سیاست کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سر ضیاءالدین کی دو پارٹیاں علی گڑھ میں مشہور تھیں۔ آپ صاحبزادہ صاحب کے جاں نثار دوستوں میں تھے اور ان کی حمایت میں انہوں نے ڈاکٹر ضیاءالدین کو ناک چنے چبوا دیئے۔ جب تک ڈاکٹر ضیاءالدین زندہ رہے ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا احتساب حبیب اللہ صاحب کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ان کے مکان میں ایک کمرہ محض ڈاکٹر ضیاءالدین کے خلاف ریکارڈ جمع کرنے کے لئے وقف تھا لیکن جس دن ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر آئی سارے کاغذات میں اپنے ہاتھ سے آگ لگا دی اور کہا کہ مرحوم کو خدا معاف کرے اب ان کے عیوب کی تشہیر درست نہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈپٹی حبیب اللہ صاحب نے علی گڑھ کو مستقلاً اپنا وطن بنا لیا اور یہیں اپنی شاندار کوٹھی بنوائی جس کا نام اپنے عزیز ترین دوست میر ولایت حسین صاحب کے نام پر "ولایت منزل" رکھا۔ ڈپٹی صاحب نے شادی تمام عمر نہیں کی۔ اپنا مکان یونیورسٹی کے نام لکھ دیا ہے۔

"ولایت منزل" علی گڑھ میں مرجع خلائق ہے۔ علی گڑھ کے تمام اکابر اور ارباب اقتدار یہاں آ کر نذرانۂ ادب پیش کرتے ہیں۔ مولوی محمد طفیل صاحب منگلوری بھی ڈپٹی صاحب کے عزیز ترین دوست تھے اور انہی کے مشورے سے علی گڑھ میں بیٹھ کر انہوں نے "مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھی۔ خود ڈپٹی صاحب نے صاحبزادہ آفتاب احمد کی سوانح عمری "حیاتِ آفتاب" کے نام سے شائع کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس صنفِ ادب میں یہ ایک وقیع اضافہ ہے۔ "میرا علی گڑھ" کے نام سے علی گڑھ کی ایک تاریخ لکھ رہے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مکمل ہونے پر علی گڑھ کی سب سے معتبر تاریخ ہوگی کیونکہ علی گڑھ سے متعلق ڈپٹی صاحب کے پاس ہر طرح کا مواد محفوظ ہے۔ شاید ہی اس تحریک پر اتنا بڑا ذخیرہ کسی کی ملکیت میں ہو۔

ڈپٹی صاحب اب کافی ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے اور بینائی بھی کمزور ہے۔ اپنی کتاب اس طرح تصنیف کر رہے ہیں کہ لیٹے لیٹے مولوی محمود الحسن صاحب کو بولتے جاتے ہیں۔ مولوی محمود الحسن صاحب جنہیں لوگ مسکین صاحب بھی کہتے ہیں، یہاں بچوں کے اسکول میں مدرس ہیں اور ڈپٹی صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی۔ ہر جمعہ کو انہی کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جاتے ہیں۔ اس وقت شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس ہوتے ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد سرسیّد کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں اور یہی معمول چلا آ رہا ہے۔ علی گڑھ کی کوئی بات اس وقت تک مستند نہیں سمجھی جاتی جب تک ڈپٹی صاحب اس کی تصدیق نہ کر دیں۔ یونیورسٹی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی ہے۔

مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی

یہ بزرگ بھی اسّی سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ نورانی داڑھی اور مقدس چہرہ۔ سر پہ گوشیہ ٹوپی اور ہاتھوں میں کپڑے کا بنا ہوا ایک تھیلا۔

جس میں طرح طرح کے کاغذات بھرے ہوئے ۔ یہ بجا طور پر علی گڈھ کے "نول کشور" ہیں ۔ سر سید نے جب علی گڈھ میں انسٹی ٹیوٹ پریس قائم کیا تو اس کا انتظام و انصرام ان کے سپرد ہوا ۔ وحید الدین سلیم کے بعد انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت بھی آپ ہی کے سپرد ہوئی ۔ ان کے اہتمام میں نہ جانے اردو کے کتنے بیش بہا جواہر زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے ۔ یونیورسٹی پریس کی کتابیں کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت پہلے اپنا معیار قائم کر چکی تھیں ۔ نواب اسحٰق خاں مرحوم نے ایک زمانے میں میر خسرو کے کلیات مختلف حصوں میں اس دور کے علی ترین محققوں سے مرتب کرا کے آرٹ پیپر پر آپ ہی کے اہتمام میں شائع کرائے تھے اور اس کام کے لئے ایک گراں قدر رقم صرف کی تھی ۔ مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اُردو اورنگ آباد سے نکالتے تھے تو اس کی طباعت علی گڈھ میں محمد مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں ہوتی تھی ۔ رشید احمد صدیقی کا رسالہ سہیل بھی ان کے اہتمام میں آرٹ پیپر پر چھپا کرتا تھا ۔

فارسی و اردو کتابوں کی اتنے اعلیٰ پیمانے پر طباعت و اشاعت کے اہتمام کے علاوہ مقتدیٰ صاحب خود بھی زبردست علم و فضل کے مالک ہیں اور متعدد علمی و تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جو مخطوطات و نوادر ہیں وہ سب آپ کی نظر میں رہتے ہیں اور اس پیرانہ سالی میں بھی وہ ان کی اشاعت اور ترتیب و تدوین کے متعلق اسکیمیں بناتے رہتے ہیں ۔ ۱۹۵۱ء میں جب ایم ۔ اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا کام میں نے سنبھالا تو اس کا پہلا پرچہ نکلتے ہی موصوف میرے دفتر میں تشریف لائے اور بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اس کی ترتیب و اشاعت سے متعلق اپنے تجربات مجھے بتاتے رہے ۔ اس وقت یہ تعلق ایسا بڑھا جو اب تک قائم ہے ۔ اب بھی جب کہیں راستے میں نظر آ جائیں گے تو رک کر گھنٹوں باتیں کریں گے اپنے جھولے سے کچھ کاغذات نکال کر مجھ کو دکھائیں گے اور اپنے اشاعتی پروگرام کی مجھ کو اطلاع دیں گے ۔ ان کے اس ذوق شوق اور محنت کو دیکھ کر ہم نوجوانوں کو شرم آتی ہے ۔

ایک زمانے میں علی گڈھ میں انجمن اردوئے معلیٰ کے اہتمام میں ایک "اردو کانفرنس" ہوئی تھی جس میں خطبہ دیتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے محمد مقتدیٰ خاں شروانی کی خدمات کو بہت سراہا تھا اور کہا تھا کہ یہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اردو زبان کی ایک اکیڈیمی یا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے اور اس کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی جائے ۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی یہاں کے اخبار "علی گڈھ" اور "جمہور" میں چھوٹے چھوٹے مزاحیہ اور ظریفانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں جن میں ان کا اپنا اسلوب نگارش ہے ۔ ان مضامین پر "مخش" لکھا ہوتا تھا ۔

وہ جب کسی سے باتیں کرتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کہے جائیں اور دوسرا ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہے ۔ سننے والا اگر بے صبر ہے اور بیچ میں اپنی کوئی بات چھیڑ دیتا ہے یا انہیں کچھ بتانے لگتا ہے تو وہ فوراً ٹوک کر "معلوم معلوم" کہیں گے اور اگر اس پر بھی وہ بولتا رہے تو "معلوم معلوم معلوم معلوم" بہت تیزی سے کہنا شروع کر دیں گے ۔ یہاں تک کہ وہ بے چارہ گھبرا کر خاموش ہو جائے گا اور پھر انہی کی سننے لگے گا ۔

شروانی خاندان کے شجرہ اور اس کی تاریخ سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں ۔ نواب مزمل اللہ خاں شروانی کی سوانح حیات بھی مرتب کر رہے ہیں اور آج کل جب ملتے ہیں تو سو سو طرح سے اس کا ذکر کرتے ہیں ۔

منشی نجم الدین

چھوٹے قد کے ایک خستہ سال معمر بزرگ ہیں جو کئی اہمیت سے علی گڈھ کے پرانے لوگ واقف ہیں ۔ یہ سر سید کے ملازم تھے ۔ ان کی وفا شعاری اور خدمت گذاری کی وجہ سے سر سید انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور پیار سے "میرا ٹٹو" کہا کرتے تھے ۔ چنانچہ یہ نام ایسا چلا کہ اب تک انہیں "سر سید کا ٹٹو" کہا جاتا ہے ۔ ان کے پاس سر سید ، حالی ، شبلی ، محسن الملک ، ذکاء اللہ ، راس مسعود وغیرہ کی تصانیف موجود ہیں جو خود

مصنفین نے اپنے دستخط کے ساتھ انہیں تحفے کے طور پر دی تھیں۔ نیز ان کے نام ان کے بہت سے خطوط اور ان بزرگوں کی دستخطی تصویریں ہیں۔ اس نادر ذخیرے سے مختار الدین احمد آرزو صاحب نے فائدہ اٹھایا ہے اور منشی صاحب سے متعلق ایک مستقل مضمون "نئی تحریریں" (۱) میں شائع کرایا ہے جس میں بہت سے خطوط اور ان کے عکس بھی شامل ہیں۔ شبلی کی نوجوانی کی ایک تصویر بھی ان کے پاس محفوظ تھی جو رسالہ آج کل (دہلی) میں شائع ہوئی۔ اب کافی ضعیف ہو گئے ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر سے متعلق ہیں اور کتابوں اور مسودات کی نقل کا کام کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ علی گڑھ کے ایک مکان کا جغرافیہ اور وہاں کے رہنے والوں کے متعلق ایک ایک تفصیل ان کو یاد ہے اور سر سید اور ان کے معاصرین کی ایک زندہ یادگار ہیں۔

مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم

بہت موٹے اور بھدے خدوخال کے ایک پستہ قد اور گول مٹول سے بزرگ تھے۔ شخصیت میں کوئی وجاہت یا جاذبیت نہ تھی۔ خاموش طبع تھے۔ ان کو میں نے اکثر یونیورسٹی مارکیٹ یا انجمن ترقی اردو ہند کے آس پاس اس طرح چلتے ہوئے دیکھا تھا جیسے بیگ رہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ "وقارِ حیات" کے مصنف مولوی اکرام اللہ خاں ندوی یہی ہیں۔ مولوی صاحب، ندوہ کے لائق فرزند اور شبلی کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ شبلی کی زندگی ہی میں الندوہ کی ادارت کی۔ بعد میں نواب صدر یار جنگ ان کو ایجوکیشنل کانفرنس میں لائے اور مستقل طور پر اسی سے وابستہ رہے۔ "کانفرنس گزٹ" کی ادارت اور تصنیف و تالیف کا کام آپ کے سپرد تھا اور نہایت خاموشی سے اپنے تحقیقی و علمی مشاغل میں لگے رہتے تھے۔ وطن شاہجہان پور تھا لیکن علی گڑھ میں بس گئے تھے اور کانفرنس کمپاؤنڈ کے ایک مکان میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔

سلطان حیدر جوش

اردو افسانہ نگاری کے دورِ اولین کی باقیات میں سے تھے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور عرصہ تک ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ شیخوپور بدایوں وطن تھا لیکن ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جس زمانے میں میں نے انہیں دیکھا ہے ان کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن چہرے پر وہی رونق اور فارغ البالی تھی۔ گورے چٹے تھے اور دیکھنے میں انگریز معلوم ہوتے تھے۔ عام طور پر مکمل سوٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ سر کے بال تقریباً غائب ہو چکے تھے اور داڑھی آخر عمر تک منڈاتے تھے۔ سنا ہے پہلے احاطہ مینڈھو ہاؤس کے قریب کہیں رہتے تھے لیکن آخر عمر میں میرس روڈ کی ایک کوٹھی "حامد منزل" میں فروکش تھے۔ ایک بار ابوالفضل صدیقی کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ تقریباً بہرے ہو چکے ہیں۔ صدیقی صاحب کانوں کے پاس چلا چلا کر ان سے کچھ باتیں کرتے رہے اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ کئی سال ہوئے علی گڑھ ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے احسان حیدر صاحب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، بعد میں انگلستان چلے گئے اور اب سنا ہے کراچی میں ہیں۔ جوش صاحب کی صاحبزادی محمودہ انور ہیں گرلس کالج میں لکچرر ہیں۔

ظفر عمر

"نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری" کے مصنف ظفر عمر علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ تھے۔ وطن بنوٹ ضلع بلند شہر تھا۔ ان کے نام کے بارے میں ایک روایت یہاں سننے میں آئی کہ اصل نام ظفر علی تھا۔ ان کے باپ کو کسی شیعہ بزرگ نے طعنہ دیا کہ حضرت، آپ سنی ہیں، لیکن "علی" کا

پیچھا نہیں چھوڑتے، اس پر ان کے باپ نے "ظفر عمر" نام رکھ دیا۔ علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد پولیس کے محکمہ میں ملازم ہو گئے اور اس میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے جاسوسی ناول اسی زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں نے اتنی مقبولیت حاصل کی اور ان سے اتنی آمدنی ہوئی کہ کئی ناولوں کے نام پر علیگڑھ میں انہوں نے ایک ایک مکان بنوایا "نیلی چھتری" "چوروں کا کلب" اور "لال کھنڈر" تینوں کوٹھیاں شمشاد مارکیٹ سے قلعہ کی طرف جانے والی سڑک پر ہیں۔ "نیلی چھتری" میں خود رہتے تھے۔ ایک بار دور سے انہیں دیکھنے کا موقع ملا جب وہ ریٹائر ہو کر مستقل طور پر یہیں مقیم تھے۔ وجیہہ آدمی تھے لیکن ایک بار گوکھا کانٹا نہ بننے اور ایک ٹانگ کاٹ دینی پڑی۔ آخر عمر میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور اس کے زبردست کارکن تھے۔ ان کی صاحبزادی سے اختر حسین رائے پوری کی علی گڑھ ہی میں شادی ہوئی۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر عبد العزیز میمن

اس وقت پوری دنیا میں عربی زبان کے مسلّم الثبوت ادیب اور محقق ہیں۔ عربی علوم کے سلسلے میں آپ کا نام طٰہٰ حسین اور بہ وفیسر کرنکو کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کی بے شمار کتابیں بیروت اور مصر سے اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں شائع ہو چکی ہیں اور وہاں کے اہل زبان سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ہندوستان میں عربی کو اس طرح مادری زبان کے مانند لکھنے اور بولنے والے بہت کم ادیب پیدا ہوئے ہوں گے میمن صاحب راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم باقاعدہ کسی درسگاہ میں نہیں حاصل کی اور نہ ہی ڈگری کے نام کی کوئی شے ان کے پاس ہے۔ مختلف علماء کی خدمت میں رہ کر حاصل کی اور خود ذہانت اور محنت سے استعداد میں اضافہ کیا نذیر احمد کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ نذیر احمد کے علم و فضل کے ساتھ ان کی خست اور کنجوسی بھی میمن صاحب کے حصے میں آئی ہے۔ لاکھوں روپے جمع کر رکھے ہیں اور خود اتنے معمولی طور پر رہتے ہیں کہ باہر سے آنے والا شخص پہچان بھی نہیں سکتا کہ یہی علامہ عبدالعزیز میمن ہیں۔ شکل و صورت سے تاجر معلوم ہوتے ہیں۔ پیوڑا پچکا چہرہ، لمبا قد، بہت چوڑا ماتھا، خشخشی داڑھی اور چوڑی مہری کا پاجامہ۔ سر پر مارواڑیوں کے انداز کی ایک ٹوپی۔ اکثر ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل سے بازار کی طرف جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سائیکل پر ایک بڑا سا تھیلا بھی لٹک رہا ہوگا۔ بازار سے سبزی ترکاری، اناج، مسالے تمام ضروریات کی چیزیں خود خرید کر لائیں گے اور دوکانداروں سے ایک ایک پیسے پر گھنٹوں تکرار کریں گے۔ ایک بڑا سا مکان بھی بنوا رکھا ہے۔ اور اس کے مختلف حصے کرائے پر اٹھا رکھے ہیں۔ کرایہ اس سختی سے وصول کرتے ہیں کہ کوئی سود خوار پٹھان اپنا قرض بھی اس طرح نہ وصول کرتا ہوگا۔ نہ صرف روپے پیسے کے معاملے میں بلکہ علم کے معاملے میں بھی ان کا بخل اسی درجے کا ہے۔ ان سے کسی سلسلے میں استفادہ کرنا اور کچھ معلوم کر لینا یا اپنی ریسرچ کے سلسلے میں مدد لینا آسان کام نہیں۔ میرے علم کے مطابق اب تک اس مقصد میں محض ان کے شاگرد مختار الدین آرزو صاحب کامیاب ہوئے ہیں۔ مئی جون کی چلچلاتی دوپہریں میمن صاحب ان کو ریسرچ میں مدد دینے کے لئے بلاتے تھے لیکن آرزو صاحب کو بھی کام کرنے کی وہ دھن تھی کہ دو سال تک بلا ناغہ حاضری دیتے رہے اور کام ختم کر کے چھوڑا۔

میمن صاحب ویسے کافی ظریف اور بذلہ سنج آدمی ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں خوب مزے لے لے کر کرتے ہیں جہاں کسی نے بیچ میں کوئی علمی مسئلہ چھیڑ دیا تو فوراً کہیں گے "اجی حضرت آپ کن دھندوں میں پڑ گئے چھوڑیئے اس کو بتائیے کشمیر کے سلسلے میں پاکستان نے اب کیا بیان دیا ہے"۔ میمن صاحب کے مکان میں نہ تو کوئی آراستہ ڈرائینگ روم ہے۔ اور نہ ہی بیٹھنے کا کوئی کمرہ۔ کھرّی چارپائی پر لیٹے ہوئے حقّہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ تمباکو بڑا اچھا پیتے ہیں اور طرح طرح کے تمباکوؤں کو ملا کر تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے تمباکو اور امین آباد لکھنؤ میں ملّانی کے یہاں کی بنی ہوئی خوبصورت چلموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ شام کو ان کی نشست احمدی نابینا اسکول

کے ایک نابینا مدرس کے یہاں رہتی ہے۔ یہ نابینا مدرس خود باغ و بہار آدمی ہیں اور سارے علی گڑھ کی خبروں کی کنجی۔ یمین صاحب روزانہ ان کے پاس سے ہر طرح کی مقامی اطلاعات کا ذخیرہ جمع کر کے اپنے گھر واپس جاتے ہیں۔ گھر پر ایک ریڈیو بھی ہے لیکن گھڑی دیکھ کر ٹھیک اسی وقت ریڈیو کھولتے ہیں جب خبریں آ رہی ہوں۔ کوئی اور پروگرام نہیں سنتے۔

علامہ اقبال کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں انہی کے توسط سے مجھے جگہ ملی تھی۔ اقبال کے ذاتی حالات سے متعلق ان کے پاس معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ مختار الدین آرزو صاحب کے ساتھ مجھے اکثر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں خاص طور سے اسی موضوع کو چھیڑ دیتا تھا اور ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق میں عربی کے اشعار پڑھتے ہیں اور ان کا مطلب اردو میں بڑے عمدہ طور پر سمجھاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں شعبہ عربی کی چیئرمین شپ سے سبکدوش ہو چکے تھے لیکن اس کے بعد بھی علی گڑھ ہی میں قیام رہا۔ پچھلے سال انہیں پاکستان میں علوم اسلامی کے تحقیقی ادارہ کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا ہے اور سنا ہے وہاں اٹھارہ سو روپے تنخواہ ہے۔ اب بھی چھٹے چھ ماہے آتے رہتے ہیں۔

پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری

سنسکرت کے عالم ہیں اور یونیورسٹی میں سنسکرت کے استاد۔ ویدانت اور اسلامی تصوف دونوں پر آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور مختلف فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے مضامین جامعہ اور ہندستانی وغیرہ میں چھپا کرتے تھے جس میں ان کا مضمون "راس لیلا" خاص طور پر اہم ہے جس میں کرشن کے رقص اور راس کے مختلف پہلوؤں کی رمزیت اور اشاریت کی فلسفیانہ توجیہہ کی ہے۔ اردو میں ایک کتاب "رس یا فلسفہ انشاط" کے نام سے لکھی تھی جو مسلم یونیورسٹی پریس سے محمد مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب پنڈت جی نے "ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال" کے نام معنون کی تھی۔ سادہ وضع رکھتے ہیں۔ دیکھنے میں عالمانہ وقار کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جب بولتے ہیں تو مجلس پر چھا جاتے ہیں۔ شعبہ فلسفہ و نفسیات کے اہتمام میں اکثر آپ کے توسیعی لکچر ہوئے ہیں جن میں میں بھی شریک رہا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ علمی تصوف سے بھی لگاؤ ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور کے یہاں اکثر نشست ہوتی ہے، اور تصوف و روحانیت کے موضوع پر گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں۔ حقے سے بھی شوق ہے۔ جس زمانے میں میرا قیام وحالی روڈ پر تھا تو میں نے انہیں مولوی مشتاق حسین صاحب (اورینٹل اسسٹنٹ لٹن لائبریری) کے پاس خوشبودار تمباکو پیتے اور رک رک کر باتیں کرتے سنا ہے۔ شمشاد بلڈنگ کے ایک معمولی کوارٹر میں رہتے ہیں اور سارا وقت مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ اپنے صاحبزادے کی آوارگی سے بہت نالاں رہتے ہیں

مولانا ضیاء احمد بدایونی

"دیوانِ مومن" کے شارح و مرتب مولانا ضیاء احمد بدایونی فارسی و عربی کے زبردست عالم و محقق اور اسلامی فقہ و تصوف فلسفہ و منطق اور عروض و بیان کے مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان چند علماء میں ہوتا ہے جن سے آئے دن ہزارہا محقق و تنقید نگار اور علمی و ادبی کام کرنے والے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جب کوئی علمی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو مولانا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور وہ اسے باتوں باتوں میں پانی کر دیتے ہیں یہاں کے ایک نوجوان اور ذہین ادیب مولانا کے تبحر علمی کے اس لئے قائل نہیں تھے کہ انہوں نے موٹی موٹی کتابوں کی تصنیف نہیں کی ہے اور نہ ہی پیشہ ور مصنف کی طرح نام کمایا ہے۔ ایک بار یہی حضرت جو غالب پر ریسرچ کر رہے تھے اور فارسی کے

حصص شعراء کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں اپنی ذہانت کے علاوہ ملک کے متعدد مشہور ادیبوں اور نقادوں سے رجوع کر چکے تھے بالآخر
جب مولانا کے پاس تشریف لے گئے تو مولانا نے چند منٹوں میں ساری دقتیں حل کر دیں اس کے بعد وہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ سب سے
کہتے تھے "واقعی یہ شخص خلیج فارس کا مگرمچھ ہے"۔ اس تشبیہ میں جہاں ان صاحب کی ذہانت اور مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے
حلیئے اور چال ڈھال کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پچاس سال سے زائد عمر ہو گی۔ توند نکل آئی ہے۔ متشرع شباہت اور چوڑی مہری کا اونچا پائجامہ
ہاتھوں میں چھڑی۔ چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ رینگ رہے ہیں اور پھنکارتے جا رہے ہیں۔

مولانا بدایوں کے ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرافت، وضعداری، دردمندی اور حلم و بردباری آپ پر ختم ہے۔ علم کا غرور
جو ہمارے بیشتر علماء کا تکیہ کلام ہے مولانا میں چھو بھی نہیں گیا ہے۔ مولانا شبلی کے طرز کی نعتیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور پرانے انداز کی غزلیں بھی۔
ان کی نظموں کا مجموعہ "تجلیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انجمن اردوئے معلی کے جلسوں میں رشید صاحب کے اصرار سے اپنی غزلیں ترنم سے
پڑھتے ہیں۔ انہیں جب بھی میں نے معصومیت سے پڑھتے سنا ہے تو بے ساختہ مرحوم حسرت موہانی کی یاد آ جاتی ہے۔

علی گڑھ میں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں بیت الحبیب کے نام سے بنوایا ہے۔ شعبہ فارسی میں ریڈر ہیں اور ہمہ وقت مطالعے میں مشغول
رہتے ہیں۔ افسوس ہے ان کی اولاد میں بھی کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا۔

خواجہ منظور حسین

علی گڑھ کے ان چند فرزندوں میں ہیں جن پر علی گڑھ نے ہمیشہ ناز کیا ہے۔ ان کے علمی وقار اور تنقیدی نظر کا نہ صرف ہندوستان کے چوٹی
کے ادیب اعتراف کرتے ہیں بلکہ انگلستان اور فرانس وغیرہ میں ان کا قول سند مانا جاتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ اور ای ایم فارسٹر جیسے مشاہیر
آپ کے گہرے دوستوں میں ہیں اور انگریزی ادب کے ملک گیر اول درجے کے ادیب اپنی تصانیف خواجہ صاحب کو بطور تحفہ بھیجتے ہیں اور ان کی رائے طلب کرتے ہیں۔ پروفیسر احمد علی نے اپنی انگریزی کتاب
T.S. Elot's Prey World of Dream.
خواجہ صاحب کے نام معنون کی ہے۔ تاتائی نے چین کی بہترین کہانیوں کو پہلی بار اردو میں خواجہ صاحب کے ہی ایماء سے منتقل کیا
اور انہی کے نام اپنی کتاب "زندہ چین" کا انتساب کیا۔ آل احمد سرور جیسے فاضل نقاد خواجہ صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب "تنقید کیا
ہے" خواجہ صاحب کے نام معنون ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے "نیا افسانہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں بہت کچھ خواجہ صاحب کی
رہنمائی کو دخل ہے جس کا انہوں نے اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

علی گڑھ میں خواجہ صاحب شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ کو اپنا مستقر بنا لیا
تھا اور یہیں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں بنوایا تھا۔ ان کی شادی یہیں کے پروفیسر ایم ایم شریف (سابق صدر شعبہ فلسفہ) کی صاحبزادی سے ہوئی
تھی اور اس طور پر میاں افتخار الدین اور احمد شاہ بخاری پطرس کے ہم زلف ہوتے ہیں۔ دہلی کے شرفاء میں سے ہیں۔ ان کے اسلاف میں سے
ایک باکمال شخص خواجہ صاحب گزرے ہیں جن کا ذکر اشرف صبوحی نے اپنی کتاب "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں کیا ہے۔

خواجہ صاحب خوبصورت آدمی ہیں۔ گورا چٹا رنگ، میانہ قد، کلین شیوڈ۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے۔ عام
گفتگو میں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان ہوتی تھی۔ ان کو میں نے صرف ایک بار انگریزی
میں تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب ای ایم فارسٹر علی گڑھ آئے تھے اور یونین ہال میں خواجہ صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ شعبۂ
انگریزی کی "ریلے لٹریری سوسائٹی" میں خواجہ صاحب ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر ایک دقیع مقالہ انگریزی میں پڑھتے تھے۔ اس مقالے
کو سننے کے لئے لوگوں کو کتنا اشتیاق ہوتا تھا اور کتنے مشاہیر اس مجلس میں موجود ہوتے تھے اس سے علی گڑھ والے خوب واقف ہیں۔

خواجہ صاحب انتہائی خلیق اور ملنسار ہیں۔ ایک معمولی طالب علم بھی ان کے یہاں پہنچ جاتا تھا تو گھر سے فوراً نکل آتے اور گھنٹوں اس کے ساتھ اپنے لان میں ٹہل ٹہل کر باتیں کرتے۔

اپنے دوست تصور حسین زیدی کے ساتھ جو اس زمانے میں ایم اے کے طالب علم تھے مجھے بارہا ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ خواجہ صاحب کا ادبی نقطۂ نظر بہت سلجھا ہوا تھا، ترقی پسند شعراء میں فیض اور جذبی اور افسانہ نگاروں میں بیدی کے قائل تھے۔ کرشن چندر اور سردار جعفری کے ادب میں جو صحافتی عنصر ہے اس پر کڑی تنقید ہم لوگوں نے خواجہ صاحب سے اس زمانے میں بھی سنی ہے۔ جب ان کی شہرت و مقبولیت حد درجہ بڑھی ہوئی تھی۔ جذبی صاحب پر بطور خاص شفقت فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام "فروزاں" کی ترتیب و انتخاب میں خواجہ صاحب کو ہی رہنما بنایا۔

اردو میں خواجہ صاحب نے کوئی مستقل کتاب شائع نہیں کی لیکن اردو ادب میں خواجہ صاحب کی خدمات سے اہل نظر واقف ہیں۔ وہ ان چند ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے فرانسیسی اور روسی ادب کے شاہکاروں کو اردو ادب میں منتقل کیا۔ آج بھی علی گڑھ منتھلی، جامعہ اور اردو کے پرانے فائلوں میں خواجہ صاحب کے ترجمے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک طویل مقالہ "ادب اور اخلاق" بھی لکھا تھا جو علیگڈھ کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ دراصل خواجہ صاحب کا علم اور شعور اب اس درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنی لکھی ہوئی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ کوئی تحریر جب تک خود میرے اپنے معیار پر پوری نہ اترے اسے کس طرح اشاعت کے لئے دے دوں۔ یہی سبب ہے کہ میر پر ان کی کتاب اب تک مسودے کی شکل میں ان کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ یہ کتاب اگر خواجہ صاحب کسی طرح چھپوانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو میرا خیال ہے اردو تنقید میں یہ سب سے معیاری اور قیمتی اضافہ ہوگا۔ خواجہ صاحب کی اپ شپ اور ان کی باتیں سن کر علی گڈھ کے بہت سے طالب علم اور لکچرر ادیب اور نقاد ہو گئے اور ادبی دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔ خواجہ صاحب کا ضبط دیکھئے کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ شہرت کی خواہش کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں نہیں پیدا ہوتی۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں خواجہ صاحب "علی گڈھ میگزین" کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے کے میگزین دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں خواجہ صاحب کے اس دور کے مضامین اب بھی اپنے طرز انشاء اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہیں۔ سجاد انصاری خواجہ صاحب کے عزیز ترین دوست تھے اردو میں اپنی نوعیت کے اکیلے فلسفیانہ اور فکر انگیز مضامین خواجہ صاحب کی تحریک سے پہلی بار لکھے گئے جسے خواجہ صاحب نے ان کی وفات کے بعد "محشر خیال" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کتاب اس زمانے میں مرتب ہو کر شائع نہ ہو گئی ہوتی تو آج اس جواں مرگ ادیب کو کوئی نہ جانتا۔

۱۹۴۸ء میں خواجہ صاحب پاکستان چلے گئے اور آج کل گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ سنا ہے اقبال پر ایک کتاب لکھی ہے اور اسے شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ کاش وہاں کے لوگ اس قیمتی متاع کو خواجہ صاحب سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

قاضی عبد الغفار

"لیلیٰ کے خطوط" کے جواں طراز اور جواں نگار مصنف جب تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے سیکرٹری ہو کر علی گڈھ تشریف لائے تو اس وقت ان پر خزاں کا عالم تھا، صحت جواب دے چکی تھی اور طبیعت بجھ سی گئی تھی پھر بھی شائستگی و نفاست اور تہذیب و شرافت کا ایک پیکر تھے۔ ان کو دیکھ کر کسی ایسے ملبوس کا گمان ہوتا تھا جو ابھی ابھی دھل دھلا کر آیا ہو اور گرد یا دھبے کا ہلکا سا نشان بھی نہ ہو۔ اپنے لباس

اور طرزِ رہائش کے اعتبار سے قاضی صاحب بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک ارسٹوکریٹ ادیب تھے لیکن مولانا کے برخلاف قاضی صاحب نہ تو خلوت پسند تھے اور نہ ہی انانیت کے اسیر۔ انتہائی ملنسار، نرم طبیعت، بُردبار اور عفو و درگزر سے کام لینے والے آدمی تھے یہی وجہ ہے کہ فریب کھانا اور پھر اس کی تجدید کرنا ان کی شخصیت کا ایک جزو بن چکا تھا۔ ان کی نرمی اور بھلمنساہٹ سے فائدہ اُٹھا کر بہت سے نالائق نہ صرف ان کو بلکہ انجمن کو نقصان پہنچاتے اور قاضی صاحب کی افسردگی اور آزردگی میں اضافہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ سخت علالت کے دوران میں بھی بستر پر بیٹھے لیٹے انجمن کا کام کیا کرتے اور سارے خطوط کا جواب خود دیتے۔ آخر عمر میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا اعتبار اُٹھ گیا تھا۔

نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کے لئے ہر طرح کمربستہ رہنا قاضی صاحب کا ایسا جوہر تھا جو پُرانی نسل کے لوگوں میں مجھے کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ آج سے کئی سال پہلے "ادب لطیف" میں میرا مضمون بہادر شاہ ظفر" چھپا تو انہیں بہت پسند آیا۔ رقعہ بھیج کر مجھے بُلایا اور بہت ہی تعریف کی اور کہا کہ جس نقطۂ نظر سے تم نے بہادر شاہ ظفر پر تنقید کی ہے وہ بالکل نئی چیز ہے اور بہت ہی قابل قدر۔ میری خواہش ہے کہ تم اسی نقطۂ نظر سے ظفر کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کر دو۔ میں اسے انجمن سے شایع کروں گا۔ اور اگر انجمن کی لٹریری کمیٹی نے نامنظور کر دیا تو اپنے خرچ سے طبع کراؤں گا۔ میں نے یہ انتخاب مرتب کر کے دیدیا۔ اتفاق کہ اسی زمانے سے قاضی صاحب پر سخت علالت کا دورہ پڑنے لگا اور ان کا زیادہ وقت حیدر آباد اور بمبئی میں علاج کے سلسلے میں صرف ہونے لگا اور میرا مسودہ انجمن کی فائل میں پڑا رہ گیا اور اب اس کی اشاعت کی نہ جانے کب نوبت آئے۔

علی گڈھ میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی طرف سے کوئی جلسہ ہوتا اور قاضی صاحب کو مدعو کیا جاتا تو اپنی ناتوانی کے باوجود آتے ایک بار کرشن چندر کی آمد کے موقع پر سالانہ جلسہ ہوا تو قاضی صاحب نے صدارت بھی کی اور خطبہ صدارت لکھ کر لائے۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا بار میرے کاندھوں پر تھا میں نے حسرت موہانی کی وفات پر ان سے ایک مضمون گزٹ کے لئے لکھنے کو کہا۔ دوسرے ہی دن قاضی صاحب نے یہ فرمائش پوری کی اور اس کا اصل مسودہ عنایت فرمایا اور کہا کہ یہ اب تمہارے اخبار کے علاوہ کہیں اور نہ بھیجا جائے گا یہاں کے چند اساتذہ نے آج سے دو سال قبل ایک علمی ادبی رسالہ "فکر و نظر" کے نام سے شایع کرنے کی اسکیم بنائی اور اشاعت کے لئے آپس میں چندہ کیا، اس رسالے کے لئے قاضی صاحب نے سب سے پہلے چندہ دیا اور انجمن کی طرف سے "فکر و نظر" کے لئے اشتہار بھی دلوایا۔ اس کی مجلس ادارت کا پہلا مشاورتی جلسہ قاضی صاحب نے خود اپنے یہاں کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک پُرتکلف دعوت بھی کی۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور جھجک جھجک کر کھا رہا تھا۔ قاضی صاحب نے فوراً بہت سی چیزیں میری طرف بڑھا دیں اور کہنے لگے میں تو اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے مرغن غذائیں ہضم نہیں کر سکتا لیکن میں نے آپ نوجوانوں کی دعوت اس لئے کی ہے کہ خود آپ کو کھاتے دیکھ کر مجھے ایک تسکین سی ہوتی ہے۔

علی گڈھ میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں مشاہیر شعراء تشریف لاتے ہیں اس موقع پر قاضی صاحب کے یہاں ایک دعوت اور شعر و شاعری کی نشست ضرور ہوتی تھی۔ اس میں علی گڈھ کے شعراء کو بھی بلاتے۔ اتنی ستھری شعر و سخن کی بزم میں میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

قاضی صاحب کا وطن مراد آباد میں تھا۔ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس کے بعد صحافتی دنیا میں داخل ہوئے اور مولانا محمد علی کے ساتھ ہمدرد و کامریڈ میں اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں کام کیا۔ خود بھی کئی اعلیٰ درجے کے اخبار نکالے جس میں "جمہور" اور "صباح" کلکتہ سے اور "پیام" حیدر آباد سے نکلا اور صحافت نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مثال قائم کی۔ قاضی صاحب کے قلم سے ایک سطر بھی ایسی نہ نکلتی تھی جو ایک مخصوص طرزِ نگارش کی حامل نہ ہو۔ اس درجہ کے صحافی اُردو زبان میں کم ہی گزرے ہیں۔

علی گڈھ میں ان کا قیام صاحبزادہ آفتاب احمد کی کوٹھی "آفتاب منزل" کے ایک حصّے میں تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم اور خوابگاہ دونوں میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا۔ وہاں نادر ترین کتابوں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی جوانی کی تصویر۔ سر یعقوب (جو قاضی صاحب کے خسر تھے)

ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کی تصویریں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ قاضی صاحب کے داماد چودھری محمد سلطان صاحب مسلم یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات میں ریڈر ہیں اور قاضی صاحب سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر نواب زاہد علی صاحب کی کوٹھی میں فروکش ہیں۔ اپنے نواسے عارف سلطان سے بہت پیار کرتے تھے اور اسے بیٹے کی طرح اپنے ہی ساتھ رکھتے تھے۔

۱۱؍ جنوری ۱۹۵۶ء کو تین بجے دن میں قاضی صاحب کا علی گڑھ ہی میں انتقال ہوگیا۔ علالت کا سلسلہ عرصے سے چل رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد ہم سے رخصت ہوجائیں گے۔ یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ دوسرے دن یونیورسٹی یونین میں بھی ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس جلسے میں یہاں کے طالب علموں اور استادوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آبدیدہ ہوکر کہا کہ "میں آپ لوگوں کو گواہ بنا کر یہ وصیت کرتا ہوں کہ اگر میں مرجاؤں تو میرے مرنے پر نہ کوئی جلسہ ہو اور نہ یونیورسٹی بند کی جائے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

ذاکر صاحب سے میری ذاتی واقفیت علی گڑھ سے پہلے کی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے جامعہ ملیہ دہلی میں عارضی طور پر کلرکی کی تھی۔ ذاکر صاحب کا قاعدہ ہے کہ وہ جہاں رہیں گے چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی ملیں گے، اس سے کرید کرید کر باتیں پوچھیں گے، اور طرح طرح سے اس سے تعلقات بڑھائیں گے۔ میں ذاکر صاحب کی شہرت و عظمت، اور ان کی تعلیمی خدمات کا پہلے ہی معترف تھا بلکہ جامعہ ملیہ کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں اس لئے دہلی گیا تھا کہ ذاکر صاحب کی تقریر سنوں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پہلی تقریر تھی جسے سن کر میری آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں اور دل پگھل گیا تھا۔ اب جامعہ کی کلرکی کے زمانے میں ذاکر صاحب کی شخصیت نے اور بھی مسحور کردیا اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے جیسے احباب کے سامنے کہنے میں جھجک ہوتی، میں بلاتکلف ذاکر صاحب سے کہہ دیتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرتے یا مجھے اس طرح مطمئن کردیتے کہ میں سرے سے اس ضرورت ہی کو مہمل سمجھنے لگتا۔ یہ ذاکر صاحب کا خاص آرٹ ہے اور اس جادو سے بچنا کم از کم میرے لئے مشکل ہے۔ میں جب کبھی ان کی خدمت میں کسی کام سے حاضر ہوا ہوں تو واپس آکر چاہے مقصد پورا نہ ہوا ہو لیکن یہی ہوا ہے کہ سو فی صدی کامیابی ہوئی ہے۔ بعض اوقات ذاکر صاحب لطف لینے کے لئے دانستہ بھی غلط باتیں کہتے ہیں اور کچھ اس طور سے کہ آدمی کو [illegible] ڈال دیتا ہے۔ پھر مسکراتے ہیں اور بڑے دلآویز طور پر کہتے ہیں کہ میں غلط کہہ رہا تھا آپ اتنی جلدی قائل کیوں ہو گئے۔ ذاکر صاحب بڑے بڑے خیالات اور اعلیٰ مقاصد کا اظہار کرنے والوں سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا اندازہ ہے کہ ایسے لوگ عام زندگی میں ناکام رہتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ جذباتی اور تخیل پرست ہوتے ہیں اور عمل کی صلاحیت سے محروم۔ ان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "کھٹ کھٹ کئے جاؤ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" یہی وجہ ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ مستقل مزاجی سے اپنے کام میں لگے رہنے والوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ زندگی میں جو چھوٹے چھوٹے کام، چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں اور بظاہر معمولی مطالبات ہیں انہیں حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں جو شخص ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے کرنے کا سلیقہ اور طریقہ نہیں رکھتا وہ بڑے بڑے کام بھی نہیں کرسکتا اور نہ ہی بڑی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک اور چیز سے میں بطورِ خاص متاثر ہوں اور وہ ان کا لکھنے کا طریقہ ہے۔ ذاکر صاحب اگرچہ پیشہ ور ادیب نہیں ہیں۔ ضرورتاً ہی کبھی کبھی مضمون یا خطبہ لکھتے لیکن ان کی ایک ایک سطر میں ان کا طرزِ نگارش عجیب جادو جگاتا ہے۔ میرا خیال ہے ذاکر صاحب ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں اور ان کی اس خصوصیت کو ہمارے بڑے بڑے پیشہ ور ادیب اور نقاد نہیں پہنچتے جنہوں نے ادب ہی کے لئے عمریں گنوائی ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز خالص تخلیقی ادب کا سا ہے۔ عموماً اس وقت لکھتے ہیں جب پانی سر سے گزرنے والا ہو لیکن اپنی تحریر میں اپنی

شخصیت کا سارا رچاؤ سمٹ آتا ہے۔ سادہ نثر اتنی دلآویز اور تخلیقی جوہر سے مالا مال کسی ادیب یا سیاستدان اور ماہرِ تعلیم کے یہاں مجھے نہیں ملی۔ خط لکھنے کا پیڈ سفید ہوتا ہے۔ اگر اس پر کچھ چھپا ہوا ہو تو الٹی طرف لکھتے ہیں۔ عموماً مضامین بھی بغیر لائن کے پیڈ پر لکھتے ہیں۔ سواد خط اس قدر خوبصورت ہے کہ دیکھتے ہی رہ جائیں، کہیں سے کوئی جملہ یا لفظ کٹا ہوا نہیں ہوتا، تحریر آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوتی ہے۔ گزٹ کی ملازمت کے دوران میں کانووکیشن کے موقع پر ان کی افتتاحی تقریر چھاپنے کے لئے مجھے جانا پڑتا تھا اور جب مسودہ میرے ہاتھ میں آتا تھا تو گھنٹوں دیکھا کرتا۔ کئی بار میں نے خود اسی طرح کا سینڈ رائٹنگ بنانے کی مشق کی لیکن بہت کم کامیابی ہوئی ویسے ان کے دستخط کی نقل میں اچھی خاصی کر لیتا ہوں۔

ذاکر صاحب میں ذہانت اور شائستگی دونوں بلا کی ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات تعلیم، معاشیات اور فلسفہ کے علاوہ دنیا بھر کے موضوعات پر اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں، جغرافیہ، سائنس، انجینئرنگ، طب، اور سرجری، تاریخ، ادب، شعر، تصوف، مذہب، رقص و موسیقی کوئی شعبہ نہیں جس پر ذاکر صاحب کی دسترس نہ ہو۔ اس موضوع پر ان سے اگر کسی تقریر یا جلسے کا افتتاح کرنے کے لئے بھی کہا جائے گا تو ایسی خیال انگیز باتیں کریں گے کہ اس کے بڑے بڑے ماہرین دنگ رہ جائیں گے۔ عموماً اس قسم کی معلومات وہ ثانوی ذرائع سے حاصل کرتے ہیں یعنی اس موضوع سے متعلق کسی کی باتیں سن کر یا کسی شخص سے کرید کرید کے کچھ پوچھنے کے بعد لیکن وہ اس علم کو اس طرح ہضم کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنے ذہن میں رچا بسا لیتے ہیں کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ذاکر صاحب اس کے منتہی نہیں ہیں۔

علی گڑھ کے استاد ورثے ان کو علم جو پیشہ کا پتہ دیتی ہے کہ یہ لوگ بغیر علم سے کام لینا نہیں جانتے۔ ہمارے یہاں پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر بابر مرزا جیسے تاریخ داں اور ماہرین سائنس موجود ہیں لیکن دنیا اور کہ اس لئے نہیں جانتی کہ ان کی تصانیف نہیں ہیں اور اگر ہیں تو برائے نام۔ ذاکر صاحب نے "یوم سرسید" کے موقع پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرسید کو دیکھئے کہ کام کرنے کی ایسی دھن تھی کہ فن زراعت، اہوسیوپیتھک، رسالہ تہذیب اور رسالہ طاعون تک لکھ ڈالا حالانکہ وہ ان فنون کے ماہر نہ تھے۔ لیکن ہمارے یہاں کے استاد ان کے ماہر ہو کر بھی آنے والی نسلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑنا چاہتے۔

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کے مضامین کا چاؤ تو مجھے اسی زمانے میں چل گیا تھا جب میں اعظم گڑھ میں نانی اسکول کا طالب علم تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے مضامین علی گڑھ کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں علی گڑھ کا گرویدہ ہو گیا تھا اور یہی مضامین مجھے یہاں کھینچ کر لائے۔ رشید صاحب کی تصویر "مضامین رشید" میں دیکھ چکا تھا، وہ ان کی شخصیت کے بارے میں ذہن طرح طرح کے نقوش بنایا کرتا۔ اعظم گڑھ سے چلنے لگا تو شبلی کالج کے پرنسپل بشیر احمد صدیقی صاحب نے جو رشید صاحب کے عزیز اور نسبتی بھائی تھے مجھے تعارفی خط دیا لیکن علی گڑھ میں اس تعارفی خط کا رشید صاحب پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ میرے پاس ضرور اسی وقت آئیے جب آپ کو ذیوٹی سوسائٹی سے قرض کی ضرورت ہو۔ اس قرض کی مجھے کئی بار ضرورت پڑی اور رشید صاحب کے یہاں جانا پڑا۔ گھر پر بار بار جاتا اور واپس آ جاتا کیونکہ اوّل تو مکان اسقدر لق و دق ہے کہ دروازے سے کمرے تک باوجود چلانے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے آواز نہ پہنچتی دوسرے یہ کہ اگر کوئی نوکر یا مالی یا مددگار بھی ہوا تو اس نے فوراً جواب دیا کہ "رشید صاحب گھر میں نہیں ہیں"۔ ناچار پھر شعبۂ اردو کا چکر لگاتا اور وہاں بھی موجود نہ ہوتے تو شعبۂ اردو کے چپراسی میاں خاں کی ہدایت کے بموجب بشیر الدین صاحب لائبریرین کے کمرے میں جاتا۔ چق اٹھا کر داخل ہوتا تو رشید صاحب بغیر کہے مقصد سمجھ جاتے اور درخواست پر رقم مطلوبہ کی منظوری لکھ کر مجھے کہتے کہ اسے خاں صاحب (عبدالمعید خاں آفس سپرنٹنڈنٹ ذیوٹی سوسائٹی) کے پاس لے جایئے۔ چنانچہ اس کے بعد ذیوٹی کے فارم کی خانہ پری اور رقم کی ادائیگی کا چیک حاصل کرنے میں خاں صاحب کے سو سو ناز اٹھانے پڑتے۔

اگرچہ پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ خاں صاحب بڑے رنگ دار آدمی ہیں اور ان کی باتیں نہ صرف دلچسپ ہوتی ہیں بلکہ ان کے پاس معلومات کا بے اندازہ ذخیرہ اور لطائف و ظرائف کا ایک خزانہ ہے۔ علی گڑھ کے ایک ایک شخص کی ساتوں پشت کی تاریخ کوئی ان سے پوچھے۔ ایسے ایسے [illegible] ہوں گے کہ آدمی دنگ رہ جائے اور سچ تو یہ ہے کہ میں ابتدا ہی میں بہار کے شخص کی اہمیت سے واقف ہو گیا تو اس میں خاں صاحب کی ان باتوں کا بہت کچھ فیضان ہے۔

رشید صاحب کی شخصیت کا شروع شروع میں مجھ پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے بھی وہ کچھ یونہی سے ہیں۔ لباس اور چال ڈھال سے کسی طرح نہ پروفیسر معلوم ہوتے ہیں نہ ادیب اور نہ ہی کوئی قابل ذکر شخص۔ جو آدمی ان کو نہ جانتا ہو وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہی رشید احمد صدیقی ہیں۔ دور سے دیکھ کر ان کو کوئی مزاح نگار تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ایک آدھ جلسوں میں انہیں تقریر کرتے سُنا تو اندازہ ہوا کہ تقریر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور صرف ٹالنے یا معذرت کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک آدھ فقرے ضرور مزہ دے جاتے تھے لیکن خود ان فقروں کو ادا کرتے ہوئے رشید صاحب کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ ہوتا۔

رشید صاحب سے صحیح معنوں میں ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میں بی اے کا طالب علم تھا اور آتش پر میرے مقالات بالاقساط نگار میں شائع ہو رہے تھے۔ غالباً نیاز صاحب نے ان کو لکھا کہ علی گڑھ کے یہ کون صاحب ہیں جن کے مضامین آتش پر ہیں تو رشید صاحب کو میری جستجو ہوئی اور یہ جان کر انہیں بڑا تعجب ہوا کہ میں وہی شخص ہوں جو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض لینے کے لئے انہیں اکثر گھیرتا ہے۔ پھر تو رشید صاحب بہت مہربان ہو گئے۔ کہا کہ جب مجھ سے ملنے گھر آیا کرو تو اپنا نام ضرور بتا دیا کرو کیونکہ میں نیکر اور بنیائن پہنے ہوئے اپنے باغیچے میں کام کرتا رہتا ہوں۔ غیر ضروری آدمیوں سے ملنے کے لئے کپڑے بدل کر باہر آنا اور پھر ان کے لئے کرسیاں اور مونڈھے نکلوانے میں زحمت ہوتی ہے اور علی گڑھ ایسی جگہ ہے کہ اگر جھوٹ نہ بولا جائے تو سارا دن اسی کی نذر ہو جائے۔

رشید صاحب سے قریب آنے کے بعد پہلا تاثر زائل ہو گیا اور آہستہ آہستہ ان کی شخصیت میں دلکشی نظر آنے لگی۔ اب ان کی باتوں اور ان کے فقروں میں مزہ آنے لگا۔ اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ فطری طور پر ایک مزاح نگار ہی ہیں۔ بی اے تک میرے پاس اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے نہیں تھا۔ میرا ارادہ فلسفہ یا معاشیات میں ایم اے کرنے کا تھا لیکن رشید صاحب کے مشورے سے میں نے اردو میں ایم اے کرنے کا ارادہ کر لیا اور ان کا طالب علم ہو گیا۔ رشید صاحب کلاس میں لکچر نہیں دیتے بلکہ باتیں کرتے ہیں اور بسا اوقات موضوع سے بہک بھی جاتے ہیں لیکن ہم لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ وہ انتہائی ذہین اور طباع آدمی ہیں اور ان کا ایک ایک لفظ اپنے اندر علم و ادب کا بیش بہا خزانہ رکھتا ہے۔ یہ معلومات چاہے امتحان کے لئے کام نہ آئیں لیکن زندگی میں ادب و شعر کو پرکھنے میں بہت [illegible] ثابت ہوتیں۔ رشید صاحب ڈیپارٹمنٹ کے اسٹاف روم میں بجائے چیئرمین کی کرسی کے ایک نیچی سی آرام کرسی پر بیٹھتے اور وہاں سے بیٹھے بیٹھے دوسرے اساتذہ سے باتیں کرتے۔ سمینار میں بیٹھ کر چوری چھپے ہم سب یہ باتیں سنتے اور مزے لیتے۔ انجمن اردوئے معلی کے جلسوں میں بھی رشید صاحب کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے قابل ہوتی۔

رشید صاحب کی ایک خصوصیت کا میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ اپنے لوگوں کا ہر طرح ساتھ دیتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی غلطیاں کرے اور غیر ذمہ داری کا مرتکب ہو۔ اس میں ڈیپارٹمنٹ کے چپراسی، مالی، خانساماں سے لے کر معین الدین صاحب بہت سے اساتذہ اور طالب علم بھی شامل ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے دوست کے مقابلے میں اگر حضرت جبرئیل بھی آسمان سے اتر کر آئیں تو میں دوست ہی کی حمایت کروں گا۔

رشید صاحب صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فنکار ہیں۔ کتابوں سے زیادہ ان کی توجہ زندگی کے مشاہدات پر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کتابیں تو اکثر انسانی ذہن کو بنجر بنا کر چھوڑ دیتی ہیں اور اس سے سارا رس اور قوت نچوڑ لیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان محققوں کے کچھ بہت زیادہ

قائل نہیں جو ولی کے سن وفات یا مصحفی کے سال پیدائش کی تحقیق میں برسوں لگاتے ہیں یا سیکڑوں صفحے سیاہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر طرح کی بہت سی معلومات جمع کرنا اور اپنے ذہن کو ایک کباڑ خانہ بنا لینا انسان کی اُپج کو ختم کر دیتا ہے۔ اور اس کو شخصیت کی نرمی اور انسانی رشتوں کی لذتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان کے گھر میں کوئی کتب خانہ نہیں۔ ان کے پاس آئے دن تحفے میں کتابیں آتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ اسے لائبریری میں یا دوستوں کو دے دیتے ہیں۔ رسالے گھر کے بچے پڑھتے ہیں اور پھر بعد میں یونیورسٹی کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صاحب اُٹھا لے جاتے ہیں۔

شام کو رشید صاحب باقاعدہ اسٹاف کلب جاتے ہیں اور احباب میں بیٹھ کر برج کھیلتے ہیں۔ کھیل میں وہ ہار جیت کی کچھ ایسی فکر نہیں کرتے کھیل کے آداب اور اسپورٹس مین شپ کا ہر لمحہ لحاظ رکھتے ہیں۔ جوانی میں ٹینس کے بہت اچھے کھلاڑی تھے لیکن مسلسل صحت کی خرابی نے یہ مشغلہ چھڑا دیا۔

رشید صاحب کی گھریلو زندگی میں بڑی رونق اور چہل پہل ہے اور وہ پوری طرح اس کی گرفت میں رہتے ہیں۔ روپیہ جمع کر کے دولتمند بننے یا پوسٹ کی پوسٹ کتابیں لکھ کر تصنیفات کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ان کو آج تک فکر نہ ہوئی۔ کہتے ہیں یہ بازاری اور سستی قسم کے لوگوں کا کام ہے

ڈاکٹر عبد العلیم

ڈاکٹر عبد العلیم کو علی گڑھ کے بعض لوگ "گوتم بدھ" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی بُردبار اور بھاری بھرکم شخصیت، فلسفیانہ انداز میں کچھ سوچتے رہنا اور عموماً ہر بات کا "ہاں" یا "نہیں" یا کسی مختصر فقرے میں جواب دینا ہے۔ رنگ گورا، ان کے جسم کا ایک ایک عضو موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ناک نقشہ خوبصورت، داڑھی سرخ و سفید رنگ پر پھبتی ہے، سیاہ بال۔ عموماً چوڑی مہری کا پاجامہ اور شیروانی پہنتے ہیں۔ یہاں کے ہنگاموں کی صدارت ان کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ ہر جگہ پکڑے جاتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ فن انہیں خوب آتا ہے۔ ویسے بھی وہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو صدر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زبان دراصل بھری بزم میں کھلتی ہے۔ تنہائی میں ملئے تو دو دو چار قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی اور بیٹھے ہوں تو بڑی دلچسپ باتیں کریں گے۔ کسی پر فقرے کسیں گے، کبھی باتوں میں مزاح کا پہلو نکال دیں گے۔ ڈاکٹر علیم کا اصل جوہر ان کی تقریر میں کھلتا ہے۔ کوئی موضوع ہو، کسی مسئلہ پر مباحثہ یا سمپوزیم ہو، کسی مقالے پر تنقید و بحث، آزادی ہو یا ... وہ اس کے بارے میں ایسی واضح اور دو ٹوک اور مدلل باتیں کریں گے کہ سارے اُلجھے ہوئے دھاگے کھل جائیں گے۔

ڈاکٹر علیم یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر اور ادارہ علوم اسلامی کے نگران ہیں لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا درست نہیں کہ وہ عربی کے ادیب یا محقق ہیں جس طرح علامہ عبدالعزیز میمن وغیرہ۔ علیم صاحب نے جرمنی سے عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی لیکن ذاکر صاحب کی طرح دراصل وہ ایک ماہر تعلیم ہیں اور انہوں نے کسی ایک موضوع میں اختصاصی حیثیت حاصل کرنے کے بجائے اپنے علم کا دائرہ وسیع رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں فلسفہ، نفسیات، تاریخ و معاشیات، سیاسیات و علم مدن، شعر و ادب اور لسانیات پر یکساں عبور ہے اور ان میں سے ہر ایک پر بڑی پختہ رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں بہت کم تنقیدی مضامین لکھے ہیں لیکن یہ مضامین اپنی گہرائی اور جامعیت کے اعتبار سے ... ہیں۔ آج اردو میں کوئی ایسا ادیب نہیں جو اتنے کم صفحات لکھنے کے باوجود ادبی دنیا میں اتنی وقعت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔

تنظیمی صلاحیت اور کسی ادارے کی نگرانی و رہنمائی کے لئے علیم صاحب بہت موزوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے انہوں نے علی گڑھ میں شعبہ عربی کی ... سنبھالی ہے ... جاگ اٹھا ہے اور اس وقت سارے شعبوں میں یہی شعبہ سب سے زیادہ ترقی کر رہا ہے اور

اپنی وسعت کا دائرہ بڑھاتا جا رہا ہے۔

بحیثیت انسان ڈاکٹر علیم کی شرافت، اور طلبا و اساتذہ سے ان کی ہمدردی علی گڑھ میں ضرب المثل ہے۔ وہ یہاں ایک "مشکل کشا" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مشکل کشائی میں شعر و ادب، اور ریسرچ سے لے کر حصول ملازمت، وظیفہ اور فیس کی معافی سب کچھ شامل ہے۔

یونیورسٹی روڈ پر مکان میں رہتے ہیں۔ یہ پہلے پھوس کا بہت پرانا شاندار بنگلہ تھا۔ اب اس کی چھت پختہ کر دی گئی ہے علیم صاحب کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار ہے۔ اور ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا انتظام بڑی خوبی سے کر رہے ہیں۔ بحیثیت شوہر اور باپ کے بھی ان کی شخصیت بے مثال ہے۔

آل احمد سرور

اب تو خیر سرور صاحب مستقل طور پر علی گڑھ میں آ گئے ہیں لیکن اس بیچ کے عرصے میں جب وہ رامپور یا لکھنؤ میں تھے اس وقت بھی انہیں علی گڑھ کا ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ان کی شخصیت پر علی گڑھ کی زبردست چھاپ ہے۔ ان کے ذہن کی تعمیر میں اقبال، رشید احمد صدیقی، ذاکر صاحب، خواجہ غلام السیدین، سر راس مسعود اور خواجہ منظور حسین کا فیضان شامل ہے۔ وہ مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ محبوب و مقبول ہیں، ان کے نقطۂ نظر میں کافی لچک اور توازن ہے اور ان کے مذاق میں رچاؤ اور نکھار ہے۔ موجودہ تنقید نگاروں میں سرور ہی صاحب ایسے ادیب ہیں جو ایک مخصوص اسلوب نگارش کے مالک ہیں، یہی انداز ان کی عام گفتگو اور تقریر میں بھی ہوتا ہے طالب علمی کے زمانے میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں اور یہاں کی یونین کے وائس پریزیڈنٹ بھی۔ سرور صاحب خشک اور خلوت پسند یا خالص اسکالر قسم کے آدمی نہیں، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں، ان کی دلچسپیوں اور تعلقات کا دائرہ بہت وسیع اور رنگارنگ ہے اور افراد سے لے کر اسٹیج کے ہنگاموں تک ان کی دسترس اور رسائی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں جاتے ہیں فضا پر چھا جاتے ہیں۔

سرور صاحب میں ذہانت اور طباعی کا جوہر قدرت کی طرف سے بہت وافر ملا ہے۔ پامال اور فرسودہ مسائل کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ بالکل نئی چیز معلوم ہوتے ہیں، ان کے ایک ایک فقرے میں چشمے کی سی روانی اور شیرینی ہوتی ہے۔

شکل و شباہت کے اعتبار سے سرور صاحب خوش اندام لوگوں میں ہیں اور بڑی نفاست سے رہتے ہیں۔ رنگ گندمی، قد میانہ، کلین شیوڈ چہرہ، عام طور پر سوٹ پہنتے ہیں ویسے ان کی پرانی علی گڑھ کی تمام قدریں شیروانی میں ملتی ہیں۔ عینک ان کے چہرے پر بڑی کھبتی ہے، ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی سرخی ہوتی ہے اور عام طور پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے۔ سید حسین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی پروفیسر شپ کے علاوہ قاضی عبدالغفار مرحوم کے بعد انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور بھی آپ ہی کے سپرد کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب سے سرور صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے، انجمن کی رگوں میں نیا خون آ گیا ہے اور اس کا کام دوگنی رفتار سے ہو رہا ہے۔

علمی و تنقیدی مضامین کے علاوہ ادھر سرور صاحب نے پھر شاعری کی طرف توجہ کی ہے اور پچھلے سال اپنا مجموعۂ کلام "ذوقِ جنوں" شائع کر چکے ہیں۔ اب مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے ہیں اور اپنا کلام تحت اللفظ میں سناتے ہیں۔

معین احسن جذبی

جذبی صاحب ۱۹۴۲ء میں اردو میں ایم اے کرنے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لائے ایم اے کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے

رسالہ آج کل دہلی میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن ۱۹۴۴ء میں استعفیٰ دے کر پھر علی گڈھ واپس آگئے اور پی، ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں شعبۂ اُردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ میں اسی سال نیا نیا علی گڈھ میں وارد ہوا تھا لیکن جذبی صاحب کی شاعری کا بہت دنوں سے پرستار تھا اور انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ دنوں تک اس کی کوئی سبیل نہ نکل سکی۔ کئی مہینے کے بعد سیّد یوسف حسن کے توسط سے میں جذبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جذبی صاحب سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو کچھ دھچکا سا لگا کیونکہ میں نے ان کی جو خیالی تصویر بنا رکھی تھی وہ اور ہی تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کے طرزِ گفتگو نے پہلی بار مجھے کچھ مایوس کیا لیکن دو ہی چار ملاقاتوں میں یہ احساس ہونے لگا کہ جذبی صاحب ایک سیدھے سادے بے تکلف اور ملنسار آدمی ہیں وہ اپنے ملنے والے پر اپنی شاعری یا اپنی قابلیت و ذہانت کا رعب نہیں جماتے اور نہ ہی اس پر اپنی شخصیت کو مسلّط کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جو آدمی اچھا اور معقول نظر آتا ہے فوراً اس سے دوستانہ اور برابر کی سطح پر تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ چاہے وہ طالب علم ہی کیوں نہ ہو اس کے لئے چائے منگاتے ہیں اور سگرٹ پینے پر اصرار کرتے ہیں اور بے دھڑک پوچھ بیٹھتے ہیں" کہئے حضرت کوئی عشق بھی وغیرہ بھی کیا ہے"۔ ان کے اس طرز ادا نے بہت جلد علی گڈھ کے نوجوانوں کو جو ادب کی دیوی کے پجاری تھے آہستہ آہستہ ان کے گرد جمع کر دیا۔ اشعر ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، اصغر عباس زیدی، سیّد منہاج الدین، فرید بخش قادری، ریاض الدین قیصر، باقر مہدی، تصور حسین۔ ہم سب کی ایک ٹولی سی بن گئی اور کچھ دنوں میں جذبی صاحب کے ایماء سے اور ان کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور یوسف حسن صاحب اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ وہ زمانہ واقعی عجیب زمانہ تھا، نئی نئی کتابوں اور نئے رسالوں کی تلاش رہتی اور جوں ہی جذبی صاحب کی ڈاک میں کوئی چیز آتی ہم سب اسے چاٹ جاتے۔ لکھنے کا جنون تھا اور اناپ شناپ صفحے کے صفحے سیاہ کئے جاتے۔ انجمن کے جلسے الحمرا میں ہوتے جو اس زمانے کا ایک خوبصورت ریستوران تھا، ہر جلسے میں حاضرین کی چائے، برفی اور نمک پاروں سے تواضع کی جاتی۔ جذبی صاحب کی وجہ سے انجمن کے ہر جلسے میں خواجہ منظور حسین صاحب تشریف لاتے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین اور انور انصاری وغیرہ بھی آنے لگے۔ باہر سے مولوی عبدالحق صاحب، قاضی عبدالغفار، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری یا کوئی بھی ادیب آجاتا تو جذبی صاحب اسے انجمن کے جلسے میں کھینچ کر لاتے۔ اس موقع پر ہم سب یوسف صاحب کو فوری جلسہ کے لئے آمادہ کرتے اور تمام ممبروں کو اطلاع دینے کے لئے بڑے شوق سے سارا علی گڈھ چھان مارتے۔ اس زمانے میں یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین ہی سب سے بڑا ادبی مرکز اور شعر و سخن کی نشست بن گئی اس میں جو مضامین پڑھے جاتے، جو تنقیدیں ہوتیں اور جو جو بحثیں آپس میں کی جاتیں ان کا کئی کئی دن تک چرچا رہتا۔

جذبی صاحب ہم لوگوں کے یہاں بعض اوقات ہوسٹل میں پہنچ جاتے اور اس وقت جو بھی مل جاتا سب کو لے کر اسٹاف کلب کے کمرے میں جہاں ان کا قیام تھا آتے اور اپنے نوکر نذر علی کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتے اور پھر گپ شپ، شعر و شاعری اور شخصیات پر گفتگو چھڑتی۔ جذبی صاحب شعر و ادب سے متعلق اپنے نظریات اور تخلیقی عمل سے متعلق اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتے اور ہم لوگوں کو اپنی نظم و نثر کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور خوبصورت بنانے کے لئے مشورہ دیتے۔ ان کی گفتگو میں اکثر خواجہ منظور کے اقوال کا حوالہ ہوتا۔ کبھی کبھی مجاز، سردار جعفری، سبط حسن، مخدوم، اختر حسین رائے پوری، فیض، تاثیر، راشد، میراجی وغیرہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور پچھلی صحبتوں کا ذکر بڑے لطف سے کرتے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کی پرائیویٹ زندگی، ان کی آپس کی چشمکیں، ان کا خلوص و محبت اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے لطیفے جذبی صاحب کا خاص موضوع ہوتے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ جذبی صاحب بہت ہی دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں، ان کے پاس اتنے تجربات اور اتنی باتیں ہیں کہ تازندگی ختم ہونے نہ آئیں۔ ان صحبتوں کے علاوہ سب سے بڑی چیز، ہم لوگوں کے

لئے یہ بھی کہ جذبی صاحب ہر طرح سے ہم لوگوں کو چاہتے۔ وہ صرف ادبی معاملات میں ہی نہیں بلکہ ہر معاملے میں رہبری کرتے، فیس اور مراعات کا مسئلہ، ڈائننگ ہال سے کھانا بند ہو جانے کا مسئلہ، یونیورسٹی کا اکاؤنٹ جمع نہ ہونے اور نام کٹ جانے کی فکر، امتحان آنے پر ہال ٹکٹ حاصل کرنے کا انتظام۔ غرض جذبی صاحب ہمارے ہر دکھ سکھ کے ساتھی ہو گئے۔ میں جب بی اے میں پہنچا تو میری سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مجھے ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ جذبی صاحب فوراً مجھے اپنے گھر لے آئے اور کہا آج سے تم میرے ساتھ رہو گے میں قریب قریب دو سال تک جذبی صاحب کے ساتھ اس طرح رہا کہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس ہوا کہ میں کسی اور کے گھر پر پڑا ہوں اور اس کا ممنونِ احسان ہوں اس گھر میں میں خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت سے تھا۔ اسی زمانے میں جذبی صاحب کی بھوپال میں شادی ہوئی۔ ان کی بیوی کے آنے کے بعد بھی جذبی صاحب کے معمولات یا دوست احباب سے تعلقات اور ملاقاتوں میں فرق نہیں آیا۔ اسی طرح محفلیں گرم ہوتیں۔ چائے کا دور چلتا اور ہر طرح کے ادبی پروگرام بنائے جاتے۔

جذبی صاحب کے ساتھ رہ کر مجھے تھوڑا بہت ان کے شعری عمل کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوئی۔ اول تو وہ کم کہنے کے عادی ہیں آئے دن کے واقعات پر یا سیاسی پالیسی کے ماتحت نظمیں لکھنے کو وہ شاعری نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں یہ صحافت اور پمفلٹ بازی ہے۔ اسی لئے اس معاملے میں وہ اپنے دوست سردار جعفری سے کبھی متفق نہ ہو سکے۔ جذبی صاحب اپنی نظمیں بڑی محنت سے لکھتے ہیں۔ مہینوں ایک موضوع کو ہضم کرتے اور رچاتے بساتے رہتے ہیں، اس کے لئے فضا تیار کرتے ہیں اور پھر لکھ لینے کے بعد بھی نظم کو فوراً چھپنے کے لئے نہیں بھیجتے۔ اسے کچھ مہینے اور سال سال ڈالے رکھتے ہیں اور اس پر اتنی تراش خراش کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ایک نظم کے لئے ایک ایک ضخیم مجلد نوٹ بک ختم ہو گئی ہے۔ "میری شاعری اور نقاد" کے عنوان سے ان کی نظم میرے سامنے لکھی گئی اور اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے۔

اسٹاف کلب (پرانا اسٹاف کلب جہاں آج کل پراکٹر آفس ہے) چھوڑنے کے بعد جذبی صاحب نے امیر نشاں میں مکان کرایہ پر لیا۔ میرا قیام ان کے ساتھ اسی مکان میں تھا جذبی صاحب تقریباً آٹھ سال تک رہے۔ یونیورسٹی کے قریب مکان حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر تنگ آکر ایک نظم بعنوان "مکان نامہ" لکھ کر ذاکر صاحب کو بھیجی۔ خیر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ذکاء اللہ روڈ پر انہیں ایک اچھا سا مکان مل گیا ہے۔ جذبی صاحب کی خانگی زندگی بڑی خوشگوار ہے اگرچہ ایک بڑے کنبے کی پرورش کا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہے۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہو چکی ہیں۔ صاحبزادے سہیل میاں کافی ہونہار اور تیز ہیں۔ جذبی صاحب اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ادھر کئی سال سے مسلسل وہ اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے سلسلے میں بے حد مصروف اور فکر مند رہے جس کی وجہ سے شعر کہنے کی رفتار اور بھی کم ہو گئی جس پر ان کے عزیز دوست مجاز مرحوم نے کہا تھا کہ "اب تک صرف دو غم سننے میں آئے تھے غم جاناں اور غم دوراں۔ جذبی نے ایک تیسرا غم ایجاد کیا ہے اور وہ ہے "غم تھیسس"۔ شکر ہے کہ اس غم سے اب جذبی صاحب نے نجات حاصل کر لی ہے کیونکہ ان کا تھیسس مکمل ہو گیا ہے۔

اختر انصاری

جن لوگوں نے اختر انصاری کے رومانی قطعات اور درد بھری "خوناب" کی غزلیں پڑھی ہیں وہ اختر انصاری کو دیکھتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہی ہیں۔ بھاری بھر کم آدمی ہیں اور اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنتے ہیں اس لئے بادی النظر میں گمان ہوتا ہے کہ کوئی آئی سی ایس قسم کے آدمی ہیں۔ جس زمانے میں پہلی بار ان کے مکان احاطہ مینڈھو ہاؤس میں ان سے ملنے کے لئے سید یوسف حسن کے ہمراہ گیا تو اختر صاحب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے لیکن ان کا آراستہ ڈرائنگ روم اس میں مجسمے اور مصوری کے شاہکار، رنگا رنگ شیشے کی بنی ہوئی چیزیں، مختلف وضع اور فیشن کے فرنیچر۔ ایک قیمتی کتب خانہ جس میں ضخیم کتابیں اور تمام مشہور رسالوں کے مکمل فائل

دیکھ کر میں دنگ رہ گیا، پوری یونیورسٹی میں کسی بڑے سے بڑے پروفیسر کو بھی میں نے اس ٹھاٹھ سے رہتے نہیں دیکھا تھا۔ اختر صاحب ایک صوفے پر سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے پائپ پی رہے تھے اور دیکھنے میں انگلستان یا فرانس کے بعض ناول نگاروں سے مشابہ تھے۔ بعد میں اختر صاحب یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہوگئے اور اتفاق سے ایم اے میں مجھے ان کا طالب علم ہونا پڑا۔ اس زمانے میں ان سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ بظاہر اس شاندار جسم کے اندر ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے اور اختر صاحب طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ دورانِ تعلیم میں وہ واقعی آئی سی ایس ہونے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اسی غرض سے انگلستان گئے بھی تھے لیکن اچانک والد کے انتقال سے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا اور انہیں ناکام واپس آنا پڑا، ایم اے بھی نہیں کیا تھا اس لئے اسکول کی ٹیچری کے علاوہ کوئی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ والد نے گھر میں فرنیچر اور سامان آرائش کافی چھوڑا تھا، اختر صاحب نے اسے اپنے ڈرائینگ روم میں سجایا اور پھر اس طرح اس جذبے کی تسکین کے لئے سامان فراہم کرتے رہے۔ اسکول کی محدود زندگی نے آہستہ آہستہ ان کو اپنی گرفت میں لینا شروع کیا اور ان کی تخلیقی اپج تقریباً ختم ہونی شروع ہوگئی اور اردو کا یہ کامیاب زین شاعر، افسانہ نگار اور تنقیدی بصیرت کا حامل ادیب و انشاء پرداز ادبی افق سے غائب ہونے لگا۔ اختر صاحب کو اس کا بہت احساس تھا لیکن ان کے مطالعے اور تحصیل علم میں کمی نہیں آئی۔" ایک ادبی ڈائری" کے پڑھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس طرح ایک اسکول کے گمنام ٹیچر نے دنیا کے علمی و ادبی شاہکاروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ان کے متعلق ایک جچی تلی رائے رکھتا ہے جو بڑی بڑی یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے کے پروفیسروں کے بس کی بات نہیں۔

یونیورسٹی میں آجانے کے بعد اختر صاحب کی زندگی میں یک گونہ تبدیلی ہوئی لیکن ابھی اس نئی عمارت کی پوری بنیاد بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ اختر صاحب کی شعبہ اردو میں ملازمت ختم ہوگئی، کچھ دنوں وہ بیحد پریشان رہے۔ آخر کار ٹریننگ کالج میں انہیں ایک لکچررشپ مل گئی۔ اس جگہ پر انہوں نے بڑی تندہی اور جانفشانی سے کام کیا اور کالج میں مقبولیت حاصل کی اور ایک حد تک اس بات کی کوشش بھی کی کہ اپنے حواس کو مجتمع کر کے اپنی کھوئی ہوئی ادبی زندگی کو دوبارہ واپس لائیں۔ اس مقصد میں انہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی ہے اور ادھر کچھ ایسی چیزیں لکھی ہیں جس میں نئے تیور اور نئی اٹھان ہے" یادوں کے چراغ "کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھ رہے ہیں جس کے بعض اجزاء سننے کا مجھے بھی موقع ملا ہے اس میں شک نہیں کہ مکمل ہونے پر ایک قابل قدر ادبی تحفہ ہوگا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

مسعود صاحب ذاکر صاحب کے بھتیجے اور قائم گنج کے پٹھان ہیں لیکن ان کے مزاج میں ایسی نرمی اور ٹھنڈک ہے جو ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے۔ وہ ہندوستان میں لسانیات کے چند مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں اور اس موضوع پر پیرس سے ڈی۔ لٹ۔ کر کے آئے ہیں لیکن ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی وہ اس نرمی پر کوئی پردہ نہ ڈال سکے۔ ان کا مزاج خالص ہندوستانی ہے۔ ادھر انہوں نے اپنی شعری تخلیقات کا مجموعہ" دونیم "کے نام سے شائع کر دیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرا کچھ ایسا اندازہ ہے کہ ان کے کلام میں گیتوں کا حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے اور" روپ بنگال " ان کی ایک کامیاب تخلیق ہے۔ مسعود صاحب نے ابتدا میں اپنی شاعری میں ہندوستانی کلچر کے جن عناصر کو سمونا اور ایک رسیلی زبان کا تجربہ شروع کیا تھا اس سے ادھر وہ کچھ ہٹ سے گئے ہیں لیکن اس طرز کو اگر پورے طور پر پروان چڑھنے کا موقع ملے تو مسعود صاحب کے ہاتھوں اردو شاعری میں زبردست اضافہ ہوسکتا ہے۔ مسعود صاحب نے ہندی اور سنسکرت ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور بنگالی زبان سے بھی واقف ہیں اور یہ سارے اثرات ان کی شخصیت میں رچ گئے ہیں اس لئے اس نوع کی شاعری کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہیں۔

مسعود صاحب بحیثیت انسان اپنی مثال آپ ہیں۔ ان جیسا مخلص آدمی مشکل سے ملے گا۔ رشید صاحب اکثر "ملنساہٹ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال سب سے زیادہ موزوں مسعود صاحب کے سلسلے میں ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کو کبھی غصے میں یا غضبناک نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کو سخت اور نا ملائم بات کہتے ہوئے۔ ان کی لغت میں شاید دشمن کا لفظ نہیں ہے۔ بعض لوگ حسد کی بنا پر مسعود صاحب کی شخصیت میں کیڑے نکالتے ہیں لیکن خود مسعود صاحب نے آج تک کسی کی ذاتی کمزوریوں کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔

مسعود صاحب خوبصورت اور وجیہہ آدمی ہیں اور قد و قامت اور رنگ روپ پر ضرور قائم گنج کی چھاپ ہے۔ بہت سادہ وضع رکھتے ہیں۔ جاڑوں میں ایک کھردرا سا سوٹ اور گرمیوں میں پتلون اور بش شرٹ زیب تن ہوتی ہے۔ گاہے ماہے شروانی بھی پہنتے ہیں۔ دیکھنے میں توانا و تندرست ہیں لیکن معمولی سا سفر بھی انہیں ہفتوں کے لئے صاحب فراش کر دیتا ہے۔ زکام سال بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ گرمی کے دنوں میں بھی اسٹاف روم کے اندر پنکھے سے دور ہٹ کر بیٹھتے ہیں۔ آج کل اپنا ذاتی مکان بنوا رہے ہیں اور بقول شخصے "تعمیر پسند" ہو گئے ہیں۔ چائے، سگریٹ، پان کسی سے شوق نہیں۔ وہ مکمل طور پر ترک منشیات کے اصول پر عامل ہیں۔ امتناعِ مسکرات کا قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

آج کل شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

علی گڑھ میں آرزو صاحب کی شہرت پہلے پہل علی گڑھ میگزین کے "غالب نمبر" کی وجہ سے ہوئی لیکن ان کے تحقیقی مضامین بہت پہلے سے رسالوں میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ "نگار" میں ان کا مضمون "سطحیات سید سلیمان ندوی" ایک ہنگامہ بپا کر چکا تھا اور "ادبی دنیا" میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" پر انہوں نے ایک ٹھوس مقالہ لکھا تھا۔ تحقیق کا ذوق آرزو صاحب کو قاضی عبد الودود صاحب کی صحبت میں ملا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے جب وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں آرزو صاحب پٹنہ کے مشاعروں میں ایک ہونہار نوجوان شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور اپنی مترنم آواز کی بنا پر خوب داد لیتے۔ غزلوں پر جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن جلد ہی قاضی عبد الودود صاحب سے سابقہ پڑا تو شاعری ترک کر کے تحقیق کی طرف آ گئے۔ قاضی صاحب کا آرزو صاحب پر گہرا اثر ہے۔ علی گڑھ کی تعلیم نے آرزو صاحب کو ڈگری ضرور دی لیکن ان کی شخصیت کی مکمل تشکیل علی گڑھ آنے سے قبل ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد آرزو صاحب کے طرز فکر اور طریق کار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ علی گڑھ میں انہیں اپنے کام کے لئے ایک وسیع میدان ملا اور اپنی تحقیق کے نتائج کو مناسب طور پر اشاعت دینے کا موقع بھی۔ ان کا قول ہے کہ ایک جگہ کھودو لیکن گہرا کھودو۔

آرزو صاحب بقول عرش ملسیانی زبردست "گورکن" ہیں۔ پرانی کتابوں اور قلمی نسخوں کی تلاش کا ایسا چسکا ہے جو کہیں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ایک بار اورینٹل کانفرنس لکھنؤ میں مجھے ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس موقع پر مخطوطات و نوادر کی ایک نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا ذوق و شوق اور انہماک دیکھنے کے قابل تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کا ایک ایک پرزہ انہوں نے پڑھ ڈالا ہے اور جہاں کہیں کوئی قیمتی خزانہ دبا پڑا ہے۔ اس کی ان کو اطلاع ہے۔ ابھی دو سال قبل راک فیلر فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر عربی میں ریسرچ کرنے آکسفورڈ یونیورسٹی گئے تو جرمنی، فرانس اور دوسرے ملکوں میں اردو ادب سے متعلق سارا مواد چھان مارا اور

آخر کار بہت کچھ ساتھ لے کر آئے۔ پچھلے دنوں "آج کل" میں راجہ رام موہن رائے کا ایک اُردو خط گارساں دتاسی کے نام شائع کیا گیا ہے جو انہیں پیرس میں ملا۔ جدید تحقیق کی رو سے یہ اُردو کا قدیم ترین خط قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو محض ایک دریافت ہے۔ دیکھئے اپنی جھولی سے ابھی اور کیا کیا نکالتے ہیں۔

باوجود محقق ہونے کے آرزو صاحب خشک اور کھردرے آدمی نہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑی رنگا رنگی اور زندگی کے مظاہر سے لطف لینے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ محفلوں اور دعوتوں میں شریک ہونا، رقص، مصوری اور موسیقی کا مذاق صحیح رکھنا، پکنک اور سیاحی، چاندنی راتوں میں ٹہلنا اور ریستورانوں میں بیٹھ کر احباب کے ساتھ نفیس چائے اور سگریٹ پینے کا سلیقہ بھی آرزو صاحب کو آتا ہے۔ آرزو صاحب کے اندر مزاح کی حس بہت بڑھی ہوئی ہے، وقت پر ان کو فقرے خوب سوجھتے ہیں۔ ان کی گل افشانیٔ گفتار سے صحیح طور پر چند ہی واقف ہیں۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر تھا اور میرا قیام ۵۔ حالی روڈ پر تھا اسی زمانے میں آرزو صاحب سے تعلقات بڑھے اور اتنی قربت ہوئی کہ آرزو صاحب مستقلاً میرے ساتھ قیام پذیر ہو گئے اور دو سال تک اس طرح گذرے ہیں کہ ہم دونوں کا ایک ایک لمحے کا "اعمال نامہ" ایک دوسرے کے سینے میں محفوظ ہے۔ ۵۔ حالی روڈ پر ہم مولوی مشتاق حسین صاحب (اسسٹنٹ لٹن لائبریری) کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے اور Paying Guest کی حیثیت سے رہتے تھے۔ مشتاق صاحب، علی گڑھ کی عجیب و غریب ہستیوں میں سے ہیں، ان کی شخصیت بذات خود علی گڑھ میں ایک ادارہ سے کم نہیں۔ اگرچہ انہوں نے کوئی علمی و ادبی کام نہیں کیا لیکن ان کے علم، ان کی ذہانت، اور ان کی سوجھ بوجھ کے سب قائل ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ جو چیز لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ ان کا خلوص، جاں نثاری اور دوست نوازی ہے۔ ۵۔ حالی روڈ پر شام کو محفل جمتی تھی۔ جس میں مشتاق صاحب صدر بن کر بیٹھتے اور ارد گرد میرے اور آرزو صاحب کے علاوہ قیوم قائد، حشمت اللہ انصاری، حنیف خاں ناشاد اور سید رضی الدین ایک گول دائرے میں ہوتے۔ چائے کا دور چلتا اور دُنیا بھر کے مسائل پر بحث مباحثہ ہوتا ایسے موقعوں پر آرزو صاحب کے لطیفے اور فقرے اور برجستہ مکالمے اس قدر دلکش ہوتے تھے۔ کہ پہروں اس کا نشہ باقی رہتا۔

آکسفورڈ سے واپسی پر آرزو صاحب نے ایک علٰحدہ مکان کرایہ پر لے لیا ہے اور اب معہ اہل و عیال کے مقیم ہیں۔ ان کے دو بچے طارق اقبال اور خالد اقبال بڑے پیارے ہیں۔

آرزو صاحب معتدل مزاج کے آدمی ہیں اور زندگی بسر کرنے کا فن انہیں آتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا ایک شمہ بھی انہوں نے بیکار نہیں چھوڑا ہے اور ہر طرح سے کامیابیوں کو اسیر کیا ہے۔

مسعود علی ذوقی

اختر انصاری صابر کے آئی سی ایس نما شخص ہیں جو ایک زمانے میں اپنی فطرت نگاری اور رومانی نظموں اور گیتوں کے لئے مشہور تھے اور ان کی تخلیقات "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ انہوں نے شاعری کی بساط بہت جلد اُٹھا دی۔ کوئی مجموعہ مرتب کر کے نہیں چھپوا سکے اس لئے آج ادب کے طالب علم ان کا نام تقریباً بھول چکے ہیں۔ ذوقی صاحب ایک شاندار اور اسمارٹ آدمی ہیں اور آج کل مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ڈرامے کے ڈائرکشن سے بھی شغف رکھتے ہیں چنانچہ ایک زمانے میں نیاز فتحپوری کے ساتھ مل کر ایک فلمی کمپنی کھولنے کی اسکیم بنائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ فلم کے سلسلے میں کئی سال تک بمبئی میں بھی قیام رہ چکا ہے اور متعدد فلموں کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں جن میں محبوب کی فلم "آن" خاص طور پر اہم ہے۔ بدایوں اور گونڈہ

کے کالجوں میں پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔ میں نے ذوقی صاحب کو پہلی بار ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا جب وہ "فانی کی المیہ شاعری" پر مقالہ پڑھنے کے لئے آئے تھے۔

ڈاکٹر محمد عزیز

"تاریخ دولت عثمانیہ" کے مصنف ڈاکٹر محمد عزیز یہاں شعبہ اُردو میں استاد ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا عنوان ہے۔ "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصّہ" یہ اب کتابی صورت میں انجمن ترقی اُردو سے شائع ہو چکا ہے۔

عزیز صاحب ایک فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت بزرگ ہیں، نرمی، بردباری و تحمل اور انکساری کا مجسمہ ہیں۔ بہت محنتی استاد ہیں اور ٹکسٹ پڑھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے لیکن دیکھنے میں تقریباً ساٹھ کے معلوم ہوتے ہیں۔ خرابیٔ صحت نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے لیکن ان کے علمی مشاغل اور مطالعے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

سادہ وضع رکھتے ہیں۔ شروانی، پاجامہ اور شروانی ہی کے کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتے ہیں۔ گردن جھکا کر چلتے ہیں انہیں دیکھ کر اکثر گمان گزرا ہے کہ حالیؔ ایسے ہی رہے ہوں گے۔ وطن ضلع اعظم گڈھ ہے۔ کچھ دن دارالمصنفین سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

شعبۂ انگریزی میں استاد ہیں اور خواجہ منظور حسین کے عزیز شاگرد اور تربیت یافتہ۔ خواجہ صاحب ہی کی طرح اسلوب صاحب نے مطالعے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے بعد اب علی گڈھ میں وسعت معلومات اور ادبی پرکھ کے اعتبار سے اسلوب صاحب ہی ان کی جگہ لیتے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلوب صاحب نے ابھی اپنی زندگی کو اس طرح کتابوں کے حوالے کر رکھا ہے۔ کہ لوگوں سے تعلقات بڑھانے یا متاثر کرنے کا ڈھب انہیں بالکل نہیں آتا۔ طالب علمی کے زمانے میں ان لڑکوں میں تھے جنہوں نے شروع سے آخر تک ہمیشہ فرسٹ کلاس فرسٹ حاصل کیا اور اس کے لئے اپنی صحت اور اپنی سماجی زندگی کی قربانی دی۔ لیکچرر ہونے کے بعد اپنی شخصیت اور زندگی کے بعض نقوش کے تشنۂ تکمیل ہونے کا اسلوب صاحب کو احساس ہونے لگا لیکن یہ ایک دن کا کام نہیں، پھر بھی ادھر چند سالوں میں انہوں نے اپنے آپ کو بہت بدلا ہے۔ کم آمیزی کی عادت کم کی ہے اور اب محفلوں میں بھی نظر آتے ہیں اور احباب اور واقف کاروں کا حلقہ بھی بڑھ گیا ہے۔ کھل کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے لگے ہیں، لطائف و ظرائف، پھبتی اور شکوہ شکایت سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اپنی رائے کو منوانے کے لئے ذرا بلند آہنگی سے بولنا اور اپنی بات پر اڑ جانا بھی سیکھ لیا ہے۔ غرض اسلوب صاحب آہستہ آہستہ کتابوں کے اس بھاری بوجھ کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس نے ان کی قابلیت و لیاقت میں تو بے انتہا اضافہ کر دیا تھا لیکن شخصیت کا سارا رس چوس لیا تھا۔ عنقریب انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آکسفورڈ جا رہے ہیں۔ امید ہے وہاں یہ تراش خراش مکمل ہو جائے گی۔

اسلوب صاحب ادب کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں۔ خواجہ منظور کی طرح وہ ہر تخلیق کا معیار اور اس کی سطح دیکھتے ہیں۔ اور اس کے تخلیقی عناصر اور رنگ و آہنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کو خود بھی شہرت کی کوئی خواہش نہیں اور نہ ہی ان لوگوں سے بالکل مرعوب ہوتے ہیں جن کا ادبی دنیا میں ڈنکا بجتا رہتا ہے۔ اسلوب صاحب کے نزدیک ایسے لوگ ادنیٰ درجے کے اشتہار باز ہیں۔ ایک نوجوان ادیب کا ذکر ہو رہا تھا جو بڑی تیزی سے اپنی تصانیف کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر متعین کرنے کے

بجائے اپنے ذہن کو بنیوں کی دکان کی طرح ہرطرح کے مال سے بھر رہا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین اور تبصروں کا ذکر چلا تو اسلوب صاحب نے کہا کہ یہ صاحب ہر اس ادیب یا افسانہ نگار کے مداح ہو جائیں گے جو ریڈیو سے منسلک ہو یا کسی مشہور رسالے کی ایڈیٹری اس کے ہاتھ میں ہو تاکہ اس کے ذریعہ اپنی پبلسٹی کرا سکیں۔ یہ لوگ ادیب یا آرٹسٹ نہیں ادبی کباڑیئے اور دلّال ہیں۔ اسلوب صاحب کہنے لگے مجھے اس قسم کی شہرت و مقبولیت یا اس طرح کتابوں کا مصنف بننے کی کبھی ہوس نہیں ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ چاہے میں زندگی میں چند ہی مضامین یا ایک ہی کتاب کیوں نہ چھوڑ جاؤں لیکن اپنے ضمیر کا خون نہ کروں۔

اسلوب صاحب نے بلاشبہ اپنے سارے مضامین میں محنت کا حق ادا کیا ہے اور ایمانداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایک بار کہنے لگے کہ ایک شاعر نے مجھ سے محض اس لئے بہت تعلقات بڑھائے کہ اس پر میں مضمون لکھ دوں اور اپنے مضمون میں انہیں وہی عظمت عطا کروں جو خود ان کے اپنے خیال کے مطابق انہیں ملنی چاہئے اس پر میں نے کہا کہ بھئی مجھے اس طرح کا کام کرنا ہوتا تو دنیا میں ایسے ذی رتبہ لوگ پڑے ہوئے ہیں جن کی تعریف اور قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بنا لوں تو مادی منفعت حاصل کر سکتا ہوں اس وقت میں آپ کا ہی انتخاب کیوں کروں گا۔

اسلوب صاحب ۱۹۴۲ء سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا پہلا قابل ذکر مضمون رسالہ جامعہ میں "اقبال کا ذہنی ارتقا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس عرصے میں کوئی اور پیشہ ور یا تجارتی ادیب و اشتہار باز ہوتا تو نہ جانے کتنی کتابیں اس کی بازار میں بکتیں لیکن اسلوب صاحب کا یہ حال ہے کہ برسوں میں کہیں ایک مضمون لکھیں گے اور اسے بھی بہت غور و فکر اور نظر ثانی کے بعد چھپنے کے لئے دیں گے یہی وجہ ہے کہ رسالوں میں ایک لمبے وقفے کے بعد ان کا کوئی مضمون شائع ہوتا ہے۔ تو چلتا ہوا نام نہ دیکھ کر عام قاری نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اہل نظر سے یہ چیز نہیں چھپتی۔ ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں جو سرسری یا صحافتی اور بھرتی کا ہو اور اسے اول درجے کے اہل علم نے نہ سراہا ہو۔ میرا خیال ہے اسلوب صاحب کی یہ روش انہیں ادب میں دیرپا مرتبہ دلائے گی اور ان کی کتابیں چار دن کی چاندنی نہ ثابت ہوں گی۔

اسلوب صاحب کا وطن سہارنپور ہے اور آزاد انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خوب صورت اور وفا شعار بیوی کے شوہر اور دو معصوم بچوں کے باپ ہیں۔ گھریلو زندگی پُرسکون ہے۔

منیب الرحمٰن

آٹھ سال انگلستان میں رہنے اور وہاں سے فارسی میں پی، ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد دو سال پہلے اپنی پرانی درسگاہ علیگڈھ میں وارد ہوئے جہاں سے انہوں نے فارسی کے علاوہ تاریخ میں بھی ایم، اے کیا تھا۔ منیب صاحب جب علی گڈھ سے انگلستان گئے تھے تو اپنی شاعری کی وجہ سے مشہور تھے۔ انہوں نے اُردو شاعری میں جدید میلانات اور ہیئت کے نئے تجربوں کو آگے بڑھانے میں بڑا سرگرم حصہ لیا تھا لیکن واپس آئے تو اسکالر بن کر۔ شاعری سے زیادہ ریسرچ پر زور دینے لگے اور جب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کا تقرّر ہو گیا تو وہ اور بھی آہستہ آہستہ شاعری سے دُور ہوتے گئے انہوں نے اپنے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا ہے۔ اپنی پچھلی نظموں کو ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور نئی نظم لکھنے کی انہیں فرصت نہیں۔

منیب صاحب ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں، قد و قامت، جسم، رنگ اور چہرے کے نقوش ہر اعتبار سے علی گڈھ کی اصطلاح میں انہیں "سویٹ" کہا جا سکتا ہے۔ اپنے والد اکرام حسین صاحب ریٹائرڈ ڈی، آئی جی اور اپنے بڑے بھائی حفیظ الرحمٰن صاحب میڈیکل آفیسر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ اپنی خوب صورت اور شاندار کوٹھی "گل رعنا" میں رہتے ہیں اور اس کا ایک حصہ اپنے لئے مخصوص

کرکے اس کا نام "خوشہ" رکھ دیا ہے۔ ان کی سوئس بیوی بڑی وفا شعار اور ہر طرح سے ان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں فرنچ اور جرمن زبان کی لکچرر ہیں جس کے کلاسز عموماً شام کو ہوتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں منیب صاحب شام کو اپنے ننھے بچے آصف کی نگہداشت کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عشرت حسین انور

فارسی اور فلسفہ میں ایم، اے ہیں اور اقبال کی مابعد الطبیعات" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی چینی فلسفے پر تحقیق کرنے چین گئے تھے جہاں ان کی ایک ٹانگ پر فالج گرا اور فارڈ بارٹن ہوگئے۔ ادھر چند سالوں سے سنسکرت سیکھ رہے تھے اور سُنا ہے اب اس کا سب سے بڑا امتحان دینے والے ہیں۔ عشرت صاحب کو کام کرنے کی بڑی دھن اور جم کر میز پر بیٹھنے کی عادت ہے۔ ملنے والوں سے بچنے کے لئے اپنے گھر کے باہر تالا لگوا دیتے ہیں اور دن رات اپنی تصانیف کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اقبال کا تقابلی مطالعہ مشرق و مغرب کے سارے فلسفیوں سے کر ڈالا ہے اور بہت جلد اپنی تحقیق کے نتائج اشاعت کے لئے دینے والے ہیں۔ فارسی میں شاعری کرتے ہیں اور اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا جواب" سرود بیخودی" کے نام سے دیا ہے۔

عشرت صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔ شادی تمام عمر نہیں کی، اجمیر کی خانقاہ سے وابستہ ہیں اور وہاں کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ خود ان کے یہاں علی گڈھ میں برابر قوالی کی محفلیں جمتی ہیں۔ ایک آدھ قوال تو مستقل طور پر ملازم رکھ لیتے ہیں۔ بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی ہیں اور باتیں کرتے ہیں تو چھا جاتے ہیں۔ گورا چٹا رنگ اور تیکھے خدو خال ہیں، عینک اور لباس میں زیادہ تر ڈاکٹر ہادی حسن کا تتبع کرتے ہیں اسی لئے ایک زمانے میں علی گڈھ والے انہیں ہادی حسن کا Miniatuere کہتے تھے۔ حالی روڈ کے بنگلہ ۱۲ میں فروکش ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

علی گڈھ میں نو وارد ہیں اور ابھی ان کا حال اس پودے کا سا ہے جو دور دراز کی سرزمین سے اکھیڑ کر نئی جگہ پر لگا یا گیا ہو اور پورے طور پر نئی ہوا سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے کھلا یا کھلا یا سا رہتا ہو۔ علیگڈھ شہر اور یونیورسٹی دونوں کے ماحول سے شاکی رہتے ہیں اور یہاں رہ کر ہمہ وقت لکھنؤ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اصل وطن مراد آباد ہے اور زبیری خاندان سے تعلق ہے۔ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی اور وہیں ادبی تربیت حاصل کی اور اپنے مضامین کے ذریعہ روشناس ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک صحافت کے پیشے میں رہے۔ پانیر میں کام کیا اور بعد میں ایک فلمی رسالہ "فلم بیل" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد ہیں۔

محمد حسن صاحب ایک ذہین و طباع آدمی ہیں اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب پر اپ ٹو ڈیٹ معلومات رکھتے ہیں۔ رقص، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون پر بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے اور فیچر، کتابوں پر تبصرے اور مختلف موضوعات پر تقریریں ان کی لکھنؤ اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ "ہندی ادب کی تاریخ" بھی لکھی ہے اور "ہندوستانی جمالیات" پر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ علی گڈھ میں انہوں نے ایک اردو تھیٹر کی بھی بنیاد ڈالی جس نے پچھلے سال علیگڈھ میں اور یہاں سے باہر حیدرآباد اور نینی تال وغیرہ میں مختلف ڈرامے اسٹیج کئے۔ ڈرامے خود ہی لکھتے ہیں، ڈائرکٹ کرتے ہیں اور اسٹیج پر اداکار کی حیثیت سے بھی آتے ہیں ——— محمد حسن صاحب ایک مرنجاں مرنج اور با اخلاق آدمی ہیں۔ لکھنؤ میں ان کی صحبتیں مجاز، نصیر حیدر اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ساتھ رہتی تھیں اس زمانے کے لطائف و ظرائف بڑے مزے سے سناتے ہیں۔ شادی ابھی نہیں کی ہے دودھ پور کے علاقے میں "زہرہ باغ" نامی کوٹھی میں رہتے ہیں وہ اس علاقے کا آخری مکان ہے، اس کے بعد لق و دق میدان اور کھیت۔ علیگڈھ میں آنے کے بعد اگرچہ وہ شاکی رہتے ہیں لیکن ان کی صحت لکھنؤ کی نسبت یہاں زیادہ اچھی ہے۔

بہار کی چند ادبی شخصیتیں

شاہ ولی الرحمٰن کاکوی

ماہنامہ نقوش کے مدیر محترم نے فرمائش کی ہے کہ بہار کے ادیبوں سے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ انہوں نے موضوع کی وضاحت نہیں کی کہ شعراء بھی ادیبوں میں شامل ہیں یا نہیں تاہم میں نے مشاہیر شعرا کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا ہے کیونکہ ادبیات میں شاعری بھی شامل ہے۔

مخدوم شیخ شرف الدین احمد بہاریؒ

آپ امام تاج فقیہ (متوطن بیت المقدس اور فاتح منیر) کے پوتے، مخدوم شیخ شہاب الدین پیر جگجوت کے نواسے اور مخدوم یحییٰ منیری کے صاحبزادے تھے۔ شیخ پیر جگجوت مذکور کاشغر کے حکمران اور شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) کے مرید و خلیفہ تھے آپ کا مزار بھی درگاہ جیٹھلی میں گنگا کے کنارے پٹنہ سٹی سے چھ میل پورب موجود ہے۔ مخدوم بہاری ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ عرصہ تک بہیہ (شاہ آباد) اور راجگیر (پٹنہ) کے جنگلوں اور پہاڑوں میں فقر و قناعت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہے۔ آپ کی پیدائش منیر میں واقع ہوئی تھی جو پٹنہ سے ۱۸ میل پچھم ایک قصبہ ہے اور بہار شریف میں وفات پائی جہاں آپ کی درگاہ بوسہ گاہ خلائق ہے اور ہر سال عظیم الشان عرس ہوتا ہے۔ آپ سے کچھ اردو اقوال بھی منسوب ہیں، مثلاً "بس بھلا پردوز" وغیرہ۔ لیکن آپ کے علم و فضل کا اصلی تماشا گاہ آپ کے فارسی مکتوبات ہیں جن میں اسرار تصوف پر مدلل بحثیں ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کے عم زاد بھائی مخدوم شاہ شعیب (متوفی ۸۲۴ھ) نے مناقب الاصفیاء کے نام سے ایک کتاب فارسی میں لکھی۔ آپ کا مزار شیخپورہ (ضلع مونگیر) میں ہے۔

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری (سال پیدائش ۱۰۵۰ھ) فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک تھے۔ ملا غلام یحییٰ (متوفی ۱۱۸۶ھ) ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا۔ یہ مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ) کے مرید تھے۔ اس قبیل کے سیکڑوں علماء و فضلاء بہار میں تھے جن کا ذکر نظر انداز کرتا ہوں۔

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ - ۱۱۳۳ھ)

مرزا بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی بہاری کہتا ہے، کوئی لاہوری، کوئی دہلوی، کوئی اکبرآبادی۔

اور کوئی عظیم آباد و بندرابن خوشگو نے سفینۂ خوشگو میں بیدل کو اکبر آبادی الوطن لکھا ہے۔ ان کا بیان قابلِ سند معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے بیدل سے دہلی میں ملاقاتیں کی تھیں۔ لیکن علامہ آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) نے جو بیدل کی وفات (۱۱۳۳ھ) کے وقت ۱۸ سال کے تھے ان کو عظیم آبادی لکھا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ اپنے تینوں تذکروں، ید بیضا، خزانۂ عامرہ اور سرو آزاد میں۔ علامہ سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ بیدل کا مولد و منشا صوبہ بہار تھا۔ مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ "عقد ثریا" میں ان کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ بہرحال بیدل کی طفولیت اور آغازِ شباب کا زمانہ بہار ہی میں گزرا ہے اس لئے اگر اب عظیم آباد انہیں اپنا ہم وطن سمجھے تو کوئی قباحت نہیں۔ شاہ آباد میں آرہ سے ۱۲ میل پچھم ایک قصبہ ہے جس کا نام رانی ساگر ہے اسی کے قریب کوئی بستی ہمارے بنارس تھی وہاں ایک بزرگ شاہ کمال قادری رہتے تھے۔ بیدل کے والد اور چچا مرزا قلندر کو انہی سے بیعت تھی۔ بیدل بھی انہی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے۔

بیدل کا پایۂ شاعری اتنا بلند ہے کہ ان کے بقول کا طائرِ خیال بھی وہاں تک پرواز نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فلسفۂ تصوف و اخلاق کے ایسے ایسے نکتے شاعرانہ لطافت کے ساتھ اور گوناگوں اسالیب سے بیان کئے ہیں کہ بیدل کے کمالاتِ شاعرانہ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بیدل نے شعر کی تمام اصناف میں یادگار چھوڑی ہیں، چہار عنصر، نکاتِ بیدل، رقعاتِ بیدل، کلیاتِ بیدل میں ہزاروں غزلیں، متعدد مثنویاں اور سیکڑوں رباعیات ہیں۔ غالب نے بیدل کی پیروی کرنا چاہی لیکن ناکام رہے۔ بیدل کے خیالات نہایت عمیق، رنگین اور دلکش ہیں۔ اس رنگ کا کوئی شاعر ایران میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ بیدل کے کلام میں "ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور اقبال کا "انسانِ کامل" تک موجود ہے ؎

آدمی ہم پیش ازاں کادم شود لازبیۃ بود | ہیچ شعلے بے ہیولیٰ قابلِ صورت نشد
بے تامل شد یقیں حکمت بوزینہ خرد آدمست | منزلِ انسانِ کامل ہر کجا آید بچشم

بیدل حیرت کے بیاباں میں سرگرداں ہے، دیر و حرم کی دیواروں سے سر ٹکراتا ہے لیکن منزلِ مقصود نہیں پاتا، کیونکہ کنہ ذات تک انسان کی رسائی نہیں۔ اس فلسفہ کو اس نے بارہا بیان کیا ہے اور قوتِ اختراع سے ایسے نئے نئے اسالیب سے کام لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بیدل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ | تو ز غنچہ کم ندمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمتِ جستجو | بہ خیالِ حلقۂ زلفِ او گرہے خورد بہ ختن درآ
تمام شوخیم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد | جگر بہ داغ کہ دزدیدہ نفس بہ آہ کہ می نیامد
مگر نہ چشمش غلط نگاہے رسد بفریاد سرال بیدل | وگرنہ آں برق بے نیازی پئے گیاہ کہ می نرامد
نہ تنہا از قدحِ مستی دو از گل رنگ می جوشد | نوائے محفلِ قدرت بہ صد آہنگ می جوشد
تجدید نازِ آشفتۂ رنگ لباس آرائیست | بے پردگی دیوانہ طرح نقاب افگندنست
ہر جاہ بروں جوشیدہ خود را بہ خود پوشیدہ | در نورِ شمعت منفعل فانوس پیراہنست
گاہے بہ کعبہ می روم و گہہ بہ سوئے دیر | دیوانہ ام زدہ سر طرف سنگ می زند
بیدل آں شعلہ کز او بزم چراغاں گرم است | یک حقیقت ز ہزار آئینہ تاباں شدہ است
ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما | چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

بیدل اردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن صرف دو شعر مشہور ہیں جن کو میر نے نکات الشعراء میں درج کیا ہے ؎

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں | اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پہ عشق آن کر پکارا   پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

ملا محمد علیم تحسین (متوفی ۱۱۶۲ھ) بیدل کے قریب العہد تھے اور فارسی میں اشعار کہتے تھے۔ میر غلام حسین شورش (متوفی ۱۱۹۵ھ) نے فارسی میں اردو شعراء کا ایک تذکرہ لکھا۔ شاہ کمال علی کمال متوفی ۱۱۵ھ دیورا (ضلع گیا) ... ... کے رہنے والے میر کے ہم عصر تھے، دیوان اردو کے علاوہ فاتح الانشا ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ حضرت عشق عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۳ھ) نے اردو دیوان کے علاوہ تصوف میں چند رسالے بھی تصنیف کئے۔ یہ بزرگ مرزا محمد علی فدوی کے استاد تھے اور فدوی سے راسخ عظیم آبادی نے اصلاح لی تھی۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۸ھ) ایک قابل قدر ادیب و مورخ اور بنارس کے گورنر تھے۔ ان کا تذکرہ گلزار ابراہیم (۱۱۹۸ھ) اردو شعراء کا ایک بلند پایہ اور مستند تذکرہ ہے گلشن ہند اسی کا ترجمہ ہے۔ خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم بھی انہی کی تصانیف ہیں ان کا ایک شعر سن لیجئے۔

مرے دیوانہ پن کو دیکھ کر زنجیر ہنستی ہے   یہاں تدبیر کرتے ہیں وہاں تقدیر ہنستی ہے

سید غلام حسین خاں (۱۱۴۰ھ-۱۲۱۹ھ ج) بڑے پائے کے مورخ اور ادیب تھے۔ انہوں نے نثر کی کئی کتابیں لکھیں جن میں سیر المتاخرین فارسی زبان میں ہندوستان کی تاریخ تین جلدوں میں ہے اور اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔ ان کا وطن حسین آباد جہنہ (ضلع پلاموں) تھا۔ یہ شاعر بھی تھے اور شیخ علی حزیں سے اصلاح لیتے تھے۔ خواجہ امین عظیم آبادی بھی اردو و فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۹۹ھ میں ہوا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔۔

نیست غمے زمرگ خویش تلخی غم چشیدہ را   دل بہ سفر قوی بود رنج سفر کشیدہ را
دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی،   عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی
بلبل کو باندھیئے تو رگ گل سے باندھیئے   دل باندھیئے تو یار کی کاکل سے باندھیئے

شیخ وجیہہ الدین عشقی عظیم آبادی نے تیرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں اردو شعراء کا ایک تذکرہ فارسی میں لکھا۔ انہی کے شاگرد آغا حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی نے دو جلدوں میں فارسی شعراء کا تذکرہ لکھا جس کا نام نشتر عشق ہے۔

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی

راسخ اردو زبان کے اچھے غزل گو اور مثنوی نگار تھے، شاد عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ راسخ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے لیکن یہ صحیح نہیں۔ قاضی عبدالودود بار ایٹ لاء کی تحقیق ہے کہ وہ ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ عرصہ ہوا راسخ کا دیوان شائع ہوا تھا جو اب نایاب ہے۔ انہوں نے فدوی سے اصلاح لی تھی مگر پھر لکھنؤ جا کر میر سے مستفید ہوئے۔ ۱۲۳۸ھ میں وفات پائی۔ انتقال سے چند سال قبل ایک رسالہ لکھا جس کا نام خلاصۃ العروض ہے۔ یہ رسالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ راسخ کے چند اشعار یہ ہیں ۔۔

صبح سے بے تابی جی کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے   دیکھئے کیا ہو شام تلک دل آج بہت گھبراتا ہے
عقل والوں کی اعانت تو نہ آئی کچھ کام ،   اب سپرد اپنا کریں گے کسی سودائی کو
تا خواب مرگ ذکر رہتا ان کا زبان پر ،   نیند آ گئی ہمیں تو اسی داستان پر
نہیں ہوش اون پہ کچھ حسد مجھے شک ہے تو انہوں پہ ہے   جنہیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری ہی

اشعار مثنوی

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے   کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

عشق اک لذت روحانی ہے — عشق کیفیت وجدانی ہے
اس کے وارفتوں کو محویت ہے — عشق اک زور ہے کیفیت ہے
ابتدا اس کی ہے گریاں رہنا — انتہا رفتہ و حیراں رہنا
عاشقی شوق ہے کچھ مت پوچھو — ہمگی ذوق ہے کچھ مت پوچھو
کچھ عجب شعلۂ سرکش ہے یہ — ایک پرکالۂ آتش ہے یہ
ایک جنجال ہے مائل ہونا — دو نگاہوں کا مقابل ہونا!
عشق میں طینت اضداد ہے ایک — رتبۂ خسرو و فرہاد ہے ایک

راسخ کی غزلوں پر میر کی غزلوں کا پرتو ضرور ہے لیکن تغزل اپنی میر ارفع و اعلیٰ میں اور راسخ کا اُن سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تاہم راسخ نے اپنی مثنویوں میں عشق کی جیسی تعریف کی ہے میر کی مثنویوں میں ایسی دلکش تصویریں نظر نہیں آتیں۔ پھر بھی میر میر ہیں اور راسخ راسخ۔

حشمت علی عظیم آبادی، رضا عظیم آبادی (متوفی ۱۲۱۶ھ)، دل عظیم آبادی، ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی، ثنا بخت عظیم آبادی، نالاں عظیم آبادی، مہاراجہ رام نرائن موزوں بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

عظیم آباد میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کے کچھ شعرا نے یہاں پناہ لی اور اُن میں سے اکثر یہیں پیوند خاک ہو گئے، مثلاً فغاں دہلوی (متوفی ۱۱۸۶ھ)، میر ضیا دہلوی، میر باقر حزیں دہلوی وغیرہ۔

قصبہ پھلواری شریف جو پٹنہ سے چھ میل پچھم واقع ہے علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ اس قصبہ کے شعرا میں شاہ ابوالحسن فرد (۱۱۹۱ھ - ۱۲۶۵ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا نہایت ضخیم فارسی دیوان دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اُن کا ایک فارسی اور ایک اُردو شعر درج کرتا ہوں ؎

کشتہ ات را ناوک تو می دہد جانے دگر — کن رہا تیرے کہ دارم ذوق پیکانے دگر
میرے جنوں کا شور ہے اب آسماں تلک — رسوائی اپنی پہونچی کہاں سے کہاں تلک

اسی سلسلے میں چند اور شعرا بھی قابل ذکر ہیں، مثلاً سید شاہ باقر علی باقر گیاوی (شاگرد غالب)، شاہ فرزند علی صوفی منیری (شاگرد غالب) جن کی کتاب وسیلۂ شرف شائع ہو چکی ہے، شاہ امین احمد شوق بہاری مصنف مثنوی شہد و شیر وغیرہ۔

سیّد فرزند علی صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ھ - ۱۳۰۷ھ)

صفیر کی پیدائش مارہرہ میں ہوئی۔ بچپن میں بلگرام آئے اور کچھ ہی دنوں کے بعد آرہ اپنے والد کے ساتھ پہنچ کر یہیں کے ہو رہے۔ ان کو ہمگت شاگرد کہنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے رشک و سحر (تلامذۂ ناسخ)، غالب اور مرزا دبیر سے اصلاحیں لیں۔ اُردو کلیات شائع نہ ہو سکا۔ بہت پر گو شاعر تھے اور نثر نگاری میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ رشحات صفیر، ترجمۂ بوستان خیال، چشمۂ کوثر، تحقیق اللسان، مردم دیدہ، اور جلوۂ خضر (تذکرۂ شعرائے اُردو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کہنہ مشق اُستاد تھے اور شاگرد بنانے کا خاص شوق تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

خاک سے میری بگولا پھر عیاں ہونے کو ہے — یہ غبار ناتواں بھی آسماں ہونے کو ہے
بادۂ عشرت ہوشربا تھا رات جو میں نے جام لیا — بارے یہ جرأت ساقی نے کی دوڑ کے مجھکو تھام لیا
کسی حالت میں لے واعظ نہیں نقصان رندوں کا — جو شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پیمانہ ہوتا ہے

مولانا حکیم عبد الحمید پریشاں (۱۲۴۵ھ - ۱۳۲۳ھ)

آپ نہایت ذی علم بزرگ تھے، طبابت میں خاص مہارت حاصل تھی۔ خاص پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ غدر کے سلسلہ میں آپ کے والد بھی حبس دوام کی سزا کے مرتکب ہوئے۔ فارسی، اردو، عربی میں شعر کہتے تھے۔ شاد عظیم آبادی سے برابر قلمی جنگ رہی۔ آپ کے دو چار اشعار فارسی و اردو کے سن لیجیے۔

قامت افراز نیازم بہ خمیدن بے تاب
بسملِ خنجر نازم بہ طپیدن بے تاب

دست بربستۂ عجزم ز رسیدن کوتاہ
پائے بشکستۂ شوقم بہ دویدن بے تاب

ہماری الجھنوں کو کاکلِ محبوب جانے ہے
پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے

مرگ مرگِ نامرادی، زندگی سوز و الم
کون سی صورت میں بہبودِ چراغ کشتہ ہے

خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی

آپ ۱۲۶۲ھ م ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۵ھ م ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ اردو، فارسی اور عربی کی تحصیل کے بعد آپ نے ابتدائے شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ صوبہ بہار میں شاد جیسا کوئی غزل گو نہیں پیدا ہوا۔ تقدم زمانی کے لحاظ سے راسخ یقیناً قابل احترام ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خیالات کی گہرائی، زورِ بیان کی شگفتگی، حسن و عشق کی دلکش داستان سرائی، جذبات و احساسات کی شدت، وضاحت، اخلاق و تصوف کی اعلیٰ [illegible] طرازی، درد و حسرت کی مرقع نگاری کے لحاظ سے شاد کا خاص مقام ہے اور آپ کی شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ آپ نے معاصرین کے غیر مطبوع رنگ سخن کو ترک کر کے پاکبازانہ رنگ تغزل اختیار کیا۔ آپ کا کلام ابتذال سے پاک ہے اور غزلوں میں انفرادی شان نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

اسیرِ جسم ہوں میعادِ قید لامعلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

چشمِ سیہ میں سرمہ دے زلفِ دوتا میں شانہ کر
قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اہلِ ہوس بھی ہو گئے آ کے حریفِ میکشاں!
پیرِ مغاں الٹ دے خم بند شراب خانہ کر

یہ عالمگیر جلوہ اور ذرہ حسن مشترک تیرا
خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا

جہاں ہے مکتبِ حیرت سبق ہے چپ رہنا
بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا
اسی قدر اسے حیرت ہے جس قدر سمجھا

بود حبابوں کا نہ دل توڑ خدارا اے موج،
انہی قطروں کی بدولت تو ہے دریا تیرا

دے کے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا
جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو افراط سے مے ہے — زباں رُک کے ہوئے ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے

آخر ہے عمر عشق میں دل بھی ہے جان بھی — مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

یونہی راتوں کو تڑپیں گے یونہی دن اپنی کھوئیں گے — تری مرضی نہیں ہے ورنہ دل اچھا نہ ہوئیں گے

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے — تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

میں شاد تنہا اک طرف دنیا کی دنیا اک طرف — سارا سمندر اک طرف آنسو کا قطرہ اک طرف

شاد نے سب اصنافِ سخن پر توجہ کی، غزلوں کے علاوہ مرثیے، رباعیات اور نظمیں بھی لکھیں۔ کلامِ شاد اور [illegible] الہام (مجموعۂ غزلیات)، (مجموعۂ مراثی [illegible]) اور مجموعۂ رباعیات مع ترجمہ انگریزی (ظہورِ رحمت)، اور مثنوی [illegible] یہ سب چیزیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ شاد نے نثر کی طرف بھی توجہ کی، مثلاً تاریخ صوبۂ بہار، نوائے وطن، نقش پائدار (۳ جلد)، افسانہ صورت الخیال (۳ جلد)، فکر بلیغ، اور [illegible] یہ سب چیزیں شائع ہو چکی ہیں۔ شاد کے تلامذہ میں مبتلا عظیم آبادی، [illegible] عظیم آبادی، [illegible] عظیم آبادی، بیتاب عظیم آبادی، امداد عظیم آبادی، مسلم عظیم آبادی، نہال عظیم آبادی، حمید عظیم آبادی، یاس عظیم آبادی (یگانہ لکھنوی)، بسمل عظیم آبادی، اختر کاکوی، عطا کاکوی، قیس مرحوم، شیدا مرحوم قابلِ ذکر ہیں۔

شاد کے معاصرین میں حسبِ ذیل حضرات بھی مشاہیرِ بہار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اکبر دانا پوری، شاگرد وحید الہ آبادی۔ آپ کے دو دیوان تجلیاتِ عشق اور جذباتِ [illegible] اور نثر میں [illegible] اور [illegible] اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شوق نیموی، شاگرد تسلیم لکھنوی، نہایت ذی علم بزرگ تھے۔ آپ کی کتاب آثار السنن (حدیث) نصاب میں داخل ہے۔ غزلوں کا دیوان اور مثنوی [illegible] یادگار وطن کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کو لسانی تحقیقات [illegible] تھا۔ چنانچہ آپ نے جلال لکھنوی سے [illegible] اور اپنی امتیازی شان اس میں بھی قائم رکھی۔ نواب امداد امام اثر عظیم آبادی بھی بہت پایہ کے بزرگ تھے۔ [illegible] آپ کا دیوان [illegible] شائع ہوا تھا، اب نایاب ہے۔ تغزل میں آپ [illegible] اور میر کی تقلید کی۔ آپ کی تصانیف [illegible] کاشف الحقائق خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ قابلِ قدر کتاب دو جلدوں میں ہے جو اگرچہ مختلف مباحث پر مشتمل ہے لیکن [illegible] تنقیدی [illegible] حصہ ہے [illegible] تنقیدی حصہ [illegible] شائع کیا جائے کیونکہ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ [illegible] عظیم آبادی بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی رباعیاں اور [illegible] اپنی آپ مثال ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا [illegible] کلیات [illegible] ہے۔ آپ نے [illegible] میں علامہ اقبال سے متاثر ہو کر بہت سی نظمیں [illegible] میں لکھیں اور بہت خوب لکھیں۔ اردو ادب کی بہترین خدمت [illegible] کا مجموعہ شائع [illegible] اس دور کے نظم نگاروں میں آزاد کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں [illegible] بہاری اور [illegible] عماد پوری بھی قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ یگانہ لکھنوی تغزل میں [illegible] [illegible]

۲۔ [illegible] کی شاعری [illegible] غزلوں کے دیوان کے علاوہ [illegible] کی نظمیں [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔ [illegible] نوجوان [illegible] کے [illegible] ہیں۔

۳۔ آپ [illegible] عزیز عظیم آبادی [illegible] [illegible] ہیں۔

نواب نصیر حسین خیال (۱۸۸۰-۱۹۳۴ء)

نواب خیال شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ آپ نے ابتدائے شباب ہی سے اردو نثر نگاری کی طرف خاص توجہ کی۔ آپ نے ایک رسالہ ادیب ۱۸۹۷ء میں پٹنہ سے جاری کیا تھا۔ جب آپ کی شادی کلکتہ میں ہوگئی اور وہیں قیام رہنے لگا تو تین سال کے اندر ہی یہ رسالہ بند ہوگیا۔ آپ کو سیاسی و تعلیمی امور سے بھی دلچسپی تھی اور اردو زبان کی خدمت کا خاص ذوق تھا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ نے آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ کی صدارت کی تھی جس میں ایک پر مغز خطبہ دیا تھا۔ آپ نے ممالک مغربی کی بھی سیر کی تھی اور ہر جگہ اردو زبان کی خدمت کو مدنظر رکھا۔ آپ کی تصانیف میں "مغل اور اردو" اور "داستان عجم" شائع ہو چکی ہیں۔ اول الذکر دراصل "داستان اردو" کا ایک باب ہے۔ آپ کی تحریر پر محمد حسین آزاد کا پرتو تھا اور آپ کی انشاپردازی ایک خاص درجہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین فارسی و اردو اور مکتوبات بھی قابل ذکر ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ کا تمام ادبی سرمایہ شائع ہو کر منظر عام پر آجائے۔ آپ عربی، انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقف تھے۔

سید عبد الغفور شہباز عظیم آبادی (متوفی ۱۹۰۸ء)

ضلع پٹنہ میں ایک چھوٹی سی بستی ہے، یہیں شہباز کی پیدائش ہوئی۔ عربی فارسی کے علاوہ انہوں نے انگریزی بھی پڑھی تھی۔ کلکتہ سے دار السلطنت ایک اردو اخبار جاری ہوا تھا، شہباز اس کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ دنوں کے بعد دوسرا اخبار جریدہ نمائش جاری کیا۔ ۱۸۸۵ء میں نواب عبد اللطیف خاں وزیر بھوپال کے پرنسپل اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد حیدر آباد پہنچے اور مولوی عزیز مرزا کی ماتحتی میں مترجمی کے فرائض انجام دیتے رہے اور پھر اورنگ آباد دکن میں پروفیسر ہو گئے۔ علامہ جمال الدین افغانی سے بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا اور ان کی تقاریر و مضامین کا ایک مجموعہ مقالات جمالیہ کے نام سے شائع کیا تھا۔ شہباز کی ادبی صلاحیت اچھی خاصی تھی۔ اودھ پنچ (لکھنؤ) اور البنچ (پٹنہ) میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ وہ انگریزی نظموں کے ترجمہ پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے کلیات نظیر اکبر آبادی کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور نظیر کی سوانح عمری بھی زندگانی بے نظیر کے نام سے لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ نواب سید محمد آزاد انسپکٹر جنرل رجسٹریشن بنگال و بہار بھی ادیب تھے۔ ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ میں چھپتے تھے، جن کا مجموعہ شہباز نے خیالات آزاد کے نام سے شائع کیا اور ان کی سوانح عمری بھی لکھی۔ شہباز کی کچھ اور کتابیں بھی شائع ہوئیں مثلاً رباعیات شہباز، خیالات شہباز وغیرہ۔ آغا شجر طہرانی ایرانی شاعر صوبہ بہار پہنچا اور نواب کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ شہباز کو اس سے بھی ربط پیدا ہو گیا تھا۔ شجر کی مونچھیں بڑی لانبی تھیں۔ شہباز نے مونچھوں پر ایک نظم لکھی ہے۔

کہیں ذلت ہے کہ زباندانیوں کا ؛ کہیں قیمت ہے کہ ثنا خوانیوں کا
غرض معرکہ ہے کہ سنا نیزہ ور کا ؛ پہنچ دو ہیں جسے سلسلہ ایرانیوں کا
پھریرا اُڑاتی ہیں سنجر کی مونچھیں

شہباز کی ایک رباعی بھی سن لیجئے:

خربوزے کا قدرت نے نقش پیکر باندھا ؛ پڑتے ہیں عجب قسم کا زیور باندھا
اک کوزۂ نور زردہ کاغذ میں لپیٹ ؛ ہے سبز رسن سے خوب کس کر باندھا

۱۔ مضمون سید شاہ الطاف صاحب مرحوم ندیم۔

خان بہادر سید ضمیر الدین احمد (۱۸۶۲ء - جنوری ۱۹۲۲ء)

آپ عظیم آباد کے ایک عالی خاندان رئیس اور قابل قدر ادیب تھے۔ ۱۸۸۵ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے فلسفہ، انگریزی اور فارسی میں اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ آپ نے انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں مثلاً شیر شاہ کی لائف (انگریزی)، راسخ کی لائف (انگریزی)، داؤد خاں پنی کی لائف (انگریزی)، ترجمہ طبقات اکبری (انگریزی)، فلسفۂ تصوف، کوکبۂ ملوکی و مملوکی، سیرۃ الشرف۔ کوکبۂ ملوکی و مملوکی میں ملک قطب الدین ایبک سے لے کر خلجی سلاطین تک کے تاریخی حالات درج کئے گئے ہیں۔ سیرۃ الشرف مخدوم شرف الدین بہاری کی لائف ہے۔ آخر الذکر کتاب بہت قابل قدر اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ عرصہ ہوا یہ کتاب چھپی تھی، اب نایاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پھر شائع کیا جائے۔ آپ نے اپنچ وغیرہ میں متعدد مضامین بھی لکھے تھے[1]۔

علامہ سلیمان ندوی (۱۳۰۲ھ - ۱۳۵۳ھ)

علامہ ندوی کا وطن قصبہ دیسنہ ضلع پٹنہ تھا۔ پھلواری اور دربھنگہ میں کچھ دن تعلیم پانے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دار العلوم میں داخل ہوئے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ندوۃ العلماء میں مدرس اور دکن کالج پونہ میں پروفیسر رہے۔ الندوہ کی سب ایڈیٹری کی، پھر الہلال کے حلقۂ ادارت میں شامل ہوئے۔ علامہ شبلی کے خاص تربیت یافتہ اور جانشین تھے۔ دار المصنفین کا خاکہ شبلی نے تیار کیا تھا لیکن اس کی بنیاد و تعمیر علامہ ندوی کی مساعی جمیلہ سے ہوئی۔ شبلی سیرۃ النبی کی صرف دو جلدیں لکھنے پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے انتقال کے وقت سیرۃ النبی کی تکمیل کی خدمت علامہ ندوی کے سپرد کی۔ آپ نے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ انگلینڈ، ۱۹۲۴ء میں وفد حجاز کے صدر کی حیثیت سے حجاز اور ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل کا سفر کیا۔ غرضکہ علامہ ندوی کی علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی خدمات مسلم ہیں۔ اور ایسی روشن خدمات صوبہ بہار کیا علمائے ہند میں سے بھی کسی نے نہیں کیں۔ اب ایسا جامع حیثیات عالم و ادیب شاید ہی پیدا ہو۔ آپ کا علمی تبحر آپ کے بے شمار مضامین اور تصانیف سے نمایاں ہے۔ الندوہ، معارف، الہلال اور ملک کے دوسرے اخبارات و جرائد میں آپ کے بے شمار مضامین شائع ہوئے۔ آپ کی تحریروں میں روانی و شگفتگی مابہ الامتیاز چیز تھی۔ شذرات و حرفیات لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ نے حسب ذیل تصانیف یادگار چھوڑیں: سیرۃ النبی (جلد ۳ - ۶)، ارض القرآن (۲ جلد)، حیات امام مالک، سیرت عائشہ، خیام، حیات شبلی، نقوش سلیمانی، اور متعدد خطبات و تقاریر۔ عربی زبان پر بھی آپ کو قدرت حاصل تھی چنانچہ اس زبان میں بھی آپ برجستہ تقریر کرتے اور مضامین لکھتے تھے۔

علامہ ندوی کے سلسلے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی (متوفی ۵ جون ۱۹۵۶ء) کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آپ بھی ایک عالم و ادیب تھے۔ گیلانی (ضلع پٹنہ) وطن تھا۔ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ آپ نے مذہبی، علمی، ادبی موضوعوں پر ہزاروں صفحات یادگار چھوڑے ہیں۔

مولوی مسعود عالم ندوی (متوفی ۱۹۵۴ء) بھی بہار کے فرزند تھے اور علم و ادب کے خدمت گذار رہے۔ عربی کی استعداد بہت اچھی تھی، چنانچہ ندوہ

---

[1] آپ کے صاحبزادے سید بدر الدین احمد صاحب بدر ایک ممتاز شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی غزلیں رفعت تخیل اور پاکیزگی ذوق کی حامل ہیں۔ انہوں نے نئے اسلوب کے مرثیے بھی لکھے ہیں جو متداول مرثیوں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یہ مضمون نگاری پر بھی قادر ہیں۔

[illegible] فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب سی [illegible] دار العلوم [illegible] میں وہ مدرس ہو گئے تو عربی میں ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام الضیاء تھا۔ اس کے بعد وہ اورینٹیل پبلک لائبریری پٹنہ میں شعبۂ عربی کے فہرست نگار مقرر ہوئے اور انگریزی میں عربی کے [illegible] مخطوطات کی فہرست کی ایک جلد مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ ان کی ایک کتاب "اشتراکیت اور اسلام" شائع ہو چکی ہے۔ مولوی سید [illegible] علی ندوی بھی گیا کے باشندے ہیں جن کی [illegible] کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی تاریخ صقلیہ [illegible] کی [illegible] دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد تاریخی مضامین لکھے جو معارف [illegible] ندیم اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ایک زمانہ میں رسالہ ندیم (گیا) کے ایڈیٹر تھے اور کئی سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ پھر معارف کے [illegible] ایڈیٹر بھی رہے۔ آجکل مدرسہ [illegible] شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل ہیں۔

افسانہ نگاری میں بھی صوبہ بہار ممتاز رہا ہے۔ شاد کی صورت الخیال کے علاوہ [illegible] فضل الدین احمد [illegible] بارایٹ لا [illegible] نے ایک طویل افسانہ شائع کیا جس کا نام فسانۂ خورشیدی ہے۔ [illegible] بلگرامی نے بھی ایک ناول "روح افزا" لکھا تھا جس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اس [illegible] سلسلہ میں سید علی سجاد عظیم آبادی کا ذکر بہت اہم ہے۔ یہ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ شاعر بھی تھے اور شاد سے اصلاح لیتے [illegible] ان کا ناول "محل خانہ" زبان و بیان کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی [illegible] میں اور [illegible] انہی کی صحبت کا اثر [illegible] لکھنؤ کی بول چال اور محاورات میں یہ ناول لکھا۔ ان کا ایک اور ناول "منی نوا" ہے [illegible] زبان بالکل لکھنؤ کی زبان ہے۔

موجودہ دور میں [illegible] عظیم آبادی [illegible] پروفیسر [illegible] اریتوی، سہیل عظیم آبادی، پروفیسر ڈاکٹر [illegible] وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ [illegible] عظیم آبادی شاعری میں [illegible] بھی۔ ان کے بھی مختصر افسانے کچھ کتابی شکل میں اور کچھ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں [illegible] نظمیں بھی کہتے ہیں۔ عقیدی [illegible] افسانہ نگار بھی کرتے ہیں [illegible] خاص طور پر ممتاز اور انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا طرز نگارش بھی مخصوص اور دلکش ہے۔ ان کے متعدد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ فن تنقید پر ان کی کتابیں "تحقیق و تنقید" اور "تنقید جدید" قابل تحسین ہیں۔ [illegible] نگاری کے فن میں جو [illegible] بہار میں خاص امتیاز رکھتے ہیں [illegible] گیا کے رہنے والے ہیں اور [illegible] آدمی ہیں۔ وہ [illegible] اور نظمیں تو ابتدائے [illegible] سے لکھتے تھے [illegible] ۱۹۳۱ء میں جب انہوں نے رسالہ ندیم نکالا [illegible] قلم کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور ندیم نے [illegible] کے علاوہ [illegible] افسانے بھی [illegible] نکلے اور ندیم ہی میں اکثر شائع ہوئے۔ [illegible] مزاحیہ اور طنزیہ ہیں [illegible] مجموعہ کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک کا نام طنزیات مانپوری ہے۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی ایچ ڈی مرحوم

ڈاکٹر عظیم [illegible] بی اے تک تعلیم پائی لیکن عربی و فارسی میں بھی کافی بصیرت رکھتے تھے۔ [illegible] لائبریری پٹنہ میں شعبۂ عربی کے فہرست نگار مقرر ہوئے [illegible] سے وظیفہ حاصل کر کے جرمنی گئے اور [illegible] ایچ ڈی کی ڈگری [illegible] پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تقریباً [illegible] سال کے بعد وطن پٹنہ [illegible] آئے اور پٹنہ کالج [illegible] شعبۂ [illegible] کے پروفیسر رہے [illegible] شاعر بھی تھے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کا نام [illegible] مکمل [illegible] عظیم الدین احمد [illegible] سے خاص ذوق تھا اور اس کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ قرآنی آیات [illegible] تقریروں [illegible] قرآن پاک [illegible] تمام نہ ہو سکی۔ آپ کی ادارت [illegible] رسالہ [illegible] جس کا نام [illegible] ہے۔ یہ رسالہ ابھی تک جاری ہے۔ [illegible] میں ڈاکٹر صاحب کے تین قابل [illegible] مضامین شائع ہوئے تھے [illegible] عربی شاعری پر ایک نظر"، "[illegible] عظیم آبادی" اور "فلسفہ [illegible]"

سیّد وصی احمد بلگرامی

وصی احمد بلگرامی قصبۂ کواتھ (شاہ آباد) کے رہنے والے اور صفیر بلگرامی کے پوتے ہیں۔ تیس سال تک ڈپٹی کلکٹری کی ۱۹۴۷ء میں پنشن لینے کے بعد ترک وطن کر کے کراچی چلے گئے۔ مضمون نگاری کا شوق ابتدائے شباب سے ہے اور متعدد ادبی مضامین کے مالک ہیں۔ اُن کی ادبیت مسلم ہے اور طرزِ نگارش میں انفرادیت نمایاں ہے۔ اُن کے بعض مشہور و مقبول مضامین یہ ہیں "جلترنگ کے تین بیٹے"، "س کش ص"۔ (مطبوعہ ندیم) "ملک خطا کے شہزادے" (مطبوعہ نگار) "زلف و رخ" اور "سپاہی کی بیٹی"۔ (مطبوعہ سہیل گیا) "س کش ص" سے سلطان عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، اور صفیر بلگرامی مراد ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے صفیر کی اُستادی اور سلطان و شاد کی شاگردی کی داستان بیان کی ہے اور شاد کو صفیر کا شاگرد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا ہے۔ "سپاہی کی بیٹی" سے اُردو زبان مراد ہے۔ "ملک خطا کے شہزادے"۔ کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ جناب نیاز فتحپوری ان کے ادبی مضامین کے بڑے مداح ہیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محفوظ الحق مرحوم، اور عبدالمالک آروی مرحوم بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی علامہ سلیمان ندوی کے ہم وطن اور اُردو کے قابل قدر مضمون نگار ہیں۔ اُن کی "رقعات عالمگیر" شائع ہو چکی ہے جس میں اورنگ زیب کے خطوط و رقعات جمع کئے گئے ہیں۔ یہ آج کل رسالہ "نوائے اَدب" بمبئی کے اڈیٹر ہیں، یہ رسالہ علم و اَدب کی گراں قدر خدمات کر رہا ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق مرحوم پٹنہ کے رہنے والے تھے، آرہ میں شادی ہوئی تھی۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر تھے۔ ادبیات فارسی کا مطالعہ بڑا گہرا اور وسیع تھا، اس لئے ان کو ہندوستان کے فاضل مستشرقین میں شمار کیا جاتا ہے۔ خیامی ادبیات کے وہ بڑے مبصر و محقق تھے۔ انہوں نے متعدد مورخانہ و محققانہ مضامین لکھے اور ساری عمر ادبی خدمات میں گذار دی۔ عبدالمالک آروی مرحوم عربی، فارسی اور انگریزی سے واقف تھے۔ وہ آرہ کلکٹری کے ایک محض معمولی اور گمنام کلرک تھے لیکن علم و اَدب کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے متعدد ادبی مضامین لکھے اور کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں "اقبال کی شاعری" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن ان کی تصنیفات و مضامین میں غیر متعلق اور دور از کار باتیں بہت ہوتی تھیں۔ سید مظفرالدین ندوی صاحب بھی بہار ہی کے فرزند ہیں، چاٹگام میں کسی کالج کے پرنسپل تھے۔ اب پنشن پاتے ہیں۔ انہوں نے ایم۔ اے گلے کی انگریزی کتاب "نٹشے" کا اُردو ترجمہ کیا جس کا ایک اقتباس علامہ سلیمان ندوی کی کتاب سیرۃ النبی جلد ششم میں موجود ہے۔

قاضی عبدالودود بار ایٹ لاء عظیم آبادی

قاضی صاحب عظیم آباد کے ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دن علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ پھر بلگرامی ٹیوٹوریل کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس کالج کے ٹوٹ جانے کے بعد پٹنہ میٹرک اور آئی اے اول درجہ میں پاس کیا اور سنہ ۱۹۲۰ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں انگلینڈ جا کر بی اے کینٹب اور بیرسٹر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ولایت سے واپس آ کر علم و اَدب کی خدمت میں مصروف رہے۔ قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کتب بینی کا شوق ہے۔ ذہانت اور حافظہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ فارسی و اُردو کا مطالعہ بڑا وسیع ہے، وہ صحیح معنی میں ایک گراں پایہ مستشرق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انہیں فارسی و اُردو ادبیات کا ایک دبستان اور دائرۃ المعارف کہنا چاہیئے۔ انہیں تحقیقات کا ذوق فطرت سے عطا ہُوا ہے اور بلاشبہ وہ موجودہ دور کے محقق اعظم ہیں۔ علمی و تحقیقی مضامین کا انہوں نے ایک انبار لگا دیا ہے۔ یہ مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر تمام مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ قاضی صاحب کی تحقیقات کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں۔ خان آرزو کا سالِ ولادت مصحفی کے تذکرہ "عقدِ ثریا" میں

۱۱۰۱ھ درج ہے۔ میں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے خود مجمع النفائس کا حوالہ دے کر کہا کہ وہ ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور "نزولِ غیب" مادۂ تاریخ ہے۔ شاہ مبارک آبرو کا سالِ وفات پردۂ خفا میں تھا۔ قاضی صاحب نے سفینۂ خوشگو سے صحیح سالِ وفات ۱۱۴۶ھ پتا لگا لیا۔ انشا اور جرأت کی تاریخ وفات ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۲۵ھ کہی جاتی تھی لیکن قاضی صاحب کی تحقیق ہے کہ صحیح سالِ وفات ۱۲۳۲ھ اور ۱۲۲۴ھ ہے۔ اربابِ ادب کو یقین تھا کہ ملا عبدالصمد واقعی غالب کا استاد تھا۔ قاضی صاحب نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ وہ خود غالب کا زائیدۂ فکر تھا۔

قاضی صاحب [illegible] کے ذکر کے سلسلہ میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آرزو صاحب بہار سب ڈویژن کے رہنے والے ہیں۔ اُن کی تحصیلِ علم کی مختصر روداد یہ ہے کہ مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ سے دستارِ فضیلت حاصل کر کے کچھ عرصہ کے بعد گریجوایٹ ہوئے اور علی گڑھ سے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لیں۔ پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے وظیفہ پا کر ولایت گئے اور مغرب کے چشمۂ علم سے سیراب ہو کر سینہ بسینہ [illegible] کر واپس آ گئے ہیں۔ آرزو صاحب کی تحریریں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کی تحریر سادہ، رواں اور شستہ ہے۔ [illegible] خیال میں ڈاکٹر عبدالحق کی تحریر سے کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ علی گڑھ میگزین [illegible] ۱۹۴۹ء کا غالب نمبر انہی کی ادارت میں نکلا تھا اور اب [illegible] شکل میں احوالِ غالب کے نام سے چھپ گیا ہے۔

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد [illegible] ڈاکٹر عظیم کے نامور فرزند ہیں۔ انگریزی میں بی اے آنرز اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور دونوں امتحانوں میں اوّل آئے [illegible] میں ولایت [illegible] یونیورسٹی سے ٹرائی پاس لے کر وطن واپس آئے اور پٹنہ کالج کے ممبر ہوئے۔ آج کل پٹنہ کالج کے پرنسپل ہیں۔ کلیم الدین [illegible] اردو ادب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین بڑے پائے کے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی [illegible] اُن کی معرکۃ الآرا کتابیں "اردو شاعری پر ایک نظر" [illegible] کے بعد "اردو تنقید پر ایک نظر" اور "اردو داستان گوئی" یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔ انگریزی میں بھی قدر اوّل کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جس کا نام [illegible] اینڈ اینڈ لٹریری کرٹیسزم" ہے۔ کلیم الدین صاحب اردو شاعری کے سرمایہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اردو شاعری کے سرمایہ کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ غزل گوئی کو نیم وحشی صنفِ سخن سمجھتے ہیں۔ غزل گوئی وہ صنف ہے جس نے فارسی میں حافظ اور اردو میں غالب کو بقائے دوام کا خلعت دیا ہے۔ اس لئے کلیم صاحب کا حکیمانہ ارشاد قابلِ سند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اردو تنقید کو بھی وہ اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ ارشاد بھی قابلِ تسلیم نہیں۔ کلیم صاحب میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد کے کلام پر تنقید کرنے میں انہوں نے غیر جانبداری سے کام نہیں لیا۔ "اردو شاعری پر ایک نظر" میں اُن کی تیغِ قلم سے تقریباً ہر شاعر کا کلام مجروح ہو گیا لیکن ڈاکٹر عظیم کا کلام اس کی زد سے محفوظ رہا۔ ایسی روش ایک نقاد کے دامنِ کمال کا بدترین داغ ہے۔

پروفیسر جمیل مظہری

[illegible] مظہری ضلع سارن (صوبہ بہار) [illegible] سے یا [illegible] ۱۳۲۱ھ میں [illegible] کرنے کے بعد اُن کی ادبی و صحافتی زندگی کلکتہ کی فضا

[illegible] نقوش نمبر [illegible]

ہیں سانس لینے لگی۔ حضرت وحشت سے ان کو تلمذ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ پٹنہ میں پبلسٹی آفیسر ہوئے۔ لیکن ۱۹۴۲ء کی تحریک سے متاثر ہو کر استعفیٰ دے دیا اور جیل بھی گئے۔ جیل سے رہائی پا کر حضرت جوش ملیح آبادی کی وساطت سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں محکمۂ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے اور ۱۹۵۰ء سے پٹنہ کالج میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ہیں۔

جمیل مظہری نہایت بلند پایہ شاعر ہیں، وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور قصیدے بھی، مرثیے بھی اور رباعیاں بھی، غرض وہ ہر صنفِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اُن کی ذہنیت فلسفیانہ اور رجحان طبیعت متفکرانہ ہے۔ اُن کے طرزِ بیان و اسلوب نگارش میں قوت و شوکت ہے، الفاظ میں شیرینی و دلآویزی، شادابی، شگفتگی اور حلاوت ہے۔ وہ ایک خوش فکر و خوش گو شاعر ہیں۔ اُن کے خیالات میں پختگی و متانت ہے، جذبات میں صداقت ہے، احساس میں شدت ہے، تجربات میں وسعت و ہمہ گیری ہے اور لب و لہجہ شاعرانہ و عاشقانہ ہے۔ ان کے ہاں داخلیت و خارجیت میں ہم آہنگی، طنزیات میں دلکشی و سنجیدگی، افکار و خیالات میں رنگینی اور گہرائی اور طرزِ بیان میں ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر ہیں لیکن اُن کی شاعری حدود و فن کے دائرے میں سانس لیتی ہے۔ ان کی غزلوں کے دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا — اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
ہے رنج تاریکیوں میں حیران چھپا ہوا ہے چراغِ منزل — کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا
ابھی تو انجامِ جستجو ہے کہ ٹھوکریں کھا کے تنگ دل کی — جبین رسوا کو رکھ کے اپنی حرم کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوں
پیتے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تاثیر عمل — پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

جمیل کی نظموں کا مجموعہ "نقشِ جمیل" منظرِ عام پر آ کر خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ وہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ بلند مرتبت ادیب بھی ہیں۔ ان کا افسانہ "فرض کی قربان گاہ پر" جو اب کتابی شکل میں "تصویرِ قسمت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے نہایت فن کارانہ اور قدر اول کا افسانہ ہے۔ بقول نیاز فتحپوری ان کے قلم سے دوسرے درجہ کی کوئی چیز نہیں نکلتی۔ حکیم جلال ایرانی کے افکار کو بھی انہوں نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے اور قوت تخیل سے آب و رنگ بھر کر ایک عجب دلکش تصویر پیش کی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جمیل کی شاعرانہ و ادیبانہ صلاحیت اس شعر کا مصداق ہے۔

زغم دیدۂ پرنم دلِ شیدا داری — دیگراں رانچہ بدارند تو تنہا داری (روحی)

جمیل کے ساتھ پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی کا ذکر بھی اہم ہے۔ اُن کا مجموعۂ کلام "شعلۂ ندا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ رضوی کے خیالات و افکار میں بڑی گہرائی ہے اور طرزِ بیان فلسفیانہ و شاعرانہ ہے۔ وہ بہار صوفیہ سوسائٹی کے رکن ہیں اور ان کی طبیعت روحانی اور صوفیانہ خیالات کی طرف مائل ہے جن کے نقوش شعلۂ ندا میں نظر آتے ہیں۔ وہ بیدل کی طرح دریائے حیرت میں بھی غرق ہیں، جس کا ثبوت اُن رباعیوں سے ملتا ہے جن کا عنوان "حکمت و حیرت" ہے۔ رضوی کے دو تین اشعار سن لیجئے۔

اسی انقلاب قدم قدم پہ حیات نو کا مدار ہے — جو ہزار طرح کی گردشیں ہیں تو اک طرح کا قرار ہے
ہے شام جھٹپٹا گم زدوں سے ہے صبح چہرہ کا جھک کے نور — یہ کس نے بال سنوارے ہیں کس نے روپ نکھار لیے
ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے — آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

اس سلسلہ میں پرویز شاہدی اور نثار عظیم آبادی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں حضرات خاص عظیم آباد کے باشندے ہیں۔ پرویز شاہدی کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہے۔ ان کے افکار میں رعنائی اور فنکاری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے [illegible] جمیل مظہری بھی اپنی شاعری پر ان کی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کی غزلیں اور نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن چونکہ میرے سامنے اُن کا کلام موجود نہیں ہے۔ اس لئے نمونہ پیش کرنے سے مجبور ہوں۔

زارؔ عظیم آبادی حضرت زکیؔ لکھنوی کی یادگار اور قدیم رنگ کی شاعری میں اس صوبہ میں جواب نہیں رکھتے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت پختہ اور استادانہ کہتے ہیں۔

سہو قلم سے میں نے ابھی تک تمنا عمادی پھلواروی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک ذی علم بزرگ ہیں اور اُن کی اُستادی، نکتہ سنجی، اور دقیقہ رسی میں کوئی کلام نہیں۔ وہ نثر نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ شوقؔ سندیلوی کی مشہور کتاب "اصلاح سخن" کے جواب میں انہوں نے "ایضاح سخن" ایک کتاب لکھی جس پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "معاصر" میں تبصرہ کیا تھا۔

شوقؔ نیموی کے شاگردوں میں ضیاؔ عظیم آبادی مرحوم بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بڑی اچھی طبیعت پائی تھی اور ان کے کلام میں سوز و گداز بہت ہے کیونکہ اُن کا دِل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ ان کا دیوان عرصہ ہوا شائع ہوا تھا اب ناپید ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے ایک شعر پر میرؔ کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اثرؔ عظیم آبادی اس شعر کو میرؔ ہی کا سمجھتے تھے۔ ؎

اِک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے اِک درد سا دل میں ہوتا ہے ہم راتوں کو اُٹھکر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

صحافتی دُنیا میں بھی صوبۂ بہار گمنام نہیں ہے۔ ۱۸۶۸ء میں مظفر پور سے سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے "اخبار الاخیار" نام ایک اخبار جاری ہوا تھا جو مہینہ میں دوبارہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے اڈیٹر منشی فرمان علی خاں تھے۔ پٹنہ سے ایک ظریفانہ اخبار نکلا جس کا نام اپنچ تھا۔ اس کا طرز تحریر اودھ پنچ لکھنؤ جیسا تھا۔ اس نے سالہا سال تک ظرافت کے پھول کھلائے۔ اس کے اڈیٹر منشی عبدالرحیم تھے۔ نواب سید نصیر حسین خیالؔ کی ادارت میں پٹنہ سے "ادیب" نکلتا تھا جس میں علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ چند اور اخبارات و رسائل کے نام یہ ہیں۔ اتحاد، المبشر (زیر ادارت سید منظر علی ندوی مرحوم) حسن و عشق، (ڈوبھری) بزم سخن اور تاج (گیا)، نوید (زیر ادارت عبدالباری ساقیؔ) تصویر خیال فطرت (راجگیر) بہارستان و موج نسیم (پٹنہ)، ندیم، سہیل و اشارہ (گیا) تہذیب (پٹنہ) معیار (پٹنہ) معاصر (پٹنہ) بہار پنچ[1] (پٹنہ) وغیرہ۔ ندیم انجمؔ کی ادارت میں جاری ہوا۔ پھر ریاست علی ندوی اور اس کے بعد حسن امام وارثیؔ اور محی الدین ندوی اڈیٹر ہوئے۔ اس جریدہ نے ۱۵-۱۶ سال تک اُردو کی خدمت کی۔ معیار بڑے پایہ کا رسالہ تھا مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ قاضی عبدالودود صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ ان کا نام ہی اس کے محاسن کا ضامن ہے۔ معاصر اب تک جاری ہے اس میں زیادہ تر قاضی عبدالودود صاحب، کلیم الدین صاحب، اخترؔ اورینوی صاحب اور حسن عسکری صاحب کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ حسن عسکری صاحب پٹنہ کالج میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ اور قابل قدر مورخ۔ ان کا دماغ تاریخی معلومات کا مخزن ہے۔ وہ نہ صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ فارسی کتابوں کا بھی۔ اخباروں میں آج کل "صدائے عام" (زیر ادارت نظیر حیدر صاحب وکیل) اور ساتھی (زیر ادارت غلام سرور جو ایک نوجوان ادیب ہیں) جاری ہے۔

یہ مقالہ کچھ طویل ہو گیا ہے لیکن موضوع ہی اتنا وسیع تھا کہ اس سے زیادہ اختصار بھی ممکن نہ تھا۔

سرگذشت عہد گل را از نظیریؔ می شنو
عندلیب آشفتہ تر می گوید ایں افسانہ را

---

[1] بہار پنچ بیاؔس عظیم آبادی نے جاری کیا تھا جو ایک خوشگو ترقی پسند شاعر ہیں۔ اس کی ادارت ضیاؔ عظیم آبادی کرتے تھے۔

سرحد کی ادبی شخصیتیں

سید فارغ بخاری

صوبہ سرحد کی ادبی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ایسی بے شمار ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جن کی عظمت مسلّم ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے ماحول کی کایا پلٹنے میں اہم پارٹ ادا کیا۔ ان میں بڑی بڑی قدآور شخصیتیں بھی ہیں جو کسی طرح سے بھی چھپائے نہیں چھپتیں۔ انہوں نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لی۔

عنوان کے اعتبار سے میرا موضوع نہایت وسیع ہے اتنا وسیع کہ اگر نقوش کے شخصیات نمبر کا دوسرا حصہ سارے کا سارا بھی اس کے لئے وقف کر دیا جائے جب بھی شاید اس عنوان کی وسعت کا حق ادا نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس طرح موضوع صرف اردو شعرا تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں پشتو، فارسی اور ہندکو زبان کی ادبی شخصیتوں کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف تین چار صدیوں میں پھیلی ہوئی اردو ادب کی بیسیوں شخصیتوں کے تفصیلی جائزے کا بھی یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس صورت میں میں نے موضوع کو سمیٹنے کی غرض سے اپنے لئے ایک درمیانی راہ ڈھونڈ نکالی ہے وہ یہ کہ ان صفحات کو میں ان حضرات کے ذکر تک محدود رکھوں جن سے میں نہ صرف بالمشافہ مل چکا ہوں بلکہ ان سے نیازمندانہ مراسم کا شرف بھی حاصل رہا اور نہایت قریب سے ان کی شخصیت کے مطالعہ کا موقع بھی ملا

مضمون کو زیادہ جامع اور مکمل طور پر پیش کرنے کی غرض سے میں نے ایک تدبیر یہ سوچی ہے کہ پشتو، فارسی، ہندکو زبانوں اور خود اردو ادب کے قدیم اساتذہ کی اولوالعزم شخصیتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے گزر جاؤں اور صرف اردو کے ادیبوں اور شاعروں ہی کا تذکرہ کروں۔

پشتو ادب کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پرانی ہے اس لمبے چوڑے عرصہ میں اس نے ہزاروں شاعر اور ادیب پیدا کئے انہیں نہایت دقت نظر سے دیکھا جائے جب بھی سینکڑوں ایسی گمبھیر ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بیرونی دنیا تو صرف خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے ناموں ہی سے واقف ہے اس میں شک نہیں کہ پشتو ادب کی تاریخ میں ان ہر دو فنکاروں

کی مثال نہیں ملتی۔ خوشحال خاں خٹک کی شخصیت تو کچھ ایسی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی کہ شاید دوسری قوموں میں اس کا جواب مشکل ہی سے مل سکے گا وہ صرف گفتار ہی کا نہیں کردار کا بھی غازی تھا وہ نہ صرف پشتو زبان کے عظیم شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بلکہ ایک بہادر اور اولوالعزم جرنیل کے طور پر بھی پشتون قوم میں ایک مسلمہ شخصیت کا مالک ہے۔ اس نے پشتون قوم کو غیر ملکیوں کی غلامی سے چھڑانے کے لئے اپنی تمام عمر میدانِ کارزار میں گزار دی اس صاحب سیف و قلم نے ایک طرف تو اس شہنشاہیت سے ٹکر لی جس کی راجدھانی ہرات سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی تو دوسری طرف پشتو ادب کو اپنے گراں بہا سرمایہ نظم و نثر سے مالامال کر دیا۔

رحمان بابا کا کردار خوشحال خاں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک صوفی مست شاعر تھا، اس نے پشتو غزل کے باغ میں وہ گل کھلائے جن کی بہار بے خزاں سے یہ گلزار سدا مہکتا رہے گا۔ رحمان بابا کو ہم پشتو کا حافظ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ پختون خواہ کا ہر دلعزیز اور نہایت مقبول عوامی شاعر ہے اس کی شاعری میں عوام کے دکھ درد کی ترجمانی بھی ہے اور وہ جوہر، وہ کشش اور وہ جادو بھی جس کا اثر جلدی ہوتا ہے اور دیر تک قائم رہتا ہے اس کے کلام میں وہ خوبی ہے جس نے اردو میں میر اور غالب اور فارسی میں سعدی اور حافظ کو ہر عہد میں محبوب بنائے رکھا۔

خوشحال خاں اور رحمان بابا کا درجہ پشتو ادب میں بہت بلند سہی لیکن ان کے علاوہ بھی یہاں کئی ایک قدآور شخصیتیں نظر آتی ہیں۔

پشتو زبان کا پہلا شاعر امیر کروڑ سنہ ۱۳۹ھ کی دریافت ہے وہ امیر پولاد کا بیٹا تھا، بڑا بہادر، دلیر اور شجاع انسان تھا ایک وقت میں سو مردان جنگی سلح پوش کا مقابلہ کرتا اس نے اپنے عہد میں غور، بالشتان، خیسار، تمران اور برکوشک کے مشہور فولادی قلعوں کو فتح کیا۔

امیر کروڑ تلوار کے ساتھ ساتھ قلم کا بھی دھنی تھا اگرچہ اس کی صرف ایک ہی رزمیہ نظم دستیاب ہو سکی ہے لیکن اس نظم سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ کس قدر زورِ قلم کا مالک تھا اور اس نے اپنی طویل عمر میں کیا کچھ نہیں کہا ہوگا۔

اس کے علاوہ بیٹ نیکہ، اسعد سوری، ملک یار غرشین، شیخ متی کو بھی پشتو ادب کے ستونوں کا درجہ حاصل ہے۔

بابا ہوتک آٹھویں صدی ہجری کا ایک ممتاز حماسی پشتو شاعر ہے یہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھا اپنی قوم کا قائد ہونے کے باعث قلم کے ساتھ ساتھ اسے تلوار بھی سنبھالنا پڑی۔ رزمیہ شاعری میں بابا ہوتک کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی نظمیں اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں اور اپنے عہد کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

اکبر زمینداروی نویں صدی میں ہوا ہے پشتو کی اولین مثنوی اکبر سے منسوب ہے جس کی وجہ سے اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ نظم اور غزل میں بھی اپنی منفرد خصوصیات نے اکبر کو اپنے معاصرین میں بہت بلند کر دیا ہے۔

مرزا خان انصاری نے گیارھویں صدی کا زمانہ پایا ہے وہ اس اعتبار سے پشتو کا منفرد شاعر ہے کہ اس نے سب سے پہلے پشتو شاعری کو تصوف سے آشنا کیا۔ سب سے پہلے اپنا دیوان بھی اسی نے مرتب کیا اور ایک روایت کے مطابق پشتو نثر نگاری کا بانی مبانی مرزا خاں ہی ہے۔

مرزا خان پیر روشان کے سکول کا فرد ہے۔ پیر روخان ایک بہت بڑی انقلابی شخصیت تھی وہ ایک عالم باعمل تھے انہوں نے حکومت وقت کی استبدادیت کے خلاف اس وقت علم جہاد بلند کیا جبکہ ان کے ہمعصر علماء حکومت کے ہاتھوں میں بک کر اس کے اشارۂ ابرو پر کھیل رہے تھے انہوں نے پیر صاحب پر طرح طرح کے اتہام تراشے اور صاحب اقتدار لوگوں کے ایماء پر انہیں پیر تاریکی کا نام دیا۔ لیکن پیر صاحب ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی دھن میں لگے رہے انہوں نے سارے پختون خواہ میں بیداری کی لہر دوڑا دی اور اپنی سحر بیانی سے قدیم نظریات اور غلامانہ روایات کے تار و پود بکھیر دیئے۔

پیر صاحب بڑی اولوالعزم شخصیت کے مالک تھے انہوں نے علمائے وقت اور حکومت وقت کی منظم مخالفت اور قدم قدم پر بے پناہ رکاوٹوں کے باوجود عوام کو اپنا گرویدہ بنایا اور اپنے عقیدتمندوں کا اتنا عظیم اور طاقتور گروہ پیدا کر لیا کہ حکومت کو بھی ان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف محسوس ہونے لگا۔

پیر صاحب کا ادبی پایہ بھی بہت بلند ہے وہ عربی فارسی پشتو اور ہندی زبانوں کے عالم بے بدل تھے انہوں نے پشتو نثر کو رواج دے کر پشتو ادب پر ناقابلِ فراموش احسان کیا۔

خوشحال خاں اور رحمان بابا نے گیارہویں صدی ہجری میں پشتو ادب کو ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے آتے ہی اپنے اپنے الگ سکول جاری کئے اور ان کے بعد سے لے کر دورِ جدید تک جتنے شعراء بھی گزرے ان میں سے ہر ایک انہی دو سکولوں میں سے کسی نہ کسی سے ضرور وابستہ نظر آتا ہے۔

خوشحال خاں کا خاندان بڑا زرخیز ثابت ہوا۔ اس نے ہر دور میں کئی ایک بلند پایہ شاعر پیدا کئے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ان دنوں نواز خٹک اور اجمل خٹک اسی مشہور خاندان کی یادگار ہیں جنہیں پشتو ادب کے دورِ جدید میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خوشحال سکول سے زیادہ رحمان سکول مقبول ہوا حتیٰ کہ خوشحال خان کی اولاد میں سے بھی اکثر شعراء نے رحمان سکول ہی کی پیروی کی۔ اس کی وجہ رحمان بابا کے کلام کی سادگی، سلاست بے ساختگی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے غزل کے مزاج کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ رحمان بابا کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود خوشحال سکول یکسر ختم نہ ہوا بلکہ ہر دور میں اس کے مقلد بھی ملتے رہے اور دورِ جدید میں تو ایک دفعہ پھر یہ سکول اس قدر مقبول ہوا کہ اس وقت تمام کے تمام نوجوان پختون شعراء خوشحال ہی کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کا یہ انداز محض نظم تک ہی محدود ہے اور جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ وہ اب بھی رحمان بابا کی تقلید سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ آخری دور میں حمزہ خاں شنواری، سمندر خاں سمندر، محمد اکبر آدم، سنوبر خاں نہمند، خلیق، قاضی اثر، خاطر بابا، زخمی جگر پشتو ادب کی گرانقدر شخصیتیں ہیں۔

دورِ جدید میں اجمل خٹک، سید رسول رسا، فضل حق شیدا، ولی محمد طوفان، قلندر، راہی، مہدی شاہ، سلیم، دوست محمد کامل، فیض یوسف، مراد شنواری، ایاز، نصر اللہ خاں نصر، امیر، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فارسی ادب کا سراغ یہاں گیارھویں صدی ہجری سے ملتا ہے۔ معز الدین یہاں کا پہلا دریافت شدہ فارسی شاعر ہے۔ لیکن فارسی کے ساتھ ساتھ پشتو اور اردو میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

ابتدا ہی سے سرحد کے تقریباً تمام اردو پشتو شاعر فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اس لئے ان کا علیحدہ ذکر بے محل معلوم ہوتا ہے۔ البتہ تیسرے دور میں چند ایک خالص فارسی گو شعراء بھی ملتے ہیں جن میں سے استاد زین العابدین عابد، قاضی طلاء محمد طلا، منشی امیر الدین امیر، مولوی علی رضا عندلیب، سردار خان بابا خان زاہد، غلام محمد خٹک، مرزا غلام عباس، منشی غلام جیلانی اور سید جی میاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخری دور میں ادیب پشاوری، رعنا کاظمی اور ملک ناصر خالص فارسی گو شعراء میں نمایاں نظر آتے ہیں اور دورِ جدید میں جب کہ فارسی کا ذوق دم توڑ رہا ہے۔ بسمل بخاری سرحد کا اکلوتا شاعر ہے جس نے محض فارسی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

فارسی کی طرح ہندکی کے شعراء میں بھی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مقامی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اپنے زورِ قلم کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔

سرحد کے خالص ہندکو شعراء میں بارھویں صدی ہجری کی تنہا یادگار استاد گاموں ہیں ان کے بعد رمضو، جیلانی اور دونی چند، مٹھو، بردا، مسکین، عبد اللہ، نشاد، کریمو اور نئے لکھنے والوں میں وحشی، فلس، جوش، سیو، یونس، معمر تاتاری، اثر، پہلوان نھتو، نظر، مجید، شادا اور مفتی ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے جوش اور معمر نے بڑا نام پیدا کیا۔ پرانی ڈگر چھوڑ کر نئی راہیں تراشیں اور ہندکو شعر کو اردو کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

اردو ادب کا آغاز سرحد میں چودھویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ لیکن اُردو کا اولین مستند صاحب دیوان شاعر قاسم علی خاں آفریدی ہے آفریدی نے پشتو فارسی شعر بھی کہے ہیں لیکن اردو میں اسے ولی دکنی کا مقام حاصل ہے۔

اس کے عہد میں حیدر پشاوری بھی ایک عظیم شاعر گزرا ہے۔

دوسرے دور میں ریاض سرحدی، مدبر پشاوری، صحیح سالم، مرزا عباس اور تیسرے دور میں مسیحی شاہ خادم، حامی سرحدی، غلام حسین مگر برق گنجوی، سلطان فرخ وغیرہ قابلِ قدر ادبی شخصیتیں گزری ہیں۔

شائق سرحدی

خصوصاً شائق سرحدی کو تو ایک انقلابی شاعر اور بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ حالی کی طرح اس نے سب سے پہلے یہاں پرانی قدروں سے بغاوت کا نہ صرف نعرہ بلند کیا بلکہ خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ انہوں نے غزل کو نیا موڑ دینے کے عملی تجربے کئے اس کی آواز گو اس وقت بالکل اجنبی تھی لیکن یہ پورے معاشرے کی آواز تھی یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانی عوام کو اس بری طرح کچلا گیا کہ وہ برسوں سر نہ اٹھا سکے۔ یہ اثر بیسویں صدی کے آغاز میں کہیں جا کر زائل ہوا تو لوگوں کو اپنی زبوں حالی اور غلامانہ زندگی کا احساس ہوا ان کے دلوں میں انقلاب انگیز ولولے کروٹیں لینے لگے لیکن اس وقت تک ملک میں کوئی انقلابی تحریک موجود نہ تھی۔ اس لئے دلوں کی امنگیں دلوں ہی میں مچل رہی تھیں۔ شائق نے ان عوامی امنگوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا انہوں نے اردو شاعری کی روایتی قدروں سے انحراف کر کے نئے رجحانات کو جنم دیا اور سارے ماحول کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

شائق ایک مکتبۂ فکر، ایک تحریک، ایک ادارہ تھا اس نے اس تیرہ و تار ماحول میں ایسی انقلابی مشعل روشن کی جسے رجعتی حلقوں کے طوفان اور مخالفتوں کے جھکڑ بھی نہ بجھا سکے۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اسی مکتبۂ فکر کا ایک بیباک نمائندہ تھے۔ علم و فضل ترکے میں پایا۔ علماء عصر سے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں شیخ الہند علامہ محمود الحسن صاحب سے کسب علم کیا۔ ۱۹۱۲ء میں فارغ التحصیل ہو کر پشاور پہنچے تو اپنے استاد گرامی کے مشورے سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔

ان کی شخصیت بڑی دلآویز، بڑی جاذب نظر اور بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ بیک وقت ایک عالم اجل، شعلہ نوا مقرر، نڈر صحافی، بے خوف رہنما، بلند پایہ ادیب اور ایک انقلابی شاعر تھے۔ آپ کی تمام عمر قید و بند میں گزری۔ دوران اسیری ہی میں پلورسی کا عارضہ ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں رہا ہو کر آئے تو بستر علالت پر ایسے پڑے کہ پھر اٹھ نہ سکے اور آخر ۱۹۴۴ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

آپ سرحدی عوام کے محبوب رہنما تھے۔ اپنی عمر کا غالب حصہ انگریز سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں گزارا۔ سرحد میں نوجوان بھارت سبھا اور کانگرس کے بانی مبانی تھے۔ صوبہ سرحد کا نوجوان طبقہ آپ کے خیالات سے بیحد متاثر تھا۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں انہیں کبھی منبر پر خطبہ دیتے دیکھا تو کبھی خاکروبوں کے جلوس کی قیادت کرتے پایا اور کبھی کسی عظیم الشان عوامی اجتماع کے سامنے دھواں دھار تقریر کرتے نظر آئے۔

سیاسی اُلجھنوں اور قید و بند کے مصائب نے آپ کو شعر و سخن کی طرف متوجہ ہونے کا کم موقع دیا تاہم انہوں نے جو کچھ کہا وہ فیض کی طرح

کم ہونے کے باوجود اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے خصوصاً صنفیات پر تو انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سوائے فیض کے اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

سائیں احمد علی

میں غالباً پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے محلہ میں ارباب درزی کی دوکان پر ایک ضعیف العمر شخص سڑک کے کنارے چارپائی پر پڑا رہتا۔ انہیں میں نے یا تو کھانستا ہوا دیکھا یا آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا پایا۔ ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم گھیرے رہتا۔ میں انہیں کوئی خدا رسیدہ بزرگ سمجھتا رہا۔ ایک دن کسی نے بتایا۔ یہ سائیں ہے —— ہندکو، اردو اور فارسی کا بہت بڑا شاعر —— یہ سُن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں عبا و قبا والے قصیدہ گو درباری شاعروں کا ہی تصور تھا —— "کیا شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ —— اور اس دن سے آتے جاتے وہاں کھڑے ہوئے پہروں سائیں مرحوم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا —— یہاں تک کہ ایک دن ارباب درزی نے مجھے ٹوک دیا —— "جاؤ بیٹا۔ اپنا کام کرو۔ یہاں کوئی تماشا تو نہیں ہو رہا ——"

سائیں مرحوم اُمی شخص تھے لیکن ان کی شخصیت اتنی جامع اور بھرپور تھی کہ بڑے بڑے اہل علم ان کا لوہا مانتے تھے —— ابتدا میں مقامی زبان ہندکو کو اپنایا اور اسے اتنے عروج تک پہنچایا کہ آپ کو ہندکو کا غالب کہا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اردو فارسی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان زبانوں میں بھی اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

سائیں زبان و محاورہ کے بادشاہ تھے ہر وقت اردو میں بات چیت کرتے۔ صحت زبان و تلفظ کے معاملہ میں اتنے محتاط واقع ہوئے تھے کہ ذرا بھی کوئی غلط لفظ استعمال کرتا تو برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے۔

ادبیات سرحد کا تیسرا دور سرحد میں اُردو کی تبلیغی اور عملی کارگزاریوں کا دَور تھا اور ان تجربات کی موجد اور پیش رو سائیں کی واحد شخصیت تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے پشاور میں پبلک مشاعروں کا آغاز کیا جو اُردو کی نشر و اشاعت اور ادبی تبلیغ کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ تھا۔ انہوں نے یہاں کے اولین ادبی ادارے بزم سخن کی بنیاد رکھی جس میں ادیبوں کی تمام منتشر قوتوں کو جمع کر دیا۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مشاعروں کے انعقاد اور بزم سخن کے قیام سے یہاں ایک ایسی شمع روشن ہوئی کہ سرحد کے گوشے گوشے سے ادبی پروانوں کا ہجوم اس کے گرد جمع ہونے لگا۔

سائیں کے شعور کی پختگی اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے انفرادی سرگرمیوں کو اجتماعی رنگ میں ڈھال کر زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ عروض سے بھی واقف تھے اور فن شاعری پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے اپنے دور کے تمام بڑے چھوٹے شعراء آپ کی عظمت کے قائل تھے اور ان میں سے اکثر آپ سے مشورۂ سخن بھی لیتے تھے۔

آخر عمر میں طبیعت میں تلخی اور چڑچڑاپن آ گیا تھا بہت کم بولتے تھے۔ دُور دُور سے لوگ شوقِ ملاقات لئے آتے لیکن بسا اوقات بیٹھ بیٹھ کر چلے جاتے کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ انہیں بلائے یا سلسلۂ گفتگو چھیڑے —— کبھی موڈ میں ہوتے اور شعر سنانے لگتے تو بھی کسی کو داد دینے یا مکرر کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا —— کوئی بھولے سے داد دے بیٹھتا تو فوراً سوال کرتے۔ بتا کیا سمجھا ہے؟ —— شعر سنانا بند کر دیتے اور اس کی وہ خبر لیتے کہ آئندہ کے لئے بیجا داد دینے سے وہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیتا۔

انہیں نمود و نمائش سے نفرت تھی وہ ہمیشہ خاموشی سے سنانا اور سننا پسند کرتے —— خود بھی بہت کم داد دیتے۔ چپ چاپ سر جھکائے سنتے جاتے —— کہیں غلطی ہوتی تو سر اُٹھا کر معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور فوراً اصلاح کر دیتے —— کبھی کوئی شعر پسند آتا تو سر ہلا دیتے بس یہی اُن کی سب سے بڑی داد تھی۔

سائیں کا درس سخن رات دن جاری رہتا وہ آخر عمر میں چرس پینے لگے تھے عمر کی زیادتی کے باعث قویٰ مضمحل ہو گئے اور عناصر میں اعتدال

رہا۔ گورگٹھڑی کے پاس اپنے ایک مخلص دوست ارباب درزی کی دوکان کے سامنے چارپائی پر پڑے رہتے اور اہل علم حضرات کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔

اُردو میں غالب اور انیس سے اور فارسی میں حافظ اور نظیری سے بہت متاثر تھے۔ اردو فارسی کے بیسیوں اشعار ازبر تھے جنہیں روزمرہ گفتگو میں نہایت سلیقے سے پیش کرتے۔ سخن فہمی میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ بیدل اور نظیری کے وقت طلب اشعار آپ کے پاس لائے جاتے اور آپ سنتے ہی صرف چند اشاروں سے مشکل سے مشکل شعر کو صاف کر دیتے۔

لباس نہایت سادہ پہنتے، ہفتوں کپڑے بدلنے کا ہوش نہ رہتا۔ بالکل مجذوبوں کی طرح پڑے رہتے لیکن ایک دنیا قدردان تھی۔

بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن آخر وقت تک بڑی شان سے وقت گزارتے رہے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو پچانوے برس کی عمر پاکر یہ آفتاب علم غروب ہوا اور شیخ حبیب صاحب کی زیارت کے پاس "لکھے" دروازے کے سامنے سپرد خاک کئے گئے۔

بیدل پشاوری

مرزا دلاور خاں بیدل پشاوری سرحد میں اپنے دور کے اولوالعزم شاعر تھے وہ صوبہ سرحد کے قدیم شعراء میں تنہا خوش نصیب شاعر ہیں جن کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہوگیا اور اس اعتبار سے بھی وہ پہلے سرحدی شاعر ہیں جنہیں ہندوستان کے مشاہیر شعراء حضرت بیخود دہلوی، حضرت فصاحت جنگ جلیل حسن جلیل، حضرت ریاض خیرآبادی اور حضرت نوح ناروی نے ان کے دیوان کی اشاعت پر خراج تحسین پیش کیا۔

اُردو فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے فن شاعری میں بھی درک حاصل تھا۔ کلام ہموار ہے ان کی شاعری خالص داخلی شاعری ہے۔ کلام میں تعلّی اور خودستائی نہیں اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ چیز ان کی طبیعت میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اپنے ہمعصروں کا تو ذکر ہی کیا وہ تو میر غالب اور اقبال کو خاطر میں نہ لاتے۔ ہر ایک کے سامنے برملا ان پر نکتہ چینی کرتے اور اپنے آپ کو ان سے بہتر اور بلند شاعر ظاہر کرتے —— ممکن ہے اقتضائے عمر کے باعث آخر وقت میں یہ بات ان کی طبیعت میں پیدا ہوگئی ہو۔

بیدل نے طویل عمر پائی۔ آخر میں ان کا دماغ تقریباً ماؤف ہو چکا تھا بعض اوقات بڑبڑاتے اور ہذیان گوئی کرتے ہوئے بازاروں میں گھومتے نظر آتے —— راستے میں جو بھی ملتا اسے بآواز بلند اپنے اشعار سنانے لگتے۔ ہر شعر پر داد طلب کرتے اور دوسرے شعراء کا مضحکہ اڑاتے۔ آخر یہ چیز اتنی بڑھ گئی کہ دوستوں نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ عمر بھر کے ملنے والے انہیں دیکھتے تو کترا کر نکل جاتے —— مشاعرہ میں کھڑے ہو کر سنانے لگتے تو بس سناتے ہی چلے جاتے، لوگ اکتا جاتے، منتظمین تنگ آجاتے لیکن آپ کو ذرا احساس نہ ہوتا۔ کوئی ٹوک دیتا تو ناراض ہو کر چلے جاتے۔ یہاں تک کہ انہیں مشاعروں میں مدعو کرنے سے گریز کیا جانے لگا۔ سادگی ان کے کلام کی بڑی خوبی اور سطحیت بڑا عیب تھا۔

آپ نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو پشاور میں انتقال کیا اور وزیر باغ کے قریب دفن ہوئے قاضی قضائے روحی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

سال رحلت روحیٔ آشفتہ حال ؎ گفت بیدل شاعر شیریں مقال

۱۳۵۸ھ

رعنا کاظمی

اگر انسانی طبائع میں ذہنی وراثت کو واقعی کوئی دخل حاصل ہے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شعر و ادب سے میری طبیعت کا لگاؤ درحقیقت میرے ننھیال کا عطیہ ہے یوں تو ددھیال میں علم و فضل کی کمی نہ تھی لیکن وہاں شعر و سخن کا رسیا کوئی نظر نہیں آیا۔ برخلاف اس کے ننھیال میں جہاں

تک سراغ ملتا ہے۔

اور پھر آگے چلئے تو دونوں ماموں سکندر شاہ رعنا کاظمی اور لعل شاہ جگر کاظمی نہ صرف شاعر بلکہ علم و فضل میں ایک نمایاں مقام کے مالک ———
رعنا کاظمی مرحوم فارسی زبان کے بے بدل شاعر تھے یہی ذوق انہیں کشاں کشاں ایران لے گیا جہاں برسوں مقیم رہے اور وہاں کی سب سے بڑی درس گاہ میں معلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اہل ایران سے اپنے علم و فن کا لوہا منوایا۔ چنانچہ ان دنوں وہاں جو شعراء کا تذکرہ لکھا گیا اس میں ادیب پشاوری اور رعنا کاظمی کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔

میری طفلی کا زمانہ تھا کہ رعنا مرحوم ایران سے لوٹ کر پشاور پہنچے۔ ان کی شخصیت یوں بھی بڑی بارعب تھی جب یہ پتہ چلا کہ وہ شاعر بھی ہیں تو میں اور زیادہ مرعوب ہوا۔ چار پانچ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ انہیں پہلی دفعہ دیکھا تو یہی جی چاہا کہ لپٹ جاؤں اور التجا کروں کہ مجھے بھی شاعری سکھا دیجئے لیکن ان کے حضور تو بڑے بڑے لوگوں کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ میری بساط ہی کیا تھی جو تاب سخن کی جرأت کرتا۔

رعنا کا علم و فضل میں بھی جواب نہ تھا۔ عربی فارسی کے علامۂ روزگار، فلسفہ منطق اور حکمت میں بے مثال ——— بڑے بڑے لسّان ان کے سامنے گُنگ نظر آتے ——— فارسی کا لب و لہجہ اتنا شستہ کہ اہل زبان بھی سن کر ششدر رہ جاتے۔ علامہ اقبال مرحوم سے ملنے گئے تو انہیں اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے کہا "میں نے آج تک کسی ہندوستانی کو اس قدر فصیح فارسی بولتے نہیں سنا"

علم و فن کے اسی گھمنڈ نے انہیں بدمزاج بنا دیا تھا کسی سے سیدھے منہ بات تک نہ کرتے۔ ان کی اس بد دماغی سے اپنے بیگانے سبھی شاکی تھے۔ اس ہمہ دانی کے باوجود اسی بد دماغی کے باعث تمام عمر فقر و فاقہ میں کٹی۔ عین جوانی میں ادبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر وفات پا گئے

جگر کاظمی

یہ میرے دوسرے ماموں ہیں جو آج ۸۰ برس کی عمر میں بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ یہاں کے بیشتر مشہور شعراء آپ کے حلقۂ تلامذہ میں رہ چکے ہیں جن میں سے حضرت ضیا جعفری اور رعنا کاظمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ خود مجھے ان سے اصلاح لینے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شعر و سخن کی طرف میرا رجحان انہی کی توجہ کا مرہون منت ہے۔ ان کی وجہ سے مجھے گھر میں یہ شاعرانہ ماحول نصیب نہ ہوتا تو شاید شاعری کی بجائے میں نے کوئی اور دھندا اختیار کیا ہوتا۔ پھر میں اُن کی دوربین نظر کا بھی معترف ہوں۔ بچپن ہی میں جب کبھی گھر آتے مجھے دیکھتے ہی فرماتے "یہ ضرور شاعر نکلے گا" پھر مجھ سے پوچھتے "کیوں بیٹا شاعر بنو گے" میں تائید میں سر ہلا دیتا اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے ———

جگر صاحب یہاں کے اولیتی ادبی ادارے بزم سخن کے مؤسسین میں سے ہیں اور یہاں کے ادبی ہنگاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اُردو کے علاوہ فارسی کے بھی بلند پایہ شاعر ہیں خصوصاً اس گئے گزرے زمانے میں بھی قصیدہ کی صنف آپ ہی کے دم قدم سے یہاں زندہ ہے۔

جگر صاحب ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے نو برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ماموں کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے جہاں مدرسۂ عالیہ میں پانچ سال تک پڑھتے رہے ۱۸۹۲ء میں تعلیم چھوڑ کر وطن مالوف کا رخ کیا ——— زاد راہ نہ ہونے کی وجہ سے سال بھر دہلی میں پڑے رہے۔ پشاور پہنچ کر چند دن قیام کیا اور پھر ایک عزیز کے ہمراہ کشمیر جا پہنچے جہاں، فارسی عربی کی تعلیم مکمل کی۔

کلکتہ میں قیام کے دوران میں حضرت شمس کلکتوی سے اصلاح لینے اور مشاعروں میں شامل ہونے لگے ان دنوں وہاں آغا حشر مرحوم کی وجہ سے ادبی ہنگامے زوروں پر تھے جگر نے ان صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ——— دہلی پہنچے تو ایک دن پھرتے پھراتے ایک مشاعرے میں جا پہنچے یہ مشاعرہ حضرت داغ دہلوی کی صدارت میں ہو رہا تھا آپ نے اجازت لے کر غزل پڑھی ایک شعر پر داغ مرحوم نے چونک کر جگر کو دیکھا اور پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو" آپ نے بتایا "سرحدی ہوں" ——— یہ سن کر انہیں بڑا تعجب ہوا ان کی بڑی تعریف کی اپنے برابر بٹھایا اور فرمایا ———

"ہم تو سمجھتے تھے سرحد پٹھانوں کا ملک ہے وہاں اُردو کوئی جانتا بھی نہ ہوگا۔ لیکن تمہاری زبان تو دلی والوں سے زیادہ فصیح معلوم ہوتی ہے"
نظم ونثر بے تکلف لکھتے ہیں اور کھرے کھاٹ لکھتے ہیں ——— باغ و بہار قسم کے آدمی ہیں۔ طبیعت میں اَنا ضرور ہے لیکن تکبّر نہیں ——— ہفتاد سالہ بزرگ ہیں لیکن طبیعت جوان پائی ہے۔ صحت بحال اور قویٰ میں اعتدال ہے ——— شاعری سے زیادہ اپنی غیر معمولی صحت پر فخر کرتے ہیں اور اس کے اظہار میں مکّے سے پتھر توڑنے کا کرشمہ بارہا احباب کو دکھا چکے ہیں۔

جگر صاحب عہد رفتہ کی یادگار ہیں آپ کے ہمعصروں میں سے صرف قاضی قضا صاحب حیات ہیں۔ آپ نے سرحد میں اُردو کی ترویج کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ایسے وقت میں ادب کی شمع روشن کی جب کہ یہاں کا ماحول تیرہ و تار تھا ——— آپ نے عظیم الشان مشاعروں اور ادبی ہنگاموں کے ذریعے لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کیا اور آج سرحد میں اردو ادب جس بلند مقام پر نظر آتا ہے اس میں آپ کی مساعی جمیلہ کا غالب حصّہ ہے۔

قاضی محمدؐ عمر قضاؔ

قاضیوں کے مشہور گھرانے میں جنم لیا علم وفضل ترکہ میں پایا۔ شعر وسخن کا ذوق گھٹی میں پڑا تھا کچھ عرصہ داغ دہلوی سے غائبانہ اصلاح لیتے رہے تمام عمر شعر کہتے اور حقّہ پیتے گزر گئی۔ والد کی وفات کے بعد ایک معقول جائیداد ترکہ میں پائی۔ ساری عمر کوئی دھندا نہ کیا۔ بیٹھ کر کھاتے رہے اسی مشغلے میں تمام جائیداد پھونک ڈالی حتیٰ کہ رہائشی مکان تک نہ رہا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک رہا ——— ان کی لائبریری میں فرانسیسی، انگریزی، عربی، فارسی، گجراتی، پشتو اور اُردو کتب کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ موجود ہے جن میں بڑے بڑے نادر نسخے بھی ملتے ہیں۔

ابتدا میں گھڑسواری اور شطرنج کا بہت شوق تھا لیکن شاعری کے شوق نے باقی تمام شوق بھلا دیئے۔

قضا عالم فاضل شخص ہیں اور اہل علم کی قدر کرتے ہیں لیکن نقادانہ طبیعت سے کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہتا۔ ان کی عمر اس وقت ۷۷ برس ہے۔ سماعت جاتی رہی، بصارت کمزور ہوگئی، اعضا مضمحل ہوگئے لیکن دل و دماغ محفوظ ہیں۔ ہوش وحواس قائم ہیں ——— اب بھی باتوں میں وہی سنجیدگی وہی مٹھاس اور وہی لذت ——— مادری زبان ہندکو ہے لیکن ہمیشہ اردو بولتے ہیں یہاں تک کہ گھر پر بھی اُردو ہی میں باتیں کرتے ہیں ——— صاف اور شستہ اُردو ——— کوثر میں دھلی ہوئی زبان ———

قضا نہایت محتاط اور ممتاز شاعر ہیں انہیں ادبیات سرحد کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے ——— وہ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اصناف سخن میں صرف غزل کو اپنایا اور اسے عروج پر پہنچایا۔

قضاؔ کو ہم سرحد کا غالبؔ کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ غالب کی طرح انہیں اپنے فارسی کلام پر ہمیشہ ناز رہا اور اردو مجموعے کو بے رنگ سمجھتے رہے لیکن اُن کی شہرت وعظمت کا باعث یہی اُردو مجموعہ ثابت ہوا ——— غالب کی طرح بیدل اور نظیری سے بے حد متاثر ہیں اس لئے اوائل میں طبیعت نہایت دقّت پسند تھی اور طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنے کو اپنے زورِ سخن کی معراج سمجھتے تھے چنانچہ ابتدائی غزلوں میں اُن کا یہی مرغوب انداز ملتا ہے۔

یک جہاں جلوہ محوِ اضطراب ضبطِ دل
قائم الفّار اے قضاؔ ہر آئینہ سیماب تھا

لیکن رفتہ رفتہ سادہ اور سلیس، زبان میں غزل کہنے لگے زبان اور محاورہ پر عبور حاصل تھا یہ اسلوب اتنا مقبول ہوا کہ انہوں نے اپنے لئے منفرد مقام حاصل کر لیا ؎

آؤ نہ ہم بھی بھیس بدل کر ادھر چلیں ——— ہے ربط ان کے ناز کو ناآشنا کے ساتھ

آئی سمجھو گھڑی قیامت کی　　　زلف سے ناپتے ہیں قد اپنا
لیجئے آپ کو مبارک ہو　　　کھا گیا غیر کو حسد اپنا

قضا کو داغ سے شرف تلمذ رہا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ داغ کے مکتبۂ فکر سے بہت کم متأثر ہوئے بلکہ اس کے برخلاف ان کے کلام میں غالب کے رنگ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

قضا سے پہلے سرحد میں غزل روایتی ڈگر پر چل رہی تھی انہوں نے اسے رفعت، حسن اور تازگی عطا کی، مضمون آفرینی کی بنا ڈالی اور غزل کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ قضا سے پہلے بلکہ ان کے دور میں بھی یہاں غزل میں کوئی ندرت نہ تھی، وہی گھسے پٹے مضمون باندھے جاتے اور اُگلے ہوئے نقمے چبائے جاتے ——— قضا نے آکر ایک ایسے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی جس نے یہاں کی اونگتی ہوئی شاعرانہ فضا کو چونکا دیا ——— قضا کی شاعری اس مسلسل بھیانک تاریکی میں روشنی کا مینار ثابت ہوئی ——— تلاش و جستجو کے دلدادہ اس کی طرف لپکے اور اس سے مستفید ہونے لگے۔

قضا میں انانیت ضرور ہے لیکن ان کے علم و فضل کے پیش نظر یہ انانیت انہیں زیب دیتی ہے ——— تمام عمر لکھتے رہے اور اتنا کچھ لکھا کہ کئی دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو یہی ہے کہ کسی طرح دیوان چھپ جائے اور اس کے لئے وہ سالہا سال سے کوشاں ہیں۔ اس وقت سے جب پریس ان کا اپنا تھا اور دیوان چھاپنے میں کوئی خاص دقت نہ تھی۔ لیکن ان کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور بدگمانی نے اس دیرینہ آرزو کو شرمندۂ تکمیل نہ ہونے دیا۔ جرائد کو کلام چھپنے کے لئے اس خدشہ سے نہیں دیتے کہ کوئی چرا نہ لے۔

مشاعروں میں ابتدا ہی سے کم شریک ہوتے ہیں اور اب تو اتنے معذور ہو چکے ہیں کہ مہینوں گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ویسے بھی گھر سے باہر شاذ ہی نکلتے تھے۔ تمام دن بیٹھک میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں یا پھر حقہ پی رہے ہیں ——— یہ بھی شاید قضا صاحب کی منفرد خصوصیت ہے کہ وہ سلیٹ پر شعر لکھتے ہیں، اسفنج سے مٹاتے اور صاف کر کے لکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ غزل کی نوک پلک درست ہو جائے تو اسے کاپی پر منتقل کر لیتے ہیں۔

ع　　نہ چلی سامنے قضا کے　　　غوث کی، قطب کی، ولی کی

غلام محمد غوثی سرحدی

۱۹۳۲ء میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر سے نکلا اور تلاش معاش میں دہلی ہوتا ہوا کلکتہ جا پہنچا۔ وہاں پشاور کے جواں سال شاعر اختر آصفی کے ذریعے غلام محمد غوثی سے تعارف ہوا۔ آپ صحافی بھی ہیں شاعر بھی اور عروضی بھی ———

بیس برس کی عمر میں اپنے وطن مالوف پشاور کو چھوڑ کر کاروباری سلسلہ میں کلکتہ جانا ہوا اور وہیں کے ہو رہے غزل کے شاعر ہیں، غزل قدیم رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ آغا حشر مرحوم اور وحشت کلکتوی کے جلیسوں میں سے ہیں نہایت ثقہ قسم کے بزرگ ہیں نیشلسٹ خیالات رکھتے ہیں شروع ہی سے کانگرس کے ساتھ تھے اور آج بھی ان کی وضع داری اور اصول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بارہا قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں تمام عمر ہنگامہ بازی میں گزری ——— صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی ——— ان کی زندگی عجیب ہنجار سے گزری۔ کبھی سونے چاندی میں کھیل رہے ہیں تو کبھی نقر و فاقہ سے دوچار ———

خوش پوش اور خوش ذوق انسان ہیں ہر وقت فکر سخن میں کھوئے نظر آتے ہیں۔ میری ذہنی تربیت میں غوثی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ میں نے

صرف چند ابتدائی غزلوں پر ہی ان سے اصلاح لی تاہم میرے ادبی ذوق کو جلا دینے اور سب سے پہلے ادبی حلقوں سے متعارف کرانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

۱۹۳۵ء میں پشاور واپس آیا۔ انہی دنوں مجھے یہاں کی ادبی محفلوں میں شمولیت کا موقع ملا اور میری ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ دائرۂ ادبیہ پشاور سے وابستگی اختیار کی اور مشاعروں میں باقاعدہ حصہ لینے لگا۔

اس وقت یہاں کی قدیم ادبی جماعت بزمِ سخن آخری سنبھالا لے رہی تھی۔ وہ اپنی چٹختی ہوئی بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ جواں سال ادبی ادارے دائرۂ ادبیہ سے ٹکر لینے کے لئے میدان میں کود پڑی تھی۔ اس کے صدر محمد شاہ برق تھے۔

محمد شاہ برق

برق صاحب نہایت پرگو اور حاضر دماغ واقع ہوئے ہیں ہمیشہ مشاعرے سے دو تین گھنٹے پہلے بیٹھ کر پندرہ بیس اشعار کی غزل کہہ لیتے ——— ایک دفعہ دفتر سے دو مہینے کی چھٹی لے کر کوہاٹ گئے اور واپسی پر ایک سو غزلیں لکھ لائے ——— تمام عمر شعر و سخن کے مشغلے میں گزاری۔ دفتر سے چھٹی ہوتی تو بزمِ سخن کے بالاخانے یا میر عباس مرحوم کے قہوہ خانے میں جا بیٹھتے جہاں احباب جمع ہونے لگتے ادبی بحثیں ہوتیں۔ اساتذہ کے کلام کی شرح کی جاتی، نوعمر شعراء کے کلام پر اصلاح دی جاتی۔ یہاں تک کہ ایک بجے شب میں محفل برخاست ہوتی اور آپ گھر کا رخ کرتے۔ یہ سلسلہ کم و بیش پچیس تیس برس تک ایک ہی ہنجار پر قائم رہا۔ اب گوشۂ عزلت اختیار کر لیا ہے اور ادبی دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

ہنس مکھ اور ملنسار ہیں کبھی بے تحاشا چائے پینے اور بے تحاشا شعر کہنے کی وجہ سے بدنام تھے لیکن اب صرف کثرت چائے نوشی کا الزام سے کر رہے ہیں۔

خالص مکی

دائرہ ادبیہ میں ایک سفید ریش بزرگ کبھی کبھار تشریف لاتے تھے ضعیف العمر، دائم المریض لیکن زندہ دل، فہمیدہ اور بامذاق ——— بعد میں معلوم ہوا وہ یہاں کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں اور انہیں خالص مکی کہتے ہیں۔

دماغ زرخیز پایا تھا مشرقی علوم پر عبور حاصل تھا خصوصاً شعر فہمی میں تو اپنی نظیر آپ تھے طبیعت دقت پسند تھی۔ بیدل، نظیری اور غالب سے بحد متاثر تھے اور انہی کی تقلید میں خود بھی فارسی اردو دونوں زبانوں میں نہایت الجھے ہوئے شعر کہتے تھے لیکن بظاہر مومن کے بڑے مداح تھے یہاں تک کہ اس کی مدح میں غالب کی قدح سے بھی دریغ نہ کرتے۔

خالص کے اصلی حریف ان کے ہمعصر جگر کاظمی تھے۔ ابتدا ہی سے ان میں بن نہ سکی اور یہ چشمک آخر تک قائم رہی ان کا سب سے بڑا مشن ایک دوسرے کی مخالفت کرنا تھا۔ خالص جہاں بیٹھتے جگر پر کڑی تنقید کرتے اور جگر ہر ملنے والے سے خالص کی شکایت کرتے ——— لیکن خالص فوت ہوئے تو سب سے زیادہ قلق جگر کو ہوا وہ رو رو کر کہتے تھے خالص کے اٹھ جانے سے ہماری شاعری ختم ہو گئی اور یہ حقیقت ہے کہ خالص کی وفات کے بعد جگر بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔

خالص آزاد مشرب اور وسیع النظر انسان تھے ان کے والد اہلِ سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہوش سنبھالا تو اہلِ حدیث بن گئے۔ شیعی لٹریچر پڑھتے پڑھتے اثنا عشری ہو گئے۔ بمبئی [illegible] سے خوارج کا لٹریچر ملا اس سے متاثر ہوئے۔ کچھ دن عیسائیت کی طرف رجحان رہا۔ پھر مرزا غلام احمد صاحب کے [illegible] [illegible] سب بند [illegible] بالکل آزاد ہو گئے۔ نہایت خوش مذاق اور صاف گو واقع ہوئے تھے اپنی اس مذہب بازی

یہ۔ ایک لطیفہ اکثر سنایا کرتے کہ انکا ایک پٹھان دوست انہیں محرم کے جلوسوں میں دیکھا کرتا تھا۔ پھر اس نے سنا خالص قادیانی ہو گئے، کچھ دنوں بعد آریہ سماجی ہو گئے۔ وہ بے حد متعجب ہوا اور بے ساختہ بولا " یہ کمبخت بھی ہر مذہب میں حاضر ہے "۔

خالص نستعلیق قسم کے بزرگ تھے چہرے سے تدبر اور رعب ٹپکتا۔ گفتگو ثقہ اور متین ہوتی۔ علمی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتے اور خوب مزے لے کر طنز کے تیر پھینکتے جاتے۔ دوسروں کو زچ کرنے میں انہیں بڑا لطف آتا۔ وہ نہایت روشن خیال اور روشن دماغ انسان تھے کسی بات کا برا نہ مانتے یہاں تک کہ اپنی کمزوریوں کو بھی برملا بیان کرتے لیکن افسوس کہ ان کی تحریریں یہ بات پیدا نہ ہو سکی۔

خالص مزدور پیشہ تھے آمدنی محدود تھی لیکن طبیعت شاہانہ پائی تھی۔ مہینوں فقر و فاقہ گزارنے کے بعد جہاں کہیں کام بنتا اور سو پچاس روپے ہاتھ آتے وہیں دوستوں کو کھلا پلا کر پھر وہی فقر و فاقہ ——— اپنے کام میں بڑے ماہر تھے ٹھیکیداری میں لاکھوں کمائے لیکن کچھ بھی پس انداز نہ کر سکے۔ ہزاروں عالیشان بلڈنگیں بنائیں مگر اپنے لئے ایک جھونپڑا تک نہ بنا سکے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے کرائے کے مکان میں رہتے جو ایک دن بارش ہوتی تو مہینہ بھر ٹپکتا ———

آخر عمر میں صحت جواب دے گئی۔ ذیابیطس کے مریض تھے، ہاضمہ بیکار ہو گیا سماعت جاتی رہی، چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ——— کام کاج کرنے کے قابل نہ رہے۔ احباب نے کوشش کر کے سکول میں معلم کرا دیا۔ لیکن وہاں بھی زیادہ دن نہ گزار سکے۔ مسلسل بیکاری کے باعث تنگدستی ایسی مسلط ہوئی کہ مرتے دم تک چھٹکارا نہ مل سکا۔ خودداری کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ کئی کئی وقت کا فاقہ ہوتا لیکن چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی، ماتھے پر بل تک نہ آتا ——— لیکن اپنی زندگی کے ان اندھیروں میں وہ اپنی شاعری کا دستور بنا سکے۔

خالص کی شعر فہمی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ایک دفعہ یار لوگوں کو مذاق سوجھا سب نے مل کر ایک مہمل غزل لکھی جو محض الفاظ و تراکیب کا گورکھ دھندا تھی غزل انہیں سنائی گئی انہوں نے بڑی تعریف کی لیکن جب راز کھلا تو وہ اڑ گئے کہ اس میں معانی موجود ہیں۔ چنانچہ اب جو انہوں نے اسے معنی پہنانے شروع کئے تو سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے وہی مہمل غزل ان کی زبانی سے اچھی خاصی غزل معلوم ہو رہی تھی۔

فروری ۱۹۴۲ء میں پشاور میں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

رضا حسین رضا ہمدانی

اسی دوران میں رضا ہمدانی سے میرا تعارف ہوا جس سے آگے چل کر ایسے قلبی تعلقات قائم ہوئے کہ ہماری رفاقت دوستوں کے حلقوں میں ضرب المثل بن گئی اور ہم ایک دوسرے کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

رضا ہمدانی سے میری پہلی ملاقات بزم سخن کے ایک مشاعرے میں ہوئی اور پھر جو ان ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو بڑھتا ہی گیا ——— میں نے اس ایرانی الاصل، غزال چشم مغل زادے کو ایرانی اور ترکمانی قالینوں میں دھنسا ہوا بھی شاعری میں گم پایا اور رنگ برنگے شال دوشالوں میں پیٹے ہوئے بھی فکر سخن میں غلطاں دیکھا ——— رضا کی دوکان پر ہر وقت شعرا کا جمگھٹا لگا رہتا اور وہ اپنے شاعرانہ پیشے رفوگری کے تانے بانے میں مصروف۔

رضا بزم سخن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ بزم کا حقیقی دفتر رضا کی دوکان ہی تھی معاشی دھندے کے بعد اس کا سارا وقت ادبی خدمت کی نذر ہو جاتا۔

ایک مدت تک رضا کی انگلیاں نوکِ سوزن سے چھلنی ہوتی رہیں ——— وہ تکلیف اور زوال دوشالوں کے سوراخ بند کرتا رہا اور معاشی ناآسودگی اس کے [illegible] ناقابل رفو سوراخ بناتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ رفوگری سے گلو خلاصی کر کے پتلی ہوئے نرم اور ریشمی سبز و سیاہ چائے تولتے دیکھا گیا۔ یہاں بھی ہم مشرب احباب کا جمگھٹا رہنے لگا۔ یہ [illegible] پہ سلسلہ کب تک چلتا۔ آخر اس نے اس علاقے سے بھی جان چھڑائی اور جہانگیر پورہ میں ایک چھوٹی سی تمباکو کی دوکان کرلی یعنی سستی آزاد ریاست ——— جس میں شاعری زیادہ ہوتی اور دوکانداری کم ———

دائرہ ادبیہ اور بزم سخن کی باہمی چپقلش، شاعرانہ سیاست کے جوڑ توڑ اور تخریبی مگر زندہ دلی سے بھرپور سکیموں کا مرکز یہی دوکان تھی۔ اس گروہ بندی کے باوجود رضا کی امن جو اور صلح کن طبیعت کا یہ عالم تھا کہ حزب مخالف کے اراکین بھی اس کی قدر کرتے ——— راقم الحروف دائرہ ادبیہ کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور رضا سے بھی قلبی انس تھا ——— ہم دونوں بزم و دائرہ کے موضوع پر ہر وقت بحثتے اور اکثر یہ مبادلۂ افکار مجادلے کی سرحدوں کو چھونے لگتا ——— اسی قضیئے کو نپٹانے کے لئے ہم نے ایک الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اور ۳۸ء میں ہم نے بزم سخن اور دائرہ ادبیہ سے قطع تعلق کرکے ادبستان کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اب رضا کی ادبی سرگرمیاں مشاعروں کے حدود پھاند کر نشر و اشاعت کا روپ اختیار کر گئیں ماہنامہ ندا اور ہفتہ وار شباب انہی ایام کی یادگار ہیں۔

جب معاشی بحران نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو رضا نے میری معیت میں پشاور سے ہجرت کرکے راولپنڈی کو جا بسایا۔ وہاں بھی ادبی ہنگاموں نے ساتھ نہ چھوڑا پھر لاہور جاکر ہفتہ وار مصور شباب کا اجراء کیا اور جب شباب بند ہوگیا تو کراچی جاکر صحافت کو ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کی۔ ادبی لگن وہاں بھی ہمراہ رہی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو کراچی کی سلور جوبلی منعقدہ ۱۹۴۱ء کے انتظام و انصرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انجمن کی پچیس سالہ ادبی رپورٹ رضا ہی کے تراوشِ قلم کا نتیجہ تھی جو سندھ میں اردو کی ایک مجمل تاریخ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کا ریلا جہاں ملک کے افراد کو سات سمندر پار لے گیا وہاں اس نے ہمیں وطن آنے پر اکسایا اور جب ہم پشاور پہنچے تو پھر وہی معاش کا سوال اپنی بھیانک صورت لئے ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ اسی زمانہ میں ہم دونوں نے طبی لائن اختیار کی اور کچھ عرصہ بعد ——— رفو گر رضا تالیفوں کی بجائے جسم انسانی کے زخموں کو رفو کرنے لگا۔

آج غیر شاعر دنیا رضا کو ڈاکٹر کی حیثیت سے جانتی ہے اب وہ ملازمت سے تو بے نیاز ہے لیکن شعر و ادب سے بے نیاز نہیں ——— سنگ میل کا جبری التوا بھی اس کے تخلیقی جذبے میں سنگِ گراں نہ بن سکا۔ چنانچہ اس وقت وہ بے شمار کتابوں کا مصنف ہے۔

رضا کی شاعری میں مقصد بھی ہے اور فن بھی ——— دل کی باتیں بھی ہیں اور دماغ کی بھی ——— ادب کی چاشنی بھی ہے اور عمل کی حرارت بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں وہ خلوص ہے جو شعر کو تصنع اور آورد سے پاک اور منزّہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

رضا ادبیات سرحد کا ایک ناقابل فراموش باب ہے وہ سچا رفیق، مخلص فنکار اور ان تھک ادبی کارکن ہے ——— وہ سادہ وضع، سادہ دل اور سادہ نظر انسان ہے اس کی ادبی خدمات کا پلہ بہت بھاری ہے اس نے یہاں دور جدید میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا ——— وہ سب سے پہلا سرحدی ادیب ہے جس نے پشتو لٹریچر کو اردو دان طبقے سے متعارف کرایا یہی کارنامہ اس کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کام کیا اس کی نظم و نثر تخلیقات بے پایاں ہیں وہ گزشتہ پچیس برس سے خدمت ادب میں منہمک ہے وہ گلشن ادب کا ایک سدا بہار پھول ہے ایک مکتبۂ فکر ہے، ایک تحریک ہے ———

جعفر علی جعفری

جعفری کو میں نے دیکھا تو وہ نابینا تھے لیکن کہتے ہیں کچھ عرصہ پہلے ان کی آنکھیں اچھی بھلی تھیں دوکانداری کرتے تھے اور ان کی دوکان پشاور کے شعراء کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ بینائی کے ساتھ دوکان بھی جاتی رہی لیکن اس حادثے نے ان کے شعری قویٰ کو مفلوج کرنے کی بجائے اور جلا دی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے۔

جعفری بزم سخن کے فدائی تھے اور اس بزم کی تمام تر سرگرمیاں انہی کی مرہون منت تھیں۔ مشاعروں کے لئے پنڈال سجانا، شعراء کو جمع کرنا، دعوت نامے تقسیم کرنا ——— غرض کہ سب کچھ جعفری ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ تمام نوآموز شعراء کے کلام کی اصلاح بھی کرتے اور مشاعروں کو کامیاب بنانے

کے لئے کئی کئی طرحی غزلیں لکھ کر فرضی شاعروں میں بانٹ دیتے۔ پھر انہیں پڑھنے کی ریہرسل بھی کراتے اور مشاعروں میں خود ہی انہیں داد بھی دیتے ——
یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا جس میں وہ رات دن جٹے رہتے۔

جعفری بڑے زندہ دل انسان تھے۔ ہنگامہ آرائی ان کی زندگی تھی اور طنز و مزاح ان کی گھٹی میں پڑے تھے ——— مشاعرے کے طرحی مصرع پر کسی نہ کسی کی ہجو میں دو چار شعر ضرور کہتے ——— ادھر یہ شعر ان کے منہ سے نکلتے ادھر زبان زد خاص و عام ہو جاتے۔ اس طرح مشاعرے سے چند روز پہلے ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا۔

جعفری کا طنز ان کے اقتضائے طبیعت کے باعث تھا اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہ تھی چنانچہ وہ اپنے عزیز دوستوں اور ہمجلیسوں کو بھی معاف نہ کرتے بلکہ بعض اوقات تو اپنے آپ کو بھی لپیٹ میں لے آتے۔

ہم کہاں کے مرد میداں تھے مگر اے جعفری
جب کبھی پی لی تو اس کوچے میں پھیرا ہو گیا

ان کے طنزیہ اشعار بے شمار ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ثقاہت سے گرے ہوئے اور مبتذل قسم کے ہیں اگرچہ ان میں فنی محاسن موجود ہیں لیکن ابتذال کی وجہ سے احاطۂ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔

ہزلیات اور ہجو میں جعفری کا کوئی ثانی نہ تھا ان کی شوخ و شنگ طبیعت اس طرف خوب چلتی تھی اس پر امّی بھی تھے اس لئے انہیں جرأت سے بڑی مناسبت تھی لیکن ان کے حسرت ناک انجام پر نظر کی جائے تو وہ انشاؔ سے بہت ملتا ہے۔ آخری ایام میں جب راقم الحروف رضا ہمدانی کی معیت میں جعفری کے مکان پر انہیں دیکھنے گیا تو ان کی حالت زار دیکھ کر بے اختیار آنسو نکل آئے ——— کمرے کے ایک کونے میں سر گھٹنوں میں دیئے گم سم بیٹھے تھے۔ بیمار و نزار جسم میں کپکپاہٹ ——— ہماری آواز سن کر سر اٹھایا آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے بہت دیر تک وفور گریہ سے بات نہ کر سکے آخر بولے "فارغ بھائی مرنے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہوں لیکن یہ انتظار کمبخت تو طول شب ہجراں بن گیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے اندھا ہو کر بھی کسی پر بوجھ بن کر نہیں رہا لیکن اب اتنا معذور ہوں کہ زندہ لاش بن کر رہ گیا ہوں۔ بھائی بھاوج خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن یہ مانگے تانگے کی زندگی مجھے منظور نہیں۔"

ان کی یہ سقیم حالت دیکھ کر دل بھر آیا۔ یا اللہ کیا یہ وہی جعفری ہیں جن کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے جو اپنے لطیفوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے ——— جن کے سامنے بڑے بڑے چرب زبان گنگ ہو کر رہ جاتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے آب حیات کا وہ واقعہ یاد آگیا جو مولانا آزاد نے انشاؔ کے متعلق لکھا ہے۔

دراصل جعفری کی زندہ دلی کا جنازہ اس دن نکلا جس دن اس کی جواں سال اکلوتی لڑکی اچانک فوت ہو گئی اس زخم نے جعفری کی زندگی کو بے نور کر دیا اور ان کا دل یک لخت دنیا اور دنیا کے ہنگاموں سے اچاٹ ہو گیا ادبی محفلوں میں جانا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

جعفری نے تقریباً دو برس کی طویل علالت کے بعد جون ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔

ضیا جعفری و عبدالودود قمر

دائرہ ادبیہ میں یوں تو بہت سے نوجوان ادیب موجود تھے لیکن ضیا اور قمر اس ادارے کی روح رواں تھے انہوں نے بزم عثمان سے بغاوت کر کے دائرہ کی بنیاد رکھی اور اپنی انتھک کوششوں سے اسے انتہائی عروج تک پہنچایا۔ میں دائرہ ادبیہ میں آیا تو ضیا اور قمر کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت سرحد کے طول و عرض میں نئے اور پرانے اچھے اچھے لکھنے والے موجود تھے لیکن ان دو شخصیتوں کے سامنے سب کے سب ٹھگنے اور

بالشتیئے معلوم ہوتے تھے۔

ضیا اور قمر کی رفاقت ادبیات سرحد کا ایک سنہری باب ہے انفرادی طور پر شاید ان کی سرگرمیاں اتنی مفید ثابت نہ ہوتیں لیکن مجموعی طور پر انہوں نے بے نظیر کام کیا —— یہی ٹیم دورِ جدید کی بانی مبانی ہے انہوں نے ماضی کی فرسودہ قدروں سے بغاوت کرکے جدید رجحانات کے لئے زمین ہموار کی اور نئے لکھنے والوں کی صحت مند تربیت سے ان کے دلوں میں خود اعتمادی اور بلند نگاہی کے جذبے کو جنم دیا۔

ضیا اور قمر کی ملاقات حادثاتی تھی قمر کی رعنائی جمال کا شہرہ تو تھا ہی لیکن ضیا بھی مہر نیم روز سے کم نہ تھے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ایسے گھائل ہوئے کہ آج تک ان کے بندھن نہ ٹوٹ سکے۔ ان کی اٹوٹ رفاقت کی وجہ مزاج کی ہم آہنگی بھی تھی دونوں مذہبی رجحانات کے حامل تھے دونوں "درجوانی توبہ کردن" والے پیغمبرانہ گروہ میں سے تھے دونوں علم و فضل کے شیدائی اور شعر و ادب کے رسیا تھے ضیا نے قمر کو تصوف کی چاٹ لگا کر رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ دونوں نے ایک ہی پیر کامل سے بیعت کی اور ایک دوسرے کے ابدی ساتھی بن گئے۔

ضیا اور قمر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ وہ مثبت و منفی تاروں کی طرح مل کر سرحد کے ادبی ماحول میں روشنی کا مینار ثابت ہوئے۔ ضیا صرف ادیب اور شاعر ہی ہے لیکن قمر اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھا منتظم اور ان تھک ادبی کارکن بھی ہے۔ نئی پود کی تربیت میں ان دونوں کا بڑا حصہ ہے دائرہ ادبیہ کے زمانہ میں راقم الحروف مشورۂ سخن ضیا صاحب سے لیتا تھا لیکن ذہنی تربیت اور لکھنے لکھانے کی ترغیب قمر صاحب ہی نے دلائی۔

ضیا کو دورِ جدید کے کارواں سالار کی حیثیت حاصل ہے۔ سرحد میں سب سے پہلے جدید اقدار کو انہوں نے ہی اپنایا۔ ان کی شاعری کلاسکیت اور جدت کا ایک خوشگوار سنگم ہے وہ پرانی قدروں کی بنیادوں پر نئی عمارت کھڑی کرنے کے حامی ہیں اسی توازن نے انہیں بھٹکنے سے بچایا اور ہر عہد میں مقبول بنایا ——

ضیا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی رجائیت ہے۔ وہ صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی —— ان میں فرار بھی ہے اور قرار بھی —— ان کے ہاں جنسی میلان بھی ہے اور زندگی کے ٹھوس مسائل بھی —— وہ فن کے دلدادہ بھی ہیں اور مقصد کے شیدائی بھی ——

ضیا کی زندگی اور فن میں جتنی مطابقت پائی جاتی ہے وہ شاید ہی کسی اور فنکار کو نصیب ہوئی ہو —— صوفی منش ہونے کے باعث وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک صلح کل انسان ہیں —— ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر مشرب کے لوگوں سے گھل مل کر رہنا اور اخلاص و محبت سے پیش آنا ان کا خاصہ ہے —— اسی طرح ادب میں بھی وہ ایک صلح کل شخصیت رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص دائرے میں مقید نہیں کرتے۔ کسی ایک مکتبۂ خیال سے وابستہ نہیں ہوتے، کسی خاص عقیدے کے پرچار پر مقید نہیں رہتے۔

ضیا کی ایک بڑی صفت ان کی وسیع النظری ہے وہ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور ہیں وہ جھوٹی وضع داری کے قائل نہیں، وہ نہ ضدی ہیں نہ برخود غلط —— اس چیز نے ان کے فن کو بڑا فائدہ پہنچایا اور انہیں جاوداں بنا دیا۔ انہوں نے جو کچھ کہا سوچ سمجھ کر کہا۔ خلوص اور دیانت داری سے کہا ——

ضیا کی رعنائی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی ضرب المثل بن چکی ہے وہ زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ان کی کمزوری بھی ہے اور خوبی بھی —— وہ علمی گفتگو میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، گھنٹوں بولتے ہیں لیکن سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں ایک آدھ فقرہ ایسا کہہ جاتے ہیں جس سے بحث کی ساری سنجیدگی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ دراصل زیادہ سنجیدہ فضا میں اُن کی روح گھٹنے لگتی ہے ان کی طبیعت میں مزاح بہت ہے اور جب انہیں مزاح کا دورہ پڑے یا کوئی تڑپتا ہوا فقرہ ان کے ذہن میں ڈھلنے لگے تو اسے روکنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

ضیا محفل کی جان، مشاعروں کی رونق اور ادبیات سرحد کے بوستان کا لالۂ احمر ہیں۔

نذیر مرزا برلاس

برلاس ضیاؔ اور قمرؔ کے ایک اور ساتھی ہیں۔ جو شروع ہی سے ان کے دوش بدوش سرحد میں شعر و ادب کے پودے کو اپنے خونِ دل سے سینچ رہے ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ برلاس کی کشش ہی مجھے دائرہ ادبیہ میں کھینچ کرلے گئی تو بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں دائرہ کے ایک مشاعرے میں سُنا وہ اپنی مشہور نظم رنگین وادی پڑھ رہے تھے مجھے اُن کی آواز بڑی عجیب سی لگی۔ غزل کے ماحول میں ان کی رومان میں ڈوبی ہوئی اس حسین و جمیل نظم نے سارے مجمع کو رنگین خوابوں کی ایک پُراسرار دنیا میں پہنچادیا۔ اور میں تو ان کی شخصیت سے اتنا مرعوب ہُوا کہ ان کے سامنے مجھے ایک عرصہ تک شعر پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

برلاس سرحد میں اردو شاعری کے رومانی دور کا آغاز کرنے والے بھی ہیں اور خاتم بھی ——— برلاس نے ہوش سنبھالا تو پنجاب میں اختؔر شیرانی کا طوطی بول رہا تھا۔ اختر متحدہ ہندوستان میں مسلّمہ طور پر اردو شاعری کے رومانوی دور کے بانی مبانی تھے۔ برلاس ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پا رہے تھے۔ انہوں نے اختر کو پڑھا، سنا اور نہایت قریب سے دیکھا ——— دوسرے نوجوان شعراء کی طرح برلاس بھی اختؔر سے بے حد متاثر ہوئے۔ ادھر مغربی شعراء میں سے ورڈزورتھ، شیلے اور کیٹس کے مطالعے نے بھی انہیں رومانیت کی طرف مائل کیا ادھر ان کی طبیعت بھی، ابتدا ہی سے رومان پسند واقع ہوئی تھی ان سب اتفاقات نے مل ملا کر برلاس کو سرحد میں اپنے دور کا سب سے بڑا رومانی شاعر بنا دیا۔

برلاس کی تمام عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ انہوں نے ایک معمولی ٹیچر کے طور پر اپنی زندگی شروع کی اور اس وقت اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو لکھتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔ کتاب ان کی بہترین رفیق ہے اور ہر سال کوئی نہ کوئی امتحان دینا ان کی عادت بن چکی ہے۔ نامساعد حالات کی وجہ سے انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت کو ذریعۂ معاش بنانا پڑا لیکن تحصیلِ علم کے ذوق نے نچلا نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے منشی فاضل، ادیب فاضل، بی اے، بی ٹی، ایم اے اردو اور ایم اے فارسی کے امتحانات ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پاس کر لئے۔ ان دنوں طہران میں پی ایچ ڈی کی تیاری میں منہمک ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر

نشتر صاحب کو شاعر کے طور پر کم اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے زیادہ لوگ جانتے ہیں آپ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی اعتبار سے بھی ایک قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بزمِ سخن سے رابطہ پیدا ہُوا اور شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے لیکن علی گڑھ سے واپسی پر سیاسی رجحانات کے غلبے نے انہیں ادب سے چھین لیا۔ پھر بھی جب تک پشاور میں رہے کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے اور ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہتے۔ ابتدا میں اکبرؔ الٰہ آبادی مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت مشورۂ سخن لیتے رہے۔

شروع میں نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے اور کانگرس کے سرگرم کارکن تھے۔ بعد میں نظریات میں انقلاب رونما ہُوا اور بعض دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح کانگرس کو متعصب ہندوؤں کی جماعت سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کی علٰحدہ ریاست کے قیام کے لئے کوشش کرنے لگے۔

انہوں نے ایک وکیل کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے حکومت کے اعلیٰ عہدوں کو چھو آئے۔ پاکستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں ——— فارسی، انگریزی، اردو اور پشتو کے نہایت اعلیٰ مقرر ہیں۔

ادھیڑ عمر ہو چلا ہے لیکن بانکپن نہیں جاتا۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شگفتگی برقرار ہے انہیں دیکھ کر یہ بات بے حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شاعر

کے لیے باصورت ہونا ضروری ہے۔

میر ولی اللہ

میر صاحب ضلع ہزارہ کی ممتاز ادبی شخصیت ہیں۔ وہ ذہین، محنتی اور مستعد انسان ہیں انہوں نے تن تنہا یہاں وہ کام کیا جو بڑے بڑے ادارے انجام نہ دے سکے۔ تمام عمر خدمت ادب میں گزری ..... شگفتہ اور رنگین طبیعت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے ہیں اور آج پچپن برس کی عمر میں بھی چہرے پر جوانی برستی ہے۔ قویٰ بحال اور صحت برقرار ہے۔

عالم فاضل انسان ہیں مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی پر بھی پورا عبور حاصل ہے اور اپنے علم و فن سے انہوں نے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ آپ انگریزی، فارسی، عربی کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ پہلے سرحدی ادیب ہیں جنہوں نے ادبی حلقوں سے اپنے فن کا لوہا منوایا اور متحدہ ہندوستان کے مشاہیر ادبا کے دوش بدوش ملک کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں چھپتے رہے۔

میر صاحب کی شخصیت جامع، ہمہ گیر اور بے مثال ہے آپ بیک وقت نہ صرف ایک نغز گو شاعر، کامیاب مترجم اور بلند پایہ نثار ہیں بلکہ طنز و مزاح میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

میر صاحب نے زرخیز ذہن و دماغ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

میر صاحب کال ٹیل قسم کے رائٹر ہیں جو تمام اصناف ادب پر حاوی نظر آتے ہیں اور سارے ادبی ماحول پر چھائے ہوئے ہیں۔

آپ ایک عرصہ سے پشاور یونیورسٹی میں لاء کالج کے پرنسپل کے طور پر متعین ہیں ان دنوں بھی فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

وحید المؤرخین حاجی سرحدی

راولپنڈی کے قیام کے دوران میں ایک بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بڑی نستعلیق قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ ملتے ہی ہماری آمد پر بیساختہ چند تاریخیں ارشاد فرمائیں اور ہمیں بغیر کسی تعارف کے یہ سمجھنے میں ذرا بھی وقت نہ ہوئی کہ آپ ہی وحید المؤرخین حضرت حاجی سرحدی ہیں۔

ابتدا میں گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں معلم رہے پھر بدلشیوں کے اتالیق کے طور پر راولپنڈی جانا ہوا اور اس سرزمین کو ایسا اپنایا کہ آخر وفات بھی وہیں پائی۔

نہایت پرگو واقع ہوئے تھے عمر بھی طویل پائی غزلوں نظموں کا بے پناہ ذخیرہ ترکہ میں چھوڑا لیکن بدقسمتی سے کوئی مجموعہ چھپ نہ سکا۔

حاجی سرحدی مرحوم اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے لیکن ان کی شہرت ایک تاریخ گو کے طور پر ہوئی تاریخ گوئی میں انہیں مہارت تامہ حاصل تھی یہاں تک پاک و ہند کی مشاہیر شخصیتوں نے انہیں بیسویں صدی کا سب سے بڑا تاریخ گو تسلیم کرتے ہوئے وحید المؤرخین کا خطاب دیا۔

جن حضرات کو حاجی مرحوم سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے وہ اس امر کی تائید کریں گے کہ فی البدیہہ تاریخ کہنے میں آپ کس درجہ ماہر واقع ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں یوں بے تکلف تاریخ کہتے جیسے پہلے ہی سے مادہ تاریخ نکال رکھے ہوں جو کوئی سامنے جاتا اس کی آمد پر بیساختہ تین، چار تاریخیں کہہ ڈالتے آپ نے دنیا کی مشاہیر شخصیتوں کے متعلق ایسی ہزاروں تاریخیں کہیں جو اردو ادب کے گراں بہا ذخیرے کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہیں آپ نے فی البدیہہ بھی بے شمار تاریخیں کہیں۔ [illegible] آخر عمر میں فن تاریخ گوئی پر ایک بلند پایہ کتاب بھی لکھ رہے تھے جسے مکمل کرنے کی موت نے فرصت نہ دی۔

ذوالفقار بخاری

پشاور میں اسد اللہ شاہ بخاری ایک بڑے ثقہ قسم کے بزرگ ہوتے تھے جو زندگی بھر ادبی جلسوں کی صدارت کرتے رہے کیونکہ ان سے بہتر صدر ملنا محال تھا خود شاعر نہ تھے لیکن صدارت کے لئے ایسے موزوں کہ کسی مشاعرے یا ادبی جلسے میں ان کا صدر ہونا کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ شخصیت اتنی باوقار کہ نہ صرف کرسی صدارت سج جاتی بلکہ اپنی پھبے دار تقریر اور نہایت دلآویز طریقے سے قدیم اساتذہ کی منتخب نظمیں سنا کر مشاعرے کا رنگ باندھ دیتے اور سامعین کو ایسا مسحور کر دیتے کہ کیا مجال جو کوئی ہلنے کا نام لے۔

ان شاہ صاحب کے تین فرزند تھے رفعت بخاری، ایاس بخاری اور ذوالفقار بخاری ——— حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ تینوں علم و فن میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔

رفعت بڑے بھائی تھے جو اپنے دور کے ذہین اور فطین شاعر گزرے ہیں مجسم ہنگامہ تھے کبھی ایک سے الجھتے کبھی دوسرے سے ——— کسی کی پگڑی اچھالتے تو کسی کی قبا پر ہاتھ ڈالتے۔ بزم سخن سے نکلے تو بزم افکار کھڑی کر دی اور ایسے معرکے کے مشاعرے کئے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

رفعت بڑی خوبیوں کے مالک تھے لیکن بدقسمتی سے دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر لاہور کے مینٹل ہسپتال میں داخل ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ پطرس کو کون نہیں جانتا ان کا ذکر شخصیات نمبر حصہ اول میں تفصیل سے آ چکا ہے اس لئے مزید کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔

ذوالفقار بخاری ان دنوں ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ یہ حضرت بھی کئی خصوصیات کے مالک ہیں۔ شاعری سے لے کر گانے بجانے تک کے فن میں طاق ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو ملنے والے کو مبہوت کرنے کے لئے کافی ہے۔

شعر سننے سے زیادہ سنانے کے شوقین ہیں۔ پڑھنے کا انداز دلکش ہے اور داد وصول کرنے کا ڈھنگ بھی خوب آتا ہے ——— لہک لہک کر پڑھتے ہیں اور جھوم جھوم کر داد وصول کرتے ہیں۔

دیکھنے میں اکھڑ معلوم ہوتے ہیں اور بنیادی طور پر بھی ہیں کچھ ——— افسرانہ فرائض سے لے کر روزمرہ زندگی کی چھوٹی موٹی سرگرمیوں تک ہر بات میں وہ اداکاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

پرگو بھی ہیں اور بدیہہ گو بھی ——— ایک ہی نشست میں غزل کہتے ہیں بے تکلف کہتے ہیں جب چاہیں کہتے ہیں اور خوب ٹھوک بجا کر کہتے ہیں۔ الفاظ کی موزونیت، بندش اور اسلوب کا خیال رکھتے ہیں اشعار کی چولیں بٹھانے میں انہیں خاص کمال حاصل ہے۔

فہمیدہ اختر

بڑے گھرانے کی چھوٹے قد کی یہ نوجوان خاتون ادبی حیثیت سے بہت اونچی شخصیت رکھتی ہیں۔ طبقہ نسواں کی بہت بڑی افسانہ نگار ہیں۔ ادبی ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے علم و ادب میں دلچسپی لینے لگیں۔ لیڈی گرفتھ گرلز ہائی سکول میں سب سے پہلی ادبی انجمن بزم ادب کی بنیاد رکھی اور اس کی جنرل سیکرٹری مقرر ہوئیں۔

سرحد میں خواتین مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تو ادب کو خیرباد کہہ کر سیاست میں حصہ لینے لگیں اور قیام پاکستان کے سلسلہ میں انتھک کام کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ادارۂ تعمیر نو میں شامل ہونے سے ادبی جنون پھر تازہ ہوا اور چند ایک اچھے افسانے پیش کرنے کے بعد پھر سیاست کی بھول بھلیاں میں کھو گئیں۔ لیکن ایک عرصہ تک سیاست کے خارزار میں بھٹکنے کے بعد احساس ہوا کہ ان کی قربانیوں کا ثمر ایک خاص طبقے کی اجارہ داری میں منتقل ہو

چکا ہے۔ اور ملک و قوم کی سربلندی کے جو فلک بوس محل انہوں نے تیار کئے تھے وہ مسمار ہو رہے ہیں اس نازک موقع پر مایوس ہونے کے بجائے وہ پھر ادب کی طرف لوٹ آئیں چنانچہ انہوں نے نہایت محنت اور کاوش سے چند انقلابی کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

فہمیدہ نے اصلاحی قسم کے مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصلی میدان مختصر افسانہ ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں قبائلی ماحول اور تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی کی ہے اور یہی ان کی وہ خصوصیت ہے جس نے انہیں دوسرے ان گنت لکھنے والوں میں ممتاز درجہ دے دیا ہے۔

نثار عزیز

نثار عزیز نے اپنی شخصیت کی تعمیر بڑی محنت سے کی ہے حال ہی میں انہوں نے شادی کر لی ہے اگر شادی کے بندھن حائل نہ ہوئے تو یہ تعمیر فلک بوس ثابت ہو گی۔

نثار عزیز نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی ——— لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کا مشہور ناول "نگری نگری پھرا مسافر" ہے جس میں انہوں نے اپنی ہی زندگی کے واقعات کو ناول کا روپ دے دیا ہے۔ اور اس لئے اس میں فن سے زیادہ خلوص ہے۔

نثار عزیز بہت بلند حوصلہ خاتون ہیں وہ تمام عمر قسمت کے خلاف برسر پیکار رہیں۔ میٹرک کرتے ہی ٹی بی کے موذی مرض نے حملہ کر دیا اور انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانچ چھ برس وارڈ سینیٹوریم میں گزارنے پڑے لیکن ہمت نہ ہاری اور ابھی پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہو پائی تھیں کہ پھر پورے زور شور سے پڑھنا شروع کر دیا اور آخر ایم اے کر کے ہی دم لیا۔

قتیل شفائی

قتیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اسے اورنگ زیب کے نام سے زیادہ اور قتیل کے نام سے کم ——— بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ وہ اس وقت شعر نہیں کہتا تھا لیکن مذاق بلند تھا۔ اساتذہ کی جستہ جستہ غزلیں یاد تھیں جنہیں اپنے مخصوص ترنم سے پڑھ کر محفل کو مسحور کر دیتا۔ یہ ۳۸ء کی بات ہے۔ وہ نوعمر تھا تلاش معاش میں اسے پشاور آنا پڑا لیکن یہاں کامیابی نہ ہوئی اور پھر یہ واپس جا کر چونگی کی ملازمت اختیار کر لی۔

تھوڑے عرصہ بعد ہی قتیل کا نام اخبارات اور رسائل میں نظر آنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوٹی کے شعراء میں شمار ہونے لگا۔ لیکن وہ اس ابتدائی ملاقات کو نہ بھولا یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے مخلصانہ تعلقات جوں کے توں قائم ہیں۔

قتیل کی منفرد شخصیت میں اس کی خود اعتمادی کو بڑا دخل ہے۔ وہ بر خود غلط انسان نہیں اپنی کمزوریوں کا بھی اسے احساس ہے لیکن اپنی خوبیاں بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ محنتی ہے، ذہین ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حوصلہ مند بھی ہے۔ اسے موجودہ مقام تک پہنچنے میں بڑی جگر کاوی سے کام لینا پڑا۔ قدم قدم ناکامیوں سے سابقہ پڑا لیکن وہ مایوس نہ ہوا اور ایک دفعہ جو قدم آگے بڑھایا اسے کسی قیمت پر بھی پیچھے نہ ہٹایا۔

قتیل دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے وہ منافقت نہیں جانتا۔ صاف دلی اور صاف گوئی اس کی وہ خصوصیات ہیں جو بسا اوقات اس کے لئے بڑی نقصان دہ بھی ثابت ہوئیں لیکن مقتضائے طبیعت کے باعث وہ ان چیزوں کو ترک نہ کر سکا۔

قتیل کی شاعری کی ابتدا بھی گیتوں سے ہوئی اور شاید اس کی انتہا بھی گیتوں ہی پر ہو وہ نغز نویس بھی ہے۔ اور خوب نویس بھی۔ اس کا مزاج گیتوں کے لئے بنا ہے وہ حسن اور رومان کا شاعر ہے گیتوں کا شاعر ہے اس کی غزلوں، نظموں میں بھی گیت ہی ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔

قتیل کے گیتوں کی نمایاں خصوصیت ان کی رنگت اور ہمہ گیری ہے اس کے گیتوں میں دیہات کے الھڑ اور سادہ باشندوں کے بے لوث اور خالص جذبات و احساسات کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور ان میں وہ ملکی مزاج ملتا ہے جو اردو شاعری کی دوسری اصناف کو فارسی کی تقلید کی وجہ سے نصیب

نہ ہو سکا۔

قتیل نے اپنی مختصر سی شاعرانہ عمر میں بہت کچھ لکھا اس نے مثنویاں لکھیں، منظوم ڈرامے لکھے، ریڈیو فیچر لکھے، بے شمار گیت، قطعات، نظمیں، غزلیں لکھیں۔ اس میں لکھنے کی بڑی قوت ہے۔

قتیل پانچ بچوں کا باپ اور پانچ کتابوں کا مصنف ہے۔ دونوں طرف اس کی تخلیقات کا یہ توازن غیر شعوری سہی لیکن اس میں کچھ نہ کچھ ربط مزید محسوس ہوتا ہے۔

قتیل کی شخصیت پیچیدہ یا پراسرار نہیں وہ سیدھا سادہ ایک عام انسان ہے لیکن کوئی شخص بھی اس سے ملنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ جادو نہ اس کی آنکھوں میں ہے نہ باتوں میں نہ چہرے میں ——— پھر یہ جادو اس کی شخصیت میں کہاں سے آیا اور کیونکر آیا یہ سراغ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کیونکہ اس طلسمی چراغ کو اس نے ایسے تہ خانوں میں چھپا رکھا ہے جہاں آج تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی ——— خود اس کی بھی نہیں ———

انگر سرحدی اور عزیز اختر وارثی

ان دونوں حضرات نے کوہاٹ میں اردو زبان و ادب کی اشاعت کے سلسلے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ عزیز اختر کی معیت انگر کے لئے دست راست کی حیثیت رکھتی تھی ان کا ملاپ بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ انہوں نے اس دور افتادہ سرزمین پر بے نظیر ادبی اجتماعات کئے۔

انگر بڑی ہر دلعزیز شخصیت کے مالک ہیں ان کی سرگرمیاں محض ادب تک محدود نہ تھیں۔ ان میں کام کرنے کی بے پناہ قوت تھی وہ بیک وقت ادبی، سیاسی اور مذہبی محاذوں پر کام کرتے رہے۔ وہ کوہاٹ میں انجمن ترقی اردو کے صدر، کانگرس کمیٹی کے جنرل سکرٹری اور مجلس تعلیم القرآن کے ناظم تھے ہنگامہ آرائی ان کی فطرت بن چکی تھی۔ ایک طرف کانگرس کے جلسے رہے ہیں تو دوسری طرف اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی عید میلاد کا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ ان کے اخلاص اور نیک نیتی کے باعث دوست دشمن سب ان سے محبت کرتے، ان کی عزت کرتے اور انہیں احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

عزیز اختر کوہاٹ کے مخلص اور ہر دلعزیز ادبی رہنما ہیں۔ ان کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے۔ شروع میں حضرت سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں سیماب سکول سے بہت آگے نکل گئے لیکن جو عقیدت ان سے شروع میں تھی آخر تک اسے نبھاتے رہے۔

اختر سادہ وضع، سادہ دل اور مخلص انسان ہیں ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ وہ ایک بے پناہ ادبی کارکن بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے دوست انگر سرحدی کی رفاقت میں صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے پورے ادارے کا کام انجام دیا ہے لیکن اب کچھ عرصہ سے خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔

موسیٰ خان کلیم

سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "طور" کے سلسلہ میں ان کا نام سننے میں آیا۔ انہی دنوں نہ صرف ان کا نام سنا بلکہ انہیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا وہ خود ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے چل کر قلمی معاونت حاصل کرنے کے لئے پشاور آئے۔ ڈیرہ جیسے دور افتادہ مقام سے ایک بلند پایہ ادبی پرچے کا اجراء کرنا کلیم ہی کا کام تھا اس پرچے کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن اس ناسازگار ماحول میں وہ پنپ نہ سکا۔ اور وہ بمشکل تمام سال بھر تک زندہ رہ سکا۔

نام موسیٰ خاں تھا تخلص کلیم اختیار کیا، پرچہ نکالا تو وہ بھی طور ——— ان تمام رعائتوں سے ان کے کلاسیکل ذوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور سے ایم اے کیا اور وہیں پروفیسری کا منصب پایا۔
علم و ادب سے والہانہ عشق ہے، مطالعہ وسیع ہے اور دماغ زرخیز ——— اقبال اور غالب سے بہت متاثر ہیں خصوصاً اقبال کے تو فدائیوں میں سے ہیں۔
شاعر کم اور نثار زیادہ ہیں عموماً علمی اور تحقیقی مضامین لکھتے ہیں اور موضوع کا حق ادا کرتے ہیں طلباء میں علمی ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

مضمر تاتاری

پشاور کے جدید شعراء میں سب سے پہلے میرا تعارف مضمر ہی سے ہوا لیکن یہ حقیقت مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ بالکل اُمّی شاعر ہے۔ اس انکشاف نے صرف مجھے ہی نہیں بڑے بڑے لوگوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اس کی گفتگو اس کے کلام اور اس کے مبلغ علم غرض کسی چیز سے بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ سرے سے پڑھنا لکھنا جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ جب ندیم قاسمی صاحب پر یہ راز کھلا تو انہوں نے کہا ——— "یہ شخص اگر پڑھا لکھا ہوتا تو بڑے بڑے اونچے فنکاروں کی کرسیاں خالی کرا دیتا۔"

مضمر ——— سائیں احمد علی مرحوم کا شاگرد بھی ہے اور صحبت یافتہ بھی ——— اس کی شاعری کی ابتدا ہندکو حرفیوں سے ہوئی ——— انیس جوش اور اقبال کے سماع نے اُردو شاعری کا ذوق دیا اور انہی تین شاعروں سے وہ متاثر بھی نظر آتا ہے ——— سب سے پہلے مضمر نے اپنی ایک نظم دائرہ ادبیہ کے مشاعرہ میں پڑھی اس نظم کی ایسی دھوم مچی کہ ادبی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مضمر نظم کا شاعر ہے یہ کلیہ کہ ہر شاعر کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے مضمر کے ہاں آکر باطل ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے تمام عمر غزل نہیں کہی۔

مضمر ایک مخلص دوست اور سچا فنکار ہے اس نے تمام عمر خدمت ادب میں گزار دی وہ ایک خاموش کارکن ہے۔ نام و نمود کی خواہش سے کوسوں دور ——— وہ ادبیات سرحد کے ریگستان کا خود رو پھول ہے، انمول موتی ہے، لوک گیت ہے۔

فارغ بخاری[1]

فارغ سے میرا بیس بائیس برس کا ساتھ ہے ہم دونوں اخبارات و رسائل میں مل کر کام کرتے رہے، ادبی اداروں میں ایک ساتھ حصہ لیا۔ تصنیف و تالیف میں رفیق کار رہے اور روزمرہ کی زندگی میں اتنا قریب رہا کہ اب تو ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال نظر آتا ہے۔

اس عرصہ میں جہاں تک میں نے فارغ کا مطالعہ کیا وہ مجھے ایک بہت "پراسرار" نظر آیا۔ وہ جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا ہے، درحقیقت ویسا نہیں بلکہ ذرا غور سے دیکھئے تو اس سے بالکل اس کے برعکس پائیے گا۔ دراصل اسے لوگوں کو دھوکا دینے میں لطف آتا ہے، اس لئے اس نے اپنی شخصیت کو کتنے ہی صندوقی خولوں میں چھپا رکھا ہے، مثال کے طور پر اس کا قد جتنا چھوٹا ہے، شخصیت اتنی ہی بڑی ہے۔ وہ جتنا بڑا فنکار ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بڑا انسان ہے۔

فارغ کو پہلی نظر میں دیکھ کر انسان کو خاصی مایوسی ہوتی ہے، ٹھگنا سا قد بے ڈھنگا سا ناک نقشہ، نہ گفتگو میں کوئی کشش، نہ شکل و صورت میں جاذبیت۔ نہ میل جول میں رغبت ——— کیا یہی وہ فارغ ہے جس کی نظمیں لوگ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں جس کی تحریروں سے حکومت کو بغاوت کی بو آتی ہے جو پورے ایک درجن کتابوں کا مصنف ہے وہ کتابیں جنہیں پڑھ کر اس کی عظمت کا تعظیم و تسلیم مجسمہ ذہنوں

---

[1] فارغ بخاری پر رضا ہمدانی نے لکھ کر اس سلسلہ کو مکمل کر دیا۔ (مرتب)

میں اُبھرنے لگتا ہے ——— نام بڑا درشن چھوٹے ——— بڑا ترقی پسند بنا پھرتا ہے ——— ترقی پسند ہم نے بھی دیکھے ہیں ——— بڑھے ہوئے بال ——— بے تکا سا لباس ——— ماورائی سا حلیہ ——— اور اسے دیکھئے ——— اچھے بھلے انسانوں کی طرح سوٹ بوٹ پہنے ٹائی لگائے۔ ہر وقت کام میں یوں جتا ہوا جیسے گوشت پوست کا نہیں دھات کا بنا ہوا مشینی انسان ہو ——— کون کہے گا اسے ترقی پسند ——— جسے نہ کبھی قہوہ خانوں میں گپیں ہانکتے دیکھا نہ ہی بازاروں میں لکچر کرتے پایا۔ وہ تو ہر وقت انڈا دینے والی مرغی کی طرح کونے کھدروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ دنیا اور اس کے ہنگاموں سے دور، جہاں کوئی ہم نفس ہو نہ ہم زبان ——— ایسے ہی کسی گوشۂ عزلت میں اگر کتابوں، فائلوں اور کاغذوں کے انبار میں ڈوبا ہوا کوئی شخص نظر آئے تو اسے بلا جھجک فارغ بخاری کہہ دیجئے۔

فارغ اس کا تخلص ہی اس کی مصروف زندگی پر ایک بھرپور طنز ہے ——— برعکس نہند نام زنگی کافور ——— وہ جب سے پیدا ہوا شاید ہی اسے کبھی سستانے کا موقع ملا ہو۔ اس سستانے کی وہ ہمیشہ آرزو کرتا ہے لیکن جہاں کہیں یہ لمحہ میسر آئے کوئی نہ کوئی کام اپنے لئے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اور کچھ نہ ہو تو اپنے ننھے منے بچوں کو پڑھانے میں یہ وقت ضائع کرنے لگے گا ——— دراصل اسی مصروفیت میں اس کی زندگی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ایسا لگتا ہے کہ جس دن اس کے کرنے کو کوئی کام نہ رہا اسی دن اس کی موت واقع ہو جائیگی۔

صبح سے شام تک دیکھئے تو وہ یا تو کسی اخبار کے دفتر میں اداریے لکھتا ہے یا رسالوں کے لئے مضامین اور تبصرے لکھتا ہے یا کسی نظم، مضمون یا کتاب کی تخلیق میں منہمک ——— یہ سلسلہ یوں چلتا ہے کہ جب اس کی کوئی نئی کتاب مارکیٹ میں آتی ہے تو احباب حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ ظالم اتنی ضخیم کتابیں لکھنے کا وقت کب نکالتا ہے۔ اس انتہائی مصروفیت کے باوجود وہ شعر کہنے اور پڑھنے کا بھی رسیا ہوتا ہے۔ ہر سال ناک کا آپریشن بھی کراتا ہے۔ اور وقت نکال کر بیوی بچوں کے ساتھ سیر و تفریح بھی کرتا ہے۔

فارغ دیکھنے میں بڑا سست اور کاہل الوجود نظر آتا ہے۔ یہاں بھی دیکھنے والوں کو دھوکا ہوتا ہے ——— وہ شعبدہ باز ہے حالانکہ اس میں کام کرنے کی اتنی قوت و صلاحیت ہے کہ بہت کم لوگوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے جن دنوں بزم ادب کا جنون سوار تھا تو اس نے تن تنہا پشاور میں یکے بعد دیگرے کئی ادارے کھڑے کر دیئے۔ ادبستان، انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین وغیرہ کی داغ بیل ڈالنے والا فارغ اور صرف فارغ ہی تھا ——— پھر اخبارات و رسائل کا دور شروع ہوا تو شباب، کہسار، کیاری، نغمۂ حیات، اسلاف اور سنگِ میل جیسے گرانقدر پرچوں کا اجرا سرحد جیسی سنگلاخ سرزمین سے کیا۔ اور انہیں کامیاب کر کے دکھایا ——— اس کے بعد تصنیفات و تالیفات کا خیال ہوا تو نہایت قلیل عرصہ میں متعدد کتابیں لکھ ڈالیں۔

اگر آپ جلدباز واقع نہیں ہوئے اور پہلے ہی لمحے فارغ کے متعلق کوئی غلط رائے نہیں قائم کر بیٹھے تو دوسرے ہی لمحے اسے بے تکلف پائیے گا۔ اور پھر لمحہ بہ لمحہ اس کی مصنوعی سنجیدگی کے چھلکے اترتے جائیں گے اور ان میں سے ایک ایسی پیاری اور دلآویز شخصیت ابھر آنے کی جسے آپ بھولنا چاہیں بھی تو نہ بھلا سکیں۔ اس جادو کو توڑنے کے لئے جس اسم اعظم کی ضرورت ہے آیئے آپ کے کانوں میں وہ بھی آپ کو بتا دوں۔ عام طور پر لوگ اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہیں لیکن فارغ پر یہ تجربہ کبھی نہ آزمائیے گا۔ ورنہ اس کا موڈ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اسے خوشامد سے بے حد چڑ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد کھل جائے اور کھل کر اصلی فارغ سامنے آ جائے تو چپکے سے کوئی ادبی بحث چھیڑ دیجئے یا پھر شام کے بعد اسے ملئے کیونکہ رات کے چوبیس گھنٹوں میں یہی ایک ایسا وقت ہے جب وہ اس موڈ میں ہوتا ہے جس کے متعلق غالب نے کہا ہے۔ حرف چھیڑ دیجئے انداز گل افشانیٔ گفتار ——— ایک دفعہ اسے چھیڑ دیجئے اور پھر سنیئے وہ یوں چہکنے لگے گا جیسے محفل میں طلسمی مٹھائی بانٹ رہا ہو۔

فارغ کو اپنی شخصیت بنانے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے بڑا حساس واقع ہوا تھا اسی شدت احساس کے

باعث اس نے اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد بھائیوں پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا، اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاشِ معاش میں ایک عرصے تک دلی، لکھنؤ، کلکتہ اور برما کے ہنگاموں میں کھویا رہا ـــــ اس نے صرف چھ روپے ماہانہ کی ملازمت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا ـــــ اور پھر کبھی کمپاؤنڈری کی تو کبھی بہی کھاتے لکھتا رہا، کبھی معلّم بنا تو کبھی کلرک، کبھی فرنٹ کا کاروبار کیا تو کبھی کارنیوال کی مینجری، کبھی کتابوں کا دھندا چلایا، تو کبھی صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ لیکن اس کی سیماب صفت طبیعت کو کہیں بھی سکون نہ ملا۔ آخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر سے حصولِ علم کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور رات دن کی محنت شاقہ سے اپنی علمی تشنگی کو بجھاتا رہا۔

آج اس کی زندگی بہت حد تک منظم ہو چکی ہے لیکن اب بھی یہ عالم ہے کہ صبح وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ڈسپنسری میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تو دوپہر کو کسی اخبار کے دفتر میں ایک صحافی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اور رات ڈھلتے ہی ایک ادیب شاعر اور مصنّف کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔

فارغ، زندگی کی بھٹی سے کندن ہو کر نکلا ہے۔ اسے گردشِ روزگار نے ایسی ایسی پٹخنیاں دی ہیں کہ اگر اس کی فطری رجائیت آڑے نہ آتی تو اب تک کبھی کی یا تو خودکشی کر لی ہوتی یا پاگل خانے پہنچ کر دم لیتا ـــــ

یہ اس کی فطری رجائیت ہی کی کارفرمائی تھی کہ جیل کی کال کوٹھڑی میں بھی وہ ایک لمحے کے لئے مغموم نہ ہوا۔ جیل سے اس نے مجھے بیسیوں خط لکھے، جن میں قید کی صعوبتوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہ کیا، بلکہ میری تالیفِ قلب کے لئے یوں کوشاں رہتا، جیسے اسیری کے ایام وہ نہیں، میں گزار رہا ہوں۔

فارغ جیل میں بھی بیکار نہ بیٹھا۔ اس نے مصوّری سیکھی، باترجمہ قرآن کریم پڑھا، مکتوب نگاری کی۔ فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ کیا، اور دو نہایت قیمتی کتابیں لکھیں، "قفس رنگ"، جو اس کی نظموں غزلوں کا مجموعہ اور "قید و بند" جس میں جیل کی آپ بیتی ہے۔

فارغ اپنی نظموں میں صبح کے اُجالے اور سحر کی روشنی پر جان چھڑکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ دراصل وہ رات کی تاریکی کا دلدادہ ہے ـــــ دن کو تو وہ اپنی زندگی کا حصّہ ہی نہیں سمجھتا، کیونکہ ان اوقات کو اس نے محض نان و نفقہ کے حصول کی غرض سے محنت و مزدوری کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ البتہ رات کو وہ صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس میں کسی کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا۔ رات کو اپنانے کے لئے اس نے بڑے جتن کئے۔ بڑی بڑی منفعت ملازمتوں کو ٹھکرایا، نہایت معقول معاشی وسائل پر لات ماری، اس لئے کہ وہ اس کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے۔ رات ہوتے ہی وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح اپنا سکّہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔ بڑے اہتمام سے وہ رات کی دیوی کا استقبال کرتا ہے اس کے چرنوں میں عقیدت کے پھول چڑھاتا ہے۔ اور پھر جب رات کی دیوی کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے تو بسا اوقات صبح کے تڑکے تک یہ ریاضت جاری رہتی ہے۔

فارغ کو دوستوں سے بڑا پیار ہے لیکن تنہائی اسے دوستوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اسے سگرٹ، کاغذ، قلم اور کتابیں مہیا کر دی جائیں تو شاید تمام عمر بھی وہ تنہائی سے نہ اُکتائے گا۔

حسن، شراب اور شعر ـــــ فارغ کی تین سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ اس کی ان کمزوریوں سے بعض سیاسی دوستوں نے بڑے بڑے فائدے اُٹھائے ہیں۔ وہ بُت شکن کہلاتا ہے، اور واقعی اس نے بڑے بڑے بتوں کو توڑا بھی ہے، سب سے پہلے تو اس نے اپنے خاندان کے اس روایتی بت کو توڑا کہ مسندوں پر بیٹھ کر آباء کے نام کی سوداگری کرو اور سادہ لوح مریدوں سے روپیہ بٹور کر عیش کرو لیکن جہاں محنت کا نام آئے وہاں صاف انکار، اس کا خیال ہے کہ سیّدوں نے اپنے آپ کو 'برہمن' کی طرح کی کوئی ہستی سمجھ رکھا ہے جو مزدوری کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں، فارغ کو چونکہ شروع ہی سے روایتی باتوں سے چڑ تھی اس لئے اس نے محنت مزدوری کو کبھی عیب نہ سمجھا۔

ایک عرصے تک وہ اپنے پندار کے بت پر مسلسل ضربیں لگاتا رہا اور آخر اسے چکنا چور کر کے چھوڑا، خیال کیجئے، جس شخص نے ایسے عقیدت مندانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہو جہاں عام لوگ اس کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کریں، جہاں اس کی دست بوسی اور قدم بوسی کو ارادت مندوں کا گروہ اپنے نصیب کی معراج سمجھے، اور جہاں اس کو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے ماورائی انسان سمجھا جائے، اس کا اس حد تک عجز و انکسار پر اتر آنا کہ بغیر مزدوروں، غریبوں اور مفلوک الحال گروہ کے کسی اور سے سروکار ہی نہ ہو، زندگی کا کتنا بڑا انقلاب ہے، اور اس سے بڑھ کر بت شکنی اور کیا ہو سکتی ہے بقول یگانہ مرحوم ؏

غلام ہمت آنم کہ خود شکن باشد

لیکن اپنی ان کمزوریوں کے باعث غیر شعوری طور پر اس نے کئی ایک ایسے نئے بت بھی تراش ڈالے جن کی تخلیق پر اب وہ خود بھی پشیمان ہو گا، اپنی اسی افتادِ طبیعت کے باعث اس نے اپنے بعض چہیتوں کے جنونِ شہرت کی تسکین کے لئے ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

فارغ کے مذہبی نظریات بظاہر ملحدانہ "قسم کے" معلوم ہوتے ہیں، وہ مذہب کے مابعد الطبیعاتی تصور کا قائل نہیں، وہ اس کی جامد حیثیت پر اعتقاد نہیں رکھتا، لیکن اس کے باوصف وہ بزمِ سماع میں شریک ہوتا ہے، مجلس عزا میں سوگوار نظر آتا ہے۔ مولود شریف میں سر پر ٹوپی جمائے مؤدب بیٹھتا ہے، اپنے بچوں کو منت کے طوق پہنواتا ہے۔ روزے نہ رکھتے ہوئے عید کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے اور ذرا قریب آ کر ایک بات کان میں سن لیجئے —— یہ ملحد کبھی کبھار چھپ چھپ کر نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ اس کی لائبریری میں مختلف مکتب ہائے فکر کے مترجم قرآنوں کے علاوہ گیتا اور انجیل مقدس کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ فارغ نے نہ صرف سب سے پہلے پشتو ادب، کلچر اور معاشرت کو بیرونی دنیا سے متعارف کرایا بلکہ اس مہم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنا رکھا ہے۔ اور اپنا فن، قلم اور تمام تر تخلیقی قوتیں اس کے لئے وقف کر رکھی ہیں، لیکن میں اگر یہ بات آپ کو بتا دوں کہ وہ پشتو کا ایک فقرہ تک صحیح ادا نہیں کر سکتا تو آپ یقیناً متعجب ہوں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ اکثر اپنے پشتون ادیب دوستوں سے بور ہو ہو جاتا ہے۔

فارغ کو اپنی طبیعت کے تلوّن کا خود بھی اعتراف ہے۔ وہ کبھی کوئی ایک کام بھی زیادہ دنوں تک مستقل مزاجی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ذریعۂ معاش ہی کو لیجئے، سوائے ڈاکٹری کے اور کسی کام سے بھی وہ زیادہ دیر تک نباہ نہیں کر سکا۔ اور ڈاکٹری کے سلسلے میں بھی آج تک اس کی ڈسپنسری متحرک ڈسپنسری کی طرح مختلف مقامات کا سیر کر چکی ہے —— اسی طرح ادب میں بھی اس نے ایک صنف پر قناعت نہیں کی، منظومات میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام، منظوم فیچر، گیت اور نثر میں افسانہ، مضمون، تنقید، ڈرامہ، ناول غرض ہر شعبے پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اس کے تلون کا یہی عالم ہے۔ لیکن جب ہم ادبی نظریات کے متعلق اس کی مستقل مزاجی اور فولادی عزائم کو دیکھتے ہیں تو اس کی شخصیت کے اس واضح تضاد پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

دراصل فارغ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ ایک اس کی انفرادی شخصیت ہے دوسری اجتماعی —— لیکن ان دونوں متضاد شخصیتوں میں اس نے کچھ اس خوبصورتی سے سمجھوتہ کرا رکھا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کے تصادم کا امکان نہیں رہا۔ اسی طرح جس طرح اس کے نام "سیّد میر احمد شاہ" اور اس کے تخلص "فارغ بخاری" میں۔ ——

انتظاريه

سر سیّد احمد خاں

(شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

رنگ سرخ و سفید۔ چہرہ نہایت پُررعب۔ پیشانی بلند۔ سر بڑا۔ بھویں سیاہ۔ بڑی آنکھیں متناسب اور نورانی۔ روشن۔ ناک چھوٹی۔ کان لمبے۔ گلے میں بڑی سی سڈول لمبی ڈاڑھی جس میں بالکل کھچڑی ہوئی۔ جسم فربہ۔ قد لمبا۔ ہڈی چوڑی چکلی۔ ہاتھ پاؤں قوی اور زبردست۔ بدن گٹھیلا اور مضبوط۔ صورت وجیہہ۔ وزن پورا ساڑھے تین من۔ لباس ترکی مع شہرت انگریزی۔ یہ تھے جوادالدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم بانی علی گڑھ کالج۔ مجدد زبان اردو۔ باعث تخلیق مسدس حالی۔

یہ تو ہوا سر سید کا سراپا۔ آئیے اب آپ کو ان کی گھریلو زندگی کی بھی ایک جھلک دکھاؤں۔ آج سے ۳۰ برس پہلے ۱۹۲۹ء میں میں نے مولوی عنایت اللہ مرحوم ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے درخواست کی کہ اپنی زندگی کے کچھ حالات مجھے لکھ دیں۔ مولوی صاحب مرحوم میری کسی درخواست کو کبھی رد نہیں کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے یہی کیا۔ اور اپنے واقعات حیات لکھ کر مجھے پانی پت بھیج دیے۔ مولوی عنایت اللہ چونکہ سر سید کے ذہنی دوست شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد کے لڑکے تھے اور نہایت لائق، مؤدب اور سعادت مند تھے اس لئے سر سید کو شروع ہی سے نہایت عزیز تھے۔ اور وہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ نے اپنے جو حالات مجھے بھیجے اس میں اس وقت کی کیفیت بھی لکھی جب انہوں نے پہلے پہل سر سید کو دیکھا۔ اس کی تقریب یوں ہوئی کہ چونکہ دہلی میں مولوی عنایت اللہ کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا لہٰذا بچپن ہی میں مولانا ذکاء اللہ ان کو اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے۔ راستے میں اپنے دوست سر سید کے پاس بھی دو دن ٹھہرے۔ اس قیام کا جو نہایت ہی دلچسپ اور پُرلطف حال مجھے مولوی عنایت اللہ نے لکھا آج میں وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ اس عبارت سے جہاں سر سید کی گھریلو معاشرت اور خانگی زندگی کا حال نہایت عمدگی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے وہاں مولوی عنایت اللہ کی نہایت حسین و دلکش طرز تحریر کا بھی قارئین کرام کو تھوڑا سا اندازہ ہو جائیگا۔

غالباً جولائی ۱۸۸۱ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم مولانا ذکاء اللہ، جو اس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے، گرمیوں کی تعطیلیں دہلی میں ختم کرکے الہ آباد واپس جانے لگے۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سید صاحب یعنی سر سید مرحوم کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر

اس دفعہ میں آٹھ برس کا [illegible] اور یہ پہلا [illegible] تھا کہ مجھے اپنی والدہ [illegible] کا اتفاق [illegible] آپ تو امی نے ہم دونوں [illegible] کو گلے سے [illegible] پیار کیا اور [illegible] پھر کہ دعا [illegible] مجھے بے انتہا [illegible] آیا [illegible] چلا گیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہوا تھا [illegible] بیٹھا کبھی [illegible] کی [illegible] کبھی [illegible] آخر [illegible] کبھی [illegible] نظر آتی [illegible] ہوا [illegible] آسمان کے [illegible] دوڑتی نظر آتی [illegible] سب [illegible] پہاڑوں کے [illegible] کبھی [illegible] کی طرف کبھی [illegible] سیاہ گھٹائیں نظر آتی تھیں [illegible] نکل کر بادلوں کے سایہ میں آ جاتی [illegible] کا اپنی سے کھلی [illegible] کوئلہ لگاتا تھا [illegible] یہ کیفیت [illegible] اور ٹرین اندھیرے کو چیرتی ہوئی روشن مطلع میں آ جاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کون سا اٹھا ایسا ہوتا جس کا منہ کھڑکی سے باہر نہ ہوا اور انجن [illegible] چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر [illegible] گارڈ [illegible] انجن تک [illegible] جھنڈی [illegible] کی طرف [illegible] بڑے سٹیشن [illegible] نظر آ رہا ہے [illegible] کوئی دھواں [illegible] اور جب [illegible] چلانے سے سب [illegible] ٹرین کا [illegible] رنج اور لمبا سٹیشن کی اونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہوتا۔ پلیٹ فارم [illegible] قلیوں اور مسافروں کا شور [illegible] والوں کی بے تکی بولیاں [illegible] اور [illegible] ناؤں کا چمکتا ہوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دنیا نئے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جونہی کوئی چیز دیکھتا چاہتا کہ والدہ بھی اسے دیکھیں۔ کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی راکھ بھی پڑ گئی مگر [illegible] دیکھنے سے نہ ہارا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آ گیا۔ وہاں اترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ [illegible] صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ سٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک [illegible] جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آ کر گاڑی ٹھہر گئی۔

[illegible] نے اب تک [illegible] مکان [illegible] دور سے دیکھے تھے کبھی ان کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت [illegible] معلوم ہوا [illegible] کے [illegible] دروازے پر [illegible] کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور [illegible] کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت [illegible] خوشبو کے [illegible] بہت سے [illegible] اور [illegible] بیٹھے اور [illegible] آدمی۔ [illegible]

لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہی سید احمد خاں تھے جنہیں دلّی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور ہیبت کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اُٹھے اور یہ کہہ کر "آپ آ گئے" والد سے مصافحہ کیا۔ اور پھر دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "اور یہ کون ہیں؟" پھر دونوں قریب گئے اور جھک جھک کر آداب کیا۔ سید صاحب نے ہماری طرف غور سے دیکھا۔ پھر خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ خس کے پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ بے حد صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ دے کر سرخ اور نیلی دھاریوں کی دری۔ سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں دیواروں پر چوکھٹوں میں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں پہاڑ، سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ بیٹھا ہی رہوں۔ کہیں ... میرے لیے اس قدر پرتکلف تھا کہ اب بڑی عمر میں بھی اس کا نقش دل سے محو نہیں ہوا ہے۔ اس کمرے کی کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان سب کے اوپر دیوار پر ایک ... صورت کا گھنٹہ لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد صاحب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں ... کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں رکھی تھیں ان میں سب سے زیادہ دلکش سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کے صندوقچے میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے مقصود کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دلی میں بار بار دیکھ چکا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس کمرے کو جو اس کا مالک ہو قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر عظیم و ضخیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت دبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ درآں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب، والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے مگر میں کھڑا رہا کیونکہ [illegible] تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا ان کے لکھنے کی دوات کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ببر کا معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اُس وقت چونکا جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور اوّل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دئیے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک کھلے ہوئے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا "پنکھا بند کرو" جس پر فرشی پنکھا فوراً رک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُسی خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد صاحب اس کمرہ میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے اس کمرے میں جو غسل خانہ تھا اُس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو چھونے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز رکھی تھی۔ اُس پہ کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر ان سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اُس کے سرے پہ ایک چبوترہ تھا۔ اُس پہ بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پہ بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کے کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ میں سے تو خون نکل رہا ہے توبہ۔ توبہ" میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پان کھانا بُری بات ہے۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آ کر کہا "کھانا میز پہ ہے" اس پہ سب لوگ اُٹھے اور کھانے کے کمرہ میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پہ نہایت سفید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے۔ ہاتھی دانت کے دستہ کی چھریاں میز پہ رکھی تھیں میز پہ دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اُسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطار کے وقت نکالے جاتے تھے۔ مامائیں ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور کانٹے چاندی کے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روزمرہ منجھوایا جاتا تھا مگر اُس کی صورت شکل اور ٹمٹمائی ہوئی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پہ قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی ڈاڑھی کا دُبلا پتلا سوکھا مگر بے حد چست چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڈھے خانساماں نے خود ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقینی ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے۔ تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو اُن کے پلنگوں پہ لے جا کے سُلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پہ آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی یا نہیں؟ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے۔ کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرز معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا۔ مگر اُن کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں، باغ ہو۔ باغوں میں پھولوں کے پودے ہوں گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری۔ چمکتی ہوئی۔ ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔"

یہ ہے سرسید کی طرز معاشرت کا وہ دلاویز نقشہ جو مولوی عنایت اللہ کے سحر طراز قلم نے نہایت نہایت خوبی کے ساتھ کھینچا ہے آئیے اب آپ کو اس عظیم الشان انسان کی شخصیت سے متعارف کرائیں۔

انیسویں صدی اس لحاظ سے تاریخ میں نہایت نمایاں رہے گی کہ اس میں ایک دو نہیں بہت سے ایسے نامور مصلح۔ ریفارمر۔ ادیب۔ شاعر مورخ اور دانشمند پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کی نظیر شاید پھر کبھی نہ لا سکے۔ دنیا ہزاروں لاکھوں چکر کھاتی ہے جب ایسے باکمال پیدا ہوتے ہیں جیسے قدرت نے اس صدی میں پیدا کئے۔ ان مشاہیر میں سرسید مرحوم اپنی خوبیوں۔ اپنی لیاقتوں اور اپنے عظیم بالشان کارناموں کی بدولت بلاشبہ ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ملک کے بہی خواہ۔ قوم کے ہمدرد اور مسلمانوں کے حقیقی غمخوار تھے۔ اپنی ساری عمر انہوں نے قوم کی بھلائی، بہبودی اور ترقی کے غم میں گزار دی مگر قوم کی طرف سے ہمیشہ اُن کو نیچری۔ مرتد۔ کافر اور بے ایمان کے "معزز خطابات" سے نوازا گیا۔ اور مکہ معظمہ تک سے ان کے لئے کفر کے فتوے بڑی کوشش اور سعی سے حاصل کر کے تمام ملک میں نہایت کثرت کے ساتھ ان کی تشہیر کی گئی۔ قوم کے حقیقی بہی خواہوں کو قوم کی طرف سے ہمیشہ یہی صلہ ملا کرتا ہے۔

جو اوصاف و فضائل و محاسن ایک ریفارمر ایک لیڈر اور ایک مصلح قوم میں ہونے چاہئیں وہ قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ سرسید کو عطا کئے تھے۔ اولوالعزمی۔ بلند حوصلگی۔ ہمت و جرأت۔ بہادری و شجاعت مستقل مزاجی و خود اعتمادی۔ دلیری و بے غرضی۔ سچائی و راستبازی۔ ہمدردی محبت۔ غیرت و حمیت۔ عقل و فہم۔ دانائی و دُوراندیشی۔ تدبیر و تدبر۔ انتظام و قابلیت۔ خوش اخلاقی و ملنساری وقار و متانت۔ رعب و داب اثر و رسوخ۔ قدردانی۔ حوصلہ افزائی محنت و جفاکشی۔ فراخ حوصلگی و عالی ہمتی۔ رواداری و بے تعصبی وغیرہ اخلاق حسنہ جن کا ایک لیڈر میں پایا جانا ضروری ہے۔ وہ سب کے سب سرسید کے وجود میں پورے طور پر پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ سرسید پیدائشی لیڈر تھے یا خلاق فطرت نے ان کو لیڈری ہی کے لئے پیدا کیا تھا تو شاید کچھ بیجا نہ ہو گا۔

قدرت جن نفوس مخصوصہ پر مہربان ہوتی ہے ان کو بڑی کثرت اور بہتات کے ساتھ اپنے انعامات اور عطیات سے نوازتی ہے۔ خوش قسمتی سے سرسید بھی ان باکمال اشخاص میں سے ایک تھے یعنی اُن کی ذات میں بیک وقت بہت سے محاسن اور فضائل جمع ہو گئے تھے۔ وہ جہاں ایک آتش بیان مقرر تھے وہاں ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی وہاں اپنے زمانہ کے اردو ادب کو بھی ایک نئی زندگی بخشی۔ جہاں انہوں نے مدرستہ العلوم مسلمانان قائم کیا۔ وہاں سائنٹفک سوسائٹی اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی بنیاد ڈالی۔ ایک طرف انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی رہنمائی کی تو دوسری طرف انڈین کانگریس سے مسلمانوں کو روکا، یہ ایسی روک تھی کہ مسلمانوں کا بڑا سے بڑا لیڈر بھی اس دلدل سے اپنے دامن کو نہ بچا سکا۔ مگر سرسید کی عقابی نگاہ نے پہلے ہی نظر میں نہایت عاقبت اندیشی سے تاڑ لیا تھا کہ کانگریس کبھی بھی مسلمانوں کی حقیقی ہمدرد نہیں بن سکتی۔ اس لئے سرسید نے مسلمانوں کو شدت سے الگ رہنے کی بڑے زور سے تلقین کی۔ یہی حقیقت تھی جو ہمارے مسلم لیڈر بڑے بڑے تلخ تجربوں کے بعد آخر میں ظاہر ہوئی اور وہ ایک ایک کر کے کانگریس سے نکل گئے۔ ایسے ہی موقع پر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کتنا بلند نگاہ۔ عاقبت اندیش۔ اور صائب الرائے انسان تھا۔

ہمارے بہت سے سیاسی لیڈر مذہب سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے بیشتر مذہبی رہنما سیاست میں صفر محض کا درجہ رکھتے ہیں۔

الا ماشاء اللہ۔ مگر سر سید میں یہ بات نہ تھی۔ وہ جہاں مسلمانوں کی تعلیم اور ان کے اصلاحی کاموں پر ایک غائر نظر رکھتے تھے وہاں اسلامی اور مذہبی تصنیفات پر بھی بہت کافی عبور رکھتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی سید وحید الدین سلیم نے جو سر سید کے لٹریری اسسٹنٹ تھے مجھے ایک واقعہ سنایا جس سے سر سید کی کتب احادیث سے گہری واقفیت کا عجیب حال معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا:

"ایک دن بیٹھے بیٹھے سر سید نے مجھ سے کہا کہ صحاح ستہ میں جس قدر احادیث معراج کے متعلق آئی ہیں سب کو تلاش کر کے ایک جگہ لکھو۔ مگر کاغذ کے ایک طرف لکھنا۔ میں نے یہ کام بڑی محنت سے [illegible] مہینے میں ختم کیا۔ اور ترتیب کر لیا تو سید صاحب سے جا کر کہا کہ جو کام آپ نے دیا تھا وہ کام ختم ہو گیا ہے۔ سر سید نے پوچھا "کونسا کام؟" میں نے کہا "وہی معراج کی حدیثوں کی نقل کا۔" سر سید بولے "اچھا تو کچھ لے آئیے اور ساتھ ہی ایک گوند دانی اور قینچی بھی لیتے آئیے۔" جب میں یہ چیزیں لے کر آیا تو سید صاحب نے اپنی میز کی دراز میں سے اپنا ایک مسودہ نکالا جو معراج پر ایک مضمون تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس مضمون میں جگہ جگہ کہیں کم کہیں زیادہ صفحہ خالی چھوڑا ہوا ہے۔ میرے ہاتھ میں سے سید صاحب نے احادیث معراج کی نقل لے کر بڑی جلدی ایک ایک حدیث کو قینچی سے کاٹ کر اپنے مسودہ کے خالی مقامات پر چپکانا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں تمام حدیثیں جہاں جہاں ان کے مقامات تھے وہاں چسپاں کر دیں۔ نہ کوئی حدیث باقی بچی نہ مسودہ میں کوئی جگہ خالی رہی۔ احادیث پر اتنا عبور اور کتب احادیث سے اتنی گہری واقفیت دیکھ کر میری عقل چکرانے لگی اور میں حیران ہو کر سید صاحب کی شکل دیکھنے لگا کہ کتنے عجیب و غریب دماغ کا یہ شخص ہے اور اس کا حافظہ کتنا زبردست ہے کہ اس کو پہلے ہی سے سب پتہ تھا کہ صحاح ستہ میں کہاں کہاں معراج کے متعلق احادیث آئی ہیں اور وہ کتنی لمبی چوڑی ہیں۔ ان کی تعداد کتنی ہے۔ اور ان کا مطلب کیا ہے؟ جبھی تو انہوں نے وہ تمام حدیثیں اپنے اپنے موقع پر بڑی پھرتی سے چسپاں کر دیں۔ میری حیرانی کو دیکھ کر سید صاحب کہنے لگے "میاں! مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ مسودہ لے جاؤ اور چھپنے کے لئے دے دو۔ پروف ذرا احتیاط سے دیکھنا۔"

ایسا جامع حیثیات انسان جیسے سر سید احمد خاں تھے بہت ہی کم کسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب پیدا ہوتے ہیں تو ایک زبردست انقلاب برپا کر جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے پہلے مسلمانوں کے عروج کا ستارا غروب ہو چکا تھا۔ ہند میں ان کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ان کے اشراف اپنی شرافت کھو چکے تھے۔ تعلیم اور تہذیب ان میں مفقود ہو گئی تھی۔ ان کی شاعری [illegible] سے بدتر بن گئی تھی۔ ان کا ادب جنوں اور پریوں کی فرضی کہانیوں اور عشق و محبت کے بے سر و پا افسانوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے سخت نامساعد اور سیاہ و تاریک زمانہ میں قدرت نے سر سید احمد خاں کو پیدا کیا۔

جب غدر کا زمانہ گزر گیا اور مسلمانوں پر جو گزرنا تھا وہ بھی گزر گیا تو سر سید احمد خاں جن کی رگ رگ میں ملت مرحومہ کی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اپنی بدقسمت قوم کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

انہوں نے سب سے اول مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دلائی جس کے بغیر اس ملک میں ان کی حیثیت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔ سر سید نے ابنائے وطن کی حالت دکھا کر اپنی قوم کو غیرت دلائی اور اس کے نونہالوں کے لئے علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ جو آج کل مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہی وہ مدرسہ ہے جس سے سارے ہندوستان میں تعلیم و تہذیب کی روشنی پھیلی اور مسلمان بھی اپنے دیگر اہل وطن کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔

اس مدرسہ کی ابتدائی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ ۱۸۸۱ء میں اس کے گریجویٹس کی تعداد صرف ۳۴ تھی۔ مگر صرف دس گیارہ سال کے عرصے میں چار سو تک پہنچ گئی۔

"مدرسۃ العلوم مسلمانان کے قیام کے بعد سر سید نظم اردو کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ خود شاعر نہ تھے اس لئے [illegible] مخلص کے ساتھ اردو

فارسی کے کچھ اشعار اُن کی یادگار ہیں۔ اس لئے اپنے مخلص مرید مولانا الطاف حسین حالی کو نظم اُردو کی تجدید کے لئے انتخاب کیا۔ سرسید کا یہ انتخاب نہایت موزوں ثابت ہوا۔ اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ نظم اُردو کے اس مجددِ اعظم نے اردو شاعری کو خس و خاشاک سے پاک کر کے کتنے ارفع اور اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ مگر بلا شائبۂ شک یہ سب کچھ ہوا سرسید ہی کا فیض تھا۔ سرسید ہی نے حالی سے وُہ مدوجزرِ اسلام نظم لکھوائی جس کی نظیر اُردو کے تمام قدیم و جدید لٹریچر میں ایک بھی نہیں۔ اپنے اس کارنامہ کو سرسید ہمیشہ بڑے فخر سے بیان کرتے اور کہا کرتے تھے کہ "جب میدانِ حشر میں خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ تو میں عرض کروں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اس کے سوا اور کچھ نہیں"۔

اردو نثر کی جو تجدید سرسید نے کی۔ آج تمام اردو مصنفین۔ ادیب۔ مورخ اور انشا پرداز سب ہی اُس کی تقلید کر رہے ہیں۔ اور ہر چھوٹا بڑا مرتبہ کہ جدید ادب کا امام مان رہا ہے۔ جسے آپ آج کل کی نئی اصطلاح کے مطابق "بابائے ادب جدید" کہہ لیجئے۔

خوش قسمتی سے سرسید کو رفیق اور ساتھی بھی ایسے اعلیٰ درجہ کے مل گئے تھے کہ شاید ہی کسی لیڈر کو ملے ہوں۔ تعلیمی کام میں سب سے بڑے مددگار نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک تھے۔ جنہوں نے پورا پورا حقِ رفاقت ادا کیا۔ اور اپنے قائد کے انتقال کے بعد بھی اُس کے کام کو نہایت خوبی اور دیانت کے ساتھ جاری رکھا۔ نہ صرف جاری رکھا بلکہ نہایت ترقی دی۔ یہاں تک کہ ایک معمولی مدرسہ عظیم الشان یونیورسٹی بن گیا۔

نظمِ اردو کی اصلاح میں سرسید کے معاون خصوصی مولانا حالی تھے۔ انہوں نے جس بے نظیر طریقہ پر اور جس خلوص و محنت سے اردو نظم کی اصلاح کا کام لیا اور جیسے لاجواب مثنوی جدید نظم کے پیش کئے وہ آج ہر شخص کے سامنے ہیں۔ فنِ شعر پر جو زبردست تنقید انہوں نے کی۔ اردو کے تمام تنقیدی لٹریچر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

نثرِ اردو کی ترقی میں سرسید کے ساتھ شمس العلماء مولوی نذیر احمد۔ اُن کے لائق فرزند مولوی عنایت اللہ۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی اور مولوی سید مہدی علی [illegible] تھے۔ ان بزرگوں نے جو بہترین ادب پیدا کیا اور جو بے مثال کتابیں [illegible] کی گئی کر شائع کیں وہ آج بھی مستقل [illegible] شمس العلماء مولانا حالی [illegible] بالکمال انشا پرداز [illegible] ساتھ برابر [illegible] ہیں۔

ان [illegible] مصنفین نے [illegible] اور ترقی میں قدر [illegible] نامور [illegible] نواب [illegible] کے [illegible] ان کو [illegible] اور ادب اردو کی تجدید کی ترغیب دلائی۔

سرسید گویا [illegible] تھے جس کے [illegible] [illegible] چاند تھے۔ [illegible] ہر طرف [illegible]

[illegible]

مولانا [illegible]

[illegible]

سرسید کی شخصیت میں [illegible]

[illegible]

اور قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا [illegible] انگریزوں کی [illegible] مسلمان [illegible] تھی۔ اس وقت انگریزوں کے نزدیک

مسلمان اور باغی بالکل ہم معنی لفظ تھے۔ اُس وقت مسلمان کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہنا خونخوار انگریز کی آتش غضب کو بھڑکانے کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اس کا انجام پھانسی کا تختہ تھا جس پر ہزاروں مسلمان بے گناہ اور بے قصور بڑی بے پروائی سے چڑھا دئیے گئے۔ ایسے پُر آشوب۔ ایسے ہولناک اور ایسے نفسا نفسی کے زمانہ میں سرسید نے انتہائی دلیری کے ساتھ رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا اور اُسے چھپا کر حکام بالا اور لندن پارلیمنٹ کے ممبروں کو بھیج دیا۔ جس میں مسلمانوں کی بے گناہی کو نہایت دلائل کے ساتھ ثابت کیا اور فساد کی تمام تر ذمہ داری ناعاقبت اندیش انگریز حکام پر ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید ہی جیسا دلیر انسان ایسے خطرناک وقت میں ایسا ہولناک اقدام کر سکتا تھا۔ ہر شخص کی ہمت نہیں۔

مذہب سے سرسید کو جس قدر محبت تھی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے جتنا عشق تھا اور پھر دونوں امور کے لئے اُن میں جتنی غیرت اور حمیت تھی اور اس کی نظیر موجودہ لیڈروں اور رہنماؤں میں تلاش کرنا ایک فعل عبث ہے۔

مذہب اسلام کے لئے جو غیرت سرسید کے دل میں تھی اس کی مثال میں وہ واقعہ مشہور ہے جب کہ ان کے ایک دوست نے ان کو لکھا کہ میرا انگریز افسر مجھے نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ تو ایسی مشکل میں میں کیا کروں۔ اس کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں۔

"گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا نہایت برا کیا۔ نہ جو خدا کا فرض ہے اس کو تم اپنی شامت اعمال سے جس خوبی سے ہو ادا کرو یا بافراط کرو۔ لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سستی بھی نہیں جا سکتی میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ ۔ ۔ ۔ مگر کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسی تدبیر اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور منہ کڑکڑانا اور معذرت رخصت نہیں دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان خالق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ ہوتی؟ فاقے مر جاتے؟ نہایت اچھا ہوتا"

والسلام

خاکسار سید احمد از بنارس ۔ ۵ جنوری ۱۸۷۵ء

سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر یوپی نے "لائف آف محمد" نامی کتاب لکھی تو اس میں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہایت رکیک اعتراضات کئے۔ کتاب شائع ہوئی تو سرسید کا دل ان اعتراضات کو دیکھ کر جل گیا۔ اور فوراً اُس کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جواب کے لئے جن کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں ملتی نہیں تھیں۔ انہوں نے اس غرض کے لئے لندن جانے کا قصد کیا مگر روپیہ پاس نہ تھا۔ جاتے کہاں سے۔ مگر عشق نبی میں سرشار سید نے اس کی پرواہ نہ کی۔ تھوڑے عرصہ پہلے تزک جہانگیری بڑے اہتمام سے چھپوائی تھی اور دس روپے فی جلد قیمت رکھی تھی۔ وہ سب جلدیں ایک روپیہ فی جلد کے حساب سے بیچ ڈالیں۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی فروخت کر دیا اور گھر کو رہن رکھ کر کچھ روپیہ حاصل کیا اور اس طرح لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں بیٹھ کر نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ کتاب کا جواب لکھا مگر اب اس کے چھپوانے کے لئے پیسہ نہ تھا مگر اس عاشق رسول نے ہمت نہ ہاری گھر خط لکھا کہ جو کچھ سامان باقی رہ گیا ہے سب بیچ ڈالو۔ میرا سارا کتب خانہ نیلام کر دو۔ جو دو ایک گھر باقی ہیں ان کو بھی رہن رکھ دو۔ اور مجھے روپیہ بھیجو۔ پھر اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھا کہ لاؤ جو کچھ بھیج سکتے ہو بھیجو۔ اس سلسلے میں اپنے دوست نواب محسن الملک کو خط لکھا کہ "میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ میں کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اُس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔ حاضر کرو۔ مارا ہیں نعمۂ شاہنشاہی

بس است۔"

یہی کتاب تھی جو بعد میں "خطباتِ احمدیہ" کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوئی۔

عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ تین باتوں کا تین آدمیوں کے ساتھ اجتماع نہیں ہوتا۔ ایک تو بڑے بڑے اونچے خیالات سوچنے والے اور عظیم الشان ہوائی قلعے تعمیر کرنے والے میدان عمل میں محض صفر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو ذہانت کے پتلے اور نہایت ہوشیار ہوتے ہیں وہ بالعموم اچھے حافظہ کے مالک نہیں ہوتے۔ تیسرے جو لوگ اچھا بول سکتے ہیں وہ عام طور پر اچھا لکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس نظریہ کو سر سید کے وجود نے باطل کر دیا تھا۔ اُن میں یہ کمال تھا کہ سوائے اعلیٰ منصوبے وہ سوچتے تھے اُن کو نہایت عزم کے ساتھ عمل کا جامہ بھی پہناتے تھے۔ پھر جیسے وہ ذہین تھے ایسے ہی حافظہ کے زبردست بھی تھے اور سب سے بڑھ کر اُن میں یہ بات تھی کہ جتنی عمدہ اور دلنشین ان کی تقریر ہوتی تھی ایسی ہی نفیس اور شاندار ان کی تحریر ہوتی تھی۔ لیکچر دیتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں شیر کی آواز گونج رہی ہے۔ مضمون لکھتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک قادر الکلام ادیب فصاحت کے دریا بہا رہا ہے۔

ایک بڑا کمال سر سید میں یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ہر فن مولا تھے۔ جو کام وہ خود اختیار کرتے تھے۔ یا جو کام ان کے سپرد کیا جاتا تھا اُسے ایسے ذوق و شوق، ایسی دلچسپی اور ایسے انہماک کے ساتھ انجام دیتے تھے گویا اس کام سے زیادہ اُنہیں اور کسی کام سے لگاؤ نہیں۔ اور پھر وہ اُس کام کو کرتے بھی اس جوش و اسلوبی کے ساتھ تھے جس کی حد نہیں۔ مثلاً تصنیف و تالیف کو لیجئے۔ جب انھوں نے دلی کے محلات، عمارات، مقابر اور آثارِ قدیمہ کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس دُھن میں اپنے آرام و راحت کو بالکل تج دیا۔ گرمی کی دوپہر ہو یا سردی کی شام وہ برابر دہلی کے قدیم کھنڈروں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ کہیں قدیم مسخ شدہ کتبے کھڑے پڑھ رہے ہیں کہیں عمارات کی تصویریں لے رہے ہیں۔ کہیں کھنڈروں کی تحقیقات کر رہے ہیں کہ یہاں جو محل بنا ہوا تھا وہ کب بنا تھا اور کس نے بنایا تھا کہیں عمارات کے بانیوں کے حالات کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ ایسا کام تھا جو ناز و نعمت میں پلے ہوئے امیر گھرانے کے ۲۹ سالہ نوجوان جنٹلمین کے لئے بڑا ہی مشکل اور صبر آزما تھا۔ مگر سر سید نے لگاتار ڈیڑھ برس کی محنت و تلاش سے اسے تمام کر کے کتاب کو "آثار الصنادید" کے نام سے شائع کر دیا۔ خود کہتے ہیں کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ اُن کے پڑھنے کے لئے ایک چھینکا دو بلیوں کے درمیان ہر ایک کتبے کے محاذ میں بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اُتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور مارے خوف کے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

ایسا ہی جب انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی تو اس کام میں اتنی محنت و مشقت برداشت کی جس کی انتہا نہیں۔ کئی کئی رات مسلسل جاگتے اور لکھتے رہتے تھے۔ جب نیند بہت زیادہ ستاتی تو اردگرد پھیلی ہوئی کتابوں پہ سر رکھ کر تھوڑی دیر سو رہتے اور پھر اُٹھ کر لکھنے لگتے تھے۔

اکثر مصنفوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کے وقت کامل سکون چاہتے ہیں۔ اُس دوران میں اگر چڑیا بھی اُن کے کمرے میں آجائے تو وہ چیخنے لگتے ہیں کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ خود میری اپنی یہ حالت ہے کہ رات کے پچھلے پہرے کے پُر سکون لمحات میں جب مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو ٹائم پیس اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ آتا ہوں تاکہ اُس کی ٹک ٹک کمرے کے سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ مگر سر سید کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں ان کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ اُن کے دفتر کا بڑا کمرہ جہاں بیٹھ کر کام کرتے تھے صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اس مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو کہ اکثر جمہور کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علماء اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی، اُن کے لئے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں۔ یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اُٹھا

دیا ہو۔ یا اُن کے پاس بیٹھے [illegible] سے تنگ دل ہو گئے ہوں۔ یا لوگوں کے اٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کر دیا ہو یا حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ [illegible] جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی ہنسی کی باتیں کر رہے ہیں جن سے خواہی نخواہی ایک عامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی ادھیڑ بن میں مستغرق ہے کبھی لکھتا ہے کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا"

حدیث میں آتا ہے کہ خط کا جواب دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسا السلام علیکم کا جواب دینا۔ سر سید کا اس حدیث پر پورا پورا عمل تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "میرے خط کا جواب مجھے پانی پت میں ہمیشہ تیسرے دن مل جاتا تھا کبھی یاد نہیں کہ جواب چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو۔" ہاں جو گالیوں بھرے خطوط ان کے نام آیا کرتے تھے ان کا جواب انہوں نے کبھی نہیں دیا۔ اور ان کا جواب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ان کے خطوط میں جو انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور ملنے والوں کو ہزاروں کی تعداد میں لکھے انتہائی خلوص، سچی دوستی، پر خلوص محبت اور نہایت درجے تعلق کے ایسے عجیب عجیب نمونے نظر آتے ہیں کہ ان پر ہزاروں فصیح و بلیغ مضامین قربان کیے جا سکتے ہیں۔

جس زمانہ میں سر سید ولیم میور کی "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کے لئے لندن گئے تو وہاں سے اپنے دوست نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی کو انہوں نے ایک خط لکھا۔ جو خلوص قلب اور سچی محبت و دوستی کا عجیب مرقع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

مخدوم و مکرم من

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ [illegible] عنایت نامہ [illegible] پہنچا۔ دل کو [illegible] کس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر کیا ہے وہ درحقیقت سچ ہے مگر [illegible] اُس کا قدر [illegible] کن ایمان کہ جیسا کہ وہ ہے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے [illegible] محبت اور دوستی کے [illegible] رشتہ ناطہ [illegible] پیدا [illegible] تھا۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو میں اپنے سگے حقیقی بھائی سے [illegible] نہیں سمجھتا تھا [illegible] دوستی [illegible] عیش کے ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ایسا ہی پاتا ہوں۔ آپ [illegible] رنج ہوا تھا [illegible] کے قریب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب [illegible] رنج [illegible] دوستی و محبت کے معاملات [illegible] ان کو محبت اور دوستی کا تعلق معدوم [illegible] وہ خدا کی [illegible] محبت کے لائق ہے۔ [illegible] اُن کی طرف [illegible] جو دوست [illegible] دوست کی کار [illegible] خلاف محبت اور دوستی [illegible] آپ خیال کیجئے کہ محبت اور دوستی ایسی [illegible] دوستی اور ایک [illegible] بات [illegible] نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں [illegible] ٹوٹ جاوے [illegible]

دل میں نہیں ہے ۔ والسلام علیکم و قلبی لدیکم ۔

خاکسار تابعدار شما بندہ شما سید احمد از مقام لندن ۔ ۲۶ نومبر ۱۸۶۹ء

اسی سلسلہ میں ایک دوسرا خط ملاحظہ فرمائیں جو انہی مولوی مہدی علی کے نام ہے ۔ اور سر سید نے روانگی لندن سے قبل لکھا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کا اپنے خاص دوستوں سے کیا برتاؤ تھا اور وہ ان کو کس قدر احترام سے یاد کرتے تھے ۔

" بخدمت شریف غبطہ ظاہری و مرشد حقیقی و معنوی مولانا مرشدنا مولوی مہدی علی صاحب

مخدوم و مکرم من سلامت

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۶ اپریل معہ ہنڈی دو سو روپیہ کے پہنچا اور آپ کا شکر کیا اور دعا کی کہ خدا اس کی جزا دے ۔ ان دنوں میں کہ طبیعت ایسی رنجیدہ ہے کہ کتاب خطبات احمدیہ کے خرچ کے سرانجام ہونے کا دو مرا رنج ہے ۔ مجبوری یہاں روپیہ قرض لینا پڑا ۔ چنانچہ تین ہزار روپیہ قرض لینے کی گفتگو ہو رہی ہے ۔ خدا راست لائے ۔ آپ نے اور دوستوں نے جس قدر مدد کی نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی غنیمت تھی ۔ ورنہ زہر کھا کر مر جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا ۔

ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کیا ہے ۔ اور " تہذیب الاخلاق " اس کا نام فارسی میں اور "[illegible]" انگریزی میں رکھ لیا ہے ۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے ۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے ۔ اور یہ سب چیزیں [illegible] روانہ کیا [illegible] وہاں پہنچنے تک [illegible] ماہواری [illegible] اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا ۔ ہم [illegible] دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر دیں گے ۔ [illegible] بقیمت [illegible]

[illegible] مذہبی اور دنیاوی بھلائی [illegible] اور کچھ نہیں [illegible]

[illegible] لندن [illegible] انشاء اللہ تعالیٰ [illegible]

[illegible] آپ [illegible]

[illegible] آگے [illegible]

[illegible] شکر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بالتخصیص [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] خدا [illegible]

پیارے دوست [illegible]

آپ کا تابعدار غلام سید احمد ۔ روز جمعہ تاریخ روانگی [illegible] ۱۸۷۰ء

سر سید اپنے نہایت عزیز دوستوں کو جس بے تکلفی سے خط لکھتے تھے ذیل کا مکتوب اُس کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ سر سید نے اپنے بے حد گہرے دوست خان بہادر سید زین العابدین کو لکھا تھا۔

"مکرمی زین بھیا

ابھی تمہارا خط پہنچا۔ کچھ شک نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اُس کو برا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ اتاروں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو شکر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ ع اے کہ ہرگز فراموشت نہ کنم کا نقشہ ہو گیا ہے۔

قبل روانگی پنجاب میری طبیعت درست نہیں تھی۔ پنجاب میں اور زیادہ مضمحل اور درماندہ ہو گئی۔ لاہور میں زیادہ ٹھہر نہ سکا اور اضلاع پنجاب میں جہاں جہاں جانا تھا جا نہیں سکا۔ واپس چلا آیا۔ لاہور اور اضلاع لاہور میں جو چندہ ہوا اس کی تعداد قریباً ۱۲ ہزار روپیہ کے ہے۔ تمہارے گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ والسلام

خاکسار سید احمد از علی گڑھ ۲۶ اپریل ۱۸۹۴ء"

سر سید اپنے دوستوں کی ملاقات کے کتنے زیادہ متمنی اور مشتاق رہتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے خط سے کیجئے جو انھوں نے اپنے نہایت عزیز دوست شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ کو لکھا تھا۔ یہ اور بہت سے دیگر خطوط سر سید کے اپنے ہاتھ سے لکھے مولوی عنایت اللہ مرحوم نے مجھے مرحمت فرمائے تھے۔ میں خط تبرکاً انہی طرز تحریر میں نقل کرتا ہوں جس طرح سر سید نے لکھا تھا۔ ناظرین املا سے سمجھ لیں۔ جہاں حروف پر اصل خط میں نقطے نہیں ہیں میں نے بھی نہیں دیے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نقل مطابق اصل ہے۔

"جناب والا شمس العلماء خان بہادر

واہ جناب واہ اپنے خواجہ وجیہ الدین سے فرمایا کہ گیارہ بجے کا وقت جو کمیٹی میٹنگ کے لیے مقرر کیا ہے اچھا نہیں ہے اگر ایک بجے کا وقت ہوتا تو اچھا تھا۔ مطلب آپ کا یہ تھا کہ آپ نو بجے دلی سے چلتے اور اجلاس میں شریک ہو کر اسی دن واپس چلے جاتے یہی آپ کا انصاف ہے۔ آپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔ برس میں دو اجلاس ہوتے ہیں جن میں آپ سے ملاقات ہونے کی توقع ہوتی ہے اگر برس میں دو دن بھی آپ ملاقات پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اپنی بدقسمتی پر افسوس ہے۔ آپ ضرور تاریخ اجلاس سے ایک روز پہلے تشریف لاویں گے دوسرے دن اجلاس میں شریک ہو کر تشریف لے جائیے گا۔ ایک دن قبل اجلاس کے بروز ات منتظمہ کا اجلاس ہوگا اور غالباً سید محمود بھی اُس اجلاس میں اور ٹرسٹیوں کے اجلاس میں شریک ہوں گے۔ ان سے بھی ملاقات ہو جاوے گی پس آپ ضرور ایک روز قبل اجلاس کے تشریف لاویں۔ معلوم نہیں کہ عزیزی عنایت اللہ مدرسہ سے واپس آئے یا نہیں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد علیگڑھ ۵ جولائی ۱۸۹۶ء"

مضمون بہت طویل ہو گیا اور ہم نے ابھی تک سر سید کی شخصیت کے متعلق بہت ہی کم بیان کیا ہے۔ گنجائش ہوتی تو ہم سر سید کی محبت و شفقت زندہ دلی و خوش طبعی۔ غیر معمولی ذہانت و طباعی۔ سچائی و راست بازی۔ ہمت و استقلال۔ صاف گوئی و دلیری۔ عزیزوں کے ساتھ مہربانی۔ دوستوں کے ساتھ برتاؤ۔ نوکروں کے ساتھ تعلق۔ سیر چشمی و فراخ حوصلگی۔ مستحقین کی امداد و دستگیری۔ وضع داری و رکھ رکھاؤ۔ جوانمردی و بہادری۔ فیاضی و داد و دہش۔ طلب علم کا ذوق و شوق۔ انتقام و مخاصمت سے پرہیز۔ منشیات اور مسکرات سے اجتناب۔ عالی ظرفی و عالی حوصلگی۔ عفو و اغماض کی عادت۔ ہمدردی

دلسوزی، بدکلامی و بدلگامی اور ہزل و فحش گوئی سے بالکل علیحدگی اور بے تعصبی و رواداری وغیرہ فضائل کے متعلق بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتے اور دکھاتے کہ یہ شخص گذشتہ انیسویں صدی میں کیسی عجیب و غریب اور عظیم الشان شخصیت کا مالک تھا۔ اور اس کی لائف ہمیں کن اخلاقِ حسنہ کے تسیل کرنے اور اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مگر قلتِ گنجائش کے سبب ہم ان تمام ضروری امور کو چھوڑتے ہیں اور آخر مضمون میں تبرک کے طور پر سرسید کا پورا ایک سو برس پہلے کا ایک خط قارئین کرام کی خدمت میں ہدیۃً پیش کرتے ہیں۔ یہ خط آج تک غیر مطبوعہ تھا اور کبھی کسی رسالے، اخبار یا مجموعہ میں آج سے پہلے شائع نہیں ہوا۔ اس خط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فارسی میں ہے۔ سرسید کی اردو تحریریں تو سینکڑوں ہزاروں آپ کی نظر سے گذری ہوں گی مگر مرحوم کی فارسی تحریر آج کل کے شاید کم لوگوں نے دیکھی ہو۔ اس خط کی عبارت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید کو جیسا عبور اردو پر تھا ایسی ہی قدرت ان کو فارسی زبان کی تحریر میں حاصل تھی۔ جیسی ان کی اردو تحریر سلیس، عام فہم اور دلچسپ ہوتی تھی، وہی بات ان کی فارسی تحریر میں موجود تھی۔ مولوی سید بندہ علی نامی ایک صاحب سرسید کے دوست تھے اور عرصہ تک جونپور، شاہجہان آباد اور متھرا وغیرہ مقامات پر منصف اور صدر امین رہے تھے۔ یہ خط ان کے نام سرسید نے فروری ۱۸۵۵ء میں اس وقت لکھا تھا جب وہ بجنور (یو۔پی) میں صدر امین تھے۔ اس اعتبار کے لحاظ سے یہ سو برس پہلے کا تبرک ملاحظہ ہو۔

جناب سید مولوی شفقی مکرمی سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام و اشتیاق ملاقات بہجت آیات التماس اینکہ قبل ازیں عریضہ نیازہ بجواب عنایت نامہ عالی فرستادہ بودم بملاحظہ رسیدہ باشد از قضاء و قدر ربانی و تقدیر ازلی و مشیت ایزدی تنقیح بندہ بعہدہ صدر امینی شدہ و در بجنور صدر امین شدم این ہمہ فضل و احسان حق تعالے است ورنہ این نالائق ہیچ کارہ محض است بفضل و کرم خدا را معاملہ فرمایید کہ چگونہ میکند۔ ان اللہ علی کل شیء قدیر۔ اگرچہ مفارقت دہلی و احباب لہ بسیار ناگوار طبع افتاد مگر تن برضا در دادہ م آب و ہوائی اینجا نہایت در نہایت خوب و مرغوب است و بجنور اگرچہ قصبہ خرد است الا بسیار خوش ہوا و سبزی اینجا ہم متعلق بصدر امین و قریب ہفتاد روپیہ ماہواری آمدنی دارد۔ در اینجا سوائے مفارقت احباب دیگر ہر وجہ خوش و خرم ہستم۔ اللہ تعالے انجام بخیر کناد آمین یا رب العالمین۔ ہنگام روانگی از دہلی انصرام صاحب بالکلیہ صفائی شدہ آنچہ مقتضائے بزرگان نسبت بحال خوردان است بلاواسطہ ارسالی خود بنام طریقہ پیش آمدند و این امر باعث بسیار خوشی شد امید کہ گاہ گاہ از حال مزاج خود مطلع میفرمودہ باشند۔

خاکسار

سید احمد۔ از بجنور

۱۰ فروری ۱۸۵۵ء

خان بہادر مولوی بشیر الدین

احمد الدین مارہروی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہرگز سگرٹ نہ پینے دیتا۔ اب معلوم ہوا کہ یہی وہ مولوی بشیر الدین ہیں جن کی وجہ سے مجھے اسکول میں داخل کیا گیا ہے۔" کہتے تھے "مولوی صاحب کے بظاہر کمزور جسم میں بڑی جان تھی اور وہ طمانچہ مجھے آج تک یاد ہے۔"

مولوی صاحب کے مزاج میں لاپرواہی کا مادہ بدرجۂ اتم تھا یہی وجہ تھی کہ اکثر ان کی داڑھی الجھی ہوتی اور کپڑے کثیف رہتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار کے سالانہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی تھا۔ سب لوگ نہایت بیش قیمت اور پُر تکلف لباس پہن کر باہر نکلتے لیکن مولوی صاحب حسبِ عادت اسی ہیئت کذائی سے گھومتے پھرتے تھے۔ جس روز ان کو تقریر کرنی تھی تو چلتے وقت مائی لارڈ نثار حسین نے ان کی داڑھی میں کچھ دھاگے الجھے ہوئے دیکھ کر کہا کہ "بھائی جہاں آپ اور قومی کاموں کے واسطے چندہ کرتے ہیں وہاں مولوی صاحب کی داڑھی کے واسطے ایک کنگھے کا بھی بندوبست کر دیں۔" ہنس کر کہنے لگے "مگر پھر آپ کو ایک ملازم بھی رکھنا پڑے گا کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کنگھا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

واقعہ یہی ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی مسئلہ میں ایسے الجھے رہتے کہ ان فروعات کی طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ "ایک سر اور ہزار سودا" کی مثل ان پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کے پیشِ نظر بہت سے کام رہتے تھے لیکن جب ذہن ایک طرف مائل ہو جاتا تو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے وہی ایک خیال پیشِ نظر رہا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ لفظ نیشن (NATION) کے معنوں پر بحث ہو گئی۔ میں نے کہا کہ عربی میں "قوم" کا جو مفہوم ہے وہ نیشن کے لفظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں۔ کہنے لگے لائبریری چلو۔ —— مختلف کتابیں نکلوائیں، تمام ڈکشنریاں دیکھیں، لغات میں قوم کے معنی تلاش کئے۔ غرض سارا دن اسی بحث میں ختم ہو گیا۔ وہ تو اطمینان سے بیٹھے حقہ پیتے رہے اور یہاں آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔ میں اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتا تھا۔ رات کو دو بجے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی دیکھا تو مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ آتے ہی کہنے لگے "تمہارے پاس مولوی عبدالحق کی ڈکشنری ہے۔ دیکھو تو نیشن کے معنی انہوں نے کیا لکھے ہیں۔ اسے تو دیکھنا بھول ہی گئے تھے۔" معنی دیکھے گئے اور پھر جو بحث کا آغاز ہوا تو صبح ہو گئی اور اگلے روز "البشیر" میں قوم اور نیشن کے مفہوم پر ایک نہایت محققانہ مضمون شائع ہو گیا۔

انہماک کی یہ عادت بعض اوقات خود فراموشی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ علی گڑھ جا رہے تھے راستے میں کسی علم دوست غیر ملکی کا ساتھ ہو گیا، ٹرکی اور انگلستان کے مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب علی گڑھ آیا اور گزر گیا۔ جب گاڑی دہلی پہنچ کر ختم ہو گئی تو معلوم ہوا کہ علی گڑھ تقریباً سو میل پیچھے رہ گیا ہے اور اب دوسری گاڑی سے واپس جانا ہو گا۔

جس زمانہ میں اسکول ہال کی عمارت بن رہی تھی ان کے ہاں مولوی محمد حسین شوق مہمان تھے۔ کھانے کا وقت آیا تو مولوی صاحب ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھے مگر فوراً ہی یہ کہہ کر کہ آپ شروع کیجئے میں ابھی آتا ہوں کسی طرف چلے گئے۔ دو گھنٹے گزر گئے، کھانا ٹھنڈا ہو گیا، شوق صاحب نے بادلِ ناخواستہ کچھ کھایا کچھ نہ کھایا، سونے کو لیٹے تو نیند نہ آئی باہر نکل آئے، دیکھا کہ اسکول کی عمارت کے سامنے دھوپ میں ٹہل رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دیواروں پر نقوش بنانے کا مسئلہ زیرِ غور ہے اور اپنی دانست میں سمجھ رہے ہیں کہ کھانا کھا کر آئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد شام تک کھانا نہیں کھایا۔

کھانے کے بارے میں ان کی یہ لاپرواہی آخر تک قائم رہی۔ شاذ و نادر ہی کبھی خود دسترخوان طلب کرتے تھے بلکہ بعض اوقات جب کہا جاتا کہ کھانا تیار ہے تو چونک سے پڑتے تھے۔ اچھا کھانا کھا کر خوش ضرور ہوتے تھے لیکن دسترخوان پر جو کچھ ہوتا وہ بے چون و چرا کھا لیتے۔ کہتے تھے مجھے جب تک بتایا نہ جائے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ مسائل ہی ایسے پیچیدہ سامنے آ جاتے ہیں کہ اس طرف خیال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن چائے کے معاملہ میں حالت بالکل جداگانہ تھی۔ اس کے لئے نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ مقدار، جب جی چاہتا پیتے اور جتنی چاہتے پیتے۔ آخر میں بہت کم کر دی تھی مگر پھر بھی کئی پیالیوں کا اوسط ہو جاتا تھا۔

باوجود اس انہماک کے وضعداری کا بہت پاس تھا۔ جب کہیں جاتے تو تمام رشتہ داروں سے ضرور ملتے، ان کی اور سارے خاندان کی خیریت دریافت کرتے۔ اگر کوئی مرجاتا تو اس کی تعزیت کرنا اور بچہ پیدا ہوا ہو تو اسے دیکھ کر پیار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ دید وادید میں بعض اوقات کئی دن لگ جاتے اور استطاعت سے زیادہ روپیہ صرف ہو جاتا تو حتی الوسع پیدل گھومتے تھے، اس کے بعد دوستوں اور ملاقاتیوں کا نمبر آتا جن کی تعداد کسی زمانہ میں بھی کم نہیں رہی۔ جس مقام پر کوئی عزیز بھی ہوتا اور دوست بھی، تو ٹھہرتے ہمیشہ عزیز کے ہاں اور رہتے دوست کے ساتھ۔ بعض اوقات اس عزیز اور دوست میں باہم رنجش ہوتی اور ایک دوسرے کی مذمت کرتا تو وہ دونوں کو باہم شیر و شکر کرنے کی کوشش کرتے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوتی تو کہتے کہ تمہاری رنجشیں اپنی جگہ پر اور میرے تعلقات اپنی جگہ پر۔

کانگریسی دوستوں کے ساتھ، مسلم لیگ اور سرکار پرست لیڈروں کے ساتھ ان کے تعلقات یکساں خوشگوار اور استوار رہتے تھے۔ اصولی اختلافات کو کبھی ذاتی دوستی میں حارج نہ ہونے دیتے۔ بلکہ جو لوگ اپنے عقائد میں پختہ ہوتے ان کی دل سے عزت کرتے تھے، زمانہ ساز لیڈروں سے البتہ سخت متنفر رہتے اور کہتے تھے کہ "یہ لوگ لیڈر نہیں گیدڑ ہیں، نہ ان میں کیریکٹر ہے نہ قوت کہ حالات کا مقابلہ کریں اور نہ اتنی جرأت ہے کہ شکست کو شکست سمجھ کر تسلیم کریں۔ یہ قوم فروش بھی ہیں اور خود فروش بھی۔"

مولوی صاحب کی خانگی زندگی بھی عجیب مجموعہ اضداد تھی۔ ان کو اپنے اہل و عیال سے بے انتہا محبت تھی لیکن قومی کاموں کے سامنے اکثر گھر کی ضروریات کو بھول جاتے تھے اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں بیوی بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں پر ہی نہیں بلکہ اولاد کی اولاد پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔ نام خود ہی تجویز کرتے، کپڑوں کا انتظام بھی اپنی ہی زیرِ نگرانی کرتے اور اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو اس کے معالجہ میں پورے انہماک سے کام لیتے تھے۔ مولوی صاحب کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں اور سب کا نام بشیر پر تھا۔ انہوں نے ان سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی، لڑکیوں کو امور خانہ داری سکھائے اور لڑکوں کو علی گڑھ کالج بھیجا۔ لیکن جدید فیشن کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ لڑکے علی گڑھ کالج کے مغربی ماحول میں رہتے اور دیسی کپڑے پہنتے تھے جس سے دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، لڑکیوں کو بھی معمولی کپڑے پہنانے اور زیور کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو اس بات کا خاص خیال رکھا کہ جہیز میں کوئی ولایتی چیز یا کپڑا نہ دیا جائے۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ساری اولاد ان کی زندگی ہی میں داغ مفارقت دے گئی اور وہ بھی زیادہ تر عین عالمِ شباب میں، مولوی صاحب ان تمام حادثات کو انتہائی صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ آخر میں بڑے صاحبزادے بشیر احمد مرحوم کے انتقال پر جب میں نے تعزیت کی تو کہنے لگے "یہ سب درازیٔ عمر کے ٹیکس ہیں جو مجھے ادا کرنے پڑ رہے ہیں، لیکن انسان کو اپنی عمر پر بھی تو اختیار نہیں۔"

مولوی صاحب کو اپنی تمام اولاد میں بشیر پاشا سے بہت محبت تھی۔ جب انہوں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو ان کو بی۔ ٹی کرا کے اسکول میں سیکنڈ ماسٹر مقرر کر دیا۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مولوی صاحب اقربا پروری یا کنبہ پروری سے بالاتر نہ تھے، اپنے رشتہ داروں کو اکثر اور بہت سوں کو اسکول میں جگہ تو دیتے مگر ان پر کڑی نگرانی رکھتے اور سب سے زیادہ کام لیتے تھے تاکہ وہ آزمودہ اور پختہ کار ہو کر اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ایک زمانہ میں معاندین نے ان کے خلاف الزام تراشی کی مہم تیز کر رکھی تھی تو سررشتہ تعلیمات سے اس امر کی بھی شکایت کی گئی۔ جواب طلبی ہوئی تو مولوی صاحب نے لکھا کہ "جس تنخواہ پر میرے اعزا کام کر رہے ہیں اگر اس مشاہرہ پر اسی قابلیت کے استاد آپ مجھے دلا سکیں تو میں آج ہی سابقہ خدمات کا اعتراف کیے بغیر آپ کے حکم سے ان کو برخاست کر دوں گا۔ یوں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسکول میں سب سے زیادہ کارگزار یہی استاد ہیں۔" یہ دندان شکن جواب سن کر محکمہ کو بھی خاموش ہو جانا پڑا اور مخالفین کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

مولوی صاحب کا خیال تھا کہ بشیر پاشا کو اپنا جانشین بنائیں اور مرتے وقت البشیر اور اسکول کو ان کے سپرد کر جائیں لیکن افسوس کہ یہ آرزو بھی

پوری نہ ہو سکی اور وہ ۱۹۲۴ء میں ایک جانکاہ حادثہ کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔ کہتے تھے اس واقعہ نے میری کمر ہمت توڑ دی اور اگر میرے سامنے قومی کام نہ ہوتے تو میں اس صدمہ سے ہرگز جانبر نہ ہو سکتا۔ پھر یہ شعر پڑھا کرتے ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

——— کبھی دوسرے مصرعہ میں یوں ترمیم کر دیتے :-

واقعہ سخت ہے اور غم طویل

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مولوی صاحب کی ایک پارٹی بھی تھی جس کا نام "جہل مرکب" تھا وہ خود اس کے صدر تھے اور ممبران میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ڈاکٹر سر ضیاء الدین (وائس چانسلر علی گڑھ) حبیب اللہ خان (بانی آفتاب ہال) محمد حسین شوق، نثار حسین، مولوی طفیل احمد (مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل")، خان بہادر جعفر حسین، میر ولایت حسین اور نظامی بدایونی (اڈیٹر "ذوالقرنین") وغیرہ شامل تھے۔ اٹاوہ کالج کے ہسٹری میوزیم میں ایک تصویر آویزاں ہے جس کے وسط میں مولوی صاحب اپنی مخصوص وضع میں بیٹھے ہیں اور ان کے گرد عمائدین علیگڑھ کا یہ گروپ ہے، کپڑے کی ایک پٹی پر نہایت نستعلیق الفاظ میں جہل مرکب لکھا ہوا ہے جو ہر دیکھنے والے کی حیرت کا باعث ہوتا ہے اور اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ یہ دراصل قومی دیوانوں کی ایک جماعت تھی جو اپنی ذات کو فراموش کر چکے تھے اور ہمیشہ قومی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے یہ لوگ ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اگر ان میں سے دو بھی ایک جگہ مل جاتے تو پھر ان کی گفتگو سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تصویر علی گڑھ یونیورسٹی میں جوبلی کے موقع پر لی گئی تھی اور آج ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مائی لارڈس کا یہ علم دوست گروپ آج ہم میں موجود نہیں۔ سب ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس محفل کی آخری شمع مولوی بشیر الدین صاحب کی ذات تھی جو پورے سو برس فروزاں رہنے کے بعد ۱۲ر جون ۱۹۵۶ء کو خاموش ہو گئی۔

امیر مینائی

اسمٰعیل احمد مینائی

کہا جاتا ہے کہ زندگی پر نام اور تخلص کا اثر پڑتا ہے مگر امیر مینائی کے یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ماں باپ نے امیر احمد نام رکھا، خود انہوں نے امیر تخلص اختیار کیا۔

نام کا نام ہے اس کا تخلص ہے امیر　　　　یہ عجب حسنِ خداداد کے نام میں ہے

لیکن عمر بھر فقیری و فقیر منشی میں گزری اور گزاری۔

ابھی نوجوان ہی تھے کہ حضرت میاں امیر شاہ ؒ سے بیعت کرلی اور ان کی نظرِ کیمیا اثر کے فیض نے سلوک کو جذب میں تبدیل کر دیا۔ اس بیعت کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔ خاندانی تعلق کے باعث امیر مینائی ؒ درگاہ حضرت شاہ مینا ؒ میں روز بلکہ دن میں کئی کئی بار حاضری دیا کرتے تھے۔ وہاں متعدد اکابر مشائخین رفتہ رفتہ ملنے جلنے کا موقع ملا تھا اور امیر مینائی ؒ کی سعادت مندی کو دیکھ کر ان میں سے اکثر نے اس کی کوشش کی کہ وہ ان سے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیں مگر امیر مینائی ؒ کو حضرت مخدوم صاحب کی جانب سے پہلے ہی بشارت دی جا چکی تھی کہ تمہیں اس شکل و صورت اور وضع قطع کے شیخ سے وابستہ ہونا ہے۔ ہر بزرگ میں ان نشانیوں کو تلاش کرتے ان کو ایک مدت ہو گئی، لیکن خود قدرت کے حال نے ان کو اپنی جانب کھینچ ہی لیا، مگر مخدوم صاحب کا تصرف باطنی بار آور ہو کے آیا۔ ایک روز مابین عصر و مغرب امیر مینائی ؒ حسبِ معمول مزار مبارک پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ منہ لپیٹے مزارِ مبارک کی جالی سے لگے بیٹھے ہیں۔ —— ان کو خلوت مطلوب تھی، چندے انتظار کیا کہ یہ فارغ ہو لیں تو خود بیٹھیں مگر وہ بزرگ نہ آج اٹھتے ہیں نہ کل۔ —— یہ اذان نماز کے لئے برابر والی مسجد میں چلے گئے۔۔۔ وہاں سے نیت کر کے لوٹے تو دیکھا کہ وہ حضرت بدستور بیٹھے ہوئے ہیں، ان کا معمول تھا کہ مزارِ مبارک کے داہنی جانب سرہانے سے متصل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اُس جگہ پر وہ بزرگ ڈٹے ہوئے تھے۔ غرض ان کو بڑی الجھن ہوئی، پہلو بدل بدل کے کچھ دیر گزاری بالآخر مغرب کا وقت آگیا تو یہ پھر مسجد چلے گئے، وہاں سے جب فراغت پاکے آئے تو دیکھا کہ وہ صاحب اپنی جگہ سے ہلنے تک نہیں ہیں۔ اب تو ان سے نہ رہا گیا، پاس جا کے کہا کہ حضرت کیا نماز مغرب کے لئے بھی مسجد نہ جائیے گا۔ انہوں نے منہ کھول کر ایک نظر امیر مینائی ؒ کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور فرمایا ”میاں امیر! اب بھی نہیں پہچانا“ یہ الفاظ سُن کر ان کا عجب حال ہو گیا۔ اب جو غور کرکے دیکھتے ہیں تو وہی شکل و صورت، وہی حلیہ، جو خواب میں ان کو دکھایا جا چکا تھا —— بس پھر کیا تھا، بیتاب

دبیقرار ہوکے قدموں سے لپٹ گئے، انہوں نے اُٹھا کر سینے سے لگالیا، ہم آغوش ہونا تھا کہ دنیا بدل گئی، تقریباً دو برس اسی استغراق اور جذب کے عالم میں گزرے، کسی شئے کی فکر نہ تھی، دن رات حضرت مخدوم صاحب کا آستانہ تھا یا میاں امیر شاہ رحؒ آئے ہوئے ہوں تو اُن کی قیام گاہ۔ لکھنا پڑھنا، شعر شاعری، مجلس محفل، سب ترک، سب سے بے نیاز، یہ عالم کہ چار چار روز گھر کی صورت نہ دیکھتے تھے۔ والدہ اِن کی اُس وقت حیات تھیں، سب سے چھوٹے اور چہیتے فرزند تھے، ماں نے باپ کے گزرنے کے بعد اِن کی ہوش مندی قابلیت اور شہرت دیکھ کر اِن کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، جوانی میں یہ عالم اُن سے نہ دیکھا گیا، پہلے حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ پر حاضر ہو کے دعا کی، پھر میاں امیر شاہ رحؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ "حضور میرے امیر کو مجھے واپس دیجئے"۔ میاں صاحب متبسم ہو کر خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد جب امیر مینائی درگاہ شریف کا چکر لگا کے پہنچے، تو شفقت سے اپنے قریب بلایا اور اپنی ٹوپی جو بوقت بیعت ان کے سر پر رکھ دی تھی، وہ بہ سہولت اتار لی، پھر کیا تھا جیسے کسی دیوانے کو ہوش آگیا ہو یا کسی کی سوتے سے آنکھ کھل گئی ہو، جذب و مستی سب رفو چکر ہو گئے، اور سخت بیقراری کا عالم طاری ہو گیا، اس بیقراری کو دیکھ کر مرشد نے فرمایا "میاں امیر ماں کی دلجوئی کو مرشد کی اطاعت پر ترجیح ہے۔ جس لطف سے تم اِس وقت محروم کر دیئے گئے ہو، انشاء اللہ اخیر عمر میں یہ لطف پھر تم کو نصیب ہو گا ——— اور تم دکن میں رہو گے"——— یہ ہزار تڑپے پھڑکے، مگر میاں صاحب نے ایک نہ سنی اور ماں کے پاس جانے کا حکم دے کر خود گھر کی راہ لی ———

ثاقب گوالیاری، جامع مکاتیب امیر مینائی رحؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ایک "عالم نور" تھے۔ راقم الحروف نے اُن کو نہیں دیکھا مگر اُن کے فرزندوں اور شاگردوں کے علاوہ اغیار نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ امیر مینائی رحؒ کی ذات بڑی پاکیزہ و دلکش تھی چہرے پر ایک معصومیت ایک محویت کے آثار کا ہلکا سا پردہ پڑا رہتا تھا جو ہر دیکھنے والے اور ملنے والے کو بے اختیار رجھا لیتا تھا۔

سنہ ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، والد کا نام کرم محمد مینائی تھا۔ مینائی سے مراد حضرت شاہ مینائی رحؒ کی نسبت ہے۔ جن کی درگاہ لکھنؤ میں آج بھی مرجع خاص و عام ہے ؎

ہر کہ خواہد چشم را بینا کند   سرمۂ خاکِ درِ مینا کند

لکھنؤ ہی میں ہر فن کے اساتذۂ وقت سے علوم کی تعلیم حاصل کی، طب کی تکمیل کی، اور عنفوانِ شباب ہی میں اپنی میانہ روی اپنی لیاقت و سعادت اپنی طباعی و ذکاوت، کے باعث فرنگی محل اور خانوادۂ اجتہاد، ہر دو میں یکساں مقبول و محترم ہوئے، جلد ہی دربار شاہی میں رسائی ہو گئی، پہلے شاہزادۂ نادر مرزا کی اتالیقی سپرد رہی پھر منصب افتا پر فائز ہوئے واجد علی شاہی مٹی اور غدر ہوا، تو چندے کاکوری میں قیام کیا، جہاں حضرت محسنؒ سے یکجائی ہوئی اور نعت گوئی کا چسکا پڑا جو اخیر عمر تک توشۂ آخرت بنا رہا، پھر لکھیم پور کان پور، بہار، کے چکر لگا کے بالآخر اپنے والد کے شاگرد عزیز، یوسف علی خاں والئی ریاست رام پور کے ایمائے اصرار پر، اپنے مرشد کے وطن ریاست رام پور میں آکے رہ پڑے یہیں وحید الزمان خان ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی اور وجیہہ الزمان خان سفیر ریاست، کی بھتیجی سے شادی ہوئی اور یہیں پہلے مفتئ عدالت و اُستاد شاہ پھر اُستاد شاہ و مقرب خاص، اور اخیر میں صدر نشین مجلسِ تدوینِ امیر اللغات رہے، اور یہیں سے بظاہر امیر اللغات کو پورا کرنے کی لگن کے بہانے موت (۷۲) سال کی ضعیف العمری میں، اِن کو کھینچ کر بماہ اگست سنہ ۱۹۰۰ء حیدر آباد دکن لے گئی اور وہیں سپرد خاک کر دیا، جہاں وہ درگاہِ یوسف صاحب شریف صاحبؒ کے احاطے میں قیامت کی نیند سو رہے ہیں، تعویذ پر سامنے انہی کے شاگردِ جلیل کا قطعۂ تاریخ مرقوم ہے۔

امیر کشورِ معنٰے امیر مینائی   خدا کے عاشقِ صادق دو نبی کے فقیر
گئے جو خلدِ بریں کو تو اُن کی تربت پر   لکھا جلیلؔ نے "روضۂ جنابِ امیر"

اور پشت پر خود ان کی لاثانی بیت، جلی حروف میں کندہ، دل رکھنے والے زائرین کو بے اختیار کھینچ لیتی ہے۔

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں　　　پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

مولوی شبیر حسن مرحوم نے مجھے بیان کیا تھا کہ میں جب حیدر آباد پہلی بار گیا تو داغ و امیر کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی نیت سے درگاہ شریف پہنچا، خاص درگاہ میں جا کے قبروں کی تلاش کی تو داغ کا مزار قبۂ مبارکہ کے سامنے ہی مل گیا، سوچا کہ فاتحہ پڑھ لوں پھر خیال آیا کہ امیر کا مزار بھی کہیں پاس ہی ہوگا، پہلے اُس کی تلاش کر لوں پھر فاتحہ پڑھ لوں گا، قریب میں تلاش کرنے پر کہیں امیر کی قبر نہ ملی تو جویندہ یابندہ آگے بڑھ گیا، راہ میں ایک آنے والے نے رہبری کی کہ میاں امیر مینائی کی قبر تو درگاہ آنے کے رستے میں ہے واپس جاؤ —— میں واپس ہوا اور شہر خموشاں میں پہنچ کے تلاش شروع کی، جب امیر مینائی کی قبر سامنے آئی تو سب سے پہلے اسی بیت پر نظر پڑی اور میں نے بے اختیار سبحان اللہ کہہ کر فاتحہ پڑھ لی پھر داغ کے مزار پر جا کے فرض سے سبکدوش ہوا۔

فی الحقیقت یہ درویشی، فقیر منشی، اور حُبِّ رسول کا مسلک، امیر مینائی کے محیطِ وجود کا مرکز تھا جس پہلو کو اُن کی شخصیت کے جانچیے جائیے اُس کی تہ میں یہی عناصر کار فرما ملیں گے —— نوجوانی کا حال بسلسلۂ تذکرۂ بیعت آپ سُن چکے، نواب کلب علی خاں سے خفا ہو کے جب دو سال کو لکھنؤ چلے گئے تھے اپنے ایک عزیز کے ایما پر بسلسلۂ کار برآری ایک بار لفٹنٹ گورنر سے ملنے گئے۔ دفتر گورنری کے احاطے ہی میں عدالت کا دفتر تھا، اِن کی پالکی داخل ہو رہی تھی کہ احاطۂ عدالت میں ہرکارے نے آواز لگائی "گیا دین حاضر ہے" —— یہ فوراً واپس ہو گئے، اور اُن عزیز نے جب نتیجۂ سعی کے بارے میں دریافت کیا تو کہہ دیا کہ میاں یہ آواز سروشِ غیبی تھی، جس مرحلے میں گیا دین اس میں میرا کہاں گذر، یہ مشرب و مسلک اُن کا کاروبار یا معاش کے معاملات ہی میں نہیں، ہر رنگ میں تھا، ایک بار کسی گلدستہ میں داغ کی غزل شائع ہوئی۔

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں　　　کہ جس کی جان لیتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

بیٹے اور شاگرد مصر ہو گئے کہ حضرت اس زمین میں غزل ہونی چاہیے، حضرت تھے کہ برابر ٹالتے رہے جب اصرار حد سے بڑھ گیا تو فرمایا کہ میاں جلیل —— مجھے دنیا داغ کا معاصر سمجھتی ہے اُن کی غزل پر غزل کہی جائے تو یا بہتر ہو ورنہ کم از کم اس معیار کی تو ہو، یہاں حالت یہ ہے کہ داغ نے غزل نہیں کہی ہے قلم توڑ دیئے ہیں۔ غزل تو غزل، ایک شعر کا جواب ہونا مشکل ہے —— میں اس زمین میں شعر کہہ کر داغ کی توہین کرنا نہیں چاہتا —— یہ تو ایک واقعہ تھا جو شاید دو چار حضرات ہی کو معلوم ہو، انہوں نے اس کے بعد کمال فراخ دلی سے یہ مقطع بھی لکھا۔

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مطلع ہے　　　بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں

بعض رسائل میں کبھی کبھی ان کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے، چند معاندانہ جا بے جا اعتراضات ان کے کلام پر وارد کرتے تھے، نو عمر اور جوشیلے شاگرد اس پر سخت برہم ہوتے اور جواب لکھنے کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہوتیں مگر خود ان کو جب اطلاع ہو جاتی یہ شعر پڑھ کر ہر ایک کو روک دیتے۔

ہر کہ آمد در رہِ ما خارے نہد از دشمنی　　　ہر گلے کز باغِ عمرش بشگفد بے خار باد

داغ جب دوسری بار حیدر آباد دکن جانے لگے تو امیر سے ملنے رام پور آئے، جلال کو خبر پہنچی تو وہ بھی لکھنؤ سے آ گئے، امیر ہی کے یہاں ٹھہرے روانگی سے پہلے شام کو ایک مختصر سی صحبتِ شعر و سخن منعقد ہوئی، جلال کے بعد داغ نے غزل شروع کی۔ رسوائی کا، شیدائی کا —— جب یہ مصرع پڑھا —— ہو گیا پرتوِ حسن سے کچھ اور ہی رنگ —— تو جلال نے جھوم کر کہا واہ نواب مرزا خاں واہ کیا مصرع کہا ہے ——

—— ہو گیا پرتوِ حسن سے کچھ اور ہی رنگ —— جو ارشاد ہوا تذکرہ اعجاز ہے اعجاز —— تعریف نہیں ہو سکتی ——

داغ ایک لمحے کے لئے دم بخود ہو گئے ـــــــ جلال نے کبھی اُن کے اچھے سے اچھے شعر کی اتنی تعریف نہیں کی تھی۔ مقصے بلا کے طباع اور ذہین آدمی، پرتو سے حسن کے نقص کو فوراً پا گئے مگر جلدی میں اُس کو دور کرنے کا پہلو نہ سوجھا ـــــــ امیر مینائی نے کسی تامل کے بغیر مصرعہ دہرایا۔

ـــــــ ہو گیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ

ہاں میاں نواب مرزا ـــــــ پھر تو پڑھنا ـــــــ داغ نے اُن کو متشکر نظروں سے دیکھ کر شعر پڑھ دیا۔

ہو گیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ ۔۔۔ میں نے منہ چوم لیا تیرے تماشائی کا

تو شرافت اور پاکیزہ نفسی کا یہ رنگ اُن کی طبیعت کا سب سے نمایاں پہلو تھا اور یہ سامنر اُسی فقیر منشی اور حُبِ رسول کا فیضان تھا۔

میاں جی، تیس سال سے اوپر اِن کے خدمت گار خاص رہے، کھانا کھاتے میں چوری ہلانا، سواری پر ساتھ جانا، وضو کرانا، بیماری آزاری میں پاؤں دبانا چپی کرنا، غرض ہر طرح سے خدمت کی۔

جیسے آقا تھے ویسے ہی نوکر ـــــــ صوم و صلوٰۃ کے پابند، فجر کی نماز کے بعد امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ آتے تو سبقت کر کے میاں جی سے پہلے اُن کو سلام کرتے۔ میاں جی شرمندہ ہو کے چپ ہو جاتے اور دل میں سوچتے کہ انشاء اللہ کل میں میاں کو پہلے سلام کروں گا۔ تیس برس اسی حسرت میں گزر گئے۔ امیر مینائی دکن جا کے پیوندِ خاک بھی ہو گئے مگر میاں جی کو سلام میں سبقت کرنے کا موقع نہ دیا ـــــــ

دوپہر کا کھانا بیوی خود کھلاتی تھیں، سامنے بیٹھ کے مکھیاں جھلتی جاتیں، یہ کھانا کھاتے جاتے، ماما گرم گرم پھلکے باورچی خانے سے لا کے دیتی جاتی ـــــــ تین چار پھلکے ـــــــ اِس سے زیادہ اِن کی غذا نہ تھی، ایک روز صرف ایک پھلکا کھا کے اُٹھ گئے ـــــــ بیوی نے پوچھا کیا بات ہے کیا کچھ طبیعت مائل نہیں ہے، سیلابچی آفتابہ، ہمیشہ کی طرح پاس رکھا تھا، یہ اُٹھنے لگے تو ٹھوکر لگی آفتابہ اُلٹ گیا۔ یہ بڑھ کر باورچی خانے کے متصل غسل خانہ تھا اُس میں ہاتھ دھونے چلے گئے، بیوی ماما کو آواز دے کر پانی صاف کرانے لگیں۔ انہوں نے چپکے سے پکانے والی کو آواز دی وہ آئی تو کہا ـــــــ کھانے میں نمک زہر ہے، ذرا جلدی سے پانی ملا دے، اگر تیری بیوی کو خبر ہو گئی تو تیری اپنی جان ایک کر دیں گی ـــــــ

اُن کی تمام زندگی درویشانہ اور فقیرانہ گزری اور اس کا اثر ان کے پاس رہنے والوں اور بیٹھنے اُٹھنے والوں سب پر کم و بیش پڑا۔ اُن کے فیضِ صحبت سے سب سے زیادہ مستفید حضرت جلیل ہوئے اور جن لوگوں نے حضرت جلیل کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی وہ قسم کھا سکتے ہیں کہ جلیل ایک شگفتہ صورت و سیرت بزرگ تھے ـــــــ

خود نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کی ذات پر اُن کی شخصیت کا خاصا اثر پڑا۔ ریاستوں اور رجواڑوں میں والیانِ تخت و تاج کہاں شرع و آئین کی پابندی کرتے ہیں مگر امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے فیضِ صحبت سے خلد آشیاں کی زندگی میں شرع و آئین کی پابندی کرنے کا میلان واضح طور پر جھلکتا ہے، تمام عمر صرف ایک بیوی پر قناعت تھا۔ اُس زمانے کو دیکھتے ہوئے صرف یہی ایک امر خلد آشیاں کی صالحیت و صلاحیت کی مستحکم دلیل ہے اور ایسا صرف دو حضرات کے اثر سے تھا، امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ارشاد حسین علیہ الرحمۃ، جن سے خلد آشیاں بیعت بھی تھے ـــــــ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے، پہلے پہلے تو مسجد میں جا کر با جماعت نماز ادا کرتے تھے پھر محل ہی کے اندر ادا کرنے لگے اور آخر میں پاؤں کے عارضے کے باعث اکثر پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے پڑھتے تھے۔

چھُپا کے متوکلوں سے سلوک کرنا درویش صفت اغنیا کی خاص پہچان ہے۔ خلد آشیاں کا نامۂ اعمال اِس بارے میں بھی بڑا درخشاں ہے اور یہاں بھی امیر مینائی کے ہاتھ کا عکس صاف جھلکتا ہے، حضرت اُن کے استاد ہی نہیں مشیر و مقرب خاص تھے، اور گو اُن کی استاد مزاج بالعموم منکسرانہ و مصالحانہ تھی، اور مولانا عبدالحق کی طرح شمشیرِ برہنہ کبھی نہ تھے، تاہم حق گوئی کا محل آجائے تو پھر چوکنے یا طرح دے جانے کی خو اُن کی بھی نہ تھی، خلد آشیاں کے بعد جب عرش آشیاں بھی جلدی ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور نواب حامد علی خاں کی کم سنی کے باعث ریجنسی کا دور دورہ ہوا

پر بھی انگریزیت کا سیلاب بلا ئے آیا، تو امیر اللغات پر بھی آفت آئی، اِن کی جلد یا نت محض منّوٰ رہ گئی۔ امدادِ دفتر اس قدر گھٹا دی گئی کہ مؤلفین کو معاوضہ دینا تو درکنار، دفتر کے عمّال، جیسے خدمتگار، کاتب مصحح وغیرہ کی تنخواہیں تک ادا نہیں ہو سکتی تھیں، پہلے انہوں نے جنرل اعظم الدین خاں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، وہ اپنی ذات سے اچھے افسر تھے مگر چونکہ طبیعت پر مغربیت کا بشدّت غلبہ تھا اس لئے امیر اللغات کے معاملے کو کسی طرح دل پر نہ لیا ——— انہوں نے مجبور ہو کے باوصف پیرانہ سالی و عوارض، بہار و بنگال کا ایک سفر ادر کیا۔ پٹنے میں مہدی حسن خاں شاد آب کے پاس ٹھیرے اور اُنہی کے توسط سے عمائدین بہار تک اپنی آواز پہنچائی مگر نہ وہاں دال گلی، نہ ڈھاکے یا مرشد آباد میں، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اِن میں سے کسی کی اتنی ہمت اور استطاعت تھی جو اتنے بڑے کام کا مالی بار اُٹھاتا ——— ناکام ہو کے یہ رام پور لوٹ آئے ——— اور گو اس پیرانہ سالی میں حیدر آباد جانا نہیں چاہتے تھے مگر امیر اللغات کی لگن نے ایسا کرنے پر بھی آمادہ کر دیا۔ اس اثنا میں جنرل اعظم الدین خاں مار ڈالے گئے اور نواب حامد علی خاں با اختیار رئیس بن گئے۔ اُن کو کسی طرح سے اس کی خبر مل گئی کہ حضرت حیدر آباد جانے کی تیاری کر رہے ہیں اور اُن سے اجازت لے کر جانا چاہتے ہیں۔ علم دوستی و معارف پروری کی خفتہ صلاحیتیں اُن میں ہنوز کما حقہٗ بیدار نہیں ہوئی تھیں جو بعد کو اُن کی حیاتِ رائیگاں کا روشن پہلو بنیں ——— کچھ یہ بھی تھا کہ ریاست کی مالی حالت اُس وقت اچھی نہ تھی، غرض نہ دفتر امیر اللغات کی سرپرستی کرنے پر راضی ہوئے نہ امیر مینائی رح کو جانے کی اجازت دی، امیر مینائی رح چاہتے تھے کہ کسی طرح خود اس موضوع پر ایک بار، اُن سے گفتگو کریں اور وہ ٹالتے تھے ——— آخرکار ایک دن انہوں نے پکڑ ہی لیا، اُنہوں نے صبر و سکون اور شائستگی سے اِن کی گفتگو سنی اور قائل ہو گئے ——— مگر شرط یہ کی کہ "میں ابھی سیاحتِ عالم پر جا رہا ہوں وہاں سے واپس آ جاؤں تو آپ جایئے" ——— انہوں نے دریافت کیا کہ "آپ کی عدم موجودگی میں انتظام کس کے سپرد رہے گا، ریجنسی کونسل کے یا کوئی سربراہ کار ہو گا" ——— غرض اِن کی یہ تھی کہ شاید امیر اللغات کے لئے کوئی ہمدرد پیدا ہو جائے، حامد علی خاں یہ سمجھے کہ یہ انتظام مملکت کے نقطہ نظر سے دریافت کر رہے ہیں، اُنہوں نے کہا "حضرت آپ تردّد نہ کریں، میں نے سب انتظام کر دیا ہے، نظم و نسق خوش اسلوبی سے چلے گا ——— حضرت نے جواب دیا کہ "نواب صاحب آپ کی موجودگی ہی میں کیا خاک انتظام تھا جو اب آپ کی غیر موجودگی میں بہتر ہو گا" ——— حامد علی خاں اُٹھنے لگے تھے یہ سن کر پھر بیٹھ گئے، اِن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "حضرت لگو بتو کرنے والے اور سرکار کے اقبال سے سب ٹھیک رہے گا" کہنے والے تو ہزاروں ہیں مگر یہ بات کہنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں، پہلے ہی میں اِس کا روادار نہ تھا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ اب تو کسی طرح آپ کو جانے نہ دوں گا بلکہ میرے واپس آنے پر امیر اللغات کے لئے کوئی مناسب انتظام یہیں کر دیا جائے گا" ——— اس ایک واقعے سے اُن کی صاف گوئی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، کتنا نازک وقت تھا، امیر اللغات کی ناؤ ڈگمگا رہی تھی، والئ ریاست نہ اِن کی جانب ملتفت تھا نہ اِن کے کام کی جانب، بہ ظاہر مصلحت اندیشی، تملّق کی خواستگار تھی، مگر انہوں نے سچی بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا ———

تعلّی ایک ایسی شاعرانہ کوتاہی ہے جو اُردو فارسی کے کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے، امیر مینائی کے کلام اور ان کے کوائف حیات میں مگر اس "جمالِ سرگرانی" کے بڑے نادر و دلپذیر نمونے ملتے ہیں، مرزا محمد تقی ہوس لکھنؤ کی بساطِ شاعری کا ایک بڑا "مہرہ تھے" جناب امیرؑ کی منقبت میں اِن کا ایک قصیدہ، خلد آشیان نے اُن سے یا کسی اور سے سُنا اور بہت پسند کیا اور بعد مغرب جو اجتماع ہوتا تھا اس میں بار بار مزے لے لے کر اُس کی بیتیں دہرائیں، اور بالآخر یہاں تک کہہ دیا کہ "اب منقبت میں ایسا قصیدہ کہنا، اور اِس زمین میں کسی کے بس کی بات نہیں"۔ امیر مینائی رح کو خدا جانے کس وجہ سے یہ بات بہت شاق گزری، اور دوسری شام کو جب سب جمع ہو چکے تو عرض کیا کہ ایک نیا قصیدہ لکھا ہے پیش کرنا چاہتا ہوں، خلد آشیاں نے پوچھا کہ قصیدے کا موضوع کیا ہے۔ کہا منقبت جناب امیرؑ ——— اور زمین وہی ہے جو مرزا محمد تقی ہوس کے قصیدے کی ہے۔ خلد آشیاں اور سارے حاضرین ہمہ تن گوش ہو کے سُننے بیٹھے۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

کیونکر نہ کروں ملکِ معانی کو میں تسخیر
خامہ ہے مرا دستِ یداللہ کی شمشیر

آئے جو تعلّی پہ مری ہمتِ عالی
دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر

سرکش مری نرمی سے کبھی بڑھ نہیں سکتے
لہرِ آب کی شعلے کے لئے بنتی ہے زنجیر

انصاف کی چھوٹے دمِ انشا نہ رعایت
پروانہ کروں میں قلمِ شمع سے تحریر

دل صاف زباں صاف سخن صاف ہے میرا
موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر

طائر اُتر آتے ہیں ٹھہر جاتی ہیں نہریں
داؤد صفت ہے وہ مرے لحن میں تاثیر

عکس آئینے میں میرے اشارے سے ہے گویا
لب میرے جو ہلتے ہیں تو بول اُٹھتی ہے تصویر

خضرِ رہ باطن ہے، مری غفلتِ ظاہر
یوسف کی زیارت ہے مرے خواب کی تعبیر

جو بات مرے منہ سے نکل جائے وہی ہو
گویا ہوں زبانِ قلمِ کاتبِ تقدیر

سُن سُن کے مجھے گرم طبیعت ہوئے شاعر
ذرّوں نے جو پائی ہے تو خورشید سے تنویر

کہتا ہوں وہ سُنتا ہوں جو استادِ ازل سے
ہوں صورتِ طوطی پسِ آئینہ تقدیر

وہ خسروِ اقلیمِ سخن ہوں کہ جہاں میں
شہرہ ہے مرا حکم کے مانند جہانگیر

تھے قبضۂ خسرو میں معانی کے جو کشور
سب میں نے کئے تیغ زباں کھینچ کے تسخیر

جب مصحفی و میر پئے تہنیت آئے
تھوڑی سی زمیں دی انہیں اس ملک میں جاگیر

بیچارہ ہوس کیا ہے کہے گا جو قصیدہ
ایسے تو بہت ہیں مرے گلشن میں عصافیر

البتہ مقابل ہیں مرے عرفی و فیضی
پر فرق ہے اتنا میں جواں طبع ہوں وہ پیر

لطفِ سخنِ تازہ کہاں اُن کے سخن میں
کہنہ ہوں دوائیں تو بدل جاتی ہے تاثیر

روکیں جو خلائق نہ رُکے میری طبیعت
پڑتی ہے بھلا پائے نگہ میں کوئی زنجیر

پیدا جو ہوا بعد میں سحبان کے تو کیا ہے
تقدیم کی مانع نہیں کچھ لفظ کی تاخیر

اس شعر پر خلد آشیان نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "حضرت جب میں نے دعویٰ کیا تھا کہ منقبت میں اب ایسا قصیدہ کہنا اور اسی زمین میں کسی کے بس کی بات نہیں تو آپ کو مستثنےٰ کر دیا تھا ——— آپ تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں"۔

ایک مرتبہ خلد آشیان نے طرحی مشاعرہ کیا، ——— دنیائے حسن و عشق کو رنج و محن ہوا، امیر مینائی نے جو غزل کہی تھی وہ مشاعرے سے پہلے خلد آشیان کے ایما پر ان کو سنائی، اُن کو پسند نہ آئی تو کہا کہ "حضرت معلوم ہوتا ہے اس غزل کے لکھنے میں آپ کا جی نہیں لگا ——— مشاعرے میں تقریباً مہینہ بھر باقی تھا، حضرت نے روزانہ ایک غزل اُس زمین میں کہہ کر نواب صاحب کو سنانے کا معمول کر لیا، اکیسویں روز جب یہ مطلع پڑھا۔

جس غنچۂ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا
جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا، چمن ہوا

تو خلد آشیاں نے کہا "حضرت ہم غریبوں کے لئے بھی تو کچھ کہنے کو چھوڑ دیجئے" حضرت مسکرائے اور سلسلہ ترک کر دیا، مگر بعد کو ریاض کے استفسار پر کہا کہ ——— "بخدا اگر نواب نہ روک دیتے تو مشاعرے کے روز تک اسی طرح غزلیں کہتا رہتا" ———

اُن کی شاعری محض بتقاضائے زمانہ تھی، جوہر کامل رکھتے تھے جس فن کو لیا پانی کر دیا، اُس عہد میں شعر کہنا شرفا کا شعار اور وقار تھا۔

اُنہوں نے بھی اس کو اختیار کیا اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے کسی سے دب کے نہ رہے، داغؔ کی شعلہ بیانی مسلّم جلالؔ کی تحقیق و تلاش سرآنکھوں پر مگر امیرمینائی رح نہ شعلہ بیانی میں کسی سے کمتر نہ تحقیق و تلاش میں کسی کے دبیل، اور پھر جس صنفِ سخن کو چھوا، اپنے عہد کے اعتبار سے اُس کو ممتاز و مفتخر کر دیا ان کے سے قصائد نہ داغ کے دیوان میں ملتے ہیں نہ جلال کے کلیات میں اور نعت گوئی کا امتیاز اس کے ماسوا ——— ہے کوئی ان کا سا کامیاب و مقبول قادر الکلام اُن کے عہد میں ——— جلال و داغ کے لئے صرف اُن کی شاعری اُن کی ناموری کا سرمایہ تھی، امیر مینائی رح سے شاعری کا طرۂ امتیاز چھین لیا جائے تو بھی وہ نامور رہیں گے۔

اُن کے ذوق و استعداد مکتوب نگاری سے اُن کے دو فاضل شاگردوں، ثاقب گوالیاری اور راز مبطوری کی سعادت مندانہ ریاضت و محنت کے طفیل، اہلِ ذوق اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ مگر یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرزمین لکھنؤ کا یہ نامور سخنور تذکرہ نویسی کا بھی ایک تابناک ستارہ ہے، اور جیسے میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء فارسی زبان میں اُردو شعراء کے متعلق پہلی مستند تصنیف ہے امیر مینائی رح کا تذکرہ انتخاب یادگار غالباً بزبان اُردو، شعراء کا ایسا پہلا تذکرہ ہے جس کو مشاہیر اردو شعراء کے منجملہ ایک فرد فرید نے خود مرتب کیا ہو۔ اس تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی، فارسی، اُردو اور بھاشا، چاروں زبانوں کے سخنوروں کا حال درج ہے۔

اُنہوں نے ماہ اکتوبر ۱۹۰۰ء (۷۳) سال کی عمر میں وفات پائی اس طرح سن کے لحاظ سے وہ عمرِ طبعی کو پہنچ کر مرے، مگر دکن پہنچتے ہی بیمار ہو جانے اور پھر باوجود ہزار علاج ایک مہینے میں وفات پا جانے سے اُن کے انتقال کے بارے میں بہت سے لوگ آج تک خلجان میں مبتلا ہیں۔ یہ خلجان بے جا ہے اور اُن کی موت اُن کی عمر کی طرح بالکل طبعی تھی بایں ہمہ بعض مسائل اور ضرورتوں کے اعتبار سے اُن کی جگہ آج تک خالی ہے، اُردو زبان و ادب کے سدا بہار چمن میں، جہاں لالہ و گل کی رنگینیاں اور طوطی و بلبل کی زمزمہ آفرینیاں دھیمی نہیں پڑتیں، گلچیں و صیاد تو بہت سے آتے جاتے رہتے ہیں، والا نظر باغبانوں کا مگر ہمیشہ توڑا رہا ہے، چمن سے آسودگی گوشِ نظر آسان ہے، لیکن چمن کی آبیاری آسان نہیں، چمن کو سینچنے کے لئے خونِ دل صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے جو فکر و شعور، علم و فضل کی کسوٹی پر پورے کامل عیار نہ نکلیں اُن کی کاوش سے شجرِ اُردو کا پروان چڑھنا معلوم ———

امیر مینائی رح، اپنے عہد کے افاضل میں تھے، زبان دانی اُن کی میراث تھی، علم و فضل اُن کا سرمایہ، اور ان دونوں کے امتزاجِ صحیح نے اُن کی پاکیزہ ہستی میں زبانِ اُردو کی لغت تیار کرنے کے لئے سب سے موزوں اور متدین محقق کو پالیا تھا۔ متدین کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے، امیر مینائی رح نے امیر اللغات میں اُردو کے تمام اساتذہ کے کلام سے سندیں شعر دئے، مگر اپنا ایک شعر بھی پیش نہیں کیا، حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اُن سے ایک بار دریافت کیا کہ "منشی صاحب، جب آپ نے داغ و جلال، منیر و تسلیم کے اشعار سے سند لی ہے تو اپنے اشعار سے استناد میں کیا قباحت تھی، اُستادی اور استناد میں تو آپ کا پلّہ ان سب پر بھاری ہے، حضرت نے فرمایا کہ" ایسا کرنے میں کبر کا پہلو پیدا ہوتا تھا، اور میری اپنی دانست میں یہ بات تقاضائے دیانت کے بھی خلاف تھی، کہ میں خود ہی ایک لفظ کے معنی و محلِ استعمال کی صراحت کروں اور خود اپنے ہی شعر یا مصرعے سے اس کا ثبوت بہم پہنچاؤں" ———

مجھ سا ہیچمدان، پھر اُن کی اولاد، قدرتی طور پر مجھ کو یہ بات کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے، لیکن دیانت کے ساتھ جو رائے قائم ہو اس کو بیباکی سے بیان نہ کرنا بھی حق گوئی کی توہین ہے، میری دانست میں اُن کے بعد سے اب تک، زبانِ اُردو کو، اُن سے اچھا کیا اُن سا یگانۂ عصر بھی، لغت کے کام کے لئے نہیں ملا اور یہی باعث ہے کہ میں اُن کی وفات اور ان کے سن، دونوں کو طبعی مانتے ہوئے فطری ہی نہیں ادبی نقطۂ نظر سے بھی اب تک اُن کا ماتم گسار ہوں، لغت کے شعبے میں اُردو زبان، فرہنگ آصفیہ، نور اللغات، اور انجمن ترقی اُردو کی ڈکشنری کی موجودگی کے باعث تہی مایہ نہ سہی، مگر اُس کی کم مایگی میں کس صاحب نظر کو کلام ہو سکتا ہے، گزری ہوئی آدھی صدی میں اُردو زبان و ادب کا دامن مخلص

اور لائق مشاہیر کے گل ہائے وجود سے مالا مال رہا ہے، محقق، شاعر، ادیب، سبھی اِس آسمان پر جلوہ گر ہوئے، شبلیؒ، نذیر احمدؒ، نظم طباطبائی جیسے اہلِ علم و تحقیق، حالی، اکبر، اقبال، چکبست، اصغر، فانی، ریاض، جگر، جلیل، سیماب سے خوش بیان شعرا، آزاد، مہدی الافادی، شرر، عبدالماجد، سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ابوالاعلیٰ مودودی، جیسے ادیب، کون سی زبان اور کون سا ادب ہے جو ان پر فخر نہ کرے، اور پھر ان سب کے اخیر میں لیکن اردو کی خدمت کی لگن میں سب سے اوّل بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ———— جن کے بارِ اکرام و احسان سے اردو سر نہیں اُٹھا سکتی ———— مگر ان میں سے کس نے تالیفِ لغت اردو کے سنگ گران کو چھونے کی جرأت کی، فی الحقیقت لغت کے کام کو سمیٹنے کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے، کوہ وقار عزم و استقلال، بحر آشام جذبۂ تحقیق و تجسس، بے پناہ تبحرِ علمی، بالغ نظرا صابت فکر

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے لغت داں

امیر مینائیؒ میں یہ خصوصیات بڑی حد تک یکجا تھیں، اردو، فارسی، عربی، بھاشا، سنسکرت، ان زبانوں کے وہ عالم تھے، نجوم، رمل اور جفر ———— عروض، موسیقی ———— فقہ و قانون کے وہ ماہر تھے، رمز الغیب، رموز غیبیہ اُنہی کی تصانیف ہیں، ست سیّہ بہاری کی شرح کے مصنف وہی ہیں اور واجد علی شاہ کی تصنیف نغمۂ قدسی پر شرح سوت المبارک کے نام سے ہوا سی اُنہی کے لکھے ہوئے ہیں، فلسفہ، حکمت، طب، اِن علوم کی اُنہوں نے تکمیل کی تھی، تفسیر حدیث اور تصوّف کے بحرِ زخّار میں اُن کا مقام شناوری مسلمہ ہے، اُن کے بعد اُن جیسا جامع کمالات مشاہیر اردو کی صف میں ڈھونڈے نہیں ملتا، اِس لحاظ سے اردو کے بہی خواہ اُن کی وفات کو بے وقت کہیں تو بے جا نہیں، امیر اللغات کا جس قدر کام انہوں نے پورا کر لیا تھا اُس میں سے صرف ایک جزو دو جلدوں کی شکل میں شائع ہوا ہے مگر ؏

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اہلِ نظر اُس سے مؤلف و مصنف کے مرتبہ و مقام کو پہچان سکتے ہیں۔ امیر اللغات کے بعد سے کوئی لغت اُس پیمانے اور اُس معیار کا اب تک تیار نہ ہو سکا، اور سچ پوچھئے تو یہ کام اکیلے شخص کے بس کا ہے بھی نہیں، خود امیر مینائیؒ کے زمانے میں باقاعدہ طور پر دفتر امیر اللغات قائم تھا اور ایک ادارے کی صورت میں وہاں کام ہوتا تھا، آوارہ، جلیل، شوق قدوائی، یہ تو مشہور نام ہیں اِن کے سوا بھی ایک خاصہ بڑا عملہ اس پر کام کرتا تھا۔ پھر بھی نہ کام کی مقدار حسب دلخواہ ہوئی نہ کام کا معیار، بس امیر مینائیؒ کی تنہا ذات تھی جس کے تبحرِ علمی اور پاکیزہ نفسی کے بل بوتے پر اور سچی بات یہ ہے کہ ریاست رام پور کی معارف پروری سے یہ ناؤ اتنی مدت تک چلی، خلد آشیاں کے مرتے ہی ڈگمگانے لگی اور امیر مینائیؒ کے پردہ کرتے ہی ڈوب گئی ؏

"خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود"

میری رائے میں امیر اللغات اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جس کی آب و تاب کو ناتمامی کا داغ اور نصف صدی کی ترقیاں بھی ماند نہیں کر سکیں۔ اِسی لئے میں نے اُس کے بیان کو اُن کے تذکرے میں زیادہ جگہ دی ہے۔

———— ————

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

مولوی محمد اسلم سیفی

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا زمانۂ حیات ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء تا یکم نومبر ۱۹۱۷ء تھا۔ عمر عیسوی حساب سے ۷۳ اور ہجری حساب سے ۷۵ سال ہوئی۔

اُن کی پیدائش شہر میرٹھ میں ہوئی جہاں ان کے والد نے جولائی ۱۸۲۷ء میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ محلہ مشائخاں کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام اسمٰعیل نگر ہے۔ یہ نام کی تبدیلی شہری بورڈ کی طرف سے عمل میں آئی ہے۔

جب مولانا کا خاندان قصبہ لاوڑ سے یہاں آ کر آباد ہوا تو میرٹھ کی آبادی آج کل کے مقابلہ میں ایک چوتھائی تھی۔ اکثر عزیز و اقارب اور اہل برادری اسی محلہ میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک اوسط درجہ کا خاندان تھا جس کے پاس کچھ زمینداری بھی تھی۔ اس زمانہ کے لوگ جب کہ انگریزوں کے تسلط کو ۴۲ سال گزر چکے تھے خاموش زندگی کے عادی تھے۔ پرانے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم مکاتب میں ہوا کرتی تھی۔ اسمٰعیل کے بڑے بھائی تو ایک ریاست کے منیجر تھے اور بقیہ درس و تدریس کا شغل رکھتے تھے۔ ابتدائی کتابیں ان سے پڑھ کر مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں جا داخل ہوئے۔ ان کے والد بہت خاموش اور کم آمیز بزرگ تھے اور اپنے تئیں شہری ماحول میں اجنبی تصور کرتے تھے ——— بچپن کے ماحول کا اور اس وقت کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں لگتا مگر تا اسمٰعیل کی یہ مخصوص صفت دیکھنے میں آئی ہے کہ جو کام کرتے تھے اس پہ کامل توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ فن خطاطی ایک استادِ کامل سے سیکھا اور خود بھی اس میں کمال حاصل کیا۔ مرزا رحیم بیگ فارسی کے مسلّم استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا کو بھی فارسی زبان میں دلچسپی انہی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ اُن کے فارسی کلام کی خوبی ان نظموں سے ظاہر ہوتی ہے جو کلیاتِ اسماعیل میں درج ہیں۔ مثلاً مثنوی دورِ آخر اور بہت سی فارسی نظمیں جن میں غزلیں قصائد اور قطعات ہیں۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ناگہاں غدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی ابتدا میرٹھ ہی سے ہوئی۔ اس وقت اسماعیل کی عمر ۱۴ سال تھی۔ اس ہنگامہ کی اہمیت کو کچھ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ برسوں اس کے اثرات کا تذکرہ زبان زدِ خاص و عام رہا۔ اسی زمانہ میں نارمل اسکول میرٹھ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں پرائیویٹ طالب علم بن کر ایک سال تعلیم پائی۔ چند شفیق اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ خاص کر علم ہندسہ کے استاد سے۔

جو حالت میں نے مشاہدہ کی اس وقت مولانا کی عمر ۶۴ سال کی تھی۔ ایک نہایت متین اور خاموش بزرگ شخص معلوم ہوتے تھے۔ گھر میں کتنا ہی بچے شور و غل مچائیں، خواہ عزیز و اقارب مرد اور عورتیں جمع ہو جائیں اور پوری بلند آوازی سے بات چیت ہوتی ہو مگر وہ منہ کے نیچے ہاتھ رکھے

ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کچھ سوچتے رہتے۔ یہی حالت آگرے کے قیام میں ۱۸۸۰ء سے دسمبر ۱۸۹۹ء تک مشاہدہ میں آئی۔ عمائد و اکابر سے ملاقات کے شائق نہ تھے۔ کسی موقع پر ملاقات ہو جائے تو ہو جائے۔ کبھی مشاعرہ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اس بارہ سال کے زمانے میں اور اس کے بعد کا زمانہ ۱۸ سال کا زمانہ جو پنشن کے بعد کا میرٹھ میں گزرا وہ زندگی بھی نہایت خاموش تھی۔ جب لوگ ان کو کسی پبلک میٹنگ کی شرکت کے واسطے دعوت دیتے مثلاً فیض عام اسکول کے واسطے کوشش یا اور طریقے کی شرکت تو وہ شرکت فرما لیتے۔ مگر جو کام کرتے نہایت اخلاص کے ساتھ کرتے۔ شہرت اور ناموری کے پاس نہیں جاتے تھے۔ آثار سلف اس قدر بلند پایہ نظم ہے مگر وہ لکھ کر بھی ان کے بستے کی زینت رہی۔ یہ وہی نظم ہے کہ جس کے شائع ہونے پر سینکڑوں خطوط اطراف ہند سے ان کے نام آگرے کے قیام میں آئے تھے۔

کچھ رسالے فارسی زبان کے مدارس کے طلبہ کے واسطے لکھے تھے۔ ایک سرکاری اشتہار کی تعمیل میں ایک اخلاقی قصہ طلسم اخلاق کے نام سے لکھ کر پیش کیا۔ اس پر دو سو روپیہ انعام ملا۔ اُن کا ایک خاص طرز تحریر ہے کہ مضمون نثر میں کچھ اشعار بھی حسب موقع لکھ دیتے ہیں۔ یہ بات اور تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ذاتی اخلاق ایسا تھا کہ جو ملتا تھا وہ گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ملنے والوں کا یہ حال تھا کہ ان سے جاہ و مرتبہ، دولت و ثروت میں کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں ان کے ساتھ ادب سے پیش آتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حال تو یہ ہوتا تھا کہ پروانوں کی طرح ان کی خدمت پر دوڑتے تھے۔ میں نے ایک بار دیکھا کہ جب وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو یک بیک ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہو گئے اور جب تک مولانا نے بات چیت کی (حالانکہ وہ بہت مختصر تھی) ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہی رہے۔ ایک ہیڈ ماسٹر ترقی کر کے انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے اور میرٹھ ہی آگئے۔ اکثر ملنے کے واسطے آتے تھے۔ اور اصناف نظم پر اُن سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

میرے دیکھنے میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ انہوں نے کسی سے جھگڑا اٹھایا ہو۔ ایک بار ان کے آگرے کے ایک ہم عصر پنڈت سنیں دھر کے لڑکے نے ان پر اس بات کا دعویٰ کر دیا کہ ان کی مشہور اردو زبان کی قواعد کی تصنیف میں پنڈت جی بھی شریک تھے اور یہ مقدمہ میرٹھ کی عدالت میں ہوا۔ بالآخر فیصلہ مولانا کے حق میں ہوا۔ اگرچہ وہ بڑے نقاد تھے مگر مضمون نویسی پسند نہیں کرتے تھے کہ اس کی بنا پر بحث کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی زندگی پر سب سے بڑا اثر ان کے پیر و مرشد مولانا غوث علی شاہ قلندر قادری قدس سرہ العزیز کی ذات بابرکات تھی۔ ۱۸۶۹ء یا ۱۸۷۰ء میں وہ ملاقات سے مشرف ہوئے اور دس سال تک مستفید ہوتے رہے۔ شیخ کے اشارہ پر ہم رباعیاں لکھیں۔ شیخ کے وصال پر ترکیب بند اردو میں اور مثنوی دور آخر فارسی میں لکھی۔ چند اور فارسی کے قطعے بھی اسی سلسلہ میں لکھے۔ شیخ کے وصال کے بعد جب تذکرۂ غوثیہ کی تدوین کا خیال مولانا شاہ گل حسین رحمتہ اللہ علیہ کو ہوا تو اس کتاب کو جامۂ زبان پہنایا۔ یہ ان کی نثر کا پہلا اور نہایت دل فریب نمونہ ہے۔

غزل گوئی میں پند و حکمت و فلسفہ کے مضامین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہی امتیاز ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ وہ قوم کی پست حالت دیکھ کر بہت متاثر تھے۔ اپنی نظموں میں جابجا یہ مضمون بہت زور شور کے ساتھ لاتے ہیں۔ سرسید کے ہم نوا تھے ایک نظم جس کی سرخی "سرسید" ہے ۱۸۹۰ء میں لکھی اور دوسری بانگ درا اور تفسیری مسلمان اور انگریزی تعلیم ہے۔ یہ سب نظمیں کلیات میں ہیں۔ مولانا کی زندگی پر تصوف کا رنگ آخر وقت تک غالب رہا۔

کچھ پتہ نہ لگا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ کس طرح حاصل ہوا۔ مگر خود اس کا نہ صرف اقبال کیا بلکہ استاد کی زمین میں کافی غزلیں لکھیں اور ان کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔

اہل و عیال اور دیرینہ احباب کے ساتھ عمدہ سلوک کرتے تھے اور مالی امداد بھی در پردہ کیا کرتے تھے۔ غصہ کا اظہار یا تیز کلامی کبھی نہیں کرتے تھے۔ اگر بہت ناراض ہوئے تو کلام کرنا ترک کر دیتے تھے۔ بہت سے مسودے ان کے میرے پاس ہیں۔ جن میں ایک میر تقی میر کی کلیات کا انتخاب ہے۔ اور اسی طرح اپنے مشہور استاد کے کلام کا بھی۔

بس ان کے نقوش میں سب سے بڑا نقش یہی تھا کہ وہ ہر وقت کام کرتے رہتے تھے اور کبھی دعویٰ استادی نہیں کیا۔

غزل گو شعراء اگر اصلاح لینے کے واسطے آتے تو انکار کر دیتے۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ مولانا ندرت میرٹھی جو اس زمانہ میں مرتبۂ استادی رکھتے تھے، خاص کر صنفِ غزل کہتے ہیں، ایک بار مولانا کی خدمت میں آئے اور فنِ سخن میں مشورہ چاہا۔ انہوں نے انکار کیا مگر ندرت کے اصرار پر پھر کہا کہ اچھا پہلے جینس کا سراپا لکھ کر لاؤ پھر بتائیں گے۔ یہ قصہ مولانا ندرت نے خود مجھے سنایا۔ نہ سراپا لکھا گیا نہ کبھی مشورۂ سخن ہوا۔ ان کا طنز ان کے قصیدۂ جریدۂ عبرت سے ضرب خاص ظاہر ہوتا ہے۔ مگر دوسرے اشعار میں بھی نمودار ہے۔ وہ شاید اپنے ہم عصروں میں بلحاظ نفع بھی بہت کامیاب رہے ——— یعنی کسی استاد کو اپنے کلام کی اشاعت سے اتنی منفعت حاصل نہیں ہوتی جتنی انہیں۔ مگر جب وہ دولت مند ہو گئے تھے آخر وقت تک کبھی بھی اپنی وضع نہیں بدلی۔

نقاش سے ممکن ہے کہ ہو نقش نمایاں — ہیں نقش ہی جلوۂ گرامی کے اوصاف
ہر شے میں عیاں ہے اوصاف وحدت — گر وہم دوئی نہ ہو تو ہے مطلع صاف

اس عقیدہ کو بار بار اور طرح طرح سے ظاہر کیا ہے اور عمل کی ترغیب دی ہے۔ خود اس پر کاربند تھے۔

جس درجہ ہو مشکلات کی طغیانی — ہو اہلِ ہمم کو اور بھی آسانی
تیراک اپنا ہنر دکھاتا ہے خوب — ہوتا ہے جب اس سر سے اونچا پانی

سنہ ۱۹۱۰ء کے شروع میں نواب اسد اللہ خاں رئیس میرٹھ کی کوٹھی پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ سوال یہ تھا کہ نوچندی کے موقع پر نواب وقار الملک کو میرٹھ آنے کی دعوت دی جائے تاکہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے اس موقع پر چندہ فراہم ہو سکے۔ ایک بزرگ سادہ ملبوس میں سر پر ترکی ٹوپی، عمر ۶۰ سال قدرے ضعیف معلوم ہوتے تھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ کل حاضرین تعظیم کے واسطے کھڑے ہو گئے۔ جلسہ میں تجویز پیش ہوئی کہ تمام سربرآوردہ حضرات اس موقع پر یونیورسٹی کا وفد بلانا مناسب نہیں خیال کرتے۔ اس پر ان بزرگ نے ذرا تیز لہجہ میں جواب دیا کہ تمام معززینِ شہر کی خواہش ہے کہ یہی موقع موزوں ہے۔ اس پر سربرآوردہ حضرات خاموش رہ گئے اور یہی رائے پسندِ خاطر رہی۔ یہ مولانا اسمٰعیل تھے۔

انہوں نے ۳۰ سال کی ریسرچ کے بعد جو نصاب اردو طلبہ کے واسطے مرتب کیا تھا وہ آج تک مقبولِ خاص و عام ہے۔ اسی لئے ان کا نام اب تک روشن ہے۔ یہ ادبی خدمت ان کی یاد کو تازہ رکھے گی۔

سر تیج بہادر سپرو

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

بیسویں صدی کے آغاز میں الہ آباد متحدہ ہندوستان کی زمین پر ایک آسمان بنا ہوا تھا۔ متعدد ممتاز ہستیاں مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے درخشندہ ستارہ بن کر چمک رہی تھیں۔ پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ وائی چنتامنی، اکبر کی شہرت سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا۔ وکالت، سیاست، صحافت، ادب چاروں عناصر یہاں کے عوام و خواص کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھے اور یہ منفرد ہستیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سارا ملک ان کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پنڈت مدن موہن مالوی تمام تر سیاسی و سماجی نہضت کا مرجع سمجھے جاتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اول تو اپنی وکالت کی وجہ سے مشہور ہوئے اور پھر بعد میں سیاسی رہنما بن کر سامنے آئے۔ سی۔ وائی چنتامنی بحیثیت صحافی کے بے نظیر دل و دماغ کے مالک سمجھے گئے۔ اکبر اپنی مزاحیہ شاعری کا سہارا لے کر دلوں سے خراج تحسین وصول کرنے لگے۔ سر تیج بہادر سپرو نے میدان سیاست میں کم عدالت میں زیادہ نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں وہ وائسرائے کے یہاں مشیر قانون بنائے گئے۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ اقتدار ایک ہندوستانی کے لئے معراج سے کم نہ تھا۔ مگر اس عہدہ پر وہ زیادہ دن تک نہ رہ سکے۔ مختلف وجوہ سے ڈیڑھ سال کے بعد اسے بھی ترک کر کے پھر الہ آباد ہائیکورٹ میں وکالت شروع کی۔

تیج بہادر سپرو اسی شہر کے باشندے تھے جہاں مولوی نذیر احمد پیدا ہوئے تھے۔ بجنور سے آکر ۱۸۹۵ء میں انہوں نے الہ آباد میں قیام کیا اور یہ سرزمین ایسی پسند آئی کہ مرتے مرتے اس کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا یہاں تک ۱۹۴۹ء میں یہیں انتقال ہوا۔

کشمیری پنڈت یوں بھی ترقی یافتہ تہذیب کے گرویدہ ہوتے ہیں لیکن تیج بہادر سپرو میں اس کا لگاؤ عشق کے درجہ تک تھا۔ وہ مسلمانوں کی طرز معاشرت، نشست و برخاست، زبان و تاریخ سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اسلامی تہذیب کا مرقع تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک باورچی مسلمان ضرور رہتا اور وہ عموماً وہی چیزیں اپنے دسترخوان پر دیکھنا چاہتے تھے جو نوابین یا مسلمان رؤساء کے یہاں ہوتی تھیں۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ اردو زبان سے بے پایاں محبت کرتے تھے۔ یہ شغف اتنا زیادہ تھا کہ وہ اردو کی کسی برائی کو سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ اتنی شستہ اور پاکیزہ اردو بولتے تھے کہ میں نے کم لوگوں کو اس زمانہ میں اتنی اچھی اردو بولتے سنا ہے۔ شام کو روزمرہ ان کے یہاں دربار ہوتا تھا اس میں تمام خاص لوگ شریک ہوتے تھے اس جلسہ میں عموماً اردو الفاظ، محاورات، شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تھی ان کی رائے اور سوجھ بوجھ ہمیشہ قابل احترام ہوتی تھی۔

اردو کے مشہور شعراء جو بھی الہ آباد آتے وہ ایک وقت تیج بہادر کے مہمان ضرور ہوتے تھے اور وہ کلام سن کر جو داد دیتے تھے اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نکاتِ شاعری سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ پورے انہماک و یکسوئی سے شاعر و شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کسی شاعر پر اعتراض بھی کرتے تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ، چونکہ خود ان کا اندازِ گفتگو نہایت دلکش تھا اس لئے سخت سے سخت اعتراض بھی لہجہ کے لحاظ سے ناگوار نہ ہوتا۔

اردو سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو علاوہ اور اطباء کے ایک وید صاحب بنارس سے علاج کے لئے بلائے گئے۔ معالج نے سخت ہندی میں ان سے گفتگو شروع کی۔ سپرو کو یہ زبان سوہانِ روح معلوم ہوئی، نہایت بیباکی کے ساتھ کہہ دیا کہ نہ میں آپ کی زبان سمجھتا ہوں نہ آپ میری زبان سمجھ سکیں گے، آپ تشریف لے جائیے چنانچہ وید صاحب کو مجبوراً واپس جانا پڑا۔ ممکن تھا کہ ان کے علاج سے فائدہ ہوتا مگر زبان کی تلخی سے زیادہ ان کو کوئی مرض بھی تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔ انہوں نے مرنا گوارا کیا مگر محض زبان کی اجنبیت نہ گوارا کی۔ انہوں نے اردو سے اپنی محبت کا اظہار ایک انجمن کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا تھا چنانچہ ایک ادارہ کی بنیاد 'انجمن روحِ ادب' کے نام سے قائم کی، اس کے واسطے روپیہ بھی فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی مدت میں چالیس پچاس ہزار کی رقم جمع بھی کر لی تھی جو آج تک بنک میں اسی انجمن کے نام سے جمع ہے مگر حالات کچھ ایسے ناسازگار ہوئے کہ یہ انجمن وہ صورت نہ اختیار کر سکی جس کی ان کو تمنا تھی۔

ہندوستان میں کم ہی لوگ ان کی قانونی قابلیت کے ہم پلہ سوچے جا سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے جتنا روپیہ کمایا کم ہی وکلاء نے اتنا کمایا ہوگا مگر ان کا خرچ اتنا شاہانہ تھا کہ مرنے کے بعد کوئی قابلِ ذکر رقم نہ چھوڑ سکے۔ اس طرح میں دوسروں سے سلوک کرنے کی بھی مد تھی اور یہ سلوک بغیر کسی مذہب و ملت کے امتیاز کے تھا۔ میرے ایک کرم فرما قاضی مسعود حسین صاحب ایڈووکیٹ جو اب بھی الہ آباد ہائیکورٹ کی نمایاں شخصیتوں میں ہیں وہ تیج بہادر سپرو کے نہایت ممتاز لوگوں میں سے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مخیّر تو اور لوگ بھی دیکھے سنے گئے ہیں مگر تیج بہادر سپرو کی یہ خصوصیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی کہ وہ سلوک کرکے اس لئے بے حد پریشان رہتے تھے کہ کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہو جائے، یہ وہ شریفانہ جذبہ ہے جس کی قدر ہر شریف آدمی کرتا ہے۔

تیج بہادر سپرو کی شہرت قابلیت کے علاوہ دیانت داری کی وجہ سے بھی تھی۔ مثال کے لئے اس وقت کو یاد کرنا پڑتا ہے کہ جب وہ الہ آباد میں پہلے پہل وکالت کے لئے آئے تو ان کا کہنا تھا کہ سات سال تک مجھے ہائیکورٹ میں کوئی مقدمہ نہیں ملا اس لئے کہ دلالوں کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ باوجود اس کے کہ میری مالی دشواریاں بڑھتی جاتی تھیں مگر میں نے کبھی ایمانداری اور وکالت کی سطح کو نیچے نہیں ہونے دیا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو اور عملی زندگی بھی ہر شخص کو یہ محسوس کرنے پر مجبور کرتی تھی کہ وہ نہایت ایماندار اور بااصول آدمی ہیں۔

تیج بہادر سپرو نہایت حساس اور نازک مزاج آدمی تھے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ ان کا مزاج شاہانہ ہے وہ ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں تو عمر بھر ناراض رہتے ہیں اور ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے تو ہر ممکن کوشش کے لئے ان کو آمادہ سمجھئے۔ باوجود احباب پرستی و دربارداری کے وہ اپنے مطالعہ میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمیشہ کوٹھی کے برآمدے میں سوتے تھے۔ وہیں چار بجے صبح بیڈ پر اخبار آ جاتا تھا اور وہ پڑھنا شروع کر دیتے تھے پھر قانونی کتابوں اور کاغذات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ہائیکورٹ کا وقت آ جاتا تھا۔ وہاں کی بحث و مباحثہ سے فراغت کے بعد گھر آکر ناشتہ وغیرہ کرکے ادبی و علمی کتابوں سے دن بھر کی کوفت دور کرنے کی کوشش کرتے۔ لوگ آتے رہتے وہ ملتے رہتے باتیں کرتے رہتے اور موقع ملتا تو پھر کتاب زیرِ نظر کا مطالعہ شروع ہو جاتا اکثر ایسا ہوتا کہ روزمرہ آنے والوں کو بھی کتابیں اٹھا کر دے دیتے کہ پڑھئے دیکھئے کتنی اچھی کتابیں ہیں۔ اس طرح صحبت کو بغیر بے لطف کئے ہوئے خود بھی مطالعہ کرتے اور بات کرنے والوں کو بھی چپ کرا دیتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی تھی صحت خراب ہوتی جاتی تھی مگر باوجود علالت کے بھی مزاج کی شگفتگی کبھی نہ گئی۔ کبھی کبھی دوست احباب ان کو رائے دیتے کہ حضور آپ کچھ ورزش کیا کیجئے تاکہ صحت قائم رہے تو ہنس کر جواب دیتے کہ "اللہ نے مجھے ہر طرح کی عافیت دی ہے میں اپنے پر ایک قید ورزش کرنے کی کیوں بڑھا لوں۔ خواہ مخواہ کی یہ زحمت اختیار کروں کون سی عقلمندی ہے۔ رہا صحت قائم رہنے کا سوال سو وہ خود ہی قائم رہے گی۔ خدا داد چیز ہے خدا خود اس کی

حفاظت کرے گا۔"

تیج بہادر سپرو علامہ اقبال کے خاص طور سے معتقد تھے، ان کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے جب کبھی لاہور جاتے تو اقبال سے ضرور ملتے، وہاں سے آ کر ان کی باتیں بڑی دلچسپی لے کر بیان کرتے، کہتے تھے کہ سچ پوچھو تو ہم اور اقبال ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ وہ اصلاً کشمیری اور میں بھی، اور حسنِ اتفاق سے نسل کے لحاظ سے اقبال بھی سپرو ہیں اس لیے سمجھنا یہ چاہئے کہ ہم اور وہ ایک ہی ہیں مذہب نے جدا کر دیا ہے مگر میرے نزدیک اس خون کے رشتہ کو کوئی مذہب دور نہیں کر سکتا۔

تیج بہادر عرصۂ دراز تک بیمار رہنے کے بعد جنوری ۱۹۴۹ء کو ۷۲ سال کی عمر میں الہ آباد کیا دنیا کو چھوڑ گئے۔ اولاد کے لحاظ سے بھی وہ خوش قسمت رہے دو لڑکیاں اور تین لڑکے ان کی اولاد کی فہرست مکمل کر دیتے ہیں۔ اولاد ذکور بھی قابلِ قدر ہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے پرکاش نرائن صاحب سپرو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج تھے، دوسرے لڑکے انند نرائن صاحب سپرو آئی۔ سی۔ ایس ہیں اور ترجوگی نرائن صاحب سپرو الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں لیکن باوجود قابلیت و کامیابی کے تیج بہادر سپرو کا کوئی نظیر نہ ہو سکا۔ سچ ہے ؎

کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

لالہ سری رام دہلوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

لالہ سری رام دہلوی، رائے بہادر مدن گوپال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا کے فرزند اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے بھتیجے تھے۔ آپ دہلی میں ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور دونوں مقامات پر ہوئی۔ ۱۸۹۰ء کے بعد سے تعلیم دہلی اور لاہور دونوں مقامات پر ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور جلد ہی آپ کا منصف کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ شعر و ادب کا شوق دامن گیر تھا۔ اور مخزن میں ... انور کا دیوان زمانہ طالب علمی میں شائع کر چکے تھے۔ داغ دہلوی کے دیوان مہتاب داغ کے ... غیر مرتب اشعار کو یادگار کے ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے شائع کیا۔ مرزا محمد تقی بیگ مائل اور بہاری لال مشتاق ... کے دو دواوین مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن فرشتۂ اجل نے مہلت نہ دی۔ کتابوں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں عربی فارسی اردو اور ہندی کی ہزارہا نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع تھیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں مخطوطات، پانچ سو قطعات ... درجنوں نمونے اور لاتعداد فرمان و شاہی دستاویزات۔ ان کی وفات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کو بطور میراث دے دئے گئے۔ تعصب یا بغض و عناد کی ہوا انہیں چھو تک نہ گئی تھی۔ نئے شاعروں کی ... ان کی مایۂ ناز تصنیف خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو جب ان کی موت ہوئی تو وہ اس کی چار جلدیں شائع کر چکے تھے۔ پانچویں جلد علامہ کیفی نے ان کی وفات کے بعد شائع کی ... چھٹی جلد ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہو گئی۔

میرے مراسم لالہ سری رام سے نہایت دیرینہ تھے۔ عرصہ تیس سال تک میں ان کی صحبت سے فیض یاب رہا۔ ۱۹۲۳ء میں بڑودہ کے مہاراجہ ہز ہائنس سیاجی راؤ گائکواڑ نے ... بطور پرائیویٹ سکریٹری کے میری خدمات تفویض کی تھیں۔ مہاراجہ صاحب بنارس یونیورسٹی کے سابقہ چانسلر تھے۔ جلسۂ تقسیم اسناد ... وہ بنارس گئے ... Gout کا عارضہ انہیں پیدا ہو گیا تھا۔ وہاں

اس کا دورہ پڑا۔ حکیم اجمل خاں صاحب دہلی سے بلائے گئے۔ وہ میرے ساتھ ہی ٹھہرے۔ چار دن علاج جاری رہا، لیکن خاص افاقہ نہ ہوا۔ حکیم صاحب کے مشورہ پر مہاراجہ صاحب اُن کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ یہاں پُرانی دہلی میں بیکانیر ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ یہ جگہ مٹکاف ہاؤس (Metcalf House) کے قریب ہے۔ نزدیک ہی علی پور روڈ ہے۔ جہاں لالہ سری رام کی کوٹھی تھی۔ اس علاقے میں ان کی کئی اور کوٹھیاں بھی تھیں جو کرائے پر اُٹھا رکھی تھیں۔ مہاراجہ صاحب کے ساتھ ان کا اسٹاف بھی آیا تھا۔ ان سب کے ٹھہرانے کے لئے جگہ کا سوال درپیش تھا۔ یہ مشکل لالہ صاحب کی مدد سے حل ہوئی اور اس طرح ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اب تک مجھے یاد ہے کہ لالہ صاحب سے ملتے ہی میں ان کی شخصیت سے گہرے طور پر متاثر ہوا تھا۔ وہ قدیم تہذیب و شرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ نہایت صاف، وشستہ ٹکسالی اُردو بولتے تھے۔ خوش مذاق اور خوش مزاج تھے۔ باتیں کیا کرتے تھے گویا پھول جھڑتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں ان کا گرویدہ ہو گیا اور ان کی دعوتوں پر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔

لالہ سری رام مہاراجہ سے ملنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ مہاراجہ صاحب اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے کافی مقبول تھے۔ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور اس آزادی پسندی کا بھی شہرہ تھا جس کا مظاہرہ انہوں نے دہلی دربار ۱۹۱۱ء کے موقع پر کیا تھا، اس وجہ سے وہ ریاستوں کے حکمرانوں کے سرگروہ کہے جاتے تھے۔ ملاقات کا وقت میں نے مقرر کرا دیا۔ اس ملاقات سے لالہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان دنوں میرا بیشتر وقت لالہ صاحب کی پُرلطف صحبت میں بسر ہوتا تھا اور میں ان کی خوش مزاجی، ظرافت طبعی اور مہمان نوازی سے پورا پورا بہرہ مند ہوتا رہا۔

لالہ سری رام کی یہ مستقل دعوت تھی کہ جب کبھی میں دہلی آؤں ان کے پاس ٹھہروں۔ چنانچہ اس افتخار کو میں نے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی زباندانی اور خوش بیانی کا نقش میرے دل پر گہرا تھا۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوش بو بھی اور صندل کا نچوڑ ہوتا تھا۔ دیدہ و دل دونوں ان سے شاداب ہوتے تھے۔ بہت کم لوگ میں نے ایسے دیکھے ہیں جن کے کلام و بیان میں ایسا چلتا ہوا جادو ہوتا ہے کہ سننے والا مسحور و محو و مستغرق ہو جائے۔ اس لحاظ سے لالہ سری رام کا نام سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سچیدا نند سنہا اور سر راس مسعود کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ لاجواب خوش تقریر تھے۔ گفتگو کے وقت چھا جاتے تھے اور باتوں باتوں میں ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑتے تھے کہ بات چیت باغ و بہار ہو جاتی تھی۔ بولنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی جادو بیانی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ پُر لطف سے پُر لطف واقعات اور چٹکلوں کو پھر ایسے انداز سے پیش کرتے کہ وہ سننے اور پُراثر بن جاتے تھے۔

افسوس ہے کہ دورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ روشیں متروک ہوتی جاتی ہیں۔ اب نہ اگلی سی فرصتیں ہیں اور نہ وہ صحبتیں گھنٹوں متواتر لالہ صاحب شستہ ٹکسالی اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے احباب اور واقعاتِ زندگی کی ایسی مکمل لفظی تصویریں پیش کرتے تھے کہ ان کی قدرتِ زبان پر حیرت ہوتی تھی۔ بات بات میں اردو کے برموقع اشعار موتیوں کی طرح ٹانکتے چلے جاتے تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ اور ہزاروں اشعار ان کی نوکِ زبان پر تھے۔ اس لحاظ سے کسی کا شیوۂ گفتار میں ان سے میدان مارنا آسان کام نہ تھا۔

لالہ صاحب اعلیٰ خاندان سے تھے اور اس پر انہیں بجا طور پر فخر بھی تھا۔ اپنے بزرگوں میں راجہ ٹوڈرمل اور پیارے لال آشوب کا ذکر وہ اکثر بڑے احترام سے کیا کرتے تھے اور وہ خطبہ بھی دکھایا کرتے تھے جو پیارے لال آشوب کو باشندگانِ دہلی نے پیش کیا تھا۔ اس خطبہ میں غالب کی لکھی ہوئی چند سطریں بھی درج ہیں جن میں غالب نے پیارے لال آشوب کی خدمات کو سراہا ہے۔ جہاں ایسا موقع ہوتا، لالہ صاحب بڑے جوش و خروش سے اپنے حسب نسب، اپنے خاندان کی شہرت اور موروثی جائداد و املاک کا ذکر کرتے تھے اور اس قسم کے تفاخر نے انہیں معلوم نہیں اور کیسی کیسی چیزوں سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن اسی نے ان میں احساسِ برتری اور تنگ دلی بھی پیدا کر دی تھی۔ دہلی کا ... حکیم اجمل خاں اور ان کے ... خاندان لوہارو اور شہرہ

آفاق اینگلو انڈین شاعر اور ناول نگار کپلنگ سے اپنے مراسم اور تعلقات کا ذکر وہ بڑی مسرت سے کیا کرتے تھے۔ کپلنگ نے دہلی میں ان ہی کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ صاحبِ ذوق مہمانوں کو، لالہ صاحب، اکثر وہ کمرہ اور اس میں رکھی ہوئی میز دکھلاتے تھے جس پر کپلنگ لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا تھا۔

لالہ سری رام اُردو ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی ملازمت تک کو انہوں نے اس پر قربان کر دیا تھا۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ منصف کے عہدہ کا دینے والے فرائض انجام دے سکنے سے معذور تھے اور شعر و ادب کے گوشہ میں خانہ نشین ہو گئے۔ مصوّری، خطاطی اور قلمی نسخوں کا جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، یہ تمام نوادر اب بنارس ہندو یونیورسٹی کی زینت بنے ہوئے ہیں جہاں لالہ صاحب سے ایک خاص شعبہ منسوب ہے۔

لالہ صاحب اردو زبان و ادب کے عاشقوں میں تھے۔ ان کی تصنیف خم خانہ جاوید ایک یادگار کارنامہ ہے اور اردو ادب میں اس کی حیثیت انسائیکلو پیڈیا کی ہے۔ اس کی تالیف کے سلسلہ میں، لالہ صاحب نے کئی ادیبوں اور اہلِ قلم حضرات کو ملازم رکھا۔ پنڈت کیفی مہینوں ان کے یہاں مہمان رہے۔ اس فیاضی کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لالہ صاحب کی وفات کے بعد بھی ان ہی کی کوٹھی پر مقیم رہے۔ پنڈت کیفی، لالہ صاحب کے ادبی کاروبار کے عامل تھے۔ خم خانہ جاوید کی تکمیل کے لئے وہ ایک کثیر رقم وقف کر گئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ملک اور ادب کے لئے یہ ایک ناقابلِ بیان نقصان ہے۔ لالہ صاحب کی وفات کے کئی سال بعد پنڈت کیفی نے خم خانہ جاوید کی ایک جلد شائع کی لیکن پہلی جلدوں کے مقابلے میں اس کا رنگ ہلکا ہے۔ نہ وہ اگلا سا معیار ہے نہ ادبی چاشنی۔ خم خانہ جاوید کی باقی جلدیں اب مکمل نہیں ہو سکتیں اور اس طرح لالہ صاحب کا وقف شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکا۔ کیفی صاحب مستقل طور پر لالہ صاحب کے ہاں رہتے تھے اور ان کے مشورہ سے خم خانہ جاوید مرتب کرتے تھے۔ گوپی ناتھ امن کے چھوٹے بھائی گوبرن لال ادیب ان کے خاص معاون تھے لیکن افسوس کہ خانگی تنازعوں و کارکنان کی عدم توجہی سے لالہ صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور ان کے وقف کا صحیح مصرف نہیں کیا گیا۔

لالہ سری رام دریا دل تھے لیکن ان کی سخاوت میں مصلحت کو بڑا دخل تھا۔ جو کچھ وہ دیتے، اس کا پورا بدل بھی چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جمع خرچ کے حساب میں وہ بڑی احتیاط برتتے تھے۔

ان کی عمر کے آخری سال بیماری کے رنج و غم اور درد و عذاب میں بسر ہوئے۔ خانگی تنازعوں نے ان کی خوشیوں کے سوتوں پر خاک ڈال دی تھی۔ اس دوران میں وہ ڈیرہ دون سے مجھے نہایت طویل خط لکھا کرتے۔ یہاں وہ تبدیل آب و ہوا اور علاج معالجہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

ان کی شخصیت پیچ در پیچ تھی۔ تہذیب، شائستگی اور شرافت کا وہ خلاصہ تھے ایک وضعدار ہندوستانی شریف کی تمام صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ بڑی بڑی ہستیوں سے اور ہندوستانی ریاستوں کے راجاؤں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور ان سے تعلقات استوار کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خوش سلیقہ، خوش اطوار اور خوش گفتار تھے لیکن مزاج نازک و زود رنج تھا۔ جب غصہ آتا تو طبیعت قابو سے نکل جاتی۔ ضبط، میانہ روی اور اعتدال جو متوازی شخصیت یا رچی سنوری سوسائٹی میں ہوتا ہے ان کے ہاں کم تھا۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بھی محدود تھا اور ان کی دنیا میں صرف خواص کا گزر تھا۔

ان کی وفات پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک نہایت مؤثر مضمون لکھا تھا۔ پنڈت کیفی نے بھی اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں لالہ صاحب پر مضمون لکھے ہیں جو ان کی شخصیت کا عمدہ مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے باوجود لالہ سری رام دہلی میں اپنے زمانہ کی نمایاں شخصیت تھے وہ اُردو کے بے مثل مربّی تھے اور اُردو پر ان کے احسانات بھلائے جانے کی چیز نہیں۔ ان کی موت دہلی اور اردو کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے آہ! ؏ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

———

سید علی بلگرامی

غلام پنجتن

کارلائل نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان میں سوانح عمریاں تو بہت لکھی گئی ہیں لیکن صحت و تسلسل کے ساتھ لکھی ہوئی کسی کی زندگی کی تاریخ اتنی ہی کمیاب ہے جتنی کہ کسی کا اعلیٰ مقاصد کے حصول میں گزاری ہوئی زندگی۔ ایسے لوگ تو بہت سے گزرے ہیں جن کی سوانح حیات ترتیب دینا چاہی مگر ان کے متعلق مفید اور سبق آموز مواد فراہم کرنے کی اہلیت رکھنے والے کم ہیں۔ ان بزرگوں کے ساتھ کچھ نہ بیٹھے والے ہی معقول اور صحیح مواد مہیا کر سکتے ہیں۔ کہ روز کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں چند ہی ایسے ہوتے ہیں جن کو اس بات کی تمیز ہو کہ زندگی میں کیا چیز کیا اہمیت رکھتی ہے۔ پھر جب انسان گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہے تو نقطۂ حیات کا سلسلہ اس کے بس میں نہیں رہتا اور یہ بھی ہوتا ہے کبھی معمولی سی بات تو حافظے میں گم کر رہ جاتی ہے لیکن اسی زمانے کا اہم واقعہ محو ہو جاتا ہے۔ کبھی عقیدت کی آنکھ ایک ہی رخ دیکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قوموں تاریخ سے افراد کی سوانح لکھنا مشکل ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی تاریخ لکھنے کے لئے ریکارڈ بھی ہوتا ہے اور یادگاریں بھی۔ لیکن کسی ایک شخص کی سوانح حیات تو وہی لکھ سکتا ہے جو ذاتی علم رکھتا ہو جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ایسے لوگ کم ہوتے جاتے ہیں اور وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی باقی ہی نہیں رہتا۔ دورِ گزشتہ کے مشاہیر کے حالات معلوم کرنے کا شوق تو دو چار کو ہوتا ہے مگر ایسے مواقع نہیں ملتے کہ وہ یہ شوق پورا کر سکیں۔ موجودہ دور میں کچھ ایسی ہوا چلی ہے اور ذہنیت کچھ ایسی مفلوج ہوئی ہے کہ پچاس برس پہلے ہم سے جو بزرگ جدا ہو چکے ہیں اُن کا تو ذکر ہی کیا۔ مظہر الحق۔ سر علی امام۔ جسٹس شاہ دین۔ سر محمد شفیع۔ مولانا محمد علی۔ حکیم اجمل خاں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں کار پردازانِ نقوش کا پرانے مٹتے ہوئے نقوش کو اُبھارنا قابلِ ستائش ہے مگر مجھ ایسے نالائق محض سے کچھ اس سلسلے میں توقع رکھنا محض اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ؎

اسفل ہی سہی لیکن نسبت تو ہے اعلےٰ سے

سب جانتے ہیں کہ واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں لے جانے کے دوسرے سال جب بہادر شاہ ظفر کو رنگون پہنچا دیا گیا تو اودھ و صوبہ

شمالی و [illegible] جسے اب اتر پردیش کہتے ہیں خوب ہی لوٹے گئے۔ دو چار ہی اس وسیع علاقے میں ایسے مسلمان گھرانے ہوں گے جن کو ان مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک سادات بلگرام کا وہ کنبہ بھی تھا جس میں سید علی ۱۸۵۱ء میں پیدا ہو چکے تھے۔ ان کے جد امجد مولوی سید کرامت حسین صاحب کمپنی بہادر کی سرکار کے گورنر جنرل کے دربار میں نواب وزیر آف اودھ کے دربار سے نمائندے تھے۔ کرامت حسین صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں اعظم الدین حسن اور زین الدین حسن کو کلکتے کے مدرسہ عالیہ میں جو وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا تعلیم دلائی۔ یہ دونوں انگریزی داں ہونے کے علاوہ علوم مشرقیہ کے عالم بھی تھے۔ آگے چل کر ان دونوں کو انگریزی سرکار میں ملازمت بھی ملی۔ اعظم الدین حسن گورنر جنرل کے مشرقی زبانوں کے ترجمان (Oriental Interpreter) کی حیثیت سے اے ڈی سی بنے اور پھر سندھ کے پولیٹیکل ایجنٹ ہو گئے۔ صوبہ بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور بندوبست کے حاکم رہے اور سی۔ آئی۔ ای کا خطاب پایا۔ دوسرے بھائی زین الدین حسن صوبہ بہار و بنگال میں ۱۸۷۵ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہو کر ریاست حیدر آباد میں کمشنر انعام بن کر آئے۔ سید علی انہی کے فرزند تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسین (عماد الملک) نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۸۶۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اسی سال سید علی فارسی و عربی کی تعلیم گھر پر ختم کر کے انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ دو سال انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی تھی اس کے بعد ۱۸۶۸ء میں پٹنہ کالج سے شریک ہو کر کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ بی اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ دو سال قانون و ادب کی تحصیل کی [illegible] انہیں [illegible] اسکالرشپ انجینئرنگ کی تعلیم رڑکی کالج میں حاصل کرنے کے لئے ملا اور یہ وہاں داخل ہو گئے۔ نواب سر سالار جنگ نے ۱۸۷۶ء میں یورپ کا سفر کیا اس سفر میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید حسین بلگرامی بھی ہم رکاب تھے۔ اس سفر میں جو کچھ انہوں نے دیکھا اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ارادہ کر لیا کہ حیدر آباد سے چند ہونہار نوجوان ہر سال انگلستان تعلیم کے لئے روانہ کئے جائیں جو واپس آ کر ریاست کے مختلف محکموں کو سنبھال سکیں۔ ایک ایرانی نوجوان مرزا مہدی خان جو اسسٹنٹ انجینئری کے امتحان میں کامیاب ہو چکے تھے ان کے ہمراہ تھے۔ انہیں سر سالار جنگ نے رائل اسکول آف مائنز میں داخل کر دیا اور جب ہندوستان لوٹے سید علی کو رڑکی سے بلوا کر کچھ ماہ اپنے [illegible] اور پھر تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا جہاں انہوں نے ۱۸۷۶ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان داخلہ اعلیٰ درجے میں پاس کر لیا اس امتحان میں ان کی اختیاری زبان جرمنی اور [illegible] تھی۔ انہوں نے کیمسٹری، طبیعات، معدنیات اور ان کے متعلقہ مضامین کی تعلیم چند سال ہی میں ختم کر لی۔ اپنی ذہانت و قابلیت کے تحسینی صداقت نامے [illegible] انگلستان چھوڑ کر جرمنی فرانس اسپین ہوتے ہوئے کچھ ماہ اٹلی میں اطالوی زبان سیکھنے کے لئے قیام کیا۔ سنسکرت اور بنگالی تو پہلے ہی سے جانتے تھے حیدر آباد میں آ کر انہوں نے مرہٹی اور تلنگی بھی سیکھ لی۔ ان کا حافظہ بڑا زبردست تھا جو ایک دفعہ پڑھ لیتے بھولتے نہ تھے۔ فرانسیسی زبان میں بلا تکلف باتیں کرتے تھے۔ اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ جس زبان کی کتاب پڑھنے بیٹھتے ایک ہی نظر میں معنی و مفہوم سمجھ لیتے تھے۔ چودہ زبانیں ایسے بولتے تھے کہ سمجھو کہ یہ سب گویا ان کی مادری زبانیں ہیں۔ بنارس کے پنڈتوں کو ان کے سنسکرت کے لہجے میں ہندی شاستری کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے تلفظ پر بنارس ہی کا شبہ ہوتا تھا۔ یورپ سے واپسی پر وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل معدنیات مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے اور مرزا مہدی خان نے جو ان سے ایک دو سال پہلے واپس آ چکے تھے مل کر پاکھال ضلع ورنگل اور [illegible] میں معدنی تحقیقات شروع کی۔ جب ان کی رپورٹ پر عمل کا وقت آیا تو وہی ہوا جو ہوتا چلا آ رہا ہے بقول اکبر الہ آبادی ؎

کچھ قدر نہیں اس کی پرستش ہی نہیں اس کی — نیٹو کی لیاقت بھی مفلس کی جوانی ہے

[illegible] نے جو ریاست کی خوشحالی انتظامی اور مالی فلاح کے منصوبے باندھے تھے اس میں رکاوٹیں تو انہی کی زندگی میں پیدا ہو گئی تھیں ان کے بعد [illegible] یہ گوارا ہو سکتا تھا کہ سید علی اور مرزا مہدی ایسے کثیر المعلومات نوجوانوں کو سرزمین دکن سے سونا اگلوانے کی اجازت

دی جاتی ۔ رائچور کا سونا سمیا ونگل کا کوئلہ ۔ ان کی جستجو اور کالے آدمی — این خیال است و محال است و جنوں ——— دونوں کو معاوضہ یا تی خدمات سے محروم کر دیا گیا ۔ مرزا مہدی علی تو مال ۔ اعداد و شمار ۔ مردم شماری کے محکموں میں طبقات الارض کی صلاحیتوں کو دفن کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے اور سید علی بلگرامی ہوم سیکرٹریٹ ۔ تعلیمات اور ریلوے کا چکر کاٹتے رہے ۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ چکر ختم ہوا اور وہ سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی کے پروفیسر ہو گئے ۔ کمال تو ان دونوں کے ہاتھ سے حکومت کی پالیسی نے چلنے نہ دی ۔ مگر ان دونوں کے ہاتھوں سے قلم چھین لینے کی قوت کسی میں نہ تھی ۔ ملک کو نہ سہی ملک کی زبان کو یہ دونوں ہستیاں مالا مال کر گئیں ۔

جس زمانے میں سید علی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی زمانے میں سرسید احمد خاں نے ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سرکار انگریزی میں کی تھی جس کا انکاری جواب دیتے ہوئے گورنمنٹ نے ان کو لکھا تھا کہ وہ علوم و فنون کے ہر شعبے میں ہندوستانیوں کو فراخ دلی سے اعلیٰ تعلیم دینا چاہتی ہے جس کے لئے دیسی زبان میں کوئی ذخیرہ موجود نہیں ۔ اس لئے کچھ عرصے تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان ہی سیکھنا ہوگی اور اسی میں اعلیٰ تعلیم دینا پڑے گی ۔ سرسید کو اس طرف توجہ کرنی پڑی ۔ سرسید کی اس آواز پر سب سے پہلے لبیک مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے کہا ۔ اور دہلی کے ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت دھرم نرائن اس مقصد کی تکمیل کے لئے بڑھے ۔ سید علی صاحب کے دل پر یہ بات بچپن ہی سے بیٹھ گئی اور اسی وجہ سے انہوں نے سنسکرت اور پھر فرانسیسی اور جرمنی اپنی اختیاری زبانیں امتحانات کے لئے چنیں اور ان زبانوں کی کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں آگے چل کر کئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادبی عمل و کرم اور تراجم زیادہ ہیں ۔

سالار جنگ ثانی اور نواب سر آسمان جاہ کی وزارت میں وہ جن الجھنوں میں پڑ گئے وہ ان کی علمی اور ادبی زندگی میں بھی رخنہ انداز ہوئیں ۔ ان حالات سے بد دل ہو کر انہیں وکالت کا خیال آیا ۔ وہ کاموں سے باہر ہو کر جب انسان دنیا کے جھمیلوں میں پڑ جاتا ہے تو وہ امتحان پاس کرنے کا نشہ ... ہوتا ہے ۔ یہ مقولہ ان کے حق میں غلط ثابت ہوا ۔ کلکتہ یونیورسٹی کے بی ایل کے سنہ ۱۸۹۱ء والے سال کے امتحان میں چار ماہ باقی رہ گئے تھے لیکن انہوں نے فیس داخل کر کے امتحان کی تیاری شروع کر دی حالانکہ وہ سنہ ۱۸۷۵ء یا سنہ ۱۸۷۶ء میں قانون کی تعلیم چھوڑ چکے تھے ۔ امتحان میں بیٹھے اور یونیورسٹی کی فہرست میں اوّل آکر طلائی تمغہ اور یونیورسٹی کے اسکالرشپ کے حقدار قرار پائے ۔ اسی زمانے کے ایک جنگ جہت ... معاملات پر مسٹر ... نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا ۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس پمفلٹ کو محسن الملک کی پارٹی نے جس کے دو مضبوط ستون سید علی بلگرامی اور محمد صدیق انجینئر سمجھے جاتے تھے شائع کرایا ہے ۔ ریذیڈنسی کا گمان یہ تھا کہ فتح نواز جنگ کی ... ان کی زندگی کے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کو اس ریاست میں سوائے عماد الملک اور ... الملک کے کوئی نہیں جانتا ... عماد الملک آسمان جاہ کی وزارت کے حامیوں میں سے ہیں ... سرور الملک کے ... نہیں دیا ۔ اس مقدمہ ... کی طرف سے فوجداری کے مشہور بیرسٹر مسٹر ایرڈلی نارٹن ... زمانے میں مدراس میں وکالت کرتے تھے اور بمبئی کے ... بلائے گئے ۔ یہ مقدمہ ایک کمیشن کے سامنے سنہ ۱۹۲۲ء میں بڑے زور شور سے چلا ۔ یہی مقدمہ حقیقت میں فتح نواز جنگ کو حیدرآباد سے نکالے جانے اور سر آسمان جاہ کی وزارت کے ٹوٹنے کا پیش خیمہ ہوا ۔ سنہ ۱۹۱۹ء یا سنہ ۱۹۲۰ء میں جب میں یوپی میں وکالت کرتا تھا ایک مقدمے میں میرا اور مسٹر نارٹن کا اورنگ آباد آنا ہوا ۔ اس مقدمے میں مسٹر محمد اصغر انصاری بیرسٹر (جو بعد کو ہائی کورٹ کے جج ہوئے) جونیئر کے طور پر کام کر رہا تھا ۔ اکثر ہم تینوں کی تفریحی صحبتیں رہتی تھیں ۔ مسٹر نارٹن بڑے ... اور ... تھے ... کی تفریق کا مادہ بہت کم تھا ۔ وہ اکثر ان صحبتوں میں بڑی شخصیتوں کا ... تفریح کے مذاق اڑاتے رہتے تھے ... "گندی ..." کا تذکرہ کرتے ہوئے نارٹن نے کہا کہ اگر سید علی بی ایل کا امتحان دے کر حیدرآباد واپس آ جاتے ... تو وہ بہت

جلد کلکتہ بار میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ ان کا حافظہ قوی، ذہن تیز اور نظر وسیع تھی۔ انہیں ہمدردی بھی تھی اور ایسی طبیعت پائی تھی کہ مقدمہ کے واقعات معلوم کرنے میں موکل کی پراگندہ خیالی سے ان کا دل اُچاٹ نہ ہوتا اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو قانون پیشہ کو "لائم لائٹ" میں لاتی ہیں۔

وہ ریاست میں تو کسی خطاب کے مستحق نہ ٹھہرے مگر گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف شمس العلماء کا خطاب ۱۸۹۳ء میں دے کر کیا۔ اور انگلستانی یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر اور ڈی لٹ بنا دیا۔ دوران ملازمت میں انہوں نے ایک رسالہ الحقائق نکالا تھا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں سہ ماہی تھا اس میں نواب عماد الملک اور علامہ شوستری اور مولوی سید کرامت حسین صاحب کے جو ۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے مضامین شائع ہوتے رہتے۔ یہ رسالہ چل نہ سکا اور جلد بند ہوگیا۔ انہوں نے میڈیکل جورس پروڈنس کا ترجمہ اردو میں "اصول قانون متعلق بہ طب" کیا۔ اس کاوش اور محنت کا معاوضہ سر آسمان جاہ کی وزارت کے زمانے میں سرکار سے چھ ہزار روپیہ ملا۔

نواب وقار الامراء کے زمانے میں وہ طوفان جو سید علی صاحب کو پریشان کرنے کے لئے اٹھایا جاتا تھا بہت کم ہوگیا اور ان کے علمی کاموں میں وقار الامراء سے مدد بھی ملی۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ایک سررشتہ علوم و فنون قائم کرالیا اور اپنی نگرانی میں دکن کی تاریخ اور بہت سی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائیں۔ انہوں نے مولانا شبلی کا تقرر بحیثیت ناظم سررشتہ علوم و فنون کرایا۔ یہ سررشتہ ایک عرصے تک قائم رہا۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کو ۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرایا۔ ان کی تالیفات پر انعام دینے کے لئے انہوں نے خود گزارش پیش کی اور سرکار سے ایک گراں قدر رقم منظور کرکے ان کے حوالے کردی۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ جو اس زمانے میں علی گڑھ میں ہوا تھا اس میں انہوں نے ایک تحقیقاتی مقالہ "کلیلہ و دمنہ" پر پڑھا۔ انہوں نے بڑی محنت سے یہ پتہ چلایا تھا کہ یہ کتاب اصل میں کہاں سے نکلی کہاں کہاں گھومی کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس میں کیا کیا تبدیلی ہوتی گئی اور اصل سے موجودہ نسخے کتنے مختلف ہوگئے۔ وہ انگلستان میں جب کیمبرج کے پروفیسر ہوگئے تو الف لیلے کے متعلق بھی ایسی ہی تحقیقات شروع کی تھی مختلف نسخے اور وہ دوسری کتابیں جس میں الف لیلے کے حوالے یا اقتباسات تھے اور جن زبانوں میں الف لیلے کا ترجمہ ہوا سب اکٹھے کر لئے تھے جن کی تعداد سو سوا سو تھی۔ اس کے کام کو وہاں تو کر نہ سکے۔ ہندوستان آتے ہی جب وہ ہردوئی میں مقیم ہوگئے تو ان کی ساری توجہ علی گڑھ کی طرف مبذول ہوگئی اور وہ مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن بنانے میں مشغول ہوگئے اور انہوں نے اس کے مرتب کرنے کے لئے یورپ اور مصر کی یونیورسٹیوں کے طریق کار انتظامی امور اور تعلیمی نصاب کا مطالعہ کیا۔ افسوس ہے کہ وہ زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ بہت ممکن تھا کہ جو کشمکش یونیورسٹی کے متعلق ہوئی اس میں بہت کمی ہو جاتی اور یہ تو مانی ہوئی بات تھی کہ وہی پہلے وائس چانسلر ہوتے۔ علی گڑھ پارٹی کے احرار اور اعتدالی دونوں ان پر بھروسہ کرتے تھے۔

تمدن ہند اور تمدن عرب ان کے دو بڑے شاہکار ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ یورپ میں یہ دونوں کتابیں اس جید عالم و ماہر فن کی دماغ سوزی اور انتھک کاوشوں کی یادگار ہیں اور بڑی مستند ہیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ انہوں نے اس طرح سے کیا کہ پہلے پورا پیراگراف پڑھ لیتے تھے پھر قلم اُٹھا کر اپنی زبان اردو میں لکھنا شروع کر دیتے تھے اور پھر مجال نہیں کہ مصنف کا منشاء فوت ہو جائے۔ ان ضخیم کتابوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ دوسری زبان سے اُردو میں ہے۔ انہیں ہند کے پرانے تمدن سے بڑی دلچسپی تھی۔ الورا کے مشہور غاروں کی جس میں بعض تو اس وقت مٹی میں دبے ہوئے تھے۔ بڑی چھان بین کی اور ان پر گائڈ کے طور پر ایک کتابچہ لکھا جس سے آئندہ چل کر ان لوگوں کو جنہوں نے پرانی یادگاروں کی تحقیق کی بڑی رہنمائی ہوئی۔ انہوں نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیمی قواعد کا تقابل کیا اور اس پر ایک پیارا رسالہ لکھا۔ حیدرآباد کی اقتصادی حالت اور یہاں کے

معدنیات پر جو رسالہ انہوں نے لکھا اس کی افادیت ابھی تک قائم ہے کاش ان کے نواسے سعادت علی جو لوک سبھا کے ممبر ہیں اور پرائم منسٹر کے پارلیمنٹری سیکریٹری امور خارجہ ہیں اس رسالے کو اپنی ماں کی کتابوں میں سے ڈھونڈ کر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دیں۔

مرحوم کو کتابوں کا بے حد شوق تھا۔ ان کی لائبریری ان کے ڈرائینگ روم سے زیادہ شاندار تھی اور بہت با ترتیب۔ انہیں کسی کتاب کے نکالنے میں دقت نہ ہوتی تھی بعض انگریز کتب فروشوں کو انہوں نے مستقل آرڈر دے رکھا تھا۔ یورپ کی کسی زبان میں اسلام کے مذہب یا تاریخ پر کتاب شائع ہوتے ہی ان کے پاس آ جاتی تھی بعض Periodicals کے وہ مستقل خریدار تھے۔ عام طور پر جن لوگوں کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے وہ ان کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور کسی کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے انہیں یہ عادت نہ تھی وہ جس کو اپنے سے زیادہ مشتاق دیکھتے اور اس کو قدردان بھی سمجھتے اپنی کتاب نذر کر دیا کرتے تھے چنانچہ مولانا شبلی کو کئی نادر کتابیں انہوں نے حوالے کر دیں۔ سرسید جب آخری مرتبہ حیدر آباد آئے تو بشیر باغ میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے۔ سید علی صاحب ان کو اپنا کتب خانہ دکھانے کو لائے۔ سرسید کئی گھنٹوں تک ان کے نایاب ذخیرے کو دیکھتے رہے اور مختلف کتابوں پر گفتگو کرتے رہے ایک کتاب کو جو اسپین کے اسلامی دور کی باتصویر تاریخ تھی بہت تعریف کی اور کہا کہ ایسی کتاب تو ہمارے کالج کی لائبریری میں ہونا چاہیئے تھی تاکہ ہمارے نوجوانوں کو ہماری عظمت معلوم ہو اور عبرت بھی ہو انہوں نے وہ کتاب نہایت خندہ پیشانی سے سرسید کے حوالے کر دی اور کہا کہ آپ سچ فرماتے ہیں ایسی نایاب کتاب ہماری قومی لائبریری ہی میں رہنی چاہیئے۔ انہیں جب کبھی موقع ملا انہوں نے نایاب کتاب کو اور نایاب بنانے کے لئے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اس کو شائع کرنے کی فکر کی۔ کہا جاتا تھا کہ تزک بابری کے اصلی ترکی زبان میں صرف دو نسخے تھے ایک روس کی لائبریری میں اور دوسرا فرانس کے کتب خانے میں۔ اس کا ایک نسخہ انہیں نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں بھی نظر پڑا۔ جب وہ سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد کو خیرباد کہہ کر انگلستان روانہ ہوئے تو اس نسخہ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث اس وقت نابالغ تھے اور ان کی ریاست پر کورٹ آف وارڈس کی نگرانی تھی۔ سید علی صاحب کے مخالفین نے ان کے اس فعل کو بڑی مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کر کے سرکار سے یہ حکم دے لیا کہ یا تو سید علی صاحب فوراً اس کتاب کو واپس کریں یا ان کے وظیفہ سے اس کی قیمت محسوب کرنا شروع کر دی جائے۔ جب اس حکم کی ان کو اطلاع ملی اس وقت تک یہ کتاب لندن کے قدیم کتابوں کے پرکھنے والوں کی نظر چڑھ چکی تھی اور گب میموریل فنڈ کے خرچ سے اس کی عکسی کاپیاں ہو چکی تھیں۔ مولوی صاحب نے اصل کتاب معہ ایک کاپی کے فوراً واپس کر دی اور جواب میں لکھا کہ میرا مقصد اس کتاب کو ہتیانا نہیں تھا بلکہ سالار جنگ کے کتب خانے کا نام بڑھانا اور اس کتاب کو زندہ کرنا تھا۔ اور اس میں میں کامیاب ہو چکا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ان کی جو عظمت و توقیر تھی اور ان کی پرانے ادب کے ساتھ دلچسپی کی جو شہرت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کیمبرج کی لائبریری میں ایک پرانی کتاب "الوصایا" تھی۔ اس قلمی نسخے پر شہاب الدین خفاجی اور امام عبد القادر کی مہر تھی۔ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی تھی کہ اس کا فوٹو لینا ضروری ہو گیا۔ اس کے صرف فوٹو تقسیم ہو چکے تھے۔ صرف ایک اُن پروفیسر صاحب کے پاس رہ گیا تھا جن کا اس سبجکٹ سے تعلق تھا۔ سید علی صاحب سے جب اس کتاب کا تذکرہ آیا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ آپ اس کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں یہ کاپی ان کے نذر کر دی۔ انہیں مصر کی پرانی تاریخ پر ایک نایاب کتاب ہاتھ آ گئی۔ انہوں نے اس کے حصے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں طبع کرانا شروع کر دیئے۔ انہوں نے کلام پاک کا ایک ایسا انڈکس بنوانا چاہا کہ جس کے ذریعہ سے ہر موضوع پر جو آیت جس سورت میں ہو آئت اور سورت کے حوالے سے مل سکے۔ اسی طرح سے انہوں نے عربی مصنفین کا نام وار ایک انڈکس حیدر آباد ہی میں بنوانا شروع کیا تھا۔ جس سے ہر مصنف کی تحقیقات کا پتہ چل سکے۔ ان دونوں کو ان کا ارادہ بیروت میں طبع کرانے کا تھا مگر یہ کام بھی جوان کا توں ہی رہ گیا۔

فطرت کا یہ اٹل اصول ہے کہ بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ اس کا اثر غیر شعوری طور پر اس کے عادات و خصائل پر ضرور پڑتا ہے۔ سید علی اپنے وطن بلگرام سے دور ایک بڑے عہدہ دار کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش فرو ہو جانے کے بعد جب ان کی عمر چھ سات برس کی تھی یہ دیکھا کہ ان کے چچا کی ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور ان کو آرہ گیریزن ہوس کا ہیرو اور بچانے والا کہا جاتا ہے۔ وہ جس اسکول میں پڑھتے اس کے دروازے محض خوشحال خاندانوں کی اولاد پر کھلے ہوئے تھے۔ ایسے میں انہیں اپنی خاندانی وجاہت کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا پھر ان کے اس احساس برتری پر ان کی اسکول کالج اور یونیورسٹی میں نمایاں کامیابیوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ بعض لوگ جوانی کے زمانے میں ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے ان کے جانے کے بعد کہنے لگے کہ "ان پر جب دولت و جاہ غالب تھی" وہ ان کی فیاضیوں پر بھی یہ کہہ کر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اکثر ان سے وہی متمتع ہوتے جو چلتے پرزے ہوتے یا ان کی شہرت میں مدد دیتے۔ چونکہ انہیں تنگدستی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور لہو و لعب میں نہیں پڑے تھے۔ اس لئے ان کے پاس اتنا تھا کہ جو ان کو دو چار بار مدد کے لئے گھیرتے اس کو کچھ نہ کچھ دے کر ٹال دیں۔ جن اشخاص کی انہوں نے مدد کی اس میں علما، مصنفین اور طلبا سب تھے۔ ان بلند حوصلہ امداد پر یہ گمان کرنا کہ وہ نقد دیتے یا علما کو اس وجہ سے دے دیتے کہ ان کا نام ہو سہل سی بات ہے۔ اگر انہیں نام و خطاب و شہرت کی خواہش ہوتی تو اپنی خودداری سے ان راستوں کو اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے جو خطاب دینے والوں کے محلوں اور کوٹھیوں کی طرف جاتے ہیں۔ جب وہ اپنی ادبی مشغولیتوں میں مصروف ہوتے تو ان کے گھر پر بڑے سے بڑا آئے اس وقت اس صحبت کو چھوڑ کر ڈرائینگ روم کی طرف کبھی نہیں بڑھے۔ البتہ وہ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے اچھے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اخلاق وسیع تھا گو بڑے درباروں میں جبیں سائی ان کو نہ آتی تھی۔ کوئی نہ کوئی مہمان ان کے یہاں آتا ہی رہتا تھا۔ امریکن ہو یا یورپین، ترکی ہو یا مصری ان کے پاس ضرور آتا اور ان سے فرنچ زبان میں گفتگو کا لطف اٹھاتا۔ ان کی بیگم صاحبہ خیر مجسم تھیں۔ تمام عمر شوہر نے ان کی اور انہوں نے شوہر کی رضا جوئی کو مقدم سمجھا۔ اپنے شوہر کے مہمانوں کے لئے عمدہ عمدہ کھانے اپنی نگرانی میں پکواتیں۔ کیمبرج میں بھی ان کے ساتھ گئیں۔ [illegible] ہندوستانیوں کو جو وہاں تھے ہندوستانی کھانا کھلا دیتیں۔ اس زمانے میں جو طلبا تھے آج تک ان کو محبت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر نہ ہندوستانی لباس چھوڑا نہ خاندانی رسم و رواج ترک کیا جس طرح حقہ پینے کی عادی تھیں وہاں بھی پیا کیں۔ سید علی صاحب جب تک حیدرآباد میں برسرِ خدمت رہے۔ جہاں اہل غرض نے ان کو گھیرا وہ اس کی مدد کر دیتے تھے اور سفارش کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ بعض وقت تو اس بارے میں وہ حد سے زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ مولوی خدا بخش خاں جن کی پٹنے میں لائبریری مشہور ہے۔ وہاں وکالت کرتے تھے درجہ دوم کی سند تھی۔ حیدرآباد میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں آئے سید علی صاحب اور ان کے والد دونوں سے ان کی ملاقات تھی اسی وجہ سے وہ مولوی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے خواہش کی کہ اگر یہاں ان کو درجہ اول کی سند مل جائے تو اچھا ہے۔ سید علی صاحب نے کہا کہ یہ کیا بڑی بات ہے اور مولوی میر افضل حسین صاحب چیف جسٹس کے پاس گئے اور پرانے تعلقات جو ان کے خاندان کے مولوی خدا بخش سے تھے وہ بھی بیان کئے میر صاحب نے ان کو سوکھا جواب دے دیا جب مولوی خدا بخش خاں صاحب کو یہ علم ہوا تو ان کو افسوس ہوا اور سید علی صاحب سے معذرت چاہی کہ آپ کو میری وجہ سے ایسا جواب سننا پڑا۔ سید علی صاحب نے کہا نہیں مولوی صاحب میں آپ کو ایک نہ ایک دن یہاں کا میر مجلس کرا کر رہوں گا۔ چنانچہ جب وقار الامرا کا دور شروع ہوا تو مولوی خدا بخش میر مجلس ہو کر ہی رہے۔ نواب سر عقیل جنگ بہادر کہتے تھے کہ میں حیدرآباد سے بیزار ہو کر بمبئی جانے والا تھا۔ ملازمت کے وعدے تو بہت سے ہوتے مگر پورا ایک بھی نہیں۔ ایک دن میں اپنے چچا سید علی صاحب سے ملنے گیا اور ان کی دریافت پر کہا کہ کل بمبئی جا رہا ہوں انہوں نے کہا کیوں۔ سید عقیل نے کہا کہ میں بمبئی میں جا کر خود نوکری تلاش کر لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ اگر تم کو ملازمت نہ ملے تو جہاں دل آئے چلے جانا۔ کل صبح بیگم پیٹھ میں مجھ سے وقار الامرا کی ڈیوڑھی پر ملو۔ چنانچہ صبح میں گیا۔ چچا بھی آئے

اور اطلاع کرنے کے لئے اے ڈی سی سے کہا اس نے کہا کہ نواب صاحب آج کسی سے نہیں ملیں گے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ کسی کی اطلاع مت کرو۔ سید علی صاحب نے کہا کہ آپ میری ذمہ داری پر جا کر اطلاع کیجئے کہ نہایت ہی اہم کام ہے۔ سر وقار الامراء کپڑے پہن کر آفس کے کمرے میں برآمد ہوئے اور سید علی صاحب کو بلوایا۔ آپ گئے اور میرے فوری تقرر کے متعلق ہوم تعلقداری کا ان کو چارج دلا دیا جائے حکم لکھا لائے۔ سر وقار الامراء نے چچا سے شکوہ کیا کہ آپ نے بلا وجہ مجھے آج تکلیف دی انہوں نے کہا کہ آپ کے لئے تو ضرور ذرا سی بات ہے لیکن میرے لئے عقیل کا اس طرح چلا جانا تو معمولی بات نہیں۔ ان میں یہ کمزوری ضرور تھی کہ کانوں کے بڑے کچے تھے۔ ذرا کسی طرف سے کسی نے کچھ ایسا لگا دیا جس میں ان کی سبکی کا تصور ہو فوراً بگڑ جاتے مگر جب بیچ والوں کی چالاکی کھل جائے تو صاف بھی ایسے ہو جاتے تھے کہ گویا کبھی دل میں ملال آیا ہی نہ تھا۔

مرزا مہدی خاں کوکب جنہوں نے تمدن یورپ، ہندسۂ جدیدہ اور نیچرل فلاسفی ایسی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ سید علی مرحوم کے ساتھ انگلستان میں بھی تھے۔ معدنیات کی تحقیقات میں رات دن ساتھ رہنا پڑا۔ پھر دونوں میں قربت اس طرح سے بھی ہو گئی تھی کہ مرزا مہدی خاں کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر کریم خاں (نواب خدیو جنگ) کے ساتھ سید علی صاحب کی بھتیجی طیبہ بیگم کی شادی بھی ہوئی تھی۔ میرزا صاحب سید علی مرحوم کا ذکر بڑی حسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں مرحوم کی سب میں بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ہم عصر علمی خدمات کرنے والوں سے نہ رشک کرتے تھے نہ حسد۔ بلکہ ان کا دل بڑھاتے تھے اپنی کتابیں مستعار دے دیتے تھے جن میں سے بعض تو پھر ان تک واپس پہنچی بھی نہ تھیں۔ بعض وقت ان میں آرام طلبی عود کر آتی تھی۔ ایک کام میں لگے لگے یکایک ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی تو اسے چھوڑ کر دوسرے کام میں منہمک ہو جاتے۔ محنتی و جفاکش نہ تھے۔ مذہبی بحث عامیانہ ہو یا عالمانہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ایام عزا کا احترام کرتے تھے۔ اسلام سے واقف اور سچے مسلمان تھے۔ چونکہ انہوں نے تنگ دستی کا منہ نہ دیکھا تھا اس لئے روپیہ کی قدر نہ کرتے تھے۔ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح خاموش طبیعت اور خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔

سید علی صاحب مرحوم اپنے آباؤ اجداد کی طرح مذہباً شیعہ تھے۔ ان کی پالیسی مرنجان و مرنج کی تھی۔ علمی گفتگو خواہ مذہبی ہو یا تاریخی انہی سے کرتے تھے جن کو ان کا اہل جانتے تھے مگر مناظروں سے دور بھاگتے تھے۔ ان کی نظر میں مذہب اخلاق کی ایک ایسی زندہ طاقت تھا جس کا اظہار انسان کے اخلاقی کمال میں متواتر ہوتا رہتا ہے ان کے خیال کے مطابق انسان جو کچھ جانتا ہے اور جو نہیں جان سکا اس کے درمیان جو اعلیٰ ترین اتحاد پایا جاتا ہے اس کے احساس اور علم کا نام مذہب ہے۔ مذہب یہ ہے کہ محدود ارادت کو غیر محدود مشیت کے تابع کر دیا جائے۔ ان کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اسلام کی عالمگیر تہذیب مسلمانوں کے ہاتھوں بدنام ہو رہی ہے۔ جب وہ کیمبرج کی پروفیسری سے علٰحدہ ہو کر واپس آئے تو اس کے کچھ دن پہلے ہی نواب وقار الملک اور سر جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر صوبہ آگرہ و اودھ کے درمیان انگلش اسٹاف کے علی گڑھ کالج میں اختیارات و اقتدار کے متعلق سخت جھگڑا چل رہا تھا اور حقیقت میں اسی کے باعث شیعہ کالج بنانے کی تجویز پیدا کرائی گئی تھی۔ جب ان سے یہ تمام اندرونی باتیں بیان کی گئیں تو انہوں نے اس تحریک کو نہایت بدبختیانہ کہا۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تمہیں معلوم ہے کہ علی گڑھ کالج میں صرف ایک ہی مسجد کیسے بنی۔ جب سر سید اقامت خانے کالج کلاسوں اور دوسرے ہالوں کا نقشہ تیار کرا رہے تھے تو بورڈنگ کے احاطہ میں دو مسجدیں بنوانا چاہتے تھے میرے بھائی نے اس کی سخت مخالفت کی اور سر سید صاحب سے کہا اگر آپ ہی شیعہ سنی طلباء سے ایک مسجد میں نماز نہ پڑھوا سکے تو جب یہ یہاں سے تعلیم پاکر نکلیں گے تو آپ کے مشن کا کیا حال ہوگا۔ سر سید نے فوراً ہی دو مسجدوں کا ارادہ ترک کر دیا۔ لکھنؤ کے ایک ان کے بڑے بارسوخ دوست نے انہیں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت کے لئے لکھا کہ آپ شیعہ ہیں، عالم ہیں، صاحب مال و جاہ ہیں اس

عہدے کو قبول کرکے شیعہ قوم کی رہنمائی کیجئے۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ میں شیعہ مزدور ہوں مگر عالم نہیں طالب علم ہوں۔ مالدار نہیں ہوں البتہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں۔ میں اس قسم کی کانفرنسوں کو پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے لئے ایک آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

ان کی طبیعت روکھی پھیکی نہ تھی مزاج میں مزاح بھی تھا۔ اجمیر میں خواجہ صاحب کی درگاہ میں فاتحہ پڑھنے کے لئے وہ جا رہے تھے۔ درگاہ میں داخل ہوتے ہی موٹی آسامی دیکھ کر مجاوران نے انہیں گھیر لیا انہوں نے کہا مجھے کیوں گھیرتے ہو میں تو وہابی ہوں۔ مولوی عبدالحق صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ وہ مولانا شبلی۔ ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار) وغیرہ ان کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے مولانا شبلی نے سیّد علی صاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ عبدالقادر جیلانی نے کوئی کتاب شیعوں کے خلاف نہیں لکھی تو شیعوں کو حضرت کے ساتھ اتنی عداوت کیوں ہے۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ کتاب لکھنے نہ لکھنے کا سوال نہیں ہے انہوں نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی مولانا نے کہا کہ وہ کیسے انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو سب ہمارے اماموں ہی کی پرستش کرتے۔ اگر اس طرح آپ کی سلطنت چھن جاتی تو آپ کیا کرتے۔ ایک مولوی صاحب نے آپ سے ایک کمیاب کتاب نقل کرنے کو مانگی مروّت کے مارے انکار تو نہ کیا کتاب نکالی اور یہ کہہ کر دینے لگے کہ کتاب تو نایاب ہے مگر جلد سؤر کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے لاحول ولا قوۃ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ تمدّنِ ہند کا ترجمہ کر رہے تھے ایک دن کچھ دوستوں کو ڈراویڈین قوم کا حال سُنانے لگے ایک صاحب نے کہا کیا یہ قوم باقی ہے۔ اس صحبت میں ایک بدھیئت پختہ رنگ مولوی صاحب بھی اتفاق سے موجود تھے مسکرا کر ان کی طرف اشارہ کر دیا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ ۳ر مئی سنہ ۱۹۱۱ء کی رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے ہردوئی کے مکان میں ٹینس کورٹ پر بیٹھے ہوئے اپنی بہن فاطمہ بیگم ، بیگم صاحبہ اور .. .. اپنی بچی رقیہ بیگم اور اپنی بہن کی لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے کہ ہوش بلگرامی کے الفاظ میں:۔

”آسمان سے ملک الموت بن کر ایک تارہ ٹوٹا جس کی روشنی سے سب کی آنکھیں چکاچوند ہوگئیں مگر ان کے پلک جھپکاتے ہی ان کی حرکتِ قلب بند ہوگئی۔ جو ابھی چند منٹ پہلے اپنے فخر خاندان سے ہنس بول رہے تھے وہ چیخ چیخ کر رونے لگے جو گھر ابھی عشرت کدہ بنا ہوا تھا وہ ماتم کدہ بن گیا۔“

منشی سجّاد حسین

(ایڈیٹر اودھ پنچ)

ممتاز حسین جونپوری

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، یہ وہی سنہ ہے جس میں اودھ کے ادب نواز اور مظلوم فرماں روا جان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق کیا گیا اور انگریزوں نے انہیں کسی قصور کے بغیر تاج و تخت سے محروم کرکے مٹیا برج میں قید کردیا۔ ان کے جانے سے لکھنؤ کی بساطِ سخن ہی اُلٹ گئی اور بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ ایک برس بعد غدر کے المیے نے پوری کردی۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس میں "اودھ پنچ" کے ہونے والے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے آنکھ کھولی۔ جہاں تک ادبی فضا کا تعلق ہے۔ اس وقت اُردو زبان نئے نئے خیالات کو اپنا چکی تھی اور اس پر انگریزی اثرات نمایاں ہو چکے تھے۔ انگریزی کتابوں اور اخبارات کی اشاعت نے ادبی حلقوں پر فکر و نظر کی راہیں کھول دی تھیں، منشی سجاد حسین نے اسی فضا میں پرورش پائی اور بدلے ہوئے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ان کے مورثِ اعلیٰ یوں تو بارہ بنکی کے مشہور اور مردم خیز قصبہ دیوہ شریف سے تعلق رکھتے تھے لیکن آب و دانہ کی کشش انہیں کاکوری شریف کھینچ لائی تھی۔ یہ دونوں بہت پرانی اسلامی بستیاں ہیں اور اسلامیانِ ہند کے لئے یکساں باعث عقیدت و احترام۔ منشی سجاد حسین ایک اونچے اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد شیخ مقصود علی ڈپٹی کلکٹر اور ماموں نواب فدا حسین لکھنؤ کے بڑے نامی وکیل تھے جو بعد میں ریاست حیدرآباد کی عدالت العالیہ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے۔ منشی صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں اپنے ماموں کے پاس ہی پائی اور اُردو فارسی پر عبور کے علاوہ عربی میں بھی شدبد حاصل کی۔ اس زمانے میں لکھنؤ اجڑ چکا تھا لیکن ہزاروں خاندانوں میں بڑی ٹکسالی زبان بولی جاتی تھی۔ بیگمات کی زبان اور محاورات مستند تھے چنانچہ منشی سجاد حسین کو بچپن ہی سے اچھی زبان سیکھنے اور اچھی اُردو برتنے کا موقعہ ملا اور یہی وجہ تھی کہ وہ جوانی ہی میں زبان کے زبردست محقق تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کی طبیعت شروع

ہی سے بڑی چلبلی تھی۔ پرانے زمانے کے مولوی بھلا ان کی خداداد شوخ طبعی کے ریلے میں کیا ٹھہرتے۔ یہ اکثر اپنے استادوں کو سبق پڑھنے اور یاد کرنے میں جُل دے جایا کرتے تھے۔

۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرکے اور کالج میں ایف اے تک پڑھ کے بھاگ نکلے اور فیض آباد میں فوجیوں کو اُردو پڑھانے پر مقرر ہوگئے۔ لیکن جلد ہی گوراشاہی اُردو اور فوجیوں کی صحبت سے دل اچاٹ ہوگیا اور لکھنؤ کی یاد ستانے لگی۔ آخر کار ایک دن نوکری پر دو حرف بھیج کر گھر چلے آئے۔

مضمون نویسی کا شوق بچپن ہی سے تھا اور بلا کے ذہین اور ہنسوڑ اور بذلہ سنج بھی تھے چنانچہ دوسری نوکری کا خیال ترک کرکے بدایوں کے منشی محفوظ علی (ڈپٹی کلکٹر) جیسے نقاد ادیب کے ڈھارس اور دم دلاسہ دینے پر لندن کے ظریفانہ اخبار "پنچ" کی طرز پر ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ "اودھ پنچ" نکالا اور اسے چلانے کے لئے "شام اودھ" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا۔ اس زمانہ میں ان کا قیام کچھ عرصہ لکھنؤ کے محلہ بیرونی خندق میں رہا پھر گولہ گنج منتقل ہوگئے۔

یہ وہ دور تھا جب کہ سودا کی ہجو والی ظرافت اور سید انشا کے چٹکلوں کی جگہ یورپ کا مذاق لکھنؤ کی محفلوں میں بار پا رہا تھا لیکن ابھی پرانا رنگ بالکل مفقود نہیں ہوا تھا۔ اُردو محاورات اور ہنسنے ہنسانے والے ادب کا چشمہ لکھنؤ کے چپے چپے سے ابل رہا تھا اور سودا سلف بیچنے والے گلی گلی تشبیہ اور استعارے لٹاتے پھر رہے تھے۔ خریداروں کو پھانسنے کے لئے اب بھی ککڑیوں کو لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں یا گنڈیریوں کو قلاقند اور برفی کی ڈلی کہہ کر لفظوں کی کمند پھینکی جاتی تھی۔ چائے فروش بھی مزاح و ظرافت کی دوکان لگائے سخن سنجوں کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔

یہ تھا اس زمانے کا لکھنؤ جب منشی سجاد حسین نے ظرافت کا نیا معیار پیش کیا اور ظریفانہ ادب میں ایک نئی طرح ڈالی۔ انہوں نے مزاح کے پردے میں زبان اور محاورات کی اصلاح پر سارا زورِ قلم صرف کر دیا اور اس کوشش میں اخلاقی اور سیاسی مقاصد کو بھی فراموش نہ کیا۔ اس لحاظ سے انہیں ایک ایسے سپاہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس نے اپنے قلم سے جہاد کیا اور ملک کی آزادی اور قوم کی فلاح کے لئے مذاق ہی مذاق میں وہ کچھ کر دکھایا جو بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے نہ ہو سکا تھا۔

منشی سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ادبی اقلیم میں ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا جہاں جرکیں اور جان صاحب کا سکہ رائج تھا۔ منشی سجاد حسین نے مذاق اور ظرافت میں سنجیدگی اور توازن پیدا کیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ملک کے گوشے گوشے سے چوٹی کے مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ کر انہیں دنیا سے روشناس کرایا۔

"اودھ پنچ" کے کارٹون، سیاسی، اقتصادی، علمی اور ادبی مضامین نے دیکھتے دیکھتے معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل سی مچ گئی، یہاں تک کہ اکبر الٰہ آبادی بھی "اودھ پنچ" کے جادو سے محفوظ نہ رہے۔ وہ اس وقت تک قصبۂ کڑا کے مشہور استاد وحید مرحوم سے سنجیدہ غزلوں پر اصلاح لیتے تھے لیکن "اودھ پنچ" ہی کے زیر اثر پرانا خرقہ و جبہ دور پھینک اور دنیا نوسی رنگ تغزّل چھوڑ کر دریائے ظرافت میں غوطہ زن ہوگئے۔

اکبر مرحوم کا پہلا منظوم خط ۱۸۷۷ء ہی کے اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے بڑے پُرجوش طریق پر "اودھ پنچ" کا خیر مقدم کیا تھا۔ اسی کے بعد انہوں نے ظرافت کا چولا پہنا۔ اکبر مرحوم اودھ پنچ کے لئے ظریفانہ مضامین بھی لکھتے تھے۔ جو کبھی ان کے اپنے نام سے اور کبھی فرضی ناموں سے شائع ہوتے تھے۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والا اکبر کا منظوم خط بعد میں ان کے دیوان میں بھی شامل کیا گیا اور اسے کسی شک و شبہ کے بغیر اکبر کی ظریفانہ شاعری کا سنگِ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔

منشی سجاد حسین کے دوستوں اور نامی ظرافت نگاروں میں سے بہتوں کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ ان میں خدا بخشے نواب آزاد، مرزا مچھو بیگ "ستم ظریف"، سید اکبر حسین جج، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی احمد علی شوق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی احمد علی کسمنڈوی۔ اور بابو جوالا پرشاد برق کے علاوہ اودھ پنچ کے بہت اچھے اور پرانے لکھنے والوں میں خان بہادر سید محمد ہادی کلکٹر اور ہمارے استاد ہیڈ ماسٹر منشی ہرسرن داس بی اے بھی شامل تھے۔

بہت عرصہ گزرا میرٹھ سے ایک اخبار "طوطیٔ ہند" نکلتا تھا۔ اس سے اور "اودھ پنچ" سے بڑی نوک جھونک رہتی تھی۔ دونوں اخباروں کی علمی اور ادبی جنگ میں بابو ہرسرن داس نے بھی بڑا حصہ لیا۔

"اودھ پنچ" گو ایک فکاہی رسالہ تھا لیکن ملک کے سیاسی اور سماجی رجحانات اور معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ یو پی میں اس اخبار کو کانگریس کا چراغ تصور کیا جاتا تھا اور صوبے کے جن گوشوں میں کانگریس کا گزر نہ تھا وہاں یہی چراغ لوگوں کی ذہنی راہنمائی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے عزیز دوست پنڈت برج نارائن چکبست کے علاوہ بڑے بڑے جغادری کانگریسی لیڈر منشی سجاد حسین کے مداحوں، قدردانوں اور قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ چکبست نے سچ کہا ہے کہ "اودھ پنچ" نے اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ مغربی اصولوں کی بنا پر صحافت کا ایک معیار قائم کیا ہے۔

اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور پر لوگ منشی سجاد حسین کی تحریر اور لطیفوں سے بڑا لطف اٹھاتے تھے۔ جو پھبتی یا لطیفہ "اودھ پنچ" میں شائع ہوتا وہ مہینوں لوگوں کی زبان پر رہتا اور ملک کے ہر گوشے میں پھیل جاتا تھا۔

اکبر الٰہ آبادی اور ظریف لکھنوی انیسویں اور بیسویں صدی کے بہت بڑے اصلاحی شاعر اور ظرافت نگار ہیں۔ ان میں سے ظریف کو ان کے بڑے بھائی صفی لکھنوی کے کہنے پر منشی سجاد حسین ہی نے ظرافت نگاری کے داؤں پیچ بتائے اور اصلاح تخیل و ادب اور سیاست وغیرہ میں جنگ و پیکار کے لئے تیار کیا۔

اردو صحافت میں کارٹونوں کے ذریعے اظہار خیال اور حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالنے کی بنا بھی منشی سجاد حسین ہی نے ڈالی۔ وہ "لندن پنچ" پڑھتے وقت مصور کو پاس بٹھا لیتے اور اسے "لندن پنچ" کی تصویریں دکھا کر کارٹون کے رمز بتاتے جاتے تھے۔ کبھی لندن پنچ کے خاکوں ہی میں کانٹ چھانٹ کر دیتے اور کبھی نیا خاکہ بنانے کی ہدایت کرتے تھے۔ اور یہی تعلیم وہ اپنے بعد ہونے والے ایڈیٹر شیخ ممتاز حسن کو بھی دے گئے۔

منشی سجاد حسین کا جسم دوہرا، قد میانہ، رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرے پر مونچھیں اور بڑی بڑی داڑھی بھی موجود تھی۔ ان کے یہاں اکثر بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ منشی سجاد حسین کا مزاج حالی کی نثر سے بھی زیادہ سادہ تھا۔ عام طور پر شیروانی اور پرانے زمانے کی فیلٹ پہنتے تھے، پاجامہ کبھی چھوٹے پائنچوں کا ہوتا تھا کبھی بڑے کا۔ چہرے سے شگفتگی برستی تھی۔ لہجے میں نرمی اور مٹھاس تھی۔ بات چیت کے کھرے تھے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر فرقے اور طبقے میں یکساں مقبول تھے۔

ایک بار ایک اخبار کے ایڈیٹر پر مقدمہ چلا۔ یہ صفائی کے گواہ تھے۔ مستغیث کے وکیل نے پوچھا کہ کل کی گواہی کے بعد جب آپ اپنے وکیل سے ملے تو کیا باتیں ہوئیں، انہوں نے کہا جانے دیجئے یہ نہ پوچھئے۔ وکیل صاحب نے جواب دینے پر اصرار کیا تو کہنے لگے "آپ کے متعلق فرماتے تھے کہ ایسا ایسا بیوقوف بنایا ہے کہ باید و شاید" ساری عدالت ہنس پڑی اور وکیل صاحب شرما کے بیٹھ گئے۔

منشی سجاد حسین بڑے نڈر، مستقل مزاج اور قانع انسان تھے۔ روپے پیسے کی ذرا بھی پروا نہ کرتے تھے۔ جو کچھ لکھتے سچائی اور دلیری سے لکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک ریاست کی بدنظمی کے متعلق پے در پے مضامین لکھے۔ اس ریاست میں ان کے کچھ عزیز بھی اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ انہیں بھی ایک اعلیٰ عہدہ پیش کر دیا گیا لیکن وہ صاف انکار کر گئے اور اپنے مسلک سے ذرا بھی انحراف گوارا نہ کیا۔

منشی سجاد حسین بڑے پکے کانگریسی اور کانگریس کے بڑے جوشیلے رکن تھے۔ ۱۸۸۷ء میں نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے تھے اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء تک مرتے دم تک اس کے ممبر رہے۔ ان کے کانگریسی دوستوں میں بڑے بڑے ادیب اور اردو کے پرستار شامل تھے جن میں پنڈت بشن نارائن در بابو گنگا پرشاد ورما مالک و مدیر "اخبار اودھ" کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مہاراجہ سر علی محمد خان مرحوم والیٔ ریاست محمود آباد ان کے بڑے مخلص قدردان تھے۔ منشی سجاد حسین اور "اودھ پنچ" نے ایسے نازک وقت میں کانگریس کی مدد کی اور اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت میں خم ٹھونک کر حصہ لیا جبکہ انگریز راج اپنی بھرپور جوانی پر تھا۔ اور کوئی آزادی کا خواب بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چند گنے چنے افراد کے سوا ملک کا ہر شخص غلامی پر قانع اور مطمئن تھا۔ اور لکھنؤ میں تو کانگریس کی مخالفت میں ایک باقاعدہ انجمن "اینٹی کانگریس" کے نام سے کام کر رہی تھی منشی سجاد حسین اور ان کے ساتھیوں نے جم کر مخالف عناصر کا مقابلہ کیا۔

۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کے مقابلہ میں اینٹی کانگریس والوں نے بھی ایک جلسے کا اعلان کر دیا اور ایک اشتہار شائع کیا جس میں لوگوں سے شرکت کی اپیل کی گئی تھی۔ اس اشتہار میں کہیں بدقسمتی سے "متعلقین" کا ذکر آ گیا تھا اس پر منشی سجاد حسین نے "اودھ پنچ" میں "انڈے بچے والی چیل چلھار" کے عنوان سے ایک ایسا چیٹ پٹا مضمون لکھا کہ بچارے مخالفوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

اینٹی کانگریس والوں نے لکھا تھا "اس جلسے میں گورنمنٹ کے خیر خواہ اپنے اعزا، اقربا، احباب اور متعلقین کے ساتھ شرکت فرمائیں۔"

جواب میں منشی سجاد حسین کے مضمون کی چند سطریں ملاحظہ ہوں ——

"اس نیاز مند کو پوچھنا یہ ہے کہ مخالفین کانگریس کے متعلقین کو جو تکلیف دی گئی ہے اس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے کیونکہ اینٹی بھائیوں سے کچھ بعید نہیں کہ انجڑوں کی طرح معہ متعلقین جلسے میں آ موجود ہوں۔

"منتظمین جانتے ہوں گے کہ متعلقین کی گھر بسی، لڑکوں کی والدہ، بیگم خانم صاحبہ یعنی جورو جی یعنی زوجہ معظمہ طال اللہ یا نچھاو آنچل اللہ وٹھا کو کہتے ہیں۔ جس طرح تھیٹر گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے یہاں بھی یہ آ دھمکیں گی اور جب سارا گھر شریک ہوگا تو ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا خواصیں پیش خدمتیں، شیر خوار بچہ (جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا) پھر اس کا گہوارہ، پالنا، حسینی انّا، چھوچھو، بکری کا بچہ۔ چند خرگوش، چینی چوہے، طوطے کا پنجرا (خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والے کی بولیاں یاد کرے) باورچی خانہ کا دیگ، انّا کے صاحبزادے، نطفہ ناتحقیق کا پلا ہوا لینڈی کتے کا پلّا۔ چھوٹی صاحبزادی کی گلہری کا بچہ، کبوتروں کی کابک۔ مرغی کا ٹاپہ، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحبہ کا پاندان۔ طشت، تسلہ، ڈھکنا، انجیرے، پنچے کے پوترے، تہالچے سبھی ہوا چاہئیں۔"

اس مضمون سے نہ صرف منشی سجاد حسین کے زورِ قلم اور زبان دانی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس زمانے کے لکھنؤ کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اودھ پنچ میں جب بھی اس طرح کا مضمون شائع ہوا تو ہلڑ ہو گیا۔ منشی سجاد حسین کی اتنی دھاک بندھی تھی کہ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا لیکن آخر عمر میں ایسا باغ و بہار آدمی بھی فالج سے لاچار ہو کر سورج مکھی کا پھول بنا۔ مدتوں سوکھتا رہا اور بالآخر دنیا سے بیزار ہو کر ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔

آخری عمر میں انہوں نے کانگریس کے اجلاس کے لئے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے ایک خطبہ لکھا جو ان کی بیماری کے سبب چکبست سے پڑھوایا گیا۔ مرنے سے پہلے یہ اعزاز بھی شاید انہیں آخرت کے خوف سے عطا کیا گیا۔ ورنہ زمانے نے ان کی ناقدری ہی کی۔

اگر وہ انگریزوں کی چاپلوسی کرتے تو کم از کم خان بہادری کا روکھا سوکھا خطاب تو لے ہی مرتے۔ مگر ان کے کردار کی عظمت اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر انگریز عہدہ اور خطاب دکھاتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں قانون کی گرفت سے بچ کر لکھنے کا بھی بڑا سلیقہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انگریز اور حکومت پر بڑی سے بڑی چوٹ کرنے کے باوجود کبھی قانون کی گرفت میں نہ آ سکے۔ البتہ قدرت کے قانون کی گرفت سے وہ نہ بچ سکے اور قضا کا فرشتہ انہیں سب سے بڑی عدالت میں پیش کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

مانی جائسی

سنہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ میں حسین آباد ہائی سکول لکھنؤ میں دسویں درجے کا متعلم تھا اور شعر بھی کہتا تھا، لیکن شاعر کی حیثیت سے میرا حلقۂ تعارف نہایت محدود تھا، میرے مدرسے کے طلبہ اور مدرسین تک اس حلقے کی وسعت تھی اور بس۔

عزیز صاحب کو سن میں مجھ سے بڑے مگر جوان تھے، شاعری کو عروج ہو چلا تھا اور مجھ تک بھی ان کے شعر کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ یہ استفادہ مجھے حکیم سید علی صاحب آشفتہ مرحوم کے ذریعہ سے ہوا کرتا تھا جن کا زمانۂ طالب علمی بھی وہی تھا جو میرا، فرق بس اتنا تھا کہ وہ عربی کے طالب علم تھے اور میں انگریزی پڑھتا تھا۔ آشفتہ مرحوم مجھ سے کوئی تین برس چھوٹے تھے مگر شعر کا ذوق انہیں بھی تھا اور خود بھی کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی باقاعدہ استاد تو اس وقت اُن کا تھا نہیں، مجھی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے، مگر عزیز صاحب سے انہیں خاصی عقیدت تھی۔

میں نے لکھنؤ چھوڑا اور اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کب آشفتہ صاحب نے عزیز صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔ بہرحال انہوں نے اپنے استاد کے فیوض سے خوب استفادہ کیا، حتیٰ کہ بلند پایہ شعراء میں شمار ہونے لگے اور خاصی شہرت حاصل کی۔

بہتیرے شعر عزیز صاحب کے میں نے ان سے سنے اور اس زمانے میں سنے جب عزیز صاحب استاد نہیں بلکہ مبتدی تھے۔ زیادہ تو نہیں ایک قصیدہ سے کے یہ دو مطلع جو آشفتہ مرحوم نے سنائے تھے، اب بھی یاد ہیں :-

(۱) فراقِ یار میں گھٹ کر لبوں پر اب تو جاں آئی — کہاں تک اے دلِ مہجور دعوائے شکیبائی

(۲) میانِ رہ گزر بے دم پڑا ہے تیرا شیدائی — دکھا دے جانے والے آج اعجازِ مسیحائی

یونہی میری طالب علمی کے دو سال لکھنؤ میں گزر گئے لیکن میں اور جناب عزیز ایک دوسرے سے روشناس بھی نہ ہو سکے۔ یہ غائبانہ تعارف نومبر سنہ ۱۹۲۶ء تک رہا۔ اس عرصے میں میں بھی شاعر کی حیثیت سے جانا جا چکا تھا اور ان کا تو ایک مجموعہ بھی "گل کدہ" کے نام سے شائع ہو گیا تھا جو انہوں نے سنہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ مجھے بھوپال میں بھیجا۔ میں اس زمانے میں نوکری کے سلسلے سے بھوپال ہی میں مقیم تھا

اگر حسن اخلاق کے مانند کچھ اور نہیں، صرف یہی ایک بات لکھ دی جائے کہ انہوں نے میرے پتے کا پتہ لگانے کی زحمت گوارا کی اور اپنی تصنیف مجھے مرحمت فرمائی، در حالیکہ ذاتی تعارف کیا دید و دید کی نوبت بھی نہ آئی تھی، تو بھی ان کے دامنِ اخلاق کی وسعت ثابت ہو جاتی ہے —— ہر چند اس ذیل میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ بڑی مدت تک میں ان سے ناآشنا رہا، اس لئے اس زمانے کے حالات اور حالات سے ان کی نجی زندگی اور کردار کے متعلق نتائج کا استنباط کر کے ان کی تفصیل سے قاصر ہوں، اصل میں یہ فرض تو ان کے مخصوص شاگردوں کو ادا کرنا چاہئے تھا جن میں اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، تسکین سوروی، امن لکھنوی اور جگر بریلوی ایسے مشاہیرِ ادب شامل ہیں —— تیر میں ہی اس حق سے سبکدوش ہوتا ہوں جس کا ذریعہ ان کی محبت، حسنِ خلق، انسانیت اور خلوص نے مجھے کر رکھا ہے کہ ان کی بناء پر جو نقوش میرے دل پر ابھرے ہیں وہ کبھی محو نہیں ہو سکتے۔

غرض نومبر ۱۹۲۶ء آیا، جوش ملیح آبادی شاگردِ عزیز، لکھنؤ کے محلہ گولا گنج میں مقیم ہیں جہاں سے امین آباد ہائی اسکول قریب ہے۔ اور عزیز صاحب مدرسے کی درمیانی فرصت میں از راہِ شاگرد نوازی جوش کی استدعا پر اکثر وہاں آ جاتے ہیں۔ میں بھی اس زمانے میں آگرے سے لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ ایک روز مجھے بھی جوش صاحب اپنے یہاں پکڑ لے گئے۔ ایک دن کے قریب عزیز صاحب تشریف لائے اور جوش صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ یہ پہلا دن ہے کہ مرحوم نے مجھے اور میں نے مرحوم کو دیکھا، بڑے تپاک سے حضرت عزیز ملے اور مجھے بھی دلی مسرت محسوس ہوئی۔ شعراء کے اجتماع کا مصرف لازماً عموماً شعر خوانی ہے، سو ہوئی، کچھ میں نے پڑھا کچھ ممدوح مغفور نے ارشاد فرمایا، یہ مختصر سی پر لطف صحبت برہم ہوئی، وہ مدرسے واپس تشریف لے گئے اور میں اپنی قیام گاہ پر آیا۔

دوسرے دن تیسرے پہر اپنے مکان پر اثر صاحب نے مجھے اور جوش اور جناب عزیز کو مدعو کیا، وہیں دن کا کھانا ہوا اور دیر تک شعر خوانی ہوتی رہی، بڑے مزے مزے کی باتیں اور بذلہ سنجیاں ہوا کیں اور بڑی دلچسپ خوش محفل رہی۔

میری رخصت ختم ہوئی، تیسرے دن میں آگرے واپس گیا مگر ان سے مل کر دل بہت خوش ہوا، ملنے کے بعد اب کی بار لکھنؤ کو اس قدر جلد چھوڑنا شاق گزرا، بہت شاق۔

اس کے بعد لکھنؤ کے بعض مشاعروں اور کبھی کبھی دوسرے مقامات کے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیشہ ہر دفعہ ان کی خوش گفتاری کی عظمت دل میں بڑھتی گئی اور محبت، مروت، محاسنِ اخلاق اور نیک نفسی کا سکہ میرے دل پر بیٹھتا گیا۔ تا آنکہ ۱۹۳۳ء میں میرا تبادلہ ریاست محمود آباد سے ہوا۔ میں چند روز کے لئے وہاں چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جناب عزیز صاحب محمود آباد کو ادبیات اردو و فارسی کی تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح پر کبھی کبھی مجھے بھی ان سے ملنے کی مسرت حاصل ہوتی رہتی تھی۔

میں پھر آگرے چلا گیا اور ۱۹۳۵ء میں پھر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی ملازمت کے لئے بلا لیا گیا۔ میرے جانے سے پہلے چند روز محمود آباد میں قیام رہا، مگر عزیز صاحب مستعفی ہو کر وہاں سے جا چکے تھے۔ اور اپنے وطن میں علاج کر رہے تھے۔

عزیز صاحب کی تو بیماری بہت بڑھ گئی تھی، اسی سال میں ایک روز راہ میں ملے، یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی جس کے چند ہفتوں کے بعد ۱۹ جولائی ۱۹۳۵ء کو یہ چراغ جس سے محفلِ شعر و ادب منور تھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۰

مرحوم نے پس ماندگان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، لیکن ان میں باپ کا ذوقِ شاعری سب سے چھوٹے فرزند مرزا محمد جعفر حیات لکھنوی

ملہ عزیز صاحب مرحوم کو غالباً ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خان صاحب بہادر کے سی ایس آئی والیٔ محمود آباد نے اس خدمت کے لئے منتخب کیا ...

نقوش ——— ۱۴۲۷

ہی کو ملا ہے جو چند سال سے بہ سلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم ہیں۔ انگریزی اخبار "ہندوستان ٹائمز" سے ان کا تعلق ہے۔ بہت خوب شعر کہتے ہیں اور بڑے سلیم المذاق ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی بڑا دل کش ہے۔ یہ ایک مبارک اقدام بھی کر رہے ہیں یعنی حضرت عزیز مغفور کا غیر مطبوعہ کلام جو صدہا غزلیات، نظموں اور قطعات، رباعیات اور قصائد پر مشتمل ہے، عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔

حلیہ عزیز صاحب میانہ قامت، گندم رنگ، قبول صورت آدمی تھے۔ بھرا بھرا گول چہرہ تھا، چیچک کے دو چار داغ چہرے پر تھے جو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ نہ دبلے تھے نہ موٹے، بھرے بھرے شانے، ابھرا ہوا سینہ، غرض ایک خوش نما سراپا ان کا تھا۔ سر پر بال گھنے تھے اور بیچ سے مانگ نکالتے تھے۔

لباس نہایت خوش پوشاک آدمی تھے اور دوسرے شہروں میں کیا لکھنؤ میں بھی مشرقی وضع کے ملبوسات کا ذوق، اچھا ذوق رکھنے والا ان سے بہتر شاید ہی کوئی رہا ہو۔ میں نے تو لباس میں وہ نفاست بہت کم دیکھی ہے جو انہیں ملحوظ رہتی تھی۔ ہمیشہ سیاہ ایرانی ٹوپی لگاتے تھے، اور اچکن کبھی حیدرآبادی وضع کی (شیروانی) اور کبھی ایسی کہ جس کی چولی یعنی قریب ناف تک شمسی جیسی تیز گھنڈیوں اور تکموں کا ایک سلسلہ ہوتا تھا، پہنا کرتے تھے۔ جامہ زیب ایسے تھے کہ ہر لباس ان پر نہایت موزوں اور اچھا معلوم ہوتا تھا۔

عادات و اخلاق بڑے ہی مہذب لیکن شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج تھے، ملاقات کے وقت خفیف سا تبسم دل میں گھر کرتا تھا، باتوں کی ٹل انسانی نگاہوں کی محبت ریزی اور موقع موقع سے بے ساختگی کے ساتھ ظرافت کی چاشنی مضمون میں گرمی پیدا کرتی اور دلوں کو نہال کر دیتی تھی۔ اہل ددھیال کی طرف صد درجے کا التفات تھا اور ایثار تو گویا ان کا شعار تھا۔ اہل ددھیال سے تجاوز کر کے جناب بلکہ اہل برادری کے لئے بھی دریغ نہ کیا جاتا تھا۔

شاگرداوران کے ساتھ خصوصی برتاؤ اور شفقت مولانا عزیز کے شاگرد تو صدہا ہیں لیکن جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا وہ (۱) نواب جناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر (محمود آباد) (۲) صاحب جناب راجکمار محمد امیر حیدر خاں صاحب (محمود آباد) (۳) پنڈت موہن لال صاحب رواں (اناؤ) (۴) نواب میرزا جعفر علی خاں صاحب اثر (لکھنؤ) (۵) سید حسن خان صاحب جوش (ملیح آباد) (۶) گوپی ناتھ صاحب امن (لکھنؤ) (۷) سید علی صاحب آشفتہ (لکھنؤ) (۸) ادیب صاحب (لکھنؤ) برادر جناب امن لکھنوی۔ (۹) جگر صاحب (بریلی) اور (۱۰) مرزا تصدق حسین صاحب صدق (حال مقیم راے بریلی) ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی حضرات حقیقتاً ان کے شاگردوں میں ممتاز ترین درجہ رکھتے ہیں ——— ایک صاحب اور بھی ہیں جو باعتبار شاعری قابل ذکر ہیں۔ ان سے میرا تعارف تو کبھی نہیں ہوا لیکن اکثر رسائل میں ان کا کلام دیکھا ہے۔ وہ بھی عزیز صاحب کے مشاہیر شاگردوں کی صف میں آتے ہیں اور اس صف میں بھی امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کا کلام مدارس کی بعض نصاب کی کتابوں میں بھی داخل ہے ——— وہ ہیں تسکین سوروتوی۔

جن تلامیذ سے ملاقات سے ان سے بارہا عزیز صاحب مغفور کا ذکر آیا، سب ان کو ایسی محبت سے یاد کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے شفیق باپ یا مربی کو یاد کرے۔ جوش صاحب قوم کے پٹھان ہیں اور ایسی باتوں میں یوں بھی کوئی مادی لطف یا منفعت نہیں، اس لئے انہیں تو کبھی رنج و افسوس کے ساتھ استاد کو یاد کرتے نہیں دیکھا، باقی سب کو تو ان کی شفقت اور شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے گویا اشک بار دیکھا ہے۔

رواں صاحب کا انتقال حضرت عزیز مرحوم کی حیات ہی میں ہو گیا، لیکن مسلم یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں ان کو میں نے کمال احترام و عقیدت اور خلوص و محبت سے عزیز صاحب کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی استادی پر مباہات کرتے ہوئے اور ان کی اصلاحوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے سنا ہے۔ معلوم نہیں عزیز صاحب کا ان کے سامنے انتقال ہوتا تو اس صدمے کو وہ کیونکر برداشت کر سکتے۔

خاندان عزیز صاحب لکھنؤ کے ایک عالی نسب مغل خاندان سے تھے، ان کے والد میرزا محمد علی صاحب کا شمار اس زمانے کے اکابر علماء

میں تھا اور صاحبِ تصانیف تھے، ایک کتاب نجوم السماء تو ان کی بڑی مشہور تصنیف ہے۔ مشاغلِ علمی کو عزیز صاحب کا پیشۂ خاندانی سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے (جناب عزیز کے) بڑے بھائی مرزا محمد مہدی، لکھنؤ کے حاذق اور مشہور اطباء میں تھے اور اس فن میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ میں نے بھی بارہا ان کی زیارت کی ہے، ہمیشہ ان کے گرد طالبانِ علم طب کا مجمع دیکھا اور مطب کو مریضوں سے بھرا ہوا پایا۔

علم و فضل اور شاعری

شاعری کا تو کہنا ہی کیا کہ ان کے اس کمال کو ہندوستان اور پاکستان کے گوشے گوشے میں شہرتِ تام، قبولِ عام اور بقائے دوام کے درجات حاصل ہیں، البتہ علم و فضل کے حدود عموماً معلوم نہ ہوں گے، سو عزیز صاحب فارسی کے مستند عالم اور عربی کے منتہی فاضل تھے، استعدادِ فطری اور ذہانت خداداد تو تھوڑے ہی سے علم کو بہت کچھ کر دکھاتی ہے، اور یہاں تو فضیلتِ علمی کے ساتھ فطری مواہب اور کتب بینی کے انتہائی شوق نے چار چاند لگا کر علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کی صفوں میں ہمیشہ انھیں ممتاز رکھا۔

اس مضمون میں ان کی شاعرانہ خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی جسارت "نجی زندگی" اور ذاتی کردار" سے تجاوز کی مرادف اور موضوع سے خارج ہوگی، اس لئے حضرت مولانا عزیز کا یہ تعارف اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ ختم کرتا ہوں: بس اتنا ہی اور کہوں گا کہ جناب مغفور شاعری کے اعتبار سے اتنا ہی بلند پایہ رکھتے تھے جتنے بلند وہ خود، حسن فطرت اور کمال انسانیت کے اعتبار سے تھے ——— اور ہے بھی یہی کہ انسانیت اگر کہیں ناقص ہے تو شاعری بھی اسی نسبت سے ناقص ہوگی، ضرور ہوگی، چاہے کوئی ناظم ظاہر میں لفظوں کا طلسم ہی کیوں نہ باندھے یا ابلہ فریبی کے لئے اِدھر اُدھر سے ذلہ ربائی کرکے اپنے کو شاعر ثابت کرنے کی ان تھک کوشش ہی کیوں نہ کرے ——— صاحب نظر کی بارگاہ سے "اندازند" کو "می شناسم" کا خلعت، بہر حال مل جائے گا۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

خواجہ شمس الدین

واہ رے لکھنؤ تیری سرزمین میں کیسے کیسے باکمال اور زندہ دل لوگ پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کا مثل و نظیر اب ڈھونڈے گا اور نہ پائے گا۔ یہاں جو تھا اپنے رنگ میں بے مثال تھا۔ جس نے جو وضع و قطع اور جو طور طریقہ اختیار کیا مرتے دم تک اس کو نباہ گیا۔ حسن اخلاق، خوش مزاجی وضعداری تو یہاں کے شرفا کی گھٹی میں پڑی تھی، لطف طبع، مروت، رواداری اور سیر چشمی عام تھی، اسی لئے یہاں کا آدمی کہیں بھی جاتا بیگانہ رہتا اور صاف پہچان لیا جاتا کہ لکھنؤ کا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو شاعری، موسیقی، بدیہہ گوئی اور ظرافت و خوش طبعی سے فطری لگاؤ تھا۔ زمانہ کے تغیر اور وقت کے انقلاب نے یہاں کے خصوصیات کافی حد تک بدل دیئے ہیں اور کیا عجب ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد لکھنوی اور غیر لکھنوی میں جو امتیاز چلا آتا ہے وہ ختم ہو جائے۔ لکھنوی خصوصیات کے حامل بکثرت یہاں نظر آتے تھے کہ دیکھتے دیکھتے صفحہ ہستی سے اٹھ گئے اور جو چند باقی ہیں اٹھتے جا رہے ہیں، لیکن کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی اگر ہم ان مشاہیر کو دلوں سے بھلا دیں اور ان کا تذکرہ ثبت نہ کریں جن سے لکھنؤ کی زیب و زینت تھی اور جن کی بزرگ ہستیوں پر لکھنؤ بجا طور سے فخر کر سکتا تھا۔ ایسے ہی حضرات میں ایک نمایاں اور قابل قدر شخصیت مرحوم خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی بھی تھی۔ ان کے ادبی خدمات اور علمی و لسانی کمالات پر میں اس وقت روشنی ڈالنا نہیں چاہتا کہ یہ ایک مستقل کام ہے جس کے واسطے کافی وقت اور فرصت درکار ہے بلکہ میں ان کے ذاتی اور شخصی حالات اور ان کے اخلاق و عادات پر مختصراً کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا تھے اور کن صفات کے انسان تھے، اردو لٹریچر کی انہوں نے جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمتیں کیں وہ ارباب ادب اور اہل زبان سے پوشیدہ نہیں ہیں، [illegible] رسالہ یا اخبار تھا جس میں ان کے مضامین کثرت سے [illegible] شائع نہیں ہوئے، اس کے علاوہ ان کی تصانیف و تالیفات خود گواہ ہیں کہ مرحوم وہ کام کر گئے جو دوسرے نہ کر سکے۔ ان کی سیرت کے متعلق مجھے قلم اٹھانے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی، وہ میرے ماموں تھے اور میری حقیقی [illegible] اور ان کا سایہ عاطفت [illegible] مرحوم خواجہ قطب الدین [illegible] لکھنؤ کے [illegible] تھے اور [illegible] آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا ان کو [illegible] دیکھتے

احاطہ خانساماں میں تھے اور چوک میں والد مرحوم نے اپنے نامی پریس کی مطبوعہ کتابوں کی جو دوکان رکھی تھی اس کے تمام انتظامات اور کام ان کے اور ان کے منجھلے بھائی خواجہ غلام محمدؒ مرحوم کے زیر نگرانی کر رکھا تھا یہ دوکان جو ٹھیک وسط چوک میں وارد غہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے واقع تھی، بڑے موقع کی دوکان تھی اس زمانے میں لکھنؤ کا چوک سارے شہر کا مرکزی مقام اور گزرگاہ خاص و عام تھا، عہد شاہی سے دستور تھا کہ تمام جلوس اور باراتیں چوک سے نکلتی تھیں۔ تیسرے پہر سے آدھی رات تک۔ چوک کی گرم بازاری کا وقت تھا، تین بجے سے میونسپلٹی کے بہشتی اکبری دروازہ سے گول دروازہ تک پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے کہ زمین ٹھنڈی رہے اور گرد و غبار بیٹھ جائے۔ پھر سارے شہر کے اشراف و رؤسا اور لکھنؤ کے زندہ دل نوجوان اور ہر فن کے اہل کمال تفریح، ملاقات احباب یا خریداری کے لئے یہاں آتے تھے، مختلف دوکانیں ان کی نشست گاہیں تھیں جن میں شہر کے اہل علم و ادب اور چیدہ حضرات کی سب سے بڑی نشست گاہ خواجہ صاحب کی دوکان تھی، دن کو دوکانداری رہتی تھی سر شام سے دوکانداری تو بند ہو جاتی تھی۔ اور اہل سخن کا مجمع لگ جاتا تھا میں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔ مولانا شررؔ، ریاضؔ، تسلیمؔ، آغا حشر کاشمیری، رشید دولہا صاحب عروجؔ، عارفؔ، حسرت موہانی، وفاؔ، مرزا محمدؐ عسکری، شمشادؔ، عزیزؔ، محشرؔ، وسیمؔ، اور خدا جانے کتنے اہل سخن اور شعراء آیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مولانا محمد حسین آزاد مصنف آبحیات بھی جب لکھنؤ آئے تھے تو کئی بار اُن سے ملنے آئے تھے میں نے نہیں دیکھا مگر وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا شبلی اور ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی کہتے تھے کہ ان کی دوکان ان حضرات کی نشست گاہ رہ چکی ہے یہاں بیٹھ کر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، الفاظ و محاورات کی تحقیق ہوتی تھی اور زبان کے مشکل مسائل حل ہوتے تھے عموماً یہ مجلس ۹ بجے شب تک رہتی تھی مگر محرم میں جبکہ چوک کی رونق اور چہل پہل امام باڑوں کی روشنی، عزاداری اور تعزیوں کے جلوسوں کے نکلنے سے بہت بڑھ جاتی تھی خواجہ صاحب کو ۱۱ — ۱۲ بجے شب تک دوکان کھلی رکھنا پڑتی تھی، وہ آنے والوں کی خاطر و مدارات بھی بیحد کرتے تھے بغل میں میاں وزیر پان فروش کی دوکان تھی جن کے ہاتھ کی سفید پانوں کی معطر گلوریاں شہر بھر میں مشہور تھیں وہ خود تو پان بہت ہی کم کھاتے تھے مگر دوسروں کی تواضع وزیر کی گلوریاں مول لے کر بہت کرتے تھے میں ان کا چھوٹا تھا اور وہ میرے بزرگ تھے مگر جب میں ان کی دوکان پہ جاتا اسی وقت وزیر سے پان لے کر مجھے دیتے تھے خواجہ صاحب لاولد تھے اور مجھ کو بہت چاہتے تھے میرا بچپن کا زمانہ تھا اکثر ضد کر بیٹھتا تھا اور جس بات کی ضد کر بیٹھتا تھا اس کو ضرور پورا کرتے تھے، ان کی والدہ مرحومہ جو شاہی زمانہ کی تھیں مجھ سے بیحد محبت کرتی تھیں جمعہ کی چھٹی میں اکثر ان کے پاس جا کر رہتا تھا تو برابر میری خاطرداری اور ناز برداری میں لگی رہتی تھیں۔ راتوں کو شاہی وقتوں کے قصے سنایا کرتی تھیں اور میں بہت شوق سے سنا کرتا تھا، میری مرغوب چیزیں خود اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاتی تھیں، خواجہ صاحب اور ان کے بھائی خواجہ غلام محمدؐ اپنی ماں کے بیحد مطیع اور فرماں بردار تھے اور اس وصف میں میں نے آج تک کسی شخص کو ان کے برابر نہیں پایا ہر کام ماں سے پوچھ کر اور ان کے اشارہ پر کرتے تھے ماں کی جدائی کے خیال سے شہر کے باہر کہیں نہیں جاتے تھے، خواجہ صاحب مرحوم کو لکھنؤ سے باہر سفر کرنے کا بہت کم اتفاق ہوا، لکھنؤ کے لوگ یوں بھی سفر کرتے بہت گھبراتے ہیں اور وہ تو پورے لکھنوی اور شرفائے لکھنؤ کے صفات کے زبردست حامل تھے، ایک مرتبہ کسی نے پٹنہ میں اُن پر کوئی جھوٹا دعویٰ کر دیا اور ان کے نام سمن جاری کرا دیا جس کی جوابدہی کے لئے ان کو پٹنہ جانا پڑا کیا بتاؤں کہ پٹنہ تک جانا ان کو کیسا کھلا ہے اور اس کے لئے کتنے سامان کئے ہیں کہ شاید حج کے سفر کے لئے بھی کوئی اتنے سامان نہ کرتا، وہاں پہنچے تو پٹنہ کے قدرشناس لوگوں نے ان کی حد سے زیادہ آؤ بھگت کی، آنریبل خواجہ محمد نور صاحب نے اپنا مہمان بنایا اور وہاں کے رؤسا و امراء نے ان کی بہت عزت اور تکریم کی بڑے بڑے بیرسٹر اور وکیلوں نے ان کے مقدمہ کی مفت پیروی کی، ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور دعوتیں ہوئیں۔ آخر مقدمہ میں کامیاب ہو کر گھر واپس آئے۔ اہل عظیم آباد کی اس قدر دانی اور مہمان نوازی کی تعریف کیا کرتے تھے، لکھنؤ کے لوگوں کا جذبہ حب وطن تو واقعی قابل تعریف ہے۔ اور خدا معلوم یہاں کی زمین میں کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں کا تو کیا ذکر باہر کے لوگ آ جاتے ہیں تو لکھنؤ سے جانے کو ان کا دل نہیں چاہتا

مگر اس سے لکھنؤ والوں نے نقصان بھی بہت اُٹھائے ہیں۔ خواجہ صاحب بات کے بہت پکے اور قول کے بہت سچے تھے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ کسی سے وعدہ خلافی کرتے تھے جو وعدہ کر لیا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا، زبردست سے زبردست طاقت بھی ان کو وعدہ خلافی اور عہد شکنی پر مجبور نہ کر سکتی تھی الیکشن کے زمانہ میں اکثر دیکھا کہ کوئی امیدوار پہلے پہل پہنچ گیا اور اس سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا پھر بعد میں بڑے امیدوار اور ان کے بیسیوں دوست ان پر پڑے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور سب سے کہہ دیا کہ زبان کٹ جائے تو کٹ جائے قول سے پھر نہیں سکتا۔ اسی لئے صاف گوئی کی عادت تھی، مداہنت یا بناوٹ بالکل نہ تھی، اس کے ساتھ مروّت دار بھی بیحد تھے جو کام کسی کا اپنے بس کا ہوتا اس سے کبھی انکار نہ کرتے اور جذبۂ ایثار و مروّت میں شدید سے شدید نقصان بھی برداشت کر لیتے، وضعداری کی صفت اہل لکھنؤ کا حصہ تھی اور اس میں بھی خواجہ صاحب بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے، وضع، قطع، لباس، طور طریقے جو اختیار کر لئے تھے ان میں کبھی تبدیلی نہ کی، دیانت دار ایسے تھے کہ ہر شخص اُن کا اعتبار کرتا تھا، کسی کا ایک پیسہ اپنے ذمّہ باقی نہ رہنے دیتے تھے۔ مزاج میں عجلت پسندی تھی، باتیں بہت جلدی جلدی کرتے تھے، چلنے میں نہایت تیز رفتار تھے اور پیدل چلنے سے کبھی تھکتے نہ تھے، میں جب چھوٹا تھا تو محرم کی روشنی دکھانے لے جاتے تھے عشا کے بعد لیکر نکلتے تو صبح تک چلتے اور میں بھی روشنی دیکھنے کے شوق میں چلا کرتا سارے شہر کے امام باڑے دیکھتے اور دکھاتے، اور ہر ایک کے خصوصیات اور تاریخ سمجھاتے، لکھنؤ کا واقف کار ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا اسی لئے لکھنؤ کے تمدّن و معاشرت اور مشاہیر کے متعلق انہوں نے بے شمار مضامین لکھ ڈالے، ان کی دوکان پر یہاں کے اگلے اور شاہی زمانہ کے لوگ اکثر آ کر بیٹھا کرتے تھے ان سے ایک ایک بات پوچھتے اور یادداشت کے طور پر لکھ لیتے تھے پھر انہی یادداشتوں سے مضامین مرتب کرتے خود ان کی والدہ شاہی عہد کی تھیں اور اس زمانہ کے اکثر چشم دید حالات بیان کیا کرتی تھیں، خواجہ صاحب کو لکھنؤ سے یہاں کی زبان سے، یہاں کی بول چال سے، یہاں کی وضع قطع سے یہاں کے معاشرت اور تمدّن سے اور یہاں کے باشندوں اور یہاں کی عمارتوں سے بیحد عشق تھا اور یہاں کے قدیم حالات جاننے کی ہمیشہ فکر رہتی تھی، افسوس یہ ہے کہ انہوں نے یہاں کے متعلق مختلف عنوانوں پر مضامین تو بے شمار لکھے جو تمام ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوئے مگر کوئی مستقل کتاب ترتیب نہ دی، اب ان مضامین کا کہیں پتہ نہیں کتاب ہوتی تو محفوظ رہتی، لوگ ان کے مضامین کے بیحد گرویدہ تھے اور رسائل و اخبارات کے اڈیٹر و احباب کی ہمیشہ ان سے طلب جاری رہتی جو کبھی ختم نہ ہوتی، ملک بھر کے رسائل و اخبارات ان کے پاس ہمیشہ مفت آیا کرتے جن کے پڑھنے کا بھی ان کو موقع نہ ملتا، اکثر ان میں سے بند کے بند میں اُٹھا لاتا تھا اور پڑھا کرتا تھا خواجہ صاحب مرحوم نے یوں تو ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں لیکن اودھ اور لکھنؤ پر انہوں نے جو مضامین تحریر کئے وہ بیحد مقبول ہوئے اور ان کو خود بھی اس موضوع پر زیادہ دلچسپی تھی اور بڑے شوق و ذوق سے اس پر قلم اُٹھاتے تھے مجھے یاد ہے کہ جب ان کا ایک مضمون قدسیہ بیگم ملکہ و محبوبۂ نصیر الدین حیدر بادشاہ پر شائع ہوا اور غالباً زمانہ کانپور میں وہ نکلا تھا تو تمام ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور بہت سے اخبارات و رسائل نے اس کو نقل کیا اسی طرح غازی الدین حیدر بادشاہ کے جشن تاج پوشی کا بھی مضمون تھا، ایک مضمون بادشاہ نصیر الدّین حیدر پر بھی لکھا تھا جن کے عہد میں لکھنؤ کا پورا شباب تھا۔ ان کی دوکان شہر کے پُرانے اور جہاں دیدہ لوگوں کی سب سے بڑی نشست گاہ تھی ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو عہد شاہی کا تماشا تیس تیس چالیس چالیس برس کی عمر تک دیکھے ہوئے تھے خود ان کی والدہ عہد شاہی کی تھیں ان لوگوں سے تمام حالات پوچھ کر قلم بند کرتے جاتے، اسی لئے ان کے معلومات بیحد وسیع تھے اور جب کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو اس کا حق پورا کر دیتے، مولانا شرر مرحوم نے بھی لکھنؤ کے تمدّن پر بہت لکھا ہے مگر خواجہ صاحب کے معلومات اور مضامین ان سے بہت زیادہ تھے شرر مرحوم کو لکھنؤ سے باہر رہنے کا بہت اتفاق رہا ہے اور جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ مضافات لکھنؤ میں پیدا ہوئے خواجہ صاحب چند روز کے سوا کبھی لکھنؤ سے باہر نہ نکلے، وہ ان کی ولادت لکھنؤ کے مشہور محلہ سالار خاں اسماعیل میں ہوئی۔ خانگی تفکّرات سے ہمیشہ آزاد رہے، اولاد کا جھگڑا نہ تھا، گھر کا سارا کام والدہ کے ذمّہ تھا جو بڑی منتظم اور محنتی تھیں، انگریز افسروں کو اُردو پڑھانے کے چند ٹیوشن بیش قرار تنخواہوں پر جب سے مل گئے تھے۔

ملازمت والد مرحوم کی بھی ترک کر دی تھی۔ اور چوک میں اپنی ذاتی دوکان کتابوں کی کر لی تھی، جتنا وقت ملتا تھا زبان کی تحقیقات، کتابوں کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف و تحریر مضامین میں صرف کرتے تھے، اردو کے متعلق ان کی تصانیف بکثرت تھیں جن کو والد مرحوم کے پریس میں چھپواتے اور فروخت کرتے، مضامین جو رسائل و اخبارات کو بھیجتے ان کا کبھی کوئی معاوضہ نہ لیتے، شوق تحریر و مطالعہ اتنا تھا کہ آدھی آدھی رات تک جاگا اور لکھا پڑھا کرتے، وہ ایک ایسے متحرک اور شاغل انسان تھے کہ آرام لینا اور خالی رہنا جانتے ہی نہ تھے جب دیکھو کسی نہ کسی کام میں مشغول ہیں انہوں نے اپنی زبان یا قلم سے کبھی کسی کی برائی یا عیب گیری نہیں کی، اپنے آپ کو نہ کبھی بڑا سمجھا نہ کسی کے سامنے اپنی بڑائی کی، ہر شخص سے بہت ہی جھک کر ملتے اور انکساری برتتے، تھے تو لکھنؤ کے مگر کھانے پینے کے یا لباس کے ذرا بھی شوقین نہ تھے، تندرستی ۴۰ - ۴۵ برس کی عمر تک تو بہت اچھی رہی بیماری کا نام بھی نہ جانتے تھے مگر اس کے بعد ایک بار درد گردہ اٹھا جو پتھری کے سبب سے تھا اور اس کا سلسلہ کچھ ایسا بڑھا کہ ختم ہی نہ ہوا، درد گردہ کے دورے نے جو کبھی کبھی پڑتے رہتے تھے ان کی تندرستی بگاڑ دی باوجود اس کے ہمت ایسی تھی کہ جس طرح کام پہلے کرتے تھے اسی طرح جاری رکھا کسی بات میں فرق نہ آنے دیا، دور دراز مقامات پر انگریزوں کو پڑھانے جانا، دوکان پر بیٹھنا، سیکڑوں خطوں کا جواب لکھنا جو ان کے شاگردوں کے یا بیرونجات کے لوگوں کی زبان یا شاعری کے متعلق استفسار کے آتے تھے غزلوں پر اصلاح دینا، مضامین اور تالیفات مرتب کرنا، یہ اور ان کے علاوہ بہت سے کام تنہا انجام دیتے رہتے، اور بیماری کی تکالیف کی پروا نہ کی آخر قوٰے کمزور پڑتے چلے گئے اور دماغی و اعصابی کمزوری نے پلنگ پر لٹا دیا والدہ کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا، بہن کی شادی ہو چکی تھی، ان کے غمگسار اور تیمار دار یا تو ان کی بیوی تھیں جن کی خود تندرستی بہت خراب رہتی تھی اور یا منجھلے بھائی خواجہ غلام محمد مرحوم تھے جو میونسپلٹی میں ملازم تھے مگر اس میں شک نہیں کہ ہمشیرہ محترمہ نے باوجود اپنی صحت خراب ہونے کے ان کی ایسی خدمت اور رفاقت کی کہ کم کسی بیوی نے اپنے شوہر کی کی ہو گی۔ آخر کار وقت اجل آ پہنچا اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے، اور لکھنؤ کا یہ نامور فرزند جو اس پر جان و دل سے فدا رہتا تھا اپنے مسکان واقع احاطہ خانساماں سے متصل خاندانی قبرستان کے ایک گوشہ میں پہنچ کر قیامت تک کے لئے محو خواب ہو گیا۔

اے پیارے عزیز وطن! تیرے ایسے چاہنے والے اور تمام ملک میں تیری نیک نامی کو اس طرح پھیلانے والے اب کہاں پیدا ہوں گے، کیا لوگ تھے اور کیا صورتیں تھیں کہ دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(میرؔ)

مولانا صفی لکھنوی

ممتاز حسن جونپوری

مولانا سید علی نقی صفی ۳ جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ کی شعر و ادب نواز سرزمین میں پیدا ہوئے اس وقت وہاں اُردو کو وزراء کے محلوں اور شاہان اودھ کے درباروں میں پرورش پاتے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ سرتاپا پرتکلف، رسمی اور رنگین الفاظ کی خلعت میں ملبوس تھی۔

مولانا صفی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لکھنؤ کی شاعری میں اصلاح اور ادب میں انقلاب پیدا کرنے کا وہ کام اپنے ہاتھوں میں لیا جو دہلی اور پنجاب میں حالی اور آزاد نے انجام دیا۔ وہاں ان حضرات کو جان گلکرسٹ جیسے ادب پرور حکام اور سرکار کی امداد میسر تھی۔ لیکن ان کی کوششوں کا اثر لکھنؤ پر نہیں پڑ سکا تھا۔ اس ضمن میں مولانا صفی نے جو کوششیں کیں ان میں وہ بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کے ثبوت میں ہم بعض دستاویزی شہادتوں کے علاوہ ان چشم دید گواہوں کو پیش کریں گے .. .. جنہوں نے انیسویں صدی عیسوی میں دبستان لکھنؤ کی آخری بہار دیکھی اور جو آج بھی صدی کا تین چوتھائی حصہ طے کر کے ستارۂ سحر کی طرح جھلملا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صفی کے کارناموں سے اردو ادب کی تاریخ خالی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صفی نے خود اپنے ساتھ دشمنی کی ہے۔

مولانا صفی ایک خاموش اور عافیت پسند شاعر تھے۔ آپ ایک گمنام حاتم کی طرح اردو ادب کو کچھ دے گئے لیکن بہت کم لوگ آپ سے روشناس ہو سکے۔ مختلف اصناف میں آپ نے ایک لاکھ سے کم شعر نہ کہے ہوں گے لیکن آج یہ سب قارون کے خزانے کی طرح لاپتہ تھیں۔ چھ سال کی جانکاہ محنت کے بعد آپ نے عمر خیام کی بارہ سو رباعیوں کی صحت کر کے ان کا منظوم ترجمہ کیا اور تصویروں کے خاکے بنائے لیکن ایسی مفید اور بیش بہا چیز بھی شرمندۂ طباعت نہ ہو سکی۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ ایسی تاریک گمنامی میں گذرا کہ مدتوں آپ لکھنؤ کے مشاعرے کے لئے غزل کہتے اور دوسروں کو دے دیتے۔ یہ لوگ مشاعروں میں پہنچ کر یہی غزلیں اپنے نام سے سناتے اور واپس آکر بڑے فخر کے ساتھ صفی سے اس داد و تحسین کا ذکر کرتے جو شاعرے

میں نہیں ملتی تھی۔

صفی نے ساری عمر کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا اور ان کے کلام کا تمام نکھار ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے ایک نامور شاگرد مولانا عزیز مرحوم نے اس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے کہ ؎

اس کا شاگرد ہوں جس کا نہیں استاد کوئی

مولانا صفی نے رؤسا و امرا کی مدح کر کے پیٹ نہیں پالا۔ مشرقی اور مغربی علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے ۱۸۸۳ء میں محکمۂ دیوانی کی ملازمت کر لی اور پیشکاری کے عہدہ سے پنشن لے کر علٰحدہ ہوئے۔ آپ کا دیوان آپ کی وفات کے بہت دنوں بعد چھپا اور اس وقت کوئی ایسا شخص نہ تھا جو تاریخ اردو ادب کے مؤلفین کے سامنے صفی کی حقیقی شخصیت کو پیش کرتا اور ان کے تاریخی کارناموں پر روشنی ڈالتا۔ یہ بات کتنی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو بہر حال اپنی جگہ پر حقیقت ہے۔ تاریخ اردو ادب مرتبہ رام بابو سکسینہ میں بھی اصلاح زبان کے سلسلے میں مولانا صفی کے شاگردوں اور پھر ان شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر تو وضاحت سے موجود ہے لیکن انتہائی عبرت اور حیرت کا مقام ہے کہ اس میں خود صفی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس اہم واقعہ کی تائید مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "اردوئے معلّٰے" میں اور مرزا جعفر علی خاں اثر نے اپنی ایک نظم میں بھی کی ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔

لکھنؤ کی شاعری اور ادب کے رنگ اور اصلاحات کی داستان بہت طویل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ناسخ نے الفاظ کی تراش خراش اور استعمال میں ندرت پیدا کرنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے اور ان کے ذی علم تلامذہ نے بھی ترتیب لغات میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لکھنؤ سکول کے پرانے رنگ کی اصلاح کے لئے مولانا صفی نے بھی ناسخ اور ان کے تلامذہ سے کچھ کم خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ ذیل میں ان دونوں "مصلحین" کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے۔

ناسخ (مصلح اصطلاح و تدوین الفاظ)

- رشک (مؤلف لغت اردو)
  - جلال لکھنوی (مصنف رسالہ تذکیر و تانیث و رسالہ عروض)
    - آرزو لکھنوی (مصنف نظام اردو)
- مہر
- خواجہ وزیر
- منیر شکوہ آبادی (موجد قیود اعلان نون وغیرہ)
  - شہید جونپوری (محقق)

صفی (مصلح طرز تخیل قدیم)

- مولانا عزیز
  - اثر لکھنوی
  - جوش ملیح آبادی
  - رواں
- ظریف لکھنوی (مبلغ دفتر زن معترضہ رنگ)
- صغیر مرحوم (ایڈیٹر "پھلجھڑی")
- حامد (بیرسٹر) (آپ انگریزی شاعری میں لارڈ ٹینی سن کے شاگرد تھے)

مولانا صفی نے لکھنؤ کے رنگ شاعری اور تخیّل کی اصلاح کے لئے طرح طرح سے جہاد کیا۔ غدر کے بعد جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلاب رونما ہوئے اُردو زبان میں انگریزی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور اس میں بھی ایک انقلابی لہر دوڑ گئی منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "اودھ پنچ" نکالا۔ اور صفی لکھنوی نے تین چار انگریزی دان ادیبوں کو ڈھونڈ کر ان کے اصلاح تخیّل کا تہیہ کیا۔ ان میں ڈاکٹر مرزا محمدؐ ہادی رسوا اور منشی سجاد حسین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ کے رنگ قدیم اور تخیّل پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ مدتوں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں لیکن صفی نے ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے منشی سجاد حسین کی معیّت میں اپنے چھوٹے بھائی ظریف کو تیار کیا اور ظرافت اور مزاح کے ذریعے زلف و دہن اور کمر والی لکھنوی شاعری پر حملہ شروع کیا۔ اس کی تفصیل کے لئے دیوان ظریف کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

۱۸۹۵ء میں صفی کے مکان پر "دائرہ ادبیہ" کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی، جس میں نظم کے موضوع دیئے جاتے تھے اور پھر ان پر نظمیں لکھی جاتی تھی۔ اس سے قبل ۱۸۸۱ء میں صفی نے خود ایک معرکہ آرا قومی نظم "نخل فریاد" کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اصلاح تخیّل کے لئے صفی کے محبوب ترین اور خوش گو شاگرد صغیر مرحوم نے لکھنؤ سے ایک رسالہ "پھلجھڑی" نکالا۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ صفی اپنے عہد کا رنگِ تخیل بدلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس ضمن میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے اپنے رسالہ اردوئے معلّیٰ میں لکھا ہے:۔

"نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر شاہان اودھ کے زمانے میں غزل اور اس کی تخیّل کا جو انداز تھا وہ اُردو داں اہل ادب دقیقہ شناس نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی تاسّی و پیروی میں کیا بلحاظِ لفظ و بندش اور کیا بلحاظ تخیّل جس طرح شعرائے لکھنؤ منہمک تھے اس میں ترمیم و اصلاح کی ہمت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مولانا صفی کی زندگی اور شاعری کا ایک کارنامہ ہے۔"

واقعی مولانا صفی کی شخصیت کا یہ ایک فلک رفعت کارنامہ ہے اور اگر مولانا کی شخصیت میں کوئی اور بات نہ ہوتی تو بھی یہ اصلاح و تصحیح تاریخ ادب میں ان کا نام زندہ اور تابندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔ یقیناً اس سلسلے کی اور کڑیاں بھی ہیں اور مدارج اصلاح و ارتقائی منازل میں اور لوگوں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہل کا سہرا ہر حال میں مولانا صفی ہی کے سر رہے گا۔ انہیں اس حق سے کسی صورت محروم نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی خدمات سے انکار کرنا یا ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی خیانت ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ انہوں نے خود رسالہ معیار اصلاح تخیّل کے لئے نکالا اور انجمن معیار قائم کی جس کے وہ مرتے دم تک صدر رہے۔ چکبست، علامہ اقبال اور ڈاکٹر مرزا محمدؐ ہادی کے علاوہ ادب کے تمام معیاری اور مستند مصلح مولانا صفی کی عظیم المرتبت شخصیت کے قائل ہیں۔

صفی کی شخصیت میں شاعری کے وسیلے اور ان کی دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کے اور بھی گوشے ملتے ہیں۔ آپ نے لوگوں کے ذہنوں میں مد و جزر پیدا کیا۔ اپنی نظموں کے ذریعے کئی رفاہی منصوبوں کی داغ بیل ڈالی۔ کالج اور سکول کھلوائے، یتیم خانہ قائم کرایا اور صنعتی ترقی کے لئے لوگوں کو عملی اقدام کی طرف مائل کیا اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے جو قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اُردو زبان کی تمام پابندیوں اور خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی شعری قدر و قیمت کے پیش نظر ہندوستان کے کسی شاعر نے ان سے بہتر نظمیں نہیں کہی ہیں۔ آپ کی نظموں کے مجموعے "لختِ جگر" اور "صحیفتہ المنظوم" ہمارے اس دعویٰ کا روشن ثبوت پیش کرتے ہیں۔

مولانا صفی نے ملک کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے لیڈروں اور رہنماؤں کی منظوم سوانح عمریاں بھی لکھیں ہیں اور ایک لحاظ سے اردو میں یہ کام سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے قومی نظموں میں کارآمد تاریخی اور جغرافیائی حالات کا ذکر بھی پٹری بندی کے عنوان سے شروع کیا۔ جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے ؎

اس چمن بندی کا موجد میں ہوں واقف ہے جہاں — نظم میں تاریخی و جغرافیائی پٹریاں

مولانا صفی اُردو کی طرح فارسی کے بھی بڑے زبردست ادیب اور شاعر تھے۔ میں نے آپ کے صدہا شاگردوں کو سُنا ہے لیکن آپ

کی شخصیت کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جبکہ ان کے ایک شاگرد مولانا عبدالرحمان ہفت زبان نے بتایا کہ مولانا صفی ان کے عربی، فارسی اور اردو کلام پر بیک وقت محققانہ انداز سے اصلاح دیا کرتے تھے اور اب ان کے مرنے کے بعد ایسی جامع شخصیت کا حامل اور کوئی شاعر نہیں ہے۔

ایک قومی جلسے میں صفی مرحوم نے جیسے ہی قومی ترانے کا مطلع پڑھا تو علامہ اقبال جو اس وقت جلسے میں موجود تھے جوش میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک صفی ترانہ پڑھتے رہے اقبال سر جھکائے کھڑے رہے۔ اس ترانے کے چند شعر یہ ہیں :-

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے   مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے   بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں   کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے   اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اس جوشیلی نظم کے جواب میں کرسچین سوسائٹی کی طرف سے بھی محض شاعری منہ چڑانے کی خاطر ایک نظم شائع کی گئی اور انگریز حکام کی طرف سے بھی صفی پر دباؤ ڈالا گیا۔ لیکن صفی کی ہمت، بیباکی اور کردار کی عظمت ملاحظہ ہو کہ آپ نے ایک اس سے بھی زیادہ زوردار نظم کہی جسے ہم لوگوں نے چھپنے نہ دیا۔ البتہ ظریف مرحوم نے جواب میں " افیونیوں کا رجز نامہ " کے عنوان سے ایک بڑی دلچسپ نظم لکھی جو آج بھی ان کے مجموعۂ کلام " دیوانجی " میں بھی عیسائیوں کی اس پھسپھسی نظم پر خندہ زن ہے۔

ایک باکمال اور ذی علم ادیب و شاعر کی سے قطع نظر بھی صفی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اگر وہ اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے مختلف تعزیرات شاعری کو محسوس کرنے اور برتنے کی صلاحیت نہ رکھتے اور بوستان شاعری کی پچھتر سال خوشہ چینی نہ کرتے تو بھی ان کی ذات اتنی ہی لائق احترام اور قابل ستائش ہوتی۔ دراصل ان کی شخصیت کئی جدا جدا شخصیتوں کا مجموعہ تھی۔

انہوں نے عربی اور فارسی پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انٹرنس تک باقاعدہ انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمت، عدالتی کام، شاعری، آرام اور دیگر ضروریات سے جو وقت بچ رہتا تھا وہ اسے کسی نہ کسی علمی یا فنی کتاب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ کتب بینی میں آپ کی ہمہ وقت مصروفیت کی تصویر کشی مشہور ایڈوکیٹ اور ادیب سید کلب عباس صاحب نے اس طرح کی ہے :-

" کسی وقت بھی کوئی جائے — وہ مولانا کو کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوا پاتا تھا۔ اکثر وہ مطالعے میں اتنا مستغرق رہتے تھے کہ جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جائے آنے والے کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ مگر جونہی آنکھ پڑ جاتی ان کا شگفتہ چہرہ پھول کی طرح متبسم ہو جاتا اور چمکتی ہوئی پُربصیرت آنکھیں اس طرح ٹکٹکی لگا دیتیں کہ گویا انہوں نے اس سے عمدہ منظر کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔"

مولانا صفی ہمیشہ سیر و شکار، تفریح، دوستوں کی بکثرت ملاقات، گپ بازی، میلوں، جلسوں اور کھیل تماشوں سے الگ تھلگ رہے۔ آپ سے میرے مراسم کم و بیش ساٹھ سال کے تھے اور اکثر مجھے ان کے یہاں مدتوں رہنے اور ساتھ زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ادبی ذوق اور قومی معاملات میں بھی میں ان کا ہم مشرب اور ساتھی رہا۔ بہت سے علمی و ادبی مباحث میں بھی تبادلۂ خیال اور بڑی بے تکلفی سے گفتگو کا موقع ملا۔

اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرے نزدیک مولانا کی زندگی ایک پُرسکون تالاب یا جھیل کی مانند تھی جس کی سطح ہمیشہ ہموار اور روشن رہتی ہے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک انتہائی مضبوط کردار کے حامل فرد تھے۔ یہاں تک کہ ان کے قدم جوانی کی عام بدمستی کے عالم میں بھی نہیں بہکے، غالباً یہی وجہ تھی کہ نوّے سال کی عمر میں بھی ان کے چہرے پر جھریوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور ان کے چہرے کا نکھار آج کل کے بیشتر نوجوانوں کے پُرشکن رخسار اور حلقۂ گیر چشم پر طعنہ زن رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ تمام دنیاوی امور

سے پوری طرح باخبر تھے اور کسی بھی موضوع کو شاعرانہ جولانیوں کے ساتھ بیان کرنے پر اس بلا کی قدرت رکھتے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے وہ ان کا اپنا حال معلوم ہوتا تھا۔ مثال کے لئے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

اظہارِ خیال پر کمال قدرت کی سب سے بڑی وجہ غالباً مولانا صفی کا مشغلۂ کتب بینی ہی تھی۔ صراح و قاموس اور فارسی کے لغات بہارِ عجم اور غیاث اللغات کے صفحات پر ان کی اتنی تحریری یادداشتیں درج تھیں کہ یہ صفحات اپنی جگہ ایک دوامی مدرسہ باعراق کے درسِ خارج کی صحبت بن گئے تھے۔

مولانا صفی عام طور پر اپنے گھر کی بیرونی نشست گاہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہ نشست گاہ کبھی پھوس کی بنگلیا ہوا کرتی تھی۔ اسے آج کے بہت سے نوعمر ادیبوں اور شاعروں نے نہیں دیکھا ہوگا کیوں کہ گزشتہ پچاس سال کے اندر اس میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

مولانا کی حیات میں یہ نشست گاہ ہزاروں اہل ذوق کا مامن تھی اور میں نے یہاں مولانا شبلی اور حالی جیسے بلند پایہ حضرات کو خود دیکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ آج یہی نشست گاہ پناہ گزیں پردیسیوں کا آستانہ بن کر رہ گئی ہے۔

مولانا کا گھر مسجد کے دروازے کی طرح ہر آنیوالے کے لئے کھلا رہتا تھا۔ آپ انتہائی سادگی کے ساتھ ہر ایک سے یکساں تواضع اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور بڑی سے بڑی فرمائش کی تکمیل کے لئے اس کشادہ دلی سے آمادہ رہتے تھے جیسے اسی کی تنخواہ پاتے ہیں۔ آخر عمر میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ اب الفاظ یاد نہیں آتے۔ مفہوم راہ بھولے ہوئے حافظے کے گرد منڈلاتے نظر آتے ہیں اور شعر کہنے میں لطف اور مزے کی بجائے تکلیف ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے ایک قومی نظم لکھنے کی فرمائش کی تو مولانا نے معذرت پر معذرت کر کے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ میری ناسمجھی اور خود غرضی کہ برابر اصرار کرتا رہا لیکن جب وہ کسی طور آمادہ نہ ہوئے تو شکستہ دل ہو کر چلا آیا ——— ابھی واپس آئے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مولانا کا فرستادہ نظم لئے ہوئے پہنچ گیا۔ میں نے اپنی طویل عمر میں اس انتہا درجہ کی وضع داری اور خیالِ خاطرِ احباب کی مثال نہ دیکھی ہے اور نہ سنی ہے۔

ایک بار مولانا کی قوتِ ادراک اور احساسات و مطالعہ پر مجھے بڑی حیرت ہوئی، لکھنؤ کے ایک تاجر حکیم صاحب مقوّی ادویہ کے لئے اشتہاری قسم کی ایک نظم کی خواہش لے کر مولانا کے پاس آئے۔ اور کوئی بھلا آدمی ہوتا تو یا تو ہمّت ہی نہ کرتا یا چند شعر کہہ کر ٹال دیتا لیکن مولانا نے نظم کہی اور وہ بھی اس دھڑلے کی کہ ناصری مرحوم نے، جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور ترتیب نصاب کمیٹی کے رکن تھے، طلبہ کے اخلاق کی اصلاح اور ترکِ عادات کے لئے اس نظم کو نصاب میں داخل کرا دیا، اس نظم کا عنوان غالباً "ما الحیات" ہے اور پہلا شعر یہ ہے ؎

ہنستی ہے ساری دنیا رنگت ہے زعفرانی
برباد اور کیجے اٹھتی ہوئی جوانی

یہاں نظم کی بلاغت اور پردہ ہی پردہ میں اظہارِ خیال پر قدرت کا ذکر کرنا مقصود نہیں بلکہ میں صرف مولانا کے کمالِ اخلاق اور منکسر المزاجی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔

مولانا صفی نے طب، فلسفہ، اور حکمت غرض کہ سبھی کچھ پڑھا تھا اور اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو کسی اور شعبہ میں اپنی عظمت کا لوہا منوا کر رہتے۔ لیکن یہ بھی ان کے کردار کی عظمت ہی کا ایک پہلو ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خاموشی کے ساتھ درس دیا۔ وہ نور کا ایک ایسا سرچشمہ تھے جن سے بیسیوں آفتاب پھوٹے لیکن خود انہوں نے اپنے آپ کو تاریکی اور گمنامی میں رکھنا پسند کیا۔ مولانا صفی لکھنوی پرانے بزرگوں کے اخلاق اور دل پذیر شخصیت کا نمونہ تھے۔ آج کل ریڈیو سٹیشن جا کر غزل یا نظم پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن مولانا صفی اس میں شاعری جیسے پاکیزہ فن کی اہانت تصوّر کرتے تھے اور زیادہ روپے کی ترغیب کے باوجود کبھی گھر سے نہ نکلے۔ منتخب اشعار کا معاوضہ دے کر اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کی بارہا خواہش ظاہر کی گئی لیکن وہ عزت اور احتیاج کے باوصف ہمیشہ ایک گوشہ نشین فقیر کی طرح ہاتھ سمیٹے بیٹھے رہے اور دستِ سوال دراز نہ کیا۔

سر تیج بہادر سپرو آنجہانی اور رائے بریلی کے تعلقہ دار راجہ مہندر سنگھ آنجہانی نے کئی بار چاہا کہ مولانا صفی اپنا دیوان ان کی مدد سے چھپوا دیں مگر ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات اور ان کے لڑکوں کے مرنے کے بعد مجھے اپنی بندوق بیچ کر اُردو کی لاج کے لئے ان کا دیوان شائع کرنے کا شرف حاصل کرنا پڑا۔

مولانا زندگی بھر اپنے آرام کے لئے دوسروں پر بار ڈالنے سے گریز کرتے رہے۔ ان کی وفات پر جوش ملیح آبادی نے "آج کل" میں مولانا کی غیور طبیعت اور وضع داری کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ:-

"طویل عمر اور لمبی علالت کو صبر و شکر کے ساتھ کاٹ دینا مولانا کے سوا کسی اور کا کام نہ تھا اور اگر ان کی سوکھی ہڈیوں کو کچھ اور راحت اور سکون میسّر آجاتا تو ابھی شاید کچھ اور جی جاتے اور اگرچہ عمرِ طبعی کو پہنچ گئے تھے لیکن ۱۵ رجون ۱۹۵۰ء کو یوں نہ مرتے"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مولانا دنیا کی صحبتوں اور ناچ رنگ کے جھمیلوں سے بہت دُور تھے مگر ہر رنگ سے باخبر تھے۔ ناچ رنگ لکھنؤ کے پُرانے نوابوں اور شرفا کی خاص خاص صحبتوں کا لازمہ بن چکا تھا۔ میرے ایک وضع دار شاہی وثیقہ دار کرم فرما اپنی ایک خاص محفل کا ذکر فرماتے تھے کہ اس میں رقاصہ کے سوا سازندوں میں سے کوئی نہ ہوتا تھا۔ بے تکلّف، عالی مرتبت ذمہ دار اور صاحب کردار احباب ہوتے تھے۔ کسی کے سامنے طبلہ ہوتا تھا، کسی کے ہاتھ میں مجیرا، کسی کے زانو پر سارنگی اور کسی کے پہلو میں ستار یا ہارمونیم۔ ادھر رقاصہ نے غزل چھیڑی ادھر ساز بجنے لگے، یہ بھی ہم مذاق شرفا اور پُرانے لکھنؤ کی صحبتوں کا ایک نقشہ تھا جواب نظر نہیں آتا۔

صفی یوں تو موسیقی کے رموز سے واقف اور ایسی صحبتوں سے باخبر تھے لیکن انہوں نے تمام عمر کسی ساز کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے باوجود وہ ایسی صحبتوں کا نقشہ تاریخ کے دامن پر اتارنے کے لئے ایک انتہائی یادگار، جاندار اور زندۂ جاوید شعر چھوڑ گئے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اس شعر پر میں نے انہی ضعیف العمر نواب صاحب کو بارہا یادِ شباب میں سر دھنتے اور آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

مولانا صفی ہمیشہ شیروانی، اُونچی دیوار کی ایرانی ٹوپی، قمیص اور چھوٹی مہری کا پاجامہ اور بوٹ پہنتے تھے۔ پان بہت کم کھاتے تھے البتہ حقّہ کے عادی تھے اور کبھی کبھی سگرٹ بھی پی لیتے تھے۔ تمام عمر مسکرات سے دور رہے کبھی کبھی نماز پڑھتے اور دو ایک روزے رکھ لیتے تھے۔ مجالس اور میلاد کی محفلوں میں کم جاتے تھے۔ نہایت غیر متعصب، آزاد طبع اور آزاد خیال تھے۔ مذہب میں ریاکاری کو بہت بُرا سمجھتے تھے اور نکتہ چینی اور اظہارِ رائے میں بڑے بے باک تھے۔ بعض شاعروں کی طرح تعلّی، دوسروں کی بدگوئی یا منقبت کبھی ان کا شعار نہ تھا۔ نہایت ہنس مکھ، خلیق، وضع دار اور نرم دل تھے اور سب کے شریکِ درد رہتے تھے۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے آپ کی وفات پر ایک مبسوط نظم صفی کے کردار اور شخصیت کے متعلق کہی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:-

وضعِ صفیؔ نہ پوچھو اک رندِ پارسا تھا بیگانہ بھی تھا سب سے پھر سب سے آشنا تھا
خلقِ خدا کی خدمت مقصدِ حیات کا تھا اس کے سوا نہ کوئی مطلب نہ مدعا تھا
بدلہ بدی کا نیکی دشمن کو دے کے ڈالا اس منزلت کا شاعر کیا کوئی دوسرا تھا
خلقِ حسن نے اس کے مل کر فروتنی سے ہر کہ و مہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا
صدق و خلوص و ایثار اس کی سرشت میں تھے جو قول یا عمل تھا بے ریب و بے ریا تھا
ظاہر سے تھی زیادہ باطن کی تابناکی عارف تھا خود نگر تھا صالح تھا باخدا تھا
غیرت کی پاسداری شیوہ تھا اس جری کا ایمان حیا کو سمجھا وہ صاحب حیا تھا

نازاں ہیں سب زباں پہ تجھ پہ زباں تھی نازاں　　　رنگِ سخن کچھ ایسا تو نے بدل دیا تھا
وہ تیری بذلہ سنجی وہ تیری خوش نوائی　　　پڑھتا تھا تیرا کلمہ پڑھتے جو سن چکا تھا

مولانا صفی کی بذلہ سنج طبیعت اور گرہ لگانے میں مہارت کے سلسلے میں کئی لطیفے مشہور ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک واقعہ کا ذکر کریں گے جو مولانا کے ایک نیاز مند قدر دان مرزا محمد سجاد تاجر بیان کرتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ صاحب مولانا کے ہمسایہ پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے گئے جو ٹیپو سلطان کے خاندان کے ایک معتمد فرد تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد سجاد صاحب مولانا سے بھی ملنے چلے گئے اور وہاں زبان سے نکل گیا کہ پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے آیا تھا۔ سوچا کہ آپ سے بھی مل لوں۔ مولانا نے بڑی خاطر تواضع کی اور جب وہ چلنے لگے تو متبسم ہو کر فرمایا کہ کہئے اب پھر پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے کب آیئے گا؟

مولانا صفی کا بے مثل اندازِ شعر خوانی ایسا تھا کہ اس میں ترنم تھا لیکن اسے موسیقی سے دُور کا تعلق نہ تھا۔ اس ضمن میں نے ایک تفصیلی اور مستقل مضمون بھی لکھا ہے

مختصر لفظوں میں مولانا صفی کی شعر خوانی کو انہی کے اس شعر کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

بہ حسنِ صوت گو مرغوب ہے طرزِ غزل خوانی　　　نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنّی نکتہ داں مجھ کو

مولانا صفؔی نے اپنی پُر اثر اور ہمہ گیر شخصیت کے بل بوتے پر اپنے لئے ایک خاص مقام تو ضرور پیدا کر لیا تھا لیکن آپ کو جو شہرت حاصل ہونی چاہیئے تھی اور ادب کی تاریخ میں آپ کو جو درجہ ملنا چاہیئے تھا وہ نہ مل سکا، اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ آپ طبعاً خلوت پسند تھے اور نام و نمود سے گریز کرتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ کہ آپ کے بعض حاسدوں نے لوگوں کے دلوں سے آپ کی حقیقی قدر و منزلت کم کرنے کے لئے بڑی تندہی سے کام کیا اور یہ باور کرا دیا کہ صفی صرف قومی نظمیں اچھی لکھ سکتے ہیں۔ اس طرح گویا ان کا وہ سارا ریاض اکارت گیا جو انہوں نے غزل کو پروان چڑھانے کے لئے کیا تھا۔

بہرحال اردو ادب کے لئے یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں کہ صفؔی جیسا بلند پایہ شاعر جس نے پون صدی تک ہر صنفِ شعر میں اپنی طبعِ رواں کے جوہر دکھائے، اتنی جلدی فراموش کر دیا گیا۔ اور اس کی شخصیت اور شاعری یوں برباد ہو گئی کہ صفی قبر کی آغوش سے اپنا یہ شعر سُناتے معلوم ہوتے ہیں ؎

یہ صلہ ہے عمر بھر کی محنتِ برباد کا
سننے بیٹھے ہیں وہ افسانہ دلِ ناشاد کا

تاجور نجیب آبادی

محمد وارث کامل

علی ساہیں کی مسجد کے عقب میں جہاں اپنے آخری موڑ پر فلیمنگ روڈ دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے پچھلی وضع کے مکانات بنے ہوئے ہیں انہی مکانات میں ایک وہ مکان بھی ہے جو ایک مدت تک شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی کی قیام گاہ بنا رہا ہے۔ علامہ سے میری پہلی ملاقات اسی مکان کے ایک کھلے برآمدے میں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۴ء کے موسم گرما کا شباب ڈھل چکا تھا لیکن پھر بھی اس تنگ و تاریک مکان میں دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا گمان تھا، اس بلا کی گرمی اور اس قیامت کا حبس تھا کہ دم گھٹتا جاتا تھا۔ علامہ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اپنے بھاری بھرکم جسم کی ایک ادنیٰ سی حرکت سے میرا خیر مقدم کیا اور کسی تمہید کے بغیر مجھ پر طنز و ظرافت سے ملے جلے الفاظ کے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔

"اچھا تو آپ ہیں میرے ہم وطن مولانا محمد وارث کامل بی اے۔ خوب، ماشاء اللہ! آپ تو بڑے نستعلیق دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا! آپ کافی عرصہ سے لاہور رہ رہے ہیں کبھی بھولے سے بھی آپ نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ میرے ڈیل ڈول کا آدمی جو روش عنایات پہ بار گراں بنا ہوا ہو کہاں کہاں جائے اور کس کس سے ملے؟ بھلا کچھ عمر کے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں۔ آپ مجھ سے عمر میں کہیں چھوٹے ہیں آپ کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھ سے اولیں فرصت میں ملتے۔ تاجور برا ہی سہی لیکن اتنا برا تو نہیں کہ اچھے اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ مولانا میں تو آپ ہی کی برادری کا آدمی ہوں [illegible] سال پہلے میں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند لی ہے۔ میں نے خود ہی بلایا تو آپ تشریف لائے۔ مولانا! اب تو یہ مارے باندھے کی ملاقات ہے پھر بھی آپ شکریہ کے مستحق ضرور ہیں۔"

میں نے علامہ کی یہ گفتگو خاموشی کے ساتھ سنی اور آخر میں اپنے غلط رویہ پر معذرت طلب کی۔ علامہ سے میری ملاقات شاہکار کی ادارت کے سلسلے میں تھی۔ اگر یہ ماہنامہ پہلے کی طرح علامہ کی ملکیت ہوتا اور کسی شیخ الیہود کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور نہ ہوتی تو میں اس ادارت

کو اپنے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا میں نے علامہ کی یہ پیشکش تو قبول نہیں کی البتہ ان کی یہ تمنا دل تجویز مان لی کہ مولانا ! مکتبہ دانش سے وابستہ ہو جائیے۔ غرض علامہ کی ناگواری خاطر کا خطرہ جاتا رہا اور تعلقات کی خوشگواری میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا۔ حادثۂ تقسیم تک علامہ سے راہ و رسم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب عظیم نے میرے اور ان کے درمیان کچھ ایسا خطِ فصل کھینچا کہ مزید ملاقاتوں کے امکانات کچھ کم قوی نہ تھے۔ قیامت تک کے لئے معرض التوا میں جا پڑے۔ پاکستان کی آزادی یا بالفاظ دیگر نوزائیدہ مملکت پاکستان نے ابھی اپنی زندگی کی تین بہاریں دیکھی تھیں کہ علامہ نے آخرت کی راہ لی۔ میں نے بجنور میں (جہاں میں سات سال مدینہ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں) یہ خبر وحشت اثر سنی تو ایک تعزیتی جلسہ کا فوری اہتمام کیا اور اس میں علامہ کے حالاتِ زندگی، ان کی علمی و ادبی خدمات، اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ اس موقعہ پر میں نے ارتجالاً یہ دو شعر بھی کہے تھے۔

غضب کی رات سے تاروں کی چھٹ گئیں صفیں
جو کچھ دیے ہیں کہیں ٹمٹمائے جاتے ہیں
نظارے دل کی طنابیں جو کھینچ لیتے ہیں
کہیں جہاں میں وہ انساں بھی پائے جاتے ہیں

علامہ تاجور نجیب آبادی کے ساتھ جو علمی و ادبی صحبتیں گرم رہی ہیں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا البتہ ایک صحبت، جس سے علامہ کی خوش مذاقی اور وسیع النظری پر روشنی پڑتی ہے، یہ تقاضا کر رہی ہے کہ میں اس کے نقوش ضرور اجاگر کروں۔ اس صحبت کا شرف مجھے حضرتِ احسان دانش کی پہلی قیام گاہ (کوٹ عبداللہ شاہ مزنگ) پر حاصل ہوا۔ علامہ دعوتِ چائے پر مدعو تھے۔ جس کمرہ میں دعوت کا اہتمام کیا گیا اس میں علامہ کے خیر مقدم کے لئے ایک تو میری خدمات وقف تھیں اور دوسرے ایک مولانا محمد علی بہار چیدی تھے جو ان خدمات کے سلسلہ میں میرے دستِ راست بنے ہوئے تھے۔ علامہ تشریف فرما ہوئے تو ہم دونوں نے بصد ادب و احترام ان کا استقبال کیا اور اس مسندِ نشست کی درخواست کی جو خاص ان کے لئے آراستہ کی گئی تھی۔ چند لمحات نہیں گذرے تھے کہ موقر مہمان کے میزبان حضرت احسان وارد ہوئے اور ہمیں علیک سلیک کے بعد اپنے برادر زادہ کو حکم دیا کہ چائے کی چینک اور رنگ برنگی پیالیاں لے آئے۔ ہر چیز تیار تھی اس لئے آنِ واحد میں حکم کی تعمیل ہو گئی۔ علامہ نے چینک، پرچوں اور پیالیوں پر ایک تجسس آمیز نظر ڈالی اور پھر بڑی سرعت کے ساتھ اس کارگہِ شیشہ گری کا [illegible] احسان صاحب بظاہر خاموش تھے مگر ان کی طبیعت پر شکست و ریخت کا یہ جارحانہ عمل گراں نہیں گذرا بلکہ میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ احسان صاحب کی اس خاموشی نے علامہ کے مزاج کا پارہ کچھ اور تیز کر دیا۔ بولے:-

تو اب بھی اپنے آپ کو شاعر مزدور ہی سمجھتا ہے۔ شاید اس بات کا مطلق احساس نہیں کہ دنیائے ادب میں تیرا کیا مقام ہے۔ ایسی بھی کیا کور ذوقی کہ روز مرہ کے استعمال کی چیزیں ابھی تیرے گھر میں نہیں یہ برتن ہیں یا [illegible] کیا اس قابل تھیں کہ ان میں کسی مہمان کو چائے پلائی جائے۔ بھونڈی اور بھدی پیالیاں، ٹیڑھی ترچھی پرچیاں، بے ڈول چینک۔ یہ ہے تیرے ذوق کی کائنات۔ شرم آنی چاہیے تجھے، [illegible] ظروف میں دکھایا جاتا [illegible] اور اس ٹھاٹھ کے ساتھ [illegible] کہ گھر میں ہر چیز سلیقے کی اور ہر شے قرینے کی ہو۔ جا ابھی نیا سیٹ لا۔

چائے کا سیٹ علامہ [illegible] تو حل ہو گیا اور ہم سب نے چائے پی لی لیکن اس دوران میں جو لطفِ صحبت علامہ نے دیا بیان سے باہر ہے۔ علامہ کی زبان سے جو فقرہ بھی نکلتا تھا گویا ظرافت کی چاشنی لئے ہوتا اور کبھی قند و نبات کا مزہ دیتا۔ علامہ نے اس دعوتی تقریب میں [illegible]

کی عبارت کرتا تو علامہ لفظ لفظ پر ٹوکتے کبھی الفاظ کے دروبست پر اور کبھی تراکیب کی تراش خراش پر بڑی بے رحمی کے ساتھ تنقید کرتے مجھے یاد ہے کہ علامہ نے مولانا محمد علی سہارنپوری کے ایک جملہ میں تین غلطیاں نکالیں مولانا کا جملہ یہ تھا :-

"علامہ! یہ ہماری ناعاقبت اندیشی ہے کہ ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں"

علامہ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا "ناعاقبت اندیشی" غلط ترکیب ہے۔ نفی عاقبت کی نہیں بلکہ اندیشہ کی ہے اس لئے "نا" کا استعمال "اندیشی" کے ماقبل ہونا چاہیئے۔ "ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں" ادبی حیثیت سے یہ جملہ بھی غلط ہے۔ رات کٹتی ہے دن نہیں کٹتا۔ دن بسر ہوتا ہے، گذرتا ہے اور تیر ہوتا ہے۔ "غریبی کے دن" میں یہ سقم ہے کہ مضاف الیہ غریبی بن گیا ہے، حالاں کہ نفس عبارت سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے، جملہ یوں ہونا چاہیئے تھا "ہم غریبی میں دن تیر کر رہے ہیں"۔

احسان صاحب تو کاندھلہ کی مخصوص بولی بولتے ہیں لہٰذا علامہ کے تنقیدی نشتر ان پر نہیں چل سکے۔ رہا میں، میرا شغل ایک مدت سے خطابت ہے زبان کھلتی ہے تو پھر میرے سامنے وسعتیں ہی وسعتیں ہوتی ہیں۔ جن میں فکر و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تلفظ الفاظ کی نشست و برخاست اور محاورہ بندی پر میری نظر صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ تقریر میں بھی رہتی ہے۔ علامہ سے میری گفتگو بڑی دیر تک ہوتی رہی اور میں جی ہی جی میں مگن ہو رہا تھا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ علامہ ایسا نقاد بھی میرے کسی لفظ اور کسی جملہ پر گرفت نہیں کر سکا۔ شامت اعمال کہ باتوں باتوں میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا "علامہ! سٹیاں بہت لذیذ ہوتی ہیں" علامہ برس پڑے اور ایسے برسے کہ نعمی لگے بہ نکلے۔ فرمایا :-

سٹیاں - یہ کیا کہا آپ نے - یہ کس زبان کا لفظ ہے ہماری نظر سے تو آج تک یہ لفظ نہیں گذرا۔

میں :- علامہ عید، بقر عید پر تو آپ نے بھی سٹیاں کھائی ہوں گی۔

علامہ :- مولانا، آپ نے تلفظ غلط کیا ہے۔ یہ لفظ "سٹیاں" نہیں بلکہ "سویاں" ہے۔ کچھ سمجھے آپ۔ اہل زبان ہوتے ہوئے ایسی فاش غلطی، آپ کو تو پنجاب آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھئے کہ ہم نے اپنی زبان کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسروں پر اپنی زبان کے نقش بٹھائے ہیں کسی کی زبان ہم پر اثر انداز نہیں ہوئی اردو میر و سودا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، انیس و دبیر، داغ و امیر، جوش و جگر، سیماب و احسان، اختر و ماجد کی زبان ہے اور پنجابی وارث شاہ اور بلھے شاہ کی زبان۔ ہر زبان کے استاد الگ الگ ہیں۔

اس صحبت کے جو نقوش میں نے اپنے حافظے کی مدد سے زیب قرطاس کئے ہیں ان سے علامہ کی معاشرتی، اخلاقی اور ادبی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا جو مقام ہے اسے سمجھنے کے لئے ہمیں علامہ کی چند خصوصیات پر نظر ڈالنی ہو گی اور وہ بھی ذیلی سرخیوں کے ساتھ تاکہ بعد میں کسی تذکرہ نویس کو زیادہ کاوش نہ کرنی پڑے۔

علامہ فارسی اور عربی علوم میں اتنی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ کہ ان کے اساتذہ کو بھی ان کے تبحر علمی پر ناز تھا۔ مجلہ دیوبند "القاسم" میں اس نابغ نظر فاضل دیوبند کے جو مضامین کسی دور میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ ان سے اگر کہیں دقت نظر کا ترشح ہوتا ہے تو کہیں جودت فکر نزاوش کرتی ہے۔ علامہ کو قدرے ذہنی سکون میسر آتا تو نہ معلوم وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کا سامان کس بلند پیمانے پر بہم پہنچاتے۔ "میری نجی اور ادبی زندگی" کے عنوان سے علامہ نے ۱۹۴۲ء میں جو سلسلہ مضامین سپرد قلم فرمایا تھا۔ اس میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

"مدت مدید سے اس فکر میں ہوں کہ قسمت موجودہ افکار لاحاصل سے رہائی بخشے تو "ادب العرب" کے نام سے چند مجلدات میں ادب عربی (نظم و نثر) پر ایک ضخیم تصنیف سرانجام دے کر اسے زندگی کی راہ ہے [illegible] تاکہ اسے نشان راہ زندگی بنا لوں ...... دیوبند ہی میں [illegible] شروع

بی سے عربی ادب اور فلسفہ پڑھتے رہے۔ لاہور آیا تو شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی جیسے عربی کے بے مثل ادیب اور بین الاقوامی شہرت کے فلسفی کا فیض مجھے نصیب رہا۔ اردو ادب میں میری دلچسپی تفریح کی حد تک رہتی تھی مگر حالات ناسازگار نے اس تفریح کو میری زندگی بنا دیا۔

علامہ کے اندر نثر نگاری کی سب نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ طنز و ظرافت، بذلہ سنجی، نغز گفتاری، سحر نگاری، شعلہ بیانی ان کی دلآویز تحریر کی وہ ادائیں ہیں جن پر ان کے معاصرین رشک کرتے تھے۔ ان کی نثر کے دو تین نمونے پیش کرتا ہوں۔ آپ ان سے علامہ کی قلمی بوقلمونیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں:-

"میں زمانہ سے دولت و حشمت کا طلب گار نہ تھا کہ میرے آبا و اجداد اپنی نمایندہ نسلوں کے حصے کی بھی دولت و حشمت صرف کر گئے۔ عیش و راحت کا خوگر بھی نہیں کہ گردِ یتیمی نے اس حسرت نادیدہ سے روشناس ہی نہیں ہونے دیا۔ اور شہرت؟ اس کا آغاز جس قدر مسرور کن نظر آتا تھا اگر اس کے اندوہگیں انجام سے باخبر ہوتا تو شہرت کو اپنے لئے شجر ممنوعہ بنا لیتا۔ اردو زبان سے متعلق میرا جنون خدمت، ادب نواز و ادب پرست طبقات کی نگاہ میں تحسین یا نقصان کا مستحق ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسوائی میرے لئے سوہانِ روح بن گئی ہے۔ اس شخص کی بدنصیبی سے کون انکار کرے گا جس نے زندگی کے پندرہ سال علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل میں اس طرح گنوا دیے ہوں کہ عید بقر عید کے سوا شکم سیر کھانا اور سالم لباس کبھی میسر نہیں ہوا، جس کی جوانی کے حسین خواب گرسنگی اور برہنہ پائی کے تصورات تک محدود رہے اور جس نے زمانہ طالب علمی اردو سے نفرت اور فارسی سے بیزاری میں اس لئے بسر کیا کہ عربی اور علوم عربیہ کے مقابلہ میں اردو فارسی ادب بے حقیقت چیز سمجھا کیا۔ یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں کہ اس نے نادانی کو اس کی زندگی بنا دیا ہے۔ آہ!

اپنے شاگرد چونی لعل کاوش کو ایک خط لکھتے ہیں:-

عزیز گرامی قدر کاوش

ہزاروں دعائیں، لاکھوں سلام! تمہارا خط ایسے وقت ملا کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا۔ تمہارے لئے میرے دل میں والہانہ محبت، دماغ میں متعصبانہ خیالات اور زبان پر بے تحاشا گالیاں جاری تھیں۔ کاوش! تمہارے مستقل طور پر گم ہو جانے سے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں۔ ۱۵ لاکھ کی آبادی کا یہ لاہور میرے لئے تو اجاڑ ہو رہا ہے۔ تم یاد آتے ہو تمہاری والدہ یاد آتی ہیں۔ تمہاری دلہن اور تمہارے حسین بچے یاد آتے ہیں۔"

اپنے بعض معاصرین کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے لگ بھگ علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں بہہ رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا۔ مگر ان کی زمین ڈگمگا گئی یا حقیقت یہ ہے کہ انہیں اس موقع پر [illegible] بچاؤ کی [illegible] نہ ملی [illegible] میں پست فطرت معاصرین کی جماعت [illegible] ایسے ایسے [illegible] دیکھنے میں آئے [illegible] حیثیت [illegible] ادبی و صحافتی لڑائیوں میں بدل [illegible] ادبی دنیا کے [illegible] میں مجھے اس [illegible]

علامہ نے پنجاب میں اُردو شاعری اور انشاپردازی کا کچھ اس شان سے صور پھونکا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خوابیدہ جذبات بیدار ہوگئے۔ لکھنؤ اور دہلی میں ادبا کی تحریر کا جو رنگ تھا اس کے سانچے میں پنجاب کے ادیبوں کی تحریریں بھی ڈھلنے لگیں۔ رسائل و اخبارات کی زبان میں پہلے جو روکھاپن تھا رفتہ رفتہ اس کی جگہ بانکپن نے لے لی۔ بیگمات اودھ کی ٹکسالی زبان کی چھاپ جب پنجاب کی اُردو پر پڑی تو زبان کا لطف دوبالا ہوگیا۔ ۱۹۱۵ء میں جب مخزن کی ادارتی باگ ڈور علامہ تاجور نجیب آبادی نے سنبھالی تو پانچ سال تک آپ نے اس کے ادارتی فرائض اس خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیے کہ ادبی حلقوں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک دنیا پیدا کر لی تھی۔ مخزن بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا میں اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تو تبدیل نہ کر سکا لیکن

"جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولہ کو مخزن کے حق میں میں نے غلط ثابت کر دیا۔" مخزن کے بعد علامہ تاجور نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی پانچ سال اس سے وابستہ رہے اس مختصر سی مدت میں ان کی ادبی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔ علامہ نے اپنی صحافتی زندگی کے تیسرے دور میں خود اپنے رسالہ کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ "ادبی دنیا" ۱۹۳۳ء تک شعر و ادب کا علمبردار رہا۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ نے شاہکار کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا۔ علامہ نے ہفتہ وار اخبار "پریم" بھی جاری کیا تھا جس کے ذریعہ آپ ملک کے بچوں، بچیوں کے دل میں خدا، مذہب، وطن اور بنی نوع انسان کی محبت اور بلا امتیاز ہر مذہب کے پیشواؤں کی محبت پیدا کرنی چاہتے تھے (لاہور میں آمد سے قبل علامہ رسالہ نالۂ بلبل، آفتاب اردو (لدھیانہ) اور رسالہ تاج الکلام (نجیب آباد) کے مدیر رہ چکے تھے)

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج پاکستان کے طول و عرض میں جو اردو روزنامے ہفت روزہ اخبارات اور ماہنامے جاری ہیں ان کے ادبی محاسن کا سہرا علامہ تاجور نجیب آبادی کے سر ہے۔ خیر و شر کے بارے میں اسلام نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ جو شخص بھی خیر یا شر کی رسم ایجاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کے منفی یا مثبت اثرات کی پرچھائیں ضرور پڑتی ہے جس کی رو سے بلا شائبۂ مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخبارات و رسائل میں جو اچھوتی تبدیلیاں، لطائف و ظرائف، پرشوکت الفاظ، زبان کے محاورے اور ادب و تنقید کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار جہاں کہیں بھی دیکھنے میں آتے ہیں، زبان حال سے علامہ کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں اور علامہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ے

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
ہم نے انداز مسکرانے ...... کا

علامہ کی شاعرانہ خصوصیت میں سے اس لئے آخر میں جگہ دی ہے تاکہ ان حضرات سے جو میرے مخاطب ہیں یہ حقیقت مخفی نہ رہے کہ علامہ اپنی اس خصوصیت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مدت العمر میں اپنے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی شائع نہ کر سکے۔ علامہ کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام ایسے شعرا کی تحویل میں ہے جو علامہ کے شاگرد ہیں یا عقیدت کیش۔ خدا کرے کہ ان میں باطن شعرا کی پردہ دری ہو اور علامہ کا یہ غیر مطبوعہ کلام پوری دیانت و امانت کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ علامہ نے نہ خوش اعتقاد اور نہ خوش فہم نہ ہوتے تو کسی کو بھی دستبرد کی جرأت نہ ہوتی۔ علامہ کا مزاج کچھ اس انداز کا تھا جس کی آئینہ داری ذیل کے ایک شعر سے ہوتی ہے ے

سلطنت بیچتے ہیں دُرد کشانِ تاک کے مول
ہے یہاں سایۂ ہما خس و خاشاک کے مول

علامہ تاجور نجیب آبادی کے تمام دوست [illegible] کے بارے میں اس دور کے ادیب [illegible] [illegible] کی زندگی [illegible]

ارشادات کئے دیتا ہوں:-

"میرا نام احسان اللہ خاں، ابوالعرفان کنیت، تاجور تخلص، جائے ولادت نینی تال، تاریخ پیدائش ۱۸۹۰ء، وطن نجیب آباد ضلع بجنور، قومیت درانی پٹھان، تربیت گاہ دارالعلوم دیوبند، ذریعہ معاش دیال سنگھ کالج کی پروفیسری۔ وطن اقامت لاہور ہے۔ گورنمنٹ نے علمی ادبی خدمات کے صلہ میں ۱۹۴۰ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ انجمن ارباب علم نے ۱۹۲۱ء میں بلیغ الملک کا خطاب دیا تھا۔"

علامہ تاجور چند در چند فضائل کے باوصف طبعاً منتقم واقع ہوئے تھے۔ اگر کسی کی طرف سے دل میں گرہ بیٹھ جاتی تو پھر مشکل سے نکلتی تھی۔ کانوں کے کچے بھی تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی کے خلاف کسی نے علامہ کے کان بھر دئیے اور پھر اس بیچارے کی شامت آئی کہ علامہ اس سے برسوں نہیں بولے۔ مزاج ناآشنا ہونے کے باعث علامہ کے اکثر شاگرد ان کی زندگی ہی میں ان سے کٹ گئے۔ علامہ کی اس کمزوری کا اثر ان کی [illegible] گی کے ہر شعبہ پر پڑا۔ پہلے شروع شروع میں اس اثر نے خاندانی کشیدگی کی شکل بھی اختیار کی ہے۔ پہلی بیوی سے علامہ کی ناراضی اور پھر نکاح ثانی ...... یہ بھی علامہ کی اسی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ علامہ مستقل مزاج بھی نہیں تھے۔ عمر بھر انہوں نے کوئی کام پامردی اور مستعدی کے ساتھ نہیں کیا۔ ذہنی انتشار کا ناسور اس بری طرح ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں رس رہا تھا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ کسی موضوع پر ایک مختصر سی تصنیف بھی نہیں پیش کر سکے۔ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں علامہ نے جو کچھ پڑھا تھا۔ بعد کے مطالعہ سے اس میں اضافہ تو کیا ہوتا بلکہ بہت کچھ سہو و نسیان کی نذر ہو گیا تھا۔ صحافتی زندگی کے اس دور میں جب شاہکار کی ادارت ان کے سپرد تھی انہوں نے ایک دفعہ نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ "مولانا اب تو درس نظامی کی ایک بھولی بسری یاد باقی رہ گئی ہے۔ وہ مبلغ علم جس پر مجھے ناز تھا۔ حوادث روزگار کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ "المستمع" کے کسی عربی مضمون کا اردو ترجمہ بھی میرے بس کی بات نہیں۔"

علامہ صرف گفتار کے غازی تھے۔ کردار کا جوہر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ نے نہ دین کمایا نہ دنیا۔ ایک فاضل دیوبند کی حیثیت سے مذہب کو ان کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہئے تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ اکثر و بیشتر نماز تک بھی نہیں پڑھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں دین سے اتنا بعد ہو گیا تھا کہ وہ علماء کو بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ رئیس المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانی اور رئیس العلماء علامہ سید انور شاہ کاشمیری نے علامہ تاجور کی بے عملی پر انہیں سرزنش بھی کی تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، علامہ کی بے عمل زندگی میں زیادہ دخل اُن کی اس وابستگی کو تھا جو انھیں اپنے ہندو اور سکھ شاگردوں سے تھی۔ دیال سنگھ کالج کی پروفیسری ان کے حق میں رحمت نہیں بلکہ زحمت ثابت ہوئی۔ ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ماحول کا غلط اثر قبول کر لیا۔ دوسرے اس لئے کہ ان کے تعلقات ان مسلمان شاگردوں سے کشیدہ ہوتے گئے جو اگر چاہتے تو علامہ کو ادب کے اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا سکتے تھے جس کی بلندیوں تک رسائی ان کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

اگر جمالیاتی ذوق کوئی عیب ہے تو پھر مجھے یہ بات کہنے میں بھی مطلق کوئی تامل نہیں کہ اس عیب کا داغ بھی علامہ کے دامن پر تھا۔ علامہ کا یہ ذوق اتنا بالغ تھا کہ بھونڈے سے خدوخال انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک ہموطن مولوی صاحب کسی ضرورت سے ان کے پاس آئے تھے۔ بیچارے کریہہ المنظر ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جب تک وہ علامہ کے پاس بیٹھے رہے، علامہ کی تیوری چڑھی رہی۔ ماتھے کے بل کھولے رہتے تھے کہ یہاں تک کہاں آمرا۔ نزول بلا کے لئے تو غالباً اور مرحوم مخصوص تھا۔ تاجور کا گھر اس قابل کہاں کہ اس پر بلائیں ٹوٹیں۔ بیچارے مولوی صاحب پر علامہ کی بے رخی کا نفسیاتی اثر پڑا اور انہوں نے بددل ہو کر رخصت چاہی۔ علامہ نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ انہیں الوداع

[illegible] بار [illegible] مجبور ہو کر [illegible] نے کتنا [illegible] یہ دوسری قسم اس کی ہے جو نے مجھے حیرت سے [illegible] کی [illegible] میرے ذوق نظر پر سخت گراں گزرتی ہے۔ میں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ جی ہی جی میں یہ ضرور سوچا کہ اگر دوسروں کا ذوق بالکل ہی [illegible] ہو جائے تو علامہ کے پاس بھی کوئی نہ پھٹکے۔ علامہ خود [illegible] واقع ہوئے تھے لہٰذا کبھی کبھی ان پر علامہ جاحظ کا گمان ہوتا تھا۔ علامہ جاحظ کا ذکر آگیا تو لگے ہاتھوں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ علامہ جاحظ بازار بغداد کی گلی سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے انہیں کسی خاتون نے آواز دی۔ علامہ جاحظ نے مڑ کر دیکھا تو اس خاتون نے جو قریب ہی آگئی تھی بڑی لجاجت سے یہ درخواست کی کہ آپ کو زحمت تو ہو گی ذرا سامنے والی دکان تک میرے ہمراہ چلیے۔ علامہ جاحظ اپنے دور کے بڑے فلسفی تھے اور آج تک کبھی انہوں نے کسی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے لیکن اس خاتون کی لجاجت نے ان پر ایسا جادو کر دیا کہ بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہو لیے۔ دوکان کے پاس پہنچے تو اس خاتون نے دوکاندار سے کہا کہ یہ صاحب ہو [illegible] انہیں دیکھ لیجئے۔ پھر یہ خاتون علامہ جاحظ سے مخاطب ہوئی۔ علامہ! آپ نے میری خاطر بڑی زحمت گوارا کی آپ کا بہت بہت شکریہ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ علامہ جاحظ کھسیا گئے اور انہیں اپنی حماقت پر [illegible] دانت پیسنے لگے۔ خاتون جا چکی تھی۔ وہ دوکاندار جو دراصل پیشہ ور سنار تھا بولا کیوں صاحب آپ کو کیا فکر دامنگیر ہے؟ علامہ جاحظ نے کہا فکر کیا دامن گیر ہوتی اس سوچ میں ہوں کہ یہ خاتون مجھے یہاں کیوں لائی تھی؟ کیوں اس نے . . . .

آپ سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے" اور پھر کیوں میرا شکریہ ادا کیا؟ ان سوالات کا جواب چاہتا ہوں۔ سنار علامہ سے واقف تھا۔ اس نے ادب و احترام کے ساتھ علامہ کی خدمت میں گزارش کی کہ حضرت! یہ خاتون اپنی انگوٹھی کے نگینہ پر ابلیس کی تصویر کندہ کرانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے مذاق [illegible] کہا کہ [illegible] ابلیس [illegible] کندہ کرنی ہے تو اسے میرے پاس لے آنا کہ میں اسے ایک نظر دیکھ لوں۔ آج کئی دن کے بعد یہ خاتون آپ کو [illegible] لائی اور مجھ سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے۔ مجھے تو [illegible] اس حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ علامہ جاحظ یہ سن کر چپ رہ گئے اور زندگی میں پہلی بار انہیں اپنی شکست خوردگی کا احساس ہوا۔ علامہ جاحظ نے یہ پورا واقعہ خود قلم بند کیا ہے۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جاحظ کتنے کریہہ المنظر تھے وہاں یہ بھی [illegible] کہ انہیں اپنی [illegible] سے مطلق عار نہ تھی [illegible] بھی اپنے [illegible] کی تلافی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے علامہ تاجور کا بھی یہی عندیہ ہو۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ علامہ تاجور کو اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ وہ اپنے چہرہ کی تراش خراش کے لحاظ سے ایک مرد معقول ہیں۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہر شخص سے یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ وہ ان کے [illegible] کی داد دے۔

میں نے اپنے ممدوح کی شخصیت کے [illegible] اس لئے ابھارے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کسی صاحب کمال کی زندگی نقائص سے مبرا نہیں ہوتی۔ [illegible] میرے خیال میں یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ [illegible] یہ [illegible] واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ بہت کچھ تھے لیکن تقاضائے بشریت ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ علامہ تاجور آج ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی زبان حال سے ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں ؎

مٹتے ہیں مگر ایسے بڑے بھی کم ہوں گے
کس زمانے کے [illegible] ہمیں کریں گے یاد!

دلؔ شاہجہانپوری

شبنم رومانی
(بی کام)

وہ کون سی خوبی ہے جو دلؔ صاحب میں نہیں ہے۔ وہ بھولے بھالے سے انسان ہیں، دوستوں پر مٹنے والے دوست ہیں، گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے میزبان ہیں، زمیندار ہیں لیکن کاشتکار انہیں اپنا امین اور استاد سمجھتے ہیں۔ طبیب ہیں لیکن دوائیں مفت بانٹتے ہیں اور کوئی کچھ نذر کرے تو اس طرح روٹھ جاتے ہیں جیسے ان کی توہین ہو گئی ہو، شکاری ہیں لیکن کوئی خوبصورت ہرنی قریب سے گزر جاتی ہے تو انگلی بندوق کی لبلبی سے پھسل پڑتی ہے، شاعر ہیں مگر کبھی دعویٰ نہیں کیا، کوئی تعریف کرتا ہے تو شرما جاتے ہیں، تنقید کرتا ہے تو مسکرا دیتے ہیں۔ استاد ہیں مگر شاگردوں کو شاگرد نہیں کہتے احباب کہتے ہیں اور ہر شاگرد کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بیچارہ خواہ مخواہ انہی کا استاد بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ —— یہی وجہ ہے کہ ملک ان پر اعتبار کرتا ہے اور لوگ انہیں "اعتبار الملک" کہتے ہیں۔

ہاں ایک خوبی ایسی ضرور ہے جو دلؔ صاحب میں نہیں ہے۔ اگر وہ تھوڑے کٹکھنے مزاج کے انسان بھی ہوتے اور انہیں کبھی کبھار چھوٹا موٹا غصہ بھی آجایا کرتا تو پھر قدرت کو مزید انسان پیدا کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی اور اس کا مشن پورا ہو جاتا —— حضرت آرزو لکھنوی مرحوم نے ایک محفل میں ٹھیک ہی کہا تھا:

"دو باتیں میری سمجھ میں اب تک نہیں آئیں —— جناب بیباکؔ سید النسل ہو کر
اتنے مغلوب الغضب اور دلؔ صاحب افغان النسل ہو کر اتنے متین و سنجیدہ کیوں ہیں؟"

دلؔ صاحب کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جہاں دن رات شکار کے پروگرام بنتے تھے، صوفی حضرات کا مجمع رہتا تھا، محفل سماع گرم رہتی تھی اور قوالوں کو ریاض کرائے جاتے تھے لہٰذا ان دونوں مشاغل سے آپ کو بھی دلچسپی رہی ہے۔ کافی عرصہ تک سیر و شکار کا شوق رہا۔ پہروں بندوق کی لبلبی سے انگلی نہیں ہٹتی تھی۔ خورد و نوش کا سامان ساتھ میں ہوتا تھا۔ ناشتہ دانوں میں طرح طرح کے حلوے ہوتے تھے، صبح کو پوری جماعت جنگل میں مزے لے لے کر ناشتہ کرتی تھی اور پھر سب لوگ شکار کھیلنے نکل جاتے تھے۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو کر جنگل کا "جھاڑا" کرتے تھے۔ جانور نکل نکل کر بھاگتے تھے اور بندوقوں کی گولیاں ملک الموت بن کر ان کے پیچھے دوڑتی تھیں۔ شام کے وقت جو شکار مارا جاتا اس کا گوشت مختلف طریقوں سے پکایا جاتا۔ کوئی باورچی کباب پکاتا،

کوئی کوفتے، کوئی قورمہ ——— رات میں سب لوگ ایک ساتھ مل بیٹھتے، کھانا کھاتے اور جنگل میں منگل مناتے۔ آپ کا نشانہ بہت صاف تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک "جھانک" شکار کیا تھا جس کے سینگ (خدا جھوٹ نہ بلائے) چالیس انچ لمبے تھے۔

ایک شکار میں آپ نے ایک بہت بڑا سانبھر گرایا۔ وہ اس قدر بھاری بھرکم تھا کہ اس کا ذبح کرنا مشکل ہو گیا۔ آپ کے ساتھ جلال آباد کے ایک خان صاحب بھی تھے۔ آپ نے ان سے کہا:

"میں اس کا منہ پکڑتا ہوں تم ذبح کرو۔"

جب وہ چھری پھیرنے لگے تو سانبھر نے اس زور سے گردن ہلائی کہ دلؔ صاحب سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔ خانصاحب نے ہنس کر فرمایا "دیکھ لیا شاہجہان پور کے پٹھانوں کا زور۔" اب خان صاحب کی باری تھی، دلؔ صاحب نے کہا "میں چھری پھیرتا ہوں آپ منہ پکڑیئے۔" خانصاحب نے اپنے جسم کا پورا زور ڈال کر سانبھر کی گردن دبائی مگر دلؔ صاحب نے جیسے ہی چھری پھیری اس نے گردن کو وہ زور کا جھٹکا دیا کہ خان صاحب دور تک لڑھکتے چلے گئے۔

دلؔ صاحب سے ان کے دیہات کے کاشتکار بہت مانوس ہیں اور ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شکاری نے ایک نیل گائے پر فائر کیا گولی سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ نیل گائے اتفاق سے آپ کے پاس سے گزری، آپ نے گولی چلا کر اسے گرا لیا۔ پھر کیا تھا شکاری صاحب بہت بگڑے "میرا شکار کیوں مار لیا؟ شاہجہان پور کے شکاری بے ایمان ہوتے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ گاؤں والے دلؔ صاحب کے پاس جمع ہو گئے اور ان سے کہا "آپ ہم کو اجازت دیں تو ہم ان شکاری صاحب کو مار کر راتوں رات کسی کنوئیں میں ڈال دیں۔" شکاری صاحب نے یہ سنا تو دلؔ صاحب کے قدموں پر گر گئے ——— آخر دل صاحب کی بڑی سفارشوں پر اُن کی جان چھوٹی۔

ایک مرتبہ شکار کے سلسلہ میں آپ نیپال کی ترائی تشریف لے گئے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ جنگل میں لکڑی کے ایک ٹھیکیدار کا جھالا تھا آپ وہیں ٹھہرے تھے۔ انہی کا گاڑیبان صبح صبح آپ کو رہلو پر شکار کے لئے لے جاتا تھا، غریب آدمی تھا صبح کو جب آتا تھا تو صرف ایک چادر اس کے جسم پر ہوتی تھی آپ نے اس سے پوچھا ——— "اس سردی میں کیونکر بسر ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا "بڑے بڑے لٹھے رات بھر جلاتا ہوں اور بدن سینکتا ہوں۔" آپ نے گاڑی رکوا دی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا، سمجھا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ دل صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اپنی اونی جرسی اور گرم قمیص اتار کر اسے دے دی اور کہا "اسے پہن لو اور گھر واپس چلو تاکہ میں دوسرے کپڑے پہن لوں ———"

میرے ایک خالو ظہیر الدین خان رائے بریلی میں کوتوال تھے اور تقریباً پندرہ سال وہاں رہے۔ جب باہر سے ان کے یہاں مہمان آتے تھے تو تانگہ والوں میں فوجداری ہو جاتی تھی۔ ہر تانگہ والا یہ چاہتا تھا کہ سواری وہ لے جائے۔ قصہ یہ تھا کہ تھے تو وہ کوتوال مگر مزاج پایا تھا شاہانہ ——— کرایہ ٹھہرتا تھا پانچ اور ملتے تھے دس ——— یہی حال کچھ دل صاحب کا ہے۔ وہ سرکاری ٹھیکیدار بھی ہیں اور جب کوئی نیا کام نکلتا ہے تو جو مزدور ان کے پاس کام کرتے ہیں ان میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے ——— اور ہر مرتبہ دل صاحب کو جھگڑا چکانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

دل صاحب کا کلام سب سے پہلے "پیام یار" میں چھپا تھا، یہ پرچہ لکھنؤ سے نکلتا تھا، اس میں اکثر امیرؔ و داغؔ بھی شرکت فرماتے تھے۔ اسی کے مطالعہ سے آپ کو شعر و سخن کا ذوق ہوا۔ رفتہ رفتہ اس ذوق نے یہاں تک زور مارا کہ آپ نے خود شعر کہنا شروع کر دیا۔ ایک بار "پیام یار" میں طرح نکلی یہ "جگر دیکھ لینا، نظر دیکھ لینا" اس میں آپ نے بھی غزل کہی تھی جس کا ایک شعر اب بھی محفوظ ہے۔ یہ شعر ۱۸۹۰ء کا ہے ؎

چلا ہے ابھی تیر مژگاں کسی کا!
ذرا اپنا اپنا جگر دیکھ لینا

دلؔ صاحب کی نومشقی کا زمانہ تھا کہ حکیم سید جعفر حسین صاحب بغرضِ علاج شاہجہان پور تشریف لائے۔ موصوف صاحب نظر شاعر بھی تھے۔

کاشف تخلص کرتے تھے اور حضرت اشک لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ دل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک شعر و سخن کے متعلق گفتگو ہوتی رہی حکیم صاحب نے آپ کے اشعار سن کر یہ مصرع دیا :

ع ہم رکھ کے کہیں بھول گئے طاق میں غنچہ (قافیہ "طاق" وغیرہ، ردیف "میں غنچہ")

اور فرمائش کی کہ اس پر غزل کہہ کر مجھے دکھاؤ۔ دل صاحب نے فوراً قلم سنبھال ان کی موجودگی میں سات شعر کہہ کر ان کے حوالے کر دیئے۔ حکیم صاحب نے اشعار دیکھے تو بے ساختہ واہ واہ کر اٹھے، فرمایا :

"میں نے تم کو شاعر مان لیا۔"

انہی دنوں "پیام یار" میں اس طرح پر طبع آزمائی ہو رہی تھی "یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے" امیرؔ، داغؔ، جلالؔ، ریاضؔ سبھی نے اس پر فکر فرمائی تھی۔ منشی امیر مینائی کا شعر تھا ؎

پہنچتی ہے یہ گردن تک ہی اس کے
صراحی دختِ رز سے کچھ بڑی ہے

حکیم صاحب نے اعتراض کیا کہ صراحی شراب سے بڑی کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی وقت محمد علی میاں خیالؔ شاہجہانپوری آ گئے، خیالؔ صاحب کو عربی فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔ شاعری میں انہیں حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شعر سوچ سمجھ کر اور صاف کہتے تھے۔ دل صاحب نے عربی کی ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی) انہوں نے فرمایا "معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب کو کبھی اس شغل سے واسطہ نہیں پڑا۔ مجھ سے پوچھیے سینکڑوں بوتلیں لنڈھا چکا ہوں۔ مینا میں شراب ہمیشہ کم ہوتی ہے گردن کا کچھ حصہ خالی رہتا ہے۔"

غالباً ۱۸۹۳ء میں شاہجہانپور میں ادبی و تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں سر سید احمد خاں، مسٹر محمود، وقار الملک، مشتاق حسین، مولانا شبلی، مولانا حالی ڈپٹی نذیر احمد اور نواب محسن الملک وغیرہ تشریف لائے تھے۔ اس کانفرنس کی روح رواں مولوی رفعت علی مرحوم تھے۔ انہی کی کوششوں سے یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ تین چار روز تک جاری رہا۔ اس کانفرنس میں سر سید اور ان کے رفقاء نے تقاریر کے ذریعہ ترغیب دی کہ ارباب وطن قدامت پرستی کو ترک کر کے دورِ حاضر کے تہذیب و تمدن کو اختیار کریں۔ ——— دل صاحب بھی اس جلسے میں شریک تھے۔

مدت تک کسی استاد کی اصلاح کے بغیر مشاعروں میں غزل پڑھتے رہے مگر بعد میں ایک استادِ کامل کی جستجو ہوئی۔ اس زمانے میں تین استاد مسلم الثبوت تھے۔ امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی۔ حضرت امیر کا پایہ باعتبار علم و فن سب سے بلند تھا اس لئے آپ نے انہی کو استاد منتخب کیا۔ منشی صاحب ان دنوں دربار رامپور سے وابستہ تھے۔ غزلیں ان کے پاس اصلاح کے لئے جاتی تھیں اور وہ ترمیم فرما کر واپس کر دیتے تھے۔ استاد اور شاگرد میں پہلی ملاقات ۱۸۹۵ء میں ہوئی جب دل صاحب اپنے ماموں کے ہمراہ بتقریب عرس بدایوں گئے۔ وہاں سے واپسی پر منشی صاحب کی زیارت کے لئے رامپور روانہ ہوئے۔ چونکہ بغیر اطلاع گئے تھے لہٰذا براہ راست منشی صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ صبح کو حاضری دی۔ صدر دروازہ کے اندر دو دروازے تھے، ایک زنانخانے کا دوسرا نشست گاہ کا۔ نشست گاہ بالائی منزل پر تھی وہاں حضرت جلیل مانکپوری موجود تھے۔ جلیل صاحب نے آپ کی آمد کی اطلاع کر دی، حضرت فوراً تشریف لائے اور بہت محبت سے گلے لگایا۔ فرمایا "یہاں کیوں نہیں قیام کیا؟" مگر دل صاحب کے عذرِ معقول پر چپ ہو گئے اور پھر شعر و ادب اور علم و فن پر گفتگو شروع ہو گئی۔

دل صاحب وہاں سے جائے قیام پر واپس آئے ہی تھے کہ معلوم ہوا جلیل صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر آ کر دیکھا تو جلیل صاحب تشریف فرما تھے۔ ایک ملازم بھی ساتھ تھا شیرینی کی ایک سینی اس کے سر پر تھی۔ جلیل صاحب نے فرمایا "قبلہ و کعبہ نے یہ شیرینی اور دس روپے ضمیر کو بھیجے ہیں۔"

لہ دلؔ صاحب کا اصلی نام حکیم ضمیر حسن خان ہے۔

دل صاحب نے کہا "یہ تو شاگرد کا فرض تھا کہ استاد کی خدمت میں نذر پیش کرتا نہ کہ استاد نے شاگرد کو شیرینی اور روپے بھیجے ہیں۔"
بلبل صاحب نے کہا "منشی صاحب نے ارشاد کیا ہے کہ میں ضمیر کو مثل مسعود احمد کے اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔ بچوں کو شیرینی کھلانا بڑوں کا فرض ہے۔"
آخر بڑی بحث کے بعد دل صاحب نے روپے واپس کر دئے اور شیرینی لے لی دوسرے روز پھر حضرت استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے دوران گفتگو استاد نے فرمایا —— "ضمیر! تمہاری شوخیٔ طبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا۔"
اس سلسلہ میں حضرت داغ کا ذکر آ گیا۔ منشی صاحب نے فرمایا "جو لوگ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے سامنے داغ کو برا بھلا کہتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا منہ نوچ لوں۔ بھلا داغ کی کوئی ہمسری کر سکتا ہے —— ہا! کوئی اس شان کا شعر کہہ کر تو سنائے ؎

خارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

دل صاحب نے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جس میں تناسخ کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی اس کا نام "دل سوز" تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جارج پنجم شہزادے کے روپ میں ہندوستان تشریف لائے تھے! ور ان کا ورود لکھنؤ میں ہوا تھا۔ لوگ جارج کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آ کر لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔

انہی دنوں دل صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر مختلف مطابع سے ناول کی اشاعت کے بارے میں بات چیت شروع کی۔ نظیر آباد میں حافظ عبدالحق نامی ایک صاحب رہتے تھے وہ بھی کسی پریس کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے مطالعہ کے بہانے ایک دن کے لئے کتاب مانگی۔ دل صاحب ایسے مرد سادہ کہ کتاب ان کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن واپس لینے پہنچے تو حافظ صاحب غائب، تیسرے دن غائب، چوتھے دن غائب، پانچویں دن غائب —— اب تو دل صاحب کو فکر لاحق ہوئی۔ اپنے ایک دوست رحمٰن حسین خان مرحوم سے ذکر کیا۔ رحمٰن صاحب زندہ دل، منچلے اور نڈر انسان تھے فوراً آپ کے ہمراہ حافظ صاحب کے مکان پر پہنچ گئے اور کہا "آپ خاموش رہیں!" پھر دروازے پر آواز دی "حافظ صاحب!" مگر جواب ندارد۔ دوسری بار پھر پکارا مگر کوئی نہ بولا، تیسری بار دروازہ پر زور سے دستک دی مگر لاحاصل —— آخر تنگ آ کر رحمٰن خان نے حافظ صاحب کو ایک فصیح و بلیغ گالی کے ساتھ خطاب کیا تو اندر سے حافظ صاحب کی آواز آئی "کون بدتہذیب ہے؟" رحمٰن خان نے چیخ کر کہا "ذرا باہر تشریف لائیے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" حافظ صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر نکلے اور پھر جو خانصاحب میں اور ان میں خالص اردوئے معلّٰی شروع ہوئی تو لوگوں نے کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔ قریب تھا کہ ہاتھا پائی ہو جائے کہ خان صاحب نے کہا "لا! دل صاحب کی کتاب واپس کر۔"
حافظ صاحب جلے ہوئے تو تھے ہی فوراً مکان میں گئے اور کتاب لا کر پٹک دی "یہ لو اپنی کتاب!"

دل صاحب کو صوفیائے کرام سے گہری عقیدت رہی ہے۔ آپ کے نانا حافظ احمد حسین خانصاحبؒ سلسلہ قادریہ چشتیہ کے بہت بلند پایہ بزرگ گذرے ہیں۔ ان کی بارگاہ میں اکثر باریابی حاصل رہتی تھی۔ ان کا مخصوص قوال گدا حسین تھا جو بعد کو ملک میں بہت مشہور رہا، اس کے ریاض و تربیت میں دل صاحب کا کافی ہاتھ رہا اور اس کو بہت سا کلام کہہ کہہ کر حفظ کرایا۔ ایک مرتبہ اس نے میران پور کٹرہ کے سجادہ نشین کو جبکہ وہ شطرنج کھیل رہے تھے آپ کا یہ مطلع سنایا ؎

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست

تو ان پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ شطرنج کی بساط ہاتھ مار کر الٹ دی اور دیر تک عالمِ رقص و وجد میں رہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو کہا "ضمیر مجھے ملے تو پوچھوں گا یہ شعر

اُس نے کس عالم میں کہا تھا"

منشی امیر مینائی کی وفات کے بعد آپ نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا اپنی ذاتی قابلیت اور مشقِ سخن پر اعتماد کیا۔ چونکہ جوہر شاعرانہ آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت تھا لہٰذا جو شعر بھی کہتے تھے بلحاظ فن بہت فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ جلد ہی آپ کی شہرت سارے ملک میں بوئے مشک کی طرح پھیل گئی۔ ——— یہاں تک کہ جب جلیل مانکپوری جانشینِ امیر ہوئے تو ملک کے بیشتر اساتذہ اور ناقدین کی نظریں دل صاحب کی طرف اٹھی رہ گئیں ——— آخر حضرت جلیل کی رحلت کے بعد انہیں تمام ملک نے متفقہ طور پر جانشینِ امیر بنا دیا اور بعض بزرگوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "دل صاحب حضرت جلیل کی زندگی میں بھی جانشینِ امیر تھے"

دل صاحب کی شاعرانہ عظمتوں کا چرچا مشاعروں اور ادبی جرائد تک محدود رہا ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی شہرت نہیں چاہی اور ہمیشہ خود نمائی سے دور بھاگے۔ یہی وجہ ہے کہ شہرت کے جس زینے پر وہ آج ہیں وہاں انہیں آج سے چالیس سال پہلے ہونا چاہیے تھا۔

سید التفات رسول صاحب تعلقدار سندیلہ، ہر سال اپنے والد کا عرس کرتے تھے جس میں مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ دل صاحب اکثر ان کے مشاعرہ میں شرکت فرماتے تھے۔ آپ کے ہمراہ جناب بیباک شاہجہان پوری بھی ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا اور تین دن تک جاری رہتا تھا۔ التفات رسول صاحب نے تمام عمر اس مشاعرے کو برقرار رکھا۔

۱۹۰۸ء کا ذکر ہے سندیلہ میں محفلِ شعر گرم تھی جس کا ذکر دل صاحب کے پہلے مجموعہ کلام "نغمۂ دل" کے تبصرہ میں جناب نیاز فتحپوری نے بھی کیا ہے۔ دو نشستوں میں دیگر شعراء نے کلام سنایا، تیسری نشست مشاہیر شعراء کے لئے متعین تھی۔ دل صاحب کی غزل جس کا ایک شعر یہ ہے حاصلِ مشاعرہ رہی ؎

نہ وہ آرامِ جاں آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ!
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

دل صاحب کے بعد صرف دو حضرات باقی رہ گئے تھے۔ صبح چار بجے کا وقت تھا جب آپ غزل پڑھ چکے تو ان کی باری آئی۔ چونکہ غزل بہت چمکی تھی لہٰذا ان حضرات نے یہ عذر پیش کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے محفل برخاست کر دی جائے۔ سید محمد عسکری و تسیم خیر آبادی بھی موجود تھے۔ انہوں نے دل صاحب کے کان میں کہا: "ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ کچھ دیر کے وقفہ کے بعد جب پھر مشاعرہ شروع ہوگا تو آپ کی غزل کے اثرات لوگوں کے دلوں سے مٹ جائیں گے اور ان کی غزلیں کامیاب ہو جائیں گی۔" مگر جب بعد میں مشاعرہ شروع ہوا تو ان لوگوں کی غزلیں کوری اتر گئیں۔ ان لوگوں نے لکھنؤ جا کر دل صاحب کے خلاف بہت پروپیگنڈہ کیا اور انجمن بہارِ ادب کے مشاعرے میں مدعو کیا تاکہ کسی طرح اپنی ناکامی کا انتقام لکھنؤ میں لے سکیں۔

لکھنؤ میں سوائے دو ایک حضرات کے باقی سب دل صاحب کے دوست تھے۔ مشاعرے سے ایک روز قبل نواب محمد عسکری بلیغ مرحوم نے آپ کی دعوت کی۔ بعد طعام محفلِ شعر منعقد ہوئی۔ تمام حضرات نے ایک ایک غزل پڑھی اور دل صاحب سے بہ اصرار سات غزلیں سنی گئیں۔ بعد ختمِ محفل پروفیسر شاداں مرحوم نے فرمایا: "یہ آپ کا امتحان تھا کہ آپ نے صرف ایک غزل اچھی کہہ لی ہے یا آپ واقعی اچھا کہتے ہیں۔ مگر خدا کے فضل سے آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور مخالفین کو شکست نصیب ہوئی۔"

اس کے بعد آپ کو "بہارِ ادب" کا رکن بنا لیا گیا اور ہر سال مشاعرے میں بلائے جانے لگے۔ مشاعرہ وسط سرما میں ہوتا تھا۔ ایک سال مشاعرہ "افضل محل" میں ہو رہا تھا، دل صاحب بھی تشریف فرما تھے، حضرت صفی، عزیز، یگانہ، آرزو وغیرہ کے علاوہ حضرت شہید مچھلی شہری اور سائل دہلوی بھی شریک تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی، مشاعرہ اپنے شباب پر تھا کہ یکایک کسی نے بجلی کی روشنی بند کر دی اور پنکھے کھول دئے ——— دسمبر کے

مہینے میں پنکھوں کی ہوا —— دل صاحب کے پاس کمبل تھا انہوں نے وہی لپیٹ لیا۔ پاس ہی رفیع احمد خان بیٹھے تھے انہوں نے پکارا "دل صاحب! میرے لئے بھی جگہ ہے؟" آپ نے کہا "کیوں نہیں دہ درویشے در گلیمے بخسپند" اور ان کو کمبل میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد روشنی ہو گئی مگر پنکھے چلتے رہے۔ غالباً تماشہ دیکھنے کے لئے —— عجیب منظر تھا۔ کوئی قالین اوڑھے تھا، کوئی گٹھڑی بنا کسی کونے میں پڑا تھا۔ جگہ جگہ لوگ ایک دوسرے سے بُری طرح چمٹے ہوئے تھے —— اس واقعہ کے بعد مشاعرہ موسم سرما کے بجائے موسم گرما میں ہونے لگا۔

قیصر باغ کے ایک مشاعرے میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پنڈت آنند نرائن ملا مہتمم مشاعرہ تھے۔ دل صاحب کے علاوہ تمام مشاہیر شعراء شریک تھے۔ ملا صاحب نے کالج کے طلباء کو کم پاس دئے تھے اس لئے بہت سے لڑکے جن کو پاس نہیں ملے تھے ان کے مخالف ہو گئے۔ قریب ۱۰ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ بارہ کا عمل تھا۔ حفیظ جالندھری نظم سنا رہے تھے، جب انہوں نے پورے جوش میں یہ مصرع پڑھا ؏

چیریں، پھاڑیں، کھائیں، پئیں یہ شیروں کی آزادی ہے

تو کالج کے شیروں نے دفعتاً بجلی کا تار کاٹ دیا، کچھ دیر تک تو سکتہ کا عالم رہا مگر جب بعد میں لیمپ لائے گئے ہیں تو وہ اودھم مچا ہے کہ —!!!

بہارِ ادب کی ایک اور سالانہ محفل کی طرح تھی۔ "منزل تھا، محفل تھا" کئی ہزار کا مجمع تھا، لکھنؤ میں یہ طریقہ رہا ہے کہ پہلے مقامی شعراء (از مبتدی تا منتہی) کلام پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد بیرونی شعراء کو دعوتِ شعر خوانی دی جاتی ہے۔ اس مشاعرہ میں دولھا صاحب نبیرہ حضرت میر انیس مرحوم بھی تشریف فرما تھے۔ چپ چاپ، نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ جب قتیل لکھنوی نے غزل پڑھی تو ایک شعر پر دولھا صاحب نے نظر اٹھا کر قتیل صاحب کو دیکھا جناب عزیز لکھنوی جو دل صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے کہا "دل صاحب پہچانا —— اعتراض ہو گیا" بعد میں دل صاحب نے جب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا ؂

نتیجے تک کھنچے کیا کیا امید و بیم کے نقشے؟
تلاطم میں تھی کشتی سامنے نظروں کے ساحل تھا

تو دولھا صاحب نے نظر اٹھا کر دل صاحب کو دیکھا۔ عزیز صاحب نے فوراً کہا "دل صاحب سمجھے —— آپ کے شعر کی داد دی گئی ہے۔"

حضرت بیباک شاہجہان پوری تلمیذ داغ سے۔ دل صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر مشاعروں میں ساتھ ساتھ جاتے اور ساتھ ہی ساتھ قیام کرتے تھے۔ بیباک صاحب شاعر ہونے کے علاوہ بہترین سخن فہم تھے۔ جس شعر پر داد دے دیتے تھے بلند پایہ سمجھ لیا جاتا تھا مگر صاف گو، اور مغلوب الغضب بھی تھے اس لئے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ سدیلے کے ایک مشاعرہ میں دل و بیباک کے علاوہ سیف شاہجہانپوری بھی شریک تھے۔ سیف صاحب بیباک میاں کے قریبی عزیز ہوتے تھے مگر بڑے فتنہ پرداز تھے۔ بعد مشاعرہ دل صاحب، بیباک میاں اور سیف صاحب سے نواب التفات رسول نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر اور جج ضلع آپ لوگوں کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ یہ حضرات انگریز ہیں۔ انہوں نے اردو نظم نہیں سنی لہٰذا آپ شام کو تشریف لا کر اپنا کلام سنائیں۔ جب روانگی کا وقت آیا تو سیف صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور برجستہ کہا "میں وہاں جا کر مسخرہ بننا نہیں چاہتا۔" دل صاحب اس وقت تو خاموش ہو گئے اور بیباک میاں کے ساتھ التفات رسول صاحب کی قیام گاہ پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر اور جج ضلع کو اپنا کلام سنایا۔ چونکہ وہ اردو سے ناواقف تھے لہٰذا ایک مترجم نے انگریزی میں اشعار کے معنی ان کو سمجھائے۔

واپس آ کر جب دل، بیباک اور سیف اکٹھے ہوئے تو دل صاحب نے چھیڑا —— "کیوں سیف صاحب! جب آپ ولایت درزی کی دکان پر جا کر اس کو اپنی غزلیں سناتے ہیں جو بالکل جاہل ہے تو آپ کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے مگر جب ایک ڈپٹی کمشنر جس کے اجلاس میں آپ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں، آپ کو نہایت احترام سے اشعار سننے کے لئے مدعو کرتا ہے تو آپ انکار کر دیتے ہیں کہ میں مسخرہ بننا نہیں چاہتا۔"

یہ سننا تھا کہ بیباک میاں آگ بگولا ہو گئے "کیوں بے سیف کے بچے! تو نے یہ کیا سمجھ کر کہا، کیا ہم مسخرے ہیں؟ خدا کی قسم اگر تو شاہجہانپور

میں ہوتا تو میں سینہ پر چڑھ کر تیرے گلے کا خون پی لیتا۔"

مرزا یگانہ اور عزیز لکھنوی مرحوم میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ جس مشاعرہ میں دونوں حضرات ہوتے یگانہ صاحب مصر ہوتے کہ میں عزیز کے بعد پڑھوں گا اور مخالف جماعت "معیارِ ادب" مصر ہوتی کہ عزیز صاحب یگانہ کے بعد پڑھیں۔ یہ کشمکش یہاں تک بڑھتی کہ دونوں بغیر غزل پڑھے اٹھ جاتے اور اہلِ مشاعرہ سر پیٹتے رہ جاتے۔ ایک بار سیتاپور کے ایک بڑے مشاعرے میں لکھنؤ سے مرزا یگانہ اور ان کی مخالف "معیارِ ادب" کے اراکین بھی آئے ہوئے تھے۔ تقدیم اور تاخیر کے مسئلے پر دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بانیٔ مشاعرہ نے دل صاحب سے کہا "آپ بیچ میں پڑ کر صلح کرا دیجئے ورنہ مشاعرہ خراب ہو جائے گا۔" لکھنؤ کے ایک اچھے شاعر شفیق لکھنوی بھی شریکِ محفل تھے۔ وہ بالکل غیر جانبدار تھے۔ دل صاحب نے حامی بھر لی۔ پہلے اراکین "معیارِ ادب" کے پاس گئے، ان کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ ان کی جماعت کے سب شعراء پہلے پڑھ لیں، ان کے بعد مرزا یگانہ اور پھر شفیق لکھنوی۔ چونکہ شفیق صاحب لکھنؤ کے ہیں اور یگانہ کے بعد پڑھیں گے اس لئے جیت اہلِ لکھنؤ کی ہو گی۔ پھر آپ یگانہ کے پاس گئے اور ان کو سمجھایا کہ آپ غزل ان لوگوں کے بعد ہی پڑھیں گے مگر آپ کے بعد شفیق لکھنوی کو پڑھوا دیا جاتے گا جو ایک اچھے شاعر ہیں، ان کے آخر میں پڑھنے سے آپ کی کوئی توہین نہ ہو گی۔ یگانہ نے بھی یہ تجویز مان لی اور مشاعرہ کی کامیابی نے دل صاحب کو دولہا بنا دیا۔

شاہجہان پور کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں دل، نوح اور سیماب پاس ہی بیٹھے تھے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ فیاض شاہ آبادی نے یہ مصرعہ پڑھا ع

ان کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں اپنے دل سے ہم

سیماب صاحب نے اعتراض داغ دیا "دل کی دھڑکنیں سنی بھی جاتی ہیں؟"

دل صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں ——— مگر کانوں سے نہیں دل سے۔"

جب فیاض صاحب نے مقطع پڑھا ع

فیض اے فیاض پاتے ہیں جنابِ دل سے ہم

تو سیماب صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معافی مانگ لی۔

الٰہ آباد کی کسی تقریب میں دل صاحب شریک تھے۔ نجم الدین جعفری بار ایٹ لا بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ دل صاحب نے جعفری صاحب سے پوچھا "آپ مجھ سے واقف ہیں؟"

جعفری صاحب نے فوراً جواب دیا "کیوں نہیں، آپ تو ہر وقت میرے بائیں پہلو میں دھڑکتے رہتے ہیں۔"

کانپور کے ایک مشاعرے میں جب دل صاحب کا نمبر آیا تو ناظمِ مشاعرہ نے کہا "آپ حضرتِ دل ہیں جو عاشق کے پہلو میں رہتے ہیں؟"

دل صاحب نے برجستہ کہا "اب تو معشوقوں کی مٹھی میں رہتا ہوں۔"

مراد آباد کے ایک مشاعرہ میں دل صاحب بھی مع ایک شاگرد کے مدعو تھے۔ آپ کو مشاعرے سے قبل ایک میزبان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ صبح سے دوپہر تک ملنے والوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ دل صاحب چونکہ لمبا سفر طے کر کے آئے تھے اس لئے بھوک نے بہت پریشان کیا۔

مگر انہوں نے تقاضا خلافِ تہذیب سمجھا۔ جب دو بج گئے تو آپ سے ضبط نہ ہوا، اپنے شاگرد کو دو روپے دے کر کہا: "ذرا بازار جا کر ایک ڈبل سگرٹ اور ایک بوریا لے آؤ۔"

میزبان صاحب نے سنا تو بہت حیران ہوئے۔ وجہ پوچھی تو دل صاحب نے اپنے شاگرد سے کہا: "ہاں ہاں بوریا لے آؤ میری آنتیں اس پر قل ہو اللہ پڑھیں گی۔"

اس پر میزبان بہت جھینپے اور فوراً دسترخوان بچھا دیا گیا۔

سہارن پور کے ایک مشاعرے میں دل صاحب اور نوح صاحب ساتھ ساتھ شریک ہوئے۔ بعد مشاعرہ طلباء ان پر آٹوگراف کیلئے ٹوٹ پڑے۔ چلتے وقت دل صاحب بیاض وہیں بھول گئے۔ قیام گاہ پہنچ کر یاد آیا تو سخت پریشان ہوئے۔ بہت تلاش کی گئی مگر بیاض نہ ملی۔ سید نثار حیدر زیدی اس وقت کلکٹر تھے۔ تمام ضلع میں احکامات بھیج دئے گئے کہ بیاض نہ ملی تو سخت مصیبت نازل ہوگی اور جو یہ بیاض ڈھونڈھ کر دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

دوسرے دن جعفر عباس ایڈوکیٹ کے یہاں مشاعرہ تھا دل صاحب کی باری آئی تو انہوں نے بمشکل چند شعر جو یاد تھے سنائے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو کسی نے کہا: "آپ کی بیاض مل گئی ہے۔"

دل صاحب خوشی سے اچھل پڑے "۔ کیا واقعی ۔۔۔؟"

جواب ملا ۔۔۔ "جی ہاں! مگر وہ ایک رقاصہ کے پاس ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ دل صاحب میرے مکان پر تشریف لائیں، ناشتہ کریں کلام سنائیں پھر بیاض ان کو پیش کی جائے گی۔" دل صاحب شرط پر غور کرنے لگے، نوح صاحب نے ان کے چٹکی لی تو بولے:

"جب پیراگذر رے خانے میں ہوتا ہے، کعبہ میں بھی رہتا ہوں، دیر میں بھی جاتا ہوں تو
ایک رقاصہ کے یہاں جانے سے کیا گریز ۔۔۔"

وقت مقررہ پر جعفر عباس، نوح صاحب اور دل صاحب وہاں پہنچے بڑے تکلف سے چائے پلائی گئی۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس فتنۂ روزگار نے دل صاحب کو چائے پیش کی۔ دل صاحب تھے کہ شرم سے دوہرے ہوئے جا رہے تھے اور نوح صاحب آنکھوں کے کونے دبا دبا کر اس شرارت پہ اکسا رہے تھے۔ چائے کے بعد شعر خوانی ہوئی اور اللہ اللہ کرکے بڑے اعزاز سے بیاض دل صاحب کو پیش کی گئی ۔۔۔ بیاض کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بیساختہ آنسو آ گئے اور بیاض رقاصہ کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بیاض کسی لڑکے نے مشاعرہ گاہ سے اٹھا لی تھی اور بازار میں اسے بیچنے لے گیا تھا۔ اس کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ لکھی جا چکی تھی اور پولیس بہ گرم تلاش تھی۔ اتفاق سے رقاصہ کا بھائی ادھر آ نکلا اس نے لڑکے سے کہا: "میاں صاحبزادے یہ کتاب میرے حوالے کرو ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔" لڑکا یہ سنتے ہی بیاض پھینک کے بھاگ کھڑا ہوا۔

دل صاحب انکساری و سادگی کے مجسمہ اور وضع کے اتنے پابند ہیں کہ خواہ کتنا ہی وقت گذر جائے تا ختم مشاعرہ نہیں اٹھتے۔ جب کسی بیرونی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں تو میزبان پیچھا نہیں چھوڑتے اور بہ اصرار اپنے یہاں ٹھہراتے ہیں۔ الہ آباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آپ گئے تو پروفیسر ضامن علی کے مہمان ہوئے۔ پروفیسر صاحب کے اصرار پر ایک ہفتہ تک قیام رہا۔ اس دوران میں ایک اور شاعر آ کر ضامن صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ دل صاحب اور وہ ایک ہی کمرے میں سوئے۔ نصف شب کے قریب انہوں نے دل صاحب کو جگایا کہ "شمالی ہوا مجھے تکلیف دیتی ہے کسی نوکر کو بلوا کر میرے پلنگ کا رُخ تبدیل کرا دیا جائے۔" لہٰذا ضامن صاحب کو جگایا گیا۔ ملازم کو سوتے سے اٹھایا گیا اور ان کے

پلنگ کا رخ تبدیل کیا گیا۔ دوسرے دن یہ لطیفہ تمام الہ آباد میں مشہور ہو گیا اور ضامن صاحب نے ان کی میزبانی سے کان پکڑ لئے۔

دل صاحب اپنے ہم عصروں میں حضرت بیخود دہلوی کے بعد سب سے معمر ہیں۔ آپ کی عمر اس وقت اسّی سے اوپر ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک باقیات الصالحات کا مشاعرہ نشر ہوا تھا اور حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات نے دستاویزی فلم لی تھی۔ اس مشاعرہ میں وہی مشاہیر شعراء مدعو تھے جن کی عمریں ساٹھ سے اوپر تھیں۔ دل صاحب بھی شریک تھے۔

گذشتہ سال نواب رامپور نے اپنی سالگرہ کے موقع پر قصر شاہی میں شاندار مشاعرہ کیا تھا۔ دل صاحب بوجہ پیرانہ سالی اب مشاعروں کی شرکت سے گریز کرتے ہیں مگر نواب صاحب کے بھائی دلّن میاں کے پیہم اصرار پر شریک ہونا پڑا۔ اس تقریب میں پہلے نواب صاحب کے اعزاز میں اعلیٰ پیمانے پر ایٹ ہوم دیا گیا اس کے بعد علی ظہیر صاحب وزیر یو۔پی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ منتظم مشاعرہ ساغر نظامی تھے۔ جب سب شعراء پڑھ چکے تو ساغر نے کہا " اب صرف تین بزرگ شعراء باقی رہ گئے ہیں، قبلہ جوش ملسیانی، قبلہ نوح ناروی اور قبلہ دل شاہجہان پوری۔ یہ حضرات ترتیب کے متعلق خود فیصلہ کر لیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا " یہ اعلان سنتے ہی جوش صاحب ڈائس پر پہنچ گئے اور غزل شروع کر دی۔ ان کے بعد نوح صاحب لپکے مگر دل صاحب نے گھسیٹ لیا " ٹھہرئیے صاحب میری عمر صرف ۷۹ سال ہے۔ آپ حضرت نوح ہیں، آپ کی عمر تیرہ سو سال ہے۔ آپ مجھ سے پہلے کیسے پڑھ سکتے ہیں ——؟"

دل صاحب میں اگلے وقتوں کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یوں تو اہلِ شاہجہان پور خاطر تواضع میں حاتم طائی کی نسل سے مشہور ہیں، مگر دل صاحب نے اپنے ہم وطنوں کا ریکارڈ بھی توڑ دیا ہے۔ بقول فضا جالندھری " آپ اتنے مہمان نواز ہیں کہ نو وارد مہمان کا جی چاہتا ہے آپ کے دسترخوان کی تمام چیزیں چٹ کر جائے " شاہ جہانپور میں جب بھی کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا ہے اکثر مہمان آپ ہی کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر جب ڈپٹی کمشنر تھے تو سالانہ کمیٹی کے سلسلہ میں شاہجہانپور آتے تھے مگر کبھی کسی افسر کے یہاں نہیں ٹھہرے سیدھے دل صاحب کے یہاں پہنچے اور بستر کھلوا دیا۔ نوح صاحب اکثر آپ کے مہمان رہے۔ جگر صاحب جب بھی شاہجہانپور گئے سب سے پہلے دل صاحب کے یہاں حاضری دی جوش صاحب پچھلے دنوں کراچی آتے ہوئے شاہجہانپور محض اس لئے اترے کہ حضرت عزیز لکھنوی کے دیرینہ دوست اور اردو کے مسلم الثبوت استاد حضرت دل کے شہر سے ان سے ملے بغیر گذرنے کو ان کا جی نہ چاہا۔ سچ پوچھئے تو دل صاحب نے شاہجہانپور کو متعارف کرایا ہے اور شاہجہانپور اسی لئے مشہور رہے کہ وہ دل صاحب کا وطن ہے۔

اوائل ۱۹۳۶ء میں سردار جگت سنگھ اور سید دل محمد فضا جالندھری بسلسلہ " دل نمبر رسالہ رہنمائے تعلیم " لاہور سے شاہجہانپور تشریف لائے تھے۔ ان دنوں آموں کی فصل تھی۔ دل صاحب نے ہر دو حضرات کو اپنے باغات کے آم کھلائے۔ فضا صاحب کا کہنا ہے کہ " جن آموں کا ذکر جلیل صاحب اور داغ صاحب نے اپنے اشعار میں کیا ہے وہ سب حضرت دل کے باغات میں موجود ہیں "

دل صاحب آموں کے عاشق صادق ہیں۔ فصل انبہ میں آپ اپنے احباب کو آم خوری کے دعوت دیتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، ڈال اور پال کے آم کھائے جاتے ہیں، شکار کھیلا جاتا ہے اور شعر پڑھے جاتے ہیں۔

آپ کے ایک دوست آم کھانے باغات میں تشریف لے گئے۔ وہ بمبئی آم سے سخت نفرت کرتے تھے کہتے تھے " بمبئی تو ایسا برا آم ہے کہ اس کو چھیل کر پیشاب کر دینا چاہئے۔" دل صاحب کے کانوں تک بھی ان کی یہ بات پہنچی آپ نے ایک خوب تیار بمبئی چھیل کر ان کو دیا۔ انہوں نے مزے لے لے کر کھایا اور بہت تعریف کی۔ نام پوچھا تو دل صاحب نے کہا " قارورہ " بہت حیران ہوئے تو آپ نے فرمایا " صاحب!

آم کی تیاری کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے بلبئی وقت سے پیشتر یا بعد کو کھایا جائے تو یقیناً بدمزہ ہو گا۔"

آپ کا شغل طب صرف رفاہِ عام کے لئے ہے۔ خاص خاص مجربات آپ خود تیار کر کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ لوگوں کے مکانوں پر جا کر مریضوں کو دیکھتے ہیں مگر کبھی کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ایک بار ایک انگریز کو جو ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا آپ کے علاج سے صحت ہو گئی اس نے پانچ سو روپے بطور نذر پیش کئے مگر آپ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گیا اور جب تک بیٹھا رہا معافی مانگتا رہا۔

بڑے بڑے رؤسا اور حکام آپ کے یہاں آتے اور آپ کو اپنے یہاں عزت سے بلاتے ہیں ——— مگر آپ سرکاری تقریبات میں بھی اسی شان سے شریک ہوتے ہیں جس شان سے اپنے مزدوروں کے ساتھ ان کے دوپہر کے کھانے میں۔

مشاعروں کے سلسلہ میں شعراء کافی روپیہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک ایک آنہ کے لئے لڑتے ہیں۔ میں نے مشاہیر شعراء میں اکثر کو "محنتانہ" کے لئے اراکین مشاعرہ سے دست و گریبان دیکھا ہے۔ اکثر صفِ اول کے شعراء تو مقررہ رقم سے بھی زائد طلب کر بیٹھتے ہیں۔ فرماتے ہیں مشاعرہ کیلئے نئی شیروانی سلوائی دو سو خرچ ہوئے، سوٹ کیس لیا پچاس صرف کئے۔ سیکنڈ کلاس کے بجائے فرسٹ میں سفر کیا ڈھائی سو لگے دلوایئے پانچ سو" یہ مرض صرف پیشہ ور شعراء ہی کو لاحق نہیں ہے کھاتے پیتے سفید پوش شعراء بھی اس میں مبتلا ہیں مگر دل صاحب نے تو ادب دوستی کا ریکارڈ ہی توڑ دیا۔ آپ نے اراکین مشاعرہ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بعض بعض جگہ آپ اپنی جیب سے کرایہ آمد و رفت صرف کر کے تشریف لے گئے۔ نواب التفات رسول صاحب نے ہر چند آپ کو زادِ راہ دینا چاہا مگر آپ نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ایک مرتبہ وہ بہت مصر ہوئے تو آپ نے فرمایا ——— "آپ مجبور کرتے ہیں تو لئے لیتا ہوں مگر آئندہ آؤں گا نہیں" ——— یہ سُن کر التفات رسول صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور الفاظ واپس لے لئے۔

دل صاحب آج بھی شاہجہانپور میں ہیں۔ زمینداری جو ان کا ذریعہ آمدنی تھی، بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔ ٹھیکیداری قریب قریب ختم ہو گئی ہے صبح کو مطب کے بعد اصلاح و تصحیح کا شغل اور شام کو لوگوں سے ملنا جلنا اب بھی جاری ہے۔ اب بھی شاہجہانپور کی کسی شاہراہ پر ٹہلنے کی چھڑی بازوؤں میں پھنسائے، ہاتھ پشت پر باندھے اور سر جھکائے بے نیازانہ گذرتے ہوئے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ادب سے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ مگر کبھی سلام کا موقعہ نہیں پاتے۔ کتنوں ہی نے مجھ سے کہا "کاش ہم کبھی دل صاحب کو پہلے سلام کر سکتے" دل صاحب خود سلام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں شاید وہ سارا ثواب خود ہی لُوٹنا چاہتے ہیں۔

انقلاباتِ زمانہ نے انہیں نیم جان کر دیا ہے مگر وضع کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ ان کے بڑے صاحبزادے شبیر حسن خان جن کی عمر پینتیس سال کے قریب ہے وکالت کرتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے شفیق حسن خان جو بیس کے لگ بھگ ہیں گھر کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور پچھلے چند برسوں سے شعر بھی کہنے لگے ہیں۔ کبھی کبھار ان کی غزلیں نگار اور ہندوستانی ادب میں نظر آ جاتی ہیں۔

چلتے چلتے حق شاگردی بھی ادا کر دوں۔ میں ان سے بہت قریب رہا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ وہ مکمل انسان ہیں اور مکمل استاد بھی۔ انہوں نے کبھی مصرعہ کاٹ کر مصرعہ اور شعر کاٹ کر شعر نہیں لکھا۔ ان کی اصلاح شاگرد کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے کبھی کسی بلندی کا شعر آسمان پر نہیں پہنچاتے اس کو خود آگے بڑھنے کا سبق دیتے ہیں۔ شعر میں صنّی فنی اور اسلوبی احتیاطیں وہ برتتے ہیں کسی نے نہیں برتیں۔ اپنے تلامذہ کے خیال کی بلندی اور پستی، رنگِ کلام اور اندازِ بیان پر وہ اپنے نظریات کا غلاف کبھی نہیں چڑھاتے، ان کے تلامذہ میں جہاں خالص کلاسیکی شعراء ملتے ہیں وہاں خالص انقلابی، رومانی اور ترقی پسند بھی۔ وہ ہر ایک کو اس کے اپنے اندازِ فکر کے مطابق راہ دکھاتے ہیں۔ ان کا اصولِ اصلاح یہ ہے کہ شعر میں فنی خامی یا زبان و بیان کا سقم نہیں رہنا چاہیئے۔

ان کی اصلاح اتنی باریک اور اتنی نازک ہوتی ہے کہ دیکھئے اور دیکھتے رہ جایئے۔ بطور مثال ایک شعر پر ان کی اصلاح نقل کرتا ہوں۔ شعر تھا ؎

جشنِ فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گلِ نورس مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

آپ نے لفظ "جشن" میں جیم اور شین کے نقاط کے گرد گھیرا ڈال کر (حسن) شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اب شعر پڑھیے اور لطف اٹھایئے ؎

حسنِ فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گلِ نورس مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

دلؔ صاحب کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہندو پاکستان کے گوشے گوشے میں ان کے عقیدتمند بکھرے ہوئے ہیں مگر فطرتاً بے نیاز ہونے کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کا ریکارڈ نہیں رکھتے اور اکثر ان کے خطوط، پشت پر جواب لکھ کر واپس کر دیتے ہیں اس طرح ان کا نام و پتہ بھی محفوظ نہیں رہتا۔ دورِ حاضر کے بیشتر اساتذہ نے ان سے باقاعدہ اصلاح لی ہے مگر دل صاحب کی وضعداری کو کیا کیا جائے انہوں نے اسے ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھا اور آج بھی یہ سطور لکھتے وقت ان کی وضع پرستی میرا قلم روکے ہوئے ہے۔ بہرحال یہ چند نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں عابدؔ شاہجہانپوری، کسریؔ منہاس، عیشؔ فیروزپوری، فضاؔ جالندھری، اصغرؔ شاہجہانپوری، شفاؔ گوالیاری، عبرتؔ صدیقی، اشرفؔ سرحدی، رساؔ بریلوی، فیاضؔ شاہ آبادی، ساقیؔ جاوید، مشیرؔ جھنجھانوی، بسملؔ شاہجہانپوری، شاداںؔ گوالیاری، عاصیؔ ترمذی، نظیرؔ حسین خاں نظیرؔ، دردؔ شاہجہانپوری، جمالؔ مینائی وغیرہ۔

دلؔ صاحب اب چراغِ سحری ہیں مگر ان کی پیاری شخصیت اور ان کے پاکیزہ افکار انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے خود بقول ان کے ؎

دلؔ ہوں، یہی فطرت ہے اے اہلِ نظر میری
میں سینۂ عالم میں ہر وقت دھڑکتا ہوں

فلک پیما

میاں بشیر احمد

مدیر نقوش نے چند ماہ ہوئے مجھے لکھا کہ میں اپنے عزیز ترین دوست میاں عبدالعزیز فلک پیما مرحوم پر چند خیالات کا اظہار کروں۔ پہلے تو کچھ عرصہ میں اس فرمائش پر گھبرایا۔ میں نے سوچا کہ فلک پیما پر لکھنا بڑا مشکل کام ہے، فلک پیما کے خیالات کو سمجھنے کے لئے بڑی فلسفیانہ فہم درکار ہے۔ اُن کی گوناگوں شخصیت اور اُن کے کردار کا نقشہ کھینچنے کے لئے بڑے تامل اور تدبر اور تفکر کی ضرورت ہے اور مختلف وجوہ سے میں آج کل اس قابل نہیں کہ یہ دشوار کام اپنے ذمے لے سکوں۔ سو میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں [illegible] نہیں لکھ سکتا۔ اتنے بڑے شخص اور اپنے ایسے دوست کی شان کے شایان کچھ لکھ سکوں تو لکھوں اور نہ لکھ سکوں تو محبت و عظمت کے حضور میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی کہ لکھنے کا عزم بھی کروں۔ پھر ایک دن یک لخت دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور معلوم ہوا کہ فلک پیما پر میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، کئی صفحے سیاہ کر سکتا ہوں اور جب کر سکتا ہوں تو حیف ہے کہ ایسا نہ کروں۔ انسانی محبت کا تقاضا ہے اُردو ادب کی مدح کا اصرار ہے کہ میں ایسا کروں میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ وقت نکالوں گا اور اطمینان سے لکھوں گا اور اس لکھنے سے اور اس محنت سے فائدہ بھی اٹھاؤں گا اور لطف بھی۔ اُن کی کتاب "مضامین فلک پیما" ہے جو اب نایاب ہے اُسے پڑھوں گا سمجھوں گا سر دھنوں گا اور لکھوں گا۔ میری طرف اُن کے سینکڑوں خطوط ہیں بڑے پرائیویٹ اور بے تکلف اور بے تحاشا، ان میں انسانی جذبات کی لہریں ہیں علمیت کے موتی ہیں فلسفے کے ہیرے ہیں۔ ان کو دیکھوں گا پرکھوں گا اوروں کو دکھاؤں گا۔ کس قدر شاندار کام ہوگا۔ اور پھر اُن ہزاروں ملاقاتوں پر ایک نگاہ ڈالوں گا جو میری اُن کی ہوئیں اُنہیں یاد کروں گا دل کے کانوں سے سنوں گا اور شکریے کی زبان سے دوستوں اور ہم جنسوں کو سناؤں گا اور مزے لوں گا واہ !
کس قدر پُر لطف کام ہوگا!

لیکن صد حیف کہ فرصت نہ ملی پر نہ ملی حالانکہ مجھ سے آدمی کی بابت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "فرصت ہی نہیں دیتے افکار معیشت کے"۔
پھر کس قدر شرم کی بات ہے کہ میں نے کچھ نہ لکھا۔ ہزاروں کاموں کے اندر بیسیوں بے سود مصروفیتوں اور بے معنی "مصیبتوں" اور "غموں"

کے اندر ڈوبا رہا یا چھپا رہا۔ یہ نہ کیا کہ ڈوبنا ہی تھا تو ایک دن ایک غوطہ لگا کر فلک پیمائی خوبصورتیوں کے چند انمول موتی سمیٹ کے اوپر لے آتا اور سورج اور چاند کی روشنی میں اُن کی چمک سے بعض نگاہوں کو خیرہ اور بعض دماغوں کو مدہوش اور دلوں کو زندہ کر دیتا۔ شاید یہ کام مجھ سے نہ ہونا تھا نہ ہو سکتا تھا صرف اس کی آرزو تھی لیکن حیف کہ وہ بھی اتنی زبردست نہ ہوئی کہ یہ کام مجھ سے ہو جاتا! یوں دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ شدت کی گرمی پڑنے لگی اور مجھ نازک مزاج کے پہاڑ پر چلے آنے کے دن قریب آ گئے۔ سوچا کہ اب پہاڑ پر فراغت میں ٹھنڈک میں بے خوابی کی راتوں میں خوب موقع ملے گا کہ فلک پیما کی کتاب کو پڑھوں اور مطلوبہ مضمون کو ٹھہر ٹھہر کر لکھوں اور "نقوش" کے صفحات پر اس نقش کو ثبت کر دوں۔

لیکن وائے قسمت کہ یہ بھی نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ پہاڑ پر تو آ گیا تو دو چار روز ہوئے کہ ارادہ کرنا پڑا کہ اس دفعہ اور وہ بھی بہت جلد صحت کے لئے سیر و تفریح کی غرض محض گریز کی خاطر یورپ چل دوں۔ اسی حال میں تھا کہ آج طفیل صاحب کا عنایت نامہ اور شکایت نامہ آ دھمکا۔ میں نے سوچا کہ خیر اب تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا نہ صرف یہ کہ فلک پیما کی کتاب پاس نہیں ہے نہ اُن کے خطوط ہیں اور نہ دلجمعی بلکہ اب یہاں (مری) جانے میں دو روز رہ گئے ہیں سینکڑوں کام نبٹانے ہیں بیسیوں قسم کی تیاریاں کرنی ہیں ان میں تشویش بھی ہو گی لطف بھی آئے گا یہ خیال کر کے کہ فلک پیما پر کچھ لکھنا چاہیئے اس رنگ میں کیوں بھنگ ڈالوں۔ چھوڑ دوں یہ خیال اور صرف چار سطر کا ایک معذرت نامہ طفیل صاحب کو لکھ دوں کہ قصہ ختم ہو جائے۔

مدیرِ نقوش کے نجی اور مطبوعہ خطوط دونوں پر پھر ایک نظر ڈالی۔ لکھا تھا "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے فلک پیما پر مضمون لکھ دیں کہ بہ حیثیت انسان کیسے تھے اور ہیں اور ان میں کیا کیا خوبیاں اور کمزوریاں تھیں یا ہیں۔ ادبی کارناموں پر بحث مقصود نہیں ہے۔" یہ پڑھتے ہی دل نے مجبور کیا کہ اُٹھوں اور ابھی میز پر بیٹھ کر کچھ لکھ ڈالوں خواہ وہ چند کلمات یا ایک آدھ صفحہ ہی کیوں نہ ہو وَ هُوَ هٰذَا:۔

مجھے عزیز کس طرح عزیز تھے اور کیوں اس ساری کہانی کو بیان کرنے کی نہ یہ جگہ ہے نہ اس کی فرصت ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ میرے والدِ محترم جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں کے "ہم عصر" اور دوست بھی تھے اور میرے بھی، وہ اُن کے "ہم عمر" بھی تھے اور میرے بھی، بلکہ وہ تو میری بڑی بیٹی رفعت کے ہم عمر بھی تھے مجھ سے زیادہ۔ وہ بڑوں سے سنجیدہ باتوں میں نوجوانوں سے ہنسی مخول میں اور بچوں سے کھیل کود میں محو ہو سکتے تھے۔ اُن کی شخصیت متنوع اور انوکھی تھی، اپنی بیچ کی اور ادھیڑ عمر میں وہ صاحب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ فیشن ایبل سوٹ بہترین ٹائی ریشمیں رومال جیب سے نکالے بڑے بانکے معلوم ہوتے تھے، ہنسی مذاق ٹھٹھا دل لگی ایک چھوٹے سے حلقے میں یہ سب کچھ لیکن پوری DECENCY (پاکیزہ مزاجی) کی تصویر تھے۔ بڑے آزاد خیال کافر سے مسلمان اپنے مخصوص دائرے میں بظاہر سلف اندوزی پر مُصر لیکن فحش نیم فحش اور ہلکے پن سے کوسوں سینکڑوں کوس دور۔ وہ ایشیا والوں کی اس کور ذوقی پر نالاں تھے کہ یہ خوشی کو جہاں دیکھتے ہیں مٹاتے ہیں مسلمانوں کی اس کوتاہ اندیشی پر رنجیدہ تھے کہ یہ پرہیزگاری کا جامہ پہن کر اپنے خدا کی وسیع دنیا میں اُس کی قدم قدم پر بکھری ہوئی اور مسکراتی ہوئی مسرتوں اور خوبصورتیوں کا خون کرتے ہیں اور اسے روحانی قربانی کا کریہہ نام دیتے ہیں۔ فلک پیما کا پیغام یہ تھا اور اسی پر اپنی پختہ سالی میں اُن کا عمل تھا کہ زہد و اتقا سے علیحدہ ہو کر حرص و ہوا سے اور بحث مباحثے سے کنارہ کر کے اپنے چھوٹے چھوٹے معاشرتی حلقوں میں کائنات کی بڑی سے بڑی خوبیوں اور خوشیوں کو ایک دوسرے میں دیکھو اور دکھاؤ۔ زندگی کا ایک ہی پہلو ہے اور وہ پہلو روشن ہے، ایک تاریک پہلو بھی ضرور ہے لیکن وہ موت ہے زندگی نہیں!

ایک دفعہ مجھے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "بشیر! مجھے جتنا رنج زیادہ ہوتا ہے اُتنا ہی میں اور زیادہ ہنستا ہوں" میں نے اُن کی زندگی کو اس خیال کی تصویر پایا جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر۔ اکثر اپنی غم پسندی میں مجھے اُن کا یہ فقرہ یاد آ گیا اور اس سے نہ صرف میری ڈھارس بندھی بلکہ میں بھی بے اختیار ہنس دیا اور اپنے افکار کو بھول گیا۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ فلک پیما ایک عیش پسند اور تنعم پرست آدمی تھے۔ بطور ایک مال کے اعلیٰ ترین افسر کے بطور ایک رکنِ اسمبلی کے بطور ایک طالب علم فلسفی کے وہ بیحد مصروف اور محنتی اور جفاکش تھے۔ اپنے بہتریں سال میں عمر کے آخری دنوں تک وہ روزانہ آٹھ دس گھنٹے کام کرتے رہے اور کام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یوں وہ ٹینس کے خاصے کھلاڑی تھے "برج" کے خاصے ماہر تھے، لاہور شہر کے اندر جاکر پوری کچوری اور حلوہ کھانے کھلانے کے مشتاق تھے، وہ ان طرح طرح کی باتوں سے لطف اُٹھاتے تھے لیکن دراصل اُن کی عمر سنجیدہ باتوں اور متین کاموں میں گزری۔ مگر ایک بڑی بات یہ تھی کہ اکثر دوسرے بڑے اور مشہور آدمیوں کی طرح جو ایسے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں ان کاموں کی سنجیدگی اور متانت نے کبھی اُن کے دل و دماغ پر قبضہ نہیں کیا وہ کبھی سنجیدگی اور متانت اور عقلمندی کے غلام نہ ہوئے بلکہ اُنہوں نے اِن سے بھی زندگی کی خوشی کا کام لیا۔ خوشی جو بیک وقت سادہ اور اعلیٰ پایہ کی تھی!

باغِ جناح (لاہور) میں سینکڑوں بار وہ اور میں مل کر گھومے اور اکثر میں نے کائنات اور زندگی کے فلسفے کی گفتگو چھیڑی۔ میں چاہتا تھا کہ مجھ سا فلسفہ ناشناس اُن سے ماہرِ فلسفہ سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہے۔ وہ مجھے اپنی مطالعہ کی ہوئی کتابوں کا خلاصہ بتا کر مجھے اپنے علم سے مالامال کرتے رہیں۔ بعض دفعہ دیر تک میں سوال جواب کرتا رہتا آخر یک لخت ہنس کر وہ کہہ دیتے کشمیری بشیر دیکھو تو یہ پھول کتنا بے نظیر ہے آج کیسی لطیف ہوا چل رہی ہے یا بس چھوڑو بھی اس فلسفے کو!

ہمایوں جاری ہوا تو میں نے اُن سے کہا کہ کچھ لکھیئے۔ کہنے لگے دیکھو میری مضمون نویسی کا زمانہ گزر چکا، میں اب بھی خوب لکھ سکتا ہوں اور لکھوں گا لیکن میں مضمون نگار نہیں بننا چاہتا نہ مصنف بننا یا مشہور ہونا چاہتا ہوں، مجھ سے میری آزادی نہ چھینو لیکن محبت سے آزادی سے جو کچھ میں لکھوں گا صرف تمہارے لئے اور ہمایوں کے لئے لکھوں گا اور گمنام رہ کر لکھوں گا۔ میں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ برسوں کے بعد جب یہ پردہ فاش ہوا اور فلک پیما کی نقاب کشائی ہوئی تو اور لوگوں کے تقاضے بھی بڑھے کہ ہمارے لئے بھی کچھ لکھیئے تو عموماً انکار کیا یا پھر مجھ سے اجازت طلب کی جیسے میں نے "فلک پیما" کو اپنے لئے Patent (مخصوص) کر رکھا ہو۔ میں حیران ہوتا اور کہتا کہ جیسے آپ کی مرضی۔ وہ کہتے کہ نہیں میں ہمایوں کی محبت کا آزاد غلام ہوں۔ میں محبت کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ میں محبت کے لئے جیتا ہوں۔ ہزاروں باتیں اور ہیں لیکن میں کیا کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں "فرصت" نہیں دلجمعی نہیں۔ غنیمت ہے کہ اتنی دیر ہی فلک پیما سے آزاد خیال اور آزاد عمل دلی دوست کی بابت کچھ لکھ دیا تو اسی سے کئی بندشوں سے آزادی مل گئی اور زندگی کی ذرا سی جھلک دیکھ لی!

سے اس مضمون میں میں نے فلک پیما کے ادبی کارنامے پر نظر ڈالی۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اُردو کے "برنارڈ شا" تھے جنہیں اب تک بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے اور جن کی کماحقہٗ ابھی قدر نہیں ہوئی!

مالک رام

مختار الدین احمد

یہ میرا قاہرہ میں دوسرا دن تھا

ہمارے ہوٹل سے میرے دوست رشاد عبدالمطلب ٹیلیفون ایکسچینج والوں سے بلند آواز میں بحث و مباحثہ میں مصروف تھے اور عامی لہجے میں عربی بول رہے تھے۔ میں مالک رام صاحب سے ٹیلیفون پہ بات کرنی چاہتا تھا جو اسکندریہ میں مقیم تھے۔ کئی نمبر غلط نکل چکے تھے، کوئی لوہے اور سیمنٹ کا بیوپاری تھا تو کوئی کھالوں کی تجارت کرتا تھا۔ ایک صاحب محامی (وکیل) نکلے اور بڑے اخلاق اور شفقت سے انہوں نے گفتگو شروع کی لیکن صورت حال معلوم ہوتے ہی انہوں نے نہایت روکھے پن سے رسیور رکھ دیا۔ اب جو نمبر ملا تھا تو کوئی بولتا ہی نہ تھا۔ آپریٹر کہہ رہا تھا کہ گھنٹی بج رہی ہے لیکن کوئی رسیور ہی نہیں اٹھاتا۔ دفتر بند ہوگا۔ رشاد کہتے تھے۔ آج دفتر کیسے بند ہوگا، تم نے اب کی بھی نمبر غلط دیا ہے۔ آخر قاہرہ میں ایک صاحب سے رجوع کیا گیا۔ ان سے مالک رام صاحب کے گھر کا نمبر معلوم ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر مالک رام صاحب کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کی آواز سنی۔ نرم اور دلکش لہجے میں انہوں نے میری آمد پر اظہار مسرت کیا اور بولے اسکندریہ فوراً پہنچو۔

دوسرے دن میں نے قاہرہ سے اسکندریہ کا ٹکٹ لیا۔ پلیٹ فارم پر کچھ مصری اخبارات و رسائل لئے اور ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ انجن چیختا چنگھاڑتا افریقہ کے ریگستان کا سینہ چاک کرتا لمحہ بہ لمحہ اسکندریہ سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ میں ہم سفروں سے گفتگو کرتا اخبار رسالے پڑھتا، کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتا رہا اور تصور میں مالک رام صاحب کے خصائل و عادات کی بابت سوچتا رہا اور تصویریں بناتا رہا۔

ٹرین اسکندریہ پہنچی تو پلیٹ فارم پہ درمیانی قد کے ایک وجیہ آدمی عینک لگائے کھڑے تھے، یہ مالک رام تھے۔ معانقے مصافحے کے بعد ہم لوگ ان کے فلیٹ کی طرف چلے جو اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ اسی شام اسکندریہ کے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کا ایک جلسہ تھا اور ان کے ایک دوست نے بہت سے لوگوں کو ڈنر پر بلا رکھا تھا۔ مالک رام اپنے نووارد مہمان سمیت وہاں مدعو تھے۔ سامان رکھ کر شہر کی سیر کرتے ہوئے اور اسکندریہ اور مصر کی عمومی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم لوگ وائی ایم سی اے کے دفتر پہنچے۔ مباحثہ وغیرہ میں تو انہوں نے کچھ حصہ نہ لیا بلکہ خاموش تماشائی کی طرح تقریریں سنتے رہے۔ لیکن وہیں تقریروں کے بعد اور پھر ڈنر میں پتہ چلا کہ وہ یہاں بہت ہر دلعزیز ہیں اور مصری سوسائٹی میں انہوں نے اچھی خاصی جگہ بنالی ہے۔

ڈنر کے دو لطیفے یاد آتے ہیں۔ وہ مرد میں قبطی اور عیسائی بھی تھے لیکن بیشتر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ماکولات کے ساتھ مشروبات خاص کا سلسلہ بھی

تھا۔ میزبان بڑے اخلاق سے ہر میز پر آکر مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ جب ہماری میز پر پہنچے تو مالک رام صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "آپ بھی کچھ پیجئے"۔ انہوں نے کہا "شکریہ! لیکن میں جمعہ کو نہیں پیتا۔"

میں نے دعوت کے بعد ان سے کہا کہ اگر آپ کے میزبانوں کا حافظہ قوی رہا تو آپ کسی نہ کسی دن ضرور پکڑے جائیں گے۔

مصر میں کچھ لوگ دیا سلائی کی ایک تیلی سے تین آدمیوں کی سگریٹ سلگانا شگون بد تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پھر آئندہ یہ تینوں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں گے۔ میں نے کھانے کے بعد سگریٹ نکالی اور اپنی میز پر کے اصحاب کو پیش کی۔ ان کی تعداد بشمول راوی چار تھی۔ میں نے ان سبھوں کی سگریٹیں سلگانی شروع کیں اب تیسرے صاحب کی باری آئی تھی، مالک رام صاحب اردو میں ہاں ہاں کہتے رہے۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ مصری دوستوں نے بھی شائد میری دل شکنی پسند نہ کی سگریٹ سلگا لی تھی۔ یورپ پہنچا تو معلوم ہوا یہ بھی گزشتہ خمار رسوم و قیود میں بلکہ وہم پرستی میں مصریوں سے کچھ بڑھ کر ہی ہیں۔

دعوت کے بعد ہم لوگ گھر پہنچے۔ یہاں پہلے تو بچوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ انگریزی تو جانتے ہی ہیں عربی بھی خوب بول لیتے ہیں۔ پھر مالک رام صاحب کے مطالعہ کے کمرے میں آئے۔ یہ مضامین اور کتابیں ہی نہیں لکھا کرتے بلکہ انہیں لکھنے پڑھنے کے لئے کتب خانہ بنانے کا بڑا شوق ہے۔ اپنے لیے نہ یہ معلوم تھا پر انہوں نے پتا نہیں کہاں کہاں سے کس کس طرح کی کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔ اس وقت میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے مصر کی حالت میں ہندوستان سے دور رہ کر اردو، فارسی اور عربی کا چھوٹا سا لیکن نفیس کتب خانہ جمع کر لیا ہے۔ غالب کے سلسلے کی شائد ہی کوئی تصنیف ہو جو ان کے پاس نہ ہو۔ اردو زبان کے شاعروں کے تذکرے بھی جس قدر ان کے پاس ہیں کسی کے پاس کم دیکھنے میں آئے۔ انہیں دو تین تذکروں کا پتہ چلا جو انگلستان میں تھے، فوراً پچاس پونڈ خرچ کر کے ان کے عکس منگوا لیے۔ کتابوں کی خریداری اور نقل و حمل میں اچھی خاصی رقم خرچ کرتے رہتے ہیں۔ دوستوں کو نئے دن فرمائشیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ کتاب بھیجو وہ رسالہ تلاش کرو، قیمتیں فوراً چکا دیتے ہیں۔ کسی نے اگر ایک آدھ کتاب ویسے ہی نذر کر دی اور قیمت نہ لی تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب سے انہوں نے ایک کتاب خرید کر بھیجنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے وہ کتاب حاصل کر کے ان کی نذر کر دی۔ انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

ہاں، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا ہوں نے آپ کا مرسلہ نسخہ لکھنؤ کا دبستان شاعری دیا، زحمت کے لئے ممنون ہوں، لیکن آپ نے یہ کیا مذاق شروع کر رکھا ہے کہ میں جس کتاب کیلئے آپ کو لکھتا ہوں آپ اس "اپنے خدوم اور بزرگ" کا نام لکھ کر ڈاک میں ڈال دیتے ہیں ——— آپ کی یہ روش مجھے آئندہ آپ کو زحمت دینے میں مانع ہو گی۔

وہ اپنے دار المطالعہ میں بیٹھے کوئی رات کے ایک بجے تک کتابیں دکھاتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن صبح کی چائے پی کر ایک دو اصحاب سے ملاقات کرائی۔ دار المعارف میں ہم لوگ تازہ مطبوعات دیکھتے رہے۔ کتابوں کا ایک پشتارہ ساتھ آیا۔ طے یہ ہوا کہ کتابیں میں اپنے ساتھ آکسفورڈ لے جاؤں، قیمتیں وہ میری طرف سے بعد میں چکاتے رہیں گے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دفتری جھمیلوں اور عجیب قسم کی غیر ادبی مصروفیات کے باوجود وہ اتنا وقت ادبی و علمی مضامین لکھنے کے لئے کس طرح نکال لیتے ہیں۔ وہ ذکرِ غالب پر نظر ثانی و اضافہ کر رہے تھے امام احمدؒ بن حنبل پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، بعض مضامین اور کتابوں کے خاکوں کا خیال ان کا دماغ بن رہا تھا، پھر بھی جب میں نے غالب کے سلسلے میں اپنے تیسرے مجموعے گنجینۂ غالب کے لئے جن جن موضوعات کا انتخاب ان کیلئے کیا وہ بلا تکلف ان پر مضامین لکھنے کو تیار ہو گئے اور انہوں نے جلد ہی اپنا وعدہ پورا بھی کر دیا۔

پندرہ سولہ گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد جب اُن سے رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔

مالک رام صاحب سے میری یہ ملاقات جولائی ۱۹۵۳ء میں ہوئی لیکن اُن سے میرے تعلقات پہلے سے تھے اور میں ان سے واقف تو بہت عرصے

سے تھا۔ غالباً سب سے پہلی مرتبہ میں نے نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں ان کی تصویر دیکھی اور ان کا ترجمہ کیا ہوا ایک مضمون دیکھا جو بجنوری مرحوم کا لکھا ہوا تھا۔ مضمون پڑھتے ہی [illegible] بجنوری اور مالک رام دونوں کا رعب مجھ پر بیٹھ گیا۔ جوں جوں عمر اور سمجھ بڑھتی گئی بجنوری مرحوم سے عقیدت میں کمی آتی گئی لیکن مالک رام کی تحریروں سے دلچسپی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

ان سے تعلقات کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا جب میں علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کی ترتیب میں مصروف تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ غالبیات کے جملہ ماہروں کو اس نمبر میں لکھنے کی دعوت دوں۔ مالک رام صاحب کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل نہ تھا اور نہ ان کی افتادِ طبیعت کے متعلق کوئی اندازہ تھا۔ خدا بھلا کرے امتیاز علی عرشی صاحب کا، انہوں نے یہ مشکل آسان کر دی۔ میرا ان سے غائبانہ تعارف کرایا اور مضمون لکھنے کی استدعا کی۔ بعض مضمون نگاروں کی طرح نہ تو انہوں نے عدیم الفرصتی کا حیلہ کیا نہ ٹال مٹول کی کوشش کی اور نہ پیشہ ور شاعروں کی طرح صعوبات سفر، نزلہ زکام اور دوسرے افکار کا ذکر ضروری سمجھا۔ ان کا فوراً خط آیا کہ میں مضمون ضرور لکھوں گا اور انہوں نے بہت جلد مضمون بھیج کر اپنا وعدہ پورا کیا۔

وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی سے تو وہ اچھی طرح واقف ہی ہیں، عربی سے ان کی دلچسپی قدیم ہے، پھر اسلامی ممالک میں طویل قیام کے باعث ان کا مطالعہ اور بھی وسیع ہو گیا ہے۔ وہیں انہیں فرانسیسی سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اور تعجب نہیں یورپ کی کسی اور زبان سے بھی واقف ہوں۔

ان کا ذوق ہمہ گیر قسم کا ہے۔ غالباً وہ اسپیشلائزیشن (تخصص) کے کچھ قائل نہیں ——— یوں بھی انہیں صرف ایک پٹڑی پر ہمیشہ چلنا مرغوب نہیں۔ مختلف طرح کے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ کبھی فتوح البلدان کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ کبھی سلیمان تاجر کا سفرنامہ سند و چین اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ کبھی غالب کے ذکر و فکر کا شغل ہے تو کبھی عورت اور اسلامی تعلیم کے موضوع پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے۔ ایک زمانے میں فارسی کے سارے نعت گویوں کا کلام جمع کر رہے تھے۔ پھر خط آیا کہ تلامذۂ غالب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھ رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے اطلاع دی کہ حمورابی کے متعلق ایک کتاب زیر ترتیب ہے جس میں اس کے آئین و قوانین بھی ترجمہ کر کے شامل کر رہے ہیں۔ پھر مژدہ سنایا کہ افلاطون کی تمام تحریروں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اب انہوں نے لکھا ہے کہ گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی کے ضخیم مجلدات کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے انہیں مضمون لکھتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اپنے افکار دماغ سے کاغذ تک منتقل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ان کی زبان اور بیان سقم سے بے عیب اور رواں ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضامین میں تمہید کا حصہ لکھتے ہیں اور اسے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ تمہید حسب حال لکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہر مضمون کی ابتدا اودھ کے مرثیہ اور سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے ہوئے چراغ سے نہیں کرتے۔ وہ مضامین جو انہوں نے مختلف شخصیتوں پر لکھے ہیں بہت دلچسپ ہیں اور ان مضامین میں طرز تحریر بہت شگفتہ ہے۔ مسائل دینی اور فقہی پر ان کے مضامین اچھے ہیں لیکن نواب صدر یار جنگ پر جو مضمون انہوں نے لکھا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔

آدمی بڑے وضع دار ہیں اور قدیم روایات کے دلدادہ۔ بڑے مروت والے ہیں۔ علمی کام ہوں یا دوسرے، جہاں تک ان سے ممکن ہو سکتا ہے وہ ضرورت مندوں کو مدد دینے پر تیار رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں کسی کتاب یا کسی مخطوطے کے عکس کے لئے لکھا، بالعموم مستعد نظر آئے۔ بعض مرتبہ عکس بھی بھجوائے اور قیمت بھی نہ لی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کو جوالیقی کی المعرب کی ضرورت تھی۔ یہاں بہت تلاش کی، مستعد رہا مگر کتاب نہ ملی۔ میں نے مالک رام صاحب کو لکھا، کتاب چھپ کر فوراً بازار سے ناپید ہو گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک نسخہ نکالا اور ڈاکٹر صدیقی کی نذر کیا۔ صدیقی صاحب سے ان کے تعلقات کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوئی ہے۔ کتابیں تو ان کی کمزوری ہیں، وہ ضرورت اور اہمیت کا خیال کر کے کبھی کبھی ایک بڑی رقم خرچ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک طالب علم کو کچھ روپوں کی ضرورت پڑی۔ انہیں اطلاع ہوئی تو کئی ہزار روپے بھجوا دیے اور لکھ بھیجا کہ تعلیم کی تکمیل ضروری ہے۔ واپسی کی فکر نہ کیجئے جی چاہے واپس کیجئے جی چاہے نہ کیجئے۔

بڑی نرمی اور مروت کے ہوتے ہوئے بھی ان کے تحقیقی مضامین میں [illegible] ہے۔ کبھی کبھی ان کی حقیقت پر ان کی فطری نرمی اور دردمندی غالب آ جاتی ہے۔ یہ

اپنے پسندیدہ مصنفین کو صحیح رنگ اور اصلی خدوخال میں نہیں دیکھتے بلکہ ان کی کمیوں اور کمزوریوں پر اس سے درگزر کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ میگزین میں غالب سے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کاش کہ...... غالب کی راست گفتاری سے متعلق نہ لکھتے۔ آخر انہیں یہ مضمون لکھنے سے کیا مل گیا؟ میں 'خطائے بزرگاں گرفتن خطاست' کا قائل نہیں ہوں لیکن گناہ بے لذت سے فائدہ؟ اگر اس سے ہمارے علم و ادب میں یا معلومات میں کچھ اضافہ ہوتا ہو تو ایک عذر بھی ہے ورنہ پردہ پوشی سے کام لینا خداوند کریم کی صفت ستاری و غفاری کا تقاضا ہے:"

غالب تو خیر ان کا خاص موضوع ہے ویسے بھی جن موضوعات پر وہ مضامین لکھتے ہیں ان پر ان کی اچھی خاصی گرفت ہوتی ہے اور وہ موضوع کے حدود سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر ان سے کسی مسئلہ پر اختلاف کیا گیا تو انہوں نے کبھی برا نہ مانا، توجہ سے سنا اور اگر انہوں نے ضروری سمجھا تو اپنی رائے میں تبدیلی بھی کر دی۔

ذکر غالب کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ انہوں نے قاضی عبدالودود صاحب کو بھجوایا اور ان سے خواہش ظاہر کی اس پر بے لاگ تبصرہ لکھیں۔ ایک طویل تبصرہ معاصر میں شائع ہوا۔ تبصرہ اچھا خاصا سخت تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی ان دونوں کے تعلقات زیادہ بڑھے۔ اسی طرح غالب نمبر میں جب ان کا مضمون 'غالب کے خصائل و عادات' پر شائع ہوا تو قاضی صاحب نے بعض امور سے اختلاف کیا۔ میں نے یہ باتیں انہیں لکھ بھیجیں۔ بعض باتوں پر وہ متفق نہ ہو سکے، لیکن بعض غلطیاں انہوں نے فوراً مان لیں اور ان کی تصحیح کر دی۔

زندگی میں نفاست اور سلیقے کے بڑے قائل ہیں۔ یہ صفت ان کی زندگی کے تقریباً سارے پہلوؤں میں کارفرما نظر آئے گی۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ صاف ستھرے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ملنے کا کمرہ، مطالعے کا کمرہ، سونے کا کمرہ گرد و غبار سے آپ اٹا ہوا کبھی نہیں پائیں گے۔ بہت اچھے کاغذ پر مضامین اور خطوط لکھتے ہیں۔ قلم، سیاہی ساری چیزیں اچھی ہونی چاہئیں۔ اپنی کتابیں اور مضامین صاف ستھرے طور پر چھپواتے ہیں۔ دوسروں کی مطبوعات بھی اسی طرح صاف ستھری دیکھنی چاہتے ہیں۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر کے مطالعہ کے بعد انہوں نے مجھے لکھا:

"غالب نمبر پچھلے ہفتے موصول ہوا، شکریہ لیکن یہ آپ نے کیا کیا؟ ایسا تاریخی نمبر اور ایسا ردی کاغذ! یہ ٹھیک ہے کہ معشوق بہرحال معشوق ہے لیکن اگر اس کا لباس اس کی شان کے مطابق نہ ہو تو بے لطفی ضرور ہو جاتی ہے۔ یہی بات اس نمبر پر صادق آتی ہے۔ اتنی محنت سے مضمون جمع کیے، اتنا خرچ کیا اور ایسا گھٹیا کاغذ۔ سارا مزا کرکرا کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے کچھ نسخے نسبتاً اچھے کاغذ پر بھی شائع کیے ہوں گے۔ اگر میرا گمان صحیح ہو تو ایک نسخہ اس کا مرحمت ہو۔"

ایک دوسرے خط میں پھر لکھتے ہیں:

"کتابت کی غلطیاں اتنی ہیں۔ دونوں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے کہ حیرت ہوتی ہے۔ پھر کتابت میں یکسانی بھی نہیں رہ سکی۔ رنگدار بلاک الا ماشاء اللہ سب مغشوش ہو گئے اور انہیں پڑھنا تک محال ہے۔ یہ آپ کو سوجھی کیا! آخر انہیں سرخ رنگ میں چھاپنے سے فائدہ ہی کیا تھا۔ جتنے بلاک کالی روشنائی میں چھپے ہیں بالکل معقول اور روشن ہیں۔ ایسے ہی دوسرے بھی چھاپ دیے ہوتے۔"

اپنا مضمون 'تلامذۂ غالب' رسالہ اردو ادب میں دیکھ کر لکھتے ہیں:

"اردو ادب کے دونوں پرچے اور میرے مضمون کی دوسری قسط کے دس نسخے موصول ہوئے۔ ہائے سر پیٹ لینے

کو جی چاہتا ہے۔ اتنی غلطیاں کتابت کی اور ستم بالائے ستم کہ صفحوں کے نمبر تک غلط ہیں جس سے مضمون الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

مضامین کی اشاعت میں صحت کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں :

"مجھے اپنے مضمون سے متعلق دو باتیں یاد آ گئیں۔ آخری ایّام کے سالات میں ایک جگہ میں نے لفظ سائنس کا استعمال کیا ہے۔ مجھے اس کی تذکیر و تانیث میں کچھ شبہ سا ہے ...... اگر میں نے مذکر لکھا ہے تو رہنے دیجئے۔"

دوسری: ایک جگہ مرزا کی زبان سے کہا گیا ہے : "کوئی ڈھب کا مکان نہیں ملتا تھا" یہاں ڈھب کی جگہ ڈھنگ بنا دیا جائے۔ اگر کاپی مطبع میں نہیں گئی ہے تو یہ مشکل نہیں ہو گا۔ اگر جا چکی ہو تو پتھر پر یہ تبدیلی کرا دیں۔ اگرچہ ڈھب بھی غلط نہیں لیکن ڈھنگ زیادہ فصیح ہو گا۔ یہ دونوں باتیں ضرور دیکھ لیں۔

ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ان کا دوسرا والا نامہ موصول ہوا :

"میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنے مضمون سے متعلق دو باتیں لکھی تھیں۔ پہلی یہ کہ سائنس کو مذکر رہنے دیں۔ اب گزارش ہے کہ اسے مؤنث بنا دیں یعنی "سائنس ہو گئی" بنا دیں۔ میں ان باتوں میں لکھنوی محاورے کو ترجیح دیتا ہوں اور لکھنؤ میں سائنس مؤنث ہی ہے اس لئے اسے مؤنث بنا دیں۔

دوسرے ڈھب کی جگہ ڈھنگ کرایا جائے۔ امید ہے آپ نے یہ کر ہی دیا ہو گا۔ مہربانی کر کے آپ بھی میری طرح تساہل سے کام نہ لیں گے۔"

جب ان کا مضمون پہنچا تھا تو کچھ ہدایتیں بھی کہ کتابت پر خاص توجہ ہو، غالب کی فارسی غزلوں کو کلیات میں سے دیکھ لیا جائے۔ مضمون کسی طاق عدد سے شروع کیا جائے، جیسے ۹، ۱۱، ۱۳، وغیرہ۔ مقصود یہ کہ اگر ممکن ہو تو مضمون کی ۸، ۱۰ کاپیاں علیحدہ نکلوا لی جائیں۔ کاتب لفظوں کو ملا کے نہ لکھے، جیسے : اسلئے، آجکل، انکو۔ یہ الفاظ الگ الگ لکھے جائیں : اس لئے، آج کل، ان کو وغیرہ۔

خط و کتابت میں باضابطگی پر بہت زور دیتے ہیں۔ جواب میں تاخیر ہوئی تو غضب ہو جاتا ہے :

"ایک درخواست کرتا ہوں کہ خطوں میں زیادہ باقاعدگی کو اپنا شعار بنائیں۔ مجھے اس سے زیادہ کوفت کسی بات سے نہیں ہوتی کہ لوگ خطوں کے جواب نہ دیں۔"

ایک مرتبہ ان کے خط کے جواب میں مجھ سے تاخیر ہوئی۔ انہوں نے فوراً لکھا :

"میں نے اتنے دن آپ کو خط نہیں لکھا اس کی دو وجہیں تھیں : اوّل تو یہ کہ میں اپنے خطوں ... کی رسید کے انتظار میں رہا، دوسرے یہ کہ میں نے خیال کیا کہ میرا خط کہیں بارِ خاطر نہ ہو۔ جب کوئی مجھے خط نہیں لکھتا یا میرے خط کا جواب نہیں دیتا تو غلط یا صحیح مجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کر رہا ہوں۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

"بھائی آج یہاں عید ہے اس لئے عید مبارک کہتا ہوں۔ آپ کے ہاں تو غالباً کل ہو گی۔ بارِ شاطر ہوں بارِ خاطر نہیں بننا چاہتا۔ آپ نے اتنے دن خط نہیں لکھا۔ میں نے بھی مخلِ صحبت ہونا پسند نہ کیا۔"

خطوط کثرت سے لکھتے ہیں اور بڑے شگفتہ انداز میں، چند ٹکڑے دیکھئے :

"اب سنیئے لطیفہ۔ آپ نے اپنے آخری خط پر پتہ لکھا۔ عربی میں صندوق البرید اور الاسکندریہ اور بمصر تک آپ کے یہاں ڈاک خانہ والے سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی افسرِ اعلیٰ سے استصواب

کیا گیا۔ اس الو کے پٹھے نے اس پر لکھ دیا Try Basrah یعنی بصرہ بھیج کے دیکھ لو۔ وہ غالباً مصر کو بصرہ سمجھے ہوں گے، چنانچہ خط بغداد پہنچ گیا۔ وہاں تو خیر سے زبان ہی عربی ہے اس لئے وہاں والوں نے اُسے یہاں بھیج دیا۔ یہ وجہ ہوئی تاخیر کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ رجسٹر کریں تو یہ حضرت اسی قماش کے اخلاف میں سے ہوں گے جنہوں نے قبلہ نیاز کیشاں کو "کپتان" پڑھ کر غالب کو کالپی کی فوج میں داخل کر دیا تھا لیکن خیریت اسی میں ہے کہ آئندہ ہمیشہ پتا انگریزی میں لکھا جائے۔"

اس اطلاع پر کہ میں کچھ عرصے کیلئے مڈل ایسٹ آرہا ہوں ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ہائے کاش کہ آپ میری موجودگی میں یہاں آتے تو چند روز مزے سے گزرتی۔ لیکن آپ نے آنے کا فیصلہ جب کیا ہے کہ یہاں چل چلاؤ کے سامان ہو رہے ہیں۔ اسکندریہ کے دس سالہ قیام کے بعد عدن جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے کہا تھا "بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں"۔ قیام کے خرچ سے متعلق کیا لکھوں۔ میرے خیال میں دو ڈھائی سو روپے ماہانہ میں اچھا اچھا خرچ چل سکتا ہے بشرطیکہ آپ قیمتی کتابیں خریدنا نہ شروع کر دیں کیونکہ پھر دو ڈھائی ہزار بھی کفائت نہیں کرنے کے۔ اگر آپ فیصلہ کر لیں کہ کب تک آنا چاہتے ہیں تو ممکن ہے کہ میں بھی آپ کی سکونت میں کچھ مدد کر سکوں۔ یوں کچھ بچت ہو جائے گی۔ لیکن آپ کا یہاں آنے سے مقصد کیا ہے۔ اگر دارالکتب اور دوسرے کتب خانوں کی سیر مطلوب ہے تو یہ واقعی معقول بات ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ یہاں آ کے کچھ علم حاصل کریں تو مجھے اس کا یقین نہیں۔ کہنے کو عربی یہاں کی زبان ہے لیکن کیسی عربی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اُن کی دارجہ عربی سن کر ہنسیں گے۔ نہ تلفظ درست نہ لہجہ، نہ صرف و نحو، الا ماشاءاللہ۔ چھوٹے بڑے عالم و جاہل یہی زبان بولتے ہیں۔ البتہ لکھنے کی درست نحوی زبان ہے...... ہاں کتب خانوں کی بات دوسری ہے۔ ایسی ایسی نادر کتابوں کے قلمی نسخے پڑے ہیں کہ دیکھنے سے دل و دماغ روشن ہو جائیں۔ لیکن پھر افسوس ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر آپ کو سیر کا شوق ہو تو ضرور آیئے اور جلد :

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاؔد یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے جو تم کو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم "

میری یورپ سے واپسی کے وقت وہ دہلی میں مقیم تھے۔ ان کا خط آیا کہ علی گڑھ جاتے وقت مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔ میں نے انہیں راستے ہی سے تار دیا اور دہلی کی آمد کے وقت سے انہیں مطلع کیا ہے۔ میرے جہاز کے پہنچنے سے پہلے وہ دہلی کے ایروڈروم پر موجود تھے۔ جب تک کسٹم وغیرہ کے جھگڑے نہ چکے گئے وہ انتظار میں کھڑے رہے۔ گھر پہنچے ملنے کے کمرے میں بیٹھے۔ وہاں تمام کتابیں اور رسالے اٹے پڑے تھے۔ کچھ یورپ کی داستان سنی کچھ مڈل ایسٹ کا چرچا رہا۔ زیادہ تر وہ میرے علمی کاموں کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر اُن اساتذہ کے متعلق جن سے یورپ میں ملنے ملانے کے مواقع ملے۔ پھر ہندوستان سے بات دہلی تک پہنچی۔ شاعرِ انقلاب کی "ہجرت"، عرش صاحب کی "خلافت" کا ذکر ہوتا رہا۔ کچھ ذاکر صاحب سے ملاقات کا حال اور انجمن ترقی اُردو کی داستان سناتے رہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ صرف غالب پر گفتگو کرنے بیٹھے اور ہم دونوں نے بیک وقت پوچھنا اور سنانا شروع کیا کہ غالب کے متعلق اب تک کیا نئی اطلاعیں ہم لوگوں نے حاصل کی ہیں۔ کیا کیا نئے خطوط اور تحریریں ہم لوگوں نے ڈھونڈھی ہیں اور کیا کیا نئی کتابیں مرتب کرنے اور شائع کرنے کے

پروگرام بنائے ہیں۔ معلوم نہیں کتنی رات تک یہ باتیں ہوتی رہیں اور اگر دوسری صبح انہیں دفتر اور مجھے علی گڑھ نہ پہنچنا ہوتا تو شاید صبح تک اسی طرح باتیں ہوتی رہتیں۔

صبح سویرے ہی بچیوں نے چائے پلائی۔ ان کی بڑی بیٹی ارشد مجھے یاد تھی لیکن اور بچوں کے نام حافظے میں نہ تھے۔ ایک صاحبزادے آئے، سلام کر گئے۔ میں نے نام پوچھا۔ بولے: اقبال۔ دوسری صاحب زادی گزریں، آداب بجا لائیں، انہوں نے نام بشریٰ بتایا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ مالک رام صاحب بھانپ گئے۔ بولے: آپ کو کچھ تعجب ہوا ان ناموں پر؟ پھر خود ہی انہوں نے بتایا کہ ان کے یہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک بزرگ کے ملفوظات میں پڑھا کہ اگر لڑکی کا نام صدق نیت سے بشریٰ رکھ دیا جائے تو پھر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہوگا۔ انہوں نے نومولود لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کے یہاں لڑکا ہی پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے اقبال رکھا۔ مالک رام صاحب یہ نسخہ کئی اصحاب کو بتا چکے ہیں اور سب اس کے بہدف ہونے کے قائل ہو گئے ہیں۔

وہ اس زمانے کا بہت دلچسپ لطیفہ سناتے ہیں۔ بیٹے کی پیدائش پر مالک صاحب کی والدہ آئیں۔ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ پوچھا کیا نام رکھا ہے۔ بولے: اقبال۔ انہوں نے کچھ منہ بنایا اور کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگیں "یہ نام تو کچھ مسلمانوں جیسا لگتا ہے"۔ بولے: اماں جان! آپ نے بھی تو میرا نام کچھ مسلمانوں ہی جیسا رکھا ہے۔

لطیفہ اس وقت مکمل ہوا جب دہلی میں شاہ ابن سعود آئے۔ جس اسکول میں بشریٰ پڑھتی ہے اس میں بھی انہیں آنا تھا۔ شاہ کو ہار پہنانے کے لئے انہی کا انتخاب ہوا۔ ہار پہناتے وقت انہوں نے نہایت فصیح عربی میں انہیں خوش آمدید کہا۔ شاہ بہت حیران ہوئے۔ اور ان کی حیرت اور مسرت اس وقت اور بڑھ گئی جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق ایک ہندو خاندان سے ہے۔

اگر اردو فارسی اور عربی کی طرف ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور مسلمانوں سے دوستی اسی طرح قائم رہیں تو وہ دن دور نہیں جب وہ مولوی سندر لال، مولوی مہیش پرشاد کی طرح وہ مولوی مالک رام ہو جائیں گے۔

احسان دانش

محمد وارث کامل

علم و فن کی دشوار گذار راہیں ان شہسواروں کی جولانگاہیں رہی ہیں جو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر اس شان سے چلے ہیں کہ انکی انفرادیت نے منزل کے کسی موڑ پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ——— یہ ہے روسو کے اس مقالہ کا نچوڑ جس پر ۱۷۵۰ء میں انجمن ڈیزان (Academy of Dijon) نے اسے انعام دیا تھا۔ روسو کی نظر میں انفرادیت ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کے آئینے میں کسی شخص کی عظمت کے خد و خال نظر آسکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات پر جن شخصیتوں کے نقوش کچھ ابھرے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں یہ وہی منفرد شخصیتیں ہیں۔ جو زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں ہر قدم پر روشنی کے مینار نصب کرتی رہی ہیں۔ ہر دور میں ایسی شخصیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن کچھ تو زمانے کی قدر ناشناسی کے باعث اور کچھ اس سبب سے کہ قدرت اپنے گنج گرانمایہ کی نمائش کے سلسلے میں کچھ زیادہ فیاض واقع نہیں ہوئی ہے، ایسی شخصیتیں جہاں کہیں اور جب کبھی منظرِ عام پر آئی ہیں تو اتنے پردوں میں لپٹی ہوئی آئی ہیں کہ عوام کی اچٹتی نگاہیں ان شخصیات کے ان خلوت کدوں میں بار نہیں پا سکیں جہاں کمالات کے دفینے گڑے ہوئے ہیں۔

آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ احسان دانش کی تاریخ ساز شخصیت کا جوہر ہنگامہ خیز جلوتوں کے باوصف راز درونِ پردہ ہے تو میں کبھی کبھی ششدر رہ جاتا ہوں، میری حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے اس چیز سے کہ آسمانِ شہرت کے اس کوکبِ درخشاں کی تابانیوں پر ظلمتوں کے اتنے غلاف چڑھے ہوئے ہیں کہ اس کے حاشیہ نشین بھی کبھی اسے عریاں نہیں دیکھ سکے۔ احسان دانش کی پراسرار شخصیت دراصل نتیجہ ہے عوام کے ذوقِ تجسس میں کمی کا۔

احسان دانش کا مقدر کہ وہ اس دور کا انسان ہے جس دور میں مغز و پوست، عرض و جوہر، صورت و حقیقت، لفظ و معنی اور روح و مادہ ایک ہی پیمانے سے ناپے اور ایک ہی ترازو میں تولے جاتے ہیں، اس دور میں سطح پر تیرتے ہوئے خار و خس کی تو قدر و قیمت ہے لیکن اگر وقعت نہیں تو اس گوہرِ شب چراغ کی نہیں جس کے دامن میں دریا کا اضطراب بھی محو ہو جاتا ہے۔

احسان دانش کے بارے میں اتنا تو سب جانتے ہیں کہ یہ کاندھلہ (مظفر نگر یو پی) کا ایک شاعر مزدور ہے، ایک ایسا شاعر جس نے افلاس کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ۱۹۱۴ء کی اس جنگِ عظیم کے پرآشوب ایام میں سفرِ حیات شروع کیا۔ جس کے شعلے مشرق سے مغرب تک

بھڑک رہے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی کے مردِ بیمار پر سکرات کا عالم طاری تھا، اور ہندوستان کا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جس نے اس ملک کی حفظ و بقا کے لئے دعائیں نہ کی ہوں، دعائیں ایک طرف اس موقعہ پر ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کی مالی امداد میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کا یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے۔ ؎

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ احسان دانش نے شروع شروع میں اپنی گذر بسر کے لئے زندگی کی ان رُندھی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھی قدم رکھا ہے جن کا تصور بھی اپنے اندر کچھ کم ہولناکیاں لئے ہوئے نہیں ہے اس شاعرِ شہیر نے اینٹیں بھی ڈھوئیں، سڑکیں بھی کوٹیں، رہٹ بھی چلائے کھیت بھی جوتے، چپراسی بھی کی اور چوکیداری بھی۔ غرض رنج کا وہ کون سا کام ہے جو احسان دانش نے نہیں کیا۔ بلند معاشرت مخلوق کو اس چیز کا سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ پستی جو ہر اک بلندی کا بار اپنے دوش پر لئے ہوئے ہے ایک دن اتنی بلند ہو جائے گی کہ بلندیاں اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکیں گی، اور پھر وہ لوگ جن کا نشیمن معاشرت کی بلندیوں پر رہا ہے یہ کہنے پر مجبور ہوں گے۔

؎ اُن کی پرواز انہیں تا بہ فلک لے پہنچی
ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

ادبی دنیا احسان دانش سے متعارف ہے لیکن اس تعارف کا مدار صرف یہ ہے کہ احسان دانش کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے، نظم و نثر میں اس کی جو تخلیقات ہیں انہیں قبولِ عام کی سند مل چکی ہے نوائے کارگر، چراغاں، آتشِ خاموش، جادۂ نو، زخم و مرہم، مقامات، گورستان، نفیرِ فطرت شیرازہ نظم میں لغات الاصلاح، دستورِ اُردو، مختصر عروض، روشنیاں اور طبقات، نثر میں احسان کے وہ ادبی کارنامے ہیں جن کی بدولت برِّصغیر ہند و پاک کے طول و عرض میں اس کا طوطی بول رہا ہے، ترقی پسند شعرا انہیں اپنی برادری کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ احسان دانش نے اپنی اکثر و بیشتر نظموں میں سماجی زندگی کے وہ گوشے اُجاگر کئے ہیں جن کے ڈانڈے اکثر ترقی پسند شعرا کے اشتراکی نظریات سے مل گئے ہیں، دوسرے اس لئے بھی کہ احسان کا اندازِ فکر شروع سے انقلابی رہا ہے، اصلاحی، تعمیری اور اخلاقی ادب کے علمبردار ادیب و شاعر بھی احسان کو اپنے زمرہ کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ احسان کے کلام کا غالب عنصر اصلاح تعمیر، اخلاق اور انسانیت کے موضوعات ہیں،

رجعت پسند شعرا جن کا اوڑھنا بچھونا ادب برائے ادب ہے، احسان دانش کے کلام پر اس لئے سر دُھنتے ہیں کہ اس نے اُردو ادب کو ایسی اچھوتی بندشیں، ایسے انوکھے استعارات اور ایسی نرالی تشبیہات دی ہیں کہ نئی پود کے شعرا اور ادبا اس مجتہد شاعر کو جتنا بھی خراجِ تحسین ادا کریں تھوڑا ہے، عوام احسان دانش پر اس لئے جان چھڑکتے ہیں کہ اس کے اشعار میں خود ان کی زندگی بول رہی ہے، ایسے اَن پڑھ لوگ جو احسان دانش کے سیدھے سادے شعر بھی نہیں سمجھ سکتے ان پر احسان کے حنجرۂ علطاں کا جادو چل جاتا ہے،

دیکھنے میں آیا ہے کہ احسان دانش کے پاس ہر مکتبۂ خیال اور ہر مدرسۂ فکر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، مفکروں اور فن کاروں کی نشست و برخاست رہتی ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی آتے جاتے رہتے ہیں، ملاقاتیوں کا تانتا صبح سویرے سے لگتا ہے اور کافی رات گئے تک یہ سیلاب فرو نہیں ہو پاتا۔ پہلے پہل جب مجھے ملاقاتیوں کا یہ بے پناہ ہجوم دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معاً یہ خیال آیا کہ احسان صاحب کی یہ ٹکنی فوج بڑے بڑے معرکے سر کرتی ہوگی اور آڑے وقت میں اس فوج کے سپاہی اپنے سپہ سالار کے ساتھ ہر قسم کا تعاون بھی کرتے ہوں گے۔ لیکن چند ہی روز کے تجربہ نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر دی کہ یہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

مجھ پر یہ راز آشکارا ہوگیا کہ اس ملکی فوج کے بعض سپاہیوں کا نان نفقہ بھی اسی سپہ سالار کے ذمہ ہے۔ احسان دانش کے ملاقاتیوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی مقصد یا کسی نہ کسی غرض سے آتے ہیں اور جب تک ان کی غرض پوری نہیں ہو جاتی احسان صاحب کے سر پر آسیب کی طرح سوار رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ احسان صاحب ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور پہلی ہی ملاقات میں کچھ اس بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں کہ اسے اجنبیت و غیریت کا احساس نہیں ہونے پاتا لیکن یہ واضح رہے کہ ان ملاقاتیوں کے پیہم اصرار کے باوجود بھی یہ کبھی نہیں ہوتا کہ احسان صاحب انہیں اپنے کلام سے بھی محظوظ فرمائیں۔ خود ہی کوئی رو آجائے تو پھر بڑی سے بڑی نظم بھی سنانے میں انہیں مطلق کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اگر کبھی طبیعت جولانیوں پر ہوتی ہے تو اپنے روایتی ترنم کا ساز بھی چھیڑ دیتے ہیں۔ احسان صاحب اپنی مرضی کے مالک اور اپنی دُھن کے پکّے ہیں اگر کسی کی فرمائش پر کبھی ان کی زبان سے 'نہیں' نکل جائے تو کسی کی سفارش سے بھی بات نہیں بنتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کراچی سے ایک اُدھیڑ عمر کے بھاری بھرکم رئیس احسان صاحب سے ملنے آئے۔ احسان صاحب نے جیسا کہ ان کا عام قاعدہ ہے ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب انہوں نے کسی غزل یا نظم کی فرمائش کی تو احسان صاحب کے تیور بدل گئے۔ اور یہ فرمایا۔ کیا یہ باتیں جو ہو رہی ہیں کچھ کم اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ غزل یا نظم بھی سنائی جائے۔ ایک اور صاحب نے اس رئیس کی دلدہی کی خاطر احسان صاحب پر اپنے لئے دیئے تعلقات جتائے اور ان پر بہت کچھ زور ڈالا لیکن کچھ پیش نہ چلی۔ احسان صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

نہیں منہ سے جو نکلی پھر کہاں ہاں
خدا محفوظ رکھّے اس نہیں سے

احسان صاحب کو جن لوگوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے ان کی معلومات کا حاصل یہ ہے کہ احسان صاحب کسی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہیں۔ البتہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے پرائمری کا امتحان ضرور پاس کیا تھا دیسی مکتب میں احسان صاحب نے قرآن پڑھا اور ایک جیّد عالم سیّد حافظ محمد مصطفےٰ سے پڑھا۔ پرائمری میں جب یہ زیر تعلیم تھے تو انہیں منشی عبدالرحیم جلال آبادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مؤخر الذکر استاد بھی اچھا خاصا علمی ذوق رکھتے تھے۔ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کاندھلوی کی توجہ سے احسان صاحب کے دل میں شعر گوئی کا ولولہ بیدار ہوا اور یہ بیداری کچھ اس انداز کی تھی کہ اس کی بدولت ان کی آنکھوں کے آگے سے ذہنی تاریکیوں کے پردے سرکتے چلے گئے اور یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب اس جوہر قابل کی نکھار کے لئے قدرت نے ان کا دامن کہیں اساتذہ فن کی عباؤں سے اور کہیں کہنہ مشق ادباکی قباؤں سے نتھی کر دیا۔ احسان صاحب نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی آنکھیں دیکھیں۔ یہ شاعر بھی تھے اور صاحب دل مجذوب سالک بھی۔ ان کے اشعار میں بلا کا تیکھا پن ہوتا تھا۔ احسان صاحب پر ان کی نظر پڑی تو آنکھوں آنکھوں میں حریف مئے مردافگن عشق، بنا دیا۔

لاہور میں شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی نے ان کے اندر زبان و بیان کی شوخیاں سمو دیں۔ ان کی صحبت کا سب بڑا اثر احسان صاحب کی شاعری پر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کے کلام کو شرف قبول کی سند مل گئی۔ لطف ادا، شوکت الفاظ، جودت فکر، معاملہ بندی اور نغز گفتاری کے جو محاسن احسان صاحب کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر بہت بڑی حد تک تاجور کے حسن نظر کی چھاپ ہے علامہ تاجور احسان صاحب سے کافی محبت کرتے تھے اور ان کے ہر قسم کے ناز نخرے بھی سہتے تھے۔ احسان صاحب علامہ تاجور سے کچھ اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ بعض اوقات خود ان کے منہ پر انہیں کھری کھری سنا دیتے تھے لیکن اپنی اس افتادِ طبع کے باوصف احسان صاحب نے فرق مراتب کا لحاظ ہمیشہ رکھا۔ اگر کبھی کسی نے احسان صاحب کی موجودگی میں علامہ تاجور کے خلاف زبان کھولی تو پھر ان سے رہا نہیں گیا۔

اور یہاں تک اس مخالفت پر بس ہے کہ آخرکار اسے معذرت طلب کرنی پڑی۔ علامہ تاجور کے دو بیٹوں کی ناگہانی وفات پر جس دلسوزی کیساتھ احسان صاحب نے مرثیہ کہا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ احسان صاحب کے احساسات و جذبات رہینِ عقیدت تھے، باوجود اس پختہ یقینی کے کہ علامہ تاجور کا اس دور کے قادر الکلام شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ میں بلاخوفِ مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ تاجور خود بھی اپنے بیٹوں کا مرثیہ لکھتے تو اس میں سوز و گداز کا وہ امرت نہ ہوتا جو احسان صاحب نے اس میں گھول دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک تاثرات و مشاہدات کا تعلق ہے، احسان صاحب اپنے اساتذہ اور دیگر ہمعصر شعراء سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ احسان صاحب کی شاعری میں جوش ملسیانی، محروم، پنڈت برجموہن کیفی کی توجہات کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔

احسان صاحب کی نثر نگاری کا خمیر جن ادبا کی نظر کیمیا اثر نے اٹھایا ہے ان میں۔ حسرت، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ل۔ احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین کے نام آتے ہیں۔ احسان صاحب کی نظر میں ان کا ادب معیاری ادب ہے۔ احسان صاحب کی ملاقاتیں یوں تو برصغیر ہند و پاک کے تمام مشاہیر سے ہوئی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر سے ان کے گہرے روابط بھی رہے ہیں اور ہیں لیکن جن مشاہیر کی ملاقاتوں پر احسان کو فخر ہے وہ ہیں زبدۃ المفسرین علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ موخر الذکر سے احسان صاحب کی پہلی ملاقات میری معیت میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تحریک میرے ان الفاظ نے کی کہ احسان صاحب! دنیا آنی جانی ہے اور یہ زندگی ایک ڈھلتا سایہ ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کریں سننے میں آیا ہے کہ ان کی صحت جواب دے گئی ہے اور وہ آج کل گوالمنڈی میں صاحب فراش ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں ہمیں کسی کا یہ شعر پڑھنا پڑے ؎

صبح دم وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

احسان صاحب لیت و لعل کے خوگر اور چوں و چرا کے عادی نہیں ہیں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے چلئے مولانا ابھی چلتے ہیں۔ غرض ہم دونوں گوالمنڈی پہنچے اور دفتر کوثر (اب یہاں دفتر ایشیا اور دفتر جماعت اسلامی ہیں) کے ایک کمرہ میں داخل ہو گئے۔ جہاں کچھ ستاروں کی جھرمٹ میں چاند کی چاندنی دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ مولانا مودودی نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میں نے احسان صاحب کا تعارف کرایا تو مولانا بولے ان کے نام سے تو میں بہت پہلے سے متعارف ہوں البتہ کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اچھا ہوا یہ خلا آج پر ہو گیا۔

باتوں باتوں میں بنوٹ کا موضوع چھڑ گیا۔ احسان صاحب ٹھہرے اونچے درجے کے بنوٹی اس موضوع پر اتنا سیر حاصل تبصرہ کیا کہ سامعین (جن میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز بھی شامل تھے) اور خود مولانا مودودی انگشت بدنداں رہ گئے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

علامہ سید سلیمان ندوی سے احسان صاحب کی ایک ملاقات بڑے عجیب عنوان سے ہوئی تھی۔ احسان صاحب اور علامہ دونوں ٹرین میں سفر کر رہے تھے اور بیٹھے بھی تھے پاس ہی پاس۔ لیکن نہ معلوم احسان صاحب کن خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں علامہ کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ علامہ نے خود ہی مہرِ سکوت توڑی اور بولے، احسان صاحب، آخر اس نیاز مند سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے کہ اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جا رہا۔ احسان صاحب پر ان بولتے ہوئے نقوشِ سلیمانی کا یہ اثر ہوا کہ فوراً باادب ہو بیٹھے اور پہلے معذرت

طلبی کے انداز میں اور پھر نہایت بے تکلفی کے ساتھ علامہ سے مصروف سخن رہے - علامہ کو تھانہ بھون کے سٹیشن پر اترنا تھا - تھوڑی دیر بعد گاڑی اس سٹیشن پر رکی تو علامہ رخصت ہوئے لیکن اس عالم میں کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی - علامہ نے پائنچے اوپر چڑھا لئے اور کھیتوں کی ڈول ڈول اس بٹیا پر پڑلئے جو بل کھاتی ہوئی تھانہ بھون لے جاتی اور پھر وہاں سے اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں اعتزال پسند علما کی تربیت گاہ کے سرپرست مولانا تھانوی کا بیمار وجود رازی و غزالی کی یاد تازہ کر رہا تھا - اور جن کی شخصیت دنیا کو یہ پیغام دے رہی تھی کہ

ایسے بھی ہیں کچھ اپنے سفینے میں مسافر
دریا کے تلاطم کو جو خاطر میں نہ لائیں

مولانا عبدالماجد دریابادی کے احسان صاحب سے اچھے خاصے مراسم ہیں" پچھلے دنوں جب مولانا لاہور آئے تو ان کی ملاقات احسان صاحب سے نہ ہو سکی مولانا کو اس چیز کا ملال رہا - چنانچہ انہوں نے اپنی سرگزشت لاہور میں خصوصیت کے ساتھ یہ لکھا کہ لاہور کی جن دو شخصیتوں سے نہ مل سکنے کی حسرت رہ گئی ان میں ایک حضرت احسان دانش ہیں اور دوسرے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی - مولانا نیاز فتح پوری کی ناقدانہ یورشوں سے نہ علما و فضلا بچے ہیں اور نہ شعرا و ادبا لیکن یہ احسان صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ مولانا انہیں اس دور کا شاعر شہیر تسلیم کرتے ہیں اور جب بھی ان سے ملے ہیں بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ملے ہیں -

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بڑی جلالت مآب شخصیت کے مالک تھے علوم عربیہ میں انہیں جو کمال حاصل تھا - اس کا اعتراف خود مصر کے فضلا نے کیا - صحیح مسلم کی شرح اور وہ بھی عربی میں مولانا نے اس تبحر علمی کے ساتھ کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے - مولانا تحریر و تقریر دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے، احسان صاحب کی جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مولانا نے کلام کی فرمائش کی - احسان صاحب نے "کوہستان" کے عنوان سے ایک تازہ نظم کہی تھی وہی سنانی شروع کر دی - ایک تو نظم تھی خود ان کے اپنے غمگین تاثرات کا نتیجہ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ احسان صاحب کے گلے کا سوز بھی قیامت ڈھا دینا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی پر رقت طاری ہو گئی اور نظم کے اختتام تک یہی کیفیت رہی -

یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ احسان صاحب کبھی مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بھی ملے ہیں یا نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مولانا بھی احسان صاحب سے اچھی طرح متعارف ہیں اور ان کے کلام سے بھی - مولانا نے ایک دفعہ 'ماں کی محبت' کے موضوع پر مستورات کے ایک جلسہ میں تقریر کی تو ان کی زبان پر احسان صاحب کا یہ شعر بار بار آیا ؎

اس قدر کر دیں گا ماؤں کی محبت کو بلند
دل کے ٹکڑوں کو شہادت کی دعا دینی پڑے

بہاول پور کے ایک عالم دین مولانا احمد یار بہاول پوری کسی بزم سماع میں شریک تھے - قوالوں نے احسان صاحب کی ایک مشہور غزل شروع کر دی - جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

زخم پر زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں،

تو مولانا پر اس بلا کی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ جاں بحق تسلیم ہو گئے -

اوپر کی سطور میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے یہ احسان صاحب کی زندگی کا عریاں پہلو ہے اس پر تھوڑی بہت واقفیت کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتا ہے لیکن ان کی وہ خصوصیات جن پر تہیں جمی ہوئی ہیں کہاں کسی کے علم میں آ سکتی ہیں - میں اس مضمون کے آخری حصہ میں رسم نقاب کشائی کا یہ اہم فریضہ سرانجام دینے کی جسارت کرتا ہوں -

۱۔ احسان دانش جنہیں لوگ حضرت احسان دانش، احسان صاحب، بھیا احسان، بھائی احسان کہتے ہیں اپنی دانست میں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ احسان صاحب کا اصل نام قاضی احسان الحق کاندھلوی ہے ۔ ان کے والد ماجد قاضی دانش علی اپنی بے علمی کے باوجود علمی ذوق رکھتے تھے اور اس ذوق کی تسکین کا ذریعہ خود احسان صاحب تھے ۔ احسان صاحب عہد طفلی میں اُردو کی مشہور کتابیں (فسانۂ آزاد، فسانہ عجائب، آرائش محفل، باغ و بہار، وغیرہ) اپنے والد ماجد کو پڑھ کر اونچی آواز میں سنایا کرتے تھے ، آس پاس کے دوسرے بزرگ بھی ذوق سماعت کا ثبوت دیتے تھے ، غالباً یہی کتاب خوانی کا شغل بعد میں ان کی شاعری کا سبب بنا ایک دفعہ احسان صاحب کے نام کے سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ ہوا ۔ عشرت کرت پوری سے جو احسان صاحب کے بڑے عقیدت مند شاگرد ہیں ، میں نے احسان صاحب کی موجودگی میں کہا ۔ عشرت صاحب اگر نغز گو شاعر بننا چاہتے ہو تو قاضی احسان الحق کاندھلوی کے شاگرد بنو ، یہ آپ کو ہفت خوان رستم طے کرا دیں گے ۔

عشرت صاحب بگڑ کر بولے ۔ قاضی واضی میں نے بہت سے دیکھے ہیں ۔ یہ جتنے قاضی قسم کے شاعر ہیں ، میں انہیں برسوں تک شاعری کی تعلیم دے سکتا ہوں ۔

میں نے نہایت متانت کے ساتھ کہا ۔ برسوں کی بات تو چھوڑیئے آپ میرے اس قاضی کو (احسان صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایک دو سیکنڈ ہی دیجئے اچھا ہے بیچارہ راہ راست پر آجائے جب عشرت صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ۔ کہ احسان دانش ہی قاضی احسان الحق کاندھلوی ہیں تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا ۔

۲۔ احسان صاحب کا شجرۂ نسب شیخ حسن زنجانی رح سے ملتا ہے اور شیخ کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رض تک منتہی ہوتا ہے ۔ اس نسب اور اس نسبت سے احسان صاحب شیخ صدیقی ہوتے ہیں ۔ خاندان قضاۃ جس کی زنجانی شاخیں یو۔ پی کے مغربی اضلاع میں پھیلی ہوئی ہیں ۹۳۳ھ سے ہندوستان کو اپنے علوم و فنون سے فیض یاب کر رہا ہے وہ خاندان ہے جس کے ایک فرد خواجہ شہاب الدین سہروردی بانی سلسلۂ سہروردیہ اور دوسرے وہ امام سعد زنجانی ہیں جن کے حضور مشہور محدث خطیب بغدادی نے بھی زانوئے تلمذ کئے ۔

قاضی عبدالشہید زنجانی رح جو امام سلسلۂ چشتیہ خواجہ نظام الدین بلخی رح کے پیر صحبت ہوتے ہیں اور جنہوں نے اکبر کے دین الٰہی کی شدید مخالفت کی تھی ۔ زنجانی سلسلۂ قضاۃ کے مشاہیر میں سے تھے ۔ قاضی شہاب الدین ثاقب جو علوم دینیات میں حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے شاگرد اور مرید اور میر و سودا کے ہمعصر شاعر باکمال تھے ۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں تذکرۂ طبقات الشعراء میں قدرت اللہ شوق نے ان کا تذکرہ کیا ہے ۔ مولوی محمد یٰسین عرفی جو شوق دہلوی کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں اپنے زمانے کے باکمال بزرگ تھے ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم بھی اس باغ و بہار خاندان کے گل رعنا ہیں (الحاج شجاعت علی صدیقی کنٹرولر پاک ملٹری اکاؤنٹس مرحوم ڈاکٹر بجنوری کے داماد ہیں) میر و سودا کے معاصر قائم چاندپوری بھی قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یو۔ پی کے وزیر حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی اسی خاندان کے اخلاف ہیں ۔ مختصر یہ ہے کہ احسان صاحب یعنی قاضی احسان الحق کاندھلوی جو آج کل شاعری کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں ایک ممتاز اور علم پرور خاندان کے فرد ہیں ۔

۳۔ احسان صاحب کی شخصیت ایک چیستاں بن کر رہ گئی ہے اور وہ اس لئے کہ یہ نہ صرف خلقی بلکہ تخلقی اعتبار سے بھی مجموعۂ اضداد واقع ہوئے ہیں ۔ احسان صاحب شاعر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ناثر بھی ہیں ، ادیب بھی ہیں ۔ لیکن ایسے ادیب کہ ان کے ادب پر نقد و نظر کا خول چڑھا ہوا ہے ۔ کبوتر بازی کا چسکا بھی ہے اور حسن پرستی کی لت بھی ۔ بنوٹ بھی ہیں اور گھڑنتی بھی ، طب ، تصوف ، اسلامیات فلسفہ ، نفسیات ، سائنس ، انسانیت سے متعلق جو ذخیرۂ علم و ادب ہے اس پر بھی ان کی دسترس ہے ۔ ان کی پوری زندگی کردار ہی کردار

ہے۔ نظری اور نظریاتی انداز انہیں کبھی نہیں بھائے۔ ان کا بیشتر وقت دوسروں کے لئے وقف ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی میں انہیں خاطرخواہ معاشی سہولتیں میسّر نہیں آسکیں۔ امرائے ان کی ملاقاتیں غربا پروری کے لئے ہیں نہ کہ خود اپنی ذاتی منفعت کے لئے۔ اس اسباب کی دنیا میں احسان صاحب قطع سبب کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس بے سروسامانی کی حالت میں کہ اگر آج یہ اللہ کو پیارے ہو جائیں تو ان کے گھر سے ایک ماہ کا کرایہ بھی نہ نکلے۔ احسان صاحب کے دامن پر جذبۂ انتقام کی گرد کبھی نہیں بیٹھی۔ کچھ لوگوں نے گذشتہ سالوں میں احسان صاحب کو تحت الثریٰ میں پہنچا دینا چاہا۔ اگر احسان صاحب کی سخت جانی آڑے نہ آتی تو شاید احسان صاحب کبھی کے نہیں بدل گئے ہوتے۔ ۱۹۳۲ء میں احسان صاحب نے سنتِ یوسفی بھی ادا کی ہے۔

احسان صاحب نقش پرست تو بے شک ہیں، فسق پرستی کے داغ سے ان کا دامن کبھی داغدار نہیں ہوا۔ حُسن چاہے پھول کی پتّی میں ہو چاہے گھاس کے تنکے میں، احسان صاحب کو اس سے فطرتی اور جذباتی لگاؤ ہے۔ موسیقی، مصوری، باغبانی، مجسمہ سازی ایسے ذوقی مشاغل سے بھی آپ کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ احسان صاحب حد درجہ آزاد خیال واقع ہوئے ہیں لیکن یہ آزاد خیالی دینی بے راہ روی کا نتیجہ نہیں بلکہ پختہ یقینی کا ثمرہ ہے۔ ان کے ظاہر پر رند مشربی کا گمان ہوتا ہے لیکن ان کا باطن ایمان و عرفان کا گنجینہ ہے۔ قریب کے مطالعہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ احسان صاحب ایک زاہدِ مرتاض بھی ہیں اور ایک عابد شب زندہ دار بھی۔ خواب اور بیداری پر انہیں بلا کی قدرت ہے۔ جب اور جس جگہ ان کا دل چاہے سو رہتے ہیں۔ اور پھر اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے بیدار بھی ہو جاتے ہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے، راستہ چلتے چلتے باتیں کرتے کرتے احسان صاحب نیند کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس سمندر کے اچھے خاصے تیراک ہیں۔ رات کو جب ساری دنیا خراٹے لیتی ہے تو احسان صاحب کے کاروبارِ شوق کا دفتر کھلتا ہے۔ حقیقت میں بات یہی ہے کہ دنیا میں جس نے بھی کچھ پایا ہے شب بیداری سے پایا ہے۔ دن کی ہنگامہ خیز مصروفیتوں میں ذہن کی گرہیں کچھ الجھی ہوئی سی رہتی ہیں اور انسان کوئی دماغی کام نہیں کر سکتا۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

جب پچھلے پہر کا سناٹا آلودۂ شبنم ہوتا ہے،
اس وقت حقائق کھلتے ہیں ہر چیز نظر آجاتی ہے

احسان صاحب کی زندگی کا انداز کچھ اتنا سادہ رہا ہے کہ انہیں آج تک قرض لینے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کسی تجارت میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ اس دور میں جتنے بھی کاروبار ہیں وہ قرض کے بل چلتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ مکتبہ دانش جس سے بظاہر ان کی معاشی زندگی وابستہ ہے۔ اس سے اتنی بافت نہیں ہوتی کہ یہ اپنا گذر بسر کر سکیں۔ بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ مکتبۂ دانش دل کا بہلاوا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے چند احباب کی نشست گاہ کہہ لیجئے۔ مکتبہ دانش کی کتابیں غالباً مال وقف ہیں۔ اس لئے کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر کتابیں اٹھالی جاتی ہیں اور ان کے گرد پوش باقی رہنے دیے جاتے ہیں۔

۴۔ جیسا کہ میں نے کہیں وسط مضمون میں کہا ہے کہ احسان صاحب عابد شب زندہ دار ہیں، اس کی مزید وضاحت اس سے ہو سکتی ہے کہ جب سے ان کا باطنی رابطہ حضرت حافظ تفضل حسین تھپھیروی رح سے قائم ہوا ہے ان کی زندگی اصحاب صفّہ کی سی زندگی بن گئی ہے۔ فرش یا تخت پر سوتے ہیں۔ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ اور وہ بھی بہت سادہ۔ ہر جمعرات کی صبح کو گورستان میانی جاتے ہیں۔ اور گھنٹوں مخصوص انداز میں فاتحہ خواں رہتے ہیں۔ شام کے وقت حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر بلاناغہ حاضری دیتے ہیں۔ احسان صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ میں زندہ مزارات کی عظمت کا قائل ہوں۔ بجنہ مزارات کے ہجوم سے مجھے نفرت ہے۔ عورتوں کے مزار بھی میرے نزدیک وقعت نہیں رکھتے۔

احسان صاحب باہمہ و بے ہمہ قسم کے انسان ہیں۔ لوگ ذہنی وابستگی کی بنا پر انہیں اپنا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسروں کے دوست تو کیا خود اپنے بھی دوست نہیں۔ کسی سے انہیں دشمنی بھی نہیں ہے بلکہ دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں رکھتے۔ میرے مطالعہ اور میری تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے۔ احسان صاحب کی سب سے بڑی کمزوری شاعر گری اور تشنا عر نوازی ہے۔ بہت سے نوجوان احسان صاحب کی اس عنایت کے شکار ہیں۔ دوسری کمزوری جس کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے وہ ہے مغلّظات کا استعمال۔ بات بات میں گالیاں دینا ان کی عادت میں داخل ہو چکا ہے۔ تیسری کمزوری ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ احسان صاحب کے اندر مردم شناسی کا جوہر نہیں بعض اوقات غلط قسم کے لوگ ان سے ستفیذ ہوتے ہیں۔ اور جو ان کی توجہ کے مستحق ہیں انہیں ان کی بارگاہ میں کسی خاص نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ چوتھی کمزوری یہ ہے کہ احسان صاحب اگر کسی کی دعوت کرتے ہیں تو مہمان کی شامت آجاتی ہے اس لئے کہ دسترخوان پر اس قسم کے کھانے چنے جاتے ہیں کہ اگر ایک ہفتہ کا بھوکا بھی ہو تو اس کی بھوک اُڑ جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک دفعہ مجھے افطار کی دعوت دی۔ میں مزاملیں۔ رتا ہوا ان کے مکان پر پہنچا۔ اس زمانے میں یہ کوٹ عبد اللہ شاہ (مزنگ) میں رہتے تھے۔ افطار کا نقارہ بجا تو مٹی کے ایک لوٹے میں غیر معروف پانی اور ایک مٹی کا سکورا لئے ہوئے احسان صاحب برآمد ہوئے اور بولے لیجئے مولانا روزہ افطار کیجئے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے صبر کیا اور دل کو یہ دلاسا دیا کہ شاید ما حضر ہے کے بعد پر تکلف کھانا بچھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک چنگیر میں دو گلڑ کی روٹیاں اور ایک رکابی میں چنے کا ساگ لایا گیا۔ اور پھر ان الفاظ کے ساتھ مولانا بسم اللہ کیجئے کھانے کا حکم صادر کیا۔ گلڑ کی روٹیاں اتنی سخت اور اینٹھی ہوئی کہ چباتے ہی منہ سے دانت باہر آجائیں اور چنے کے ساگ میں اتنی مرچیں کہ الامان الحفیظ! کھانا تو میں نے کھا لیا۔ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ عہد کیا کہ احسان صاحب کی دعوت کبھی قبول نہیں کروں گا۔ چنانچہ آج تک اپنے عہد پر قائم ہوں۔

احسان صاحب میں پانچویں کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی کی پوری بات کان دھر کر نہیں سنتے بلکہ بعض اوقات تو ستم ظریفی کا یہ عالم ہوتا ہے، کہ جب کوئی شخص ان کے سامنے اپنا دکھڑا جھینکتا ہے تو یہ اسے لفظ لفظ پر ٹوکتے اور زبان کی غلطیاں درست کرتے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے، کہ احسان صاحب اصلاح کا یہ کون سا موقع ہے تو بڑی سنجیدگی سے فرماتے ہیں "اور کیا مرنے کے بعد زبان کی اصلاح کا وقت آئے گا۔ احسان صاحب زبان پر قدرت کے باوجود کامذحلہ کی بولی میں بات کرنے کے عادی ہیں اور ان کا یہ انداز گفتگو ان کے نئے ملاقاتیوں پر یہ نقش بٹھا دیتا ہے کہ یہ احسان صاحب جو ہم سے ہمکلام ہیں وہ حضرت احسان دانش نہیں ہیں جن کی زبان ادبا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

ان کمزوریوں کے باوجود احسان صاحب بہت کچھ ہیں۔ اس دور کے بہت سے نغز گو شعرا اپنے کلام میں ان سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور آج بھی ان سے مشورے لیتے ہیں ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

احسان صاحب کے تعلقات تمام شاگردوں سے دوستانہ ہیں۔ بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ احسان صاحب کبھی اُن شعرا کو اپنا شاگرد نہیں بتلاتے اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو نظیری کا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

طائرے نیست کہ از تار منش بر پا نیست
صید یک مرغ نہ کردم ز کہن دامے ما

احسان صاحب اس دور کی شاگردی اُستادی کے قائل نہیں اور وہ اس لئے کہ اس دور کے شاگرد گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں، اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئے اُستاد سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں اور سکولوں کی طرز تعلیم نے شاگردی کا معیار باقی رکھا ہے نہ اُستادی کا۔ جہاں دو برس کے بعد اُستاد بدلتے ہوں وہاں کیسی شاگردی اور کہاں کی اُستادی۔ شاگرد تو وہ ہوتے تھے جو عمر بھر کسی ایک اُستاد کے ہو رہتے اور نظر اُٹھا کر بھی دوسری طرف نہ دیکھتے۔ تاریخ ہمیں ایسے شاگردوں اور ایسے استادوں کے واقعات سناتی ہے جن کے رشتے اتنے مستحکم ہوتے تھے

کہ دوئی کے تمام حجابات مرتفع ہو جاتے تھے۔ حکیم نابینا دہلوی مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد و مرید تھے اُنہیں اپنے استاد کا اتنا احترام تھا کہ دہلی سے دیوبند ہر جمعرات کو اُستاد کی خدمت میں پہنچتے اور علوم و معارف کے خزانے لوٹتے تھے۔ احسان صاحب اِس گئے گزرے دور میں ایسے شاگردوں کے متمنّی ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

عبدالرزّاق کانپوری

ابوالخیر مودودی

انیسویں صدی کے آخری قرن کی یادگاروں میں تھے۔ ایسے ماحول میں پرورش پائی جس میں داستانِ امیر حمزہ، فتوح الشام، قصۂ چار درویش قصۂ حاتم طائی۔ اگلے وقتوں کی زندگی کی ایسی ہی حکایتیں اور روایتیں ذوق و شوق سے پڑھی سنی جاتی تھیں۔ طبیعت میں ایک جوہر تھا۔ اس چیز نے بیان میں داستانی رنگ پیدا کر دیا۔ شعور کی آنکھ ایسے ماحول میں کھلی جس میں زندگی کے نئے تقاضے ہمک رہے تھے، قصوں کا ذوق تاریخ کے مطالعے میں منتقل ہو گیا۔ طبیعت کی اُپج سے "البرامکہ" لکھی، اور تاریخ نگاری کے نئے ادبی دور میں اپنی ایک جگہ پیدا کر لی۔ یہ کتاب ایسی ظالم نکلی کہ بیچاروں کو عبدالرزاق سے "البرامکہ" بنا دیا اور یہ عرف ان پر ایسا سوار ہوا کہ جب تک "نظام الملک طوسی" نہ لکھی نام بخشی نہ ہوئی۔

ان کے آبا و اجداد "فرخ آباد" (صوبہ متحدہ) کے رہنے والے تھے۔ سن اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد ان کے والد منشی الٰہی بخش نے "کان پور" کو وطن بنا لیا۔ نسباً فاروقی تھے۔ بدلتے زمانے کا اثر اتنا قبول کیا کہ سراپا مغربی ہو گئے۔ انگریزی لکھنے بولنے پر قادر اور اپنے زمانے کے نامی گرامی منجم و رمّال تھے۔ اس تقریب سے انبالہ چھاؤنی ان کا مستقل مسکن تھا۔

عبدالرزاق صاحب اٹھارہ سو چھیاسٹھ میں پیدا ہوئے۔ نانا رضوی سید تھے، "فتح پور ہسوہ" (الہ آباد) میں ان کی زمینداری تھی، اس تعلق سے نشو و نما "فتح پور" میں ہوئی۔ وہیں مکتب پڑھا اور عمر کی اٹھارہ منزلیں وہیں طے ہوئیں۔ کہتے تھے، فتح پور میں ایک نامور درویش صوفی میر حسن علی تھے، انہوں نے بسم اللہ پڑھائی، پھر انہی کے مکتب میں فارسی عربی پڑھی، یہ مکتب ان کے فرزند مولوی ظہور الاسلام نے قائم کیا تھا۔ وہ اس علاقے میں بڑے نامور اور با اثر عالم تھے، جب ندوہ کی تحریک نے جنم لیا تو اس کے سربراہوں میں ان کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ تحصیلی اسکول میں فارسی کے ایک ادیب منشی امام علی تھے، سکندر نامے تک ان سے فارسی درسیات پڑھیں۔ عربی متوسطات سے فراغت پائی تھی کہ مولوی ظہور الاسلام صاحب نے اپنے مدرسہ میں فارسی، حساب اور ابتدائی درجے کی عربی پڑھانے کا کام سپرد کر دیا۔ والد نے یہ کہہ کر یہ تعلق منقطع کرا دیا کہ میں تم کو مُلّا بنانا نہیں چاہتا۔ اب غیر مُلّا بننے "کان پور" آئے، یہاں کلکٹری سب اہلمدی گلے پڑی۔ چھ سات برس یہ مصیبت بھگتی، پھر میونسپلٹی میں سررشتہ داری مل گئی اور دس برس گلے کا ہار رہی، ان مکروہات میں منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کی ذات دل چسپی کا واحد سہارا تھی۔ اس دلچسپی نے طبیعت میں شگفتگی پیدا کی۔ ندوۃ العلماء کے ناظم اول مولوی محمد علی صاحب مونگیری سے تھوڑی سی حدیث پڑھی، اور مدرسۂ فیضِ عام

کے مشہور مدرس مولوی احمد حسن معقولی سے درسِ نظامی کی بقیہ کتابیں تمام کیں۔ ۱۹۰۰ء میں آب و دانے کی کشش بھوپال لائی، یہاں تحصیل داری مل گئی فراغت نصیب ہوئی، دس برس سے نظام الملک طوسی کی دھن تھی، فراغت نے اس کی تکمیل کا موقع دیا۔ ۱۹۱۱ء میں یہ کتاب شائع ہوئی، ۱۹۱۴ء میں سرکار عالیہ نے بنظرِ قدر دانی منتظم تاریخِ اسلام مقرر فرما دیا۔ "البرامکہ" سے قلم کے مسافر نے سفر شروع کیا تھا۔ اب تاریخ اسلام کا وسیع میدان ہے، خدا اتمام کی توفیق بخشے۔

اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ بلند بالا، سپاہیانہ ہاڑ، خدوخال میں کتابیں پیوست، گفتگو میں انشائی اسلوب، پرانے وقتوں کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے، وہ کم و بیش ایک صدی کی شنیدہ و دیدہ تاریخ تھے۔ پرانے معاشرے کا شیرازہ ان کے بدنِ شعور میں بکھرا تھا۔ نئے معاشرے کا شیرازہ ان کی آنکھوں کے سامنے بندھ رہا تھا۔ بزرگوں سے جو کچھ سنا یاد رکھا۔ اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ذہن میں نقش کر لیا۔ نئی پرانی، دونوں باتیں ان میں ملی جلی موجود تھیں، جب کوئی پرانی بات چھڑ جاتی، یادوں کا چشمہ پھوٹ نکلتا۔

علی گڑھ تحریک سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کے نورتن اور ان کی تعلیمی و ادبی تحریک کے بڑے چھوٹے سب لوگوں سے ان کی راہ و رسم رہی تھی۔ تاریخی ذوق کی وجہ سے زیادہ تعلق علامہ شبلی سے تھا۔ جب تک علامہ شبلی مدرستہ العلوم میں پروفیسر رہے باہم آمد و رفت رہی، علی گڑھ میں یہ ان کے مہمان، کان پور میں وہ ان کے مہمان۔ بے تکلف دوستی تھی، اس عہدِ بے تکلفی کے قصوں کا پشتارہ جب کبھی کھل جاتا، علامہ شبلی سے ملاقات ہو جاتی سرسید کی خدمت میں بھی ان کو نیاز حاصل تھا، کہتے تھے کہ مجھ کو صحیح مطالعے کی راہ اسی تحریک نے دکھائی جس کا سرچشمہ سید کی ذاتِ گرامی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا۔ اس میں شمس العلماء شبلی نعمانی نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پہ لکچر دیا۔ اسی سے مجھ کو تاریخ اسلام کے مطالعے کا شوق ہوا، چند سال گزرے تھے کہ ہردوئی سے حکیم محمد علی کا ناول "جعفر و عباسہ" نکلا، ناول کیا تھا ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا۔ جی میں آیا کہ اس کی تردید میں ایک مضمون لکھوں۔ مگر تاریخ نے مختصر سے تردیدی مضمون کو آلِ برمک کی پوری داستان بنا دیا۔ سچ پوچھو تو یہ اسی تحریک کا فیض تھا۔ میں نے کہا: اور شبلی صاحب کو بھی سید کے فیضِ نظر نے علامہ شبلی بنایا، ورنہ "اسکات المعتدی" لکھا کرتے!

عبدالرزاق صاحب دم بھر کو غوطے میں گئے، ذہن نے کچھ ڈھونڈا کر بدا اور اس کو گفتگو میں گھول دیا۔ مجھ کو "اسکات المعتدی" سے وہ سارے مجادلانہ رسالے یاد آگئے۔ کیا مشغلے تھے ہمارے علامہ کے! "میرے دوست شمس العلماء شبلی نعمانی[1] نے شروع زمانے میں خود اس بات کا اعتراف کیا تھا۔ کہ تاریخ کا ذخیرہ انہوں نے اول اول سید صاحب کے کتب خانے میں دیکھا، اور وہ کہتے تھے کہ اس بات کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یورپ والوں نے ہمارے ذخیرۂ علوم سے استفادہ اتنا کیا ہو گا، میرے دوست نے اس سلسلے میں اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ میں حیرت زدہ نظروں سے یورپ کی مطبوعہ کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہا تھا، سید صاحب اپنی میز پر کام میں مشغول تھے، انکی آواز گونجی میں نے مڑ کے دیکھا کام جاری تھا اور فرما رہے تھے دیکھو! یہ تمہارے کرنے کے کام تھے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اور یہاں تم لوگوں کا مشغلہ کنوئیں میں چوہا گر جائے تو اس کے ڈول گننا ہے، یا استنجے کے ڈھیلے چٹانا اور فبتیاں مارنا! سید صاحب کی یہ بات سن کر میں زمین میں گڑ گیا" ——— عبدالرزاق صاحب نے کہا: یہ مولوی شبلی صاحب کے جوہر کی بات تھی۔ کوئلے کو تو کوئی بھی جوہری ہیرا نہیں بنا سکتا۔

میں نے بطور تفنن عرض کیا "کلبس کا سا حیرت زدہ احساس آپ نے بھی رسائل شبلی کے بین السطور میں پڑھا ہو گا!" ——— خوش مذاقی ان کے چہرے پر لہرائی ——— "مگر یہ فطری بات تھی" عبدالرزاق صاحب نے کہا، جب آدمی اندھیرے سے دوپہر کی تیز روشنی میں دفعتہً آئے تو چکرا ہی جاتا ہے!۔

البرامکہ کا مصنف اپنے اصلی قد و قامت سے زیادہ بلند بالا ہو گیا۔ دماغ نے اس کے لئے ایک جگہ سنواری ——— قدریں ان جگہوں کی مختلف

---

[1] عبدالرزاق صاحب علامہ شبلی کو اکثر اسی لاحقے کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔

ہوتی ہیں، جن کے لئے دل کا یا دماغ کا دروازہ کھلتا ہے :

پچاس سال ادھر کی بات ہے، علی گڑھ سے مولوی وحید الدین سلیمؔ "معارف" نام ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس میں ایک عجیب قصہ نظر سے گزرا تھا۔ "پامر کی کتاب" الہارون" کے ترجمے پر ریویو کرتے ہوئے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ جب مولوی شبلی صاحب مدرسۃ العلوم میں آئے تو انہوں نے اپنا تصنیفی کام اس کتاب سے شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ قصہ اس وجہ سے عجیب ترین تھا کہ علامہ ممدوح نے "المامون" پر مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے تبصرے پر اپنے جوابی مضمون میں ہارون کی بہت مذمت کی تھی اور اس کے جرائم کی ایک لمبی فہرست تحریر فرمائی تھی۔ میں نے عبد الرزاق صاحب سے اس قصے کی اصلیت پوچھی۔ اسی زمانے میں ان کا بھی ایک سلسلۂ مضمون آثار عجم پر "معارف" کے کئی پرچوں میں نکلا تھا۔

عبد الرزاق صاحب نے کہا: "الہارون" کا ماجرا تو مجھ کو یاد ہے، لیکن میں دیکھ لوں کہ ریویو نگار نے کیا لکھا تھا۔ مبادا اس میں کوئی الگ بات ہو، یا میری معلومات سے زائد بات ہو اور میں بے دیکھے بھالے تصدیق کر دوں" ——— عبارت پڑھی ——— ہاں! ٹھیک ہے۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟ یہ ۱۸۸۴ء کا قصہ ہے۔ میرے مرحوم دوست کو جب اس کتاب کا علم ہوا تو انہوں نے چند خاص طلبہ سے، جن سے کہ وہ مانوس تھے۔ اس کے ابواب کا ترجمہ کرایا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کو اپنے حاشیوں سے مزین کریں۔ خوب چیز ہو جاتی اگر یہ کتاب ان کے حاشیوں کے ساتھ چھپتی۔ مجھ کو بھی یہ ترجمہ دکھایا تھا۔ اور یہ کہہ کر اپنے نور بصیرت سے بہرہ ور کیا تھا کہ دیکھو! ایک تو ہمارے ہاں تاریخیں لکھی جاتی ہیں، اور ایک ان لوگوں کی تاریخ نگاری کا ڈھنگ ہے۔ "پامر نے ڈنکے تو مارے ہیں، مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کہاں کہاں سے موتی اور خزف ریزے نکالے ہیں اور ان کو کس خوبی اور سلیقے سے لڑیوں میں پرویا ہے۔ مگر جب سید صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ان لوگوں کو اپنی تاریخ میں بیساکھی بنا کر چلنا چاہتے ہو۔ بیا گر اپنی لکھنے کا جو نیا ڈھنگ ہے وہ تم نے دیکھ لیا۔ اب اسی ڈھنگ پر تم خود لکھو۔ اور مامون پر لکھو۔ ذہنی رنجشی زیادہ اسی میں ہے اور ہماری قوم کو زیادہ ضرورت اس وقت اس چیز کی ہے، تاکہ فکر کی آزادی پیدا ہو اور وہ نئے علوم سیکھے اور نئی روشنیاں حاصل کرے"۔ ۔

عبد الرزاق صاحب نے کہا: سنا نہیں کہ جائے استاد خالی است۔ سید صاحب نے ضرورت اور مصلحت سمجھا دی اور سمجھنے والے نے اس خوبی سے سمجھی کہ سمجھنے کا حق ادا کر دیا۔ یہی تو میرے دوست مرحوم شمس العلما شبلی نعمانی کا خاص جوہر تھا"

عبد الرزاق صاحب آدمی بڑے قرینے اور رکھ رکھاؤ کے تھے۔ واجبی احترام ملحوظ رکھتے تھے اور بات بے کم و کاست کہتے۔ نیک فہمی اور کھری قدر شناسی ان کی عام روش تھی، مشاہیر ادب میں بہتوں سے ان کے تعلقات تھے اور بہتوں کو انہوں نے دیکھا تھا، وہ ان سب کا ذکر یکساں احترام سے کرتے اور تنقیص و ترجیح سے دامن کش رہتے۔ بڑی جان دار خوبی ان میں یہ تھی کہ مشاہیر ادب سے تعلقات کے ہجوم میں جس کی دوستی پر ان کو عمر بھر فخر رہا وہ ان کی گم نامی کے زمانے کا دوست تھا! رحمت اللہ رعد! زندگی کے میدان میں وہ منزل بمنزل بڑھتے رہے، اور بحیثیت مصنف اس مرتبے کو پہنچے کہ عماد الملک بلگرامی نے قدر افزائی کی ——— جن کی قدر افزائی اس عہد کے بڑے بڑے علمی قدر آوروں کے لئے سرمایۂ افتخار تھی۔ لیکن اس قدر افزائی پر بھی ان کو اتنا فخر نہ تھا جتنا کہ رعد سے دوستی پر۔ گفتگو میں جب ان کا ذکر آ جاتا تو کیف خلوص سے آواز میں گھلاوٹ پیدا ہو جاتی۔

انہوں نے عمر بھر کتابوں سے آنکھیں لڑائیں اور مصنفوں سے آنکھیں ملائیں اور دفتر کے دفتر لکھے، تاریخ اسلام اور تاریخ جلالی اور سفر نامہ خسرو بلخی پر حاشیے اور منشی رحمت اللہ کی "نامی جنتری" کے لئے تاریخی مضامین کے انبار اور "نظام الملک طوسی" جس کو فاضل بلگرامی نے سراہا مگر ان کی بس دو کتابیں ہیں۔ اولین تصنیف "البرامکہ" اور آخری تصنیف یادِ ایام[1] پر بیتی اور آپ بیتی۔ وہ بھی افسانہ یا فسانہ، یہ بھی افسانہ یا فسانہ! ——— ایک داستان میں کتنی داستانیں ہیں جو سرا سر ابھرتی چلی آئی ہیں۔ آپ بیتی کی ایک داستان میں افسانہ یا فسانہ ایک داستان ہے۔ نواب مرزا داغ کی صحبت میں تین گھنٹے میں نے اپنی

---

[1] "یادِ ایام" اس وقت میرے سامنے نہیں ہے چند پرچوں کے اوراق ۱۹۴۳ء میں مرحوم نے بھیجے تھے۔ ان میں سے کچھ ورق کاغذوں میں نکل آئے یہ اقتباس انہی ورقوں سے ماخوذ ہے۔ "یادِ ایام" تقسیم سے تھوڑی مدت پہلے چھپی تھی مرحوم نے لکھا تھا کہ یہ میری آخری یادگار ہے یہ یادگاری نسخہ حیدرآباد میں آیا تھا۔ وہیں رہا۔

زندگی کے ہر دور میں پچاس سال کے اندر ہندوستان کے مشاہیر شعراء کو دیکھا اور ان کی زبان سے ان کا کلام بھی سنا ہے۔ میرے والد منشی الٰہی بخش مضطر (نجم ہند) چونکہ خود شاعر تھے اور انہوں نے آگرہ و لکھنؤ کے باکمال شعرا کو دیکھا تھا۔ اور مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھتے تھے۔ اس لئے مجھے ہدایت تھی کہ ادبی مجالس سے استفادہ کروں۔ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم کے زمانے میں بھی ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی، لیکن شاعری کی طرف توجہ نہیں ہوئی، اور تمام عمر سماعت شعر میں گزری ——

اب سنئے کہ داغ تک کیسے رسائی ہوئی؟

دلّی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز افتادہ رقبہ کوٹھی سے متعلق تھا۔ جس میں امرائے دولت کے خیمے اور بارگاہیں تھیں۔ صدر پھاٹک پر فوجی سپاہیوں کا پہرہ تھا، ایک کمرے میں پولیس افسر جمع تھے۔ ملاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وہ ایک عرب تھا۔ جب میں نے مرزا داغ سے ملاقات کی خواہش کی تو اس نے درقہ (ملاقات کا کارڈ) طلب کیا، چند کارڈ پیش کئے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھیرے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا، اور ان کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ کے اندر جانے کی اجازت ہوئی۔ رستے میں صدہا خیمے نظر آئے، جو ایک سے بڑھ کر ایک شاندار تھے، ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ حروف میں صاحب بارگاہ کا نام لکھا تھا۔ پینتیس منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا۔ ان بارگاہوں کے قریب ہی کوٹھی تھی جس میں حضور نظام خواب راحت میں تھے۔ میرے بوٹ کی چرمر کی آواز آ رہی تھی۔ ایک پہرہ دار دوڑتا ہوا آیا۔ اور شریفانہ انداز میں فہمائش کی۔ آہستہ آہستہ چلئے حضور نظام آرام میں ہیں، بوٹ کی آواز خواب گاہ تک کسی طرح نہیں جا سکتی تھی۔ تاہم حکم کی بسر و چشم تعمیل کی گئی اس وقت مجھے صائب کا یہ شعر یاد آیا اور منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور کو مخاطب کر کے پڑھا ؎

اے صبا برگ ہائے غنچہ نہ آہستہ پا

پاسبانند گلہا صائبا خوابیدہ است

الحمدللہ، منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پہنچ گئے۔ صدر دروازے پر ایک چوبدار نے، جس کی زرد مخملی وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا چک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے، پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا اور کرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں چند منٹ کے بعد طلبی ہوئی۔ دو درجے طے کر کے جب تیسرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بزرگ قوی الجثہ خیمے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہا ہے۔ چلنے میں معذور تھے اور پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ عرق النساء میں مبتلا تھے۔ بھاری بھرکم، رنگ سیاہ اور چہرے پر خفیف سیتلا کے داغ تھے۔ بارگاہ کا یہ حصہ نہایت آراستہ تھا، ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا، ذرا ہٹ کر چاندی کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی، مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا، پھر ہمارے اصرار پر فرش پر بیٹھ گئے۔ کارڈ سے نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے۔ اب نام بنام تعارف ہوا۔ بیٹھتے ہی میری طرف پیچوان بڑھایا: شغل فرمایئے۔ میں نے عرض کیا: پیر و مرشد! خدا نے اس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کا نعم البدل بھی موجود ہے، اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے! اس لطیفے پر خوب ہنسی رہی۔ میری کتاب البرامکہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکی تھی، اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ اس کتاب کے مضامین پر گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے، میں نے جواب عرض کیا، بہت خوش ہوئے اور حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔ پھر فرمایا کہ اپنی تصویر کانپور پہنچ کر بھیج دینا۔ میرے بعد منشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ جناب رعد! آپ تو میرے ہم مشرب ہیں کچھ اپنا کلام سنایئے۔ رعد نے معذرت کی کہ مسدس حالی پڑھنے کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں، تاہم دو تین غزلیں سنائیں، اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا، ڈیڑھ گھنٹے کی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں ہے، لیکن اردو علم و ادب

کی ترقی کے لئے شاعری اور مشاعروں کا بقا ضروری ہے، البتہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو کانفرنس قائم کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے اور جو عیوب ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔

جب یہ دلچسپ بحث ختم ہوئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ لکھی ہے۔ تحقیقات لغات، محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مکرر سوال کرنا ادب کے خلاف سمجھا اور اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحقیقات لغات میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ البتہ فرہنگ کی زبان ٹکسال باہر ہے۔ کیوں کہ عرب سرائے کی آبادی بیرون دہلی ہے۔ میں نے سید محترم کی جملہ کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں۔ اگر چند غلطیاں ہوں تو قابل معافی ہیں۔ کیوں کہ اندر کے چند دانے خراب ہوں تو پورے انار کی لطافت میں فرق نہیں آتا۔

چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا۔ اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی، رعد نے خیال کیا کہ یہ مصحف ہے، چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں۔ اس پر مرزا صاحب کو ہنسی آگئی اور رعد بھی کچھ سمجھ گئے، سرورق کھولا تو "مہتاب داغ" کا جلوہ نظر آیا۔ یہ دکن کی پیداوار تھی۔ رعد اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے۔ ایک غزل پڑھی۔ حاضرین مجلس نے بہت داد دی۔ لیکن جناب داغ کی موجودگی میں رعد کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے مرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی یہ شان ہے کہ جناب خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی، رعد سے دیوان لے کر کئی غزلیں سنائیں۔ پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیس سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے۔ نہ آنکھیں پھڑکتی تھیں، نہ ہاتھوں کو حرکت تھی، یہ محسوس ہو رہا تھا کہ متن کے ساتھ شارح تفسیر کرتا جاتا ہے۔ میری زبان سے برجستہ نکلا کہ آج میں نے داغ سے نہیں بلکہ ذوق کی زبان سے یہ غزلیں سنی ہیں۔ ذوق کا نام آتے ہی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

چائے کی کشتیاں آئیں، زرد پیالیوں کے سوا کل سامان نقرئی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے، خود شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ناشتہ کا وقت گزر چکا تھا۔ تین گھنٹے میں یہ پُرلطف صحبت ختم ہوئی، چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لئے تشریف لائے، اب ہم رخصت ہوئے، مرزا صاحب نے مصافحہ کیا اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس کہ میری یہی پہلی اور یہی آخری ملاقات تھی۔"

"برسبیل تذکرہ" ——— کہانی میں ایک کہانی:

"میرے مرحوم دوست شمس العلماء شبلی نعمانی نے خود برسبیل تذکرہ فرمایا کہ حیدر آباد میں عید کے دن میں داغ سے ملنے گیا، ادبیات اُردو پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ملاقات کے کمرے میں یکایک ایک بیس سالہ نازنین آگئی جو رنگین لباس اور زیور میں جنت الفردوس کی حور معلوم ہوتی تھی وہ اس طرح بے حجابانہ آئی کہ دوپٹہ شانے سے سرک گیا تھا جس کا مقیاس الشباب پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ اس پر اس درجہ بدحواسی چھا گئی کہ نقش دیوار بن کر رہ گئی نہ اس میں بیٹھنے کی جرأت تھی نہ واپس جا سکتی تھی، یکایک آ جانے سے مرزا صاحب بھی شرما گئے اور بولے: کم بختو! ذرا یہ بھی تو دیکھ لیا کرو کہ میرے پاس کوئی مولوی صاحب موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی بنی پھر چمکی اور حور پردے میں غائب ہو گئی قد آدم آئینہ سامنے تھا جس میں اس شوخ کا عکس پڑا اور داغ نے اس انفعالی حالت پر ایک برجستہ شعر تصنیف کر دیا۔ افسوس ہے میں وہ نادر شعر بھول گیا، مگر اس کا مضمون ابو نواس کے اس شعر سے ملتا جلتا تھا۔

وقد سقط الرداء عن منکبہا ——— من التخیش والحل الازار

اس روایت سے ظاہر ہے کہ داغ کے کلام میں شوخی اور عشق و محبت کی رنگینیاں اسی قسم کے لوازم اور خارجی اسباب سے پیدا ہوئی تھیں۔ موصوف نے اپنے خلوت کدے کو ایک پرستان بنا رکھا تھا۔ قلعہ معلیٰ میں بچپن سے جوانی تک اسی ماحول میں پرورش پائی تھی، یہ بات دوسروں کو کہاں میسر ہو سکتی ہے وہ ایک مصور تھے جو ہر ادا کی تصویر برمحل کھینچ لیتے تھے" ایک داستان کتابوں سے اور ایک داستان مصنفوں سے! یہ تھے عبدالرزاق صاحب!۔ اور کچھ شوق زندہ کہانیوں کا: اسی میں محدود تھی میری ان کی ملاقات!۔

اصغر گونڈوی

صغیر احمد صدیقی

سنہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے میں الہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ میرا مضمون اردو ادب تھا۔ میں نے ایک مبسوط مضمون بعنوان "کلام جلیلیت پر ایک تنقیدی نظر" لکھا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ یہ مضمون چھپ جائے۔ رائے ہوئی کہ الہ آباد ہی سے جو ایک مشہور معیاری رسالہ ہندوستانی نکلتا ہے، اسی میں چھپوایا جائے۔ اصغر مرحوم اس وقت اس رسالے کے مدیر تھے۔ میرے ایک دوست جو اصغر مرحوم سے واقف تھے مجھے ان کے پاس لے گئے۔ اس زمانے میں وہ شہر میں رہتے تھے ہم نے مکان پر پہنچ کر آواز دی اور بالاخانہ بیرون کی نشست گاہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر کے بزرگ صورت انسان۔ لانبا قد۔ قدرے کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ پتلے پتلے چہرے پر خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک، لانبا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے روشن روشن، صاف صاف، نکھرے نکھرے، گردن اور شانہ میں ایک خفیف سا خم جو بقول رشید احمد صدیقی معلوم ہوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ سے پیدا ہو گیا ہے۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرہ پر ایک تبسم ذوق پذیرائی لئے ہوئے۔ مختصر یہ کہ شخصیت میں وہ جذب اور کشش جو اجنبیت اور بیگانگی کے احساس کو مٹا دے۔

معمولی رسم تعارف کے بعد میں نے وہ مضمون ان کی طرف بڑھا کر درخواست کی کہ اپنے رسالے میں اس کو جگہ دیں۔ مضمون کو یہاں وہاں سے دیکھ کر بولے کہ یہ زبان اور طرز بیان آپ کے شعبہ اردو کا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے عرض کیا "جی ہاں شعبہ سے ابھی تک مستفید نہیں ہو سکا ہوں۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اپنی کاوش کا نتیجہ ہے" کہنے لگے کہ "ہمارے یہاں تو بورڈ آف ایڈیٹرس ہے۔ وہ فیصلہ کرے گا کہ مضمون شائع کیا جائے یا نہیں۔ معاوضہ دیا جانا اب بند کر دیا گیا ہے۔ البتہ یہ تجویز ہے جو ابھی منظور نہیں ہوئی ہے کہ پھر معاوضہ دیا جائے۔ آپ چند روز بعد تشریف لائیے تو میں بتا سکوں گا کہ فیصلہ کیا ہوا۔"

میں چند دنوں بعد گیا تو انہوں نے کہا کہ مضمون اگر آپ چاہتے ہیں تو چھپ سکتا ہے مگر معاوضے کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے مضمون میری طرف بڑھایا۔ میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک بزرگ نے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے بعض حصوں کو حذف کرنے کے لئے نشانات لگا رکھے تھے۔ مجھے بہت ناگوار ہوا۔ میرے

چہرے کو متغیر دیکھ کر مرحوم بولے "صغیر صاحب قوت نام ضبط کا ہے انتشار کا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ آپ کا مضمون اسی رسالے میں چھپے۔ میں آپ کو مولوی عبدالحق صاحب کے نام خط دیتا ہوں۔ آپ اس کو رسالہ اردو کے لئے بھیج دیجئے۔ یہ رسالہ معاوضہ بھی دیتا ہے۔" غرضیکہ وہ مضمون رسالہ اردو میں چھپ گیا اور اس کا معاوضہ بھی مجھے توقع سے زیادہ ملا۔ مگر اس مضمون سے زیادہ وقیع اور اس معاوضہ سے کہیں گرانقدر وہ پہلا سبق تھا جو اصغر مرحوم سے مجھے ملا اور جسے میں ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں "قوت نام ضبط کا ہے انتشار کا نہیں"۔

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی تفضل حسین تھا جو قانون گو تھے۔ ابتدائی تعلیم کی تفصیل نہیں معلوم ہوئی اس کے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ویسے گورنمنٹ ہائی سکول گونڈہ میں داخل ہوئے تھے مگر آٹھویں جماعت کا امتحان نہ پاس کر سکے۔ ان کے ایک ہم جماعت جناب ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب کا بیان ہے کہ امتحان میں ناکامیابی کے باوجود ان کی ذہانت و فطانت کے سب معترف تھے۔ اصغر مرحوم کو دل و دماغ کی جو صلاحیتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں وہ درس و تدریس، آزمائش و امتحان کے رسوم و قیود کی کب متحمل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ انہوں نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو کبھی بھی ان کی علمیت کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ممکن ہے ان کا مطالعہ بہت وسیع نہ رہا ہو لیکن جتنا تھا عمیق تھا وہ جو کچھ پڑھتے اس پہ کافی غور کرتے اور نفس موضوع پر اپنی انفرادی رائے رکھتے تھے۔

اصغر صاحب کی ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے ناآشنا رہی۔ جوانی میں وہ بے راہ ہو گئے اور منہیات میں بالکل ڈوب گئے۔ جو لوگ جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ میں کہ ان کی زندگی کے آخری تین سالوں میں ان کو کافی قریب سے دیکھ چکا ہوں، آج بھی ان پہ حیرت کرتا ہوں۔ وہ شگفتگی اور سنجیدگی کا بے مثل امتزاج، وہ فکر و عمل کی ہم آہنگی اپنے چاروں طرف طہارت و پاکیزگی کی ایک فضا لئے ہوئے ——— کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اپنے سینے سے واقعی اتنی "متاعِ داغِ عصیاں" لگائے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو گداز ان کے تقدس میں تھا اور جو درگذر اور رواداری ان کے مزاج میں تھی وہ شاید اسی سبب تھی کہ وہ خود لغزش کر کے سنبھل چکے تھے۔

قصہ مختصر ایک دن آیا جب اصغر نے محسوس کیا کہ جسمانی آسودگی روح کی تشنگی کو ناقابل برداشت حد تک تیز کر چکی ہے اور وہ سب کو چھوڑ چھاڑ بلا اطلاع شیخ کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ یہ سراغ میں تھے شیخ محمد عمر صاحبؒ کے جو قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے پیر بھائی تھے اور تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ مراد آباد پہنچ کر جو انہوں نے لوگوں سے پتہ پوچھا تو انہوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شیخ محمد عمرؒ کا صحیح پتہ بتا سکیں گے۔ قاضی صاحب اس وقت پلیٹ فارم کے ایک گوشہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ ان سے پتہ پوچھ کر اپنی گاڑی کے ڈبہ میں آکر بیٹھ گئے۔ کوئی چیز خرید کر پیسے گن رہے تھے جو کچھ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر گر پڑے ٹھیک اسی وقت قاضی صاحب ادھر سے گذرے انہوں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ذرا میرے پیسے اٹھا دیجئے۔ قاضی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی۔ پیسے چن کر ان کے ہاتھ پر رکھے اور خود بھی اسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گاڑی جب رڑکی پہنچی تو قاضی صاحبؒ اتر پڑے اور ساتھ ہی ساتھ اصغر صاحب بھی۔ قاضی صاحب نے کہا بھی کہ آپ کو تو آگے جانا ہے مگر اصغر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے آپ کے ساتھ چلوں گا۔

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغر — کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھکو

قاضی صاحبؒ نے اسی وقت اپنے ایک مرید تہور علی صاحب تحصیلدار گونڈہ کو تار دیا کہ تفضل حسین صاحب کو مطلع کر دیں کہ ان کا لڑکا میرے پاس آگیا ہے۔

اصغر مرحوم نے قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مرید ہو گئے یہی واقعہ وہ نقطہ ہے جہاں سے اصغر کی زندگی مڑتی ہے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لئے۔

اب وہ زماں نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں!
تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں!

ان قوتوں اور صلاحیتوں کا جو اصغر صاحب کو ممنوعات کی انتہائی پستیوں میں کھینچ لے گئی تھی کتنا مکمل اور شاندار ارتفاع ہوا اس کا اندازہ آج بھی "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" کے صفحات سے کیا جا سکتا ہے جن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو تہذیب اور اخلاق کے پاکیزہ ترین معیار سے گرتا ہو۔ صرف "نظر" سے اتنے مکمل علاج کی کوئی اور نظیر کم از کم اردو ادب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اصغر کی زندگی بدل گئی، ان کی شخصیت نے ایک نیا جامہ پہنا اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وہ ہر حیثیت سے اور ہر معاملہ میں ایک صاحب ذوق و حال رہے۔

گونڈہ واپس ہوئے تو پھر ان کا دامن پکڑا گیا۔ وہ ترغیبیں اپنی پوری طاقت سے ان کو پھر اپنی طرف کھینچنے کے لئے تیار تھیں۔ کشاکش شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تائب ہو کر ان کی نئی زندگی کے شریک بن گئے۔

اصغر صاحب کو اپنے پیر سے والہانہ شیفتگی تھی اور اکثر حاضری دیا کرتے۔ قاضی صاحبؒ بھی ان کے ساتھ خصوصیت برتتے۔ ان کو بابو اصغر کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے کہا کہ تہجد کے وقت تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی۔ تم بھی اٹھ کر ذکر کیا کرو۔ چنانچہ دوسرے دن سے انہوں نے بھی اوروں کی طرح ذکر کرنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد آواز گلوگیر ہو گئی اور شدت گریہ سے مجبور ہو کر اٹھ آئے اور سو رہے۔ پھر جب کئی کوششوں کا یہی نتیجہ ہوا تو ذکر کرنا ترک کر دیا۔ ایک دن قاضی صاحبؒ نے پھر کہا کہ بابو اصغر تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی تو جواب ملا "حضرت کیا کروں۔ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں ناکام رہ جاتا ہوں۔" قاضی صاحبؒ نے کہا "اچھا تو تم ذکر نہ کیا کرو۔ میں مجبور ہوں فرض، واجب اور سنت کے ترک کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لیکن ان کے علاوہ جملہ عبادات ترک کر سکنے کی اجازت دیتا ہوں۔" یہی وجہ ہے کہ کسی نے اصغر مرحوم کو کبھی اوراد و وظائف میں مستغرق نہیں پایا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ضرور تھے مگر اس میں کوئی غلو نہیں تھا اور نہ دوسروں سے اس معاملہ میں سخت گیری کرتے تھے۔ خود خشیتِ الٰہی عبادت کرتے ذوقِ عبودیت کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ۔

اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جب فالج سے صاحب فراش تھے یہ آرزو تھی کہ منگلور جا کر قاضی صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیں طبیعت سنبھلی تو روانہ ہو گئے۔ مجھے ساتھ لے لیا۔ میری آزاد خیالی سے واقف تھے۔ راستے میں مسکرا کر بولے "چل تو رہے ہیں آپ مگر وہاں فضا صوم و صلوٰۃ کی ہے۔ آپ کیا کریں گے"؟ میں نے کہا "وہاں پہنچ کر پڑھنے لگوں گا۔" کہنے کو تو میں کہہ گیا مگر کچھ متفکر سا ہو گیا۔ مسکرا کر بولے "کیا بات ہے"؟ میں نے دبی زبان سے پوچھا "فجر کی نماز وہاں کس وقت پڑھی جاتی ہے"؟ بہت ہنسے۔ کہنے لگے فجر کے وقت۔ میں نے عرض کی "ایک فجر کا وقت وہ سمجھا جاتا ہے جسے میں رات کا پچھلا پہر کہتا ہوں۔ جب تارے آسمان پر اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ نیچے کافی اندھیرا ہوتا ہے۔ آنکھیں کھولئے تو مرچیں سی لگتی ہیں۔ پانوں کہیں ڈالئے پڑتا کہیں ہے دوسرا وقت وہ ہے جسے عرف عام میں صبح کہتے ہیں اور جو طلوع آفتاب سے کچھ قبل ہوتا ہے اور کچھ بعد تک بھی رہتا ہے۔" ہنس کر بولے "آپ جماعت میں نہ شامل ہوں۔ طلوع آفتاب سے کچھ قبل ہی پڑھ لیں تو بہت ہے۔" بہرحال منگلور پہنچ کر ہوا یہ کہ اکتوبر کی خنک رات تھی۔ میں گہری نیند سو گیا اٹھا تو دن کافی چڑھ گیا تھا۔ مولانا سرہانے کھڑے ہنس رہے تھے۔ میں اپنا کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور اس پر مولانا کا بھی کمبل پڑا ہوا تھا جو نماز کو جاتے ہوئے انہوں نے میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ رواداری یہاں تک تھی کہ خود میری صفائی میں کہا کرتے تھے کہ بھئی کوئی آسانی سے نماز نہیں پڑھا کرتا۔ نماز تو بہت پٹ چکنے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اپنے پیر کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور اس تعلق کا علی الاعلان ذکر بھی نہ کرتے تھے۔ اپنے کلام میں بھی کہیں واضح طور پر اشارہ نہیں

کیا ہے۔ بے تکلف احباب سے کبھی کبھی ان کے اوصاف کا ذکر کرتے تھے۔ مجھ سے ان کے جس وصف کا اکثر ذکر کرتے تھے وہ یہی تھا جسے کہتے ہیں ع "درویش صفت باش و کلاہ تتری دار" قاضی صاحبؒ رئیسانہ شان سے رہتے تھے مگر اس کے باوجود مزاج فقیرانہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ جو نفاست اصغر کی شخصیت میں تھی وہ بھی قاضی صاحبؒ کا طفیل تھا۔ بہت رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے جس میں مزاجی خصوصیت زیادہ اور کوشش و التزام کا شائبہ کم پایا جاتا تھا۔ سر پر پٹے اور چہرہ پر فرنچ کٹ داڑھی موزوں و مناسب لباس پاکیزہ اور نفیس، کھانا بھی عمدہ کھاتے تھے اور عمدہ کھلاتے تھے اور بقول شوکت صاحب تکلف کرتے تھے مگر تکلف کی طرح نہیں۔ غرضکہ ان کے چاروں طرف سادگی، نفاست اور پاکیزگی کی ایک فضا سی رہتی تھی جو ان کے جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار تھی۔

اصغر مرحوم کے جذبات و خیالات میں توازن کے ساتھ، فکر و عمل میں بھی ربط تھا۔ وہ زندگی کو ایک مخصوص، منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرسودہ قدروں سے ہمیشہ دامن بچاتے تھے۔ یہ چیزیں ان کی شاعری ہی میں نہیں ان کے ہر دعمل میں ہوتی تھیں۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ ایک بلند کردار اور اونچی شخصیت کا ثبوت دیتے تھے۔ ریلوے انجینیرنگ کے دفتر میں ملازم تھے۔ ایک ٹھیکہ دار نے نذرانہ دیا۔ ان کو لینے میں تکلف ہوا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ لے لیجئے یہ رشوت نہیں بلکہ نذرانہ ہے۔ مگر ضرورت مند ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت نے گوارا نہ کیا اور وہ روپیہ واپس کر دیا۔ نظم و نثر پر آپ کی یکساں قدرت دیکھ کر بعض اخبارات و رسائل آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ اس خوف سے انکار کر دیا کرتے کہ اختیارات کلی نہ ہونے کے سبب ضمیر فروشی کرنی پڑے گی۔ انڈین پریس کے جس شعبہ میں ملازم تھے اس میں تخفیف کی جانے لگی تو چونکہ پریس کے مالک آپ کے کام سے خوش تھے آپ کی بجائے ان صاحب کو برطرف کرنا چاہتے تھے جو آپ سے پہلے سے ملازم تھے۔ آپ رضامند نہ ہوئے اور کہا کہ برطرف کیجئے تو پہلے مجھے کہ میں بعد میں اس شعبہ میں آیا ہوں۔ مجبوراً پریس کو دونوں ہی صاحبان کو رکھنا پڑا۔ رسالہ ہندوستانی کی ادارت کے امیدوار تھے۔ معاملہ صرف اس پر ٹھہرا تھا کہ آپ انگریزی بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی۔ کیسے ہاں کر دیتے۔ انکار کر کے چلے آئے۔ بعد میں احباب نے اصرار کر کے سر تیج بہادر سپرو صدر انتخابیہ کمیٹی کے پاس سر شاہ محمد سلیمان مرحوم کا وہ خط بھیجا جس میں انہوں نے اپنی ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے پر اصغر مرحوم کو یوں داد دی تھی کہ "اگر میں بھی ترجمہ کرتا تو اس سے بہتر نہ ہو سکتا" ملازمت مل گئی مگر اس کو حاصل کرنے کے لئے مولانا کوئی ایسا ادعا کیسے کر بیٹھتے جس کی اجازت ان کا ضمیر نہ دیتا ہو۔ معاملات زندگی میں تو انتہائی طفلانہ سادگی کا ثبوت دیتے تھے۔ سرود زندگی کی ایک ہزار جلدیں خود چھپوائی تھیں۔ معاملہ کے تجارتی پہلو سے ناآشنائے محض ہونے کے سبب آٹھ سو جلدیں بیکار پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مشہور فرم کے ایجنٹ کے حوالے کیں اور اس کو دوبارہ چھاپنے کی اجازت بھی دی یہ کہتے ہوئے کہ آپ جو مناسب سمجھیں کریں، میں ان معاملات میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس سادگی کا جو نتیجہ ہوا ہو گا ظاہر ہے۔

اصغر کی شخصیت کے جو خد و خال اوپر نمایاں کئے گئے ہیں وہی بلا کم و کاست ان کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں ان کے مزاج کی نفاست اور پاکیزگی، موضوع اور مواد میں وہی مخصوص اور منفرد طرز نظر، وہی عام قدروں سے بچ نکلنے کی کوشش۔ اصغر کم گو تھے۔ غزل گو شعراء میں شائد ان کی واحد مثال ہے کہ جو سوچتے تھے اور محسوس کرتے تھے وہی اور اتنا ہی کہتے تھے۔ محض قافیہ و ردیف کے مطالبوں سے مجبور ہو کر یا مشق و مزاولت کے زور میں آ کر کبھی کچھ نہ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے ان کا فلسفۂ زندگی بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ کچھ مزید کہتے تو صرف اپنے کو دہراتے رہتے۔

ان کے کلام کے مخصوص موضوع اور مضامین کی بنیادی ہم رنگی پر ایک صاحب نے کہا کہ مولانا آپ کے یہاں تنوع نہیں بلکہ ایک ہی قسم کی چیز ملتی ہے۔ جواب ملا تو اس میں برائی کیا ہے جب تک وہ چیز معیار کے مطابق ملتی ہے۔ میری دوکان ایک ہی نوع کا سامان

بہم پہنچاتی ہے اور جب تک وہ سامان معیاری ہے دوکان کی ساکھ بڑھنی چاہئے۔ ہاں البتہ میں مضامین کا کباڑی نہیں ہوں جس کی دوکان پہ بھانت بھانت کی اچھی بری بکثرت قسم کی اشیاء ملتی ہیں۔

شاعری پیشہ کے طور پر نہ کرتے تھے اور نہ شاعر کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرنا پسند کرتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اور اگر کبھی شرکت کرتے بھی تھے تو معاوضہ لینا اپنی شاعرانہ وقعت و شان کے منافی سمجھتے تھے۔ دوسروں کو شاعری کی ترغیب دینے کے بجائے طرح طرح سے روکتے تھے۔ مشاعروں سے ان کی گریز پائی کا ایک ذاتی تجربہ مجھ کو بھی ہے۔ ۱۹۳۳ء کا مسلم ہوسٹل کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ مولانا کو میں نے طرح بہم پہنچائی اور انہوں نے غزل بھی کہی۔ احباب کو یقین تھا کہ میری وساطت سے اصغر صاحب کی مشاعرہ میں شرکت ضرور حاصل ہو جائے گی۔ مگر جب وقت آیا۔ اور میں نے کہا کہ چلئے تو اصغر صاحب نے صاف انکار کر دیا اور ایسے سنجیدہ انداز سے جس میں شاعرانہ تکلف کا شائبہ بھی نہ تھا۔ میں اس انکار پر بہت متحیر ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ غزل آپ نے کیوں کہی تو بولے کہ بھئی یہ قصور غزل کا ہے میرا نہیں۔ غزل لیتے جاؤ اسے کسی سے پڑھوا دینا۔ میں نے واپس آکر احباب کو جو خبر دی کہ اصغر صاحب نہیں آ رہے ہیں تو لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی اور مجھے طعنے دیئے گئے کہ بس رہ گئی صبح و شام کی حاضری اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔ میں واپس ہوا اور مولانا کی نشست گاہ میں پہنچ کر شیروانی کھونٹی پر ٹانگی اور کچھ اس انداز سے بیٹھا کہ مولانا کو پوچھنا پڑا کہ کیا ارادہ ہے میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ دو تین دن بعد جب اس مشاعرہ کی یاد اور وہ سبکی جو اس سلسلے میں میری ہو رہی ہے لوگوں کو فراموش ہو جائے گی تب میں ہوسٹل میں واپس ہونگا۔ جب تک خدمت میں حاضر رہونگا۔ اصغر مرحوم با دلِ نخواستہ تیار ہو گئے۔ محفل میں آکر ڈائس کے پیچھے ایک بنچ پر بے پروائی سے بیٹھ گئے۔ جب ان کی باری آئی غزل جناب حفیظ جالندھری کو پکڑا دی۔ انہوں نے ڈائس پر کھڑے ہو کر مطلع پڑھا۔

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

اک شورِ تحسین و آفریں محفل سے جو بلند ہوا تو حفیظ صاحب نے اس داد کو جو انہیں مخاطب کر کے دی جا رہی تھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اصغر صاحب کی طرف پھینکنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا لوگوں کا اصرار بڑھا اور صدر مشاعرہ سر تیج بہادر سپرو نے بھی درخواست کی کہ اصغر صاحب ڈائس پر تشریف لائیں۔ کشاں کشاں لائے گئے۔ بہت خاموشی اور وقار سے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم لئے بیٹھے رہے۔ وہ شاعرانہ ادائیں کہ یہ شعر ملاحظہ کیجئے گا" "ذرا غور کیجئے گا یہ شعر شاید کسی قابل ہو" ان میں کہاں۔ مرصع غزل تھی۔ ہر شعر پہ محفل جھوم جاتی تھی۔ یہ کبھی کبھی تسلیم کر لیتے مگر داد طلب انداز سے نہیں۔

اصغر مرحوم وسیع المشرب اور کثیر الاحباب تھے۔ ان کی صحبت میں ہندو بھی شریک ہوتے اور مسلمان بھی۔ آزاد خیال حضرات بھی اور بہت ہی متورع و متقشف قسم کے بزرگ بھی۔ سب کو ان کی ہم نوائی پہ ناز تھا۔ اپنے احباب سے بہت خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ صحبتیں بہت دلچسپ اور مفید ہوتی تھیں۔ موضوعات گفتگو سنجیدہ اور وقیع ہوتے۔ مذہب و فلسفہ، شعر و ادب سبھی پہ خیال آرائی ہوتی۔ اصغر مرحوم خوش مذاقی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ طبیعت بذلہ سنج پائی تھی اور گفتگو کا انداز بہت دل نشیں تھا۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے ان کی صحبتوں کی فضا بہت شگفتہ و پرسکون ہوتی اور کوئی بے کیف نہ ہونے پاتا۔

ان کے احباب نے ان کو کبھی مایوس، پریشان، ملول یا افسردہ نہیں پایا۔ یہ بھی قاضی صاحب رح کا فیض روحانی تھا کہ اصغر صاحب ہر حال میں آسودہ مطمئن اور شگفتہ رہتے تھے۔ یہی نہیں انکی طمانیت، آسودگی اور سکون ان کے ہم نشینوں میں بھی منتقل ہو جاتا آپ کسی الجھن یا پریشانی میں ہوئے اگر اصغر صاحب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئے تو دل و دماغ کی فضا بدل گئی۔ حیرت تو اس پر ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خوش

حائل نہ۔ مجھے کسی نے ان کو تنگ دست نہ پایا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ مسرت و طمانیت داخلی کیفیات ہیں جن کو ایک صاحب دل بڑی حد تک خارجی حالات سے بے نیاز رکھتا ہے۔

آخری زمانے میں پنڈت شری نرائن مصرا جو اس وقت شعبۂ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرار تھے اور اب ساگر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں ان کے بہت قریب آگئے تھے۔ یہ پنڈت جی موصوف کا شاگرد تھا اور اصغر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ پنڈت جی ادب اور فلسفہ کے عالم متبحر ہیں اور شعر و سخن کا بہت سنجیدہ اور بلند مذاق رکھتے ہیں میرا خیال ہے کہ اصغر صاحب کے نظریہ شعر و ادب پہ پنڈت جی کے خیالات کا بھی اثر پڑا ہے۔

اصغر مرحوم جب فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے تو ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی غرض سے پنڈت جی ان کو شہر کے مکان سے منتقل کرا کے اپنے قریب یونیورسٹی کے پڑوس میں لائے۔ بلویڈیر پریس کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھ کرائے پر لی گئی۔ ۲۹ نومبر ۳۶ء کی شب میں جب فالج کا آخری دورہ پڑا پنڈت جی بلائے گئے۔ انھوں نے اصغر صاحب کو بیہوش پایا۔ پکارا تو آنکھ کھولی۔ مسکرائے اور پھر ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔ صبح کو مجھے جب انتقال کی خبر ملی تو میں نے جا کر دیکھا۔ اس آخری تبسم کی جھلک چہرے پہ باقی تھی۔ معاً ان کا یہ شعر یاد آیا۔

کائنات دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

اپنی وصیت کے مطابق مزار شاہ محب اللہ الہ آبادی کے پائنتی مدفون ہوئے۔

منشی محمد الدین فوق

محمد عبداللہ قریشی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دلّی کے آسمانِ ادب کے چند ٹوٹے ہوئے ستارے گردشِ روزگار کے ہاتھوں لاہور پہنچے ان میں مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مرزا ارشد گورگانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے دلّی مرحوم کی یادیں یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں جمائیں اور اس طرح سرزمین پنجاب کے لوگ ان ادبی روایات اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے جو اس سے پیشتر دہلی سے نکل کر اودھ۔ مرشد آباد۔ عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدرآباد (دکن) میں اپنا گھر بنا چکی تھیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ پنجاب میں پہلی نسل کے لوگوں نے تو حالی۔ آزاد۔ فیض اور ارشد وغیرہ کو اردو بولتے ہوئے سُنا اور دوسری پشت میں ہمارے ہاں جو لوگ پیدا ہوئے ان میں سر عبدالقادر۔ علامہ اقبال۔ خان احمد حسین خان۔ مولوی ظفر علی خاں۔ چودھری خوشی محمد ناظر۔ میر غلام بھیک نیرنگ۔ میاں شاہ دین ہمایوں۔ مولوی محبوب عالم۔ مولوی انشاء اللہ خاں۔ مولوی محرم علی چشتی۔ پنڈت شیونرائن شمیم اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ بزرگ اس وقت بھی کمالِ فن کے اعتبار سے خداوندانِ سخن تھے۔ اور آج بھی اس میدان میں ان کا کوئی مدِمقابل نظر نہیں آتا۔ مولانا ظفر الملک علوی مدیر الناظر لکھنو جو مئی یا جون ۱۹۳۵ء میں لاہور آئے پنجاب میں اُردو کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین فوق اور میر غلام بھیک نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی شاعر ایسا نہ تھا جس کا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جس کی انشا صحیح اردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اس وقت اہلِ پنجاب میں شمار نہیں کئے جا سکتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا کر دیئے ہیں جن کی نظم و نثر اہلِ زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زبان دانوں کے معیار پر مزید پوری اترتی ہے اور آثار ظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔“

(نیرنگِ خیال لاہور بابت اگست ۱۹۳۵ء)

منشی محمد الدین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے اور ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں وفات

پا گئے۔ انہوں نے ایک صحافی۔ ایک ادیب۔ ایک مورخ اور ایک شاعر کی حیثیت سے اُردو زبان کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ اپنے پیچھے اپنے اتنے کارنامے چھوڑ گئے ہیں کہ دنیا انہیں مدتوں نہیں بھلا سکتی۔ ان کی تصانیف کے انمٹ نقوش کو اگر نکھارنے اور اجالنے کا موقع ملتا رہا تو وہ ہمارے ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گے اور منشی صاحب کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

منشی صاحب سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ محض دوستی تھی جس میں خودغرضی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات کو بھی ایک اتفاق ہی سمجھنا چاہئے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی نے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کے سرمایہ کی مدد سے اُردو مرکز کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی مقتدر ادبی شخصیتوں اصغر گونڈوی، یاس عظیم آبادی۔ جگر مراد آبادی اور سیماب اکبر آبادی وغیرہ کو لاہور بلایا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں علامہ سیماب کے نامور شاگرد ساغر نظامی نے مجھے یہ مژدہ سنایا کہ دفتر پیمانہ آگرہ سے مستقلاً لاہور منتقل کر دیا گیا ہے۔ چونکہ علامہ سیماب اور ساغر نظامی سے میرے نیازمندانہ تعلقات تھے۔ اس لئے ان کے لاہور آنے کی خبر میرے لئے مسرّت انگیز تھی۔ ایک دن میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ وہ یکی دروازہ کے اندر ایک مکان میں اقامت گزین تھے یہ مکان اس حویلی کے بالکل قریب تھا جہاں سے کسی زمانے میں منشی ہرسکھ رائے پنجاب کا سب سے پہلا ہفتہ وار اُردو اخبار کوہ نور شائع کیا کرتے تھے۔ وہاں سیماب۔ ساغر اور منتظر صدیقی کے علاوہ ایک اور بزرگ تشریف فرما تھے۔ دوہرا جسم۔ میانہ قد۔ کھلتا ہوا رنگ۔ بھرا ہوا صحت مند اور باوقار چہرہ۔ موزوں ترشی ہوئی داڑھی جس کے کالے بال کچھ کچھ سپید ہو رہے تھے۔ سادہ لباس۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ یہ ایسی شخصیت تھی جس نے مجھے غیر ارادی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تعارف کا مرحلہ آیا تو علامہ سیماب نے ان الفاظ میں ان کی جان پہچان کرائی "کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ آپ کے لاہور کے مشہور اخبار نویس اور مورخ منشی محمد الدین فوق ہیں"۔ یہ میری اور منشی صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں نے علامہ سیماب۔ ساغر نظامی اور منتظر صدیقی کے اعزاز میں دعوت کی جس میں چوہدری خوشی محمد ناظر۔ پروفیسر تاثیر۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک۔ حکیم یوسف حسن اور دیگر دوستوں کے علاوہ منشی محمد الدین فوق بھی شریک تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر جی بھر کر باتیں ہوئیں سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اور پہلی ملاقات میں منشی محمد الدین فوق کے متعلق میرے دل میں جو تاثر پیدا ہوا تھا وہ اور گہرا ہو گیا۔ اور یہی تعلق خاطر مجھے آہستہ آہستہ ان کے قریب لے گیا۔

منشی صاحب شیرانوالہ دروازہ کے باہر رہتے تھے۔ جب تک اخبار کشمیری جاری رہا نیچے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد مکان کی پہلی منزل میں اپنی نشست کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر لیا تھا۔ جس کی بڑی بڑی الماریوں میں ہر قسم کی کتابیں بھری رہتی تھیں۔ ان میں ان کی ذاتی مطبوعات بھی تھیں اور دوسری کتابیں بھی۔ منشی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ لاہور کے تمام اخبار نویسوں میں مولوی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار اور مولوی انشاء اللہ مدیر وطن کے بعد آپ ہی کی ذاتی لائبریری قابل ذکر تھی۔ جس میں ہر سال مفید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

میرا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پریشان و ملول جاتا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا اور ان کی پُرلطف باتوں سے غم غلط ہو جاتا۔ خالی الذہن جاتا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند واپس آتا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔ خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا اور جب کہیں اور نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔ جب واپس آنے کی اجازت چاہتا تو اُٹھنے نہ دیتے۔ چائے۔ لسی۔ شربت۔ ستو جو کچھ ہوتا اس سے تواضع کرتے اور اگر کسی وجہ سے میرے جانے میں ناغہ ہو جاتا تو دوسرے دن خود میرے ہاں تشریف لاتے اور نہ آنے کا سبب دریافت کرتے۔ اُن کے اس معمول میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔ فوق صاحب کے پاس اُٹھنے بیٹھنے سے کشمیر کی محبت میری رگ رگ میں سما گئی اور میں دن رات کشمیر کے خواب دیکھنے لگا۔ میں ہر سال کشمیر جاتا۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک اکثر میرے ساتھ ہوتے۔ کبھی وہ نہ جاتے اور میں اکیلا ہوتا تو فوق صاحب مجھے ہوٹل کا کھانا نہ کھانے دیتے۔

گھر میں جو کچھ پکتا وہ باصرار کھلاتے۔ کسی عزیز یا دوست کے ہاں دعوت ہوتی تو گھر کے فرد کی طرح مجھے شریک کرتے۔ گاؤں جاتے تو اپنے ہمراہ لے کر جاتے۔ انڈا۔ مرغی۔ سیب۔ ناشپاتی۔ بگوگوشہ۔ انار۔ بادام۔ اخروٹ وغیرہ جی بھر کھلاتے۔ پھلوں کے لئے تو ان کے چچا منشی غلام محمد خادم کا وسیع باغ موجود تھا۔ انڈے مرغی کا انتظام وہ یوں کرتے کہ لاہور سے اپنی روانگی کے تین ماہ قبل کسی عزیز کو لکھ دیتے کہ میرے نام کی ایک دو مرغیاں خرید کر انڈوں پر بٹھائیں اور بچے نکلوائیں۔ اس طرح جب وہ وہاں پہنچتے تو دس بیس مرغیاں تیار ملتیں اور گوشت کی حاجت نہ رہتی۔ یہ ان کی دور اندیشی اور کفایت شعاری کی ایک ادنیٰ مثال تھی۔

ذوق صاحب اپنے گھر میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے رہن سہن کے طریقوں میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ اس کے باوجود ان کی زندگی باقاعدہ اور باوقار نظر آتی تھی۔ عام طور پر علی الصبح بیدار ہو جاتے تھے صبح کی سیر کو جانا ان کی پختہ عادت تھی جسے انہوں نے مجبوری کے سوا کبھی ترک نہ کیا۔

لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہ برتتے تھے۔ کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر۔ کبھی چھوٹی سی پلنگڑی پر نیم دراز ہو کر اور کبھی تخت پوش یا زمین پر دری بچھا کر تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھتے تھے۔ البتہ ایک عادت قابل ذکر ہے کہ جب وہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتے تو یونہی سرسری طور پر پڑھ کر ایک طرف نہ رکھ دیتے بلکہ اس میں سے قابل استعمال مواد پر نشان کرتے جاتے تھے۔ کس موضوع پر کونسی چیز کہاں استعمال ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انہوں نے الگ الگ لفافے بنا رکھے تھے جن میں الگ الگ مضامین کے تراشے جمع کرتے رہتے تھے پھر جب کوئی کتاب لکھتے تو ان تراشوں اور یادداشتوں کی وجہ سے حوالے تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوتی مہینوں کا کام دنوں میں ختم ہو جاتا۔

گھر والوں سے ان کا سلوک بہت مشفقانہ تھا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی دونوں بیویاں صاحب اولاد تھیں۔ تیسری سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے گھریلو جھگڑوں کے لئے معقول وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذوق صاحب کی زندگی میں یہ جھگڑے نہایت زور شور سے سر اٹھاتے تھے۔ لیکن ان کا ذہنی توازن ایسے حالات میں برقرار رہتا تھا اور وہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرتے تھے۔

ذوق صاحب ہنگامہ خیزیوں سے الگ اپنے گوشۂ عافیت میں رہ کر خاموش کام کرنے کے علاوہ خلوص و محبت۔ استقلال و ہمت۔ ظرافت و شوخی اور جذبۂ ایثار و ذوق خدمت کی دولت سے مالا مال تھے ؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

ان کی بذلہ سنجی۔ حاضر جوابی۔ خوش اخلاقی۔ خوش مذاقی اور خوش مزاجی کی وجہ سے ان کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔

یہ باتیں کچھ میرے ساتھ ہی خاص نہیں تھیں۔ ان کے تمام دوست اور ملنے والے ان کی شگفتہ مزاجی سے متمتع ہوتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے ہنس مکھ تھے ایسی بات بناتے اور اس قسم کے برجستہ فقرے چست کرتے تھے کہ بس مزا آ جاتا تھا۔ خود سنایا کرتے تھے کہ جب وہ گھڑتل کا پرائمری سکول پاس کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قصبہ جالکے کے مڈل سکول میں داخل ہوئے تو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ بورڈروں کی زندگی عام طور پر شرارتوں سے بھری ہوتی ہے۔ دن رات دل لگی، تفریح اور ہنسی مذاق کے سینکڑوں پہلو نکلتے رہتے ہیں۔ لڑکے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ استادوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایک رات بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے لڑکوں کو شرارت جو سوجھی تو انہوں نے ایک تماشا کیا۔ کوئی استاد بنا۔ کوئی شاگرد۔ ایک لڑکے نے سبق سنانا شروع کیا اور غلط پڑھا۔ ماسٹر نے ٹوکا اس نے پھر غلط پڑھا۔ استاد نے بنچ پر کھڑا دیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کو چھیڑا۔ اس نے ماسٹر سے شکایت کی۔ ماسٹر نے ایک کو جرمانہ کیا اور دوسرے کو رجسٹر سے نام خارج کرنے کی دھمکی دی پھر

ایک لڑکے نے بتایا کہ گھروں میں جا کر کس طرح جھوٹے بہانے بنائے جاتے ہیں۔ جیب خرچ کے لئے کس طرح پیسے طلب کئے جاتے ہیں۔ کسی نے سیدھے سادھے درویش صفت ہیڈ ماسٹر بابو گنڈا مل کی نقل اتار کر میز پر ٹانگیں پھیلائیں۔ کسی نے بورڈنگ کا نگران بن کر بورڈنگ کا معائنہ کیا اور لنگر کی روٹیاں دیکھیں۔ غرض کسی نے کوئی حرکت کی اور کسی نے کوئی۔ سب اپنے اپنے جوہر دکھاتے۔ ہنستے اور شور مچاتے رہے اور یہ بھول گئے کہ ان کا کوئی نگران بھی ہے۔ ابھی یہ کھیل تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ کسی نے چغلی کھا کر بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ حافظ اللہ بخش کو اطلاع دی۔ وہ فارسی کے استاد مولوی غلام محی الدین کو ہمراہ لے کر وہاں آگئے۔ اب جس طرح ہوا کے آتے ہی مچھر غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح استادوں کی شکلیں دیکھتے ہی لڑکے تتر بتر ہو گئے۔

فوق صاحب سکول کی چھت پر جا بیٹھے جو لڑکے قابو آگئے ان کو پٹتے ہوئے دیکھتے رہے اور بغیر پٹے ہی کانپتے رہے۔ صبح ان کی بھی حاضری ہوئی۔ مولوی غلام محی الدین چھڑی لے کر اُٹھے۔ فوق صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ گو رات کو مار نہیں پڑی۔ لیکن خدا کی قسم مار پٹنے والوں سے زیادہ نادم ہوں اور ان سے زیادہ درد محسوس کر کے روتا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے پھر پوچھا۔ جب مار نہیں پڑی تو رونا کس طرح آیا؟ کہا۔ آپ ہی نے تو گلستاں میں پڑھایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

مولوی صاحب اس جواب سے ہنس پڑے اور آپ کو سزا سے نجات مل گئی۔ سچ کہا مولانا حالیؔ نے ؎

بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

۱۸۹۷ء کا ذکر ہے فوق صاحب پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازم تھے۔ تنخواہ اس وقت نو روپیہ ماہوار تھی۔ بعد میں تو انہوں نے اس سے کئی گنا زیادہ مشاہرے پر خود ملازم رکھے اور لاہور اور کشمیر میں بہت سی جائداد بھی پیدا کرلی۔ بہر حال جیسا کہ عام پرائیویٹ فرموں کا دستور ہے آٹھویں دسویں دن ہر ملازم کو روپیہ دو روپے بطور خرچ ملا کرتے تھے جو مہینہ کے آخر میں تنخواہوں سے وضع ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ اکونٹنٹ نے تمام ملازمین کے خرچ کی فہرست بنائی۔ اس میں فوق صاحب نے پانچ روپے اپنے نام لکھوائے حالانکہ جانتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دو روپے ملیں گے۔ اکونٹنٹ نے اعتراض کیا۔ فوق صاحب نے کہا۔ آپ لکھ دیجئے۔ منیجر صاحب منظور نہ کریں گے تو نہ سہی۔ مولوی محبوب عالم کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز منیجر تھے۔ ان کے پاس فہرست پیش ہوئی۔ وہ فوق صاحب کے نام پانچ روپے دیکھ کر چونک اُٹھے۔ انہیں بلایا۔ اور کہا۔ آپ اس سے پہلے تین روپے لے چکے ہیں۔ اب یک مشت پانچ کس طرح مل سکتے ہیں۔ کیا کسی اور نے بھی پانچ روپے لکھوائے ہیں؟ اس وقت ایک روپیہ سے زیادہ نہیں ملے گا۔ فوق صاحب نے کہا۔ ایک روپیہ کیا۔ میں تو آٹھ آنے قبول کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن خواہش صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ زندگی میں پانچ روپے اکٹھے دیکھ لوں۔ منشی عبدالعزیز صاحب ہنس پڑے اور ایک کی بجائے دو روپے دے دیئے۔ اس واقعہ سے بھی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ابتدا میں فوق صاحب کی مالی حالت کیا تھی اور کس چھوٹے درجے سے انہوں نے ترقی کی۔

لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی جو ہندو اخبار نویسوں میں بڑے کامیاب اخبار نویس اور جرنلسٹ تھے۔ پیسہ اخبار کے دفتر میں فوق صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۵ء میں اخبار ہندوستان جاری کیا جس سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمالہ اور دیش وغیرہ اخبار بھی نکالے۔ ایک روز فوق صاحب ان سے ملنے گئے۔ وہ ایک گول میز کے گرد چھ سات آدمیوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں دو وکیل بھی تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ فوق صاحب نے مزاج پرسی کے بعد پانی طلب کیا۔ لالہ دینا ناتھ نے کہا۔ پانی تو ہے مگر کتے کا جوٹھا ہے۔ فوق صاحب نے کہا۔ کوئی پروا نہیں۔ تمہارا جوٹھا تو نہیں۔ لالہ دینا ناتھ نے جب آپ

کو اس قسم کا جواب دیا تھا تو سب اہل مجلس حیران تھے کہ پانی کی طلب پھر اس کو یہ مذاق کی کیا سوجھی۔ لیکن جب فوقؔ صاحب نے نہلے پر دہلا مارا تو سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور سمجھ گئے کہ ان دونوں میں بے تکلفی کی وجہ سے باہم مذاق ہے۔ لالہ دینا ناتھ بھی جو بڑے حاضر جواب تھے اس جواب پر نادم ہوئے اور انہوں نے فوقؔ صاحب کے برجستہ اور لطیف فقرے کی داد دی۔

فوقؔ صاحب سیر و سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ سفر میں گزرا۔ کشمیر تو ان کا وطن ہی تھا۔ وہاں وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے جاتے۔ کئی کئی مہینے وہاں رہتے۔ گوشے گوشے میں گھومتے۔ قابل دید مقامات کی سیر کرتے۔ لوگوں کے حالات دریافت کرتے اور اپنے تجربات و مشاہدات سے اخبار بین حضرات کو فائدہ پہنچاتے۔

کشمیر کے علاوہ انہوں نے وسط ہند۔ راجپوتانہ اور کانگڑہ کی ریاستوں مثلاً سمتھرا۔ ناگود۔ میہر۔ ریوال سکیت۔ منڈی وغیرہ شملہ لکھنؤ دہلی۔ بھوپال۔ بنگال اور صوبہ سرحد کے بھی متعدد سفر کئے۔ جن سے ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہو گیا اور اخبار کو بھی فائدہ پہنچا۔

فوقؔ صاحب بڑے محنتی تھے۔ شعر و شاعری کا شوق تو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف خیال بہت کم رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا۔ سیالکوٹ میں جا کر پٹوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے کسی اور ملازمت کی توقع پر جموں کا رخ کیا اور کئی ماہ کی لگاتار کوششوں سے محکمہ پرمٹ دچونگی میں سردار ہری سنگھ رئیس ٹھیکیدار کے پاس ملازمت حاصل کی۔ جہاں قاضی فقیر علی عاقلؔ کی ہم نشینی میسر آ جانے سے جموں میں چند دن خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔ جب چونگی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا تو بیکاری کے چند ماہ گھوڑ تل میں گزار کر ۳۱ جنوری ۱۸۹۷ء کو اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور چلے آئے۔ یہاں پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت مل گئی جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مزید مشق کے لئے اخبار بھارت سیوک جالندھر کی نامہ نگاری بھی کرتے رہے اور اخبار عام اور خالصہ بہادر میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ ہر ہفتہ مندرجہ ذیل چار اخبار خود مرتب کرتے رہے:-

(۱) کوہ نور جو پنجاب کا سب سے پہلا اردو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کے آخری ایڈیٹر فوقؔ صاحب تھے۔

(۲) گلزار ہند جو اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔

(۳) آفتاب پنجاب جو ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں بند ہوا۔

(۴) بہاول گزٹ جو منشی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے شالامار باغ کی سیر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس سے حوصلہ اتنا بڑھا کہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ چونکہ ان دنوں ناولوں کی گرم بازاری تھی۔ آپ نے بھی انار کلی۔ غم نصیب۔ عصمت آرا اور اکبر وغیرہ چند ناول لکھے جن سے شہرت پر لگا کر اڑنے لگی۔ اور مالی حالت بھی اچھی ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۰۱ء میں آپ نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے نومبر میں اپنا اخبار اور پریس جاری کیا۔ اس اخبار کا نام پنجۂ فولاد تھا۔ پہلا پرچہ صرف پچیس تیس کی تعداد میں چھاپا گیا جس کا افتتاحیہ یہ تھا:-

"خدا کے گھر پر سرکار کا قبضہ"۔

مضمون اس شاہجہانی مسجد کے متعلق تھا جو دائی انگا کی مسجد کے نام سے مشہور رہے۔ اور لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے اس وقت محکمہ ریل کے قبضے میں تھی۔ ریل والوں نے اس میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ اخبار کے آزادانہ لب و لہجہ پر تمام اخبار نویس دنگ رہ گئے۔ آخر رفتہ رفتہ دیگر اخبارات بھی اس معاملے میں ہمنوا ہوئے۔ اور لارڈ کرزن نے پبلک آواز سے متاثر ہو کر اس مسجد کو واگذار کر دیا۔ آج کل یہ مسجد آباد ہے اور اس پر محکمہ آثار قدیمہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

پیغامِ فولاد کا مطبع۔ کاغذ اور لکھوائی چھپائی وغیرہ سب ادھار تھے۔ گویا بغیر کسی سرمایہ کے کام شروع کیا گیا تھا۔ تقریباً نصف پرچے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو وی پی کیے گئے تھے۔ باقی لاہور میں تقسیم ہوئے تھے جن کی اس قدر دھوم مچی تھی کہ پرچہ دوبارہ چھاپنا پڑا تھا۔ پہلے پرچہ کی قیمتیں وصول ہو جانے پر دوسرا پرچہ پچاس کی تعداد میں چھاپا گیا۔ اسی طرح دسمبر میں اس کی تعداد بڑھا کر سو کر دی گئی ڈیڑھ ماہ تک یہ اخبار پندرہ روزہ رہا۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں ہفتہ وار ہو گیا۔ جولائی ۱۹۰۲ء میں اس کی اشاعت پانچ سو تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۴ء میں سات سو ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس کی اشاعت اتنی بڑھی کہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں بارہ سو سے بڑھ گئی۔ اتنی اشاعت اس زمانے میں بڑی کافی سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اخبار بینی کا مذاق آج کل کی طرح اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اخبار کی پالیسی صلح کل تھی۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکثر والیانِ ریاست اور پولیٹیکل ایجنٹ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ خریداروں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی موجود تھے۔ حضرت داغ دہلوی، احسان شاہجہانپوری اور علامہ اقبال نے اس کی تعریف میں نظمیں لکھیں لیکن افسوس کہ وسط ستمبر میں یہ اخبار ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے بند ہو گیا۔ فوق صاحب کا اپنا بیان ہے:۔

"ایک شخص جو بڑا چالاک اور زمانے کا باراں دیدہ تھا۔ چند دنوں کی آمد و رفت کے بعد میرا ہمدرد بن گیا۔ وہ سیر و سیاحت اور سفر و حضر میں میرے ساتھ ہوتا تھا اور ایک معمولی سا برائے نام پندرہ روزہ اخبار نکال کر بہت فائدے میں رہتا تھا۔ میں نے اس کی ریش سفید پر اعتبار کیا اور یہ نہ سمجھا کہ یہ شخص تصنّع و فریب سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس کے چہرے کو "صبح صادق" سمجھتا رہا حالانکہ وہ شخص "مکر چاندنی" کا مظہر تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اخبار پر ٹکٹیں لگانے کا کام اس کے سپرد کیا اور نیز اخبار شماری بھی اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دی۔ حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ ٹکٹیں وہ لگاتا اور اخبار کو گننے والا کوئی اور ہوتا جو دیکھتا کہ اس نے جتنی ٹکٹیں لی تھیں اتنی لگائی بھی ہیں یا نہیں۔ اس طریق سے وہ سفید ریش بزرگ سال ہا سال تک کئی روپے ماہوار کے ٹکٹ ہضم کرتا رہا۔ اس کا اثر اخبار پر اس قدر پڑا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ آخر میں نے مجبور ہو کر مطبع پنجۂ فولاد اور اخبار پنجۂ فولاد دونوں بند کر دیے۔" اسی زمانے کا ایک شعر ہے۔ ؎

اخبار بند ہو [illegible] سے چھپتے ہیں ناول اب　　　اے فوق اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں لالہ منشی رام [illegible] نے ایک اخبار بنام "اردو اخبار" جاری کیا۔ جس کی ادارت فوق صاحب کے سپرد تھی۔ چنانچہ پنجۂ فولاد کے ساتھ اس اخبار کو بھی چار ماہ تک نہایت قابلیت سے چلاتے رہے۔ بعد میں اپنے کاروبار کی مشغولیت سے مجبور ہو کر اس سے الگ ہو گئے۔

۱۸۹۹ء میں میاں جان محمد گنائی نے "کشمیری گزٹ" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ جسے تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی کی حیثیت سے مرتب کرتے رہے۔ آخر چوہدری میاں جان محمد گنائی کی وفات کے ساتھ اس رسالے کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ البتہ اسی کی داغ بیل پر ایک اور رسالہ کشمیری مخزن نکل آیا جس کے ایڈیٹر خواجہ کمال الدین بی اے مسلم مشنری انگلستان اور اسسٹنٹ ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ اس کے بند ہوتے ہی ۱۹۰۶ء میں آپ نے ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو نو برس تک جاری رہا۔ یہ پہلا رسالہ ہے جس نے ہاف ٹون بلاک کی تصاویر چھاپنے کے علاوہ خاص نمبر نکالنے کی بدعت شروع کی۔ چنانچہ اس کا [illegible] نمبر جو اردو کے مشہور اخبارات کے ایڈیٹروں کے حالاتِ زندگی سے متعلق شائع ہوا تھا اب تک ایک یادگار تاریخی پرچہ تصور کیا جاتا ہے۔

۱۹۱۳ء میں کشمیری میگزین نے ماہوار سے ہفتہ وار اخبار کشمیری کی شکل اختیار کی۔ اور اپنی مفید اور کارآمد تحریروں سے اس خطہ میں علم و حکمت کی روح پھونکی۔ اس اخبار نے کشمیر میں بیگار کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور متواتر لکھتا رہا۔ یہاں تک کہ [illegible] اس کی منسوخی

کے احکام جاری فرمائے۔ ریاست جموں و کشمیر میں محکمہ امداد باہمی کا قیام۔ زمیندارہ سوسائٹیوں کا اجراء اور قانون انتقالِ اراضی کا نفاذ بھی اسی اخبار کی تحریروں کا ثمرہ ہے۔ ۱۹۱۵ء میں جب سری نگر کی پتھر مسجد کے اندر تھانہ پولیس کے لئے پختہ عمارت بننے لگی تو اسی اخبار نے پبلک آواز پیدا کرکے اسے رکوایا۔ اب چند برس سے یہ مسجد مسلمانوں کو واپس مل چکی ہے۔ اسی اخبار کی کوششوں سے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے میڈیکل وظائف ملنے شروع ہوئے۔ کشمیر میں زبان اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے بھی اس اخبار نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ جب یہ جاری ہوا تو جتنے خطوط اس کے دفتر میں آتے تھے ان میں فیصدی پچاس خط عربی اور فارسی میں ہوتے تھے۔ اب ہر شخص اردو بولتا، سمجھتا اور لکھتا ہے۔ لاہور کی انجمن کشمیری مسلمانان، مسلم کشمیری کانفرنس اور بیرونجات کی کشمیری انجمنوں کا قیام بھی فوق صاحب ہی کی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ اور جس آنے والے دور کی مدھم اور دھندلی سی تصویر وہ آج سے پچاس ساٹھ سال بیشتر لوگوں کو اپنی نظم و نثر میں دکھایا کرتے تھے وہ اب بڑا صاف اور روشن نظر آ رہا ہے۔

اخبار کشمیری کے ساتھ ساتھ فوق صاحب نے یکے بعد دیگرے طریقت اور نظام دو ماہانہ رسالے جاری کئے جو تین چار سال تصوف کی خدمت کرکے بند ہو گئے۔

فوق صاحب عملی سیاست میں عموماً حصہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن قومی معاملات کے سلسلے میں ان کا احساس بہت گہرا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ بالخصوص کشمیری مسلمانوں کی پستی اور ڈوگرہ شاہی غلامی ان کے لئے سوہانِ روح کا باعث تھی۔ وہ نسلاً کشمیری تھے۔ اس لئے بھی انہیں کشمیر سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے ساری عمر کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت کی۔ کشمیری تعلیم سے کورے، اخلاق میں پست اور تہذیب و تمدن میں دنیا کے لوگوں سے بہت پیچھے تھے۔ فوق صاحب نے انہیں تعلیم کا شوق دلایا۔ ان کو دنیا کی ترقیوں سے آگاہ کیا۔ ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا۔ اور ان کو ترقی یافتہ قوموں کے برابر لا کھڑا کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔

فوق صاحب اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ انہوں نے تخریبی کاموں میں الجھنے کو کبھی پسند نہ کیا۔ اختلاف عقائد کی بنا پر کسی فرقے کو برا بھلا نہ کہا۔ تمام عمر تعمیری اسکیموں کو چلانے میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو ایک ایسا ثالث بالخیر ثابت کیا جو حاکم و محکوم کو بہتر سے بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ کشمیر میں واقفیت عامہ ترقی کرے۔ اہل خطہ روشن خیال ہو جائیں اور واقعات عالم پر ان کی نظریں وسیع ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ توقعات ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئیں۔ اور کشمیر میں ایک وسیع ذہنی، سیاسی اور مجلسی انقلاب پیدا ہو گیا۔

فوق صاحب نے کشمیر کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، خواتین کشمیر، راہنمائے کشمیر، حکایات کشمیر، شباب کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر، اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے سے انہوں نے کشمیر کے بھولے ہوئے افسانے نوجوانوں کو سنائے۔ کشمیریوں کے شاندار کارناموں سے قوم کو روشناس کیا اور کشمیر کا نام ساری دنیا میں روشن کر دیا۔

اس ادبی اور لٹریری کام کے علاوہ فوق صاحب نے کشمیری مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کی پریشانیاں دور کرنے کے سلسلے میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ غالباً ان کی انہی بے لوث خدمات کا تاثر تھا کہ علامہ اقبال انہیں مجدد کشمیر کہا کرتے تھے۔

فوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندیٔ وضع کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اگر وہ کشمیر کے چکر سے نکل کر اپنے حدود دائرہ عمل کو وسعت دیتے تو ہندوستان کے بہترین اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں وطنی تاریخ کی تدوین کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا نعم البدل دستیاب ہونا مشکل تھا۔ پھر بھی جب ہم ان کی تصانیف، لاہور عہد مغلیہ میں، تذکرہ علمائے لاہور، یادِ رفتگاں (تذکرہ صوفیائے لاہور)، حیات داتا گنج بخشؒ، تاریخ سیالکوٹ، تذکرۃ الصالحین، مہاراجہ رنجیت سنگھ، شالامار باغ، مآثر لاہور اور فاتح ملتان وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخ کے متعلق بھی ان کی معلومات بڑی

وسیع تھیں۔ تاریخ حریّت اسلام وحیدانی نشتر اور تاریخ کا روشن پہلو بھی اُن کی بڑی مقبول کتابیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فوق صاحب انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس کا اعتراف کرتے ہوئے خود ہی کہتے ہیں۔ ؎

انگلش زبان ہی سے جو نا آشنا تھے تم ‏ ‏ اے فوق! بھیّا ایڈیٹر اخبار کیوں ہوئے

اور عربی۔ فارسی بھی بقدر ضرورت ہی جانتے تھے لیکن تجربہ اور مشق سے انہیں اخبار نویسی کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ معمولی معمولی واقعات میں انتہائی دلچسپی پیدا کر دینا ان کا ایک ادبی ساکرشمہ تھا۔ تاریخ کے خشک واقعات بھی آپ اس خوبی اور ایسے انداز سے لکھتے تھے کہ پڑھنے والا پہروں مزے لیتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں تاریخ اور صحافت کا مجمع البحرین کہا جاتا تھا۔ حضرت احسان شاہجہانپوری فرماتے ہیں ؎

فوق کی مضمون نگاری میں کشش ہے حُسن کی ‏ ‏ خود فدا ہونے کو آتی ہے خبر اخبار پہ

یہی وجہ ہے کہ آپ کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کا سکول بنا رہا ہے۔ یوں تو آپ کے پرتوِ فیض سے سینکڑوں ذرّے آسمانِ ادب و صحافت پہ آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ لیکن مندرجہ ذیل چند نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :۔

(۱) چوہدری رحمت علی بی اے۔ جو بعد میں انگلستان چلے گئے اور جنہوں نے "پاکستان" کا لفظ وضع کر کے یورپ میں اس کا پراپگنڈا کیا۔ (۲) نازش بدایونی (۳) ملک مقبول احمد (جو بعد میں رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز صوبہ کشمیر ہو گئے) (۴) سیّد حبیب مالک اخبار سیاست لاہور (۵) ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جنہوں نے بعد میں اخبار پولیس ریویو جاری کیا اور آج کل انگلستان میں ہیں۔ (۶) میر نیاز کاشمیری (۷) مسٹر محمد حنیف۔ مُلّا (جونیئر نگ خیال۔ شاہکار لاہور اور اخبار ریاست دہلی کے بھی ایڈیٹر رہے) (۸) ماسٹر محمد بخش مسلم بی اے (۹) رشید صحرائی (۱۰) بابو محمد الدین بی اے وغیرہ۔

فوق صاحب محض تخلّص ہی کے کہنگار نہ تھے۔ بلکہ فطری شاعر تھے اور غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ رباعی وغیرہ تمام اصنافِ سخن پر حاوی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "کلام فوق" اور "نغمہ گلزار" چھپ چکے ہیں۔ کلام فوق کے محاسن پر اکبر الٰہ آبادی کی اس رائے کے ہوتے ہوئے ایک لفظ کا اضافہ کرنا بھی مشکل ہے :۔

"کلام فوق بلاشبہ قابل داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہوں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں۔ شوخی کا اظہار بھی۔ قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلّف کے کلام کا اکثر حصّہ ہے۔ اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاقی و ہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں۔ بعض اشعار پر تو جی چاہتا ہے کہ داد دوں اور لوٹوں۔ بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کے شانِ نزول نے تو آپ کی جدّت آفرینی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔"

محسن الملک

ڈاکٹر سید محمود

نواب محسن الملک کی شخصیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے پہلے اس ماحول کا مختصر جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اور جو ان کے تمام کارہائے نمایاں کا پس منظر ہے۔ اس سلسلے میں ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی نادر ہے جن سے وہ متاثر ہوئے یا جن کو انہوں نے متاثر کیا۔ اس لئے کہ غیر معمولی شخصیتوں کو بنانے میں ان کے ذاتی صفات اور خصوصیات کے علاوہ اس [illegible] فضا کا بھی زبردست ہاتھ ہوتا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں اور جس میں رہ کر وہ اصول زندگی اور لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک جن کا اصلی نام سید مہدی علی تھا، ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ کو اٹاوہ کے ایک مشہور سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولوی محمود علی ایک زبردست عالم اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ایک مرتبہ ریاست ٹونک میں منصب وزارت پر بھی سرفراز رہ چکے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق [illegible] کے علاوہ [illegible] مکتب میں ہوئی جہاں انہوں نے عربی، فارسی اور فقہ و تفسیر میں اچھی دستگاہ حاصل کر لی۔ انگریزی تعلیم انہوں نے باقاعدہ نہیں حاصل کی تھی لیکن غیر معمولی ذہانت اور مشق و مزاولت سے اچھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ انگریزی اخبار وغیرہ بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تھے۔

انہوں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں [illegible] سے ملازمت شروع کی اور [illegible] سررشتہ داری اور تحصیلداری کے منازل طے کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے درجے تک پہنچ گئے جو اس وقت ہندوستانیوں کے لئے معراج ملازمت تھی۔ یہ ترقی اس قدر عرصے میں غیر معمولی سہی لیکن ان کے جیسے صاحب دماغ اور ماہر انتظام و نسق کے لئے باعث فخر نہ تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک وقت میں ایلن ہیوم ان کے بالادست افسر تھے جو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ہوئے اور جنہوں نے ان کی قابلیت کے متعلق لکھا تھا [illegible] وہ ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور کارگزاری اور سلیقہ رکھتا ہے کہ [illegible] صوبے کے انتظام کی صلاحیت رکھتے ہیں، ابھی تک وہ ڈپٹی کلکٹری کے درجے سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

لیکن انہیں ابھی اپنے اعلیٰ جوہر کو دکھانے کا موقع یہاں ملا تھا۔ اس لئے ۱۸۷۴ء میں انگریزوں کی ملازمت سے مستعفی ہو کر انہوں نے نظام حیدرآباد کے یہاں ملازمت کر لی۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر انتظامی [illegible] میں ایسا [illegible] دکھلایا [illegible] کہ انگریز ریزیڈنٹ تک بھی ان کے معترف اور

مدّاح ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ محکمۂ سیاسیات اور خزانہ کے اہم صیغوں کے معتمد ہو گئے۔ اس طرح عملاً حکومت کی پوری طاقت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔

۲۴ مارچ ۱۸۸۴ء میں ان کو منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب دربار نوروزی کی تقریب پر ملا جس نے ان کی شہرت کو حیدر آباد کے حدود سے آگے بڑھنے میں مدد دی۔ وہ خود بھی محکمۂ سیاسیات کے معتمد ہونے کی وجہ سے اپنی نظر ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسائل پر دوڑانے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر روسی حملے کے آثار نمایاں دیکھ کر ایک سیاسی مکتوب شائع کیا جس کا عنوان تھا "مسلمان اور روسی حملہ" جس میں انہوں نے مسلمانوں کی سلطنتِ برطانیہ سے وفاداری کے مسئلے پر بحث کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے برطانیہ کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے ترکی اور ایران سے اچھے تعلقات نہیں رکھے تھے۔ انہوں نے حیدر آباد کی ان تمام سازشوں کو جو ان کے زمانے میں سر اٹھاتی رہیں اس طرح ختم کر دیا کہ ان کے بعض مداحین کہا کرتے تھے کہ "اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو بسمارک اور ڈزریلی کا ہم پلہ ہوتا۔"

انہیں نظام حیدر آباد نے ستمبر ۱۸۸۸ء میں دوبارہ محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب مع تمام لوازماتِ خطاب کے گورنر جنرل کی سفارش اور منظوری سے دیا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا وہ اپنی قابلیت اور ایمانداری کا سکّہ سبھوں کے دلوں میں بٹھاتے گئے۔ جب سر آسمان جاہ وزیر اعظم ہوئے تو انہوں نے نواب محسن الملک کو ایک نازک اور اہم مشن پر لندن بھیجا یہ واقعہ ۱۸۸۸ء کا ہے جب ان کی عمر کوئی ۵۱ برس کی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہیں اپنے کام کے سلسلہ میں پارلیمان کی جوڈیشل کمیٹی کے سامنے بیان دینا پڑا جہاں انہوں نے اپنی قانونی دسترس کے جوہر دکھائے۔

ان کی صحت چونکہ خراب ہونے لگی اس لئے دوسرے قانونی مشیروں کو چھوڑ کر وہ انگلستان سے واپس چلے آئے۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں محسن الملک کو وہاں کے بڑے بڑے امراء اور سیاستدانوں مثلاً پرنس البرٹ وکٹر، سر جان اسٹریچی اور لارڈ رپن وغیرہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے ساتھ ان کی سیاسی حیثیت کے مطابق سلوک روا رکھا۔ وہاں انہوں نے کیمبرج کے ہندوستانی طلباء کی سوسائٹی میں تقریر کی اور پھر ہندوستانی طلبا کو نارتھ بروک کلب میں دعوت دی۔ انہی دنوں لارڈ لینسڈاون وائسرائے ہند مقرر ہوئے تھے ان کے اعزاز میں کی گئی متعدد دعوتوں میں وہ شریک ہوئے۔ ایک جلسے میں دادا بھائی نوروجی بھی شریک تھے جنہوں نے لندن میں مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے ایک ایڈریس لارڈ لینسڈاون کو پیش کیا تھا۔

غرضکہ وہ وہاں کی سیاسی تہذیبی اور سماجی زندگی سے ذاتی واقفیت لے کر ہندوستان لوٹے اور بعد میں یہی تجربات ان کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔

نظام حیدر آباد ان کو اب بڑی سے بڑی جگہ دینے کو تیار تھے کہ یکایک حیدر آباد کی سیاسی فضا پلٹ گئی اور ریذیڈنسی کی طرف سے کی گئی سازشوں کی وجہ سے محسن الملک اور سر آسمان جاہ دونوں کو حیدر آباد کی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ حیدر آباد میں بسلسلہ ملازمت تقریباً بیس برس رہے۔

جب انہوں نے حیدر آباد چھوڑا تو خواص اور عوام دونوں کو اس کا بڑا ملال تھا۔ نواب مرزا داغؔ جو ان دنوں حیدر آباد میں ملک الشعراء تھے اپنے دلی جذبات پر قابو نہ پاسکے اور بے اختیار کہہ اٹھے ؎

مہدی کہو اگر تمہیں زماں کہتے ہیں ۔۔۔ یا محسنِ ملک اس کو یہاں کہتے ہیں
زیبا ہے کہیں محسنِ عالم اسے داغؔ ۔۔۔ جو چاہئے کہنا وہ کہاں کہتے ہیں

———

اس خیر کا انسان کوئی ہو تو سہی ۔۔۔ ذی مرتبہ ذی شان کوئی ہو تو سہی
ہر شخص کو ملحوظ ہے خاطر داری ۔۔۔ یوں دل کا نگہبان کوئی ہو تو سہی

ایک طرف تو محسن الملک اپنی ملازمت کے سلسلے میں انتظامی امور میں دلچسپی اور حصہ لیتے رہے دوسری طرف سر سید احمد خان سے ان کے تعلقات

گوناگوں منازل طے کرتے رہے۔ شروع میں وہ سرسید کے عقائد اور طریقۂ عمل سے اتفاق نہ رکھتے تھے لیکن سرسید کی شیریں اور نرم گفتاری نے ان کا دل موہ لیا اور بعد میں ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا ایسا عہد کیا کہ آخری وقت تک اسی کام میں منہمک رہے۔

سرسید کی زندگی میں وہ ان کی طرح طرح سے امداد کرتے رہے، کبھی مالی امداد کی اور کبھی رسالہ تہذیب الاخلاق میں نہایت سلیس اور آسان زبان میں بہترین اصلاحی اور تحقیقی مضامین لکھ کر ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ سرسید ان کے زبردست تعاون سے اتنے مرعوب ہوئے کہ انہیں "لحمک لحمی" یعنی اپنا گوشت کہہ دیا اور ان کے نام پر "مہدی منزل" بطور یادگار تعمیر کروایا جس کے کتبے میں ان کے محاسن اور امداد کا بڑی محبت سے ذکر مرقوم ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۸۹۰ء سے شرکت کرنی شروع کی اور ایسی معرکۃ الآرا تقریریں کیں اور ایسے پُرمغز اور تحقیقی مقالے پڑھے کہ مسلمانوں میں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی اور اس طرح سرسید اور محسن الملک کی ان تھک کوشش سے قومی بیداری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

وہ حیدرآباد سے ۱۸۹۳ء میں مستعفی ہونے کے بعد علی گڑھ ہی میں رہے تاکہ سرسید کے تعلیمی اور اصلاحی مشن میں ممد و معاون ہو سکیں اور ان کی زندگی ہی میں وہ کالج کے تقریباً سب سے اہم ٹرسٹی بن گئے۔

سرسید کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا۔ اس وقت کالج مالی پریشانیوں میں گھرا تھا جسے انہوں نے سرسید میموریل فنڈ قائم کر کے اپنی دانشمندی سے نجات دلائی اور کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ قوم کے سامنے پیش کر دیا۔

سرسید کے بعد ان کے صاحبزادے جسٹس سید محمود سیکرٹری ہوئے لیکن خرابی صحت کے باعث اس عہدے سے علیحدہ ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں نواب محسن الملک کو یہ عہدہ سپرد کیا گیا۔

اس کے بعد سے ان کی حیثیت کل ہند مسلم رہنما کی ہو گئی اور ہر اعتبار سے وہ سرسید کے جانشین ہو گئے اور باوجود کبر سنی کے خدمتِ قوم میں جوش و خروش کے ساتھ لگ گئے۔

۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کا قضیہ چھڑا جس نے یو۔پی، بہار اور دیگر علاقہ جات میں ہندو مسلم تعلقات میں تلخی پیدا کر دی۔

انہوں نے ایک طرف تو حکومت سے پہلی بار اس مسئلے پر کھلم کھلا ٹکر لی دوسری طرف مسلمانوں کو صاف اور کھلے لفظوں میں سمجھایا کہ برادرانِ وطن کے فوائد اور اغراض کے خلاف حملہ آور ہونے سے احتراز کرو۔ انہوں نے جو تاریخی میموریل تیار کر کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت میں پیش کیا تھا وہ اس دور کی سیاسی بے چینی کی گویا عکسی تصویر ہے۔ نواب محسن الملک کی زندگی کا آخری دور ہندوستان کی تاریخ سیاست کا ایک اہم باب ہے اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کا ایک ایسا موڑ ہے جسے سمجھے بغیر کوئی آنے والی سیاسی تحریکوں کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔

یہی زمانہ تھا جب میں علی گڑھ کے ہائی انگلش اسکول میں داخل کیا گیا۔ میں نے شروع ہی سے علی گڑھ کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ کیونکہ میرا مطالعہ عمر کے لحاظ سے وسیع تھا اور میں مولانا حالی، شبلی نعمانی اور مولوی نذیر احمد کی بیشتر تصانیف پڑھ چکا تھا۔ مسدس حالی کا ایک بڑا حصہ اور بہت سی دوسری قومی نظمیں مجھے یاد تھیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں آتے ہی یونین کلب کے مقابلے کی تقریروں میں شامل ہونے لگا جہاں پہلے ہی سال میں اسکول کے طلبا میں اول رہا اور کالج کلاسوں کو ملا کر پانچواں بہترین مقرر مانا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ کالج کے لائق اور ممتاز طلبا ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی مجھے اپنی صحبتوں میں شرکت کا شرف بخشنے لگے اور جلد ہی میری رسائی نواب محسن الملک تک بھی ہو گئی۔

جو لڑکے ان دنوں کالج کے ممتاز طلبا میں تھے اور جن کے ناموں سے آج بھی علیگڑھ کی تاریخ روشن ہے ان میں عبدالرحمٰن بجنوری (جو اس وقت اونچے درجے میں تھے)، تصدق احمد خان شیروانی (جو مجھ سے دو تین درجے آگے تھے) اور قاضی تلمذ حسین (جو اس وقت کالج میں تھے) خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی صاحب بڑے سیاستدان سمجھے جاتے تھے اور کالج میں اردو کے سب سے بہتر مقرر تھے۔ اسی وجہ سے محسن الملک انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی قابلانہ تقریروں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے، قاضی صاحب میرے سیاسی استاد بھی تھے اور انہی کی بدولت میں اوائل عمر ہی میں کانگرس کی طرف مائل ہو گیا۔

ان بزرگ دوستوں کے ساتھ میں نواب محسن الملک کے یہاں حاضر ہوتا۔ اگر ہم لوگ ہفتہ دو ہفتہ ان کے یہاں حاضری نہ دیتے اور نواب صاحب کہیں راستے میں مل جاتے، کیونکہ ہر شام کو بلاناغہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو جاتے تھے تو فوراً گاڑی روک کر ہم سبھوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور نہایت سخت مگر محبت آمیز الفاظ میں شکایت کرتے کہ تم سب اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ کبھی کہتے "تم سب باغی ہو گئے ہو!" —— "باغی" کا لفظ وہ اس لئے استعمال کرتے کیونکہ ہم لوگ کبھی کبھی سیاست پر گفتگو کرتے تھے اور انگریزوں کو برا بھلا کہتے تھے اور چونکہ میں سب دوستوں میں چھوٹا تھا وہ چھیڑ چھیڑ کر مجھے انگریزوں کے خلاف بولنے پر مجبور کرتے اور کبھی ہنس کر فرماتے کہ یہ لڑکا ضرور کبھی نہ کبھی جیل جائے گا یا پھانسی چڑھے گا۔ کبھی ہم لوگوں کو بڑی شفقت سے سمجھاتے کہ تمہاری قوم ابھی ان خیالات کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس وقت ہم لوگ زیادہ تر انگریزوں کی اسلام دشمنی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ قاضی تلمذ حسین اور بجنوری نواب صاحب سے کبھی کبھی علمی گفتگو کرتے اور بعض وقت اسلام کے کسی مسئلے کے متعلق اعتراض کرتے، سمجھنے کی خاطر نواب صاحب سے الجھنے کی کوشش کرتے اس وقت محسن الملک کی گفتگو سننے کے قابل ہوتی، وہ ایسی خوبی اور قابلیت کے ساتھ اعتراضات کا جواب دیتے کہ معلوم ہوتا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ یہ بھی ہوتا کہ کبھی وہ جوش میں آ جاتے۔

ان ہی دنوں یعنی ۱۹۰۴ء میں نواب صاحب نے مجوزہ یونیورسٹی فنڈ کی غرض سے رنگون کا سفر کیا اور اپنی معجز بیانی اور فصاحت لسانی اور بلند اخلاق و اعلیٰ کردار سے قومی تعلیم اور قومی یونیورسٹی کا خیال ہر مسلمان کے دل میں جاگزین کیا۔ رنگون میں پہلے پہل کامیابی کا امکان نظر نہ آیا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن ایک جلسے میں بڑی معرکۃ الآرا تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم مسلمان علمی اور ملکی دونوں سلطنتیں کھو بیٹھے ہیں ملکی سلطنت کی نہ ہم کو سردست خواہش ہے اور نہ حاصل ہو سکتی ہے لیکن علمی سلطنت کی خواہش بھی ہے اور حاصل بھی ہو سکتی ہے۔ ملکی سلطنت کا آفتاب تو دہلی سے طلوع ہوا اور رنگون میں آ کر غروب ہو گیا۔ کیا اہل رنگون اس کے بدلے میں علمی سلطنت کا آفتاب رنگون سے نکال کر علیگڑھ میں نہ غروب کریں گے؟ —— یہ تقریر کس موثر پیرایہ میں کی ہو گی اسی ایک خطیبانہ جملے سے ظاہر ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک بہت بڑی رقم اسی وقت جلسے میں جمع ہو گئی۔

۱۹۰۳ء میں جبکہ میں نویں درجے میں تھا علیگڑھ میں ایک خفیہ سوسائٹی قائم ہوئی جس کے بانیوں میں چھ لوگ تھے، یعنی عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خاں شیروانی، بدرالدین (برادر بزرگ مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سیکرٹری جمعیۃ العلمائے ہند) عزیز الرحمٰن اور راقم الحروف اور بعض دیگر حضرات۔ ان میں صرف عزیز الرحمٰن اور میں زندہ ہوں (عزیز الرحمٰن ان دنوں ضلع اناؤ (یو۔پی) میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں) اس سوسائٹی کا مقصد پین اسلامزم اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا تھا۔ طلباء کی یہ جماعت ہر ہفتے بڑی خاموشی کے ساتھ کسی ایک جگہ ملتی تھی۔ ایک آدمی کسی بابت موضوع پر کوئی مقالہ پڑھتا، کبھی اس پر سنجیدگی سے بحث ہوتی کہ دنیا کے مسلمانوں کو کیونکر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکتا ہے اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ یہ جماعت زمین دوز رہ کر کالج کے طلباء کے درمیان انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتی رہی۔ ممبرانِ خفیہ انجمن نے آگے چل کر ایک موقع پر سرسید کی قبر پر جا کر اس بات کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم لوگ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نہ نکال دیں گے ہرگز دم نہ لیں گے اور ان میں سے تقریباً ہر ممبر اپنی قسم پر قائم رہا۔

مسٹر آرچبولڈ اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے، یہ صاحب بہت بد زبان تھے اور ان کی بد زبانی کی وجہ سے طلبا ان سے بہت نالاں تھے۔ ایک روز طلبا کسی کام سے ان کے پاس گئے، انہوں نے طلباء کو (Herd of Pigs) (سوروں کے جھنڈ) کہہ کر اپنے بنگلے سے نکلوا دیا۔ اس پر طلباء میں بڑی برہمی پھیلی۔ نواب صاحب تک شکایت پہنچی لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے وہ انگلش اسٹاف کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے —— آپس کے

صلاح و مشورہ کے بعد میں نواب وقار الملک کے پاس امروہہ پہنچا، ان سے کارنا صاحب کی بہت سی شکایتیں کیں۔ وہاں اس وقت مسعود نامی مرحوم بھی پہلے سے موجود تھے۔ یہ نواب صاحب کے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ انہوں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ نواب وقار الملک نے فوراً ہم لوگوں کا بیان قلمبند کر لیا۔ پہلے تو ہم لوگ سمجھے کہ وہ اپنی یادداشت کے لئے ہم لوگوں کا بیان قلمبند کر رہے ہیں لیکن بیان مکمل کر کے انہوں نے دستخط کے لئے ہمارے آگے بڑھایا تو ہم دونوں خائف ہو گئے اور سمجھے کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم لوگ علی گڑھ سے نکالے جائیں گے۔ اس خیال کا اظہار ہم لوگوں نے نواب وقار الملک سے بھی کیا۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ کیا ہرج ہے۔ دوسرے دار العلوم میں پڑھنا مگر سچ بات کے کہنے میں دریغ نہ کرنا چاہئے اور اس طرح کی بہت سی باتیں سمجھائیں۔ ہم دونوں نے دستخط کر دئے مگر چند گھنٹوں کے بعد مسعود نامی نے اپنے بیان کی کچھ تاویلیں کیں جس پر نواب وقار الملک نے ان کے دستخط کاٹ دئے، اور میرا بیان لے کر وہ علی گڑھ تشریف لائے اور نواب محسن الملک سے میرے متعلق دریافت فرمایا۔ جب نواب محسن الملک نے میری بڑی تعریفیں کیں تو نواب وقار الملک نے میرا وہ بیان دکھلایا جو امروہہ میں لکھا گیا تھا اس کے بعد نواب محسن الملک سے کچھ ترش گفتگو ہوئی کہ انہوں نے کالج میں انگلش اسٹاف کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے، پھر وہ بیان ٹرسٹیوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ یہ تعطیلوں کا زمانہ تھا جب پرنسپل ماریسن صاحب کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو بہت چراغ پا ہوئے اور میرے اسکول سے نکالے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ نواب محسن الملک بھی مجھ سے کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے کیونکہ اس واقعے میں ان کی بھی کافی شکایت ہو گئی تھی لیکن ان کی فیاض طبیعت اور نیک دلی نے گوارا نہ کیا کہ میں اسکول سے نکالا جاؤں۔ انہوں نے ماریسن صاحب کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر اپنا حکم واپس لینے پر راضی کیا۔ جب میں تعطیلات کے بعد واپس آیا تو ایک موقع پر نواب محسن الملک سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کسی قدر بے رخی برتی اور "آپ" کہہ کر مجھ سے گفتگو کی جو ان کی طبیعت اور عادت کے خلاف بات تھی۔ وہ مجھ سے اور ان تمام طلباء سے جو ان سے مانوس تھے "تم" اور "تو" کہہ کر باتیں کرتے تھے ——— لیکن وہ بہت جلد سب کچھ بھول گئے اور میں پھر حسب دستور ان کے یہاں آنے جانے لگا۔

۱۹۰۶ء کا ذکر ہے کہ میں پروفیسر کریم حیدر [illegible] نثار احمد خاں شیروانی اور نذر الحسن مرحوم کے ساتھ نارمل کلاسز اسکول کی طرف سے کاٹھیاواڑ ڈیپوٹیشن میں بھیجا گیا۔ ہم لوگ کاٹھیاواڑ، گجرات، بڑودہ اور سورت میں کام ختم کر کے جب بمبئی پہنچے تو اس وقت نواب محسن الملک شہر سیاسی وفد بمبئی میں ترتیب دے رہے تھے جو بعد کو سر آغا خان کی سرکردگی میں بمقام شملہ لارڈ منٹو کے یہاں حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے مجھے بمبئی میں روک لیا اور واٹسن ہوٹل میں بلا لیا اور ڈیپوٹیشن سے متعلق کچھ معمولی کام میرے سپرد بھی کیا۔ اس سال میں بی اے میں تھا اور میرے سیاسی خیالات میں اب بہت کچھ پختگی آ چکی تھی اور کبھی کبھی نواب صاحب کے ساتھ گستاخانہ بحث کر بیٹھتا تھا جیسے یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ملک اس طرح سے تباہ ہو جائے گا وغیرہ ——— اس وقت وہ کبھی پیار سے اور کبھی غصہ میں آ کر مجھ کو ڈانٹ دیا کرتے تھے لیکن پھر جب شام کے وقت وہ گاڑی میں سیر کو نکلتے تو اکثر مجھے ساتھ لیتے اور سمجھانا شروع کرتے "تو سمجھتا ہے کہ میں ایک پھسپھڈے کا آدمی ہوں، انگریزوں سے ڈرتا ہوں، میں انگریزوں کا خوشامدی ہوں" وہ کہتے کہ گو تو یہ الفاظ زبان سے نہیں کہتا لیکن تیرے دل میں یہ باتیں جاگزیں ضرور ہیں۔" پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں سمجھاتے کہ "میں کمزور نہیں ہوں، اور نہ انگریزوں کا خوشامدی ہوں مگر تیری قوم ابھی ان خیالات کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کیا تجھ کو یاد نہیں ہے کہ جب سر انٹونی میکڈونل نے ہندی کا اجراء کیا تھا تو اس وقت اردو ڈیفنس کمیٹی کا میں صدر بنایا گیا تھا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسوں میں جو تقریریں میں نے کیں ان سے گورنمنٹ لرز گئی۔ میرے خلاف خود کالج کے ٹرسٹیوں اور بڑے بڑے مسلمانوں نے شکایتیں کیں۔ مسٹر میکڈونل علی گڑھ آئے تو ٹرسٹیوں کے جلسے میں کالج کو دھمکی دی۔ ٹرسٹیوں نے مجھے اردو ڈیفنس کمیٹی سے استعفا دینے پر مجبور کیا، جب تیری قوم کا یہ حال ہے تو پھر ان میں تیرے خیالات کو ابھی پھلنے پھولنے کی گنجائش کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے سے انگریز فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مسلمانوں میں اب تک سیاسی شعور نہیں پیدا ہوا ہے کہ اس بات کو سمجھیں۔ جب یہ شعور پیدا ہو جائے گا تو دیکھنا وہ تیری کانگریس سے کبھی پیچھے نہیں رہیں گے۔" پھر کہتے "کیا تو نہیں جانتا کہ ۵۷ء میں کیا ہوا، اس تحریک نے جسے انگریز وہابی تحریک کہتے ہیں انگریزوں کے خلاف کیا کیا کام کئے۔ ابھی چند برس پہلے تک انگریز مسلمانوں کے سخت خلاف تھے، سر سید اور ان کے ساتھیوں کی مسلسل کوششوں سے

اب جا کر وہ کسی قدر مسلمانوں سے صاف ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوستان میں ہیر رکھنے کی اجازت مل رہی ہے " وغیرہ ۔

اس طرح نواب محسن الملک نے اکثر مسلمانوں کی تباہی، ان کی سیاسی کمزوری اور سرسید کے قصے سنایا کرتے ۔

اس ڈیپوٹیشن کی تنظیم میں تقریباً دو مہینے صرف ہوئے انہوں نے اس درمیان میں زبردست تنظیمی صلاحیت کا ثبوت دیا ۔ پہلے سر آغا خان ڈیپوٹیشن لے جانے پر راضی نہیں ہو رہے تھے لیکن نواب صاحب نے ایسا دل ہلا دینے والا تار انہیں یورپ بھیجا کہ انہیں یورپ سے واپس آنا پڑا اور ڈیپوٹیشن لے جانا بالآخر انہوں نے منظور کر لیا ۔

سرسید کے بعد کالج کے لئے روپیہ جمع کرنے، علماء اور صوفیائے کرام کو کالج کی طرف متوجہ کرانے، عمارت بنوانے، امراء اور والیانِ ریاست، شہزادوں اور حکمرانانِ ملک کو کالج میں مدعو کر کے لانے، کالج میں طلباء کی تعداد بڑھانے کی جو ان تھک کوششیں نواب صاحب نے ضعیفی میں کیں وہ علی گڑھ کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی ۔ اگر سرسید کی جانشینی اس وقت نواب محسن الملک کو نہ ملتی تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ علیگڑھ اس بامِ ترقی پر نہ پہنچتا، حکومت اور انگریزی حکام کی توجہ بھی انہوں نے کالج کی طرف پورے طور پر مبذول کرائی ۔ مسٹر بیک کے مرنے کے بعد مسٹر ماریسن کو جو کالج چھوڑ کر ولایت چلے گئے تھے، جس طرح اصرار کر کے واپس بلایا اور کالج کا پرنسپل بنایا اس سے نواب محسن الملک کی مردم شناسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کالج کو ترقی دینے، انگریزوں کے خیالات مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنے، طلبا سے محبت آمیز اور مربیانہ برتاؤ کرنے اور دیگر انتظامی معاملات میں ماریسن صاحب نے بھی نہایت قابلیت کا ثبوت دیا ۔ ان میں اور نواب صاحب میں آخر وقت تک دوستانہ تعلقات قائم رہے ۔ اور شاید ہی کسی امر میں اختلاف ہوا ہو ۔ ماریسن صاحب انگریز قوم کے ایک رکن تھے اور لازمی اور فطری طور پر وہ ہندوستان میں انگریز قوم کی بہبودی بھی چاہتے تھے ۔

ماریسن صاحب کے جانے کے بعد ان کے جانشین کا مسئلہ نہایت سخت تھا، ماریسن صاحب آرنلڈ صاحب کو پرنسپل بنانا چاہتے تھے اور ان کو عارضی طور پر چارج بھی دے کر چلے گئے تھے لیکن آرنلڈ صاحب کی چونکہ سخت مخالفت تھی اس لئے نواب صاحب کو دوسرے پرنسپل کی تلاش ہوئی اور انہوں نے ایک سن رسیدہ، تجربہ کار اور تاریخ داں انگریز کیمبرج سے بلوایا جس کا نام آرچبولڈ تھا ۔ یہ نیک مزاج آدمی تھے لیکن مزاج میں تھوڑا چڑچڑا پن بھی تھا ۔ انہوں نے حتی الوسع مسٹر ماریسن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن ان کو ماریسن صاحب کا سا علیگڑھ کا تجربہ، مسلمانوں کے کلچر سے واقفیت اور اس درجہ ہمدردی کیسے ہو سکتی تھی ؟ اس کے علاوہ ان میں ماریسن صاحب جیسی انتظامی قابلیت بھی نہ تھی، تبدیل شدہ حالات میں انگلش اسٹاف اور طلباء میں پہلے جیسا برتاؤ بھی باقی نہ رہا تھا ۔ مسٹر آرنلڈ کو پرنسپل نہ بنانے کا بھی انگلش اسٹاف پر خاصا اثر تھا ۔ غرضکہ طلباء اور انگلش اسٹاف میں ایک کشیدگی پیدا ہو چکی تھی ۔

اگرچہ علی گڑھ میں والیانِ ریاست، گورنر اور وائسرائے رسمی طور پر آیا کرتے تھے لیکن محسن الملک کی موقع شناسی کی بدولت علی گڑھ اس شعر کا مصداق بن گیا ؎

عاقبت مقبولیٔ کالج بایں غایت رسید
تربیت گاہِ غریباں شد گذرگاہِ شہاں

جب جارج پنجم اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ہندوستان میں بغرضِ سیر و سیاحت آئے تو ٹرسٹیان کالج کی کوششوں کے باوجود علیگڑھ آنا ان کے پروگرام میں شامل نہ کیا گیا لیکن نواب صاحب نے سر آغا خان کے ذاتی اثر و رسوخ سے فائدہ حاصل کر کے آخر کار انہیں ۵ مارچ ۱۹۰۶ء کو علی گڑھ بلوا ہی لیا ۔ ان کی آمد کی یادگار میں سائنس اسکول کے قیام کا اعلان ہوا اور ولی عہد کی موجودگی میں سر آدم جی پیر بھائی (بمبئی) نے ایک لاکھ دس ہزار روپے کا عطیہ بذریعہ تار بھیجا ۔ پرنس آف ویلز نے اسٹریچی ہال اور کالج کلاسز کا معائنہ کر کے یکی بارک اور بورڈنگ ہاؤس کے چند کمروں کو بھی ملاحظہ فرمایا جس میں سے ایک کمرہ بڑا بھی تھا ۔ اس میں شہنشاہ جرمنی اور کچھ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں بھی تھیں ۔ ولی عہد نے پوچھا کہ کیا تم جرمنی کے بادشاہ کو پسند کرتے ہو ؟ میں نے

جواب دیا "جی ہاں!" وہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں دیکھتے رہے لیکن ان کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔

پرنس آف ویلز کا یہ دورہ بظاہر بہت کامیاب رہا اور جب وہ واپس انگلستان گئے تو گلڈ ہال لندن میں دورۂ ہندوستان پر ایک تقریر فرمائی جس میں علیگڑھ کالج کا تذکرہ بہت شاندار طریقے پر کیا۔ لیکن اندرونی خبر یہ تھی کہ ان پر یہ اثر ہوا کہ یہ کالج بھی باغی سرکار رہے یا ہو جائے گا۔

دوسری اہم ہستی جس نے علی گڑھ میں قدم رنجہ فرمایا وہ امیر حبیب اللہ خان والئ افغانستان کی تھی - ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو امیر افغانستان بغرض معائنہ تشریف لائے اور تنقیدی نظر لے کر آئے۔ ان کا استقبال مسلموں اور غیر مسلموں دونوں نے شاندار طریقے پر کیا۔ ابھی کالج کے صدر دروازے پر تعارفی سلسلہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر افغانستان کا وہ مکالمہ شروع ہوا جس نے نواب صاحب کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ جب نواب صاحب نے کالج کی چند خوبیاں بتانی چاہیں تو شاہ نے فرمایا کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" اور یہ صاف ظاہر کیا کہ وہ کالج سے بدظن ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت علی کا قول ہے کہ سچ اور جھوٹ میں صرف چار انگل کا فاصلہ ہے جو آنکھ اور کان کے درمیان ہے۔ کان سے میں سن چکا ہوں، بس آنکھ سے دیکھنے آیا ہوں۔

نواب محسن الملک نے برجستہ عربی کے یہ اشعار پڑھے ؎

قِیلَ اِنَّ الالٰہَ ذُو وَلَدٍ　　قِیلَ اِنَّ الرَّسُولَ قَدْ کَھَنَا

(لوگوں نے خدا کو بھی صاحبِ اولاد کہا، اور رسول کو جادوگر ———)

مَا نَجَی اللّٰہُ وَالرَّسُولُ مَعًا　　مِن لِسَانِ الوَرَیٰ فَکَیفَ اَنَا

(جب خدا اور رسول بدگویوں کی زبان سے نہ بچے تو ہم کیسے بچ سکتے ہیں ——؟)

امیرِ افغانستان نے فرمایا کہ کالج کے ملاحظہ کے بعد ہی میں اپنی رائے دے سکتا ہوں، اور نواب صاحب کو طلب فرما کر خاص کر تعلیمِ دینیات کے متعلق سوالات کئے اور دریافت کیا کہ وہ کالج کو بطور ممتحن دیکھیں یا بطور سیاح؟ نواب صاحب نے یہ تمنا ظاہر کی کہ وہ بطور ممتحن کالج کو ملاحظہ فرمائیں۔

جب ٹرسٹیان نے امیر کو لنچ کی دعوت دی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ جب تک میری تشفی نہ ہو جائے میں تم لوگوں کے ساتھ شریکِ طعام نہیں ہو سکتا۔ اس جواب نے نواب صاحب کو انگشت بدنداں کر دیا۔

امیر افغانستان نے لنچ علیحدہ کھایا اور پہلے یکّی بارک کی بورڈنگ دیکھی۔ انگلش ہاؤس میں پہنچ کر بچوں کے سونے، کھانے، نماز، غسل اور مطالعہ کے کمرے دیکھے اور فرمایا کہ "لوگ مسلمان بچوں کے اس طرح رہنے سہنے پر کیوں معترض ہیں۔ اگر یہ بچے اسلامی عقائد سے واقف ہیں اور ارکانِ اسلام کے پابند ہیں تو چاہے جس طرح پڑھیں، سوئیں اور رہیں۔"

امیر کو جب وہ الماری دکھائی گئی جس میں قرآنِ پاک اور سپارے رکھے رہتے تو کہنے لگے کہ میں کلامِ پاک کو بالائے طاق دیکھنے نہیں آیا ہوں میں اس کا متلاشی ہوں کہ بچے انہیں پڑھتے ہیں یا نہیں۔ اس بات پر چار لڑکے پیش کئے گئے تو کہنے لگے کہ میں آپ کے منتخب لڑکوں کا امتحان لینا نہیں چاہتا، بلکہ میں خود لڑکوں کا انتخاب کروں گا۔ کالج کی مسجد میں انہوں نے نماز ظہر ادا کی اور اس کے بعد نظام مسجد میں طریقِ تعلیم ملاحظہ فرمایا اور پہلے ہی کمرے میں تشریف فرما کر ایک طالب علم علی الدین نامی کو اپنے قریب بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ قرآن مجید میں سے جو تمہیں یاد ہو سناؤ، خدا کو بھلا کرنا منظور تھا کہ وہ لڑکا اتفاق سے قاری اور خوش الحان تھا۔ اس نے نہایت خوش گلوئی کے ساتھ بعد تعوذ و بسم اللہ سورۂ عمران کی یہ رکوع تلاوت کرنی شروع کی:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ . . . . الخ

دو چار ہی آیتوں کی تلاوت کے بعد ایک عجیب پُراثر سماں بندھ گیا اور ہر شخص پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ادھر شاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور قطرے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں اور داڑھی تک چلے آئے۔ رکوع ختم ہونے تک کئی رومال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔

امیر افغانستان الحمد للہ کہہ کر نہایت جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بار بار کبھی اردو کبھی فارسی اور کبھی انگریزی میں فرمانے لگے "اس کی جو بدگوئی مجھ سے

مجھ

کی گئی ہے سب غلط اور جھوٹ ہے ـــــ" ہمہ دروغ است وکذب وبدگوئی" ـــــ They are liars "یا" میں بدگوؤں کی زبان بند کرنے کی کنجی ہوں گا۔"

نواب صاحب کی خوشی کی انتہا نہ تھی، فرطِ مسرت سے ان کا چہرہ روشن ہو رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ امیر نواب صاحب سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ "ہم نے امتحان لے کر اپنی پوری تشفی کر لی ہے۔ ہر چیز اچھی اور لائقِ تعریف پائی"۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ نواب صاحب نے عرض کیا کہ اسٹریچی ہال میں تمام ہندوستان کے مسلمان جمع ہیں، بڑی عنایت ہو اگر آپ وہاں قدم رنجہ فرما کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، اور امیر نے بخوشی یہ پیشکش منظور کر لی۔

اس وقت سر ہنری میکموہن نے کہا:

No doubt your majesty is a good Mullah

(اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی جناب ایک اچھے ملّا ہیں)

اس کا امیر افغانستان نے برجستہ جواب دیا: 'yes' I am three things, I am a Mullah, I am a Soldier and I am a King.'

(بلاشبہ میں تین چیز ہوں۔ میں ایک ملّا ہوں، میں ایک سپاہی ہوں اور میں ایک بادشاہ ہوں)

اسٹریچی ہال میں ایڈریس پیش کیا گیا جہاں ہال تالیوں اور نعروں سے گونج رہا تھا۔

شاہ کی تقریر بہت مختصر تھی جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "اول کسے کہ دہنِ بدگویاں بہ زبان بند کند او من خواہم بود" اور علی گڑھ کے متعلق تاثرات مختصر طور پر بیان کئے۔ رات کی دعوت کے بعد شاہ نے ٹرسٹیوں کا شکریہ ادا کیا اور مولانا حالی کا قصیدہ سنا جس کا ایک شعر اوپر درج کیا جا چکا ہے وہیں انہوں نے بیس ہزار روپے یکمشت دینے اور چھ ہزار سالانہ وظیفہ کالج کے لئے مقرر کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس موقع پر گراں قدر عطیات دیئے۔

ابھی جوش اور ولولہ کم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر گوکھلے علیگڈھ تشریف لائے۔ اس وقت علیگڈھ میں مولانا محمد علی مرحوم بھی موجود تھے، انہوں نے مسٹر گوکھلے کو فوراً طلباء کی طرف سے کالج میں آنے کی دعوت دے دی۔ پرنسپل آرچبولڈ اس بات پر بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور مسٹر گوکھلے کو لکھا کہ آپ کو طلباء نے بغیر میری اجازت کے مدعو کر لیا ہے، اس پر بھی آپ تشریف لائیں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ صرف تعلیمی مسائل پر گفتگو کریں گے۔ جب طلباء کو معلوم ہوا تو انہیں بہت غصہ آیا۔ مسٹر گوکھلے نے پرنسپل کو جواب دیا کہ آپ کے کہنے کے مطابق میں صرف تعلیمی مسائل پر طلباء سے گفتگو کروں گا۔ آپ مطمئن رہئے۔

طلباء میں ایسا جوش و خروش تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ شہر جا کر جہاں مسٹر گوکھلے قیام پذیر تھے ان کی گاڑی خود کھینچ کر لائیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اس بات سے روکا گیا۔ لیکن جب مسٹر گوکھلے کی گاڑی کالج کے صدر دروازے پر آئی تو طلباء نے ان کی گاڑی کھینچی اور جس جوش و خروش کا اظہار کیا وہ قابلِ دید تھا۔ مسٹر گوکھلے کو مسلمان نوجوانوں کا سیاسی جوش دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آواز بھرّا اٹھی ان کے ہر ہر لفظ سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا اور ہر ہر جملے پر تالیوں کی گونج اٹھتی تھی اور مشکل سے روکی جا سکتی تھی۔

مسٹر گوکھلے نے وعدے کے مطابق صرف تعلیمی مسائل پر گفتگو کی لیکن اس انداز سے گفتگو کی کہ ان کی ساری تقریر سیاستِ وقت کی تفسیر تھی۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ملک کے ایک خادم کی جو عزت افزائی علی گڑھ میں ہوئی ہے اس سے مجھے امید ہو گئی ہے کہ آزادی اب زیادہ دور نہیں ہے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو چکے ہیں اور کیسی آگ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔

طلباء مسٹر گوکھلے پر نچھے جاتے تھے اور گوکھلے زندہ باد' 'ہندوستان زندہ باد' کے نعروں سے سارا کالج گونج اٹھا۔

اسٹریچی ہال میں مسٹر گوکھلے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے اپنی قومی پالیسی کی صاف لفظوں میں وضاحت کی اور کہا کہ وہ سیاسی رائے میں اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ اپنی قومیت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ مگر اہلِ ملک کے ساتھ دوستی رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ علیگڑھ آنے سے قبل لکھنؤ کے مشہور جلسے میں نواب صاحب نے اپنی سیاسی پوزیشن کی صفائی میں نہایت اہم تقریر کی تھی اور مسٹر گوکھلے کا خیر مقدم نہایت شاندار طور پر کر چکے تھے جس کا موضوع "ہندو مسلم اتحاد" تھا۔

پرنسپل اور انگلش اسٹاف کو طلباء کا یہ مظاہرہ جوش بہت ناگوار ہوا اور انگلش اسٹاف اور طلباء کے تعلقات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے۔

نواب محسن الملک نے بمبئی میں شملہ ڈیپوٹیشن کی تیاری کے وقت اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ مجھ کو یاد آ گیا۔ ظاہراً معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب انگلش اسٹاف سے بہت مرعوب ہیں اور انگریزوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے لیکن ان کی تربیت اور طور طریقے سے لڑکوں کو جیسے شہ مل رہی ہو اور روز بروز انگریز دشمنی کا جذبہ اور ملکی آزادی حاصل کرنے کا ولولہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں کہ چند طلباء نے ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو کسی صورت سے جلد ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سوسائٹی کے پروپیگنڈا کا چند ہی برسوں میں یہ اثر ہوا کہ ۱۹۰۴-۰۵ء میں یونین کلب میں کانگرس اور ہندوؤں کو برا بھلا کہنا کسی بڑے سے بڑے مسلمان لیڈر کے لئے آسان بات نہ تھی۔

حکومت نے علیگڑھ کو بھی ہاتھ سے جاتا ہوا دیکھ کر بے ضابطہ طور پر یہ تجویز پیش کرائی کہ کالج کو ایک اورینٹل کالج بنایا جائے اور عربی تعلیم پر زور دیا جائے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ نواب محسن الملک کو جب یہ معلوم ہوا تو یونین کلب کے ایک مباحثے میں انہوں نے اس تجویز کی نہایت پُرزور مخالفت کی اور تشریح کی کہ اس تجویز کا منشا سیاسی معلوم ہوتا ہے حکومت غالباً چاہتی ہے کہ علیگڑھ کو انگریزی تعلیم سے رفتہ رفتہ دور کر دیا جائے تاکہ مغربی علوم و فنون سے جو شورش ہندوستان میں برپا ہو گئی ہے اس کے اثر سے کہ از کم علیگڑھ محفوظ رہ جائے۔ پرنسپل مارلین نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی کہ حکومت کا یہ منشا نہیں ہے بلکہ حکومت اس کو ایک مکمل مسلمانوں کا دارالعلوم بنانا چاہتی ہے لیکن محسن الملک کی شدید مخالفت کے باعث یہ تجویز کچھ آگے نہ بڑھ سکی۔

ہم اپنے رفقاء کے ساتھ جب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائلِ حاضرہ پر بے دھڑک بحث شروع کر دیتے تو وہ ہماری گستاخانہ باتوں کو برداشت کرتے ہوئے فرماتے کہ گھبراتے کیوں ہو، بہت جلد یہاں کے طلباء تم لوگوں جیسے خیالات کو ماننے والے ہو جائیں گے۔ گو اس وقت شاید میں زندہ نہ رہوں گا۔ سرسید کا بھی دراصل یہی منشا تھا اور میرا بھی یہی ہے کہ یہاں ملک کے جانباز سپاہی پیدا ہوں لیکن آہستہ خرامی سے کام لینا ہی وقت اور مصلحت کا تقاضا ہے۔ ابھی تمہاری قوم میں تیز دوڑنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

عجیب اتفاق کہ مسٹر گوکھلے کے جانے کے کچھ ہی دن بعد علیگڑھ کی نمائش میں ۹ فروری ۱۹۰۷ء کو ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ اس نے طلباء کی صف میں ہیجان برپا کر دیا۔ راجہ غلام حسین سے جو کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے ایک پولیس کانسٹیبل کا جھگڑا ہو گیا۔ ایسے جھگڑے ہمیشہ ہی ہوا کرتے تھے مگر مسٹر مارلین ہمیشہ طلباء کا ساتھ دیتے تھے اور ایسے معاملات رفع دفع کرا دیا کرتے تھے۔ یہ بات کالج کی تقریباً روایت بن چکی تھی لیکن جب راجہ غلام حسین کے معاملے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پرنسپل آرچبولڈ سے شکایت کی تو انہوں نے بلا سوچے سمجھے راجہ غلام حسین کو کالج سے خارج کر دیا۔

انگلش اسٹاف اور طلباء میں کشیدگی تو پہلے ہی سے تھی۔ یہ واقعہ گویا کھلم کھلا جھگڑے کا شاخسانہ بن گیا۔ طلباء میں جوش اور غصے کی لہر پھیل گئی اور انہوں نے بہت زور اور شور کے ساتھ احتجاج کا نعرہ بلند کر دیا اور جلسے کرنے شروع کر دیئے۔ اس پر کالج کے انگلش اسٹاف کا غصہ اور بھڑکا اور

ایک موقع پر جہاں طلباء کافی تعداد میں جمع تھے انہیں سخت سست کہا۔ بس پھر کیا تھا اس پر طلباء آپے سے باہر ہو گئے اور ان میں سے بعضوں نے انگلش اسٹاف کے خلاف بھی سخت الفاظ استعمال کئے۔ نثار احمد خان شیروانی (جو ابھی حال تک یو۔پی میں منسٹر تھے) جن کے مزاج میں غصہ بہت تھا، ایک انگریز پروفیسر کے یہ کہنے پر کہ ”ہم تم لوگوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں اور تم ایسی گستاخی کرتے ہو“ فوراً بول اٹھے کہ ”تم لوگ یہاں ہندوستان کی دولت لوٹنے آتے ہو کہ ہم لوگوں پر احسان کرنے؟“

اس واقعے سے انگلش اسٹاف نے یہ سمجھ لیا کہ علیگڑھ کے طلباء بھی بنگال والوں کی طرح کھلم کھلا سرکار کے باغی ہو گئے ہیں اور تعجب نہیں کہ ہم سب کو مار ڈالیں۔ چنانچہ گھبراہٹ میں انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی اور سب انگریزوں کے بنگلوں کی مسلح پولیس حفاظت کرنے لگی۔ طلباء کا ان انگریز پروفیسروں کو کسی طرح کی اذیت پہنچانے کا خیال بھی نہ تھا۔ یہ امر اتفاقی تھا کہ غصے کی حالت میں کچھ گستاخانہ گفتگو ہو گئی تھی۔ بہر حال اب تو طلباء کو باغی قرار دیا گیا تھا۔ چاروں طرف تار دوڑ گئے اور انگریزی اخباروں نے اور نمک مرچ لگا کر مضامین لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء نے اسٹرائک کر دی۔ پانچ مہینے وہ کالج میں جمع رہے مگر کلاسوں میں نہ گئے اور اپنے اسباب جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔

طلباء کے وفود مختلف مقامات کے لئے روانہ ہو گئے اور نواب وقار الملک کے علاوہ حکیم اجمل خان، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا نذیر احمد کے پاس دہلی آئے تاکہ انہیں علی گڑھ لے جائیں۔ نواب وقار الملک خود دہلی تشریف لائے اور حکیم صاحب کو علی گڑھ لے گئے۔ مولوی نذیر احمد طلباء کے بیانات سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں علی گڑھ چلوں گا اور تم لوگوں کی حمایت میں ایک لاکھ روپیہ تک جمع کر دوں گا۔ نواب محسن الملک تو مصلحت برتتے ہیں میں ہرگز کوئی مصلحت نہیں برتوں گا۔ طلباء کا وفد ان کے ساتھ علی گڑھ آیا اور ان کو نواب محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچا دیا گیا۔

اپنی اس کامیابی پر طلباء بہت خوش تھے لیکن جب دوسرے روز مولوی نذیر احمد طلباء کے سامنے کالج میں آئے تو ان کو مصلحت کا نام لے کر سمجھانے لگے۔ طلباء نے کہہ دیا کہ مولانا آپ پر بھی نواب محسن الملک کا جادو آخر چل ہی گیا۔

ایک حقیقت واقعہ سے طلباء، اسٹاف اور ٹرسٹیان کالج میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور انگلش اسٹاف نے اس پر جو سیاسی رنگ چڑھا دیا تھا اس نے نواب محسن الملک کو بہت متردد اور بے چین کر دیا تھا۔ بالآخر چند طلباء کالج سے نکالے گئے جن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خان شیروانی اور میں بھی تھا۔

ابھی طلباء کی اسٹرائک جاری تھی کہ ایک دن نواب صاحب نے ہم لوگوں کو طلب کیا اور ایسے دردناک لہجے میں گفتگو کی کہ طلباء بہت متاثر ہوئے اور ان سے وعدہ کیا کہ ہم لوگ خوشی سے کالج چھوڑ کر چلے جائیں گے اور اسٹرائک ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی دن ہم تینوں طلباء نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ طلباء کو سمجھانے کا ایک خط لکھ دیں۔ نواب صاحب اسی وقت میز کے سامنے بیٹھ گئے اور ایک لمبا خط اپنے ہاتھ سے تحریر کیا جس کی ابتدا ”میرے نالائق فرزندو!“ سے کی۔

اس فقرے نے اور اس خط کے پورے مضمون نے طلباء پر جادو کا اثر کیا۔ نواب صاحب نے وہ خط ختم کیا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ طلباء اب تک دوران اسٹرائک میں بھی نواب صاحب سے خفا تھے اور ان پر الزام دھرتے تھے کہ انگلش اسٹاف کے معاملہ میں کمزوری برت رہے ہیں اور ہمت کو راہ نہیں دے رہے ہیں لیکن ان کے خطوط نے حیرت انگیز طریقہ پر طلباء کی کایا پلٹ کر دی۔ ان کی تحریر کے لفظ لفظ سے طلباء کے ساتھ ان کی محبت ٹپکتی تھی۔ اس خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علم نفسیات کے کتنے بڑے ماہر تھے۔ آج سے ان خطوط نے وہ کام کیا جو تمام ٹرسٹیوں اور پرانے طالب علموں کی نصیحتیں نہ کر سکی تھیں۔۔۔

ظاہراً تو یہ طلباء کالج کی ایک اسٹرائک تھی لیکن حقیقتاً علی گڑھ کے طلباء کی یہ اسٹرائک مسلمان قوم کی سیاست کی سنگ بنیاد تھی۔ اس اسٹرائک کے بعد ہی مسلم لیڈروں نے محسوس کر لیا کہ اب مسلمان نوجوان پرانی سیاسی پالیسی سے بیزار ہو چکے ہیں اور یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے لئے ایک سیاسی

پلیٹ فارم بنایا جائے۔ چنانچہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

اسٹرائک کے کچھ عرصہ بعد ایک دن ہم چند طالب علم صبح کے وقت ان کی کوٹھی پر گئے۔ اس وقت نواب صاحب نوکروں پر خفا ہو رہے تھے۔ نواب صاحب نے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم سب خود باغی ہو اور میرے نوکروں کو بھی باغی کر دیا ہے۔ نہ تم سب میرا کہا مانتے ہو اور نہ میرے نوکر میرا کہا مانتے ہیں"۔ ان سے پوچھا گیا کہ حضور کیا بات ہے تو فرمانے لگے کہ "مجھے رات میں پاؤں دبوانے کی سخت عادت ہے۔ کل رات صرف کلن (ان کا پرانا نوکر) تھا جو اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو جا کر ذرا کالج کے اس بیرے کو جو میری کوٹھی میں رہتا ہے بھیج دے اور اس سے کہہ دے کہ میں اس کو کچھ انعام دوں گا۔ میں نے اس بیرے کو دو بار بلوایا لیکن اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب مجھ کو غصہ آیا اور میں نے کہلوایا کہ کل صبح میری کوٹھی سے نکل جائے۔ آج صبح کو میرے نوکروں نے جب اس کو مکان سے نکل جانے کو کہا تو بولا کہ جاؤ سرکار سے کہو کہ کیا رات کی بات ان کو اب تک یاد ہے؟ ——— نوکر بھی تم سبھوں کی طرح مجھ کو کمزور سمجھتے ہیں"۔ جب ہم سبھوں نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ تو فرمایا کہ ہونا کیا میں چپ ہو گیا۔

اس ایک واقعے سے نواب صاحب کی مروت، نیکی اور شرافت کا پتہ چلتا ہے جس سے لوگ اکثر ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔

ان تھکا دینے والی محنتوں اور کالج کی اسٹرائک اور دیگر پیچیدگیوں نے ضعیفی میں نواب صاحب کو کافی صدمے پہنچائے مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ قوم کے لیے دوڑ دھوپ کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی آخری علالت کا واقعہ بھی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ انہوں نے خدمتِ قوم میں جان دے دی۔ آخر ستمبر ۱۹۰۷ء میں وہ وائسرائے سے اصلاحات کی اسکیم میں مسلمانوں کے حقوق کی توسیع وغیرہ کے لئے ملاقات کرنے شملہ تشریف لے گئے تھے۔ وہیں وہ زبردست طور پر علیل ہوئے۔ وائسرائے نے اپنے خاص ڈاکٹر کو علاج کے لئے مامور کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ۶ بجے شام اس حقیقی محسن الملک اور خادمِ قوم نے بارگاہِ اقدس میں اپنی زندگی کا اجر حاصل کرنے کے لئے انتقال فرمایا کہ زبانِ وحی کا یہ اٹل وعدہ ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِين (خدا نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

حالی نے چند رباعیات میں نواب محسن الملک کی زندگی کی تصویر کھینچی ہے اس کو بھی سن لیجیے:

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا — خدمت کے لیے قوم کی مر مر کے جیا
پیری ہوئی سدِ راہ اس کی نہ مرض — صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

پیری میں جوانوں کو کیا مات اس نے — آرام پہ اپنے مار دی لات اس نے
تدبیر سے محنت سے دکھا دی سب کو — کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر — غل علم کا برما میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی — واں آبِ حیات ان کو پلایا جا کر

مکتبۂ چٹان کی ایک اور پیشکش

شورش کاشمیری کے قلم سے

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

(نفسیاتی مطالعہ و سوانحی خاکہ)

اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب کی سرسٹھ سالہ زندگی کے لیل و نہار کی سرگزشت، جس میں نصف صدی کے سیاسی حالات کی لفظی تصویریں جگمگاتی نظر آتی ہیں

——— شاہ جی کے خاندانی حالات

——— شاہ جی کے ذاتی واقعات

——— شاہ جی کے خطابتی معرکے

——— شاہ جی کے ہماعتی کارنامے

——— شاہ جی کے اسارتی ہنگامے

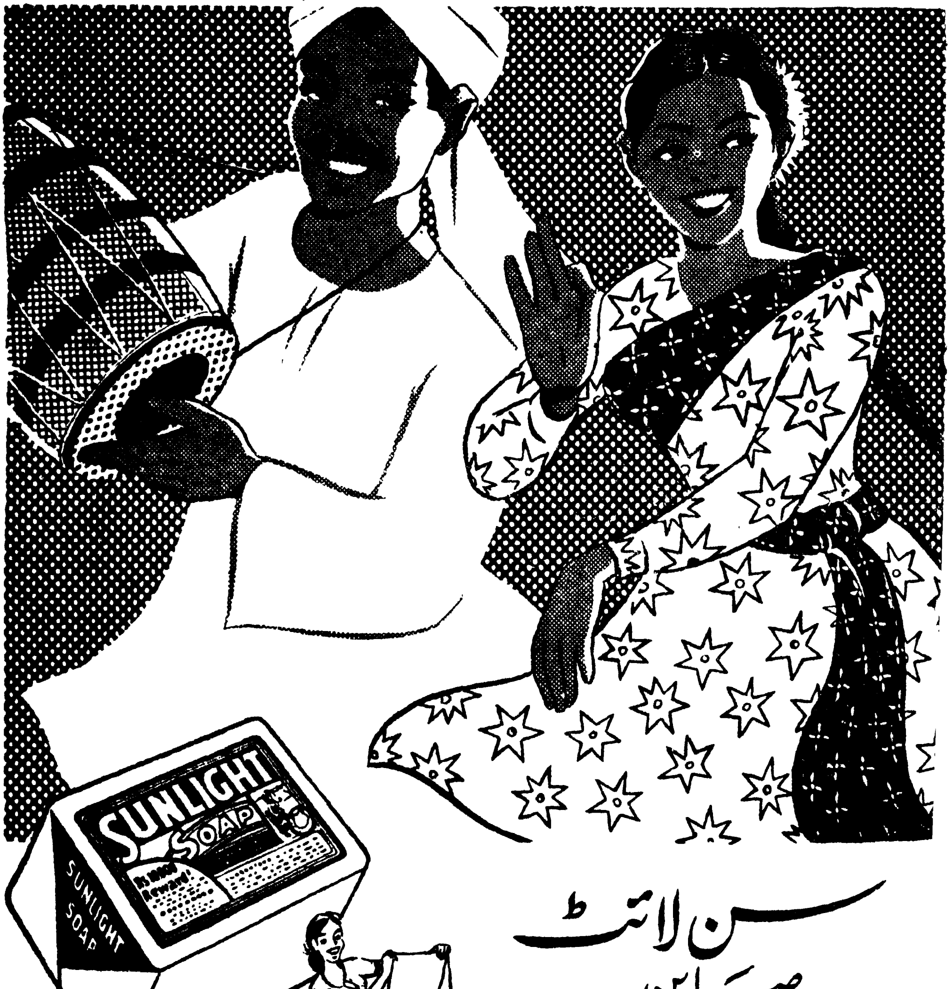
(خطیب کی کہانی ادیب کے قلم سے)

سوانحی خطوط کا نیا پیراہن ——— اور ——— سیاسی حالات کا نیا جائزہ

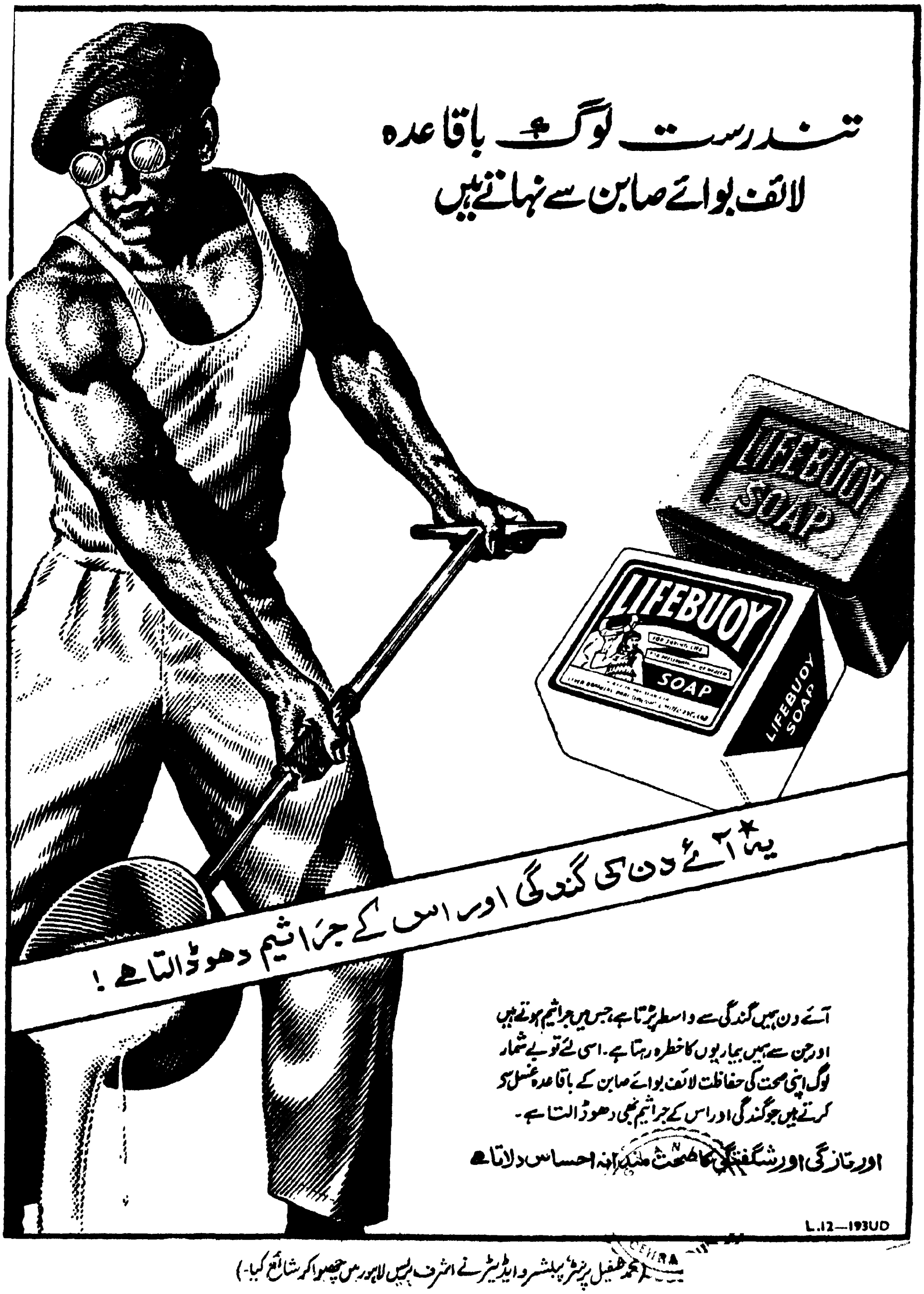
(زیرِ طبع)

مکتبۂ چٹان - ۸۸ میکلوڈ روڈ - لاہور

بے حد جھاگ دینے والا سن لائٹ
کپڑوں کو سفید اور اُجلا دھوتا ہے




میں
لکس ٹائیلٹ
صابن
استعمال کرتی ہوں
چاند عثمانی
کہتی ہے
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا سفید اور خوشبودار حسن بخش صابن
LTS.10—193UD



(محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا۔)


آپ کو مال کس جگہ چاہیے؟
BURMAH-SHELL
BURMAH SHELL
ہر طبقے کے خریداروں
کی سہولت کے لئے برماشیل
نے ملک کے ۹۵ اہم مقامات پر
اپنے ڈپو کھول رکھے ہیں جہاں سے
ضرورت کے وقت فی الفور رسد
حاصل کی جا سکتی ہے۔ پٹرولیم کی مصنوعات
کے نقل و حمل اور ذخیرہ اندوزی کے سلسلے میں برماشیل کا وسیع
تجربہ اور کامل انتظام ملک کے گوشہ گوشہ میں بہ کفایت تقسیم کاری
کا ضامن ہے۔
برماشیل
ترقیٔ پاکستان کا ایک حصہ ہے

پنجابی زبان دا

ادب تے تاریخ

ملن دا پتہ : ملک نذیر احمد پروپرائٹر : ... اردو بازار لاہور (پاکستان)